پیش لفظ

سیّدنا حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام نے اپنی تصانیف اور تقاریر میں قرآن کریم کی جن آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے ہم اُسے یکجا کر کے احباب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ابوالمنیر نورالحق
مینجنگ ڈائریکٹر ادارۃ المصنفین ربوہ

اَلْفِہرِسْ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست آیات سورۃ آل عمران

فہرست آیات سورۃ النساء

فہرست آیات سورۃ المائدۃ

فہرست آیات سورۃ الاعراف

فہرست آیات سورۃ الانفال

فہرست آیات سورۃ توبہ

فہرست آیات سورۃ یونس

فہرست آیات سورۃ ہود

فہرست آیات سُورۃ یوسف

فہرست آیات سُورۃ الرّعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ　　　　بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ آل عمران

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

وہی اللہ ہے اُس کا کوئی ثانی نہیں اُسی سے ہر ایک کی زندگی اور بقا ہے اُس نے حق اور ضرورت حقّہ کے ساتھ تیرے پر کتاب اُتاری۔ (نور القرآن نمبر ۱ بار دوم صفحہ ۳)

قرآنی عقیدہ یہی ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ ہر ایک چیز کا خالق اور پیدا کنندہ ہے اسی طرح وہ ہر ایک چیز کا واقعی اور حقیقی طور پر قیوم بھی ہے یعنی ہر ایک چیز کا اُسی کے وجود کے ساتھ بقا ہے اور اُس کا وجود ہر یک چیز کے لیے بمنزلہ جان ہے اور اگر اُس کا عدم فرض کر لیں تو ساتھ ہی ہر یک چیز کا عدم ہو گا۔ غرض ہر یک وجود کے بقا اور قیام کے لیے اُس کی معیت لازم ہے۔ (ست بچن بار اوّل صفحہ ۱۵۳)

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں سے منکر ہو گئے اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور خدا غالب بدلہ لینے والا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں بھی منکروں کے لیے عذاب کا وعدہ ہے لہٰذا ضرور تھا کہ اُن پر عذاب نازل ہوتا۔ پس خدا تعالیٰ نے تلوار کا عذاب اُن پر وارد کیا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۷)

هُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

پیشگوئیوں کے ہمیشہ دو حصہ ہوا کرتے ہیں اور آدم سے اس وقت تک یہی تقسیم چلی آرہی ہے کہ ایک حصہ متشابہات کا ہوا کرتا ہے اور ایک حصہ بیّنات کا اب حدیبیہ کے واقعات کو دیکھا جاوے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان تو سب سے بڑھ کر ہے مگر علم کے لحاظ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا سفر کرنا دلالت کرتا تھا کہ آپ کی رائے اسی طرف تھی کہ فتح ہوگی۔ نبی کی اجتہادی غلطی جائے عار نہیں ہوا کرتی اصل صورت جو معاملہ کی ہوتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے انسان اور خدا میں یہی تو فرق ہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۹ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۷)

ایمان اس بات کو کہتے ہیں کہ اُس حالت میں مان لینا جبکہ ابھی علم کمال تک نہیں پہنچا اور شکوک اور شبہات سے ہنوز لڑائی ہے پس جو شخص ایمان لاتا ہے یعنی باوجود کمزوری اور نہ مہیا ہونے کل اسباب یقین کے اس بات کو اغلب احتمال کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے وہ حضرت احدیت میں صادق اور راستباز شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو موہبت کے طور پر معرفت تامہ حاصل ہوتی

ہے اور ایمان کے بعد عرفان کا جام اُس کو پلایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک مردِ متقی رسولوں اور نبیوں اور ماموریں من اللہ کی دعوت کو سن کر ہر ایک پہلو پر ابتداء امر میں ہی حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ حصّہ جو کسی مامور من اللہ کے ہونے پر بعض صاف اور کھلے کھلے دلائل سے سمجھ آ جاتا ہے اُسی کو اپنے اقرار اور ایمان کا ذریعہ ٹھہرا لیتا ہے اور وہ حصہ جو سمجھ میں نہیں آتا اُس میں سنت صالحین کے طور پر استعارات اور مجازات قرار دیتا ہے اور اس طرح تناقض کو درمیان سے اُٹھا کر صفائی اور اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتا ہے تب خدا تعالیٰ اُس کی حالت پر رحم کرکے اور اس کے ایمان پر راضی ہو کر اور اس کی دعاؤں کو سن کر معرفت تامہ کا دروازہ اس پر کھولتا ہے اور الہام اور کشوف کے ذریعہ سے اور دوسرے آسمانی نشانوں کے وسیلہ سے یقین کامل تک اس کو پہنچاتا ہے لیکن متعصب آدمی جو عناد سے پُر ہوتا ہے ایسا نہیں کرتا اور وہ ان امور کو جو حق کے پہچاننے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں تحقیر اور توہین کی نظر سے دیکھتا ہے اور ٹھٹھے اور ہنسی میں اُن کو اُڑا دیتا ہے اور وہ امور جو ہنوز اُس پر مشتبہ ہیں اُن کو اعتراض کرنے کی دستاویز بناتا ہے اور ظالم طبع لوگ ہمیشہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نبی کی نسبت جو پہلے نبیوں نے پیشگوئیاں کیں ان کے ہمیشہ دو حصے ہوتے رہے ہیں۔ ایک بیّنات اور محکمات جن میں کوئی استعارہ نہ تھا اور کسی تاویل کی محتاج نہ تھیں اور ایک متشابہات جو محتاج تاویل تھیں اور بعض استعارات اور مجازات کے پردے میں محجوب تھیں پھر ان نبیوں کے ظہور اور بعثت کے وقت جو اُن پیشگوئیوں کے مصداق تھے دو فریق ہوتے رہے ہیں۔ ایک فریق سعیدوں کا جنہوں نے بیّنات کو دیکھ کر ایمان لانے میں تاخیر نہ کی اور جو حصّہ متشابہات کا تھا اُس کو استعارات اور مجازات کے رنگ میں سمجھ لیا آئندہ کے منتظر رہے اور اس طرح پر حق کو پا لیا اور ٹھوکر نہ کھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی ایسا ہی ہوا پہلی کتابوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت دو طور کی پیشگوئیاں تھیں ایک یہ کہ وہ مسکینوں اور عاجزوں کے پیرایہ میں ظاہر ہوگا اور غیر سلطنت کے زمانہ میں آئے گا اور داؤد کی نسل سے ہوگا اور حلم اور نرمی سے کام لے گا اور نشان دکھلائے گا اور دوسری قسم کی یہ پیشگوئیاں تھیں کہ وہ بادشاہ ہوگا اور بادشاہوں کی طرح لڑے گا اور یہودیوں کو غیر سلطنت کی ماتحتی سے چھڑا دیگا اور اس سے پہلے ایلیا نبی دوبارہ دنیا میں آئے گا اور جب تک ایلیا نبی دوبارہ دنیا میں نہ آوے وہ نہیں آئیگا۔ پھر جب حضرت عیسیٰؑ نے ظہور فرمایا تو یہود دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق جو بہت ہی کم اور قلیل التعداد تھا اُس نے حضرت مسیح کو داؤد کی نسل سے پا کر اور پھر ان کی مسکینی اور عاجزی اور راست بازی دیکھ کر اور پھر آسمانی نشانوں کو ملاحظہ کرکے اور نیز زمانہ موجودہ کو دیکھ کر کہ وہ ایک نبی مصلح کو چاہتی ہے اور پہلی پیشگوئیوں کے قرار داد وقت کا مقابلہ کرکے یقین کر لیا کہ یہ وہی نبی ہے جس کا اسرائیل کی قوم کو وعدہ دیا گیا تھا سو وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے اور اُن کے ساتھ ہو کر طرح طرح کے دُکھ اُٹھائے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک اپنا صدق ظاہر کیا لیکن جو بدبختوں کا گروہ تھا اُس نے کھلی کھلی علامتوں اور نشانوں کی طرف ذرہ التفات نہ کیا یہاں تک کہ زمانہ کی حالت پر بھی ایک نظر نہ ڈالی اور شریرانہ حجت بازی کے ارادے سے دوسرے حصّے کو جو متشابہات کا حصّہ تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت گستاخی سے اُس مقدس کو گالیاں دینی شروع کیں اور اس کا نام ملحد اور بے دین اور کافر رکھا اور یہ کہا کہ یہ شخص پاک نوشتوں کے اُلٹے معنے کرتا ہے اور اُس نے

ناحق ایلیا نبی کے دوبارہ آنے کی تاویل کی ہے اور نص صریح کو اُس کے ظاہر سے پھیرا ہے اور ہمارے علماء کو مکّار اور ریا کار کہتا ہے اور کتب مقدسہ کے اُلٹے معنے کرتا ہے اور نہایت شرارت سے اس بات پر زور دیا کہ نبیوں کی پیشگوئیوں کا ایک حرف بھی صادق نہیں آتا وہ نہ بادشاہ ہو کر آیا اور نہ غیر قوموں سے لڑا اور نہ ہم کو اُن کے ہاتھ سے چھڑایا اور نہ اس سے پہلے ایلیا نبی نازل ہوا پھر وہ مسیح موعود کیونکر ہوگیا۔ غرض ان بدقسمت شریروں نے سچائی کے انوار اور علامات پر نظر ڈالنا نہ چاہا اور جو حصہ متشابہات کا پیشگوئیوں میں تھا اُس کو ظاہر پر حمل کر کے بار بار پیش کیا۔ یہی ابتلا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اکثر یہودیوں کو پیش آیا۔ انہوں نے بھی اپنے اسلاف کی عادت کے موافق نبیوں کی پیشگوئیوں کے اُس حصّہ سے فائدہ اُٹھانا نہ چاہا جو بیّنات کا حصّہ تھا اور متشابہات جو استعارات تھے اپنی آنکھ کے سامنے رکھ کر یا تحریف شدہ پیشگوئیوں پر زور دیکر اُس نبی کریم (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی دولت اطاعت سے جو سید الکونین ہے محروم رہ گئے اور اکثر عیسائیوں نے بھی ایسا ہی کیا انجیل کی کھلی کھلی پیشگوئیاں ہمارے (نبی) صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تھیں ان کو تو ہاتھ تک نہ لگایا اور جو سنت اللہ کے موافق پیشگوئیوں کا دوسرا حصّہ یعنی استعارات اور مجازات تھے اُن پر گر پڑے اس لیے حقیقت کی طرف راہ نہ پاسکے۔ لیکن ان میں سے وہ لوگ جو حق کے طالب تھے اور جو پیشگوئیوں کی تحریر میں طرز و عادت الٰہی ہے اُس سے واقف تھے انہوں نے انجیل کی اُن پیشگوئیوں سے جو آنے والے بزرگ نبی کے بارے میں تھیں فائدہ اٹھایا اور مشرف باسلام ہوئے۔ اور جس طرح یہود میں سے اُس گروہ نے جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے تھے پیشگوئیوں کے بیّنات سے دلیل پکڑی تھی اور متشابہات کو چھوڑ دیا تھا ایسا ہی ان بزرگ عیسائیوں نے بھی کیا اور ہزارہا نیک بخت انسان اُن میں سے اسلام میں داخل ہوئے۔ غرض ان دونوں قوموں یہود و نصاریٰ میں سے جس گروہ نے متشابہات پر جم کر انکار پر زور دیا اور بیّنات پیشگوئیوں سے جو ظہور میں آئیں فائدہ نہ اُٹھایا ان دونوں گروہ کا قرآن شریف میں جابجا ذکر ہے اور یہ ذکر اس لیے کیا گیا کہ تا ان کی بدبختی کے ملاحظہ سے مسلمانوں کو سبق حاصل ہو اور اس بات سے متنبہ رہیں کہ یہود نصاریٰ کی مانند بیّنات کو چھوڑ کر اور متشابہات میں پڑ کر ہلاک نہ ہو جائیں اور ایسی پیشگوئیوں کے بارے میں جو مامور من اللہ کے لیے پہلے سے بیان کی جاتی ہیں امید نہ رکھیں کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کے رو سے ظاہری طور پر ہی پوری ہوں گی بلکہ اس بات کے ماننے کے لیے تیار رہیں کہ قدیم سنت اللہ کے موافق بعض حصّے ایسی پیشگوئیوں کے استعارات اور مجازات کے رنگ میں بھی ہوتے ہیں اور اسی رنگ میں وہ پوری بھی ہو جاتی ہیں مگر غافل اور سطحی خیال کے انسان ہنوز انتظار میں لگے رہتے ہیں کہ گویا ابھی وہ باتیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ آئندہ ہوں گی جیسا کہ یہود ابھی تک اس بات کو روتے ہیں کہ ایلیا نبی دوبارہ دنیا میں آئیگا اور پھر اُن کا مسیح موعود بڑے بادشاہ کی طرح ظاہر ہوگا اور یہودیوں کو امارت اور حکومت بخشے گا حالانکہ یہ سب باتیں پوری ہو چکیں۔ اور اُس پر انیس سو برس کے قریب عرصہ گزر گیا اور آنے والا آ بھی گیا اور اس دنیا سے اُٹھایا بھی گیا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۲)

یہ بات نہایت کارآمد اور یاد رکھنے کے لائق تھی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مامور ہو کر آتے ہیں خواہ وہ رسول ہوں یا نبی یا محدث

اور مجدد وان کی نسبت جو پہلی کتابوں میں یا رسولوں کی معرفت پیشگوئیاں کی جاتی ہیں ان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ علامات جو ظاہری طور پر وقوع میں آتی ہیں اور ایک متشابہات جو استعارات اور مجازات کے رنگ میں ہوتی ہیں پس جن کے دلوں میں زیغ اور کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور طالب صادق بیّنات اور محکمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہود اور عیسائیوں کو یہ ابتلا پیش آچکے ہیں پس مسلمانوں کے اولوا الابصار کو چاہیئے کہ اُن سے عبرت پکڑیں اور صرف متشابہات پر نظر رکھ کر تکذیب میں جلدی نہ کریں اور جو باتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کھل جائیں اُن سے اپنی ہدایات کے لیے فائدہ اٹھاویں یہ تو ظاہر ہے کہ شک یقین کو رفع نہیں کرسکتا پس پیشگوئیوں کا وہ دوسرا حصہ جو ظاہری طور پر ابھی پورا نہیں ہوا وہ ایک امر شکی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایلیا کے دوبارہ آنے کی طرح وہ حصہ استعارات یا مجاز کے رنگ میں پورا ہو گیا ہو مگر انتظار کرنے والا اس غلطی میں پڑا ہو کہ وہ ظاہری طور پر کسی دن پورا ہو گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض احادیث کے الفاظ محفوظ نہ رہے ہوں کیونکہ احادیث کے الفاظ وحی متلو کی طرح نہیں اور اکثر احادیث احاد کا مجموعہ ہیں اعتقادی امر تو الگ بات ہے جو چاہو اعتقاد کرو مگر واقعی اور حقیقی فیصلہ یہی ہے کہ احاد میں عند العقل امکان تغیر الفاظ ہے چنانچہ ایک ہی حدیث جو مختلف طریقوں اور مختلف راویوں سے پہنچتی ہے اکثر ان کے الفاظ اور ترتیب میں بہت سا فرق ہوتا ہے حالانکہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی منہ سے نکلی ہے۔ پس صاف سمجھ آتا ہے کہ چونکہ اکثر راویوں کے الفاظ اور طرز بیان جدا جدا ہوتے ہیں اس لیے اختلاف پڑ جاتا ہے اور نیز پیشگوئیوں کے متشابہات کے حصہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض واقعات پیشگوئیوں کے جن کا ایک ہی دفعہ ظاہر ہونا امید رکھا گیا ہے وہ تدریجاً ظاہر ہوں یا کسی اور شخص کے واسطے سے ظاہر ہوں جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کہ قیصر وکسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں آپ کے ہاتھ پر رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ پیشگوئی کے ظہور سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے تھے اور آنجناب نے نہ قیصر اور کسریٰ کے خزانہ کو دیکھا اور نہ کنجیاں دیکھیں مگر چونکہ مقدر تھا کہ وہ کنجیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ظلی طور پر گویا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی تھا اس لیے عالم وحی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ قرار دیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ دھوکا کھانے والے اسی مقام پر دھوکا کھاتے ہیں وہ اپنی بدقسمتی سے پیشگوئی کے ہر ایک حصہ کی نسبت یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ظاہری طور پر ضرور پورا ہو گا۔ اور پھر جب وقت آتا ہے اور کوئی مامور من اللہ آتا ہے تو جو جو علامتیں اُس کے صدق کی نسبت ظاہر ہو جائیں ان کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے اور جو علامتیں ظاہری صورت میں پوری نہ ہوں یا ابھی اُن کا وقت نہ آیا ہو اُن کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ ہلاک شدہ امتیں جنہوں نے سچے نبیوں کو نہیں مانا ان کی ہلاکت کا اصل موجب یہی تھا اپنے زعم میں تو وہ لوگ اپنے تئیں بڑے ہوشیار جانتے رہے ہیں مگر ان کے اس طریق نے قبول حق سے اُن کو بے نصیب کھا۔

یہ عجیب ہے کہ پیشگوئیوں کی نافہمی کے بارے میں جو کچھ پہلے زمانہ میں یہود اور نصاریٰ سے وقوع میں آیا اور انہوں نے سچوں کو قبول نہ کیا۔ ایسا ہی میری قوم مسلمانوں نے میرے ساتھ معاملہ کیا یہ تو ضروری تھا کہ قدیم سنت اللہ کے

موافق وہ پیشگوئیاں جو مسیح موعود کے بارے میں کی گئیں وہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہوئیں ایک حصہ بیّنات کا جو اپنی ظاہر صورت پر واقع ہونے والا تھا اور ایک حصہ متشابہات کا جو استعارات اور مجازات کے رنگ میں تھا۔ لیکن افسوس کہ اس قوم نے بھی پہلے خطا کار لوگوں کے قدم پر قدم مارا اور متشابہات پر اَڑ کر اُن بیّنات کو رد کر دیا جو نہایت صفائی سے پوری ہو گئی تھیں۔ حالانکہ شرط تقویٰ یہ تھی کہ پہلی قوموں کے ابتلاؤں کو یاد کرتے متشابہات پر زور نہ مارتے اور بیّنات سے یعنی ان باتوں اور ان علامتوں سے جو روز روشن کی طرح کھل گئی تھیں فائدہ اٹھاتے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی وہ پیشگوئیاں پیش کی جاتی ہیں جن کے اکثر حصّے نہایت صفائی سے پورے ہو چکے ہیں تو نہایت لاپرواہی سے اُن سے منہ پھیر لیتے ہیں اور پیشگوئیوں کی بعض باتیں جو استعارات کے رنگ میں تھیں پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حصّہ پیشگوئیوں کا کیوں ظاہری طور پر پورا نہیں ہوا۔ اور بااینہمہ جب پہلے مکذبوں کا ذکر آوے جنہوں نے بعینہٖ اُن لوگوں کی طرح واقع شدہ علامتوں پر نظر نہ کی اور متشابہات کا حصّہ جو پیشگوئیوں میں تھا اور استعارات کے رنگ میں تھا اُس کو دیکھ کر کہ وہ ظاہری طور پر پورا نہیں ہوا حق کو قبول نہ کیا۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم ان کے زمانہ میں ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ حالانکہ اب یہ لوگ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ان پہلے مکذبوں نے کیا۔ جن ثابت شدہ علامتوں اور نشانوں سے قبول کرنے کی روشنی پیدا ہو سکتی ہے اُن کو قبول نہیں کرتے اور جو استعارات اور مجازات اور متشابہات ہیں ان کو ہاتھ میں لیے ہوئے پھرتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں پوری نہیں ہوئیں حالانکہ سنت اللہ کی تعلیم طریق کے موافق ضرور تھا کہ وہ باتیں اس طرح پوری نہ ہوتیں جس طرح ان کا خیال ہے یعنی ظاہری اور جسمانی صورت پر بیشک ایک حصہ ظاہری طور پر اور ایک حصہ مخفی طور پر پورا ہو گیا لیکن اس زمانہ کے متعصب لوگوں کے دلوں نے نہیں چاہا کہ قبول کریں وہ تو ہر ایک ثبوت کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں وہ خدا کے نشانوں کو انسان کی مکاری خیال کرتے ہیں جب خدائے قدوس کے پاک الہاموں کو سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان کا افترا ہے مگر اس بات کا جواب نہیں دے سکتے کہ کیا کبھی خدا پر افترا کرنے والے کو مفتریات کے پھیلانے کیلئے وہ مہلت ملی جو سچے ملہموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی؟ کیا خدا نے نہیں کہا کہ الہام کا افترا کے طور پر دعویٰ کرنے والے ہلاک کیے جائیں گے اور خدا پر جھوٹ بولنے والے پکڑے جائیں گے؟ یہ تو توریت میں بھی ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جائے گا اور انجیل میں بھی ہے کہ جھوٹا جلد فنا ہوگا اور اس کی جماعت متفرق ہو جائے گی۔ کیا کوئی ایک نظیر بھی ہے کہ جھوٹے ملہم نے جو خدا پر افترا کرنے والا تھا ایام افترا میں وہ عمر پائی جو اس عاجز کو ایام دعوت الہام میں ملی؟ بھلا اگر کوئی نظیر ہے تو پیش تو کرو۔ میں نہایت پر زور دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا کی ابتدا سے آج تک ایک نظیر بھی نہیں ملے گی۔ پس کیا کوئی ایسا ہے کہ اس محکم اور قطعی دلیل سے فائدہ اٹھاوے اور خدا تعالیٰ سے ڈرے؟ میں نہیں کہتا کہ بت پرست عمر نہیں پاتے یا دہریہ یا انا الحق کہنے والے جلد پکڑے جاتے ہیں کیونکہ ان غلطیوں اور ضلالتوں کی سزا دینے کے لیے دوسرا عالم ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص خدا تعالیٰ پر الہام کا افترا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الہام مجھ کو ہوا حالانکہ

جانتا ہے کہ وہ الہام اس کو نہیں ہوا وہ جلد پکڑا جاتا ہے اور اُس کی عمر کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ قرآن اور انجیل اور توارت نے یہی گواہی دی ہے۔ عقل بھی یہی گواہی دیتی ہے۔ اور اس کے مخالف کوئی منکر کسی تاریخ کے حوالہ سے ایک نظیر بھی پیش نہیں کر سکتا اور نہیں دکھلا سکتا کہ کوئی جھوٹا الہام کا دعویٰ کرنے والا پچیس برس تک یا اٹھارہ برس تک جھوٹے الہام دنیا میں پھیلاتا رہا۔ اور جھوٹے طور پر خدا کا مقرب اور خدا کا مامور اور خدا کا فرستادہ اپنا نام رکھا۔ اور اس کی تائید میں سالہائے دراز تک اپنی طرف سے الہامات تراش کر مشہور کرتا رہا اور پھر وہ باوجود ان مجرمانہ حرکات کے پکڑا نہ گیا۔ کیا امید کی جاتی ہے کہ کوئی ہمارا مخالف اس سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ان کے دل جانتے ہیں کہ وہ ان سوالات کے جواب دینے سے عاجز ہیں مگر پھر بھی انکار سے باز نہیں آتے بلکہ بہت سے دلائل سے اُن پر حجت وارد ہو گئی۔ مگر وہ خواب غفلت میں سو رہے ہیں۔

(البدر جلد ۲ ع ۴۸ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۲-۳۸۳)

پیشگوئی میں کسی قدر اخفاء اور متشابہات کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہی ہمیشہ سے سنت الٰہی ہے۔ ملاکی نبی اگر اپنی پیشگوئی میں صاف لکھ دیتا کہ الیاس خود نہ آئے گا بلکہ اس کا مثیل تو حضرت عیسٰیؑ کے ماننے میں اس قدر دقتیں اس زمانہ کے علماء کو پیش نہ آتیں۔ ایسا ہی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشگوئیاں توریت اور انجیل میں ہیں وہ نہایت ظاہر الفاظ میں ہوتیں کہ آنے والا نبی آخر زمان اسماعیل کی اولاد میں سے ہوگا اور شہر مکہ میں ہوگا تو پھر یہودیوں کو آپ کے ماننے سے کوئی انکار نہ ہو سکتا تھا لیکن خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ کہ ان میں متقی کون ہے جو صداقت کو اس کے نشانات سے دیکھ کر پہچانتا اور اُس پر ایمان لاتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○

اے ہمارے خدا ہمارے دل کو لغزش سے بچا اور بعد اس کے جو تو نے ہدایت دی ہمیں پھسلنے سے محفوظ رکھ اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عنایت کر کیونکہ ہر ایک رحمت کو تو ہی بخشتا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۱۹)

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○

خدا تخلّف وعدہ نہیں کرے گا۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

وعدہ سے مراد وہ امر ہے جو علم الٰہی میں بطور وعدہ قرار پا چکا ہے نہ وہ امر جو انسان اپنے خیال کے مطابق اس کو قطعی وعدہ خیال کرتا ہو یہی وجہ ہے المیعاد پر جو الف لام ہے وہ عہد ذہنی کی قسم میں سے ہے یعنی وہ امر جو ارادہ قدیمہ میں وعدہ کے نام سے موسوم ہے گو انسان کو اس کی تفاصیل پر علم ہو یا نہ ہو وہ غیر متبدل ہے ورنہ ممکن ہے جو انسان جس بشارت کو وعدہ کی صورت میں سمجھتا ہے اُس کے ساتھ کوئی ایسی شرط مخفی ہو جس کا عدم تحقق اس بشارت کے عدم تحقق کے لیے ضرور ہو کیونکہ شرائط کا ظاہر کرنا اللہ جل شانہٗ پر حق واجب نہیں ہے چنانچہ اسی بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بسط سے لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے بھی فتوح الغیب کی شرح میں اس میں بہت عمدہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کا بدر کی لڑائی میں تضرع اور دعا کرنا اسی خیال سے تھا کہ الٰہی مواعید اور بشارات میں احتمال شرط مخفی ہے اور یہ اس لیے سنت اللہ ہے کہ تا اس کے خاص بندوں پر ہیبت اور عظمت الٰہی مستولی رہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں بے شک تخلف نہیں وہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں پورے ہو جاتے ہیں لیکن انسان ناقص العقل کبھی انکو تخلف کی صورت میں سمجھ لیتا ہے کیونکہ بعض ایسی مخفی شرائط پر اطلاع نہیں پاتا جو پیشگوئی کو دوسرے رنگ میں لے آتے ہیں اور ہم لکھ چکے ہیں کہ الہامی پیشگوئیوں میں یہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ وہ ہمیشہ ان شرائط کے لحاظ سے پوری ہوتی ہیں جو سنت اللہ میں اور الٰہی کتاب میں مندرج ہو چکی ہیں گو وہ شرائط کسی ولی کے الہام میں ہوں یا نہ ہوں۔ (اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ بمرتبہ چہارم۔ تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۸۰ حاشیہ)

وقتوں اور میعادوں کا ٹلنا تو ایک ایسی سنت اللہ ہے جس سے بجز ایک سخت جاہل کے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا دیکھو حضرت موسیٰ کو نزول توریت کے لیے تیس رات کا وعدہ دیا تھا اور کوئی ساتھ شرط نہ تھی مگر وہ وعدہ قائم نہ رہا اور اُس پر دس دن اور بڑھائے گئے جس سے بنی اسرائیل گوسالہ پرستی کے فتنہ میں پڑے پس جبکہ اس نص قطعی سے ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ ایسے وعدہ کی تاریخ کو بھی ٹال دیتا ہے جس کے ساتھ کسی شرط کی تصریح نہیں کی گئی تھی تو وعید کی تاریخ میں عندالرجوع تاخیر ڈالنا خود کرم میں داخل ہے اور ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر تاریخ عذاب کسی کے توبہ استغفار سے ٹل جائے تو اُس کا نام تخلف وعدہ نہیں کیونکہ بڑا وعدہ سنت اللہ ہے پس جبکہ سنت اللہ پوری ہوئی تو وہ ایفاء وعدہ ہوا نہ تخلف وعدہ۔ (اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ بمرتبہ چہارم۔ تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۱۷۹۔۱۸۰)

خدا نے ابتدا سے وعید کے ساتھ یہ شرط لگا رکھی ہے کہ اگر چاہوں تو وعید کو موقوف کروں اس لیے قرآن میں یہ تو آیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ اور یہ نہیں آیا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْوَعِیْدَ۔

(کتاب البریہ صفحہ ۲۱۔۲۲)

لوگ اس نعمت سے بے خبر ہیں کہ صدقات۔ دعا۔ اور خیرات سے رد بلا ہوتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان زندہ ہی مر جاتا۔ مصائب اور مشکلات کے وقت کوئی امید اس کے لیے تسلی بخش نہ ہوتی مگر نہیں اسی نے لَا یُخْلِفُ

اَلْمِیْعَادَ فرمایا ہے۔ لَا یُخْلِفُ الْوَعِیْدَ نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کے وعید معلق ہوتے ہیں جو دعا اور صدقات سے بدل جاتے ہیں اس کی بے انتہا نظیریں موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی فطرت میں مصیبت اور بلا کے وقت دعا اور صدقات کی طرف رجوع کرنے کا جوش ہی نہ ہوتا۔

جس قدر راست باز اور نبی دنیا میں آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور قوم میں آئے ہوں مگر یہ بات ان سب کی تعلیم میں یکساں ملتی ہے کہ انہوں نے صدقات اور خیرات کی تعلیم دی۔ اگر خدا تعالیٰ تقدیر کے محو و اثبات پر قادر نہیں تو پھر یہ ساری تعلیم فضول ٹھہر جاتی ہے اور پھر ماننا پڑے گا کہ دعا کچھ نہیں۔ اور ایسا کہنا ایک عظیم الشان صداقت کا خون کرنا ہے۔

اسلام کی صداقت اور حقیقت دعا ہی کے نکتہ کے نیچے مخفی ہے کیونکہ اگر دعا نہیں تو نماز بیفائدہ زکوٰۃ بے سود اور اسی طرح سب اعمال معاذ اللہ لغو ٹھہرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷، ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

۱۳ قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ۝

کافروں کو کہہ دے کہ تم عنقریب مغلوب کیے جاؤ گے اور پھر آخر جہنم میں پڑو گے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

انسان جس لذت کا خوگرفتہ اور عادی ہو جب وہ اس سے چھڑائی جاوے تو وہ ایک دکھ اور درد محسوس کرتا ہے اور یہی جہنم ہے پس جبکہ ساری لذتیں دنیا کی چیزوں میں محسوس کرنے والا ہو تو ایک دن یہ ساری لذتیں تو چھوڑنی پڑیں گی پھر وہ سیدھا جہنم میں جاوے گا لیکن جس شخص کی ساری خوشیاں اور لذتیں خدا میں ہیں اس کو کوئی دکھ اور تکلیف محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ اس دنیا کو چھوڑتا ہے تو سیدھا بہشت میں ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۷، ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

۱۸ اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ۝

خدا تمہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم ہر روز صبح کے وقت استغفار کیا کرو وہ فرماتا ہے اَلصَّابِرِیْنَ وَالصَّادِقِیْنَ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ پھر فرماتا ہے اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ۔ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ

اَللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝[1] ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ہمیں یہی حکم نہیں کرتا کہ جس وقت تم سے کوئی گناہ سرزد ہو اُس وقت استغفار[2] کیا کرو۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ بغیر گناہوں کے ارتکاب کے بھی ہم استغفار کیا کریں۔ (ریویو جلد ۲ ع۶ بابت جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۴۳)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

اسلام کے لفظ میں نظر کیجیے کہ اُس کے لغوی معنے تو صرف یہی ہیں کہ جو کسی کو کام سونپا یا ترک مقابلہ اور فروگذاشت اور اطاعت۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم حاشیہ در حاشیہ نمبر ا صلہ ۲۲)

واضح ہو کہ لغت عرب میں اسلام اس کو کہتے ہیں کہ بطور پیشگی ایک چیز کا مول دیا جاوے اور یا یہ کہ کسی کو اپنا کام سونپیں اور یا یہ کہ صلح کے طالب ہوں اور یا یہ کہ کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دیں۔ اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اس آیت کریمہ میں اُس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[3] یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لیے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیوے۔ اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لیے قائم ہو جاوے۔ اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دیوے مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے۔

"اعتقادی" طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی طاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اور "عملی" طور پر اس طرح سے کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق اور ہر یک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں بجا لاوے مگر ایسے ذوق شوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبود حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔
(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۷-۵۸)

---

[1] الذّاریٰت آیات ۱۷ تا ۱۹ ✦ [2] استغفار کی تشریح کے لیے دیکھیں تفسیر سورۃ البقرۃ صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۰ ✦ [3] البقرۃ آیت ۱۱۳ ✦

حقیقت اسلامیہ جس کی تعلیم قرآن کریم فرماتا ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام اسی حقیقت کے ظاہر کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے اور تمام الٰہی کتابوں کا یہی مدعا رہا ہے کہ تا بنی آدم کو اس صراط مستقیم پر قائم کریں لیکن قرآن کریم کی تعلیم کو جو دوسری تعلیموں پر کمال درجہ کی فوقیت ہے تو اس کی دو وجہ ہیں۔

اوّل یہ کہ پہلے نبی اپنے زمانہ کے جمیع بنی آدم کے لیے مبعوث نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ صرف اپنی ایک خاص قوم کے لیے بھیجے جاتے تھے جو خاص استعداد میں محدود اور خاص طور کے عادات اور عقائد اور اخلاق اور روش میں قابل اصلاح ہوتے تھے پس اس وجہ سے وہ کتابیں قانون مختص القوم کی طرح ہو کر صرف اسی حد تک اپنے ساتھ ہدایت لاتی تھیں جو اس خاص قوم کے مناسب حال اور ان کے پیمانہ استعداد کے موافق ہوتی تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ اُن انبیاء علیہم السلام کو ایسی شریعت ملتی تھی جو ایک خاص زمانہ تک محدود ہوتی تھی اور خدا تعالیٰ نے اُن کتابوں میں یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ دُنیا کے اخیر تک وہ ہدایتیں جاری رہیں اس لیے وُہ کتابیں قانون مختص الزمان کی طرح ہو کر صرف اسی زمانہ کی حد تک ہدایت لاتی تھیں جو ان کتابوں کی پابندی کا زمانہ حکمت الٰہی نے اندازہ کر رکھا تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۲۶-۱۲۸)

قرآن کریم نے حقیقت اسلامیہ کی تحصیل کے لیے بہت سے وسائل بیان فرمائے ہیں مگر در حقیقت اُن سب کا مآل دو قسم پر ہی جا ٹھہرتا ہے اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی مالکیت تامہ اور اُس کی قدرت تامہ اور اُس کی حکومت تامہ اور اُس کے علم تام اور اُس کے حساب تام اور نیز اُس کے واحد لاشریک اور حیّ قیّوم اور حاضر ناظر ذوالاقتدار اور ازلی ابدی ہونے میں اور اُس کی تمام قوتوں اور طاقتوں اور جمیع جلال و کمال کے ساتھ یگانہ ہونے میں پورا پورا یقین آجائے یہاں تک کہ ہر ایک ذرّہ اپنے وجود اور اس تمام عالم کے وجود کا اُس کے تصرف اور حکم میں دکھائی دے اور وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ[1] کی تصویر سامنے نظر آجاوے اور نقش راسخ بید ہ ملکوت السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا جلی قلم کے ساتھ دل میں لکھا جائے یہاں تک کہ اُس کی عظمت اور ہیبت اور کبریائی تمام نفسانی جذبات کو اپنی قہری شعاعوں سے منفعل اور خیرہ کر کے اُن کی جگہ لے لے اور ایک دائمی رُعب اپنا دل پر جما دیوے اور اپنے قہری حملہ سے نفسانی سلطنت کے تخت کو خاک مذلّت میں پھینک دیوے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیوے اور اپنے خوفناک کرشموں سے غفلت کی دیواروں کو گرا دے اور تکبّر کے میناروں کو توڑ دے اور ظلمت بشری کی حکومتیں وجود انسانی کی دار السلطنت سے بکلّی اُٹھا دیوے اور جو جذبات نفس امّارہ کی طبیعت انسانی پر حکومت کرتے تھے اور باعزّت سمجھے گئے تھے اُن کو ذلیل اور خوار اور ہیچ اور بے مقدار کر کے دکھلا دیوے۔

دوم یہ کہ اللہ جلّشانہٗ کے حسن و احسان پر اطلاع وافر پیدا کرے کیونکہ کامل درجہ کی محبت یا تو حُسن کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے اور یا احسان کے ذریعہ سے۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۸۰-۱۸۲)

[1] سورۃ الانعام آیت [illegible]

جب کوئی اپنے مولیٰ کا سچا طالب کامل طور پر اسلام پر قائم ہو جائے اور نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے بلکہ طبعی طور پر خدا تعالیٰ کی راہوں میں ہر ایک قوت اُس کے کام میں لگ جائے تو آخری نتیجہ اُس کی اِس حالت کا یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کے اعلیٰ تجلیات تمام حُجب سے مبرّا ہو کر اُس کی طرف رُخ کرتے ہیں اور طرح طرح کے برکات اُس پر نازل ہوتے ہیں اور وہ احکام اور وہ عقاید جو محض ایمان اور سماع کے طور پر قبول کیے گئے تھے اب بذریعہ مکاشفات صحیحہ اور الہامات یقینیہ قطعیہ مشہود اور محسوس طور پر کھولے جاتے ہیں اور مُتعلقات شرع اور دین کے اور اسرار سربستہ ملّت حنیفیہ کے اُس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور ملکوت الٰہی کا اُس کو سیر کرایا جاتا ہے تا وہ یقین اور معرفت میں مرتبہ کامل حاصل کرے اور اُس کی زبان اور اُس کے بیان اور تمام افعال اور اقوال اور حرکات سکنات میں ایک برکت رکھی جاتی ہے اور ایک فوق العادت شجاعت اور استقامت اور ہمت اُس کو عطا کی جاتی ہے اور شرح صدر کا ایک اعلیٰ مقام اُس کو عنایت کیا جاتا ہے اور بشریت کے حجابوں کی تنگ دلی اور خست اور بخل اور بار بار کی لغزش اور تنگ چشمی اور غلامی شہوات اور رداءت اخلاق اور ہر ایک قسم کی نفسانی تاریکی بکلّی اُس سے دور کر کے اُس کی جگہ ربانی اخلاق کا نور بھر دیا جاتا ہے تب وہ بکلّی مبدّل ہو کر ایک نئی پیدائش کا پیرایہ پہن لیتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے سُنتا اور خدائے تعالیٰ سے دیکھتا اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ حرکت کرتا اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ ٹھہرتا ہے اور اُس کا غضب خدائے تعالیٰ کا غضب اور اُس کا رحم خدائے تعالیٰ کا رحم ہو جاتا ہے اور اِس درجہ میں اُس کی دعائیں بطور اصطفاء کے منظور ہوتی ہیں نہ بطور ابتلا کے اور وہ زمین پر حجت اللہ اور امان اللہ ہوتا ہے اور آسمان پر اُس کے وجود سے خوشی کی جاتی ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عطیہ جو اُس کو عطا ہوتا ہے مکالمات الٰہیہ اور مخاطبات حضرت یزدانی ہیں جو بغیر شک اور شبہ اور کسی غبار کے چاند کے نور کی طرح اُس کے دل پر نازل ہوتے رہتے ہیں اور ایک شدید الاثر لذت اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور طمانیت اور تسلّی اور سکینت بخشتے ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۲۷-۲۳۱)

قرآن کریم نے اسلام کی نسبت جس کو وہ پیش کرتا ہے یہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سپارہ ۳ رکوع ۱۰) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (سپارہ ۳ رکوع ۱۷) ترجمہ یعنی دین سچا اور کامل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے اور جو کوئی بجز اسلام کے کسی اور دین کو چاہے گا تو ہرگز قبول نہیں کیا جاوے گا۔ اور وہ آخرت میں زیان کاروں میں سے ہوگا۔ (جنگ مقدس بحث ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۴)

وہ دین جس میں خدا کی معرفت صحیح اور اُس کی پرستش احسن طور پر ہے وہ اسلام ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۶)

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ یعنی سب دین جھوٹے ہیں مگر اسلام۔ (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۳ حاشیہ)

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ تمہاری روحیں خدا تعالیٰ کے آستانہ پر گر جائیں۔ اور خدا اور اس کے احکام ہر ایک پہلو کے رو سے تمہاری دنیا پر تمہیں مقدم ہو جائیں۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۱-۶۲)

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی گردن خدا کے آگے قربانی کے بکرے کی طرح رکھ دینا اور اپنے تمام ارادوں سے

آل عمران آیت ۸۶

کھوئے جانا اور خدا کے ارادہ اور رضا میں محو ہو جانا اور خدا میں گم ہو کر ایک موت اپنے پر وارد کر لینا اور اس کی محبت ذاتی سے پورا رنگ حاصل کر کے محض محبت کے جوش سے اس کی اطاعت کرنا نہ کسی اور بنا پر۔ اور ایسی آنکھیں حاصل کرنا جو محض اس کے ساتھ دیکھتی ہوں اور ایسے کان حاصل کرنا جو محض اس کے ساتھ سنتے ہوں۔ اور ایسا دل پیدا کرنا جو سراسر اس کی طرف جھکا ہوا ہو اور ایسی زبان حاصل کرنا جو اس کے بلائے بولتی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس پر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور انسانی قویٰ اپنے ذمہ کا تمام کام کر چکتے ہیں اور پورے طور پر انسان کی نفسانیت پر موت وارد ہو جاتی ہے تب خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے زندہ کلام اور چمکتے ہوئے نوروں کے ساتھ دوبارہ اس کو زندگی بخشتی ہے۔ اور وہ خدا کے لذیذ کلام سے مشرف ہوتا ہے۔ اور وہ دقیق در دقیق نور جس کو عقلیں دریافت نہیں کر سکتیں اور آنکھیں اس کی کنہ تک نہیں پہنچتیں وہ خود انسان کے دل سے نزدیک ہو جاتا ہے۔ (لیکچر لاہور صـ۱۳)

سچا اسلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کو مادام الحیات وقف کر دے تاکہ وہ حیات طیبہ کا وارث ہو۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ اس للہی وقف کی طرف ایما کر کے فرماتا ہے مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[1]۔ اس جگہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے معنے یہی ہیں کہ ایک نیستی اور تذلل کا لباس پہن کر آستانہ الوہیت پر گرے اور اپنی جان۔ مال آبرو غرض جو کچھ اس کے پاس ہے خدا ہی کے لیے وقف کرے اور دنیا اور اس کی ساری چیزیں دین کی خادم بنا دے۔ (الحکم جلد ۴ ۲۹ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۰ء صـ۳)

اسلام تو یہ ہے کہ بکرے کی طرح سر رکھ دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا مرنا میرا جینا میری نماز میری قربانیاں اللہ ہی کے لیے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنی گردن رکھتا ہوں۔

(الحکم جلد ۵ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صـ۳)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سچا دین جو نجات کا باعث ہوتا ہے اسلام ہے اگر کوئی عیسائی ہو جاوے یا یہودی ہو یا آریہ ہو وہ خدا کے نزدیک عزت پانے کے لائق نہیں۔

(الحکم جلد ۶ ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صـ۱۰)

سچے اسلام کا یہ معیار ہے کہ اُس سے انسان اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہو جاتا ہے اور وہ ایک ممیز شخص ہوتا ہے۔

(البدر جلد ۱ ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صـ۲۳)

ابراہیم علیہ السلام کے قصہ پر غور کرو کہ جو آگ میں گرنا چاہتے ہیں تو ان کو خدا تعالیٰ آگ سے بچاتا ہے اور جو خود آگ سے بچنا چاہتے ہیں وہ آگ میں ڈالے جاتے ہیں یہ سلم ہے اور یہ اسلام ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آوے اس سے انکار نہ کرے۔ (البدر جلد ۱ ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صـ۵۳)

اسلام اس بات کا نام ہے کہ بجز اس قانون کے جو مقرر ہے ادھر ادھر بالکل نہ جاوے۔ (البدر جلد ۲ ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صـ۵۹)

[1] البقرة آیت ۱۱۳۔

اپنے آپ کو ہر آن واحد میں خدا کا محتاج جاننا اور اس کے آستانہ پر سر رکھنا یہی اسلام ہے......... اسلام نام ہے خدا کے آگے گردن جھکا دینے کا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۶ مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۶۲)

اسلام اس بات کا نام ہے کہ قرآن شریف کی اتباع سے خدا کو راضی کیا جاوے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اسلام کے سوا اور کوئی دین قبول نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نرا دعویٰ نہیں تاثیرات ظاہر کر رہی ہیں اگر کوئی اہل مذہب اسلام کے سوا اپنے مذہب کے اندر انوار و برکات اور تاثیرات رکھتا ہے تو پھر وہ آئے ہمارے ساتھ مقابلہ کر لے اور ہم نے ہمیشہ ایسی دعوت کی ہے کوئی مقابلہ پر نہیں آیا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

اسلام کے معنے تو یہ تھے کہ انسان خدا کی محبت اور اطاعت میں فنا ہو جاوے اور جس طرح پر ایک بکری کی گردن قصاب کے آگے ہوتی ہے اس طرح پر مسلمان کی گردن خدا تعالیٰ کی اطاعت کے لیے رکھ دی جاوے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ خدا تعالیٰ ہی کو وحدہ لاشریک سمجھے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں۔ (حضرت کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط صفحہ ۱ مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ)

یاد رکھو اسلام ایک موت ہے جب تک کوئی شخص نفسانی جذبات پر موت وارد کر کے نئی زندگی نہیں پاتا اور خدا ہی کے ساتھ بولتا۔ چلتا پھرتا سنتا۔ دیکھتا نہیں وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۱ مورخہ ۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

سچا رجوع اس وقت ہوتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی رضاء سے رضاء انسانی مل جاوے۔ یہ وہ حالت ہے جہاں انسان اولیا اور ابدال اور مقربین کا درجہ پاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف ملتا ہے اور وحی کی جاتی ہے اور چونکہ وہ ہر قسم کی تاریکی اور شیطانی شرارت سے محفوظ ہوتا ہے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا میں زندہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ایک ابدی بہشت اور سرور میں ہوتا ہے انسانی ہستی کا مقصد اعلیٰ اور غرض اسی مقام کا حاصل کرنا ہے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جو اسلام کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کیونکہ اسلام سے سچی مراد یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع اپنی رضا کر لے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

۲۱ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

اِن کو کہہ دے کہ میری راہ یہ ہے کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کو سونپ دوں اور اپنے تئیں رب العالمین کے لیے خالص کر لوں یعنی اس میں فنا ہو کر جیسا کہ وہ رب العالمین ہے میں خادم العالمین بنوں اور ہمہ تن اُسی کا اور اسی کی راہ کا ہو جاؤں۔ سو میں نے اپنا تمام وجود اور جو کچھ میرا تھا خدا تعالیٰ کا کر دیا ہے اب کچھ بھی میرا نہیں جو کچھ میرا ہے وہ سب اُس کا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۵)

اور اے پیغمبر اہل کتاب اور عرب کے جاہلوں کو کہو کہ کیا تم دین اسلام میں داخل ہوتے ہو پس اگر اسلام قبول کر لیں تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو تمہارا تو صرف یہی کام ہے کہ حکم الٰہی پہنچا دو۔ اس آیت میں یہ نہیں لکھا کہ تمہارا یہ بھی کام ہے کہ تم ان سے جنگ کرو اس سے ظاہر ہے کہ جنگ صرف جرائم پیشہ لوگوں کے لیے تھا کہ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے یا امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے اور چوری ڈاکہ میں مشغول رہتے تھے اور یہ جنگ بحیثیت بادشاہ ہونے کے تھا نہ بحیثیت رسالت۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۳۴)

۲۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

عرب کے مشرکوں کی طرح اُس ملک کے اہل کتاب بھی جرائم پیشہ ہو گئے تھے عیسائیوں نے تو کفارہ کے مسئلہ پر زور دیکر اور اُس پر بھروسہ کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم پر سب جرائم حلال ہیں اور یہودی کہتے تھے کہ ہم ارتکاب جرائم کی وجہ سے صرف چند روز دوزخ میں پڑیں گے اِس سے زیادہ نہیں جیسا کہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (الجزء ۳ سورۃ آل عمران) (ترجمہ) یہ دلیری اور جرأت اِس سے اُن کو پیدا ہوئی کہ اُن کا یہ قول ہے کہ دوزخ کی آگ اگر ہمیں چھوئے گی بھی تو صرف چند روز تک رہے گی اور جو افترا پردازیاں وہ کرتے ہیں اُنہیں پر مغرور ہو کر اُن کے یہ خیالات ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۳۲-۲۳۳)

۲۷ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

کہ اے بارِ خدایا اے مالک الملک تو جسے چاہتا ہے مُلک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے مُلک چھین لیتا ہے تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے ہر یک خیر کا جس کا انسان طالب ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے تو ہر یک چیز پر قادر ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۷ حاشیہ ۱۱)

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ یعنی خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۹۲)

۲۸۔ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے اس بات کو بڑے پُرزور الفاظ سے قرآن شریف میں بیان کیا ہے کہ دُنیا کی حالت میں قدیم سے ایک مد و جزر واقعہ ہے اور اُسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا ہے تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ یعنی اے خدا کبھی تو رات کو دن میں اور کبھی دن کو رات میں داخل کرتا ہے یعنی ضلالت کے غلبہ پر ہدائت اور ہدائت کے غلبہ پر ضلالت کو پیدا کرتا ہے اور حقیقت اس مد و جزر کی یہ ہے کہ کبھی بامر اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں ایک صورت انقباض اور محجوبیت کی پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا کی آرائشیں ان کو عزیز معلوم ہونے لگتی ہیں اور تمام ہمتیں ان کی اپنی دنیا کے درست کرنے میں اور اس کے عیش حاصل کرنے کی طرف مشغول ہو جاتی ہیں۔ یہ ظلمت کا زمانہ ہے جس کے انتہائی نقطہ کی رات لیلۃ القدر کہلاتی ہے اور وہ لیلۃ القدر ہمیشہ آتی ہے مگر کامل طور پر اُس وقت آئی تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا دن آپہنچا تھا کیونکہ اُس وقت تمام دنیا پر ایسی کامل گمراہی کی تاریکی پھیل چکی تھی جس کی مانند کبھی نہیں پھیلی تھی اور نہ آیندہ کبھی پھیلے گی جب تک قیامت نہ آوے۔ غرض جب یہ ظلمت اپنے اس انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتی ہے کہ جو اُس کے لیے مقدر ہے تو عنایت الٰہیہ تنویر عالم کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور کوئی صاحب نور دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اور جب وہ آتا ہے تو اس کی طرف مستعد روحیں کھینچی چلی آتی ہیں اور پاک فطرتیں خود بخود رو بحق ہوتی چلی جاتی ہیں اور جیسا کہ ہرگز ممکن نہیں کہ شمع کے روشن ہونے سے پروانہ اُس طرف رُخ نہ کرے ایسا ہی یہ بھی غیر ممکن ہے کہ بروقت ظہور کسی صاحب نور کے صاحب فطرت سلیمہ کا اس کی طرف بارادت متوجہ نہ ہو۔ ان آیات میں جو خدائے تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے جو بُنیاد دعویٰ ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت ایک ایسی ظلمانی حالت پر زمانہ آچکا تھا کہ جو آفتاب صداقت کے ظاہر ہونے کے متقاضی تھی۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۳۸-۵۴۰)

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۝

ان کو کہہ دے کہ اگر خدا سے پیار کرتے ہو تو آؤ میرے پیچھے ہو لو۔ اور میری راہ پر چلو تا خدا بھی تم سے پیار کرے اور تمہارے گناہ بخشے اور وہ تو بخشندہ اور رحیم ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۴)

اُن کو کہہ دو کہ اگر تم خدائے تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تا خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت رکھے اور تمہیں اپنا محبوب بنالیوے۔ اب سوچنا چاہیئے کہ جس وقت انسان ایک محبوب کی پیروی سے خود بھی محبوب بن گیا تو کیا اُس محبوب کا مثیل ہی ہو گیا یا ابھی غیر مثیل رہا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۵۸)

ان کو کہہ دے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میرے پیچھے پیچھے چلنا اختیار کرو یعنی میرے طریق پر جو اسلام کی اعلیٰ حقیقت ہے۔ قدم مارو تب خدا تعالیٰ تم سے بھی پیار کریگا اور تمہارے گناہ بخش دیگا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۵)

اے نبی ان کو کہدے کہ اگر تم خدا سے پیار کرتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تا خدا بھی تم سے پیار کرے اور تمہارے گناہ بخش دیوے (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۵)

إِنَّ كَمَالَاتِ النَّبِيِّينَ لَيْسَتْ كَكَمَالَاتِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَإِنَّ اللّٰهَ أَحَدٌ صَمَدٌ وَحِيْدٌ لَا شَرِيْكَ لَهُ فِيْ ذَاتِهٖ وَلَا فِيْ صِفَاتِهٖ وَأَمَّا الْأَنْبِيَاءُ فَلَيْسُوْا كَذَالِكَ بَلْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ وَارِثِيْنَ مِنَ الْمُتَّبِعِيْنَ الصَّادِقِيْنَ۔ فَأُمَّتُهُمْ وُرَثَاءُهُمْ يَجِدُوْنَ مَا وَجَدَ أَنْبِيَاءُهُمْ إِنْ كَانُوْا لَهُمْ مُتَّبِعِيْنَ وَإِلٰى هٰذَا أَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ فَانْظُرْ كَيْفَ جَعَلَ الْأُمَّةَ أَحِبَّاءَ اللّٰهِ بِشَرْطِ اتِّبَاعِهِمْ وَاقْتِدَاءِهِمْ بِسَيِّدِ الْمَحْبُوْبِيْنَ۔ (کرامت الصادقین صفحہ ۸۹)

(ترجمہ) نبیوں کے کمالات پروردگار عالم کے کمالات کی طرح نہیں ہوتے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا بے نیاز اور یگانہ ہے اُس کی ذات اور صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں لیکن نبی ایسے نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے سچے متبعین میں سے اُن کے وارث بناتا ہے پس اُن کی اُمت اُن کی وارث ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ پاتے ہیں جو اُن کے نبیوں کو ملا ہو بشرطیکہ وہ اُن کے پُورے پُورے مُتبع ہیں۔ اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیت قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میں اشارہ فرمایا ہے۔ پس دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے افرادِ امت کو اپنے محبوب قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ محبوبوں کے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں اور آپ کے نمونہ پر چلیں۔

خدا نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لیے دنیا میں بھیجا ہے کہ تا دنیا میں اُن کے مثیل قائم کرے اگر یہ بات نہیں تو پھر نبوت لغو ٹھہرتی ہے۔ نبی اس لیے نہیں آتے کہ اُن کی پرستش کی جائے بلکہ اس لیے آتے ہیں کہ لوگ اُن کے نمونے پر چلیں اور اُن سے تشبہ حاصل کریں اور اُن میں فنا ہو کر گویا وہی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ پس خدا جس سے محبت کریگا کونسی نعمت ہے جو اُس سے اٹھا رکھے گا اور اتباع سے مراد بھی مرتبہ فنا ہے جو مثیل کے درجے تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ سب کا مانا ہوا ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کریگا مگر وہی جو جاہل سفیہ یا ملحد بے دین ہوگا۔ (ایام الصلح ص۱۶۴)

سوال: مسیح نے اپنی نسبت یہ کلمات کہے "میرے پاس آؤ تم جو تھکے اور ماندے ہو کہ میں تمہیں آرام دونگا" اور یہ کہ "میں روشنی ہوں اور میں راہ ہوں میں زندگی اور راستی ہوں۔" کیا بانی اسلام نے یہ کلمات یا ایسے کلمات کسی جگہ اپنی طرف منسوب کیے ہیں۔

الجواب: قرآن شریف میں صاف فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ الخ یعنی ان کو کہہ دے کہ اگر خدا سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تا خُدا بھی تم سے محبت کرے اور تمہارے گناہ بخشے۔ یہ وعدہ کہ میری پیروی سے انسان خدا کا پیارا بن جاتا ہے مسیح کے گذشتہ اقوال پر غالب ہے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ انسان خدا کا پیارا ہو جائے۔ پس جس کی راہ پر چلنا انسان کو محبوب الٰہی بنا دیتا ہے اس سے زیادہ کس کا حق ہے کہ اپنے تئیں روشنی کے نام سے موسوم کرے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۴۶)

میرے نزدیک مومن وہی ہوتا ہے جو آپ کی اتباع کرتا ہے۔ اور وہی کسی مقام پر پہنچتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنالے۔ اب محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ محبوب کے فعل کے ساتھ خاص موانست ہو۔ اور مرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے آپ نے مر کر دکھا دیا پھر کون ہے جو زندہ رہے یا زندہ رہنے کی آرزو کرے یا کسی اور کے لیے تجویز کرے کہ وہ زندہ رہے۔ محبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ کی اتباع میں ایسا گم ہو کہ اپنے جذبات نفس کو تھام لے اور یہ سوچ لے کہ میں کس کی امت ہوں ایسی صورت میں جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں وہ کیونکر آپ کی محبت اور اتباع کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اس لیے کہ آپ کی نسبت وہ گوارا کرتا ہے کہ مسیح کو افضل قرار دیا جاوے اور آپؐ کو مردہ کہا جاوے مگر اس کے لیے وہ پسند کرتا ہے کہ زندہ یقین کیا جاوے۔ (الحکم ۷۔ ستمبر ۱۹۰۶ء جلد ۱۰ ۳۲ ص۳۔ لیکچر لدھیانہ)

میں نے محض خدا کے فضل سے نہ اپنے کسی ہنر سے اس نعمت سے کامل حصہ پایا ہے جو مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور خدا کے برگزیدوں کو دی گئی تھی۔ اور میرے لیے اُس نعمت کا پانا ممکن نہ تھا اگر میں اپنے سید و مولیٰ فخر الانبیاء اور خیر الوریٰ

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راہوں کی پیروی نہ کرتا۔ سو میں نے جو کچھ پایا اس پیروی سے پایا اور میں اپنے سچے اور کامل علم سے جانتا ہوں کہ کوئی انسان بجز پیروی اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ معرفت کاملہ کا حصہ پا سکتا ہے۔ اور میں اس جگہ یہ بھی بتلاتا ہوں کہ وہ کیا چیز ہے کہ سچی اور کامل پیروی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب باتوں سے پہلے دل میں پیدا ہوتی ہے سو یاد رہے کہ وہ قلب سلیم ہے یعنی دل سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور دل ایک ابدی اور لازوال لذت کا طالب ہو جاتا ہے پھر بعد اس کے ایک مصفّٰی اور کامل محبّت الٰہی بباعث اس قلب سلیم کے حاصل ہوتی ہے اور یہ سب نعمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے بطور وراثت ملتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اُن کو کہدے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تا خدا بھی تم سے محبت کرے بلکہ یکطرفہ محبت کا دعویٰ بالکل ایک جھوٹ اور لاف وگزاف ہے جب انسان سچے طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو خدا بھی اُس سے محبت کرتا ہے تب زمین پر اُس کے لیے ایک قبولیت پھیلائی جاتی ہے اور ہزاروں انسانوں کے دلوں میں ایک سچی محبت اس کی ڈال دی جاتی ہے اور ایک قوت جذب اُس کو عنایت ہوتی ہے اور ایک نور اُس کو دیا جاتا ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جب ایک انسان سچے دل سے خدا سے محبت کرتا ہے اور تمام دنیا پر اُس کو اختیار کر لیتا ہے اور غیر اللہ کی عظمت اور وجاہت اس کے دل میں باقی نہیں رہتی بلکہ سب کو ایک مرے ہوئے کیڑے سے بھی بدتر سمجھتا ہے تب خدا جو اس کے دل کو دیکھتا ہے ایک بھاری تجلی کے ساتھ اُس پر نازل ہوتا ہے اور جس طرح ایک صاف آئینہ میں جو آفتاب کے مقابل پر رکھا گیا ہے آفتاب کا عکس ایسے پورے طور پر پڑتا ہے کہ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں کہہ سکتے ہیں کہ وہی آفتاب جو آسمان پر ہے اس آئینہ میں بھی موجود ہے۔ ایسا ہی خدا ایسے دل پر اُترتا ہے اور اس کے دل کو اپنا عرش بنا لیتا ہے یہی وہ امر ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۲،۶۳)

اُن کو کہہ کہ اگر خدا سے تم محبّت کرتے ہو پس آؤ میری پیروی کرو تا خدا بھی تم سے محبت کرے اور تمہارے گناہ بخش دے اور خدا غفور و رحیم ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۷)

صوفیوں نے ترقیات کی دو راہیں لکھی ہیں۔ ایک سلوک۔ دوسرا جذب۔ سلوک وہ ہے۔ جو لوگ آپ عقلمندی سے سوچ کر اللہ و رسول کا راہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ یعنی اگر تم اللہ کے پیارے بننے چاہتے ہو تو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرو۔ وہ ہادی کامل وہی رسول ہیں جنہوں نے وہ مصائب اُٹھائی کہ دنیا اپنے اندر نظیر نہیں رکھتی۔ ایک دن بھی آرام نہ پایا۔ اب پیروی کرنے والے بھی حقیقی طور سے وہی ہوں گے۔ جو اپنے متبوع کے ہر قول و فعل کی پیروی پورے جدوجہد سے کریں۔ متبع وہی ہے جو سب طرح پیروی کریگا۔ سہل انگار اور سخت گذار کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے غضب میں آ دیگا۔ یہاں جو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کا حکم دیا۔ تو سالک کا کام یہ ہوگا کہ اول رسول اکرمؐ کی کل تاریخ

دیکھے اور پھر پیروی کرے۔ اسی کا نام سلوک ہے۔ اس راہ میں بہت مصائب و شدائد ہوتے ہیں۔ ان سب کو اٹھانے کے بعد ہی انسان سالک ہوتا ہے۔ اہل جذبہ کا درجہ سالکوں سے بڑھا ہوا ہے اللہ تعالیٰ انہیں سلوک پر ہی نہیں رکھتا بلکہ خود ان کو مصائب میں ڈالتا اور جاذبۂ ازلی سے اپنی طرف کھینچتا ہے کل انبیا مجذوب ہی تھے جس وقت انسانی روح کو مصائب کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ان سے فرسودہ کار اور تجربہ کار ہو کر روح چمک اُٹھتی ہے جیسے لوہا یا شیشہ اگرچہ چمک کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن صیقلوں کے بعد ہی مجلا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں منہ دیکھنے والے کا نظر آجاتا ہے۔ مجاہدات بھی صیقل کا ہی کام کرتے ہیں۔ دل کا صیقل یہاں تک ہونا چاہیئے کہ اس میں سے بھی منہ نظر آجاوے منہ کا نظر آنا کیا ہے تخلقوا باخلاق اللہ کا مصداق ہونا۔ سالک کا دل آئینہ ہے جس کو مصائب شدائد اس قدر صیقل کر دیتے ہیں کہ اخلاق النبی اس میں منعکس ہو جاتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب بہت مجاہدات اور تزکیوں کے بعد اس کے اندر کسی قسم کی کدورت یا کثافت نہ رہے۔ تب یہ درجہ نصیب ہوتا ہے ہر ایک مومن کو ایک حد تک ایسی صفائی کی ضرورت ہے۔ کوئی مومن بلا آئینہ ہونے کے نجات نہ پائے گا۔ سلوک والا خود یہ صیقل کرتا ہے۔ اپنے کام سے مصائب اٹھاتا ہے۔ لیکن جذبہ والا مصائب میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا خود اس کا مصقل ہوتا ہے۔ اور طرح طرح کے مصائب شدائد سے صیقل کر کے اس کو آئینہ کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔ دراصل سالک و مجذوب دونوں کا ایک ہی نتیجہ ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۳-۴۴)

اس خانہ خدا کو بتوں سے پاک وصاف کرنے کے لیے ایک جہاد کی ضرورت ہے اور اس جہاد کی راہ میں تمہیں بتاتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو گے تو ان بتوں کو توڑ ڈالو گے اور یہ راہ میں اپنی خود تراشیدہ نہیں بتاتا بلکہ خدا نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں بتاؤں اور وہ راہ کیا ہے؟ میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ یہ آواز نئی آواز نہیں ہے مکہ کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کہا تھا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اسی طرح پر اگر تم میری پیروی کرو گے تو اپنے اندر کے بتوں کو توڑ ڈالنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اور اس طرح پر سینہ کو جو طرح طرح کے بتوں سے بھرا پڑا ہے پاک کرنے کے لائق ہو جاؤ گے۔ تزکیہ نفس کے لیے چلہ کشیوں کی ضرورت نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے چلہ کشیاں نہیں کی تھیں۔ ارّہ اور نفی و اثبات وغیرہ کے ذکر نہیں کیے تھے۔ بلکہ ان کے پاس ایک اور ہی چیز تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں محو تھے جو نور آپ میں تھا وہ اس اطاعت کی نالی میں سے ہو کر صحابہ کے قلب پر گرتا تھا اور ماسوی اللہ کے خیالات کو پاش پاش کرتا جاتا تھا تاریکی کے بجائے ان سینوں میں نور بھرا جاتا تھا۔ (الحکم جلدہ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

مَیں سچ کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور خدا تعالیٰ کی رضا کو پانے والا نہیں ٹھہر سکتا اور ان انعام و برکات اور معارف اور حقائق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو اعلیٰ درجہ کے تزکیہ نفس پر ملتے ہیں جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کھویا نہ جائے اور اس کا ثبوت خود خدا تعالیٰ کے

کلام سے ملتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ اور خدا تعالیٰ کے اس دعویٰ کی عملی اور زندہ دلیل میں ہوں۔ (الحکم جلد ۵ ۳۴ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱-۲)

ان کو کہہ دو کہ تم اگر چاہتے ہو کہ محبوب الٰہی بن جاؤ اور تمہارے گناہ بخش دئیے جاویں تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔

کیا مطلب کہ میری پیروی ایک ایسی شئی ہے جو رحمت الٰہی سے نا امید ہونے نہیں دیتی گناہوں کی مغفرت کا باعث ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ اور تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اسی صورت میں سچا اور صحیح ثابت ہوگا کہ تم میری پیروی کرو۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی خود تراشیدہ طرز ریاضت و مشقت اور جپ تپ سے اللہ تعالیٰ کا محبوب اور قرب الٰہی کا حقدار نہیں بن سکتا انوار و برکات الٰہیہ کسی پر نازل نہیں ہوسکتیں جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کھویا نہ جاوے۔

اور جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گم ہو جاوے اور آپ کی اطاعت اور پیروی میں ہر قسم کی موت اپنی جان پر وارد کر لے اس کو وہ نور ایمان۔ محبت اور عشق دیا جاتا ہے جو غیر اللہ سے رہائی دلا دیتا ہے۔ اور گناہوں سے رستگاری اور نجات کا موجب ہوتا ہے۔ اسی دنیا میں وہ ایک پاک زندگی پاتا ہے۔ اور نفسانی جوش و جذبات کی تنگ و تاریک قبروں سے نکال دیا جاتا ہے اسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے اَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِيْ یعنی میں وہ مردوں کو اٹھانے والا ہوں جس کے قدموں پر لوگ اٹھائے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

سعادت عظمیٰ کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ رکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاوے جیسا کہ اس آیت میں صاف فرما دیا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی آؤ میری پیروی کرو تاکہ اللہ بھی تم کو دوست رکھے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ رسمی طور پر عبادت کرو۔ اگر حقیقت مذہب یہی ہے تو پھر نماز کیا چیز ہے اور روزہ کیا چیز ہے خود ہی ایک بات سے رُکے اور خود ہی کرلے۔ اسلام محض اس کا نام نہیں ہے۔ اسلام تو یہ ہے کہ بکرے کی طرح سر رکھ دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا مرنا میرا جینا میری نماز میری قربانیاں اللہ ہی کے لیے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنی گردن رکھتا ہوں۔ (الحکم جلد ۵ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

خداوند تعالیٰ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے نمونے پر چلیں اور آپ کے ہر قول اور فعل کی پیروی کریں، چنانچہ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[۱] ۔ پھر فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال عیب سے خالی نہ تھے تو کیوں ہم پر واجب کیا کہ ہم آپ کے نمونے

---

[۱] الاحزاب آیت ۲۲۔

پر چلیں جب خدا نے ابراہیم علیہ السلام کے نمونے پر چلنے کی تاکید فرمائی تو ساتھ ایک استثنا لگا دیا[1] مگر آنحضرتؐ کی صورت میں کوئی استثنا نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال غلطی سے پاک تھے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ عـ۶ بابت جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۴۵-۲۴۶)

اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو۔

(الحکم جلد ۵ ۳۹ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء صـ۲)

روحانیت کے نشوونما اور زندگی کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ خدا تعالیٰ نے رکھا ہے اور وہ اتباع رسول ہے...... قرآن شریف اگر کچھ بتاتا ہے تو یہ کہ خدا سے یوں محبت کرو۔ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ[2] کے مصداق ہو اور فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[3] پر عمل کرو اور ایسی فناء اتم تم پر آجاوے کہ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا[4] کے رنگ سے تم رنگین ہو جاؤ۔ اور خدا تعالیٰ کو سب چیزوں پر مقدم کرلو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۰ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء صـ۲)

جس طرح پر آفتاب سے ساری دنیا فایدہ اُٹھاتی ہے اور اُس کا فائدہ کسی خاص حد تک جا کر بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات کا آفتاب ہمیشہ چمکتا ہے اور سعادت مندوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی ان کو کہہ دو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریگا۔ آپ کی سچی اطاعت اور اتباع انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس جبکہ آپ کی اتباع کامل اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک محبوب اپنے محب سے کلام نہ کرے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صـ۱)

اللہ تعالیٰ کی محبت کامل طور پر انسان اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا جب تک نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّم کے اخلاق اور طرزِ عمل کو اپنا رہبر اور ہادی نہ بنالے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت فرمایا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی محبوب الٰہی بننے کے لیے ضروری ہے کہ رُسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّم کی اتباع کی جاوے۔ سچی اتباع آپ کے اخلاق فاضلہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۸)

نجات اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خدا کے فضل سے ہوا کرتی ہے اُس فضل کے حصول کے لیے خدا تعالیٰ نے جو اپنا قانون ٹھہرایا ہوا ہے وہ اسے کبھی باطل نہیں کرتا وہ قانون یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ[5]۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صـ۳۱)

خدا کے محبوب بننے کے واسطے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی ایک راہ ہے اور کوئی دوسری راہ نہیں کہ تم کو خدا سے ملا دے...... میں پھر کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی راہ کے سوا اور کسی طرح انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء صـ۸)

[1] دیکھو آیت قد كانت لكم اسوة حسنة فی ابراهیم...... الا قول ابراهیم لابیه لاستغفرن لك (الممتحنة) [3] آل عمران آیت ۳۲

[2] البقرۃ آیت ۱۶۶ - [4] المزمل آیت ۹ -

ہر ایک شخص کو خود بخود خدا سے ملاقات کرنے کی طاقت نہیں ہے اس کے واسطے واسطہ کی ضرورت ہے اور وہ واسطہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس واسطے جو آپ کو چھوڑتا ہے وہ کبھی بامراد نہ ہوگا انسان تو دراصل بندہ یعنی غلام ہے غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ مالک جو حکم کرے اسے قبول کرے اسی طرح اگر تم چاہتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض حاصل کرو۔ تو ضرور ہے کہ اس کے غلام ہو جاؤ قرآن کریم میں خدا فرماتا ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اس جگہ بندوں سے مراد غلام ہی ہیں۔ نہ کہ مخلوق۔ رسول کریم کے بندہ ہونے کے واسطے ضروری ہے کہ آپ پر درود پڑھو اور آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرو۔ سب حکموں پر کاربند رہو جیسے کہ حکم ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اگر تم خدا سے پیار کرنا چاہتے ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے فرماں بردار بن جاؤ اور رسول کریم کی راہ میں فنا ہو جاؤ تب خدا تم سے محبت کریگا۔ (البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

جو جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے کلام بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح خدا جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے بلا مکالمہ نہیں رہتا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع سے جب انسان کو خدا پیار کرنے لگتا ہے تو اس سے کلام کرتا ہے غیب کی خبریں اُس پر ظاہر کرتا ہے اسی کا نام نبوت ہے۔ (البدر جلد ۲ ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کے خوش کرنے کا ایک یہی طریق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی فرمانبرداری کی جاوے۔ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ طرح طرح کی رسومات میں گرفتار ہیں۔ کوئی مرجاتا ہے تو قسم قسم کی بدعات اور رسومات کی جاتی ہیں حالانکہ چاہیے کہ مردہ کے حق میں دعا کریں۔ رسومات کی بجا آوری میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صرف مخالفت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی ہتک بھی کی جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح سے کہ گویا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو کافی نہیں سمجھا جاتا اگر کافی خیال کرتے تو اپنی طرف سے رسومات کے گھڑنے کی کیوں ضرورت پڑتی۔ (البدر جلد ۲ ۱۹ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۵)

یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء و رسل اور آئمہ کے آنے سے کیا غرض ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں اس لیے نہیں آتے کہ ان کو اپنی پوجا کرانی ہوتی ہے وہ تو ایک خدا کی عبادت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی مطلب کے لیے آتے ہیں۔ اور اس واسطے کہ لوگ اُن کے کامل نمونہ پر عمل کریں اور اُن جیسے بننے کی کوشش کریں۔ اور ایسی اتباع کریں کہ گویا وہی ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ بعض لوگ ان کے آنے کے اصل مقصد کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان کو خدا سمجھ لیتے ہیں اس سے وہ آئمہ اور رسل خوش نہیں ہو سکتے کہ لوگ ان کی اس قدر عزت کرتے ہیں کبھی نہیں وہ اس کو کوئی خوشی کا باعث قرار نہیں دیتے ان کی اصل خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ لوگ اُن کی اتباع کریں اور جو تعلیم وہ پیش کرتے ہیں کہ سچے خدا کی عبادت کرو اور توحید پر قائم ہو جاؤ اس پر قائم ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ہوا۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اے رسول ان کو کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے پیار کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس اتباع کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے پیار کرے گا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بننے کا طریق یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع کی جاوے پس اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیا علیہم السلام اور ایسا ہی اور جو خدا تعالیٰ کے راست باز اور صادق بندے ہوتے ہیں وہ دنیا میں ایک نمونہ ہو کر آتے ہیں جو شخص اس نمونہ کے موافق چلنے کی کوشش نہیں کرتا لیکن اُن کو سجدہ کرنے اور حاجت روا ماننے کو تیار ہو جاتا ہے وہ کبھی خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل قدر نہیں ہے۔ بلکہ وہ دیکھ لیگا کہ مرنے کے بعد وہ امام اُس سے بیزار ہوگا۔ (الحکم جلد ۸ ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء ص ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مقام تو یہ تھا کہ آپ محبوب الٰہی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو بھی اس مقام پر پہنچنے کی راہ بتائی جیسا کہ فرمایا قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ یعنی ان کو کہہ دو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ محبوب الٰہی بن جاؤ تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنالے گا۔ اب غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع محبوب الٰہی تو بنا دیتی ہے۔ پھر اور کیا چاہیئے۔ (الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱)

اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اس اتباع کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دیگا۔ پس اب اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ جب تک انسان کامل متبع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ سے فیوض و برکات پا نہیں سکتا اور وہ معرفت اور بصیرت جو اس کی گناہ آلود زندگی اور نفسانی جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کر دے عطا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ ہیں جو علماء اُمتی کے مفہوم کے اندر داخل ہیں۔

(الحکم جلد ۹ ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء ص ۳)

اے رسول تو ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتّباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنالے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع انسان کو محبوب الٰہی کے مقام تک پہنچا دیتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کامل موحد کا نمونہ تھے۔ (الحکم جلد ۹ ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء ص ۷)

یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے اور یہ آپؐ کی حیات کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح پر آپ کے برکات و فیوض کا سلسلہ لاانتہا اور غیر منقطع ہے۔ اور ہر زمانہ میں گویا امت آپ کا ہی فیض پاتی ہے اور آپ ہی سے تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محب بنتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ پس خدا تعالیٰ کا پیار ظاہر ہے کہ اس امت کو کسی صدی میں خالی نہیں چھوڑتا اور یہی ایک امر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر روشن دلیل ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء ص ۳)

مسلمانوں میں اندرونی تفرقہ کا موجب بھی یہی حُبِ دنیا ہی ہوتی ہے کیونکہ اگر محض اللہ تعالیٰ کی رضا مقدم ہوتی تو آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا کہ فلاں فرقے کے اصول زیادہ صاف ہیں اور وہ انہیں قبول کر کے ایک ہو جاتے۔

اب جبکہ حبِّ دنیا کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہو رہی ہے تو ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کا قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر نہیں اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی کہو اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا۔ اب اس حب اللہ کی بجائے اور اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حب الدنیا کو مقدم کیا گیا ہے کیا یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا دار تھے؟ کیا وہ سود لیا کرتے تھے یا فرائض اور احکام الٰہی کی بجا آوری میں غفلت کیا کرتے تھے کیا آپ میں (معاذ اللہ) نفاق تھا۔ مداہنہ تھا دنیا کو دین پر مقدم کرتے تھے؟ غور کرو۔ اتباع تو یہ ہے کہ آپؐ کے نقش قدم پہ چلو اور پھر دیکھو کہ خدا تعالیٰ کیسے کیسے فضل کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

جو شخص یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر نجات ہو سکتی ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو بات ہم کو سمجھائی ہے وہ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگر تم خدا سے پیار کرتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ بغیر متابعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شخص نجات نہیں پا سکتا۔ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض رکھتے ہیں ان کی کبھی خیر نہیں۔ (بدر جلد ۲ ۲۳ مورخہ ۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پا جانا تھا اس لیے ظاہری طور پر ایک نمونہ اور خدا نمائی کا آلہ دنیا سے اٹھنا تھا اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک آسان راہ رکھ دی کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ کیونکہ محبوب اللہ مستقیم ہی ہوتا ہے۔ زیغ رکھنے والا کبھی محبوب نہیں بن سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی ازدیاد اور تجدید کے لیے ہر نماز میں درود شریف کا پڑھنا ضروری ہو گیا۔ تاکہ اس دعا کی قبولیت کے لیے استقامت کا ایک ذریعہ ہاتھ آئے۔

(حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط صفحہ ۲۱ مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ)

قبولیت دعا کے تین ہی ذریعے ہیں۔ اوّل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ دوم یٰایھا الذین آمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیماً۔ تیسرا موہبت الٰہی۔ (حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط صفحہ ۲۲ ایضاً)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو خدا تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے بغیر اس کے یہ مقام مل ہی نہیں سکتا۔ (الحکم جلد ۱۱ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۵)

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک طبقہ کے انسان کو مخاطب کیا ہے۔ کہ ہر ایک قسم کا سبق مجھ سے لو۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جب تک ایک اسوہ سامنے نہ ہو۔ انسان عمل درآمد سے قاصر رہتا ہے۔ ہر ایک قسم کے کمال کے حصول کے لیے نمونہ کی ضرورت ہے۔ انسانی طبایع اسی قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ کہ وہ صرف قول سے

لہ۔ الاحزاب آیت ۵۷۔

مؤثر نہیں ہوتیں جب تک اس کے ساتھ فعل نہ ہو۔ اگر صرف قول ہو۔ تو صدہا اعتراض لوگ کرتے ہیں۔ دین کی باتوں کو سن کر کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ سب باتیں کہنے کی ہیں۔ کون اُن کو بجا لا سکتا ہے۔ یونہی بنا چھوڑی ہیں۔ اوران اعتراضوں کا رد نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایک انسان عمل کر کے دکھانے والا نہ ہو۔ (البدر جلد ۳ ۳۱ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صہ ۴)

خدا کی ذات میں بخل نہیں۔ اور نہ انبیاء اس لیے آتے ہیں کہ اُن کی پوجا کی جاوے۔ بلکہ اس لیے کہ لوگوں کو تعلیم دیں کہ ہماری راہ اختیار کرنے والے ہمارے ظل کے نیچے آجاویں گے۔ جیسے فرمایا۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ یعنی میری پیروی میں تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر محبوب ہونے کی بدولت یہ سب اکرام ہوئے مگر جب کوئی اور شخص محبوب بنے گا۔ تو اُس کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اگر اسلام ایسا مذہب ہے۔ تو سخت بیزاری ہے ایسے اسلام سے۔ مگر ہرگز اسلام ایسا مذہب نہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہ مائدہ لائے ہیں کہ جو چاہے اُس کو حاصل کرے۔ وہ نہ تو دنیا کی دولت لائے اور نہ مہاجن بن کر آئے تھے۔ وہ تو خدا کی دولت لائے تھے اور خود اُس کے قاسم تھے پس اگر وہ مال دینا نہیں تھا تو کیا وہ گٹھڑی واپس لے گئے۔

(الحکم جلد ۸ ۳۸ و ۳۹ مورخہ ۱۰ و ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صہ ۲)

کل انبیاء، اولیاء، اتقیا۔ اور صالحین کا ایک یہ مجموعی مسئلہ ہے کہ پاک کرنا خدا کا کام ہے اور خدا کے اس فضل کے جذب کے واسطے اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازبس ضروری اور لازمی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ سورج دنیا میں موجود ہے مگر چشم بینا بھی تو چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کا قانون قدرت لغو اور بے فایدہ نہیں ہے۔ جو ذرائع کسی امر کے حصول کے خدا نے بنائے ہیں آخر اُنہیں کی پابندی سے وہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کان سُننے کے واسطے خدا نے بنائے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے۔ آنکھ جو دیکھنے کے واسطے بنائی گئی ہے وہ سننے کا کام نہیں کر سکتی۔ پس اسی طرح خدا کے فضل کے فیضان کے حصول کی جو راہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اس سے باہر رہ کر کیسے کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔

حقیقی پاکیزگی اور طہارت ملتی ہے اتباع نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیونکہ خود خدا نے فرما دیا کہ اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو رسولؐ کی پیروی کرو۔ پس وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمیں کسی نبی یا رسول کی کیا ضرورت ہے وہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ ۳۲ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۸ء صہ ۴)

جبکہ خدا تعالیٰ کی محبّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے اور آنجناب کے عملی نمونوں کے دریافت کے لیے جن پر اتباع موقوف ہے حدیث بھی ایک ذریعہ ہے پس جو شخص حدیث کو چھوڑتا ہے وہ طریق اتباع کو بھی چھوڑتا ہے۔ (ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صہ ۲)

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

الْكٰفِرِيْنَ۝

ان کو کہہ کہ خدا اور رسول کی اطاعت کرو پس اگر وہ اطاعت سے منہ پھیر لیں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ان آیات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور خدا تعالیٰ کا پیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے وابستہ ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہ کافر ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۷)

ہر ایک دل اس بات کو محسوس کر سکتا ہے۔ کہ ایک حج کے ارادہ کرنے والے کے لیے اگر یہ بات پیش آجائے۔ کہ وہ اُس مسیح موعود کو دیکھ لے جس کا تیرہ سو برس سے اہل اسلام میں انتظار ہے۔ تو بموجب نص صریح قرآن اور احادیث کے وہ بغیر اس کی اجازت کے حج کو نہیں جا سکتا ہاں با جازت اس کے دوسرے وقت میں جا سکتا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۷)

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَابِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۝

میں نے ایک مولوی صاحب کی ایک تازہ تصنیف پڑھی ہے۔ جس میں لکھا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ اور اس کی ماں مریم کے سوائے مس شیطان سے دنیا میں کسی کی پیدائش پاک نہیں۔ صرف یہی دو نفس مریم اور ابن مریم مس شیطان سے پاک ہیں اور بس۔ اس عبارت کو پڑھ کر مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔ کہ ہمیں تو یہ لوگ کافر کہتے ہیں۔ اور اپنا یہ حال ہے کہ تمام انبیاء اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پاکوں کے سردار ہیں۔ نعوذ باللہ مس شیطان سے محفوظ نہیں سمجھتے۔ گویا ان کے نزدیک نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش میں شیطان کا حصہ تھا۔ مگر حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں کی پیدائش میں شیطان کا حصہ نہ تھا۔ بار بار افسوس آتا ہے۔ کہ ان لوگوں کی حالت کہاں تک پہنچ گئی ہے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یہ لوگ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں ہے اور نہیں سوچتے کہ سب سے مقدم تو قرآن شریف ہے۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو کہا کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ[1] میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں۔ کیا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے نزدیک عباد میں شامل نہ تھے۔ اول تو جو حدیث قرآن شریف کے مخالف ہو وہ حدیث ہی نہیں۔ خواہ بخاری میں ہو اور خواہ مسلم میں ہو۔ دوسرا جس حدیث سے حضرت

[1] الحجر آیت ۴۳ اور بنی اسرائیل آیت ۶۶۔

نبی کریم محمد مصطفےٰ حبیب خدا محبوب الٰہی کی تمام نبیوں کے سردار کی اس قدر ہتک اور توہین لازم آتی ہو۔ کیونکر ایک مسلمان کی غیرت مان سکتی ہے کہ اسے صحیح حدیث تسلیم کرلے ان لوگوں میں کچھ شرم اور حیا باقی نہیں رہی۔ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایسے ناجائز حملے کرتے ہیں۔

اگر ان لوگوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کچھ محبت ہوتی۔ تو یہ لوگ اس حدیث کے یہ معنے نہ کرتے۔ ہر ایک کلام کے واسطے ایک شانِ نزول ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ مریم کے واسطے ضرورتاً اس قسم کے لفظ بولے گئے ہیں کہ مریم صدیقہ تھی اور حضرت عیسیٰ کا روح خدا کی طرف سے تھا۔ ایسا ہی حدیث میں ضرورتاً یہ کلمات بولے گئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش مس شیطان سے پاک تھی اور یہ ضرورت اس طرح سے واقعہ ہوئی تھی۔ کہ یہودی لوگ کہا کرتے تھے بلکہ اب تک کہتے ہیں کہ حضرت مریم نعوذ باللہ زانیہ تھیں اور یسوع کی پیدائش ناجائز تھی اور مس شیطان سے تھی۔ اس الزام کے جواب میں خدا تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حدیث شریف میں یہ بات فرمائی۔ کہ یہ الزام جھوٹے ہیں۔ بلکہ مریم صدیقہ تھی اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش مس شیطان سے پاک تھی۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی والدہ ماجدہ کے متعلق کبھی کسی کافر کو ایسا وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا بلکہ سب کے نزدیک آپ اپنی ولادت کی رُو سے طیب اور طاہر تھے اور آپ کی والدہ عفیفہ اور پاکدامن تھی اس لیے آپ کی نسبت یا آپ کی والدہ ماجدہ کی نسبت ایسے الفاظ بیان کرنے ضروری نہ تھے کہ وہ مس شیطان سے پاک ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ماجدہ کی نسبت یہودیوں کے بہتان کی وجہ سے ایسے بَری کرنے والے الفاظ کی ضرورت پڑی یہی حال دیگر انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ ان کے متعلق بھی نہ کبھی ایسا اعتراض ہُوا اور نہ اس کے دفعیہ کی ضرورت کبھی محسوس ہوئی۔ افسوس ہے۔ کہ ان علماء کو یہ خبر بھی نہیں کہ یہ (باتیں) کیوں قرآن و حدیث میں ذکر کی گئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ایسی باتیں کسی بہتان کے دفع کرنے کے لیے آتی ہیں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ کہ مریم صدیقہ پر ایک بڑا بہتان باندھا گیا تھا۔ اسی واسطے خدا تعالےٰ نے اس کا نام صدیقہ رکھ دیا۔ افسوس ہے نہ تو ان لوگوں کے اکابر سمجھتے ہیں اور نہ ان کا اقتداء کرنے والوں کو کچھ خیال آتا ہے کہ ایسے عقیدہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر داغ لگایا جاتا ہے اگر قرآن شریف میں خدا کے بندوں کا مس شیطان سے پاک ہونے کا ذکر بھی نہ ہوتا۔ تب بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت اور آپ پر ایمان کا یہ تقاضا ہونا چاہیئے تھا کہ ایسا ناپاک عقیدہ آپ کے متعلق نہ رکھا جاتا۔

حضرت مریم کے متعلق یہ دعا تھی کہ اِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ مگر یہ دعا بھی اسی اعتراض کے رفع کرنے کے واسطے ذکر کی گئی ہے۔ ورنہ خدا کے انبیاء اور اولیا کے متعلق تو پہلے سے اللہ تعالیٰ کا خاص ارادہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو مُقدس رسول بنایا جاوے گا وہی ارادۂ الٰہی ابتداء سے ان کی پیدائش اور تمام اُمور کو مقدس رکھتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو مادر زاد پاک ہوتے ہیں اور شیطان سے دور رکھے جاتے ہیں۔ دنیا میں پیدائش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک رحمانی اور دوسری شیطانی۔ خدا تعالیٰ کے تمام نیک بندوں کی پیدائش رحمانی ہوتی ہے۔ شیطان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور انہیں کے

متعلق کہا جاتا ہے) کہ رُوحٌ مِّنۡهُ ان کا رُوح خدا کی طرف سے ہوتا ہے اس میں حضرت عیسٰی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے خدا تعالیٰ کے تمام نیک بندوں کی رُوح خدا کی طرف سے آتی ہے۔

زمخشری نے بخاری کے حاشیہ میں اس حدیث کے یہی معنے کیے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ یہ علماء زمخشری کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مگر ہمارے خیال میں وہ ان علماء سے بہتر اور افضل تھا۔ گو معتزلی تھا مگر اس کے ایمان نے گوارا نہ کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت پر داغ لگا دے بلکہ اس کے دل میں اسلامی غیرت اور محبت نے جوش مارا۔ اصل میں ان لوگوں میں تزکیہ نفس نہیں ہے جب انسان تزکیہ نفس اختیار کرتا ہے۔ تو قرآن شریف کے معانی اور معارف اُس پر کھولے جاتے ہیں۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

حضرت مسیح اور ان کی ماں مریم پر یہود کا اعتراض تھا۔ مسیح کو وہ لوگ ناجائز ولادت کا الزام لگاتے اور مریم کو زانیہ کہتے تھے۔ قرآن شریف کا کام ہے کہ انبیاء پر سے اعتراضات کو رفع کرے اس لیے اس نے مریم کے حق میں زانیہ کی بجائے صدیقہ کا لفظ رکھا اور مسیح کو مس شیطان سے پاک کہا اگر ایک محلہ میں صرف ایک عورت کا تبریہ کیا جاوے اور اس کی نسبت کہا جاوے کہ وہ بدکار نہیں ہے تو اس سے یہ التزام لازم نہیں آتا کہ باقی کی سب ضرور بدکار ہیں صرف یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس پر جو الزام ہے وہ غلط ہے یا اگر ایک آدمی کو کہا جاوے کہ وہ بھلا مانس ہے تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی کے سب لوگ بھلے مانس نہیں بلکہ بدکار ہیں اسی طرح یہ ایک مقدمہ تھا کہ مسیح اور اس کی ماں پر الزام لگائے گئے تھے خدا نے شہادت دی کہ وہ الزاموں سے بری اور پاک ہیں۔ کیا عدالت اگر ایک ملزم کو قتل کے مقدمہ میں بری کر دے تو اس سے یہ لازم آویگا کہ باقی کے سب لوگ اس شہر کے ضرور قاتل اور خونخوار ہیں غرضیکہ اس قسم کی بدعات اور فساد پھیلے ہوئے تھے جن کے دور کرنے کے لیے خدا نے ہمیں مبعوث کیا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

تمام انبیاء اور صلحا مس شیطان سے پاک ہوتے ہیں حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اُن کی صراحت اس واسطے کی ہے کہ اُن پر ایسے ایسے اعتراض ہوئے اور کسی نبی پر چونکہ نہیں ہوئے۔ اس لیے اُن کے لیے صراحت کی ضرورت بھی نہ پڑی دوسرے نبیوں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ ہوتے تو یہ بھی ایک قسم کی توہین ہے۔ کیونکہ اگر ایک مسلم و مقبول نیک آدمی کی نسبت کہا جاوے کہ وہ تو زانی نہیں یہ اُس کی ایک رنگ میں ہتک ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو خود اہل مکہ تسلیم کر چکے ہوئے تھے کہ وہ مس شیطان سے پاک ہے تب ہی تو آپ کا نام اُنہوں نے امین رکھا ہوا تھا اور آپ نے اُن پر تحدی کیا کہ قَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ آپ کی نسبت بھی کہا جاتا۔ یہ الفاظ حضرت مسیح کی عزت کو بڑھانے والے نہیں ہیں اُن کی برأت کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کلنک کا بھی پتہ دیدیتے ہیں کہ اُن پر الزام تھا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اصل میں یہ مسئلہ اس طرح سے ہے۔ کہ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ پیدائش دو قسم کی ہوتی ہے ایک مس رُوح القدس

سے اور ایک مس شیطان سے تمام نیک اور راست باز لوگوں کی اولاد مس روح القدس سے ہوتی ہے اور جو اولاد بدی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ مس شیطان سے ہوتی ہے تمام انبیاء مس روح القدس سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر چونکہ حضرت عیسٰی کے متعلق یہودیوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ نعوذ باللہ ولد الزنا ہیں اور مریم کا ایک اور سپاہی پنڈارا نام کے ساتھ تعلق ناجائز کا ذریعہ ہیں اور مس شیطان کا نتیجہ ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ سے یہ الزام دور کرنے کے واسطے انکے متعلق یہ شہادت دی تھی۔ کہ ان کی پیدائش بھی مس روح القدس سے تھی چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کے متعلق کوئی اس قسم کا اعتراض نہ تھا۔ اس واسطے ان کے متعلق ایسی بات بیان کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین عبد اللہ اور آمنہ کو تو پہلے ہی سے ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ان کے متعلق ایسا خیال و گمان بھی کبھی کسی کو نہ ہوا تھا۔ ایک شخص جو مقدمہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تو اس کے واسطے صفائی کی شہادت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن جو شخص مقدمہ میں گرفتار ہی نہیں ہوا۔ اس کے واسطے صفائی شہادت کی کچھ ضرورت ہی نہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

ہمارا ایمان یہ ہے کہ کسی نبی کو کبھی مس شیطان نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے راست باز اور صادق بندوں میں سے بھی کسی کو مس شیطان نہیں ہوتا۔ مطلب اس سے اور تھا اور انہوں نے کچھ اور سمجھ لیا۔ اگر صرف یہ اعتقاد رکھا جاوے کہ مسیح ہی مس شیطان سے پاک تھے اور کوئی پاک نہ تھے تو یہ تو کلمہ کفر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودی مریم علیہا السلام کو معاذ اللہ زانیہ اور حضرت مسیح کو نعوذ باللہ ولد الزنا کہتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کے اس الزام سے بریت کی اور مریم کا نام صدیقہ رکھا۔ اور حضرت مسیح کے لیے کہا کہ وہ مس شیطان سے پاک ہے۔ اولاد دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو مس شیطان سے ہو۔ وہ ولد الحرام کہلاتی ہے دوسری وہ جو روح القدس کے مس سے ہو وہ ولد الحلال ہوتی ہے۔ یہودیوں کا اس پر زور تھا کہ وہ مسیح پر ناجائز پیدائش کا الزام لگاتے تھے او ن کے ہاں یہ لکھا تھا کہ ولد الحرام سات پشت تک بھی خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ان کے اس شبہ اور الزام کا جواب ضروری تھا اس لیے ان کے متعلق یہ کہا گیا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاذ اللہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مس شیطان سے پاک نہ تھے ایسا اعتقاد کفر صریح ہے کیا کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آمنہ کی نسبت ایسا الزام لگایا؟ کبھی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ مخالفوں نے امین اور صادق تسلیم کیا۔

برخلاف اس کے مسیح اور ان کی والدہ کی نسبت یہودیوں کے بیہودہ الزام تھے ہی خود عیسائیوں نے سائیکلوپیڈیا میں مان لیا ہے کہ نعوذ باللہ وہ ولد الحرام تھے۔ پھر ایسی صورت میں کسقدر ضروری تھا کہ اس کا ازالہ ہوتا۔ اب یہ ہمارے مخالف اندھے ہو کر ان کی خصوصیت بتاتے ہیں اور منبروں پر چڑھ کر بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ تو حضرت مسیح کا ایک داغ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دھویا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مثلاً اگر

ایک شخص کے چہرہ پر سیاہی کا داغ ہو اور اسے صاف کر دیا جاوے تو یہ کیسی حماقت ہو کہ ایک شخص جس کے چہرہ پر وہ داغ ہی نہیں بلکہ خوبصورت اور روشن چہرہ رکھتا ہو اس سے اس سیاہی کے داغ والے کو افضل کہا جاوے صرف اس لیے کہ اس کا داغ صاف ہوا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

مسیح کی راست بازی اپنے زمانہ میں دوسرے راست بازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی بلکہ یحیٰی نبی کو اس پر ایک فضیلت ہے کیونکہ وہ شراب نہیں پیتا تھا اور کبھی نہیں سنا گیا کہ کسی فاحشہ عورت نے آکر اپنی کمائی کے مال سے اس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور اپنے سر کے بالوں سے اس کے بدن کو چھوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اس کی خدمت کرتی تھی اسی وجہ سے خدا نے قرآن میں یحیٰی کا نام حصور رکھا مگر مسیح کا یہ نام نہ رکھا کیونکہ ایسے قصے اس نام کے رکھنے سے مانع تھے۔

(دافع البلاء ومعیار اہل الاصطفاء صفحہ ۴ آخری ٹائیٹل حاشیہ)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

(سوال پیش ہوا) کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بابت جو آیا ہے کہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا کیا اس سے یہ مراد ہے کہ وہ کلام نہ کریں گے۔

فرمایا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے لَا تَسْتَطِیْعُ نہیں کہا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖۗ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ

الْمُقَرَّبِيْنَ○

(اِسْمُہُ الْمَسِیْحُ) یہ لفظ مسیح ہے جس کے معنے خلیفہ کے ہیں عربی اور عبرانی میں حدیثوں میں مسیح لکھا ہے اور قرآن شریف میں خلیفہ لکھا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

قولہ۔ مسیح کے دوبارہ آنے پر ایک یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ اور حضرت مسیح نے اُس زمانہ میں جبکہ وہ یہودیوں کے لیے مبعوث ہوئے عزت نہیں پائی اس لیے ماننا پڑا کہ پھر وہ آویں گے تب دنیا کی وجاہت اُن کو نصیب ہوگی۔

اقول۔ یہ خیال بالکل بیہودہ ہے۔ قرآن شریف میں یہ لفظ نہیں کہ وَجِيْهًا عِنْدَ اَهْلِ الدُّنْيَا۔ دنیاداروں اور دنیا کے کتّوں کی نظر میں تو کوئی نبی بھی اپنے زمانے میں وجیہ نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے کسی نبی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ قبول کرنے والے اکثر ضعفا اور غربا ہوئے ہیں جو دنیا سے بہت کم حصہ رکھتے تھے سو آیت کے یہ معنے نہیں کہ پہلے زمانے میں عیسیٰ کو دنیا کے رئیسوں اور امیروں اور کُرسی نشینوں نے قبول نہ کیا لیکن دوسری مرتبہ قبول کریں گے۔ بلکہ قرآن کے عام محاورہ کے رو سے آیت کے یہ معنے ہیں کہ دنیا میں بھی راستبازوں میں مسیح کی عزت ہوئی اور وجاہت مانی گئی جیسا کہ یحییٰ نبی نے ان کو مع اپنی تمام جماعت کے قبول کیا اور اُن کی تصدیق کی اور بہتوں نے تصدیق کی اور قیامت میں بھی وجاہت ظاہر ہوگی۔ پھر میں کہتا ہوں کہ کیا اب تک حضرت عیسیٰ کو دنیا کی وجاہت نصیب نہ ہوئی حالانکہ چالیس کروڑ انسان اُن کو خدا کر کے مانتا ہے۔ کیا وجاہت کے لیے زندہ موجود ہونا بھی ضروری ہے اور مرنے کے بعد وجاہت جاتی رہتی ہے۔ ماسوا اس کے مسیح علیہ السلام کا دنیا میں دوبارہ آنا کسی طرح موجب وجاہت نہیں بلکہ آپ لوگوں کے عقیدے کے موافق اپنی حالت اور مرتبہ سے متنزل ہو کر آئیں گے امتی بن کے امام مہدی کی بیعت کریں گے مقتدی بن کر اُن کے پیچھے نماز پڑھیں گے پس یہ کیا وجاہت ہوئی بلکہ یہ تو قضیہ معکوسہ اور نبی اولوالعزم کی ایک ہتک ہے۔ اور یہ کہنا کہ ان سب باتوں کو وہ اپنا فخر سمجھیں گے بالکل بے ہودہ خیال ہے۔ لیکن اگر آسمان سے نازل نہ ہوں تو یہ ان کی وجاہت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ[1] غرض واپس آنے میں کوئی وجاہت نہیں بلکہ بقول شیخ سعدی سخت است پس از جاہ تحکّم بُردن دوسرے کے حکم کے نیچے اسلام کی خدمت کریں گے۔ اور مجدّد صاحب اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ "علماء اسلام اُن کے منکر ہو جائیں گے اور قریب ہے کہ اُن پر حملہ کریں" دیکھو یہ خوب وجاہت ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ مُلّا مقابلہ کے لیے اٹھیں گے اور آثار سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حجج الکرامہ میں ہے کہ اُن کی تکفیر بھی ہوگی کیونکہ مہدی اور اس کی جماعت پر کفر کا فتویٰ لکھا جائے گا اور علماء امت اس کو کافر اور کذاب اور دجّال کہیں گے۔ پس جبکہ مہدی موعود مع اپنی جماعت کے کافر اور دجّال ٹھہرائے

---

[1] القمر آیت ۵۶

جائیں گے تو اس سے یقینی طور پر معلوم ہوا کہ مسیح موعود پر بھی کفر کا فتویٰ لگے گا کیونکہ وہ مہدی اور اُس کی جماعت سے الگ نہیں ہوں گے۔ اب دیکھو کہ آثار صحیحہ سے ثابت ہو گیا کہ مسیح موعود کو نالائق بدبخت پلید طبع مولوی کافر ٹھہرائیں گے اور دجّال کہیں گے اور کفر کا فتویٰ ان کی نسبت لکھا جائے گا۔ اب انصافاً سوچو کہ کیا یہی وجاہت ہے جس کے لیے مسیح کو دوبارہ دنیا میں آنا ضروری ہے؟ کیا ناچیز اور ذلیل ملّاؤں سے گالیاں کھانا اور کافر اور دجّال کہلانا یہی وجاہت ہے؟ آثار صحیحہ سے ثابت ہے کہ مسیح موعود کی جس قدر پلید ملّاؤں کے ہاتھ سے بے عزتی ہو گی اور جس قدر وہ ناپاک طبع مولویوں کے مُنہ سے کافر اور فاسق اور دجّال کے الفاظ سنیں گے وہ نہایت درجہ کی ہتک ہو گی جو پلید طبع مولوی فتوے لکھنے والے کریں گے اور خدا کا اُن مولویوں پر غضب ہو گا۔ آثار صحیحہ میں لکھا ہے کہ مسیح موعود کے وقت کے مولوی تمام روئے زمین کے انسانوں سے بدتر اور پلید تر ہوں گے کیونکہ وہ مسیح جیسے راست باز کو کافر اور دجّال ٹھیرائیں گے۔ غرض مسیح موعود کو جو مولویوں سے عزت اور وجاہت ملے گی وہ یہ ہے۔ لیکن جو شخص خدا کے نزدیک خدا کے فرشتوں کے نزدیک خدا کے نیک بندوں کے نزدیک عزت اور وجاہت رکھتا ہے اگر پلید جاہلوں کے نزدیک وہ کافر اور دجّال ہو تو اس سے اُس کا کیا نقصان ہوا

؎ مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند سگ را بپرس خشم تو با ماہتاب چیست

اور یہ بھی سوچو کہ اگر وجاہت کے لیے دنیا داروں کی اطاعت اور تعظیم شرط ہے تو کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکّہ سے کفّار کے ہاتھ سے نکالے گئے اور دُکھ دیئے گئے تو کیا اُس وقت آپؐ وجیہہ نہ تھے؟ اور مکّہ کی فتح کے بعد وجیہہ ہوئے؟ غرض آپ کا یہ اعتراض دینی اور روحانی دوراندیشی کی بنا پر نہیں بلکہ دنیا داری اور رسم اور عادت کے گندے تصورات سے پیدا ہوا ہے۔ بہتیرے نبی دنیا میں ایسے آئے کہ دو آدمیوں نے بھی اُن کو قبول نہیں کیا تو کیا وہ وجیہہ نہیں تھے؟ اور حضرت مسیح علیہ السلام کب قبولیت سے بکلی خالی رہے تھے صدہا لوگوں نے اُن کو قبول کر لیا۔ یحییٰ علیہ السلام نے مع اپنی تمام جماعت کے قبول کیا۔ حواریوں نے قبول کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک بادشاہ نے بھی قبول کیا تھا۔ اس بات کے عیسائی بھی قائل ہیں۔ اب اس سے زیادہ اور کیا وجاہت ہو گی۔ یہ وجاہت تو ان کو اپنے زمانے میں حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ انجیل میں لکھا ہے کہ صدہا آدمی اہل حاجت نیازمندی کے ساتھ اُن کے گرد رہتے تھے اور ہجوم کی وجہ سے بعض دفعہ اُن کو ملنا مشکل ہو جاتا تھا اور اگرچہ بعض مولوی یہودیوں نے ان کو کافر کہا مگر جس زور شور سے مسیح موعود کی تکفیر ہوئی ایسی تکفیر حضرت عیسیٰ کی نہیں ہوئی۔ بلکہ انجیل سے ثابت ہے کہ اکثر کفّار کے دلوں میں بھی حضرت عیسیٰ کی وجاہت تھی اور پھر موت کے بعد تو وہ وجاہت ہوئی کہ خدا بنائے گئے۔ اور ہمارے مخالف مولویوں کو تو یہ اقرار کرنا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی خدا بننے کی وجاہت بھی دیکھ لی اور دیکھ رہے ہیں کیونکہ ان کے عقیدہ کے رو سے وہ اب تک زندہ موجود ہیں اور یورپ کے تمام طاقتور بادشاہ مع اپنے ارکان دولت کے اُن کو خدائے ذوالجلال مانتے ہیں کیا ایسی وجاہت کسی دوسرے انسان کی ہوئی۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۶۶-۱۶۷)

ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں خداتعالیٰ کی زمین پر بعض راست بازا پنی راست بازی اور تعلق باللہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل اور اعلیٰ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انکی نسبت فرمایا ہے وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ جس کے یہ معنے ہیں کہ اُس زمانہ کے مقربوں میں سے یہ بھی ایک تھے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ سب مقربوں سے بڑھ کر تھے بلکہ اس بات کا امکان نکلتا ہے کہ بعض مقرب ان کے زمانہ کے ان سے بہتر تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لیے آئے تھے اور دوسرے ملکوں اور قوموں سے ان کو کچھ تعلق نہ تھا پس ممکن بلکہ قریب قیاس ہے کہ بعض انبیاء جو لَمۡ نَقۡصُصۡ[1] میں داخل ہیں وہ اُن سے بہتر اور افضل ہوں گے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ کے مقابل پر آخر ایک انسان نکل آیا جس کی نسبت خدا نے عَلَّمۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا[2] فرمایا تو پھر حضرت عیسیٰ کی نسبت جو موسیٰ سے کمتر اور اس کی شریعت کے پیرو تھے اور خود کوئی کامل شریعت نہ لائے تھے اور ختنہ اور مسائل فقہ اور وراثت اور حرمت خنزیر وغیرہ میں حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے تابع تھے کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بالاطلاق اپنے وقت کے تمام راست بازوں سے بڑھ کر تھے جن لوگوں نے ان کو خدا بنایا ہے جیسے عیسائی یا وہ جنہوں نے خواہ نخواہ خدائی صفات انہیں دی ہیں جیسا کہ ہمارے مخالف اور خدا کے مخالف نام کے مسلمان وہ اگر ان کو اوپر اٹھاتے اٹھاتے آسمان پر چڑھا دیں یا عرش پر بٹھا دیں یا خدا کی طرح پرندوں کا پیدا کرنے والا قرار دیں تو ان کو اختیار ہے۔ انسان جب حیا اور انصاف کو چھوڑ دے تو جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے لیکن مسیح کی راست بازی اپنے زمانہ میں دوسرے راست بازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی...

مسلمانوں میں یہ جو مشہور ہے کہ عیسیٰ اور اس کی ماں مس شیطان سے پاک ہیں اس کے معنے نادان لوگ نہیں سمجھتے اصل بات یہ ہے کہ پلید یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں پر سخت ناپاک الزام لگائے تھے اور دونوں کی نسبت نعوذ باللہ شیطانی کاموں کی تہمت لگاتے تھے سو اس افترا کا رد ضروری تھا پس اس حدیث کے اس سے زیادہ کوئی معنے نہیں کہ یہ پلید الزام جو حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں پر لگائے گئے ہیں یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ان معنوں کر کے وہ مس شیطان سے پاک ہیں۔ اور اس قسم کے پاک ہونے کا واقعہ کسی اور نبی کو کبھی پیش نہیں آیا۔ (دافع البلاء و معیار اہل الاصطفاء آخری ٹائیٹل ص۳-۴ حاشیہ)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی مسیح کو اس کی زندگی میں وجاہت یعنی عزت اور مرتبہ اور عام لوگوں کی نظر میں عظمت اور بزرگی ملے گی اور آخرت میں بھی۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح نے ہیرودوس اور پیلاطوس کے علاقہ میں کوئی عزت نہیں پائی بلکہ غایت درجہ کی تحقیر کی گئی۔ اور یہ خیال کہ دنیا میں پھر آ کر عزت اور بزرگی پائیں گے یہ ایک بے اصل وہم ہے جو نہ صرف خدائے تعالیٰ کی کتابوں کے منشاء کے مخالف بلکہ اس کے قدیم قانون قدرت سے بھی مغائر اور مبائن اور پھر ایک بے ثبوت امر ہے مگر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اُس بدبخت قوم کے ہاتھ سے نجات پا کر جب ملک پنجاب کو اپنی تشریف آوری سے فخر بخشا تو اس ملک میں خدائے تعالیٰ نے اُن کو بہت عزت دی اور بنی اسرائیل کی وہ دس قومیں جو گم

---

[1] المؤمن آیت ۷۹۔ [2] الکہف آیت ۶۶۔

تھیں اس جگہ آکر اُن کو مل گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اس ملک میں آکر اکثر ان میں سے بدھ مذہب میں داخل ہو گئے تھے اور بعض ذلیل قسم کی بت پرستی میں پھنس گئے تھے۔ سو اکثر ان کے حضرت مسیح کے اس ملک میں آنے سے راہ راست پر آگئے اور چونکہ حضرت مسیح کی دعوت میں آنے والے نبی کے قبول کرنے کے لیے وصیت تھی اس لیے وہ دس فرقے جو اس ملک میں آکر افغان اور کشمیری کہلائے آخر کار سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ غرض اس ملک میں حضرت مسیح کو بڑی وجاہت پیدا ہوئی۔ اور حال میں ایک سکہ ملا ہے جو اسی ملک پنجاب میں سے برآمد ہوا ہے اُس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام پالی تحریر میں درج ہے اور اُسی زمانہ کا سکہ ہے جو حضرت مسیح کا زمانہ تھا۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس ملک میں آکر شاہانہ عزت پائی۔ اور غالباً یہ سکہ ایسے بادشاہ کی طرف سے جاری ہوا ہے جو حضرت مسیح پر ایمان لے آیا تھا۔ ایک اور سکہ برآمد ہوا ہے اس پر ایک اسرائیلی مرد کی تصویر ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی حضرت مسیح کی تصویر ہے قرآن شریف میں ایک یہ بھی آیت ہے کہ مسیح کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ جہاں جائے گا وہ مبارک ہوگا۔ سو ان سکوں سے ثابت ہے کہ اُس نے خدا سے بڑی برکت پائی اور وہ فوت نہ ہوا جب تک اس کو ایک شاہانہ عزت نہ دی گئی۔

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۵۱-۵۲)

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝

کہل کے لفظ سے درمیانی عمر کا آدمی مراد لیتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں دیکھیئے جو بعد کتاب اللہ اصح الکتب ہے اُس میں کہل کے معنے جوان مضبوط کے لکھے ہیں اور یہی معنے قاموس اور تفسیر کشاف وغیرہ میں موجود ہیں اور سیاق سباق آیات کا بھی انہیں معنوں کو چاہتا ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ کا اس کلام سے مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم نے خورد سالی کے زمانہ میں کلام کر کے اپنے نبی ہونے کا اظہار کیا پھر ایسا ہی جوانی میں بھر کر اور مبعوث ہو کر اپنی نبوت کا اظہار کریگا۔ سو کلام سے مراد وہ خاص کلام ہے جو حضرت مسیح نے اُن یہودیوں سے کیا تھا جو یہ الزام اُن کی والدہ پر لگاتے تھے اور جمع ہو کر آئے تھے کہ اے مریم تو نے یہ کیا کام کیا۔ پس یہی معنے منشاء کلام الٰہی کے مطابق ہیں اگر ادھیڑ عمر کے زمانہ کا کلام مراد ہوتا تو اس صورت میں یہ آیت نعوذ باللہ لغو ٹھہرتی گویا اس کے یہ معنے ہوتے کہ مسیح نے خورد سالی میں کلام کی اور پھر پیرانہ سالی کے قریب پہنچ کر کلام کریگا اور درمیان کی عمر میں بے زبان رہے گا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ دو مرتبہ اپنی نبوت پر گواہی دے گا منصف کے لیے ایک بخاری کا دیکھنا ہی کافی ہے۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۷)

حضرت عیسیٰؑ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مہد میں بولنے لگے اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیدا ہوتے ہی یا دو چار مہینہ کے بولنے لگے بلکہ اس سے مطلب ہے کہ جب وہ دو چار برس کے ہوئے کیونکہ یہی وقت تو بچوں کا پنگھوڑوں میں کھیلنے کا ہوتا ہے اور ایسے بچے کے لیے باتیں کرنا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہماری لڑکی امۃ الحفیظ بھی بڑی باتیں کرتی ہے۔ {الحکم جلد ۱۱ ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱}

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞

اِنْ قِيْلَ اِنَّ الْمَسِيْحَ قَدْ خُلِقَ مِنْ غَيْرِ اَبٍ مِّنْ يَّدِ الْقُدْرَةِ۔ وَهٰذَا اَمْرٌ فَوْقَ الْعَادَةِ۔ فَلَا يَتِمُّ هُنَاكَ شَانُ الْمُمَاثَلَةِ۔ وَقَدْ وَجَبَ الْمُضَاهَاةُ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْقَرِيْحَةِ الْوَقَّادَةِ۔ قُلْنَا اِنَّ خَلْقَ اِنْسَانٍ مِنْ غَيْرِ اَبٍ دَاخِلٌ فِيْ عَادَةِ اللّٰهِ الْقَدِيْرِ الْحَكِيْمِ۔ وَلَا نُسَلِّمُ اَنَّهٗ خَارِجٌ مِّنَ الْعَادَةِ وَلَا هُوَ حَرِيٌّ بِالتَّسْلِيْمِ۔ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ قَدْ يَتَوَلَّدُ مِنْ نُّطْفَةِ الْاِمْرَاَةِ وَحْدَهَا وَلَوْ عَلٰى سَبِيْلِ النُّدْرَةِ۔ وَلَيْسَ هُوَ بِخَارِجٍ مِّنْ قَانُوْنِ الْقُدْرَةِ بَلْ لَهٗ نَظَائِرُ وَقِصَصٌ فِيْ كُلِّ قَوْمٍ وَّقَدْ ذَكَرَهَا الْاَطِبَّاءُ مِنْ اَهْلِ التَّجْرِبَةِ۔ نَعَمْ نَقْبَلُ اَنَّ هٰذِهِ الْوَاقِعَةَ قَلِيْلَةٌ نِسْبَةً اِلٰى مَا خَالَفَهَا مِنْ قَانُوْنِ التَّوْلِيْدِ وَكَذٰلِكَ كَانَ خَلْقِيْ مِنَ اللّٰهِ الْوَحِيْدِ۔ وَكَانَ كَمِثْلِهٖ فِي النُّدْرَةِ وَكَفٰى هٰذَا الْقَدْرُ لِلسَّعِيْدِ فَاِنِّيْ وُلِدْتُ تَوْءَمًا وَّكَانَتْ صَبِيَّةٌ تَوَلَّدَتْ مَعِيْ فِيْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ۔ فَمَاتَتْ وَبَقِيْتُ حَيًّا مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ ذِي الْعِزَّةِ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذِهِ الْوَاقِعَةَ نَادِرَةٌ نِسْبَةً اِلَى الطَّرِيْقِ الْمُتَعَارَفِ الْمَشْهُوْرِ۔ وَيَكْفِيْ لِلْمُضَاهَاةِ الْاِشْتِرَاكُ فِي النُّدْرَةِ بِهٰذَا الْقَدْرِ عِنْدَ اَهْلِ الْعَقْلِ وَالشُّعُوْرِ۔ (خطبہ الہامیہ حاشیہ صفحہ ۴۷-۴۹)

(ترجمہ) اگر کہا جائے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بے باپ پیدا ہوئے تھے اور یہ اک امر فوق العادۃ ہے پس شان مماثلت پوری نہیں ہوتی ہے اور باہم مشابہت کا ہونا ضروری ہے جو سلیم الطبع لوگوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انسان کا بے باپ پیدا کرنا عادت اللہ میں داخل ہے اور ہم اس کو قبول نہیں کرتے کہ یہ خارج از عادت ہے اور نہ لائق ہے کہ اس بات کو قبول کیا جائے کس لیے کہ انسان کبھی عورت کے نطفہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ بات نادر ہو اور یہ امر قانون قدرت سے بھی خارج نہیں ہے بلکہ ہر قوم میں اس کی نظیریں پائی جاتی ہیں اور اہل تجربہ طبیبوں نے ایسی نظیروں کا ذکر کیا ہے۔ ہاں ہم یہ بات قبول کر سکتے ہیں کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا قلیل الوقوع امر ہے بہ نسبت اس امر کے کہ اس کا مخالف ہے اور اُس امر عجیب کے مشابہ میری پیدائش ہے کس لیے کہ میں توام پیدا ہوا ہوں اور میرے ساتھ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو وہ مر گئی اور میں زندہ رہ گیا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ واقعہ بھی نسبتاً عام پیدائش کے قاعدہ سے عجیب ہے اور مشابہت کے لیے اسی قدر اشتراک کافی ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۴۷-۴۹ حاشیہ)

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ تَوَلُّدَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مِنْ غَيْرِ اَبٍ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ بِهٰذَا الطَّرِيْقِ۔ تَنْبِيْهٌ لِّلْيَهُوْدِ وَعِلْمٌ لِّسَاعَتِهِمْ وَاِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ النُّبُوَّةَ مُنْتَزَعٌ مِّنْهُمْ بِالتَّحْقِيْقِ۔ (خطبہ الہامیہ حاشیہ ص۴۹-۵۰)

وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ اَنَّ مَرْيَمَ وُجِدَتْ حَامِلًا قَبْلَ النِّكَاحِ۔ وَمَا كَانَ لَهَا اَنْ تَتَزَوَّجَ بِعَهْدٍ سَبَقَ مِنْ اُمِّهَا لِبُعْدِ الْاِحْرَاجِ۔ فَالْاَمْرُ مَحْصُوْرٌ فِي الْاِحْتِمَالَيْنِ۔ عِنْدَ ذَوِي الْعَيْنَيْنِ۔ اِمَّا اَنْ يُّقَالَ اِنَّ عِيْسٰى خُلِقَ مِنْ كَلِمَةِ اللّٰهِ الْعَلَّامِ۔ اَوْ يُقَالَ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ اِنَّهٗ مِنَ الْحَرَامِ۔ وَلَا نَجِدُ سَبِيْلًا اِلٰى حَمْلِ مَرْيَمَ مِنَ النِّكَاحِ۔ فَاِنَّ اُمَّهَا كَانَتْ عَاهَدَتِ اللّٰهَ اَنَّهَا تَتْرُكُهَا مُحَرَّرَةً سَادِنَةً وَّكَانَتْ عَهْدُهَا هٰذَا فِيْ اَيَّامِ اللِّقَاحِ۔ وَهٰذَا اَمْرٌ نَكْتُبُهٗ مِنْ شَهَادَةِ الْقُرْاٰنِ وَالْاِنْجِيْلِ فَلَا تَتْرُكُوْا سَبِيْلَ الْحَقِّ وَالْفَلَاحِ۔ هٰذَا لِمَنِ اسْتَوْضَحَتْهُ فِطْرَتُهٗ۔ وَلَا تَقْبَلُ خَارِقَ الْعَادَةِ عَادَتُهٗ۔ وَاَمَّا نَحْنُ فَنُؤْمِنُ بِكَمَالِ قُدْرَةِ اللّٰهِ الْاَعْلٰى وَنُؤْمِنُ بِاَنَّهٗ اِنْ يَّشَاْ يَخْلُقُ مِنْ وَرَقِ الْاَشْجَارِ عِمْثْلِ عِيْسٰى۔ وَكَمْ مِنْ دُوْدٍ فِي الْاَرْضِ لَيْسَ لَهَا اٰبْوَانِ۔ فَاَيُّ عَجَبٍ يَاْخُذُكُمْ مِنْ خَلْقِ عِيْسٰى يَا فِتْيَانُ۔ (مواہب الرحمٰن ص۷۰-۸۰)

میں ہمیشہ سے اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ حضرت عیسٰی بے باپ پیدا ہوئے تھے اور ان کا بے باپ پیدا ہونا

(ترجمہ) پھر جان لو کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بے باپ پیدا ہونا بنی اسرائیل میں سے یہود کے لیے ایک تنبیہ ہے اور ان کے زوال کی گھڑی پر ایک دلیل ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ضرور نبوت ان سے منتقل ہو جائے گی۔ (خطبہ الہامیہ ص۴۹-۵۰ حاشیہ)

(ترجمہ) اور یہ بات معلوم ہے کہ حضرت مریم نکاح سے قبل حاملہ پائی گئیں اور اس عہد کی وجہ سے جو ان کی والدہ نے اپنے حاملہ ہونے کے بعد کیا تھا حضرت مریم کی مجال نہیں تھی کہ نکاح کرتیں پس اہل بصیرت کے نزدیک اس معاملہ کی دو صورتیں ممکن ہیں اوّل یا تو یہ کہا جائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام خدائے علام کے کلمہ سے پیدا ہوئے تھے یا نعوذ باللہ یہ کہا جائے کہ وہ ولد الحرام تھے۔ اور ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حضرت مریم کا حمل نکاح کے نتیجہ میں قرار دیا جائے کیونکہ ان کی والدہ نے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کو نکاح سے آزاد رکھیں گی اور بیت المقدس کی خادمہ بنائیں گی۔ انہوں نے یہ عہد اپنے حمل کے ایام میں کیا تھا اور ہم یہ بات قرآن کریم اور انجیل کی شہادت کی بناء پر لکھتے ہیں پس تم حق اور فلاح کا رستہ ترک نہ کرو۔ یہ تفصیل اس شخص کے لیے ہے جس کی فطرت وضاحت کا تقاضا کرتی ہے اور اس کی طبیعت کسی خارق عادت امر کو قبول نہیں کرتی۔ مگر ہم تو خدائے بزرگ و برتر کی کامل قدرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو درختوں کے پتوں سے بھی عیسٰی کی مانند پیدا کر سکتا ہے۔ دیکھو زمین میں کتنے ہی ایسے کیڑے ہیں جو بغیر ماں باپ کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس اے لوگو تمہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بن باپ پیدائش میں کیا تعجب ہوتا ہے۔ (مواہب الرحمان ص۷۰-۸۰)

ایک نشان تھا اس بات پر کہ اب بنی اسرائیل کے خاندان میں نبوت کا خاتمہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ بشرط تقویٰ نبوت بنی اسرائیل کے گھرانے سے ہوگی لیکن جب تقویٰ نہ رہا۔ تو یہ نشان دیا گیا تا کہ دانشمند سمجھ لیں کہ اب آئندہ اس سلسلہ کا انقطاع ہوگا۔ (الحکم جلد ۵ ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

ہمارا ایمان اور اعتقاد یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بن باپ تھے اور اللہ تعالیٰ کو سب طاقتیں ہیں نیچری جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کا باپ تھا وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ ایسے لوگوں کا خدا مردہ خدا ہے اور ایسے لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بے باپ پیدا نہیں کر سکتا ہم ایسے آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تمہاری حالتیں ایسی ردی ہو گئی ہیں کہ اب تم میں کوئی اس قابل نہیں جو نبی ہو سکے یا اُس کی اولاد میں سے کوئی نبی ہو سکے اسی واسطے آخری خلیفہ موسوی کو اللہ تعالیٰ نے بے باپ پیدا کیا اور ان کو سمجھایا کہ اب شریعت تمہارے خاندان سے گئی۔ (الحکم جلد ۵ ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے قصّہ کو ایک جا جمع کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جیسے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش خوارق طرز سے ہے ویسے ہی مسیح کی بھی ہے پھر یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا حال بیان کر کے مسیح کی پیدائش کا حال بیان کیا ہے۔ یہ ترتیب قرآنی بھی بتلاتی ہے کہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کی ہے یعنی جس قدر معجز نمائی کی قوت یحییٰ کی پیدائش میں ہے اس سے بڑھ کر مسیح کی پیدائش میں ہے۔ اگر اس میں کوئی معجزانہ بات نہ تھی تو یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کر کے کیوں ساتھ ہی مریم کا ذکر چھیڑ دیا اس سے کیا فائدہ تھا یہ اسی لیے کیا کہ تاویل کی گنجائش نہ رہے ان دونوں بیانات کا ایک جا ذکر ہونا اعجازی امر کو ثابت کرتے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو گویا قرآن تنزل پر آتا ہے جو کہ اس کی شان کے برخلاف ہے۔ (البدر جلد ۲ ۱۶ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۲)

وہ (مسیح علیہ السلام) بن باپ ہوئے اس کا زبردست ثبوت یہ ہے۔ کہ یحییٰ اور عیسیٰؑ کا قصہ ایک ہی جگہ بیان کیا ہے۔ پہلے یحییٰ کا ذکر کیا۔ جو بانجھ سے پیدا ہوئے۔ دوسرا قصّہ مسیح کا اس کے بعد بیان فرمایا۔ جو اس سے ترقی پر ہونا چاہیے تھا۔ اور وہ یہی ہے۔ کہ وہ بن باپ ہوئے۔ اور یہی امر خارق عادت ہے اگر بانجھ سے پیدا ہونے (والے) یحییٰ کے بعد باپ سے پیدا ہونے والے کا ذکر ہوتا۔ تو اس میں خارق عادت کی کیا بات ہوتی۔ (الحکم جلد ۹ ۴۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

قرآن شریف سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے اور قرآن شریف پر ہم ایمان لاتے ہیں پھر قانون قدرت میں ہم اس کے برخلاف کوئی دلیل نہیں پاتے۔ کیونکہ سینکڑوں کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو نہ باپ رکھتے ہیں اور نہ ماں قرآن شریف میں جہاں اس کا ذکر ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کے دو عجائب نمونوں کا ذکر کیا ہے۔ اوّل حضرت زکریا کا ذکر ہے۔ کہ ایسی پیرانہ سالی میں جہاں کہ بیوی بھی بانجھ تھی۔ خدا نے بیٹا پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ دوسرا واقعہ ہے جو خدا تعالیٰ کی ایک اور قدرت عجیبہ کا نمونہ ہے اس کے ماننے میں کونسا ہرج پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے پڑھنے

سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح بن باپ ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے کمثل آدم جو فرمایا اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس میں ایک عجوبہ قدرت ہے جس کے واسطے آدم کی مثال کا ذکر کرنا پڑا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ مسیح بن باپ پیدا ہوئے اور قرآن شریف سے یہی ثابت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) یہود کے واسطے ایک نشان تھے جو ان کی شامتِ اعمال سے اس رنگ میں پورا ہوا زبور اور دوسری کتابوں میں لکھا گیا تھا کہ اگر تم نے اپنی عادت کو نہ بگاڑا تو نبوت تم میں رہے گی مگر خدا تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ اپنی حالت کو بدل لیں گے اور شرک و بدعت میں گرفتار ہو جائیں گے جب انہوں نے اپنی حالت کو بگاڑا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے موافق یہ تنبیہی نشان ان کو دیا اور مسیح کو بن باپ پیدا کیا۔ اور بن باپ پیدا ہونے کا سر یہ تھا۔ کہ چونکہ سلسلہ نسب کا باپ کی طرف سے ہوتا ہے تو اس طرح گویا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اسرائیلی خاندان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی کیونکہ وہ پورے طور سے اسرائیل کے خاندان سے نہ رہے مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ میں بشارت ہے اس کے دو ہی پہلو ہیں یعنی ایک تو آپ کا وجود ہی بشارت تھا کیونکہ بنی اسرائیل کے خاندان نبوت کا خاتمہ ہو گیا دوسرے زبان سے بھی بشارت دی یعنی آپ کی پیدائش میں بھی بشارت تھی اور زبانی بھی انجیل میں بھی مسیح نے باغ کی تمثیل میں اس امر کو بیان کر دیا ہے اور اپنے آپ کو مالک باغ کے بیٹے کی جگہ ٹھہرایا ہے۔ بیٹے کا محاورہ انجیل اور بائبل میں عام۔ ہے اسرائیل کی نسبت آیا ہے کہ اسرائیل فرزند من بلکہ نخست زادۂ من است آخر اس تمثیل میں بتایا گیا ہے کہ بیٹے کے بعد وہ مالک خود آکر باغبانوں کو ہلاک کر دیگا اور باغ دوسروں کے سپرد کر دیگا یہ اشارہ تھا اس امر کی طرف کہ نبوت ان کے خاندان سے جاتی رہی پس مسیح کا بن باپ ہونا اس امر کا نشان تھا۔ (البدر جلد اول نمبر ۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ[۵] اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

[۵] الصف آیت ۷

بعض لوگ موحدین کے فرقہ میں سے بحوالہ آیت قرآنی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت مسیح ابن مریم انواع واقسام کے پرندے بناکر اور ان میں پھونک مار کر زندہ کر دیا کرتے تھے ..... ان تمام اوہام باطلہ کا جواب یہ ہے کہ وہ آیات جن میں ایسا لکھا ہے متشابہات میں سے ہیں اور ان کے یہ معنے کرنا کہ گویا خدا تعالیٰ نے اپنے ارادہ اور اذن سے حضرت عیسیٰ کو صفات خالقیت میں شریک کر رکھا تھا صریح الحاد اور سخت بے ایمانی ہے۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ اپنی صفات خاصہ الوہیت بھی دوسرے کو دے سکتا ہے تو اس سے اس کی خدائی باطل ہوتی ہے اور موحد صاحب کا یہ عذر کہ ہم ایسا اعتقاد تو نہیں رکھتے کہ اپنی ذاتی طاقت سے حضرت عیسیٰ خالق طیور تھے بلکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ طاقت خدائے تعالیٰ نے اپنے اذن اور ارادہ سے ان کو دے رکھی تھی اور اپنی مرضی سے اُن کو اپنی خالقیت کا حصہ دار بنا دیا تھا اور یہ اس کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے اپنا مثیل بنا دیوے قادر مطلق جو ہوا یہ سراسر مشرکانہ باتیں ہیں اور کفر سے بدتر۔ اس موحد کو یہ بھی کہا گیا کہ کیا تم اب شناخت کر سکتے ہو کہ ان پرندوں میں سے کون سے ایسے پرندے ہیں جو خدائے تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں اور کونسے ایسے پرندے ہیں جو اُن پرندوں کی نسل ہیں جن کے حضرت عیسیٰ خالق ہیں تو اس نے اپنے ساکت رہنے سے یہی جواب دیا کہ میں شناخت نہیں کر سکتا۔

اب واضح رہے کہ اس زمانہ کے بعض موحدین کا یہ اعتقاد کہ پرندوں کی نوع میں سے کچھ تو خدائے تعالیٰ کی مخلوق اور کچھ حضرت عیسیٰ کی مخلوق ہے سراسر فاسد اور مشرکانہ خیال ہے اور ایسا خیال رکھنے والا بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور یہ عذر کہ ہم حضرت عیسیٰ کو خدا تو نہیں مانتے بلکہ یہ مانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے بعض اپنی خدائی کی صفتیں اُن کو عطا کر دی تھیں نہایت مکروہ اور باطل عذر ہے کیونکہ اگر خدائے تعالیٰ اپنے اذن اور ارادہ سے اپنی خدائی کی صفتیں بندوں کو دے سکتا ہے تو بلاشبہ وہ اپنی ساری صفتیں خدائی کی ایک بندے کو دیکر پورا خدا بنا سکتا ہے پس اس صورت میں مخلوق پرستوں کے کل مذاہب سچے ٹھہر جائیں گے کیونکہ اگر خدائے تعالیٰ کسی بشر کو اپنے اذن اور ارادہ سے خالقیت کی صفت عطا کر سکتا ہے تو پھر وہ اسی طرح کسی کو اذن اور ارادہ سے اپنی طرح عالم الغیب بھی بنا سکتا ہے اور اُس کو ایسی قوت بخش سکتا ہے جو خدائے تعالیٰ کی طرح ہر جگہ حاضر و ناظر ہو اور ظاہر ہے کہ اگر خدائی کی صفتیں بھی بندوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ کا وحدہٗ لاشریک ہونا باطل ہے جس قدر دنیا میں مخلوق پرست ہیں وہ بھی یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارے معبود خدا ہیں بلکہ ان موحدوں کی طرح اُن کا بھی درحقیقت یہی قول ہے کہ ہمارے معبودوں کو خدائے تعالیٰ نے خدائی کی طاقتیں دے رکھی ہیں رب اعلیٰ و برتر تو وہی ہے اور یہ صرف چھوٹے چھوٹے خدا ہیں تعجب کہ یہ لوگ یا رسول اللہ کہنا شرک کا کلمہ سمجھ کر منع کرتے ہیں لیکن مریم کے ایک عاجز بیٹے کو خدائی کا حصہ دار بنا رہے ہیں۔ بھائیو! آپ لوگوں کا دراصل یہی مذہب ہے کہ خدائی بھی مخلوق میں تقسیم ہو سکتی ہے اور خدائے تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی صفت خالقیت اور رازقیت و عالمیت و قادریت وغیرہ میں ہمیشہ کے لیے شریک کر دیتا ہے تو پھر آپ لوگوں نے اپنے بدعتی بھائیوں سے اس قدر جنگ و جدل کیوں شروع کر رکھی ہے وہ بیچارے بھی تو اپنے اولیا کو خدا کر کے نہیں مانتے صرف یہی کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے اذن

اور ارادہ سے کچھ کچھ خدائی طاقتیں اُنہیں دے رکھی ہیں اور اُنہیں طاقتوں کی وجہ سے جو باذن الٰہی اُن کو حاصل ہیں وہ کسی کو بیٹیا دیتے ہیں اور کسی کو بیٹی اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں نذریں نیازیں لیتے ہیں اور مرادیں دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی طالب حق یہ سوال کرے کہ اگر ایسے عقائد سراسر باطل اور مشرکانہ خیالات ہیں تو ان آیات فرقانیہ کے صحیح معنے کیا ہیں جن میں لکھا ہے کہ مسیح ابن مریم مٹی کے پرندے بنا کر پھونک اُن میں مارتا تھا تو وہ باذن الٰہی پرندے ہو جاتے تھے۔

سو واضح ہو کہ انبیا کے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) ایک وہ جو محض سماوی امور ہوتے ہیں جن میں انسان کی تدبیر اور عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا جیسے شق القمر جو ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا اور خدائے تعالیٰ کی غیر محدود قدرت نے ایک راست باز اور کامل نبی کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے اس کو دکھایا تھا (۲) دوسرے عقلی معجزات ہیں جو اُس خارق عادت عقل کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو الہام الٰہی سے ملتی ہے جیسے حضرت سلیمان کا وہ معجزہ جو صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ [1] ہے جس کو دیکھ کر بلقیس کو ایمان نصیب ہوا۔

اب جاننا چاہیئے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت مسیح کا معجزہ حضرت سلیمان کے معجزہ کی طرح صرف عقلی تھا تاریخ سے ثابت ہے کہ اُن دنوں میں ایسے امور کی طرف لوگوں کے خیالات جُھکے ہوئے تھے کہ جو شعبدہ بازی کی قسم میں سے اور دراصل بے سود اور عوام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔ وہ لوگ جو فرعون کے وقت میں مصر میں ایسے ایسے کام کرتے تھے جو سانپ بنا کر دکھلا دیتے تھے اور کئی قسم کے جانور طیار کر کے اُن کو زندہ جانوروں کی طرح چلا دیتے تھے وہ حضرت مسیح کے وقت میں عام طور پر یہودیوں کے ملکوں میں پھیل گئے تھے اور یہودیوں نے اُن کے بہت سے ساحرانہ کام سیکھ لیے تھے جیسا کہ قرآن کریم بھی اس بات پر شاہد ہے سو کچھ تعجب کی جگہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کو عقلی طور سے ایسے طریق پر اطلاع دیدی ہو جو ایک مٹی کا کھلونا کسی کل کے دبانے یا کسی پھونک مارنے کے طور پر ایسا پرواز کرتا ہو جیسے پرندہ پرواز کرتا ہے یا اگر پرواز نہیں تو پیروں سے چلتا ہو کیونکہ حضرت مسیح ابن مریم اپنے باپ یوسف کے ساتھ بائیس ۲۲ برس کی مدت تک نجاری کا کام بھی کرتے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ بڑھئی کا کام درحقیقت ایک ایسا کام ہے جس میں کلوں کے ایجاد کرنے اور طرح طرح کی صنعتوں کے بنانے میں عقل تیز ہو جاتی ہے اور جیسے انسان میں قویٰ موجود ہوں انہیں کے موافق اعجاز کے طور پر بھی مدد ملتی ہے جیسے ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی قویٰ جو دقایق اور معارف تک پہنچنے میں نہایت تیز و قوی تھے سو انہیں کے موافق قرآن شریف کا معجزہ دیا گیا جو جامع جمیع دقایق و معارف الٰہیہ ہے پس اس سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت مسیح نے اپنے دادا سلیمان کی طرح اُس وقت کے مخالفین کو یہ عقلی معجزہ دکھلایا ہو اور ایسا معجزہ دکھانا عقل سے بعید بھی نہیں کیونکہ حال کے زمانہ میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ اکثر صناع ایسی ایسی چڑیاں بنا لیتے ہیں کہ وہ بولتی بھی ہیں اور ہلتی بھی ہیں اور دُم بھی ہلاتی ہیں اور میں نے سُنا ہے کہ بعض چڑیاں

---

[1] النمل آیت ۴۵۔

کل کے ذریعہ سے پرواز بھی کرتی ہیں بمبئی اور کلکتہ میں ایسے کھلونے بہت بنتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بکثرت ہیں
اور ہر سال نئے نئے نکلتے آتے ہیں اور چونکہ قرآن شریف اکثر استعارات سے بھرا ہوا ہے اس لیے ان آیات کے روحانی طور
پر یہ معنی بھی کر سکتے ہیں کہ مٹی کی چڑیوں سے مراد وہ امی اور نادان لوگ ہیں جن کو حضرت عیسٰی نے اپنا رفیق بنایا گویا اپنی صحبت
میں لیکر پرندوں کی صورت کا خاکہ کھینچا پھر ہدایت کی روح اُن میں پھونک دی جس سے وہ پرواز کرنے لگے۔

ماسوا اس کے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ایسے ایسے اعجاز طریق عمل الترب یعنی مسمریزمی طریق سے بطور لہو ولعب
نہ بطور حقیقت ظہور میں آسکیں کیونکہ عمل الترب میں جس کو زمانہ حال میں مسمریزم کہتے ہیں ایسے ایسے عجائبات ہیں کہ اُس میں
پوری پوری مشق کرنے والے اپنی روح کی گرمی دوسری چیزوں پر ڈال کر اُن چیزوں کو زندہ کے موافق کر دکھاتے ہیں انسان کی روح
میں کچھ ایسی خاصیت ہے کہ وہ اپنی زندگی کی گرمی ایک جماد پر جو بالکل بے جان ہے ڈال سکتی ہے تب جماد سے وہ بعض حرکات
صادر ہوتی ہیں جو زندوں سے صادر ہوا کرتی ہیں راقم رسالہ ہذا نے اس علم کے بعض مشق کرنے والوں کو دیکھا جو انہوں نے ایک
لکڑی کی تپائی پر ہاتھ رکھ کر ایسا اپنی حیوانی روح سے اُسے گرم کیا کہ اُس نے چارپایوں کی طرح حرکت کرنا شروع کر دیا اور کتنے
آدمی گھوڑے کی طرح اس پر سوار ہوئے اور اس کی تیزی اور حرکت میں کچھ کمی نہ ہوئی سو یقینی طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ایک
شخص اس فن میں کامل مشق رکھنے والا مٹی کا ایک پرند بنا کر اس کو پرواز کرتا ہوا بھی دکھا دے تو کچھ بعید نہیں کیونکہ کچھ اندازہ
نہیں کیا گیا کہ اس فن کے کمال کی کہاں تک انتہا ہے اور جبکہ ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ اس فن کے ذریعہ سے ایک جماد میں حرکت پیدا
ہو جاتی ہے اور وہ جانداروں کی طرح چلنے لگتا ہے تو پھر اگر اُس میں پرواز بھی ہو تو بعید کیا ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا
جانور جو مٹی یا لکڑی وغیرہ سے بنایا جاوے اور عمل الترب سے اپنی روح کی گرمی اُس کو پہنچائی جائے وہ درحقیقت زندہ
نہیں ہوتا بلکہ بدستور بے جان اور جماد ہوتا ہے صرف عامل کے روح کی گرمی بارودت کی طرح اس کو جنبش میں لاتی ہے اور
یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان پرندوں کا پرواز کرنا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُن کا ہلنا اور جنبش کرنا بھی بپایہ
ثبوت نہیں پہنچتا۔ اور نہ درحقیقت ان کا زندہ ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔

(وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ) اِس جگہ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ سلب امراض کرنا یا اپنی روح کی گرمی جماد میں ڈال
دینا درحقیقت یہ سب عمل الترب کی شاخیں ہیں ہر یک زمانہ میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو اس روحانی
عمل کے ذریعہ سے سلب امراض کرتے رہے ہیں اور مفلوج مبروص مدقوق وغیرہ ان کی توجہ سے اچھے ہوتے رہے ہیں
جن لوگوں کے معلومات وسیع ہیں وہ میرے اِس بیان پر شہادت دے سکتے ہیں کہ بعض فقرا نقش بندی و سہروردی وغیرہ
نے بھی ان مشقوں کی طرف بہت توجہ کی تھی اور بعض ان میں یہاں تک مشاق گذرے ہیں کہ صدہا بیماروں کو اپنے یمین و یسار
میں بٹھا کر صرف نظر سے اچھا کر دیتے تھے اور محی الدین ابن عربی صاحب کو بھی اِس میں خاص درجہ کی مشق تھی اولیاء
اور اہل سلوک کی تواریخ اور سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاملین ایسے عملوں سے پرہیز کرتے رہے ہیں مگر بعض

لوگ اپنی ولایت کا ایک ثبوت بنانے کی غرض سے یا کسی اور نیت سے اِن مشغلوں میں مبتلا ہو گئے تھے اور اب یہ بات قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم باذن وحکم الٰہی الیسع نبی کی طرح اس عمل الترب میں کمال رکھتے تھے گو الیسع کے درجہ کاملہ سے کم رہے ہوئے تھے کیونکہ الیسع کی لاش نے بھی وہ معجزہ دکھلایا کہ اُس کی ہڈیوں کے لگنے سے ایک مردہ زندہ ہو گیا مگر چوروں کی لاشیں مسیح کے جسم کے ساتھ لگنے سے ہرگز زندہ نہ ہو سکیں یعنی وہ دو چور جو مسیح کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے بہرحال مسیح کی یہ تربی کارروائیاں زمانہ کے مناسب حال بطور خاص مصلحت کے تھیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ عمل ایسا قدر کے لائق نہیں جیسا کہ عوام الناس اِس کو خیال کرتے ہیں اگر یہ عاجز اس عمل کو مکروہ اور قابلِ نفرت نہ سمجھتا تو خدائے تعالیٰ کے فضل و توفیق سے امید قوی رکھتا تھا کہ ان اعجوبہ نمائیوں میں حضرت ابن مریم سے کم نہ رہتا لیکن مجھے وہ روحانی طریق پسند ہے جس پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم مارا ہے اور حضرت مسیح نے بھی اِس عمل جسمانی کو یہودیوں کے جسمانی اور پست خیالات کی وجہ سے جو اُن کی فطرت میں مرکوز تھے باذن وحکم الٰہی اختیار کیا تھا ورنہ دراصل مسیح کو بھی یہ عمل پسند نہ تھا واضح ہو کہ اِس عمل جسمانی کا ایک نہایت بُرا خاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے تئیں اس مشغولی میں ڈالے اور جسمانی مرضوں کے رفع دفع کرنے کے لیے اپنی دلی و دماغی طاقتوں کو خرچ کرتا رہے وہ اپنی اُن روحانی تاثیروں میں جو روح پر اثر ڈال کر روحانی بیماریوں کو دور کرتی ہیں بہت ضعیف اور نکما ہو جاتا ہے اور امر تنویر باطن اور تزکیہ نفوس کا جو اصل مقصد ہے اُس کے ہاتھ سے بہت کم انجام پذیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو حضرت مسیح جسمانی بیماروں کو اِس عمل کے ذریعہ سے اچھا کرتے رہے مگر ہدایت اور توحید اور دینی استقامتوں کے کامل طور پر دلوں میں قائم کرنے کے بارے میں اُن کی کارروائیوں کا نمبر ایسا کم درجہ کا رہا کہ قریب قریب ناکام کے رہے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ ان جسمانی امور کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور تمام زور اپنی روح کا دلوں میں ہدایت پیدا ہونے کے لیے ڈالا اِسی وجہ سے تکمیل نفوس میں سب سے بڑھ کر رہے اور ہزار ہا بندگانِ خدا کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا اور اصلاح خلق اور اندرونی تبدیلیوں میں وہ یدِ بیضا دکھلایا کہ جس کی ابتدائے دُنیا سے آج تک نظیر نہیں پائی جاتی۔ حضرت مسیح کے عمل الترب سے وہ مُردے جو زندہ ہوتے تھے یعنی وہ قریب الموت آدمی جو گویا نئے سرے زندہ ہو جاتے تھے وہ بلا توقف چند منٹ میں مر جاتے تھے کیونکہ بذریعہ عمل الترب روح کی گرمی اور زندگی صرف عارضی طور پر اُن میں پیدا ہو جاتی تھی مگر جن کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ کیا وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور یہ جو میں نے مسمریزمی طریق کا عمل الترب نام رکھا جس میں حضرت مسیح بھی کسی درجہ تک مشق رکھتے تھے یہ الہامی نام ہے اور خدائے تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا کہ یہ عمل الترب ہے اور اس عمل کے عجائبات کی نسبت یہ بھی الہام ہوا ھٰذا ھو التّرب الّذی لا یعلمون یعنی یہ وہ عمل الترب ہے جس کی اصل حقیقت کی زمانہ حال کے لوگوں کو کچھ خبر نہیں ورنہ خدائے تعالیٰ اپنی ہر یک صفت میں واحد لاشریک ہے اپنی صفات الوہیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی آیات بینات میں اِس قدر اِس مضمون کی تائید پائی جاتی ہے جو کسی پر مخفی نہیں جیسا کہ وہ عزّ اسمہٗ فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ۔ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ (سورۃ الفرقان الجزو ۱۸)۔ یعنی خدا وہ خدا ہے جو تمام زمین و آسمان کا اکیلا مالک ہے کوئی اس کا حصہ دار نہیں اُس کا کوئی بیٹا نہیں اور نہ اُس کے ملک میں کوئی اس کا شریک اور اُسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور پھر ایک حد تک اس کے جسم اور اس کی طاقتوں اور اس کی عمر کو محدود کر دیا اور مشرکوں نے بجز اس خدائے حقیقی کے اور اور ایسے ایسے خدا مقرر کر رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ اور مخلوق ہیں اپنے ضرر اور نفع کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت اور زندگی اور جی اُٹھنے کے مالک ہیں۔ اب دیکھو خدائے تعالیٰ صاف صاف طور پر فرما رہا ہے کہ بجز میرے کوئی اور خالق نہیں بلکہ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ تمام جہان مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتا اور صاف فرماتا ہے کہ کوئی شخص موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مخلوق کو موت اور حیات کا مالک بنا دیتا اور اپنی صفات میں شریک کر دیتا اُس کی عادت میں داخل ہوتا تو وہ بطور استثناء ایسے لوگوں کو ضرور باہر رکھ لیتا اور ایسی اعلیٰ توحید کی ہمیں ہرگز تعلیم نہ دیتا۔

اگر یہ وسواس دل میں گذرے کہ پھر اللہ جلّ شانہٗ نے مسیح ابن مریم کی نسبت اُس قصہ میں جہاں پرندہ بنانے کا ذکر ہے تخلق کا لفظ کیوں استعمال کیا جس کے بظاہر یہ معنے ہیں کہ تو پیدا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ کو خالق قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ اس دوسری آیت میں فرمایا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[1] بلاشبہ حقیقی اور سچا خالق خدائے تعالیٰ ہے اور جو لوگ مٹی یا لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں وہ بھی خالق ہیں مگر جھوٹے خالق جن کے فعل کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کیوں بطور معجزہ جائز نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام اذن اور ارادہ الٰہی سے حقیقت میں پرندے بنا لیتے ہوں اور وہ پرندے اُن کی اعجازی پھونک سے پرواز کر جاتے ہوں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے اذن اور ارادہ سے کسی شخص کو موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں بناتا نبی لوگ دُعا اور تضرع سے معجزہ مانگتے ہیں معجزہ نمائی کی ایسی قدرت نہیں رکھتے جیسا کہ انسان کو ہاتھ پیر ہلانے کی قدرت ہوتی ہے غرض معجزہ کی حقیقت اور مرتبہ سے بہ امر بالاتر اور ان صفات خاصہ خدائے تعالیٰ میں سے ہے جو کسی حالت میں بشر کو مل نہیں سکتیں معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک امر خارق عادت یا ایک امر خیال اور گمان سے باہر اور امید سے بڑھ کر ایک اپنے رسول کی عزّت اور صداقت ظاہر کرنے کے لیے اور اُس کے مخالفین کی عجز اور مغلوبیت جتلانے کی غرض سے اپنے ارادہ خاص سے یا اُس رسول کی دُعا اور درخواست سے آپ ظاہر فرماتا ہے مگر ایسے طور سے جو اُس کی صفات وحدانیت و تقدس

---

[1] المؤمنون آیت ۱۵ + [2] آیت ۳ و ۴۔

کمال کے منافی و مغائر نہ ہو اور کسی دوسرے کی وکالت یا کارسازی کا اس میں کچھ دخل نہ ہو۔

اب ہر یک دانشمند سوچ سکتا ہے کہ یہ صورت ہرگز معجزہ کی صورت نہیں کہ خدائے تعالیٰ دائمی طور پر ایک شخص کو اجازت اور اذن دیدے کہ تو مٹی کے پرندے بنا کر پھونک مار کر وہ حقیقت میں جانور بن جایا کریں گے اور اُن میں گوشت اور ہڈی اور خون اور تمام اعضا جانوروں کے بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ پرندوں کے بنانے میں اپنی خالقیت کا کسی کو وکیل ٹھہرا سکتا ہے تو تمام امور خالقیت میں وکالت تامہ کا عہدہ بھی کسی کو دے سکتا ہے اس صورت میں خدائے تعالیٰ کی صفات میں شریک ہونا جائز ہوگا گو اُس کے حکم اور اذن سے ہی سہی اور نیز ایسے خالقوں کے سامنے اور فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ[1] کی مجبوری سے خالق حقیقی کی معرفت مشتبہ ہو جائے گی۔ غرض یہ اعجاز کی صورت نہیں یہ تو خدائی کا حصہ دار بنانا ہے۔

بعض دانشمند شرک سے بچنے کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح جو پرندے بناتے تھے وہ بہت دیر تک جیتے نہیں تھے ان کی عمر چھوٹی ہوتی تھی تھوڑی مسافت تک پرواز کر کے پھر گر کر مر جاتے تھے لیکن یہ عذر بالکل فضول ہے اور صرف اس حالت میں ماننے کے لائق ہے کہ جب یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اُن پرندوں میں واقعی اور حقیقی حیات پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف ظلی اور مجازی اور جھوٹی حیات جو عمل الترب کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے ایک جھوٹی جھلک کی طرح اُن میں نمودار ہو جاتی تھی پس اگر اتنی ہی بات ہے تو ہم اس کو پہلے سے تسلیم کر چکے ہیں ہمارے نزدیک ممکن ہے کہ عمل الترب کے ذریعہ سے پھونک کی ہوا میں وہ قوت پیدا ہو جائے جو اس دُخان میں پیدا ہوتی ہے جس کی تحریک سے غبارہ اوپر کو چڑھتا ہے صانع فطرت نے اس مخلوقات میں بہت کچھ خواص مخفی رکھے ہوئے ہیں ایک شریک صفات باری ہونا ممکن نہیں اور کونسی صنعت ہے جو غیر ممکن ہے۔

اور اگر یہ اعتقاد رکھا جاوے کہ اُن پرندوں میں واقعی اور حقیقی حیات پیدا ہو جاتی تھی اور سچ مچ اُن میں ہڈیاں گوشت پوست خون وغیرہ اعضاء بن کر جان پڑ جاتی تھی تو اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُن میں جاندار ہونے کے تمام لوازم پیدا ہو جاتے ہوں گے اور وُہ کھانے کے بھی لائق ہوتے ہوں گے اور ان کی نسل بھی آج تک کروڑ ہا پرندے زمین پر موجود ہوں گے اور کسی بیماری سے یا شکاری کے ہاتھ سے مرتے ہوں گے تو ایسا اعتقاد بلا شبہ شرک ہے بہت لوگ اس وسوسہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی نبی کے دعا کرنے سے کوئی مُردہ زندہ ہو جائے یا کوئی جماد جاندار بن جائے تو اس میں کونسا شرک ہے ایسے لوگوں کو جاننا چاہیئے کہ اِس جگہ دعا کا کچھ ذکر نہیں اور دعا کا قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہوتا ہے اور دُعا پر جو فعل مترتب ہوتا ہے وہ فعل الٰہی ہوتا ہے نبی کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا اور نبی خواہ دعا کرنے کے بعد فوت ہو جائے نبی کے موجود ہونے یا نہ ہونے کی اُس میں کچھ حاجت نہیں ہوتی۔ غرض نبی کی طرف سے صرف دعا ہوتی ہے جو کبھی قبول اور کبھی رَدّ بھی ہو جاتی ہے لیکن اس جگہ وہ صورت نہیں۔ اناجیل اربعہ کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح جو جو کام

---

[1] الرعد آیت ۱۷

اپنی قوم کو دکھلاتا تھا وہ دُعا کے ذریعہ سے ہرگز نہیں تھے اور قرآن شریف میں بھی کسی جگہ یہ ذکر نہیں کہ مسیح بیماروں کے چنگا کرنے یا پرندوں کے بنانے کے وقت دعا کرتا تھا بلکہ وہ اپنی روح کے ذریعہ سے جس کو رُوح القدس کے فیضان سے برکت بخشی گئی تھی ایسے ایسے کام اقتداری طور پر دکھاتا تھا چنانچہ جس نے کبھی اپنی عمر میں غور سے انجیل پڑھی ہوگی وہ ہمارے اس بیان کی بالیقین تمام تصدیق کریگا اور قرآن شریف کی آیات بھی بآواز بلند یہی پُکار رہی ہیں کہ مسیح کے ایسے عجائب کاموں میں اُس کو طاقت بخشی گئی تھی اور خدائے تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ وہ ایک فطرتی طاقت تھی جو ہر یک فرد بشر کی فطرت میں مودَع ہے مسیح سے اُس کی کچھ خصوصیت نہیں چنانچہ اس بات کا تجربہ اسی زمانہ میں ہو رہا ہے مسیح کے معجزات تو اُس تالاب کی وجہ سے بے رونق اور بے قدر تھے جو مسیح کی ولادت سے بھی پہلے مظہر عجائبات تھا جس میں ہر قسم کے بیمار اور تمام مجذوم مفلوج مبروص وغیرہ ایک ہی غوطہ مار کر اچھے ہو جاتے تھے لیکن بعد کے زمانوں میں جو لوگوں نے اِس قسم کے خوارق دکھلائے اُس وقت تو کوئی تالاب بھی موجود نہیں تھا۔

غرض یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور اُن میں پھونک مار کر اُنہیں سچ مچ کے جانور بنا دیتا تھا نہیں بلکہ صرف عمل الترب تھا جو روح کی قوت سے ترقی پذیر ہو گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح ایسے کام کے لیے اُس تالاب کی مٹی لاتا تھا جس میں روح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی بہرحال یہ معجزہ صرف ایک کھیل کی قسم میں سے تھا اور وہ مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ۔ فَتَدَبَّرْ فَاِنَّہٗ نُکْتَۃٌ جَلِیْلَۃٌ مَا یُلَقّٰھَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔

(ازالہ اوہام حاشیہ حصہ اوّل حاشیہ ص۲۹۵-۳۲۲)

وَقَالُوْا اِنَّہٗ کَانَ خَالِقَ الطُّیُوْرِ کَخَلْقِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَجَعَلَہُ اللّٰہُ شَرِیْکَہٗ بِاِذْنِہٖ وَالطُّیُوْرُ الَّتِیْ تُوْجَدُ فِیْ ھٰذَا الْعَالَمِ تَنْحَصِرُ فِی الْقِسْمَیْنِ خَلْقُ اللّٰہِ وَخَلْقُ الْمَسِیْحِ فَانْظُرْ کَیْفَ جَعَلُوا ابْنَ مَرْیَمَ مِنَ الْخَالِقِیْنَ۔ وَیُشِیْعُوْنَ فِی النَّاسِ ھٰذِہِ الْعَقَائِدَ وَلَا یَدْرُوْنَ مَا فِیْھَا مِنَ الْبَلَایَا وَالْمَنَایَا وَیُؤَیِّدُوْنَ الْمُتَنَصِّرِیْنَ وَھَلَکَ بِھَا اِلَی الْاٰنَ اُلُوْفٌ مِّنَ النَّاسِ وَدَخَلُوْا فِی الْمِلَّۃِ النَّصْرَانِیَّۃِ بَعْدَ مَا کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ۔ وَمَا کَانَ فِی الْقُرْاٰنِ ذِکْرُ خَلْقِہٖ عَلَی الْوَجْہِ الْحَقِیْقِیِّ وَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی

(ترجمہ) (لوگ کہتے ہیں کہ مسیح خدا تعالیٰ کی طرح وہ پرندوں کا بھی خالق تھا اور خدا تعالیٰ نے اپنے اذن سے اُس کو اپنا شریک بنایا۔ سو وہ سب پرندے جو دُنیا میں پائے جاتے ہیں دو قسم کے ہیں کچھ خدا کی پیدائش اور کچھ مسیح کی سو دیکھو کیونکر ابن مریم کو خالق بنا دیا۔ اور لوگوں میں یہ عقاید شائع کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان عقیدوں میں کیا کیا بلائیں اور موتیں ہیں اور نصاریٰ کو مدد پہنچا رہے ہیں۔ اور ان عقاید کی شامت سے اب تک ہزاروں انسان ہلاک ہو چکے اور نصرانی مذہب میں داخل ہو گئے بعد اس کے جو وہ مسلمان تھے اور قرآن میں مسیح کے پرندے بنانے کا ذکر حقیقی طور پر کہیں بھی نہیں اور خدا نے اِس قصہ

عِنْدَ ذِكْرِ هٰذِهِ الْقِصَّةِ فَيَصِيْرُ حَيًّا بِاِذْنِ اللّٰهِ بَلْ قَالَ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ فَانْظُرُوْا لَفْظَ فَيَكُوْنُ وَلَفْظَ طَيْرًا لِمَ اخْتَارَهُمَا الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ وَتَرَكَ لَفْظَ يَصِيْرُ حَيًّا فَثَبَتَ مِنْ هٰهُنَا اَنَّ اللّٰهَ مَا اَرَادَ هٰهُنَا خَلْقًا حَقِيْقِيًّا كَخَلْقِهٖ عَزَّ وَجَلَّ وَيُؤَيِّدُهٗ مَا جَاءَ فِيْ كُتُبِ التَّفْسِيْرِ مِنْ بَعْضِ الصَّحَابَةِ اَنَّ طَيْرَ عِيْسٰى مَا كَانَ يَطِيْرُ اِلَّا اَمَامَ اَعْيُنِ النَّاسِ فَاِذَا غَابَ سَقَطَ عَلَى الْاَرْضِ وَرَجَعَ اِلٰى اَصْلِهٖ كَعَصَا مُوْسٰى وَكَذَالِكَ كَانَ اِحْيَاءُ عِيْسٰى فَاَيْنَ الْحَيَاةُ الْحَقِيْقِيُّ فَلِاَجْلِ ذَالِكَ اخْتَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ اَلْفَاظًا تُنَاسِبُ الْاِسْتِعَارَاتِ لِيُشِيْرَ اِلَى الْاِعْجَازِ الَّذِيْ بَلَغَ اِلٰى حَدِّ الْمَجَازِ وَذَكَرَ مَجَازًا لِيُبَيِّنَ اِعْجَازًا فَحَمَلَهُ الْجَاهِلُوْنَ الْمُسْتَعْجِلُوْنَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَسَلَكُوْهُ مَسْلَكَ خَلْقِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ تَفَاوُتٍ مَعَ اَنَّهٗ كَانَ مِنْ نَفْخِ الْمَسِيْحِ وَتَاثِيْرِ رُوْحِهٖ مِنْ غَيْرِ مُقَارَنَتِهٖ دُعَاءً فَهَلَكُوْا وَاَهْلَكُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ۔

وَالْقُرْاٰنُ لَا يَجْعَلُ شَرِيْكًا فِيْ خَلْقِ اللّٰهِ اَحَدًا وَّلَوْ فِيْ ذُبَابٍ اَوْ بَعُوْضَةٍ بَلْ يَقُوْلُ اِنَّهٗ وَاحِدٌ ذَاتًا وَّصِفَاتًا فَاقْرَؤُا الْقُرْاٰنَ كَالْمُتَدَبِّرِيْنَ۔ فَالْاَمْرُ الَّذِيْ ثَبَتَ عَقْلًا

کے ذکر کرنے کے وقت یہ نہیں فرمایا کہ فیصیر حیًّا باذن اللہ بلکہ یہ فرمایا کہ فیکون طیرًا باذن اللہ سو لفظ فَیَکُوْنُ اور لفظ طَیْرًا میں غور کرو کہ کیوں اس علیم حکیم نے انہیں دونوں لفظوں کو اختیار کیا اور لفظ فیصیر حیا کو چھوڑ دیا سو اس جگہ ثابت ہوا کہ اِس جگہ خدا تعالیٰ کی مراد حقیقی خلق نہیں ہے اور وہ خالقیت مراد نہیں ہے جو اس کی ذات سے مخصوص ہے اور اس کی تائید وہ بیانات کرتے ہیں جو بعض صحابہ سے تفسیروں میں بیان ہوئے ہیں اور وہ یہ کہ عیسیٰ کا پرندہ اُسی وقت تک پرواز کرتا تھا جب تک کہ وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہتا تھا اور جب غائب ہوتا تھا تو گر جاتا تھا اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرتا تھا جیسے عصا موسیٰ کا اور عیسیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا بھی ایسا ہی تھا سو اس جگہ حیات حقیقی کہاں ثابت ہوئی سو اسی لیے خدا تعالیٰ نے اس مقام میں وہ لفظ اختیار کیے جو استعارات کے مناسب حال تھے تا کہ اس مجاز کی طرف اشارہ کرے جو اعجاز کی حد تک پہنچا تھا اور مجاز کو اس لیے ذکر کیا کہ تا اُن کے معجزہ کو جو خارق عادت تھا بیان فرماوے پس اس مجاز کو جاہلوں نے حقیقت پر حمل کر دیا اور ایسے مرتبہ میں داخل کیا جو الٰہی پیدائش کا مرتبہ ہے حالانکہ وہ صرف نفخ مسیح اور اس کی روح کی تاثیر سے تھا اور اُس کے ساتھ کوئی دعا نہیں تھی سو ایسے سمجھنے والے ہلاک ہوئے اور بہتوں کو جاہلوں میں سے ہلاک کیا۔

اور قرآن تو کسی کو خدا کی خالقیت میں شریک نہیں کرتا اگرچہ ایک مکھی بنانے یا ایک مچھر بنانے میں شراکت ہو بلکہ وہ کہتا ہے کہ خدا ذاتاً و صفاتاً واحد لاشریک ہے سو تم قرآن کو ایسا پڑھو جیسا کہ تدبر کرنے والے پڑھتے ہیں۔ سو جو امر عقلاً

وَنَقْلًا وَاسْتِدْلَالًا لَا يُنْكِرُهُ اَحَدٌ اِلَّا الَّذِيْ مَا بَقِيَ فِيْ رَاْسِهٖ مِرَّةٌ اِنْسَانِيَّةٌ وَلَحِقَ بِالْاَخْسَرِيْنَ السَّافِلِيْنَ۔ وَلَا يَقُوْلُ اَحَدٌ كَمِثْلِ هٰذِهِ الْكَلِمَاتِ اِلَّا الَّذِيْ نَسِيَ طَرِيْقَ التَّوْحِيْدِ وَمَالَ اِلَى الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَمَا بَلَغَ نَظْرُهٗ اِلٰى نَتَائِجِهَا الضَّرُوْرِيَّةِ وَمَفَاسِدِهَا الْمَخْفِيَّةِ اَوِ الَّذِيْ رَسَا عَلٰى جَهْلِهٖ عَمَدًا اَوْغَرِقَ فِيْ لُجَّةِ التَّقْلِيْدِ غَرْقًا حَتّٰى فَقَدَ اَثَرَ حُرِّيَّةِ الْاِنْسَانِيَّةِ وَسَقَطَ فِيْ شَبَكَةٍ لَا تَخَلُّصَ مِنْهَا وَتَابَعَ اَثَرَ اِبْلِيْسَ اللَّعِيْنِ وَالَّذِيْ آمَنَ بِالْقُرْآنِ وَاَلْقٰى نَفْسَهٗ تَحْتَ هِدَايَاتِهٖ فَلَنْ يَرْضٰى بِمِثْلِ هٰذِهِ الْعَقَائِدِ بَلْ لَا يَسُوْغُ لَهٗ قَوْلٌ يُخَالِفُ الْقُرْآنَ بِالْبَدَاهَةِ وَيُعَارِضُ بَيِّنَاتِهٖ وَمُحْكَمَاتِهٖ صَرِيْحًا وَاَيُّ ذَنْبٍ اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ اَنَّ اَحَدًا يُؤْمِنُ بِالْقُرْآنِ ثُمَّ يَرْجِعُ وَيُنْكِرُ بَعْضَ هِدَايَاتِهٖ وَيَتَّبِعُ الْمُتَشَابِهَاتِ وَيَتْرُكُ الْمُحْكَمَاتِ وَيُحَرِّفُ الْقُرْآنَ وَيُغَيِّرُ مَعَانِيَهٗ مِنْ مَرْكَزِهَا الْمُسْتَقِيْمِ وَيُؤَيِّدُ بِاَقْوَالِهٖ قَوْمًا مُشْرِكِيْنَ۔ وَلٰكِنِ الَّذِيْ تَمَسَّكَ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَآمَنَ بِمَا فِيْهِ صِدْقًا وَحَقًّا فَاَيُّ حَرَجٍ عَلَيْهِ وَاَيُّ ضَيْرٍ اِنْ تَرَكَ رِوَايَاتٍ اُخْرٰى الَّتِيْ تُخَالِفُ بَيِّنَاتِ الْقُرْآنِ وَلَيْسَتْ ثَابِتَةً مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ بِثُبُوْتٍ قَطْعِيٍّ يَقِيْنِيٍّ الَّذِيْ يُسَاوِيْ ثُبُوْتَ الْقُرْآنِ وَتَوَاتُرَهٗ اَوْ تَرَكَ مَثَلًا مَعَانٍ تُخَالِفُ نُصُوْصَهٗ وَاخْتَارَ الْمُوَافِقَ وَلَوْ

ونقلاً واستدلالاً ثابت ہوگیا اُس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا بجز ایسے شخص کے جس کے سر میں انسانی دانشمندی کا مادہ نہیں رہا اور زیاں کاروں اور تحت الثریٰ جانیوالوں کے ساتھ جاملا۔ اور ایسی باتیں کوئی مُنہ پر نہیں لائیگا مگر وہی جو توحید کی راہ کو بھول گیا اور پہلی جاہلیت کی طرف مایل ہوگیا اور اُس کی نظر ان عقیدوں کے لازمی نتیجوں اور چھپے ہوئے فسادوں تک نہیں پہنچ سکی یا وہ شخص ایسے کلمات کہیگا جو جہالت کی باتوں پر اڑ بیٹھا اور تقلید کے دریا میں غرق ہوگیا یہاں تک کہ انسانی آزادی کے نام ونشان کو کھو بیٹھا اور ایسے جال میں پھنس گیا جس میں سے نجات نہیں اور ابلیس لعین کے نشان قدم کا پیرو ہوگیا اور وہ شخص جو قرآن پر ایمان لایا اور اس کی ہدایتوں کے نیچے اپنے تئیں ڈال دیا سو وہ ایسے عقائد پر کبھی راضی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسی باتوں کو جو صریح قرآن کے مخالف اور اس کی محکم آیتوں کے کھلے کھلے معارض ہیں ناجائز سمجھے گا اور اس سے بڑھ کر اور کونسا گناہ ہوگا کہ ایک شخص قرآن پر ایمان لاکر پھر رجوع کرے اور اس کی بعض ہدایتوں سے انکاری ہوجائے اور متشابہات کی پیروی کرنے لگے اور محکمات کو چھوڑ دے اور قرآن کی تحریف کرے اور اُس کے معانی کو اُن کے مرکز مستقیم سے پھیر دے اور اپنی باتوں سے مشرکوں کو مدد دے۔ مگر وہ شخص جس نے کتاب اللہ سے پنجہ مارا اور جو کچھ اس میں ہے اُن سب باتوں پر ایمان لایا اور سچ اور حق سمجھ لیا پس اس پر کونسا ہرج اور کونسا مضائقہ ہے اگر وہ ایسی روایتوں کو چھوڑ دے جو قرآن کے کھلے کھلے بیانات کی مخالف ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی قطعی اور یقینی طور سے ثابت نہیں جو قرآن کے ثبوت اور تواتر سے برابری کرسکے یا مثلاً کوئی ایسے معانی ترک کرے جو نصوص قرآنیہ کے مخالف ہیں اور وہ

بِالتَّاوِیْلِ بَلْ ھٰذَا مِنْ سِیَرِ الصَّالِحِیْنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ وَمِنْ سِیَرِ الصِّدِّیْقَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ فَالْوَاجِبُ عَلَی الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ الْمُتَوَرِّعِ الَّذِیْ یَتَّقِی اللّٰہَ حَقَّ التُّقَاتِ اَنْ یَعْتَصِمَ بِحَبْلِ اللّٰہِ الْقُرْاٰنِ وَلَا یُبَالِیْ غَیْرَہُ الَّذِیْ یُخَالِفُہٗ وَ اِذَا رَاٰی وَانْکَشَفَ عَلَیْہِ اَنَّ بَعْضَ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ اَوِ الْخَلَفِ غَلَطُوْا فِیْ فَہْمِ اَمْرٍ فَلَیْسَ مِنْ دِیَانَتِہٖ اَنْ یَتَّبِعَ اَغْلَاطَہُمْ وَیَقْبَلَہَا بِغَضِّ الْبَصَرِ وَلَا یُفَارِقَہَا بِتَفْہِیْمِ مُفْہِمٍ۔ (نورالحق صفحہ ۱۰ الحصۃ الاولیٰ)

ہمارے کم توجہ علماء کی یہ غلطی ہے کہ اُن (مسیح علیہ السلام) کی نسبت وہ گمان کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی خالق العٰلمین کی طرح کسی جانور کا قالب تیار کر کے پھر اُس میں پھونک مارتے تھے اور وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتا اور مُردہ پر ہاتھ رکھتے تھے اور وہ زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگتا تھا اور غیب دانی کی بھی اُن میں طاقت تھی اور اب تک مرے بھی نہیں مع جسم آسمان پر موجود ہیں اور اگر یہ باتیں جو ان کی طرف نسبت دی گئی ہیں صحیح ہوں تو پھر اُن کے خالق العالم اور عالم الغیب اور محی اموات ہونے میں کیا شک رہا پس اگر اس صورت میں کوئی عیسائی اِن کی الوہیت پر استدلال کرے اِس بنا پر کہ لوازم شئے کا پایا جانا وجود شئے کو مستلزم ہے تو ہمارے بھائی مسلمانوں کے پاس اِس کا کیا جواب ہے اگر کہیں کہ دُعاء سے ایسے معجزات ظہور میں آتے تھے تو یہ کلام الٰہی پر زیادت ہے کیونکہ قرآن کریم سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً پھونک مارنے سے وہ چیز جو ہیئت طیر کی طرح بنائی جاتی تھی اُڑنے لگتی تھی۔ دُعا کا تو قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں اور نہ یہ ذکر ہے کہ اُس ہیئت طیر میں درحقیقت جان پڑ جاتی تھی۔ یہ تو نہیں چاہیئے کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی پر کچھ زیادت کریں یہی تو تحریف ہے جس کی وجہ سے یہودیوں پر لعنت ہوئی۔ پھر جس حالت میں جان پڑنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ معالم التنزیل اور بہت سی اور تفسیروں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہیئت طیر تھوڑی دیر اُڑ کر پھر مٹی کی طرح زمین پر گر پڑتی تھی تو بجز اُس کے اور کیا سمجھا جائے کہ وہ دراصل مٹی کی مٹی ہی تھی۔ اور جس طرح مٹی کے کھلونے انسانی کلوں سے چلتے پھرتے ہیں وہ ایک نبی کی روح کی سرایت سے پرواز کرتے تھے ورنہ حقیقی خالقیت کے ماننے سے عظیم الشان فساد اور شرک لازم آتا ہے غرض تو معجزہ سے ہے اور بیجان کا باوجود بیجان ہونے کے پرواز یہ بڑا معجزہ ہے ہاں اگر قرآن کریم کی کسی قراءت میں اِس موقعہ پر فَیَکُوْنُ حَیًّا کا لفظ

معنے اختیار کرے جو اُس کے موافق ہیں اگرچہ تاویل سے ہی سہی بلکہ یہ تو نیک بختوں اور متقیوں کا طریق ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ام المومناں کے طریق اور خصلت میں سے ہے پس ایسے شخص پر جو مومن مسلمان پرہیز گار ہے اور خدا سے جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے ڈرتا ہے واجب ہے جو حبل اللہ سے جو قرآن ہے پنجہ مارے اور اُس کے غیر کی کچھ پروا نہ کرے جو اس کا مخالف ہے اور جب دیکھے اور جب اُس پر کھلے کہ بعض علماء سلف میں سے یا خلف میں سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی میں پڑ گئے ہیں تو اُس کی دیانت سے بعید ہوگا کہ اُن کی غلطیوں کی پیروی کرے اور آنکھ بند کر کے ان کو قبول کر لیوے اور کسی سمجھانے والے کے سمجھانے سے باز نہ آوے۔ (نورالحق صفحہ ۱۰ حصہ اوّل)

موجود ہے یا تاریخی طور پر ثابت ہے کہ درحقیقت وہ زندہ ہو جاتے تھے اور انڈے بھی دیتے تھے اور اب تک اُن کی نسل سے بھی بہت سے پرندے موجود ہیں تو پھر ان کا ثبوت دینا چاہیئے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اگر تمام دنیا چاہے کہ ایک مکھی بنا سکے تو نہیں بن سکتی کیونکہ اس سے تشابہ فی خلق اللہ لازم آتا ہے ۔ اور یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے آپ اُن کو خالق ہونے کا اذن دے رکھا تھا یہ خدا تعالیٰ پر افترا ہے کلام الٰہی میں تناقض نہیں خدا تعالیٰ کسی کو ایسے اذن نہیں دیا کرتا ۔ اللہ تعالیٰ نے سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مکھی بنانے کا بھی اذن نہ دیا ۔ پھر مریم کے بیٹے کو یہ اذن کیونکر حاصل ہوا ۔ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور مجاز کو حقیقت پر حمل نہ کرو ۔ (شہادت القرآن صفحہ ۷۸-۷۹ حاشیہ)

پھر ان (حضرت مسیح علیہ السلام) کا جانور بنانا ہے سو اس میں بھی ہم اس بات کے تو قایل ہیں کہ روحانی طور سے معجزہ کے طور پر درخت بھی ناچنے لگ جاوے تو ممکن ہے مگر یہ کہ انہوں نے چڑیاں بنا دیں اور انڈے بچے دیدئے اس کے ہم قائل نہیں ہیں اور نہ قرآن شریف سے ایسا ثابت ہے ۔ ہم کیا کریں ہم اس طور پر ان باتوں کو مان ہی نہیں سکتے جس طرح پر ہمارے مخالف کہتے ہیں کیونکہ قرآن شریف صریح اس کے خلاف ہے ۔ اور وہ ہماری تائید میں کھڑا ہے ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

چڑیاں کیا شئی ہیں ہم تو یہ بھی مانتے ہیں کہ ایک درخت بھی ناچنے لگے مگر پھر بھی وہ خدا کی چڑیوں کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتی کہ جس سے تشابہ فی الخلق لازم آجاوے ۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۶)

خلق طیور...... پر ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اس سے ایسے پرندے مراد ہیں جن کا ذبح کر کے گوشت بھی کھایا جا سکے ...... بلکہ مراد یہ ہے کہ خلق طیور اس قسم کا تھا کہ حد اعجاز تک پہنچا ہوا تھا ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۴)

حضرت عیسیٰؑ کا خلق طیور کا مسئلہ بعینہٖ موسیٰ علیہ السلام کے سوٹے والی بات ہے ۔ دشمنوں کے مقابلہ کے وقت وہ اگر سانپ بن گیا تھا تو دوسرے وقت میں وہی سوٹے کا سوٹا تھا ۔ نہ یہ کہ وہ کہیں سانپوں کے گروہ میں چلا گیا تھا پس اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے وہ طیور بھی آخر مٹی کی مٹی ہی تھے بلکہ حضرت موسیٰؑ کا سوٹا تو چونکہ مقابلہ میں آگیا تھا اور مقابلہ میں غالب ثابت ہوا تھا اس واسطے حضرت عیسیٰؑ کے طیور سے بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ طیور تو نہ کسی مقابلے میں آئے اور نہ اُن کا غلبہ ثابت ہوا ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

اَکْمَہ ...... کے معنے شبکور کے ہیں ...... یہ اَکْمَہ وہ مرض ہے کہ جس کا علاج بکرے کی کلیجی کھانا بھی ہے اور اس سے بھی یہ اچھے ہو جاتے ہیں ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

حضرت عیسیٰ کے معجزے تو ایسے ہیں ۔ کہ اس زمانے میں وہ بالکل معمولی سمجھے جا سکتے ہیں ۔ اَکْمَہ سے مراد شب کور ہے ۔ اب ایسا بیمار معمولی کلیجی سے بھی اچھا ہو سکتا ہے ۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

علاج کی چار صورتیں تو عام ہیں دوا سے۔ غذا سے۔ عمل سے پرہیز سے علاج کیا جاتا ہے ایک پانچویں قسم بھی ہے جس سے سلب امراض ہوتا ہے وہ توجہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام اسی توجہ سے سلب امراض کیا کرتے تھے اور یہ سلب امراض کی قوت مومن اور کافر کا امتیاز نہیں رکھتی بلکہ اس کے لیے نیک چلن ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ نبی اور عام لوگوں کی توجہ میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ نبی کی توجہ کسبی نہیں ہوتی وہبی ہوتی ہے۔ آج کل ڈوئی جو بڑے بڑے دعوے کرتا ہے یہ بھی وہی سلب امراض ہے۔ توجہ ایک ایسی چیز ہے کہ اُس سے سلب ذنوب بھی ہو جاتا ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اور مسیح علیہ السلام کی توجہ میں یہ فرق ہے کہ مسیح کی توجہ سے تو سلب امراض ہوتا تھا مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ سے سلب ذنوب ہوتا تھا اور اس وجہ سے آپ کی قوت قدسی کمال کے درجہ پہنچی ہوئی تھی۔ دعا بھی توجہ ہی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ توجہ کا سلسلہ کڑیوں کی طرح ہوتا ہے جو لوگ حکیم اور ڈاکٹر ہوتے ہیں اُن کو اس فن میں مہارت پیدا کرنی چاہیئے۔ مسیح کی توجہ چونکہ زیادہ تر سلب امراض کی طرف تھی اس لیے سلب ذنوب میں ان کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہی تھی۔ کہ جو جماعت اُنہوں نے تیار کی وہ اپنی صفائی نفس اور تزکیہ باطن میں ان مدارج کو پہنچ نہ سکی جو جلیل الشان صحابہ کو ملی اور یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی با اثر تھی کہ آج اس زمانہ میں بھی تیرہ سو برس کے بعد سلب ذنوب کی وہی قوت اور تاثیر رکھتی ہے جو اُس وقت رکھتی تھی۔ مسیح اس میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

فَاعْلَمْ اَنَّا نُؤْمِنُ بِاِحْيَاءٍ اِعْجَازِيٍّ وَخَلْقٍ اِعْجَازِيٍّ وَلَا نُؤْمِنُ بِاِحْيَاءٍ حَقِيْقِيٍّ وَخَلْقٍ حَقِيْقِيٍّ كَاِحْيَاءِ اللّٰهِ وَخَلْقِ اللّٰهِ وَلَوْ كَانَ كَذٰلِكَ لَتَشَابَهَ الْخَلْقُ وَالْاِحْيَاءُ وَقَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَا قَالَ فَيَكُوْنُ حَيًّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَا قَالَ فَيَصِيْرُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاِنَّ مَثَلَ طَيْرِ عِيْسٰى كَمَثَلِ عَصَا مُوْسٰى ظَهَرَتْ كَحَيَّةٍ تَسْعٰى وَلٰكِنْ مَا تَرَكَتْ لِلّٰهِ وَامِ سِيْرَتَهُ الْاُوْلٰى وَكَذٰلِكَ قَالَ الْمُحَقِّقُوْنَ اِنَّ طَيْرَ عِيْسٰى كَانَ يَطِيْرُ اَمَامَ اَعْيُنِ النَّاسِ وَاِذَا غَابَ فَكَانَ يَسْقُطُ وَيَرْجِعُ اِلٰى سِيْرَتِهِ الْاُوْلٰى فَاَيْنَ حَصَلَ لَهُ الْحَيَاتُ الْحَقِيْقِيُّ وَكَذٰلِكَ كَانَ

(ترجمہ) (وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ) جان لو کہ ہم احیاء اعجازی اور خلق اعجازی پر ایمان لاتے ہیں نہ کہ حقیقی طور پر زندہ کرنے اور پیدا کرنے پر جیسا کہ خدا تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو یہ احیاء اور خلق (خدا تعالیٰ کے خلق اور احیاء سے) متشابہ ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فیکون طیراً باذن اللہ کہا ہے اور یہ نہیں کہا کہ فیکون حیًّا باذن اللہ اور نہ یہ فرمایا کہ فَيَصِيْرُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے پرندوں کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی مثال ہے جو بھاگتے ہوئے سانپ کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی پہلی سیرت کو چھوڑ نہیں دیا تھا۔ اور اسی طرح محققین نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرندے جب تک لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رہتے تھے اڑتے تھے اور جونہی وہ نظروں سے غائب ہوتے۔ نیچے گر جاتے اور اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آتے۔ پس ان پرندوں کو حقیقی زندگی کہاں حاصل ہوئی تھی

حَقِیْقَۃُ الْاِحْیَاءِ اَعْنِیْ اَنَّہٗ مَارَدَّ اِلٰی مَیِّتٍ قَطُّ لَوَازِمَ الْحَیَاۃِ کُلَّھَا بَلْ کَانَ یُرِیْ جَلْوَۃً مِّنْ حَیَاۃِ الْمَیِّتِ بِتَاثِیْرِ رُوْحِہِ الطَّیِّبِ وَکَانَ الْمَیِّتُ حَیًّا مَادَامَ عِیْسٰی قَائِمًا عَلَیْہِ اَوْ قَاعِدًا فَاِذَا ذَھَبَ فَعَادَ الْمَیِّتُ اِلٰی حَالِہِ الْاَوَّلِ وَمَاتَ فَکَانَ ھٰذَا اِحْیَاءً اِعْجَازِیًّا لَا حَقِیْقِیًّا۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۰)

کَانَ الْاِحْیَاءُ بِالنَّفْخِ کَالْاِمَاتَۃِ بِالنَّظْرِ۔ پھونک سے زندہ کرنا ایسا تھا جیسے نظر سے مارنا۔

(نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۸ حاشیہ)

اگر مسیح واقعی مردوں کو زندہ کرتے تھے تو کیوں پھونک مار کر ایلیا کو زندہ نہ کر دیا تا یہود ابتلا سے بچ جاتے اور خود مسیح کو بھی ان تکالیف اور مشکلات کا سامنا نہ ہوتا جو ایلیا کی تاویل سے پیش آئیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

رہا حضرت عیسٰی کا احیاءِ موتیٰ۔ اس میں روحانی احیاءِ موتیٰ کے تو ہم بھی قائل ہیں اور ہم مانتے ہیں کہ روحانی طور پر مردے زندہ ہوا کرتے ہیں اور اگر یہ کہو کہ ایک شخص مر گیا اور پھر زندہ ہو گیا یہ قرآن شریف یا احادیث سے ثابت نہیں ہے اور ایسا ماننے سے پھر قرآن شریف اور احادیث نبوی گو یا ساری شریعت اسلام ہی کو ناقص ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ردّالموتیٰ کے متعلق مسائل نہ قرآن شریف میں ہیں نہ حدیث نے کہیں ان کی صراحت کی ہے اور نہ فقہ میں کوئی بات اس کے متعلق ہے غرض کسی نے بھی اس کی تشریح نہیں کی۔ اس طرح پر یہ مسئلہ بھی صاف ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

ہم اعجازی احیاء کے قایل ہیں مگر یہ بات بالکل ٹھیک نہیں ہے کہ ایک مردہ اس طرح زندہ ہوا ہو کہ وہ پھر اپنے گھر میں آیا اور رہا اور ایک اور عمر اس نے بسر کی اگر ایسا ہوتا تو قرآن ناقص ٹھہرتا ہے کہ اس نے ایسے شخص کی وراثت کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۶)

اصل میں..... احیاءِ موتیٰ پر ہمارا یہ ایمان نہیں ہے..... نہ احیائے موتیٰ سے یہ مطلب ہے کہ حقیقی مُردہ کا احیاء کیا گیا...... احیائے موتیٰ کے یہ معنے ہیں کہ (۱) روحانی زندگی عطا کی جاوے (۲) یہ کہ بذریعہ دعا ایسے انسان کو شفا دی جاوے کہ وہ گو یا مردوں میں شمار ہو چکا ہو جیسا کہ عام بول چال میں کہا جاتا ہے کہ فلاں تو مر گیا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۴)

یہی حقیقت ان کے مُردے زندہ کرنے کی ہے یعنی انہوں نے کسی مُردہ میں کبھی تمام لوازمات زندگی دوبارہ نہیں لوٹائے۔ بلکہ ان کی پاکیزہ روح کی تاثیر سے مُردہ میں زندگی کا ایک جلوہ دکھلایا جاتا تھا اور وہ مُردہ اسی وقت تک زندہ رہتا تھا جب تک حضرت عیسٰی علیہ السلام اس کے پاس کھڑے یا بیٹھے رہتے جب آپ وہاں سے چلے جاتے تو مردہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتا اور مر جاتا پس یہ زندہ کرنا احیاء اعجازی تھا حقیقی نہ تھا۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹ ترجمہ از عربی)

احیاءِ موتی سے مراد بھی خطرناک مریضوں کا تندرست ہونا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

معجزہ عاداتِ الٰہیہ میں سے ایک ایسی عادت یا یوں کہو کہ اُس قادرِ مُطلق کے افعال میں سے ایک ایسا فعل ہے جس کو اضافی طور پر خارقِ عادت کہنا چاہیئے پس امر خارقِ عادت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جو پاک نفس لوگ عام طریق و طرزِ انسانی سے ترقی کر کے اور معمولی عادات کو پھاڑ کر قُربِ الٰہی کے میدانوں میں آگے قدم رکھتے ہیں تو خُدائے تعالیٰ حسبِ حالت اُن کے ایک ایسا عجیب معاملہ اُن سے کرتا ہے کہ وُہ عام حالاتِ انسانی پر خیال کرنے کے بعد ایک امرِ خارقِ عادت دکھائی دیتا ہے اور جس قدر انسان اپنی بشریت کے وطن کو چھوڑ کر اور اپنے نفس کے حجابوں کو پھاڑ کر عرصاتِ عشق و محبّت میں دور تر چلا جاتا ہے اُسی قدر یہ خوارق نہایت صاف اور شفاف اور روشن و نمایاں ظہور میں آتے ہیں۔ جب تزکیہ نفسِ انسانی کمالِ تام کی حالت پر پہنچتا ہے اور اُس کا دل غیر اللہ سے بالکل خالی ہو جاتا ہے اور محبّتِ الٰہی سے بھر جاتا ہے تو اُس کے تمام اقوال و افعال و اعمال و حرکات و سکنات و عبادات و معاملات و اخلاق جو انتہائی درجہ پر اُس سے صادر ہوتے ہیں وہ سب خارقِ عادت ہی ہو جاتے ہیں سو بمقابل اُس کے ایسا ہی معاملہ باری تعالیٰ کا بھی اُس مبدّل تام سے بطور خارقِ عادت ہی ہوتا ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۰-۲۱ حاشیہ)

یوں تو عاداتِ ازلیہ و ابدیہ خُدائے کریم جل شانہ سے کوئی چیز باہر نہیں مگر اُس کی عادات جو بنی آدم سے تعلّق رکھتی ہیں دو طور کی ہیں ایک عاداتِ عامّہ جو روپوش اسباب ہو کر سب پر مُؤثر ہوتی ہیں دوسری عاداتِ خاصہّ جو توسطِ اسباب اور بلا توسطِ اسباب خاص اُن لوگوں سے تعلّق رکھتی ہیں جو اُس کی محبت اور رضا میں کھوئی جاتی ہیں یعنی جب انسان بکُلّی خدائے تعالیٰ کی طرف انقطاع کر کے اپنی عاداتِ بشریہ کو استرضاءِ حق کے لیے تبدیل کر دیتا ہے تو خُدائے تعالیٰ اُس کی اُس حالتِ مُبدّلہ کے موافق اُس کے ساتھ ایک خاص معاملہ کرتا ہے جو دوسروں سے نہیں کرتا یہ خاص معاملہ نسبتی طور پر گویا خارقِ عادت ہے جس کی حقیقت اُنہیں پر کُھلتی ہے جو عنایتِ الٰہی سے اُس طرف کھینچے جاتے ہیں۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۵۵)

نبی اگر ایک سونٹا پھینک دے اور کہے کہ میرے سوا کوئی اس کو اُٹھا نہ سکے گا تو یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

معجزات وہی ہوتے ہیں جس کی نظیر لانے پر دوسرے عاجز ہوں۔ انسان کا یہ کام نہیں کہ وہ اُن کی حد بند کرے کہ ایسا ہونا چاہیئے یا ویسا ہونا چاہیئے۔ اس میں ضرور ہے کہ بعض پہلو اخفا کے ہوں کیونکہ نشانات کے ظاہر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایمان بڑھے اور اس میں ایک عرفانی رنگ پیدا ہو جس میں ذوق ملا ہوا ہو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

معجزہ سے مراد فرقان ہے جو حق اور باطل میں تمیز کر کے دکھا دے اور خدا کی ہستی پر شاہد ناطق ہو۔ {البدر جلد ۴ نمبر ۸ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲}

انبیاء علیہم السّلام کو جو معجزات دئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی تجارب شناخت نہیں کر سکتے۔ اور جب انسان اُن خارق عادت امور کو دیکھتا ہے تو ایک بار تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۲)

صحیح تاریخ ایک عمدہ معلّم ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہر نبی کے معجزات اس رنگ کے ہوتے ہیں جس کا چرچا اور زور اس کے وقت میں ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

میرا ایمان ہے۔ کہ بغیر معجزات کے زندہ ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اور خدا تعالیٰ کے ماموریں کی شناخت کا ذریعہ اُن کے معجزات اور نشانات ہوتے ہیں جیسا کہ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی شخص اگر حاکم مقرر کیا جاوے تو اس کو نشان دیا جاتا ہے اسی طرح پر خدا کے ماموریں کی شناخت کے لیے بھی نشانات ہوتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

معجزات اور خوارق قرآنی چار قسم پر ہیں۔ (۱) معجزات عقلیہ۔ (۲) معجزات علمیہ (۳) معجزات برکات روحانیہ (۴) معجزات تصرّفات خارجیہ۔ نمبر اوّل دو تین کے معجزات خواص ذاتیہ قرآن شریف میں سے ہیں اور نہایت عالیشان اور بدیہی الثبوت ہیں جن کو ہر یک زمانہ میں ہر یک شخص تازہ بتازہ طور پر چشم دید ماجرا کی طرح دریافت کر سکتا ہے لیکن نمبر چار کے معجزات یعنی تصرّفات خارجیہ یہ بیرونی خوارق ہیں جن کو قرآن شریف سے کچھ ذاتی تعلق نہیں انہیں میں سے معجزہ شق القمر بھی ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲ حاشیہ)

معجزات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ دعائیہ ارہاصیہ اور قوت قدسیہ کے معجزات۔ ارہاصیہ میں دعا کو دخل نہیں ہوتا۔ قوت قدسیہ کے معجزات ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی میں انگلیاں رکھ دی تھیں اور لوگ پانی پیتے چلے گئے۔ یا کنوئیں میں لب گرا دیا اور اس کا پانی میٹھا ہو گیا مسیح کے معجزات اس قسم کے بھی تھے۔ خود ہم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو کہ موسیٰؑ کے سوٹے کی طرح فوراً دکھا دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے علمی رنگ کے معجزات اور غیب پر مشتمل پیشگوئیاں۔ اول الذکر معجزات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن سے دشمنوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔ مگر دیرپا اور ہمیشہ کے واسطے نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ وقتی ضرورت کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ پیچھے آنے والی قوموں کے واسطے وہ کوئی حجت اور دلیل نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن میں تدبر و تفکر کا انسان کو موقع نہیں ملتا۔ مگر موخر الذکر معجزات ایسے علمی رنگ میں ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے واسطے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ انسان جوں جوں اُن میں غور و خوض کرتا ہے توں توں اُن کی شوکت اور عظمت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور جوں جوں بُعد زمانی ہوتا جاتا ہے اُن کی ضیاء اور شوکت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اُن کی عظمت میں فرق نہیں آتا چنانچہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اس قسم ثانی کے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

جس قدر معجزات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے ہیں دنیا میں کل نبیوں کے معجزات کو بھی اگر ان کے مقابل میں رکھیں تو میں ایمان سے کہتا ہوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بڑھ کر ثابت ہوں گے۔ قطع نظر اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے اور قیامت تک اور اس کے بعد تک کی پیشگوئیاں اس میں موجود ہیں سب سے بڑھ کر ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ان پیشگوئیوں کا زندہ ثبوت دینے والا موجود ہوتا ہے چنانچہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بطور نشان کھڑا کیا اور پیشگوئیوں کا ایک عظیم الشان نشان مجھے دیا تا میں اُن لوگوں کو جو حقائق سے بے بہرہ اور معرفت الٰہی سے بے نصیب ہیں روز روشن کی طرح دکھا دوں کہ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کیسے مستقل اور دائمی ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

قرآن کریم میں جس قدر معجزات آگئے ہیں ہم ان کے دکھانے کو زندہ موجود ہیں خواہ قبولیت دعا کے متعلق ہوں خواہ اور رنگ کے۔ معجزہ کے منکر کا یہی جواب ہے کہ اس کو معجزہ دکھایا جاوے اس سے بڑھ کر اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۴)

یہ بات اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس قسم کے اقتداری خوارق گو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی خدا تعالیٰ کے اُن خاص افعال سے جو بلا توسط ارادہ غیری ظہور میں آتے ہیں کسی طور سے برابری نہیں کر سکتے اور نہ برابر ہونا اُن کا مناسب ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی نبی یا ولی اقتداری طور پر بغیر توسط کسی دُعا کے کوئی ایسا امر خارق عادت دکھلاوے جو انسان کو کسی حیلہ اور تدبیر اور علاج سے اُس کی قوت نہیں دی گئی تو نبی کا وہ فعل خدا تعالیٰ کے اُن افعال سے کم رتبہ پر رہیگا جو خود خدا تعالیٰ علانیہ اور بالجہر اپنی قوت کاملہ سے ظہور میں لاتا ہے یعنی ایسا اقتداری معجزہ بہ نسبت دوسرے الٰہی کاموں کے جو بلا واسطہ اللہ جل شانہ سے ظہور میں آتے ہیں ضرور کچھ نقص اور کمزوری اپنے اندر موجود رکھتا ہوگا تا سرسری نگاہ والوں کی نظر میں تشابہ فی الخلق واقع نہ ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا باوجود اس کے کہ کئی دفعہ سانپ بنا لیکن آخر عصا کا عصا ہی رہا۔ اور حضرت مسیح کی چڑیاں باوجودیکہ معجزہ کے طور پر اُن کا پرواز قرآن کریم سے ثابت ہے مگر پھر بھی مٹی کی مٹی ہی تھے۔ اور کہیں خدا تعالیٰ نے یہ نہ فرمایا کہ وہ زندہ بھی ہوگئیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداری خوارق میں چونکہ طاقت الٰہی سب سے زیادہ بھری ہوئی تھی کیونکہ وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تجلیاتِ الٰہیہ کے لیے اتم و اعلیٰ و ارفع و اکمل نمونہ تھا اس لیے ہماری نظر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداری خوارق کو کسی درجہ بشریت پر مقرر کرنے سے قاصر ہیں مگر تاہم ہمارا اس پر ایمان ہے کہ اس جگہ بھی اللہ جل شانہ اور اُس کے رسول کریم کے فعل میں مخفی طور پر کچھ فرق ضرور ہوگا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۶۷-۶۸)

قرآن شریف میں حضرت مسیح ابن مریم کے معجزات کا ذکر اس غرض سے نہیں ہے کہ اس سے معجزات زیادہ ہوئے ہیں بلکہ اس غرض سے ہے کہ یہودی اس کے معجزات سے قطعاً منکر تھے اور اس کو فریبی اور مکار کہتے تھے پس خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہودیوں کے دفع اعتراض کے لیے مسیح ابن مریم کو صاحب معجزہ قرار دیا۔ (نسیم دعوت صفحہ ۱۵-۱۶)

حضرت عیسیٰ نے خود کہا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ (بدر جلد ۵ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۸ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۶)

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

شریعت نے اسباب کو منع نہیں کیا ہے اور سچ پوچھو تو کیا دعا اسباب نہیں؟ یا اسباب دعا نہیں؟ تلاش اسباب بجائے خود ایک دعا ہے اور دعا بجائے خود عظیم الشان اسباب کا چشمہ! ..... اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دنیا پر کھول دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسولوں کو باقی نہ رہنے دیتے مگر پھر بھی ایک وقت ان پر آتا ہے کہ وہ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کیا وہ ایک ٹکڑ گدا فقیر کی طرح بولتے ہیں؟ نہیں۔ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے وہ دنیا کو رعایت اسباب سکھانا چاہتے ہیں جو دعا کا ایک شعبہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ پر ان کو کامل ایمان اس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا[1] ایک یقینی اور حتمی وعدہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دل میں مدد کا خیال نہ ڈالے تو کوئی کیونکر مدد کر سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

اشاعت دین میں مامور من اللہ دوسروں سے مدد چاہتے ہیں۔ مگر کیوں؟ اپنے ادائے فرض کے لیے تاکہ دلوں میں خدا تعالیٰ کی عظمت پیدا کرے ورنہ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ قریب بہ کفر پہنچ جاتی ہے اگر غیر اللہ کو متولی قرار دیں اور ان نفوس قدسیہ سے ایسا امکان؟ محال مطلق ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

تمام کامیابی ہماری معاشرت اور آخرت کے تعاون پر ہی موقوف ہو رہی ہے کیا کوئی اکیلا انسان کسی کام دین یا دنیا کو انجام دے سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی کام دینی ہو۔ یا دنیوی بغیر معاونت باہمی کے چل ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک گروہ کہ جس کا مدعا اور مقصد ایک ہی مثل اعضائے یک دیگر ہے۔ اور ممکن نہیں۔ جو کوئی فعل جو متعلق غرض مشترک اس گروہ کے ہے۔ بغیر معاونت باہمی ان کی کے بخوبی و خوش اسلوبی ہو سکے۔ بالخصوص جس قدر جلیل القدر کام ہیں۔ اور جن کی

[1] المومن۔ آیت ۵۲

علّت غائی کوئی فائدہ عظیمہ جمہوری ہے وہ تو بجز جمہوری اعانت کے کسی طور پر انجام پذیر ہی نہیں ہو سکتے اور صرف ایک ہی شخص ان کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کبھی ہوا۔ انبیاء علیہم السلام جو توکل اور تفویض اور تحمل اور مجاہدات افعال خیر میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ ان کو بھی بہ رعایت اسباب ظاہری مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ کہنا پڑا خدا نے بھی اپنے قانون تشریعی میں بہ تصدیق اپنے قانون قدرت کے تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی[1] کا حکم فرمایا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۲۶)

۵۵۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝

خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ .... یعنی ایسا مکر کرنے والا جس میں کوئی شر نہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۱)

مکر لطیف اور مخفی تدبیر کو کہتے ہیں جس کا اطلاق خدا پر ناجائز نہیں۔ (استفتاء صفحہ ۸)

مکر کے مفہوم میں کوئی ایسا ناجائز امر نہیں ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ شریروں کو سزا دینے کے لیے خدا کے جو باریک اور مخفی کام ہیں اُن کا نام مکر ہے۔ (استفتاء صفحہ ۹)

لیکھرام نے نشان مانگنے کے وقت خدا تعالیٰ کا نام خیر الماکرین رکھا اور خدا تعالیٰ کے بارے میں ماکر کا لفظ اس صورت میں بولا جاتا ہے کہ جب وہ باریک اسباب سے مجرم کو ہلاک یا ذلیل کرتا ہے پس لیکھرام کے مُنہ سے خود وہ الفاظ نکل گئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی موت کا نشان مانگتا تھا یعنی ایسا نشان جس کے اسباب بہت باریک ہوں سو خدا کی قدرت ہے کہ اسی طرح اس کی موت ہوئی اور ایسے قاتل کے ہاتھ سے مارا گیا جس کی کارروائی ہر ایک کو نہایت تعجب میں ڈالتی ہے کہ کیونکر اس نے عین روز روشن میں حملہ کیا اور کیونکر آباد گھر میں ہاتھ اٹھانے کی اس کو جرأت ہوئی اور کیونکر وہ چھری مار کر صاف نکل گیا اور پھر کیونکر ہندوؤں کی ایک آباد گلی میں باوجود مقتول کے وارثوں کے شور دہائی کے پکڑا نہ گیا سو جب ہم ان واقعات کو غور سے سوچتے ہیں تو فی الفور طبیعت اس طرف چلی جاتی ہے کہ یہی وہ کام ہے جس کو خیر الماکرین کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ خدا کا نام قرآن شریف کی رو سے خیر الماکرین اُس وقت کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی مجرم مستوجب سزا کو باریک اسباب کے استعمال سے سزا میں گرفتار کرتا ہے۔ یعنی ایسے اسباب اس کی سزا کے اُس کے لیے مہیا کرتا ہے کہ جن اسباب کو مجرم کسی اور ارادہ سے اپنے لیے آپ مہیا کرتا ہے پس وہی اسباب جو اپنی بہتری یا ناموری کے لیے مجرم جمع کرتا ہے وہی اُس کی ذلت اور ہلاکت کا موجب ہو جاتے ہیں۔ قانون قدرت صاف گواہی دیتا ہے کہ خُدا کا یہ فعل بھی دنیا میں پایا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات بے حیا اور سخت دل مجرموں کی سزا ان کے ہاتھ سے دلواتا ہے۔ سو وہ لوگ اپنی ذلت

[1] المائدہ آیت ۳۔

اور تباہی کے سامان اپنے ہاتھ سے جمع کر لیتے ہیں اور ان کی نظر سے وہ امور اس وقت تک مخفی رکھے جاتے ہیں جب تک خدا تعالیٰ کی قضا و قدر نازل ہو جائے پس اس مخفی کارروائی کے لحاظ سے خدا کا نام ماکر ہے" دنیا میں ہزاروں نمونے اس کے پائے جاتے ہیں سو لیکھرام کے معاملہ میں خدا کا مکر یہ ہے کہ اول اُسی کے مُنہ سے کہلوا یا کہ میں خیر الماکرین سے اپنی نسبت نشان مانگتا ہوں۔ سو اس درخواست میں اُس نے ایسا عذاب مانگا جس کے اسباب مخفی ہوں اور ایسا ہی وقوع میں آیا کیونکہ جس شخص کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے اُس نے اتوار کا دن مقرر کیا تھا اور اتوار کے دن آریوں کا ایک خوشی کا جلسہ قرار پایا تھا جیسا کہ عید کا دن ہوتا ہے تا اس شخص کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے سو وہی خوشی کے اسباب اُس کے لیے اور اس کی قوم کے لیے ماتم کے اسباب ہو گئے اور خیر الماکرین کے نام کو خدا تعالیٰ نے تمام آریوں کو خوب سمجھا دیا۔ (استفتاء حاشیہ صفحہ ۳۰)

قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کی صفات میں اس قسم کا مکر بھی داخل رکھا ہے جو اُس کی ذات پاک کے منافی نہیں اور جس میں کوئی امر اُس کے تقدس اور اُس کی بے عیب ذات کے مخالف نہیں اور جس پر خدا کا قانون قدرت بھی گواہی دیتا ہے اور اُس کی قدیم عادت میں پایا جاتا ہے اور خدا کا مکر اس حالت میں کہا جاتا ہے اور اُس کے اس فعل پر اطلاق پاتا ہے کہ جب وہ ایک شریر آدمی کے لیے اُسی کے پوشیدہ منصوبوں کو اُس کے سزا یاب ہونے کا سبب ٹھیراتا ہے۔ قرآن شریف کے رُو سے یہی خدا کا مکر ہے جو مکر کرنے والے کے پاداش میں ظہور میں آتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یعنی کافروں نے ایک بد مکر کیا کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکال دیا اور خدا نے اُن کے مقابل پر ایک نیک مکر کیا کہ وہی نکالنا اُس رسول کی فتح اور اقبال کا موجب ٹھیرا دیا پس خدا نے اس جگہ اپنا نام خیر الماکرین رکھا یعنی ایسا مکر کرنے والا جو نیک مکر ہے نہ بد مکر۔ اور کافروں کے مکر کو بد مکر قرار دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے مکر کو دو قسم پر تقسیم کیا ہے ایک بد مکر اور ایک نیک مکر۔ پس خدا نے نیک مکر اپنی صفات میں داخل کیا ہے اور بد مکر کا فروں اور شریر لوگوں کی عادات میں قرار دیا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۵۰)

وہ مکر جو خدا کی شان کے مناسب حال ہیں وہ اس قسم کے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ نیکوں کو آزماتا ہے اور بدوں کو جو اپنی شرارت کے مکر نہیں چھوڑتے سزا دیتا ہے اور اُس کے قانون قدرت پر نظر ڈال کر ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی مخفی رحمتیں یا مخفی غضب اُس کے قانون قدرت میں پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک مکار شریر آدمی جو اپنے بد مکروں سے باز نہیں آتا۔ بعض اسباب کے پیدا ہونے سے خوش ہوتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ان اسباب کے ذریعہ سے جو میرے لیے میسر آ گئے ہیں ایک مظلوم کو انتہا درجہ کے ظلم کے ساتھ پیس ڈالونگا مگر انہیں اسباب سے خدا اسی کو ہلاک کر دیتا ہے اور یہ خدا کا مکر ہوتا ہے جو شریر آدمی کو اُن کاموں کے بد نتیجے سے بے خبر رکھتا ہے اور اُس کے دل میں یہ

خیال پیدا کرتا ہے کہ اس مکر میں اس کی کامیابی ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے کام خدا تعالیٰ کے دُنیا میں ہزار ہا پائے جاتے ہیں کہ وہ ایسے شریر آدمی کو جو بد مکروں سے بے گناہوں کو دُکھ دیتا ہے اپنے نیک اور عدل کے مکر سے سزا دیتا ہے۔

اب ہم عام فائدہ کے لیے کتاب لسان العرب سے جو ایک پُرانی اور معتبر کتاب لُغت کی ہے مکر کے معنے لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے۔ اَلْمَکْرُ اِحْتِیَالٌ فِیْ خُفْیَۃٍ۔ وَاِنَّ الْکَیْدَ فِی الْحُرُوْبِ حَلَالٌ۔ وَالْمَکْرُ فِیْ کُلِّ حَلَالٍ حَرَامٌ۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَمَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ[۱]۔ قَالَ اَھْلُ الْعِلْمِ بِالتَّاوِیْلِ اَلْمَکْرُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی جَزَاءٌ سُمِّیَ بِاسْمِ مَکْرِ الْمَجَازِیْ۔ ترجمہ۔ مکر اُس حیلہ کو کہتے ہیں جو پوشیدہ رکھا جائے۔ جنگوں میں اس قسم کے حیلے حلال ہیں۔ اور ہر ایک حلال امر کو حیلہ کر کے ٹالنا یہ حرام ہے اور قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافروں نے اپنی دانست میں ایک بڑا مکر کیا اور ہم نے بھی مکر کیا اور وہ ہمارے مکر سے بے خبر تھے اور اہل علم کہتے ہیں کہ خدا کا مکر یہ ہے کہ مکار کو مکر کی سزا دینا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

ہمارے مخالف ہر طرف سے کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ ہر قسم کی تدبیریں اور منصوبے کرتے ہیں مگر اُن کو معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ پہلے ہی ہم کو تسلّی دے چکا ہے مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔ خدا کے ساتھ لڑ کر کبھی کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کا بھروسا اپنی تدابیر اور حیل پر ہے اور ہمارا خدا پر۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

میں نے غور کیا ہے کہ مکر کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کے لیے قرآن میں آیا ہے اور میرے لیے بھی یہی لفظ براہین میں آیا ہے گویا مسیح علیہ السلام کے قتل کے لیے بھی ایک مخفی منصوبہ کیا گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کیا گیا تھا اور یہاں بھی منصوبے ہوئے اور اپنے طور پر آج کل بھی فرق نہیں کیا جاتا مگر خدا تعالیٰ کا مکر ان سب پر غالب آیا۔ مکر مخفی اور لطیف تدبیر کو کہتے ہیں۔ لیکھرام نے اپنے خطوط میں یہی لکھا تھا کہ خیر الماکرین سے میرے لیے کوئی نشان طلب کرو۔ جب خدا تعالیٰ باریک اسباب سے مجرم کو ہلاک یا ذلیل کرتا ہے اور اپنے بندہ کو جو راست باز ہوتا ہے دشمن کے منصوبوں اور شرارتوں سے محفوظ رکھتا ہے اُس وقت اُس کا نام خیر الماکرین بیان ہوتا ہے یعنی ایسے اسباب مجرم کی سزا کے لیے مہیا کرتا ہے کہ جن اسباب کو وہ اپنے لیے کسی اور غرض سے مہیا کرتا ہے۔ وہی اسباب جو بہتری کے لیے بناتا ہے ہلاکت کا باعث بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسیح کو ایسے طرز پر بچایا کہ وہ اسباب جو ان کی ہلاکت کے لیے جمع ہوئے تھے اُن کی زندگی کا موجب ثابت ہوئے اور ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کفار مکہ کے منصوبوں سے بچا لیا۔ اور اُسی طرح پر یہاں بھی اُس کا وعدہ ہے۔

اگر کوئی یوں کہے کہ وہاں ہی محفوظ کیوں نہ رکھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سنت اللہ یہ نہیں ہے بلکہ خدا اپنا علم دکھانا چاہتا ہے اس لیے وہاں سے نکال لیتا ہے۔

---

[۱] النمل آیت ۵۱۔

مکر کی حد اُس وقت تک ہے جبکہ وہ انسانی تدابیر تک ہو مگر جب انسانی منصوبوں کے رنگ سے نکل گیا پھر وہ خارق عادت معجزہ ہوا۔

اگر ذرہ بھی ایمان کسی میں ہو تو وہ اُن امور کو صفائی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کے لیے ہجرت نہ ہو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

مکر اللہ کے یہی معنے ہیں کہ انسان کی باریک در باریک تدابیر اور تجاویز پر آخر کار خدا کی تجاویز غالب آ جاویں اور انسان کو ناکامی ہو۔ اگر کوئی کتاب اللہ سے اس فلاسفی کو نہیں مانتا تو دنیا میں بھی اس کی نظیر موجود ہے اور اس کے اسرار پائے جاتے ہیں۔ چور کیسی باریک در باریک تدابیر کے نیچے اپنا کام اور اپنی حفاظت کرتا ہے لیکن گورنمنٹ نے جو تجاویز باریک در باریک اُس کی گرفتاری کی رکھی ہیں آخر وہ غالب آ جاتی ہیں تو خدا کیوں نہ غالب آوے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸-۱۹ مورخہ ۸-۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جب انسان مکر کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ خدا بھی مکر کرتا ہے۔ مکر کا مقابلہ مکر کرے جب ہی بات بنتی ہے۔ نادان مکر کے لفظ پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی بُری بات نہیں مگر اس باریک تدبیر کو کہتے ہیں۔ جو خبیث آدمی کے دفع کے لیے کی جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا نام خیر الماکرین رکھا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

اے عیسٰی میں تجھے وفات دینے والا ہوں۔ اور پھر عزت کے ساتھ اپنی طرف اُٹھانے والا اور کافروں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں۔ اور تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر قیامت تک غلبہ دینے والا ہوں۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۹۸)

اے عیسٰی میں تجھے کامل اجر بخشوں گا یا وفات دوں گا اور اپنی طرف اُٹھاؤں گا یعنی رفع درجات کروں گا یا دُنیا

سے اپنی طرف اُٹھاؤں گا اور تیرے تابعین کو ان پر جو تیرے منکر ہیں قیامت تک غلبہ بخشوں گا یعنی تیرے ہم عقیدہ اور ہم مشربوں کو حجت اور برہان اور برکات کی رو سے دوسرے لوگوں پر قیامت تک فائق رکھونگا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۶ حاشیہ در حاشیہ)

اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے ترتیب وار اپنے تئیں فاعل ٹھہرا کر چار فعل اپنے یکے بعد دیگرے بیان کیے ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور کفار کے الزاموں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے متبعین کو قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دینے والا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ہر چہار فقرے ترتیب طبعی سے بیان کیے گئے ہیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدائے تعالیٰ کی طرف بلایا جاوے اور اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ[1] کی خبر اُس کو پہنچ جائے پہلے اُس کا وفات پانا ضروری ہے پھر موجب آیت کریمہ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ اور حدیث صحیح کے اُس کا خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے اور وفات کے بعد مومن کی روح کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع لازمی ہے جس پر قرآن کریم اور احادیث صحیحہ ناطق ہیں پھر بعد اس کے جو خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فرمایا جو میں تجھے کفار کے الزاموں سے پاک کرنے والا ہوں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہود چاہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کر کے اُس الزام کے نیچے داخل کریں جو توریت باب استثناء میں لکھا ہے جو مصلوب لعنتی اور خدائے تعالیٰ کی رحمت سے بے نصیب ہے جو عزت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھایا نہیں جاتا سو خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اس آیت میں بشارت دی کہ تو اپنی موت طبعی سے فوت ہوگا اور پھر عزت کے ساتھ میری طرف اٹھایا جائیگا اور جو تیرے مصلوب کرنے کے لیے تیرے دشمن کوشش کر رہے ہیں ان کوششوں میں وہ ناکام رہیں گے اور جن الزاموں کے قائم کرنے کے لیے وہ فکر میں ہیں اُن تمام الزاموں سے میں تجھے پاک اور منزہ رکھوں گا یعنی مصلوبیت اور اُس کے بد نتائج سے جو لعنتی ہونا اور نبوت سے محروم ہونا اور رفع سے بے نصیب ہونا ہے اور اس جگہ تَوَفِّی کے لفظ میں بھی مصلوبیت سے بچانے کے لیے ایک باریک اشارہ ہے کیونکہ تَوَفِّی کے معنے پر غالب یہی بات ہے کہ موت طبعی سے وفات دی جائے یعنی ایسی موت سے جو محض بیماری کی وجہ سے ہو نہ کسی ضربہ سقطہ سے اسی وجہ سے مفسرین صاحب کشاف وغیرہ اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ کی یہ تفسیر لکھتے ہیں کہ انی ممیتک حتف انفک ہاں یہ اشارہ آیت کے تیسرے فقرہ میں کہ مطہرک من الذین کفروا ہے اور بھی زیادہ ہے غرض فقرہ مطہرک من الذین جیسا کہ تیسرے مرتبہ پر بیان کیا گیا ہے ایسا ہی ترتیب طبعی کے لحاظ سے بھی تیسری مرتبہ پر ہے کیونکہ جبکہ حضرت عیسیٰ کا موت طبعی کے بعد نبیوں اور مقدسوں کے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہو گیا تو بلاشبہ وہ کفار کے منصوبوں اور الزاموں سے بچائے گئے اور چوتھا فقرہ وجاعل الذین اتبعوک جیسا کہ ترتیباً چوتھی جگہ قرآن کریم میں واقع ہے ایسا ہی طبعاً بھی چوتھی جگہ ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ کے متبعین کا غلبہ ان سب امور کے بعد ہوا ہے سو یہ چار فقرے

---

[1] الفجر آیت ۲۹

آیت موصوفہ بالا میں ترتیب طبعی سے واقع ہیں اور یہی قرآن کریم کی شان بلاغت سے مناسب حال ہے کیونکہ امور قابل بیان کا ترتیب طبعی سے بیان کرنا کمال بلاغت میں داخل اور عین حکمت ہے اسی وجہ سے ترتیب طبعی کا التزام تمام قرآن کریم میں پایا جاتا ہے سورۃ فاتحہ میں ہی دیکھو کہ کیونکر پہلے رب العالمین کا ذکر کیا پھر رحمان پھر رحیم پھر مالک یوم الدین اور کیونکر فیض کے سلسلہ کو ترتیب وار عام فیض سے لیکر اخص فیض تک پہنچایا۔ غرض موافق عام طریق کامل البلاغۃ قرآن کریم کی آیت موصوفہ بالا میں ہر چہار فقرہ ترتیب طبعی سے بیان کیے گئے ہیں لیکن حال کے متعصب ملاجن کو یہودیوں کی طرز پر یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ کی عادت ہے اور جو مسیح ابن مریم کی حیات ثابت کرنے کے لیے بے طرح ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور کلام الٰہی کی تحریف و تبدیل پر کمر باندھی ہے وہ نہایت تکلف سے خدائے تعالیٰ کی ان چار ترتیب وار فقروں میں سے دو فقروں کی ترتیب طبعی سے منکر ہو بیٹھے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ اگرچہ فقرہ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور فقرہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ ترتیب طبعی واقع ہیں لیکن فقرہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ اور فقرہ رَافِعُكَ اِلَیَّ ترتیب طبعی پر واقع نہیں ہیں بلکہ دراصل فقرہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ موخر اور فقرہ رَافِعُكَ اِلَیَّ مقدم ہے افسوس کہ ان لوگوں نے باوجود اس کے کہ کلام بلاغت نظام حضرت ذات احسن المتکلمین جلشانہ کو اپنی اصل وضع اور صورت اور ترتیب سے بدلا کر مسخ کر دیا اور چار فقروں میں سے دو فقروں کی ترتیب طبعی کو مسلم رکھا اور دو فقروں کو دائرہ بلاغت و فصاحت سے خارج سمجھ کر اپنی طرف سے اُن کی اصلاح کی یعنی مقدم کو موخر کیا اور موخر کو مقدم کیا مگر باوجود اس قدر یہودیانہ تحریف کے پھر بھی کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اگر فرض کیا جائے کہ فقرہ اِنِّيْ رَافِعُكَ اِلَیَّ۔ فقرہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ پر مقدم سمجھنا چاہیئے تو پھر بھی اس سے محرّفین کا مطلب نہیں نکلتا کیونکہ اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اے عیسیٰ میں تجھے اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور وفات دینے والا ہوں اور یہ معنے سراسر غلط ہیں کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی آسمان پر ہی وفات ہو وجہ یہ کہ جب رفع کے بعد وفات دینے کا ذکر ہے اور نزول کا درمیان کہیں ذکر نہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آسمان پر ہی حضرت عیسیٰ وفات پائیں گے ہاں اگر ایک تیسرا فقرہ اپنی طرف سے گھڑا جائے اور اُن دونوں فقروں کے بیچ میں رکھا جائے اور یوں کہا جائے يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ رَافِعُكَ وَمُنَزِّلُكَ وَمُتَوَفِّيْكَ تو پھر معنے درست ہو جائیں گے مگر ان تمام تحریفات کے بعد فقرات مذکورہ بالا خدائے تعالیٰ کا کلام نہیں رہیں گے بلکہ بباعث دخل انسان اور صریح تغییر تبدیل و تحریف کے اسی محرف کا کلام متصور ہوں گے جس نے بے حیائی اور شوخی کی راہ سے ایسی تحریف کی ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ ایسی کارروائی سراسر الحاد اور صریح بے ایمانی میں داخل ہو گی۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۲۲-۹۲۶ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۸۹۲)

تفسیر معالم کے صفحہ ۱۶۲ میں زیر تفسیر آیت يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ لکھا ہے کہ علی بن طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اِنِّيْ مُمِيْتُكَ یعنی میں تجھ کو مارنے والا ہوں اس پر دوسرے

۵۔ المائدۃ۔ آیت ۱۴۔

اقوال اللہ تعالیٰ کے دلالت کرتے ہیں قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ[1]۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ[2] اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ[3] غرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں اور ناظرین پر واضح ہوگا کہ حضرت ابن عباس قرآن کریم کے سمجھنے میں اول نمبر والوں میں سے ہیں اور اس بارے میں ان کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا بھی ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۴۷)

قرآن شریف میں اول سے آخر تک جس جس جگہ توفّی کا لفظ آیا ہے اُن تمام مقامات میں توفّی کے معنے موت ہی لیے گئے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۴۶ حاشیہ)

اگر حضرت عیسیٰ حقیقت میں موت کے بعد پھر جسم کے ساتھ اُٹھائے گئے تھے تو قرآن شریف میں عبارت یوں چاہیئے تھی يَا عِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ ثُمَّ مُحْيِيْكَ ثُمَّ رَافِعُكَ مَعَ جَسَدِكَ اِلَى السَّمَآءِ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے وفات دُوں گا پھر زندہ کروں گا پھر تجھے تیرے جسم کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھاؤں گا لیکن اب تو بجز مجرد رَافِعُكَ کے جو مُتَوَفّی کے بعد ہے کوئی دوسرا لفظ رافعک کا تمام قرآن شریف میں نظر نہیں آتا جو ثُمَّ مُحْيِيْكَ کے بعد ہو اگر کسی جگہ ہے تو وہ دکھلانا چاہیئے میں بدعویٰ کہتا ہوں کہ اس ثبوت کے بعد کہ حضرت عیسیٰ فی الحقیقت فوت ہو گئے تھے یقینی طور پر یہی ماننا پڑیگا کہ جہاں جہاں رَافِعُكَ یا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ[4] ہے اُس سے مُراد اُن کی رُوح کا اُٹھایا جانا ہے جو ہر یک مومن کے لیے ضروری ہے۔ ضروری کو چھوڑ کر غیر ضروری کا خیال دل میں لانا سراسر جہل ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۶۷)

قراین قویہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مسیح جسم کے ساتھ آسمان پر ہرگز نہیں گیا اور نہ آسمان کا لفظ اس آیت میں موجود ہے بلکہ لفظ تو صرف یہ ہے يَا عِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ پھر دوسری جگہ ہے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ[1] جس کے یہ معنے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے مسیح کو موت دے کر پھر اپنی طرف اُٹھا لیا جیسا کہ یہ عام محاورہ ہے کہ نیک بندوں کی نسبت جب وہ مرجاتے ہیں یہی کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کو خدائے تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھا لیا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۸۷)

خدائے تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جانے کے یہی معنے ہیں کہ فوت ہو جانا۔ خدائے تعالیٰ کا یہ کہنا کہ اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ[2] اور یہ کہنا کہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ایک ہی معنے رکھتا ہے سوا اس کے جس وضاحت اور تفصیل اور توضیح کے ساتھ قرآن شریف میں مسیح کے فوت ہو جانے کا ذکر ہے اس سے بڑھ کر متصوّر نہیں کیونکہ خداوند عزّوجل نے عام اور خاص دونوں طور پر مسیح کا فوت ہو جانا بیان فرمایا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۲۴)

---

[1] النساء آیت ۱۵۹ ۔ [2] الفجر آیت ۲۹ ۔ [3] السجدۃ آیت ۱۲ ۔ [4] النحل آیت ۳۳ ۔ [5] النحل آیت ۲۹ ۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر مسیح ابن مریم اُس جماعت مرفوعہ سے الگ ہے جو دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر خدائے تعالیٰ کی طرف اٹھائی گئی ہے تو اُن میں جو عالم آخرت میں پہنچ گئے ہرگز شامل نہیں ہو سکتا بلکہ مرنے کے بعد پھر شامل ہوگا اور اگر یہ بات ہو کہ اُن میں جا ملا اور بموجب آیت فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ[1] اُن فوت شدہ بندوں میں داخل ہو گیا تو پھر زندہ نہیں میں سے شمار کیا جاویگا اور معراج کی حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسیح اُن فوت شدہ نبیوں میں جا ملا اور یحیٰی نبی کے پاس اُس کو مقام ملا اِس صورت میں ظاہر ہے کہ معنے اِس آیت کے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ہے یہ ہوں گے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلٰی عِبَادِیَ الْمُتَوَفِّیْنَ الْمُقَرَّبِیْنَ وَمُلْحِقُکَ بِالصّٰلِحِیْنَ سو عقلمند کے لیے جو متعصب نہ ہو اسی قدر کافی ہے کہ اگر مسیح زندہ ہی اُٹھایا گیا تو پھر مُردوں میں کیوں جا گھسا۔ ہاں اس قدر ذکر کرنا اور بھی ضروری ہے کہ جیسے بعض نادان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ آیات ذُو مَعْنَیَیْن ہیں یہ خیال سراسر فاسد ہے مومن کا یہ کام نہیں کہ تفسیر بالرائے کرے بلکہ قرآن شریف کے بعض مقامات بعض دوسرے مقامات کے لیے خود مفسر اور شارح ہیں اگر یہ بات سچ نہیں کہ مسیح کے حق میں جو یہ آیتیں ہیں کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ اور فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[2] یہ درحقیقت مسیح کی موت پر ہی دلالت کرتی ہیں بلکہ اِن کے کوئی اور معنے ہیں تو اس نزاع کا فیصلہ قرآن شریف سے ہی کرانا چاہیئے۔ اور اگر قرآن شریف مساوی طور پر کبھی اس لفظ کو موت کے لیے استعمال کرتا ہے اور کبھی اُن معنوں کے لیے جو موت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے تو محل متنازعہ فیہ میں مساوی طور پر احتمال رہے گا اور اگر ایک خاص معنے اغلب اور اکثر طور پر مستعملات قرآنی میں سے ہیں تو اُنہی معنوں کو اِس مقام بحث میں ترجیح ہوگی اور اگر قرآن شریف اول سے آخر تک اپنے کُل مقامات میں ایک ہی معنوں کو استعمال کرتا ہے تو محل مبحوث فیہ میں بھی یہی قطعی فیصلہ ہوگا کہ جو معنے توفّی کے سارے قرآن شریف میں لیے گئے ہیں وہی معنے اس جگہ بھی مراد ہیں کیونکہ یہ بالکل غیر ممکن اور بعید از قیاس ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے بلیغ اور فصیح کلام میں ایسے تنازع کی جگہ میں جو اُس کے علم میں ایک معرکہ کی جگہ ہے ایسے شاذ اور مجہول الفاظ استعمال کرے جو اس کے تمام کلام میں ہرگز استعمال نہیں ہوئے اگر وہ ایسا کرے تو گویا وہ خلق اللہ کو آپ ورطہ شبہات میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُس نے ہرگز ایسا نہیں کیا ہوگا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے قرآن کریم کے تیئیس[23] مقام میں تو ایک لفظ کے ایک ہی معنے مراد لیتا جاوے اور پھر دو مقام میں جو زیادہ تر محتاج صفائی بیان کے تھے کچھ اور کا اور مراد لیکر آپ ہی خلق اللہ کو گمراہی میں ڈال دے۔

اب اے ناظرین! آپ پر واضح ہو کہ اِس عاجز نے اول سے آخر تک تمام وہ الفاظ جن میں توفّی کا لفظ مختلف صیغوں میں آگیا ہے قرآن شریف میں غور سے دیکھے تو صاف طور سے کُھل گیا کہ قرآن کریم میں علاوہ محل متنازعہ فیہ کے یہ لفظ تیئیس[23] جگہ لکھا ہے اور ہریک جگہ موت اور قبض رُوح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور ایک بھی ایسا مقام نہیں جس میں توفّی کا

---

[1] الفجر آیت ۳۰ ۔ [2] المائدہ آیت ۱۱۸ ۔

لفظ کسی اور معنے پر استعمال کیا گیا ہو اور وہ یہ ہیں:-

نام سورۃ	الجزو	آیت قرآن کریم
نساء	نمبر ۴	حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ
آل عمران	″	وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ
سجدہ	۲۱	قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ
نساء	۵	اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
مومن	۲۴	فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ
النحل	۱۴	تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
″	″	تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ
بقر	۲	يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ
″	۲	يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ
انعام	۷	تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا
اعراف	۸	رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ
″	۹	تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ
الانفال	۱۰	اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ
یونس	۱۱	يَتَوَفّٰىله
سورہ محمد صلعم	۲۶	فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ
یونس	۱۱	وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
یوسف	۱۳	تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ
رعد	″	اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
مومن	۲۴	وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى
نحل	۱۴	ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ
حج	۱۷	وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى
زمر	۲۴	اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

له پوری آیت یوں ہے۔ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ (۱۰۵)

نام سورۃ	الجزو	آیت قرآن کریم
الانعام	۷	هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ؎

اب ظاہر ہے کہ ان تمام مقامات قرآن کریم میں توفّی کے لفظ سے موت اور قبض روح ہی مراد ہے اور دو مؤخر الذکر آیتیں اگرچہ بظاہر نیند سے متعلق ہیں مگر درحقیقت ان دونوں آیتوں میں بھی نیند نہیں مراد لی گئی بلکہ اس جگہ بھی اصل مقصد اور مدعا موت ہے اور یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ نیند بھی ایک قسم کی موت ہی ہے اور جیسی موت میں روح قبض کی جاتی ہے نیند میں بھی روح قبض کی جاتی ہے سو ان دونوں مقامات میں نیند پر توفی کے لفظ کا اطلاق کرنا ایک استعارہ ہے جو بنصب قرینہ نوم استعمال کیا گیا ہے یعنی صاف لفظوں میں نیند کا ذکر کیا گیا ہے تا ہر ایک شخص سمجھ لیوے کہ اس جگہ توفی سے مراد حقیقی موت نہیں ہے بلکہ مجازی موت مراد ہے جو نیند ہے۔ یہ بات ادنیٰ ذی علم کو بھی معلوم ہوگی کہ جب کوئی لفظ حقیقت مسلّمہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایسے معنوں پر جن کے لیے وہ عام طور پر موضوع یا عام طور پر مستعمل ہو گیا ہے تو اُس جگہ متکلم کے لیے کچھ ضروری نہیں ہوتا کہ اُس کی شناخت کے لیے کوئی قرینہ قائم کرے کیونکہ وہ اُن معنوں میں شائع متعارف اور متبادر الفہم ہے۔ لیکن جب ایک متکلّم کسی لفظ کے معانی حقیقت مسلّمہ سے پھیر کر کسی مجازی معنی کی طرف لے جاتا ہے تو اس جگہ صراحتاً یا کنایتاً یا کسی دوسرے رنگ کے پیرایہ میں کوئی قرینہ اُس کو قائم کرنا پڑتا ہے تا اُس کا سمجھنا مُشتبہ نہ ہو۔ اور اس بات کے دریافت کے لیے کہ متکلم نے ایک لفظ بطور حقیقت مُسلّمہ استعمال کیا ہے یا بطور مجاز اور استعارہ نادرہ کے بھی کھلی کھلی علامت ہوتی ہے کہ وہ حقیقت مُسلّمہ کو ایک متبادر اور شائع و متعارف لفظ سمجھ کر بغیر احتیاج قرائن کے یونہی مختصر بیان کر دیتا ہے مگر مجاز یا استعارہ نادرہ کے وقت ایسا اختصار پسند نہیں کرتا بلکہ اُس کا فرض ہوتا ہے کہ کسی ایسی علامت سے جس کو ایک دانشمند سمجھ سکے اپنے اس مدعا کو ظاہر کر جائے کہ یہ لفظ اپنے اصل معنوں پر مستعمل نہیں ہوا۔

اب چونکہ یہ فرق حقیقت اور مجاز کا صاف طور پر بیان ہو چکا تو جس شخص نے قرآن کریم پر اوّل سے آخر تک نظر ڈالی ہوگی اور جہاں جہاں توفی کا لفظ موجود ہے بنظر غور دیکھا ہوگا وہ ایماناً ہمارے بیان کی تائید میں شہادت دے سکتا ہے چنانچہ بطور نمونہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ آیات (۱) امّا نرینّك بعض الّذی نعدھم او نتوفّینك (۲) توفّنی مسلماً (۳) ومنکم من یتوفّٰی (۴) توفّٰھم الملائکۃ (۵) یتوفّون منکم (۶) توفته رسلنا (۷) رسلنا یتوفونھم (۸) توفنا مسلمین (۹) وتوفّنا مع الابرار (۱۰) ثم یتوفٰکم کیسی صریح اور صاف طور پر موت کے معنوں میں

؎ ان سورتوں کی ان آیات کے نمبر حسب ترتیب یہ ہیں۔ ۱۷، ۱۹۴، ۱۲، ۹۸، ۷۸، ۲۹، ۳۳، ۲۳۵، ۲۴۱، ۶۲، ۳۸، ۱۲۶، ۵۱، ۱۰۵، ۲۸، ۴۷، ۱۰۲، ۴۱، ۶۸، ۷۱، ۹، ۴۳، ۶۱ +

استعمال کی گئی ہیں مگر کیا قرآن شریف میں کوئی ایسی آیت بھی ہے کہ اِن آیات کی طرح مجرد توفّی کا لفظ لکھنے سے اُس سے کوئی اور معنے مراد لیے گئے ہوں موت مراد نہ لی گئی ہو بلاشبہ قطعی اور یقینی طور پر اوّل سے آخر تک قرآنی محاورہ یہی ثابت ہے کہ ہر جگہ درحقیقت توفّی کے لفظ سے موت ہی مراد ہے تو پھر متنازعہ فیہ دو آیتوں کی نسبت جو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ اور فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[1] ہیں اپنے دل سے کوئی معنے مخالف عام محاورہ قرآن کے گھڑنا اگر الحاد اور تحریف نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اس جگہ یہ نکتہ بیان کرنے کے لایق ہے کہ قرآن شریف میں ہر جگہ موت کے محل پر توفّی کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے اماتت کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا۔ اس میں بھید یہ ہے کہ موت کا لفظ ایسی چیزوں کے فنا کی نسبت بھی بولا جاتا ہے جن پر فنا طاری ہونے کے بعد کوئی روح اُن کی باقی نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے جب نباتات اور جمادات اپنی صورت نوعیہ کو چھوڑ کر کوئی اور صور قبول کر لیں تو اُن پر بھی موت کا لفظ اطلاق پاتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ یہ لوہا مر گیا اور کشتہ ہو گیا اور یہ چاندی کا ٹکڑا مر گیا اور کُشتہ ہو گیا ایسا ہی تمام جاندار اور کیڑے مکوڑے جن کی روح مرنے کے بعد باقی نہیں رہتی اور مورد ثواب وعقاب نہیں ہوتے اُن کے مرنے پر بھی توفّی کا لفظ نہیں بولتے بلکہ صرف یہی کہتے ہیں کہ فلاں جانور مر گیا یا فلاں کیڑا مر گیا۔ چونکہ خدائے تعالیٰ کو اپنے کلام عزیز میں یہ منظور ہے کہ کھلے کھلے طور پر یہ ظاہر کرے کہ انسان ایک ایسا جاندار ہے کہ جس کی موت کے بعد بکلّی اس کی فنا نہیں ہوتی بلکہ اُس کی روح باقی رہ جاتی ہے جس کو قابض ارواح اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اسی وجہ سے موت کے لفظ کو ترک کر کے بجائے اُس کے توفّی کا لفظ استعمال کیا ہے تا اس بات پر دلالت کرے کہ ہم نے اِس پر موت وارد کر کے بکلّی اُس کو فنا نہیں کیا بلکہ صرف جسم پر موت وارد کی ہے اور روح کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور اس لفظ کو اختیار کرنے میں دہریوں کا ردّ بھی منظور ہے جو بعد موت جسم کے روح کی بقا کے قائل نہیں ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ قرآن شریف میں اوّل سے آخر تک توفّی کے معنے روح کو قبض کرنے اور جسم کو بیکار چھوڑ دینے کے لیے گئے ہیں اور انسان کی موت کی حقیقت بھی صرف اسی قدر ہے کہ روح کو خدائے تعالیٰ قبض کر لیتا ہے اور جسم کو اُس سے الگ کر کے چھوڑ دیتا ہے اور چونکہ نیند کی حالت بھی کسی قدر اس حقیقت میں اشتراک رکھتی ہے اسی وجہ سے مذکورہ بالا دو آیتوں میں نیند کو بھی بطور استعارہ توفّی کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ کچھ شک نہیں کہ نیند میں بھی ایک خاص حد تک روح قبض کی جاتی ہے اور جسم کو بیکار اور معطل کیا جاتا ہے لیکن توفّی کی کامل حالت جس میں کامل طور پر روح قبض کی جائے اور کامل طور پر جسم بیکار کر دیا جائے وہ انسان کی موت ہے اسی وجہ سے توفّی کا لفظ عام طور پر قرآن شریف میں انسان کی موت کے بارے میں ہی استعمال کیا گیا ہے اور اوّل سے آخر تک قرآن شریف اسی استعمال سے بھرا پڑا ہے اور نیند کے محل پر توفّی کا لفظ صرف دو جگہ قرآن شریف میں آیا ہے اور وہ بھی قرینہ قایم کرنے کے ساتھ اور اُن آیتوں میں صاف طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ اُس جگہ بھی توفّی کے لفظ سے نیند مراد نہیں ہے بلکہ موت ہی مراد ہے اور اس بات کا اظہار

---

[1] المائدہ آیت ۱۱۸

مقصود ہے کہ نیند بھی ایک موت ہی کی قسم ہے جس میں روح قبض کی جاتی ہے اور جسم معطل کیا جاتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ نیند ایک ناقص موت ہے اور موت حقیقی ایک کامل موت ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ توفی کا لفظ جو قرآن شریف میں استعمال کیا گیا ہے خواہ وہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل ہے یعنی موت پر یا غیر حقیقی معنوں پر یعنی نیند پر ہر یک جگہ اُس لفظ سے مراد یہی ہے کہ روح قبض کی جائے اور جسم معطّل اور بیکار کر دیا جائے اب جبکہ یہ معنے مذکورہ بالا ایک مسلم قاعدہ ٹھہر چکا جس پر قرآن شریف کی تمام آیتیں جن میں توفی کا لفظ موجود ہے شہادت دے رہی ہیں تو اس صورت میں اگر فرض محال کے طور پر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال باطل بھی قبول کر لیں کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے معنے اِنِّیْ مُنِیْمُکَ ہے یعنی یہ کہ میں تجھے سُلانے والا ہوں تو اس سے بھی جسم کا اٹھایا جانا غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس جگہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْ کے معنے از روئے قاعدہ متذکرہ بالا یہی کریں گے کہ میں تجھ پر نیند کی حالت غالب کر کے تیری روح کو قبض کرنے والا ہوں اب ظاہر ہے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے بعد جو رَافِعُکَ اِلَیَّ فرمایا ہے یعنی میں تیری روح کو قبض کر کے پھر اپنی طرف اُٹھاؤں گا یہ رَافِعُکَ کا لفظ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے لفظ سے تعلق رکھتا ہے جس سے بہ بداہت یہ معنے نکلتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے روح کو قبض کیا اور روح کو ہی اپنی طرف اُٹھایا کیونکہ جو چیز قبض کی گئی وہی اُٹھائی جائے گی جسم کے قبض کرنے کا تو کہیں ذکر نہیں چنانچہ دوسری آیات میں جو نیند کے متعلق ہیں خدائے تعالیٰ صاف صاف فرما چکا ہے کہ نیند میں بھی موت کی طرح روح ہی قبض کی جاتی ہے جسم نہیں قبض کیا جاتا۔ اب ہریک شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو قبض کیا جاتا ہے اُٹھایا بھی وہی جائے گا یہ تو نہیں کہ قبض کیا جائے روح اور پھر جسم کو اُٹھایا جائے ایسے معنے تو قرآن شریف کی تمام آیات اور منشاء ربانی سے صریح صریح مخالف ہیں قرآن شریف نیند کے مقامات میں بھی جو توفی کے لفظ کو بطور استعارہ استعمال کرتا ہے اُس جگہ بھی صاف فرماتا ہے کہ ہم روح کو قبض کر لیتے ہیں اور جسم کو بیکار چھوڑ دیتے ہیں اور موت اور نیند میں صرف اتنا فرق ہے کہ موت کی حالت میں ہم روح کو قبض کر کے پھر چھوڑتے نہیں بلکہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور نیند کی حالت میں ایک مدت تک روح کو قبض کر کے پھر اُس روح کو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر وہ جسم سے تعلق پکڑ لیتی ہے۔

اب سوچنا چاہیئے کہ کیا یہ بیان قرآن شریف کا اس بات کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ خدائے تعالیٰ کو جسم کے قبض کرنے اور اٹھانے سے دونوں حالتوں موت اور نیند میں کچھ سروکار نہیں بلکہ جیسا کہ اُس نے خود فرمایا ہے یہ جسم خاک سے پیدا کیا گیا ہے اور آخر خاک میں ہی داخل ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ ابتداء دُنیا سے صرف روحوں کو قبض کرتا آیا ہے اور روحوں کو ہی اپنی طرف اُٹھاتا ہے اور جبکہ یہی امر واقعی اور یہی صحیح اور سچ ہے تو اس صورت میں اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے یہی معنے ہیں کہ میں تیری روح کو اسی طور سے قبض کرنے والا ہوں جیسا کہ سونے والے کی روح قبض کی جاتی ہے تو پھر بھی جسم کو اس قبض سے کچھ علاقہ نہیں ہوگا اور اس طور کی تاویل سے اگر کچھ ثابت ہوگا تو یہ ہوگا کہ حضرت مسیح کی روح خواب کے طور پر قبض کی گئی اور جسم اپنی جگہ زمین پر پڑا رہا اور پھر کسی وقت روح جسم میں داخل ہوگئی اور ایسے معنے سراسر باطل اور دونوں فریق کے مقصد کے مخالف ہیں کیونکہ صرف کچھ عرصہ کیلئے

حضرت مسیح کا سونا اور پھر جاگ اٹھنا جاری اس بحث سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا اور قرآن کریم کی آیت ممدوحہ بالا صاف بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ حضرت مسیح کی روح جو قبض کی گئی تو پھر سونے والے کی روح کی طرح جسم کی طرف نہیں چھوڑی گئی بلکہ خدائے تعالیٰ نے اُس کو اپنی طرف اٹھا لیا جیسا کہ الفاظ صریحۃ الدلالت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ سے ظاہر ہے۔

انصاف کی آنکھ سے دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح حضرت مسیح کے حق میں اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ فرمایا ہے اسی طرح ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہے وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ[۵] یعنی دونوں جگہ مسیح کے حق میں اور ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں توفی کا لفظ موجود ہے پھر کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ ہمارے سیّد و مولیٰ کی نسبت جو توفی کا لفظ آیا ہے تو اُس جگہ تو ہم وفات کے ہی معنے کریں اور اُسی لفظ کو حضرت عیسیٰ کی نسبت اپنے اصلی اور شایع متعارف معنوں سے پھیر کر اور اُن متفق علیہ معنے سے جو اول سے آخر تک قرآن شریف سے ظاہر ہو رہے ہیں انحراف کر کے اپنے دل سے کچھ اور کے اور معنے تراش لیں اگر یہ الحاد اور تحریف نہیں تو پھر الحاد اور تحریف کس کو کہتے ہیں!!! جس قدر مبسوط تفاسیر دنیا میں موجود ہیں جیسے کشاف اور معالم اور تفسیر رازی اور ابن کثیر اور مدارک اور فتح البیان سب میں زیر تفسیر یاعیسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ یہی لکھا ہے کہ اِنِّیْ مُمِیْتُکَ حَتْفَ اَنْفِکَ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے طبعی موت سے مارنے والا ہوں بغیر اس کے کہ تو مصلوب یا مضروب ہونے کی حالت میں فوت ہو۔ غایت مافی الباب بعض مفسّرین نے اپنی کوتہ اندیشی سے اس آیت کی اور وجوہ پر بھی تفسیریں کی ہیں، لیکن صرف اپنے بے بنیاد خیال سے نہ کسی آیت یا حدیث صحیح کے حوالہ سے اگر وہ زندہ ہوتے تو اُن سے پوچھا جاتا کہ حق کے ساتھ تم نے باطل کو کیوں اور کس دلیل سے ملایا بہرحال جب وہ اس بات کا اقرار کر گئے کہ منجملہ اقوال مختلفہ کے یہ بھی ایک قول ہے کہ ضرور حضرت مسیح فوت ہو گئے تھے اور اُن کی روح اُٹھائی گئی تھی تو ان کی دوسری لغزشیں قابل عفو ہیں اُن میں سے بعض جیسا کہ صاحب کشاف خود اپنی قلم سے دوسرے اقوال کو قیل کے لفظ سے ضعیف ٹھہرا گئے ہیں۔

اب جبکہ توفی کے لفظ کی بخوبی تحقیقات ہو چکی اور ثابت ہو گیا کہ تمام قرآن شریف میں اول سے آخر تک یہ لفظ فقط روح کے قبض کرنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے تو اب یہ دیکھنا باقی رہا کہ اِس کے بعد جو فقرہ رَافِعُکَ اِلَیَّ میں رفع کا لفظ ہے یہ کن معنوں پر قرآن شریف میں مستعمل ہے۔

جاننا چاہیئے کہ رفع کا لفظ قرآن شریف میں جہاں کہیں انبیا اور اخیار ابرار کی نسبت استعمال کیا گیا ہے عام طور پر اُس سے یہی مطلب ہے کہ جو اُن برگزیدہ لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی جناب میں باعتبار اپنے روحانی مقام اور نفسی

[۵] یونس آیت ۴۷

نقطہ کے آسمانوں میں کوئی بلند مرتبہ حاصل ہے اُس کو ظاہر کردیا جائے اور اُن کو بشارت دی جائے کہ بعد موت و مفارقت بدن اُن کی رُوح اُس مقام تک جو اُن کے لیے قرب کا مقام ہے اُٹھائی جائیگی جیسا کہ اللہ جل شانہ ہمارے سیّد و مولیٰ کا اعلیٰ مقام ظاہر کرنے کی غرض سے قرآن شریف میں فرماتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ[1]۔ یعنی یہ تمام رسول اپنے مرتبہ میں یکساں نہیں بعض اُن میں سے وہ ہیں جن کو روبرو کلام کرنے کا شرف بخشا گیا اور بعض وہ ہیں جن کا رفع درجات سب سے بڑھ کر ہے۔

اِس آیت کی تفسیر احادیث نبویہ میں یہی بیان کی گئی ہے کہ موت کے بعد ہریک نبی کی روح آسمان کی طرف اُٹھائی جاتی ہے اور اپنے درجہ کے موافق اُس روح کو آسمانوں میں سے کسی آسمان میں کوئی مقام ملتا ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس مقام تک اُس روح کا رفع عمل میں آیا ہے تا جیسا کہ باطنی طور پر اُس روح کا درجہ تھا۔ خارجی طور پر وہ درجہ ثابت کرکے دکھلایا جائے سو یہ رفع جو آسمان کی طرف ہوتا ہے تحقیق درجات کے لیے وقوع میں آتا ہے اور آیت مذکورہ بالا میں جو رفع بعضہم درجات ہے یہ اشارہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رفع تمام نبیوں کے رفع سے بلند تر ہے اور اُن کی روح مسیح کی روح کی طرح دوسرے آسمان میں نہیں اور نہ حضرت موسیٰ کی روح کی طرح چھٹے آسمان میں بلکہ سب سے بلند تر ہے اسی کی طرف معراج کی حدیث بہ تصریح دلالت کر رہی ہے بلکہ معالم النبوت میں بہ صفحہ ۱۷۰ یہ حدیث لکھی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں چھٹے آسمان سے آگے گذر گئے تو حضرت موسیٰ نے کہا رَبِّ لَمْ اَظُنَّ اَنْ یُّرْفَعَ عَلَیَّ اَحَدٌ یعنی اے میرے خداوند مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ کوئی نبی مجھ سے اوپر اُٹھایا جائیگا اور اپنے رفع میں مجھ سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب دیکھو کہ رفع کا لفظ محض تحقیق درجات کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور آیت موصوفہ بالا کے احادیث نبویہ کی رو سے یہ معنے کھُلے کہ ہریک نبی اپنے درجہ کے موافق آسمانوں کی طرف اُٹھایا جاتا ہے اور اپنے قرب کے انداز کے موافق رفع سے حصہ لیتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کی روح اگرچہ دنیوی حیات کے زمانہ میں زمین پر ہو۔ مگر پھر بھی اُس آسمان سے اُس کا تعلق ہوتا ہے جو اس کی روح کے لیے حد رفع ٹھہرایا گیا ہے اور موت کے بعد وہ رُوح اُس آسمان میں جا ٹھہرتی ہے جو اُس کے لیے حد رفع مقرر کیا گیا ہے چنانچہ وہ حدیث جس میں عام طور پر موت کے بعد روحوں کے اُٹھائے جانے کا ذکر ہے اِس بیان کی مؤید ہے اور چونکہ یہ بحث نہایت صریح اور صاف ہے اور کسی قدر ہم پہلے لکھ بھی چکے ہیں اس لیے کچھ ضرورت نہیں کہ اس کو زیادہ طول دیا جائے۔

اس مقام میں یہ بھی بیان کرنے کے لائق ہے کہ بعض مفسروں نے جب دیکھا کہ درحقیقت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ میں توفی کے معنے وفات دینے کے ہیں اور بعد اس کے جو رَافِعُكَ اِلَیَّ واقع ہے وہ بقرینہ صریحہ وفات کی روح کے رفع پر دلالت کر رہا ہے تو اُنہیں یہ فکر پڑی کہ یہ صریح ہماری رائے کے مخالف ہے اِس لیے اُنہوں نے گویا اپنے تئیں نظم فرقانی کا مصلح

---

[1] البقرۃ آیت ۲۵۴

قرار دے کر یا اپنے لیے اُستادی کا منصب تجویز کر کے یہ اصلاح کی کہ اِس جگہ رَافِعُكَ مقدم اور اِنِّي مُتَوَفِّيكَ موخر ہے
مگر ناظرین جانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کے ابلغ اور افصح کلام میں یہ کس قدر بے جا اور اُس کلام کی کسرِ شان کا موجب ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اول ص ۳۲۷-۳۴۶)

بعض علماء نہایت سادگی سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اِنِّي مُتَوَفِّيكَ کے آگے جو رَافِعُكَ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ قرآن کریم میں آیا ہے اِس سے زندہ ہو جانا ثابت ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگر یہ معنے سچ نہیں تو پھر بجز مسیح کے اور کسی کے حق میں رَافِعُكَ کا لفظ کیوں نہیں آیا۔ مگر میں اسی رسالہ ازالہ اوہام میں اِن تمام وہموں کا مفصل جواب لکھ چکا ہوں کہ رفع سے مراد روح کا عزت کے ساتھ اُٹھائے جانا ہے جیسا کہ وفات کے بعد بموجب نص قرآن اور حدیث صحیح کے ہر ایک مومن کی روح عزت کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف اُٹھائی جاتی ہے اور مسیح کے رفع کا جو اس جگہ ذکر کیا گیا تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح کو دعوت حق میں قریباً ناکامی رہی اور یہودیوں نے خیال کیا کہ یہ کاذب ہے کیونکہ ضرور تھا کہ سچے مسیح سے پہلے ایلیا آسمان سے نازل ہو سو اُنہوں نے اِس سے انکار کیا کہ مسیح کا اور نبیوں کی طرح عزت کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہو بلکہ اس کو نعوذ باللہ لعنتی قرار دیا اور لعنتی اس کو کہتے ہیں جس کو عزت کے ساتھ رفع نصیب نہ ہو سو خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ یہ الزام مسیح کے سر پر سے اُٹھا دے۔ سو اول اُس نے اس بنیاد کو باطل ٹھہرایا جس بنیاد پر حضرت مسیح کا لعنتی ہونا نابکار یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے دلوں میں سمجھ لیا تھا اور پھر بعد اس کے بتصریح یہ بھی ذکر کر دیا کہ مسیح نعوذ باللہ ملعون نہیں جو رفع سے روکا گیا ہے بلکہ عزت کے ساتھ اُس کا رفع ہوا ہے چونکہ مسیح ایک بیکس کی طرح دُنیا میں چند روزہ زندگی بسر کر کے چلا گیا اور یہودیوں نے اس کی ذلت کے لیے بہت سا غلو کیا اُس کی والدہ پر ناجائز تہمتیں لگائیں اور اُس کو ملعون ٹھہرایا اور راستبازوں کی طرح اُس کے رفع سے انکار کیا اور نہ صرف یہودیوں نے بلکہ عیسائی بھی موخر الذکر خیال میں مبتلا ہو گئے اور کمینگی کی راہ سے اپنی نجات کا یہ حیلہ نکالا کہ ایک راستباز کو ملعون ٹھہرا دیں اور یہ خیال نہ کیا کہ اگر مسیح کے ملعون ہونے پر ہی نجات موقوف ہے اور تبھی نجات ملتی ہے کہ مسیح جیسے ایک راستباز پاک روش خدائے تعالیٰ کے پیارے کو لعنتی ٹھہرایا جاوے تو حیف ہے ایسی نجات پر اس سے تو ہزار درجہ دوزخ بہتر ہے۔ غرض جب مسیح کے لیے دونوں فریق یہود و نصاریٰ نے ایسے دور از ادب القاب روا رکھے تو خدائے تعالیٰ کی غیرت نے نہ چاہا کہ اُس پاک روش کی عزت کو بغیر شہادت کے چھوڑ دیوے سو اُس نے جیسا کہ انجیل میں پہلے سے وعدہ دیا گیا تھا ہمارے سید و مولیٰ ختم المرسلین کو مبعوث فرما کر مسیح کی عزت اور رفع کی قرآن کریم میں شہادت دی رفع کا لفظ قرآن کریم میں کئی جگہ واقع ہے ایک جگہ بلعم کے قصہ میں بھی ہے کہ ہم نے اُس کا رفع چاہا مگر وہ زمین کی طرف جھک گیا اور ایک ناکام نبی کی نسبت اُس نے فرمایا وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا[1] درحقیقت یہ بھی ایک ایسا نبی ہے جس کی رفعت سے لوگوں نے انکار کیا تھا اور چونکہ اس عاجز کی بھی مسیح کی طرح ذلت کی گئی ہے کوئی کافر کہتا ہے اور کوئی ملحد

[1] مریم آیت ۵۸

اور کوئی بلایان نام رکھتا ہے اور فقیہ اور مولوی صلیب دینے کو بھی طیار ہیں جیسا کہ میاں عبد الحق اپنے اشتہار میں لکھتے ہیں کہ اس شخص کے لیے مسلمانوں کو کچھ ہاتھ سے بھی کام لینا چاہیئے۔ لیکن پلاطوس سے زیادہ یہ گورنمنٹ بے گناہ کی رعایت رکھتی ہے اور پلاطوس کی طرح رعیت کے رعب میں نہیں آتی مگر ہماری اس قوم نے ذلیل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ تا دونوں طرف سے مشابہت ثابت کر کے دکھا دیوے انہیں الہام بھی ہو گئے کہ یہ جہنمی ہے آخر جہنم میں پڑے گا اور اُن میں داخل نہیں ہوگا جن کا عزت کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے سو آج میں اُس الہام کے معنی سمجھا جو اس سے کئی سال پہلے براہین میں درج ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے يَا عِيسٰى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

یعنی یہ مولوی صاحبان عبد الرحمان و عبد الحق تو مجھے اس وقت قطعی دوزخی بناتے ہیں لیکن ان کے اس بیان سے دس سال پہلے خدائے تعالیٰ مجھے جنّتی ہونے کا وعدہ دے چکا ہے اور جس طرح یہودیوں نے خیال کیا تھا کہ نعوذ باللہ عیسٰی مسیح لعنتی ہے اور ہرگز عزت کے ساتھ اُس کا رفع نہیں ہوگا اور اُن کے ردّ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ اسی طرح خدائے تعالیٰ نے اس جگہ بھی پہلے سے ہی اپنے علم قدیم کی وجہ سے یہ الہام بطور پیشگوئی اس عاجز کے دل پر القاء کیا ...... حاصل کلام یہ ہے کہ جو رفع کا لفظ حضرت مسیح کے لیے قرآن کریم میں آیا ہے وہی لفظ الہام کے طور پر اس عاجز کے لیے بھی خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۸۶-۳۹۱)

قرآن شریف کی نصوص بیّنہ اسی بات پر بصراحت دلالت کر رہی ہیں کہ مسیح اپنے اُسی زمانہ میں فوت ہو گیا ہے جس زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کے مفسد فرقوں کی اصلاح کے لیے آیا تھا جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے يَا عِيسٰى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اب اس جگہ ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ نے إِنِّي مُتَوَفِّيكَ پہلے لکھا ہے اور رَافِعُكَ بعد اُس کے بیان فرمایا ہے جس سے ثابت ہوا کہ وفات پہلے ہوئی اور رفع بعد از وفات ہوا اور پھر اور ثبوت یہ ہے کہ اس پیشگوئی میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ میں تیری وفات کے بعد تیرے متبعین کو تیرے مخالفوں پر جو یہودی ہیں قیامت کے دن تک غالب رکھوں گا اب ظاہر ہے اور تمام عیسائی اور مسلمان اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ پیشگوئی حضرت مسیح کے بعد اسلام کے ظہور تک بخوبی پوری ہو گئی کیونکہ خدائے تعالیٰ نے یہودیوں کو اُن لوگوں کی رعیت اور ماتحت کر دیا جو عیسائی یا مسلمان ہیں اور آج تک صدہا برسوں سے وہ ماتحت چلے آتے ہیں یہ تو نہیں کہ حضرت مسیح کے نزول کے بعد پھر ماتحت ہوں گے ایسے معنے تو بہ بداہت فاسد ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۳۵-۴۳۶)

بعض چالاکی سے قرآن شریف کے کھلے کھلے ثبوت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توفّی کا لفظ لغت کی کتابوں میں کئی معنوں پر آیا ہے حالانکہ اپنے دلوں میں خوب جانتے ہیں کہ جن لفظوں کو قرآن شریف اصطلاحی طور پر بعض معانی کے لیے

خاص کر لیتا ہے اور اپنے متواتر بیان سے بخوبی سمجھا دیتا ہے کہ فلاں معنے کے لیے اُس نے فلاں لفظ خاص کر رکھا ہے اُس معنے سے اُس لفظ کو صرف اِس خیال سے پھیرنا کہ کسی لُغت کی کتاب میں اِس کے اور معنے بھی آئے ہیں صریح الحاد ہے مثلاً کتب لغت میں اندھیری رات کا نام بھی کافر ہے مگر تمام قرآن شریف میں کافر کا لفظ صرف کافر دین یا کافر نعمت پر بولا گیا ہے اب اگر کوئی شخص کفر کا لفظ الفاظ مروجہ فرقان سے پھیر کر اندھیری رات اس سے مراد لے اور یہ ثبوت دے کہ لُغت کی کتابوں میں یہ معنے بھی لکھے ہیں تو سچ کہو کہ اُس کا یہ ملحدانہ طریق ہے یا نہیں۔ اسی طرح کتب لُغت میں صوم کا لفظ صرف روزہ میں محدود نہیں بلکہ عیسائیوں کے گرجا کا نام بھی صوم ہے اور شتر مرغ کے سرگین کو بھی صوم کہتے ہیں لیکن قرآن شریف کی اصطلاح میں صوم صرف روزہ کا نام ہے اور اسی طرح صلوٰۃ کے لفظ کے معنے بھی لغت میں کئی ہیں مگر قرآن شریف کی اصطلاح میں صرف نماز اور درود اور دُعا کا نام ہے یہ بات سمجھنے والے جانتے ہیں کہ ہر ایک فن ایک اصطلاح کا محتاج ہوتا ہے اور اہل اس فن کے حاجات کے موافق بعض الفاظ کو متعدد معنوں سے مجرد کر کے کسی ایک معنی سے مخصوص کر لیتے ہیں مثلاً طبابت کے فن کو دیکھیئے کہ بعض الفاظ جو کئی معنے رکھتے تھے صرف ایک معنے میں اصطلاحی طور پر محصور و محدود رکھے گئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی علم بغیر اصطلاحی الفاظ کے چل ہی نہیں سکتا۔ پس جو شخص الحاد کا ارادہ نہیں رکھتا اُس کے لیے سیدھی راہ یہی ہے کہ قرآن شریف کے معنے اُس کے مروجہ اور مصطلحہ الفاظ کے لحاظ سے کرے ورنہ تفسیر بالرّائے ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اگر تَوَفّی کے معنے الفاظ مروجہ قرآن میں عام طور پر قبض روح ہی ہے تو پھر مفسروں نے اِس کے برخلاف اقوال کیوں لکھے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ موت کے معنے بھی تو وہ برابر لکھتے چلے آئے ہیں اگر ایک قوم کا ان معنوں پر اجماع نہ ہوتا تو کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے آجتک جو تیرہ سو برس گذر گئے یہ معنے تفسیروں میں درج ہوتے چلے آئے سو اِن معنوں کا مسلسل طور پر درج ہوتے چلے آنا صریح اِس بات پر دلیل ہے کہ صحابہ کے وقت سے آجتک اِن معنوں پر اجماع چلا آیا ہے رہی یہ بات کہ پھر دوسرے معنے اُنہیں تفسیروں میں کیوں لکھے گئے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بعض لوگوں کی غلط رائے ہے اور اُس رائے کی غلطی ثابت کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ رائے سراسر قرآن شریف کے منشاء کے برخلاف ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۶۵-۴۶۷)

مسیح ابن مریم کی وفات کے بارہ میں اگر خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں کسی ایسے لفظ کو استعمال کرتا جس کو اُس نے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہوتا تو کسی خائن کو خیانت کرنے کی گنجائش ہوتی سو خیانت پیشہ لوگوں کا خدائے تعالیٰ نے ایسا بندوبست کیا کہ توفّی کے لفظ کو جو حضرت عیسیٰ کی وفات کے لیے استعمال کیا گیا تھا پچیس جگہ پر ایک ہی معنی پر استعمال کیا اور اُس کو ایک اصطلاحی لفظ بنا کر ہر یک جگہ میں اس کے یہ معنے لیے ہیں کہ روح کو قبض کر لینا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا تا یہ لفظ اس بات پر دلالت کرے کہ روح ایک باقی رہنے والی چیز ہے جو بعد موت اور ایسا ہی حالت خواب میں بھی

خدائے تعالیٰ کے قبضہ میں آجاتی ہے اور جسم پر فنا طاری ہوتی ہے مگر روح پر نہیں اور چونکہ یہی معنی بالالتزام ہریک محل میں جہاں توفی کا لفظ آیا ہے لیے گئے اور ان سے خروج نہیں کیا گیا اس لیے یہ معنے نصوص صریحہ بیّنہ ظاہرہ قرآن کریم میں سے ٹھہر گئے جن سے انحراف کرنا الحاد ہوگا کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ اَلنُّصُوْصُ یُحْمَلُ عَلٰی ظَوَاھِرِھَا۔ پس قرآن کریم نے توفی کے لفظ کو جو محل متنازعہ فیہ میں یعنی مسیح کی وفات کے متعلق ہے تئیس۲۳ جگہ ایک ہی معنوں پر اطلاق کر کے ایسا کھول دیا ہے کہ اب مراس کے ان معنوں میں کہ روح قبض کرنا اور جسم کو چھوڑ دینا ہے ایک ذرہ شک وشبہ کی جگہ نہیں رہی بلکہ یہ اول درجہ کے بیّنات اور مطالب صریحہ ظاہرہ بدیہیہ میں سے ہوگیا جس کو قطع اور یقین کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے اور جس سے انکار کرنا بھی اول درجہ کی نادانی ہے۔

اب قرآن کریم میں اس لفظ کی تشریح کرنے میں صرف دو سبیل ہیں تیسرا کوئی سبیل نہیں۔

(۱) دائمی طور پر روح کو قبض کر کے جسم کو بیکار چھوڑ دینا جس کا دوسرے لفظوں میں اماتت نام ہے یعنی مار دینا۔

(۲) دوسرے کچھ تھوڑی مدت کے لیے روح کا قبض کرنا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا جس کا دوسرے لفظوں میں انامت نام ہے یعنی سُلا دینا۔ لیکن ظاہر ہے کہ محل متنازعہ فیہ سے دوسرے قسم کے معنے کو کچھ تعلق نہیں کیونکہ سونا اور پھر جاگ اُٹھنا ایک معمولی بات ہے جب تک انسان سویا رہا روح اُس کی خدائے تعالیٰ کے قبضہ میں رہی اور جب جاگ اُٹھا تو پھر روح اُس جسم میں آگئی جو بطور بیکار چھوڑا گیا تھا۔ یہ بات صفائی سے سمجھ آسکتی ہے کہ جبکہ توفی کے لفظ سے صرف روح کا قبضہ میں کرلینا مراد ہے بغیر اس کے جو جسم سے کچھ سروکار ہو بلکہ جسم کا بیکار چھوڑ دینا توفّی کے مفہوم میں داخل ہے تو اس صورت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی حماقت نہیں کہ توفی کے یہ معنے کیے جاویں کہ خدا تعالیٰ جسم کو اپنے قبضہ میں کرلیوے کیونکہ اگر یہ معنے صحیح ہیں تو نمونہ کے طور پر قرآن کریم کے کسی اور مقام میں بھی ایسے معنے ہونے چاہیئے مگر ابھی ہم ظاہر کرچکے ہیں کہ قرآن کریم اول سے آخر تک صرف یہی معنے ہریک جگہ مراد لیتا ہے کہ روح کو قبض کرلینا اور جسم سے کچھ تعلق نہ رکھنا بلکہ اسکو بیکار چھوڑ دینا۔ اگر فرض کےطور پر اگر مسیح ابن مریم کے محل وفات میں دوسرے معنے مراد لیں تو انکا ماحصل یہی ہوگا کہ مسیح کچھ مدت تک سویا رہا اور پھر جاگ اُٹھا پس اس سے تو ثابت نہ ہوسکا کہ جسم آسمان پر چلا گیا۔ کیا جو لوگ رات کو یا دن کو سوتے ہیں تو انکا جسم آسمان پر چلا جایا کرتا ہے سونے کی حالت میں جیسا کہ ابھی میں بیان کرچکا ہوں صرف تھوڑی مدت تک روح قبض کرلی جاتی ہے جسم کے اُٹھائے جانے سے اُس کو علاقہ ہی کیا ہے ابھی میں بیان کرچکا ہوں کہ نصوص ظاہرہ متواترہ صریحہ قرآن کریم نے توفی کے لفظ کو صرف روح تک محدود رکھا ہے یعنی روح کو اپنے قبضہ میں کرلینا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا اور جبکہ یہ حال ہے تو پھر توفی کے لفظ سے یہ نکالنا کہ گویا خدائے تعالیٰ نے نہ صرف مسیح ابن مریم کی روح کو اپنی طرف اُٹھایا بلکہ اُس کے جسم عنصری کو بھی ساتھ ہی اُٹھا لیا یہ کیسا سخت جہالت سے بھرا ہوا خیال ہے جو صریح اور بدیہی طور پر نصوص بیّنہ قرآن کریم کے مخالف ہے۔ قرآن کریم نے نہ ایک بار نہ دو بار بلکہ پچیس۲۵ بار فرما دیا کہ توفی کے لفظ سے صرف قبض روح مراد ہے جسم سے

کچھ غرض نہیں پھر اگر اب بھی کوئی نہ مانے تو اُس کو قرآن کریم سے کیا غرض اُس کو تو صاف یہ کہنا چاہیئے کہ میں اپنے چند موہومی بزرگوں کی لکیر کو کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۴۰-۵۴۳)

خدائے تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ کوئی شخص میری طرف بغیر مرنے کے آ نہیں سکتا لیکن کچھ شک نہیں کہ مسیح اُس کی طرف اُٹھایا گیا سو وہ ضرور مر گیا خدائے تعالیٰ نے اپنی پاک کلام میں اُس کو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ سے پکارا ہے سو لفظ متوفی جن عام معنوں سے تمام قرآن اور حدیثوں میں مستعمل ہے وہ یہی ہے کہ روح کو قبض کرنا اور جسم کو معطل چھوڑ دینا یہ بڑے تعصّب کی بات ہے کہ تمام جہان کے لیے تو توفّی کے یہی معنے روح قبض کرنے کے ہوں لیکن مسیح ابن مریم کے لیے جسم قبض کرنے کے معنے لیے جاویں کیا ہم خاص عیسیٰ کے لیے کوئی نئی لُغت بنا سکتے ہیں جو کبھی اللہ اور رسول کے کلام میں مستعمل نہیں ہوئے اور نہ عرب کے شعرا اور زبان دان کبھی اس کو استعمال میں لائے پھر جس حالت میں توفی کے یہی شایع متعارف معنے ہیں کہ رُوح قبض کی جائے خواہ بطور ناقص یا بطور تام تو پھر رفع سے رفع جسد کیوں مراد لیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جس چیز پر قبضہ کیا جائے گا رفع بھی اُسی کا ہوگا نہ یہ کہ قبض تو روح کا ہو اور جسم کا رفع کیا جائے غرض برخلاف اُس متبادر اور مسلسل معنوں کے جو قرآن شریف سے توفی کے لفظ کی نسبت اول سے آخر تک سمجھے جاتے ہیں ایک نئے معنے اپنی طرف سے گھڑنا یہی تو الحاد اور تحریف ہے۔ خدائے تعالیٰ مسلمانوں کو اِس سے بچاوے اگر یہ کہا جاوے کہ توفی کے معنے تفسیروں میں کئی طور سے کیے گئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ مختلف اور متضاد اقوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے نہیں لیے گئے ورنہ ممکن نہ تھا کہ وُہ بیان جو چشمۂ وحی سے نکلا ہے اُس میں اختلاف اور تناقض رہ پاسکتا بلکہ وہ مفسرین کے صرف اپنے اپنے بیانات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی ان کا کسی خاص معنے پر اجماع نہیں ہوا اگر ان میں سے کسی کو وہ بصیرت دی جاتی جو اس عاجز کو دی گئی تو ضرور اسی ایک بات پر اُن کا اجماع ہو جاتا لیکن خدائے تعالیٰ نے اِس قطعی اور یقینی علم سے ان کو محروم رکھا تا اپنے ایک بندہ کو کامل طور پر یہ علم دیکر آدم صفی اللہ کی طرح اُس کی علمی فضیلت کا ایک نشان ظاہر کرے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۴۴، ۴۵۰)

عموم محاورہ قرآن شریف کا توفی کے لفظ کے استعمال میں یہی واقع ہوا ہے کہ وہ تمام مقامات میں اول سے آخر تک ہر ایک جگہ جو توفی کا لفظ آیا ہے اُس کو موت اور قبض روح کے معنے میں لاتا ہے اور جب عرب کے قدیم و جدید اشعار و قصائد و نظم و نثر کا جہاں تک ممکن تھا تتبّع کیا گیا اور عمیق تحقیقات سے دیکھا گیا تو یہ ثابت ہوا کہ جہاں جہاں توفی کے لفظ کا ذوی الروح سے یعنی انسانوں سے علاقہ ہے اور فاعل اللہ جل شانہ کو ٹھہرایا گیا ہے ان تمام مقامات میں توفی کے معنے موت و قبض روح کے کیے گئے ہیں اور اشعار قدیمہ و جدیدہ عرب میں اور ایسا ہی ان کی نثر میں بھی ایک بھی لفظ توفی کا ایسا نہیں ملیگا جو ذوی الروح میں مستعمل ہوا اور جس کا فاعل لفظاً یا معناً خدائے تعالیٰ ٹھہرایا گیا ہو یعنی فعل عبد کا قرار نہ دیا گیا ہو اور محض خدائے تعالیٰ کا فعل سمجھا گیا ہو اور پھر اس کے معنے بجز قبض روح کے

اور مراد رکھے گئے ہوں۔ لغات کی کتابوں قاموس صحاح صراح وغیرہ پر نظر ڈالنے والے بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ ضرب المثل کے طور پر بھی کوئی فقرہ عرب کے محاورات کا ایسا نہیں ملا جس میں توفی کے لفظ کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اور ذوی الروح کے بارہ میں استعمال میں لا کر پھر اس کے اور بھی معنے کیے ہوں بلکہ برابر ہر جگہ یہی معنے موت اور قبض روح کے کیے گئے ہیں اور کسی دوسرے احتمال کا ایک ذرہ راہ کھلا نہیں رکھا پھر بعد اس کے اس عاجز نے حدیثوں کی طرف رجوع کیا تا معلوم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ اور خود آنحضرت صلعم اس لفظ توفی کو ذوی الروح کی طرف منسوب کر کے کن کن معنوں میں استعمال کرتے تھے آیا یہ لفظ اُس وقت اُن کے روزمرہ محاورات میں کئی معنوں پر استعمال ہوتا تھا یا صرف ایک ہی معنے قبض روح اور موت کے لیے مستعمل تھا سو اس تحقیقات کے لیے مجھے بڑی محنت کرنی پڑی اور ان تمام کتابوں صحیح بخاری صحیح مسلم ترمذی ابن ماجہ ابوداؤد نسائی دارمی موطا شرح السنہ وغیرہ وغیرہ کا صفحہ صفحہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان تمام کتابوں میں جو داخل مشکوٰۃ ہیں تین سو چھیالیس ۳۴۶ مرتبہ مختلف مقامات میں توفیؔ کا لفظ آیا ہے اور ممکن ہے کہ میرے شمار کرنے میں بعض توفی کے لفظ رہ بھی گئے ہوں لیکن پڑھنے اور زیر نظر آ جانے سے ایک بھی لفظ باہر نہیں رہا اور جس قدر وہ الفاظ توفی کے ان کتابوں میں آئے ہیں خواہ وہ ایسا لفظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلا ہے یا ایسا ہے جو کسی صحابی نے منہ سے نکالا ہے تمام جگہ وہ الفاظ موت اور قبض روح کے معنے میں ہی آئے ہیں اور چونکہ میں نے ان کتابوں کو بڑی کوشش اور جانکاہی سے سطر سطر پر نظر ڈال کر دیکھ لیا ہے اس لیے میں دعوے سے اور شرط کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہر یک جگہ جو توفی کا لفظ ان کتابوں کی احادیث میں آیا ہے اُس کے بجز موت اور قبض روح کے اور کوئی معنے نہیں اور ان کتابوں سے بطور استقراء کے ثابت ہوتا ہے کہ بعد بعثت اخیر عمر تک جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توفیؔ کا لفظ بغیر معنی موت اور قبض روح کے کسی دوسرے معنی کے لیے ہرگز استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی دوسرے معنی کا لفظ زبانِ مبارک پر جاری ہوا اور کچھ شک نہیں کہ استقراء بھی ادلّہ یقینیہ میں سے ہے بلکہ جس قدر حقایق کے ثابت کرنے کے لیے استقراء سے مدد ملی ہے اور کسی طریق سے مدد نہیں ملی مثلاً ہمارے ان یقینیات کی بنا جو عموماً تمام انسانوں کی ایک زبان ہوتی ہے اور دو آنکھ اور عمر انسان کی عموماً اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتی اور اناج کی قسموں میں سے چنا اِس انداز کا ہوتا ہے اور گیہوں کا دانہ اس انداز کا یہ سب یقینیات استقراء سے معلوم ہوئے ہیں پس جو شخص اس استقراء کا انکار کرے تو ایسا کوئی لفظ توفیؔ کا پیش کرنا اُس کے ذمہ ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلا ہو اور بجز موت اور قبض روح کے اُس کے کوئی اور معنے ہوں اور امام محمد اسماعیل بخاری نے اس جگہ اپنی صحیح میں ایک لطیف نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم سات ہزار مرتبہ توفی کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے بعثت کے بعد اخیر عمر تک نکلا ہے اور ہر یک لفظ توفی کے معنے قبض روح اور موت تھی سو یہ نکتہ بخاری کا منجملہ اُن نکات کے ہے جن سے حق کے طالبوں کو امام بخاری کا مشکور و ممنون ہونا چاہیئے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۸۵-۸۸۸)

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ یہ جو آیت قرآن کریم ہے کہ یَا عِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ اس کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسٰی میں تجھے وفات دوں گا سو امام بخاری صاحب ابن عباس کا قول بطور تائید کے لائے ہیں تا معلوم ہو کہ صحابہ کا بھی یہی مذہب تھا کہ مسیح ابن مریم فوت ہو گیا ہے اور پھر امام بخاری نے ایک اور کمال کیا ہے کہ اپنی صحیح کے صفحہ ۵۳۱ میں مناقب ابن عباس میں لکھا ہے کہ خود ابن عباس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور دُعا کی کہ یا الٰہی اس کو حکمت بخش اس کو علم قرآن بخش چونکہ دُعا نبی کریم کی مستجاب ہے اس لیے ابن عباس کا یہ بیان کہ توفی عیسٰی جو قرآن کریم میں آیا ہے اماتت عیسٰی اُس سے مُراد ہے یعنی عیسٰی کی وفات دینا یہ معنی آیت کریمہ کے جو ابن عباس نے کیے ہیں اس وجہ سے بھی قابل قبول ہیں کہ ابن عباس کے حق میں علم قرآن کی دُعا مستجاب ہو چکی ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۹۲-۸۹۳)

بعض علماء وقت کو اس بات پر سخت غلو ہے کہ مسیح ابن مریم فوت نہیں ہوا بلکہ زندہ ہی آسمان کی طرف اُٹھایا گیا اور حیات جسمانی دنیوی کے ساتھ آسمان پر موجود ہے اور نہایت بے باکی اور شوخی کی راہ سے کہتے ہیں کہ توفّی کا لفظ جو قرآن کریم میں حضرت مسیح کی نسبت آیا ہے اُس کے معنے وفات دینا نہیں ہے بلکہ پورا لینا ہے یعنی یہ کہ روح کے ساتھ جسم کو بھی لے لینا مگر ایسے معنے کرنا اُن کا سراسر افترا ہے قرآن کریم کا عموماً التزام کے ساتھ اس لفظ کے بارہ میں یہ محاورہ ہے کہ وہ لفظ قبض روح اور وفات دینے کے معنوں پر ہر یک جگہ اس کو استعمال کرتا ہے یہی محاورہ تمام حدیثوں اور جمیع اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے جب سے دُنیا میں عرب کا جزیرہ آباد ہوا ہے اور زبان عربی جاری ہوئی ہے کسی قول قدیم یا جدید سے ثابت نہیں ہوتا کہ توفّی کا لفظ کبھی قبض جسم کی نسبت استعمال کیا گیا ہو بلکہ جہاں کہیں توفّی کے لفظ کو خدائے تعالیٰ کا فعل ٹھہرا کر انسان کی نسبت استعمال کیا گیا ہے وہ صرف وفات دینے اور قبض روح کے معنی پر آیا ہے نہ قبض جسم کے معنوں میں کوئی کتاب لغت کی اس کے مخالف نہیں کوئی مثل اور قول اہل زبان کا اس کے مغائر نہیں غرض ایک ذرہ احتمال مخالف کے گنجایش نہیں اگر کوئی شخص قرآن کریم سے یا کسی حدیث رسول اللہ صلعم سے یا اشعار و قصاید و نظم و نثر قدیم و جدید عرب سے یہ ثبوت پیش کرے کہ کسی جگہ توفّی کا لفظ خدا تعالیٰ کا فعل ہونے کی حالت میں جو ذوی الروح کی نسبت استعمال کیا گیا ہو وہ بجز قبض روح اور وفات دینے کے کسی اور معنی پر بھی اطلاق پا گیا ہے یعنی قبض جسم کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا ہے تو میں اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر اقرار صحیح شرعی کرتا ہوں کہ ایسے شخص کو اپنا کوئی حصہ ملکیت کا فروخت کر کے مبلغ ہزار روپیہ نقد دوں گا اور آئندہ اس کی کمالات حدیث دانی اور قرآن دانی کا اقرار کر لوں گا۔ ایسا ہی اگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی یا کوئی اُن کا ہم خیال یہ ثابت کر دیوے کہ اَلدَّجَّال کا لفظ جو بخاری اور مسلم میں آیا ہے بجز دجّال معہود کے کسی اور دجّال کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں ایسے شخص کو بھی جس طرح ممکن ہو

ہزار روپیہ نقد بطور تاوان کے دوں گا چاہیں تو مجھ سے رجسٹری کرالیں یا تمسک لکھالیں۔ اِس اشتہار کے مخاطب خاص طور پر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی ہیں جنہوں نے غرور اور تکبّر کی راہ سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ توفّی کا لفظ جو قرآن کریم میں حضرت مسیح کی نسبت آیا ہے اس کے معنے پورا لینے کے ہیں یعنی جسم اور روح کو بہیئت کذائی زندہ ہی اُٹھا لینا اور وجود مرکّب جسم اور روح میں سے کوئی حصہ متروک نہ چھوڑنا بلکہ سب کو بحیثیت کذائی اپنے قبضہ میں زندہ اور صحیح سلامت لے لینا سو اسی معنی سے انکار کر کے یہ شرطی اشتہار ہے ایسا ہی محض نفسانیت اور عدم واقفیت کی راہ سے مولوی محمد حسین صاحب نے الدجال کے لفظ کی نسبت جو بخاری اور مسلم میں جا بجا دجال معہود کا ایک نام ٹھہرایا گیا ہے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ الدجال دجال معہود کا خاص طور پر نام نہیں بلکہ ان کتابوں میں یہ لفظ دوسرے دجالوں کے لیے بھی مستعمل ہے اور اس دعویٰ کے وقت اپنی حدیث دانی کا بھی ایک لمبا چوڑا دعویٰ کیا ہے سو اِس وسیع معنی الدجّال سے انکار کر کے اور پھر دعویٰ کر کے کہ یہ لفظ الدجال کا صرف دجال معہود کے لیے آیا ہے اور بطور علم کے اُس کے لیے مقرر ہو گیا ہے یہ شرطی اشتہار جاری کیا گیا ہے مولوی محمد حسین صاحب اور ان کے ہم خیال علماء نے لفظ توفّی اور الدجال کی نسبت اپنے دعویٰ متذکرہ بالا کو بپایۂ ثبوت پہنچا دیا تو وہ ہزار روپیہ لینے کے مستحق ٹھہریں گے اور نیز عام طور پر یہ عاجز یہ اقرار بھی چند اخباروں میں شایع کر دیگا کہ درحقیقت مولوی محمد حسین صاحب اور اُن کے ہم خیال فاضل اور واقعی طور پر محدّث اور مفسر اور رموز اور دقایق قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے سمجھنے والے ہیں اگر ثابت نہ کر سکے تو پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ لوگ دقایق و حقایق بلکہ سطحی معنوں قرآن اور حدیث کے سمجھنے سے بھی قاصر اور سراسر غبی اور بلید ہیں اور درپردہ اللہ اور رسول کے دشمن ہیں کہ محض الحاد کی راہ سے واقعی اور حقیقی معنوں کو ترک کر کے اپنے گھر کے ایک نئے معنے گھڑتے ہیں ایسا ہی اگر کوئی یہ ثابت کر دکھاوے کہ قرآن کریم کی وہ آیتیں اور احادیث جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کوئی مردہ دنیا میں واپس نہیں آئے گا قطعیۃ الدلالت نہیں اور نیز بجائے لفظ موت اور امات کے جو متحد المعنی ہے اور نیند اور بے ہوشی اور کفر اور ضلالت اور قریب الموت ہونے کے معنوں میں بھی آیا ہے توفّی کا لفظ کہیں دکھا دے مثلاً یہ کہ توفاہ اللہ مائۃ عامٍ ثمّ بعثہ تو ایسے شخص کو بھی بلا توقف ہزار روپیہ نقد دیا جاوے گا۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۱۸-۹۲۱)

سوال اگر مسیح ابن مریم درحقیقت فوت ہو گیا ہے تو پھر کیا یہ بات کہ جو تیرہ سو برس سے آج تک مشہور چلی آتی ہے کہ مسیح زندہ آسمان کی طرف اُٹھایا گیا آج غلط ثابت ہو گئی۔

اما الجواب پس واضح ہو کہ یہ بالکل افترا ہے کہ تیرہ سو برس سے بالاجماع یہی مانا گیا ہے کہ مسیح جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر اُٹھایا گیا ہے ظاہر ہے کہ اگر سلف اور خلف کا کسی ایک بات پر اجماع ہوتا تو تفسیروں کے لکھنے والے متفرق قولوں کو نہ لکھتے لیکن کونسی ایسی تفسیر ہے جو اس بارہ میں اقوال متفرقہ سے خالی ہے کبھی کہتے ہیں کہ مسیح نیند

کی حالت میں اُٹھایا گیا اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ مرگیا اور اس کی روح اُٹھائی گئی اور کبھی قرآن شریف کی غلطی نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت اِنّی متوفیک ورافعک الی میں دراصل مُتَوَفّیک بعد میں ہونا چاہیئے اور رافعک الیّ اس سے پہلے اب ظاہر ہے کہ اگر ان کا اجماع ایک خاص شق پر ہوتا تو اپنی تفسیروں میں مختلف اقوال کیوں جمع کرتے اور جب ایک خاص بات پر یقین ہی نہیں تو پھر اجماع کہاں اور یہ اعتراض کہ تیرہ سو برس کے بعد یہ بات تمہیں کو معلوم ہوئی اِس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہ قول نیا تو نہیں پہلے راوی اس کے تو ابن عباس ہی تھے لیکن اب خدائے تعالیٰ نے اِس عاجز پر اس قول کی حقیقت ظاہر کر دی اور دوسرے اقوال کا بُطلان ثابت کر دیا تا قولی طور پر اپنے ایک عاجز بندہ کی اِس طرح پر ایک کرامت دکھاوے اور تا عقلمند لوگ سمجھ جاویں کہ یہ رہبری خاص خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اگر یہ معمولی فہم اور عقل کا کام ہوتا تو دوسرے لوگ بھی اس صداقت کو مع اُس کے ان سب دلائل کے جو ان رسالوں میں درج ہو چکے ہیں بیان کر سکتے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۵۸-۴۵۹)

دو گواہوں کے ذریعہ سے پھانسی مل جاتی ہے مگر یہاں اس قدر شواہد موجود ہیں اور وہ بدستور انکار کرتے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ اور پھر حضرت مسیح کا اپنا اقرار اسی قرآن مجید میں موجود ہے فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم[1] اور توفی کے معنے موت بھی قرآن مجید ہی سے ثابت ہے کیونکہ یہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی آیا ہے جیسا کہ فرمایا و اما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلما توفیتنی کہا ہے جس کے معنے موت ہی ہیں اور ایسا ہی حضرت یوسف اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی یہی لفظ آیا ہے پھر ایسی صورت میں اس کے کوئی اور معنے کیونکر ہو سکتے ہیں، یہ بڑی زبردست شہادت مسیح کی وفات پر ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

رافعک الیّ میں جو رفع کا وعدہ دیا گیا تھا یہ وہی وعدہ ہے جو آیت بل رفعہ اللہ الیہ[3] میں پورا کیا گیا اب آپ وعدہ کی آیت پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ اس سے پہلے کون رسے) لفظ موجود ہیں تو فی الفور آپ کو نظر آ جائے گا کہ اس سے پہلے انی متوفیک ہے اب ان دونوں آیتوں کے ملانے سے جن میں سے ایک وعدہ کی آیت اور ایک ایفاء وعدہ کی آیت ہے آپ پر کھل جائے گا کہ جس طرز سے وعدہ تھا اُسی طرز سے وہ پورا ہونا چاہیئے تھا یعنی وعدہ یہ تھا کہ اے عیسیٰ میں تجھے مارنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اِس سے صاف کھل گیا کہ اُن کی روح اٹھائی گئی ہے کیونکہ موت کے بعد روح ہی اٹھائی جاتی ہے نہ کہ جسم۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں کہا۔ کہ میں تجھے آسمان کی طرف اُٹھانے والا ہوں بلکہ یہ کہا کہ اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور جو لوگ موت کے ذریعہ سے اُس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اسی قسم کے لفظ اُن کے حق میں بولے جاتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اٹھائے گئے یا خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کر گئے

[1] المائدہ آیت ۱۱۸ ۔ [2] یونس آیت ۴۷ ۔ [3] النسا آیت ۱۵۹

جیساکہ اس آیت میں بھی ہے یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ[2]۔ اور جیساکہ اس آیت میں اشارہ ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[3]۔ (الحق دہلی ص ۳۸)

قرآن کریم کے عموم محاورہ پر نظر ڈالنے سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تمام قرآن میں توفی کا لفظ قبض روح کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے یعنی اُس قبض روح میں جو موت کے وقت ہوتا ہے دو جگہ قرآن کریم میں وہ قبض روح بھی مراد لیا ہے جو نیند کی حالت میں ہوتا ہے لیکن اس جگہ قرینہ قائم کردیا ہے جس سے سمجھا گیا ہے کہ حقیقی معنے توفی کے موت لیے ہیں۔ اور جو نیند کی حالت میں قبض روح ہوتا ہے۔ وہ بھی ہمارے مطلب کے مخالف نہیں کیونکہ اس کے تو یہی معنے ہیں کہ کسی وقت تک انسان سوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اپنے تصرف میں لے لیتا ہے اور پھر انسان جاگ اٹھتا ہے سو یہ وقوعہ ہی الگ ہے اس سے ہمارے مخالف کچھ فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بہرحال جبکہ قرآن میں لفظ توفی کا قبض روح کے معنوں میں ہی آیا ہے اور احادیث میں ان تمام مواضع میں جو خدا تعالیٰ کو فاعل ٹھہرا کر اس لفظ کو انسان کی نسبت استعمال کیا ہے جا بجا موت ہی معنے لیے ہیں۔ تو بلاشبہ یہ لفظ قبض روح اور موت کے لیے قطعیۃ الدلالت ہوگیا۔ اور بخاری جو اصح الکتب ہے اُس میں بھی تفسیر آیت فلما توفیتنی کی تقریب میں متوفیک کے معنے ممیتک لکھا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ موت اور رفع میں ایک ترتیب طبعی واقع ہے ہر یک مومن کی روح پہلے فوت ہوتی ہے پھر اُس کا رفع ہوتا ہے۔ اسی ترتیب طبعی پر یہ ترتیب وضعی آیت کی دلالت کررہی ہے کہ پہلے انی متوفیک فرمایا اور پھر بعد اُس کے رافعک کہا اور اگر کوئی کہے کہ رافعک مقدم اور متوفیک مؤخر ہے یعنی رافعک آیت کے سر پر اور متوفیک فقرہ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا کے بعد اور بیچ میں یہ فقرہ محذوف ہے ثُمَّ مُنَزِّلُکَ اِلَی الْاَرْضِ سو یہ ان یہودیوں کی تحریف ہے جن پر بوجہ تحریف کے لعنت ہوچکی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس آیت کو اس طرح پر زیر و زبر کرنا پڑے گا۔ یاعیسٰی انی رافعک الی السّماء و مطہرک من الذین کفروا و جاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ ثم منزلک الی الارض و متوفیک اب فرمائیے کیا اس تحریف پر کوئی حدیث صحیح مرفوع متصل مل سکتی ہے۔ یہودی بھی تو ایسے ہی کام کرتے تھے کہ اپنی رائے سے اپنی تفسیروں میں بعض آیات کے معنے کرنے کے وقت بعض الفاظ کو مقدم اور بعض کو مؤخر کردیتے تھے جن کی نسبت قرآن مجید میں یہ آیت موجود ہے کہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ[1] ان کی تحریف ہمیشہ لفظی نہیں تھی بلکہ معنوی بھی تھی۔ سو ایسی تحریفوں سے ہر یک مسلمان کو ڈرنا چاہیئے۔ اگر کسی حدیث صحیح میں ایسی تحریف کی اجازت ہے تو بسم اللہ وہ دکھلائیے۔ غرض آیت یاعیسٰی انی متوفیک میں اگر قرآن کریم کا عموم محاورہ ملحوظ رکھا جائے اور آیت کو تحریف سے بچایا جائے تو پھر موت کے بعد اور دوسرے معنے کیا نکل سکتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آیت میں رافعک الی وارد ہے رافعک الی السّماء وارد نہیں۔ اس میں حکمت

[1] المائدہ آیت ۱۴ ؎ [2] الفجر آیت ۲۸ تا ۳۱ ؎ [3] البقرۃ آیت ۱۵۷ ؎

یہ ہے کہ روح کوئی مکانی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تعلقات مجہول الکنہ ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک تعلق روح کا قبر کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور کشف قبور کے وقت ارباب مکاشفات پر وہ تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب قبور اپنی اپنی قبروں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان سے صاحب کشف کے مخاطبات و مکالمات بھی واضح ہو جاتے ہیں یہ بات احادیث صحیحہ سے بھی بخوبی ثابت ہے۔ صلوٰۃ فی القبر کی حدیث مشہور ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ مُردے جوتی کی آواز بھی سُن لیتے ہیں اور السلام علیکم کا جواب دیتے ہیں باوجود اس کے ایک تعلق اُن کا آسمان سے بھی ہوتا ہے اور اپنے نفسی نقطہ کے مکان پر اُن کا تمثل مشاہدہ میں آتا ہے اور اُن کا رفع مختلف درجات سے ہوتا ہے بعض پہلے آسمان تک رہ جاتے ہیں بعض دوسرے تک بعض تیسرے تک لیکن موت کے بعد رفع روح بھی ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث صحیح اور آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ[1] صریح اشارہ کر رہی ہے۔ لیکن اُن کا آسمان پر ہونا یا قبروں میں ہونا ایک مجہول الکنہ امر ہے۔ عنصری خاکی جسم تو اُن کے ساتھ نہیں ہوتا۔ کہ خاکی اجسام کی طرح ایک خاص اور حیّز اور مکان میں ان کا پایا جانا ضروری ہو۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے رافعك الی فرمایا رافعك الی السماء نہیں کہا۔ کیونکہ جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں وہ خاص طور پر کسی مکان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے بلکہ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ[2] ہوتے ہیں یعنی اگر ان کا کوئی خاص مکان ہے تو یہی مکان ہے کہ خدا تعالیٰ کے قرب کا مکان جو حسب استعداد اُن کو ملتا ہے اب جبکہ قرآن کریم میں رافعك الی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ میں تجھ کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اگر جسمانی طور پر رفع مراد لیا جائے تو سخت اشکال پیش آتا ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ بخاری سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح مع اپنے خالہ زاد بھائی کے دوسرے آسمان پر ہیں۔ تو کیا خدا تعالیٰ دوسرے آسمان میں بیٹھا ہوا ہے تا دوسرے آسمان میں ہونا رافعك الی کا مصداق ہو جائے بلکہ اس جگہ روحانی رفع مراد ہے جس کا حسب مراتب ایک خاص آسمان سے تعلق ہے۔ بخاری میں حدیث معراج کی پڑھو اور غور سے دیکھو۔ اب خلاصہ کلام یہ کہ ان تمام وجوہات کی رو سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ وفات پا گئے ہیں بلاشبہ آیت انی متوفیك حضرت عیسیٰ کی وفات پر قطعیۃ الدلالت ہے عموم محاورہ قرآن شریف کا اسی پر دلالت کرتا ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے متوفیک کے معنے ممیتک لکھے ہیں۔ اور بخاری نے کسی صحابی کی روایت سے کوئی دوسرے متوفیک کے معنے ہرگز اپنی صحیح میں نہیں لکھے اور نہ مسلم نے لکھے ہیں۔ بلکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے فاعل ہونے اور انسان کے مفعول ہونے کی حالت میں بجز قبض روح کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر میں نے ہزار روپیہ کا اشتہار بھی دیا ہے۔ اب اگر آیت مسیح ابن مریم کی وفات پر قطعیۃ الدلالت نہیں تو دلائل مذکورہ بالا اور نیز دلائل مفصلہ مبسوطہ ازالہ اوہام کا جواب دینا

---

[1] الاعراف آیت ۴۱ ۔ [2] القمر آیت ۵۶ ۔

چاہیئے تا آپ کو ہزار روپیہ بھی مل جائے اور اپنے بھائیوں میں علمی شہرت بھی حاصل ہوجائے۔ (الحق دہلی صفحہ ۸۴-۸۶)

بعض نادان خیال کرتے ہیں کہ آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ میں صرف حضرت مسیح کی وفات کا وعدہ ہے جس سے صرف اِس قدر نکلتا ہے کہ کسی وقت خدا تعالیٰ مسیح کو وفات دیدیگا یہ تو نہیں نکلتا کہ وفات دے بھی دی مگر یہ لوگ نہیں سوچتے کہ خدا تعالیٰ نے اُس وعدہ کو پورا ہونے کی بھی تو خبر دیدی جبکہ خود حضرت مسیح کی زبان سے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[1] کا ذکر بیان فرمادیا ماسوا اس کے یہ بھی سوچنے کے لائق ہے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ کہ میں ایسا کرنے کو ہوں خود یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ وعدہ جلد پورا ہونے والا ہے اور اُس میں کچھ توقف نہیں نہ یہ کہ رفع کا وعدہ تو اسی وقت پورا ہوجائے لیکن وفات دینے کا وعدہ ابھی تک جو دو ہزار برس کے قریب گذر گئے پورا ہونے میں نہ آوے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۵-۴۶)

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ رَدَّ عَلٰی اَقْوَالِكُمْ فِیْ كِتَابِهٖ وَذَكَرَ مَوْتَ الْمَسِیْحِ بِلَفْظِ التَّوَفِّیْ كَمَا ذَكَرَ مَوْتَ نَبِیِّنَا بِذَالِكَ اللَّفْظِ فَاَنْتُمْ تُؤَوِّلُوْنَ ذَالِكَ اللَّفْظَ فِی الْمَسِیْحِ وَاَمَّا فِیْ سَیِّدِنَا فَلَا تُؤَوِّلُوْنَهٗ فَتِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی وَخِیَانَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ۔

(تحفہ بغداد صفحہ ۱۶)

وَاَمَّا لَفْظُ التَّوَفِّی الَّذِیْ یُوْجَدُ فِی الْقُرْاٰنِ فِیْ حَقِّ الْمَسِیْحِ وَغَیْرِهٖ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ فَلَا سَبِیْلَ فِیْهِ اِلٰی تَاْوِیْلٍ اُخْرٰی بِغَیْرِ الْاِمَاتَةِ وَاَخَذْنَا مَعْنَاهُ مِنَ النَّبِیِّ وَمِنْ اَجَلِّ الصَّحَابَةِ لَا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِنَا وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْاِمَاتَةَ اَمْرٌ ثَابِتٌ دَائِمٌ دَاخِلٌ فِیْ سُنَنِ اللّٰهِ الْقَدِیْمَةِ وَمَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا تُوُفِّیَ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِ عِیْسَی الرُّسُلُ فَاِذَا تَعَارَضَ لَفْظُ التَّوَفِّیْ وَلَفْظُ النُّزُوْلِ فَاِنْ سَلَّمْنَا وَفَرَضْنَا صِحَّةَ الْحَدِیْثِ فَلَا بُدَّ لَنَا اَنْ

(ترجمہ) تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تمہارے اقوال کی تردید کی ہے اور مسیح علیہ السلام کی موت کو اسی طرح توفی کے لفظ کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے اس نے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کو اسی لفظ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ تم حضرت مسیح کے بارے میں تو اس لفظ کی تاویل کرتے ہو لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کی تاویل نہیں کرتے۔ یہ تو ناقص تقسیم اور اللہ تعالیٰ کے دین میں خیانت ہے۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۱۶)

مگر توفی کا لفظ جو قرآن میں حضرت مسیح اور دوسروں کے حق میں پایا جاتا ہے سو اُس میں بغیر معنے مارنے کے اور کوئی تاویل نہیں ہوسکتی اور یہ معنے مارنے کے ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُس کے بزرگ صحابہ سے لیے ہیں یہ نہیں کہ اپنی طرف سے گھڑے ہیں اور تو جانتا ہے کہ مارنا ایک امر ثابت دائم الوقوع اور خدا تعالیٰ کی قدیم سنتوں میں داخل ہے اور کوئی نبی ایسا نہیں جو فوت نہ ہوا ہو اور حضرت عیسٰی سے پہلے جو نبی آئے وہ فوت ہوچکے ہیں اور جبکہ لفظ نزول اور لفظ توفی میں معارضہ واقع ہوا

---

[1] المائدہ آیت ۱۱۸

نُزُوْلَ لَفْظِ النُّزُوْلِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بِمَوْضُوْعٍ لِنُزُوْلِ رَجُلٍ مِّنَ السَّمَآءِ بَلْ وُضِعَ لِنُزُوْلِ مُسَافِرٍ مِّنْ اَرْضٍ بِاَرْضٍ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۵۱)

اُنْظُرُوْا فِی الرِّسَالَةِ الْفَوْزِ الْكَبِيْرِ وَفَتْحِ الْخَبِيْرِ الَّتِیْ هِیَ تَفْسِيْرُ الْقُرْاٰنِ بِاَقْوَالِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَهِیَ مِنْ وَّلِیِّ اللّٰهِ الدِّهْلَوِیِّ حَكِيْمِ الْمِلَّةِ قَالَ مُتَوَفِّيْكَ مُمِيْتُكَ وَلَمْ يَقُلْ غَيْرَهَا مِنَ الْكَلِمَةِ وَلَمْ يَذْكُرْ مَعْنًی سِوَاهَا اِتِّبَاعًا لِّمَعْنًی خَرَجَ مِنْ مِّشْكٰوةِ النُّبُوَّةِ۔

(اتمام الحجۃ صفحہ ۶)

اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت دو جگہ توفی کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی قرآن کریم میں آیا ہے اور ایسا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا میں بھی یہی لفظ اللہ جل شانہ نے ذکر فرمایا ہے اور کتنے اور مقامات میں بھی موجود ہے۔ اور اُن تمام مقامات پر نظر ڈالنے سے ایک منصف مزاج آدمی پورے اطمینان سے سمجھ سکتا ہے کہ توفی کے معنے ہر جگہ قبض روح اور مارنے کے ہیں نہ اور کچھ۔ کتب حدیث میں بھی یہی محاورہ بھرا ہوا ہے۔ کتب حدیث میں توفی کے لفظ کو صدہا جگہ پاؤ گے مگر کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ بجز مارنے کے کسی اور معنے پر بھی استعمال ہوا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر ایک اُمّی آدمی عرب کو کہا جائے کہ تُوُفِّیَ زَیْدٌ تو وہ اس فقرہ سے یہی سمجھے گا کہ زید وفات پا گیا۔ خیر عربوں کا عام محاورہ بھی جانے دو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات مبارکہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی صحابی یا آپ کے عزیزوں میں سے فوت ہوتا تو آپ توفی کے لفظ سے ہی اس کی وفات ظاہر کرتے تھے اور جب آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو صحابہ نے بھی توفی کے لفظ سے ہی آپ کی وفات ظاہر کی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کی وفات حضرت عمر کی وفات۔ غرض تمام صحابہ کی وفات توفی کے لفظ سے ہی تقریراً تحریراً بیان ہوئی اور مسلمانوں کی وفات کے لیے یہ لفظ ایک عزت کا قرار پایا تو پھر جب مسیح پر یہی وارد ہوا تو کیوں اس کے خود تراشیدہ معنے لیے جاتے ہیں۔ اگر یہ عام محاورہ کا فیصلہ منظور نہیں تو دوسرا طریق فیصلہ یہ ہے کہ یہ دیکھا

پس اگر ہم حدیث کی صحت کو قبول کریں تاہم ہمارے لیے ضروری ہے کہ نزول کے لفظ کی تاویل کریں کیونکہ وہ دراصل آسمان سے اُترنے کے معنوں کے لیے موضوع نہیں ہے بلکہ وہ تو مسافروں کے نزول کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ (ترجمہ از نور الحق حصہ اول صفحہ ۵۱)

(ترجمہ)۔ رسالہ الفوز الکبیر و فتح الخبیر جو حکیم الملت سید ولی اللہ شاہ صاحب دہلوی کی تصنیف ہے اور جس میں احادیث نبویہ کے ذریعہ تفسیر قرآن بیان ہوئی ہے اسے دیکھیں۔ اس میں انہوں نے متوفیک کے معنے ممیتک کیے ہیں۔ اور اس کے خلاف کوئی اور بات نہیں کہی اور نہ اس کے سوا اور کوئی معنے نقل کیے ہیں اور ایسا کرنے میں انہوں نے ان معنے کا تتبع کیا ہے جو نور نبوت سے ظاہر ہوئے ہیں۔

جائے کہ جو مسیح کے متعلق قرآنی آیات میں توفی کا لفظ موجود ہے اس کے معنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے کیا کیے ہیں چنانچہ ہم نے یہ تحقیقات بھی کی تو بعد دریافت ثابت ہوا کہ صحیح بخاری میں یعنی کتاب التفسیر میں آیت فلما توفیتنی کے معنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مارنا ہی لکھا ہے اور پھر اسی موقعہ پر آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے معنے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مُمِیْتُکَ درج ہیں یعنی اے عیسیٰ میں تجھے مارنے والا ہوں۔ (اتمام الحجۃ صفحہ ۱۵، ۱۶)

مسئلہ وفات مسیح میں کسی جگہ حدیث نے قرآن شریف کی مخالفت نہیں کی بلکہ تصدیق کی ہے قرآن میں مُتَوَفِّیْکَ آیا ہے حدیث میں ممیتک آگیا ہے۔ قرآن میں فلما توفیتنی آیا حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی لفظ فلما توفیتنی بغیر تغیر و تبدیل کے اپنے پر وارد کر کے ظاہر فرما دیا کہ اس کے معنے مارنا ہے نہ اور کچھ اور نبی کی شان سے بعید ہے کہ خدا تعالیٰ کے مرادی معنوں کی تحریف کرے۔ اور ایک آیت قرآن شریف کی جس کے معنے خدا تعالیٰ کے نزدیک زندہ اٹھا لینا ہو اسی کو اپنی طرف منسوب کر کے اس کے معنے مار دینا کر دیوے یہ تو خیانت اور تحریف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس گندی کارروائی کو منسوب کرنا میرے نزدیک اول درجہ کا فسق بلکہ کفر کے قریب قریب ہے۔ افسوس کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی ثابت کرنے کے لیے ان خیانت پیشہ مولویوں کی کہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی محرف القرآن ٹھہرایا بجز اس کے کیا کہیں کہ لعنت اللہ علی الخائنین الکاذبین یہ بات نہایت سیدھی اور صاف تھی کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کو اسی طرح اپنی ذات کی نسبت منسوب کر لیا جیسا کہ وہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب تھی اور منسوب کرنے کے وقت یہ نہ فرمایا کہ اس آیت کو جب حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کریں تو اس کے معنے اور ہوں گے اور جب میری طرف منسوب ہو تو اس کے اور معنے ہیں حالانکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت میں کوئی معنوی تغیر و تبدیل ہوتی تو رفع فتنہ کے لیے یہ عین فرض تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس تشبیہ و تمثیل کے موقع پر فرما دیتے کہ میرے اس بیان سے کہیں یوں نہ سمجھ لینا کہ جس طرح میں قیامت کے دن فلما توفیتنی کہہ کر جناب الٰہی میں ظاہر کروں گا کہ بگڑنے والے لوگ میری وفات کے بعد بگڑے اسی طرح حضرت مسیح بھی فلمّا توفّیتنی کہہ کر یہی کہیں گے کہ میری وفات کے بعد میری امت کے لوگ بگڑے کیونکہ فلما توفیتنی سے میں تو اپنا وفات پانا مراد رکھتا ہوں لیکن مسیح کی زبان سے جب فلما توفیتنی نکلے گا تو اس سے وفات پانا مراد نہیں ہوگا بلکہ زندہ اٹھایا جانا مراد ہوگا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرق کر کے نہیں دکھلایا جس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں موقعوں پر ایک ہی معنے مراد لیے ہیں۔ پس اب ذرا آنکھ کھول کر دیکھ لینا چاہیئے کہ جبکہ فلما توفیتنی کے لفظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ دونوں شریک ہیں گویا یہ آیت دونوں کے حق میں وارد ہے تو اس آیت کے خواہ کوئی معنے کرو دونوں اس میں شریک ہوں گے سو اگر تم یہ کہو کہ اس جگہ توفی کے معنے زندہ آسمان پر اٹھایا جانا مراد ہے تو تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ اس زندہ اٹھائے

لہ المائدہ آیت ۱۱۸۔

جانے میں حضرت عیسیٰ کی کچھ خصوصیت نہیں بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں کیونکہ آیت میں دونوں کی مساوی شراکت ہے۔ لیکن یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ آسمان پر نہیں اٹھائے گئے بلکہ وفات پا گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں آپ کی قبر مبارک موجود ہے تو پھر اس سے تو بہر حال ماننا پڑا کہ حضرت عیسیٰ بھی وفات پا گئے ہیں۔ (اتمام الحجۃ ص۱۷-۱۸)

قرآن میں رفع الی اللہ کا ذکر ہے۔ نہ رفع الی السماء کا پھر جبکہ اللہ جل شانہ نے یہ فرمایا ہے کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تو اس سے قطعی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ رفع موت کے بعد ہے کیونکہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ میں تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھاؤں گا سو اس میں کیا کلام ہے کہ خدا کے نیک بندے وفات کے بعد خدا کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ سو وفات کے بعد نیک بندوں کا رفع ہونا سنت اللہ میں داخل ہے مگر وفات کے بعد جسم کا اٹھایا جانا سنت اللہ میں داخل نہیں اور یہ کہنا کہ توفی کے معنے اس جگہ سونا ہے سراسر الحاد ہے کیونکہ صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ متوفیک ممیتک اور اسی کی تائید میں صاحب بخاری اسی محل میں ایک حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لایا ہے۔ پس جو معنی توفی کے ابن عباس اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام متنازع فیہ میں ثابت ہو چکے۔ اس کے برخلاف کوئی اور معنی کرنا بھی ملحدانہ طریق ہے مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام متنازع فیہ میں یہی معنے کیے پس بڑی بے ایمانی ہے جو نبی کریم کے معنوں کو ترک کر دیا جائے۔ (ست بچن ص ح حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶۴)

وَاَمَّا نَحْنُ فَمَا نَقُوْلُ فِیْ مَعْنَی التَّوَفِّیْ اِلَّا مَاقَالَ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ۔ وَاَصْحَابُہُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ مَّنْبَعِ النُّبُوَّۃِ۔ وَمَا نَقْبَلُ خِلَافَ ذَالِکَ رَأْیَ اَحَدٍ۔ وَلَا قَوْلَ قَائِلٍ۔ اِلَّا مَا وَافَقَ قَوْلَ اللّٰہِ وَقَوْلَ خَیْرِ الْمُرْسَلِیْنَ۔ وَاِذَا حَصْحَصَ الْحَقُّ فِیْ مَعْنَی التَّوَفِّیْ مِنْ لِّسَانِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ۔ وَثَبَتَ اَنَّ التَّوَفِّیْ ھُوَ الْاِمَاتَۃُ وَالْاِفْنَاءُ۔ لَا الرَّفْعُ وَالْاِسْتِیْفَاءُ۔ کَمَا ھُوَ زَعْمُ الْمُخَالِفِیْنَ۔ (انجام آتھم ص۱۳۰-۱۳۱)

مگر ہم تو لفظ توفی کے معنے کے بارے وہی کچھ کہتے ہیں جو ہمارے رسول خیر الخلق صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ان صحابہ نے جو چشمہ نبوت سے علم دیئے گئے تھے فرمایا ہے۔ اور اس کے خلاف کسی کی رائے اور کسی کے قول کو قبول نہیں کرتے سوائے اس قول کے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے موافق ہو خصوصاً جب کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے توفی کے معنے کے بارہ میں حق ظاہر ہو گیا ہے اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ توفی کے معنے مارنے اور فنا کرنے کے ہیں۔ نہ کہ اٹھانے یا پورا پورا لینے کے۔ جیسا کہ مخالفین کا خیال ہے۔ (انجام آتھم ص۱۳۰-۱۳۱)

لَا یُمْکِنُ لِاَحَدٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاَثَرٍ مِّنَ الصَّحَابَۃِ۔ اَوْحَدِیْثٍ مِّنْ خَیْرِ الْبَرِیَّۃِ۔ فِیْ تَفْسِیْرِ لَفْظِ التَّوَفِّیْ بِغَیْرِ مَعْنَی الْاِمَاتَۃِ۔ وَلَا یَقْدِرُوْنَ عَلَیْہِ اَبَدًا وَّلَوْ مَاتُوْا بِالْحَسْرَۃِ۔ فَاَیُّ دَلِیْلٍ اَکْبَرُ مِنْ ذَالِکَ لَوْ کَانَ فِیْ قَلْبٍ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنَ الْخَشْیَۃِ۔ (انجام آتھم ص۱۳۳)

وَاَمَّا لَفْظُ التَّوَفِّیْ الَّذِیْ یُفَتِّشُوْنَہٗ فِی اللِّسَانِ الْعَرَبِیَّۃِ فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَا یُسْتَعْمَلُ حَقِیْقَۃً اِلَّا لِلْاِمَاتَۃِ فِیْ ھٰذِہِ اللَّھْجَۃِ۔ سِیَّمَا اِذَا کَانَ فَاعِلُہُ اللّٰہُ وَالْمَفْعُوْلُ رَجُلًا اَوْ مِنَ النِّسْوَۃِ۔ فَلَا یَاْتِیْ اِلَّا بِمَعْنٰی قَبْضِ الرُّوْحِ وَالْاِمَاتَۃِ۔ وَمَا تَرٰی خِلَافَ ذَالِکَ فِیْ کُتُبِ اللُّغَتِ وَالْاَدَبِیَّۃِ۔ وَمَنْ فَتَّشَ لُغَاتَ الْعَرَبِ وَاَنْضَا اِلَیْھَا رِکَابَ الطَّلَبِ۔ لَنْ یَّجِدَ ھٰذَا اللَّفْظَ فِیْ مِثْلِ ھٰذِہِ الْمَقَامَاتِ۔ اِلَّا بِمَعْنَی الْاِمَاتَۃِ وَالْاِھْلَاکِ۔ مِنَ اللّٰہِ رَبِّ الْکَائِنَاتِ۔ وَقَدْ ذُکِرَ ھٰذَا اللَّفْظُ مِرَارًا فِی الْقُرْاٰنِ۔ وَوَضَعَہُ اللّٰہُ فِیْ مَوَاضِعِ الْاِمَاتَۃِ وَاَقَامَہٗ مَقَامَھَا فِی الْبَیَانِ۔ وَالسِّرُّ فِیْ ذَالِکَ اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّیْ یَقْتَضِیْ وُجُوْدَ شَیْءٍ بَعْدَ الْمَمَاتِ۔ فَھٰذَا رَدٌّ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْتَقِدُوْنَ بِبَقَاءِ الْاَرْوَاحِ بَعْدَ الْوَفَاتِ۔ فَاِنَّ لَفْظَ التَّوَفِّیْ یُؤْخَذُ مِنَ الْاِسْتِیْفَاءِ۔ وَفِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی اَخْذِ شَیْءٍ بَعْدَ الْاِمَاتَۃِ وَالْاِفْنَاءِ۔ وَالْاَخْذُ یَدُلُّ عَلَی الْبَقَاءِ۔ فَاِنَّ الْمَعْدُوْمَ لَا یُؤْخَذُ وَلَا یَلِیْقُ بِالْاَخْذِ

ترجمہ: کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ صحابہ کرام کی کوئی روایت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پیش کر سکے جس میں لفظ توفی کے معنے مارنے کے سوا کچھ اور بیان ہوئے ہوں اور مخالفین ہرگز ہرگز ایسا کرنے پر قادر نہیں ہونگے اگرچہ حسرت سے مر ہی جائیں پس اگر کسی کے دل میں ذرا بھر بھی خشیت اللہ پائی جاتی ہو۔ تو اس کے لیے اس سے بڑھکر اور کونسی دلیل ہو گی۔

لفظ توفی جسے وہ عربی لغت میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں یاد رہے کہ سوائے مارنے کے اس زبان میں کسی اور معنے میں از روئے حقیقت وہ استعمال نہیں ہوتا خصوصاً اس وقت جب اس کا فاعل اللہ اور مفعول کوئی انسان مرد یا عورت ہو پس اس صورت میں سوائے قبض روح کے اور موت دئے جانے کے اور کسی معنے میں استعمال نہیں ہوتا اور کتب لغت اور ادب میں اس کے خلاف ہرگز کوئی معنے نہیں پاؤگے اور جو کوئی بھی لُغت عربی کی تفتیش کرے اور جستجو کی سواریوں کو اس غرض کے لیے لاغر کرے وہ بھی اس لفظ کو ایسے مقامات میں صرف مارنے اور اللہ کی طرف سے ہلاک کیے جانے کے معنے میں پائیگا اور یہ لفظ قرآن کریم میں بارہا بیان ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس لفظ کو امات کی جگہ پر ہی رکھا ہے اور موت کے لفظ کا قائمقام بنایا ہے اور اس میں بھید یہ ہے کہ لفظ توفی مُتوفّٰی کے وفات پاجانے کے بعد بھی اس کے باقی رہنے کا مقتضی ہے۔ اور اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو موت کے بعد بقائے ارواح کے قائل نہیں ہیں کیونکہ لفظ توفی استیفا سے ماخوذ ہے اور اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ موت اور فنا کے بعد بھی کسی چیز کا اخذ (لینا) موجود ہے۔ اور کسی چیز کا ماخوذ ہونا اس کے باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو چیز معدوم ہو وہ ماخوذ نہیں ہو سکتی اور

وَالْإِقْتِنَاءِ۔ وَهٰذَا مِنَ الْعُلُوْمِ الْحِكْمِيَّةِ الْقُرْآنِيَّةِ۔ فَإِنَّهُ رَجَعَ الْقَوْمَ إِلٰى لِسَانِهِمُ الْمُبَارَكَةِ الْإِلْهَامِيَّةِ۔ لِيَعْلَمُوْا أَنَّ الْأَرْوَاحَ بَاقِيَةٌ وَّالْمَعَادَ حَقٌّ وَّلِيَنْتَهُوْا مِنْ عَقَائِدِ الدَّهْرِيِّيْنَ وَالطَّبِيْعِيِّيْنَ۔ (انجام آتھم صفحہ ۱۵۳-۱۵۴)

لَمَّا كَانَ الْمَلْحُوْظُ فِيْ مَعْنَى التَّوَفِّيْ مَفْهُوْمَ الْإِمَاتَةِ مَعَ الْإِبْقَاءِ فَلِأَجْلِ ذٰلِكَ لَا يُسْتَعْمَلُ هٰذَا اللَّفْظُ فِيْ غَيْرِ الْإِنْسَانِ بَلْ يُسْتَعْمَلُ فِيْ غَيْرِهٖ لَفْظُ الْإِمَاتَةِ وَالْإِهْلَاكِ وَالْإِفْنَاءِ۔ مَثَلًا لَا يُقَالُ تَوَفَّى اللّٰهُ الْحِمَارَ أَوِ الْقُنْفُذَ وَالْأَفْعٰى وَالْفَارَ۔ فَإِنَّ أَرْوَاحَهَا لَيْسَتْ بِبَاقِيَةٍ كَأَرْوَاحِ الْآدَمِيِّيْنَ۔

(انجام آتھم صفحہ ۱۵۴ حاشیہ)

وَفَحَصْتُ كَلَامَ الْقَوْمِ وَتَصَفَّحْتُ فَمَا وَجَدْتُ لَفْظَ التَّوَفِّيْ فِيْ كَلَامٍ أَوْ شِعْرِ الشُّعَرَاءِ إِلَّا بِمَعْنَى الْإِمَاتَةِ مَعَ الْإِبْقَاءِ۔ وَمَا اسْتَعْمَلُوْا فِيْ غَيْرِهٖ إِلَّا بَعْدَ إِقَامَةِ الْقَرِيْنَةِ وَالْإِيْمَاءِ۔ وَمَا جَاءَ بِهٖ فِيْ صُوْرَةِ كَوْنِ اللّٰهِ فَاعِلًا إِلَّا بِهٰذَا الْمَعْنٰى۔ وَلِيَعْلَمَهٗ كُلُّ أَحَدٍ مِّنْ عُلَمَاءِ الْعَرَبِ مِنَ الْأَعْلٰى إِلَى الْأَدْنٰى۔ وَإِذَا كَتَبْتَ مَثَلًا إِلٰى أَحَدٍ مِّنْ أَهْلِ هٰذَا اللِّسَانِ إِنَّ اللّٰهَ تَوَفّٰى فُلَانًا مِّنَ الْأَحْبَابِ أَوِ الْجِيْرَانِ۔ فَلَا يَفْهَمُ مِنْهُ هٰذَا الْعَرَبِيُّ إِلَّا وَفَاتَ ذٰلِكَ

یہ نکتہ علوم حکمیہ قرآنیہ میں سے ہے۔ کیونکہ قرآن نے عرب قوم کو ان کی زبان کی طرف جو مبارک اور الہامی ہے توجہ دلائی ہے تا وہ جان لیں کہ ارواح باقی رہیں گی اور قیامت برحق ہے اور تا کہ وہ دہریوں اور نیچریوں کے عقاید سے بچ جائیں۔

(انجام آتھم صفحہ ۱۵۳-۱۵۴)

ترجمہ: چونکہ لفظ توفی میں اماتت مع الابقاء کا مفہوم ملحوظ ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ انسان کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے لفظ اماتت و اہلاک و افناء استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً یہ نہیں کہتے تَوَفَّى اللّٰهُ الْحِمَارَ أَوِ الْقُنْفُذَ وَالْأَفْعٰى وَالْفَارَ۔ کہ اللہ نے فلاں گدھے یا کچھوے یا اژدھا یا چوہے کی توفی کی کیونکہ ان جانوروں کی روحیں انسانی روحوں کی طرح باقی رہنے والی نہیں۔ (انجام آتھم حاشیہ صفحہ ۱۵۴)

میں نے اہل عرب کے کلام کی ورق گردانی کی اور اسے خوب اچھی طرح جانچا مجھے کسی ادیب کے کلام یا کسی شاعر کے شعر میں توفی کے لفظ کے معنے اماتۃ مع الابقاء کے سوا کچھ نہیں ملے۔ ان لوگوں نے لفظ توفی کا استعمال مذکورہ بالا معنوں کے سوا قرینہ اور اشارہ کے بغیر نہیں کیا اور اگر اللہ فاعل ہو تو اسکے معنے صرف مارنے ہی کے ہونے ہیں اسبات کو علماء عرب میں سے ہر شخص جانتا ہے خواہ وہ ادنی ہو یا اعلیٰ مثلاً اگر تو کسی اہل زبان کی طرف یہ لکھے کہ إِنَّ اللّٰهَ تَوَفّٰى فُلَانًا مِّنَ الْأَحْبَابِ وَالْجِيْرَانِ کہ فلاں شخص کو خدا نے وفات دیدی ہے تو وہ عرب سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھیگا کہ وہ شخص وفات پا گیا اور یہ ہرگز گمان نہیں کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سُلا دیا ہے

اَلْاِنْسَانِ۔ وَلَا یَزْعَمُ اَبَدًا اَنَّہٗ اَنَامَہٗ اَوْرَفَعَہٗ بِالْجِسْمِ مِنْ ذَالِکَ الْمَکَانِ۔ بَلْ یَسْتَرْجِعُ عَلٰی مَوْتِہٖ کَمَا ھُوَعَادَۃُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (انجام آتھم صـــ۱۵۶)

براہین احمدیہ کا وہ الہام یعنی یاعیسیٰ اِنّی متوفیک جو سترہ برس سے شائع ہو چکا ہے اس کے اس وقت خوب معنے کھلے یعنی یہ الہام حضرت عیسیٰ کو اس وقت بطور تسلی ہوا تھا جب یہود اُن کے مصلوب کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ اور اِس جگہ بجائے یہود ہنود کوشش کر رہے ہیں۔ اور الہام کے یہ معنے ہیں کہ میں تجھے ایسی ذلیل اور لعنتی موتوں سے بچاؤں گا۔ دیکھو اس واقعہ نے عیسیٰ کا نام اس عاجز پر کیسے چسپاں کر دیا ہے۔ (سراج منیر صـــ۲ حاشیہ)

اے عیسیٰ میں تجھے طبعی وفات دونگا اور اپنی طرف اٹھاؤں گا۔ اور تیرے تابعین کو اُن لوگوں پر غلبہ بخشوں گا جو مخالف ہوں گے...... یہ آیت حضرت مسیح پر اُس وقت نازل ہوئی تھی کہ جب اُن کی جان یہودیوں کے منصوبوں سے نہایت گھبراہٹ میں تھی اور یہودی اپنی خباثت سے اُن کے مصلوب کرنے کی فکر میں تھے تا مجرمانہ موت کا داغ ان پر لگ کر توریت کی ایک آیت کے موافق ان کو ملعون ٹھہرا دیں کیونکہ توریت میں لکھا تھا کہ جو لکڑی پر لٹکایا جائے وہ لعنتی ہے۔ چونکہ صلیب کو جرائم پیشہ سے قدیم طریق سزادہی کی وجہ سے ایک مناسبت پیدا ہو گئی تھی اور ہر ایک خونی اور نہایت درجہ کا بدکار صلیب کے ذریعہ سے سزا پاتا تھا اس لیے خدا کی تقدیر نے راستبازوں پر صلیب کو حرام کر دیا تھا تا پاک کو پلید سے مشابہت پیدا نہ ہو پس یہ عجیب بات ہے کہ کوئی نبی مصلوب نہیں ہوا تا اُن کی سچائی عوام کی نظر میں مشتبہ نہ ہو جائے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو ایسے اضطراب کے زمانہ میں تسلی دی تھی کہ جب یہودی ان کے مصلوب کرنے کی فکر میں تھے۔ اب جو یہ آیت براہین احمدیہ میں اس عاجز پر بطور الہام نازل ہوئی تو اس میں ایک باریک اشارہ یہ ہے کہ اس عاجز کو بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ لوگ قتل کرنے یا مصلوب کرانے کے منصوبے کریں گے تا یہ عاجز جرائم پیشہ کی سزا پا کر حق مشتبہ ہو جائے۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس عاجز کا نام عیسیٰ رکھ کر اور وفات دینے کا ذکر کر کے ایما فرماتا ہے کہ یہ منصوبے پیش نہیں جائیں گے اور میں ان کی شرارتوں سے محفوظ ہوں گا۔ (سراج منیر صـــ۳۷-۳۸)

اس بشارت کی حضرت عیسیٰ کے حق میں بھی ضرورت پڑی تھی کہ اُس وقت یہودیوں کی ہر روز کی دھمکیوں سے اُن کی جان خطرہ میں تھی۔ اور یہودی لوگ ایک ایسی موت کی ان کو دھمکی دیتے تھے جس موت کو ایک مجرمانہ موت سمجھ سکتے ہیں اور جس پر توریت کے رو سے بھی راستبازی کی شان کو دھبہ لگتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے ایسے پُرخطر وقت میں ایسی

یا اس جگہ سے زندہ مع جسم اٹھا لیا ہے بلکہ فوراً اس شخص کی موت پر آگاہ ہو کر مومنوں کی عادت کے مطابق اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے گا۔ (انجام آتھم صـــ۱۵۶)

پلید اور لعنتی موت سے ان کو بچا لیا۔ پس اس الہام میں جو اسی آیت کے ساتھ اس عاجز کو ہوا یہ ایک نہایت لطیف پیشگوئی ہے جو آج کے دن سے سترہ برس پہلے کی گئی اور یہ بآواز بلند بتلا رہی ہے کہ وہی واقعہ اس جگہ بھی پیش آئیگا۔ اور اس عاجز کو عیسٰی کے نام سے مخاطب کرکے یہ کہنا کہ اے عیسٰی میں تجھے وفات دونگا اور اپنی طرف اُٹھاؤنگا یہ درحقیقت اُس واقعہ کا نقشہ دکھلانا ہے جو حضرت عیسٰی کو پیش آیا تھا اور وہ واقعہ یہ تھا کہ یہود نے اس ارادہ سے اُن کو قتل کرنا چاہا تھا کہ اُن کا کاذب ہونا ثابت کریں۔ اور اُنہوں نے یہ پہلو ہاتھ میں لیا تھا کہ ہم صلیب کے ذریعہ سے اُس کو قتل کریں گے۔ اور مصلوب لعنتی ہوتا ہے۔ اور لعنت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بے ایمان اور خُدا سے برگشتہ اور دور اور مہجور ہو۔ اور اس طرح پر اُن کا کاذب ہونا ثابت ہو جائے گا۔ اور خُدا نے اُن کو تسلی دی کہ تو ایسی موت سے نہیں مرے گا جس سے یہ نتیجہ نکلے کہ تو لعنتی اور خدا سے دور اور مہجور ہے بلکہ میں تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا یعنی زیادہ سے زیادہ تیرا قُرب ثابت کرونگا اور یہود اپنے اس ارادہ میں نامراد رہیں گے۔ پس لفظ رفع کے مفہوم میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بھی ایک پیشگوئی مخفی تھی کیونکہ جس سچائی کے زیادہ ظاہر ہونے کا وعدہ تھا وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے وقوع میں آئی۔ اور خدا تعالیٰ نے اپنے ایک سچے نبی کو بغیر شہادت کے نہ چھوڑا۔ (سراج منیر صفحہ ۳۹-۴۱)

یہ وعدہ اس عاجز کو بھی دیا گیا کہ میں تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اُٹھاؤں گا۔ چنانچہ اُسی آیت کو بطور الہام اس عاجز کے حق میں بھی نازل فرمایا ہے جس سے ہمارے علماء رفع عنصری مُراد لیتے ہیں۔ اور میں دلائل سے ثابت کرچکا ہوں کہ یہ آیت میرے حق میں بھی الہام ہوئی ہے۔ تو اب کیا میری نسبت بھی یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ میں مع جسم عنصری آسمان کی طرف اُٹھایا جاؤں گا۔ اگر کہو کہ تمہارا الہام ثابت نہیں تو یہ عُذر فضول ہو گا کیونکہ جس لطیف پیشگوئی پر یہ الہام مشتمل ہے وہ ظہور میں آگئی ہے پس اسی دلیل سے الہام کا سچا ہونا ثابت ہو گیا۔ (سراج منیر صفحہ ۴۱ حاشیہ)

منجملہ قرآن کی ضرورتوں کے ایک یہ امر بھی تھا کہ جو اختلاف حضرت مسیح کی نسبت یہود اور نصاریٰ میں واقع تھا اُس کو دور کرے۔ سو قرآن شریف نے ان سب جھگڑوں کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ قرآن شریف کی یہ آیت یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ الخ اسی جھگڑے کے فیصلہ کے لیے ہے۔ کیونکہ یہودی لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ نصاریٰ کا نبی یعنی مسیح صلیب پر کھینچا گیا۔ اس لیے موافق حکم توریت کے وہ لعنتی ہوا اور اُس کا رفع نہیں ہوا۔ اور یہ دلیل اُس کے کاذب ہونے کی ہے۔ اور عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ لعنتی تو ہوا مگر ہمارے لیے۔ اور بعد اس کے لعنت جاتی رہی اور رفع ہو گیا۔ اور خُدا نے اپنے دہنے ہاتھ اُس کو بٹھا لیا۔ اب اس آیت نے یہ فیصلہ کیا کہ رفع بلا توقف ہوا نہ یہودیوں کے زعم پر دائمی لعنت ہوئی جو ہمیشہ کے لیے رفع الی اللہ سے مانع ہے۔ اور نہ نصاریٰ کے زُعم پر چند روز لعنت رہی اور پھر رفع الی اللہ ہوا بلکہ وفات کیساتھ ہی رفع الی اللہ ہو گیا۔ اور ان ہی آیات میں خُدا تعالیٰ نے یہ بھی سمجھا دیا کہ یہ رفع توریت کے احکام کے مخالف نہیں۔ کیونکہ توریت کا حکم عدم رفع اور لعنت اُس حالت میں ہے کہ جب کوئی صلیب

پر مارا جائے۔ مگر صرف صلیب کے چھونے یا صلیب پر کچھ ایسی تکلیف اٹھانے سے جو موت کی حد تک نہیں پہنچی لعنت لازم نہیں آتی اور نہ عدمِ رفع لازم آتا ہے۔ کیونکہ توریت کا منشاء یہ ہے کہ صلیب خدا تعالیٰ کی طرف سے جرائم پیشہ کی موت کا ذریعہ ہے پس جو شخص صلیب پر مر گیا وہ مجرمانہ موت مرا جو لعنتی موت ہے لیکن مسیح صلیب پر نہیں مرا اور اُس کو خدا نے صلیب کی موت سے بچا لیا بلکہ جیسا کہ اُس نے کہا تھا کہ میری حالت یونس سے مشابہ ہے ایسا ہی ہوا نہ یونس مچھلی کے پیٹ میں مرا نہ یسوع صلیب کے پیٹ پر۔ اور اُس کی دُعا "ایلی ایلی لما سبقتانی" سُنی گئی۔ اگر مرتا تو پیلاطوس پر بھی ضرور وبال آتا۔ کیونکہ فرشتہ نے پیلاطوس کی جورو کو یہ خبر دی تھی کہ اگر یسوع مر گیا تو یاد رکھ کہ تم پر وبال آئے گا۔ مگر پیلاطوس پر کوئی وبال نہ آیا۔ اور یہ بھی یسوع کے زندہ رہنے کی ایک نشانی ہے کہ اُس کی ہڈیاں صلیب کے وقت نہیں توڑی گئیں۔ اور صلیب پر سے اتارنے کے بعد چھیدنے سے خون بھی نکلا۔ اور اُس نے حواریوں کو صلیب کے بعد اپنے زخم دکھلائے۔ اور ظاہر ہے کہ نئی زندگی کے ساتھ زخموں کا ہونا ممکن نہ تھا پس اس سے ثابت ہوا کہ یسوع صلیب پر نہیں مرا اس لیے لعنتی بھی نہیں ہوا۔ اور بلاشبہ اُس نے پاک وفات پائی اور خدا کے تمام پاک رسولوں کی طرح موت کے بعد وہ بھی خدا کی طرف اُٹھایا گیا۔ اور بموجب وعدہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ اُس کا خدا کی طرف رفع ہوا۔ اگر وہ صلیب پر مرتا تو اپنے قول سے خود جھوٹا ٹھہرتا کیونکہ اس صورت میں یونس کے ساتھ اس کی کچھ بھی مشابہت نہ ہوتی۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲۷-۲۸)

شیخ محی الدین ابن العربی کا بھی یہی مذہب ہے۔ ..... یعنی عیسیٰ کے رفع کے یہ معنے ہیں کہ جب عالم سفلی سے اُس کی روح جُدا ہوئی تو عالم بالا سے اس کا اتصال ہو گیا۔ پھر اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۷۸ میں لکھتے ہیں کہ رفع کے یہ معنے ہیں کہ عیسیٰ کی روح اُس کے قبض کرنے کے بعد روحوں کے آسمان میں پہنچائی گئی۔ فتدبّر۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۰ حاشیہ)

افسوس کہ ہمارے کج فہم علماء پر کہاں تک غباوت اور بلادت وارد ہو گئی ہے کہ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ قرآن نے اگر اس آیت میں کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ رفع جسمانی کا ذکر کیا ہے تو اس ذکر کا کیا موقعہ تھا اور کونسا جھگڑا اس بارے میں یہود اور نصاریٰ کا تھا۔ تمام جھگڑا تو یہی تھا کہ صلیب کی وجہ سے یہود کو بہانہ ہاتھ آگیا تھا کہ نعوذ باللہ یہ شخص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ملعون ہے یعنی اُس کا خدا کی طرف رفع نہیں ہوا اور جب رفع نہ ہوا تو لعنتی ہونا لازم آیا کیونکہ رفع الی اللہ کی ضد لعنت ہے۔ اور یہ ایک ایسا انکار تھا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے نبوت کے دعوے میں جھوٹے ٹھہرتے تھے کیونکہ توریت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو شخص مصلوب ہو اُس کا رفع الی اللہ نہیں ہوتا یعنی مرنے کے بعد راستبازوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف اُس کی روح اٹھائی نہیں جاتی یعنی ایسا شخص ہرگز نجات نہیں پاتا۔ پس خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے سچے نبی کے دامن کو اس تہمت سے پاک کرے اس لیے اُس نے قرآن میں یہ ذکر کیا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ[1] اور یہ فرمایا یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تا معلوم ہو کہ یہودی جھوٹے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا

[1] النساء آیت ۱۵۸

اور سچے نبیوں کی طرح رفع الی اللہ ہو گیا اور یہی وجہ ہے جو اس آیت میں یہ لفظ نہیں فرمائے گئے کہ رَافِعُكَ اِلَى السَّمَاءِ بلکہ یہ فرمایا گیا کہ رَافِعُكَ اِلَیَّ تا صریح طور پر ہر ایک کو معلوم ہو کہ یہ رفع روحانی ہے نہ جسمانی کیونکہ خدا کی جناب جس کی طرف راستبازوں کا رفع ہوتا ہے روحانی ہے نہ جسمانی۔ اور خدا کی طرف روح چڑھتے ہیں نہ کہ جسم۔ اور خدا تعالیٰ نے جو اس آیت میں توفّی کو پہلے رکھا اور رفع کو بعد تو اسی واسطے یہ ترتیب اختیار کی کہ تا ہر ایک کو معلوم ہو کہ یہ وہ رفع ہے کہ جو راستبازوں کے لیے موت کے بعد ہوا کرتا ہے ہمیں نہیں چاہیئے کہ یہودیوں کی طرح تحریف کر کے یہ کہیں کہ دراصل توفّی کا لفظ بعد میں ہے اور رفع کا لفظ پہلے کیونکہ بغیر کسی محکم اور قطعی دلیل کے محض ظنون اور اوہام کی بنا پر قرآن کو اُلٹ پُلٹ دینا اُن لوگوں کا کام ہے جن کی روحیں یہودیوں کی روحوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ پھر جس حالت میں آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ میں صاف طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ عیسائیوں کا تمام بگاڑ اور گمراہی حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد ہوئی ہے تو اب سوچنا چاہیئے کہ حضرت عیسیٰ کو اب تک زندہ ماننے میں یہ اقرار بھی کرنا پڑتا ہے کہ اب تک عیسائی بھی گمراہ نہیں ہوئے۔ اور یہ ایک ایسا خیال ہے جس سے ایمان جانے کا نہایت خطرہ ہے۔

(کتاب البریہ ص۵-۶)

اس آیت میں یہود کے اس قول کا رد ہے کہ وہ کہتے تھے کہ عیسیٰ مصلوب ہو گیا اس لیے ملعون ہے اور خدا کی طرف اُس کا رفع نہیں ہوا اور عیسائی کہتے تھے کہ تین دن لعنتی رہ کر پھر رفع ہوا اور اس آیت نے یہ فیصلہ کیا کہ بعد وفات بلا توقف خدا تعالیٰ کی طرف عیسیٰ کا رفع روحانی ہوا اور خدا تعالیٰ نے اس جگہ رَافِعُكَ اِلَى السَّمَاءِ نہیں کہا بلکہ رَافِعُكَ اِلَیَّ فرمایا تا رفع جسمانی کا شبہ نہ گذرے۔ کیونکہ جو خدا کی طرف جاتا ہے وہ روح سے جاتا ہے نہ جسم سے اِرْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ[1] اس کی نظیر ہے۔ غرض اس طرح پر یہ جھگڑا فیصلہ پایا مگر ہمارے نادان مخالف جو رفع جسمانی کے قائل ہیں وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسمانی رفع امر متنازع فیہ نہ تھا۔ اور اگر اس بے تعلق امر کو بفرض محال قبول کر لیں تو پھر یہ سوال ہو گا کہ جو روحانی رفع کے متعلق یہود اور نصاریٰ میں جھگڑا تھا اس کا فیصلہ قرآن کی کن آیات میں بیان فرمایا گیا ہے آخر لوٹ کر اسی طرف آنا پڑے گا کہ وہ آیات یہی ہیں۔ (تبلیغ رسالت جلد ششم ص۱۴۷-۱۴۸)

اے عیسیٰ میں تجھے وفات دوں گا اور وفات کے بعد تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا اور تجھے اُن الزاموں سے پاک کروں گا جو تیرے پر اُن لوگوں نے لگائے جنہوں نے تیری راستبازی کو قبول نہ کیا۔ اب ظاہر ہے کہ اس جگہ رفع جسمانی کی کوئی بحث نہ تھی۔ اور یہودیوں کے عقیدہ میں یہ ہرگز داخل نہیں کہ جس کا رفع جسمانی نہ ہو وہ نبی یا مومن نہیں ہوتا۔ پس اِس بیہودہ قصّے کے چھیڑنے کی کیا حاجت تھی۔ خدا تعالیٰ کا کلام لغو سے پاک ہے۔ وہ تو اُن مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے جن کا فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ یہود نالائق نعوذ باللہ حضرت مسیح کو کافر اور کاذب اور مفتری ٹھہراتے تھے اور

---

[1] الفجر آیت ۲۹

کہتے تھے کہ موسیٰ اور تمام راستبازوں کی طرح اُن کو روحانی رفع نصیب نہیں ہوا اور کسی حد تک نصاریٰ بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے تھے سو خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ دونوں فریق جھوٹے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام بے شک مرنے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف اٹھائے گئے ہیں جیسا کہ اور راستباز اٹھائے گئے۔ یہ بعینہٖ ایسا ہی فیصلہ ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ عیسیٰ اور اس کی ماں مسّ شیطان سے پاک ہیں۔ جاہل مولویوں نے اس کے یہ معنے کر لیے کہ بجز حضرت عیسیٰ اور اُن کی ماں کے اور کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسّ شیطان سے پاک نہیں یعنی معصوم نہیں۔ اور آیت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ[1] کو بھول گئے اور نیز آیت سَلَامٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ[2] کو پس پشت ڈال دیا اور بات صرف اتنی تھی کہ اس حدیث میں بھی یہودیوں کا ذب اور دفع اعتراض منظور تھا۔ چونکہ وہ لوگ طرح طرح کے ناگفتنی بہتان حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ پر لگاتے تھے اس لیے خدا کے پاک رسول نے گواہی دی کہ یہودیوں میں سے مسّ شیطان سے کوئی پاک نہ تھا۔ اگر پاک تھے تو صرف حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ تھی نعوذ باللہ اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک حضرت عیسیٰ اور اُن کی والدہ ہی معصوم ہیں اور ان کے سوا کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسّ شیطان سے معصوم نہیں ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۱۶ و ۱۱۷)

مخالفین کی حالت پر رونا آتا ہے وہ نہیں سوچتے کہ اگر اس آیت انی متوفیک ورافعک الیّ سے ایک پاک موت کا بیان کرنا غرض نہیں تھا اور بجائے ملعون ہونے کے روحانی رفع کا بیان کرنا مقصود نہیں تھا تو اس قصے کو بیان کرنے کی کونسی ضرورت تھی اور جسمانی رفع کے لیے کونسی دینی ضرورت پیش آئی تھی افسوس صاف اور سیدھی بات کو ناحق بگاڑتے ہیں بات تو صرف اتنی تھی کہ یہودی حضرت عیسیٰ کو ملعون ٹھہرا کر اُن کے رفع روحانی سے منکر ہو گئے تھے اب رافعک الیّ سے اس بات کا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حضرت عیسیٰ ملعون نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف اُن کا رفع ہو گیا اور توفّی کے لفظ سے جس کے معنے صحیح بخاری میں مارنا کیا گیا حضرت عیسیٰ کی موت ثابت ہو گئی۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۱۶ حاشیہ)

بخاری میں عبد اللہ بن عباس کے قول سے ثابت ہو چکا ہے کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دوں گا۔ چنانچہ امام بخاری نے اسی مقام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث لکھ کر جس میں کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ ہے اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہی معنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے ہیں۔ پھر بعد اس کے جو حضرت عیسیٰ کی وفات کے بارے میں قرآن نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور عبد اللہ بن عباس کے قول میں بھی یہی آیا دوسرے معنے کرنے یہودیوں کی طرح ایک خیانت ہے۔ غور کر کے دیکھو کہ تمام قرآن میں بجز روح قبض کرنے کے توفی کے اور کوئی معنے نہیں۔ تمام حدیثوں میں بجز مارنے کے اور کسی محل میں توفی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ تمام لغت کی کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ جب خدا تعالیٰ فاعل ہو اور کوئی انسان مفعول بہٖ

---

[1] الحجر آیت ۴۳ ؛ [2] مریم آیت ۱۶ ؛

مثلاً یہ قول ہو کہ تَوَفَّی اللّٰہُ زَیْدًا تو بجز روح قبض کرنے اور مارنے کے اور کوئی معنے نہیں لیے جاویں گے پس جب اس صراحت اور تحقیق سے فیصلہ ہو چکا کہ توفی کے معنے مارنا ہے اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[1] سے ثابت ہو چکا کہ حضرت عیسٰی کی توفی عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے ہو چکی ہے یعنی وہ خدا بنائے جانے سے پہلے فوت ہو چکے ہیں تو پھر اب تک ان کی وفات کو قبول نہ کرنا یہ طریق بحث نہیں بلکہ بے حیائی کی قسم ہے۔ خدا تعالیٰ نے چونکہ ان لوگوں کو ذلیل کرنا تھا کہ جو خواہ مخواہ حضرت عیسٰی کی حیات کے قائل ہیں اس لیے اس نے نہ ایک پہلو سے بلکہ بہت سے پہلوؤں سے حضرت عیسٰی کی موت کو ثابت کیا توفّی کے لفظ سے موت ثابت ہوئی اور پھر آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[2] سے موت ثابت ہوئی اور پھر آیت مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[4] سے موت ثابت ہوئی۔ پھر قرآن شریف کی آیت فِیْهَا تَحْیَوْنَ[5] سے موت ثابت ہوئی۔ اور پھر قرآن شریف کی آیت وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ[3] سے موت ثابت ہوئی کیونکہ ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ آسمان پر جسمانی زندگی اور قرار گاہ کسی انسان کا نہیں ہو سکتا۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۳۸-۱۳۹)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کا وہ فضل اور کرم یاد کر جو اس نے عیسٰی علیہ السلام پر کیا اور عیسٰی علیہ السلام کو یہ بشارت دی کہ اے عیسٰی میں تجھے موت سے وفات دوں گا یعنی تو مصلوب نہیں ہوگا اور تجھے وفات کے بعد اپنی طرف اٹھاؤں گا یعنی تیرے برگزیدہ اور صادق ہونے کے بارے میں آثار قویہ اور جلیہ ظاہر کروں گا اور اس قدر دنیا میں تیرا ذکر خیر باقی رہ جائے گا کہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ تو خدا کا مقرب ہے اور اس کے حضرت قدس میں بلایا گیا ہے اور جو الزام تیرے پر لگائے جاتے ہیں ان سب سے تیرا پاک دامن ہونا ثابت کر دوں گا اور تیرے تابعین کو جو تیری صحیح صحیح تعلیم کی پیروی کریں گے حجت اور برہان کے رو سے قیامت تک دوسروں پر غلبہ دونگا کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور نیز تیرے مخالفوں اور گالیاں دینے والوں پر ذلت ڈالوں گا وہ ہمیشہ ذلت سے عمر بسر کریں گے۔ درحقیقت خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے پردے میں ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے کر ایک بشارت دی ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو تیرے مارنے کے درپے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ نور دنیا میں نہ پھیلے یہ تمام نامراد رہیں گے اور عیسٰی مسیح کی طرح پر تنگی کے وقت میں خدا تیری نصرت کرے گا اور دشمنوں کے شر سے تجھے بچائے گا اور تیرے پر بہت الزام لگائے جائیں گے لیکن خدا تعالیٰ تمام الزاموں سے تجھے پاک کرے گا اور قیامت تک تیرے گروہ کو غلبہ بخشے گا اور یہ فقرہ جو آیت موصوفہ بالا میں ہے کہ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح جب مسیح علیہ السلام پر یہودیوں اور عیسائیوں نے بہت سے الزام لگائے تو حضرت مسیح کو وعدہ دیا گیا کہ خدا تعالیٰ تیرے بعد ایک نبی پیدا کریگا جو ان تمام الزامات سے تیرے دامن کا پاک ہونا ثابت کر دیگا ایسا ہی تیری نسبت خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ آخری زمانہ میں جبکہ دشمنوں کی نکتہ چینی اور عیب گیری کمال کو پہنچ جائے گی تیری تصدیق کے لیے تیری ہی اُمت میں سے ایک شخص جو مسیح موعود ہے پیدا کیا جائے گا وہ تیرے دامن کو ہر ایک الزام سے پاک ثابت کر دیگا اور تیرے معجزات تازہ

---

[1] المائدۃ آیت ۱۱۸ ٭ [2] آل عمران آیت ۱۴۵ ٭ [3] البقرۃ آیت ۳۷ ٭ [4] المائدۃ آیت ۷۶ ٭ [5] الاعراف آیت ۲۶ ٭

کریگا اور اس پیشگوئی میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل نہیں ہوں گے اور آپ کا نفع الی السما اپنی نبوت کے رو سے آفتاب کی طرح چمکیگا کیونکہ ہزارہا اولیاء اس امت میں پیدا ہوں گے۔ اور اس پیشگوئی میں صاف لفظوں میں تبلایا گیا ہے کہ حضرت مسیح اس زمانہ سے پہلے وفات پا جائیں گے جبکہ وہ رسول مقبول ظاہر ہوگا جو مخالفوں کے اعتراضات سے ان کے دامن کو پاک کریگا کیونکہ اس آیت کریمہ میں لف نشر مرتب ہے پہلے وفات کا وعدہ ہے پھر رفع کا پھر تطہیر کا اور پھر یہ کہ خدا تعالیٰ ان کے متبعین کو ہر ایک پہلو سے غلبہ بخش کر مخالفوں کو قیامت تک ذلیل کرتا رہے گا اگر اس ترتیب کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ ترتیب جو واقعات خارجیہ نے ثابت کر دی ہے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور کسی کا اختیار نہیں ہے کہ قرآنی ترتیب کو بغیر کسی قوی دستاویز کے اٹھا دے کیونکہ ایسا کرنا گویا یہودیوں کے قدم پر قدم رکھنا ہے یہ تو سچ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ حرف واؤ کے ساتھ ہمیشہ ترتیب کا لحاظ واجب ہو۔ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ خدا تعالیٰ اس آیت میں فقرہ متوفیک کو پہلے لایا ہے اور پھر فقرہ رافعک کو بعد اس کے اور پھر اس کے بعد فقرہ مطہرک بیان کیا گیا ہے اور بہر حال ان الفاظ میں ایک ترتیب ہے جس کو خدائے علیم و حکیم نے اپنی ابلغ و افصح کلام میں اختیار کیا ہے اور ہمارا اختیار نہیں ہے کہ ہم بلا وجہ اس ترتیب کو اٹھا دیں۔ اور اگر قرآن شریف کے اور مقامات یعنی بعض اور آیات میں مفسرین نے ترتیب موجودہ قرآن شریف کے برخلاف بیان کیا ہے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ انہوں نے خود ایسا کیا ہے یا وہ ایسا کرنے کے مجاز تھے بلکہ بعض نصوص حدیثیہ نے اسی طرح ان کی شرح کی تھی یا قرآن شریف کے دوسرے مواضع کے قرائن واضحہ نے اس بات کے ماننے کے لیے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ ظاہری ترتیب نظر انداز کی جائے لیکن پھر بھی خدا تعالیٰ کا ابلغ اور افصح کلام ترتیب سے خالی نہیں ہوتا اگر اتفاقاً کسی عبارت میں ظاہری ترتیب نہ ہو تو بلحاظ معنے ضرور کوئی ترتیب مخفی ہوتی ہے مگر بہر حال ظاہری ترتیب مقدم ہوتی ہے اور بغیر وجود کسی نہایت قوی قرینہ کے اس ظاہری ترتیب کو چھوڑ دینا سراسر الحاد اور خیانت اور تحریف ہوتی ہے۔ یہی تو وہ خصلت تھی جس کے اختیار کرنے سے یہودی خدا کی نظر میں لعنتی ٹھہرے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ حاشیہ)

یہ زمانہ جس میں ہم ہیں یہ وہی زمانہ ہے جس میں دشمنوں کی طرف سے ہر ایک قسم کی بدزبانی کمال کو پہنچ گئی ہے اور بدگوئی اور عیب گیری اور افترا پردازی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور ساتھ اس کے مسلمانوں کی اندرونی حالت بھی نہایت خطرناک ہو گئی ہے صدہا بدعات اور انواع اقسام کے شرک اور الحاد اور انکار ظہور میں آ رہے ہیں اس لیے قطعی یقینی طور پر اب یہ وہی زمانہ ہے جس میں پیشگوئی مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ کے مطابق عظیم الشان مصلح پیدا ہو سو الحمد للہ کہ وہ میں ہوں۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۴۲ حاشیہ کا حاشیہ)

اور اگر یہ کہو کہ ترتیب کو تو ہم مانتے ہیں مگر توفی کے معنے موت نہیں مانتے تو اس کے ہماری طرف سے دو جواب ہیں (۱) اول یہ کہ خود صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے یہ معنے مروی ہیں کہ متوفیک ممیتک یعنی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں

کہ متوفیک کے یہ معنے ہیں کہ میں تجھے وفات دوں گا۔ علاوہ اس کے جو شخص تمام احادیث اور قرآن شریف کا تتبع کریگا اور تمام لغت کی کتابوں اور ادب کی کتابوں کو غور سے دیکھے گا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہے گی کہ یہ قدیم محاورہ لسان عرب ہے کہ جب خدا تعالیٰ فاعل ہوتا ہے اور انسان مفعول بہ ہوتا ہے تو ایسے موقع پر لفظ توفی کے معنے بجز وفات کے اور کچھ نہیں ہوتے اور اگر کوئی شخص اس سے انکار کرے تو اس پر واجب ہے کہ ہمیں حدیث یا قرآن یا فن ادب کی کسی کتاب سے یہ دکھلا دے کہ ایسی صورت میں کوئی اور معنے بھی توفی کے آجاتے ہیں اور اگر ایسا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مقدسہ سے پیش کر سکے تو ہم بلا توقف اس کو پانسو روپے انعام دینے کو طیار ہیں۔ دیکھو حق کے اظہار کے لیئے ہم کس قدر مال خرچ کرنا چاہتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتا؟ اگر سچائی پر ہوتے تو اس سوال کا ضرور جواب دیتے اور نقد روپیہ پاتے۔ غرض جب فیصلہ ہو گیا کہ توفی کے معنے موت ہیں یہی معنے حضرت ابن عباس کی حدیث سے معلوم ہوئے۔ اور ابن عباس کا قول جو صحیح بخاری میں مندرج ہے وہ قول ہے جس کو عینی شارح بخاری نے اپنی شرح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کیا ہے اور یہی معنے محاورات قرآن اور محاورات احادیث میں سے اور نیز کلام بلغاء عرب کے تتبع سے ثابت ہوئے اور اس کے سوا کچھ ثابت نہ ہوا تو پھر ماننا پڑا کہ یہ وعدہ جو اس آیت شریفہ میں مندرج ہے یہ حضرت مسیح کی موت طبعی کا وعدہ ہے اور اس میں حضرت مسیح کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ یہودی کہ جو اس فکر میں تھے کہ آنجناب کو بذریعہ صلیب قتل کر دیں وہ قتل نہیں کر سکیں گے اور اس خوف سے اللہ تعالیٰ نے مسیح کو تسلی بخشی اور ایک طبعی عمر جو انسان کے لیئے قانون قدرت میں داخل ہے اس کا وعدہ دیا اور یہ فرمایا کہ تو اپنی طبعی موت سے فوت ہوگا اب اس فیصلہ کے بعد دوسرا تنقیح طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ وعدہ پورا ہو چکا یا ابھی حضرت مسیح زندہ ہیں سو یہ تنقیح بھی نہایت صفائی سے فیصلہ پا چکی ہے اور فیصلہ یہ ہے کہ اس آیت شریفہ کی ترتیب صاف طور پر دلالت کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں کیونکہ اگر وہ اب تک فوت نہیں ہوئے تو پھر اس سے لازم آتا ہے کہ رفع بھی نہیں ہوا اور نہ اب تک ان کی تطہیر ہوئی۔ اور نہ اب تک ان کے دشمنوں کی ذلت ہوئی اور ظاہر ہے کہ ایسا خیال بدیہی البطلان ہے۔

(تریاق القلوب ص۱۲۵ تا ۱۲۶ حاشیہ)

آیت یا عیسیٰ انی متوفیک میں فقرہ متوفیک کو اس جگہ سے جہاں خدا تعالیٰ نے اس کو رکھا ہے اٹھا لیا جائے تو پھر اس فقرہ کے رکھنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملتی کیونکہ اس کو فقرہ رَافِعُكَ اِلَیَّ کے بعد نہیں رکھ سکتے وجہ یہ کہ بموجب عقیدہ معتقدین رفع جسمانی کے رفع کے بعد بلا فاصلہ موت نہیں ہے بلکہ ضرور ہے کہ آسمان مسیح کو تھامے رہے جب تک کہ خاتم الانبیاء کے ظہور کے ساتھ وعدہ تطہیر پورا نہ ہو جائے۔ ایسا ہی فقرہ مطہرک کے بعد بھی نہیں رکھ سکتے کیونکہ بموجب اہل خیال اس عقیدہ کے تطہیر کے بعد بھی بلا فاصلہ موت نہیں ہے بلکہ دائمی غلبہ کے بعد موت ہو گی اب رہا غلبہ یعنی وعدہ فقرہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

سو اس فقرہ کا دامن قیامت تک پھیلا ہوا ہے اس لیے اس جگہ بھی فقرہ متوفیک کو رکھ نہیں سکتے جب تک قیامت کا دن نہ آجائے اور قیامت کا دن تو حشر کا دن ہوگا نہ کہ موت کا دن۔ لہذا معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حصہ میں موت نہیں اور وہ بغیر مرنے کے ہی قیامت کے میدان میں پہنچ جائیں گے اور یہ خیال وعدہ توفی کے برخلاف ہے لہذا فقرہ متوفیک کو اپنی جگہ سے اٹھانا موجب اجتماع نقیضین ہے اور وہ محال۔ اس لیے اس فقرہ کی تاخیر بھی محال ہے اور سوا اس کے کوئی نہیں بتلا سکتا کہ اس فقرہ کو اس جگہ سے اٹھا کر کہاں رکھا جائے اور اگر کہے کہ رافعک کے بعد رکھا جائے تو ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ اس جگہ تو ہم کسی طرح نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ رفع کے بعد بلافاصلہ اور بغیر ظہور دوسرے واقعات مندرجہ آیت ہذا موت پیش آجائے گی اور یہی خرابی دوسری جگہوں میں ہے جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اور اگر بلاوجہ قرآنی ترتیب کو اٹھا دینا اور اپنی تصرف کے مناسب حال معنے کر لینا جائز ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایسے تغیر تبدیل کے ساتھ نماز بھی درست ہو یعنی نماز میں اس طرح پڑھنا جائز ہو یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ ثُمَّ مُتَوَفِّیْکَ حالانکہ ایسا تصرف مفسد نماز اور داخل تحریف قرآن ہے۔ (تریاق القلوب ص۱۴۲ حاشیہ در حاشیہ)

وَالْمَرْفُوْعُ مَنْ یُّسْقٰی کَاْسَ الْوِصَالِ ۝ مِنْ اَیْدِی الْمَحْبُوْبِ الَّذِیْ هُوَ لُجَّةُ الْجَمَالِ ۝ وَیُدْخَلُ تَحْتَ رِدَاءِ الرُّبُوْبِیَّةِ ۝ مَعَ الْعُبُوْدِیَّةِ الْاَبَدِیَّةِ ۝ وَهٰذَا اٰخِرُ مَقَامٍ یَبْلُغُهٗ طَالِبُ الْحَقِّ فِی النَّشْاَةِ الْاِنْسَانِیَّةِ ۝ (خطبہ الہامیہ ص۱۱)

قرآن شریف میں حضرت مسیح کے بارے میں صاف لفظوں میں یہ پیشگوئی موجود تھی کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور وفات کے بعد اپنی طرف اٹھانے والا لیکن ہمارے مخالفوں نے اس نص کے ظاہر الفاظ پر عمل نہیں کیا اور نہایت مکروہ اور پرتکلف تاویل سے کام لیا یعنی رافعک کے فقرہ کو متوفیک کے فقرہ پر مقدم کیا اور ایک صریح تحریف کو اختیار کر لیا اور بالبعض نے توفی کے لفظ کے معنے پھیر لیا کیا جو نہ قرآن سے نہ حدیث سے نہ علم لغت سے ثابت ہوتا ہے اور جسم کے ساتھ اٹھائے جانا اپنی طرف سے ملا لیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متوفیک کے معنے صریح ممیتک بخاری میں موجود ہیں اُن سے منہ پھیر لیا اور علم نحو میں صریح یہ قاعدہ مانا گیا ہے کہ توفی کے لفظ میں جہاں خدا فاعل اور انسان مفعول بہ ہو ہمیشہ اس جگہ توفی کے معنے مارنے اور روح قبض کرنے کے آتے ہیں مگر ان لوگوں نے اس قاعدہ کی کچھ بھی پرواہ نہیں رکھی اور خدا کی تمام کتابوں میں کسی جگہ رفع الی اللہ کے معنے یہ نہیں کیے گئے کہ کوئی جسم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف اٹھایا جائے۔ لیکن ان لوگوں

(ترجمہ) مرفوع وہ ہے جس کو اس محبوب کے ہاتھ سے جام وصال پلایا جاتا ہے جو حسن و جمال کا دریا ہے اور ربوبیت کی چادر کے نیچے داخل کیا جاتا ہے باوجود اس بات کے کہ عبودیت ابدی طور پر رہتی ہے اور یہ وہ آخری مقام ہے جس تک ایک حق کا طالب انسانی پیدائش میں پہنچ سکتا ہے۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۱)

نے زبردستی سے بغیر وجود کسی نظیر کے رفع الی اللہ کو اس جگہ یہ معنے کیے کہ جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ایسا ہی توفی کے الٹے معنے کرنے کے وقت کوئی نظیر پیش نہ کی اور پھر اپنا معنے لے لیے۔ اب بتلاؤ کہ کس نے نصوص کے ظاہر پر عمل کرنا چھوڑ دیا؟

(تحفہ گولڑویہ ص ۴۵)

کوئی فولادی قلعہ بھی ایسا پختہ نہیں ہو سکتا جیسا کہ قرآن شریف میں حضرت مسیح کی موت کی آیت ہے پھر آسمان سے زندہ مع جسم اترنے کی پیشگوئی کس قدر موت کی پیشگوئی کی نقیض ہے ذرہ سوچ لو اور قرآن نے توفی اور رفع کے لفظ کو کئی جگہ ایک ہی معنوں موت اور رفع روحانی کے محل پر مکرر کر کے صاف سمجھا دیا ہے کہ توفی کے معنے مارنا اور رفع الی اللہ کے معنے روح کو خدا کی طرف اٹھانا ہے اور پھر توفی کے لفظ کے معنے حدیثوں کے رو سے بھی خوب صاف ہو گئے ہیں کیونکہ بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ مُتَوَفِّیکَ مُمِیْتُکَ یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لفظ مُتَوَفِّیکَ کے یہی معنے کیے ہیں کہ میں تجھے مارنے والا ہوں اور اس بات پر صحابہ کا اجماع بھی ہو چکا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے اور گذشتہ روحوں میں جا ملے۔ (تحفہ گولڑویہ ص ۴۶)

فقرہ رافعک الیّ اور بل رفعہ اللہ الیہ کے یہ معنے کیوں کیے جاتے ہیں کہ حضرت مسیح آسمان کی طرف اٹھائے گئے ان لفظوں کے تو یہ معنے نہیں ہاں اگر کسی حدیث نے یہ تشریح کی ہے تو وہ حدیث تو پیش کرنی چاہیئے ورنہ یہودیوں کی طرح ایک تحریف ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص ۴ حاشیہ)

یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے وفات دوں گا۔ اور اپنی طرف اٹھاؤں گا۔ اور تیری بریّت ظاہر کروں گا اور وہ جو تیرے پیرو ہیں قیامت تک ان کو تیرے منکروں پر غالب رکھوں گا اس جگہ اس وحی الٰہی میں عیسیٰ سے مراد میں ہوں اور تابعین یعنی پیرووں سے مراد میری جماعت ہے۔ قرآن شریف میں یہ پیشگوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہے اور مغلوب قوم سے مراد یہودی ہیں جو دن بدن کم ہوتے گئے پس اس آیت کو دوبارہ میرے لیے اور میری جماعت کے لیے نازل کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقدر یوں ہے کہ وہ لوگ جو اس جماعت سے باہر ہیں وہ دن بدن کم ہوتے جائیں گے اور تمام فرقے مسلمانوں کے جو اس سلسلہ سے باہر ہیں وہ دن بدن کم ہو کر اس سلسلہ میں داخل ہوتے جائیں گے یا نابود ہوتے جائیں گے جیسا کہ یہودی گھٹتے گھٹتے یہاں تک کم ہو گئے کہ بہت ہی تھوڑے رہ گئے ایسا ہی اس جماعت کے مخالفوں کا انجام ہوگا اور اس جماعت کے لوگ اپنی تعداد اور قوت مذہب کے رو سے سب پر غالب ہو جائیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۳۲، ۱۴۲)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ فَقَدَّمَ التَّوَفِّیْ عَلَی الرَّفْعِ کَمَا اَنْتُمْ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ فرمایا ہے اور لفظ توفی کو رفع پر مقدم کیا ہے جیسا کہ تم

تَحْكُمُوْنَ فَهُوَ حُكْمُ اللّٰهِ ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ[1]۔ وَلَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يُّحَرِّفَ كَلَامَ اللّٰهِ عَنْ مَّوَاضِعِهَا كَمَا لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَرِّفِيْنَ كَمَا اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۵۳ حاشیہ)

اور توفّی بجز موت دیگر کچھ نہیں جیسا کہ صاحب کشاف نے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ میں لکھا ہے اِنِّیْ مُمِیْتُکَ حَتْفَ اَنْفِکَ ترتیب قرآنی کی یہ آیت یعنی یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تمام جھگڑے کو فیصلہ کرتی ہے کیونکہ ہمارے مخالف یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا رفع زندگی کی حالت میں تھا۔ اور خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ موت کے بعد رفع ہوا پس افسوس ہے اس قوم پر کہ جو نص صریح کتاب اللہ کے مخالف دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن شریف اور تمام پہلی کتابیں اور تمام حدیثیں بیان کر رہی ہیں کہ موت کے بعد وہی رفع ہوتا ہے جس کو رفع روحانی کہتے ہیں اور جو ہر ایک مومن کے لیے بعد موت ضروری ہے۔ بعض متعصب اس جگہ لاجواب ہو کر کہتے ہیں کہ آیت کو اس طرح پڑھنا چاہیئے کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُتَوَفِّیْکَ گویا خدا تعالیٰ سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے مُتَوَفِّیْکَ کو رَافِعُکَ پر مقدم کر دیا اور بھول گیا کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ کہنا لا کہ کہنا یہ تھا کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُتَوَفِّیْکَ تھا۔ ہائے افسوس! نہایت تعجب ہے کس قدر جرأت یہ ہے کہ اس کی حمایت کے لیے کتاب اللہ کی تحریف کرتے ہیں یہی تحریف وہی پلید عمل ہے جس سے یہودی لعنتی کہلائے اور اُن کی صورتیں مسخ کی گئیں اب یہ لوگ قرآن شریف کی تحریف پر آمادہ ہیں اور اگر یہ وعدہ نہ ہوتا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[2] تو ان لوگوں سے بعید نہ تھی کہ بجائے آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ کے اس طرح قرآن شریف میں لکھ دیتے کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُتَوَفِّیْکَ مگر اس طرح کی تحریف بھی غیر ممکن تھی کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں چار وعدے فرمائے ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ[1] وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ[2] وَ مُطَهِّرُکَ[3] مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ جَاعِلُ[4] الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ یہ چار وعدے ہیں جن پر نمبر لگا دیئے گئے اور جیسا کہ احادیث صحیحہ اور خود قرآن شریف سے ثابت ہے وعدہ مطہّرک من الذین کفروا جو وعدہ رفع کے بعد تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پورا ہو گیا کیونکہ آپ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اور ان کی ماں کو ان بیجا تہمتوں سے پاک کیا جو یہود اور نصاریٰ نے ان پر لگائی تھیں۔ اسی طرح یہ چوتھا وعدہ یعنی وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اسلام کے غلبہ اور شوکت سے پورا ہو گیا پس اگر مُتَوَفِّیْکَ کے لفظ کو

پڑھتے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور جو لوگ ان احکام کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ کسی شخص کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کلام کو اس کی جگہوں سے آگے پیچھے کر دے اور جیسا کہ تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ نے تحریف کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۵۳ حاشیہ)

---

[1] المائدہ آیت ۴۵ ۔ [2] الحجر آیت ۱۰

متاخر کیا جائے اور لفظ رافعک الیّ مقدم کیا جائے جیسا کہ ہمارے مخالف چاہتے ہیں تو اس صورت میں فقرہ
رَافِعُكَ اِلَیَّ فقرہ مُطَهِّرُكَ سے پہلے نہیں آ سکتا کیونکہ فقرہ مُطَهِّرُكَ کا وعدہ پورا ہو چکا ہے اور بموجب قول ہمارے
مخالفوں کے مُتَوَفِّيْكَ کا وعدہ ابھی پورا نہیں ہوا اور اسی طرح یہ فقرہ مُتَوَفِّيْكَ وعدہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کے پہلے بھی نہیں آ سکتا کیونکہ وہ وعدہ بھی پورا ہو چکا ہے اور
قیامت کے دن تک اس کا دامن لمبا ہے پس اس صورت میں توفّی کا لفظ اگر آیت کے سر پر سے اُٹھا دیا جائے تو اس
کو کسی دوسرے مقام میں قیامت سے پہلے رکھنے کی کوئی جگہ نہیں سو اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ
السلام قیامت کے بعد مریں گے اور پہلے مرنے سے یہ ترتیب مانع ہے اب دیکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کی یہ غیرت
ہے کہ ہمارے مخالف یہودیوں کی طرح قرآن شریف کی تحریف پر آمادہ تو ہوئے مگر قادر نہیں ہو سکے اور کوئی جگہ نظر نہیں آتی
جہاں فقرہ رَافِعُكَ کو اپنے مقام سے اُٹھا کر اس جگہ رکھا جائے ہر ایک جگہ کی خانہ پُری ایسے طور سے ہو چکی ہے کہ دست
اندازی کی گنجائش نہیں اور دراصل یہی ایک آیت یعنی آیت يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ طالب حق کے لیے کافی ہے
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رفع جس پر ہمارے مخالفوں نے شور مچا رکھا ہے وہ موت کے بعد ہے نہ موت سے پہلے
کیونکہ خدا کی گواہی سے یہ بات ثابت ہے اور خدا کی گواہی کو قبول نہ کرنا ایماندار کا کام نہیں اور جبکہ بموجب نصِّ قرآن رفع
موت کے بعد ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی رفع ہے جس کا ہر ایک ایماندار کے لیے مرنے کے بعد خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۷۷-۱۷۹)

اے عیسیٰ میں تجھے طبعی موت دوں گا یعنی قتل اور صلیب کے ذریعہ سے تو ہلاک نہیں کیا جائے گا اور میں تجھے اپنی طرف
اُٹھاؤں گا پس یہ آیت تو بطور ایک وعدہ کے تھی۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۲۰۵)

معلوم رہے کہ زبان عرب میں لفظ توفّی صرف موت دینے کو نہیں کہتے بلکہ طبعی موت دینے کو کہتے ہیں جو بذریعہ قتل و
صلیب یا دیگر خارجی عوارض سے نہ ہو اس لیے صاحب کشاف نے جو علّامہ لسانِ عرب ہے اس مقام میں تفسیر اِنِّیْ
مُتَوَفِّيْكَ میں لکھا ہے کہ اِنِّیْ مُمِيْتُكَ حَتْفَ اَنْفِكَ یعنی میں تجھے طبعی موت دوں گا۔ اسی بنا پر لسان العرب اور
تاج العروس میں لکھا ہے توفّی المیّت استیفاء مُدّتہ التی وفیت لہ وعدد ایامہ وشہورہ واَعوامہ
فی الدنیا یعنی مرنے والے کی توفّی سے مراد یہ ہے کہ اس کی طبعی زندگی کے تمام دن اور مہینے اور برس پورے کیے
جائیں اور یہ صورت اسی حالت میں ہوتی ہے جب طبعی موت ہو بذریعہ قتل نہ ہو۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۲۱۲ حاشیہ)

اس جگہ اس بات پر ضد کرنا بے فائدہ ہے کہ توفّی کے معنے مارنا نہیں کیونکہ اس بات پر تمام ائمہ لغت عرب
اتفاق رکھتے ہیں کہ جب ایک عَلَم پر یعنی کسی شخص کا نام لے کر توفّی کا لفظ اُس پر استعمال کیا جائے مثلاً کہا جائے کہ توفّی
اللّٰہ زیدًا تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ خدا نے زید کو مار دیا اسی وجہ سے ائمہ لغت ایسے موقع پر دوسرے معنے لکھتے ہی

نہیں صرف وفات دینا لکھے ہیں چنانچہ لسان العرب میں ہمارے بیان کے مطابق یہ فقرہ ہے۔ تُوُفِّيَ فُلَانٌ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ اِذَا قَبَضَ نَفْسَهٗ وفی المصباح اذا قبض روحہ یعنی جب یہ بولا جائے گا کہ تُوُفِّيَ فُلَانٌ یا یہ کہا جائے گا تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تو اس کے صرف یہی معنے ہوں گے کہ فلاں شخص مر گیا اور خدا نے اُس کو مار دیا اس مقام میں تاج العروس میں یہ فقرہ لکھا ہے تُوُفِّيَ فُلَانٌ اِذَا مَاتَ۔ یعنی تُوُفِّيَ فُلَانٌ اس شخص کی نسبت کہا جائے گا جب وہ مر جائیگا۔ دوسرا فقرہ تاج العروس میں یہ لکھا ہے تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِذَا قَبَضَ نَفْسَهٗ یعنی یہ فقرہ کہ توفاہ اللہ عزوجل اس مقام میں بولا جائے گا جب خدا کسی کی روح قبض کریگا۔ اور صحاح میں لکھا ہے تَوَفَّاهُ اللّٰهُ قَبَضَ رُوْحَهٗ یعنی اس فقرہ توفاہ اللہ کے یہ معنے ہیں کہ فلاں شخص کی روح کو خدا تعالیٰ نے قبض کر لیا ہے۔ اور میں نے جہاں تک ممکن تھا صحاح ستہ اور دوسری احادیث نبویہ پر نظر ڈال کر معلوم کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور صحابہؓ کے کلام اور تابعین کے کلام اور تبع تابعین کے کلام میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی علم پر توفی کا لفظ آیا ہو یعنی کسی شخص کا نام لیکر توفی کا لفظ اس کی نسبت استعمال کیا گیا ہو اور خدا فاعل اور وہ شخص مفعول بہ ٹھہرایا گیا ہو اور ایسی صورت میں اس فقرہ کے معنے بجز وفات دینے کے کوئی اور کئے گئے ہوں بلکہ ہر ایک مقام میں جب نام لے کر کسی شخص کی نسبت توفی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس جگہ خدا فاعل اور وہ شخص مفعول بہ ہے جس کا نام لیا گیا تو اس سے یہی معنے مراد لیے گئے ہیں کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایسی نظیریں مجھے تین سو سے بھی زیادہ احادیث میں ملیں جن سے ثابت ہوا کہ جہاں کہیں توفی کے لفظ کا خدا فاعل ہو اور وہ شخص مفعول بہ ہو جس کا نام لیا گیا ہے تو اس جگہ صرف مار دینے کے معنے ہیں نہ اور کچھ۔ مگر باوجود تمام تر تلاش کے ایک بھی ایسی حدیث مجھے نہ ملی جس میں توفی کے لفظ کا خدا فاعل ہو۔ اور مفعول بہ علم ہو یعنی نام لے کر کسی شخص کو مفعول بہ ٹھہرایا گیا ہو اور اس جگہ بجز مارنے کے کوئی اور معنے ہوں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۶-۲۰۷)

علامہ زمخشری آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے یہی معنے کرتا ہے کہ اِنِّیْ مُمِیْتُکَ حَتْفَ اَنْفِکَ یعنی اے عیسٰی میں تجھے طبعی موت سے ماروں گا حتف لغتِ عرب میں موت کو کہتے ہیں اور انف کہتے ہیں ناک کو۔ اور عربوں میں قدیم سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ انسان کی جان ناک کی راہ سے نکلتی ہے اس لیے طبعی موت کا نام انہوں نے حتف انف رکھ دیا۔ وہ عربی زبان میں توفی کے لفظ کا اصل استعمال طبعی موت کے محل پر ہوتا ہے اور جہاں کوئی شخص قتل کے ذریعہ سے ہلاک ہو وہاں قتل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ ایسا محاورہ ہے کہ جو کسی عربی دان پر پوشیدہ نہیں۔ ہاں یہ عرب کے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ کبھی ایسے لفظ کو کہ جو اپنی اصل وضع میں استعمال اُس کی کسی خاص محل کے لیے ہوتا ہے ایک قرینہ قائم کر کے کسی غیر محل پر بھی مستعمل کر دیتے ہیں یعنی استعمال اُس کا وسیع کر دیتے ہیں اور جب ایسا قرینہ موجود نہ ہو تو پھر ضروری ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں وہ لفظ اپنی اصل وضع پر استعمال پاوے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۹)

چونکہ یہودیوں کے عقیدہ کے موافق کسی نبی کا رفع روحانی طبعی موت پر موقوف ہے اور قتل اور صلیب مانع رفع روحانی

کا مانع ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے اوّل یہود کے رد کے لیے یہ ذکر فرمایا کہ عیسیٰ کے لیے طبعی موت ہوگی اور پھر چونکہ رفع روحانی طبعی موت کا ایک نتیجہ ہے اس لیے لفظ مُتَوَفِّيكَ کے بعد رَافِعُكَ إِلَيَّ لکھ دیا تا یہودیوں کے خیالات کا پورا رد ہو جائے

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲۰۹ حاشیہ)

جو لوگ اپنے خدا کی پوری محبت اور پوری اطاعت اختیار کر لیتے ہیں اور پورے صدق اور وفاداری سے اس کے آستانہ پر جھکتے ہیں ان کو خاص طور پر ایک کامل زندگی بخشی جاتی ہے اور ان کے فطرتی حواس میں بھی بہت تیزی عطا کی جاتی ہے اور ان کی فطرت کو ایک نور بخشا جاتا ہے جس نور کی وجہ سے ایک فوق العادت روحانیت ان میں جوش مارتی ہے اور تمام روحانی طاقتیں جو دنیا میں وہ رکھتے تھے موت کے بعد بہت وسیع کی جاتی ہیں اور نیز مرنے کے بعد وہ اپنی خداداد مناسبت کی وجہ سے بیوجہ حضرت عزت سے رکھتے ہیں آسمان پر اٹھائے جاتے ہیں جس کو شریعت کی اصطلاح میں رفع کہتے ہیں لیکن جو مومن نہیں ہیں اور جو خدا تعالیٰ سے صاف تعلقات نہیں رکھتے یہ زندگی ان کو نہیں ملتی اور نہ یہ صفات ان کو حاصل ہوتی ہیں اس لیے وہ لوگ مردہ کے حکم میں ہوتے ہیں۔ (چشمہ مسیحی ص۵۲ حاشیہ)

قرآن شریف سے تو صرف رفع الی اللہ ثابت ہے جو ایک روحانی امر ہے نہ رفع الی السماء اور یہودیوں کا اعتراض تو یہ تھا کہ جو شخص لکڑی پر لٹکایا جاوے اس کا رفع روحانی دوسرے نبیوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتا اور یہی اعتراض دفع کرنے کے لائق تھا پس قرآن شریف نے کہاں اس اعتراض کو دفع کیا ہے یعنی اس تمام نزاع کی بنیاد یہ تھی کہ یہودی کہتے تھے کہ عیسیٰؑ مصلوب ہو گیا ہے اور جو شخص مصلوب ہو اس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا اس لیے عیسیٰؑ کا اور نبیوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف رفع روحانی نہیں ہوا لہٰذا وہ مومن نہیں ہے اور نہ نجات یافتہ ہے اور چونکہ قرآن اس بات کا ذمہ دار ہے کہ پہلے جھگڑوں کا تصفیہ فرماوے لہٰذا اس نے یہ فیصلہ فرمایا کہ عیسیٰ کا بھی دوسرے نبیوں کی طرح رفع ہوا ہے خدا نے تو ایک جھگڑے کا فیصلہ کرنا تھا پس اگر خدا تعالیٰ نے ان آیتوں میں یہ فیصلہ نہیں کیا تو پھر بتلاؤ کہ کس مقام میں یہ فیصلہ کیا۔ کیا نعوذ باللہ اس طرح کی بدفہمی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتی ہے کہ جھگڑا تو یہود کی طرف سے روحانی رفع کا تھا اور خدا یہ کہے کہ عیسیٰؑ مع جسم دوسرے آسمان پر بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ نجات کے لیے مع جسم آسمان پر جانا شرط نہیں صرف روحانی رفع شرط ہے۔

پس اس جگہ اس جھگڑے کے فیصلہ کے لیے یہ بیان کرنا تھا کہ نعوذ باللہ عیسیٰؑ لعنتی نہیں ہے بلکہ ضرور رفع روحانی اس کو نصیب ہوا ہے ماسوا اس کے قرآن شریف میں جو رفع کے پہلے توفی کا لفظ لایا گیا ہے یہ صریح اس بات پر قرینہ ہے کہ یہ وہ رفع ہے جو ہر ایک مومن کو موت کے بعد نصیب ہوتا ہے اور توفی کے یہ معنے کرنا کہ زندہ آسمان پر حضرت عیسیٰؑ اٹھائے گئے یہ بھی یہودیوں کی طرح قرآن شریف کی تحریف ہے قرآن شریف اور تمام حدیثوں میں توفی کا لفظ قبض روح کے بارہ میں استعمال پاتا ہے کسی مقام میں ان معنوں پر استعمال نہیں ہوا کہ کوئی شخص مع جسم زندہ آسمان پر اٹھایا گیا۔

[illegible] سے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قرآن شریف میں عیسیٰؑ کی موت کا کہیں ذکر نہیں اور اس نے کبھی مرنا ہی نہیں [illegible] مقام میں حضرت عیسیٰؑ کی نسبت توفی کا لفظ ہوگا وہاں یہی معنے کرنے پڑیں گے کہ مع جسم آسمان پر چلا گیا یا جائیگا پھر موت ان کی کس طرح ثابت ہوگی۔ (تذکرۃ الشہادتین ص۱۵-۱۶)

یہ عقیدہ صریح طور پر قرآن شریف کے مخالف ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ سب لوگ حضرت عیسیٰ کو قبول کرلیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے یا عیسیٰ انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے موت دوں گا اور (پھر بعد) موت کے مومنوں کی طرح اپنی طرف تجھے اٹھاؤں گا بعد پھر تمام تہمتوں سے تجھے بری کروں گا اور پھر قیامت تک تیرے متبعین کو تیرے مخالفوں پر غالب رکھوں گا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قیامت سے پہلے تمام لوگ حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئیں گے تو پھر وہ کون سے مخالف ہیں جو قیامت تک رہیں گے۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۲)

وَاَمَّا مَا قَالَ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ فَلَیْسَ مَعْنَاہُ رَفْعَ الْجِسْمِ مَعَ الرُّوْحِ وَالدَّلِیْلُ عَلَیْہِ ذِکْرُ التَّوَفِّیْ قَبْلَ الرَّفْعِ وَاِنَّ ھٰذَا الرَّفْعَ حَقُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدَ الْمَمَاتِ وَھُوَ ثَابِتٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَالْاَحَادِیْثِ وَالرِّوَایَاتِ۔ وَاِنَّ الْیَھُوْدَ کَانُوْا مُنْکِرِیْنَ بِرَفْعِ عِیْسٰی۔ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّ عِیْسٰی لَا یُرْفَعُ کَمِثْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا یُحْیٰی وَذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یُکَفِّرُوْنَہٗ وَلَا یَحْسَبُوْنَہٗ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَرَدَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ۔

(الاستفتاء ص۲۴ حاشیہ مشمولہ حقیقۃ الوحی)

فَانْظُرْ کَیْفَ شَھِدَ اللّٰہُ عَلٰی وَفَاتِہٖ فِیْ کِتَابِہِ الْمُبِیْنِ۔ وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ الرَّفْعَ وَتَطْھِیْرَ ذَیْلِ الْمَسِیْحِ مِنْ اِلْزَامَاتِ الْیَھُوْدِ وَبُھْتَانَاتِھِمْ وَغَلَبَۃَ اَھْلِ الْحَقِّ وَضَرْبَ الذِّلَّۃِ عَلَی الْیَھُوْدِ وَجَعْلَھُمْ مَغْلُوْبِیْنَ مَقْھُوْرِیْنَ تَحْتَ النَّصَارٰی وَالْمُسْلِمِیْنَ۔

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے جو یا عیسیٰ انی متوفیک ورافعک الیّ فرمایا ہے اس کے معنے جسم مع روح کے اٹھائے جانے کے نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں توفی کا ذکر رفع سے پہلے کیا گیا ہے اور یہ رفع بعد موت ہر مومن کا حق ہے۔ یہ بات قرآن کریم احادیث اور روایات سے ثابت ہے۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا رفع دوسرے مومنوں کی طرح نہیں ہوگا اور نہ وہ زندہ کیے جائیں گے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آپ کو کافر گردانتے تھے اور آپ کو مومن خیال نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے۔ (الاستفتاء ص۲۴ حاشیہ ترجمہ از عربی)

(ترجمہ) دیکھ خدا نے اپنی روشن کتاب میں اس کی وفات پر کیسی شہادت دی ہے اور ظاہر ہے کہ مسیح کا رفع اور اس کے دامن کا یہود کے الزاموں اور بہتانوں سے پاک کرنا اور اہل حق کا غلبہ اور یہود پر ذلت کا چھا جانا اور نصاریٰ اور مسلمانوں کے

لقد وقعت هذه الانباء والمواعيد كلها وتمت وظهرت وما وقعت الا على صورتها وترتيبها وقد انقضت مدة طويلة على ظهورها ووقوعها فكيف يعتقد عاقل بالغ ذو عقل سليم وفهم مستقيم بان خبر التوفي الذي قدم على هذه الاخبار في ترتيب الآية الموصوفة هو حقير ما وقع الى وقتنا هذا وما مات عيسى ابن مريم الى هذا الزمان الذي فسد بضلالات امته بل يموت بعد نزوله في وقت غير معلوم ولا يخفى سخافة هذا الرأي على المتفكرين۔

والقائلون بحيات المسيح لما رأوا ان الآية الموصوفة تبين وفاته بتصريح لا يمكن اخفاءه جعلوا يئوّلونها بتاويلات ركيكة واهية وقالوا ان لفظ التوفي في آية يا عيسى انى متوفيك كان موخرا في الحقيقة من كل هذه الواقعات يعني من رفع عيسى وتطهيره من البهتانات ببعث النبي المصدق وغلبة المسلمين على اليهود وجعل اليهود من السافلين۔ ولكن الله قدم لفظ المتوفي على لفظ رافعك وعلى لفظ مطهرك وغيرها مع حذف بعض الفقرات الضرورية رعايةً لصفاء نظم الكلام كالمضطرين۔ وكان اللفظ المذكور يعني انى متوفيك في آخر الفاظ الآية فوضعه الله في اوّلها اضطرارًا لرعاية النظم المحكم وكان الله في هذا التاخير والتقديم من المعذورين۔ فلاجل هذا الاضطرار وضع الالفاظ

پیچھے مغلوب و مقہور ہونا۔ یہ سب وعدے اپنی ترتیب اور صورت پر پورے اور ظاہر ہو چکے ہیں اور ان کے ظہور پر لمبا زمانہ گذر چکا ہے پس کوئی عاقل بالغ جو عقل سلیم اور فہم مستقیم رکھتا ہو کب باور کر سکتا ہے کہ توفی کا وعدہ جو آیت موصوفہ کی ترتیب میں سب وعدوں سے اوّل ہے وہ اب تک واقع نہ ہوا اور عیسٰی بن مریم اس زمانہ تک بھی نہ مرے جو اُس کی اُمت کی ضلالتوں سے فاسد ہو چکا ہے بلکہ کسی غیر معلوم وقت میں نازل ہونے کے بعد مرے گا اور سوچنے والوں پر اس رائے کا ضعف اور فساد پوشیدہ نہیں۔

اور مسیح کی حیات کے قائلوں نے جب دیکھا کہ آیت موصوفہ اُس کی وفات کو بتصریح بیان کرتی ہے کہ جس کا اخفا ممکن نہیں تو ضعیف اور رکیک تاویلیں کرنے لگے اور کہتے ہیں کہ آیت یا عیسٰی انّی متوفّیک میں لفظ توفّی فی الحقیقت ان سب واقعات سے مؤخر تھا یعنے عیسٰی کے رفع اور آنحضرت کی بعثت کے ساتھ بہتانوں سے ان کی تطہیر کرنے اور یہود پر مسلمانوں کے غالب ہونے اور ان کے مغلوب ہونے سے مؤخر ہے لیکن خدا نے نظم کلام کے واسطے مضطر ہو کر اس کو مقدم کر دیا ہے اور باوجود اس کے کچھ ضروری فقرے حذف کر دیئے ہیں اور چونکہ رعایت نظم کے لیے مضطر ہو کر خدا نے لفظ توفّی کو مقدم کیا ہے جو در اصل مؤخر تھا لہذا اس تقدم و تاخیر میں خدا معذور ہے کیونکہ اضطرار کی وجہ سے الفاظ غیر محل میں رکھے ہیں اور

فِيْ غَيْرِ مَوَاضِعِهَا وَجَعَلَ الْقُرْآنَ عِضِيْنَ۔ وَالْآيَةُ بِزَعْمِهِمْ كَانَتْ فِي الْأَصْلِ عَلٰى مَتْنِ وَالصُّوْرَةِ
يَا عِيْسٰى إِنِّيْ رَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ مُنَزِّلُكَ مِنَ السَّمَآءِ ثُمَّ مُتَوَفِّيْكَ فَانْظُرْ كَيْفَ يُبَدِّلُوْنَ
كَلَامَ اللّٰهِ وَيُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهَا وَلَيْسَ عِنْدَهُمْ مِنْ بُرْهَانٍ عَلٰى هٰذَا إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
إِلَّا أَهْوَاءَهُمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّتَكَلَّمُوْا فِي الْقُرْآنِ إِلَّا خَائِفِيْنَ۔ وَأَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ مُنَزَّهٌ
عَنْ هٰذِهِ الْاِضْطِرَارَاتِ وَكَلَامُهٗ كُلُّهٗ مُرَتَّبٌ كَالْجَوَاهِرَاتِ وَالتَّكَلُّمُ فِيْ شَأْنِهٖ بِمِثْلِ ذٰلِكَ
جَهَالَةٌ خَفِيْفَةٌ وَسَفَاهَةٌ شَنِيْعَةٌ وَمَا يَقَعُ فِيْ هٰذِهِ الْوَسَاوِسِ إِلَّا الَّذِيْ نَسِيَ قُدْرَةَ اللّٰهِ
تَعَالٰى وَقُوَّتَهٗ وَحَوْلَهٗ وَاحْتَقَرَهٗ وَمَا قَدَرَهٗ حَقَّ قَدْرِهٖ وَمَا عَرَفَ شَأْنَ كَلَامِهٖ بَلِ اجْتَرَءَ
وَأَلْحَقَ كَلَامَ اللّٰهِ بِكَلَامِ الشَّاعِرِيْنَ۔

وَكَيْفَ يَجُوْزُ لِأَحَدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ أَنْ يَّتَكَلَّمَ بِمِثْلِ هٰذَا أَوْ يُبَدِّلَ كَلَامَ اللّٰهِ مِنْ تِلْقَاءِ
نَفْسِهٖ وَيُحَرِّفَهٗ عَنْ مَّوْضِعِهٖ مِنْ غَيْرِ سَنَدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ أَلَيْسَتْ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْمُحَرِّفِيْنَ۔ وَلَوْ كَانُوْا عَلَى الْحَقِّ فَلِمَ لَا يَأْتُوْنَ بِبُرْهَانٍ عَلٰى هٰذَا التَّحْرِيْفِ مِنْ آيَةٍ
أَوْ حَدِيْثٍ أَوْ قَوْلِ صَحَابِيٍّ أَوْ رَأْيِ إِمَامٍ مُّجْتَهِدٍ إِنْ كَانُوْا مِنَ الصَّادِقِيْنَ وَكَيْفَ نَقْبَلُ

قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے اور یہ آیت کریمہ ان کے خیال میں درحقیقت یوں تھی اے عیسیٰ میں تجھے اپنی طرف اُٹھاؤں گا اور تجھ کو
منکروں کے بہتانوں سے پاک کروں گا اور تیرے متبعین کو مخالفوں پر قیامت تک غلبہ دوں گا پھر آسمان سے تجھے اُتاروں گا پھر
اس کے بعد تجھے وفات دوں گا پس دیکھو کہ کس طرح کلام الٰہی کو بدلتے ہیں اور اس کے کلمات کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹاتے ہیں اور
اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں حالانکہ اُن کے لیے مناسب نہ تھا کہ قرآن میں کلام کرتے
لیکن ڈرتے ڈرتے۔ اور تم جانتے ہو کہ اللہ ایسے اضطراروں سے پاک ہے اور اُس کے سب کلام جواہرات کی طرح مرتب ہیں
اور اُس کی شان میں ایسی بات کتنی بڑی جہالت اور بیوقوفی ہے اور ایسے وسوسوں میں بجز ایسے شخص کے کوئی بھی نہیں پڑتا کہ جو
اُس کی قدرت اور طاقت اور حفظ کو بھلا دے اور رحقیر خیال کرے اور اُس کی پوری قدر نہ کرے اور اُس کی کلام کی شان سے
جاہل ہو اور اُس کو شاعروں کے کلام سے ملا دے اور کسی مسلمان کے لیے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی بات منہ پر لاوے
اور اللہ کے کلام کو اپنی طرف سے بدلے اور خدا و رسول سے اُس کے پاس کوئی سند نہ ہو اور کلمات الٰہیہ کو اُن کے محل سے
اِدھر اُدھر کرے۔ کیا تحریف کرنے والوں پر خدا کی لعنت نہیں ہے اور اگر وہ حق پر ہیں تو کیوں اس تحریف پر کوئی آیت یا
حدیث یا قول صحابی یا قول امام دلیل کے طور پر پیش نہیں کرتے اگر سچے ہوتے تو ضرور پیش کرتے اور ہم کیونکر ایسی تحریفیں کو قبول

تَحْرِيْفَاتِهِمُ الَّتِيْ لَا دَلِيْلَ عَلَيْهَا مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَلَا نَجِدُ هَا اِلَّا كَتَحْرِيْفِ الْيَهُوْدِ مِنْ تَلْبِيْسِ الشَّيَاطِيْنِ۔ وَاَمَّا السَّلَفُ الصَّالِحُ فَمَا تَكَلَّمُوْا فِيْ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ تَفْصِيْلًا بَلْ اٰمَنُوْا مُجْمَلًا بِاَنَّ الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ قَدْ تُوُفِّيَ كَمَا وَرَدَ فِي الْقُرْاٰنِ وَاٰمَنُوْا بِمُجَدِّدٍ يَّاْتِيْ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ عِنْدَ غَلَبَةِ النَّصَارٰى عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اِسْمُهُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ وَفَوَّضُوا التَّفْصِيْلَ هٰذِهِ الْحَقِيْقَةِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَا دَخَلُوْا فِيْ تَفَاصِيْلِهٖ قَبْلَ الْوُقُوْعِ وَكَذٰلِكَ كَانَتْ سِيْرَتُهُمْ فِي الْاَنْبَاءِ الْمُسْتَقْبِلَةِ كَمَا هِيَ سُنَّةُ الصَّالِحِيْنَ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوْا سُنَّتَهُمْ وَتَرَكُوْا سِيْرَتَهُمْ وَاَوَّلُوْا قَوْلَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ ثُمَّ اَصَرُّوْا عَلَيْهِ كَاَنَّهُمْ عَرَفُوْا اَسْرَارَ اللّٰهِ يَقِيْنًا وَكَاَنَّهُمْ كَانُوْا مِنَ الْمُسْتَيْقِنِيْنَ۔ (حمامۃ البشرٰی ص۱۵-۱۸)

وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ فِيْ تَرْتِيْبِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ كَانَتْ هٰذِهِ الْمَوَاعِيْدُ كُلُّهَا بَعْدَ وَعْدِ التَّوَفِّيْ وَكَانَ وَعْدُ التَّوَفِّيْ مُقَدَّمًا عَلٰى كُلِّهَا وَقَدِ اتَّفَقَ الْقَوْمُ عَلٰى اَنَّهَا وَقَعَتْ بِتَرْتِيْبٍ يُّوْجَدُ فِي الْاٰيَةِ فَلَوْ فَرَضْنَا اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ مُؤَخَّرٌ مِّنْ لَّفْظِ الرَّفْعِ لَلَزِمَنَا اَنْ نُّقِرَّ بِاَنَّ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَدْ تُوُفِّيَ بَعْدَ الرَّفْعِ وَقَبْلَ وُقُوْعِ الْمَوَاعِيْدِ الْبَاقِيَةِ وَهٰذَا

کر لیں جن پر قرآن اور حدیث سے کوئی دلیل نہیں اور ہم ان کو بعینہٖ ان تحریفوں کی مانند پاتے ہیں جو شیطان کے دھوکے سے یہود نے کی تھیں اور سلف صالحین نے اس مسئلہ میں مفصل کچھ نہیں کہا بلکہ اجمالی رنگ میں ایمان لاتے تھے کہ مسیح مرگیا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اور اس پر کہ آخری زمانہ میں جبکہ نصاریٰ روئے زمین پر غالب ہو جاویں گے تو اس اُمت میں سے ایک مجدد آئے گا جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہوگا اور اس کی تفصیل کو انہوں نے خدا تعالیٰ کے سپرد کیا اور واقع ہونے کے پہلے اس کی تفصیل کے پیچھے نہیں پڑے جیسا کہ آئندہ زمانہ کی پیش گوئیوں میں اُن کی عادت تھی اور سب صالحین کی یہی عادت ہے پھر ان کے بعد ایسی ذریت آئی جنہوں نے ان کی عادت اور سیرت کو ضائع کر دیا اور قال اللّٰہ قال الرسول کی اپنی خواہشوں کے مطابق تاویلیں کر دیں اور پھر ایسا اصرار کیا گویا کہ خدائی اسرار کو انہوں نے یقیناً جان لیا۔ اور ان کو پورا یقین حاصل ہے۔

(ترجمہ از حمامۃ البشریٰ از ص۴۹ تا ۵۱ طبع ۱۹۰۳ء)

اور تو جانتا ہے۔ کہ ترتیب کے لحاظ سے اس آیت میں جتنے وعدے ہیں وہ توفّی کے وعدے کے بعد ہیں۔ اور توفّی کا وعدہ ان سب سے مقدم ہے۔ اور تمام مسلمانوں کا اسبات پر اتفاق ہے کہ آیت میں موجود ترتیب کے مطابق ہی وہ وعدے پورے ہوئے ہیں پس اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ لفظ توفّی رفع کے لفظ سے مؤخر ہے تو ہمارے لیے اسبات کا اقرار کرنا بھی ضروری ٹھہریگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات رفع کے بعد اور باقی وعدوں کے پورا ہونے سے پہلے واقع ہو گئی ہے حالانکہ یہ ایک ایسی بات ہے

مِمَّا لَا يَعْتَقِدُ بِهٖ اَحَدٌ مِّنَ الْمُخَالِفِيْنَ وَلَوْ قُلْنَا اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ مُؤَخَّرٌ مِّنْ جُمْلَةِ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمُقَدَّمٌ مِّنْ وَّعْدٍ وَّقَعَ فِيْ تَرْتِيْبِ الْاٰيَةِ بَعْدَهَا لَلَزِمَنَا اَنْ نُّقِرَّ بِاَنَّ وَفَاتَ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ بَعْدَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ غَيْرِ مُكْثٍ قَبْلَ غَلَبَةِ اَتْبَاعِهٖ عَلٰى اَعْدَاءِهِمْ وَهٰذَا بَاطِلٌ اَيْضًا بِزَعْمِ الْقَوْمِ فَاِنَّهُمْ قَدِ اعْتَقَدُوْا اَنَّ الْمَسِيْحَ لَا يَمُوْتُ اِلَّا بَعْدَ هَلَاكِ الْمِلَلِ كُلِّهَا فَلَوْ رَجَعْنَا مِنْ هٰذِهِ الْاَقْوَالِ كُلِّهَا وَ قُلْنَا اِنَّ الْمَسِيْحَ لَا يَمُوْتُ اِلَّا بَعْدَ تَكْمِيْلِ وَعْدِ الْغَلَبَةِ الْمُمْتَدَّةِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَمَا صَرَّحَتْ اٰيَةُ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَلَزِمَنَا اَنْ نُّقِرَّ بِاَنَّ الْمَسِيْحَ لَا يَمُوْتُ اِلَّا بَعْدَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَاِنَّ الْوَعْدَ قَدِ امْتَدَّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا يُمْكِنُ نُزُوْلُ الْمَسِيْحِ اِلَّا بَعْدَ وُقُوْعِهٖ عَلَى الْوَجْهِ الْاَتَمِّ وَالْاَكْمَلِ فَمَا نَجِدُ لَهٗ مَوْضِعَ قَدَمٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا بَعْدَ يَوْمِ الْحَشْرِ عَلٰى طَرِيْقِ فَرْضِ الْمُحَالِ وَلَيْتَ شِعْرِيْ اَنَّ اَعْدَاءَنَا يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ اِنَّ لَفْظَ مُتَوَفِّيْكَ فِيْ اٰيَةِ يَا عِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ مُؤَخَّرٌ فِي الْحَقِيْقَةِ وَلَيْسَ هٰذَا الْمَوْضِعُ مَوْضِعَهٗ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُنَبِّئُوْنَنَا بِاَنْ لَّوْ نَرْفَعُ هٰذَا اللَّفْظَ مِنْ هٰذَا الْمَقَامِ فَاَيْنَ نَضَعُهٗ اَنُسْقِطُهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ كَالْمُحَرِّفِيْنَ۔

جسے مخالفین میں سے بھی کوئی نہیں مانتا اور اگر ہم یہ کہیں کہ لفظ توفی وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے جملہ سے موخر ہے اور ان وعدوں سے مقدم ہے جو اس آیت کی ترتیب میں اس جملہ کے بعد ذکر ہوتے ہیں تو لازم آئے گا کہ ہم اقرار کریں کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی وفات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بلا تاخیر واقع ہوگئی پیشتر اس کے کہ آپ کے متبعین کو ان کے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا۔ اور یہ بات مسلمانوں کے خیال کے مطابق باطل ہے۔ کیونکہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح علیہ السلام تمام باطل فرقوں اور مذہبوں کے مٹنے اور تباہ ہونے کے بعد ہی فوت ہونگے پس اگر ہم ان تمام امور سے رجوع کرلیں۔ اور یہ کہیں کہ مسیح علیہ السلام کی وفات اس غلبہ کے وعدے کی تکمیل کے بعد ہوگی جس کا عرصہ قیامت تک ممتد ہے جیسا کہ آیت وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ صراحت کر رہی ہے اور یہ بھی ہم پر لازم آتا ہے کہ اقرار کریں کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی وفات قیامت کے بعد واقع ہوگی کیونکہ یہ غلبہ کا وعدہ قیامت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس وعدہ کے بدرجہ اتم واکمل پورا ہونے کے بعد ہی آپ کا نزول ممکن ہوگا۔ اس صورت میں ہمیں کتاب اللہ کی رُو سے یوم حشر سے پہلے مسیح کے قدم دھرنے کے لیے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی یہ بات علی سبیل الفرض کہی جا رہی ہے اور کاش میں سمجھ سکتا کہ ہمارے مخالف یہ بات اپنے منہ سے کس طرح نکالتے ہیں کہ اس آیت میں لفظ متوفیک درحقیقت موخر ہے اور موجودہ جگہ اس کی اصل جگہ نہیں۔ لیکن وہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتے کہ اگر ہم اس لفظ متوفیک کو موجودہ جگہ سے ہٹا دیں تو اسے کہاں رکھیں کیا ہم اسے تحریف کرنیوالوں کی طرح کتاب اللہ سے نکال دیں۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ إِنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ مُؤَخَّرٌ مِّنْ لَفْظِ الرَّفْعِ وَمُقَدَّمٌ عَلٰى مَوَاعِيْدِ أُخْرٰى فَيَضْحَكُ الْعَاقِلُ مِنْ قَوْلِهِمْ وَيَتَعَجَّبُ مِنْ حُمْقِهِمْ أَلَا يَعْلَمُوْنَ أَنَّ هٰذَا الْقَوْلَ خِلَافُ مَا يَعْتَقِدُوْنَ فِيْ وَقْتِ وَفَاةِ الْمَسِيْحِ بِزَعْمِهِمْ وَإِنَّا ذَكَرْنَا آنِفًا أَنَّهُمْ يَعْتَقِدُوْنَ أَنَّ وَعْدَ التَّوَفِّيْ لَا يَظْهَرُ وَلَا يَقَعُ إِلَّا بَعْدَ هَلَاكِ أَهْلِ الْمِلَلِ كُلِّهَا فَلَزِمَهُمْ أَنْ يَعْتَقِدُوْا أَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ مُؤَخَّرٌ مِّنْ هٰذَا الْوَعْدِ الْآخِرِ لَا مِنَ الرَّفْعِ فَقَطْ فَإِنَّ التَّأَخُّرَ الْوَضْعِيَّ يَتْبَعُ التَّأَخُّرَ الطَّبْعِيَّ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُتَفَكِّرِيْنَ. ثُمَّ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُّؤَخِّرَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِنَا مَا قَدَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ مِنْ غَيْرِ سَنَدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَمَا هٰذَا إِلَّا التَّحْرِيْفُ الَّذِيْ لَعَنَ اللّٰهُ لِأَجْلِهِ الْيَهُوْدَ فَاتَّقُوْهُ وَلَا تُقَلِّبُوْا آيَاتِ اللّٰهِ بَعْدَ تَرْتِيْبِهَا إِنْ كُنْتُمْ خَائِفِيْنَ۔ (حمامة البشرٰی ص۵۶-۵۷)

وَالَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ لَفْظَ مُتَوَفِّيْكَ فِيْ آيَةِ يَا عِيْسٰى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ بِمَعْنٰى إِنِّيْ مُنِيْمُكَ مَا كَانَ خَطَاؤُهُمْ خَطَاءً وَّاحِدًا بَلْ جَمَعُوْا أَنْوَاعَ الْعَثَرَاتِ فِيْ قَوْلِهِمْ وَتَرَكُوْا تَفْسِيْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ خَيْرُ الْبَشَرِ وَكَانَ تَكَلُّمُهُ بِالرُّوْحِ الرَّحْمَانِيِّ وَكَانَ

اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ لفظ توفی لفظ رفع سے موخر ہے اور باقی تمام وعدوں سے مقدم ہے۔ ان کے اس قول پر عقلمند شخص تو ہنس پڑیگا اور ان کی حماقت پر تعجب کریگا۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ان کا یہ قول تو ان کے اس عقیدہ کے خلاف ہے جو وہ بزعم خود مسیح کی وفات کے وقت کے متعلق رکھتے ہیں۔ اور ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وعدہ توفی کا ظہور اور وقوع تمام ملتوں کے پیروؤں کے ہلاک ہونے کے بعد واقع ہوگا۔ اس طرح ان پر لازم آتا ہے کہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھیں کہ لفظ توفی آخری وعدہ سے بھی موخر ہے۔ نہ صرف لفظ رفع سے کیونکہ تاخر وضعی تاخر طبعی کا تابع ہوتا ہے۔ جیسا کہ فکر کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم از خود بغیر خدا تعالیٰ یا اس کے رسول کی سند کے کسی ایسی چیز کو موخر قرار دیں جسے خدا تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں مقدم رکھا ہے اور یہ ایسی تحریف ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہود پر لعنت کی تھی۔ پس تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور اگر تمہیں کچھ بھی خوف ہے۔ تو آیات الٰہیہ کو ان کی ترتیب سے الٹ پلٹ نہ کرو۔ (حمامة البشریٰ ص۵۶-۵۷)

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت یا عیسیٰ انی متوفیک میں لفظ متوفیک کے معنے مُنِیْمُکَ ہیں (یعنی میں تجھے سلانے والا ہوں) تو ان کی یہ غلطی ایک غلطی نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے اس قول میں اور بھی کئی لغزشیں جمع کر لی ہیں۔ اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ آپ خیر البشر تھے۔ اور آپ رحمانی روح سے گفتگو فرماتے تھے اور آپ کا قول

قَوْلَهُ خَيْراً مِّنْ أَقْوَالِ عِلْمِهَا وَقَدْ أَحَاطَتْ كَلِمَاتُهُ طُرُقَ الذَّوْقِ وَالْوِجْدَانِ وَ الْعِلْمِ وَالْعِرْفَانِ وَالنُّوْرِ الَّذِيْ أُعْطِيَ لَهُ مِنَ الرَّحْمٰنِ وَتَرَكُوْا مَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِيْ مَعْنٰى مُتَوَفِّيْكَ وَمَا نَظَرُوْا إِلَى الْقُرْآنِ وَطَرِيْقِ اسْتِعْمَالِهٖ فِيْ هٰذَا اللَّفْظِ وَوُرُوْدِهٖ فِيْهِ بِمَعْنَى الْإِمَاتَةِ بِالتَّوَاتُرِ وَالتَّتَابُعِ فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔

ثُمَّ إِذَا فَرَضْنَا أَنَّ التَّوَفِّيْ بِمَعْنَى الْإِنَامَةِ فَمَا نَرٰى أَنْ يَّنْفَعَهُمْ هٰذَا الْمَعْنٰى مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فَإِنَّ النَّوْمَ مُرَادٌ مِّنْ قَبْضِ الرُّوْحِ وَتَعَطُّلِ حَوَاسِّ الْجِسْمِ مَعَ بَقَاءِ تَعَلُّقٍ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ فَمِنْ أَيْنَ يَثْبُتُ مِنْ هٰذَا أَنَّ اللّٰهَ قَبَضَ جِسْمَ الْمَسِيْحِ أَلَا تَنْظُرُ إِلٰى سُنَّةِ اللّٰهِ الْقَدِيْمَةِ فَإِنَّهُ يَقْبِضُ الْأَرْوَاحَ فِيْ حَالَةِ النَّوْمِ وَيَتْرُكُ الْأَجْسَامَ عَلَى الْأَرْضِ فَمِنْ أَيْنَ عَلِمْتَ أَنَّ لَفْظَ مُتَوَفِّيْكَ مُشْعِرٌ بِرَفْعِ الْجَسَدِ وَالْخَلْقُ يَنَامُوْنَ كُلُّهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يَقْبِضُ اللّٰهُ جِسْمَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ ......

وَعَلٰى تَقْدِيْرِ فَرْضِ هٰذَا الْمَعْنٰى يَلْزَمُ فَسَادٌ آخَرُ وَهُوَ أَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ فِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ وَعْدٌ مُّحْدَثٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى كَمَوَاعِيْدَ أُخْرَى الَّتِيْ ذَكَرَهَا اللّٰهُ فِيْهَا وَلَوْ كَانَ هٰذَا الْمَعْنٰى

مبارک باقی تمام اقوال پر فوقیت رکھتا ہے اور آپ کے کلمات مبارکہ ذوق۔ وجدان۔ علم۔ عرفان اور اس نور پر حاوی ہیں جو آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے دیا گیا تھا۔ نیز ان لوگوں نے حضرت ابن عباس کے اس قول کو بھی ترک کر دیا ہے جو آپ نے متوفیک کے معنے کے بارہ میں فرمایا ہے۔ پھر ان لوگوں نے قرآن شریف اور اس کے توفی کے لفظ کے استعمال کے طریق پر غور نہیں کیا اور نہ اس کا خیال کیا۔ کہ یہ لفظ متواتر اور پے درپے امانت کے معنے میں ہی قرآن مجید میں آیا ہے پس نہ صرف وہ خود گمراہ ہوئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ اور وہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ پھر اگر ہم فرض کر لیں کہ توفی کے معنے سلانے کے ہیں تو ہمارے خیال میں یہ معنے بھی انہیں ذرہ بھر فائدہ نہیں دے سکتے کیونکہ نیند سے مراد دراں حالیکہ جسم اور روح کے درمیان تعلق باقی رہتا ہے۔ قبض روح اور جسم کے حواس کا تعطل ہے اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے جسم کو قبض کر لیا تھا۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کی اس قدیم سنت کو نہیں دیکھتا کہ وہ نیند کی حالت میں صرف ارواح کو قبض کرتا ہے اور اجسام کو زمین پر ہی رہنے دیتا ہے۔ پس تو نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ متوفیک کا لفظ جسم کو اٹھانے پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ تمام لوگ سوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان میں سے کسی کے جسم کو قبض نہیں کرتا......

یہ معنے فرض کر لینے کے بعد ایک اور خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ آیت میں لفظ توفی ایسا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئے طور پر پورا ہونے والا ہے۔ ان وعدوں کی طرح جن کا اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

هُوَ الْحَقُّ فَيَلْزَمُ مِنْهُ اَنْ يَكُوْنَ نَوْمُ الْمَسِيْحِ عِنْدَ الرَّفْعِ اَوَّلَ اَمْرٍ وَرَدَ عَلَيْهِ فِيْ عُمُرِهٖ وَيَلْزَمُهُمْ اَنْ يَعْتَقِدُوْا اَنَّ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ لَا يَنَامُ قَبْلَ الرَّفْعِ قَطُّ فَاِنَّ الْاَمْرَ الَّذِيْ قَدْ وَقَعَ عَلَيْهِ فِيْ حَيَاتِهٖ غَيْرَ مَرَّةٍ كَيْفَ يُمْكِنُ اَنْ يَذْكُرَهُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاعِيْدَ جَدِيْدَةٍ مُحْدَثَةٍ فَاِنَّ وَعْدَ الشَّيْءِ يَدُلُّ عَلٰى عَدَمِ وُجُوْدِ الشَّيْءِ قَبْلَ الْوَعْدِ وَاِلَّا فَيَلْزَمُ تَحْصِيْلُ حَاصِلٍ وَّهُوَ فِعْلٌ لَّغْوٌ لَا يَلِيْقُ بِشَانِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَوَجَبَ اَنْ يَّتَنَزَّهَ عَنْهُ وَعْدُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. ثُمَّ لَوْ كَانَ هٰذَا الْمَعْنٰى هُوَ الصَّحِيْحُ فَمَا تَقُوْلُ فِيْ اٰيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ[1] اَتَظُنُّ اَنَّ النَّصَارٰى اتَّخَذُوا الْمَسِيْحَ اِلٰهًا بَعْدَ نَوْمِهٖ لَا بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَتَظُنُّ اَنَّ الْمَسِيْحَ مَا نَامَ قَطُّ فِيْ عُمُرِهٖ اِلَّا فِيْ وَقْتِ ضَلَالَةِ النَّصَارٰى وَلَمْ تَذُقْ عَيْنُهٗ طَعْمَ النَّوْمِ قَطُّ اِلَّا عِنْدَ الرَّفْعِ وَكَانَ قَبْلَ الرَّفْعِ مُسْتَيْقِظًا دَائِمًا فَانْظُرْ مُنْصِفًا اَيَسْتَقِيْمُ هٰذَا الْمَعْنٰى فِيْ هٰذَا الْمَوْضِعِ وَيَحْصُلُ مِنْهُ ثَلْجُ الْقَلْبِ وَسَكِيْنَةُ الرُّوْحِ وَاطْمِيْنَانُ الْبَاطِنِ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اِنَّهٗ مُسْتَبْعَدٌ جِدًّا وَفَاسِدٌ بِالْبَدَاهَةِ وَمَا كَانَ اَنْ يُّصْلِحَهٗ تَاْوِيْلُ الْمُؤَوِّلِيْنَ۔

(حمامة البشریٰ ط ۵۹-۶۰)

اگر یہ بات حق اور درست ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو رفع کے وقت پہلی دفعہ ہی عمر بھر میں نیند آئی۔ پھر ان لوگوں پر لازم آئے گا کہ وہ یہ اعتقاد رکھیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام رفع سے پہلے ہرگز نہیں سوتے تھے۔ کیونکہ جو امر آپ کی زندگی میں کئی بار واقع ہو چکا کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان نئے وقوع پذیر ہونے والے وعدوں میں ذکر فرمائے۔ کیونکہ کسی چیز کا وعدہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ چیز وعدہ سے پہلے موجود نہیں تھی۔ ورنہ تحصیل حاصل لازم آئے گی اور یہ ایسا لغو فعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے شایاں نہیں ہے اور ضروری ہے کہ رب العالمین کے وعدے ایسی باتوں سے پاک ہوں پھر اگر یہ معنے صحیح ہوں تو آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ کے متعلق تم کیا کہو گے۔ کیا تو خیال کرتا ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے سونے کے بعد خدا بنا لیا تھا۔ نہ ان کی وفات کے بعد۔ اور کیا تو یہ بھی خیال کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی زندگی میں صرف نصاریٰ کی گمراہی کے وقت ہی سوئے تھے اور آپ کی آنکھوں نے رفع کے وقت ہی نیند کا مزہ چکھا تھا اور اس سے قبل وہ ہمیشہ جاگتے رہتے تھے۔ پس تو انصاف سے بتا کیا یہ معنے اس جگہ ٹھیک بیٹھتے ہیں اور کیا ان معنوں سے سینہ کی ٹھنڈک روح کا سکون اور دل کا اطمینان حاصل ہو سکتا ہے تجھے معلوم ہے کہ یہ معنے عقل سے دور اور بالبداہت غلط ہیں اور تاویل کرنے والوں کی تاویل بھی انہیں درست قرار نہیں دے سکتی۔

(حمامة البشریٰ ط ۵۹-۶۰)

---

[1] المائدۃ آیت ۱۱۸

وَقَدْ ذَكَرْتُ آنِفًا أَنَّا لَوْ فَرَضْنَا عَلٰى سَبِيْلِ التَّنَزُّلِ وَقُلْنَا إِنَّ التَّوَفِّيَ هٰهُنَا أَعْنِيْ فِيْ آيَةِ يَا عِيْسٰى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ بِمَعْنَى الْإِنَامَةِ لَكَانَتْ هٰذِهِ الْوَاقِعَةُ وَاقِعَةً أُخْرٰى وَلَا يَنْفَعُ الْإِسْتِدْلَالُ بِهَا قَوْمًا مُخَالِفِيْنَ. فَإِنَّ مَطْلُوْبَ الْمُخَالِفِيْنَ مِنْ خَبْطِهِمْ أَنْ يُثْبِتُوْا رَفْعَ الْمَسِيْحِ مَعَ جِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ وَلٰكِنْ لَا يَحْصُلُ هٰذَا الْمَطْلُوْبُ مِنْ هٰذَا الْمَعْنٰى بَلْ يَحْصُلُ مَا يُخَالِفُهُ فَإِنَّ مَعْنَى الْآيَةِ فِيْ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ يَكُوْنُ هٰكَذَا يَا عِيْسٰى إِنِّيْ قَابِضُ رُوْحِكَ وَتَارِكُ جَسَدِكَ عَلَى الْأَرْضِ مَعَ بَقَاءِ عَلَاقَةٍ بَيْنَ الْجَسَدِ وَالرُّوْحِ فَإِنَّ النَّوْمَ عِبَارَةٌ عَنْ قَبْضِ الرُّوْحِ وَتَرْكِ الْجَسَدِ مَعَ بَقَاءِ عَلَاقَتِهِمَا عَلٰى وَجْهٍ تَامٍّ فَانْظُرْ أَنّٰى يَحْصُلُ مَطْلُوْبُ الْمُخَالِفِيْنَ مِنْ هٰذَا الْمَعْنٰى وَأَيْنَ يَثْبُتُ مِنْهُ رَفْعُ جَسَدِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَى السَّمَاءِ بَلِ الْأَمْرُ بَقِيَ عَلٰى حَالِهِ مَعَ حَمْلِ مَعْنَى التَّوَفِّيْ عَلٰى غَيْرِ مَحَلِّهِ۔ (حمامة البشرٰی ص۶۰)

وَقَدْ تَقْتَضِيْ حِكْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَدَقَائِقُ مَصَالِحِهٖ أَنَّهٗ يَتَوَفّٰى نَبِيًّا قَبْلَ مَجِيْءِ أَيَّامِ فَتْحِهٖ وَإِقْبَالِهٖ فَلَا يَتَوَفَّاهُ حَزِيْنًا يَائِسًا بَلْ يُبَشِّرُهٗ بِتَبْشِيْرَاتٍ مُتَوَالِيَةٍ مُتَتَابِعَةٍ بِغَلَبَةِ مُتَّبِعِيْهِ بَعْدَ وَفَاتِهٖ لِيَطْمَئِنَّ بِهَا قَلْبُهٗ وَلِكَيْ لَا يَحْزَنَ وَلِكَيْلَا يَرْجِعَ إِلٰى رَبِّهٖ بِقَلْبٍ أَلِيْمٍ

اور میں ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ اگر ہم آیت یا عیسٰی انّی متوفیک میں علی سبیل التنزل لفظ توفی کے معنے سلانے کے کر لیں تب بھی یہ ایک دوسری بات ہوگی اور اس سے استدلال کرنا مخالفین کو کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ کیونکہ اس ساری گڑبڑ سے مخالفین کا مقصد حضرت مسیح علیہ السلام کا مع جسم عنصری اٹھایا جانا ثابت کرنا ہے۔ لیکن ان معنوں سے بھی انہیں یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے مقصد کے خلاف نتیجہ نکلے گا کیونکہ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہونگے کہ اے عیسٰی میں تیری روح قبض کرنے والا ہوں اور تیرے جسم کو زمین میں اس صورت میں چھوڑنے والا ہوں۔ کہ روح اور جسم میں تعلق باقی رہے گا۔ کیونکہ نیند روح کے قبض کرنے اور جسم کے چھوڑ دینے کا نام ہے۔ درآں حالیکہ ان دونوں کے درمیان تعلق باقی رہتا ہے۔ اب دیکھ لو۔ ان معنوں کی رو سے مخالفین کا مقصد کہاں حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ مسیح علیہ السلام کا جسم آسمان پر اٹھایا گیا۔ بلکہ توفی کو اس کے غیر محل میں استعمال کرنے کے باوجود معاملہ جوں کا توں باقی رہے گا۔ (حمامة البشرٰی ص۶۰)

کبھی کبھی اللہ تعالٰی کی حکمت اور اس کی مصلحت کی باریکیاں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ وہ نبی کو اس کی فتح اور اقبال کے زمانہ کے آنے سے قبل وفات دیدے۔ لیکن اسے ناامید اور غمگین ہونے کی صورت میں وفات نہیں دیتا۔ بلکہ وہ اسے پے در پے بشارات سے نوازتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی وفات کے بعد غالب آئیں گے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تا اس نبی کا دل مطمئن رہے اور کسی قسم کا حزن اسے حاصل نہ ہو اور تا وہ اپنے رب کی طرف دکھی دل کے

بَلْ يَنْتَقِلُ مِنْ هٰذَا الْعَالَمِ بِسَكِيْنَةٍ وَّسُرُوْرٍ وَّحُبُوْرٍ وَّقُرَّةِ عَيْنٍ وَّلَا يَبْقٰى لَهٗ هَمٌّ بَعْدَ تَبْشِيْرِ اللّٰهِ وَمَوَاعِيْدِهِ الصَّادِقَةِ وَيَذْهَبُ اِلٰى رَبِّهٖ فَرْحَانَ غَيْرَ حَزِيْنٍ۔ فَكَذٰلِكَ كَانَ اَمْرُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاِنَّهٗ مَا رَاٰى غَلَبَةً فِىْ زَمَنِ حَيَاتِهٖ وَاقْتَرَبَ يَوْمُ وَفَاتِهٖ فَبَشَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى بِغَلَبَةِ مُتَّبِعِيْهِ بَعْدَ مَوْتِهٖ وَمَا بَشَّرَهٗ بِغَلَبَتِهٖ فِىْ اَيَّامِ حَيَاتِهٖ فَارْجِعْ اِلَى الْاٰيَةِ الْمُتَقَدِّمَةِ وَدَقِّقِ النَّظَرَ فِيْهَا هَلْ تَرٰى فِىْ هٰذَا الْمَعْنٰى مِنْ فُتُوْرٍ فَكَاَنَّهٗ قَالَ فِىْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ يَا عِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ قَبْلَ اَنْ تَرٰى ظَفَرَكَ وَفَتْحَكَ وَغَلَبَتَكَ وَاِنِّىْ مُعْطِيْكَ مَقَامَ الْعِزَّةِ وَالرَّفْعِ وَالْقُرْبِ عَلٰى خِلَافِ زَعْمِ الْيَهُوْدِ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا تَمُوْتُ قَبْلَ رُؤْيَةِ غَلَبَتِكَ وَلَا تَخْشَ عَلٰى ضُعْفِ مُتَّبِعِيْكَ وَكَثْرَةِ اَعْدَائِكَ فَاِنِّىْ خَلِيْفَتُكَ بَعْدَكَ فَاُمَزِّقُ اَعْدَائَكَ كُلَّ مُمَزَّقٍ وَاسْتَاْصِلُهُمْ لِلْاَبَدِ وَاَجْعَلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ وَتَصَدَّوْا لِخِلَافَتِكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ هٰذَا التَّفْسِيْرُ مَا قَالَ اَحْسَنُ الْقَائِلِيْنَ۔

وَلَوْ كَانَ عِيْسٰى نَازِلًا مِّنَ السَّمَآءِ فِىْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ لَمَا قَالَ كَذٰلِكَ بَلْ قَالَ يَا عِيْسٰى لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ فَاِنَّا لَا نُمِيْتُكَ بَلْ نَرْفَعُكَ حَيًّا اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ اِنَّا نُنَزِّلُكَ اِلَى الْاَرْضِ

ساتھ نہ لوٹے بلکہ پورے سکون سرور خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک کے ساتھ اس جہان سے رحلت فرمائے۔ اللہ تعالےٰ کی بشارات اور اس کے سچے وعدوں کے بعد اسے کوئی غم نہ رہے اور وہ خوش خوش بے غم ہو کر اپنے رب کی طرف جائے یہی صورت حال حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہوئی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی غلبہ نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات کا وقت قریب آگیا تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے متبعین کے غلبہ کی بشارت دی۔ جو آپ کی موت کے بعد ملنا تھا اور یہ بشارت نہیں دی کہ آپ کو اپنی زندگی میں خود غلبہ حاصل ہوگا۔ اب آیت مذکورہ بالا پر غور کرو اور اس پر باریک نظر ڈالو کیا تمہیں ان معنی میں کوئی نقص نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے۔ کہ اے عیسےٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں۔ پیشتر اس کے کہ تو اپنی کامیابی اور غلبہ کو دیکھے اور میں تمہیں یہود کے زعم کے خلاف عزت، بلندی اور قرب کا مرتبہ عطا کرنے والا ہوں پس تو اس وجہ سے غمگین نہ ہو کہ تو اپنے غلبہ کو دیکھنے سے پہلے فوت ہو رہا ہے اور نہ اپنے متبعین کی موجودہ کمزوری اور اپنے دشمنوں کی کثرت کا فکر کر۔ کیونکہ تمہارے بعد میں تمہارا قائمقام ہونگا۔ میں تمہارے دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردونگا۔ اور انہیں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کردونگا اور میں ان لوگوں کو جو تیری پیروی کریں گے اور تیری خلافت کے لیے کوشاں رہیں گے۔ انہیں تیرے نہ ماننے والوں پر تا قیامت غلبہ عطا کرونگا یہ تفسیر ہے اس کی جو اللہ تعالیٰ احسن القائلین نے فرمایا ہے اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام نے آئندہ کسی وقت آسمان سے نازل ہونا ہوتا تو خدا تعالیٰ یوں نہ فرماتا۔ بلکہ یوں فرماتا۔ کہ اے عیسٰی ڈرو نہیں۔ غم مت کھاؤ۔ ہم تجھے وفات نہیں دیں گے۔ بلکہ تجھے زندہ آسمان پر اٹھالیں گے۔ پھر تجھے زمین پر نازل کریں گے اور تجھے

وَنَرُدُّكَ اِلٰی اُمَّتِكَ وَنَجْعَلُكَ غَالِبًا عَلٰی اَعْدَائِكَ ثُمَّ نَجْعَلُ مُتَّبِعِیْكَ غَالِبِیْنَ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلَا تَحْسَبْ نَفْسَكَ مِنَ الْمَغْلُوْبِیْنَ ۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ مَا وَعَدَهٗ اَنْ یُّنَزِّلَهٗ مِنَ السَّمَآءِ ثُمَّ یَجْعَلَهٗ غَالِبًا عَلٰی اَعْدَائِهٖ بَلْ وَعَدَهٗ اَنْ یَّجْعَلَ مُتَّبِعِیْهِ غَالِبِیْنَ عَلَی الْكَافِرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَفَعَلَ كَمَا وَعَدَ وَمَضٰی عَلَیْهِ قُرُوْنٌ كَثِیْرَةٌ۔ (حمامۃ البشریٰ صـ۶۱ـ)

حضرت مسیح (علیہ السلام) جب صلیب پر چڑھائے گئے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ مجھے صلیبی موت سے ہلاک کرنے کے موجب ٹھہرے ہیں اور اس طرح پر یہ لعنتی موت ہوگی اس ہلاکت کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو یہ بشارت دی کہ میں تجھے طبعی موت سے وفات دونگا۔ اور تجھے رفع کرنے والا ہوں۔ اور تجھے پاک کرنے والا ہوں۔ اس آیت کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے مگر افسوس یہ لوگ کچھ بھی غور نہیں کرتے اور قرآن کریم کی ترتیب کو بدل کر تحریف کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہ تھا؟ جو یوں کہہ دیتا کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ پھر وہ کونسی دقت اور مشکل اس کو پیش آگئی تھی جو یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ ہی کہا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صـ۳ـ)

اس آیت میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ واقعات کی بنا پر ہے۔ وہ احمق ہے جو کہتا ہے کہ ترتیب واؤ سے نہیں ہوتی ہے اگر ایسا ہی غبی ہے کہ وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا تو اس کو واقعات پر نظر کرنی چاہیئے اور دیکھے کہ تطہیر رفع کے بعد ہوتی ہے یا پہلے اس تطہیر میں دراصل اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تیرے بعد ایک رسول آئے گا جو حَکَم ہو کر تیری نسبت جھگڑے کو فیصل کردے گا۔ اور جس قدر الزامات یہودی تجھ پر لگاتے ہیں ان سے تجھے پاک ٹھہرائے گا۔ تین ترتیبوں کے تو یہ مخالف بھی قایل ہیں یعنی رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ یہ تو مانتے ہیں کہ مرتب کلام ہے اس میں جو کچھ وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ پورا ہو گیا جسمانی رفع کے قایل اس میں کچھ کہہ نہیں سکتے مگر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب تین ترتیبوں کے وہ قایل ہیں اور انہوں نے اس کو تسلیم کرلیا ہے تو توفّی کے لفظ کو اٹھانے کی بیفایدہ کوشش کیوں کرتے ہیں۔ بھلا یہ یہودی سیرت اختیار کرکے بتاؤ تو سہی اس لفظ کو رکھو گے کہاں؟ اگر رفع کے بعد رکھو تو واقعات خارجہ کے خلاف ہے رفع اور تطہیر میں فاصلہ نہیں ہے بلکہ رفع

تیری قوم کی طرف لوٹائیں گے اور تجھے تیرے دشمنوں پر غالب کریں گے پھر ان پر تیرے متبعین کو تاقیامت غلبہ عطا کریں گے پس تو اپنے آپ کو مغلوب لوگوں میں سے خیال نہ کر۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ سے یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ آپ کو آسمان سے نازل کرے گا اور پھر آپ کو آپ کے دشمنوں پر غالب کریگا بلکہ اس نے مسیح سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آپ کے متبعین کو آپ کے مخالفوں پر تاقیامت غالب رکھے گا پس اس نے اسی طرح کیا جیسے وعدہ کیا تھا اور اس پر کئی صدیاں گزر گئی ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صـ۶۱ـ)

کے بعد تطہیر ہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے اس الزام سے کہ وہ نبی بھی نہیں مانتے تھے اور ملعون قرار دیتے تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ ابن اللہ اور اللہ ہیں جس کو آسمان پر اٹھایا گیا اور وہ ہمارے لیے ملعون ہوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بری کیا ہے یہ دو انگلیوں کی طرح ہیں ان کو الگ کر سکتے ہی نہیں اور جاعل الذین اتبعوک کو دیکھو تو وہ قیامت تک مطہرک کے بعد کسی دوسرے لفظ کو آنے ہی نہیں دیتا پھر اس کو رکھو گے تو کہاں رکھو گے جس طرح پر واقعات ظہور میں آئے اسی طرز سے بیان کیا ہے اب اُلٹ پُلٹ کر کہاں رکھ سکتے ہو میں تو یہ کہتا ہوں کہ تمہیں خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ اس قدر دشمنی کیوں ہے جو اس کی ترتیب کو توڑنا چاہتے ہو۔ کیا تم کو یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی خدائی ثابت کرو؟ عیسائیوں کے اس مُردہ خدا کو کہیں تو مرنے دو؟؟؟ (الحکم جلد ۵ ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

لعنت کی ضد رفع تو وہی ہے جس سے قرب الٰہی ہو۔ یہ تو بجز موت کے حاصل نہیں ہوتا۔ پھر جو لوگ ہمارے مخالف ہیں وہ چونکہ موت کے قائل نہیں اس لیے اُن کے اعتقاد کے موافق مسیح کو ابھی رفع نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ رفع انسان کی آخری زندگی کا نتیجہ ہے اور یہ ان کو حاصل نہیں ہوا۔ پس اس شق کے لحاظ سے تو ان کا آسمان پر چڑھنا باطل ہوا۔

(الحکم جلد ۶ ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ آیتہ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ۔ الآیۃ کی ترتیب جو قرآن شریف میں ہے صحیح نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے کلام کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنا یا گمان کرنا خطرناک بے ادبی اور شوخی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی ترتیب صحیح ہے اور اسی لیے اس کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں۔ مگر یہ لوگ اس ترتیب کو غلط (معاذ اللہ) ٹھہراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ رَافِعُكَ اِلَیَّ کی جگہ رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ الثَّانِیَۃِ چاہیئے اور اس کے بعد مُتَوَفِّیْكَ چاہیئے۔ گویا کہ ان کے اعتقاد کے موافق خدا تعالیٰ کو غلطی لگی اس نے کہنا تو یہ تھا یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ الثَّانِیَۃِ وَ مُتَوَفِّیْكَ اور کہہ دیا جو آیت میں درج ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۳۱ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

قرآن شریف تو ہمیں بار بار یہ بتلاتا ہے کہ حضرت مسیح فوت ہو گئے ہیں۔ ہاں جو رفع ایماندار لوگوں کے لیے فوت کے بعد ہوا کرتا ہے وہ ان کے لیے بھی ہوا تھا جیسا کہ آیت یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ سے سمجھا جاتا ہے کیونکہ لفظ رَافِعُكَ قرآن شریف میں لفظ متوفیک کے بعد مذکور ہے اور یہ قطعی قرینہ اس بات پر ہے کہ یہ وہ رفع ہے جو وفات کے بعد مومنوں کے لیے ہوا کرتا ہے اصل جڑھ اس کی یہ تھی کہ یہودی حضرت مسیح کے رفع روحانی کے منکر ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چونکہ وہ سولی دئے گئے تھے۔ تو بموجب حکم توریت کے وہ اس رفع سے بے نصیب ہیں جو مومنوں کو موت کے بعد خدا کی طرف سے بطور انعام ہوتا ہے اور خدا کے قرب کے ساتھ ایک پاک زندگی ملتی ہے۔ سو ان آیات میں یہودیوں کے اس خیال کا اس طرح پر رد کیا گیا کہ مسیح صلیب کے ذریعے قتل نہیں کیا گیا تھا اور اس کی موت صلیب پر نہیں ہوئی اس لیے وہ توریت کے اس حکم کے نیچے نہیں آ سکتا کہ جو شخص سولی پر چڑھایا جاوے اس کا خدا کی طرف رفع نہیں ہوتا بلکہ وہ لعنتی ہو کر جہنم کی طرف جاتا ہے۔ اب دیکھو کہ

جسمانی رفع کا اس جگہ کوئی جھگڑا نہ تھا اور یہودیوں کا کبھی یہ مذہب نہیں ہوا۔ اور نہ اب ہے کہ جو شخص سولی پر لٹکایا جاوے اس کا جسمانی طور پر رفع نہیں ہوتا یعنی وہ مع جسم آسمان پر نہیں جاتا کیونکہ یہودیوں نے جو حضرت مسیح کے اُس رفع کا انکار کیا جو ہر ایک مومن کے لیے موت کے بعد ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں اور نیز مسلمانوں کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ایماندار کا فوت کے بعد خدا کی طرف رفع ہو جیسا کہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ[1] صریح دلالت کرتی ہے اور جیسا کہ اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً[2] میں بھی یہی اشارہ ہے لیکن جسمانی رفع یہودیوں کے نزدیک اور نیز مسلمانوں کے نزدیک بھی نجات کے لیے شرط نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا جسمانی رفع نہیں ہوا تو کیا وہ یہودیوں کے نزدیک نجات یافتہ نہیں ہیں۔ غرض اس قصہ میں اکثر لوگ حقیقت کو چھوڑ کر کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں قرآن شریف ہرگز اس عقیدہ کی تعلیم نہیں کرتا کہ نجات کے لیے جسمانی رفع کی ضرورت ہے اور نہ یہ کہ حضرت مسیح زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں۔

قرآن نے کیوں اس قصہ کو چھیڑا۔ اس کا فقط یہ سبب تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں روحانی طور پر رفع اور عدم رفع میں ایک جھگڑا تھا۔ یہودیوں کو یہ حجت ہاتھ آگئی تھی کہ یسوع مسیح سُولی دیا گیا ہے لہٰذا وہ توریت کے رو سے اس رفع کا جو ایماندار کا ہوتا ہے بے نصیب رہا۔ اور اس سے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ سچا نبی نہیں ہے جیسا کہ اب بھی وہ سولی کا واقعہ بیان کر کے یہی مقام توریت کا پیش کرتے ہیں۔ اور میں نے اکثر یہودیوں سے جو دریافت کیا تو اُنہوں نے یہی جواب دیا کہ ہمیں جسمانی رفع سے کچھ غرض نہیں ہم تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ شخص توریت کے رو سے ایماندار اور صادق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ سُولی دیا گیا۔ پس توریت فتویٰ دیتی ہے کہ اس کا رفع روحانی نہیں ہوا۔ بمبئی اور کلکتہ میں بہت سے یہودی موجود ہیں جس سے چاہو پوچھ لو۔ یہی جواب دیگا سو یہی وہ جھگڑا تھا جو فیصلہ کے لائق تھا خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ سے اس جھگڑے کا فیصلہ کر دیا ہے کہ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ یعنی یہ کہ وفات کے بعد حضرت مسیح کا رفع ہوا ہے اور وہ ایمانداروں کے گروہ میں سے ہے۔ نہ اُن میں سے جن پر آسمان کے دروازے بند ہوئے ہیں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۱۳-۱۵)

یہ تو سچ ہے کہ وہ میرے متبعین کو قیامت تک میرے منکروں اور مخالفوں پر غلبہ دیگا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ متبعین میں ہر شخص محض میرے ہاتھ پر بیعت کرنے سے داخل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے اندر وہ اتباع کی پوری کیفیت پیدا نہیں کرتا متبعین میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پوری پوری پیروی جب تک نہیں کرتا۔ ایسی پیروی کہ گویا اطاعت میں فنا ہو جاوے اور نقش قدم پر چلے اس وقت تک اتباع کا لفظ صادق نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسی جماعت میرے لیے مقدر کی ہے جو میری اطاعت میں فنا ہو اور پورے طور پر میری اتباع کرنے والی ہو۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

قرآن شریف کی آیت یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مغضوب علیہم ہونے کی بڑی

---

[1] الاعراف آیت ۴۱ ٭ [2] الفجر آیت ۲۹ ٭

وجہ جس کی سزا ان کو قیامت تک دی گئی اور دائمی ذلت اور محکومیت میں گرفتار کیے گئے۔ یہی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے ہاتھ پر خدا تعالیٰ کے نشان بھی دیکھ کر پھر بھی پورے عناد اور شرارت اور جوش سے ان کی تحقیر اور توہین اور تفسیق اور تکذیب کی اور ان پر اور ان کی والدہ صدیقہ پر جھوٹے الزام لگائے جیسا کہ آیت وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ سے صریح سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہمیشہ کی محکومیت جیسی اور کوئی ذلت نہیں اور دائمی ذلت کے ساتھ دائمی عذاب لازم پڑا ہوا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۶)

آیت وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کو غور سے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آیت ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ[1] کی سزا بھی حضرت مسیح کی ایذا کی وجہ سے ہی یہود کو دی گئی ہے کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں یہود کے لیے یہ دائمی وعید ہے کہ وہ ہمیشہ محکومیت میں جو ہر ایک عذاب اور ذلت کی جڑھ ہے زندگی بسر کریں گے جیسا کہ اب بھی یہود کی ذلت کے حالات کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک خدا تعالیٰ کا وہ غصہ نہیں اترا جو اس وقت بھڑکا تھا جبکہ اس وجیہہ نبی کو گرفتار کرا کر مصلوب کرنے کے لیے کھوپری کے مقام پر لے گئے تھے اور جہاں تک بس چلا تھا ہر ایک قسم کی ذلت پہنچائی تھی اور کوشش کی گئی تھی کہ وہ مصلوب ہو کر توریت کی نصوص صریحہ کے رو سے ملعون سمجھا جائے اور اس کا نام ان میں لکھا جائے جو مرنے کے بعد تحت الثریٰ کی طرف جاتے ہیں اور خدا کی طرف اُن کا رفع نہیں ہوتا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۶-۶۷)

آیت وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ سے سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کا غضب جو قیامت تک منقطع نہ ہو اس کی نظیر قرآن شریف میں بجز حضرت مسیح کے دشمنوں کے یا آنے والے مسیح موعود کے دشمنوں کے اور کسی قوم کے لیے پائی نہیں جاتی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۲)

اے عیسیٰ خدا تیرے حقیقی تابعین کو جو مسلمان ہیں اور ادّعائی تابعین کو جو عیسائی ہیں ادعائی طور پر قیامت تک ان لوگوں پر غالب رکھے گا جو تیرے دشمن اور منکر اور مکذب ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۴)

ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیئے کہ قیامت تک دولت اور سلطنت مسلمانوں اور عیسائیوں میں قائم رہے گی اور وہ لوگ جو حضرت مسیح کے منکر ہیں وہ کبھی بلاد اسلامیہ کے مالک اور بادشاہ نہیں بنیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائیگی۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۴)

اس جگہ کفروا سے مراد بھی یہود ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام محض یہودیوں کے لیے آئے تھے اور اس آیت میں وعدہ ہے کہ حضرت مسیح کو ماننے والے یہود پر قیامت تک غالب رہیں گے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۶)

بموجب آیت کریمہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ سب کا ایمان لانا خلاف نص صریح ہے۔ ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۴ حاشیہ واربعین ۳ صفحہ ۳۶ حاشیہ)

---

[1] البقرۃ آیت ۶۲۔

هٰذِهِ الْآيَةُ دَلِيْلٌ قَطْعِيٌّ عَلٰى أَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالنَّصَارٰى يَرِثُوْنَ الْأَرْضَ وَيَتَمَلَّكُوْنَ أَهْلَهَا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لِأَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اتَّبَعُوا الْمَسِيْحَ اتِّبَاعًا حَقِيْقِيًّا وَالنَّصَارٰى اتَّبَعُوْهُ اتِّبَاعًا إِدِّعَائِيًّا۔ (حمامۃ البشریٰ ص۱۵ حاشیہ)

وَمَعْلُوْمٌ أَنَّ كَوْنَ الْيَهُوْدِ مَغْلُوْبِيْنَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَقْتَضِىْ وُجُوْدَهُمْ وَبَقَاءَهُمْ وَكُفْرَهُمْ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔ (حمامۃ البشریٰ ص۴۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ یہ تسلی بخش وعدہ ناصرت میں پیدا ہونے والے ابن مریم سے ہوا تھا۔ مگر میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ یسوع مسیح کے نام سے آنے والے ابن مریم کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہی الفاظ میں مخاطب کر کے بشارت دی ہے اب آپ سوچ لیں کہ جو میرے ساتھ تعلق رکھ کر اس وعدۂ عظیم اور بشارت عظیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیا وہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو امارہ کے درجہ میں پڑے ہوئے فسق و فجور کی راہوں پر کاربند ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص۱)

جو لوگ مجھے قبول کرتے ہیں ان کی دین و دنیا بھی اچھی ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ درحقیقت وہ زمانہ آتا ہے کہ ان کو امیت سے نکال کر خود قوت بیان عطا کرے گا اور وہ منکروں پر غالب ہونگے۔ (الحکم جلد ۶ ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء ص۲)

جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ سے ثابت ہوتا ہے کہ دجال عیسائیوں کے سوا کوئی علیحدہ گروہ نہیں ہوگا کیونکہ جب غلبہ اور سلطنت قیامت تک عیسائیوں کے لیے مقدر ہے یا مسلمانوں کے لیے جو حقیقی متبع ہیں تو پھر کون ایماندار یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایک اور شخص جو حضرت عیسیٰ کا مخالف ہے اور ان کو نبی نہیں جانتا تمام زمین پر اپنا تسلط جمالے گا۔ ایسا خیال تو نص صریح قرآن شریف کے مخالف ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۲۵)

فَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

(ترجمہ) یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ مسلمان اور نصاریٰ قیامت تک زمین کے وارث رہیں گے کیونکہ مسلمان تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حقیقی متبع ہیں اور نصاریٰ ادعائی رنگ میں متبع ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ ص۱۵ حاشیہ)

یہ بات ظاہر ہے کہ یہود کا قیامت تک مغلوب رہنا قیامت تک ان کے وجود، بقاء اور کفر کو چاہتا ہے۔

(حمامۃ البشریٰ ص۴۶)

فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○

میں کافروں پر عذاب شدید نازل کروں گا کیا دنیا میں اور کیا آخرت میں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو میں انہیں اُن کا پورا بدلہ دوں گا۔ (ایام الصلح ص۵ حاشیہ)

۶۰۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کی خدائی پر یہ دلیل پیش کی کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو فی الفور خدا تعالیٰ نے اُس قسم کی پیدائش کی بلکہ اس سے بڑھ کر نظیر پیش کر دی اور فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ۔ اور نظیر ایسی پیش کی جو عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلم اور بدیہیات اور معتقدات میں سے تھی۔

(ایام الصلح ص۱۳۷ حاشیہ)

حضرت مسیح کا بغیر باپ پیدا ہونا بھی امور نادرہ میں سے ہے خلاف قانون قدرت نہیں ہے کیونکہ یونانی مصری ہندی طبیبوں نے اس امر کی بہت سی نظیریں لکھی ہیں کہ کبھی بغیر باپ کے بھی بچہ پیدا ہو جاتا ہے بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بحکم قادر مطلق ان میں دونوں قوتیں عاقدہ اور منعقدہ پائی جاتی ہیں اس لیے دونوں خاصیتیں ذکر اور انثیٰ کی ان کے تخم میں موجود ہوتی ہے۔ یونانیوں نے بھی ایسی پیدائشوں کی نظیریں دی ہیں اور ہندوؤں نے بھی نظیریں دی ہیں اور ابھی حال میں مصر میں جو طبی کتابیں تالیف ہوئی ہیں اُن میں بھی بڑی تحقیق کے ساتھ نظیروں کو پیش کیا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں کے لفظ چندر بنسی اور سورج بنسی درحقیقت انہی امور کی طرف اشارات ہیں پس اس قسم کی پیدائش صرف اپنے اندر ایک ندرت رکھتی ہے جیسے توام میں ایک ندرت ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بغیر باپ پیدا ہونا ایک ایسا امر فوق العادت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصیت رکھتا ہے۔ اگر یہ امر فوق العادت ہوتا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہی مخصوص ہوتا تو خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اس کی نظیر جو اس سے بڑھ کر تھی کیوں پیش کرتا اور کیوں فرماتا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم کی مثال کہ خدا نے اس کو مٹی سے جو تمام انسانوں کی ماں ہے پیدا کیا اور پھر اس کو کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا یعنی جیتا جاگتا ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی امر کی نظیر پیدا ہونے سے وہ امر بے نظیر نہیں کہلا سکتا۔ اور جس شخص کے کسی عارضہ ذاتی کی کوئی نظیر مل جائے تو پھر وہ شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ صفت مجھ سے مخصوص ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۶۸-۶۹ حاشیہ)

یاد رہے کہ خدا نے بے باپ پیدا ہونے میں حضرت آدم سے حضرت مسیح کو مشابہت دی ہے اور یہ بات کہ کسی دوسرے انسان سے کیوں مشابہت نہیں دی یہ محض اس غرض سے ہے کہ تا ایک مشہور متعارف نظیر پیش کی جائے کیونکہ عیسائیوں کو یہ دعویٰ تھا کہ بے باپ پیدا ہونا حضرت مسیح کا خاصہ ہے اور یہ خدائی کی دلیل ہے۔ پس خدا نے اس حجّت کے توڑنے کے لیے وہ نظیر پیش کی جو عیسائیوں کے نزدیک مُسلّم اور مقبول ہے۔ اگر خدا تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کوئی اور نظیر پیش کرتا تو وہ اس نظیر کی طرح بدیہی اور مُسلّم الثبوت نہ ہوتی اور ایک نظری امر ہوتا۔ ورنہ دنیا میں ہزارہا افراد ایسے ہیں جو بے باپ پیدا ہوتے ہیں اور غایت کار یہ امر امور نادرہ میں سے ہے نہ یہ کہ خلاف قانون قدرت اور عادت اللہ سے باہر ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص حاشیہ)

ایسا قادر خدا جو ابتداء دنیا میں صرف مٹی سے انسان کو پیدا کر دیتا ہے پھر اگر وہ کسی انسان کو صرف عورت کے نطفہ سے ہی پیدا کرے تو یہ کونسی تعجب کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نطفہ بہ نسبت مٹی کے بچہ پیدا ہونے کے لیے بہت قریب استعداد رکھتا ہے اور مٹی کی استعداد ایک استعداد بعیدہ ہے پس جبکہ تمہارا یہ اقرار ہے کہ جو چیز استعداد بعید رکھتی ہے اس سے انسان پیدا ہو سکتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ جو چیز بہ نسبت مٹی کے بچہ پیدا ہونے کے لیے استعداد قریب رکھتی ہے اس سے بچہ پیدا نہیں ہو سکتا اگر یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یسوع کی پیدائش کی مثال بیان کرنے کے وقت آدم کو ہی پیش کیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ یعنی عیسیٰ کی مثال خدا تعالیٰ کے نزدیک آدم کی ہے کیونکہ خدا نے آدم کو مٹی سے بنا کر پھر کہا کہ تو زندہ ہو جا پس وہ زندہ ہو گیا۔

(چشمہ معرفت ص۲۱۸-۲۱۹)

ہمارے مخالفوں کا یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب سے محفوظ رہ کر آسمان پر مع جسم عنصری چڑھ گئے۔ یہ ایسا اعتقاد ہے جس سے قرآن شریف سخت اعتراض کا نشانہ ٹھیرتا ہے کیونکہ قرآن شریف ہر ایک جگہ عیسائیوں کے ایسے دعاوی کو جن سے حضرت عیسیٰ کی خدائی ثابت کی جاتی ہے ردّ کرتا ہے جیسا کہ قرآن شریف نے حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ پیدا ہونا (جس سے اُن کی خدائی پر دلیل پیش کی جاتی تھی) یہ کہہ کر ردّ کیا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ پھر اگر حضرت عیسیٰ درحقیقت مع جسم عنصری آسمان پر چڑھ گئے تھے اور پھر نازل ہونے والے ہیں تو یہ تو ان کی ایسی خصوصیت تھی کہ بے باپ پیدا ہونے سے زیادہ دھوکہ میں ڈالتی تھی پس جواب دو کہ کہاں قرآن شریف نے اس کی کوئی نظیر پیش کر کے اس کو ردّ کیا ہے کیا خدا تعالیٰ اس خصوصیت کے توڑنے سے عاجز رہا۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۱)

وَاللّٰہِ اِنَّ عِیْسٰی مَاتَ وَاِنَّھُمْ یُعَانِدُوْنَ الْحَقَّ الصَّرِیْحَ وَیَقُوْلُوْنَ مَا یُخَالِفُ الْقُرْاٰنَ وَمَا یَخَافُوْنَ۔

(ترجمہ) بخدا حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں اور اس کے منکر ثابت شدہ سچائی کے دشمن ہیں اور وہ بات کہتے ہیں جو قرآن کے مخالف ہے اور

وَاَیُّ اِشْکَالٍ یَاْخُذُھُمْ فِیْ مَوْتِ عِیْسٰی بَلْ ھُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۔ یُخَصِّصُوْنَہٗ بِصِفَۃٍ لَّاتُوْجَدُ فِیْ اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ وَیُؤَیِّدُوْنَ النَّصَارٰی وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۔ فَکَیْفَ تَقْبَلُ غَیْرَۃُ اللّٰہِ اَنْ یُّخَصِّصَ اَحَدًا بِصِفَۃٍ لَّاشَرِیْکَ لَہٗ فِیْھَا مِنْ بَدْءِ الدُّنْیَا اِلٰی اٰخِرِھَا وَاَیُّ عَقِیْدَۃٍ اَقْرَبُ اِلَی الْکُفْرِ مِنْھَا لَوْ کَانُوْا یَتَدَبَّرُوْنَ ۔ فَاِنَّ التَّخْصِیْصَ اَسَاسُ الشِّرْکِ وَاَیُّ ذَنْبٍ اَکْبَرُ مِنَ الشِّرْکِ اَیُّھَا الْجَاھِلُوْنَ ۔ وَاِذْ قَالَتِ النَّصَارٰی اِنَّ عِیْسَی ابْنُ اللّٰہِ بِمَا تَوَلَّدَ مِنْ غَیْرِ اَبٍ وَّکَانُوْا بِہٖ یَتَمَسَّکُوْنَ ۔ فَاَجَابَھُمُ اللّٰہُ بِقَوْلِہٖ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ وَلٰکِنَّا لَا نَرٰی جَوَابَ خُصُوْصِیَّۃِ رَفْعِ عِیْسٰی وَنُزُوْلِہٖ فِی الْقُرْاٰنِ ۔ مَعَ اَنَّہٗ اَکْبَرُ الدَّلَایِلِ عَلٰی اُلُوْھِیَّۃِ عِیْسٰی عِنْدَ اَھْلِ الصُّلْبَانِ ۔ فَلَوْ کَانَ اَمْرُ صُعُوْدِ عِیْسٰی وَھُبُوْطِہٖ صَحِیْحًا فِیْ عِلْمِ رَبِّنَا الرَّحْمٰنِ ۔ لَکَانَ مِنَ الْوَاجِبِ اَنْ یَّذْکُرَ اللّٰہُ مَثِیْلَ عِیْسٰی فِیْ ھٰذِہِ الصِّفَۃِ فِی الْفُرْقَانِ ۔ کَمَا ذَکَرَ اٰدَمَ لِیُبْطِلَ بِہٖ حُجَّۃَ اَھْلِ الصُّلْبَانِ فَلَاشَکَّ اَنَّ فِیْ تَرْکِ الْجَوَابِ اِشْعَارٌ بِاَنَّ ھٰذِہِ الْقِصَّۃَ بَاطِلَۃٌ لَا اَصْلَ لَھَا وَلَیْسَ اِلَّا کَالْھَذَیَانِ ۔

(الاستفتاء (مشمولہ حقیقۃ الوحی) ص۴۰۔۴۱)

اور ایسا کہتے ہوئے ڈرتے نہیں۔ بھلا حضرت عیسیٰؑ کی موت تسلیم کرنے میں انہیں کونسا اشکال پیش آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ حد سے بڑھنے والے لوگ ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک ایسی صفت سے ممتاز کرتے ہیں۔ جو کسی انسان میں نہیں پائی جاتی اور جان بوجھ کر عیسائیوں کی امداد کرتے ہیں۔ بھلا خدا کی غیرت کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ وہ کسی ہستی کو ایسی صفت سے مخصوص کرے جس میں نہ کوئی ابتدائے دنیا سے خدا کا شریک ہوا اور نہ قیامت تک ہو سکیگا۔ اگر وہ سوچ بچار سے کام لیں۔ تو اس سے بڑھ کر اور کونسا عقیدہ کفر سے مشابہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی تخصیص ہی تو شرک کی جڑ ہے۔ اور اے جاہلو! شرک سے بڑا اور کونسا گناہ ہے اور چونکہ عیسائی کہتے تھے کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے۔ کیونکہ وہ بغیر باپ پیدا ہوا تھا اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کا جواب دیا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ لیکن حضرت عیسیٰ کی اس خصوصیت کا کہ وہی آسمان پر اُٹھائے گئے تھے پھر اتریںگے کوئی مثال ہمیں قرآن مجید میں نظر نہیں آتی۔ باوجودیکہ صلیب پرستوں کے نزدیک عیسیٰ کی خدائی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ پس اگر عیسیٰ کے آسمان پر چڑھنے اور پھر اترنے کی بات خدا تعالیٰ کے نزدیک درست ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ اس صفت میں عیسیٰ کے کسی مثیل کا ذکر فرقان مجید میں ضرور کرتا تا اس کے ذریعہ عیسائیوں کی اس دلیل کو جھٹلائے۔ پس بلاشبہ ایسی کوئی مثال پیش نہ کرنے کا مقصد یہ سمجھانا ہے کہ یہ قصہ صریح جھوٹ ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں اور محض بکواس ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بعض عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ خصوصیت پیش کی تھی کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو فی الفور اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی اس آیت میں جواب دیا اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ یعنی عیسیٰ کی مثال آدم کی مثال ہے۔ خدا نے اُس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اُس کو کہا کہ ہو جا۔ سو وہ ہو گیا۔ ایسا ہی عیسیٰ بن مریم مریم کے خون سے اور مریم کی منی سے پیدا ہوا اور پھر خدا نے کہا کہ ہو جا سو ہو گیا پس اتنی بات میں کونسی خدائی اور کونسی خصوصیت اُس میں پیدا ہو گئی۔ موسم برسات میں ہزار ہا کیڑے مکوڑے بغیر ماں اور باپ کے خود بخود زمین سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی اُن کو خدا نہیں ٹھہراتا۔ کوئی اُن کی پرستش نہیں کرتا۔ کوئی اُن کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ پھر خواہ نخواہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اتنا شور کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۳۹-۴۰)

خدا تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی مثال ہے خدا نے اُس کو مٹی سے بنایا پھر کہا کہ ہو جا پس وہ زندہ جیتا جاگتا ہو گیا۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا بے باپ ہونا کوئی امر خاص اُس کے لیے نہیں تا خدا ہونا اُس کا لازم آوے۔ آدم کے باپ اور ماں دونوں نہیں۔ پس جس حالت میں خدا تعالیٰ کی غیرت نے یہ تقاضا کیا کہ حضرت عیسیٰ میں بے پدر ہونے کی خصوصیت نہ رہی تا اُن کی خدائی کے لیے کوئی دلیل نہ ٹھہرائی جائے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ میں چار فوق العادت خصوصیتیں[۵] قبول کرلی ہوں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۱)

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ۔ اگر مسیح بن باپ کے نہ تھا تو آدم سے مماثلت کیا ہوئی اور وہ کیا اعتراض مسیح پر تھا جس کا یہ جواب دیا گیا۔ تواریخی بات بھی یہ ہے کہ یہود آپ کی پیدائش کو اسی لیے ناجائز قرار دیتے تھے کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا اس پر خدا نے یہود کو جواب دیا کہ آدم بھی تو بلا باپ پیدا ہوا تھا بلکہ بلا ماں بھی۔ بہ اعتبار واقعات کے جو اعتراض ہوا کرتے ہیں ان سے جواب کو دیکھنا چاہیئے اور اگر کوئی اسے خلاف قانون قدرت قرار دیتا ہے تو اول قانون قدرت کی حد بست دکھلاوے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۲)

بغیر نظیر کے کوئی بات نہیں مانی جاتی۔ عیسائیوں نے جب مسیح کے بن باپ ہونے سے اس کی خدائی کا استدلال کیا تو خدا تعالیٰ نے نظیر بتلا کر ان کی بات کو رد کر دیا فرمایا ان مثل عیسیٰ کمثل آدم کہ اگر بن باپ ہونے سے انسان خدا ہو سکتا ہے تو آدم کی تو ماں بھی نہ تھی اُسے خدا کیوں نہیں مان لیتے۔ پس جب نصاریٰ کی اس بات کو خدا نے رد کر دیا تو اگر مسیح بھی واقعی آسمان پر زندہ ہوتا اور عیسائی اسے خدائی کی دلیل گردانتے تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی رد کرتا اور چند ایک نظائر پیش کرتا کہ فلاں فلاں اور نبی زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

[۵] (۱) وہ مع جسم عنصری آسمان پر چلے گئے (۲) صد ہا سال تک بغیر آب و دانہ کے آسمان پر زندہ رہنے والے ٹھہرے (۳) آسمان پر اتنی مدت تک پیرانہ سالی اور ضعف سے محفوظ رہنے والے ٹھہرے (۴) مدت دراز کے بعد آسمان سے مع ملائک نازل ہونے والے ٹھہرے۔
(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۹ خلاصہ)

اگر بن باپ پیدا ہونے والا خدا ہو سکتا ہے۔ تو پھر جس کا ماں اور باپ دونوں نہ ہوں۔ وہ تو بدرجہ اولیٰ خدا ہو گا۔ مگر ان کو وہ خدا نہیں مانتے۔ اور ایسا ہی یحییٰ میں بھی خدائی ماننی چاہیئے کیونکہ وہ بانجھ سے پیدا ہوئے تھے۔

(الحکم جلد ۹ ۴۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اگر بے باپ پیدا ہونا دلیل الوہیت اور ابنیت ہے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام بدرجۂ اولیٰ اس کے مستحق ہیں۔ کیونکہ نہ ان کی ماں ہے نہ باپ۔ اور خدا فرماتا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (۳۔۶۰) اور سوچنے والی بات یہ ہے۔ کہ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے سے خلقت کو دھوکہ لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے خدا نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر کے ایک نظیر پہلے ہی سے قائم کر دی تھی لیکن اگر اس کے آسمان پر جانے والی بات بھی صحیح مانی جاوے تو چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی بھی ایک نظیر قائم کر دیتا۔ اب تبلاؤ جبکہ خدا نے آسمان پر جانے کی کوئی نظیر پیش نہیں کی تو پھر اسی سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے آسمان پر جانے والی کہانی محض جھوٹی ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

نصاریٰ نے ایک عقیدہ پکڑا تھا۔ کہ حضرت عیسیٰؑ چونکہ بن باپ کے ہیں لہذا یہ خصوصیت ان کی خدائی کی پختہ دلیل ہے۔ اور یہ ان کا مسلمانوں پر ایک بھاری اعتراض تھا اور اس سے وہ حضرت عیسیٰؑ میں ایک خصوصیت ثابت کر کے ان کی خدائی کی دلیل پکڑتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ان کا یوں مُنہ توڑا اور ان کا ردیوں بیان کیا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ الخ یعنی اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش اعجازی رنگ میں پیش کر کے تم اس کی خدائی کی دلیل ٹھیراتے ہو تو پھر آدم بطریق اولیٰ خدا ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا نہ باپ نہ ماں۔ اس طرح سے اول آدم کو بڑا خدا مان لو پھر اس بات کو عیسیٰ کی خدائی کی دلیل ٹھہرانا۔ (الحکم جلد ۱۲ ۴۲ مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

تعجب کی بات ہے ایک شخص انسانی جامہ میں ہو اور انسانی لوازم اور عوارض کے ماتحت ہو کس دلیل سے فوق العادۃ انسان اس کو مانا جا سکتا ہے؟ صورت شکل سے یہ پہچاننا کہ وہ خدا ہے یہ تو سراسر خیال باطل اور محال ہے اور نصاریٰ بھی اس کے قائل نہیں ہوں گے تو اب بجز اس کے کہ یہ دکھایا جائے کہ اس کے یہ افعال اور اعمال تھے جو انسانی طاقتوں سے بڑھ کر ہیں اور جو اسے خدائی کا منصب دلاتے ہیں اور کوئی مضبوط دلیل اس کی الوہیت کی ہو نہیں سکتی۔ اور یہ سودائے خام ہے۔ اسلام آج تک ڈنکے کی چوٹ سے پکار رہا ہے اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ یعنی اللہ کے نزدیک جو حقیقی الوہیت کا حقدار ہے اسلیئے کہ جامع جمیع صفات کاملہ اور ہر قسم کے بشری ضعفوں اور مخلوقی عوارض و لوازم سے منزہ ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ آدمی سے کچھ بھی زیادہ نہیں یعنی اس میں سارے وہ لوازم اور عوارض موجود ہیں جو آدمی میں پائے جاتے ہیں۔ جو شخص اس کی الوہیت کا مدعی ہے وہ معمولی آدمی سے بڑھ کر خواص اس میں دکھائے۔ یہ بڑا بھاری قرضہ نصاریٰ کی گردن پر ہے اور تیرہ سو برس سے برابر چلا آتا ہے۔ ان کی غیرت کا اگر ان میں ہوتی یہ مقتضاء ہونا چاہیئے

تھا کہ اس خطرناک الزام سے بری ہوتے کہاں یہ کہ وہ ایک شخص کو خدا اور الفا امیگا (ALPHA & OMEGA)[1] کہیں اور کہاں یہ کہ اسلام مٹی سے بنے ہوئے آدمی سے کسی طرح بھی بڑھ کر اُسے نہ مانے اور نہ ماننے دے۔

(الحکم جلد ۷، ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء ص ۴)

اب وہ ابن مریم جس کا روحانی باپ زمین پر بجز معلم حقیقی کے کوئی نہیں۔ جو اس وجہ سے آدم سے بھی مشابہت رکھتا ہے بہت سا خزانہ قرآن کریم کا لوگوں میں تقسیم کرے گا۔ یہاں تک کہ لوگ قبول کرتے کرتے تھک جائیں گے اور لایقبلہ احدٌ کا مصداق بن جائیں گے اور ہر یک طبیعت اپنے ظرف کے مطابق پر ہو جائے گی۔ وہ خلافت جو آدم سے شروع ہوئی تھی۔ خدائے تعالیٰ کی کامل اور بے تغیر حکمت نے آخر کار آدم پر ہی ختم کر دی۔ یہی حکمت اس الہام میں ہے کہ اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ آدَمَ یعنی میں نے ارادہ کیا کہ اپنا خلیفہ بناؤں سو میں نے آدم کو پیدا کر دیا۔ چونکہ استدارت زمانہ کا یہی وقت ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر ناطق ہیں اس لیے خدا تعالیٰ نے آخر اور اول کے لفظ کو ایک ہی کرنے کے لیے آخری خلیفہ کا نام آدم رکھا۔ اور آدم اور عیسیٰ میں کسی وجہ سے روحانی مباینت نہیں۔ بلکہ مشابہت ہے اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ۔ (ازالہ اوہام ص ۶۸۱)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝ (۶۲)

اُن کو کہہ دے کہ آؤ ہم اور تم معہ اپنی عورتوں اور بیٹیوں اور عزیزوں کے مباہلہ کریں پھر اُن پر لعنت کریں جو کاذب ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام ص ۲۶۵)

مباہلہ کے معنے لغت عرب کے رو سے اور نیز شرعی اصطلاح کے رُو سے یہ ہیں کہ دو فریق مخالف ایک دوسرے کے لیے عذاب اور خدا کی لعنت چاہیں۔ (اربعین ۲ ص ۲۹ حاشیہ)

میرے نزدیک مباہلہ تحریری بھی ہو سکتا ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱ ص ۱۱۲)

صلحا کی سنت قدیمہ سے ثابت ہے کہ مباہلہ کی غایت میعاد ایک سال تک ہوتی ہے سو ہم بدیہی ثبوت اپنے پاس رکھتے ہیں کہ جن برکات کو ہم نے اپنی نسبت لکھا ہے وہ ایک سال کے اندر ہی ہم پر وارد ہوئیں۔ (انوار الاسلام ص ۳۲ حاشیہ)

---

[1] BEGINNING AND THE END

اصل مسنون طریق مباہلہ میں یہی ہے کہ جو لوگ ایسے مدعی کے ساتھ مباہلہ کریں جو مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ رکھتا ہو اور اُس کو کاذب یا کافر ٹھہراویں۔ وہ ایک جماعت مباہلین کی ہو۔ صرف ایک یا دو آدمی نہ ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ فَقُلْ تَعَالَوْا میں تَعَالَوْا کے لفظ کو بصیغہ جمع بیان فرمایا ہے۔ سو اُس نے اس جمع کے صیغہ سے اپنے نبی کے مقابل پر ایک جماعت مکذبین کو مباہلہ کے لیے بُلایا ہے نہ شخص واحد کو بلکہ مَنْ حَآجَّكَ کے لفظ سے جھگڑنے والے کو ایک شخص واحد قرار دیکر پھر مطالبہ جماعت کا کیا ہے۔ اور یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی جھگڑنے سے باز نہ آوے اور دلائل پیش کردہ سے تسلّی نہ پکڑے تو اُس کو کہہ دو کہ ایک جماعت بن کر مباہلہ کے لیے آویں۔ سو اسی بنا پر ہم نے جماعت کی قید لگادی ہے۔ جس میں یہ صریح فائدہ ہے کہ جو امر خارق عادت بطور عذاب مکذبین پر نازل ہو وہ مشتبہ نہیں رہے گا۔ مگر صرف ایک شخص میں مشتبہ رہنے کا احتمال ہے۔ (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۳۵-۳۶)

مسیح کا بندہ ہونا بالکل سچ اور شک سے منزہ ہے۔ اور اگر اب بھی عیسائی لوگ مسیح ابن مریم کی الوہیت پر تجھ سے جھگڑا کریں۔ اور خدا تعالیٰ کے اس بیان کو جو مسیح درحقیقت آدم کی طرح ایک بندہ ہے۔ گو بغیر باپ کے پیدا ہوا دروغ سمجھیں۔ اور انسان کا افترا خیال کریں تو ان کو کہہ دے۔ کہ اپنے عزیزوں کی جماعت کے ساتھ مباہلہ کے لیے آویں۔ اور ادھر ہم بھی اپنی جماعت کے ساتھ مباہلہ کے لیے آویں گے۔ پھر جھوٹوں پر لعنت کریں گے۔

اب اس تمام بیان سے بوضاحت کھل گیا۔ کہ مسنون طریق مباہلہ کا یہ ہے کہ جو شخص مباہلہ کی درخواست کرے۔ اس کے دعوے کی بنا ایسے یقین پر ہو جس یقین کی وجہ سے وہ اپنے فریق مقابل کو قطعی طور پر مفتری اور کاذب خیال کرے اور اس یقین کا اس کی طرف سے بصراحت اظہار چاہیئے۔ کہ میں اس شخص کو مفتری جانتا ہوں۔ نہ صرف ظن اور شک کے طور سے۔ بلکہ کامل یقین سے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں ظاہر فرمایا ہے۔

پھر ان آیات سے یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ پہلے خدا تعالیٰ نے دلائل بیّنہ سے بخوبی عیسائیوں کو سمجھا دیا۔ کہ عیسیٰ بن مریم میں کوئی خدائی کا نشان نہیں۔ اور جب وہ باز نہ آئے تو پھر مباہلہ کے لیے درخواست کی۔ اور نیز آیات موصوفہ بالا سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسنون طریقہ مباہلہ کا یہی ہے کہ دونوں طرف سے جماعتیں حاضر ہوں۔ اگر جماعت سے کسی کو بے نیازی حاصل ہوتی۔ تو اس کے اول مستحق ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دوم صفحہ ۵-۶)

اس آیت میں لفظ اَلْکَاذِبِیْنَ صاف ہمارے مدعا اور بیان کا شاہد ناطق ہے اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ فرما کر ظاہر کرتا ہے۔ کہ مباہلہ اسی صورت میں جائز ہے کہ جب فریقین ایک دوسرے کو عمداً دروغ باف یقین کرتے ہوں نہ یہ کہ صرف مخطی خیال کرتے ہوں۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دوم صفحہ ۸ حاشیہ)

۶۵ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ

اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ○

قرآنی تعلیم کا دوسرا کمال کمالِ تفہیم ہے یعنی اس نے ان تمام راہوں کو سمجھانے کے لیے اختیار کیا ہے جو تصور میں آسکتے ہیں اگر ایک عامی ہے تو اپنی موٹی سمجھ کے موافق اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اگر ایک فلسفی ہے تو اپنے دقیق خیال کے مطابق اُس سے صداقتیں حاصل کرتا ہے اور اس نے تمام اصول ایمانیہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرکے دکھلایا ہے اور آئتہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ (۳/۶۵) میں اہل کتاب پر یہ حجت پوری کرتا ہے کہ اسلام وہ کامل مذہب ہے کہ زوائد اختلافی جو تمہارے ہاتھ میں ہیں یا تمام دنیا کے ہاتھ میں ہیں اُن زوائد کو نکال کر باقی اسلام ہی رہ جاتا ہے۔

(جنگ مقدس پرچہ ۵ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۴-۱۵)

اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ نری خشک توحید مدارِ نجات نہیں ہو سکتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے علیحدہ ہو کر کوئی عمل کرنا انسان کو ناجی نہیں بنا سکتا۔ لیکن طمانیت قلب کے لیے عرض پرداز ہیں۔ کہ عبدالحکیم خاں نے جو آیات لکھی ہیں ان کا کیا مطلب ہے مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ[1] اور جیسا کہ یہ آیت بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ[2] اور جیسا کہ یہ آیت تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

واضح ہو کہ قرآن شریف میں ان آیات کے ذکر کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر اس کے جو رسول پر ایمان لایا جائے نجات ہو سکتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ خدائے واحد لاشریک اور یوم آخرت پر ایمان لایا جاوے نجات نہیں ہو سکتی اور اللہ پر پورا ایمان تبھی ہو سکتا ہے کہ اُس کے رسولوں پر ایمان لاوے وجہ یہ کہ وہ اس کی صفات کے مظہر ہیں اور کسی چیز کا وجود بغیر وجود اُس کی صفات کے بپایہ ثبوت نہیں پہنچتا۔ لہٰذا بغیر علم صفات باری تعالیٰ کے معرفت باری تعالیٰ ناقص رہ جاتی ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَكُمْؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ○ (۷۰)

ایک گروہ نے عیسائیوں اور یہودیوں میں سے یہ چاہا ہے کہ کسی طرح تم کو گمراہ کریں اور وہ تم کو تو کیا گمراہ کرینگے

[1] البقرۃ آیت ۶۳ ٭ [2] البقرۃ آیت ۱۱۳ ٭

خود اپنے ہی نفسوں کو گمراہ کر رہے ہیں پر اپنی غلطی پر انہیں شعور نہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۶ حاشیہ نمبر ۱)

۷۲ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

لِمَ لَا تَتَجَافُوْنَ عَنِ الْاِشْتِطَاطِ فِيْ تَحْرِيْفِ كَلِمَاتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ الصِّدْقَ وَسِيْلَةُ الْفَلَاحِ وَالْكِذْبَ مِنْ آثَارِ الطَّلَاحِ وَفِي الْتِزَامِ الْحَقِّ نَبَاهَةٌ وَّفِي اخْتِيَارِ الزُّوْرِ عَاهَةٌ فَاِيَّاكُمْ وَطُرُقَ الْكَذَّابِيْنَ۔ فَاَشَارَ اللّٰهُ فِيْ هٰذَا اَنَّ عُلَمَاءَ النَّصَارٰى هُمُ الدَّجَّالُوْنَ الْمُفْسِدُوْنَ اَعْدَاءُ الْحَقِّ وَاَهْلِهٖ نَسُوْا ظُلْمَةَ الرَّمْسِ فَلَا يَذْكُرُوْنَ مَا ثَمَّ وَحُبُّ الشَّهَوَاتِ فِيْهِمْ عَمَّ وَتَمَّ وَغَابَ اَثَرُ الدِّيْنِ۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۶)

۷۳ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

بعض یہود اور عیسائیوں نے کہا کہ یوں کرو کہ دن کے اول وقت میں تو ایمان لاؤ اور دن کے آخری وقت یعنی شام کو حقیت اسلام سے منکر ہو جاؤ تا شائد اسی طور سے لوگ اسلام کی طرف رجوع کرنے سے ہٹ جائیں۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

بعضوں نے عیسائیوں اور یہودیوں میں سے یہ کہا کہ یوں کرو کہ اول صبح کے وقت جا کر قرآن پر ایمان لے آؤ پھر شام کو اپنا ہی دین اختیار کر لو تا شائد اس طور سے لوگ شک میں پڑ جائیں اور دین اسلام کو چھوڑ دیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۹۴)

(ترجمہ) کیوں تم اس بات سے کنارہ نہیں کرتے کہ الٰہی کلمات کی تحریف میں حد سے زیادہ بڑھے جاتے ہو اور تم جانتے ہو کہ سچائی نجات کا موجب اور جھوٹ تباہی کی علامت ہے اور حق کے اختیار کرنے میں نیکنامی اور جھوٹ کے اختیار کرنے میں آفت ہے سو تم کذابوں کا طریق چھوڑ دو۔ پس اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ نصاریٰ کے علماء درحقیقت دجال اور مفسد ہیں اور حق اور حق پرستوں کے دشمن ہیں قبر کی تاریکی کو بھلا دیا سو وہ اس خوف کو جو اس جگہ ہے یاد نہیں کرتے اور نفسانی شہوتوں کی محبت اُن میں پھیل گئی اور کمال تک پہنچ گئی اور دین کا نشان گم ہو گیا۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۶)

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُن کے پاس زر نقد کا ایک ڈھیر بھی امانت رکھی جائے تو جب تو مانگے وہ سب مال تیرے حوالہ کریں گے اور بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر ایک شرفی بھی تو اُن کے حوالہ بطور امانت کرے تو وہ کبھی حوالہ نہ کریں گے۔ مگر صرف اُس وقت کہ تو اُن کے سر پر کھڑا ہو گا۔ یہ بد معاملگی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کھلے کھلے طور پر کہتے ہیں کہ عرب کے ان پڑھ لوگوں کا حق مار لینے میں ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی اور دیدہ دانستہ خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ (چشمہ معرفت ص ۲۳۲)

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۗ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ ۗ قَالُوْٓا أَقْرَرْنَا ۗ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

(ترجمہ) اور یاد کر جب خدا نے تمام رسولوں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دونگا اور پھر تمہارے پاس آخری زمانہ میں میرا رسول آئے گا جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کریگا تمہیں اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی اور کہا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس عہد پر استوار ہو گئے انہوں نے کہا کہ ہم نے اقرار کر لیا تب خدا نے فرمایا کہ اب اپنے اقرار کے گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ اس بات کا گواہ ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ انبیاء تو اپنے اپنے وقت پر فوت ہو گئے تھے یہ حکم ہر نبی کی اُمت نے لیے ہے کہ جب وہ رسول

ظاہر ہو تو اس پر ایمان لاؤ ورنہ مواخذہ ہوگا۔ اب بتلا دیں میاں عبدالحکیم خاں نیم مُلّا خطرہ ایمان! کہ اگر صرف توحید خشک سے نجات ہو سکتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ ایسے لوگوں سے کیوں مواخذہ کریگا جو گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے مگر توحید باری کے قایل ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۰-۱۳۱)

قرآن شریف سے ثابت ہے کہ ہر ایک نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں داخل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ پس اس طرح تمام انبیاء علیہم السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت ہوئے اور پھر حضرت عیسیٰ کو اُمّتی بنانے کے کیا معنے ہیں اور کونسی خصوصیت۔ کیا وہ اپنے پہلے ایمان سے برگشتہ ہو گئے تھے جو تمام نبیوں کے ساتھ لائے تھے تا نعوذ باللہ یہ سزا دی گئی کہ زمین پر اتار کر دوبارہ تجدید ایمان کرائی جائے مگر دوسرے نبیوں کے لیے وہی پہلا ایمان کافی رہا۔ کیا ایسی کچی باتیں اسلام سے تمسخر ہے یا نہیں؟ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۳۳)

اس آیت سے بنص صریح ثابت ہوا کہ تمام انبیاء جن میں حضرت مسیح بھی شامل ہیں مامور تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاویں اور انہوں نے اقرار کیا کہ ہم ایمان لائے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ش ۵ صفحہ ۱۹۶)

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

جو کوئی بجز اسلام کے کسی اور دین کو چاہے گا تو ہرگز قبول نہیں کیا جاویگا! اور وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔
(جنگ مقدس ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۴)

اسلام میں خاصیت ہے۔ کہ سچائی سے اس پر قدم مارنے والے مکالمات خاصہ الٰہیہ سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ اور قبولیت کے انوار جن میں ان کا غیر ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔ ان کے وجود میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک واقعی صداقت ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۱۴۲)

یاد رکھو کہ دُنیا میں سچّا مذہب جو ہر ایک غلطی سے پاک اور ہر ایک عیب سے منزّہ ہے صرف اسلام ہے یہی مذہب ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتا اور خدا کی عظمت دلوں میں بٹھاتا ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ششم صفحہ ۱۵۴)

قرآن نے جو دین اسلام پیش کیا ہے جو شخص قرآنی تعلیم کو قبول نہیں کرے گا وہ مقبول خدا ہرگز نہ ہوگا اور مرنے کے بعد وہ زیاں کاروں میں ہوگا۔ (مکتوبات جلد دوم ۳ صفحہ ۴ (مکتوب بنام لالہ بھیم سین صاحب)

نجات اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خدا کے فضل سے ہوا کرتی ہے اُس فضل کے حصول کے لیے خدا تعالیٰ نے جو اپنا قانون ٹھہرایا ہوا ہے وہ کبھی باطل نہیں کرتا وہ قانون یہ ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1]

[1] آل عمران آیت ۳۲

اور مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۱)

جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواست گار ہو ۔ وہ آخر کار ٹوٹے میں رہیگا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اسلام کے سوا اور کوئی دین قبول نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نرا دعویٰ نہیں تاثیرات ظاہر کر رہی ہیں۔

اگر کوئی اہل مذہب اسلام کے سوا اپنے مذہب کے اندر انوار و برکات اور تاثیرات رکھتا ہے۔ تو پھر وہ آئے ہمارے ساتھ مقابلہ کرے۔ اور ہم نے ہمیشہ ایسی دعوت کی ہے۔ کوئی مقابلہ پر نہیں آیا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

۸۷۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

یعنی انہوں نے رسول کے حق ہونے پر گواہی دی اور کھلے کھلے نشان ان کو پہنچ گئے۔ (مکتوبات احمدیہ جلد ۳ صفحہ ۴۸)

۹۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝

توبہ کا لفظ نہایت لطیف اور روحانی معنے اپنے اندر رکھتا ہے جس کی غیر قوموں کو خبر نہیں یعنی توبہ کہتے ہیں اُس رجوع کو کہ جب انسان تمام نفسانی جذبات کا مقابلہ کرکے اور اپنے پر ایک موت کو اختیار کرکے خدا تعالیٰ کی طرف چلا آتا ہے۔ سو یہ کچھ سہل بات نہیں ہے اور ایک انسان کو اُسی وقت تائب کہا جاتا ہے جبکہ وہ بکلی نفس امارہ کی پیروی سے دست بردار ہو کر اور ہر ایک تلخی اور ہر ایک موت خدا کی راہ میں اپنے لیے گوارا کرکے آستانۂ حضرت احدیت پر گر جاتا ہے تب وہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ اس موت کے عوض میں خدا تعالیٰ اُس کو زندگی بخشے۔ (قادیان کے آریہ اور ہم صفحہ ۴۶-۴۷)

توبہ کے یہ معنی ہیں کہ انسان ایک بدی کو اس اقرار کے ساتھ چھوڑ دے کہ بعد اس کے اگر وہ آگ میں بھی ڈالا جائے تب بھی وہ بدی ہرگز نہیں کرے گا پس جب انسان اس صدق اور عزم محکم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا جو اپنی ذات میں کریم و رحیم ہے وہ اس گناہ کی سزا معاف کر دیتا ہے اور یہ خدا کی اعلیٰ صفات میں سے ہے کہ توبہ قبول کرکے ہلاکت سے بچا لیتا ہے اور اگر انسان کو توبہ قبول کرنے کی امید نہ ہو تو پھر وہ گناہ سے باز نہیں آئے گا۔

عیسائی مذہب بھی توبہ قبول کرنے کا قایل ہے مگر اس شرط سے کہ توبہ کرنے والا عیسائی ہو لیکن اسلام میں توبہ کے لیے کسی مذہب کی شرط نہیں ہے ہر ایک مذہب کی پابندی کے ساتھ توبہ قبول ہو سکتی ہے اور صرف وہ گناہ باقی رہ جاتا ہے جو کوئی شخص خدا کی کتاب اور خدا کے رسول سے منکر ہے اور یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ انسان محض اپنے عمل سے نجات پاسکے بلکہ یہ خدا کا احسان ہے کہ کسی کی وہ توبہ قبول کرتا ہے اور کسی کو اپنے فضل سے ایسی قوت عطا کرتا ہے کہ وہ گناہ کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۸۱-۱۸۲)

توبہ دراصل حصول اخلاق کے لیے بڑی محرک اور مؤید چیز ہے۔ اور انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔ یعنی جو شخص اپنے اخلاق سیئہ کی تبدیلی چاہتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ سچے دل اور پکّے ارادے کے ساتھ توبہ کرے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ توبہ کے لیے تین شرائط ہیں۔ بدوں اُن کی تکمیل کے سچی توبہ جسے توبۃ النصوح کہتے ہیں حاصل نہیں ہوتی۔ اُن ہر سہ شرائط میں سے پہلی شرط جسے عربی زبان میں اقلاع کہتے ہیں۔ یعنی اُن خیالات فاسدہ کو دُور کر دیا جاوے جو اُن خصائل ردّیہ کے محرک ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تصوّرات کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ حیطۂ عمل میں آنے سے پیشتر ہر ایک فعل ایک تصوّری صورت رکھتا ہے پس توبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اُن خیالات فاسد و تصوّرات بد کو چھوڑ دے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی عورت سے کوئی ناجایز تعلق رکھتا ہو۔ تو اُسے توبہ کرنے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ اُس کی شکل کو بدصورت قرار دے اور اُس کی تمام خصائل رذیلہ کو اپنے دل میں مستحضر کرے کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے۔ تصورات کا اثر بہت زبردست اثر ہے اور میں نے صوفیوں کے تذکروں میں پڑھا ہے کہ اُنہوں نے تصوّر کو یہاں تک پہنچایا کہ انسان کو بندر یا خنزیر کی صورت میں دیکھا غرض یہ ہے کہ جیسا کوئی تصور کرتا ہے ویسا ہی رنگ چڑھ جاتا ہے پس جو خیالات بد لذات کا موجب سمجھے جاتے تھے اُن کا قلع و قمع کرے۔ یہ پہلی شرط ہے۔

دوسری شرط ندم ہے یعنی پشیمانی اور ندامت ظاہر کرنا۔ ہر ایک انسان کا کانشنس اپنے اندر یہ قوت رکھتا ہے کہ وہ اُس کو ہر بُرائی پر متنبہ کرتا ہے۔ مگر بدبخت انسان اُس کو معطل چھوڑ دیتا ہے پس گناہ اور بدی کے ارتکاب پر پشیمانی ظاہر کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لذات عارضی اور چند روزہ ہیں۔ اور پھر یہ بھی سوچے کہ ہر مرتبہ اُس لذت اور حظ میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں آکر جبکہ قویٰ بیکار اور کمزور ہو جاویں گے۔ آخر ان سب لذات دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ پس جبکہ خود زندگی ہی میں یہ سب باتیں چھوٹ جانے والی ہیں تو پھر اُن کے ارتکاب سے کیا حاصل؟ بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو توبہ کی طرف رجوع کرے۔ اور جس میں اول اقلاع کا خیال پیدا ہو۔ یعنی خیالات فاسدہ و تصورات بیہودہ کو قلع و قمع کرے۔ جب یہ نجاست اور ناپاکی نکل جاوے۔ تو پھر نادم ہو۔ اور اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

تیسری شرط عزم ہے یعنی آیندہ کے لیے مصمم ارادہ کرلے کہ پھر اُن برائیوں کی طرف رجوع نہ کرونگا اور جب وہ

مداومت کریگا تو اللہ تعالیٰ اُسے سچی توبہ کی توفیق عطا کریگا۔ یہاں تک کہ وہ سیئات اُس سے قطعاً زایل ہو کر اخلاق حسنہ اور افعال حمیدہ اُس کی جگہ لے لیں گے۔ اور یہ فتح ہے اخلاق پر۔ اس پر قوت اور طاقت بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ تمام طاقتوں اور قوتوں کا مالک وہی ہے۔ جیسے فرمایا اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۶-۱۵۸)

توبہ کے معنے ہی یہ ہیں کہ گناہ کو ترک کرنا اور خدا کی طرف رجوع کرنا۔ بدی چھوڑ کر نیکی کی طرف آگے قدم بڑھانا۔ توبہ ایک طرف (موت) کو چاہتی ہے جس کے بعد انسان زندہ کیا جاتا ہے اور پھر نہیں مرتا۔ توبہ کے بعد انسان ایسا بن جاوے کہ گویا نئی زندگی پاکر دنیا میں آیا ہے نہ اُس کی وہ چال ہو نہ اُس کی وہ زبان نہ ہاتھ نہ پاؤں سارے کا سارا نیا وجود ہو جو کسی دوسرے کے ماتحت کام کرتا ہوا نظر آجاوے۔ دیکھنے والے جان لیں کہ یہ وہ نہیں یہ تو کوئی اور ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یقین جانو کہ توبہ میں بڑے بڑے ثمرات ہیں۔ یہ برکات کا سرچشمہ ہے۔ درحقیقت اولیاء اور صلحاء یہی لوگ ہوتے ہیں جو توبہ کرتے اور پھر اُس پر مضبوط ہو جاتے ہیں وہ گناہ سے دور اور خدا کے قریب ہوتے جاتے ہیں کامل توبہ کرنے والا شخص ہی ولی قطب اور غوث کہلا سکتا ہے۔ اسی حالت میں وہ خدا کا محبوب بنتا ہے۔ اس کے بعد بلائیں اور مصائب جو انسان کے واسطے مقدر ہوتی ہیں ٹل جاتی ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

؏ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۝

تُم حقیقی نیکی کو جو نجات تک پہنچاتی ہے ہرگز پا نہیں سکتے بجز اس کے کہ تُم خدا تعالیٰ کی راہ میں وہ مال اور وہ چیزیں خرچ کرو جو تمہاری پیاری ہیں۔ (فتح اسلام صفحہ ۶۳)

خدا کو راضی کرنے والی اس سے زیادہ کوئی قُربانی نہیں کہ ہم درحقیقت اُس کی راہ میں موت کو قبول کرکے اپنا وجود اُس کے آگے رکھ دیں۔ اسی قُربانی کی خدا نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ یعنی تم حقیقی نیکی کو کسی طرح پا نہیں سکتے جب تک تم اپنی تمام پیاری چیزیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲۱)

تم حقیقی نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے جب تک کہ بنی نوع کی ہمدردی میں وہ مال خرچ نہ کرو جو تمہارا پیارا مال ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۰)

مال کے ساتھ محبت نہیں چاہیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ تم ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ جن سے تم پیار کرتے ہو۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ

؎ البقرۃ آیت ۱۶۶

وسلم کے زمانہ کے ساتھ آج کل کے حالات کا مقابلہ کیا جاوے تو اس زمانہ کی حالت پر افسوس آتا ہے۔ کیونکہ جان سے پیاری کوئی شے نہیں۔ اور اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان ہی دینی پڑتی تھی۔ تمہاری طرح وہ بھی بیوی اور بچے رکھتے تھے جان سب کو پیاری لگتی ہے۔ مگر وہ ہمیشہ اس بات پر حریص رہتے تھے کہ موقع ملے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کردیں۔ (الحکم جلد ۱۴ ص۱۱)

بیکار اور نکمی چیزوں کے خرچ سے کوئی آدمی نیکی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ نیکی کا دروازہ تنگ ہے۔ پس یہ امر ذہن نشین کرلو کہ نکمی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نص صریح ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ جب تک عزیز سے عزیز اور پیاری سے پیاری چیزوں کو خرچ نہ کرو گے اُس وقت تک محبوب اور عزیز ہونے کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اگر تکلیف اُٹھانا نہیں چاہتے اور حقیقی نیکی کو اختیار کرنا نہیں چاہتے تو کیونکر کامیاب اور بامراد ہو سکتے ہو؟ کیا صحابہ کرام مفت میں اُس درجہ تک پہنچ گئے جو اُن کو حاصل ہوا۔ دنیاوی خطابوں کے حاصل کرنے کے لیے کس قدر اخراجات اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں تو پھر کہیں جا کر ایک معمولی خطاب جس سے دلی اطمینان اور سکینت حاصل نہیں ہو سکتی ملتا ہے۔ پھر خیال کرو کہ رضی اللہ عنہم کا خطاب جو دل کو تسلی اور قلب کو اطمینان اور مولا کریم کی رضامندی کا نشان ہے کیا یونہی آسانی سے مل گیا؟ بات یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی جو حقیقی خوشی کا موجب ہے حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عارضی تکلیفیں برداشت نہ کی جاویں خدا ٹھگا نہیں جاتا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو رضائے الٰہی کے حصول کے لیے تکلیف کی پروا نہ کریں۔ کیونکہ ابدی خوشی اور دائمی آرام کی روشنی اُس عارضی تکلیف کے بعد مومن کو ملتی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۹)

دنیا میں انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی واسطے علم تعبیر الرویا میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دیکھے کہ اُس نے جگر نکال کر کسی کو دیا ہے تو اُس سے مراد مال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی اِتّقا اور ایمان کے حصول کے لیے فرمایا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ حقیقی نیکی کو ہرگز نہ پاؤ گے جب تک کہ تم عزیز ترین چیز خرچ نہ کرو گے کیونکہ مخلوق الٰہی کے ساتھ ہمدردی اور سلوک کا ایک بڑا حصہ مال کے خرچ کرنے کی ضرورت بتلاتا ہے اور ابنائے جنس اور مخلوق الٰہی کی ہمدردی ایک ایسی شے ہے جو ایمان کا دوسرا جزو ہے جس کے بدوں ایمان کامل اور راسخ نہیں ہوتا۔ جب تک انسان ایثار نہ کرے دوسرے کو نفع کیونکر پہنچا سکتا ہے دوسرے کی نفع رسانی اور ہمدردی کے لیے ایثار ضروری شے ہے اور اس آیت میں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں اُسی ایثار کی تعلیم اور ہدایت فرمائی گئی ہے پس مال کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا بھی انسان کی سعادت اور تقویٰ شعاری کا معیار اور محک ہے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں للّٰہی وقف کا معیار اور محک وہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضرورت بیان کی اور وہ کل اثاث البیت لے کر حاضر ہو گئے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

جب تک تم اپنی عزیز ترین اشیاء اللہ جل شانہ کی راہ میں خرچ نہ کرو تب تک تم نیکی کو نہیں پا سکتے۔ [الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۸]

اس میں چندہ دینے اور مال صرف کرنے کی تاکید اور اشارہ ہے۔ (البدر جلد ۲ ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۲)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ یہ معنے ہیں کہ سب سے عزیز شے جان ہے اگر موقعہ ہو تو وہ بھی خدا کی راہ میں دے دی جاوے۔ نماز میں اپنے اوپر جو موت اختیار کرتا ہے وہ بھی بِرّ کو پہنچتا ہے۔ (البدر جلد ۳ ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ایسا ہی مالی عبادت جسقدر انسان اپنی کوشش سے کرسکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اپنے اموال مرغوبہ میں سے کچھ خدا کے لیے دیوے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ میں فرمایا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] اور جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ لیکن ظاہر ہے کہ اگر مالی عبادت میں انسان صرف اسی قدر بجالاوے کہ اپنے اموال محبوبہ مرغوبہ میں سے کچھ خدا تعالیٰ کی راہ میں دیوے تو یہ کچھ کمال نہیں ہے کمال تو یہ ہے کہ ماسولی سے بکلی دست بردار ہوجائے اور جو کچھ اُس کا ہے وہ اس کا نہیں بلکہ خدا کا ہوجائے یہاں تک کہ جان بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں فدا کرنے کے لیے طیار ہو۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

انسان میں ہمدردی اعلیٰ درجہ کا جوہر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ یعنی تم ہرگز ہرگز اس نیکی کو حاصل نہیں کرسکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

یہ طریق اللہ کو راضی کرنے کا نہیں کہ مثلاً کسی ہندو کی گائے بیمار ہوجاوے اور وہ کہے کہ اچھا اسکو منس (راہ خدا پر دینا) دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ باسی اور سڑی لسی روٹیاں جو کسی کام نہیں آسکتی ہیں فقیروں کو دیدیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے خیرات کردی ہے ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں اور نہ ایسی خیرات مقبول ہوسکتی ہے وہ تو صاف طور پر کہتا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ حقیقت میں کوئی نیکی نیکی نہیں ہوسکتی جب تک اپنے پیارے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے دین کی اشاعت اور اس کی مخلوق کی ہمدردی کے لیے خرچ نہ کرو۔

(الحکم جلد ۹ ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اُس وقت تک تم حقیقی نیکی کو حاصل ہی نہیں کرسکتے جب تک تم اس چیز کو خرچ نہ کرو گے جو تم کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

مال سے محبت نہ کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ یعنی تم بِرّ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک وہ مال خرچ نہ کرو جس کو تم عزیز رکھتے ہو۔ (الحکم جلد ۱۱ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

[1] البقرۃ آیت ۴

جبکہ بیت اللہ تمام عالم کے لیے ہدایت پانے کا ذریعہ ہوا تو اس میں صاف اشارہ ہے کہ وہ ایسے مرکز پر واقع ہے جس کی زبان تمام دنیا کی زبانوں سے مشارکت رکھتی ہے اور یہی اُمّ الالسنہ ہونے کی حقیقت ہے۔

(منن الرحمان صـ۸۹ حاشیہ)

فَاَوْمیٰ اِلٰی اَنَّ الْعَرَبِیَّۃَ سَبَقَتِ الْاَلْسِنَۃَ - وَاَحَاطَتِ الْاَمْکِنَۃَ وَھِیَ اَوَّلُ غِذَاءٍ لِلنَّاطِقِیْنَ - فَاِنَّ الْبَیْتَ لَایَخْلُوْ مِنْ مَجْمَعِ النَّاسِ - وَالْمَجْمَعُ یَحْتَاجُ اِلَی الْکَلَامِ لِدَفْعِ الْحَوَائِجِ وَالْاِسْتِیْنَاسِ - فَاِنَّ الْمُعَاشَرَۃَ مَوْقُوْفَۃٌ عَلَی الْفَھْمِ وَالتَّفْھِیْمِ کَمَا لَایَخْفٰی عَلَی الذَّکِیِّ الْفَھِیْمِ - (منن الرحمٰن صـ۸۹)

فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝

حج کا مانع صرف زادراہ نہیں اور بہت سے امور ہیں جو عنداللہ حج نہ کرنے کے لیے عذر صحیح ہیں۔ چنانچہ ان میں سے صحت کی حالت میں کچھ نقصان ہونا ہے۔ اور نیز ان میں سے وہ صورت ہے کہ جب راہ میں یا خود مکہ میں امن کی صورت نہ ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا۔ (ایام الصلح صـ۱۶۷)

اسلام نے.... محبت کی حالت کے اظہار کے لیے حج رکھا ہے خوف کے جس قدر ارکان ہیں وہ نماز کے ارکان سے بخوبی واضح ہیں کہ کس قدر تذلل اور اقرار عبودیت اس میں موجود ہے اور حج میں محبت کے سارے ارکان پائے جاتے ہیں بعض وقت شدت محبت میں کپڑے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ عشق بھی ایک جنون ہوتا ہے کپڑوں کو سنوار کر رکھنا یہ عشق میں نہیں رہتا سیالکوٹ میں ایک عورت ایک درزی پر عاشق تھی اسے بہتیرا پکڑ کر رکھتے تھے وہ کپڑے پھاڑ کر چلی آتی تھی غرض یہ نمونہ جو انتہائے محبت کا لباس میں ہوتا ہے وہ حج میں موجود ہے۔ سر منڈایا جاتا ہے۔ دوڑتے ہیں محبت کا بوسہ رہ گیا وہ بھی ہے جو خدا کی ساری شریعتوں میں تصویری زبان میں چلا آیا ہے پھر قربانی میں بھی کمال عشق دکھایا ہے۔ (الحکم جلد ۶ عـ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۳)

(ترجمہ) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو عربی تمام زبانوں پر سبقت لے گئی اور تمام مکانوں پر محیط ہے اور وہ بولنے والوں کی پہلی غذا ہے کیونکہ گھر لوگوں کے مجمع سے خالی نہیں ہوتا اور مجمع دفع حاجت اور باہم اُنس پکڑنے کے لیے کلام کی طرف محتاج ہوتا ہے کیونکہ معاشرت فہم اور تفہیم پر موقوف ہے جیسا کہ زیرک اور فہیم پر یہ بات پوشیدہ نہیں۔ (منن الرحمن صـ۱۰۸)

حج کے واسطے جانا خلوص اور محبت سے آسان ہے مگر و ایسی ایسی حالت میں مشکل۔ بہت ہیں جو وہاں سے نامراد اور سخت دل ہو کر آتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی حقیقت اُن کو نہیں ملتی قشر کو دیکھ کر رائے زنی کرنے لگ جاتے ہیں وہاں کے فیوض سے محروم ہوتے ہیں۔ اپنی بدکاریوں کی وجہ سے اور پھر الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ مامور کی خدمت میں صدق اور استقلال سے کچھ عرصہ رہا جاوے تاکہ اُس کے اندرونی حالات سے بھی آگاہی ہو اور صدق پورے طور پر نورانی ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۷ عنا مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

بے وقت حج بھی فائدہ نہیں کرتا اکثر حاجی جو بڑی خوشی سے حج کرنے کو جاتے ہیں اور پھر دل سخت ہو کر آتے ہیں اس کا یہی باعث ہے کہ انہوں نے بے وقت بیت اللہ کی زیارت کی اور بجز ایک کوٹھہ کے اور کچھ نہ دیکھا اور اکثر مجاورین کو صدق اور صلاح پر نہ پایا دل سخت ہو گیا۔ (الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

حج سے صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ ایک شخص گھر سے نکلے اور سمندر چیر کر چلا جاوے اور رسمی طور پر کچھ لفظ مُنہ سے بول کر ایک رسم ادا کر کے چلا آوے اصل بات یہ ہے کہ حج ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہے جو کمال سلوک کا آخری مرحلہ ہے سمجھنا چاہیئے کہ انسان کا اپنے نفس سے انقطاع کا یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی محبت میں کھویا جاوے اور تعشق باللہ اور محبت الٰہی ایسی پیدا ہو جاوے کہ اس کے مقابلہ میں نہ اسے کسی سفر کی تکلیف ہو اور نہ جان و مال کی پروا ہو نہ عزیز و اقارب سے جدائی کا فکر ہو۔ جیسے عاشق اور محب اپنے محبوب پر جان قربان کرنے کو طیار رہتا ہے اسی طرح یہ بھی کرنے سے دریغ نہ کرے اس کا نمونہ حج میں رکھا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب کے گرد طواف کرتا ہے اسی طرح حج میں بھی طواف رکھا ہے یہ ایک باریک نکتہ ہے جیسا بیت اللہ ہے ایک اس سے بھی اوپر ہے جب تک اُس کا طواف نہ کرو یہ طواف مفید نہیں اور ثواب نہیں۔ اس کے طواف کرنے والوں کی بھی یہی حالت ہونی چاہیئے جو یہاں دیکھتے ہو کہ ایک مختصر سا کپڑا رکھ لیتے ہیں اسی طرح اس کا طواف کرنے والوں کو چاہیئے کہ دُنیا کے کپڑے اُتار کر فروتنی اور انکساری اختیار کرے اور عاشقانہ رنگ میں پھر طواف کرے۔ طواف عشق الٰہی کی نشانی ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ گویا مرضات اللہ ہی کے گرد طواف کرنا چاہیئے۔ اور کوئی غرض باقی نہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ ع۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

ایک حج کے ارادہ کرنے والے کے لیے اگر یہ بات پیش آجائے۔ کہ وہ اُس مسیح موعود کو دیکھ لے جس کا تیرہ سو برس سے اہل اسلام میں انتظار ہے۔ تو بموجب نص صریح قرآن اور احادیث کے وہ بغیر اس کی اجازت کے حج کو نہیں جا سکتا ہاں باجازت اس کے دوسرے وقت میں جا سکتا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۷)

اصل میں جو لوگ خدا کی طرف سے آتے ہیں ان کی خدمت میں دین سیکھنے کے واسطے جانا بھی ایک طرح کا حج ہی ہے۔ حج بھی خدا تعالیٰ کے حکم کی پابندی ہے اور ہم بھی تو اُس کے دین اور اُس کے گھر یعنی خانہ کعبہ کی حفاظت کے واسطے آئے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ ع۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

خانہ کعبہ کا پتھر یعنی حجر اسود ایک روحانی امر کے لیے نمونہ قائم کیا گیا ہے اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو نہ خانہ کعبہ بناتا اور نہ اس میں حجر اسود رکھتا لیکن چونکہ اس کی عادت ہے کہ روحانی امور کے مقابل پر جسمانی امور بھی نمونہ کے طور پر پیدا کر دیتا ہے تا وہ روحانی امور پر دلالت کریں اسی عادت کے موافق خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور عبادت دو قسم کی ہے (۱) ایک تذلّل اور انکسار۔ (۲) دوسری محبت اور ایثار۔ تذلّل اور انکسار کے لیے اُس نماز کا حکم ہوا جو جسمانی رنگ میں انسان کے ہر ایک عضو کو خشوع اور خضوع کی حالت میں ڈالتی ہے یہاں تک کہ دلی سجدہ کے مقابل پر اس نماز میں جسم کا بھی سجدہ رکھا گیا تا جسم اور روح دونوں اس عبادت میں شامل ہوں اور واضح ہو کہ جسم کا سجدہ بیکار اور لغو نہیں اول تو یہ امر مسلّم ہے کہ خدا جیسا کہ روح کا پیدا کرنے والا ہے ایسا ہی وہ جسم کا بھی پیدا کرنے والا ہے اور دونوں پر اُس کا حق خالقیت ہے ماسوا اس کے جسم اور روح ایک دوسرے کی تاثیر قبول کرتے ہیں بعض وقت جسم کا سجدہ روح کے سجدہ کا محرک ہو جاتا ہے اور بعض وقت روح کا سجدہ جسم میں سجدہ کی حالت پیدا کر دیتا ہے کیونکہ جسم اور روح دونوں باہم مرایا متقابلہ کی طرح ہیں مثلاً ایک شخص جب محض تکلف سے اپنے جسم میں ہنسنے کی صورت بناتا ہے تو بسا اوقات وہ سچی ہنسی بھی آجاتی ہے جو روح کے انبساط سے متعلق ہے ایسا ہی جب ایک شخص تکلف سے اپنے جسم میں یعنی آنکھوں میں ایک رونے کی صورت بناتا ہے تو بسا اوقات حقیقت میں رونا ہی آجاتا ہے جو روح کی درد اور رقت سے متعلق ہے پس جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ عبادت کی اس قسم میں جو تذلل اور انکسار ہے جسمانی افعال کا روح پر اثر پڑتا ہے اور روحانی افعال کا جسم پر اثر پڑتا ہے۔ پس ایسا ہی عبادت کی دوسری قسم میں بھی جو محبت اور ایثار ہے انہیں تاثیرات کا جسم اور روح میں عوض معاوضہ ہے محبت کے عالم میں انسانی روح ہر وقت اپنے محبوب کے گرد گھومتی ہے اور اُس کے آستانہ کو بوسہ دیتی ہے ایسا ہی خانہ کعبہ جسمانی طور پر محبان صادق کے لیے ایک نمونہ دیا گیا ہے اور خدا نے فرمایا کہ دیکھو یہ میرا گھر ہے اور یہ حجر اسود میرے آستانہ کا پتھر ہے اور ایسا حکم اِس لیے دیا کہ تا انسان جسمانی طور پر اپنے ولولہ عشق اور محبت کو ظاہر کرے۔ سو حج کرنے والے حج کے مقام میں جسمانی طور پر اس گھر کے گرد گھومتے ہیں ایسی صورتیں بنا کر کہ گویا خدا کی محبت میں دیوانہ اور مست ہیں زینت دور کر دیتے ہیں سر منڈوا دیتے ہیں اور مجذوبوں کی شکل بنا کر اُس کے گھر کے گرد عاشقانہ طواف کرتے ہیں اور اس پتھر کو خدا کے آستانہ کا پتھر تصوّر کر کے بوسہ دیتے ہیں اور یہ جسمانی ولولہ روحانی تپش اور محبت کو پیدا کر دیتا ہے اور جسم اس گھر کے گرد طواف کرتا ہے اور سنگ آستانہ کو چومتا ہے اور روح اس وقت محبوب حقیقی کے گرد طواف کرتا ہے اور اُس کے روحانی آستانہ کو چومتا ہے اور اس طریق میں کوئی شرک نہیں۔ ایک دوست ایک دوست جانی کا خط پا کر بھی اُس کو چومتا ہے کوئی مسلمان خانہ کعبہ کی پرستش نہیں کرتا اور نہ حجر اسود سے مرادیں مانگتا ہے بلکہ صرف خدا کا قرار دادہ ایک جسمانی نمونہ سمجھا جاتا ہے و بس۔ جس طرح ہم زمین پر سجدہ کرتے ہیں مگر وہ سجدہ زمین کے لیے نہیں ایسا ہی ہم حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں مگر وہ بوسہ اس پتھر کے لیے نہیں پتھر تو پتھر ہے جو نہ کسی کو نفع دے سکتا ہے نہ نقصان مگر

اُس محبوب کے ہاتھ کا ہے جس نے اُس کو اپنے آستانہ کا نمونہ ٹھہرایا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۹۱-۹۳)

خدا کا آستانہ مصدر فیوض ہے یعنی اُسی کے آستانہ سے ہر یک فیض ملتا ہے پس اس کے لیے معبّرین لکھتے ہیں کہ اگر کوئی خواب میں حجرِ اسود کو بوسہ دے تو علوم روحانیہ اس کو حاصل ہوتے ہیں کیونکہ حجر اسود سے مراد منبع علم و فیض ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۹۲ حاشیہ)

اس اعتراض کے جواب میں کہ آپ نے "باوجود مقدرت کے حج نہیں کیا"۔ فرمایا۔...... عجیب حالت ہے کہ ایک طرف بداندیش علماء مکّہ سے فتویٰ لاتے ہیں کہ یہ شخص کافر ہے اور پھر کہتے ہیں کہ حج کے لیے جاؤ اور خود جانتے ہیں کہ جبکہ مکّہ والوں نے کفر کا فتویٰ دیدیا تو اب مکّہ فتنہ سے خالی نہیں اور خدا فرماتا ہے کہ جہاں فتنہ ہو اس جگہ جانے سے پرہیز کرو۔ سو میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیسا اعتراض ہے۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ فتنہ کے دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حج نہیں کیا اور حدیث اور قرآن سے ثابت ہے کہ فتنہ کے مقامات میں جانے سے پرہیز کرو۔ یہ کس قسم کی شرارت ہے کہ مکّہ والوں میں ہمارا کفر مشہور کرنا اور پھر بار بار حج کے بارے میں اعتراض کرنا۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۶۷)

کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو خدمت خدا نے اول رکھی ہے اس کو پس انداز کر کے دوسرا کام شروع کر دیوے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عام لوگوں کی خدمات کی طرح ملہمین کی عادت کام کرنے کی نہیں ہوتی وہ خدا کی ہدایت اور راہ نمائی سے ہر ایک امر کو بجالاتے ہیں اگرچہ شرعی تمام احکام پر عمل کرتے ہیں مگر ہر ایک حکم کی تقدیم و تاخیر الٰہی ارادہ سے کرتے ہیں اب اگر ہم حج کو چلے جاویں تو گویا اس خدا کے حکم کی مخالفت کرنے والے ٹھہریں گے اور مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کے بارے میں کتاب حج الکرامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو حج ساقط ہے حالانکہ اب جو لوگ جاتے ہیں ان کی کئی نمازیں فوت ہو جاتی ہیں ماموریں کا اول فرض تبلیغ ہوتا ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ۱۳ سال مکہ میں رہے آپ نے کتنی دفعہ حج کیے تھے ایک دفعہ بھی نہیں کیا تھا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۲)

اس سوال کے جواب میں کہ ایک شخص حج کی نیت رکھتا تھا لیکن وہ اس نیت کے پورا کرنے سے پہلے فوت ہو گیا۔ کیا اس کی طرف سے کوئی شخص حج کر سکتا ہے۔ فرمایا جائز ہے۔ اس سے متوفی کو ثواب حج کا حاصل ہو جائے گا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۸ مورخہ ۲ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ خدا کو تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۲۴۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

خدا تعالیٰ بوجہ استغناء ذاتی کے بے نیاز ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ...... یعنی خدا تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۱۴)

خدا بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اس شخص سے جو خدا سے لاپروائی کرتا ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ

غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۱۰۰ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

اے اہل کتاب کیوں ایمان لانے والوں کو ایمان لانے سے روکتے ہو اور کجی اختیار کرتے ہو۔ (جنگ مقدس پرچہ ۲ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۸)

۱۰۴ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

کیا ہمیں قرآن کریم کے اس مرتبہ پر ایمان نہیں لانا چاہیئے جو مرتبہ وہ خود اپنے لیے قرار دیتا ہے؟ دیکھنا چاہیئے کہ وہ صاف الفاظ میں بیان فرماتا ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ کیا اس حبل سے حدیثیں مراد ہیں؟ پھر جس حالت میں وہ اس حبل سے پنجہ مارنے کے لیے تاکید شدید فرماتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ہر ایک اختلاف کے وقت قرآن کریم کی طرف رجوع کریں؟ (الحق لدھیانہ صفحہ ۳۵)

چاہیئے کہ تمہارے تمام اعضاء اور تمام قوتیں خدا کی تابع ہوں اور تم سب ایک ہو کر اس کی اطاعت میں لگو۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۱)

وہ نمونہ دکھاؤ کہ غیروں کے لیے کرامت ہو۔ یہی دلیل تھی جو صحابہ میں پیدا ہوئی تھی كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ یاد رکھو تالیف ایک اعجاز ہے۔ یاد رکھو جب تک تم میں ہر ایک ایسا نہ ہو کہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۹)

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا اور تھے تم ایک گڑھے کے کنارہ پر سو اس سے تم کو خلاصی بخشی یعنی خلاصی کا سامان عطا فرمایا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۰۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ تک پہنچ چکے تھے سو خدا نے تم کو اے ایماندارو نجات دی اسی طرح وہ اپنے نشان

کو بیان فرماتا ہے تا تم ہدائیت پا جاؤ۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۴۲-۵۴۳)

تم اس نبی کے آنے سے پہلے دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی متنبہ کیا کہ تم نے اپنے دجل سے خدا کی کتابوں کو بدل دیا اور تم ہر یک شرارت اور بدکاری میں تمام قوموں کے پیشرو ہو اور بت پرستوں کو جا بجا ملزم کیا کہ تم پتھروں اور انسانوں اور ستاروں اور عناصر کی پرستش کرتے ہو اور خالق حقیقی کو بھول گئے ہو اور تم یتیموں کا مال کھاتے اور بچوں کو قتل کرتے اور شرکاء پر ظلم کرتے ہو اور ہر ایک بات میں حد اعتدال سے گذر گئے ہو۔

(نور القرآن ۱ صفحہ ۶)

رات بہت بڑی رات گزر گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کی طرف جو توراۃ میں ہے اور آج تک کسی نے اس پر توجہ نہیں کی مگر خدا نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا پس اسی وقت میں نے توراۃ نکالی اور اس کو دیکھا جو لوگ علوم الہیہ اور اس کے استعارات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کو بیشک اس میں مزا آئے گا۔ مگر جو حقایق سے حصّہ نہیں رکھتے وہ اس پر ہنسی کریں گے۔

وہ پیشگوئی اس طرح پر ہے کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ جب ہاجرہ کو اور اسماعیل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام چھوڑ آئے تو ان کے پاس ایک پانی کی مشک دیکر چھوڑ آئے۔ جب وہ ختم ہو گئی اور حضرت اسماعیل پیاس کی شدت سے تڑپنے لگے اور قریب المرگ ہو گئے تو حضرت ہاجرہ ان کی اس حالت کو نہ دیکھ سکی اور کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔ وہاں لکھا ہے کہ تیر کے پتے پر اس وقت ہاجرہ چلائی اور خدا کے فرشتہ نے اس کو پکارا اور کہا کہ اے ہاجرہ مت ڈر اٹھ لڑکے کو اٹھا غرض پھر ہاجرہ کو ایک کنواں نظر آیا جہاں سے اس نے مشک بھری۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ فرشتہ نے جو ہاجرہ کو کنواں دکھایا تھا اسی میں ایک پیشگوئی تھی اس پر میرے دل میں فوراً یہ آیت گزری وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ابراہیم کا پانی جب ختم ہو چکا تو اسماعیل قریب المرگ ہو گیا۔ اس وقت خدا نے اس سے بچا لیا اور ایک دم کنواں پانی کا اسے دیا گیا۔ عرب والے بھی اسماعیل کی اولاد ہونے کے سبب سے گویا اسماعیل ہی تھے جب ہدایت اور شریعت کا ان میں خاتمہ ہو گیا اور قریب المرگ ہو گئے تو خدا تعالیٰ نے ایک نئی شریعت ان پر نازل کی اور یہ اس آیت میں اشارہ ہے۔ غرض یہ پیشگوئی ہے جس کی طرف پہلے کسی نے توجہ نہیں کی۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

۱۰۵ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

یعنی تم میں سے ایسے لوگ ہونے چاہیئے جو نیکی کی دعوت کریں اور امر معروف اور نہی منکر اپنا طریق رکھیں۔

(شہادت القرآن ص۳۵)

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ قف أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ○

یعنی اُس دن بعض مُنہ سیاہ ہو جائیں گے اور بعض سفید اور نورانی ہو جائیں گے...... روحانی حالتیں مخفی نہیں رہیں گی بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۰۳-۱۰۴)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ؕ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ○

حضرتِ احدیت نے جیسا کہ اِس اُمّت کا خیر الامم نام رکھا ہے ایسا ہی اِس اُمّت کے اکابر کو سب سے زیادہ کمالات بھی بخشے ہیں جو کسی طرح چھپ نہیں سکتے اور اُن سے انکار کرنا ایک سخت درجہ کی حق پوشی ہے اور نیز ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ الزام کہ صحابۂ کرام سے ایسے الہامات ثابت نہیں ہوئے بالکل بیجا اور غلط ہے کیونکہ احادیث صحیحہ کے رو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الہامات اور خوارق بکثرت ثابت ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساریہ کے لشکر کی خطرناک حالت سے باعلامِ الٰہی مطلع ہو جانا جس کو بیہقی نے ابن عمر سے روائیت کیا ہے اگر الہام نہیں تھا تو اور کیا تھا اور پھر اُن کی یہ آواز کہ یا ساریہ اَلْجَبَلَ اَلْجَبَلَ مدینہ میں بیٹھے ہوئے مونہہ سے نکلنا اور وہی آواز قدرتِ غیبی سے ساریہ اور اُس کے لشکر کو دور دراز مسافت سے سنائی دینا اگر خارقِ عادت نہیں تھی تو اَور کیا چیز تھی اِسی طرح جناب علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہٗ کے بعض الہامات و کشوف مشہور و معروف ہیں ماسوا اِس کے میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدائے تعالیٰ کا قرآنِ شریف میں اِس بارہ میں شہادت دینا تسلّی بخش امر نہیں ہے کیا اُس نے صحابہ کرام کے حق میں نہیں فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ پھر جس حالت میں خدائے تعالیٰ اپنے نبی کریم کے اصحاب کو امم سابقہ سے جمیع کمالات میں بہتر و بزرگتر ٹھہراتا ہے اور دوسری طرف بطور مُشتے نمونہ از خروارے پہلی اُمتوں کے کاملین کا حال بیان کرکے کہتا ہے کہ مریم صدیقہ والدہ عیسیٰ اور الیاہی والدہ حضرت موسیٰ اور نیز حضرت مسیح کے حواری اور نیز خضر جن میں سے کوئی بھی نبی نہ تھا یہ جب مُلہم من اللہ تھے اور بذریعہ وحی اعلام اسرارِ غیبیہ سے مطلع کیے جاتے تھے تو اب سوچنا چاہیئے کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُمتِ محمدیہ کے کامل متبعین اُن لوگوں کی نسبت بوجہ اولیٰ مُلہم و محدث ہونے چاہیئے کیونکہ وہ حسب تصریح قرآن شریف خیر الامم ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۴۶-۵۴۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

غور کی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیضہ بشریت کے روحانی بچے جو روح القدس کی معرفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے پیدا ہوئے وہ اپنی کمیّت اور کیفیت اور صورت اور نوع اور حالت میں تمام انبیا کے بچوں سے اتم اور اکمل ہیں اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی تم سب اُمتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور درحقیقت جس قدر قرآنی تعلیم کے کمالات خاصہ ہیں وہ اس اُمت مرحومہ کے استعدادی کمالات پر شاہد ہیں کیونکہ اللہ جلشانہٗ کی کتابیں ہمیشہ اسی قدر نازل ہوتی ہیں جس قدر اُس اُمت میں جو تعمیل کتاب کی مکلّف ہے استعداد ہوتی ہے مثلاً انجیل کی نسبت تمام محققین کی یہ رائے ہے کہ اُس کی تعلیم کامل نہیں ہے اور وہ ایک ہی پہلو پر چلی جاتی ہے اور دوسرے پہلو کو بکلّی چھوڑ رہی ہے لیکن دراصل یہ قصور اُن استعدادوں کا ہے جن کے لیے انجیل نازل ہوئی تھی چونکہ خدا تعالیٰ نے انسانی استعدادوں کو تدریجاً ترقی دی ہے اس لیے اوائل زمانوں میں اکثر ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے کہ جو غبی اور بلید اور کم عقل اور کم فہم اور کم دل اور کم ہمت اور کم یقین اور پست خیال اور دنیا کے لالچوں میں پھنسے ہوئے تھے اور دماغی اور دلی قوتیں اُن کی نہایت ہی کمزور تھیں مگر ان زمانوں کے بعد ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ زمانہ آیا جس میں رفتہ رفتہ استعدادیں ترقی کر گئیں گویا دنیا نے اپنے فطرتی قویٰ میں ایک اَور ہی صورت بدل لی پس اُن کی کامل استعدادوں کے موافق کامل تعلیم نے نزول فرمایا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۹۷-۱۹۸)

منجملہ ان دلائل کے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا قرآن شریف کی یہ آیت ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو جو اس لیے نکالی گئی ہو کہ تا تم تمام دجالوں اور دجال معہود کا فتنہ فرو کرکے اور اُن کے شر کو دفع کرکے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچاؤ واضح رہے کہ قرآن شریف میں الناس کا لفظ بمعنی دجال معہود بھی آتا ہے اور جس جگہ ان معنوں کو قرینہ قویّہ متعین کرے تو پھر اور معنے کرنا معصیت ہے چنانچہ قرآن شریف کے ایک اور مقام میں الناس کے معنے دجال ہی لکھا ہے اور وہ یہ ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ[1] یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اسرار اور عجائبات پر ہیں دجّال معہود کی

---

[1] المؤمن آیت ۵۸

طبائع کی بناوٹ اس کے برابر نہیں یعنی گو وہ لوگ اسرار زمین و آسمان کے معلوم کرنے میں کتنی ہی جانکاہی کریں اور کیسی ہی طبع وقاد لاویں پھر بھی ان کی طبیعتیں ان اسرار کے انتہا تک پہنچ نہیں سکتیں۔ یاد رہے کہ اس جگہ بھی مفسرین نے الناس سے مراد دجال معہود ہی لیا ہے دیکھو تفسیر معالم وغیرہ اور قرینہ قویہ اس پر یہ ہے کہ لکھا ہے کہ دجال معہود اپنی ایجادوں اور صنعتوں سے خدا تعالیٰ کے کاموں پر ہاتھ ڈالے گا اور اس طرح پر خدائی کا دعویٰ کریگا اور اس بات کا سخت حریص ہوگا کہ خدائی باتیں جیسے بارش برسانا اور پھل لگانا اور انسان وغیرہ حیوانات کی نسل جاری رکھنا اور سفر اور حضر اور صحت کے سامان فوق العادۃ طور پر انسان کے لیے مہیا کرنا ان تمام باتوں میں قادر مطلق کی طرح کارروائیاں کرے اور سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہو جائے اور کوئی بات اس کے آگے انہونی نہ رہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور خلاصہ مطلب آیت یہ ہے کہ زمین آسمان میں جس قدر اسرار رکھے گئے ہیں جن کو دجال بذریعہ علم طبعی اپنی قدرت میں کرنا چاہتا ہے وہ اسرار اس کے اندازہ جودت طبع اور مبلغ علم سے بڑھ کر ہیں۔ اور جیسا کہ آیت ممدوحہ میں الناس کے لفظ سے دجال مراد ہے ایسا ہی آیت اخرجت للناس میں بھی الناس کے لفظ سے دجال ہی مراد ہے کیونکہ تقابل کے قرینہ سے اس آیت کے یہ معنے معلوم ہوتے ہیں کہ کُنْتُمْ خَیْرَ النَّاسِ اُخْرِجَتْ لِشَرِّ النَّاسِ اور شر الناس سے بلاشبہ گروہ دجال مراد ہے کیونکہ حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ آدم سے قیامت تک شر انگیزی میں دجال کی مانند نہ کوئی ہوا اور نہ ہوگا اور یہ ایک ایسی محکم اور قطعی دلیل ہے کہ جس کے دونوں حصے یقینی اور قطعی اور عقائد مسلمہ میں سے ہیں۔ یعنی جیسا کہ کسی مسلمان کو اس بات سے انکار نہیں کہ یہ امت خیر الامم ہے اسی طرح اس بات سے بھی انکار نہیں کہ گروہ دجال شر الناس ہے اور اس تقسیم پر یہ دو آیتیں بھی دلالت کرتی ہیں جو سورۃ لَمْ یَکُنْ میں ہیں اور وہ یہ ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ[1] دیکھو اس آیت کے رو سے ایک ایسے گروہ کو شر البریہ کہا گیا ہے جس میں سے گروہ دجال ہے اور ایسے گروہ کو خیر البریہ کہا گیا ہے جو امت محمدیہ ہے بہر حال آیت خیر اُمّت کا لفظ الناس کے ساتھ مقابلہ ہو کر قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ الناس سے مراد دجال ہے اور یہی ثابت کرنا تھا۔ اور اس مقصد پر ایک یہ بھی بزرگ قرینہ ہے کہ خدا کی عادت حکیمانہ یہی چاہتی ہے کہ جس نبی کے عہد نبوت میں دجال پیدا ہوا اسی نبی کی امت کے بعض افراد اس فتنہ کے فرو کرنے والے ہوں نہ یہ کہ فتنہ تو پیدا ہووے عہد نبوت محمدیہ میں اور کوئی گذشتہ نبی اس کے فرو کرنے کے لیے نازل ہو اور یہی قدیم سے اور جب سے کہ شریعتوں کی بنیاد پڑی سنت اللہ ہے کہ جس کسی نبی کے عہد نبوت میں کوئی مفسد فرقہ پیدا ہوا اسی نبی کے بعض جلیل الشان وارثوں کو اس فساد کے فرو کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہاں اگر یہ فتنہ دجال کا حضرت مسیح کے عہد نبوت میں ہوتا تو ان کا حق تھا کہ خود وہ یا کوئی ان کے حواریوں اور خلیفوں میں سے اس فتنہ کو فرو کرتا مگر یہ کیا اندھیر کی بات ہے

---

[1] البینۃ آیت ۷،۸

کہ یہ امت کہلا وے تو خیر الامم مگر خدا تعالیٰ کی نظر میں اس قدر نالایق اور نکمی ہو کہ جب کسی فتنہ کے دور کرنے کا موقع آوے تو اس کے دور کرنے کے لیے کوئی شخص باہر سے مامور ہو اور اس امت میں کوئی ایسا لائق نہ ہو کہ اس فتنہ کو دور کر سکے گویا اس امت کی اس صورت میں وہ مثال ہوگی کہ مثلاً کوئی گورنمنٹ ایک نیا ملک فتح کرے جس کے باشندے جاہل اور نیم وحشی ہوں تو آخر اس گورنمنٹ کو مجبوری سے یہ کرنا پڑے کہ اس ملک کے مالی اور دیوانی اور فوجداری کے انتظام کے لیے باہر سے لائق آدمی طلب کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کرے۔ سو ہرگز عقل سلیم قبول نہیں کر سکتی کہ جس امت کے ربانی علماء کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ یعنی میری امت کے علماء اسرائیلی پیغمبروں کی طرح ہیں اخیر پر ان کی یہ ذلت ظاہر کرے کہ دجال جو خدائے عظیم للقدرت کی نظر میں کچھ بھی چیز نہیں اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے ان میں مادہ لیاقت نہ پایا جائے اس لیے ہم اسی طرح پر جیسا کہ آفتاب کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ آفتاب ہے اس آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کو پہچانتے ہیں اور اس کے یہی معنے کرتے ہیں کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِشَرِّ النَّاسِ الَّذِیْ هُوَ الدَّجَّالُ الْمَعْهُوْدُ۔ یاد رہے کہ ہر ایک امت سے ایک خدمت دینی لی جاتی ہے اور ایک قسم کے دشمن کے ساتھ اس کا مقابلہ پڑتا ہے سو مقدر تھا کہ اس امت کا دجال کے ساتھ مقابلہ پڑیگا جیسا کہ حدیث نافع بن عتبہ سے مسلم میں صاف لکھا ہے کہ تم دجال کے ساتھ لڑو گے اور فتح پاؤ گے۔ اگرچہ صحابہ دجال کے ساتھ نہیں لڑے مگر حسب منطوق آخرین منھم مسیح موعود اور اس کے گروہ کو صحابہ قرار دیا۔ اب دیکھو اس حدیث میں بھی لڑنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو جو امت ہیں قرار دیا۔ اور یہ نہ کہا کہ مسیح بنی اسرائیلی لڑے گا اور نزول کا لفظ محض اجلال اور اکرام کے لیے ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اُس پر فساد زمانہ میں ایمان ثریا پر چلا جائے گا اور تمام پیری مریدی اور شاگردی استادی اور افادہ استفادہ معرض زوال میں آجائے گا اس لیے آسمان کا خدا ایک شخص کو اپنے ہاتھ سے تربیت دیکر بغیر توسط زمینی سلسلوں کے زمین پر بھیجے گا جیسے کہ بارش آسمان سے بغیر توسط انسانی ہاتھوں کے نازل ہوتی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۰-۲۲)

اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا کہ میں اسی طور پر اس اُمت میں خلیفے پیدا کرتا رہوں گا جیسے موسیٰ کے بعد خلیفے پیدا کیے۔ تو دیکھنا چاہیئے کہ موسیٰ کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اُس نے صرف تیس ۳۰ برس تک خلیفے بھیجے یا چودہ سو برس تک اس سلسلہ کو لمبا کیا۔ پھر جس حالت میں خدا تعالیٰ کا فضل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں زیادہ تھا چنانچہ اُس نے خود

[1] عَنْ نَافِعِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْزُوْنَ جَزِيْرَةَ الْعَرَبِ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ فَارِسَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الرُّوْمَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الدَّجَّالَ فَيَفْتَحُهُ اللّٰهُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

مشکوٰۃ شریف باب الملاحم صفحہ ۴۶۶ مطبع مجتبائی۔ دہلی)

فرمایا وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا۔[5] اور ایسا ہی اس اُمت کی نسبت فرمایا وَکُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تو پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ حضرت موسٰی کے خلیفوں کا چودہ سو[14] برس تک سلسلہ ممتد ہو اور اس جگہ صرف تیس برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جائے اور نیز جبکہ یہ اُمت خلافت کے انوار روحانی سے ہمیشہ کے لیے خالی ہے تو پھر آیت اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ کے کیا معنے ہیں کوئی بیان تو کرے۔ مثل مشہور ہے کہ او خویشتن گم است کرا رہبری کند جبکہ اس امت کو ہمیشہ کے لیے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مُردہ رکھنا ہی مدنظر ہے تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو اور لوگوں کی بھلائی اور رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے ہو کیا معنی رکھتا ہے کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے۔ سواے لوگو جو مسلمان کہلاتے ہو برائے خدا سوچو کہ اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ ہمیشہ قیامت تک تم میں روحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی جو غیر مذہب والوں کو حق کی دعوت کرنے کے لیے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں پھر کیونکر کہتے ہو کہ خلافت صرف تیس برس تک ہو کر پھر زاویہ عدم میں مخفی ہو گئی۔ اِتَّقُوا اللّٰہ اِتَّقُوا اللّٰہ اِتَّقُوا اللّٰہ (شہادت القرآن ص۵۹)

ایسے شخص کو جو مریمی صفت سے محض خدا کے نفخ سے عیسوی صفت حاصل کرنے والا تھا اُس کا نام سورۃ تحریم میں ابن مریم رکھ دیا ہے کیونکہ فرمایا ہے کہ جبکہ مثالی مریم نے بھی تقوٰی اختیار کیا تو ہم نے اپنی طرف سے رُوح پھونک دی اس میں اشارہ تھا کہ مسیح ابن مریم میں کلمۃ اللہ ہونے کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ آخری مسیح بھی کلمۃ اللہ ہے اور روح اللہ بھی بلکہ ان دونوں صفات میں وہ پہلے سے زیادہ کامل ہے جیسا کہ سورۃ تحریم اور سورۃ فاتحہ اور سورۃ النور اور آئت کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ سے سمجھا جاتا ہے۔ (تریاق القلوب ص۱۵۹)

تمام انبیاء کے متفرق کمالات تھے اور متفرق طور پر اُن پر فضل اور انعام ہوا۔ اب اِس اُمّت کو یہ دعا سکھلائی گئی کہ اُن تمام متفرق کمالات کو مجھ سے طلب کرو پس ظاہر ہے کہ جب متفرق کمالات ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو وہ مجموعہ متفرق کی نسبت بہت بڑھ جائے گا اسی بنا پر کہا گیا کہ کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ۔ یعنی تم اپنے کمالات کی رُو سے سب اُمتوں سے بہتر ہو۔ (چشمہ مسیحی ص۶۵-۶۶)

اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان نبی مبعوث فرمایا جس کی امت کو کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ کہا کہ تم تمام امتوں سے بہتر ہو۔ کیونکہ وہ لوگ جن کو شریعت قصہ کے رنگ میں ملی تھی دماغی علوم کی کتاب و شریعت کے ماننے والوں کے کب برابر ہو سکتے ہیں پہلے صرف قصص پر راضی ہو گئے۔ اور ان کے دماغ اس قابل نہ تھے کہ حقائق و معارف کو سمجھ سکتے مگر اس امت کے دماغ اعلیٰ درجہ کے تھے اسی لیے شریعت اور کتاب علوم کا خزانہ ہے جو علوم قرآن مجید لیکر آیا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب میں پائے نہیں جاتے اور جیسے شریعت کے نزول کے وقت وہ اعلیٰ درجہ کے حقایق و معارف سے لبریز تھی ویسے ہی ضروری تھی ترقی علوم و فنون سب اسی زمانہ میں ہوتا بلکہ کمال انسانیت بھی اسی میں پورا ہوا۔ (الحکم جلد۷ نمبر۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء ص۹)

[5] النساء آیت ۱۱۴

اللہ تعالیٰ نے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ تو ہمیں ہی فرمایا ہے کیونکہ اعلیٰ درجہ کے خیر اور برکات تھے وہ اسی امت میں جمع ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ایسے وقت تک پہنچ گیا ہوا تھا کہ دماغی اور عقلی قویٰ پہلے کی نسبت بہت کچھ ترقی کر گئے تھے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

اگر نبوت کا دروازہ بالکل بند سمجھا جاوے تو نعوذ باللہ اس سے تو انقطاع فیض لازم آتا ہے۔ اور اس میں تو نحوست ہے۔ اور نبی کی ہتک شان ہوتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ جو کہا کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ۔ یہ جھوٹ تھا۔ نعوذ باللہ۔ اگر یہ معنی کیے جاویں کہ آئندہ کے واسطے نبوت کا دروازہ ہر طرح سے بند ہے تو پھر خیر الامۃ کی بجائے شر الامم ہوئی یہ امت۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ سے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی نصیب نہ ہوا تو یہ تو کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ[1] ہوئی اور بہائم سیرت اسے کہنا چاہیئے نہ کہ خیر الامم۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

اگر یہودی ضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ[2] کے مصداق ہو چکے ہیں اور نبوت اس خاندان سے منتقل ہو چکی ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ مسیح دوبارہ اسی خاندان سے آوے؟ اگر یہ تسلیم کیا جاویگا تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ادنیٰ نبی مانا جاوے اور اس امت کو بھی ادنیٰ اُمّت حالانکہ یہ قرآن شریف کے منشاء کے صریح خلاف ہے کیونکہ قرآن شریف نے تو صاف طور پر فرمایا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ پھر اس امت کو خیر الامۃ کی بجائے شر الامۃ کہو گے؟ اور اس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ پر حملہ ہوگا اگر یقیناً یہ سب جھوٹ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی اعلیٰ درجہ کی تھی اور ہے اس لیے کہ وہ اب تک اپنا اثر دکھا رہی اور تیرہ سو سال گزرنے کے بعد مطہر اور مقدس وجود پیدا کرتی ہے (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا کہ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ[3] اور دوسری طرف اس امت کو کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ کہا۔ تا کہ یہودیوں پر زد ہو۔ مگر میرے مخالف عجیب بات کہتے ہیں کہ یہ امت باوجود خیر الامۃ ہونے کے پھر شر الامۃ ہے۔ بنی اسرائیل میں تو عورتوں تک کو شرف مکالمہ الٰہیہ دیا گیا مگر اس امت کے مرد بھی خواہ کیسے ہی متقی ہوں اور خدا تعالیٰ کی رضا جوئی میں مریں اور مجاہدہ کریں مگر ان کو حصہ نہیں دیا جائے گا اور یہی جواب ان کے لیے خدا کی طرف سے ہے کہ بس تمہارے لیے مُہر لگ چکی!!! اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گستاخی اور اس پر سوءِ ظن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور اسلام کی ہتک کیا ہوگی؟ دوسری قوموں کو ملزم کرنے کے لیے یہی تو زبردست اور بے مثل اوزار ہمارے ہاتھ میں ہے اور اسی کو تم ہاتھ سے دیتے ہو۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت اکثر یہود اور نصاریٰ فاسق تھے جیسا کہ قرآن شریف صاف گواہی دیتا ہے کہ وَاَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ پس جبکہ اکثر لوگ ان میں فاسق تھے جنہوں نے عملی طور پر توحید کے آداب اور

---

[1] الاعراف آیت ۱۸۰ ٭ [2] البقرہ آیت ۶۲ ٭ [3] الکوثر آیت ۲

اعمال صالحہ کو چھوڑ دیا تھا اس لیے خدا کے رحم نے ان کی اصلاح کے لیے اپنی سنّت قدیمہ کے موافق یہی تقاضا کیا کہ اُن کی طرف رسول بھیجے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۰)

(آل عمران: ۱۱۳) ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ‌ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝

اُن پر ذلّت کی مار ڈالی گئی یعنی جہاں رہیں گے ذلیل اور محکوم بن کر رہیں گے اور اُن کے لیے یہ مقرر کیا گیا ہے کہ بجز کسی قوم کے ماتحت رہنے کے کسی ملک میں خود بخود عزت کے ساتھ نہیں رہیں گے ہمیشہ کمزوری اور ناتوانی اور بدبختی اُن کے شامل رہے گی وجہ یہ کہ وہ خدا کے نشانوں سے انکار کرتے رہے ہیں اور خدا کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے تھے یہ اس لیے کہ وہ معصیت اور نافرمانی میں حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

(آل عمران: ۱۱۵) يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝

زبان کو جیسے خدا تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف کسی بات کے کہنے سے روکنا ضروری ہے اسی قدر امر حق کے اظہار کے لیے کھولنا لازمی امر ہے يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ مومنوں کی شان ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنی عملی حالت ثابت کر دکھائے کہ وہ اس قوت کو اپنے اندر رکھتا ہے کیونکہ اس سے پیشتر کہ وہ دوسروں پر اپنا اثر ڈالے اس کو اپنی حالت پر اثر انداز بھی تو بنانی ضروری ہے پس یاد رکھو کہ زبان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی مت روکو ہاں محل اور موقع کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اور انداز بیان ایسا ہونا

چاہیئے جو نرم ہو اور سلاست اپنے اندر رکھتا ہو۔ اور ایسا ہی تقویٰ کے خلاف بھی زبان کا کھولنا سخت گناہ ہے۔

(الحکم جلدہ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ۖ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ○

یعنی یہود اور نصاریٰ سے محبت مت کرو اور ہر ایک شخص جو صالح نہیں اُس سے محبت مت کرو۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۹)

إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ○

اگر تم صبر کرو گے اور ہر یک طور کی بے صبری اور اضطراب سے پرہیز کرو گے تو اُن لوگوں کے مکر کچھ بھی تمہارا بگاڑ نہیں سکیں گے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○

لَا نَحْتَاجُ إِلَى الْحُسَامِ وَلَا إِلَى حِزْبٍ مِّنْ مُّحَارِبِينَ۔ وَلِأَجْلِ ذَالِكَ اخْتَارَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ لِبَعْثِ الْمَسِيْحِ

(ترجمہ) ہم تلوار اور لڑنے والے گروہ کے محتاج نہیں اور اسی لیے خدا تعالیٰ نے مسیح موعود کی بعثت کے لیے صدیوں کے

اَلْمَوْعُوْدِ عِدَّةً مِّنَ الْمِاٰتِ۔ كَعِدَّةِ لَيْلَةِ الْبَدْرِ مِنْ هِجْرَةِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْكَائِنَاتِ۔ لِتَدُلَّ تِلْكَ الْعِدَّةُ عَلٰى مَرْتَبَةِ كَمَالٍ تَامٍّ مِّنْ مَّرَاتِبِ التَّرَقِّيَاتِ۔ وَهِيَ اَرْبَعُ مِائَةٍ بَعْدَ الْاَلْفِ مِنْ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔ لِيَتِمَّ وَعْدُ اِظْهَارِ الدِّيْنِ الَّذِيْ سَبَقَ فِي الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ۔ اَعْنِيْ قَوْلَهٗ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ۔ فَانْظُرْ اِلٰى هٰذِهِ الْاٰيَةِ كَالْمُبْصِرِيْنَ۔ فَاِنَّهَا تَدُلُّ عَلَى الْبَدْرَيْنِ بِالْيَقِيْنِ۔ بَدْرٌ مَّضَتْ لِنَصْرِ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَبَدْرٌ كَانَتْ اٰيَةً لِّلْاٰخِرِيْنَ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِشَارَةً لَطِيْفَةً اِلَى الزَّمَانِ الْاٰتِي الَّذِيْ يُشَابِهُ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عِدَّةً اَعْنِيْ سَنَةَ اَرْبَعِ مِائَةٍ بَعْدَ الْاَلْفِ وَهِيَ لَيْلَةُ الْبَدْرِ اِسْتِعَارَةً۔ عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَاِنْ كَانَ لِلْاٰيَةِ مَعْنًى اٰخَرُ يَتَعَلَّقُ بِالزَّمَانِ الْمَاضِيْ مَعَ هٰذَا الْمَعْنٰى كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْعَالَمِيْنَ۔ فَاِنَّ لِلْاٰيَةِ وَجْهَيْنِ۔ وَالنَّصْرُ نَصْرَانِ۔ وَالْبَدْرُ بَدْرَانِ۔ بَدْرٌ تَتَعَلَّقُ بِالْمَاضِيْ وَبَدْرٌ تَتَعَلَّقُ بِالْاِسْتِقْبَالِ مِنَ الزَّمَانِ۔ عِنْدَ ذِلَّةٍ تُصِيْبُ الْمُسْلِمِيْنَ كَمَا تَرَوْنَ فِيْ هٰذَا الْاَوَانِ۔ وَكَانَ الْاِسْلَامُ بَدَءَ كَالْهِلَالِ۔ وَكَانَ قُدِّرَ اَنَّهٗ سَيَكُوْنُ بَدْرًا فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَالْمَآلِ۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ۔ فَاقْتَضَتْ حِكْمَةُ اللّٰهِ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِسْلَامُ بَدْرًا فِيْ مِائَةٍ تُشَابِهُ الْبَدْرَ عِدَّةً۔ فَاِلَيْهِ اَشَارَ

شمار کو رسول کریم کی ہجرت کے بدر کی راتوں کے شمار کی مانند اختیار فرمایا تا وہ شمار اس مرتبہ پر جو ترقیات کے تمام مرتبوں سے کمال تام رکھتا ہے دلالت کرے اور وہ چار سو کا شمار خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے بعد ہے تا دین کے غلبہ کا وعدہ جو کتاب مبین میں پہلے ہو چکا تھا پورا ہو جائے یعنی خدا تعالیٰ کا یہ قول کہ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ پس بیناؤں کی طرح اس آیت میں نگاہ کر کیونکہ یہ آیت یقیناً دو بدر پر دلالت کرتی ہے اول وہ بدر جو پہلوں کی نصرت کے لیے گذرا اور دوسرا وہ بدر جو پچھلوں کے لیے ایک نشان ہے پس کوئی شک نہیں کہ یہ آیت ایک لطیف اشارہ اس آیندہ زمانے کی طرف کرتی ہے جو شمار کے رو سے شب بدر کی مانند ہو اور وہ چار سو برس ہزار برس کے بعد ہے اور یہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ کے نزدیک شب بدر ہے اور ان سب کے باوجود ہم کو یہ بھی اعتراف ہے کہ اس آیت کے اور معنے بھی ہیں جو گذشتہ زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ عالموں کو معلوم ہے کیونکہ اس آیت کے دو رخ ہیں۔ اور نصرت دو نصرتیں اور بدر دو بدر ہیں ایک بدر گذشتہ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا بدر آیندہ زمانہ سے اس وقت جبکہ مسلمانوں کو ذلت پہنچے جیسا کہ اس زمانہ میں دیکھتے ہو اور اسلام ہلال کی طرح شروع ہوا اور مقدر تھا کہ انجام کار آخر زمانہ میں بدر ہو جائے خدا تعالیٰ کے حکم سے۔ پس خدا تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ اسلام اس صدی میں بدر کی شکل اختیار کرے جو شمار کے رو سے بدر کی طرح مشابہ ہو پس انہی معنوں کی طرف اشارہ ہے خدا تعالیٰ کے اس قول میں کہ لَقَدْ نَصَرَكُمْ

فِیْ قَوْلِہٖ لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ فَفَکِّرْ بِفِکْرَۃٍ کَامِلَۃٍ وَّلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ۔ وَاِنَّ لَفْظَ لَقَدْ نَصَرَکُمْ قَدْ اَتٰی ھٰنَا عَلٰی وَجْہِ الْاِسْتِقْبَالِ اَعْنِیْ بِمَعْنٰی یَنْصُرُکُمْ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْعَارِفِیْنَ۔ فَحَاصِلُ الْکَلَامِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ قَدْ قَدَّرَ لِلْاِسْلَامِ الْعِزَّتَیْنِ بَعْدَ الذِّلَّتَیْنِ عَلٰی رَغْمِ الْیَھُوْدِ الَّذِیْنَ کَانَ قَدَّرَ لَھُمُ الذِّلَّتَیْنِ بَعْدَ الْعِزَّتَیْنِ نَکَالًا مِّنْ عِنْدِہٖ کَمَا تَقْرَءُوْنَ فِیْ سُوْرَۃِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ قِصَّۃَ الْفَاسِقِیْنَ مِنْھُمْ وَالظَّالِمِیْنَ۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۸۲-۱۸۵)

وَاِنَّ مُوْسٰی وَمُحَمَّدًا عَلَیْھِمَا صَلَوَاتُ الرَّحْمٰنِ مُتَمَاثِلَانِ بِنَصِّ الْفُرْقَانِ وَاِنَّ سِلْسِلَۃَ ھٰذِہِ الْخِلَافَۃِ تُشَابِہُ سِلْسِلَۃَ تِلْکَ الْخِلَافَۃِ۔ کَمَا ھِیَ مَذْکُوْرَۃٌ فِی الْقُرْاٰنِ۔ وَفِیْھَا لَا یَخْتَلِفُ اِثْنَانِ۔ وَقَدِ اخْتُتِمَتْ مِئَاتُ سِلْسِلَۃِ خُلَفَاءِ مُوْسٰی عَلٰی عِیْسٰی کَمِثْلِ عِدَّۃِ اَیَّامِ الْبَدْرِ۔ فَکَانَ مِنَ الْوَاجِبِ اَنْ یَّظْھَرَ مَسِیْحُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ فِیْ مُدَّۃٍ ھِیَ کَمِثْلِ ھٰذَا الْقَدْرِ۔ وَقَدْ اَشَارَ اِلَیْہِ الْقُرْاٰنُ فِیْ قَوْلِہٖ لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ۔ وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ ذُو الْوُجُوْہِ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْعُلَمَاءِ الْاَجِلَّۃِ۔ فَالْمَعْنَی الثَّانِیْ لِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ فِیْ ھٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ اللّٰہَ یَنْصُرُ الْمُؤْمِنِیْنَ بِظُھُوْرِ الْمَسِیْحِ اِلَی الْمِئِیْنَ تُشَابِہُ عِدَّتُھَا اَیَّامَ الْبَدْرِ التَّامِّ۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَذِلَّۃٌ فِیْ تِلْکَ

اللّٰہُ بِبَدْرٍ۔ پس اس امر میں باریک نظر سے غور کر اور غافلوں سے نہ ہو اور بے شک لَقَدْ نَصَرَکُمْ کا لفظ یہاں دوسری وجہ کے رو سے یَنْصُرُکُمْ کے معنوں میں آیا ہے جیسا کہ عارفوں پر ظاہر ہے۔ الغرض خدا تعالیٰ نے اسلام کے لیے دو ذلت کے بعد دو عزتیں رکھی تھیں۔ یہود کے برخلاف کہ ان کے لیے سزا کے طور پر دو عزتوں کے بعد دو ذلتیں مقرر کی تھیں جیسا کہ بنی اسرائیل کی سورۃ میں اُن کے فاسقوں اور ظالموں کا قصہ پڑھتے ہو۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۸۲ تا ص۱۸۵)

(ترجمہ) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو پر خدائے رحمان کا درود اور سلام ہو۔ قرآنی نص کے رُو سے ایک دوسرے کے مثیل ہیں اور اس خلافت کا سلسلہ اس سلسلہ خلافت سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اس سلسلہ کا ذکر موجود ہے اور اس بارہ میں کوئی دو آدمی مختلف نہیں۔ اور خلفاء موسیٰ کے سلسلہ کی صدیاں چودھویں کے چاند کی گنتی کے مطابق حضرت عیسےٰ پر ختم ہو گئیں پس ضروری تھا کہ اس امت کا مسیح اسی قدر عرصہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ظاہر ہو اور اس کی طرف قرآن مجید نے آیت کریمہ وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ میں اشارہ کیا ہے اور جیسا کہ جلیل القدر عالموں پر مخفی نہیں قرآن کریم ذوالوجوہ ہے سو اس جگہ اس آیت کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان صدیوں کے اختتام پر جن کی گنتی بدر کامل کے دنوں کے مشابہ ہے مسیح موعود کے ظہور سے مومنوں کی مدد فرمائے گا درانحالیکہ مومن اس زمانہ میں حقیر ہوں گے پس اس آیت کو دیکھو کہ کس طرح ترقی کے بعد

اَلْاَیَّامِ۔ فَانْظُرْ اِلٰی هٰذِهِ الْاٰیَةِ کَیْفَ تُشِیْرُ اِلٰی ضُعْفِ الْاِسْلَامِ۔ ثُمَّ تُشِیْرُ اِلٰی کَوْنِ هِلَالِهٖ بَدْرًا فِیْ اَجَلٍ مُّسَمًّی مِّنَ اللّٰهِ الْعَلَّامِ۔ کَمَا هُوَ مَفْهُوْمٌ مِّنْ لَّفْظِ الْبَدْرِ۔ (اعجاز المسیح ص۱۸۲-۱۸۴)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت موسیٰ سے ہے تو اس مماثلت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اس صدی کا مجدد مسیح ہو کیونکہ مسیح (چودھویں صدی پر موسیٰ کے بعد آیا تھا۔ اور آج کل چودھویں صدی ہے چودہ کے عدد کو بڑی مناسبت ہے چودھویں صدی کا چاند کامل ہوتا ہے اسی کی طرف اللہ نے لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ میں اشارہ کیا ہے یعنی ایک بدر تو وہ تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے اپنے مخالفوں پر فتح پائی۔ اس وقت بھی آپ کی جماعت قلیل تھی اور ایک بدر یہ ہے بدر میں چودھویں صدی کی طرف اشارہ ہے اس وقت بھی اسلام کی حالت اذلہ کی ہو رہی ہے سو ان سارے وعدوں کے موافق اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔ (الحکم جلد ۷ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء ص۳)

دیکھو کہ صحابہ کو بدر میں نصرت دی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ نصرت ایسے وقت میں دی گئی جبکہ تم تھوڑے تھے اس بدر میں کفر کا خاتمہ ہو گیا۔ بدر پر ایسے عظیم الشان نشان کے اظہار میں آیندہ کی بھی ایک خبر رکھی گئی تھی اور وہ یہ کہ بدر چودھویں کے چاند کو بھی کہتے ہیں اس سے چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کے اظہار کی طرف بھی ایما ہے۔ اور یہ چودھویں صدی وہی صدی ہے جس کے لیے عورتیں تک کہتی تھیں کہ چودھویں صدی خیر و برکت کی آئے گی۔ خدا کی باتیں پوری ہوئیں اور چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ کے منشا کے موافق اسم احمد کا بروز ہوا۔ اور وہ میں ہوں جس کی طرف اس واقعہ بدر میں پیشگوئی تھی جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا۔ مگر افسوس کہ جب وہ دن آیا اور چودھویں کا چاند نکلا تو دوکاندار خود غرض کہا گیا۔ افسوس ان پر جنہوں نے دیکھا اور نہ دیکھا وقت پایا اور نہ پہچانا۔ وہ مر گئے جو منبروں پر چڑھ چڑھ کر رویا کرتے تھے کہ چودھویں صدی میں یہ ہوگا۔ اور وہ رہ گئے جو اب ممبروں پر چڑھ کر کہتے ہیں کہ جو آیا ہے وہ کاذب ہے!!!
ان کو کیا ہو گیا یہ کیوں نہیں دیکھتے اور کیوں نہیں سوچتے۔

اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے بدر ہی میں مدد کی تھی اور وہ مدد اَذِلَّةٌ کی مدد تھی جس وقت ۳۱۳ آدمی صرف میدان میں آئے تھے اور کُل دو تین لکڑی کی تلواریں تھیں اور ان ۳۱۳ میں زیادہ تر چھوٹے بچے تھے اس سے زیادہ کمزوری کی حالت کیا ہوگی۔ اور دوسری طرف ایک بڑی بھاری جمعیت تھی اور وہ سب کے سب چیدہ چیدہ جنگ آزمودہ اور بڑے بڑے جوان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ظاہری سامان کچھ نہ تھا اُس وقت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ پر دعا کی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ اَهْلَکْتَ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا یعنی اے اللہ اگر آج تو نے اس

اسلام کے ضعیف ہو جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے پھر یہی آیت خدائے علیم و خبیر کی طرف سے مقرر کردہ مدت میں ہلالِ اسلام کے بدر بن جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسا کہ آیت میں لفظ بدر سے سمجھا جاتا ہے۔ (اعجاز المسیح ۱۸۲-۱۸۴)

جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر کوئی تیری عبادت کرنے والا نہ رہے گا۔

سنو! میں بھی یقیناً اُسی طرح کہتا ہوں کہ آج وہی بدر کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ایک جماعت طیار کر رہا ہے وہی بدر اور اذلّۃ کا لفظ موجود ہے کیا یہ جھوٹ ہے کہ اسلام پر ذلت نہیں آئی؟ نہ سلطنت ظاہری میں شوکت ہے ایک یوروپ کی سلطنت منہ دکھاتی ہے تو بھاگ جاتے ہیں اور کیا مجال ہے جو سر اٹھائیں، اس ملک کا کیا حال ہے؟ کیا اذلّۃ نہیں ہیں ہندو بھی اپنی طاقت میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں کوئی ایک ذلت ہے جس میں ان کا نمبر بڑھا ہوا ہے جس قدر ذلیل سے ذلیل پیشے ہیں وہ ان میں پاؤ گے ٹکڑ گدا مسلمان ہی ملیں گے۔ جیل خانوں میں جاؤ تو جرائم پیشہ گرفتار مسلمان ہی پاؤ گے شراب خانوں میں جاؤ کثرت سے مسلمان اب بھی کہتے ہیں ذلت نہیں ہوئی؟ کروڑہا ناپاک اور گندی کتابیں اسلام کے ردّ میں تالیف کی گئیں۔ ہماری قوم میں مغل، سید کہلانے والے اور شریف کہلانے والے عیسائی ہو کر اُسی زبان سے سید المعصومین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کوسنے لگے صفدر علی اور عماد الدین وغیرہ کون تھے اُمہات المومنین کا مصنف کون ہے؟ جس پر اس قدر واویلا اور شور مچایا گیا اور آخر کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس پر بھی کہتے ہیں کہ ذلت نہیں ہوئی کیا تم تب خوش ہوتے کہ اسلام کا اتنا رہا سہا نام بھی باقی نہ رہتا تب محسوس کرتے کہ ہاں اب ذلت ہوئی ہے!!! آہ! میں تم کو کیونکر دکھاؤں جو اسلام کی حالت ہو رہی ہے دیکھو! میں پھر کھول کر کہتا ہوں کہ یہی بدر کا زمانہ ہے اسلام پر ذلت کا وقت آچکا ہے مگر اب خدا نے چاہا ہے کہ اس کی نصرت کرے چنانچہ اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اسلام کو براہین اور حجج ساطعہ کے ساتھ تمام ملتوں اور مذہبوں پر غالب کر کے دکھا دوں اللہ تعالیٰ نے اس مبارک زمانہ میں چاہا ہے کہ اس کا جلال ظاہر ہو اب کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴-۵)

اس آیت میں بھی در اصل ایک پیشگوئی مرکوز تھی یعنی جب چودھویں صدی میں اسلام ضعیف اور ناتوان ہو جاوے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس وعدہ حفاظت کے موافق اس کی نصرت کرے گا۔ پھر تم کیوں تعجب کرتے ہو کہ اس نے اسلام کی نصرت کی؟ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

۱۳۵ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

دوسری قسم ان اخلاق کی (ہے) جو ایصال خیر سے تعلق رکھتے ہیں پہلا خلق ان میں سے عفو ہے یعنی کسی کے گناہ کو بخش دینا اس میں ایصال خیر یہ ہے کہ جو گناہ کرتا ہے وہ ایک ضرر پہنچاتا ہے اور اس لائق ہوتا ہے کہ اس کو بھی ضرر پہنچایا جائے سزا دلائی جائے قید کرایا جائے جرمانہ کرایا جائے یا آپ ہی اس پر ہاتھ اُٹھایا جائے پس اس کو بخش دینا

اگر بخش دینا مناسب ہو تو اس کے حق میں ایصال خیر ہے۔ اس میں قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے۔ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ[1]۔ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ[2] یعنی نیک آدمی وہ ہیں جو غصہ کھانے کے محل پر اپنا غصہ کھا جاتے ہیں اور بخشنے کے محل پر گناہ کو بخشتے ہیں۔ بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو لیکن جو شخص گناہ کو بخش دے اور ایسے موقع پر بخشے کہ اس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو یعنی عین عفو کے محل پر ہو نہ غیر محل پر تو اس کا وہ بدلہ پائے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محل اور موقع گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا ہے پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے پس خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ اندھوں کی طرح صرف گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں۔ پس جو امر محل اور موقع کے مناسب ہو وہی کرو۔ افراد انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں یہاں تک کہ دادوں پردادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس عادت کے افراط سے دیوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور ایسے قابل شرم حلم اور عفو اور درگذران سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیت اور غیرت اور عفت کے برخلاف ہوتے ہیں بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اٹھتے ہیں انہیں خرابیوں کے لحاظ سے قرآن کریم میں ہر ایک خُلق کے لیے محل اور موقع کی شرط لگا دی ہے اور ایسے خُلق کو منظور نہیں رکھا جو بے محل صادر ہو۔

یاد رہے کہ مجرد عفو کو خُلق نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ایک طبعی قوت ہے جو بچوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچہ کو جس کے ہاتھ سے چوٹ لگ جائے خواہ شرارت سے ہی لگے تھوڑی دیر کے بعد وہ اس قصّہ کو بھلا دیتا ہے اور پھر اس کے پاس محبت سے جاتا ہے اور اگر ایسے شخص نے اس کے قتل کا بھی ارادہ کیا ہو تب بھی صرف میٹھی بات پر خوش ہو جاتا ہے پس ایسا عفو کسی طرح خُلق میں داخل نہیں ہوگا۔ خلق میں اس صورت میں داخل ہوگا جب ہم اس کو محل اور موقع پر استعمال کرینگے ورنہ صرف ایک طبعی قوت ہوگی۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۲-۴۴)

یعنی مومن وہی ہیں جو غصّہ کو کھا جاتے ہیں اور یاوہ گو اور ظالم طبع لوگوں کے حملوں کو معاف کر دیتے ہیں اور بیہودگی کا بیہودگی سے جواب نہیں دیتے۔ (تبلیغ رسالت جلد ۳ (مجموعہ اشتہارات) صفحہ ۱۹۵ حاشیہ)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ...... وہ تکلیفوں اور کم آمدنی کی حالت میں اور قحط کے دنوں میں سخاوت سے تنگ دل نہیں ہو جاتے بلکہ تنگی کی حالت میں بھی اپنے مقدور کے موافق سخاوت کرتے رہتے ہیں وہ کبھی پوشیدہ

---

[1] آل عمران آیت ۱۳۵ ؛ [2] الشوریٰ آیت ۴۱ ؛

خیرات کرتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اس لیے کہ تا ریاکاری سے بچیں اور ظاہر اس لیے کہ تا دوسروں کو ترغیب دیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۴۷و۴۹)

یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا عفو کے لائق ہے یا نہیں مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں بعض تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی ہے جو غصہ تو لاتی ہے لیکن وہ معافی کے قابل ہوتے ہیں اور (بعض) ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی کسی شرارت پر چشم پوشی کی جاوے اور اُس کو معاف کر دیا جاوے تو وہ زیادہ دلیر ہو کر مزید نقصان کا باعث بنتا ہے مثلاً ایک خدمتگار ہے جو بڑا نیک اور فرماں بردار ہے وہ چاء لایا اتفاق سے اس کو ٹھوکر لگی اور چاء کی پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور چاء بھی مالک پر گر گئی اگر اس کو مارنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور تیز و تند ہو کر اس پر جا پڑے تو یہ سفاہت ہوگی۔ یہ عفو کا مقام ہے کیونکہ اس نے عمداً شرارت نہیں کی ہے۔ اور عفو اس کو زیادہ شرمندہ کرنا اور آئندہ کے لیے محتاط بناتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا شریر ہے کہ وہ ہر روز توڑتا ہے اور یوں نقصان پہنچاتا ہے تو اس پر رحم یہی ہوگا کہ اس کو سزا دی جاوے۔ (الحکم جلد ۵ ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۱ء ص۴)

ہماری شریعت کا یہ حکم ہے کہ موقع دیکھو۔ اگر نرمی کی ضرورت ہے خاک سے مل جاؤ۔ اگر سختی کی ضرورت ہے سختی کرو۔ جہاں عفو سے صلاحیت پیدا ہوتی ہو وہاں عفو سے کام لو۔ نیک اور باحیا خدمتگار اگر قصور کرے تو بخش دو مگر بعض ایسے خیرہ طبع ہوتے ہیں کہ ایک دن بخشو تو دوسرے دن دُگنا بگاڑ کرتے ہیں وہاں سزا ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء ص۴)

کہتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوکر چاء کی پیالی لایا جب قریب آیا تو غفلت سے وہ پیالی آپ کے سر پر گر پڑی آپ نے تکلیف محسوس کر کے ذرا تیز نظر سے غلام کی طرف دیکھا غلام نے آہستہ سے پڑھا اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ یہ سُن کر امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کَظَمْتُ غلام نے پھر کہا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ۔ کَظْم میں انسان غصہ دبا لیتا ہے اور اظہار نہیں کرتا ہے مگر اندر سے پوری رضامندی نہیں ہوتی اس لیے عفو کی شرط لگا دی ہے آپ نے کہا کہ میں نے عفو کیا پھر پڑھا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ محبوب الٰہی وہ ہوتے ہیں جو کظم اور عفو کے بعد نیکی بھی کرتے ہیں آپ نے فرمایا جا آزاد بھی کیا راستبازوں کے نمونے ایسے ہیں کہ چاء کی پیالی گرا کر آزاد ہوا۔ اب بتاؤ کہ یہ نمونہ اصول کی عمدگی ہی سے پیدا ہوا۔ (الحکم ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء ص۳)

اہل التقویٰ کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ غربت اور مسکینی میں اپنی زندگی بسر کرے یہ ایک تقویٰ کی شاخ ہے جس کے ذریعہ ہمیں غضب ناجائز کا مقابلہ کرنا ہے بڑے بڑے عارف اور صدیقوں کے لیے آخری اور کڑی منزل غضب سے ہی بچنا ہے۔ عُجب و پندار غضب سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی کبھی خود غضب عُجب و پندار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ غضب اُس وقت ہوگا جب انسان اپنے نفس کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص۴۹)

یاد رکھو کہ عقل اور جوش میں خطرناک دشمنی ہے جب جوش اور غصہ آتا ہے تو عقل قایم نہیں رہ سکتی لیکن جو صبر کرتا ہے اور بردباری کا نمونہ دکھاتا ہے اس کو ایک نور دیا جاتا ہے جس سے اس کی عقل و فکر کی قوتوں میں ایک نئی روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر نور سے نور پیدا ہوتا ہے غصہ اور جوش کی حالت میں چونکہ دل و دماغ تاریک ہوتے ہیں اس لیے پھر تاریکی سے تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵-۶)

یاد رکھو جو شخص سختی کرتا اور غضب میں آجاتا ہے اُس کی زبان سے معارف اور حکمت کی باتیں ہرگز نہیں نکل سکتیں وہ دل حکمت کی باتوں سے محروم کیا جاتا ہے جو اپنے مقابل کے سامنے جلدی طیش میں آکر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ گندہ دہن اور بے لگام کے ہونٹ لطائف کے چشمہ سے بے نصیب اور محروم کئے جاتے ہیں غضب اور حکمت دونو جمع نہیں ہو سکتے جو مغضوب الغضب ہوتا ہے اُس کی عقل موٹی اور فہم کُند ہوتا ہے۔ اُس کو کبھی کسی میدان میں غلبہ اور نصرت نہیں دئے جاتے۔ غضب نصف جنون ہے جب یہ زیادہ بھڑکتا ہے تو پورا جنون ہو سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

مرد کو چاہیئے کہ اپنے قویٰ کو برمحل اور حلال موقع پر استعمال کرے۔ مثلاً ایک قوت غضبی ہے جب وہ اعتدال سے زیادہ ہو تو جنون کا پیش خیمہ ہوتی ہے جنون میں اور اس میں بہت تھوڑا فرق ہے جو آدمی شدید الغضب ہوتا ہے اُس سے حکمت کا چشمہ چھین لیا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی مخالف ہو تو اس سے بھی مغلوب الغضب ہو کر گفتگو نہ کرے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۴)

دو قوتیں انسان کو منجر بہ جنون کر دیتی ہیں۔ ایک بدظنی اور ایک غضب جبکہ افراط تک پہنچ جاویں۔ ..... پس لازم ہے کہ انسان بدظنی اور غضب سے بہت بچے۔

سوائے راست بازوں کے باقی جس قدر لوگ دنیا میں ہوتے ہیں ہر ایک کچھ نہ کچھ حصہ جنون کا رکھتا ہے جس قدر قویٰ ان کے ہوتے ہیں ان میں ضرور افراط تفریط ہوتی ہے اور اس سے جنون ہوتا ہے۔

غضب اور جنون میں فرق یہ ہے کہ اگر سرسری دورہ ہو تو اسے غضب کہتے ہیں اور اگر وہ مستقل استحکام پکڑ جاوے تو اس کا نام جنون ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۴۱)

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ یعنی مومن وہ ہیں جو غصہ کھا جاتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ عفو اور درگذر سے پیش آتے ہیں۔ اور اگرچہ انجیل میں بھی عفو اور درگذر کی تعلیم ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں مگر وہ یہودیوں تک محدود ہے دوسروں سے حضرت عیسیٰ نے اپنی ہمدردی کا کچھ واسطہ نہیں رکھا اور صاف طور پر فرما دیا کہ مجھے بجز بنی اسرائیل کے دوسروں سے کچھ غرض نہیں خواہ وہ غرق ہوں خواہ نجات پاویں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۰)

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟ وَلَمْ يُصِرُّوْا

عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ○

اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کا کام کریں یا اپنی جانوں پر ظلم کریں اور پھر اپنے ایسے حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور اُس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگیں اور اپنے گناہ پر اصرار نہ کریں ان کا خدا آمرزگار ہوگا اور گناہ بخش دیگا .... ظاہر ہے کہ جیسے خدا انسان کا اس طور سے مالک ہے کہ اگر چاہے تو اُس کے گناہ پر اُس کو سزا دے ایسا ہی اِس طور سے بھی اُس کا مالک ہے کہ اگر چاہے تو اُس کا گناہ بخش دے کیونکہ ملکیت تبھی متحقق ہوتی ہے کہ جب مالک دونوں پہلوؤں پر قادر ہو۔ (چشمہ معرفت ص۱۷-۱۸)

۱۴۰ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ○

اور سُست مت ہو اور غم مت کرو اور انجام کار غلبہ تمہیں کو ہوگا اگر تم ایمان پر قائم رہو گے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۳۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

اے مومنو مقابلہ سے ہمت مت ہارو اور کچھ اندیشہ مت کرو اور انجام کار غلبہ تمہیں کا ہے اگر تم واقعی طور پر مومن ہو۔

(آسمانی فیصلہ ص۲۷ بار سوم ۱۹۰۱ء)

۱۴۱ اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ○

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ نشان بھی ہوتے ہیں اور ان میں التباس بھی ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگا گیا تو کہا کہ خدا قادر ہے۔ خواہ آسمان سے نشان دکھلاوے یا بعض کو بعض سے جنگ کرا کر نشان دکھاوے چنانچہ جنگوں میں صحابہ بھی قتل ہوئے بعض کمزور ایمان والوں نے اعتراض کیا کہ اگر یہ عذاب ہے تو ہم میں سے لوگ کیوں مرتے ہیں اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ الخ پس اگر ہماری جماعت میں سے کوئی بھی نہ مرے اور کل قومیں مرتی رہیں تو کل دنیا ایک ہی دفعہ راہ راست پر آجائے اور بجز اسلام کے اور کوئی مذہب دنیا پر نہ رہے حتیٰ کہ گورنمنٹ کو بھی مسلمان ہونا پڑے۔ اور یہی سِر تھا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بھی فوت ہوئے تھے۔ ہاں سلامتی کا حصّہ نسبتاً ہماری طرف زیادہ رہے گا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۸)

خدا تعالیٰ نشانوں میں قیامت کا نمونہ دکھانا نہیں چاہتا اور نہ کبھی ایسا ہوا، بلکہ اُن میں کسی حد تک خفا ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں سے بھی بعض ان جنگوں میں شہید ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی لیکن انجام نے دکھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان کیسا عظیم الشان تھا۔ اسی طرح پر یہاں بھی ہے سلامتی کا حصّہ نسبتاً ہماری ہی طرف زیادہ ہوگا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

اور ہم یہ دن لوگوں میں پھیرتے رہتے ہیں یعنی کبھی کسی کی نوبت آتی ہے اور کبھی کسی کی اور عنایات الٰہیہ نوبت بہ نوبت اُمّت محمدیہ کے مختلف افراد پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۰۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر۳)

اللہ تعالیٰ کا یہ خاصہ ہے۔ کہ پُرانے خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اور کو لے لیتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل کو لے لیا۔ کیونکہ وہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ کر خدا کو بھول گئے ہوئے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ (ص ۴)

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲)

یاد رکھو کہ خدا سب کچھ آپ کرتا ہے ہم اور ہماری جماعت اگر سب کے سب حجروں میں بیٹھ جاویں تب بھی کام ہو جاوے گا اور دجال کو زوال آوے گا تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا اس کا کمال بتاتا ہے کہ اب اس کے زوال کا وقت ہے اس کا ارتفاع ظاہر کرتا ہے کہ اب وہ نیچا دیکھے گا۔ اس کی آبادی اس کی بربادی کا نشان ہے ہاں ٹھنڈی ہوا چل پڑی ہے۔ خدا کے کام آہستگی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

یہودی کہتے ہیں کہ بنی اسماعیل کو نبوت کیوں ملی۔ وہ نہیں جانتے تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ خدا تعالیٰ سے اگر کوئی مقابلہ کرتا ہے تو وہ مردود ہے وہ ہر ایک سے پوچھ سکتا ہے اُس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

(۱۴۵) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○

یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک رسول ہیں اور ان سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں پس کیا اگر وہ

فوت ہوگئے یا قتل کیے گئے تو تم دین اسلام کو چھوڑ دو گے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ضمیمہ ص۲۱۵)

خداوند عزوجل نے عام اور خاص دونوں طور پر مسیح کا فوت ہو جانا بیان فرمایا ہے عام طور پر جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف ایک رسول ہے اور اس سے پہلے ہر یک رسول جو آیا وہ گذر گیا اور انتقال کر گیا اب کیا تم اس رسول کے مرنے یا قتل ہو جانے کی وجہ سے دین اسلام چھوڑ دو گے اب دیکھو یہ آیت بطور استدلال طور پر پیش کی گئی ہے صریح دلالت کرتی ہے کہ ہر یک رسول کو موت پیش آتی رہی ہے خواہ وہ موت طبعی طور پر ہو یا قتل وغیرہ سے اور گذشتہ نبیوں میں سے کوئی ایسا نبی نہیں جو مرنے سے بچ گیا ہو سو اس جگہ ناظرین بہ بداہت سمجھ سکتے ہیں کہ اگر حضرت مسیح جو گذشتہ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں اب تک مرے نہیں بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تو اس صورت میں مضمون اس آیت کا جو عام طور پر ہر یک گذشتہ نبی کے فوت ہونے پر دلالت کر رہا ہے صحیح نہیں ٹھہر سکتا بلکہ یہ استدلال ہی لغو اور قابل جرح ہوگا۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ص۳۲۴-۳۲۵)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہیں اُن سے پہلے سب نبی فوت ہو گئے ہیں اب کیا اگر وہ بھی فوت ہو جائیں یا مارے جائیں تو اُن کی نبوت میں کوئی نقص لازم آئے گا جس کی وجہ سے تم دین سے پھر جاؤ۔ اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ اگر نبی کے لیے ہمیشہ زندہ رہنا ضروری ہے تو کوئی ایسا نبی پہلے نبیوں میں سے پیش کرو جو اب تک زندہ موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اگر مسیح ابن مریم زندہ ہے تو پھر یہ دلیل جو خدائے تعالیٰ نے پیش کی صحیح نہیں ہوگی۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۶۰۶)

بخاری کے صفحہ ۶۴۰ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کی گئی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو بعض آدمی یہ گمان کرتے تھے کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے اور بعض کہتے تھے کہ فوت ہو گئے مگر پھر دنیا میں آئیں گے اس حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ کے گھر گئے اور دیکھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تب وہ چادر کا پردہ اٹھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف جھکے اور چوما اور کہا کہ میرے ماں باپ تیرے پر قربان مجھے خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ خدا تیرے پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔ پھر لوگوں میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فوت ہو جانا ظاہر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت ہونے اور پھر دنیا میں نہ آنے کی تائید میں یہ آیت پڑھی مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی محمد اس سے زیادہ نہیں کہ وہ رسول اللہ ہے اور اس سے پہلے تمام رسول اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے گذر چکے ہیں یاد رہے کہ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کا الف لام استغراق کا ہے جو رسولوں کی جمع افراد گذشتہ پر محیط ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر دلیل ناقص رہ جاتی ہے کیونکہ اگر ایک فرد بھی باہر رہ جائے تو پھر وہ استدلال جو مدعا قرآن کریم کا ہے اس آیت سے پیدا نہیں ہو سکتا اس آیت کے پیش کرنے سے حضرت ابوبکر صدیق نے اس بات کا ثبوت دیا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا کہ جو فوت نہ ہوا ہو

اور نیز اس بات کا ثبوت دیا کہ جو فوت ہو جائے پھر دُنیا میں کبھی نہیں آتا کیونکہ لغت عرب اور محاورہ اہل عرب میں خلا یا خلت ایسے لوگوں کے گذرنے کو کہتے ہیں جو پھر آنے والے نہ ہوں پس تمام رسولوں کی نسبت جو آیت موصوفہ بالا میں خلت کا لفظ استعمال کیا گیا وہ اسی لحاظ سے استعمال کیا گیا تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ لوگ ایسے گئے ہیں کہ پھر دُنیا میں ہرگز نہیں آئیں گے۔ چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال یافتہ ہونے کی حالت میں آپ کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیکر کہا تھا کہ تو حیات اور موت میں پاک ہے تیرے پر دو موتیں ہرگز وارد نہیں ہوں گی یعنی تو دوسری مرتبہ دنیا میں ہرگز نہیں آئے گا اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے قول کی تائید میں آیت قرآن کریم کی پیش کی جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ سب رسول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے گذر چکے ہیں اور جو رسول اس دنیا سے گذر گئے ہیں پھر اس دنیا میں ہرگز نہیں آئیں گے کیونکہ جیسا کہ قرآن شریف میں اور فوت شدہ لوگوں کی نسبت خلوا یا خلت کا لفظ استعمال ہوا ہے ایسا ہی یہی لفظ نبیوں کے حق میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ موت کے لفظ سے اخصّ ہے کیونکہ اس کے مفہوم میں یہ شرط ہے کہ اس عالم سے گذر کر پھر اس عالم میں نہ آوے غرض امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اِس جگہ فوت شدہ نبیوں کے دوبارہ نہ آنے کے بارے میں اول قول ابوبکر صدیق کا پیش کیا جس میں یہ بیان ہے کہ خدا تیرے پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا کیونکہ دوبارہ آنا دو موتوں کو مستلزم ہے اور پھر اس بارے میں قرآن کریم کی آیت پیش کی اور یہ ثبوت دیا کہ خلا اُس گذرنے کو کہتے ہیں کہ پھر اُس کے بعد عود نہ ہو۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۹۴-۸۹۶)

اللہ جل شانہ کی یہ دلیل معقولی کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ جو بطور استقراء کے بیان کی گئی ہے یہ ایک قطعی اور یقینی دلیل استقرائی ہے جب تک کہ اس دلیل کو توڑ کر نہ دکھلایا جائے اور یہ ثابت نہ کیا جائے کہ خدا تعالیٰ کی رسالتوں کو لیکر خدا تعالیٰ کے بیٹے بھی آیا کرتے ہیں اُس وقت تک حضرت مسیحؑ کا خدا تعالیٰ کا حقیقی بیٹا ہونا ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ جل شانہٗ اِس دلیل میں صاف توجہ دلاتا ہے کہ تم مسیح سے لیکر انبیا کے انتہائی سلسلہ تک دیکھ لو جہاں سے سلسلہ نبوّت کا شروع ہوا ہے کہ بجز نوع انسان کے کبھی خدا یا خدا کا بیٹا بھی دنیا میں آیا ہے اور اگر یہ کہو کہ آگے تو نہیں آیا مگر اب تو آگیا تو فن مناظرہ میں اِس کا نام مصادرہ علی المطلوب ہے یعنی جو امر متنازعہ فیہ ہے اُسی کو بطور دلیل پیش کر دیا جائے۔ (جنگ مقدس پرچہ ۲۴ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۷)

يَعْنِيْ مَاتُوْا كُلُّهُمْ كَمَا اسْتَدَلَّ بِهِ الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ عِنْدَ وَفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا بَقِيَ شَكٌّ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ وَفَاتِ الْمَسِيْحِ وَ امْتِنَاعِ رُجُوْعِهٖ اِنْ كُنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ اٰيَاتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۸)

(ترجمہ) یعنی تمام کے تمام رسول فوت ہو گئے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت استدلال کیا تھا پس اس کے بعد اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو حضرت مسیح کی وفات اور مسیح کے واپس نہ آنے کے متعلق کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۸ از عربی)

فَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ اَبَا بَكْرِنِ الصِّدِّيْقَ رَدَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ قَوْلَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ثُمَّ مَا اكْتَفٰى عَلٰى ذٰلِكَ بَلْ قَصَدَ الْمَسْجِدَ وَانْطَلَقَ مَعَهٗ رَهْطٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ فَجَاءَ وَصَعِدَ الْمِنْبَرَ وَجَمَعَ حَوْلَهٗ كُلَّ مَنْ كَانَ مَوْجُوْدًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ وَصَلّٰى عَلٰى رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اعْلَمُوْا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تُوُفِّيَ فَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيَعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّهٗ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ ثُمَّ قَرَءَ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ فَاسْتَدَلَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَاءً عَلٰى اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ كُلَّهُمْ قَدْ مَاتُوْا فَلَمَّا سَمِعَ الصَّحَابَةُ قَوْلَ الصِّدِّيْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَا رَدَّ اَحَدٌ عَلٰى قَوْلِهٖ وَمَا قَالَ اَحَدٌ لَّهٗ اَيُّهَا الرَّجُلُ اِنَّكَ كَذَبْتَ اَوْ اَخْطَأْتَ فِي اسْتِدْلَالِكَ اَوْ ذَكَرْتَ اسْتِدْلَالًا نَاقِصًا وَّمَا كُنْتَ مِنَ الْمُصِيْبِيْنَ۔

فَلَوْ كَانُوْا مُعْتَقِدِيْنَ بِاَنَّ عِيْسٰى حَيٌّ اِلٰى ذٰلِكَ الزَّمَانِ لَرَدُّوْا عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ وَّقَالُوْا كَيْفَ تَفْهَمُ مِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ مَوْتَ الْاَنْبِيَاءِ كُلِّهِمْ اَلَا تَعْلَمُ اَنَّ عِيْسٰى قَدْ رُفِعَ اِلَى السَّمَاءِ حَيًّا وَّيَاْتِيْ فِيْ

(ترجمہ) خلاصہ کلام یہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ حضرت عمرؓ کے قول کی تردید کی پھر آپ نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی مسجد میں پہنچ کر آپ منبر پر رونق افروز ہوئے تمام موجود صحابہ کو آپ نے اپنے گرد جمع کر لیا پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا اور پھر فرمایا اے لوگو! تم یہ جان لو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں پس تم میں سے جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ حضور فوت ہو گئے ہیں اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر کبھی موت نہیں آئے گی پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ اور آپ نے اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر استدلال فرمایا اس بات پر بناء رکھتے ہوئے کہ سب کے سب انبیاء فوت ہو گئے ہیں پس جب صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات سنی تو ان میں سے کسی نے بھی آپ کی بات کی تردید نہیں کی۔ اور نہ کسی نے آپ کو کہا کہ اے شخص تو نے جھوٹ بولا ہے یا اپنے استدلال میں غلطی کی ہے یا تو نے ناقص استدلال کیا ہے اور تو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کی رائے درست ہو۔

اگر ان کا یہ اعتقاد ہوتا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں تو وہ ضرور حضرت ابوبکرؓ کی تردید کرتے اور کہتے آپ اس آیت سے تمام انبیاء کے فوت ہو جانے کا مفہوم کیسے نکال رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ عیسٰی علیہ السلام آسمان

آخِرِ الزَّمَانِ فَاِذَا كَانَ عِيسٰى رَاجِعًا اِلَى الدُّنْيَا مَرَّةً ثَانِيَةً وَاَنْتَ تُؤْمِنُ بِهٖ فَاَيُّ حَرَجٍ وَّمُضَايَقَةٍ فِيْ اَنْ يَّاْتِيَنَا رَسُوْلُنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْضًا كَمَا زَعَمَهٗ عُمَرُ الَّذِيْ يَجْرِي الْحَقُّ عَلٰى لِسَانِهٖ وَلَهٗ شَانٌ عَظِيْمٌ فِي الرَّاْيِ الصَّائِبِ وَلِرَاْيِهٖ مُوَافَقَةٌ بِاَحْكَامِ الْقُرْاٰنِ فِيْ مَوَاضِعَ وَمَعَ ذٰلِكَ هُوَ مُلْهَمٌ وَّمِنَ الْمُحَدَّثِيْنَ - وَاِنَّ وَفَاتَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمُسْلِمِيْنَ مُصِيْبَةٌ مَّا اُصِيْبُوْا بِمِثْلِهٖ فَلَيْسَ مِنَ الْعَجَبِ اَنْ يَّرْجِعَ نَبِيُّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الدُّنْيَا بَلْ رُجُوْعُهٗ اِلَى الدُّنْيَا اَحَقُّ وَاَوْلٰى وَاَنْفَعُ مِنْ رُّجُوْعِ الْمَسِيْحِ وَحَاجَةُ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى وُجُوْدِهِ الْمُبَارَكِ اَشَدُّ وَاَزْيَدُ مِنْ حَاجَتِهِمْ اِلٰى وُجُوْدِ الْمَسِيْحِ لٰكِنَّهُمْ مَا رَدُّوْا عَلَى الصِّدِّيْقِ بِهٰذِهِ الْكَلِمَاتِ بَلْ سَكَتُوْا كُلُّهُمْ وَنَبَذُوْا مِنْ اَيْدِيْهِمْ سِهَامَ الْاِنْكَارِ وَقَبِلُوْا قَوْلَهٗ وَبَكَوْا وَقَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ وَنَظَرُوْا اِلٰى مَوْتِ الْاَنْبِيَاءِ كُلِّهِمْ وَاطْمَئَنُّوْا بِهَا فَاِنَّهُمْ مَاتُوْا كُلُّهُمْ وَمَا كَانَ اَحَدٌ مِّنْهُمْ مِّنَ الْخَالِدِيْنَ -

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۵)

خَلَتْ کا لفظ جہاں جہاں قرآن شریف میں انسانوں کے لیے استعمال ہوا ہے موت کے معنوں پر استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سے بھی حضرت عیسٰی کی موت ہی ثابت ہوئی۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۱۶ حاشیہ)

کی طرف زندہ اٹھائے گئے ہیں اور آخری زمانہ میں آپ واپس آئیں گے پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام دنیا میں دوبارہ واپس آنے والے ہیں اور آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اس بات میں کیا حرج اور مضائقہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس تشریف لے آئیں جیسا کہ حضرت عمرؓ دعوٰی کر رہے ہیں جن کی زبان پر حق جاری ہوتا ہے اور رائے کے صائب ہونے میں ان کی بڑی شان ہے اور ان کی رائے بہت سی جگہوں میں قرآن کریم کے احکام کے موافق تھی۔ پھر وہ ملہم بھی تھے اور محدثین میں سے ہیں۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مسلمانوں کے لیے بڑی مصیبت تھی ایسی مصیبت جو اُن پر پہلے کبھی وارد نہیں ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں واپس آئیں بلکہ آپ دنیا میں واپس آنے کے لیے حضرت مسیح سے زیادہ حقدار اور موزوں اور فائدہ رساں ہیں اور مسلمانوں کو آپ کے وجود مبارک کی جو ضرورت ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود سے زیادہ شدید اور اہم ہے لیکن انہوں نے اس قسم کے الفاظ کہہ کر حضرت ابوبکر کو جواب نہیں دیا بلکہ سب کے سب خاموش رہے اور اپنے ہاتھوں سے انکار کے تیروں کو پھینک دیا اور آپ کی بات کو قبول کر لیا اور رو پڑے اور انہوں نے کہا تو یہی کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اس طرح انہیں تمام انبیاء کی موت پر یقین آگیا اور وہ اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ سب کے سب نبی فوت ہو گئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ زندہ رہنے والا نہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۵) (از عربی)

وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ فَصَرَّحَ بِاَنَّ الْاَنْبِيَآءَ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ مَاتُوْا كُلُّهُمْ وَالْمُرْسَلُوْنَ۔ وَهٰذِهٖ اٰيَةٌ تَلَاهَا اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِذْ كَانَ الْاَصْحَابُ يَخْتَلِفُوْنَ۔ اَعْنِيْ اِذَا اخْتَلَفَ بَعْضُ النَّاسِ مِنَ الصَّحَابَةِ فِيْ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ عُمَرُ اِنَّهٗ سَيَرْجِعُ كَمَا يَرْجِعُ عِيْسٰى وَكَذٰلِكَ قَالَ بَعْضُهُمُ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُخْطِئُوْنَ۔ فَسَمِعَ اَبُوْبَكْرٍ كَلَامَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَزْعُمُوْنَ۔ فَقَامَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَاجْتَمَعَ الصَّحَابَةُ حَوْلَهٗ وَتَلَا الْاٰيَةَ الْمَذْكُوْرَةَ وَقَالَ اسْمَعُوْنِ۔ وَكَانُوْا مُجْتَمِعِيْنَ كُلُّهُمْ لِمَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعُوْا وَتَاَثَّرُوْا بِاَثَرٍ عَجِيْبٍ كَاَنَّ الْاٰيَةَ نَزَلَتْ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَكَانُوْا يَبْكُوْنَ وَيُصَدِّقُوْنَ۔ وَمَا بَقِيَ اَحَدٌ مِّنْهُمْ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ اِلَّا اَنَّهٗ اٰمَنَ بِصَمِيْمِ الْقَلْبِ بِاَنَّ الْاَنْبِيَآءَ كُلَّهُمْ قَدْ مَاتُوْا وَقَدْ اَدْرَكَهُمُ الْمَنُوْنُ۔ فَمَا بَقِيَ لَهُمْ اَسَفٌ عَلٰى مَوْتِ رَسُوْلِهِمْ وَلَا مَحَلُّ غِبْطَةٍ لِحَبِيْبِهِمْ وَتَنَبَّهُوْا عَلٰى مَوْتِهٖ وَفَاضَتْ عُيُوْنُهُمْ وَقَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ وَكَانُوْا يَتْلُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ فِي السِّكَكِ وَالْاَسْوَاقِ وَالْبُيُوْتِ وَيَبْكُوْنَ۔ وَقَالَ حَسَّانُ بْنُ ثَابِتٍ وَهُوَ يَرْثِيْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ خُطْبَةِ اَبِيْ بَكْرٍ كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ

(ترجمہ) خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں اور ان سے پہلے رسول گذر چکے ہیں۔ یہ آیت تبلاتی ہے کہ سارے اگلے نبی فوت ہو چکے ہیں۔ اسی آیت کو حضرت ابوبکر صدیق نے تمام صحابہ کو سنایا جب انہوں نے اختلاف کیا یعنی جب بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت میں اختلاف کیا اور حضرت عمر نے کہا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُسی طرح واپس آئیں گے جیسا کہ عیسیٰ واپس آئے گا اور اسی طرح اور بعض خطا کاروں نے بھی کہا تو اس وقت حضرت ابوبکر نے ان کا کلام سنا اور ان کے گمان پر آگاہ ہوئے تب منبر پر کھڑے ہوئے اور صحابہ ان کے گرد جمع ہوئے پھر آیت مذکورہ پڑھی اور فرمایا سنو اور سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر جمع تھے جب یہ آیت سنی تو عجیب تاثیر اپنے دلوں میں پائی اور سمجھے کہ گویا یہ آیت آج ہی اتری ہے۔ اس کو سن کر انہوں نے رونا شروع کیا اور تصدیق کی۔ اس دن ایسا کوئی شخص نہ رہا جو اس پر ایمان نہ لایا ہو کہ سارے نبی فوت ہو چکے ہیں۔ اب ان کو اپنے رسول کی موت پر کوئی رنج اور غم اور اپنے پیارے کے لیے کوئی حسرت اور افسوس کی جگہ نہ رہی اور اس کی موت پر خبردار اور آگاہ ہو گئے اور آنسوؤں کے دریا آنکھوں سے بہائے اور اِنَّا لِلّٰہ کہا اور اس آیت کو گلی کوچوں میں اور گھروں میں پڑھتے تھے اور روتے تھے چنانچہ حسّان بن ثابت نے حضرت ابوبکر کے خطبہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں کہا:

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ ٭ مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

ل البقرۃ آیت ۱۵۷؂

مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ. يُرِيْدُ أَنَّ نَفُوْقَ عِلْمِهِ كَانَ عَلَيْكَ فَإِذَا مِتَّ فَلَا أُبَالِي أَنْ يَّمُوْتَ مُوْسٰى أَوْ عِيْسٰى فَانْظُرُوْا إِلَيْهِمْ كَيْفَ أَحَبُّوْا نَبِيَّهُمْ وَكَيْفَ كَانَ تَصْدُرُ مِنْهُمْ اٰدَابُ الْمَحَبَّةِ وَاٰثَارُهَا أَيُّهَا الْمُجَادِلُوْنَ. وَانْظُرُوْا كَيْفَ اقْتَضَتْ غَيْرَتُهُمْ أَنَّهُمْ مَا رَضُوْا بِحَيَاتِ نَبِيٍّ بَعْدَ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَهَدَوْا إِلَى الصِّرَاطِ كَمَا يَهْدِي الْعَاشِقُوْنَ. وَاجْتَمَعَتْ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى مَفْهُوْمِ اٰيَتِ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاٰمَنُوْا بِهٖ وَكَانُوْا بِهٖ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۴۸-۱۵۱)

قَدْ جَرَتْ سُنَّةُ أَهْلِ اللِّسَانِ فِيْ لَفْظِ خَلَا. أَنَّهُمْ إِذَا قَالُوْا مَثَلًا خَلَا زَيْدٌ مِّنْ هٰذِهِ الدَّارِ أَوْ مِنْ هٰذِهِ الدُّنْيَا. فَيُرِيْدُوْنَ مِنْ هٰذَا الْقَوْلِ أَنَّهُ لَا يَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَدًا ۔ وَمَا اخْتَارَ اللّٰهُ هٰذَا اللَّفْظَ إِلَّا إِشَارَةً إِلٰى هٰذِهِ الْمُحَاوَرَةِ كَمَا لَا يَخْفٰى۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۴۵ حاشیہ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس آیت سے استدلال کرنا کہ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ صاف دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت ہو چکے تھے کیونکہ اگر اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ پہلے نبیوں میں سے بعض نبی تو جناب خاتم الانبیاء کے عہد سے پیشتر فوت ہو گئے ہیں مگر بعض ان میں سے زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک فوت نہیں ہوئے تو اس صورت میں یہ آیت قابل استدلال نہیں رہتی کیونکہ ایک ناتمام دلیل جو ایک قاعدہ کلیہ کی طرح نہیں اور تمام افراد گذشتہ پر دائرہ کی طرح محیط نہیں وہ دلیل کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی پھر اس سے حضرت ابوبکر کا استدلال لغو ٹھہرتا ہے اور یاد رہے کہ یہ دلیل جو حضرت ابوبکر نے تمام گذشتہ نبیوں کی وفات پر پیش کی کسی صحابی

تو میری آنکھ کی پتلی تھی اب تیرے جاتے رہنے سے میں اندھا ہو گیا تیرے مرنے کے بعد جو چاہے مرے مجھے تو تیرے ہی مرنے کا ڈر تھا یعنی مجھے تو سارا یہی ڈر تھا کہ کہیں تو نہ مر جائے لیکن اب جبکہ تو ہی مر گیا تو اب مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ موسٰی مرے یا عیسٰی مرے۔ اب غور کرو کہ وہ اپنے نبی کو کس قدر دوست رکھتے تھے اور کس طرح محبت کے آداب اور نشان ان سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور یہ بھی غور کرو کہ ان کی غیرت نے ہرگز نہ چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد کسی نبی کی حیات پر راضی ہو جائیں پس خدا نے ان کو اسی طرح سے حق کی راہ دکھلائی جس طرح سے عاشقوں کو دکھلاتا ہے اور ان کے دلوں نے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کی آیت کے مفہوم پر اتفاق کر لیا اور اس پر ایمان لائے اور اس پر خوش ہوئے۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۴۸-۱۵۱)

ترجمہ۔ لفظ خلا کے بارہ میں اہل زبان کا یہ طریق ہے کہ جب وہ یہ کہیں کہ خَلَا زَيْدٌ مِّنْ هٰذِهِ الدَّارِ أَوْ مِنْ هٰذِهِ الدُّنْيَا (یعنی زید اس گھر سے یا اس دنیا سے چلا گیا) تو اس قول سے انکی یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ اس کی طرف کبھی واپس نہیں آئیگا اور اس لفظ کو خدا تعالیٰ نے اسی لیے اختیار کیا ہے تا اہل زبان کے اس استعمال کی طرف اشارہ فرمائے جیسا کہ ظاہر ہے۔

(خطبہ الہامیہ ص۱۴۸ حاشیہ)

سے اس کا انکار مروی نہیں حالانکہ اُس وقت سب صحابی موجود تھے اور سب سُن کر خاموش ہو گئے۔ اس سے ثابت ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا اور صحابہ کا اجماع حجّت ہے جو کبھی ضلالت پر نہیں ہوتا۔ سو حضرت ابوبکر کے احسانات میں سے جو اس امت پر ہیں ایک یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے اس غلطی سے بچنے کے لیے جو آیندہ زمانہ کے لیے پیش آنے والی تھی اپنی خلافت حقہ کے زمانہ میں سچائی اور حق کا دروازہ کھول دیا اور ضلالت کے سیلاب پر ایک ایسا مضبوط بند لگا دیا کہ اگر اس زمانہ کے مولویوں کے ساتھ تمام جنّیات بھی شامل ہو جائیں تب بھی وہ اس بند کو توڑ نہیں سکتے۔ سو ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت ابوبکر کی جان پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے جنہوں نے خدا تعالیٰ سے پاک الہام پا کر اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ مسیح فوت ہو گیا ہے۔ (تریاق القلوب حاشیہ ص۱۴۷)

تمام صحابہ کا ان (حضرت مسیح علیہ السلام) کی موت پر اجماع ہو گیا اور اگر اجماع نہیں ہوا تھا تو ذرہ بیان تو کرو کہ جب حضرت عمر کے غلط خیال پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے اور پھر دوبارہ دنیا میں آئیں گے حضرت ابوبکر نے یہ آیت پیش کی کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ تو حضرت ابوبکر نے کیا سمجھ کر یہ آیت پیش کی تھی اور کونسا استدلال مطلوب تھا جو مناسب محل بھی تھا اور صحابہ نے اس کے معنے کیا سمجھے تھے اور کیوں مخالفت نہیں کی تھی اور کیوں اس جگہ لکھا ہے کہ جب یہ آیت صحابہ نے سنی تو اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ (تحفہ غزنویہ ص۱۲)

اَلَا تُفَكِّرُ فِيْ قَوْلِهٖ عَزَّ اِسْمُهٗ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اَوْ عَلٰى قَلْبِكَ الْقُفْلُ۔ وَقَدِ انْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلَيْهِ قَبْلَ كُلِّ اِجْمَاعٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ۔ وَرَجَعَ الْفَارُوْقُ مِنْ قَوْلِهٖ بَعْدَ سَمَاعِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ فَمَا لَكَ لَا تَرْجِعُ مِنْ قَوْلِكَ وَقَدْ قَرَءْنَا عَلَيْكَ كَثِيْرًا مِّنَ الْاٰيَاتِ۔ اَتَكْفُرُ بِالْقُرْاٰنِ اَوْ نَسِيْتَ يَوْمَ الْمُجَازَاةِ۔ (الہدیٰ ص۱۱۲)

ان سب کے بعد وہ عظیم الشان آیت ہے جس پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوا اور ایک لاکھ سے زیادہ صحابی نے اس بات کو مان لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کل گذشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں اور وہ یہ آیت ہے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ اس جگہ خلت کے معنے خدا تعالیٰ نے آپ فرما دئے کہ موت یا قتل پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محل استدلال میں جمیع انبیاء گذشتہ کی موت پر اس آیت کو پیش کر کے اور صحابہ نے ترک مقابلہ اور تسلیم کا طریق اختیار کر کے ثابت کر دیا کہ یہ آیت موت

(ترجمہ) اے مخاطب کیا تو خدا تعالیٰ کے قول وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ پر غور نہیں کرتا یا تیرے دل پر قفل لگا ہوا ہے اور سب سے پہلے صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع ہوا تھا اور حضرت عمر فاروق رضؓ نے اس آیت کو سُن کر اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا پھر تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو اپنی بات سے رجوع نہیں کرتا حالانکہ ہم نے تجھے کئی آیات سنائی ہیں۔ کیا تو قرآن کریم کا انکار کرتا ہے یا یوم جزا کو بھول گیا ہے۔ (الہدیٰ ص۱۱۲ (از عربی)

مسیح اور تمام گذشتہ انبیاء علیہم السلام پر قطعی دلیل ہے اور اس پر تمام اصحاب رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا ایک فرد بھی باہر نہ رہا جیسا کہ میں نے اس بات کو مفصل طور پر رسالہ تحفہ غزنویہ میں لکھ دیا ہے پھر اس کے بعد تیرہ سو برس تک کبھی کسی مجتہد اور مقبول امام پیشوائے انام نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حضرت مسیح زندہ ہیں بلکہ امام مالک نے صاف شہادت دی کہ فوت ہو گئے ہیں اور امام ابن حزم نے صاف شہادت دی کہ فوت ہو گئے ہیں اور تمام کامل مکمل ملہمین میں سے کبھی کسی نے یہ الہام نہ سنایا کہ خدا کا یہ کلام میرے پر نازل ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم برخلاف تمام نبیوں کے زندہ آسمان پر موجود ہے الغرض جبکہ میں نے نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ اور اقوال ائمہ اربعہ اور وحی اولیاء امت محمدیہ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم میں بجز موت مسیح کے اور کچھ نہ پایا تو بنظر تکمیل لوازم تقویٰ انبیاء سابقین علیہم السلام کے قصص کی طرف دیکھا کہ کیا قرون گذشتہ میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود ہے کہ کوئی آسمان پر چلا گیا ہو اور دوبارہ واپس آیا ہو تو معلوم ہوا کہ حضرت آدم سے لیکر اس وقت تک کوئی نظیر نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صلے)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کسی نے اعتراض نہ کیا کہ قرآن میں کیوں تحریف کرتے ہو تمام گذشتہ انبیاء کہاں فوت ہوئے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت عذر کرتے کہ نہیں صاحب میرا منشا تمام انبیاء کا فوت ہونا تو نہیں ہے میں تو بدل اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ بجسمہ العنصری آسمان پر چڑھ گئے ہیں اور کسی وقت اتریں گے تو صحابہ جواب دیتے کہ اگر آپ کا یہی اعتقاد ہے تو پھر آپ نے اس آیت کو پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیالات کا رد کیا کیا۔ کیا آپ کے کان بہرے ہیں کیا آپ سنتے نہیں کہ عمر بلند آواز سے کیا کہہ رہا ہے۔ حضرت وہ تو یہ کہہ رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مرے نہیں زندہ ہیں اور پھر دنیا میں آئیں گے اور منافقوں کو قتل کریں گے اور وہ آسمان کی طرف ایسا ہی زندہ اٹھائے گئے ہیں جیسے کہ عیسیٰ بن مریم اٹھایا گیا تھا آپ نے آیت تو پڑھ لی مگر اس آیت میں اس خیال کا رد کہاں ہے۔ لیکن صحابہ جو عقلمند اور زیرک اور پاک نبی کے ہاتھ سے صاف کیے گئے تھے اور عربی تو ان کی مادری زبان تھی اور کوئی تعصب درمیان نہ تھا اس لیے انہوں نے آیت موصوفہ بالا کے سنتے ہی سمجھ لیا کہ خلت کے معنے موت ہیں جیسا کہ خود خدا تعالیٰ نے فقرہ اَفَإِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ میں تشریح کر دی ہے اس لیے انہوں نے بلا توقف اپنے خیالات سے رجوع کر لیا اور ذوق میں آکر اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فراق کے درد سے بھر کر بعض نے اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے شعر بھی بنائے جیسا کہ حسان بن ثابت نے بطور مرثیہ یہ دو بیت کہے۔

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ ۔ فَعَمِىَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ

مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ ۔ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

یعنی اے میرے پیارے نبی تو تو میری آنکھوں کی پتلی تھی اور میرے دیدوں کا نور تھا پس میں تو تیرے مرنے سے اندھا ہو گیا اب تیرے بعد میں دوسروں کی موت کا کیا غم کروں عیسیٰ مرے یا موسیٰ مرے کوئی مرے مجھے تو تیرا ہی غم تھا۔ دیکھو عشق محبت

اپنے کہتے ہیں جب صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ نبی افضل الانبیا جن کی زندگی کی اشد ضرورت تھی عرصہ سے پہلے ہی فوت ہو گئے تو وہ اس کلمہ سے سخت بیزار ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو مر جائیں مگر کسی دوسرے کو زندہ رسول کہا جائے۔

(تحفہ گولڑویہ ص)

یہ آیت کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے کہ حضرت مسیح فوت ہو چکے ہیں کیونکہ یہ آیت وہ عظیم الشان آیت ہے جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجماع کر کے اقرار کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سب نبی فوت ہو چکے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۲۶)

یہ وہ آیت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس استدلال کی غرض سے پیش کی تھی کہ تمام گذشتہ انبیاء فوت ہو چکے ہیں اور اس پر تمام صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا۔ (اربعین ۴ ص۲۶)

آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ میں سب نبیوں کی وفات ایک مشترک لفظ میں جو خلت ہے خدا نے ظاہر کی تھی اور حضرت عیسیٰ کے لیے کوئی لفظ استعمال نہیں فرمایا تھا یہ بھی نعوذ باللہ آپ لوگوں کے نزدیک خدا کا ایک جھوٹ ہے یہ وہی آیت ہے جس کے پڑھنے سے حضرت ابوبکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ثابت کی تھی ابوبکر کی بھی یہ منطق خوب تھی کہ باوجودیکہ عیسیٰ آسمان پر زندہ بیٹھا ہے پھر وہ لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھتا ہے یہ کس قسم کی تسلی دینا ہے کیا اس کو معلوم نہیں کہ عیسیٰ تو زندہ آسمان پر بیٹھا ہے اور پھر دوبارہ آئے گا اور چالیس برس رہے گا یہ کی وہ عمر اور افضل الرسل کی یہ عمر تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى[1]۔ اور صحابہ بھی خوب سمجھ کے آدمی تھے جو اس آیت کے سننے سے ساکت ہو گئے اور کسی نے ابوبکر کو جواب نہ دیا کہ حضرت آپ یہ کیسی آیت پڑھ رہے ہیں جو اور بھی ہمیں حسرت دلاتی ہے عیسیٰ تو آسمان پر زندہ اور پھر آنے والا اور ہمارا پیارا نبی ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا۔ اگر عیسیٰ اس قانون قدرت سے باہر اور ہزار ہا برس کی عمر پانے والا اور پھر آنے والا ہے تو ہمارے نبی کو یہ نعمت کیوں عطا نہ ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ نے جو اس وقت تمام حاضر تھے اُن میں سے ایک بھی غائب نہ تھا اس آیت کے یہی معنے سمجھے تھے کہ تمام انبیا فوت ہو چکے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایک دو کم سمجھ صحابہ کو جن کی درایت عمدہ نہیں تھی عیسائیوں کے اقوال سن کر جو ارد گرد رہتے تھے پہلے کچھ یہ خیال تھا کہ عیسیٰ آسمان پر زندہ ہے جیسا کہ ابوہریرہ جو غبی تھا اور درایت اچھی نہیں رکھتا تھا لیکن جب حضرت ابوبکر نے جن کو خدا نے علم قرآن عطا کیا تھا یہ آیت پڑھی تو سب صحابہ پر موت جمیع انبیا ثابت ہو گئی اور وہ اس آیت سے بہت خوش ہوئے اور اُن کا وہ صدمہ جو اُن کے پیارے نبیؐ کی موت کا اُن کے دل پر تھا جاتا رہا اور مدینہ کی گلیوں کوچوں میں یہ آیت پڑھتے پھرے۔ اسی تقریب پر حسان بن ثابت نے مرثیہ کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں یہ شعر بھی بنائے۔ شعر

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيْ عَلَيْكَ النَّاظِرُ ۔ مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

[1] النجم آیت ۲۳

یعنی تو اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میری آنکھوں کی پتلی تھا۔ میں تو تیری جدائی سے اندھا ہو گیا۔ اب جو چاہے مرے عیسیٰ ہو یا موسیٰ۔ مجھے تو تیری ہی موت کا دھڑکا تھا۔ یعنی تیرے مرنے کے ساتھ ہم نے یقین کر لیا کہ دوسرے تمام نبی مرگئے ہیں اُن کی کچھ پرواہ نہیں۔ مصرعہ

عجب تھا عشق اس دل میں محبت ہو تو ایسی ہو

(اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۱۸-۱۹)

اسلام میں پہلا اجماع یہی تھا کہ کوئی نبی گذشتہ نبیوں میں سے زندہ نہیں ہے جیسا کہ آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سے ثابت ہے۔ خدا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بہت بہت اجر دے۔ جو اس اجماع کا موجب ہوئے اور منبر پر چڑھ کر اس آیت کو پڑھ سنایا۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۸)

کیونکہ یہ نہیں سوچتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر بھی بعض صحابہ کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں آئیں گے مگر حضرت ابوبکر نے یہ آیت پڑھ کر مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اس خیال کو رفع دفع کر دیا۔ اور اس آیت کے یہ معنی سمجھائے کہ کوئی نبی نہیں جو فوت نہیں ہو چکا پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوت ہو جائیں تو کوئی افسوس کی جگہ نہیں یہ امر سب کے لیے مشترک ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ خیال ہوتا کہ عیسیٰ آسمان پر چھ سو برس سے زندہ بیٹھا ہے تو وہ ضرور حضرت ابوبکر کے آگے یہ خیال پیش کرتے لیکن اس روز سب نے مان لیا کہ سب نبی مرچکے ہیں اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال بھی تھا کہ عیسیٰ زندہ ہے تو اُس نے اس خیال کو ایک ردی چیز کی طرح اپنے دل سے باہر پھینک دیا۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ ممکن ہے کہ عیسائی مذہب کے قرب وجوار کے اثر کی وجہ سے کوئی ایسا شخص جو غبی ہو اور جس کی درایت صحیح نہ ہو یہ خیال رکھتا ہو کہ شاید عیسیٰ اب تک زندہ ہی ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس وعظ صدیقی کے بعد کل صحابہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے جتنے نبی تھے سب مرچکے ہیں اور یہ پہلا اجماع تھا جو صحابہ میں ہوا اور صحابہ رضی اللہ عنہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں محو تھے کیونکر اس بات کو قبول کر سکتے تھے کہ باوجودیکہ ان کے بزرگ نبی نے جو تمام نبیوں کا سردار ہے چونسٹھ برس کی بھی پوری عمر نہ پائی مگر عیسیٰ چھ سو برس سے آسمان پر زندہ بیٹھا ہے ہرگز ہرگز محبت نبوی فتویٰ نہیں دیتی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت بالتخصیص ایسی فضیلت قائم کرتے لعنت ہے ایسے اعتقاد پر جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین لازم آوے۔ وہ لوگ تو عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے وہ تو اس بات کے سننے سے زندہ ہی مرجاتے کہ ان کا پیارا رسول فوت ہو گیا مگر عیسیٰ آسمان پر زندہ بیٹھا ہے وہ رسول نہ ان کو بلکہ خدا تعالیٰ کو بھی تمام نبیوں سے زیادہ پیارا تھا اسی وجہ سے جب عیسائیوں نے اپنی بدقسمتی سے اس رسول مقبول کو قبول نہ کیا اور اُس کو اتنا اُڑایا کہ خدا بنا دیا تو خدا تعالیٰ کی غیرت نے تقاضا کیا کہ ایک غلام غلمان محمدی سے

یعنی یہ عاجز اس کا مثیل کر کے اس امت میں سے پیدا کیا اور اس کی نسبت اپنے فضل اور انعام کا زیادہ اس کو حصہ دیا تا عیسائیوں کو معلوم ہو کہ تمام فضل خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۲۰-۲۱)

(عبد الحق غزنوی نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام پر الزام لگایا تھا کہ آپ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جو فوت نہیں ہو گیا..... قرآن شریف میں فقط خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پیغمبر گذرے۔

(آپ نے فرمایا) کیا گذرنا بجز مرنے کے کوئی اور چیز بھی ہے جو شخص دنیا سے گذر گیا اسی کو تو کہتے ہیں کہ مر گیا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

پدر چوں دور عمرش منقضی گشت — مرا ایں یک نصیحت داد و بگذشت

اب بتلاؤ کہ بگذشت کے اس جگہ کیا معنے ہیں کیا یہ کہ شیخ سعدی علیہ الرحمت کا باپ زندہ بجسم عنصری آسمان پر چلا گیا تھا یا یہ کہ مر گیا تھا۔ اے عزیز کیا ان تاویلات رکیکہ سے ثابت ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ مع جسم عنصری آسمان پر چلے گئے تھے۔ تمام دنیا کا یہ محاورہ ہے کہ جب مثلاً کہا جائے کہ فلاں بیمار گذر گیا تو کوئی بھی یہ معنے نہیں کرتا کہ وہ آسمان پر مع جسم عنصری چڑھ گیا اور عربی میں بھی گذرنا بمعنی مرنا ایک قدیم محاورہ ہے چنانچہ ایک فاضل کی نسبت جو کسی کتاب کو تالیف کرنا چاہتا تھا اور قبل از تالیف مر گیا کسی کا یہ پرانا شعر ہے

وَلَمْ يَتَّفِقْ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ — وَكَمْ حَسَرَاتٍ فِيْ بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ

یعنی اس فاضل کو اس کتاب کا تالیف کرنا اتفاق نہ ہوا یہاں تک کہ گذر گیا اور قبروں کے پیٹ میں بہت سی حسرتیں ہیں یعنی اکثر لوگ قبل اس کے جو اپنے ارادے پورے کریں مر جاتے ہیں اور حسرتوں کو قبروں میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ اب دیکھو کہ اس جگہ بھی گذرنا بمعنی مرنے کے ہے اور اگر یہ کہو کہ کس تفسیر والے نے یہ معنے لکھے ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ ہر ایک محقق مفسر جو عقل اور بصیرت اور علم بصیرت سے حصہ رکھتا ہے یہی معنے لکھتا ہے دیکھو تفسیر مظہری صفحہ ۴۸۵ زیر آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی مَضَتْ وَ مَاتَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی پہلے نبی دنیا سے گذر گئے اور مر گئے اور الف لام سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی ان میں سے موت سے خالی نہیں رہا۔ ایسا ہی تفسیر تبصیر الرحمان و تیسیر المنان للشیخ العلامہ زین الدین علی المہائمی زیر آیت قَدْ خَلَتْ لکھا ہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْهُمْ مَنْ مَاتَ وَمِنْهُمْ مَنْ قُتِلَ فَلَا مُنَافَاتَ بَيْنَ الرِّسَالَةِ وَالْقَتْلِ وَالْمَوْتِ دیکھو صفحہ ۱۳۰ جلد پہلی تبصیر الرحمان یعنی گذشتہ انبیاء دنیا سے اس طرح گذر گئے کہ کوئی مر گیا اور کوئی قتل کیا گیا پس نبوت اور موت اور قتل میں کچھ منافات نہیں۔ ایسا ہی تفسیر جامع البیان للشیخ العلامہ سید معین الدین ابن الشیخ سید صفی الدین صفحہ ۶۱ میں زیر آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ لکھا ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ بِالْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ فَيَخْلُوْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْضًا یعنی تمام نبی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے موت کے ساتھ یا قتل کے ساتھ دنیا سے گذر گئے ایسا ہی آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا سے گذر جائیں گے۔ ایسا ہی حاشیہ غایۃ القاضی وکفایۃ الراضی علی تفسیر البیضاوی جلد ۳ صفحہ ۶۸ مقام مذکور کے متعلق یہ لکھا ہے لَیْسَ (رَسُوْلُنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) مُتَبَرِّءًا عَنِ الْھَلَاکِ کَسَائِرِ الرُّسُلِ وَیَخْلُوْا کَمَا خَلَوْا یعنی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موت سے مستثنیٰ نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ پہلے اُن سے تمام پیغمبر مر چکے ہیں وہ بھی مریں گے اور جیسا کہ وہ اس دنیا سے گذر گئے وہ بھی گذر جائیں گے۔ ایسا ہی تفسیر جمل میں جس کا دوسرا نام فتوحات الٰہیہ ہے یعنی جلد ایک صفحہ ۳۲۶ میں زیر تفسیر آیت وما محمد۔ قد خلت یہ لکھا ہے کَاَنَّھُمْ اعْتَقَدُوْا اَنَّہٗ لَیْسَ کَسَائِرِ الرُّسُلِ فِیْ اَنَّہٗ یَمُوْتُ کَمَا مَاتُوْا یعنی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو گویا یہ گمان ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے نبیوں کی طرح نہیں مریں گے بلکہ زندہ رہیں گے سو فرمایا کہ وہ بھی مرے گا جیسا کہ پہلے تمام نبی مر گئے۔ ایسا ہی تفسیر صافی زیر آیت مذکورہ جلد اول میں لکھا ہے فَسَیَخْلُوْا کَمَا خَلَوْا بِالْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ یعنی حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا سے ایسا ہی گذر جائے گا جیسا کہ دوسرے نبی موت یا قتل کے ساتھ دنیا سے گذر گئے اب ظاہر ہے کہ ان تمام تفسیر والوں نے لفظ خَلَتْ کے معنے مَاتَتْ ہی کیا ہے یعنی اس آیت کے یہی معنے کیے ہیں کہ جیسے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام فوت ہو گئے ہیں ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وفات پائیں گے۔ اب دیکھو کہ حضرت مسیح کی موت پر کس قدر روشن ثبوت ہے جو تمام تفسیروں والے یک زبان ہو کر بول رہے ہیں کہ پہلے جس قدر دنیا میں نبی آئے سب فوت ہو چکے ہیں۔ ماسوا اس کے ہر ایک ایماندار کا یہ فرض ہے کہ اس مقام میں جن معنوں کی طرف خود اللہ جل شانہ نے اشارہ فرمایا ہے اُنہی معنوں کو درست سمجھے اور اس کے مخالف معنوں کو زیغ اور الحاد یقین کرے اور یہ بات نہایت بدیہی اور اظہر من الشمس ہے کہ اللہ جل شانہ نے آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ کی تفسیر میں آپ ہی فرما دیا ہے اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ۔ پس اس ساری آیت کے یہ معنی ہوئے کہ پہلے تمام نبی اس دنیا سے موت یا قتل سے گذر چکے ہیں۔ سو اگر یہ نبی بھی انہی کی طرح موت یا قتل سے گذر جائے تو کیا تم دین سے پھر جاؤ گے۔ اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس مقام میں خدا تعالیٰ نے دنیا سے گذر جانے کے دو ہی طور پر معنے قرار دئے ہیں ایک یہ کہ بذریعہ موت حتف انف یعنی طبعی موت کے انسان مر جائے اور دوسرے یہ کہ مارا جائے یعنی قتل کیا جائے۔ غرض خدا تعالیٰ نے خَلَتْ کے لفظ کو موت یا قتل میں محصور کر دیا ہے پس ظاہر ہے کہ اگر کوئی تیسرا شق بھی خدا تعالیٰ کے علم میں ہوتا تو خَلَتْ کے معنوں کی تکمیل کے لیے اس کو بھی بیان فرماتا مثلاً یہ کہتا اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ اَوْ رُفِعَ اِلَی السَّمَاءِ بِجِسْمِہٖ کَمَا رُفِعَ عِیْسٰی انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ سارے نبی پہلے اس سے گذر چکے ہیں پس اگر یہ نبی بھی مر جائے یا قتل کیا جائے یا عیسیٰ کی طرح مع جسم آسمان پر اٹھایا جائے تو کیا تم اس دین سے پھر جاؤ گے۔ اب اے عزیز کیا تو خدا پر اعتراض کرے گا کہ وہ اس تیسری شق کا بیان کرنا بھول گیا اور صرف دو شق بیان کیے لیکن عقلمند خوب جانتے ہیں کہ لفظ خلت جو ایک تشریح طلب لفظ تھا اس کی تشریح صرف موت یا قتل سے کرنا اس بات پر قطعی دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اس مقام میں خَلَتْ کے معنے یا موت یا قتل ہے اور کچھ نہیں

اور یہ ایک ایسا یقینی امر ہے جو اس سے انکار کرنا گویا خدا کی اطاعت سے خارج ہونا اور اس پر افترا کرنا ہے جبکہ خدا تعالیٰ نے اسی آیت میں اپنے ہی مُنہ سے بیان فرمادیا کہ خَلَتْ کے معنے یا مرنا یا قتل کیے جانا ہے تو اس کے مخالف بولنا، کذب عظیم اور ایک بڑا افترا ہے اور صغائر میں سے نہیں ہے بلکہ کبیرہ گناہ ہے پس جبکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک خَلَتْ کے معنے دو میں ہی محصور ٹھہر گئے یعنی مرنا یا قتل کیے جانا تو اس سے زیادہ افترا اور دروغ کیا ہو گا کہ جس طرح نصاریٰ نے خواہ نخواہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا اسی طرح خواہ نخواہ بغیر دلیل اور سلطان مبین کے خَلَتْ کے معنوں میں آسمان پر بجسم عنصری اٹھائے جانا داخل سمجھا جائے ہاں اس جگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہو گا کہ جبکہ ائمہ لغت عرب نے بھی خَلَتْ کے معنے کہیں یہ نہیں لکھے کہ کوئی شخص زندہ مع جسم عنصری آسمان پر چلا جائے تو کیا حاجت تھی کہ خدا تعالیٰ نے اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کے ساتھ لفظ خَلَتْ کی تشریح فرمائی تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ فیج اعوج کے زمانہ میں خَلَتْ کے یہ معنے بھی کیے جائیں گے کہ حضرت مسیح کو زندہ مع جسم عنصری آسمان پر پہنچا دیا گیا ہے لہٰذا اس تشریح سے بطور حفظ ماتقدم پہلے سے ہی ان خیالات فاسدہ کا رد کر دیا۔ اب اس تمام تحقیق کے رو سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے ان معنوں میں کوئی جھوٹ نہیں بولا بلکہ آپ ناراض نہ ہوں آپ خود بوجہ ترک معنی قرآن اس قول شنیع اور دروغگوئی کے مرتکب ہوئے ہیں میں آپ کو ہزار روپیہ بطور انعام دینے کو طیار ہوں اگر آپ کسی قرآن شریف کی آیت یا کسی حدیث قوی یا ضعیف یا موضوع یا کسی قول صحابی یا کسی دوسرے امام کے قول سے یا جاہلیت کے خطبات یا دواوین اور ہر ایک قسم کے اشعار یا اسلامی فصحاء کے کسی نظم یا نثر سے یہ ثابت کر سکیں کہ خَلَتْ کے معنوں میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر چلا جائے خدا تعالیٰ کا قرآن شریف میں اوّل خَلَتْ کا بیان کرنا اور پھر ایسی عبارت میں جو بموجب اصول بلاغت و معانی تفسیر کے محل میں ہے صرف مرنا یا قتل کیے جانا بیان فرمانا کیا مومن کے لیے یہ اس بات پر حجت قاطع نہیں ہے کہ خَلَتْ کے معنے اس محل میں دو ہی ہیں یعنی مرنا یا قتل کیے جانا اب خدا کی گواہی کے بعد اور کس کی گواہی کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اسی مقام میں خدا تعالیٰ نے میری سچائی کی گواہی دیدی اور بیان فرمادیا کہ خَلَتْ کے معنے مرنا یا قتل کیے جانا ہے۔ آپ نے تو اس مقام میں اپنے اس اشتہار میں میری نسبت یہ عبارت لکھی ہے کہ ایسا جھوٹ بولا ہے کہ کسی ایماندار بلکہ ذرہ شرم اور حیا کے آدمی کا کام نہیں۔ لیکن یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک عظیم الشان نشان ہے کہ وہی جھوٹ قرآنی شہادت سے آپ پر ثابت ہو گیا۔ اب تبلائیے کہ میں آپ کی نسبت کیا کہوں۔ آپ نے ناحق جلد بازی کر کے میرا نام دروغگو رکھا لیکن میں نہیں چاہتا کہ بدی کا بدی کے ساتھ جواب دوں بلکہ اگر اسلامی شریعت میں جھوٹ بولنا حرام اور گناہ نہ ہوتا تو میں بعوض آپ کے کذاب کہنے کے آپ کو صدیق کہتا اور بعوض اس کے کہ آپ نے محض دروغگوئی سے مجھے ذلیل اور شکست یافتہ قرار دیا آپ کو معزز اور فتحیاب کے نام سے پکارتا۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۳۹-۴۴)

(عبد الحق غزنوی نے یہ کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور تمام نبیوں کی موت پر اجماع ہو جانا یہ بھی سفید جھوٹ ہے۔

اصحاب کرام تو لاکھوں سے بھی زیادہ ہونگے سب سے ثبوت دینا تو مشکل ہے۔

(فرمایا) اس جگہ مجھے آپ لوگوں کی حالت پر رونا آتا ہے کہ کیسے خدا نے عقل و علم اور دیانت کو سینوں میں سے چھین لیا۔ کیا اسی مایۂ علمی پر آپ لوگ مولوی کہلاتے ہیں اور ایک دوسرے کا نام علماء کرام اور صوفیہ عظام رکھتے ہیں۔ اپنے قابل رحم ناداں یہ بات فی الواقع سچ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور تمام گذشتہ نبیوں کی موت کی نسبت صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا تھا اور جس طرح خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اجماع پایا گیا ہے۔ اسی قسم کا بلکہ اس سے افضل و اعلیٰ یہ اجماع تھا اور اگر کوئی جرح قدح اس اجماع پر ہوتا ہے تو اس سے زیادہ جرح قدح خلافت مذکورہ کے اجماع پر ہوگا درحقیقت یہ اجماع خلافت ابوبکر کے اجماع سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں کوئی ضعیف قول بھی مروی نہیں جس سے ثابت ہو جو کسی صحابی نے حضرت ابوبکر کی مخالفت کی یا تخلف کیا یعنی جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر بطور استدلال کے یہ آیت پڑھی کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِكُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک رسول ہے اس میں کوئی جز الوہیت کی نہیں اور اس سے پہلے تمام رسول دنیا سے گذر چکے ہیں یعنی مر چکے ہیں پس ایسا ہی اگر یہ بھی مر کر یا قتل ہو کر دنیا سے گذر گیا تو کیا تم دین سے پھر جاؤ گے تو اس آیت کے سننے کے بعد کسی ایک صحابی نے بھی مخالفت نہیں کی اور اٹھ کر یہ عرض نہیں کی کہ یہ آپ کا استدلال ناقص اور ناتمام ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ بعض نبی زندہ بجسم عنصری زمین پر موجود ہیں جیسے الیاس و خضر اور بعض آسمان پر جیسے ادریس اور عیسیٰ تو پھر اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت موت کیونکر ثابت ہوا اور کیوں جائز نہیں کہ وہ بھی زندہ ہوں بلکہ تمام صحابہ نے اس آیت کو سن کر تصدیق کی اور سب کے سب اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ تمام نبیوں کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مرنا ضروری تھا پس یہ اجماع بلا توقف اور تردد واقع ہوا لیکن وہ اجماع جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مانا جاتا ہے اس میں بعض صحابہ کی طرف سے بیعت کرنے میں کچھ توقف اور تردد بھی ہوا تھا گو کچھ دنوں کے بعد بیعت کر لی اور اس ابتلا میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مبتلا ہو گئے تھے لیکن گذشتہ انبیاء کی موت پر کسی صحابی کو بعد سننے صدیقی خطبہ کے کوئی ابتلا پیش نہیں آیا اور نہ ماننے میں کچھ توقف اور تردد کیا بلکہ سنتے ہی مان گئے لہذا اسلام میں یہ وہ پہلا اجماع ہے جو بلا توقف انشراح صدر کے ساتھ ہوا۔ خلاصہ کلام یہ کہ بیشک نصوص صریحہ کے رو سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا تمام گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی موت پر جس میں حضرت مسیح بھی داخل ہیں اجماع ہو گیا تھا بلکہ حضرت مسیح اس اجماع کا پہلا نشانہ تھے۔ اب ذیل میں نصوص حدیثیہ کے رو سے ثبوت لکھتا ہوں تا معلوم ہو کہ ہم دونوں میں سے کون شخص خدا تعالیٰ سے خوف کر کے سچ پر قائم ہے اور کون شخص دلیری سے جھوٹ بولتا اور نصوص صریحہ کو چھوڑتا ہے۔

واضح ہو کہ اس بارے میں صحیح بخاری میں جو اصح الکتب کہلاتی ہے مندرجہ ذیل عبارتیں ہیں۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ

عَبَّاسٍ اَنَّ اَبَابَکْرٍ خَرَجَ وَعُمَرُ یُکَلِّمُ النَّاسَ فَقَالَ اجْلِسْ یَا عُمَرُ فَاَبٰی عُمَرُ اَنْ یَّجْلِسَ فَاَقْبَلَ النَّاسُ اِلَیْہِ وَتَرَکُوْا عُمَرَ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ اَمَّا بَعْدُ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ قَالَ اللّٰہُ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ۔ اِلَی الشَّاکِرِیْنَ ۔ وَقَالَ وَاللّٰہِ کَاَنَّ النَّاسَ لَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ حَتّٰی تَلَاھَا اَبُوْبَکْرٍ فَتَلَقَّاھَا مِنْہُ النَّاسُ کُلُّھُمْ فَمَا اَسْمَعُ بَشَرًا مِّنَ النَّاسِ اِلَّا یَتْلُوْھَا...... اِنَّ عُمَرَ قَالَ وَاللّٰہِ مَا ھُوَ اِلَّا اَنْ سَمِعْتُ اَبَابَکْرٍ تَلَاھَا فَعُقِرْتُ حَتّٰی مَا یُقِلُّنِیْ رِجْلَایَ وَحَتّٰی اَھْوَیْتُ اِلَی الْاَرْضِ حَتّٰی سَمِعْتُہٗ تَلَاھَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ مَاتَ۔

یعنی ابن عباس سے روایت ہے کہ ابوبکر نکلا (یعنی بروز وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اور عمر لوگوں سے کچھ باتیں کر رہا تھا (یعنی کہہ رہا تھا کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں) پس ابوبکر نے کہا کہ اے عمر بیٹھ جا مگر عمر نے بیٹھنے سے انکار کیا پس لوگ ابوبکر کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر کو چھوڑ دیا پس ابوبکر نے کہا کہ بعد حمد و صلوٰۃ واضح ہو کہ جو شخص تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا ہے اس کو معلوم ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فوت ہو گیا اور جو شخص تم میں سے خدا کی پرستش کرتا ہے تو خدا زندہ ہے جو نہیں مریگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر دلیل یہ ہے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ محمد صرف ایک رسول ہے اور اس سے پہلے تمام رسول اس دنیا سے گذر چکے ہیں یعنی مر چکے ہیں اور حضرت ابوبکر نے الشاکرین تک یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ کہا راوی نے پس بخدا گویا لوگ اس سے بے خبر تھے کہ یہ آیت بھی خدا نے نازل کی ہے اور ابوبکر کے پڑھنے سے ان کو پتہ لگا پس اس آیت کو تمام صحابہ نے ابوبکر سے سیکھ لیا اور کوئی بھی صحابی یا غیر صحابی باقی نہ رہا جو اس آیت کو پڑھتا نہ تھا اور عمر نے کہا کہ بخدا میں نے یہ آیت ابوبکر سے ہی سنی جب اس نے پڑھی پس میں اس کے سننے سے ایسا بے حواس اور زخمی ہو گیا ہوں کہ میرے پیر مجھے اٹھا نہیں سکتے اور میں اُس وقت سے زمین پر گرا جاتا ہوں جب سے کہ میں نے یہ آیت پڑھتے سنا اور یہ کلمہ کہتے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے۔ اور اس جگہ قسطلانی شرح بخاری کی یہ عبارت ہے وعمر بن الخطاب یکلم الناس یقول لھم ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم...... ولا یموت حتی یقتل المنافقین یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے اور جب تک منافقوں کو قتل نہ کرلیں فوت نہیں ہونگے اور ملل و نحل شہرستانی میں اس قصہ کے متعلق یہ عبارت ہے۔ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مَنْ قَالَ اِنَّ مُحَمَّدًا مَاتَ فَقَتَلْتُہٗ بِسَیْفِیْ ھٰذَا۔ وَاِنَّمَا رُفِعَ اِلَی السَّمَآءِ کَمَا رُفِعَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَقَالَ اَبُوْبَکْرِ بْنُ قُحَافَۃَ مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اِلٰہَ مُحَمَّدٍ فَاِنَّہٗ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ وَقَرَءَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ فَرَجَعَ الْقَوْمُ اِلٰی قَوْلِہٖ ۔ دیکھو ملل و نحل جلد ثالث۔ ترجمہ یہ ہے کہ عمر خطاب کہتے

تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو میں اپنی اسی تلوار سے اس کو قتل کر دوں گا بلکہ وہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں جیسا کہ عیسیٰ بن مریم اٹھائے گئے اور ابوبکر نے کہا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہے تو وہ ضرور فوت ہو گئے ہیں اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کی عبادت کرتا ہے تو وہ زندہ ہے نہیں مرے گا یعنی ایک خدا ہی میں یہ صفت ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ ہے اور باقی تمام نوع انسان وحیوان پہلے اس سے مرجاتے ہیں کہ ان کی نسبت خلود کا گمان ہو۔ اور پھر حضرت ابوبکر نے یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہیں اور سب رسول دنیا سے گذر گئے کیا اگر وہ فوت ہو گئے یا قتل کیے گئے تو تم مرتد ہو جاؤ گے تب لوگوں نے اس آیت کو سن کر اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ اب سوچو کہ حضرت ابوبکر کا اگر قرآن سے یہ استدلال نہیں تھا کہ تمام نبی فوت ہو چکے ہیں اور نیز اگر یہ استدلال صریح اور قطعیۃ الدلالت نہیں تھا تو وہ صحابہ جو بقول آپ کے ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھے محض ظنی اور شکی امر پر کیونکر قائل ہو گئے اور کیوں یہ حجت پیش نہ کی کہ یا حضرت یہ آپ کی دلیل ناتمام ہے اور کوئی نص قطعیۃ الدلالت آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا آپ اب تک اس سے بے خبر ہیں کہ قرآن ہی آیت رافعک الیّ میں حضرت مسیح کا بجسمہ العنصری آسمان پر جانا بیان فرماتا ہے۔ کیا بل رفعہ اللہ الیہ بھی آپ نے نہیں سنا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمان پر جانا آپ کے نزدیک کیوں مستبعد ہے بلکہ صحابہ نے جو مذاق قرآن سے واقف تھے آیت کو سن کر اور لفظ خلت کی تشریح فقرہ اَفَإِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ میں پا کر فی الفور اپنے پہلے خیال کو چھوڑ دیا ہاں ان کے دل آنحضرت کی موت کی وجہ سے سخت غمناک اور چور ہو گئے اور ان کی ... گئی تھی اور حضرت عمر نے فرمایا کہ اس آیت کے سننے کے بعد میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میرے جسم کو میرے پیر اٹھا نہیں سکتے اور میں زمین پر گرا جاتا ہوں۔ سبحان اللہ کیسے سعید اور وقّاف عند القرآن تھے کہ جب آیت میں غور کر کے سمجھ آ گیا کہ تمام گذشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں تب بجز اس کے کہ رونا شروع کر دیا اور غم سے بھر گئے اور کچھ نہ کہا اور تب حضرت حسان بن ثابت نے یہ مرثیہ کہا

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

یعنی تو میری آنکھ کی پتلی تھا پس میری آنکھیں تو تیرے مرنے سے اندھی ہو گئیں اب تیرے بعد میں کسی کی زندگی کو کیا کروں عیسیٰ مرے یا موسیٰ مرے بیشک مر جائیں مجھے تو تیرا ہی غم تھا۔ یاد رہے کہ اگر حضرت ابوبکر کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام موت سے باہر ہوتے تو وہ ہرگز اس آیت کو بطور استدلال پیش نہ کرتے اور اگر صحابہ کو اس آیت کے ان معنوں میں جو تمام نبی فوت ہو چکے ہیں کچھ تردد ہوتا تو وہ ضرور عرض کرتے کہ جس حالت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ بجسم عنصری آسمان پر چلے گئے ہیں تو پھر یہ دلیل ناتمام ہے اور کیا وجہ کہ عیسیٰ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر نہ گئے ہوں۔ لیکن اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی موت کا بھی اُسی دن فیصلہ ہوا اور صحابہ نے اس آیت کو سن کر

بعد اس کے کبھی دم نہیں مارا کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں۔ اور چونکہ صحیح بخاری کے لفظ کلہم سے ثابت ہو گیا کہ اس وقت سب صحابہ موجود تھے اور کسی نے اس آیت کے سننے کے بعد مخالفت نہ کی اس لیے ماننا پڑا کہ ان سب کا تمام گذشتہ انبیاء کی موت پر اجماع ہو گیا اور یہ پہلا اجماع تھا جو صحابہ میں ہوا اور خلافت ابوبکر کے اجماع سے جو بعد اس کے ہوا یہ اجماع بہت بڑھ کر تھا کیونکہ اس میں کسی نے دم نہیں مارا اور خلافت ابوبکر میں ابتدا میں اختلاف ہو گیا تھا ہاں اس جگہ یہ خیال گذرتا ہے کہ اس آیت کے سننے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عیسیٰ کی نسبت یہ مذہب تھا کہ باوجود مر جانے کے وہ بھی دنیا میں واپس آئیں گے کیونکہ انہوں نے ان کا رفع اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رفع ایک ہی طور کا قرار دیا اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم تو حضرت عائشہ کے گھر میں ہی اب تک پڑا ہے تو وہ باوجود اقرار مشابہت کے کس طرح اس بات کے قائل ہو سکتے تھے کہ حضرت مسیح کا جسم آسمان پر چلا گیا لیکن آیت کو سن کر یہ خیال بھی انہوں نے چھوڑ دیا اور اس روز تمام صحابہ اس بات پر ایمان لائے کہ اس سے پہلے سب نبی فوت ہو چکے ہیں اور درحقیقت بڑی بے ادبی بھی اور سخت گناہ تھا کہ نبی خاتم الرسل افضل الانبیاء فوت ہو جائیں ان کی میّت سامنے پڑی ہو اور کسی دوسرے نبی کی نسبت یہ خیال ہو کہ وہ فوت نہیں ہوا۔ درحقیقت یہ خیال اور محبت اور تعظیم رسول کریم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ایمانداری اور تقویٰ یہ ہے سوچو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اس خیال کا رد بجز اس کے کب ممکن تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت مسیح اور تمام گذشتہ نبیوں کی موت ثابت کرتے بھلا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس آیت قد خلت کے پڑھنے سے یہ ارادہ نہ تھا کہ حضرت مسیح وغیرہ انبیاء گذشتہ کی موت ثابت کریں تو انہوں نے حضرت عمر کے خیال کا رد کیا کیا۔ حضرت عمر کے اس خیال کا تمام مدار حضرت مسیح کے زندہ اٹھائے جانے پر تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اپنے اجتہاد سے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر حضرت مسیح زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں تو پھر ہمارے نبی احق و اولیٰ ہیں کہ زندہ آسمان پر چلے جائیں کیونکہ یہ ایک عظیم فضیلت ہے کہ خدا تعالیٰ کسی نبی کو زندہ آسمان پر اپنے پاس بلا لے اور بلحاظ طریقت و حسن ادب یہ بات کفر کے رنگ میں تھی کہ ایسا سمجھا جائے کہ گویا حضرت مسیح تو زندہ آسمان پر چلے گئے اور وہ نبی جو خاتم الانبیاء اور افضل الانبیاء ہے جس کے وجود باجود کی بہت سی ضرورتیں ہیں وہ عمر طبعی تک بھی نہ پہنچے اگر بے ایمانی اور تعصب مانع نہ ہو تو یہ آیت مذکورہ بالا ایک بڑی نص صریح اس بات پر ہے کہ تمام صحابہ کا اسی پر اتفاق ہو گیا تھا کہ مسیح وغیرہ تمام گذشتہ انبیاء علیہم السلام فوت ہو چکے ہیں اور اگر یہ نہیں تو بھلا ہوش کر کے اور خدا سے ڈر کر بتلاؤ کہ اس مخالفت کے وقت میں جو حضرت ابوبکر کی رائے اور حضرت عمر کی رائے میں واقع ہوئی تھی جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے کی تائید میں یہ پیش کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں سو ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے جائیں گے اور پھر کیوں ممتنع اور محال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود بہتر اور افضل ہونے کے حضرت مسیح کی طرح آسمان پر نہ اٹھائے

جائیں۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کی رائے کے رد کرنے میں جو آیت قد خلت من قبلہ الرسل پڑھی اس سے ان کا اگر یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت عیسٰی بھی جن کا حوالہ دیا جاتا ہے فوت ہو چکے ہیں تو پھر اور کیا مطلب تھا اور کیونکر حضرت عمر کے خیال کا بجز اس کے ازالہ ہو سکتا تھا اور آپ کا یہ کہنا کہ اس پر اجماع نہیں ہوا یہ ایسا صریح جھوٹ ہے کہ بے اختیار رونا آتا ہے کہ کہاں تک آپ لوگوں کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ اے عزیز بخاری میں تو اس جگہ کلّہم کا لفظ موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ کل صحابہ اس وقت موجود تھے اور لشکر اسامہ جو بیس ہزار آدمی تھا اس مصیبت عظمیٰ واقعہ خیر الرسل سے رک گیا تھا اور وہ ایسا کون بے نصیب اور بدبخت تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنی اور فی الفور حاضر نہ ہوا بجز کسی کا نام تو لو ما سوا اس کے اگر فرض بھی کر لیں کہ بعض صحابہ غیر حاضر تھے تو آخر مہینہ دو مہینہ چھ مہینہ کے بعد ضرور آئے ہونگے پس اگر انہوں نے کوئی مخالفت ظاہر کی تھی اور آیت قد خلت کے اور معنے کیے تھے تو آپ اس کو پیش کریں اور اگر پیش نہ کر سکیں تو یہی ایمان اور دیانت کے برخلاف ہے کہ ایسے جامع اجماع کے برخلاف آپ عقیدہ رکھتے ہیں حضرت مسیح کی موت پر ایک ایسا زبردست اجماع ہے کہ کوئی بے ایمان اس سے انکار کرے تو کرے نیک بخت اور متقی آدمی تو ہرگز اس سے انکار نہیں کریگا اب تبلاؤ کہ حضرت مسیح کی موت پر اجماع تو ہوا زندگی پر کہاں اجماع ثابت ہے۔

(تحفہ غزنویہ صفحہ ۴۴-۵۳)

اس آیت کا اگلا فقرہ یعنی افان مات او قتل صاف تبلا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک گذر جانا صرف دو قسم پر ہے یا بذریعہ موت حتف انف اور یا بذریعہ قتل اور خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ گذر جانا اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص زندہ بجسم عنصری آسمان پر چلا جائے۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ نے گذر جانے کی تشریح لفظ افان مات او قتل سے آپ کر دی اور اس پر حصر کر دیا تو اس کے بعد نہ ماننا کسی صالح مومن کا کام نہیں۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۱۴ حاشیہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ جو شخص حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کلمہ منہ پر لائے گا کہ وہ مر گئے ہیں تو میں اس کو اپنی اسی تلوار سے اس کو قتل کر دوں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو اپنے کسی خیال کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر بہت غلو ہو گیا تھا اور وہ اس کلمہ کو جو آنحضرت مر گئے کلمہ کفر و ارتداد سمجھتے تھے۔ خدا تعالیٰ ہزارہا نیک اجر حضرت ابوبکر کو بخشے کہ جلد تر انہوں نے اس فتنہ کو فرو کر دیا اور نص صریح کو پیش کر کے بتلا دیا کہ گذشتہ تمام نبی مر گئے ہیں اور جیسا کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہ کو قتل کیا درحقیقت اس تصریح سے بھی بہت سے فیج اعوج کے کذابوں کو تمام صحابہ کے اجتماع سے قتل کر دیا گویا چار کذاب نہیں بلکہ پانچ کذاب مارے۔ یا الٰہی ان کی جان پر کروڑ ہا رحمتیں نازل کر آمین۔ اگر اس جگہ خلت کے یہ معنے کیے جائیں کہ بعض نبی زندہ آسمان پر جا بیٹھے ہیں تب تو اس صورت میں حضرت عمر حق بجانب ٹھہرتے ہیں اور یہ آیت ان کو مضر نہیں بلکہ ان کی مؤید ٹھہرتی ہے لیکن اس آیت کا اگلا فقرہ جو بطور تشریح ہے یعنی افان مات او قتل جس پر حضرت ابوبکر کی نظر

جا پڑی ظاہر کر رہا ہے کہ اس آیت کے یہ معنے لینا کہ تمام نبی گذر گئے گو مر کر گذر گئے یا زندہ ہی گذر گئے یہ دجل اور تحریف اور خدا کی منشاء کے برخلاف ایک عظیم افترا ہے۔ اور ایسے افترا عمداً کرنے والے جو عدالت کے دن سے نہیں ڈرتے اور خدا کی پاک تشریح کے برخلاف الٹے معنے کرتے ہیں وہ بلاشبہ ابدی لعنت کے نیچے ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت تک اس آیت کا علم نہیں تھا اور دوسرے بعض صحابہ بھی اسی غلط خیال میں مبتلا تھے اور اُس سہو و نسیان میں گرفتار تھے جو مقتضائے بشریت ہے اور اُن کے دل میں تھا کہ بعض نبی اب تک زندہ ہیں اور پھر دنیا میں آئیں گے۔ پھر کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مانند نہ ہوں۔ لیکن حضرت ابوبکر نے تمام آیت پڑھ کر اور اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ سنا کر دلوں میں بٹھا دیا کہ خَلَتْ کے معنے دو قسم میں ہی محصور ہیں (۱) حتف انف سے مرنا یعنی طبعی موت۔ (۲) مارے جانا۔ تب مخالفوں نے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور تمام صحابہ اس کلمہ پر متفق ہو گئے کہ گذشتہ نبی سب مر گئے ہیں اور فقرہ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کا بڑا ہی اثر پڑا اور سب نے اپنے مخالفانہ خیالات سے رجوع کر لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک (تحفہ غزنویہ ۴۸-۴۹ حاشیہ)

سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تمام صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ کہ تمام نبی فوت ہو چکے ہیں۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی معنی آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کے کیے گئے۔ یعنی سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔ پس کیا حضرت عیسیٰ رسول نہیں تھے جو فوت سے باہر رہ گئے۔ پھر باوجود اس اجماع کے فیج اعوج کے زمانہ کی تقلید کرنا دیانت سے بعید ہے۔ امام مالک کا بھی یہی مذہب تھا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے ہیں پس جبکہ سلف لائمہ کا یہ مذہب ہے۔ تو دوسروں کا بھی یہی مذہب ہوگا۔ اور جن بزرگوں نے اس حقیقت کے سمجھنے میں خطا کی وہ خطا خدا تعالیٰ کے نزدیک درگذر کے لائق ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۴۳-۴۴)

اسلام میں سب سے پہلا اجماع یہی تھا کہ تمام نبی فوت ہو گئے ہیں کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو بعض صحابہ کا یہ بھی خیال تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے اور پھر دنیا میں واپس آئیں گے اور منافقوں کی ناک اور کان کاٹیں گے تو اُس وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور یہ آیت پڑھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی ہیں اور تمام انبیاء گذشتہ پہلے ان سے فوت ہو چکے ہیں تب صحابہ جو سب کے سب موجود تھے رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیشک فوت ہو گئے اور اُنہوں نے یقین کر لیا کہ کوئی نبی بھی زندہ نہیں۔ اور کسی نے اعتراض نہ کیا کہ حضرت عیسیٰ اس آیت کے مفہوم سے باہر ہیں اور وہ اب تک زندہ ہیں۔ اور کیا ممکن تھا کہ عاشقانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر راضی ہو سکتے کہ اُن کا نبی تو چھوٹی سی عمر میں فوت ہو گیا اور عیسیٰ چھ سو برس سے زندہ چلا آتا ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ بلکہ وہ تو اس خیال سے زندہ ہی مر جاتے۔ پس اسی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن سب کے سامنے یہ آیت پڑھ کر ان کو تسلّی دی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور اس آیت نے ایسا اثر صحابہ کے دل پر کیا کہ وہ مدینہ کے بازاروں میں یہ آیت پڑھتے

پھرتے تھے گویا اُسی دن وہ نازل ہوئی تھی اور اسلام میں یہ اجماع تمام اجماعوں سے پہلا تھا کہ تمام نبی فوت ہو چکے ہیں ......
معلوم ہوتا ہے کہ اِس اجماع سے پہلے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی وفات پر ہُوا بعض نادان صحابی جن کو درائت سے کچھ حصّہ نہ تھا وہ ابھی اس عقیدہ سے بے خبر تھے کہ کُل انبیاء فوت ہو چکے ہیں اور اسی وجہ سے صدیق رضی اللہ عنہ کو اِس آیت کے سنانے کی ضرورت پڑی اور اِس آیت کے سُننے کے بعد سب نے یقین کر لیا کہ تمام گذشتہ لوگ داخل قبور ہو چکے ہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس اُمت پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اُس کا شکر نہیں ہو سکتا اگر وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو مسجد نبوی میں اکٹھے کرکے یہ آیت نہ سناتے کہ تمام گذشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں تو یہ اُمت ہلاک ہو جاتی کیونکہ ایسی صورت میں اس زمانہ کے مُفسد علماء یہی کہتے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی مذہب تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں۔ مگر اب صدیق اکبر کی آیت ممدوحہ پیش کرنے سے اس بات پر کل صحابہ کا اجماع ہو چکا کہ کُل گذشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں بلکہ اُس اجماع پر شعر بنائے گئے ابوبکر کی روح پر خدا تعالیٰ ہزاروں رحمتوں کی بارش کرے اُس نے تمام روحوں کو ہلاکت سے بچا لیا اور اِس اجماع میں تمام صحابہ شریک تھے ایک فرد بھی ان میں سے باہر نہ تھا اور یہ صحابہ کا پہلا اجماع تھا اور نہایت قابل شکر کارروائی تھی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مسیح موعود کی باہم ایک مشابہت ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ قرآن شریف میں دونوں کی نسبت یہ تھا کہ جب ایک خوف کی حالت اسلام پر طاری ہوگی اور سلسلہ مرتد ہونے کا شروع ہوگا تب اُن کا ظہور ہوگا۔ سو حضرت ابوبکر اور مسیح موعود کے وقت میں ایسا ہی ہُوا یعنی حضرت ابوبکر کے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدہا جاہل عرب مُرتد ہو گئے تھے اور صرف دو مسجدیں باقی تھیں جن میں نماز پڑھی جاتی تھی حضرت ابوبکر نے دوبارہ اُن کو اسلام پر قائم کیا ایسا ہی مسیح موعود کے وقت میں کئی لاکھ انسان اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی بن گئے اور یہ دونوں حالات قرآن شریف میں مذکور ہیں یعنی پیشگوئی کے طور پر اُن کا ذکر ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۲ حاشیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ کی وفات سے سخت صدمہ گذرا تھا اور اِسی صدمہ کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے بعض منافقوں کے کلمات سُن کر فرمایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور منافقوں کے ناک اور کان کاٹیں گے پس چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لیے اوّل حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہ صدیقہ کے گھر آئے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ پر سے چادر اٹھا کر پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور کہا اَنْتَ طَیِّبٌ حَیًّا وَّ مَیِّتًا لَنْ یَّجْمَعَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْمَوْتَتَیْنِ اِلَّا مَوْتَتَکَ الْاُوْلٰی یعنی تُو زندہ اور میّت ہونے کی حالت میں پاک ہے خدا تعالیٰ ہرگز تیرے پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا مگر پہلی موت۔ اِس قول سے مطلب یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں واپس نہیں آئیں گے اور پھر تمام اصحاب رضی اللہ عنہم کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور حُسن اتفاق سے اس دن تمام صحابہؓ جو زندہ تھے مدینہ میں موجود تھے پس سب کو جمع کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر یہ آیت پڑھی وَمَا

مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف نبی ہیں اور پہلے اس سے سب نبی فوت ہو چکے ہیں پس کیا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو جائیں یا قتل کیے جائیں تو تم لوگ دین کو چھوڑ دو گے یہ پہلا اجماع تھا جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوا جس سے ثابت ہوا کہ کل نبی فوت ہو چکے ہیں جن میں حضرت عیسٰی بھی داخل ہیں اور یہ کہنا کہ خَلَتْ کے معنوں میں زندہ آسمان پر جانا بھی داخل ہے یہ سراسر ہٹ دھرمی ہے کیونکہ عرب کی تمام لغت دیکھنے سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ زندہ آسمان پر جانے کے لیے بھی خلت کا لفظ آسکتا ہے۔

ماسوا اس کے اس جگہ اللہ تعالیٰ نے خَلَتْ کے معنے دوسرے فقرہ میں خود بیان فرما دئے ہیں کیونکہ فرمایا اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ۔ پس خَلَتْ کے معنے دو صورتوں میں محدود کر دئے ایک یہ کہ طبعی موت سے مرنا دوسرے قتل کیے جانا ورنہ تشریح یوں ہونی چاہیئے تھی اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ اَوْ رُفِعَ اِلَی السَّمَآءِ مَعَ جِسْمِهِ الْعُنْصُرِیِّ یعنی اگر مر جائے یا قتل کیا جائے یا مع جسم آسمان پر اُٹھا دیا جائے یہ تو بلاغت کے برخلاف ہے کہ جس قدر معنوں پر خلت کا لفظ بقول مخالفین مشتمل تھا ان میں سے صرف دو معنے لیے اور تیسرے کا ذکر تک نہ کیا ماسوا اس کے اصل مطلب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ تھا کہ دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نہیں آئیں گے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر بوسہ دینے کے وقت حضرت ابوبکر نے اس کی تصریح بھی کر دی تھی تو بہرحال مخالف کو ماننا پڑیگا کہ کسی طرح حضرت عیسٰی دنیا میں نہیں آسکتے گو بفرض محال زندہ ہوں ورنہ غرض استدلال باطل ہو جائے گی اور یہ صحابہ کا اجماع وہ چیز ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴ حاشیہ)

یہ صحیح نہیں ہے کہ خلت کا لفظ اور تمام نبیوں کے لیے تو وفات دینے کے لیے آتا ہے مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے اِن معنوں پر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھا لیا یہ دعویٰ سراسر بے دلیل ہے اِس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ جہاں جہاں قرآن شریف میں خَلَتْ کا لفظ آیا ہے وفات کے معنوں پر ہی آیا ہے اور کوئی شخص قرآن شریف سے ایک بھی ایسی نظیر پیش نہیں کر سکتا کہ اِن معنوں پر آیا ہو کہ کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھایا گیا۔ ماسوا اس کے جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں خدا تعالیٰ نے انہیں آیات میں خَلَتْ کے لفظ کی خود تشریح فرما دی ہے اور خلت کے مفہوم کو صرف موت اور قتل میں محدود کر دیا ہے۔ یہی آیۃ شریفہ ہے جس کی رُو سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اِس بات پر اجماع ہو گیا تھا کہ تمام نبی اور رسول فوت ہو چکے ہیں اور کوئی ان میں سے دنیا میں واپس آنے والا نہیں بلکہ اِس اجماع کی اصل غرض یہی تھی کہ دنیا میں واپس آنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اور اس اجماع سے اُس خیال کا ازالہ مطلوب تھا کہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں آیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں واپس آئیں گے اور منافقوں کے ناک اور کان کاٹیں گے۔ اِس صورت میں ظاہر ہے کہ اگر اسلام میں کسی نبی کا دنیا میں واپس آنا تسلیم کیا جاتا تو اس آیت کے پڑھنے سے حضرت عمرؓ کے خیال کا ازالہ غیر ممکن ہوتا اور ایسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کسر شان تھی

بلکہ ایسی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کا اس آیت کو پڑھنا ہی بے محل تھا۔ غرض یہ آیت بھی وہ عالیشان آیت ہے کہ جو حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا بلند آواز سے اعلان کرتی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۵-۲۱۶)

مَیں تم کو سچ سچ کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی ضرورت دنیا اور مسلمانوں کو تھی اس قدر ضرورت مسیح کے وجود کی نہیں تھی۔ پھر آپ کا وجود باجود وہ مبارک وجود ہے کہ جب آپ نے وفات پائی تو صحابہ کی یہ حالت تھی کہ وہ دیوانے ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار میان سے نکال لی۔ اور کہا کہ اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مردہ کہیگا تو میں اس کا سر جدا کر دوں گا اس جوش کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک خاص نور اور فراست عطا کی انہوں نے سب کو اکٹھا کیا اور خطبہ پڑھا مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہیں اور آپ سے پیشتر جس قدر رسول آئے وہ سب وفات پا چکے۔ اب آپ غور کریں اور سوچ کر بتائیں کہ حضرت ابوبکر صدیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر یہ آیت کیوں پڑھی تھی اور اس سے آپ کا کیا مقصد اور منشاء تھا اور پھر ایسی حالت میں کہ کل صحابہ موجود تھے میں یقیناً کہتا ہوں اور آپ انکار نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے صحابہ کے دل پر سخت صدمہ تھا اور اس کو بے وقت اور قبل از وقت سمجھتے تھے وہ پسند نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُنیں ایسی حالت اور صورت میں کہ حضرت عمر رضی اللہ جیسا جلیل القدر صحابی اس جوش کی حالت میں ہو ان کا غصہ فرو نہیں ہو سکتا بجز اس کے کہ یہ آیت ان کی تسلی کا موجب ہوتی۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا یا یہ یقین ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ تو زندہ ہی مر جاتے وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشّاق تھے اور آپ کی حیات کے سوا کسی اور کی حیات کو گوارا ہی نہ کر سکتے تھے پھر کیونکر اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو وفات یافتہ دیکھتے اور مسیح کو زندہ یقین کرتے یعنی جب حضرت ابوبکر نے خطبہ پڑھا تو ان کا جوش فرو ہو گیا اس وقت صحابہ مدینہ کی گلیوں میں یہ آیت پڑھتے پھرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ گویا یہ آیت آج ہی اتری ہے۔ اس وقت حسّان بن ثابت نے ایک مرثیہ لکھا جس میں انہوں نے کہا ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ　فَعَمِیَ عَلَیْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْیَمُتْ　فَعَلَیْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

چونکہ مذکورہ بالا آیت نے بتا دیا تھا کہ سب مر گئے اس لیے حسّان نے بھی کہہ دیا کہ اب کسی کی موت کی پروا نہیں یقیناً سمجھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی کی زندگی صحابہ پر سخت شاق تھی اور وہ ان کو گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر یہ پہلا اجماع تھا جو دنیا میں ہوا اور اس میں حضرت مسیح کی وفات کا بھی کل فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں بار بار اس امر میں اس لیے زور دیتا ہوں کہ یہ دلیل بڑی ہی زبردست دلیل ہے جس سے مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کوئی معمولی اور چھوٹا امر نہ تھا جس کا صدمہ صحابہ کو نہ ہوا ہو۔

ایک گاؤں کا نمبردار یا محلہ دار یا گھر کا کوئی عمدہ آدمی مر جائے تو گھر والوں۔ محلہ والوں یا دیہات والوں کو صدمہ

ہوتا ہے پھر وہ نبیؐ جو کل دنیا کے لیے آیا تھا اور رحمۃ للعالمین ہو کر آیا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ [۱] اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا [۲] پھر وہ نبیؐ جس نے صدق اور وفا کا نمونہ دکھایا اور وہ کمالات دکھائے کہ جن کی نظیر نظر نہیں آتی وہ فوت ہو جاوے۔ اس کے ان جان نثار متبعین پر اثر نہ پڑے جنہوں نے اس کی خاطر جانیں دے دینے سے دریغ نہ کیا جنہوں نے وطن چھوڑا خویش و اقارب چھوڑے اور اس کے لیے ہر قسم کی تکلیفوں اور مشکلات کو اپنے لیے راحت جان سمجھا۔ ایک ذرا سے فکر اور توجہ سے یہ بات سمجھ میں آجاتی۔ کہ جس قدر بھی دکھ اور تکلیف انہیں اس خیال کے تصور سے ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اور قیاس ہم نہیں کر سکتے۔ ان کی تسلی اور تسکین کا موجب یہی آیت تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نے پڑھی اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے ایسے نازک وقت میں صحابہ کو سنبھالا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض نادان اپنی جلد بازی اور شتاب کاری کی وجہ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت تو بیشک حضرت ابوبکرؓ نے پڑھی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے باہر رہ جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ایسے نادانوں کو میں کیا کہوں وہ باوجود مولوی کہلانے کے ایسی بیہودہ باتیں پیش کر دیتے ہیں وہ نہیں بتاتے کہ اس آیت میں وہ کونسا لفظ ہے جو حضرت عیسیٰ کو الگ کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تو کوئی امر قابل بحث اس میں چھوڑا ہی نہیں قَدْ خَلَتْ کے معنے خود ہی کر دئے اَفَاِئنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ۔ اگر کوئی تیسری شق بھی اس کے سوا ہوتی تو کیوں نہ کہہ دیتا اَوْ رُفِعَ بِجَسَدِ الْعُنْصُرِیِّ اِلَی السَّمَآءِ کیا خدا تعالیٰ اس کو بھول گیا تھا جو یہ یاد دلاتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ کا دوبارہ دُنیا میں آنا اجماعی عقیدہ ہے یہ سراسر افترا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع صرف اس آیت پر ہوا تھا کہ۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ پھر بعد ان کے اُمّت میں طرح طرح کے فرقے پیدا ہو گئے چنانچہ معتزلہ اب تک حضرت عیسیٰ کی وفات کے قائل ہیں اور بعض اکابر صوفیہ بھی ان کی موت کے قائل ہیں اور مسیح موعود کے ظہور سے پہلے اگر امت میں سے کسی نے یہ خیال بھی کیا کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دُنیا میں آئیں گے تو ان پر کوئی گناہ نہیں صرف اجتہادی خطا ہے جو اسرائیلی نبیوں سے بھی بعض پیشگوئیوں کے سمجھنے میں ہوتی رہی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۱ حاشیہ)

اس بات پر زور دینا کہ اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں آئیں گے یہ عجیب افترا ہے جو سمجھ نہیں آتا۔ اگر اتفاق سے مراد صحابہ کا اتفاق ہے تو یہ اُن پر تہمت ہے اُن کی تو بلا کو بھی اس مستحدث عقیدہ کی خبر نہیں تھی کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں آجائیں گے اور اگر اُن کا یہ عقیدہ ہوتا تو اس آیت کے مضمون پر زور و کر کیوں اتفاق کیا جاتا۔ کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک انسان رسول تھے خدا تو نہیں تھے اور ان سے پہلے سب رسول دُنیا سے گذر گئے ہیں۔ پس اگر حضرت عیسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک دُنیا سے نہیں گذرے تھے اور اُن کو اُس وقت تک ملک الموت چھو نہیں گیا تھا۔ تو اس آیت کے سُننے کے بعد کیونکر صحابہ رضی اللہ عنہم

---

[۱] الانبیاء آیت ۱۰۸ ٭ [۲] الاعراف آیت ۱۵۹ ٭

نے اس عقیدہ سے رجوع کرلیا کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دُنیا میں آئیں گے۔ ہرایک کو معلوم ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُس دن تمام صحابہ کو مسجد نبوی میں پڑھ کر سنائی تھی جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تھی اور وہ پیر کا دن تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دفن نہیں کیے گئے تھے اور عائشہ صدیقہ کے گھر میں آپ کی میّت مُطہّر تھی کہ شدّت دردِ فراق کی وجہ سے بعض صحابہ کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت میں فوت نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں اور پھر دنیا میں آئیں گے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس فتنہ کو خطرناک سمجھ کر اسی وقت تمام صحابہ کو جمع کیا اور اتفاق سے اُس دن کل صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ میں موجود تھے تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور فرمایا کہ میں نے سُنا ہے کہ بعض ہمارے دوست ایسا ایسا خیال کرتے ہیں مگر سچ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور ہمارے لیے یہ کوئی خاص حادثہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے کوئی نبی نہیں گزرا جو فوت نہیں ہوا۔ پھر حضرت ابوبکر نے یہ آیت پڑھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف انسان رسول تھے خدا تو نہیں تھے۔ سو جیسے پہلے اس سے سب رسول فوت ہو چکے ہیں آپ بھی فوت ہو گئے۔

تب اس آیت کو سُن کر تمام صحابہ چشم پُرآب ہو گئے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ اور اس آیت نے ان کے دلوں میں ایسی تاثیر کی کہ گویا اُسی روز نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ بعد اس کے حسّان بن ثابت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ مرثیہ بنایا۔

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ فَعَمِیْ عَلَیْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْیَمُتْ فَعَلَیْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

یعنی تو میری آنکھوں کی پتلی تھا۔ میں تو تیری موت سے اندھا ہو گیا۔ اب بعد اس کے جو چاہے مرے مجھے تو تیرے ہی مرنے کا خوف تھا۔ اِس شعر میں حسّان بن ثابت نے تمام نبیوں کی موت کی طرف اشارہ کیا ہے گویا وہ کہتا ہے کہ ہمیں اس کی کیا پرواہ ہے کہ موسیٰ مر گیا ہو یا عیسیٰ مر گیا ہو ہمارا ماتم تو اس نبی محبوب کے لیے ہے جو آج ہم سے علیحدہ ہو گیا اور آج ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہو گیا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اِس غلط عقیدہ میں بھی مبتلا تھے کہ گویا حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں آئیں گے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ پیش کرکے یہ غلطی دور کر دی اور اسلام میں یہ پہلا اجماع تھا کہ سب نبی فوت ہو چکے ہیں۔

غرض اِس مرثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کم تدبر کرنے والے صحابی جن کی درایت اچھی نہیں تھی (جیسے ابوہریرہ) وہ اپنی غلط فہمی سے عیسیٰ موعود کے آنے کی پیشگوئی پر نظر ڈال کر یہ خیال کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ ہی آجائیں گے جیسا کہ ابتدا میں ابوہریرہ کو بھی یہی دھوکا لگا ہوا تھا۔ اور اکثر باتوں میں ابوہریرہ بوجہ اپنی سادگی اور کمی درایت کے ایسے دھوکوں میں پڑ جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک صحابی کے آگ میں پڑنے کی پیشگوئی میں بھی اس کو یہی دھوکہ لگا تھا......

غرض تمام صحابہ کا اجماع حضرت عیسیٰ کی موت پر تھا بلکہ تمام انبیاء کی موت پر اجماع ہو گیا تھا اور یہی پہلا اجماع

تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوا۔ اسی اجماع کی وجہ سے تمام صحابہ حضرت عیسیٰ کی موت کے قایل تھے اور اسی وجہ سے حسان بن ثابت نے مذکورہ بالا مرثیہ بنایا تھا جس کا ترجمہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو تو میری آنکھوں کی پتلی تھا میں تو تیرے مرنے سے اندھا ہو گیا اب تیرے بعد جو شخص چاہے مرے عیسیٰ ہو یا موسیٰ مجھے تو تیرے ہی مرنے کا خوف تھا۔ اور درحقیقت صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق صادق تھے۔ اور اُن کو کسی طرح یہ بات گوارا نہ تھی کہ عیسیٰ جس کا وجود شرک عظیم کی جڑھ قرار دیا گیا ہے زندہ ہو اور آپ فوت ہو جائیں پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر معہ جسم عنصری زندہ بیٹھے ہیں اور اُن کا برگزیدہ نبی فوت ہو گیا تو وُہ مارے غم کے مَر جاتے۔ کیونکہ اُن کو ہرگز اِس بات کی برداشت نہ تھی کہ کوئی اَور نبی زندہ ہو اور اُن کا پیارا نبی قبر میں داخل ہو جائے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۴-۳۵)

جو شخص حضرت عیسیٰ کو آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ سے باہر رکھتا ہے اُس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ عیسیٰ انسان نہیں ہے اور نیز ظاہر ہے کہ اِس صورت میں حضرت ابوبکرؓ کا اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ٹھہرتا کیونکہ جبکہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر زندہ مع جسم عنصری موجود ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو اِس آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کونسی تسلی ہو سکتی تھی۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۳۔ حاشیہ)

حضرت عیسیٰ نے جو میرے قتل کرنے کے لیے چراغ دین کو عصا دیا معلوم نہیں کہ یہ جوش اور غضب کیوں ان کے دل میں بھڑکا۔ اگر اس لیے ناراض ہو گئے کہ میں نے ان کا مرنا دنیا میں شایع کیا ہے تو یہ ان کی غلطی ہے یہ میں نے شایع نہیں کیا بلکہ اُس نے شایع کیا ہے جس کی مخلوق ہماری طرح حضرت عیسیٰ بھی ہیں اگر شک ہو تو یہ آیت دیکھیں مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۳ حاشیہ)

اَیُصِرُّوْنَ عَلٰی حَیٰوۃِ عِیْسٰی وَیُخْفُوْنَ اِجْمَاعًا اتَّفَقَ عَلَیْہِ الصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ وَیَتَّبِعُوْنَ غَیْرَ سَبِیْلِ قَوْمٍ اَدْرَکُوْا صُحْبَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمْ اسْتَفَاضَ مِنَ النَّبِیِّ وَتَعَلَّمَ وَانْعَقَدَ اِجْمَاعُھُمْ عَلٰی مَوْتِ عِیْسٰی وَھُوَ الْاِجْمَاعُ الْاَوَّلُ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَیَعْلَمُہُ الْعَالِمُوْنَ۔ اَنَسِیْتُمْ قَوْلَ اللّٰہِ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَوْ اَنْتُمْ لِلْکُفْرِ مُتَعَمِّدُوْنَ۔ وَقَدْ مَاتَ عَلٰی ھٰذَا

(ترجمہ) کیا یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر اصرار کرتے ہیں اور اُس اجماع کو چھپاتے ہیں جس پر سارے کے سارے صحابہؓ متفق ہو گئے تھے اور وہ صحابہ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت پایا یہ لوگ ان کا راستہ چھوڑ کر دوسرے کی پیروی کرتے ہیں ان صحابہ میں سے ہر ایک نے رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کیا اور سیکھا اور ان کا موت مسیح پر اجماع ہوا اور رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ صحابہ کا پہلا اجماع ہے اور تمام علم والے اسے جانتے ہیں۔ کیا تم خدا تعالیٰ کے قول قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ کو بھول گئے یا تم بالارادہ کفر کے مرتکب ہو رہے ہو حالانکہ اسی اجماع

اَلْاِجْمَاعُ مَنْ کَانَ مِنَ الصَّحَابَۃِ۔ ثُمَّ صِرْتُمْ شِیَعًا وَّھَبَّتْ فِیْکُمْ رِیْحُ التَّفْرِقَۃِ۔ وَمَا اُوْتِیْتُمْ سُلْطَانًا عَلٰی حَیَاتِہٖ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَظُنُّوْنَ۔ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ حِکَایَۃً عَنْ عِیْسٰی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[1] فَـلَا تُفَکِّرُوْنَ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ وَلَا تَتَوَجَّھُوْنَ۔ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ اَوْ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الاستفتاء ضمیمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۴۳)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر نکلے کہ اگر کوئی کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا ہے تو میں اسے قتل کروں گا ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیق نے بڑی جرأت اور دلیری سے کلام کیا اور کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک رسول ہی ہیں اور آپ سے پہلے جس قدر نبی ہو گذرے ہیں سب نے وفات پائی ہے۔ اس پر وہ جوش فرو ہوا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

تمام صحابہ کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہی پر یہ ہوتی ہے کہ سب نبی مر گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ابھی نہیں مرے اور تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر یہ خطبہ پڑھتے ہیں کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ۔ اب اس موقعہ پر جو ایک قیامت ہی کا میدان تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور کل صحابہ جمع ہیں یہاں تک کہ اسامہ کا لشکر بھی روانہ نہیں ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت ابوبکرؓ باآواز بلند کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور اس پر استدلال کرتے ہیں مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ سے اب اگر صحابہ کے وہم و گمان میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہوتی تو ضرور بول اُٹھتے مگر سب خاموش ہو گئے اور بازاروں میں یہ آیت پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ گویا یہ آیت آج اُتری ہے۔

معاذ اللہ صحابہ منافق نہ تھے جو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رعب میں آکر خاموش ہو رہے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی تردید نہ کی نہیں اصل بات یہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ نے بیان کی اس لیے سب نے گردن جھکالی۔ یہ ہے اجماع صحابہ کا۔ حضرت عمرؓ بھی تو یہی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آئیں گے اگر یہ استدلال کامل نہ ہوتا اور کامل تب ہی ہوتا کہ

کے عقیدہ پر تمام صحابہ نے وفات پائی۔ پھر تم گروہ در گروہ ہو گئے اور تم میں تفرقہ کی ہوا چل پڑی۔ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ تم صرف گمان کی پیروی کرتے ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی زبان سے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کا فقرہ بیان فرمایا ہے لیکن تم اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور نہیں کرتے اور نہ اس طرف توجہ کرتے ہو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ یا تم وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (الاستفتاء (مشمولہ حقیقۃ الوحی) صفحہ ۴۳۔ (از عربی)

کسی قسم کا استثناء نہ ہوتا کیونکہ اگر حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور انہوں نے پھر آنا تھا تو پھر یہ استدلال کیا یہ تو ایک مسخری ہوتی۔) تو خود حضرت عمرؓ ہی تردید کرتے۔

---

[1] المائدہ آیت ۱۱۸

جبکہ آیت میں استثنا نہ تھا اور امر واقعی یہی تھا اس لیے سب صحابہ نے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کر لیا...... اب مولویوں سے پوچھو کہ ابو بکرؓ دانشمند تھا یا نہیں؟ کیا یہ وہ ابو بکرؓ نہیں جو صدیق کہلایا؟ کیا یہی وہ شخص نہیں جو سب سے پہلے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنا جس نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی کہ خطرناک ارتداد کی وبا کو روک دیا۔ اچھا اور باتیں جانے دو یہی بتاؤ کہ ابو بکرؓ کو منبر پر چڑھنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ پھر تقوی سے یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ پڑھا تو اس سے استدلال تام کرنا تھا یا ایسا ناقص کہ ایک بچہ بھی کہہ سکتا کہ عیسیٰ کو موتی سمجھنے والا کافر ہوتا ہے۔

افسوس! ان مخالفوں نے میری مخالفت اور عداوت میں یہی نہیں کہ قرآن کو چھوڑا بلکہ میری عداوت نے ان کی یہاں تک نوبت پہنچائی ہے کہ صحابہ کی کل جماعت پر انہوں نے اپنے طریق عمل سے کفر کا فتویٰ دیدیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق کے استدلال کو استخفاف کی نظر سے دیکھا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ایک سُنت یہ بھی تھی کہ آپ فوت ہو گئے قرآن شریف میں تھا کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی سب مرگئے وہ بھی مریگا خدا کی بات پوری ہوگئی کہ آپ مرگئے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی تک کل اہل اسلام کا یہی مذہب رہا کہ کل نبی فوت ہو گئے ہیں چنانچہ صحابہ کرام کا بھی یہی مذہب تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی صحابہ کا اجماع ہوا حضرت عمرؓ وفات کے منکر تھے اور وہ آپ کو زندہ ہی مانتے تھے آخر ابو بکرؓ نے آکر مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کی آیت سنائی تو حضرت عمر اور دیگر صحابہ کو آپ کی موت کا یقین آیا اور اگر صحابہ کرام کا یہ عقیدہ ہوتا کہ کوئی نبی زندہ ہے تو سب اُٹھ کر ابو بکرؓ کی خبر لیتے کہ ہمارا عقیدہ مسیح کی نسبت ہے کہ وہ زندہ ہے تو کیسے کہتا ہے کہ سب نبی فوت ہو گئے اور کیا وجہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہ ہوں اگر بعض مرتے اور بعض زندہ ہوتے تو کسی قسم کا افسوس نہ ہوتا مگر غریب سے لے کر امیر تک سب مرتے ہیں پھر مسیح کو کیسے زندہ مانا جاوے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

قرآن شریف کے صریح الفاظ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ نے قتل نبی حرام کیا ہو بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ جس سے قتل انبیاء کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵۷)

اس پیغمبر کی شان میں جو افضل الرسل ہے۔ یہ بے ادبی نہ کرو۔ کہ حضرت مسیح کو اس سے افضل قرار دو کیا تم نہیں جانتے کہ آپ کی وفات پر صحابہ کی کیا حالت ہوئی تھی وہ دیوانہ وار پھرتے تھے آپ کی زندگی ان کو ایسی عزیز تھی کہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی تھی کہ اگر کوئی آپ کو مردہ کہے گا تو میں اس کا سر اُڑا دوں گا۔

اس شور پر حضرت ابو بکرؓ آئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا کہ آپ پر خدا دو موتیں جمع نہ کریگا اور پھر یہ آیت پڑھی۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی

ایک رسول ہیں آپ سے پہلے جس قدر رسول آئے ہیں سب وفات پا گئے ہیں صحابہ نے جب اس آیت کو سنا تو انہیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت اب اُتری ہے انہوں نے معلوم کیا کہ آپ کے مقابلہ میں کوئی اور زندہ نہیں ہے۔ تم میں وہ عشق اور محبت نہیں جو صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ ورنہ تم یہ کبھی روا نہ رکھتے کہ مسیح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل زندہ کہتے میں سچ کہتا ہوں کہ اگر صحابہ کے سامنے اس وقت کوئی کہتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہتا۔ وہ اس قدر آپ کے عشق اور محبت میں فنا شدہ تھے۔

حسان بن ثابت نے اس موقعہ پر ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں

کُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ　　فَعَمِیَ عَلَیْكَ النَّاظِرُ

مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْیَمُتْ　　فَعَلَیْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

یعنی اے میرے پیارے نبی تو تو میری آنکھوں کی پتلی تھی اور میرے دیدوں کا نور تھا بس میں تو تیرے مرنے سے اندھا ہو گیا۔ اب تیرے بعد میں دوسروں کی موت کا کیا غم کروں۔ عیسیٰ مرے یا موسیٰ مرے کوئی مرے مجھے تو تیرے ہی مرنے کا غم تھا۔ صحابہ کی تو یہ حالت تھی مگر اس زمانہ میں اپنے منہ سے اقرار کرتے ہیں کہ نبیں افضل الانبیا وفات پا گئے اور حضرت مسیح زندہ ہیں۔ افسوس مسلمانوں کی حالت کیا سے کیا ہو گئی۔ میں خوب جانتا ہوں اور اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا پہلا اجماع مسیح کی وفات ہی پر ہوا تھا۔ پھر ان کے خلاف کرنا یہ کونسی عقلمندی اور تقویٰ ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ غلطیاں امتداد زمانہ کی وجہ سے ہیں۔ تقویٰ نہیں رہا۔ جہالت بڑھ گئی ہے روبحق ہونا کم ہو گیا ہے راہ راست محجوب ہو گیا ہے۔ اور یہی امور ہیں جو میری ضرورت کے داعی ہیں۔　　(الحکم جلد ۸ ۳۱ صفحہ ۶ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء)

یہ کیا ہی مبارک اجماع تھا اگر یہ اجماع نہ ہوتا تو بڑا بھاری فتنہ اسلام میں پیدا ہوتا۔ اسلام میں سب سے پہلا اجماع مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ہی پر ہوا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منشاء تو اس صدمہ ہی کو دور کرنا تھا۔ اور وہ مرگ یاراں جشنے دارد ہی سے دور ہوتا تھا۔ اگر اس آیت کے استدلال میں حضرت مسیح کو مستثنیٰ کیا جاتا تو صحابہ کے درد کا کیا علاج ہوتا؟ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسیح سے کم درجہ پر تھے جو زندہ نہ رہتے۔ قَدْ خَلَتْ کے معنے تو خود اسی آیت میں اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ نے کر دئے ہیں کیا اس میں رفع بجسدہ العنصری بھی کہیں لکھا ہے غرض جس طرح پر کسی کی قوت شامہ ماری جاوے تو اُسے خوشبو کا حاسہ نہیں رہتا۔ اسی طرح پر ان لوگوں کی ایمانی قوت شامہ مر گئی ہے جو مسیح کو زندہ آسمان پر لے جاتے ہیں اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر حالت بہت خطرناک ہے یہی عقیدہ ان کی خدائی کی پہلی اینٹ قرار دیا گیا ہے۔　　(الحکم جلد ۹ ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

کہتے ہیں کہ خلت کے معنے موت کے نہیں مگر یہ تو ان کی غلطی ہے اس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے خلت کے معنے کر دئے ہیں اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ اگر اس کے سوا کوئی اور معنے ہوتے جو یہ کرتے ہیں تو پھر رفع الجسد العنصری بھی ساتھ ہوتا۔

مگر قرآن شریف میں تو ہے نہیں پھر ہم کیونکر تسلیم کر لیں۔ ایسی صورت میں درمیانی زمانہ کی شہادت کو ہم کیا کریں؟ اور پھر تعجب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی اس مذہب کے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس کی وفات کا اقرار کیا ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پہلا اجماع یہی کیا کہ مسیح فوت ہو گیا۔ جیسا کہ بارہا میں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی وفات پر تلوار نکال لی اور کہا کہ اگر کوئی آپ کو مُردہ کہے گا تو اُس کا سر اُڑا دوں گا اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک رسول ہیں اور آپ سے پیشتر سب رسول وفات پا چکے ہیں۔ اب بتاؤ اس میں مسیح یا کسی اور کی کیا خصوصیت ہے؟ کیا حضرت ابوبکر نے کسی کو باہر رکھ لیا تھا۔ اور صحابہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ وہ کسی اور کو تو زندہ تسلیم کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تجویز کریں کہ آپ نے وفات پائی ہے غرض صحابہ کا اجماع بھی موت پر مُہر کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہُوا۔ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر دلیل قاطع ہے جو اس آیت کے رُو سے اجماع تھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔

(بدر جلد ۱ ۳۳ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

انسان کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہر بات کو قبل از وقت سمجھتا ہے اس لیے جب اس کی کوئی محبوب چیز جاتی رہے تو پھر ضرور غمگین ہوتا ہے یہ ایک فطرتی تقاضا ہے صحابہ کی حالت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھی۔ ان کو تو قریباً ایک قسم کا جنون ہو گیا تھا۔ اس غم میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں ان پر آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو وہ جوش آیا کہ انہوں نے تلوار ہی نکال لی کہ جو شخص کہے گا کہ آپ وفات پا گئے ہیں میں اسے قتل کر دوں گا گویا وہ یہ لفظ بھی سُننا نہ چاہتے تھے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا۔ اور آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ پڑھی تو ان کا جوش فرو ہوا۔ یہ آیت دراصل ایک جنگ میں نازل ہوئی تھی جبکہ شیطان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی آواز دی گئی۔ مگر اس وقت جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھا تو صحابہ سمجھتے تھے کہ گویا یہ آیت ابھی اُتری ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۴۳ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

عقیدہ میں یہ بات ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ہم اور نبیوں کی طرح فوت شدہ مانتے ہیں اور ایک مسلمان کی محبت جو اسے اپنے متبوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ جب آپ فوت ہو گئے۔ تو ان کے بعد کسی کو زندہ نہ سمجھے صحابہ کرام کس قدر درد دل میں تھے جب مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سنا تو سب کو ٹھنڈ پڑ گئی

(الحکم جلد ۱۱ ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

خَلَتْ کا لفظ قرآن شریف کے محاورے میں ہرگز کسی ایسے شخص کے واسطے استعمال نہیں ہوا جو زندہ ہو بلکہ ہمیشہ وفات یافتہ لوگوں پر ہی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی یہی معنے کیے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر جب حضرت عمرؓ نے جوش محبت اور وفور الفت کی وجہ سے تلوار کھینچ لی تھی اور آپؓ ننگی تلوار لیے گلیوں میں پھرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جو کوئی کہے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے ہیں۔ اس کی گردن مار دوں گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ سے خبر پاکر مسجد میں آئے۔ اور منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں ابتداءً یہی آیت پڑھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ الخ اس وقت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس آیت کو سن کر رو پڑے اور یہ سمجھا کہ گویا یہ آیت آج ہی اتری ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی جن کو اتنا جوش تھا۔ کہ تلوار لیے پھرتے تھے۔ اور ان کا یہ خیال تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی وفات نہیں پائی۔ اس خطبہ کے بعد تلوار چھوڑ دی اور پھر کبھی کوئی ایسا ذکر نہ کیا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر صحابہ میں سے کسی ایک نفس واحد کا بھی یہ اعتقاد ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ بجسم عنصری آسمان پر ہیں۔ تو کیوں وہ اس وقت اعتراض نہ کرتے اور کہتے۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ ایک چھوٹی سی قوم کا رسول تو زندہ ہے پر ہمارا رسول جس کو خدا نے تمام جہان کے واسطے قیامت تک کی تمام انسانی نسلوں کے لیے بلاکسی خصوصیت کے بھیجا۔ وہ تو ستّر برس تک بھی زندہ نہ رہ سکے پس صحابہ کا سکوت اور خاموشی اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے۔ کہ تمام صحابہؓ حضرت عیسیٰ کو دوسرے انبیاء کی طرح وفات یافتہ یقین کرتے تھے۔ اور کسی ایک کا بھی ہرگز یہ اعتقاد نہ تھا۔ کہ وہ آسمان پر زندہ بجسم عنصری خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھے ہیں اور یہ اسلام میں سب سے پہلا اجماع ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ۝

سچ تو یہ ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کسی جاندار پر حقیقی موت وارد نہ کرے وہ مر نہیں سکتا اگرچہ وہ ٹکڑے ٹکڑے کیا جاوے۔ .... وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۲۱ حاشیہ)

قرآن شریف میں ہے۔ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ تَمُوْتَ میں روحانی اور جسمانی دونوں باتیں

رکھی ہوئی ہیں ایسے ہی ھدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا۟ رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِىٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ○

یعنی اے ہمارے خدا ہمارے گناہ بخش اور جو اپنے کاموں میں ہم حد سے گذر جاتے ہیں وہ بھی معاف فرما۔ پس ظاہر ہے کہ اگر خدا گناہ بخشنے والا نہ ہوتا تو ایسی دعا ہرگز نہ سکھلاتا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۷)

سَنُلْقِى فِى قُلُوبِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلرُّعْبَ بِمَآ أَشْرَكُوا۟ بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ سُلْطَٰنًا ۖ وَمَأْوَىٰهُمُ ٱلنَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى ٱلظَّٰلِمِينَ ○

عنقریب ہم ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۶۲ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۴)

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنۢ بَعْدِ ٱلْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَآئِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ ظَنَّ ٱلْجَٰهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ ٱلْأَمْرِ مِن شَىْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ ٱلْأَمْرَ كُلَّهُۥ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِىٓ أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ ٱلْأَمْرِ شَىْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَٰهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِى بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ ٱلَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ ٱلْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِىَ ٱللَّهُ مَا فِى صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِى قُلُوبِكُمْ ۗ وَٱللَّهُ

عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝

اس جگہ ڈپٹی صاحب نے جو یہ آیت پیش کی ہے یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ اور اس سے ان کا مدعا یہ ہے کہ اس سے جبر ثابت ہوتا ہے یہ ان کی غلط فہمی ہے دراصل بات یہ ہے کہ امر کے معنے حکم اور حکومت کے ہیں اور یہ بعض ان لوگوں کا خیال تھا جنہوں نے کہا کہ کاش اگر حکومت میں ہمارا دخل ہوتا تو ہم ایسی تدابیر کرتے جس سے یہ تکلیف (جو) جنگ احد میں ہوئی ہے پیش نہ آتی اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ یعنی تمام امر خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تمہیں اپنے رسول کریم کا تابع رہنا چاہئیے اب دیکھنا چاہیئے کہ اس آیت کو قدر سے کیا تعلق ہے سوال تو صرف بعض آدمیوں کا اتنا تھا کہ اگر ہماری صلاح اور مشورہ لیا جاوے تو ہم اس کے مخالف صلاح دیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو منع فرمایا کہ اس امر کی اجتہاد پر بنا نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ (جنگ مقدس پرچہ یکم جون ۱۸۹۳ء)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۝

یہ خدا کی رحمت ہے کہ تو ان پر نرم ہوا اور اگر تو سخت دل ہوتا تو یہ لوگ تیرے نزدیک نہ آتے اور تجھ سے الگ ہو جاتے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۹۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

ایک شخص نے اپنی خانگی تکالیف کا ذکر کیا فرمایا پورے طور پر خدا پر توکل یقین اور امید رکھو تو سب کچھ ہو جاویگا اور ہمیں خطوط سے ہمیشہ یاد کراتے رہا کرو ہم دعا کریں گے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۵-۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۷)

انسان کو مشکلات کے وقت اگرچہ اضطراب ہوتا ہے مگر چاہیئے کہ توکل کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدر کے موقع پر سخت اضطراب ہوا تھا چنانچہ عرض کرتے تھے کہ یَا رَبِّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ فَلَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا۔ مگر آپ کا اضطراب فقط بشری تقاضا سے تھا کیونکہ دوسری طرف توکل کو آپ نے ہرگز ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ آسمان کی طرف نظر تھی اور یقین تھا کہ خدا تعالیٰ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ یاس کو قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ایسے اضطرابوں کا آنا تو انسانی اخلاق اور مدارج کی تکمیل کے واسطے ضروری ہے مگر انسان

کو چاہیئے کہ یاس کو پاس نہ آنے دے۔ کیونکہ یاس تو کفار کی صفت ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

توکل یہی ہے کہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے کسی امر کے حاصل کرنے کے واسطے مقرر کیے ہوئے ہیں ان کو حتی المقدور جمع کرو اور پھر خود دعاؤں میں لگ جاؤ کہ اے خدا تو ہی اس کا انجام بخیر کر۔ صدہا آفات ہیں اور ہزاروں مصائب ہیں جو ان اسباب کو بھی برباد و تہ و بالا کر سکتے ہیں اُن کی دست برد سے بچا کر ہمیں سچی کامیابی اور منزل مقصود پر پہنچا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

توکل ایک طرف سے توڑ اور ایک طرف جوڑ کا نام ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۶)

جب انسان خدا پر سے بھروسا چھوڑتا ہے تو دہریت کی رگ اس میں پیدا ہو جاتی ہے خدا پر بھروسا اور ایمان اس کا ہوتا ہے جو اُسے ہر بات پر قادر جانتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

اسلام کی خدمت جو شخص درویشی اور قناعت سے کرتا ہے وہ ایک معجزہ اور نشان ہو جاتا ہے جو جمعیت کے ساتھ کرتا ہے اس کا مزا نہیں آتا۔ کیونکہ توکل علی اللہ کا پورا لطف نہیں رہتا اور جب توکل پر کام کیا جاوے تو خدا مدد کرتا ہے۔ اور یہ باتیں روحانیت سے پیدا ہوتی ہیں جب روحانیت انسان کے اندر پیدا ہو تو وہ وضع بدل دیتا ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح پر صحابہ کی وضع بدل دی یہ سارا کام اس کشش نے کیا جو صادق کے اندر ہوتی ہے یہ خیالات باطل ہیں کہ کئی لاکھ روپیہ ہو تو کام چلے خدا تعالیٰ پر توکل کر کے جب ایک کام شروع کیا جاوے اور اصل غرض اُس کے دین کی خدمت ہو تو وہ خود مددگار ہو جاتا ہے اور سارے سامان اور اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

جو لوگ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کا نام خدا پر بھروسہ ہے اسباب سے کام لینا اور خدا تعالیٰ کے عطا کردہ قویٰ کو کام میں لگانا۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی قدر ہے جو لوگ ان قویٰ سے کام نہیں لیتے اور منہ سے کہتے ہیں کہ ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں وہ بھی جھوٹے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو آزماتے ہیں۔ اور اس کی عطا کی ہوئی قوتوں اور طاقتوں کو لغو قرار دیتے ہیں اور اس طرح پر اس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے مفہوم سے دور جا پڑتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں جہاں تک ممکن اور طاقت ہو رعایت اسباب کرے۔ لیکن ان اسباب کو اپنا معبود اور مشکل کشا قرار نہ دے بلکہ کام لیکر پھر تفویض الی اللہ کرے اور اس بات پر سجدات شکر بجا لائے کہ اسی خدا نے وہ قویٰ اور طاقتیں اس کو عطا فرمائی ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

انسان کو چاہیئے کہ تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دیوے اور خدا پر بھروسہ رکھے تو پھر اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو سکتی خدا پر بھروسہ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ انسان تدبیر کو ہاتھ سے چھوڑ دے بلکہ یہ معنے ہیں کہ تدبیر پوری کر کے پھر انجام کو خدا پر چھوڑے اس کا نام توکل ہے اگر وہ تدبیر نہیں کرتا اور صرف توکل کرتا ہے تو اس کا توکل پھوکا (جس کے اندر کچھ نہ ہو) ہوگا۔ اور

اگر زری تدبیر کرکے اُس پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا پر توکل نہیں ہے تو وہ تدبیر بھی پھوکی رجس کے اندر کچھ نہ ہوا ہو گی۔ ایک شخص اونٹ پر سوار تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے دیکھا تعظیم کے لیے نیچے اترا اور ارادہ کیا کہ توکل کرے اور تدبیر نہ کرے چنانچہ اس نے اپنے اونٹ کا گھٹنا نہ باندھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آیا تو دیکھا کہ اونٹ نہیں ہے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں نے تو توکل کیا تھا لیکن میرا اونٹ جاتا رہا آپ نے فرمایا کہ تونے غلطی کی پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھتا اور پھر توکل کرتا تو ٹھیک ہوتا۔ (البدر جلد ۳ صفحہ ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

ایک روز میں[1] حضور اقدس کی خدمت میں اندر بیٹھا تھا۔ خدا تعالیٰ پر توکل کی بات چل پڑی حضور اقدس نے فرمایا میں اپنے قلب کی عجیب کیفیت پاتا ہوں جیسے سخت حبس ہوتا اور گرمی کمال شدت کو پہنچ جاتی ہے لوگ وثوق سے اُمید کرتے ہیں کہ اب بارش ہوگی ایسا ہی جب اپنی صندوقچی کو خالی دیکھتا ہوں تو مجھے خدا کے فضل پر یقین واثق ہوتا ہے کہ اب یہ بھرے گی اور ایسا ہی ہوتا ہے۔

اور خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر فرمایا کہ جب میرا کیسہ خالی ہوتا ہے جو ذوق و سرور خدا تعالیٰ پر توکل کا اُس وقت مجھے حاصل ہوتا ہے میں اس کی کیفیت بیان نہیں کرسکتا اور وہ حالت بہت ہی زیادہ راحت بخش اور طمانیت انگیز ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کیسہ بھرا ہوا ہو۔

اور فرمایا ان دنوں میں جبکہ دنیوی مقدمات کی وجہ سے والد صاحب اور بھائی صاحب طرح طرح کے ہموم و غموم میں مبتلا رہتے تھے وہ بسا اوقات میری حالت دیکھ کر رشک کھاتے اور فرماتے تھے کہ یہ بڑا ہی خوش نصیب آدمی ہے اس کے نزدیک کوئی غم نہیں آتا۔ (الحکم جلد ۳ صفحہ ۲۹ مورخہ ۱۷۔ اگست ۱۸۹۹ء صفحہ ۳)

۱۶۲ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

عیسائی بیان کرتے ہیں کہ انبیاء بھی اسی طرح گناہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے لوگ۔ اور یہ کہ انبیاء اور دوسرے لوگوں میں اس بارہ میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن شریف اس کی تردید کرتا ہے وہ اس بارے میں انبیاء اور دوسرے لوگوں میں صاف تمیز کرتا ہے۔ جب بعض لوگوں نے شک کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ لے لیا ہے تو خدا تعالیٰ نے ان کے شبہات کا اس طرح جواب دیا مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (ترجمہ) نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے جس طرز میں خداوند تعالیٰ نے جواب دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گناہ کے

[1] یعنی حضرت مولوی عبد الکریم صاحب سیالکوٹی۔

بارے میں خدائے تعالیٰ انبیاء کو اور دوسرے لوگوں کو مساوات کی نظر سے نہیں دیکھتا خدائے تعالیٰ اُن کے شبہوں کا یوں جواب دیتے سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں کوئی خیانت نہیں کی۔ برخلاف اسکے خُدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نبی ایسا کام کرے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ خُدائے تعالیٰ کے نزدیک انبیاء اور دُوسرے لوگ گناہ کے معاملہ میں مساوی نہیں۔ جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے۔ خُدا یہاں ایک قسم کے گناہ کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ موجودہ صورت میں اسی قسم کا الزام لگایا گیا تھا۔ اور یہی الزام تھا جس سے خُدائے تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بری کرنا چاہتا تھا۔

(ریویو آف ریلیجنز۔ جلد ۲ ع۶ صـ۲۴۲)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ

یعنی جو لوگ خدائے تعالیٰ کے راہ میں قتل کیے گئے تم اُن کو مُردے نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور انہیں اپنے رب کی طرف سے رزق مل رہا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صـ۲۵۱-۲۵۲)

مومن کو فوت ہونے کے بعد بلا توقف بہشت میں جگہ ملتی ہے جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہو رہا ہے...... وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صـ۳۵۴)

یاد رہے کہ اولیاء اللہ اور وہ خاص لوگ جو خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں۔ وہ چند دنوں کے بعد پھر زندہ کیے جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ یعنی تم ان کو مُردے مت خیال کرو جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں وہ تو زندے ہیں۔ (تذکرۃ الشہادتین صـ۵۵)

جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُن کی نسبت یہ گمان مت کرو کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں خدا تعالیٰ سے اُن کو رزق ملتا ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صـ۲۱۴)

قرآن شریف صاف طور پر بتاتا ہے کہ کفار جو بار بار عذاب مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ تم پر عذاب بصورت

جنگ نازل ہوگا آخر جب وہ سلسلہ عذاب کا شروع ہوا اور کفار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیاں ہونے لگیں تو کون کہہ سکتا ہے؟ کہ ان جنگوں میں صحابہ شہید نہیں ہوئے۔ حالانکہ یہ مسلم بات ہے کہ وہ تو کفار پر عذاب تھا اور خاص ان کے ہی لیے آیا تھا۔ مگر صحابہ کو بھی چشم زخم پہنچا۔ اور بعض جو علم الٰہی میں مقدر تھے شہید ہو گئے۔ جن کی بابت خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاویں ان کو مردے مت کہو بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں اور اسی جگہ ان کی نسبت فرمایا فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ۔ اب بتاؤ کہ وہ جنگ ایک ہی قسم کا تھا لیکن وہ کفار کے لیے عذاب تھا مگر صحابہ کے لیے باعث شہادت اسی طرح پر اب بھی حالت ہے لیکن انجام کار دیکھنا چاہیئے کہ طاعون سے فائدہ کس کو رہتا ہے ہم کو یا ہمارے مخالفین کو اس وقت معلوم ہوگا کہ کون کم ہوئے اور کون بڑھے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

اُن کو ڈرایا جاتا ہے کہ لوگ تمہیں سزا دینے کے لیے اتفاق کر گئے ہیں سو تم لوگوں سے ڈرو پس ڈرانے سے اور بھی اُن کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ خدا ہمیں کافی ہے یعنی اُن کی شجاعت کتّوں اور درندوں کی طرح نہیں ہوتی جو صرف طبعی جوش پر مبنی ہو جس کا ایک ہی پہلو پر میل ہو۔ بلکہ اُن کی شجاعت دو پہلو رکھتی ہے کبھی تو وہ اپنی ذاتی شجاعت سے اپنے نفس کے جذبات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس پر غالب آتے ہیں اور کبھی جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ قرین مصلحت ہے تو نہ صرف جوش نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کے لیے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کر کے بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے بہادری دکھاتے ہیں.....

(اس آیت میں) یہ سمجھایا گیا ہے کہ حقیقی شجاعت کی جڑھ صبر اور ثابت قدمی ہے اور ہر ایک جذبہ نفسانی یا بلا جو دشمنوں کی طرح حملہ کرے اس کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور بُزدل ہو کر بھاگ نہ جانا یہی شجاعت ہے سو انسان اور درندہ کی شجاعت میں بڑا فرق ہے درندہ ایک ہی پہلو پر جوش اور غضب سے کام لیتا ہے اور انسان جو حقیقی شجاعت رکھتا ہے وہ مقابلہ اور ترک مقابلہ میں جو کچھ قرین مصلحت ہو وہ اختیار کر لیتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۱-۵۲)

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيْمٌ○

اور تجھے کافروں کی بداندیشی سے غمناک نہیں ہونا چاہیئے وہ خدا کے دین کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے اور اُن کے لیے خدا نے بزرگ عذاب مقرر کر رکھا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ○

یہ سچ اور بالکل صحیح ہے کہ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان اسی دن انسان کو نصیب ہوتا ہے کہ جب اللہ جل شانہ اپنے وجود سے آپ خبر دیتا ہے۔ اور پھر دوسری علامت خدا تعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ اپنے پیارے بندوں کو صرف اپنے وجود کی خبر ہی نہیں دیتا بلکہ اپنی رحمت اور فضل کے آثار بھی خاص طور پر ان پر ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح پر کہ ان کی دعائیں جو ظاہری امیدوں سے زیادہ ہوں قبول فرما کر اپنے الہام اور کلام کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دیدیتا ہے تب ان کے دل تسلی پکڑ جاتے ہیں۔ کہ یہ ہمارا قادر خدا ہے۔ جو ہماری دعائیں سُنتا اور ہم کو اطلاع دیتا اور مشکلات سے ہمیں نجات بخشتا ہے۔ اسی روز سے نجات کا مسئلہ بھی سمجھ آتا ہے اور خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی پتہ لگتا ہے۔ اگرچہ جگانے اور متنبہ کرنے کے لیے کبھی کبھی غیروں کو بھی سچی خواب آسکتی ہے۔ مگر اس طریق کا مرتبہ اور شان اور رنگ اور ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا مکالمہ ہے۔ جو خاص مقربوں سے ہی ہوتا ہے۔ اور جب مقرب انسان دعا کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنی خدائی کے جلال کے ساتھ اس پر تجلی فرماتا ہے۔ اور اپنی رُوح اس پر نازل کرتا ہے۔ اور اپنی محبت سے بھرے ہوئے لفظوں کے ساتھ اس کو قبول دعا کی بشارت دیتا ہے۔ اور جس کسی سے یہ مکالمہ کثرت سے وقوع میں آتا ہے۔ اس کو نبی یا محدث کہتے ہیں۔ اور سچے مذہب کی یہی نشانی ہے۔ کہ اس مذہب کی تعلیم سے ایسے راستباز پیدا ہوتے رہیں جو محدث کے مرتبہ تک پہنچ جائیں جن سے خدا تعالیٰ آمنے سامنے کلام کرے۔ اور اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی اوّل نشانی یہی ہے۔ کہ اس میں ہمیشہ ایسے راستباز جن سے خدا تعالیٰ ہمکلام ہو پیدا ہوتے ہیں۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا[1] سو یہی معیار حقیقی سچے اور زندہ اور مقبول مذہب کی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ نور صرف اسلام میں ہے

---

[1] حٰم السجدۃ آیت ۳۱

عیسائی مذہب اس روشنی سے بے نصیب ہے۔ (حجۃ الاسلام صـ۲ ٹائیٹل اندرونی صفحہ)

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا ط وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

تم اپنے مالوں اور جانوں میں بھی آزمائے جاؤ گے لوگ تمہارے مال لوٹیں گے تمہیں قتل کریں گے اور تم یہودیوں اور عیسائیوں اور مشرکوں کے ہاتھ سے بہت ہی ستائے جاؤ گے وہ بہت کچھ ایذا کی باتیں تمہارے حق میں کہیں گے پس اگر تم صبر کرو گے اور بیجا باتوں سے بچو گے تو یہ ہمت اور بہادری کا کام ہوگا۔ ان تمام آیات کا مطلب یہ ہے کہ بابرکت علم وہی ہوتا ہے جو عمل کے مرتبہ میں اپنی چمک دکھاوے اور منحوس علم وہ ہے جو صرف علم کی حد تک رہے کبھی عمل تک نوبت نہ پہنچے۔

جاننا چاہیئے کہ جس طرح مال تجارت سے بڑھتا ہے اور پھولتا ہے ایسا ہی علم عملی مزاولت سے اپنے روحانی کمال کو پہنچتا ہے۔ سو علم کو کمال تک پہنچانے کا بڑا ذریعہ عملی مزاولت ہے مزاولت سے علم میں نور آجاتا ہے اور یہ بھی سمجھو کہ علم کا حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچنا اور کیا ہوتا ہے یہی تو ہے کہ عملی طور پر ہر ایک گوشہ اُس کا آزمایا جائے چنانچہ اسلام میں ایسا ہی ہوا جو کچھ خدائے تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو سکھایا اُن کو یہ موقع دیا کہ عملی طور پر اس تعلیم کو چمکا دیں اور اس کے نور سے پُر ہو جاویں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صـ۱۳۵-۱۳۶)

ایسے لوگوں سے افسوس ہی کیا ہے اگر وہ اپنے سخت الفاظ سے ہمارا دل دُکھا دیں تو ہمیں صبر کرنا چاہیئے جب تک کہ ہمارا اور اُن کا خدا تعالیٰ فیصلہ کرے اور اسی صبر کے لیے خدا تعالیٰ کے قرآن شریف میں یہ تعلیم ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے...... البتہ تم اپنے مالوں اور جانوں کے بارے میں آزمائے جاؤ گے اور تم اہل کتاب اور مشرکوں سے بہت دل آزار باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو گے اور جوش اور اشتعال سے اپنے تئیں بچاؤ گے تو یہ بات ہمت کے کاموں سے ہے۔

(چشمہ معرفت صـ۷)

اور تم یہودیوں اور عیسائیوں اور دوسرے مشرکوں سے بہت کچھ دل دکھانے کی باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو گے اور ہر یک طور کی بے صبری اور اضطراب سے پرہیز کرو گے تو اُن لوگوں کے مکر کچھ بھی تمہارا بگاڑ نہیں سکیں گے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صـ۲۳۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

تم اہل کتاب اور دوسرے مخلوق پرستوں سے بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنو گے۔ تب اگر تم صبر کرو گے اور زیادتی سے بچو گے تو تم خدا کے نزدیک اولوالعزم شمار کئے جاؤ گے۔ (البلاغ فریاد درد) ص ۲۲-۲۳)

قرآن شریف میں بھی آخری زمانہ میں پادریوں اور مشرکوں کا اسلام پر اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بدگوئی اور فحش گوئیوں کے ساتھ زبان کھولنا بیان فرمایا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا۔ یعنی تم اہل کتاب اور مشرکوں سے دل آزار اور دُکھ دینے والی باتیں بہت سنو گے سو جس قدر اس زمانہ میں دل آزار باتیں سنی گئیں اُن کی نظیر تیرہ سو برس میں نہیں پائی گئی اس لیے اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا یہی زمانہ ہے۔ (ایام الصلح ص ۸۳ حاشیہ)

اہل علم مسلمان اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ قرآن شریف میں آخری زمانہ کے بارے میں ایک پیشگوئی ہے اور اس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے وصیت کے طور پر ایک حکم ہے جس کو ترک کرنا سچے مسلمان کا کام نہیں ہے اور وہ یہ ہے لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ سورۃ آل عمران۔ ترجمہ یہ ہے کہ خدا تمہارے مالوں اور جانوں پر بلا بھیج کر تمہاری آزمائش کریگا اور تم اہل کتاب اور مشرکوں سے بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنو گے سو اگر تم صبر کرو گے اور اپنے تئیں ہر ایک ناکردنی امر سے بچاؤ گے تو خدا کے نزدیک اولوالعزم لوگوں میں سے ٹھہرو گے۔ یہ مدنی سورۃ ہے اور یہ اُس زمانہ کے لیے مسلمانوں کو وصیت کی گئی ہے کہ جب ایک مذہبی آزادی کا زمانہ ہوگا کہ جو کچھ کوئی سخت گوئی کرنا چاہے وہ کر سکے گا جیسا کہ یہ زمانہ ہے۔ سو کچھ شک نہیں کہ یہ پیشگوئی اسی زمانہ کے لیے تھی اور اسی زمانہ میں پوری ہوئی۔ کون ثابت کر سکتا ہے کہ جو اس آیت میں اَذًى كَثِيْرًا کا لفظ ایک عظیم الشان ایذاء لسانی کو چاہتا ہے وہ کبھی کسی صدی میں اس سے پہلے اسلام نے دیکھی ہے؟ اس صدی سے پہلے عیسائی مذہب کا یہ طریق نہ تھا کہ اسلام پر گندے اور ناپاک حملے کرے بلکہ اکثر ان کی تحریریں اور تالیفیں اپنے مذہب تک ہی محدود تھیں۔ قریباً تیرھویں صدی ہجری سے اسلام کی نسبت بدگوئی کا دروازہ کھلا جس کے اوّل بانی ہمارے ملک میں پادری فنڈل صاحب تھے۔ بہرحال اس پیشگوئی میں مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جب تم دل آزار کلمات سے دُکھ دیئے جاؤ اور گالیاں سنو تو اُس وقت صبر کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ سو قرآنی پیشگوئی کے مطابق ضرور تھا کہ ایسا زمانہ بھی آتا کہ ایک مقدس رسول کو جس کی امت سے ایک حصہ کثیر دنیا کا پُر ہے عیسائی قوم جیسے لوگ جن کا تہذیب کا دعویٰ تھا گالیاں دیتے اور اُس بزرگ نبی کا نام نعوذ باللہ زانی اور ڈاکو اور چور رکھتے اور دنیا کے سب بدتروں سے بدتر ٹھہراتے۔ بیشک یہ اُن لوگوں کے لیے بڑے رنج کی بات ہے جو اُس پاک رسول کی راہ میں فدا ہیں۔

اور ایک دانشمند عیسائی بھی احساس کر سکتا ہے کہ جب مثلاً ایسی کتاب امہات المومنین میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کو نعوذ باللہ زناکار کے نام سے پکارا گیا اور گندے تحقیر کے الفاظ آنجناب کے حق میں استعمال کیے گئے اور پھر عمداً ہزار کاپی اس کتاب کی محض دلوں کے دکھانے کے لیے عام اور خاص مسلمانوں کو پہنچائی گئی اس سے کس قدر دردناک زخم عام مسلمانوں کو پہنچے ہوں گے اور کیا کچھ اُن کے دلوں کی حالت ہوئی ہوگی اگرچہ بدگوئی میں یہ کچھ پہلی ہی تحریر نہیں ہے بلکہ ایسی تحریروں کی پادری صاحبوں کی طرف سے کروڑہا تک نوبت پہنچ گئی ہے مگر یہ طریق دل دکھانے کا ایک نیا طریق ہے کہ خواہ نخواہ غافل اور بے خبر لوگوں کے گھروں میں یہ کتابیں پہنچائی گئیں۔ اور اسی وجہ سے اس کتاب پر بہت شور بھی اٹھا ہے باوجود اس بات کے کہ پادری عمادالدین اور پادری ٹھاکرداس کی کتابیں اور نورافشاں کی پچیس سال کی مسلسل تحریریں سختی میں اس سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر ہمیں آیۃ موصوفہ بالا میں یہ تاکیدی حکم ہے کہ جب ہم ایسی بدزبانی کے کلمات جن جن سے ہمارے دلوں کو دُکھ پہنچے تو ہم صبر کریں۔ (الانذار صفحہ ۳۴-۳۶)

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

اور چاہتے ہیں کہ اُن کاموں کے ساتھ تعریف کیے جائیں جن کو وہ کرتے نہیں سو تو یہ گمان مت کر کہ یہ لوگ عذاب سے بچ جائیں گے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب مقرر ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۶-۲۳۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے اختلاف میں دانشمندوں کے لیے صانع عالم کی ہستی اور قدرت پر کئی نشان ہیں۔ دانشمند وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو خدا کو بیٹھے کھڑے اور پہلو پر پڑے ہونے کی حالت میں یاد کرتے رہتے ہیں اور زمین اور آسمان اور دوسری مخلوقات کی پیدائش میں تفکّر اور تدبّر کرتے رہتے ہیں اور اُن کے دل اور زبان

پر یہ مناجات جاری رہتی ہے کہ اے ہمارے خداوند تو نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو عبث اور بیہودہ طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ ہر یک چیز تیری مخلوقات میں سے عجائبات قدرت اور حکمت سے بھری ہوئی ہے کہ جو تیری ذات بابرکات پر دلالت کرتی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۷۴-۲۷۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یا الٰہی تو اس سے پاک ہے کہ تیرے وجود سے انکار کر کے نالائق صفتوں سے تجھے موصوف کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا یعنی تجھ سے انکار کرنا عین دوزخ ہے۔ اور تمام آرام اور راحت تجھ میں اور تیری شناخت میں ہے جو شخص کہ تیری سچی شناخت سے محروم رہا وہ درحقیقت اسی دنیا میں آگ

مومن وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور جو کچھ زمین و آسمان میں عجائب صنعتیں موجود ہیں اُن میں فکر اور غور کرتے رہتے ہیں اور جب لطائف صنعتِ الٰہی اُن پر کھلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدایا تو نے اُن صنعتوں کو بیکار پیدا نہیں کیا یعنی وہ لوگ جو مومن خاص ہیں صنعت شناسی اور ہیئت دانی سے دُنیا پرست لوگوں کی طرح صرف اتنی ہی غرض نہیں رکھتے کہ مثلاً اسی پر کفائت کریں کہ زمین کی شکل یہ ہے اور اُس کا قطر اس قدر ہے اور اُس کی کشش کی کیفیت یہ ہے اور آفتاب اور ماہتاب اور ستاروں سے اُس کو اس قسم کے تعلقات ہیں بلکہ وہ صنعت کی کمالیت شناخت کرنے کے بعد اور اُس کے خواص کھلنے کے پیچھے صانع کی طرف رجوع کر جاتے ہیں اور اپنے ایمان کو مضبوط کرتے ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

جب دانشمند اور اہل عقل انسان زمین اور آسمان کے اجرام کی بناوٹ میں غور کرتے اور رات اور دن کی کمی بیشی کے موجبات اور علل کو نظر عمیق سے دیکھتے ہیں انہیں اس نظام پر نظر ڈالنے سے خدائے تعالیٰ کے وجود پر دلیل ملتی ہے پس وہ زیادہ انکشاف کے لیے خدا سے مدد چاہتے ہیں اور اُس کو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اور کروٹ پر لیٹے کر یاد کرتے ہیں جس سے اُن کی عقلیں بہت صاف ہو جاتی ہیں پس جب وہ ان عقلوں کے ذریعہ سے اجرام فلکی اور زمین کی بناوٹ احسن اور اولیٰ میں فکر کرتے ہیں تو بے اختیار بول اُٹھتے ہیں کہ ایسا نظام ابلغ اور محکم ہرگز باطل اور بے سود نہیں بلکہ صانع حقیقی کا چہرہ دکھلا رہا ہے پس وہ الوہیت صانع عالم کا اقرار کر کے یہ مناجات کرتے ہیں کہ یا الٰہی تو اس سے پاک ہے کہ کوئی تیرے وجود سے انکار کر کے نالائق صفتوں سے تجھے موصوف کرے سو تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا یعنی تجھ سے انکار کرنا عین دوزخ ہے اور تمام آرام اور راحت تجھ میں اور تیری شناخت میں ہے جو شخص کہ تیری سچی شناخت سے محروم رہا وہ درحقیقت اسی دنیا میں آگ میں ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۴)

فَمَالَنَا اَنْ لَّا نُقِرَّ بِتَاثِيْرَاتِ اَشْيَاءٍ قَدْ ذَكَرَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى فِى الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ بَلْ فَضَّلَهَا عَلٰى[1] اَكْثَرِ النَّعْمَآءِ وَحَثَّ عِبَادَهٗ عَلٰى اَنْ يَّتَفَكَّرُوْا فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاٰيَاتِهَا وَقَالَ اِنَّ فِىْ خَلْقِ

(ترجمہ) ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم ان اشیاء کی تاثیرات کا اقرار نہ کریں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں فرمایا ہے بلکہ انہیں اکثر نعمتوں پر فضیلت دی ہے اور اپنے بندوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین اور ان میں پائے جانے والے نشانوں

[1] اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۰۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ وَالْحَقُّ اَنَّ تَاثِیْرَاتِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُوْمِ شَیْءٌ یَّرَاهُ الْخَلْقُ فِیْ کُلِّ وَقْتٍ وَّحِیْنٍ۔ (حمامۃ البشریٰ صـ۴۳)

آسمانوں کی بناوٹ اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا دانشمندوں کو اُس اللہ کا صاف پتا دیتے ہیں جس کی طرف مذہب اسلام دعوت کرتا ہے اس آیت میں کس قدر صاف حکم ہے کہ دانشمند اپنی دانشوں اور مغزوں سے بھی کام لیں اور جانچیں کہ اسلام کا خدا ایسا گورکھ دھندا نہیں کہ اُسے عقل پر پتھر مار کر بجبر منوایا جائے۔ اور صحیفۂ فطرت میں کوئی بھی ثبوت اُس کے لیے نہ ہو۔ بلکہ فطرت کے وسیع اوراق میں اُس کے اس قدر نشانات ہیں جو صاف بتلاتے ہیں کہ وہ ہے۔ ایک ایک چیز اس کائنات میں اُس نشان اور تختہ کی طرح ہے جو ہر سڑک یا گلی کے سرے پر اُس سڑک یا محلہ یا شہر کا نام معلوم کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ خدا کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس موجود ہستی کا پتہ ہی نہیں بلکہ مطمئن کر دینے والا ثبوت دیتی ہے۔ زمین و آسمان کی شہادتیں کسی مصنوعی اور بناوٹی خدا کی ہستی کا ثبوت نہیں دیتیں۔ بلکہ اُس خدائے احد الصمد لم یلد ولم یولد کی ہستی کو دکھاتی ہیں جو زندہ اور قایم خدا ہے۔ اور جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ۱۵)

طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی چلی جائے گی اللہ تعالیٰ اس آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ میں بتلاتا ہے کہ جس خدا کو قرآن پیش کرتا ہے اُس کے لیے زمین آسمان دلائل سے بھرے پڑے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ۱۸)

قرآن کریم میں اُن لوگوں کو جو عقل سے کام لیتے ہیں اولوا الالباب فرمایا ہے۔ پھر اس کے آگے فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ الآیۃ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرا پہلو بیان کیا ہے کہ اولوا الالباب اور عقل سلیم بھی وہی رکھتے ہیں جو اللہ جل شانہٗ کا ذکر اُٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں۔ یہ گمان نہ کرنا چاہیئے کہ عقل و دانش ایسی چیزیں ہیں جو یونہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نہیں بلکہ سچی فراست اور سچی دانش اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے تو کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ الٰہی نور سے دیکھتا ہے صحیح فراست اور حقیقی دانش جیسا میں نے ابھی کہا کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک تقویٰ میسر نہ ہو۔ اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو عقل سے کام لو۔ فکر کرو۔ سوچو۔ تدبر اور فکر کے لیے قرآن کریم میں بار بار تاکیدیں موجود ہیں۔ کتاب مکنون اور قرآن کریم میں فکر کرو اور پارسا طبع ہو جاؤ۔ جب تمہارے دل پاک ہو جائیں گے۔ اور ادھر عقل سلیم سے کام لو گے اور تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو گے۔ پھر ان دونوں کے جوڑ سے وہ حالت پیدا ہو جائے گی کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ تمہارے دل سے

پر غور کریں چنانچہ فرمایا اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اور حق بات یہی ہے کہ سورج چاند اور ستاروں کی تاثیرات ایسی چیزیں ہیں جن کو لوگ ہر وقت اور ہر آن مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صـ۴۳)

نکلے گا۔ اُس وقت سمجھ میں آجائیگا کہ یہ مخلوق عبث نہیں بلکہ صانع حقیقی کی حقانیت اور اثبات پر دلالت کرتی ہے تاکہ طرح طرح کے علوم و فنون جو دین کو مدد دیتے ہیں ظاہر ہوں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۲-۸۳)

(۱۹۴) رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ

اے ہمارے خدا ہم نے ایک منادی کی آواز سنی کہ جو لوگوں کو ایمان کی طرف بلاتا ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۶)

اے ہمارے پروردگار ہم نے پکارنے والے کو سنا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۸۳)

اے ہمارے خدا ہم نے ایک آواز دینے والے کی آواز کو سُنا جو کہتا تھا کہ اپنے ایمان کو درست کرو اور قوی کرو۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۲۴)

(۱۹۶) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○

میں تم میں سے کسی عامل کا عمل ضایع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت ہو۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۳۵)

(۲۰۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

یعنی اے ایمان والو! دشمنوں کی ایذا پر صبر کرو اور با ایں ہمہ مقابلہ میں مضبوط رہو اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرتے رہو تا تم نجات پا جاؤ۔ سو اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی ہمیں یہی ہدایت ہے کہ ہم جاہلوں کی توہین اور تحقیر اور بدزبانیوں اور گالیوں سے اعراض کریں اور ان تدبیروں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں کہ کیونکر ہم بھی ان کو سزا دلا دیں۔ بدی کے مقابل پر بدی کا ارادہ کرنا ایک معمولی بات ہے کمال میں داخل نہیں۔ کمال انسانیت یہ ہے کہ ہم حتی الوسع گالیوں کے مقابل پر اعراض اور درگذر کی خو اختیار کریں۔ (البلاغ صفحہ ۲۳)

اور سرحد پر اپنے گھوڑے باندھے رکھو کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن اس تمہاری تیاری اور استعداد سے ڈرتے رہیں۔ اے مومنو! صبر اور مصابرت اور مرابطت کرو۔

رباط اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ صحابہ کو اعدا کے مقابلہ کے لیے مستعد رہنے کا حکم دیتا ہے اور اس رباط کے لفظ سے اُنہیں پوری اور سچی تیاری کی طرف متوجہ کرتا ہے اُن کے سپرد دو کام تھے۔ ایک ظاہری دشمنوں کا مقابلہ۔ اور ایک وہ روحانی مقابلہ کرتے تھے۔ اور رباط لغت میں نفس اور انسانی دل کو بھی کہتے ہیں۔ اور یہ ایک لطیف بات ہے کہ گھوڑے وہی کام آتے ہیں جو سدھائے ہوئے اور تعلیم یافتہ ہوں۔ آج کل گھوڑوں کی تعلیم و تربیت کا اُسی انداز پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور اُسی طرح اُن کو سدھایا سکھایا جاتا ہے جس طرح بچوں کو سکولوں میں خاص احتیاط اور اہتمام سے تعلیم دی جاتی ہے اگر اُن کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ سدھائے نہ جائیں تو وہ بالکل نکمے ہوں اور بجائے مفید ہونے کے خوفناک اور مضر ثابت ہوں۔

یہ اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ انسانوں کے نفوس یعنی رباط بھی تعلیم یافتہ چاہئیں۔ اور اُن کے قوای اور طاقتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کے نیچے نیچے چلیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اس حرب اور جدال کا کام نہ دے سکیں گے۔ جو انسان اور اُس کے خوفناک دشمن یعنی شیطان کے درمیان اندرونی طور پر ہر لحظہ اور ہر آن جاری ہے جیسا کہ لڑائی اور میدان جنگ میں علاوہ قوائے بدنی کے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس اندرونی حرب اور جہاد کے لیے نفوس انسانی کی تربیت اور مناسب تعلیم مطلوب ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان اُس پر غالب آجائے گا اور وہ بہت بُری طرح ذلیل اور رسوا ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص توپ و تفنگ۔ اسلحۂ حرب بندوق وغیرہ تو رکھتا ہو لیکن اُس کے استعمال اور چلانے سے ناواقف محض ہو تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور تیر و تفنگ اور سامان حرب بھی ایک شخص رکھتا ہو اور اُن کا استعمال بھی جانتا ہو لیکن اُس کے بازو میں طاقت نہ ہو تو بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف طریق اور طرز استعمال کا سیکھ لینا بھی کار آمد اور مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ ورزش اور مشق کر کے بازو میں توانائی اور قوت پیدا نہ کی جاوے۔ اب اگر ایک شخص جو تلوار چلانا تو جانتا ہے لیکن ورزش اور مشق نہیں رکھتا۔ تو میدان حرب میں جا کر جونہی تین چار دفعہ تلوار کو حرکت دیگا اور دو ایک ہاتھ مارے گا اُس کے بازو نکمے ہو جائیں گے اور وہ تھک کر بالکل بیکار ہو جائے گا۔

اور خود ہی آخر دشمن کا شکار ہو جائے گا......

جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ میدان کارزار میں کامیاب ہونے کے لیے جہاں ایک طرف طریق استعمال اسلحہ وغیرہ کی تعلیم اور واقفیت کی ضرورت ہے۔ وہاں دوسری طرف ورزش اور محل استعمال کی بھی بڑی بھاری ضرورت ہے اور نیز حرب و ضرب میں تعلیم یافتہ گھوڑے چاہئیں یعنی ایسے گھوڑے جو توپوں اور بندوقوں کی آواز سے نہ ڈریں اور گرد و غبار سے پراگندہ ہو کر پیچھے نہ ہٹیں بلکہ آگے ہی بڑھیں۔ اسی طرح نفوس انسانی کامل ورزش اور پوری ریاضت اور حقیقی تعلیم کے بغیر اعداء اللہ کے مقابل میدان کارزار میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

لغت عرب بھی عجیب چیز ہے۔ مقابلہ بھی اسی پر ختم ہے رباط کا لفظ جو آیہ مذکورہ میں آیا ہے۔ جہاں دنیاوی جنگ و جدل اور فنون جنگ کی فلاسفی پر مشتمل ہے وہاں روحانی طور پر اندرونی جنگ اور مجاہدۂ نفس کی حقیقت اور خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے...... اب دیکھو یہی رباط کا لفظ جو اُن گھوڑوں پر بولا جاتا ہے جو سرحد پر دشمنوں سے حفاظت کے لیے باندھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ لفظ اُن نفسوں پر بھی بولا جاتا ہے جو اس جنگ کی تیاری کے لیے تعلیم یافتہ ہوں جو انسان کے اندر ہی اندر شیطان سے ہر وقت جاری ہے۔

یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئیں تھیں۔ ایک قوت وہ تھی جس کا استعمال صدر اول میں بطور مدافعت و انتقام کے ہوا یعنی مشرکین عرب نے جب ستایا اور تکلیفیں دیں تو ایک ہزار نے ایک لاکھ کفار کا مقابلہ کر کے شجاعت کا جوہر دکھایا اور ہر امتحان میں اُس پاک قوت و شوکت کا ثبوت دیا۔ وہ زمانہ گذر گیا۔ اور رباط کے لفظ میں جو فلاسفی ظاہری قوت جنگ اور فنون جنگ کی مخفی تھی وہ ظاہر ہو گئی ہے۔ اب اس زمانہ میں جس میں ہم ہیں جنگ ظاہری کی مطلق ضرورت اور حاجت نہیں۔ بلکہ ان آخری دنوں میں جنگ باطنی کے نمونے دکھانے مطلوب تھے۔ اور روحانی مقابلہ زیر نظر تھا۔ کیونکہ اس وقت باطنی ارتداد اور الحاد کی اشاعت کے لیے بڑے بڑے سامان اور اسلحہ بنائے گئے اس لیے اُن کا مقابلہ بھی اسی قسم کے اسلحوں سے ضروری ہے۔ کیونکہ آج کل امن و امان کا زمانہ ہے۔ اور ہم کو ہر طرح کی آسایش اور امن حاصل ہے۔ آزادی سے ہر آدمی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ اور احکام کی بجا آوری کر سکتا ہے۔ پھر اسلام جو امن کا سچا حامی ہے بلکہ حقیقتاً امن اور سلم اور آشتی کا اشاعت کنندہ ہی اسلام ہے کیونکر اس زمانہ امن و آزادی میں اُس پہلے نمونہ کو دکھانا پسند کر سکتا تھا۔ پس آج کل وہی دوسرا نمونہ یعنی روحانی مجاہدہ مطلوب ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۵-۶۳)

جس طرح دشمن کے مقابلہ پر سرحد پر گھوڑا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ حد سے نہ نکلنے پاوے۔ اسی طرح تم بھی تیار رہو ایسا نہ ہو کہ دشمن سرحد سے گذر کر اسلام کو صدمہ پہنچائے..... اگر تم اسلام کی حمایت اور خدمت کرنا چاہتے ہو تو پہلے خود تقویٰ اور طہارت اختیار کرو جس سے خود تم خدائے تعالیٰ کی پناہ کے حصن حصین میں آسکو اور پھر تم کو اس خدمت کا شرف اور استحقاق حاصل ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمانوں کی بیرونی طاقت کیسی کمزور ہو گئی ہے۔ قومیں اُن کو نفرت اور حقارت کی نظر سے

دیکھتی ہیں۔ اگر تمہاری اندرونی اور قلبی طاقت بھی کمزور اور پست ہوگئی۔ تو بس پھر تو خاتمہ ہی سمجھو۔ تم اپنے نفسوں کو ایسے پاک کرو کہ قدسی قوت اُن میں سرایت کرے۔ اور وہ سرحد کے گھوڑوں کی طرح مضبوط اور محافظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہمیشہ متقیوں اور راست بازوں ہی کے شامل حال ہوا کرتا ہے۔ اپنے اخلاق اور اطوار ایسے نہ بناؤ جن سے اسلام کو داغ لگ جاوے۔ بدکاروں اور اسلام کی تعلیم پر عمل نہ کرنے والے مسلمانوں سے اسلام کو داغ لگتا ہے۔ کوئی مسلمان شراب پی لیتا ہے تو کہیں قے کرتا پھرتا ہے۔ پگڑی گلے میں ہوتی ہے موریوں اور گندے نالوں میں گرتا پھرتا ہے۔ پولیس کے جُوتے پڑتے ہیں، ہندو اور عیسائی اُس پر ہنستے ہیں۔ اب اُس کا ایسا خلاف شرع فعل اُس کی ہی تضحیک کا موجب نہیں ہوتا بلکہ درپردہ اُس کا اثر نفس اسلام تک پہنچتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۰-۸۱)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا صبر ایک نقطہ کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر دائرہ کی شکل اختیار کر کے سب پر محیط ہو جاتا ہے۔ آخر بدمعاشوں پر بھی اُس کا اثر پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دے اور تقویٰ کی راہوں پر مضبوط قدم مارے۔ کیونکہ متقی کا اثر ضرور پڑتا ہے اور اُس کا رُعب مخالفوں کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۲-۸۳)



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سورۃ النساء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ۝

وَتَرَکۡنَا بَعۡضَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَجَمَعۡنٰہُمۡ جَمۡعًا[1] جس سے ظاہر ہے۔ کہ نہایت درجہ کا اختلاف پیدا ہو جائیگا اور سب مذاہب ایک دنگل میں ہو کر نکلیں گے۔" ترکنا "کا اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ آزادی کا زمانہ ہو گا۔ اور یہ آزادی کمال تک پہنچ جائے گی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے مامور کی معرفت ان کو جمع کرنے کا ارادہ کریگا پہلے دیکھو جَمَعۡنٰہُمۡ فرمایا۔ اور ابتدائے عالم کے لیے خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً۔ فرمایا۔ لفظ بثّ اور جمع آپس میں پورا تناقض رکھتے ہیں۔ گویا دائرہ پورا ہو کر پھر وہی زمانہ ہو جائے گا۔ پہلے تو وحدۃ شخصی تھی۔ اب اخیر میں وحدت نوعی ہو جائے گی۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

وَخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا یعنی آدم کے وجود میں سے ہی ہم نے اس کا جوڑا پیدا کیا جو حوّا ہے تا آدم کا یہ تعلق حوا اور اس کی اولاد سے طبعی ہو نہ بناوٹی۔ اور یہ اس لیے کیا کہ تا آدم زادوں کے تعلق اور ہمدردی کو بقا ہو کیونکہ طبعی تعلق غیر منفک ہوتے ہیں مگر غیر طبعی تعلق کے لیے بقا نہیں ہے کیونکہ ان میں وہ باہمی کشش نہیں ہے جو طبعی میں ہوتی ہے۔ غرض خدا نے اس طرح پر دونوں قسم کے تعلق جو آدم کے لیے خدا سے اور بنی نوع سے ہونے چاہیئے تھے طبعی طور پر پیدا کیے ہیں [ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۷۹]

[1] الکھف آیت ۱۰۰

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

تم اچھی چیزوں کے عوض میں خبیث اور ردی چیزیں نہ دیا کرو یعنی جس طرح دوسروں کا مال دبا لینا ناجائز ہے اسی طرح خراب چیزیں بیچنا یا اچھی کے عوض میں بُری دینا بھی ناجائز ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۳۹)

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ ۝

یتیم لڑکیاں جن کی تم پرورش کرو ان سے نکاح کرنا مضائقہ نہیں لیکن اگر تم دیکھو کہ چونکہ وہ لاوارث ہیں شائد تمہارا نفس ان پر زیادتی کرے تو ماں باپ اور اقارب والی عورتیں کرو جو تمہاری مؤدب رہیں اور ان کا تمہیں خوف رہے ایک دو تین چار تک کر سکتے ہو بشرطیکہ اعتدال کرو اور اگر اعتدال نہ ہو تو پھر ایک ہی پر کفایت کرو۔ گو ضرورت پیش آوے چار کی حد لگا دی گئی ہے۔ وہ اس مصلحت سے ہے کہ تا تم پرانی عادت کے تقاضے سے افراط نہ کرو یعنی صدہا تک نوبت نہ پہنچاؤ۔ یا یہ کہ حرامکاری کی طرف جُھک نہ جاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۲۷)

اسلام سے پہلے اکثر قوموں میں کثرت ازدواج کی سینکڑوں اور ہزاروں تک نوبت پہنچ گئی تھی اور اسلام نے تعداد ازدواج کو کم کیا ہے۔ نہ زیادہ بلکہ یہ قرآن میں ہی ایک فضیلت خاص ہے کہ اس نے ازدواج کی بیحدی اور بے قیدی کو رد کر دیا ہے۔ اور کیا وہ اسرائیلی قوم کے مقدس نبی جنہوں نے سَو سَو بیوی کی بلکہ بعض نے سات سَو تک نوبت پہنچائی وہ اخیر عمر تک حرامکاری میں مبتلا رہے۔ اور کیا ان کی اولاد جن میں سے بعض راست باز بلکہ نبی بھی تھے ناجائز طریق کی اولاد سمجھی جاتی ہے۔ (حجۃ الاسلام ص۵-۶)

عرب میں صدہا بیویوں تک نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان کے درمیان اعتدال بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے ایک مصیبت میں عورتیں پڑی ہوئی تھیں جیسا کہ اس کا ذکر جان ڈیون پورٹ اور دوسرے بہت سے انگریزوں نے بھی لکھا ہے قرآن کریم نے ان صدہا نکاحوں کے عدد کو گھٹا کر چار تک پہنچا دیا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

یعنی اگر تم ان میں اعتدال نہ رکھو تو پھر ایک ہی رکھو پس اگر کوئی قرآن کے زمانہ پر ایک نظر ڈال کر دیکھے کہ دنیا میں تعدد ازواج کس افراط تک پہنچ گیا تھا اور کیسی بے اعتدالیوں سے عورتوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا تھا تو اُسے اقرار کرنا پڑیگا کہ قرآن نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اُن تمام بے اعتدالیوں کو موقوف کر دیا لیکن چونکہ قانون قدرت ایسا ہی پڑا ہے کہ بعض اوقات انسان کو اولاد کی خواہش اور بیوی کے عقیمہ ہونے کے سبب سے یا بیوی کے دایمی بیمار رہنے کی وجہ سے یا بیوی کی ایسی بیماری کے عارضہ سے جس میں مباشرت ہرگز ناممکن ہے جیسی بعض صورتیں خروج رحم کی بعض میں چھونے کے ساتھ ہی عورت کی جان نکلتی ہے اور کبھی دس دس سال ایسی بیماریاں رہتی ہیں اور یا بیوی کا زمانہ پیری جلد آنے سے یا اس کے جلد جلد حمل دار ہونے کے باعث سے فطرتاً دوسری بیوی کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اس قدر تعدد کے لیے جواز کا حکم دیدیا اور ساتھ اس کے اعتدال کی شرط لگادی سو یہ انسان کی حالت پر رحم ہے تا وہ اپنی فطری ضرورتوں کے پیش آنے کے وقت الٰہی حکمت کے تدارک سے محروم نہ رہے جن کو اس بات کا علم نہیں کہ عرب کے باشندے قرآن شریف سے پہلے کثرت ازواج میں کس بے اعتدالی تک پہنچے ہوئے تھے ایسے بیوقوف ضرور کثرت ازدواجی کا الزام اسلام پر لگائیں گے مگر تاریخ کے جاننے والے اس بات کا اقرار کریں گے کہ قرآن نے اُن رسموں کو گھٹایا ہے نہ کہ بڑھایا پس جس نے تعدد ازواج کی رسم کو گھٹایا اور نہایت ہی کم کر دیا اور صرف اُس اندازہ پر جواز کے طور پر رہنے دیا جس کو انسان کی تمدن کی ضرورتیں کبھی نہ کبھی چاہتی ہیں کیا اُس کو کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے شہوت رانی کی تعلیم سکھائی ہے؟ (آریہ دھرم صفحہ ۳۹-۴۰)

یہ کیسی بے انصافی ہے کہ جن لوگوں کے مقدس اور پاک نبیوں نے سینکڑوں بیویاں ایک ہی وقت میں رکھی ہیں وہ دو یا تین بیویاں کا جمع کرنا ایک کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں بلکہ اس فعل کو زنا اور حرامکاری خیال کرتے ہیں کسی خاندان کا سلسلہ صرف ایک ایک بیوی سے ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کسی نہ کسی فرد سلسلہ میں یہ دقت آپڑتی ہے کہ ایک جورو عقیمہ اور ناقابل اولاد نکلتی ہے اِس تحقیق سے ظاہر ہے کہ دراصل بنی آدم کی نسل ازدواج مکرر سے ہی قایم و دایم چلی آتی ہے اگر ایک سے زیادہ بیوی کرنا منع ہوتا تو اب تک نوع انسان قریب قریب خاتمہ کے پہنچ جاتی تحقیق سے ظاہر ہوگا کہ اس مبارک اور مفید طریق نے انسان کی کہاں تک حفاظت کی ہے اور کیسے اُس نے اُجڑے ہوئے گھروں کو بیک دفعہ آباد کر دیا ہے اور انسان کے تقویٰ کے لیے یہ فعل کیسا زبردست ممد و معین ہے خاوندوں کی حاجت براری کے بارے میں جو عورتوں کی فطرت میں ایک نقصان پایا جاتا ہے جیسے ایام حمل اور حیض نفاس میں یہ طریق بابرکت اُس نقصان کا تدارک تام کرتا ہے اور جس حق کا مطالبہ مرد اپنی فطرت کے رو سے کر سکتا ہے وہ اُسے بخشتا ہے ایسا ہی مرد اور کئی وجوہات اور موجبات سے ایک سے زیادہ بیوی کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے مثلاً اگر مرد کی ایک بیوی تغیر عمر یا کسی بیماری کی وجہ سے بدشکل ہو جائے تو مرد کی قوت فاعلی جس پر سارا مدار عورت کی کارروائی کا ہے بیکار اور معطل ہو جاتی ہے لیکن اگر مرد بدشکل ہو تو عورت کا کچھ بھی حرج نہیں کیونکہ کارروائی کی کل مرد کو دی گئی ہے اور عورت کی تسکین کرنا مرد کے ہاتھ میں ہے ہاں اگر مرد اپنی قوت مردمی

میں قصور یا عجز رکھتا ہے تو قرآنی حکم کے رو سے عورت اُس سے طلاق لے سکتی ہے اور اگر پوری پوری تسلّی کرنے پر قادر ہو تو عورت یہ عُذر نہیں کر سکتی کہ دوسری بیوی کیوں کی ہے کیونکہ مرد کی ہر روزہ حاجتوں کی عورت ذمہ دار اور کاربرار نہیں ہو سکتی اور اِس سے مرد کا استحقاق دوسری بیوی کرنے کے لیے قایم رہتا ہے جو لوگ قوی الطاقت اور متقی اور پارسا طبع ہیں اُن کے لیے یہ طریق نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ بعض اسلام کے مخالف نفس امّارہ کی پیروی سے سب کچھ کرتے ہیں مگر اس پاک طریق سے سخت نفرت رکھتے ہیں کیونکہ بوجہ اندرونی بے قیدی کے جو اُن میں پھیل رہی ہے اُن کو اِس پاک طریق کی کچھ پروا اور حاجت نہیں اِس مقام میں عیسائیوں پر سب سے بڑھ کر افسوس ہے کیونکہ وہ اپنے مسلّم النبوت انبیا کے حالات سے آنکھ بند کر کے مسلمانوں پر ناحق دانت پیسے جاتے ہیں۔ شرم کی بات ہے کہ جن لوگوں کا اقرار ہے کہ حضرت مسیح کے جسم اور وجود کا خمیر اور اصل جڑ اپنی ماں کی جہت سے وہی کثرت ازدواج ہے جس کی حضرت داؤد (مسیح کے باپ) نے نہ دو نہ تین بلکہ سو بیوی تک نوبت پہنچائی تھی وہ بھی ایک سے زیادہ بیوی کرنا زنا کرنے کی مانند سمجھتے ہیں اور اِس پُر خُبث کلمہ کا نتیجہ جو حضرت مریم صدیقہ کی طرف عاید ہوتا ہے اُس سے ذرا پرہیز نہیں کرتے اور باوجود اس تمام بے ادبی کے دعویٰ محبت مسیح رکھتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ بئبل کے رو سے تعدد نکاح نہ صرف قولاً ثابت ہے بلکہ بنی اسرائیل کے اکثر نبیوں نے جن میں حضرت مسیح کے دادا صاحب بھی شامل ہیں عملاً اِس فعل کے جواز بلکہ استحباب پر مُہر لگا دی ہے۔ اے ناخدا ترس عیسائیو! اگر مُلہم کے لیے ایک ہی جورو ہونا ضروری ہے تو پھر کیا تم داؤد جیسے راست باز نبی کو نبی اللہ نہیں مانو گے یا سلیمان جیسے مقبول الٰہی کو مُلہم ہونے سے خارج کر دو گے۔ کیا بقول تمہارے یہ دائمی فعل اُن انبیا کا جن کے دلوں پر گویا ہر دم الہام الٰہی کی تار لگی ہوئی تھی اور ہر آن خوشنودی یا ناخوشنودی کی تفصیل کے بارے میں احکام وارد ہو رہے تھے ایک دائمی گناہ نہیں ہے جس سے وہ اخیر عمر تک باز نہ آئے اور خدا اور اُس کے حکموں کی کچھ پروا نہ کی۔ وہ غیرت مند اور نہایت درجہ کا غیور خدا جس نے نافرمانی کی وجہ سے ثمود اور عاد کو ہلاک کیا لوط کی قوم پر پتھر برسائے فرعون کو مع تمام شریر جماعت کے ہولناک طوفان میں غرق کر دیا کیا اُس کی شان اور غیرت کے لائق ہے کہ اُس نے ابراہیم اور یعقوب اور موسیٰ اور داؤد اور سلیمان اور دوسرے کئی انبیا کو بہت سی بیویوں کے کرنے کی وجہ سے تمام عمر نافرمان پا کر اور پکے سرکش دیکھ کر پھر اُن پر عذاب نازل نہ کیا بلکہ اُنہیں سے زیادہ تر دوستی اور محبت کی کیا آپ کے خدا کو الہام اُتارنے کے لیے کوئی اور آدمی نہیں ملتا تھا یا بہت سی جورو ان کرنے والے ہی اُس کو پسند آ گئے؟ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نبیوں اور تمام برگزیدوں نے بہت سی جوروان کر کے اور پھر روحانی طاقتوں اور قبولیتوں میں سب سے سبقت لے جا کر تمام دُنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ دوست الٰہی بننے کے لیے یہ راہ نہیں کہ انسان دُنیا میں مخنثوں اور نامردوں کی طرح رہے بلکہ ایمان میں قوی الطاقت وہ ہے جو بیویوں اور بچوں کا سب سے بڑھ کر بوجھ اُٹھا کر پھر باوجود ان سب تعلقات کے بے تعلق ہو۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۸۱-۲۸۴)

اگرچہ آریہ سماج والے تعدد ازدواج کو نظرِ نفرت سے دیکھتے ہیں مگر بلاشبہ وہ اِس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں جس کے لیے اکثر انسان تعدد ازدواج کے لیے مجبور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے لیے یہ ضروری امر ہے

کہ اپنی نسل باقی رہنے کے لیے کوئی احسن طریق اختیار کرے اور لاولد رہنے سے اپنے تئیں بچاوے اور یہ ظاہر ہے کہ بسا اوقات ایک بیوی سے اولاد نہیں ہوتی اور یا ہوتی ہے اور باعث لاحق ہونے کسی بیماری کے مر مر جاتی ہے اور یا لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں مرد کو دوسری بیوی کے نکاح کے لیے ضرورت پیش آتی ہے خاص کر ایسے مرد جن کی نسل کا مفقود ہونا قابل افسوس ہوتا ہے اور اُن کی ملکیت اور ریاست کو بہت حرج اور نقصان پہنچتا ہے۔ ایسا ہی اور بہت سے وجوہ تعدد نکاح کے لیے پیش آتے ہیں مگر بالفعل ہم صرف یہ ایک ہی وجہ بیان کرکے قرآن شریف کی اُس تعلیم کا جو تعدد ازواج کی ضرورت پیش کرتی ہے وید کی اس تعلیم سے مقابلہ کرتے ہیں جو ضرورت مندرجہ بالا کے پورا کرنے کے لیے وید نے پیش کی ہے

سنو! جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن شریف میں انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے تعدد ازواج کو روا رکھا ہے اور منجملہ اُن ضرورتوں کے ایک یہ بھی ہے کہ تا بعض صورتوں میں تعدد ازواج نسل قائم رہ جانے کا موجب ہو جائے کیونکہ جس طرح قطرے قطرے سے دریا بنتا ہے اسی طرح نسل سے بھی قومیں بنتی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ کثرت نسل کے لیے نہایت عمدہ طریق تعدد ازواج ہے پس وہ برکت جس کا دوسرے لفظوں میں نام کثرت نسل ہے اُس کا بڑا بھاری ذریعہ تعدد ازواج ہی ہے یہ تو وہ ذریعہ کثرت نسل کا ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا ہے اور اس کے برخلاف جو وید نے ذریعہ پیش کیا ہے جس کو وہ نہایت ضروری سمجھتا ہے وہ نیوگ ہے یعنی یہ کہ اگر کسی کے گھر میں پہلی بیوی سے اولاد نہ ہو تو اولاد حاصل کرنے کے لیے دو طریق ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اُس کی اپنی بیوی کسی دوسرے مرد سے مونہہ کالا کراوے نہ ایک دن نہ دو دن بلکہ قریباً چودہ سال تک کسی دوسرے مرد سے ناجائز تعلق رکھے یا کم و بیش۔ اور جو اُس غیر مرد سے اولاد ہو وہ مرغیوں کے بچوں کی طرح نصفا نصف تقسیم ہو جائے گی۔ یعنی نصف بچے تو اس پاکدامن کے خاوند کو ملیں گے اور نصف دیگر اُس کو ملیں گے جس کے ساتھ یارانہ اولاد کے لیے لگایا گیا۔ اب اگرچہ آریہ صاحبان اِس کام سے کچھ بھی نفرت نہیں کرتے مگر میں جانتا ہوں کہ اب بھی کئی کروڑ ہندو اسی آریہ ورت میں ایسے ہوں گے کہ وید کی اِس تعلیم کو اُن کا دل ہرگز منظور نہیں کرتا ہوگا اور مسلمانوں کی طرح ضرورت کے وقت دوسری شادی کرتے ہونگے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ شریف ہندوؤں کی فطرت نے بھی ضرورت کے وقت نکاح ثانی کو پسند کیا ہے اگر تم پنجاب میں ہی تلاش کرو تو ہزارہا دولت مند اور امیر ہندو ایسے نکلیں گے کہ وہ دو دو تین تین بیویاں رکھتے ہونگے مگر بجز اس قلیل گروہ آریوں کے کوئی شریف باعزت ہندو اس بات کو منظور نہیں کرے گا کہ اپنی جوان خوبصورت بیوی کو رات کو دوسرے کے ساتھ ہم بستر کراوے اگر یہ بے غیرتی نہیں تو پھر بے غیرتی اور بے شرمی کس چیز کا نام ہے؟ مگر کئی بیویاں کرنے کا طریق مسلمانوں کی طرح ہندوؤں میں بھی ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور اِس وقت کے ہندو راجے بھی برابر اس کے کاربند ہیں اور ہم بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ کئی بیویاں کرنے کا طریق فقط اسی زمانہ میں ہندوؤں میں پیدا نہیں ہوا بلکہ ہندوؤں کے وہ بزرگ جو اوتار کہلاتے تھے ان کا تعدد ازواج بھی ثابت ہے چنانچہ کرشن جی کی

ہزاروں بیویاں بیان کی جاتی ہیں اور اگر ہم اِس بیان کو مبالغہ خیال کریں تو اس میں شک نہیں کہ دس بیس تو ضرور ہوں گی۔ راجہ رام چندر کے باپ کی بھی دو بیویاں تھیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے وید میں کہیں تعدّد ازواج کی ممانعت نہیں پائی جاتی ورنہ یہ بزرگ لوگ ایسا کام کیوں کرتے جو وید کے برخلاف تھا ایسا ہی باوا نانک صاحب جو ہندو قوم میں ایک بڑے مقدس آدمی شمار کیے گئے ہیں اُن کی بھی دو بیویاں تھیں۔

اِس جگہ مخالفوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کرتا ہے کہ تعدد ازواج میں یہ ظلم ہے کہ اعتدال نہیں رہتا اعتدال اسی میں ہے کہ ایک مرد کے لیے ایک ہی بیوی ہو مگر مجھے تعجب ہے کہ وہ دوسروں کے حالات میں کیوں خواہ نخواہ مداخلت کرتے ہیں جبکہ یہ مسئلہ اسلام میں شائع متعارف ہے کہ چار تک بیویاں کرنا جائز ہے مگر جبر کسی پر نہیں اور ہر ایک مرد اور عورت کو اس مسئلہ کی بخوبی خبر ہے تو یہ اُن عورتوں کا حق ہے کہ جب کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہیں تو اول شرط کرا لیں کہ اُن کا خاوند کسی حالت میں دوسری بیوی نہیں کرے گا اور اگر نکاح سے پہلے ایسی شرط لکھی جائے تو بیشک ایسی بیوی کا خاوند اگر دوسری بیوی کرے تو جرم نقض عہد کا مرتکب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی عورت ایسی شرط نہ لکھا وے اور حکم شرع پر راضی ہو وے تو اس حالت میں دوسرے کا دخل دینا بیجا ہوگا اور اس جگہ یہ مثل صادق آئے گی کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ہر ایک عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ خُدا نے تعدّد ازواج فرض و واجب نہیں کیا ہے خدا کے حکم کی رو سے صرف جائز ہے پس اگر کوئی مرد اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے اِس جائز حکم سے فائدہ اُٹھانا چاہے جو خدا کے جاری کردہ قانون کی رو سے ہے اور اُس کی پہلی بیوی اُس پر راضی نہ ہو تو اُس بیوی کے لیے یہ راہ کشادہ ہے کہ وہ طلاق لے لے اور اس غم سے نجات پاوے اور اگر دوسری عورت جس سے نکاح کرنے کا ارادہ ہے اُس نکاح پر راضی نہ ہو تو اس کے لیے بھی یہ سہل طریق ہے کہ ایسی درخواست کرنے والے کو انکاری جواب دیدے کسی پر جبر تو نہیں لیکن اگر وہ دونوں عورتیں اس نکاح پر راضی ہو جاویں تو اس صورت میں کسی آریہ کو خواہ نخواہ دخل دینے اور اعتراض کرنے کا کیا حق ہے ؟ کیا اُس مرد نے اُن عورتوں سے نکاح کرنا ہے یا اُس آریہ سے۔ جس حالت میں خُدا نے تعدّد ازواج کو کسی موقع پر انسانی ضرورتوں میں جایز رکھا ہے اور ایک عورت اپنے خاوند کے دوسرے نکاح میں رضامندی ظاہر کرتی ہے اور دوسری عورت بھی اس نکاح پر خوش ہے تو کسی کا حق نہیں ہے کہ اُن کے اس باہمی فیصلہ کو منسوخ کردے اور اس جگہ یہ بحث پیش کرنا کہ ایک سے زیادہ بیوی کرنا پہلی بیوی کے حق میں ظلم ہے اور طریق اعتدال کے برخلاف ہے یہ اُن لوگوں کا کام ہے جن کی تعصب سے عقل ماری گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ حقوق عباد کے متعلّق ہے اور جو شخص دو بیویاں کرتا ہے اس میں خدا تعالیٰ کا حرج نہیں اگر حرج ہے تو اس بیوی کا جو پہلی بیوی ہے یا دوسری بیوی کا پس اگر پہلی بیوی اس نکاح میں اپنی حق تلفی سمجھتی ہے تو وہ طلاق لیکر اِس جھگڑے سے خلاصی پا سکتی ہے اور اگر خاوند طلاق نہ دے تو بذریعہ حاکم وقت وہ خلع کرا سکتی ہے اور اگر دوسری بیوی اپنا کچھ حرج سمجھتی ہے تو وہ اپنے نفع نقصان کو خود سمجھتی ہے پس یہ اعتراض کرنا کہ اس طور سے اعتدال ہاتھ سے جاتا ہے خواہ نخواہ کا دخل ہے اور بایں ہمہ خدا تعالیٰ نے مردوں کو وصیت

فرمائی ہے کہ اُن کی چند بیویاں ہوں تو ان میں اعتدال رکھیں ورنہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں۔

اور یہ کہنا کہ تعدّد ازدواج شہوت پرستی سے ہوتا ہے یہ بھی سراسر جاہلانہ اور متعصّبانہ خیال ہے ہم نے تو اپنی آنکھوں کے تجربہ سے دیکھا ہے کہ جن لوگوں پر شہوت پرستی غالب ہے اگر وہ تعدّد ازدواج کی مبارک رسم کے پابند ہو جائیں تب تو وہ فسق و فجور اور زنا کاری اور بدکاری سے رُک جاتے ہیں اور یہ طریق اُن کو متقی اور پرہیز گار بنا دیتا ہے ورنہ نفسانی شہوات کا تُند اور تیز سیلاب بازاری عورتوں کے دروازہ تک اُن کو پہنچا دیتا ہے آخر آتشک اور سوزاک خریدتے یا اور کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ کام فسق و فجور کے چھپے چھپے اور کھلے کھلے اُن سے صادر ہوتے ہیں جن کی نظیر اُن لوگوں میں ہرگز نہیں پائی جاتی جن کی دو دو تین تین دل پسند بیویاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ تھوڑی مدت تک تو اپنے تئیں روکتے ہیں آخر اس قدر یکدفعہ اُن کی ناجائز شہوات جوش میں آتی ہیں کہ جیسے ایک دریا کا بند ٹوٹ کر وہ دریا دن کو یا رات کو تمام اردگرد کے دیہات کو تباہ کر دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام کام نیّت پر موقوف ہیں جو لوگ اپنے اندر یہ محسوس کرتے ہیں کہ دوسری بیوی کرنے سے اُن کے تقویٰ کا سامان پورا ہو جائے گا اور وہ فسق و فجور سے بچ جائیں گے یا یہ کہ وہ اس ذریعہ سے اپنی صالح اولاد چھوڑ جائیں گے تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ضرور اس بابرکت کام سے حصہ لیں خدا کی جناب میں بدکاری اور بدنظری ایسے ناپاک گناہ ہیں جن سے نیکیاں باطل ہو جاتی ہیں اور آخر اسی دُنیا میں جسمانی عذاب نازل ہو جاتے ہیں۔ پس اگر کوئی تقویٰ کے محکم قلعہ میں داخل ہونے کی نیت سے ایک سے زیادہ بیویاں کرتا ہے اُس کے لیے صرف جایز ہی نہیں بلکہ یہ عمل اُس کے لیے موجب ثواب ہے۔ جو شخص اپنے تئیں بدکاری سے روکنے کے لیے تعدد ازدواج کا پابند ہوتا ہے وہ گویا اپنے تئیں فرشتوں کی طرح بنانا چاہتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ اندھی دُنیا صرف جھوٹی منطقوں اور جھوٹی شیخیوں میں گرفتار ہے وہ لوگ جو تقویٰ کی تلاش میں لگے نہیں رہتے کہ کیونکر حاصل ہو اور تقویٰ کے حصول کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرتے اور نہ دعا کرتے ہیں اُن کی حالتیں اُس پھوڑے کی مانند ہیں جو اوپر سے بہت چمکتا ہے مگر اُس کے اندر بجز پیپ کے اور کچھ نہیں اور خدا کی طرف جھکنے والے جو کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کرتے وہ تقویٰ کی راہوں کو یوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں جیسا کہ ایک گدا روٹی کو۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں مصیبتوں کی آگ میں پڑتے ہیں جن کا دل ہر وقت مغموم رہتا ہے اور خدا کی راہ میں بڑے مقاصد مگر دشوار گذار اُن کی روح کو تحلیل کرتے اور کمر کو توڑتے رہتے ہیں اُن کے لیے خدا خود تجویز کرتا ہے کہ وہ اپنے دن یا رات میں سے چند منٹ اپنی مانوس بیویوں کے ساتھ بسر کریں اور اس طرح پر اپنے کوفتہ اور شکستہ نفس کو آرام پہنچاویں اور پھر سرگرمی سے اپنے دینی کام میں مشغول ہو جاویں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سمجھتا مگر وہ جو اس راہ میں مذاق رکھتے ہیں۔ میں نے ہندوؤں کی ہی پستک میں یہ ایک حکایت پڑھی ہے کہ ایک شخص کسی بہت ضروری کام کے لیے کسی طرف جاتا تھا اور راہ میں اُس کے ایک خونخوار دریا تھا۔ اور کوئی کشتی نہیں تھی اور جانا ضروری تھا جب وہ دریا کے کنارہ پر پہنچا تو ایک فقیر کو اس نے دیکھا جس کی سَو بیوی تھی تب اُس نے اُس کی خدمت میں عرض کی کہ آپ دعا کریں کہ میں کسی طرح اس دریا سے پار ہو جاؤں اُس فقیر نے کہا کہ تو دریا کے کنارہ

پر جا اور اُس دریا کو کہہ دے کہ میں تیرے آگے اُس فقیر مجرد کا واسطہ ڈالتا ہوں جو تیرے کنارہ پر بیٹھا ہے جس نے ساری عمر میں کسی عورت کو چھوا بھی نہیں پس اگر یہ بات سچ ہے تو مجھے راہ دیدے۔ جب اس شخص نے یہ پیغام اس دریا کو پہنچایا تو یہ سنتے ہی دریا نے راہ دیدی اور وہ دریا سے پار ہو گیا اور آتے وقت پھر وہی مشکل تھی اور دوسرے کنارہ پر اور فقیر بیٹھا ہوا تھا جو ہر روز ایک دیگ پلاؤ کی کھاتا تھا یہ شخص اُس کے پاس گیا اور اپنی مشکل بیان کی اُس نے کہا کہ دریا کو میری طرف سے جا کر کہہ دے کہ میں تیرے آگے اس فقیر کا واسطہ ڈالتا ہوں جو تیرے کنارہ پر بیٹھا ہے جس نے کبھی ایک دانہ اناج کا بھی نہیں کھایا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو مجھے راہ دیدے تب فی الفور دریا نے راہ دیدی ؎

تو مردان آن راہ چون بنگری	کہ از کینہ و بُغض کور و کری
چہ دانی کہ ایشان چساں می زیند	ز دُنیا نہان در نہان می زیند
فدا گشتہ در راہ آن جان پناہ	ز کف دل ز سر او فتادہ کلاہ
دلے ریش رفتہ بکوئے دِگر	ز تحسین و لعنِ جہان بے خبر
چو بیت المقدس درون پُر زتاب	رہا کردہ دیوار بیرون خراب

(چشمہ معرفت ۲۳۴-۲۴۰)

کثرت ازدواج کثرت اولاد کا موجب ہے جو ایک برکت ہے۔ اگر ایک عورت کا سو خاوند ہو تو اُس کو سو لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اگر سو عورت کا ایک خاوند ہو تو سو لڑکا پیدا ہونا کچھ بعید نہیں ہے پس جس طریق سے انسان کی نسل پھیلتی ہے اور خدا کے بندوں کی تعداد بڑھتی ہے اس طریق کو کیوں بُرا کہا جاوے؟ اگر کہو کہ یہ اعتدال کے برخلاف ہے تو یہ خیال باطل ہے کیونکہ جب کہ خدا نے ایک کو مرد بنایا اور زیادہ بچہ پیدا کرانے کا اس میں مادہ رکھا اور عورت کی نسبت اس کو بہت زبردست قوتیں دیں تو اس صورت میں اعتدال کو تو خدا نے اپنے ہاتھ سے توڑ دیا جن کو خدا نے برابر نہیں کیا وہ کیونکر برابر ہو جائیں اُن کو برابر سمجھنا صریح حماقت ہے۔ ماسوا اِس کے ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ تعدادِ ازدواج میں کسی عورت پر ظلم نہیں مثلاً اگر کسی شخص کی پہلی بیوی موجود ہے تو اب دوسری عورت جو اس سے شادی کرنا چاہتی ہے وہ کیوں ایسے شخص سے شادی کرتی ہے جو پہلے بھی ایک بیوی رکھتا ہے ظاہر ہے کہ وہ تبھی شادی کرے گی کہ جب تعدد ازدواج پر راضی ہو جائے گی پھر جب میاں بیوی راضی ہو گئے تو پھر دوسرے کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔ جب حقدار نے اپنا حق چھوڑ دیا تو پھر دوسرے کا اعتراض محض جھک مارنا ہے اور اگر پہلی بیوی ہے تو وہ خوب جانتی ہے کہ اسلام میں دوسری بیوی کر سکتے ہیں تو وہ کیوں نکاح کے وقت میں یہ شرط نہیں کرا لیتی کہ اس کا خاوند دوسری بیوی نہ کرے اس صورت میں وہ بھی اپنی خاموشی سے اپنا حق چھوڑتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ کثرت ازواج خدا کے تعلق کی کچھ حارج نہیں اگر کسی کی دس ہزار بیوی بھی ہو تو اگر اُس کا خدا سے پاک اور مستحکم تعلق ہے تو دس ہزار بیوی سے اُس کا

کچھ بھی حرج نہیں بلکہ اس سے اُس کا کمال ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام تعلقات کے ساتھ وہ ایسا ہے کہ گویا اُس کو کسی کے ساتھ بھی تعلق نہیں اگر ایک گھوڑا بوجھ کی حالت میں کچھ چل نہیں سکتا مگر بغیر سواری اور بوجھ خوب چال نکالتا ہے تو وہ گھوڑا کس کام کا ہے؟ اِسی طرح بہادر وہی لوگ ہیں جو تعلقات کے ساتھ ایسے ہیں کہ گویا بے تعلق ہیں پاک آدمیوں کی شہوات کو ناپاکوں کی شہوات پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ناپاک لوگ شہوات کے اسیر ہوتے ہیں مگر پاکوں میں خدا اپنی حکمت اور مصلحت سے آپ شہوات پیدا کر دیتا ہے اور صرف صورت کا اشتراک ہے جیسا کہ مثلاً قیدی بھی جیل خانہ میں رہتے ہیں اور داروغہ جیل بھی۔ مگر دونوں کی حالت میں فرق ہے۔ دراصل ایک انسان کا خدا سے کامل تعلق تبھی ثابت ہوتا ہے کہ بظاہر بہت سے تعلقات میں وہ گرفتار ہو۔ بیویاں ہوں اولاد ہو تجارت ہو زراعت ہو اور کئی قسم کے اُس پر بوجھ پڑے ہوئے ہوں اور پھر وہ ایسا ہو کہ گویا خدا کے سوا کسی کے ساتھ بھی اُس کا تعلق نہیں یہی کامل انسانوں کے علامات ہیں۔ اگر ایک شخص ایک بن میں بیٹھا ہے نہ اُس کی کوئی جورو ہے نہ اولاد ہے نہ دوست ہیں اور نہ کوئی بوجھ کسی قسم کے تعلق کا اُس کے دامنگیر ہے تو ہم کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ اُس نے تمام اہل وعیال اور ملکیت اور مال پر خدا کو مقدم کر لیا ہے اور بے امتحان ہم اس کے کیونکر قایل ہو سکتے ہیں اگر ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیویاں نہ کرتے تو ہمیں کیونکر سمجھ آ سکتا کہ خدا کی راہ میں جاں فشانی کے موقعہ پر آپ ایسے بے تعلق تھے کہ گویا آپ کی کوئی بھی بیوی نہیں تھی مگر آپ نے بہت سی بیویاں اپنے نکاح میں لا کر صدہا امتحانوں کے موقعہ پر یہ ثابت کر دیا کہ آپ کو جسمانی لذات سے کچھ بھی غرض نہیں اور آپ کی ایسی مجردانہ زندگی ہے کہ کوئی چیز آپ کو خدا سے روک نہیں سکتی تاریخ دان لوگ جانتے ہیں کہ آپ کے گھر میں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے تھے اور سب کے سب فوت ہو گئے تھے اور آپ نے ہر ایک لڑکے کی وفات کے وقت یہی کہا کہ مجھے اس سے کچھ تعلق نہیں میں خدا کا ہوں اور خدا کی طرف جاؤں گا۔ ہر ایک دفعہ اولاد کے مرنے میں جو لخت جگر ہوتے ہیں یہی مونہہ سے نکلتا تھا کہ اے خدا ہر ایک چیز پر میں تجھے مقدم رکھتا ہوں مجھے اِس اولاد سے کچھ تعلق نہیں۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ بالکل دُنیا کی خواہشوں اور شہوات سے بے تعلق تھے اور خدا کی راہ میں ہر ایک وقت اپنی جان ہتھیلی پر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جنگ کے موقعہ پر آپ کی انگلی پر تلوار لگی اور خون جاری ہو گیا تب آپ نے اپنی انگلی کو مخاطب کر کے کہا کہ اے اُنگلی تو کیا چیز ہے صرف ایک اُنگلی ہے جو خدا کی راہ میں زخمی ہو گئی۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے گھر میں گئے اور دیکھا کہ گھر میں کچھ اسباب نہیں اور آپ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور چٹائی کے نشان پیٹھ پر لگے ہیں تب عمرؓ کو یہ حال دیکھ کر رونا آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے عُمر تو کیوں روتا ہے۔ حضرت عمر نے عرض کی کہ آپ کی تکالیف کو دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ قیصر اور کسریٰ جو کافر ہیں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور آپ ان تکالیف میں بسر کرتے ہیں۔ تب آنجناب نے فرمایا کہ مجھے اِس دُنیا سے کیا کام! میری مثال اُس سوار کی ہے کہ جو شدت گرمی کے وقت ایک اونٹنی پر جا رہا ہے اور جب دوپہر کی شدت نے اُس کو سخت تکلیف دی تو وہ اسی سواری کی حالت

میں دم لینے کے لیے ایک درخت کے سایہ کے نیچے ٹھہر گیا اور پھر چند منٹ کے بعد اسی گرمی میں اپنی راہ لی۔ اور آپ کی بیویاں بھی بجز حضرت عائشہ کے سب سن رسیدہ تھیں بعض کی عمر ساٹھ برس تک پہنچ چکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تعدد ازدواج سے یہی اہم اور مقدم مقصود تھا کہ عورتوں میں مقاصد دین شایع کیے جائیں اور اپنی صحبت میں رکھ کر علم دین اُن کو سکھایا جائے تا وہ دوسری عورتوں کو اپنے نمونہ اور تعلیم سے ہدایت دے سکیں یہ آپ ہی کی سنت مسلمانوں میں اب تک جاری ہے کہ کسی عزیز کی موت کے وقت کہا جاتا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[1] یعنی ہم خدا کے ہیں اور خدا کا مال ہیں اور اُسی کی طرف ہمارا رجوع ہے۔ سب سے پہلے یہ صدق و وفا کے کلمے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلے تھے پھر دوسروں کے لیے اِس نمونہ پر چلنے کا حکم ہوگیا۔ اگر آنجناب بیویاں نہ کرتے اور لڑکے پیدا نہ ہوتے تو ہمیں کیوں کر معلوم ہوتا کہ آپ خدا کی راہ میں اس قدر فدا شدہ ہیں کہ اولاد کو خدا کے مقابل پر کچھ بھی چیز نہیں سمجھتے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۸۶-۲۸۷)

کثرت ازدواج کے متعلق صاف الفاظ قرآن کریم میں دو دو تین تین چار چار کر کے ہی آئے ہیں۔ مگر اُسی آیت میں اعتدال کی بھی ہدایت ہے۔ اگر اعتدال نہ ہو سکے۔ اور محبت ایک طرف زیادہ ہو جاوے۔ یا آمدنی کم ہو۔ اور یا قوائے رجولیت ہی کمزور ہوں۔ تو پھر ایک سے تجاوز کرنا نہیں چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے کہ انسان اپنے تئیں ابتلا میں نہ ڈالے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ[2]۔

حلال پر بھی ایسا زور نہ مارو کہ نفس پرست ہی بن جاؤ۔ غرض اگر حلال کو حلال سمجھ کر بیویوں ہی کا بندہ ہو جاوے۔ تو بھی غلطی کرتا ہے۔ ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی منشاء کو نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کا یہ منشا نہیں۔ کہ بالکل زن مرید ہو کر نفس پرست ہی ہو جاؤ۔ اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ رہبانیت اختیار کرو۔ بلکہ اعتدال سے کام لو اور اپنے تئیں بے جا کارروائیوں میں نہ ڈالو۔

انبیاء علیہم السلام کے لیے کوئی نہ کوئی تخصیص اگر اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے۔ تو یہ کوتاہ اندیش لوگوں کی ابلہ فریبی اور غلطی ہے کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ دیکھو توریت میں کاہنوں کے فرقہ کے ساتھ خاص مراعات ملحوظ رکھی گئی ہیں اور ہندؤں کے برہمنوں کے لیے خاص خاص رعایتیں ہیں پس یہ نادانی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی کسی تخصیص پر اعتراض کیا جاوے۔ اُن کا نبی ہونا ہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جو اور لوگوں میں موجود نہیں۔ (الحکم جلد ۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۸۹۸ء صفحہ ۲)

کثرت ازدواج پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت عورتوں کی اجازت دی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا کوئی ایسا دلیر اور مرد میدان معترض ہے جو ہم کو یہ دکھلا سکے۔ کہ قرآن کہتا ہے ضرور ضرور ایک سے زیادہ عورتیں کرو۔ ہاں یہ ایک سچی بات ہے۔ اور بالکل طبعی امر ہے کہ اکثر اوقات انسان کو ضرورت پیش آجاتی ہے۔ کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں کرے۔ مثلاً عورت اندھی ہو گئی یا کسی اور خطرناک (مرض) میں مبتلا ہو کر اس قابل ہو گئی کہ خانہ داری کے امور سرانجام نہیں دے سکتی۔ اور مرد از راہ ہمدردی

[1] البقرۃ آیت ۱۵۷۔ [2] المائدۃ آیت ۸۸۔

یہ بھی نہیں چاہتا کہ اُسے علیحدہ کرے یا رحم کی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو کر مرد کی طبعی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ تو ایسی صورت میں اگر نکاح ثانی کی اجازت نہ ہو تو بتلاؤ کیا اُس سے بدکاری اور بداخلاقی کو ترقی نہ ہوگی؟ پھر اگر کوئی مذہب و شریعت کثرت ازدواج کو روکتی ہے تو یقیناً وہ بدکاری اور بداخلاقی کی مؤیّد ہے لیکن اسلام جو دنیا سے بداخلاقی اور بدکاری کو دُور کرنا چاہتا ہے اجازت دیتا ہے کہ ایسی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ ایسا ہی اولاد کے نہ ہونے پر جبکہ لاولد کے پس مرگ خاندان میں بہت سے ہنگامے اور کشت و خون ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے ایک ضروری امر ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں کر کے اولاد پیدا کرے۔ بلکہ ایسی صورت میں نیک اور شریف بیبیاں خود اجازت دے دیتی ہیں پس جس قدر غور کرو گے یہ مسئلہ صاف اور روشن نظر آئے گا۔ عیسائی کو تو حق ہی نہیں پہنچتا کہ اس مسئلہ پر نکتہ چینی کرے۔ کیونکہ اُن کے مسلّم نبی اور ملہم بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بزرگوں نے سات سات سو اور تین تین سو بیبیاں کیں۔ اور اگر وہ کہیں کہ وہ فاسق فاجر تھے تو پھر اُن کو اس بات کا جواب دینا مشکل ہوگا کہ اُن کے الہام خدا کے الہام کیونکر ہو سکتے ہیں۔ عیسائیوں میں بعض فرقے ایسے بھی ہیں جو نبیوں کی شان میں ایسی گستاخیاں جائز نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں انجیل میں صراحت سے اس مسئلہ کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔ لنڈن کی عورتوں کا زور ایک باعث ہو گیا کہ دوسری عورت نہ کریں۔ پھر اس کے نتائج خود دیکھ لو کہ لنڈن اور پیرس میں عفت اور تقویٰ کی کیسی قدر ہے۔

(الحکم جلد ۳ عـ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء صـ۸)

عیسائیوں نے جو مسیح کو خدا بناتے ہیں باوجود خدا بنانے کے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اور باتوں کے علاوہ ایک نئی بات مجھے معلوم ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ جس یوسف کے ساتھ حضرت مریم کی شادی ہوئی اس کی ایک بیوی پہلے بھی موجود تھی اب غور طلب یہ امر ہے کہ یہودیوں نے تو اپنی شرارت سے اور حد سے بڑھی ہوئی شوخی سے حضرت مسیح کی پیدائش کو ناجائز قرار دیا۔ اور انہوں نے یہ ظلم پر ظلم کیا کہ ایک تارکہ اور نذر دی ہوئی لڑکی کا اپنی شریعت کے خلاف نکاح کیا اور پھر حمل میں نکاح کیا۔ اس طرح پر انہوں نے شریعت موسوی کی توہین کی اور بااین حضرت مسیح کی پاک پیدائش پر نکتہ چینی کی اور ایسی نکتہ چینی جس کو ہم سن بھی نہیں سکتے ان کے مقابلے میں عیسائیوں نے کیا کیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کی پیدائش کو تو بے شک اعتقادی طور پر روح القدس کی پیدائش قرار دیا اور خود خدا ہی کو مریم کے پیٹ سے پیدا کیا مگر تعدد ازدواج کو ناجائز کہہ کر وہی اعتراض اس شکل میں حضرت مریم کی اولاد پر کر دیا۔ اور اس طرح پر خود مسیح اور ان کے دوسرے بھائیوں کی پیدائش پر حملہ کیا۔

واقعی عیسائیوں نے تعدد ازدواج کے مسئلہ پر اعتراض کر کے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے ہم تو حضرت مسیح کی شان بہت بڑی سمجھتے ہیں۔ اور اُسے خدا کا سچا اور برگزیدہ نبی مانتے ہیں۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی پیدائش باپ کے بدوں خدا تعالیٰ کی قدرت کا ایک نمونہ تھی۔ اور حضرت مریم صدیقہ تھیں یہ قرآن کریم کا احسان ہے حضرت مریم پر اور حضرت مسیح پر جو ان کی تطہیر کرتا ہے اور پھر یہ احسان ہے اس زمانہ کے موعود امام کا کہ اس نے ازسرِ نو اس تطہیر کی تجدید فرمائی۔

(الحکم جلد ۵ عـ۴۱ صـ۳ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء)

اگرچہ عورت یہاں تک خود پسند نہیں کرتی کہ کوئی اور اس کی سَوت آوے مگر اسلام نے جس اصول پر کثرت ازدواج کو رکھا ہے وہ تقویٰ کی بنا پر ہے۔ بعض وقت اولاد نہیں ہوتی اور بقائے نوع کا خیال انسان میں ایک فطرتی تقاضا ہے اس لیے دوسری شادی کرنے میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ بعض اوقات پہلی بیوی کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے اور بہت سے اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں پس اگر عورتوں کو پورے طور پر خدا تعالیٰ کے احکام سے اطلاع دی جاوے اور انہیں آگاہ کیا جاوے تو وہ خود بھی دوسری شادی کی ضرورت پیش آنے پر ساعی ہوتی ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

عورتوں میں یہ بھی ایک بد عادت ہے۔ کہ جب کسی عورت کا خاوند کسی اپنی مصلحت کے لیے کوئی دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ عورت اور اس کے اقارب سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور گالیاں دیتے ہیں۔ اور شور مچاتے ہیں۔ اور اس بندۂ خدا کو ناحق ستاتے ہیں۔ ایسی عورتیں اور ایسے ان کے اقارب بھی نابکار اور خراب ہیں۔ کیونکہ اللہ جلّ شانہ نے اپنی حکمت کاملہ سے جس میں صدہا مصالح ہیں۔ مردوں کو اجازت دے رکھی ہے۔ کہ وہ اپنی کسی ضروریات یا مصلحت کے وقت چار تک بیویاں کر لیں۔ پھر جو شخص اللہ رسول کے حکم کے مطابق کوئی نکاح کرتا ہے۔ تو اس کو کیوں بُرا کہا جائے۔ ایسی عورتیں اور ایسے ہی اس عادت والے اقارب جو خدا اور اس کے رسول کے حکموں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ نہایت مردود اور شیطان کی بہنیں اور بھائی ہیں۔ کیونکہ وہ خدا اور رسول کے فرمودہ سے مُنہ پھیر کر اپنے ربّ کریم سے لڑائی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر کسی نیک دل مسلمان کے گھر میں ایسی بد ذات بیوی ہو۔ تو اُسے مناسب ہے کہ اس کو سزا دینے کے لیے دوسرا نکاح ضرور کرے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۴۷)

کثرت ازدواج کے اعتراض میں ہماری طرف سے وہی معمولی جواب ہوگا کہ اسلام سے پہلے اکثر قوموں میں کثرت ازدواج کی سیکڑوں اور ہزاروں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ اور اسلام نے تعداد ازدواج کو کم کیا ہے نہ زیادہ۔ بلکہ یہ قرآن میں ہی ایک فضیلت خاص ہے کہ اُس نے ازدواج کی بے حدی اور بے قیدی کو ردّ کر دیا ہے۔ اور کیا وہ اسرائیلی قوم کے مقدس نبی جنہوں نے سو سو بیوی کی۔ بلکہ بعض نے سات سو تک نوبت پہنچائی۔ وہ اخیر عمر تک حرامکاری میں مُبتلا رہے۔ اور کیا اُن کی اولاد جن میں سے بعض راستباز بلکہ نبی بھی تھے ناجائز طریق کی اولاد سمجھی جاتی ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۳۹)

واحدٌ لاشریک ہونا خدا کی تعریف ہے۔ مگر عورتیں بھی شریک ہرگز پسند نہیں کرتی ہیں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میرے ہمسایہ میں ایک شخص اپنی بیوی سے بہت کچھ سختی کیا کرتا تھا۔ اور ایک مرتبہ اس نے دوسری بیوی کرنے کا ارادہ کیا۔ تب اس بیوی کو نہایت رنج پہنچا۔ اور اس نے اپنے شوہر کو کہا۔ کہ میں نے تیرے سارے دکھ سہے۔ مگر یہ دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ کہ تو میرا خاوند ہو کر اب دوسری کو میرے ساتھ شریک کرے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کے اس کلمہ نے میرے دل پر نہایت دردناک اثر پہنچایا میں نے چاہا کہ اس کلمہ کے مشابہ قرآن شریف میں پاؤں۔ سو یہ آیت مجھے ملی۔ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ[۵] ۔الآیۃ یہ

[۵] النساء آیت ۴۹

مسئلہ بظاہر بڑا نازک ہے۔ دیکھا جاتا ہے۔ کہ جس طرح مرد کی غیرت نہیں چاہتی کہ اس کی عورت اس میں اور اس کے غیر میں شریک ہو۔ اسی طرح عورت کی غیرت بھی نہیں چاہتی۔ کہ اس کا مرد اس میں اور اس کے غیر میں بٹ جاوے۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی تعلیم میں نقص نہیں ہے۔ اور نہ وہ خواص فطرت کے برخلاف ہے۔ اس میں پوری تحقیق یہی ہے۔ کہ مرد کی غیرت ایک حقیقی و کامل غیرت ہے جس کا انفکاک واقعی لاعلاج ہے۔ مگر عورت کی غیرت کامل نہیں بالکل مشتبہ اور زوال پذیر ہے۔ اس میں وہ نکتہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ رضی اللہ کو فرمایا تھا نہایت معرفت بخش نکتہ ہے۔ کیونکہ جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست نکاح پر عذر کیا۔ کہ آپ کی بہت بیویاں ہیں اور آئندہ بھی خیال ہے اور میں ایک عورت غیرت مند ہوں۔ جو دوسری بیوی کو دیکھ نہیں سکتی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میں تیرے لیے دعا کروں گا۔ کہ تا خدا تعالیٰ تیری یہ غیرت دور کر دے اور صبر بخشے..... نئی بیوی کی دل جوئی نہایت ضروری ہے۔ کہ وہ مہمان کی طرح ہے۔ مناسب ہے کہ آپ کے اخلاق اس سے اوّل درجہ کے ہوں۔ اور ان سے بے تکلف مخالطت اور محبت کریں۔ اور اللہ جل شانہ سے چاہیں۔ کہ اپنے فضل و کرم سے ان سے آپ کی صافی محبت و تعشق پیدا کرے۔ کہ یہ سب امور اللہ جل شانہٗ کے اختیار میں ہیں۔ (مکتوبات جلد ۵ ۲ ص ۶۶-۱۸ مکتوب ۵۴ بنام حضرت خلیفہ اول رض)

چار بیویاں رکھنے کا حکم تو نہیں دیا بلکہ اجازت دی ہے کہ چار تک رکھ سکتا ہے اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ چار ہی کو گلے کا ڈھول بنا لے قرآن کا منشا تو یہ ہے کہ چونکہ انسانی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اس واسطے ایک سے لے کر چار تک اجازت دیدی ہے۔ ایسے لوگ جو ایک اعتراض کو اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں اور پھر وہ خود اسلام کا دعویٰ بھی کرتے ہیں میں نہیں جانتا کہ اُن کا ایمان کیسے قائم رہ جاتا ہے وہ تو اسلام کے معترض ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ ایک مقنّن کو قانون بنانے کے وقت کن کن باتوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ بھلا اگر کسی شخص کی ایک بیوی ہے اُسے جذام ہو گیا ہے یا آتشک میں مبتلا ہے یا اندھی ہو گئی ہے یا اس قابل ہی نہیں کہ اولاد اُس سے حاصل ہو سکے وغیرہ وغیرہ عوارض میں مبتلا ہو جاوے تو اس حالت میں اب اس خاوند کو کیا کرنا چاہیئے کیا اسی بیوی پر قناعت کرے۔ ایسی مشکلات کے وقت وہ کیا تدبیر پیش کرتے ہیں۔ یا بھلا اگر وہ کسی قسم کی بدمعاشی زنا وغیرہ میں مبتلا ہو گئی تو کیا اب اُس خاوند کی غیرت تقاضا کریگی کہ اُسی کو اپنی پر عصمت بیوی کا خطاب دے رکھے۔ خدا جانے یہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت اندھے کیوں ہو جاتے ہیں یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مذہب ہی کیا ہے جو انسانی ضروریات کو ہی پورا نہیں کر سکتا۔ اب ان مذکورہ حالتوں میں عیسویت کیا تدبیر بتاتی ہے۔ قرآن شریف کی عظمت ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی کوئی ایسی ضرورت نہیں جس کا پہلے سے ہی اُس نے قانون نہ بنا دیا ہو۔ اب تو انگلستان میں بھی ایسی مشکلات کی وجہ سے کثرت ازدواج اور طلاق شروع ہوتا جاتا ہے۔ ابھی ایک لارڈ کی بابت لکھا تھا کہ اُس نے دوسری بیوی کر لی آخر اُسے سزا بھی ہوئی مگر وہ امریکہ میں جا رہا۔

غور سے دیکھو کہ انسان کے واسطے ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں یا نہیں کہ یہ ایک سے زیادہ بیویاں کرلے۔ جب ایسی ضرورتیں ہوں اور اُن کا علاج نہ ہو تو یہی نقص ہے جس کے پورا کرنے کو قرآن شریف سی اتم اکمل کتاب بھیجی ہے۔
(الحکم جلد ۷ ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ میری جماعت کے لوگ کثرت ازدواج کریں اور کثرت اولاد سے جماعت کو بڑھاویں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پہلی بیویوں کے ساتھ دوسری بیوی کی نسبت زیادہ اچھا سلوک کریں تاکہ اُسے تکلیف نہ ہو۔ دوسری بیوی۔ پہلی بیوی کو اس لیے ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ وہ خیال کرتی ہے کہ میری غور و پرداخت اور حقوق میں کمی کی جاویگی مگر میری جماعت کو اس طرح نہ کرنا چاہیئے۔ اگرچہ عورتیں اس بات سے ناراض ہوتی ہیں مگر میں تو یہی تعلیم دوں گا ہاں یہ شرط ساتھ رہے گی کہ پہلی بیوی کی غور و پرداخت اور اس کے حقوق دوسری کی نسبت زیادہ توجہ اور غور سے ادا ہوں اور دوسری سے اُسے زیادہ خوش رکھا جاوے ورنہ یہ نہ ہو کہ بجائے ثواب کے عذاب ہو۔ عیسائیوں کو بھی اس امر کی ضرورت پیش آئی ہے اور بعض نے پہلی بیوی کو زہر دیکر دوسری کی تلاش سے اس کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تقویٰ کی عجیب راہ ہے۔ مگر بشرطیکہ انصاف ہو اور پہلی کی نگہداشت میں کمی نہ ہو۔
(البدر جلد ۳ ۷ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱)

بدنظری اور بدکاری سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی جماعت کو کثرۃ ازدواجی کی نصیحت بھی کی ہے کہ تقویٰ کے لحاظ سے اگر وہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنا چاہیں تو کرلیں مگر خدا کی معصیت کے مرتکب نہ ہوں پھر (گناہ کرکے) جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔
(البدر جلد ۳ ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ایک احمدی صاحب نے حضرت اقدس کی خدمت میں عرض کی کہ تعدد ازواج میں جو عدل کا حکم ہے کیا اُس سے یہی مراد ہے کہ مرد بحیثیت الرجال قوامون علی النساء کے خود ایک حاکم عادل کی طرح جس بیوی کو سلوک کے قابل پاوے ویسا سلوک اُس سے کرے یا کچھ اور معنے ہیں۔

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ محبت کو قطع نظر بالائے طاق رکھ کر عملی طور پر سب بیویوں کو برابر رکھنا چاہیئے مثلاً پارچہ جات۔ خرچ خوراک۔ معاشرت حتّٰی کہ مباشرت میں بھی مساوات برتے۔ یہ حقوق اس قسم کے ہیں کہ اگر انسان کو پورے طور پر معلوم ہوں تو بجائے بیاہ کے وہ ہمیشہ رنڈوا رہنا پسند کرے۔ خدا تعالیٰ کی تہدید کے نیچے رہ کر جو شخص زندگی بسر کرتا ہے وہی اُن کی بجاآوری کا دم بھر سکتا ہے۔ ایسے لذات کی نسبت جن سے خدا تعالیٰ کا تازیانہ ہمیشہ سر پر رہے تلخ زندگی بسر کرلینی ہزار ہا درجہ بہتر ہے تعدد ازدواج کی نسبت اگر ہم تعلیم دیتے ہیں تو صرف اس لیے کہ معصیت میں پڑنے سے انسان بچا رہے اور شریعت نے اسے بطور علاج کے ہی رکھا ہے کہ اگر انسان اپنے نفس کا میلان اور غلبہ شہوات کی طرف دیکھے اور اُس کی نظر بار بار خراب ہوتی ہو تو زنا سے بچنے کے لیے دوسری شادی کرلے لیکن پہلی بیوی کے حقوق تلف نہ کرے۔ تورات سے بھی ثابت ہے کہ اُس کی دلداری زیادہ کرے کیونکہ جوانی کا بہت سا حصہ

اُس نے اُس کے ساتھ گزارا ہوا ہوتا ہے اور ایک گہرا تعلق خاوند کا اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلی بیوی کی رعایت اور دلداری یہاں تک کرنی چاہیئے کہ اگر کوئی ضرورت مرد کو ازدواجِ ثانی کی محسوس ہو لیکن وہ دیکھتا ہے کہ دوسری بیوی کے کرنے سے اُس پہلی بیوی کو سخت صدمہ ہوتا ہے اور حد درجہ کی اس کی دل شکنی ہوتی ہے تو اگر وہ صبر کر سکے اور کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا ہو اور نہ کسی شرعی ضرورت کا اُس سے خون ہوتا ہو تو ایسی صورت میں اگر اُن اپنی ضرورتوں کی قربانی سابقہ بیوی کی دلداری کے لیے کردے اور ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اُسے مناسب ہے کہ دوسری شادی نہ کرے۔

اس قدر ذکر ہوا تھا کہ ایک صاحب نے اُٹھ کر عرض کی کہ البدر اور الحکم اخباروں میں تعددِ ازواج کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ذمہ دوسرا نکاح حضور نے فرض کر دیا ہے (......)

آپ نے فرمایا کہ ہمیں جو کچھ خدا تعالیٰ سے معلوم ہوا ہے وہ بلا کسی رعایت کے بیان کرتے ہیں۔ قرآن شریف کا منشاء زیادہ بیویوں کی اجازت سے یہ ہے کہ تم کو اپنے نفوس کو تقویٰ پر قائم رکھنے اور دوسرے اغراض مثل اولادِ صالحہ کے حاصل کرنے اور خویش و اقارب کی نگاہ داشت اور اُن کے حقوق کی بجا آوری سے ثواب حاصل ہو۔ اور اپنی اغراض کے لحاظ سے اختیار دیا گیا ہے کہ ایک دو تین چار عورتوں تک نکاح کر لو لیکن اگر اُن میں عدل نہ کر سکو تو پھر یہ فسق ہوگا اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل کرو گے کہ ایک گناہ سے نفرت کی وجہ سے دوسرے گناہوں پر آمادہ ہوئے۔ دل دکھانا بڑا گناہ ہے اور لڑکیوں کے تعلقات بہت نازک ہوتے ہیں جب والدین اُن کو اپنے سے جدا اور دوسرے کے حوالہ کرتے ہیں تو خیال کرو کہ کیا اُمیدیں اُن کے دلوں میں ہوتی ہیں اور جن کا اندازہ انسان عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] کے حکم سے ہی کر سکتا ہے۔ اگر انسان کا سلوک اپنی بیوی سے عمدہ ہو اور اُسے ضرورت شرعی پیدا ہو جاوے تو اُس کی بیوی اُس کے دوسرے نکاحوں سے ناراض نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنے گھر میں کئی دفعہ دیکھا ہے کہ وہ ہمارے نکاح والی پیشگوئی کے پورا ہونے کے لیے رو رو کر دعائیں کرتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بیویوں کی ناراضگی کا بڑا باعث خاوند کی نفسانیت ہوا کرتی ہے اور اگر اُن کو اس بات کا علم ہو کہ ہمارا خاوند صحیح اغراض اور تقویٰ کے اصول پر دوسری بیوی کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ فساد کی بنا تقویٰ کی خلاف ورزی ہوا کرتی ہے۔

خدا کے قانون کو اُس کے منشاء کے برخلاف ہرگز نہ برتنا چاہیئے اور نہ اُس سے ایسا فائدہ اُٹھانا چاہیئے جس سے وہ صرف نفسانی جذبات کی ایک سپر بن جاوے۔ یاد رکھو کہ ایسا کرنا معصیت ہے خدا تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ شہوات کا تم پر غلبہ نہ ہو بلکہ تمہاری غرض ہر ایک امر میں تقویٰ ہو اگر شریعت کو سپر بنا کر شہوات کی اتباع کے لیے بیویاں کی جاویں گی تو سوائے اس کے اور کیا نتیجہ ہوگا کہ دوسری قومیں اعتراض کریں کہ مسلمانوں کو بیویاں کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ زنا کا نام ہی گناہ نہیں بلکہ شہوات کا کھلے طور پر دل میں پڑ جانا گناہ ہے۔ دنیاوی تمتع کا حصہ انسانی زندگی میں بہت ہی کم ہونا چاہیئے تا کہ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا[2] یعنی ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت کا مصداق بنو۔ لیکن جس شخص کی دنیاوی تمتع کثرت سے ہیں اور وہ رات دن

[2] التوبۃ آیت ۸۲ [1] النساء آیت ۲۰

بیویوں میں مصروف ہے اُس کو رقت اور رونا کب نصیب ہو گا اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ ایک خیال کی تائید اور اتباع میں تمام سامان کرتے ہیں اور اس طرح سے خدا تعالیٰ کے اصل منشا سے دور جا پڑتے ہیں خدا تعالیٰ نے اگرچہ بعض اشیا جائز تو کر دی ہیں مگر اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ عمر ہی اُس میں بسر کی جاوے۔ خدا تعالیٰ تو اپنے بندوں کی صفت میں فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا[1]۔ کہ وہ اپنے رب کے لیے تمام تمام رات سجدہ اور قیام میں گزارتے ہیں۔ اب دیکھو رات دن بیویوں میں غرق رہنے والا خدا کے منشا کے موافق رات کیسے عبادت میں کاٹ سکتا ہے۔ وہ بیویاں کیا کرتا ہے گویا خدا کے لیے شریک پیدا کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں اور باوجود اُن کے پھر بھی آپ ساری ساری رات خدا کی عبادت میں گذارتے تھے۔ ایک رات آپ کی باری عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھی کچھ حصہ رات کا گذر گیا۔ تو عائشہ کی آنکھ کھلی دیکھا کہ آپ موجود نہیں اُسے شبہ ہوا کہ شاید آپ کسی اور بیوی کے ہاں ہوں گے اُس نے اُٹھ کر ہر گھر میں تلاش کیا مگر آپ نہ ملے آخر دیکھا کہ آپ قبرستان میں ہیں اور سجدہ میں رو رہے ہیں۔ اب دیکھو کہ آپ زندہ اور چاہتی بیوی کو چھوڑ کر مُردوں کی جگہ قبرستان میں گئے اور روتے رہے تو کیا آپ کی بیویاں حظ نفس یا اتباع شہوت کی بنا پر ہو سکتی ہیں؟ غرض کہ خوب یاد رکھو کہ خدا کا اصل منشا یہ ہے کہ تم پر شہوات غالب نہ آویں اور تقویٰ کی تکمیل کے لیے اگر ضرورت حقہ پیش آوے تو اور بیوی کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمتع دنیاوی کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے ملنے گئے ایک لڑکا بھیج کر اجازت چاہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھجور کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جب حضرت عمر اندر آئے تو آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ حضرت عمر نے دیکھا کہ مکان سب خالی پڑا ہے اور کوئی زینت کا سامان اُس میں نہیں ہے ایک کھونٹی پر تلوار لٹک رہی ہے یا وہ چٹائی ہے جس پر آپ لیٹے ہوئے تھے اور جس کے نشان اُسی طرح آپ کی پشت مبارک پر بنے ہوئے تھے حضرت عمرؓ اُن کو دیکھ کر رو پڑے آپ نے پوچھا اے عمر تجھ کو کس چیز نے رُلایا عمر نے عرض کی کہ کسریٰ اور قیصر تو تنعم کے اسباب رکھیں اور آپ جو خدا کے رسول اور دو جہان کے بادشاہ ہیں اس حال میں رہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے عمر مجھے دنیا سے کیا غرض میں تو اُس مسافر کی طرح گذارہ کرتا ہوں جو اونٹ پر سوار منزل مقصود کو جاتا ہو ریگستان کا راستہ ہو اور گرمی کی سخت شدت کی وجہ سے کوئی درخت دیکھ کر اُس کے سایہ میں سستا لے اور جونہی کہ ذرا پسینہ خشک ہوا ہو وہ پھر چل پڑے جس قدر نبی اور رسول ہوئے ہیں سب نے دوسرے پہلو (آخرۃ) کو ہی مدنظر رکھا ہوا تھا۔

پس جاننا چاہیئے کہ جو شخص شہوات کی اتباع سے زیادہ بیویاں کرتا ہے وہ مغز اسلام سے دور رہتا ہے ہر ایک دن جو چڑھتا ہے اور رات جو آتی ہے اگر وہ تلخی سے زندگی بسر نہیں کرتا اور روتا کم یا بالکل ہی نہیں روتا اور ہنستا زیادہ ہے تو یاد رہے کہ وہ ہلاکت کا نشانہ ہے۔ استیفاء لذات اگر حلال طور پر ہو تو حرج نہیں جیسے ایک شخص ٹٹو پر سوار ہے

[1] الفرقان آیت ۶۵

اور راستہ میں اُسے نہاری وغیرہ اس لیے دیتا ہے کہ اُس کی طاقت قائم رہے اور وہ منزل مقصود تک اُسے پہنچا دے جہاں خدا تعالیٰ نے سب کے حقوق رکھے ہیں۔ وہاں نفس کا بھی حق رکھا ہے۔ کہ وہ عبادت بجالا سکے۔

لوگوں کے نزدیک چوری زنا وغیرہ ہی گناہ ہیں اور اُن کو یہ معلوم نہیں کہ استیفاء لذات میں مشغول ہونا بھی گناہ ہے اگر ایک شخص اپنا اکثر حصہ وقت کا توعیش وآرام میں بسر کرتا ہے اور کسی وقت اُٹھ کر چار ٹکریں بھی مار لیتا ہے (یعنی نماز پڑھ لیتا ہے) تو وہ نمرودی زندگی بسر کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاضت اور مشقت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تو اس محنت میں مرجاویگا حالانکہ ہم نے تیرے لیے بیویاں بھی حلال کی ہیں یہ خدا تعالیٰ نے آپ کو ایسے ہی فرمایا جیسے ماں اپنے بچہ کو پڑھنے یا دوسرے کام میں مستغرق دیکھ کر صحت کے قیام کے لحاظ سے اُسے کھیلنے کودنے کی اجازت دیتی ہے خدا تعالیٰ کا یہ خطاب اسی غرض سے ہے کہ آپ تازہ دم ہو کر پھر دین کی خدمت میں مصروف ہوں اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ آپ شہوات کی طرف جھک جاویں نادان معترض ایک پہلو کو تو دیکھتے ہیں اور دوسرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں پادریوں نے اس بات کی طرف کبھی غور نہیں کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی میلان کس طرف تھا اور رات دن آپ کس فکر میں رہتے تھے۔ بہت سے مُلّا اور عام لوگ ان باریکیوں سے ناواقف ہیں اگر ان کو کہا جاوے کہ تم شہوات کے تابع ہو تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم حرام کرتے ہیں شریعت نے ہمیں اجازت دی ہے تو ہم کرتے ہیں۔ انکو اس بات کا علم نہیں کہ بے محل استعمال سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] سے ظاہر ہے کہ انسان صرف عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے پس اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جس قدر چیز اُسے درکار ہے۔ اگر اُس سے زیادہ لیتا ہے تو گو وہ شے حلال ہی ہو مگر فضول ہونے کی وجہ سے اُس کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ جو انسان رات دن نفسانی لذات میں مصروف ہے وہ عبادت کا کیا حق ادا کر سکتا ہے مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک تلخ زندگی بسر کرے لیکن عیش وعشرت میں بسر کرنے سے تو وہ اُس زندگی کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے کلام کا مقصد یہ ہے کہ دونو پہلوؤں کا لحاظ رکھا جاوے یہ نہیں کہ صرف لذات کے پہلو پر زور دیا جاوے اور تقویٰ کو بالکل ترک کر دیا جاوے۔ اسلام نے جن کاموں اور باتوں کو مباح کہا ہے اُس سے یہ غرض ہرگز نہیں ہے کہ رات دن اس میں مستغرق رہے صرف یہ ہے کہ بقدر ضرورت وقت پر اُن سے فائدہ اُٹھایا جاوے۔

اس مقام پر پھر وہی صاحب بولے کہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ تعداد ازواج بطور دوا کے ہے نہ بطور غذا کے۔

حضور نے فرمایا ہاں۔ اس پر انہوں نے عرض کی کہ ان اخبار والوں نے تو لکھا ہے کہ احمدی جماعت کو بڑھانے کے لیے زیادہ بیویاں کرو۔ حضور نے فرمایا کہ ایک حدیث میں یہ ہے کہ کثرت ازدواج سے اولاد بڑھاؤ تاکہ اُمت زیادہ ہو اصل بات یہ ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ انسان کے ہر عمل کا مدار اُس کی نیت پر ہے کسی کے دل کو چیر کر ہم نہیں دیکھ سکتے اگر کسی کی یہ نیت نہیں ہے کہ زیادہ بیویاں کر کے عورتوں کی لذات میں فنا ہو بلکہ یہ ہے کہ اُس سے خادم دین پیدا ہوں

[1] الذاریات آیت ۵۷

تو کیا حرج ہے لیکن یہ امر بھی مشروط بالشرائط بالا ہے مثلاً اگر ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور ہر سال ہر ایک سے ایک ایک اولاد ہو تو چار سال میں سولہ بچے ہوں گے۔ مگر بات یہ ہے کہ لوگ دوسرے پہلو کو ترک کر دیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک پہلو پر ہی زور دیا جاوے حالانکہ ہمارا یہ منصب ہرگز نہیں ہے۔ قرآن شریف میں متفرق طور پر تقویٰ کا ذکر آیا ہے لیکن جہاں کہیں بیویوں کا ذکر ہے وہاں ضرور ہی تقویٰ کا بھی ذکر ہے ادائیگی حقوق ایک بڑی ضروری شی ہے اسی لیے عدل کی تاکید ہے اگر ایک شخص دیکھتا ہے کہ وہ حقوق کو ادا نہیں کر سکتا یا اُس کی رجولیت کے قویٰ کمزور ہیں یا خطرہ ہو کہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اُسے چاہیئے کہ دیدہ دانستہ اپنے آپ کو عذاب میں نہ ڈالے۔ تقویٰ یعنی شرعی ضرورت جو اپنے محل پر ہو اگر موجود ہو تو پہلی بیوی خود تجویز کرتی ہے کہ خاوند او نکاح کرلے۔ آخری نصیحت ہماری یہی ہے کہ اسلام کو اپنی عیاشیوں کے لیے سپر نہ بناؤ کہ آج ایک حسین عورت نظر آئی تو اُسے کرلیا کل اور نظر آئی تو اُسے کرلیا یہ تو گویا خدا کی گدی پر عورتوں کو بٹھانا اور اُسے بھلا دینا ہوا۔ دین تو چاہتا ہے کہ کوئی زخم دل پر ایسا ہے جس سے ہر وقت خدا تعالیٰ یاد آوے ورنہ سلب ایمان کا خطرہ ہے۔ اگر صحابہ کرام عورتیں کرنے والے اور اُنہیں میں مصروف رہنے والے ہوتے تو اپنے سر جنگوں میں کیوں کٹواتے حالانکہ اُن کا یہ حال تھا کہ ایک کی اُنگلی کٹ گئی تو اُسے مخاطب ہو کے کہا کہ تو ایک اُنگلی ہی ہے اگر کٹ گئی تو کیا ہوا۔ مگر جو شب و روز عیش و عشرت میں مستغرق ہے وہ کب ایسا دل لا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں اس قدر روتے اور قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم ہو جاتا صحابہؓ نے عرض کی کہ خدا نے آپ کے تمام گناہ بخش دئیے ہیں پھر اس قدر مشقت اور رونے کی کیا وجہ ہے فرمایا کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ ہوں۔ (البدر جلد ۳ ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳-۲)

تعدد ازدواج کا ذکر تھا۔ فرمایا کہ شریعت حقّہ نے اس کو ضرورت کے واسطے جائز رکھا ہے۔ ایک لائق آدمی کی بیوی اگر اس قسم کی ہے کہ اُس سے اولاد نہیں ہو سکتی تو وہ کیوں بے اولاد رہے اور اپنے آپ کو بھی عقیم بنالے ایک عمدہ گھوڑا ہوتا ہے۔ تو اس کی نسل بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے انسان کی نسل کو کیوں ضائع کیا جاوے۔ پادری لوگ دوسری شادی کو زناکاری قرار دیتے ہیں۔ تو پھر پہلے انبیاء کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ حضرت سلیمان کی کہتے ہیں کئی سو بیویاں تھیں اور ایسا ہی حضرت داؤد کی تھیں نیت صحیح ہو اور تقویٰ کی خاطر ہو تو دس بیس بیویاں بھی گناہ نہیں۔ اگر نعوذ باللہ عیسائیوں کے قول کے مطابق ایک سے زیادہ نکاح سب زناء ہیں۔ تو حضرت داؤد کی اولاد سے ہی اُن کا خدا بھی پیدا ہوا ہے تب تو یہ نسخہ اچھا ہے اور بڑی برکت والا طریق ہے۔ (بدر جلد ۸ ۸-۹ مورخہ ۲۴ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

(اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ) یہ امر کہ کافروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو جو لڑائیوں میں ہاتھ آویں لونڈیاں بنا کر اُن سے ہم بستر ہونا تو یہ ایک ایسا امر ہے جو شخص اصل حقیقت پر اطلاع پاوے وہ اس کو ہرگز محل اعتراض نہیں ٹھیرائیگا اور اصل حقیقت یہ ہے کہ اُس ابتدائی زمانہ میں اکثر جنڈال اور خبیث طبع لوگ ناحق اسلام کے دشمن ہو کر طرح

طرح کے دُکھ مسلمانوں کو دیتے تھے اگر کسی مسلمان کو قتل کریں تو اکثر اس میّت کے ہاتھ پیر اور ناک کاٹ دیتے تھے اور بے رحمی سے بچوں کو بھی قتل کرتے تھے اور اگر کسی غریب مظلوم کی عورت ہاتھ آتی تھی تو اُس کو لونڈی بناتے تھے اور اپنی عورتوں میں مگر لونڈی کی طرح) اُس کو داخل کرتے تھے اور کوئی پہلو ظلم کا نہیں تھا جو اُنہوں نے) اُٹھا رکھا تھا ایک مدت دراز تک مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی حکم ملتا رہا کہ ان لوگوں کی شرارتوں پر صبر کرو مگر آخر کار جب ظلم حد سے بڑھ گیا تو خدا نے اجازت دیدی کہ اب ان شریر لوگوں سے لڑو اور جس قدر وہ زیادتی کرتے ہیں اس سے زیادہ نہ کرو لیکن پھر بھی مُثلہ کرنے سے منع کیا یعنی منع فرما دیا کہ کافروں کے کسی مقتول کی ناک کان ہاتھ وغیرہ نہیں کاٹنے چاہئیں اور جس بے عزتی کو مسلمانوں کے لیے وہ لوگ پسند کرتے تھے اس کا بدلہ لینے کے لیے حکم دیدیا۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ رسم جاری ہوئی کہ کافروں کی عورتیں لونڈی کی طرح رکھی جائیں اور عورتوں کی طرح استعمال کی جائیں یہ تو انصاف اور طریق عدل سے بعید تھا کہ کافر تو جب کسی مسلمان عورت کو اپنے قبضہ میں لاویں تو اُس کو لونڈی بنا دیں اور عورتوں کی طرح ان کو استعمال کریں اور جب مسلمان اُن کی عورتوں اور ان کی لڑکیوں کو اپنے قبضہ میں کریں تو ماں بہن کر کے رکھیں۔ خدا بیشک حلیم ہے مگر وہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اُس کی غیرت ہی تھی جو نوح کے طوفان کا باعث ہوئی۔ اُسی کی غیرت نے ہی انجام کار فرعون اور اس کے تمام لشکر کو دریا میں غرق کر دیا۔ اُسی کی غیرت نے لوط کی قوم پر زمین کا تختہ اُلٹا دیا اور اُسی کی غیرت اب جابجا ہیبت ناک زلزلے دکھلا رہی ہے اور لاکھوں انسانوں کو طاعون سے ہلاک کر رہی ہے اور اسی کی غیرت نے لیکھرام کو جو بد زبانی سے کسی طرح باز نہیں آتا تھا اُسی کی زبان کی چھری سے آخر لوہے کی چھری غیب سے پیدا کر دی اور جوانا مرگ مارا اور بڑے دُکھ سے اُس کو اس کی قوم میں سے اُٹھا لیا اور کوئی اُس کو بچا نہ سکا اور خدا نے اپنی پیشگوئی اُس میں پوری کر دی پس اسی طرح جب عرب کے خبیث فطرت ایذاء اور دُکھ دینے سے باز نہ آئے اور نہایت بے حیائی اور بے غیرتی سے عورتوں پر بھی فاسقانہ حملے کرنے لگے تو خدا نے اُن کی تنبیہ کے لیے یہ قانون جاری کر دیا کہ اُن کی عورتیں بھی اگر لڑائیوں میں پکڑی جائیں تو اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے پس یہ تو بموجب مثل مشہور کہ عوض معاوضہ گلہ ندارد کوئی محل اعتراض نہیں جیسی ہندی میں بھی یہ مثل مشہور ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی مگر یہ دوسری بات درحقیقت نہایت بے رحمی۔ دیوثی اور بے حیائی کا کام ہے کہ انسان اپنی عورت سے محض لڑکا پیدا ہونے کی خواہش سے زنا کراوے یہ ایک ایسی ناپاکی کی راہ اور گندی نظیر ہے کہ تمام دنیا میں اگر تلاش کرو تو ہرگز ہرگز اُس کی نظیر نہیں ملے گی۔ پھر ماسوا اس کے اسلام اس بات کا حامی نہیں کہ کافروں کے قیدی غلام اور لونڈیاں بنائی جائیں بلکہ غلام آزاد کرنے کے بارہ میں اس قدر قرآن شریف میں تاکید ہے کہ جس سے بڑھ کر متصور نہیں غرض ابتدا غلام لونڈی بنانے کی کافروں سے شروع ہوئی اور اسلام میں بطور سزا کے یہ حکم جاری ہوا۔ اور اُس میں بھی آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۳-۲۴۵)

یاد رہے کہ نکاح کی اصل حقیقت یہ ہے کہ عورت اور اس کے ولی کی اور نیز مرد کی بھی رضامندی لی جاتی ہے لیکن جس حالت میں ایک عورت اپنی آزادی کے حقوق کھو چکی ہے اور وہ آزاد نہیں ہے بلکہ وہ اُن ظالم طبع جنگ جو لوگوں میں سے ہے

جنھوں نے مسلمانوں کے مردوں اور عورتوں پر بیجا ظلم کیے ہیں تو ایسی عورت جب گرفتار ہو کر اپنے اقارب کے جرائم کی پاداش میں لونڈی بنائی گئی تو اس کی آزادی کے حقوق سب تلف ہو گئے لہذا وہ اب فتح یاب بادشاہ کی لونڈی ہے اور ایسی عورت کو حرم میں داخل کرنے کے لیے اس کی رضامندی کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے جنگجو اقارب پر فتحیاب ہو کر اس کو اپنے قبضہ میں لانا یہی اس کی رضامندی ہے یہی حکم توریت میں بھی موجود ہے ہاں قرآن شریف میں فَكُّ رَقَبَةٍ یعنی لونڈی غلام کو آزاد کرنا بڑے ثواب کا کام بیان فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو رغبت دی ہے کہ اگر وہ ایسی لونڈیوں اور غلاموں کو آزاد کر دیں تو خدا کے نزدیک بڑا اجر حاصل کریں گے اگرچہ مسلمان بادشاہ ایسے خبیث اور جنڈال لوگوں پر فتح یاب ہو کر غلام اور لونڈی بنانے کا حق رکھتا ہے مگر پھر بھی بدی کے مقابل پر نیکی کرنا خدا نے پسند فرمایا ہے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے زمانہ میں اسلام کے مقابل پر جو کافر کہلاتے ہیں انہوں نے یہ تعدی اور زیادتی کا طریق چھوڑ دیا ہے اس لیے اب مسلمانوں کے لیے بھی روا نہیں کہ ان کے قیدیوں کو لونڈی غلام بناویں کیونکہ خدا قرآن شریف میں فرماتا ہے جو تم جنگجو فرقہ کے مقابل پر صرف اسی قدر زیادتی کرو جس میں پہلے انہوں نے سبقت کی ہو پس جبکہ اب وہ زمانہ نہیں ہے اور اب کافر لوگ جنگ کی حالت میں مسلمانوں کے ساتھ ایسی سختی اور زیادتی نہیں کرتے کہ ان کو اور ان کے مردوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بناویں بلکہ وہ شاہی قیدی سمجھے جاتے ہیں اس لیے اب اس زمانہ میں مسلمانوں کو بھی ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۳-۲۴۵ حاشیہ)

۵ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○

اور اپنی عورتوں کو مہر دو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۷)

۶-۷ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ

ل البلد آیت ۱۴

كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا۝

یعنی اگر کوئی الیسا تم میں مالدار ہو جو صحیح العقل نہ ہو مثلاً یتیم یا نابالغ ہو اور اندیشہ ہو کہ وہ اپنی حماقت سے اپنے مال کو ضائع کر دیگا تو تم (بطور کورٹ آف وارڈس کے) وہ تمام مال اس کا متکفل کے طور پر اپنے قبضہ میں لے لو اور وہ تمام مال جس پر سلسلہ تجارت اور معیشت کا چلتا ہے ان بیوقوفوں کے حوالہ مت کرو اور اس مال میں سے بقدر ضرورت ان کے کھانے اور پہننے کے لیے دیدیا کرو اور ان کو اچھی باتیں قول معروف کی کہتے رہو یعنی ایسی باتیں جن سے ان کی عقل اور تمیز بڑھے اور ایک طور سے ان کے مناسب حال ان کی تربیت ہو جائے اور جاہل اور ناتجربہ کار نہ رہیں اگر وہ تاجر کے بیٹے ہیں تو تجارت کے طریقے ان کو سکھلاؤ اور اگر کوئی اور پیشہ رکھتے ہوں تو اس پیشہ کے مناسب حال اُن کو پختہ کر دو۔ غرض ساتھ ساتھ ان کو تعلیم دیتے جاؤ۔ اور اپنی تعلیم کا وقتاً فوقتاً امتحان بھی کرتے جاؤ کہ جو کچھ تم نے سکھلایا انہوں نے سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ پھر جب نکاح کے لائق ہو جائیں یعنی عمر قریباً اٹھارہ برس تک پہنچ جائے اور تم دیکھو کہ ان میں اپنے مال کے انتظام کی عقل پیدا ہو گئی ہے تو ان کا مال ان کے حوالہ کرو۔ اور فضول خرچی کے طور پر ان کا مال خرچ نہ کرو اور نہ اس خوف سے جلدی کر کے کہ اگر یہ بڑے ہو جائیں گے تو اپنا مال لے لیں گے ان کے مال کا نقصان کرو۔ جو شخص دولت مند ہو اس کو نہیں چاہیئے کہ ان کے مال میں سے کچھ حق الخدمت لیوے۔ لیکن ایک محتاج بطور معروف لے سکتا ہے۔

عرب میں مالی محافظوں کے لیے یہ طریق معروف تھا کہ اگر یتیموں کے کارپرداز اُن کے مال میں سے لینا چاہتے تو حتی الوسع یہ قاعدہ جاری رکھتے کہ جو کچھ یتیم کے مال کو تجارت سے فائدہ ہوتا اس میں سے آپ بھی لیتے راس المال کو تباہ نہ کرتے۔ سو یہ اسی عادت کی طرف اشارہ ہے کہ تم بھی ایسا کرو اور پھر فرمایا کہ جب تم یتیموں کو مال واپس کرنے لگو تو گواہوں کے روبرو ان کو ان کا مال دو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۷-۳۸)

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا○

مردوں کے لیے اُس جایداد میں سے ایک حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابتی چھوڑ گئے ہوں ایسا ہی عورتوں کے لیے اُس جائداد میں سے ایک حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابتی چھوڑ گئے ہوں۔ اِس میں سے کسی کا حصہ تھوڑا ہو یا بہت ہو بہر حال ہر ایک کے لیے ایک حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور جب ترکہ کی تقسیم کے وقت ایسے قرابتی لوگ حاضر آویں جن کو حصہ نہیں پہنچتا۔ ایسا ہی اگر یتیم اور مسکین بھی تقسیم کے موقعہ پر آجاویں تو کچھ کچھ اُس مال میں سے اُن کو دیدو اور اُن سے معقول طور پر پیش آؤ یعنی نرمی اور خلق کے ساتھ پیش آؤ۔ اور سخت جواب نہ دو۔ اور وارثان حقدار کو ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ خود چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مرتے تو اُن کے حال پر اُن کو کیسا کچھ ترس نہ آتا اور کیسی وہ اُن کی کمزوری کی حالت کو دیکھ کر خوف سے بھر جاتے پس چاہیئے کہ وہ کمزور بچوں کے ساتھ سختی کرنے میں اللہ سے ڈریں اور اُن کے ساتھ سیدھی طرح بات کریں یعنی کسی قسم کے ظلم اور حق تلفی کا ارادہ نہ کریں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۳-۲۰۴)

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ..... اور جو شخص فوت ہونے لگے اور بچے اس کے ضعیف اور صغیر السن ہوں تو اس کو نہیں چاہیئے کہ کوئی ایسی وصیت کرے کہ جس میں بچوں کی حق تلفی ہو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۸)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا○

جو لوگ ایسے طور سے یتیم کا مال کھاتے ہیں جس سے یتیم پر ظلم ہو جائے وہ مال نہیں بلکہ آگ کھاتے ہیں اور آخر جلانے والی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

اب دیکھو خدائے تعالیٰ نے دیانت اور امانت کے کس قدر پہلو بتلائے۔ سو حقیقی دیانت اور امانت وہی ہے جو ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ہو اور اگر پوری عقل مندی کو دخل دیکر امانتداری میں تمام پہلوؤں کا لحاظ نہ ہو تو ایسی

دیانت اور امانت کئی طور سے چھپی ہوئی خیانتیں اپنے ہمراہ رکھے گی۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۸)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ
فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا
تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ
الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ
بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ
نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَ لَكُمْ
نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ
وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ
اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ
بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ

شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ

تمہاری اولاد کے حصّوں کے بارے میں خدا کی یہ وصیت ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا کرو[1] پھر اگر لڑکیاں دو یا دو سے بڑھ کر ہوں تو جو کچھ مرنے والے نے چھوڑا ہے اُس مال میں سے اُن کا حصہ تہائی ہے اور اگر لڑکی اکیلی ہو تو وہ مال متروکہ میں سے نصف کی مستحق ہے۔ اور میّت کے ماں باپ کو یعنی دونوں میں سے ہر ایک کو اُس مال میں سے جو میّت نے چھوڑا ہے چھٹا حصّہ ہے اور یہ اس حالت میں کہ مرنے والا کچھ اولاد چھوڑ گیا ہو۔ اور اگر مرنے والا لاولد مرا ہو اور اُس کے وارث صرف ماں باپ ہوں تو ماں کا حصہ صرف ایک تہائی ہے باقی سب باپ کا۔ اگر ماں باپ کے علاوہ میّت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہنیں ہوں تو اس صورت میں ماں کا چھٹا حصہ ہوگا لیکن یہ حصہ وصیت یا قرض کے ادا کرنے کے بعد دینا ہوگا۔ تمہارے باپ ہوں یا بیٹے تمہیں معلوم نہیں کہ اُن میں سے باعتبار نفع رسانی کے کون تُم سے زیادہ قریب ہے پس جو حصّے خُدا نے قرار دیدئے ہیں اُن پر کاربند ہو جاؤ۔ کیونکہ وہ صرف خدا ہی ہے جس کا علم غلطی اور خطا سے پاک ہے اور جو حکمت سے کام کرتا اور ہر ایک مصلحت سے واقف ہے اور جو ترکہ تمہاری بیبیاں چھوڑ مریں پس اگر وہ لاولد مر جاویں تو اُن کے ترکے میں سے تمہارا آدھا حصّہ ہے اور اگر تمہاری بیبیوں کی اولاد ہے تو اس حالت میں اُن کے ترکہ میں سے تمہارا حصہ چوتھائی ہے مگر وصیت یا قرض کے ادا کرنے کے بعد۔ اور اگر تم مر جاؤ اور تمہاری کچھ اولاد نہ ہو تو تمہاری بیبیوں کا حصہ تمہارے مال میں سے چوتھائی ہے اور اگر تمہاری اولاد ہو تو اُن کا حصہ تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں ہے مگر اس امر کے بعد کہ پہلے اُن کی وصیت کی تعمیل کی جائے یا جو کچھ اُن کے سر پر قرضہ ہے وہ ادا کیا جائے۔ اور اگر کسی مرد یا عورت کی میراث ہو اور وہ ایسا ہو کہ اُس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا اور اُس کی بھائی یا بہن ہو تو اُن بھائی یا بہنوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں۔ تو اس صورت میں ایک تہائی میں سب شریک ہونگے مگر ضروری ہوگا کہ پہلے وصیت کی تعمیل کی جائے یا اگر مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے لیکن اس وصیت اور اس قرض میں ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وصیت یا اُس قرضہ کے ذریعہ سے مرنے والے نے کسی کو نقصان پہنچانا نہ چاہا ہو۔ اس طرح پر کہ ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت کر دی ہو یا ایک فرضی قرضہ ظاہر کیا ہو۔ یہ خدا کا حکم ہے وہ خدا جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں اور وہ علیم ہے اِس لیے وہ باوجود علم کے نافرمان کو جلدی سزا نہیں دیتا۔ یعنی وہ سزا دینے میں دھیما ہے۔ پس اگر کسی ظلم اور خیانت کے وقت کوئی شخص اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچے تو اُس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ

[1] یہ اس لیے ہے کہ لڑکی سسرال میں جا کر ایک حصّہ لیتی ہے پس اس طرح سے ایک حصّہ ماں باپ کے گھر سے پا کر اور ایک حصّہ سسرال سے پا کر اُس کا حصّہ لڑکے کے برابر ہو جاتا ہے۔ منہ

خداکو اُس کی اُس مجرمانہ حرکت کی خبر نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ بباعث خدا کے حکم کے یہ تاخیر واقع ہوئی ہے اور آخر شریر آدمی کو وہ سزا دیتا ہے جس کے وہ لائق ہوتا ہے ؎

ہاں مشو مغرور بر حلمِ خدا　　دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

اب ان تمام آیات (نمبر ۸ تا ۱۲) سے صاف ظاہر ہے کہ کیسے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں والدین کے حق کو تاکید کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے اور ایسا ہی اولاد کے حقوق بلکہ تمام اقارب کے حقوق ذکر فرمائے ہیں اور مساکین اور یتیموں کو بھی فراموش نہیں کیا بلکہ ان حیوانات کا حق بھی انسانی مال میں ٹھہرایا ہے جو کسی انسان کے قبضہ میں ہوں۔

(چشمہ معرفت ص۲۰۴-۲۰۵)

(اس سوال کے جواب میں کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتا محروم الارث کیوں ہے) فرمایا کہ دادے کا اختیار ہے کہ وصیت کے وقت اپنے پوتے کو کچھ دیدے بلکہ جو چاہے دیدے اور باپ کے بعد بیٹے وارث قرار دئے گئے کہ تا ترتیب بھی قائم رہے اور اگر اس طرح نہ کہا جاتا تو پھر ترتیب ہرگز قائم نہ رہتی کیونکہ پھر لازم آتا ہے کہ پوتے کا بیٹا بھی وارث ہو اور پھر آگے اس کی اولاد ہو تو وہ وارث ہو اس صورت میں دادے کا کیا گناہ ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور اس سے حرج نہیں ہوا کرتا ورنہ اس طرح تو ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور جس قدر سلاطین ہیں وہ بھی آدم کی اولاد ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ سب کی سلطنتوں سے حصہ بٹانے کی درخواست کریں۔ چونکہ بیٹے کی نسبت سے آگے پوتے میں جا کر کمزوری ہو جاتی ہے اور آخر ایک حد پر آ کر تو برائے نام رہ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ اس طرح کمزوری نسل میں اور ناطہ میں ہو جاتی ہے اس لیے یہ قانون رکھا۔ ہاں ایسے سلوک اور رحم کی خاطر خدا تعالیٰ نے ایک اور قانون رکھا ہے جیسے قرآن شریف میں ہے۔ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا۔[1] (یعنی جب ایسی تقسیم کے وقت بعض خویش و اقارب موجود ہوں اور یتیم اور مساکین تو ان کو کچھ دیا کرو) تو وہ پوتا جس کا باپ مر گیا ہے وہ یتیم ہونے کے لحاظ سے زیادہ مستحق اس رحم کا ہے اور یتیم میں اور لوگ بھی شامل ہیں (جن کا کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا) خدا تعالیٰ نے کسی کا حق ضائع نہیں کیا مگر جیسے جیسے رشتہ میں کمزوری بڑھتی جاتی ہے حق کم ہوتا جاتا ہے۔　(البدر جلد ۲ نمبر ۱ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

۱۵ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے اور اُس کی حدوں سے باہر ہو جائے خدا اُس کو جہنم میں داخل کرے گا

[1] النساء آیت ۹

اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر ذلیل کرنے والا عذاب نازل ہوگا۔

اب دیکھو کہ رسول سے قطع تعلق کرنے میں اُس سے بڑھ کر اور کیا وعید ہوگا کہ خدائے عزوجل فرماتا ہے کہ جو شخص رسول کی نافرمانی کرے اس کے لیے دائمی جہنم کا وعدہ ہے مگر میاں عبدالحکیم کہتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم کا مکذب اور نافرمان ہو اگر وہ توحید پر قائم ہو تو وہ بلاشبہ بہشت میں جائے گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے پیٹ میں کس قسم کی توحید ہے کہ باوجود نبی کریم کی مخالفت اور نافرمانی کے جو توحید کا سرچشمہ ہے بہشت تک پہنچا سکتی ہے۔

(حقیقۃ الوحی صـــ۱۲۶)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝

یہ بھی تمہارے لیے جائز نہ ہوگا کہ جبراً عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ۲۵)

(عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ) درحقیقت نکاح مرد اور عورت کا باہم ایک معاہدہ ہے پس کوشش کرو کہ اپنے معاہدہ میں دغاباز نہ ٹھہرو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی اپنی بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ اور حدیث میں ہے خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ (باَهلِهٖ۔ اربعین) یعنی تم میں سے اچھا وہی ہے جو اپنی بیوی سے اچھا ہے۔ سو روحانی اور جسمانی طور پر اپنی بیویوں سے نیکی کرو۔ ان کے لیے دُعا کرتے رہو اور طلاق سے پرہیز کرو کیونکہ نہایت بدخدا کے نزدیک وہ شخص ہے جو طلاق دینے میں جلدی کرتا ہے۔ جس کو خدا نے جوڑا ہے اس کو ایک گندہ برتن کی طرح جلد مت توڑو۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صـــ۲۵ حاشیہ اور اربعین ۳ صـــ۳۵ حاشیہ)

قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ اگر مرد اپنی عورت کو مروّت اور احسان کی رُو سے ایک پہاڑ سونے کا بھی دے تو طلاق کی حالت میں واپس نہ لے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں عورتوں کی کس قدر عزت کی گئی ہے ایک طور سے تو مردوں کو عورتوں کا نوکر ٹھیرایا گیا ہے اور بہرحال مردوں کے لیے قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی تم اپنی عورتوں سے ایسے حُسن سلوک سے معاشرت کرو کہ ہر ایک عقلمند معلوم کر سکے کہ تم اپنی بیوی سے احسان اور مروّت سے پیش آتے ہو۔ (چشمۂ معرفت صـــ۲۷۵)

فحشاء کے سوا باقی تمام کج خلقیاں اور تلخیاں عورتوں کی برداشت کرنی چاہیئے اور فرمایا ہمیں تو کمال بے شرمی معلوم ہوتی ہے کہ مرد ہو کر عورت سے جنگ کریں۔ ہم کو خدا نے مرد بنایا اور یہ درحقیقت ہم پر اتمام نعمت ہے اس کا شکر یہ ہے کہ عورتوں سے لطف اور نرمی کا برتاؤ کریں ...... میرا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی پر آوازہ کسا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ وہ بانگِ بلند دل کے رنج سے ملی ہوئی ہے اور بایں ہمہ کوئی دل آزار اور درشت کلمہ مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کے بعد میں بہت دیر تک استغفار کرتا رہا اور بڑے خشوع اور خضوع سے نفلیں پڑھیں اور کچھ صدقہ بھی دیا کہ یہ درشتی زوجہ پر کسی پنہانی معصیت الہٰی کا نتیجہ ہے۔ (الحکم جلد ۴ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

ہمارے ہادی کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہو۔ بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں وہ نیک کہاں دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی تب کرسکتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو اور عمدہ معاشرت رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ ہر ادنیٰ بات پر زدوکوب کرے ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک غصہ میں بھرا ہوا انسان بیوی سے ادنیٰ سی بات پر ناراض ہو کر اس کو مارتا ہے اور کسی نازک مقام پر چوٹ لگی ہے اور بیوی مرگئی ہے۔ اس لیے ان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ہاں اگر وہ بیجا کام کرے تو تنبیہ ضروری چیز ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ عورتوں کے دل میں یہ بات جما دے کہ وہ کوئی ایسا کام جو دین کے خلاف اور بدعت ہو کبھی بھی پسند نہیں کرسکتا۔ اور ساتھ ہی وہ ایسا جابر اور ستم شعار نہیں کہ اس کی کسی غلطی پر بھی چشم پوشی نہیں کرسکتا۔

(الحکم جلد ۴ ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

عورتوں اور بچوں کے ساتھ تعلقات اور معاشرت میں لوگوں نے غلطیاں کھائی ہیں اور جادہ مستقیم سے بہک گئے ہیں قرآن شریف میں لکھا ہے عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ مگر اب اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے۔

دو قسم کے لوگ اس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں ایک گروہ تو ایسا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو بالکل خلیع الرسن کر دیا ہے کہ دین کا کوئی اثر ہی اُن پر نہیں ہوتا اور وہ کھُلے طور پر اسلام کے خلاف کرتی ہیں اور کوئی اُن سے نہیں پوچھتا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے خلیع الرسن تو نہیں کیا مگر اُس کے بالمقابل ایسی سختی اور پابندی کی ہے کہ اُن میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ اور کنیزکوں اور بہائم سے بھی بدتر اُن سے سلوک ہوتا ہے۔ مارتے ہیں تو ایسے بیدرد ہو کر کہ کچھ پتہ ہی نہیں کہ آگے کوئی جاندار ہستی ہے یا نہیں۔ غرض بہت ہی بری طرح سلوک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پنجاب میں مثل مشہور ہے کہ عورت کو پاؤں کی جوتی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ ایک اُتار دی دوسری پہن لی۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے اور اسلام کے شعائر کے خلاف ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری باتوں کے کامل نمونہ ہیں آپ کی زندگی میں دیکھو کہ آپ عورتوں کے ساتھ کیسی معاشرت کرتے تھے میرے نزدیک وہ شخص بزدل اور نامرد ہے جو عورت کے

مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو مطالعہ کرو تا تمہیں معلوم ہو کہ آپ ایسے خلیق تھے باوجودیکہ آپ بڑے بارعب تھے لیکن اگر کوئی ضعیفہ عورت بھی آپ کو کھڑا کرتی تو آپ اُس وقت تک کھڑے رہتے۔ جب تک کہ وہ اجازت نہ دے......

بعض وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑے بھی ہیں ایک مرتبہ آپ آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ خود نرم ہو گئے تا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا آگے نکل جائیں۔ اور وہ آگے نکل گئیں۔ اسی طرح پر یہ بھی ثابت ہے کہ ایک بار کچھ حبشی آئے جو تماشا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کا تماشا دکھایا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب آئے تو وہ حبشی اُن کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

شریعت میں حکم ہے عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ نمازوں میں عورتوں کی اصلاح اور تقویٰ کے لیے دعا کرنی چاہیئے قصاب کی طرح برتاؤ نہ کرے کیونکہ جب تک خدا نہ چاہے کچھ نہیں ہو سکتا مجھ پر بھی بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ عورتوں کو پھراتے ہیں اصل میں بات یہ ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسی بیماری ہے کہ جس کا علاج پھرانا ہے جب ان کی طبیعت زیادہ پریشان ہوتی ہے تو بدیں خیال کہ گناہ نہ ہو کہا کرتا ہوں کہ چلو پھرا لاؤں اور بھی عورتیں ہمراہ ہوتی ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۸)

خدا تعالیٰ اس سے تو منع نہیں کرتا کہ انسان دنیا میں کام نہ کرے مگر یہ بات ہے کہ دنیا کے لیے نہ کرے بلکہ دین کے لیے کرے تو وہ موجب برکات ہو جاتا ہے مثلاً خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ بیویوں سے نیک سلوک کرو عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لیکن اگر انسان محض اپنی ذاتی اور نفسانی اغراض کی بنا پر وہ سلوک کرتا ہے تو فضول ہے اور وہی سلوک اگر اس حکم الٰہی کے واسطے ہے تو موجب برکات ہے...... مومن کی غرض ہر آسایش ہر قول و فعل حرکت و سکون سے گو بظاہر نکتہ چینی ہی کا موقعہ ہو مگر دراصل عبادت ہوتی ہے۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ جاہل اعتراض سمجھتا ہے مگر خدا کے نزدیک عبادت ہوتی ہے لیکن اگر اس میں اخلاص کی نیت نہ ہو تو نماز بھی لعنت کا طوق ہو جاتی ہے...... اسی طرح عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ امر کی بجا آوری سے ثواب ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

بیوی اسیر کی طرح ہے اگر یہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ پر عمل نہ کرے تو وہ ایسی قیدی ہے جس کی کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

(حضرت سید خصیلت علی شاہ صاحبؓ کے نام ایک مکتوب میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تحریر فرمایا)

باعث تکلیف دہی ہے کہ میں نے بعض آپ کے سچے دوستوں کی زبانی جو در حقیقت آپ سے تعلق اخلاص اور محبت اور حسن ظن رکھتے ہیں سنا ہے کہ امور معاشرت میں جو بیویوں اور اہل خانہ سے کرنی چاہیئے کسی قدر آپ شدت رکھتے ہیں

یعنی غیظ و غضب کے استعمال میں بعض اوقات اعتدال کا اندازہ ملحوظ نہیں رہتا۔ میں نے اس شکایت کو تعجب کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ اول تو بیان کرنے والے آپ کی تمام صفات حمیدہ کے قائل اور دلی محبت آپ سے رکھتے ہیں اور دوسری چونکہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ حکومت قسام ازلی نے دے رکھی ہے اور ذرہ ذرہ سی باتوں میں تادیب کی نیت سے یا غیرت کے تقاضا سے وہ اپنی حکومت کو استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر چونکہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے ساتھ معاشرت کے بارے میں نہایت حلم اور برداشت کی تاکید کی ہے اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ جیسے رشید اور سعید کو اس تاکید سے کسی قدر اطلاع کروں اللہ جل شانہ فرماتا ہے عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی اپنی بیویوں سے تم ایسے معاشرت کرو جس میں کوئی امر خلاف اخلاق معروفہ کے نہ ہو اور کوئی وحشیانہ حالت نہ ہو بلکہ ان کو اس مسافر خانہ میں اپنا ایک دلی رفیق سمجھو اور احسان کے ساتھ معاشرت کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ بِاَھْلِہٖ یعنی تم میں سے بہتر وہ انسان ہے جو بیوی سے نیکی سے پیش آوے اور حسن معاشرت کے لیے اس قدر تاکید ہے کہ میں اس خط میں لکھ نہیں سکتا۔ عزیز من انسان کی بیوی ایک مسکین اور ضعیف ہے جس کو خدا نے اس کے حوالہ کر دیا اور وہ دیکھتا ہے کہ ہر یک انسان اُس سے کیا معاملہ کرتا ہے نرمی برتنی چاہیئے اور ہر یک وقت دل میں یہ خیال کرنا چاہیئے کہ میری بیوی ایک مہمان عزیز ہے جس کو خدا تعالیٰ نے میرے سپرد کیا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ میں کیونکر شرائط مہمان داری بجا لاتا ہوں اور میں ایک خدا کا بندہ ہوں اور یہ بھی ایک خدا کی بندی ہے مجھے اس پر کونسی زیادتی ہے۔ خونخوار انسان نہیں بننا چاہیئے بیویوں پر رحم کرنا چاہیئے اور ان کو دین سکھلانا چاہیئے درحقیقت میرا یہی عقیدہ ہے کہ انسان کے اخلاق کے امتحان کا پہلا موقعہ اس کی بیوی ہے میں جب کبھی اتفاقاً ایک ذرہ درشتی اپنی بیوی سے کروں تو میرا بدن کانپ جاتا ہے کہ ایک شخص کو خدا نے صدہا کوس سے میرے حوالہ کیا ہے شاید معصیت ہوگی کہ مجھ سے ایسا ہوا تب میں ان کو کہتا ہوں کہ تم اپنی نماز میں میرے لیے دعا کرو کہ اگر یہ امر خلاف مرضی حق تعالیٰ ہے تو مجھے معاف فرماویں اور میں بہت ڈرتا ہوں کہ ہم کسی ظالمانہ حرکت میں مبتلا نہ ہو جائیں سو میں امید رکھتا ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں گے ہمارے سیّد و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر اپنی بیویوں سے حلم کرتے تھے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ والسلام

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

۲۳۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝

یہ بھی جائز نہیں کہ تم ان عورتوں کو نکاح میں لاؤ جو تمہارے باپوں کی بیویاں تھیں۔ جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۵-۲۶)

اور جن عورتوں کے ساتھ تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو تم اُن کے ساتھ نکاح مت کرو اور جو ہو چکا اُس پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی جاہلیت کے زمانہ کی خطا معاف کی گئی) اور پھر فرماتا ہے کہ باپ کی منکوحہ عورت کو کرنا یہ بڑی بے حیائی اور غضب کی بات تھی اور بہت ہی بُرا دستور تھا۔ (چشمہ معرفت ص۲۴۱)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝ (النساء:۲۴)

اس زمانہ میں عرب کا حال نہایت درجہ کی وحشیانہ حالت تک پہنچا ہوا تھا اور کوئی نظام انسانیت کا باقی نہیں رہا تھا اور تمام معاصی ان کی نظر میں فخر کی جگہ تھے ایک ایک شخص صدہا بیویاں کر لیتا تھا۔ حرام کا کھانا ان کے نزدیک ایک شکار تھا ماؤں کے ساتھ نکاح کرنا حلال سمجھتے تھے اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ یعنی آج مائیں تمہاری تم پر حرام ہو گئیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۸،۱۷)

تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں اور ایسا ہی تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کے پہلے خاوند سے لڑکیاں جن سے تم ہم صحبت ہو چکے ہو اور اگر تم ان سے ہم صحبت نہیں ہوئے تو کوئی گناہ نہیں اور تمہارے حقیقی بیٹوں کی عورتیں اور ایسے ہی دو بہنیں ایک وقت میں یہ سب کام جو پہلے ہوتے تھے۔ آج تم پر حرام کیے گئے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۲۵)

تم پر یہ سب رشتے حرام کیے گئے ہیں جیسے تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور دائیاں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور دودھ شریک بہنیں اور تمہاری عورتوں کی وہ لڑکیاں جو تمہاری گودوں میں پرورش پائیں اور تمہارے گھروں میں رہیں مگر عورتوں سے وہ عورتیں مراد ہیں جو تم سے ہم بستر ہو چکی ہوں اور اگر تم نے اُن عورتوں سے صحبت داری نہ کی ہو تو اس صورت میں تمہیں نکاح کرنے میں مضایقہ نہیں اور ایسا ہی تمہارے بیٹوں کی بیویاں تم پر حرام ہیں مگر وہ بیٹے جو تمہارے صلبی بیٹے ہیں متبنّیٰ نہیں ہیں اور یہ حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح کرو اور دونوں تمہارے نکاح میں ہوں مگر جو پہلے اس سے گذر گیا اُس پر کچھ مواخذہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنیوالا مہربان ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۱)

خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف اُن بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے صلبی بیٹے ہیں جیسا کہ یہ آیت ہے وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ یعنی تم پر فقط ان بیٹوں کی جورُواں حرام ہیں جو تمہاری اپشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں۔ پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیم قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصہ ایک مدت بعد اُس کے ظہور میں آیا تو اب ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اُسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصہ اخیری حصہ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّیٰ کی جورو حرام نہیں ہو سکتی یہ پہلے حصہ میں ہی موجود ہے اور اُس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو اور ذرہ شرم کو کام میں لاؤ۔ (آریہ دھرم صفحہ ۵۱-۵۲)

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۚ کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا۝

احصان ..... سے مراد خاص وہ پاک دامنی ہے جو مرد اور عورت کی قوت تناسل سے علاقہ رکھتی ہے اور محصن یا محصنہ اس مرد یا اس عورت کو کہا جائے گا کہ جو حرامکاری یا اس کے مقدمات سے مجتنب رہ کر اس ناپاک بدکاری سے اپنے تئیں روکے جس کا نتیجہ دونوں کے لیے اس عالم میں ذلت اور لعنت اور دوسرے جہان میں عذاب آخرت اور متعلقین

کے لیے علاوہ بے آبروئی نقصان شدید ہے مثلاً جو شخص کسی کی بیوی سے ناجائز حرکت کا مرتکب ہو یا مثلاً زنا تو نہیں مگر اس کے مقدمات مرد اور عورت دونوں سے ظہور میں آویں تو کچھ شک نہیں کہ اس غیرت مند مظلوم کی ایسی بیوی کو جو زنا کرانے پر راضی ہوگئی تھی یا زنا بھی واقع ہو چکا تھا طلاق دینی پڑے گی اور بچوں پر بھی اگر اس عورت کے پیٹ سے ہوں گے بڑا تفرقہ پڑے گا اور مالک خانہ یہ تمام نقصان اس بد ذات کی وجہ سے اُٹھائیگا۔

اس جگہ یاد رہے کہ یہ خُلق جس کا نام احصان یا عفّت ہے یعنی پاک دامنی یہ اسی حالت میں خُلق کہلائے گا جبکہ ایسا شخص جو بدنظری یا بدکاری کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے یعنی قدرت نے وہ قویٰ اس کو دے رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے اس جرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے اس فعل شنیع سے اپنے تئیں بچائے۔ اور اگر بباعث بچہ ہونے یا نامرد ہونے یا خوجہ ہونے یا پیر فرتوت ہونے کے یہ قوت اس میں موجود نہ ہو تو اس صورت میں ہم اس کو اس خلق سے جس کا نام احصان یا عفّت ہے موصوف نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عفّت اور احصان کی اس میں ایک طبعی حالت ہے مگر ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ طبعی حالتیں خلق کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتیں بلکہ اس وقت خلق کی حد میں داخل کی جائیں گی جبکہ عقل کے زیر سایۂ ہو کر اپنے محل پر صادر ہوں یا صادر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیں۔ لہٰذا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ بچے اور نامرد اور ایسے لوگ جو کسی تدبیر سے اپنے تئیں نامرد کر لیں اس خلق کا مصداق نہیں ٹھہر سکتے گو بظاہر عفت اور احصان کے رنگ میں اپنی زندگی بسر کریں بلکہ ان تمام صورتوں میں ان کی عفت اور احصان کا نام طبعی حالت ہوگا نہ اور کچھ

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۰-۳۱)

واضح ہو کہ احصان کا لفظ حصن سے مشتق ہے اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں اور نکاح کرنے کا نام احصان اس واسطے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے انسان عفت کے قلعہ میں داخل ہو جاتا ہے اور بدکاری اور بدنظری سے بچ سکتا ہے اور نیز اولاد ہو کر خاندان بھی ضایع ہونے سے بچ جاتا ہے اور جسم بھی بے اعتدالی سے بچا رہتا ہے پس گویا نکاح ہر یک پہلو سے قلعہ کا حکم رکھتا ہے۔ (آریہ دھرم صفحہ ۱۹ حاشیہ)

ہمیں قرآن نے تو یہ تعلیم دی ہے کہ پرہیزگار رہنے کی غرض سے نکاح کرو اور اولاد صالح طلب کرنے کے لیے دعا کرو جیسا کہ وہ اپنی پاک کلام میں فرماتا ہے مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ یعنی چاہیئے کہ تمہارا نکاح اس نیت سے ہو کہ تا تم تقویٰ اور پرہیزگاری کے قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حیوانات کی طرح محض نطفہ نکالنا ہی تمہارا مطلب ہو اور مُحْصِنِيْن کے لفظ سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو شادی نہیں کرتا وہ نہ صرف روحانی آفات میں گرتا ہے بلکہ جسمانی آفات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے سو قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے تین فایدے ہیں ایک عفت اور پرہیزگاری دوسری حفظ صحت۔ تیسری اولاد۔ (آریہ دھرم صفحہ ۱۹)

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو دوسروں کے قید نکاح میں ہیں مگر وہ عورتیں جو شرعی طور پر ظالم کافروں کی لڑائی

میں قید ہوکر تمہارے قبضہ میں آئی ہوں۔ یہ خدا کا حکم تحریری ہے جو تم پر لازم کیا جاتا ہے ان عورتوں کے سوا جو ذکر ہو چکیں (آیت ۲۳ تا ۲۵) باقی سب عورتیں تم پر حلال ہیں مگر اس شرط سے کہ وہ تعلق صرف شہوت رانی کا ناجائز تعلق نہ ہو بلکہ نیک اور پاک مقاصد کی بنا پر نکاح ہو۔

یہ ہیں وہ عورتیں جو خدا کے قانون نے مسلمانوں پر حرام کر دی ہیں اور یہ محض خدا کا حق ہے کہ جن چیزوں کو چاہے حلال کرے اور جن کو چاہے حرام کرے اور وہی اپنے مصالح کو خوب جانتا ہے اب آریوں کا خدائی قانون میں خواہ نخواہ بغیر کسی حجت اور روشن دلیل کے دخل دینا صرف شوخی اور کمینگی ہے اور ہمیں تو تعجب آتا ہے کہ جو لوگ حیوانات کا پیشاب اور گوبر بھی کھا جاتے ہیں اور حرام حلال کا یہ حال ہے کہ اپنی بیوی کو بنام نہاد نیوگ دوسروں سے ہم بستر کراتے ہیں وہ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قریبی رشتہ داروں سے کیوں نکاح کیا جاتا ہے؟ اس کا یہی جواب ہے کہ وہ خدا کے نزدیک ایسے قریبی نہیں ہیں جو تمہارے خیال خام میں قریبی معلوم ہوتے ہیں جن کو خدا نے قریبی ٹھیرایا ہے ان کا ذکر اپنی کتاب میں کر دیا ہے اور وہ نکاح حرام کیے گئے ہیں جیسا کہ ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں مگر اس کا کیا جواب ہے کہ وید کے پرمیشر نے ایک بڑا اندھیر مارا ہے (جس کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ لوگ بسا اوقات ماؤں اور بہنوں سے بھی شادی کر لیتے ہیں) اور وہ تناسخ یعنی آواگون کا دھوکہ دینے والا طریق ہے کیونکہ جس حالت میں دوبارہ آنے والی روح کے ساتھ پرمیشر کی طرف سے کوئی ایسی فہرست پیٹ میں سے ساتھ نہیں نکلتی جس سے معلوم ہو کہ فلاں عورت سے پیدا ہونے والی درحقیقت فلاں شخص کی ماں ہے یا دادی ہے یا نانی ہے یا بیٹی ہے یا بہن ہے تو اس میں کیا شک ہے کہ بسا اوقات ایک آریہ شادی کرنے والا اپنی ماں سے نکاح کر لیتا ہوگا؟ یا بیٹی سے یا بہن سے یا دادی سے اگر کہو کہ یہ تو پرمیشر کا قصور ہے ہمارا قصور نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر تم ایسے پرمیشر پر کیوں ایمان لاتے ہو؟ جو تمہیں دیدہ دانستہ ایسی ایسی ناپاکی میں ڈالتا ہے اور اگر وہ ان رشتوں کو تمہارے لیے حلال سمجھتا ہے تو پھر تم کیوں اپنے پرمیشر کی نافرمانی کرتے ہو اور کیوں شاکت مت کی طرح جو ہندوؤں کی ایک شاخ ہے ماؤں بہنوں کو اپنے پر حلال نہیں کر لیتے۔ یہ کمال ناسمجھی اور کمزوری ہے کہ جن چیزوں کو پرمیشر تمہارے لیے حلال ٹھیراتا ہے تم ان چیزوں کو حرام ٹھیراتے ہو۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۴۱، ۲۴۲)

محصنات تو قرآن شریف میں خود نکاح والی عورتوں پر بولا گیا ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ......

(مہر کی مقدار کس قدر ہو؟) فرمایا کہ تراضی طرفین سے جو ہو اس پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور شرعی مہر سے یہ مراد نہیں کہ نصوص یا احادیث میں کوئی اس کی حد مقرر کی گئی ہے بلکہ اس سے مراد اس وقت کے لوگوں کے مروجہ مہر سے

ہوا کرتی ہے ہمارے ملک میں یہ خرابی ہے کہ نیت اور ہوتی ہے اور محض نمود کے لیے لاکھ لاکھ روپے کا مہر ہوتا ہے صرف ڈراوے کے لیے یہ لکھا جایا کرتا ہے کہ مرد قابو میں رہے اور اس سے پھر دوسرے نتائج خراب نکل سکتے ہیں نہ عورت والوں کی نیت لینے کی ہوتی ہے اور نہ خاوند کے دینے کی۔

میرا مذہب یہ ہے کہ جب ایسی صورت میں تنازعہ آپڑے تو جب تک اس کی نیت یہ ثابت نہ ہو کہ ہاں رضا و رغبت سے وہ اسی قدر مہر پر آمادہ تھا جس قدر کہ مقررہ شدہ ہے تب تک مقرر شدہ نہ دلایا جاوے اور اس کی حیثیت اور رواج وغیرہ کو مدنظر رکھ کر پھر فیصلہ کیا جاوے کیونکہ بدنیتی کی اتباع نہ شریعت کرتی ہے اور نہ قانون۔

(البدر جلد ۲ ع۱۶ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۳)

۲۹ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ۝

ساری قوتیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ اور انسان ضعیف البنیان تو کمزور ہستی ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا اُس کی حقیقت ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۸)

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے یہی کمزوری ہے کہ اگر الٰہی طاقت اس کے ساتھ شامل نہ ہو تو وہ انواع اقسام کے گناہوں کا موجب ہو جاتی ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ا صفحہ ۱۹۷)

یقیناً یاد رکھو کہ انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے اور اسی لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا اس کا اپنا تو کچھ بھی نہیں سر سے پاؤں تک اتنے اعضا نہیں جس قدر امراض اس کو لاحق ہوتے ہیں پھر جب وہ اس قدر کمزوریوں کا نشانہ اور مجموعہ ہے تو اس کے لیے امن اور عافیت کی یہی سبیل ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ صاف ہو اور وہ اس کا سچا اور مخلص بندہ بنے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صدق کو اختیار کرے جسمانی نظام کی کل بھی صدق ہی ہے جو شخص صدق کو چھوڑتے ہیں اور خیانت کرکے جرائم کو پناہ میں لانے والی سپر کذب کو خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء)

بیماری کی شدت سے موت اور موت سے خدا یاد آتا ہے اصل یہ ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا انسان چند روز کے لیے زندہ ہے، ذرہ ذرہ کا وہی مالک ہے جو حی و قیوم ہے جب وقت موعود آجاتا ہے تو ہر ایک چیز السلام علیکم کہتی اور سارے قویٰ رخصت کرکے الگ ہو جاتے ہیں اور جہاں سے یہ آیا ہے وہیں چلا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (یعنی انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے) اور اس میں بذات خود کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے جب تک خدا تعالیٰ خود عطا نہ فرماوے اگر آنکھیں ہیں اور تم ان سے دیکھتے ہو یا کان ہیں اور تم ان سے سنتے ہو یا زبان ہے اور تم اس سے بولتے ہو تو یہ سب خدا کا فضل ہے کہ یہ سب قوائی اپنا اپنا کام کر رہے ہیں ورنہ اکثر لوگ مادرزاد اندھے یا

بہرے یا گونگے پیدا ہوتے ہیں بعض بعد پیدائش کے دوسرے حوادثات سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں مگر تمہاری آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ جب تک روشنی نہ ہو اور کان نہیں سن سکتے جب تک ہوا نہ ہو۔ پس اس سے سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیا گیا ہے جب تک آسمانی تائید اس کے ساتھ نہ ہو تب تک تم محض بیکار ہو ایک بات کو تم کتنے ہی صدق دل سے قبول کرو مگر جب تک فضل الٰہی شامل حال نہیں تم اس پر قائم نہیں رہ سکتے۔ (البدر جلد ۳ ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

انسان کمزور ہے جب تک دعا سے قوت اور تائید نہیں پاتا اس دشوار گذار منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ خود اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوری اور اس کے ضعف حال کے متعلق ارشاد فرماتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا یعنی انسان ضعیف اور کمزور بنایا گیا ہے۔ پھر باوجود اس کی کمزوری کے اپنی ہی طاقت سے ایسے عالی درجہ اور ارفع مقام کے حاصل کرنے کا دعویٰ کرنا سراسر خام خیالی ہے۔ اس کے لیے دعا کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

بچہ کو اگر دودھ نہ ملے تو وہ کب تک جئے گا؟ آخر سسک کر مر جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انقطاع امداد ہو تو انسان چونکہ کمزور اور ضعیف ہے جیسا کہ فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا پس وہ بھی آخر روحانی طور پر مر جائیگا۔
(الحکم جلد ۹ ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

انسان ناتوان ہے۔ غلطیوں سے پُر ہے۔ مشکلات چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں پس دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا کرے اور تائیدات غیبی اور فضل کے فیضان کا وارث بناوے۔
(الحکم جلد ۱۲ ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۳۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝

ناجائز طور پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ مگر باہم رضامندی کی تجارت سے۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۳۵-۳۶)
لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ تم خودکشی نہ کرو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۶)

۳۵ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا

حَفِظَ اللّٰہُ ؕ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ فَعِظُوۡھُنَّ وَاھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡھُنَّ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡہِنَّ سَبِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا ○

ملوک کے خیالات کا مذہب طرز لباس وغیرہ ہر قسم کے امور کا اخلاقی ہوں یا مذہبی بہت بڑا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ جیسے ذکور کا اثر اناث پر پڑتا ہے اس لیے فرمایا گیا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ۔

(الحکم جلد ۵ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

یہ بھی عورتوں میں خراب عادت ہے کہ وہ بات بات میں مردوں کی نافرمانی کرتی ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر ان کا مال خرچ کر دیتی ہیں۔ اور ناراض ہونے کی حالت میں بہت کچھ بُرا بھلا ان کے حق میں کہہ دیتی ہیں۔ ایسی عورتیں اللہ اور رسُول کے نزدیک لعنتی ہیں۔ ان کا نماز روزہ اور کوئی عمل منظور نہیں۔ اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے۔ کہ کوئی عورت نیک نہیں ہو سکتی۔ جب تک پوری پوری اپنے خاوند کی فرمانبرداری نہ کرے۔ اور دلی محبت سے اس کی تعظیم بجا نہ لائے۔ اور پس پشت یعنی اس کے پیچھے اس کی خیر خواہ نہ ہو۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عورتوں پر لازم ہے کہ اپنے مردوں کی تابعدار رہیں۔ ورنہ ان کا کوئی عمل منظور نہیں۔ اور نیز فرمایا ہے کہ اگر غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز ہوتا۔ تو میں حکم کرتا۔ کہ عورتیں اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے حق میں کچھ بد زبانی کرتی ہے۔ یا اہانت کی نظر سے اس کو دیکھتی ہے۔ اور حکم ربّانی سُن کر پھر بھی باز نہیں آتی۔ تو وہ لعنتی ہے۔ خدا اور رسُول اس سے ناراض ہیں۔ عورتوں کو چاہیئے کہ اپنے خاوندوں کا مال نہ چراویں۔ اور نامحرم سے اپنے تئیں بچاویں۔ اور یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بغیر خاوند اور ایسے لوگوں کے جن کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور جتنے مرد ہیں۔ ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ جو عورتیں نامحرم لوگوں سے پردہ نہیں کرتیں شیطان ان کے ساتھ ساتھ ہے۔ عورتوں پر یہ بھی لازم ہے۔ کہ بدکار اور بدوضع عورتوں کو اپنے گھروں میں نہ آنے دیں۔ اور ان کو اپنی خدمت میں نہ رکھیں۔ کیونکہ یہ سخت گناہ کی بات ہے۔ کہ بدکار عورت نیک عورت کی ہم صحبت ہو۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۴۸ کے ول)

عورتوں کے لیے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ کہ اگر وہ اپنے خاوندوں کی اطاعت کریں گی۔ تو خدا ان کو ہر ایک بلا سے بچاوے گا۔ اور ان کی اولاد عمر والی ہو گی۔ اور نیک بخت ہو گی۔

(مکتوبات جلد ۵ ۵ صفحہ ۲۰ (مکتوب ۱۵۶/۸۵ بنام ہر دو اہلیہ حضرت میاں عبد اللہ صاحب سنوری رضی)

مرد چونکہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ کا مصداق ہے اس لیے اگر وہ لعنت لیتا ہے تو وہ لعنت بیوی

بچوں کو بھی دیتا ہے۔ اور اگر برکت پاتا ہے تو ہمسائیوں اور شہر والوں تک کو بھی دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ اسی لیے کہا ہے کہ عورتیں خاوندوں سے متاثر ہوتی ہیں جس حد تک خاوند صلاحیت اور تقویٰ بڑھاویگا کچھ حصہ اُس سے عورتیں ضرور لیں گی۔ ویسے ہی اگر وہ بدمعاش ہوگا تو بدمعاشی سے وہ حصہ لیں گی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

عورتیں اصل میں مردوں کی ہی ذیل میں ہوا کرتی ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

مرد گھر کا کشتی بان ہوتا ہے اگر وہ ڈوبے گا تو کشتی بھی ساتھ ہی ڈوبے گی اسی لیے کہا اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ اُسی کی رستگاری کے ساتھ اُس کے اہل وعیال کی رستگاری ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

عورتوں میں بت پرستی کی جڑ ہے کیونکہ ان کی طبائع کا میلان زینت پرستی کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بت پرستی کی ابتدا انہی سے ہوئی ہے۔ بزدلی کا مادہ بھی ان میں زیادہ ہوتا ہے۔ کہ ذرا سی سختی پر اپنی جیسی مخلوق کے آگے ہاتھ جوڑنے لگ جاتی ہے۔ اس لیے جو لوگ زن پرست ہوتے ہیں رفتہ رفتہ ان میں بھی یہ عادتیں سرایت کر جاتی ہیں۔ پس بہت ضروری ہے۔ کہ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ رہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ اور اسی لیے مرد کو عورتوں کی نسبت قویٰ زیادہ دئے گئے ہیں۔ اس وقت جو نئی روشنی کے لوگ مساوات پر زور دے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ ان کی عقلوں پر تعجب آتا ہے۔ وہ ذرا مردوں کی جگہ عورتوں کی فوجیں بنا کر جنگوں میں بھیج کر دیکھیں تو سہی۔ کہ کیا نتیجہ مساوی نکلتا ہے یا مختلف۔ ایک طرف تو اُسے حمل ہے۔ اور ایک طرف جنگ ہے۔ وہ کیا کر سکے گی۔ غرضیکہ عورتیں مردوں کی نسبت قویٰ کمزور ہیں۔ اور کم بھی ہیں۔ اس لیے مرد کو چاہیئے۔ کہ عورت کو اپنے ماتحت رکھے۔

یورپ کی طرح بے پردگی پر بھی یہ لوگ زور دے رہے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں۔ یہی عورتوں کی آزادی فسق و فجور کی جڑ ہے۔ جن ممالک نے اس قسم کی آزادی کو روا رکھا ہے۔ ذرا ان کی اخلاقی حالت کو اندازہ کرو۔ اگر اس آزادی اور بے پردگی سے ان کی عفت اور پاک دامنی بڑھ گئی ہے۔ تو ہم مان لیں گے کہ ہم غلطی پر ہیں۔ لیکن یہ بات بہت ہی صاف ہے کہ جب مرد اور عورت جوان ہوں۔ اور آزادی اور بے پردگی بھی ہو۔ تو اُن کے تعلقات کس قدر خطرناک ہوں گے بدنظر ڈالنی اور نفس کے جذبات سے اکثر مغلوب ہو جانا انسان کا خاصہ ہے۔ پھر جس حالت میں کہ پردہ میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔ اور فسق و فجور کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ تو آزادی میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مردوں کی حالت کا اندازہ کرو۔ کہ وہ کس طرح بے لگام گھوڑے کی طرح ہو گئے ہیں۔ نہ خدا کا خوف رہا ہے نہ آخرت کا یقین ہے دنیاوی لذات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس سب سے اوّل ضروری ہے کہ اس آزادی اور بے پردگی سے پہلے مردوں کی اخلاقی

حالت درست کرو اگر یہ درست ہو جاوے۔ اور مردوں میں کم از کم اس قدر قوت ہو کہ وہ اپنے نفسانی جذبات کے مغلوب نہ ہو سکیں۔ تو اس وقت اس بحث کو چھیڑو۔ کہ آیا پردہ ضروری ہے کہ نہیں۔ ورنہ موجودہ حالت میں اس بات پر زور دینا کہ آزادی اور بے پردگی ہو۔ گویا بکریوں کو شیروں کے آگے رکھ دینا ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ کسی بات کے نتیجہ پر غور نہیں کرتے۔ کم سے کم اپنے کانشنس سے ہی کام لیں۔ کہ آیا مردوں کی حالت ایسی اصلاح شدہ ہے کہ عورتوں کو بے پردہ ان کے سامنے رکھا جاوے۔ (البدر جلد ۳ ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

جن عورتوں کی طرف سے ناموافقت کے آثار ظاہر ہو جائیں پس تم اُن کو نصیحت کرو اور خوابگاہوں میں اُن سے جدا رہو اور مارو (یعنی جیسی جیسی صورت اور مصلحت پیش آوے) پس اگر وہ تمہاری تابعدار ہو جائیں تو تم بھی طلاق وغیرہ کا نام نہ لو اور تکبر نہ کرو کہ کبریائی خدا کے لیے مسلم ہے یعنی دل میں یہ نہ کہو کہ اس کی مجھے کیا حاجت ہے میں دوسری بیوی کر سکتا ہوں بلکہ تواضع سے پیش آؤ کہ تواضع خدا کو پیاری ہے۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۵)

۳۶ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝

اگر میاں بیوی کی مخالفت کا اندیشہ ہو تو ایک منصف خاوند کی طرف سے مقرر کرو اور ایک منصف بیوی کی طرف سے اگر منصف صلح کرانے کے لیے کوشش کریں گے تو خدا توفیق دیدیگا۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۵)

۳۷ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝

تم خدا کی پرستش کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو مت شریک ٹھہراؤ اور اپنے ماں باپ سے احسان کرو اور اُن سے بھی احسان کرو جو تمہارے قرابتی ہیں (اس فقرہ میں اولاد اور بھائی اور قریب اور دور کے تمام رشتہ دار آگئے) اور

پھر فرمایا کہ یتیموں کے ساتھ بھی احسان کرو اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور جو ایسے ہمسایہ ہوں جو قرابت والے بھی ہوں اور ایسے ہمسایہ ہوں جو محض اجنبی ہوں اور ایسے رفیق بھی جو کسی کام میں شریک ہوں یا کسی سفر میں شریک ہوں یا نماز میں شریک ہوں یا علم دین حاصل کرنے میں شریک ہوں اور وہ لوگ جو مسافر ہیں اور وہ تمام جاندار جو تمہارے قبضہ میں ہیں سب کے ساتھ احسان کرو۔ خدا ایسے شخص کو دوست نہیں رکھتا جو تکبر کرنے والا اور شیخی مارنے والا ہو جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا۔ مگر افسوس! کہ ایک آریہ بجز عوض معاوضہ کے کسی پر رحم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ صفت اُس کے پرمیشر میں بھی موجود نہیں کیونکہ وہ بھی صرف اعمال کی جزا دے سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں اور اسی وجہ سے مکتی محدود ہے نہ دائمی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲)

تم ماں باپ سے نیکی کرو اور قریبیوں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور ہمسایہ سے جو تمہارا قریبی ہے اور ہمسایہ سے جو بیگانہ ہے اور مسافر سے اور نوکر اور غلام اور گھوڑے اور بکری اور گائے سے اور حیوانات سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں کیونکہ خدا کو جو تمہارا خدا ہے یہی عادتیں پسند ہیں۔ وہ لاپرواہوں اور خود غرضوں سے محبت نہیں کرتا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵)

۳۸۔ اَلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَ یَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ۚ﴿۳۸﴾

ایسے لوگوں کو نہیں چاہتا جو بخیل ہیں اور لوگوں کو بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے مال کو چھپاتے ہیں یعنی محتاجوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵)

۴۲۔ فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا ﴿ؕ۴۲﴾

جب اُن قوموں میں ایک مدت دراز گزرنے کے بعد باہمی تعلقات پیدا ہونے شروع ہو گئے اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے تعارف اور شناسائی اور آمد و رفت کا کسی قدر دروازہ بھی کھل گیا اور دُنیا میں مخلوق پرستی اور ہر ایک قسم کا گناہ بھی انتہا کو پہنچ گیا۔ تب خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا میں بھیجا تا بذریعہ اس تعلیم قرآنی کے جو تمام عالم کی طبایع کے لیے مشترک ہے دُنیا کی تمام متفرق قوموں کو ایک قوم کی طرح بنا دے اور جیسا کہ وہ واحد لاشریک ہے اُن میں بھی ایک وحدت پیدا کرے اور تا وہ سب مل کر ایک وجود کی طرح اپنے خدا کو یاد کریں اور اُس کی وحدانیت کی گواہی دیں اور تا پہلی وحدت قومی جو ابتدائے آفرینش میں ہوئی اور آخری وحدت

اقوام جن کی بنیاد آخری زمانہ میں ڈالی گئی یعنی جس کا خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت میں ارادہ فرمایا۔ یہ دونوں قسم کی وحدتیں خدائے واحد لاشریک کے وجود اور اُس کی وحدانیت پر دوہری شہادت ہو کیونکہ وہ واحد ہے اس لیے اپنے تمام نظام جسمانی اور روحانی میں وحدت کو دوست رکھتا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۸۲)

اور خدا ان لوگوں پر تجھ کو گواہ لائے گا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اللہ جل شانہ نے اسلامی اُمت کے کل لوگوں کے لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد ٹھہرایا ہے اور فرمایا...

.... وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۶۷-۶۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا تھا اُس نے کچھ کہا تھا تو آپ نے فرمایا بس کر اب تو میں اپنی ہی اُمت پر گواہی دینے کے قابل ہو گیا ہوں مجھے فکر ہے کہ میری اُمت کو میری گواہی کی وجہ سے سزا ملے گی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

اگر تم مریض ہو یا سفر پر یا پاخانہ سے آؤ یا عورتوں سے مباشرت کرو اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمم کر لو۔ (شہادت القرآن صفحہ ۳۶)

جن لوگوں کو ساری عمر میں تَعْلَمُوْا نصیب نہ ہوا ان کی نماز ہی کیا ہے۔ ایک عورت کا ذکر کرتے ہیں کہ نماز پڑھا کرتی تھی ایک دن اس نے پوچھا کہ درود میں جو صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ آتا ہے اس کے کیا معنے ہیں خاوند نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے رسول تھے اس پر اُس نے تعجب کیا اور کہا کہ ہائے ہائے میں ساری عمر بیگانہ مرد کا نام لیتی رہی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۴-۱۱۵)

ابتدا میں بعض صحابہ کرامؓ نے شراب پی ہوئی ہوتی تھی اور نماز پڑھ لیتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

کسی کو منع نہیں کیا جب تک کہ آیہ کریمہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى نہ نازل ہوئی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۴)

بیجا عذر تراشنے کے واسطے تو بڑے حیلے ہیں بعض شریر لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ کے یہ معنے کر دیتے ہیں کہ نماز نہ پڑھو۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

۴۷ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

یہودی بھی تو ایسے ہی کام کرتے تھے کہ اپنی رائے سے اپنی تفسیروں میں بعض آیات کے معنے کرنے کے وقت بعض الفاظ کو مقدم اور بعض کو مؤخر کر دیتے تھے جن کی نسبت قرآن مجید میں یہ آیت موجود ہے کہ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ان کی تحریف ہمیشہ لفظی نہیں تھی بلکہ معنوی بھی تھی۔ سو ایسی تحریفوں سے ہر ایک مسلمان کو ڈرنا چاہیئے (الحق دہلی صفحہ ۸۵)

دجال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لیگا اور مذہبی رنگ میں دنیا میں فتنہ ڈالے گا سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۴۸-۴۹ حاشیہ)

دجل یہ ہے کہ اندر ناقص چیز ہو اور اوپر کوئی صاف چیز ہو۔ مثلاً اوپر سونے کا ملمع ہو اور اندر تانبا ہو۔ یہ دجل ابتدائے دنیا سے چلا آتا ہے مکر و فریب سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ زرگر کیا کرتے ہیں۔ جیسے دنیا کے کاموں میں دجل ہے ویسے ہی روحانی کاموں میں بھی دجل ہوتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ بھی دجل ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ان کتابوں (توریت اور انجیل) کی نسبت قرآن مجید میں يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ لکھا ہے وہ لوگ شرح کے طور پر اپنی طرف سے بھی کچھ ملا دیا کرتے تھے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

۴۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ

يَشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا۝

خدا ہر ایک گناہ کو بخش دے گا جس کے لیے چاہے گا پر شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اسی طرح پر خدا نے قرآن میں فرمایا وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ الخ یعنی ہر ایک گناہ کی مغفرت ہو گی مگر شرک کو خدا نہیں بخشے گا پس شرک کے نزدیک مت جاؤ اور اس کو حرمت کا درخت سمجھو۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۳ حاشیہ)

یہاں شرک سے یہی مراد نہیں کہ پتھروں وغیرہ کی پرستش کی جاوے بلکہ یہ ایک شرک ہے کہ اسباب کی پرستش کی جاوے اور معبودات دنیا پر زور دیا جاوے اسی کا نام ہی شرک ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

۵۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۝

وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔۔۔۔ اور ایک تاگے کے برابر کسی پر زیادتی نہیں ہو گی۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۱)

۵۲ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۝

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ یہ عیسائی اور یہودی جنہوں نے انجیل اور توریت کو کچھ ادھورا سا پڑھ لیا ہے ایمان ان کا دیوتوں اور بتوں پر ہے اور مشرکوں کو کہتے ہیں کہ ان کا مذہب جو بت پرستی ہے وہ بہت اچھا ہے اور توحید کا مذہب جو مسلمان رکھتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۹۴)

۵۳ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا۝ ؕ

یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا لعنت کرے اُس کے لیے کوئی مددگار نہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۹۴)

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۝

موسیٰ نے ظاہر ہو کر تین بڑے کھلے کھلے کام کیے جو دنیا پر روشن ہو گئے ایسے ہی کھلے کھلے تین کام جو دنیا پر بدیہی طور پر ظاہر ہو گئے ہوں جس نبی سے ظہور میں آئے ہوں وہی نبی مثیل موسیٰ ہوگا۔ اور وہ کام یہ ہیں۔ (۱) اول یہ کہ موسیٰ نے اُس دشمن کو ہلاک کیا جو ان کی اور ان کی شریعت کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ (۲) دوسرے یہ کہ موسیٰ نے ایک نادان قوم کو جو خدا اور اس کی کتابوں سے ناواقف تھی اور وحشیوں کی طرح چار سَو برس سے زندگی بسر کرتے تھے کتاب اور خدا کی شریعت دی یعنی توریت عنایت کی اور ان میں شریعت کی بنیاد ڈالی۔ (۳) تیسرے یہ کہ بعد اس کے کہ وہ لوگ ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے ان کو حکومت اور بادشاہت عنایت کی اور ان میں سے بادشاہ بنائے۔ ان تینوں انعامات کا قرآن شریف میں ذکر ہے جیسا کہ فرمایا۔ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ دیکھو سورۃ الاعراف الجزو ۹[1]۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا دیکھو سورۃ النساء الجزو نمبر ۵۔ اب سوچ کر دیکھ لو کہ ان تینوں کاموں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ذرہ بھی مناسبت نہیں نہ وہ پیدا ہو کر یہودیوں کے دشمن کو ہلاک کر سکے اور نہ وہ ان کے لیے کوئی نئی شریعت لائے اور نہ انہوں نے بنی اسرائیل یا اُن کے بھائیوں کو بادشاہت بخشی ..... یہ پیشگوئی سیّدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری ہو گئی ہے اور ایسی صفائی سے پوری ہو گئی ہے کہ اگر مثلاً ایک ہندو کے سامنے بھی جو عقل سلیم رکھتا ہو یہ دونوں تاریخی واقعات رکھے جائیں یعنی جس طرح موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی اور پھر سلطنت بخشی اور پھر ان وحشی لوگوں کو جو غلامی میں بسر کر رہے تھے ایک شریعت بخشی اور جس طرح سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن غریبوں اور کمزوروں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے عرب کے خونخوار درندوں سے نجات دی اور سلطنت عطا کی اور پھر اس وحشیانہ حالت کے بعد ان کو ایک شریعت عطا کی تو بلاشبہ وہ ہندو دونوں واقعات کو ایک ہی رنگ میں سمجھے گا اور ان کی مماثلت کی گواہی دیگا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۱ و ۱۲۲)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ

[1] الاعراف آیت ۱۳۰

جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝

بہشت میں بھی ہر روز ایک تجدد ہوتا رہے گا۔اسی طرح دوزخیوں پر بھی لکھا ہے ۔ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا۔ مگر خدا کا تجدد بے پایاں ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔خدا کے کاموں میں انتہا نہیں۔ فرماتا ہے وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ[1] یعنی زیادتی ہوتی رہے گی۔ (البدر جلد اول ۱۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۸)

۵۹۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝

امانت سے مراد انسان کامل کے وہ تمام قُوای اور عقل اور علم اور دل اور جان اور حواس اور خوف اور محبت اور عزت اور وجاہت اور جمیع نعماء روحانی و جسمانی ہیں جو خدا تعالیٰ انسان کامل کو عطا کرتا ہے اور پھر انسان کامل برطبق آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا اِس ساری امانت کو جناب الٰہی کو واپس دیدیتا ہے یعنی اُس میں فانی ہو کر اُس کے راہ میں وقف کر دیتا ہے ...... اور یہ شان اعلیٰ اور اکمل اور اتم طور پر ہمارے سید ہمارے مولیٰ ہمارے ہادی نبی امی صادق مصدوق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۱-۱۶۲)

امانتوں کو ان کے حقداروں کو واپس دیدیا کرو۔ خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۹)

ہم اسی وقت سچے بندے ٹھہر سکتے ہیں کہ جو خداوند منعم نے ہمیں دیا ہم اُس کو واپس دیں یا واپس دینے کے لیے تیار ہو جائیں ہماری جان اُس کی امانت ہے اور وہ فرماتا ہے تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا۔ (مکتوبات جلد دوم ۳ صفحہ ۴۷-۴۸ حاشیہ) (مکتوب بنام ڈاکٹر جگن ناتھ صاحب جموں)

۶۰۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

[1] قٓ: ۳۶

بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾

قرآن میں حکم ہے۔ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔ اب اولی الامر کی اطاعت کا صاف حکم ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ گورنمنٹ مِنۡکُمۡ میں داخل نہیں۔ تو یہ اُس کی صریح غلطی ہے۔ گورنمنٹ جو بات شریعت کے موافق کرتی ہے۔ وہ مِنۡکُمۡ میں داخل ہے۔ جو ہماری مخالفت نہیں کرتا۔ وہ ہم میں داخل ہے۔ اشارۃ النص کے طور پر قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ گورنمنٹ کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اور اُس کی باتیں مان لینی چاہیئے۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۶۹)

اگر حاکم ظالم ہو تو اُس کو بُرا نہ کہتے پھرو۔ بلکہ اپنی حالت میں اصلاح کرو۔ خدا اُس کو بدل دیگا یا اُسی کو نیک کر دے گا۔ جو تکلیف آتی ہے وہ اپنی ہی بد عملیوں کے سبب آتی ہے۔ ورنہ مومن کے ساتھ خدا کا ستارہ ہوتا ہے۔ مومن کے لیے خدا تعالیٰ آپ سامان مہیا کر دیتا ہے۔ میری نصیحت یہی ہے کہ ہر طرح سے تم نیکی کا نمونہ بنو خدا کے حقوق بھی تلف نہ کرو اور بندوں کے حقوق بھی تلف نہ کرو۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

اے مسلمانوں اگر کسی بات میں تم میں باہم نزاع واقعہ ہو تو اس امر کو فیصلہ کے لیے اللہ اور رسول کے حوالہ کرو اگر تم اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہو تو یہی کرو کہ یہی بہتر اور احسن تاویل ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۰۷)

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ یعنی اللہ اور رسول اور اپنے بادشاہوں کی تابعداری کرو۔ (شہادت القرآن صفحہ ۳۶)

اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے۔ اور جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اُس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم میں سے ہے۔ (ضرورت الامام صفحہ ۲۳)

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ یعنی اگر تم کسی بات میں تنازع کرو تو اس امر کا فیصلہ اللہ اور رسول کی طرف ردّ کرو۔ اور صرف اللہ اور رسول کو حکم بناؤ نہ کسی اور کو۔ (الحق دہلی صفحہ ۵۴)

یعنی اللہ اور اُس کے رسول اور ملوک کی اطاعت اختیار کرو۔ اطاعت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر سچے دل سے اختیار کی جائے تو دل میں ایک نور اور روح میں ایک لذت اور روشنی آتی ہے مجاہدات کی اس قدر ضرورت نہیں ہے جس قدر اطاعت کی ضرورت ہے مگر ہاں یہ شرط ہے کہ سچی اطاعت ہو اور یہی ایک مشکل امر ہے اطاعت میں اپنے ہوائے نفس کو ذبح کر دینا ضروری ہوتا ہے بدوں اس کے اطاعت ہو نہیں سکتی اور ہوائے نفس ہی ایک ایسی چیز ہے جو بڑے بڑے موحدوں کے قلب میں بھی بُت بن سکتی ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کیسا فضل تھا اور وہ کس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں فنا شدہ قوم تھی۔ یہ سچی بات ہے کہ کوئی قوم قوم نہیں کہلا سکتی اور ان میں ملّیت اور یگانگت کی روح نہیں پھونکی جاتی جب تک کہ وہ فرمان برداری کے اصول کو اختیار نہ کرے۔ اور اگر اختلاف رائے اور پھوٹ رہے تو پھر سمجھ لو کہ یہ

ادبار اور تنزل کے نشانات ہیں مسلمانوں کے ضعف اور تنزل کے منجملہ دیگر اسباب کے باہم اختلاف اور اندرونی تنازعات بھی ہیں پس اگر اختلاف رائے کو چھوڑ دیں اور ایک کی اطاعت کریں جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے پھر جس کام کو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے اس میں یہی تو سِرّ ہے۔ اللہ تعالیٰ توحید کو پسند فرماتا ہے اور یہ وحدت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اطاعت نہ کی جاوے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ بڑے بڑے اہل الرائے تھے خدا نے اُن کی بناوٹ ایسی ہی رکھی تھی وہ اصول سیاست سے بھی خوب واقف تھے کیونکہ آخر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام خلیفہ ہوئے اور ان میں سلطنت آئی تو انہوں نے جس خوبی اور انتظام کے ساتھ سلطنت کے بارگراں کو سنبھالا ہے۔ اس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن میں اہل الرائے ہونے کی کیسی قابلیت تھی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ان کا یہ حال تھا کہ جہاں آپ نے کچھ فرمایا اپنی تمام رائوں اور دانشوں کو اُس کے سامنے حقیر سمجھا۔ اور جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُسی کو واجب العمل قرار دیا۔ اُن کی اطاعت میں گمشدگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کے وضو کے بقیہ پانی میں برکت ڈھونڈتے تھے اور آپ کے لب مبارک کو متبرک سمجھتے تھے اگر اُن میں یہ اطاعت یہ تسلیم کا مادہ نہ ہوتا بلکہ ہر ایک اپنی ہی رائے کو مقدم سمجھتا اور پھوٹ پڑ جاتی تو وہ اس قدر مراتب عالیہ کو نہ پاتے۔ میرے نزدیک شیعہ سنیوں کے جھگڑوں کو چکا دینے کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ صحابہ کرام میں باہم پھوٹ ہاں باہم کسی قسم کی پھوٹ اور عداوت نہ تھی کیونکہ ان کی ترقیاں اور کامیابیاں اس امر پر دلالت کر رہی ہیں کہ وہ باہم ایک تھے اور کچھ بھی کسی سے عداوت نہ تھی۔ ناسمجھ مخالفوں نے کہا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا مگر میں کہتا ہوں یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دل کی نالیاں اطاعت کے پانی سے لبریز ہو کر نکلی تھیں یہ اُس اطاعت اور اتحاد کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے دوسرے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ وہ تلوار جو ان کو اٹھانی پڑی وہ صرف اپنی حفاظت کے لیے تھی ورنہ اگر وہ تلوار نہ بھی اُٹھاتے تو یقیناً وہ زبان ہی سے دنیا کو فتح کر لیتے۔

سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم بر دل

اُنہوں نے ایک صداقت اور حق کو قبول کیا تھا اور پھر سچے دل سے قبول کیا تھا اُس میں کوئی تکلف اور نمائش نہ تھی اُن کا صدق ہی اُن کی کامیابیوں کا ذریعہ ٹھہرا۔ یہ سچی بات ہے کہ صادق اپنے صدق کی تلوار ہی سے کام لیتا ہے۔ آپ (پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل وصورت جس پر خدا پر بھروسہ کرنے کا نور چڑھا ہوا تھا اور جو جلالی اور جمالی رنگوں کو لیے ہوئے تھی اُس میں ہی ایک کشش اور قوت تھی کہ وہ بے اختیار دلوں کو کھینچے لیتے تھے۔ اور پھر آپ کی جماعت نے اطاعت الرسول کا وہ نمونہ دکھایا اور اس کی استقامت ایسی فوق الکرامت ثابت ہوئی کہ جو اُن کو دیکھتا تھا وہ بے اختیار ہو کر اُن کی طرف چلا آتا تھا۔ غرض صحابہ کی سی حالت اور وحدت کی ضرورت اب بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو مسیح موعود کے ہاتھ سے طیار ہو رہی ہے اُسی جماعت کے ساتھ شامل کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طیار کی تھی۔ اور چونکہ جماعت کی ترقی ایسے ہی لوگوں کے نمونوں سے ہوتی ہے اس لیے تم جو مسیح موعود کی جماعت کہلا کر صحابہ کی جماعت سے ملنے کی

آرزو رکھتے ہو اپنے اندر صحابہ کا رنگ پیدا کرو۔ اطاعت ہو تو ویسی ہو۔ باہم محبت اور اخوت ہو تو ویسی ہو غرض ہر رنگ میں ہر صورت میں تم وہی شکل اختیار کرو جو صحابہ کی تھی۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱-۲)

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ○

یعنی کس طرح جس وقت پہنچے ان کو مصیبت بوجہ ان اعمال کے جو ان کے ہاتھ کر چکے ہیں اب دیکھئے ...... ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے کاموں میں اختیار بھی رکھتا ہے۔ (جنگ مقدس پرچہ یکم جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۷-۸)

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ○

یعنی ہر یک رسول مطاع اور امام بنانے کے لیے بھیجا جاتا ہے اس غرض سے نہیں بھیجا جاتا کہ کسی دوسرے کا مطیع اور تابع ہو ہاں محدّث جو مرسلین میں سے ہے اُمتی بھی ہوتا ہے اور ناقص طور پر نبی بھی۔ اُمتی وہ اِس وجہ سے کہ وہ بکلی تابع شریعت رسول اللہ اور مشکوٰۃ رسالت سے فیض پانے والا ہوتا ہے اور نبی اِس وجہ سے کہ خدائے تعالیٰ نبیوں سا معاملہ اُس سے کرتا ہے اور محدث کا وجود انبیا اور اُمم میں بطور برزخ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے وہ اگرچہ کامل طور پر اُمتی ہے مگر ایک وجہ سے نبی بھی ہوتا ہے۔ اور محدث کے لیے ضرور ہے کہ وہ کسی نبی کا مثیل ہو اور خدائے تعالیٰ کے نزدیک وُہی نام پاوے جو اُس نبی کا نام ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۶۹)

یعنی ہر ایک نبی ہم نے اِس لیے بھیجا ہے کہ تا خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے اب ظاہر ہے کہ جبکہ بمنشاء اس آیت کے نبی واجب الاطاعت ہے پس جو شخص نبی کی اطاعت سے باہر ہو وہ کیونکر نجات پا سکتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۷)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○

یعنی اے پیغمبر تمہارے ہی پروردگار کی قسم ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے باہمی جھگڑے تم ہی سے فیصلہ نہ کرائیں اور صرف فیصلہ ہی نہیں بلکہ جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل گیر بھی نہ ہوں بلکہ کمال اطاعت اور دلی رضامندی اور شرح صدر سے اس کو قبول کریں تب تک یہ لوگ ایمان سے بے بہرہ ہیں۔ (تریاق القلوب صفحہ ۸۳)

۳۳ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝

ہم نمازمیں یہ دعا کرتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[1] اس سے یہی مطلب ہے کہ خدا سے ہم اپنے ترقی ایمان اور بنی نوع کی بھلائی کے لیے چار قسم کے نشان چار کمال کے رنگ میں چاہتے ہیں نبیوں کا کمال صدیقوں کا کمال۔ شہیدوں کا کمال صلحاء کا کمال۔ سو نبی کا خاص کمال یہ ہے کہ خدا سے ایسا علم غیب پاوے جو بطور نشان کے ہو۔ اور صدیق کا کمال یہ ہے کہ صدق کے خزانہ پر ایسے کامل طور پر قبضہ کرے یعنی ایسے اکمل طور پر کتاب اللہ کی سچائیاں اس کو معلوم ہو جائیں کہ وہ بوجہ خارق عادت ہونے کے نشان کے صورت پر ہوں اور اس صدیق کے صدق پر گواہی دیں۔ اور شہید کا کمال یہ ہے کہ مصیبتوں اور دکھوں اور ابتلاؤں کے وقت میں ایسی قوت ایمانی اور قوت اخلاقی اور ثابت قدمی دکھلاوے کہ جو خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان کے ہو جائے اور مرد صالح کا کمال یہ ہے کہ ایسا ہر ایک قسم کے فساد سے دور ہو جائے۔ اور مجسم صلاح بن جائے کہ وہ کامل صلاحیت اس کی خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان مانی جائے۔ سو یہ چاروں قسم کے کمال جو ہم پانچ وقت خدا تعالیٰ سے نماز میں مانگتے ہیں یہ دوسرے لفظوں میں ہم خدا تعالیٰ سے آسمانی نشان طلب کرتے ہیں اور جس میں یہ طلب نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔ ہماری نماز کی حقیقت یہی طلب ہے جو ہم چار رنگوں میں پنج وقت خدا تعالیٰ سے چار نشان مانگتے ہیں اور اس طرح پر زمین پر خدا تعالیٰ کی تقدیس چاہتے ہیں تا ہماری زندگی انکار اور شک اور غفلت کی زندگی ہو کر زمین کو پلید نہ کرے اور ہر ایک شخص خدا تعالیٰ کی تقدیس تبھی کر سکتا ہے کہ جب وہ یہ چاروں قسم کے نشان خدا تعالیٰ سے مانگتا رہے حضرت مسیح نے بھی مختصر لفظوں میں یہی سکھایا تھا۔ دیکھو متی باب ۶ آیت ۹۔ پس تم اسی طرح دعا مانگو کہ اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صفحہ ۹۰، ۹۱)

نبی کا لفظ نباء سے نکلا ہے اور نباء کہتے ہیں خبر دینے کو۔ اور نبی کہتے ہیں خبر دینے والے کو یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کلام پا کر جو غیب پر مشتمل زبردست پیشگوئیاں ہوں مخلوق کو پہنچانے والا اسلامی اصطلاح کے رو سے نبی کہلاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

[1] الفاتحہ آیت ۶، ۷۔

نبی وہ ہوتے ہیں جن کا تبتل الی اللہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خدا سے کلام کرتے اور وحی پاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ ۲۶/۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

انسان جب سفلی زندگی کو چھوڑ دیتا ہے اور بالکل سانپ کی کینچلی کی طرح اس زندگی سے الگ ہو جاتا ہے اس وقت اس کی حالت اور ہو جاتی ہے وہ بظاہر اسی زمین پر چلتا پھرتا کھاتا پیتا ہے اور اس پر قانون قدرت کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا دوسرے لوگوں پر لیکن باوجود اس کے بھی وہ اس دنیا سے الگ ہوتا ہے وہ ترقی کرتے کرتے اس مقام پر جا پہنچتا ہے جو نقطہ نبوت کہلاتا ہے اور جہاں وہ خدا تعالے سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہ مکالمہ یوں شروع ہوتا ہے کہ جب وہ نفس اور اس کے تعلقات سے الگ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا تعلق اللہ تعالیٰ ہی سے ہوتا ہے اور اسی سے وہ مکالمہ کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۱۱/۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

نبوت کیا ہے یہ ایک جوہر خداداد ہے اگر کسب سے ہوتا تو سب نبی ہو جاتے ان کی فطرت ہی اس قسم کی نہیں ہوتی کہ وہ ان بے جا سلسلہ کلام میں مبتلا ہوں۔ وہ نفسی کلام کرتے ہی نہیں دوسرے لوگوں میں تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ ان سلسلوں میں کچھ ایسے مبتلا ہوتے ہیں کہ خدا کا خانہ ہی خالی رہتا ہے لیکن نبی ان دونوں سلسلوں سے الگ ہو کر خدا میں کچھ ایسے گم ہوتے ہیں اور اس کے مخاطبہ مکالمہ میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ ان سلسلوں کے لیے ان کے دل و دماغ میں سمائی اور گنجائش ہی نہیں ہوتی بلکہ خدا ہی کا سلسلہ کلام رہ جاتا ہے چونکہ وُہی حصّہ باقی ہوتا ہے اس لیے خدا ان سے کلام کرتا ہے اور وہ خدا کو مخاطب کرتے رہتے ہیں تنہائی اور بیکاری میں بھی جب ایسے خیالات کا سلسلہ ایک انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اس وقت اگر نبی کو بھی ویسی ہی حالت میں دیکھو تو شاید غلطی اور ناواقفی سے سمجھ لو کہ اب اس کا سلسلہ تو خدا سے کلام کا نہ ہوگا؟ مگر نہیں وہ ہر وقت خدا ہی سے باتیں کرتا ہے کہ اے خدا میں تجھ سے پیار کرتا ہوں اور تیری رضا کا طالب ہوں۔ مجھ پر ایسا فضل کر کہ میں اس نقطہ اور مقام تک پہنچ جاؤں جو تیری رضا کا مقام ہے۔ مجھے ایسے اعمال کی توفیق دے جو تیری نظر میں پسندیدہ ہوں دنیا کی آنکھ کھول کہ وہ تجھے پہچانے اور تیرے آستانے پر گرے۔ یہ اس کے خیالات ہوتے ہیں اور یہ اسکی آرزوئیں۔ اس میں ایسا محو اور فنا ہوتا ہے کہ دوسرا اس کو شناخت نہیں کر سکتا۔ وہ اس سلسلہ کو ذوق کے ساتھ دراز کرتا ہے اور پھر اسی میں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کا دل پگھل جاتا ہے اور اس کی روح بہ نکلتی ہے وہ پورے زور اور اطاعت کے ساتھ آستانہ الوہیت پر گرتی اور اَنْتَ رَبِّیْ اَنْتَ رَبِّیْ کہہ کر پکارتی ہے تب اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم جوش میں آتا ہے اور وہ اس کو مخاطب کرتا اور اپنے کلام سے اس کو جواب دیتا ہے۔ یہ ایسا لذیذ سلسلہ ہے کہ ہر شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا اور یہ لذت ایسی ہے کہ الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ پس وہ بار بار مستسقی کی طرح باب ربوبیت ہی کو کھٹکھٹاتا رہتا ہے اور وہاں ہی اپنے لیے راحت و آرام پاتا ہے۔ وہ دنیا میں ہوتا ہے لیکن دنیا سے الگ ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی کسی چیز کا آرزومند نہیں ہوتا لیکن دنیا اس کی خادم ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اس کے قدموں پر دنیا کو لا ڈالتا ہے۔

یہ ہے مختصر حقیقت نبوت کے مقام کی۔ یہاں کلام نفسی کے دونوں سلسلے بھسم ہو جاتے ہیں اور تیسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا مبدا اور منتہا خدا ہی ہوتا ہے اس وقت وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو جذب کرتا ہے جس میں اس قسم کے دخان اور اضغاث ۔ احلام نہیں ہوتے جو نفسی کلام میں ہوتے ہیں بلکہ وہ دنیا سے انقطاع کلّی کیے ہوئے ہوتا ہے ۔ جیسے ایک نفسانی خواہشوں کا اسیر اعلیٰ درجہ کا محبوبہ سے تعلق پیدا کر کے ہمہ گوش ہو کر تصور کرتا ہے اور اسے نفسانی لذات کا معراج پاتا ہے اور قطعاً نہیں چاہتے کہ کسی دوسرے کو ملیں ۔ اسی طرح پر نبی خدا تعالیٰ سے اپنے تعلقات کو یہاں تک پہنچاتا ہے کہ وہ اس تنہائی اور خلوت میں کسی دوسرے کا دخل ہرگز پسند نہیں کرتے وہ اپنے محبوب سے ہمکلام ہوتا ہے اور اس میں لذت اور راحت پاتے ہیں ۔ وہ ایک دم کے لیے بھی اس خلوت کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے لیکن خدا تعالےٰ انہیں دنیا کے سامنے لاتا ہے تاکہ وہ دنیا کی اصلاح کریں اور خدا نما آئینہ ٹھہریں ۔ نبی طبعاً ایک لذت اور کیفیت پاتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ ہی میں چاہتا ہے اس سے زیادہ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا اگرچہ دل اس لذت سے بھرا ہوا ہے اگرچہ اس ذکر کی درازی اور بھی لذت بخش ہے مگر وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جس میں مَیں اس کو ظاہر کر سکوں ۔

(الحکم جلد ۹ ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

نبیوں کا عظیم الشان کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے خبریں پاتے ہیں ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

صدیق وہ ہوتا ہے جس کو سچائیوں کا کامل طور پر علم بھی ہوا اور پھر کامل اور طبعی طور پر ان پر قائم بھی ہو مثلاً اس کو ان معارف کی حقیقت معلوم ہو کہ وحدانیت باری تعالیٰ کیا شئی ہے اور اُس کی اطاعت کیا شئی اور محبت باری عزّ اسمہٗ کیا شئے اور شرک سے کس مرتبہ اخلاص پر مخلصی حاصل ہو سکتی ہے اور عبودیت کی کیا حقیقت ہے اور اخلاص کی حقیقت کیا اور توبہ کی حقیقت کیا اور صبر اور توکل اور رضا اور محویت اور فنا اور صدق اور وفا اور تواضع اور سخا اور ابتہال اور دعا اور عفو اور حیا اور دیانت اور امانت اور اتقا وغیرہ اخلاق فاضلہ کی کیا کیا حقیقتیں ہیں ۔ پھر ماسوا اس کے ان صفات فاضلہ پر قائم بھی ہو ۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۲۳)

صدیق کا کمال یہ ہے کہ صدق کے خزانہ پر ایسے کامل طور پر قبضہ کرے یعنی ایسے اکمل طور پر کتاب اللہ کی سچائیاں اس کو معلوم ہو جائیں کہ وہ بوجہ خارق عادت ہونے کے نشان کی صورت پر ہوں اور اس صدیق کے صدق پر گواہی دیں ۔

(تریاق القلوب (اشتہار اپنی جماعت کے لیے اطلاع) صفحہ ۵)

صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جو بالکل راست بازی میں فنا شدہ ہو ۔ اور کمال درجہ کا پابند راست بازی اور عاشق صادق ہو ۔ اس وقت وہ صدیق کہلاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جب ایک شخص اس درجہ پر پہنچتا ہے تو وہ ہر قسم کی صداقتوں اور راست بازیوں کا مجموعہ اور ان کو کشش کرنے والا ہو جاتا ہے جس طرح پر آتشی شیشہ سورج کی شعاعوں کو اپنے اوپر جمع کر لیتا ہے اسی طرح پر صدیق کمالات صداقت کا جاذب کرنے والا ہوتا ہے ۔ بقول شخصے ۔ زر زر کشد در جہاں گنج گنج

جب ایک شی بہت بڑا ذخیرہ پیدا کر لیتی ہے تو اسی قسم کی اشیاء کو جذب کرنے کی قوت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔

صدیق کے کمال کے حصول کا فلسفہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی کمزوری اور ناداری کو دیکھ کر اپنی طاقت اور حیثیت کے موافق اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہتا ہے اور صدق اختیار کرتا اور جھوٹ کو ترک کر دیتا ہے اور ہر قسم کے رجس اور پلیدی سے جو جھوٹ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے دور بھاگتا ہے اور عہد کر لیتا ہے کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا نہ جھوٹی گواہی دوں گا۔ اور جذبہ نفسانی کے رنگ میں کوئی جھوٹی کلام نہ کروں گا۔ نہ لغو طور پر نہ کسب خیر کے لیے نہ دفع شر کے لیے یعنی کسی رنگ اور حالت میں بھی جھوٹ کو اختیار نہیں کروں گا۔ جب اس حد تک وعدہ کرتا ہے تو گویا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر وہ ایک خاص عمل کرتا ہے اور وہ عمل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے آگے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے خواہ یہ اس کے مُنہ سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اللہ تعالیٰ جو مبدء الفیوض اور صدق اور راستی کا چشمہ ہے اس کو ضرور مدد دیگا اور صداقت کے اعلیٰ اصول اور حقایق اس پر کھول دیگا جیسے یہ قاعدہ کی بات ہے کہ کوئی تاجر جو اچھے اصولوں پر چلتا ہے اور راستبازی اور دیانتداری کو ہاتھ سے نہیں دیتا اگر وہ ایک پیسہ سے تجارت کرے اللہ تعالیٰ اُسے ایک پیسہ کے لاکھوں لاکھ روپیہ دیتا ہے۔

اسی طرح پر جب عام طور پر انسان راستی اور راست بازی سے محبت کرتا ہے اور صدق کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو وہی راستی اس عظیم الشان صدق کو کھینچ لاتی ہے جو خدا تعالیٰ کو دکھا دیتی ہے اور وہ صدق مجسم قرآن کریم ہے اور وہ صدق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کے ماموروں مرسل حق اور صدق ہوتے ہیں پس وہ اس صدق تک پہنچ جاتے ہیں تب اُن کی آنکھ کھلتی ہے اور ایک خاص بصیرت ملتی ہے جس سے معارف قرآنی کھُلنے لگتے ہیں۔

میں اس بات کے ماننے کے واسطے کبھی طیار نہیں ہوں کہ وہ شخص جو صدق سے محبّت نہیں رکھتا اور راست بازی کو اپنا شعار نہیں بناتا وہ قرآن کریم کے معارف کو سمجھ بھی سکے۔ اس واسطے کہ اس کے قلب کو مناسبت ہی نہیں یہ تو صدق کا چشمہ ہے اس سے وہی پی سکتا ہے جس کو صدق سے محبت ہو۔ (الحکم جلد ۹ ۱۳ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

صدیق وہ ہوتے ہیں جو صدق سے پیار کرتے ہیں سب سے بڑا صدق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور پھر دوسرا صدق مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ہے وہ صدق کی تمام راہوں سے پیار کرتے ہیں اور صدق ہی چاہتے ہیں ..... صدیق عملی طور پر صدق سے پیار کرتا اور کذب سے پرہیز کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

صدیقوں کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بدظنی سے بہت ہی بچے اور اگر کسی کی نسبت کوئی سوءظن پیدا ہو تو کثرت کے ساتھ استغفار کرے اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرے تاکہ اس معصیت اور اس کے برے نتیجے سے بچ جاوے جو اس بدظنی کے پیچھے آنے والا ہے۔ اس کو کبھی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے جس سے انسان بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب دیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ

میں کیا کیا کمالات تھے۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اس چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل کے اندر ہے اور حقیقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو صدق دکھایا ہے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں جو شخص صدیق کے کمالات حاصل کرنے کی خواہش کرے اسے ضروری ہے کہ ابوبکری خصلت اور فطرت کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہے مجاہدہ کرے اور پھر جہاں تک ہو سکے دعا کرے جب تک ابوبکری فطرت کا سایہ اپنے اوپر ڈال نہیں لیتا اور اسی رنگ میں رنگین نہیں ہو جاتا وہ کمالات حاصل نہیں ہو سکتے۔ (الحکم جلد ۹ ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صـ۲)

صدق کامل اس وقت تک جذب نہیں ہوتا جب تک توبۃ النصوح کے ساتھ صدق کو نہ کھینچے قرآن کریم تمام صداقتوں کا مجموعہ اور صدق تام ہے جب تک خود صادق نہ بنے صدق کے کمال اور مراتب سے کیونکر واقف ہو سکتا ہے۔

صدیق کے مرتبہ پر قرآن کریم کی معرفت اور اس سے محبت اور اس کے نکات و حقائق پر اطلاع ملتی ہے کیونکہ کذب کذب کو کھینچتا ہے اس لیے کبھی بھی کاذب قرآنی معارف اور حقائق سے آگاہ نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[۱] فرمایا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۵ عـ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صـ۱)

مرتبہ شہادت سے وہ مرتبہ مراد ہے جبکہ انسان اپنی قوت ایمان سے اس قدر اپنے خدا اور روز جزا پر یقین کر لیتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے۔ تب اس یقین کی برکت سے اعمال صالحہ کی مرارت اور تلخی دور ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ہر ایک قضاء و قدر بباعث موافقت کے شہد کی طرح دل میں نازل ہوتی اور تمام صحن سینہ کو حلاوت سے بھر دیتی ہے اور ہر ایک ایلام انعام کے رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ سو شہید اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قوت ایمانی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہو اور اس کے تلخ قضا و قدر سے شہد شیریں کی طرح لذت اٹھاتا ہے اور اسی معنے کے رو سے شہید کہلاتا ہے۔ اور یہ مرتبہ کامل مومن کے لیے بطور نشان کے ہے۔ (تریاق القلوب صـ۱۲۴)

شہید کا کمال یہ ہے کہ مصیبتوں اور دکھوں اور ابتلاؤں کے وقت میں ایسی قوت ایمانی اور قوت اخلاقی اور ثابت قدمی دکھلاوے کہ جو خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان کے ہو جائے۔ (تریاق القلوب (اشتہار اپنی جماعت کے لیے اطلاع) صـ۱۱)

جب تک ایمان قوی ہوتا ہے اسی قدر اعمال میں بھی قوت آتی ہے یہاں تک کہ اگر یہ قوت ایمانی پورے طور پر نشوونما پا جاوے تو پھر ایسا مومن شہید کے مقام پر ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی امر اس کے سد راہ نہیں ہو سکتا وہ اپنی عزیز جان تک دینے میں بھی تامل اور دریغ نہ کرے گا۔ (الحکم جلد ۹ عـ۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء صـ۶)

عام لوگ تو شہید کے لیے اتنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ شہید وہ ہوتا ہے جو تیر یا بندوق سے مارا جاوے یا کسی اور اتفاقی موت سے مر جاوے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہادت کا یہی مقام نہیں ہے ...... میرے نزدیک شہید کی حقیقت قطع نظر اس کے کہ اس کا جسم کاٹا جاوے کچھ اور ہی ہے اور وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق دل سے ہو یاد رکھو کہ صدیق نبی سے ایک قرب رکھتا ہے اور وہ اس سے دوسرے درجہ پر ہوتا ہے اور شہید صدیق کا ہمسایہ ہوتا ہے۔ نبی میں تو سارے کمالات

---

[۱] الواقعۃ آیت ۸۰

ہوتے ہیں یعنی وہ صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی ہوتا ہے صالح بھی ہوتا ہے لیکن صدیق اور شہید ایک الگ الگ مقام ہیں۔ اس بحث کی بھی حاجت نہیں کہ آیا صدیق شہید ہوتا ہے۔ یا نہیں۔ وہ مقام کمال جہاں ہر ایک امر خارق عادت اور معجزہ سمجھا جاتا ہے وہ ان دونوں مقاموں پر اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جدا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوت عطا کرتا ہے کہ جو عمدہ اعمال ہیں اور جو عمدہ اخلاق ہیں وہ کامل طور پر اور اپنے اصلی رنگ میں اس سے صادر ہوتے ہیں اور بلا تکلف صادر ہوتے ہیں کوئی خوف اور رجا ان اعمالِ صالحہ کے صدور کا باعث نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اس کی فطرت اور طبیعت کا ایک جزو ہو جاتے ہیں۔ تکلف اس کی طبیعت میں نہیں رہتا۔ جیسے ایک سائل کسی شخص کے پاس آوے تو خواہ اس کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو تو اسے دینا ہی پڑیگا۔ اگر خدا کے خوف سے نہیں تو خلقت کے لحاظ سے مگر اس قسم کا تکلف شہید میں نہیں ہوتا۔ اور یہ قوت اور طاقت اس کی بڑھتی جاتی ہے جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اسی قدر اس کی تکلیف کم ہوتی جاتی ہے اور وہ بوجھ کا احساس نہیں کرتا مثلاً ہاتھی کے سر پر ایک چیونٹی ہو تو وہ اس کا کیا احساس کریگا۔

(الحکم جلد ۹ ع۱۸ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

عام لوگوں نے شہید کے معنی صرف یہی سمجھ رکھے ہیں کہ جو شخص لڑائی میں مارا گیا۔ یا دریا میں ڈوب گیا۔ یا وبا میں مر گیا وغیرہ مگر میں کہتا ہوں کہ اسی پر اکتفا کرنا اور اسی حد تک اس کو محدود رکھنا مومن کی شان سے بعید ہے۔ شہید اصل میں وہ شخص ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ سے استقامت اور سکینت کی قوت پاتا ہے اور کوئی زلزلہ اور حادثہ اُس کو متغیر نہیں کر سکتا وہ مصیبتوں اور مشکلات میں سینہ سپر رہتا ہے یہاں تک کہ اگر محض خدا تعالیٰ کے لیے اس کو جان بھی دینی پڑے تو فوق العادت استقلال اُس کو ملتا ہے اور وہ بدوں کسی قسم کا رنج یا حسرت محسوس کیے اپنا سر رکھ دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ بار بار مجھے زندگی ملے اور بار بار اس کو اللہ کی راہ میں دوں۔ ایک ایسی لذت اور سرور ان کی روح میں ہوتا ہے کہ ہر تلوار جو ان کے بدن پر پڑتی ہے اور ہر ضرب جو ان کو پیس ڈالے ان کو پہنچتی ہے وہ ان کو ایک نئی زندگی نئی مسرت اور تازگی عطا کرتی ہے یہ ہیں شہید کے معنی۔

پھر یہ لفظ شہد سے بھی نکلا ہے عبادت شاقہ جو لوگ برداشت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں ہر ایک تلخی اور کدورت کو جھیلتے ہیں اور جھیلنے کے لیے طیار ہو جاتے ہیں وہ شہد کی طرح ایک شیرینی اور حلاوت پاتے ہیں اور جیسے شہد فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ[1] کا مصداق ہے یہ لوگ بھی ایک تریاق ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت میں آنے والے بہت سے امراض سے نجات پا جاتے ہیں۔

اور پھر شہید اس درجہ اور مقام کا نام بھی ہے جہاں انسان اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے یا کم از کم خدا کو دیکھتا ہوا یقین کرتا ہے اس کا نام احسان بھی ہے۔ (الحکم جلد ۵ ع۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

صالحین وہ ہوتے ہیں جن کے اندر سے ہر قسم کا فساد جاتا رہے جیسے تندرست آدمی جب ہوتا ہے تو اس کی

[1] النحل آیت ۷۰

زبان کا مزہ بھی درست ہوتا ہے پورے اعتدال کی حالت میں تندرست کہلاتا ہے کسی قسم کا فساد اُندر نہیں رہتا۔ اسی طرح پر صالحین کے اندر کسی قسم کی روحانی مرض نہیں ہوتی اور کوئی مادہ فساد کا نہیں ہوتا اس کا کمال اپنے نفس میں نفی کے وقت ہے اور شہید۔ صدّیق۔ نبی کا کمال ثبوتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

صلاح کی حالت میں انسان کو ضروری ہوتا ہے کہ ہر ایک قسم کے فساد سے خواہ وہ عقائد کے متعلق ہو یا اعمال کے متعلق پاک ہو جیسے انسان کا بدن صلاحیت کی حالت اُس وقت رکھتا ہے جبکہ سب اخلاط اعتدال کی حالت پر ہوں اور کوئی کم زیادہ نہ ہو لیکن اگر کوئی خلط بھی بڑھ جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح پر روح کی صلاحیت کا مدار بھی اعتدال پر ہے اسی کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں صراط مستقیم ہے صلاح کی حالت میں انسان محض خدا کا ہو جاتا ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت تھی اور رفتہ رفتہ صالح انسان ترقی کرتا ہوا مطمئنہ کے مقام پر پُہنچ جاتا ہے اور یہاں ہی اس کا انشراح صدر ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

کامل صلاح یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی فساد باقی نہ رہے بدن صالح میں کسی قسم کا کوئی خراب اور زہریلا مادہ نہیں ہوتا بلکہ صاف اور مؤید صحت مواد اس میں ہو اس وقت صالح کہلاتا ہے جب تک صالح نہیں تو لازم بھی صالح نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ مٹھاس بھی اسے کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح پر جب تک صالح نہیں بنتا اور ہر قسم کی بدیوں سے نہیں بچتا اور خراب مادے نہیں نکلتے اس وقت تک عبادات کڑوی معلوم ہوتی ہیں نماز میں جاتا ہے مگر اسے کوئی لذت اور سرور نہیں آتا وہ ٹکریں مار کر منحوس منہ سے سلام پھیر کر رخصت ہوتا ہے لیکن مزا اسی وقت آتا ہے جب گندے مواد نکل جاتے ہیں تو انس اور ذوق شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور اصلاح انسانی اسی درجہ سے شروع ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۱۸ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

چوتھا درجہ صالحین کا ہے جن کو مواد ردیہ سے صاف کر دیا گیا ہے اور ان کے قلوب صاف ہو گئے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب تک مواد ردّیہ دور نہ ہوں اور سوء مزاج رہے تو مزہ زبان تک کا بھی بگڑ جاتا ہے تلخ معلوم دیتا ہے اور جب بدن میں پوری صلاحیت اور اصلاح ہو اُس وقت ہر ایک شے کا اصل مزہ معلوم ہوتا ہے اور طبیعت میں ایک قسم کی لذت اور سرور اور چستی اور چالاکی پائی جاتی ہے اسی طرح پر جب انسان گناہ کی ناپاکی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور روح کا قوام بگڑ جاتا ہے پھر روحانی قوتیں کمزور ہونی شروع ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ عبادات میں مزہ نہیں رہتا طبیعت میں ایک گھبراہٹ اور پریشانی پائی جاتی ہے لیکن جب مواد ردیہ جو گناہ کی زندگی سے پیدا ہوئے تھے توبۃ النصوح کے ذریعہ خارج ہونے لگیں تو روح میں وہ اضطراب اور بے چینی کم ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ آخر ایک سکون اور تسلی ملتی ہے۔ پہلے جو گناہ کی طرف قدم اٹھانے میں راحت محسوس ہوتی تھی اور پھر اسی فعل میں جو نفس کی خواہش کا نتیجہ ہوتا تھا اور جھکنے میں خوشی ملتی تھی اس طرف جھکتے ہوئے دکھ اور رنج معلوم ہوتا ہے روح پر ایک لرزہ پڑ جاتا ہے اگر اس تاریک زندگی کا وہم

یا تصور بھی آجائے اور پھر عبادات میں ایک لُطف۔ ذوق۔ جوش اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے اور روحانی قویٰ جو گناہ آمیز زندگی سے مردہ ہو چلے تھے ان کا نشوونما شروع ہوتا ہے اور اخلاقی طاقتیں اپنا ظہور کرتی ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱-۲)

منعم علیہ چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں نبی۔ صدیق۔ شہدا اور صالح۔ انبیاء علیہم السلام میں چاروں شانیں جمع ہوتی ہیں کیونکہ یہ اعلیٰ کمال ہے۔ ہر ایک انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کمالات کے حاصل کرنے کے لیے جہاں مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس طریق پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دکھایا ہے کوشش کرے...... اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قایم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

الہام صحیح اور سچے کے لیے یہی شرط لازمی ہے کہ اُس کے مقامات مجملہ کی تفصیل بھی اُسی الہام کے ذریعہ سے کی جائے جیسا کہ قرآن کریم میں یعنی سورہ فاتحہ میں یہ آیت ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اب اس آیت میں جو أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا لفظ ہے یہ ایک مجمل لفظ تھا اور تشریح طلب تھا تو خدا تعالیٰ نے دوسرے مقام میں خود اس کی تشریح کر دی اور فرمایا کہ أُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ۔ (جنگ مقدس پرچہ ۲۴ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۸)

قَفَّا اللّٰهُ ذِكْرَ الصِّدِّيقِينَ بَعْدَ النَّبِيِّينَ وَقَالَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۔ وَفِي ذٰلِكَ إِشَارَاتٌ إِلَى الصِّدِّيقِ وَتَفْضِيلِهٖ عَلَى الْاٰخَرِينَ ۔ فَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا سَمّٰى أَحَدًا مِّنَ الصَّحَابَةِ صِدِّيقًا إِلَّا إِيَّاهُ لِيُظْهِرَ مَقَامَهٗ وَرَيَّاهُ فَانْظُرْ كَالْمُتَدَبِّرِينَ ۔ وَفِي الْاٰيَةِ إِشَارَةٌ عَظِيمَةٌ إِلٰى مَرَاتِبِ الْكَمَالِ وَأَهْلِهَا لِقَوْمِ السَّالِكِينَ وَإِنَّا إِذَا تَدَبَّرْنَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَبَلَّغْنَا الْفِكْرَ إِلَى النِّهَايَةِ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذکر کے بعد صدیقوں کا ذکر فرمایا ہے جیسے کہ فرمایا أُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ۔ اس میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف اور دوسروں پر آپ کی فضیلت کی طرف کئی ایک اشارے ہیں کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں سے آپ کے سوا کسی کا نام صدیق نہیں رکھا تاکہ آپ کے مقام اور آپ کی فضیلت کو ظاہر کرے پس غور کرنے والوں کی طرح دیکھو پھر اس آیت میں سالکوں کے لیے مراتب کمال اور ان مراتب کے حاصل کرنے والوں کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ جب ہم نے اس آیت پر تدبر کیا اور اپنے فکر کو انتہا تک پہنچایا تو اس بات کا انکشاف

فَانْكَشَفَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اَكْبَرُ شَوَاهِدِ كَمَالَاتِ الصِّدِّيْقِ وَفِيْهَا سِرٌّ عَمِيْقٌ يَّنْكَشِفُ عَلٰى كُلِّ مَنْ يَّتَمَايَلُ عَلَى التَّحْقِيْقِ فَاِنَّ اَبَابَكْرٍ سُمِّيَ صِدِّيْقًا عَلٰى لِسَانِ الرَّسُوْلِ الْمَقْبُوْلِ وَالْفُرْقَانُ اَلْحَقُّ الصِّدِّيْقِيْنَ بِالْاَنْبِيَآءِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى ذَوِی الْعُقُوْلِ وَلَا نَجِدُ اِطْلَاقَ هٰذَا اللَّقَبِ وَالْخِطَابِ عَلٰى اَحَدٍ مِّنَ الْاَصْحَابِ فَثَبَتَ فَضِيْلَةُ الصِّدِّيْقِ الْاَمِيْنِ۔ فَاِنَّ اسْمَهٗ ذُكِرَ بَعْدَ النَّبِيّٖنَ فَانْظُرْ بِالْاِنَابَةِ وَفَارِقْ غِشَاوَةَ الْاِسْتِرَابَةِ۔ (سرّ الخلافۃ صفحہ ۳۳)

۷۹ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝

یعنی جس جگہ تم ہو اُسی جگہ موت تمہیں پکڑے گی اگرچہ تم بڑے مرتفع برجوں میں بود و باش اختیار کرو۔ اس آیت سے بھی صریح ثابت ہوتا ہے کہ موت اور لوازم موت ہر یک جگہ جسم خاکی پر وارد ہو جاتے ہیں یہی سنت اللہ ہے اور اس جگہ بھی استثناء کے طور پر کوئی ایسی عبارت بلکہ ایک ایسا کلمہ بھی نہیں لکھا گیا ہے جس سے مسیح باہر رہ جاتا پس بلاشبہ یہ اشارۃ النص بھی مسیح ابن مریم کی موت پر دلالت کر رہے ہیں موت کے تعاقب سے مراد زمانہ کا اثر ہے جو ضعف اور پیری یا امراض و آفات منجرہ الی الموت تک پہنچاتا ہے اس سے کوئی نفس مخلوق خالی نہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۲۲)

۸۲ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ

ہوا کہ یہ آیت کمالات صدیقیہ کے بڑے شواہد میں سے ہے اور اس میں ایک گہرا راز ہے اور وہ ہر اس شخص پر ظاہر ہوتا ہے جو تحقیق کی طرف مائل ہو۔ پس حضرت ابوبکرؓ کا نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صدیق رکھا گیا۔ اور قرآن کریم نے صدیقوں کو انبیاء کے ساتھ ملایا ہے جیسا کہ یہ بات کسی عقلمند پر مخفی نہیں اور ہم صدیق کے لقب اور خطاب کا اطلاق صحابہ میں سے کسی اور پر نہیں پاتے پس اس سے اس صدیق امین کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کا نام نبیوں کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ پس تو پوری توجہ سے دیکھ اور شک کے پردوں کو پھاڑ ڈال۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۳۳)

غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا یعنی خدا اپنے کاموں کا آپ ہی وکیل ہے کسی دوسرے کو پوچھ پوچھ کر احکام جاری نہیں کرتا۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۴)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝

فَاَشَارَ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ اَنَّ الْاِخْتِلَافَ لَا یُوْجَدُ فِی الْقُرْاٰنِ وَهُوَ کِتَابُ اللّٰهِ وَشَانُهٗ اَرْفَعُ مِنْ هٰذَا وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ کِتَابَ اللّٰهِ مُنَزَّهٌ عَنِ الْاِخْتِلَافَاتِ فَوَجَبَ عَلَیْنَا اَنْ لَّا نَخْتَارَ فِیْ تَفْسِیْرِهٖ طَرِیْقًا یُّوْجِبُ التَّعَارُضَ وَالتَّنَاقُضَ۔ (حمامۃ البشریٰ حاشیۃ المتعلقہ بصفحہ ۵۶ سطر آخر کتاب)

یعنی کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر وہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پایا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں قرآن شریف کی نسبت خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اس میں اختلاف نہیں تو اس زمانہ کے لوگوں کا حق تھا کہ اگر ان کے نزدیک کوئی اختلاف تھا تو وہ پیش کرتے۔ مگر سب ساکت ہو گئے اور کسی نے دم نہ مارا اور اختلاف کیونکر اور کہاں سے ممکن ہے جس حالت میں تمام احکام ایک ہی مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں یعنی علمی اور عملی رنگ میں اور درشتی اور نرمی کے پیرایہ میں خدا کی توحید پر قائم کرنا اور ہوا و ہوس چھوڑ کر خدا کی توحید کی طرف کھینچنا یہی قرآن کا مدعا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۹۰)

اگر وحی نبوت میں کبھی کچھ بیان ہو اور کبھی کچھ تو اس سے امان اٹھ جاتا ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۶۲)

جو لوگ قصص اور ہدایات میں تمیز نہیں کرتے اُن کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قرآن کریم میں اختلاف ثابت کرنے کے موجب ہوتے ہیں اور گویا اپنی عملی صورت میں قرآن کریم کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں کیونکہ قرآن شریف کی نسبت

(ترجمہ) اس آیت میں (اللہ تعالیٰ نے) اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن مجید میں اختلاف نہیں پایا جاتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ کی شان ایسے امور سے بالا ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید اختلافات سے پاک ہے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کی تفسیر کرتے وقت ہم کوئی ایسا طریق اختیار نہ کریں جو تعارض و تناقض کا موجب ہو۔ (حمامۃ البشریٰ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۶ صفحہ ۱۰ آخر کتاب)

تو خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ اور عدم اختلاف اُس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ٹھہرائی گئی ہے لیکن یہ ناعاقبت اندیش قصص اور ہدایات میں تمیز نہ کرنے کی وجہ سے اختلاف پیدا کر کے اُس کو من عند غیر اللہ ٹھیراتے ہیں افسوس اُن کی دانش پر!!! (الحکم جلد ۴ ۲۶ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

(النساء: ۸۶) مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا۔ اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (پیغام صلح صفحہ ۵)

(النساء: ۸۷) وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○

اور سلام کا جواب احسن طور پر دے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

اور اگر کوئی تمہیں سلام کہے تو اس سے بہتر اور نیک تر اس کو سلام کہو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۶)

(النساء: ۹۴) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○

یعنی جو شخص کہ ایک مومن کو بلا کسی کافی عذر کے قتل کر دے پس اس کی سزا جہنم ہے ...... اور یہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے شخص پر میرا غضب نازل ہوگا پس خدا کے غضب سے اور کونسی چیز ہے جو خطرناک ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

(النساء: ۹۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

قرآن شریف نے تو نکتہ چینی کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ یعنی تم بھی تو ایسے ہی تھے خدا نے تم پر احسان کیا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۹۶ لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"قاعدین یعنی سست اور معمولی حیثیت کے لوگ اور خدا کی راہ میں کوشش اور سعی کرنے والے ایک برابر نہیں ہوتے۔ یہ تجربہ کی بات ہے اور سالہا سال سے دراز سے ایسا ہی دیکھنے میں آرہا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۱۰۱ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے کہ نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں لیکن میں کہتا ہوں کہ نہ صرف نبی بلکہ بجز اپنے وطن کے کوئی راست باز بھی دُوسری جگہ ذلّت نہیں اُٹھاتا اور اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے ..... جو شخص اطاعت الٰہی میں اپنے وطن کو چھوڑے تو خدائے تعالیٰ کی زمین میں ایسے آرام گاہ پائے گا جن میں بلا حرج دینی خدمت بجا لا سکے۔

(عام اطلاع صفحہ ج مشمولہ شحنہ حق روحانی خزائن)

اسباب کیا شے ہیں کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری راہ میں جاؤ گے تو مُرَاغَمًا کَثِیْرًا پاؤ گے صحت نیت سے جو قدم اُٹھاتا ہے خدا اس کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ انسان اگر بیمار ہو تو اس کی بیماری دور ہو جاتی ہے۔

(البدر جلد ۲ ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵)

۱۰۲ وَاِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوۃِ ٭ۖ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَکُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ اِنَّ الۡکٰفِرِیۡنَ کَانُوۡا لَکُمۡ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ۝

فرمایا جو شخص تین دن کے واسطے یہاں آوے اس کے واسطے قصر جائز ہے۔ میری دانست میں جس سفر میں عزم سفر ہو پھر خواہ وہ تین چار کوس ہی کا سفر کیوں نہ ہو اس میں قصر جائز ہے۔ یہ ہماری سیر سفر نہیں ہے۔ ہاں اگر امام مقیم ہو تو اس کے پیچھے پوری ہی نماز پڑھنی پڑے گی۔ حکام کا دورہ سفر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے باغ کی سیر کرتا ہے۔ خواہ نخواہ قصر کرنے کا تو کوئی وجود نہیں۔ اگر دوروں کی وجہ سے انسان قصر کرنے لگے تو پھر یہ دائمی قصر ہو گا جس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ حکام کہاں مسافر کہلا سکتے ہیں سعدی نے بھی کہا ہے۔ ؎

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست ٭ ہر جا کہ رفت خیمہ زد وخوابگاہ ساخت

(الحکم جلد ۷ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جو شخص رات دن دورہ پر رہتا ہے اور اسی بات کا ملازم ہے۔ وہ حالت دورہ میں مُسافر نہیں کہلا سکتا۔ اس کو پوری نماز پڑھنی چاہیئے۔ (بدر جلد ۶ ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

سفر تو وہ ہے جو ضرورتاً گاہے گاہے ایک شخص کو پیش آوے نہ یہ کہ اُس کا پیشہ ہی یہ ہو کہ آج یہاں کل وہاں۔ اپنی تجارت کرتا پھرے۔ یہ تقویٰ کے خلاف ہے کہ ایسا آدمی آپ کو مسافروں میں شامل کر کے ساری عمر نماز قصر کرنے میں ہی گزار دے۔ (بدر جلد ۶ ۱۳ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

مرض کی حالت میں قصر نماز نہیں چاہیئے البتہ اگر طاقت کھڑے ہونے کی نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔
(مکتوبات جلد ۵ نمبر ۵ ص ۱۲۵ مکتوب بنام حضرت منشی حبیب الرحمن صاحبؓ)

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝

پنجگانہ نمازیں کیا چیز ہیں وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے۔ تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیر ہیں جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں اور تمہاری فطرت کے لیے اُن کا وارد ہونا ضروری ہے۔

(۱) پہلے جبکہ تم مُطلع کیے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے۔ مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہُوا۔ یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلّی اور خوشحالی میں خلل ڈالا۔ سو یہ حالت زوال کے وقت سے مشابہ ہے کیونکہ اِس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہُوا۔ اس کے مقابل پر نماز ظہر متعین ہوئی جس کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا تغیر اُس وقت تم پر آتا ہے جبکہ تم بلا کے محل سے بہت نزدیک کیے جاتے ہو۔ مثلاً جبکہ تم بذریعہ وارنٹ گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے پیش ہوتے ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارا خوف سے خون خشک ہو جاتا ہے اور تسلّی کا نور تم سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے۔ سو یہ حالت تمہاری اُس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب سے نور کم ہو جاتا ہے اور نظر اُس پر جم سکتی ہے اور صریح نظر آتا ہے کہ اب اس کا غروب نزدیک ہے۔ اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز عصر مقرر ہوئی۔

(۳) تیسرا تغیر تم پر اُس وقت آتا ہے۔ جو اس بلا سے رہائی پانے کی بکلّی اُمید منقطع ہو جاتی ہے۔ مثلاً جیسے تمہارے نام فرد قرار داد جرم لکھی جاتی ہے اور مخالفانہ گواہ تمہاری ہلاکت کے لیے گذر جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارے حواس خطا ہو جاتے ہیں اور تم اپنے تئیں ایک قیدی سمجھنے لگتے ہو۔ سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور تمام امیدیں دن کی روشنی کی ختم ہو جاتی ہیں اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز مغرب مقرر ہے

(۴) چوتھا تغیر اس وقت تم پر آتا ہے۔ کہ جب بلا تم پر وارد ہی ہو جاتی ہے اور اس کی سخت تاریکی تم پر احاطہ کر لیتی ہے۔ مثلاً جبکہ فرد قرار داد جرم اور شہادتوں کے بعد حکم سزا تم کو سنایا جاتا ہے اور قید کے لیے ایک پولس مین

کے تم حوالہ کیے جاتے ہو۔ سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے۔ جبکہ رات پڑ جاتی ہے اور ایک سخت اندھیرا پڑ جاتا ہے۔ اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز عشا مُقرر ہے۔

(۵) پھر جبکہ تم ایک مدت تک اُس مصیبت کی تاریکی میں بسر کرتے ہو۔ تو پھر آخر خدا کا رحم تم پر جوش مارتا ہے اور تمہیں اُس تاریکی سے نجات دیتا ہے۔ مثلاً جیسے تاریکی کے بعد پھر آخر کار صبح نکلتی ہے اور پھر وہی روشنی دن کی اپنی چمک کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔ سو اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز فجر مقرر ہے اور خدا نے تمہارے فطرتی تغیرات میں پانچ حالتیں دیکھ کر پانچ نمازیں تمہارے لیے مقرر کیں۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو۔ کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدہ کے لیے ہیں پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچے رہو۔ تو پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہارے اندرونی اور روحانی تغیرات کا ظل ہیں۔ نماز میں آنے والی بلاؤں کا علاج ہے۔ تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کس قسم کے قضا و قدر تمہارے لیے لائے گا۔ پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولیٰ کی جناب میں تضرّع کرو کہ تمہارے لیے خیر و برکت کا دن چڑھے۔ (کشتی نوح صفحہ ۶۳۔ ۶۵)

خدا نے اپنے قانون قدرت میں مصائب کو پانچ قسم پر منقسم کیا ہے۔ یعنی آثار مصیبت کے جو خوف دلاتے ہیں۔ اور پھر مصیبت کے اندر قدم رکھنا۔ اور پھر ایسی حالت جب نومیدی پیدا ہوتی ہے اور پھر زمانہ تاریک مصیبت کا۔ اور پھر صبح رحمت الٰہی کی یہ پانچ وقت ہیں جن کے نمونہ پانچ نمازیں ہیں۔ (پیغام صلح صفحہ ۳۵ و براہین احمدیہ حصہ پنجم زیادداشتیں صفحہ ۳)

یاد رکھو کہ یہ جو پانچ وقت نماز کے لیے مقرر ہیں۔ یہ کوئی تحکّم اور جبر کے طور پر نہیں بلکہ اگر غور کرو تو یہ دراصل روحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ[1]۔ یعنی قایم کرو نماز کو دلوک الشمس سے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہاں قیام صلوٰۃ کو دلوک شمس سے لیا ہے۔ دلوک کے معنوں میں گو اختلاف ہے۔ لیکن دوپہر کے ڈھلنے کے وقت کا نام دلوک ہے۔ اب دلوک سے لیکر پانچ نمازیں رکھ دیں۔ اس میں حکمت اور ستر کیا ہے۔ قانون قدرت دکھاتا ہے کہ روحانی تذلل اور انکسار کے مراتب بھی دلوک ہی سے شروع ہوتے ہیں۔ اور پانچ ہی حالتیں آتی ہیں پس یہ طبعی نماز بھی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حزن اور ہم و غم کے آثار شروع ہوتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ انسان پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے تو کس قدر تذلل اور انکساری کرتا ہے۔ اب اُس وقت اگر زلزلہ آوے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ طبیعت میں کیسی رقت اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر سوچو کہ اگر مثلاً کسی شخص پر نالش ہو تو سمن یا وارنٹ آنے پر اُس کو معلوم ہوگا کہ فلاں دفعہ فوجداری یا دیوانی میں نالش ہوئی ہے۔ اب بعد مطالعہ وارنٹ اُس کی حالت میں گویا نصف النہار کے بعد زوال شروع ہوا۔ کیونکہ وارنٹ یا سمن تک تو اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اب خیال پیدا ہوا کہ خدا جانے ادھر وکیل ہو یا کیا ہو؟ اس قسم کے ترددات اور تفکرات سے جو زوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہی حالت دلوک ہے۔ اور یہ پہلی حالت ہے جو نماز ظہر کے قایم مقام ہے۔ اور اُس کی

[1] بنی اسرائیل آیت ۷۹

عکسی حالت نماز ظہر ہے۔ اب دوسری حالت اس پر وہ آتی ہے جبکہ وہ کمرۂ عدالت میں کھڑا ہو۔ فریق مخالف اور عدالت کی طرف سے سوالات جرح ہو رہے ہیں۔ اور وہ ایک عجیب حالت ہوتی ہے یہ وہ حالت اور وقت ہے جو نماز عصر کا نمونہ ہے۔ کیونکہ عصر گھونٹنے اور نچوڑنے کو کہتے ہیں۔ جب حالت اور بھی نازک ہو جاتی ہے اور فرد قرارداد جرم لگ جاتی ہے تو یاس اور نا امیدی بڑھتی ہے کیونکہ اب خیال ہوتا ہے کہ سزا مل جاوے گی۔ یہ وہ وقت ہے جو مغرب کی نماز کا عکس ہے۔ پھر جب حکم سنایا گیا اور کنسٹیبل یا کورٹ انسپکٹر کے حوالہ کیا گیا تو وہ روحانی طور پر نماز عشا کی عکسی تصویر ہے یہاں تک کہ نماز کی صبح صادق ظاہر ہوئی۔ اور اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا[1] کی حالت کا وقت آگیا تو روحانی نماز فجر کا وقت آگیا۔ اور فجر کی نماز اُس کی عکسی تصویر ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۶-۱۶۷)

نماز بھی ظہر ہی سے شروع ہوتی ہے جو زوال کا وقت ہے یہاں تک کہ غروب تک بالکل تاریکی میں جا پڑتا ہے اور رات میں دعائیں کرتا ہے یہاں تک کہ صبح میں سے جا حصہ لیتا ہے نماز کی تقسیم بھی بتاتی ہے کہ خدا نے اس تقسیم میں ایک صبح اور باقی چار ایسی رکھی ہیں جو تاریکی سے حصہ رکھتی ہیں ورنہ ممکن تھا کہ اقبال تک ختم ہو جاتا ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

میں طبعاً اور فطرتاً اس کو پسند کرتا ہوں کہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جاوے۔ اور نماز موقوتہ کے مسئلہ کو بہت ہی عزیز رکھتا ہوں بلکہ سخت مطر میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جاوے اگرچہ شیعوں نے اور غیر مقلدوں نے اس پر بڑے بڑے مباحثے کیے ہیں مگر ہم کو ان سے کوئی غرض نہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

لوگ زمانہ جاہلیت میں گالیوں کے واسطے یہ انگلی اٹھایا کرتے تھے اس لیے اس کو سبابہ کہتے ہیں یعنی گالی دینے والی خدا تعالیٰ نے عرب کی اصلاح فرمائی اور وہ عادت ہٹا کر فرمایا کہ خدا کو واحد لاشریک کہتے وقت یہ انگلی اٹھایا کرو تاکہ اس سے وہ الزام اُٹھ جاوے۔ ایسے ہی عرب کے لوگ پانچ وقت شراب پیتے تھے اس کے عوض میں پانچ وقت نماز رکھی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۶)

ارکان نماز دراصل روحانی نشست و برخواست کے ہیں۔ انسان کو خدا تعالیٰ کے روبرو کھڑا ہونا پڑتا ہے اور قیام بھی آداب خدمتگاران میں سے ہے۔ رکوع جو دوسرا حصہ ہے بتلاتا ہے کہ گویا تیاری ہے کہ وہ تعمیل حکم کو کس قدر گردن جھکاتا ہے اور سجدہ کمال ادب اور کمال تذلل اور نیستی کو جو عبادت کا مقصود ہے ظاہر کرتا ہے۔ یہ آداب اور طرق ہیں جو خدا تعالیٰ نے بطور یادداشت کے مقرر کر دئے ہیں اور جسم کو باطنی طریق سے حصہ دینے کی خاطر ان کو مقرر کیا ہے علاوہ ازیں باطنی طریق کے اثبات کی خاطر ایک ظاہری طریق بھی رکھ دیا ہے۔ اب اگر ظاہری طریق میں (جو اندرونی اور باطنی طریق کا ایک عکس ہے) صرف نقال کی طرح نقلیں اتاری جاویں اور اُسے ایک بارگراں سمجھ کر اتار پھینکنے کی کوشش کی جاوے تو تم ہی بتلاؤ۔ اس میں کیا لذت اور حظ آسکتا ہے اور جب تک لذت اور سرور نہ آئے اس کی حقیقت کیونکر متحقق ہو گی

---

[1] الم نشرح: ۷۔ آیت ۷

اور یہ اس وقت ہوگا جب کہ روح بھی ہمہ نیستی اور تذلل تام ہو کر آستانہ الوہیت پر گرے اور جو زبان بولتی ہے روح بھی بولے اس وقت ایک سرور اور نور اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۵)

(نمازوں میں تعداد رکعات کے متعلق فرمایا) اس میں اللہ تعالیٰ نے اور اسرار رکھے ہیں جو شخص نماز پڑھے گا وہ کسی نہ کسی حد پر تو آخر رہے گا ہی اور اسی طرح پر ذکر میں بھی ایک حد تو ہوتی ہے لیکن وہ حد وہی کیفیت اور ذوق و شوق ہوتا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے جب وہ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ بس کر جاتا ہے۔

دوسرے یہ بات حال والی ہے قال والی نہیں جو شخص اس میں پڑتا ہے وہی سمجھ سکتا ہے۔ اصل غرض ذکر الٰہی سے یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کرے اور اُسے اپنے سامنے دیکھتا رہے اس طریق پر وہ گناہوں سے بچا رہے گا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۱ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

۱۰۵ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

(وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ) اور قوم کی ہمدردی میں سرگرم رہو تھکو مت۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۵)

۱۰۶ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝

(وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا) اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے مت جھگڑو (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۵)

۱۰۸ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝

اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے مت جھگڑو جو خیانت کرنے سے باز نہیں آتے خدائے تعالیٰ خیانت پیشہ لوگوں

کو دوست نہیں رکھتا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۵۵)

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُورًا رَّحِيمًا۝

یعنی جس سے کوئی بدعملی ہو جائے یا اپنے نفس پر کسی نوع کا ظلم کرے اور پھر پشیمان ہو کر خدا سے معافی چاہے تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائے گا۔ اِس لطیف اور پُرحکمت عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے لغزش اور گناہ نفوسِ ناقصہ کا خاصّہ ہے جو اُن سے سرزد ہوتا ہے اُس کے مقابلہ پر خدا کا ازلی اور ابدی خاصّہ مغفرت و رحم ہے اور اپنی ذات میں وہ غفور و رحیم ہے یعنی اُس کی مغفرت سرسری اور اتفاقی نہیں بلکہ وہ اُس کی ذات قدیم کی صفتِ قدیم ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور جوہرِ قابل پر اُس کا فیضان چاہتا ہے یعنی جب کبھی کوئی بشر بروقت صدور لغزش و گناہ بہ ندامت و توبہ خدا کی طرف رجوع کرے تو وہ خدا کے نزدیک اِس قابل ہو جاتا ہے کہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ خدا اُس کی طرف رجوع کرے اور یہ رجوعِ الٰہی بندۂ نادم اور تائب کی طرح ایک یا دو مرتبہ میں محدود نہیں بلکہ یہ خدائے تعالیٰ کی ذات میں خاصّہ دائمی ہے اور جب تک کوئی گنہگار توبہ کی حالت میں اُس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ خاصّہ اُس کا ضرور اُس پر ظاہر ہوتا رہتا ہے پس خدا کا قانونِ قدرت یہ نہیں ہے کہ جو ٹھوکر کھانے والی طبیعتیں ہیں وہ ٹھوکر نہ کھاویں یا جو لوگ قُوائے بہیمیہ یا غضبیہ کے مغلوب ہیں اُن کی فطرت بدل جاوے بلکہ اُس کا قانون جو قدیم سے بندھا چلا آتا ہے یہی ہے کہ ناقص لوگ جو بمقتضائے اپنے ذاتی نقصان کے گناہ کریں وہ توبہ اور استغفار کر کے بخشے جائیں لیکن جو شخص بعض قوتوں میں فطرتاً ضعیف ہے وہ قوی نہیں ہو سکتا اِس میں تبدلِ پیدائش لازم آتی ہے اور وہ بداہتاً محال ہے اور خود مشہود و محسوس ہے کہ مثلاً جس کی فطرت میں سریع الغضب ہونے کی خصلت پائی جاتی ہے وہ بطی الغضب ہرگز نہیں بن سکتا بلکہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسا آدمی غضب کے موقعہ پر آثارِ غضب بلا اختیار ظاہر کرتا ہے اور ضبط سے باہر آ جاتا ہے یا کوئی ناگفتنی بات زبان پر لے آتا ہے اور اگر کسی لحاظ سے کچھ صبر بھی کرے تو دل میں تو ضرور پیچ و تاب کھاتا ہے پس یہ احمقانہ خیال ہے کہ کوئی منتر جنتر یا کوئی خاص مذہب اختیار کرنا اُس کی طبیعت کو بدلا دیگا اسی جہت سے اُس نبیٔ معصوم نے جس کی لبوں پر حکمت جاری تھی فرمایا خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ یعنی جو لوگ جاہلیت میں نیک ذات ہیں وہی اسلام میں بھی داخل ہو کر نیک ذات ہوتے ہیں غرض طبایع انسانی جواہر کانی کی طرح مختلف الاقسام ہیں بعض طبیعتیں چاندی کی طرح روشن اور صاف بعض گندھک کی طرح بدبودار اور جلد بھڑکنے والی بعض زیبق کی طرح بے ثبات اور بے قرار بعض لوہے کی طرح سخت اور کثیف۔ اور جیسا یہ اختلافِ طبایع بدیہی الثبوت ہے ایسا ہی انتظام ربانی کے بھی موافق ہے کچھ بے قاعدہ بات

نہیں کوئی ایسا امر نہیں کہ قانون نظام عالم کے برخلاف ہو بلکہ آسائش وآبادی عالم اُسی پر موقوف ہے ظاہر ہے کہ اگر تمام طبیعتیں ایک ہی مرتبہ استعداد پر ہوتیں تو پھر مختلف طور کے کام (جو مختلف طور کی استعدادوں پر موقوف تھے) جن پر دُنیا کی آبادی کا مدار تھا حیز التوا میں رہ جاتے کیونکہ کثیف کاموں کے لیے وہ طبیعتیں مناسب حال ہیں جو کثیف ہیں اور لطیف کاموں کے لیے وہ طبیعتیں مناسبت رکھتی ہیں جو لطیف ہیں یونانی حکیموں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جیسے بعض انسان حیوانات کے قریب قریب ہوتے ہیں اسی طرح عقل تقاضا کرتی ہے کہ بعض انسان ایسے بھی ہوں جن کا جوہر نفس کمال صفوت اور لطافت پر واقعہ ہو۔ تا جس طرح طبایع انسانی کا سلسلہ نیچے کی طرف اس قدر متنزل نظر آتا ہے کہ حیوانات سے جا کر اتصال پکڑ لیا ہے اسی طرح اوپر کی طرف بھی ایسا متصاعد ہو کہ عالم اعلیٰ سے اتصال پکڑ لے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم حاشیہ نمبر ۱۱ صفحہ ۱۷۳-۱۷۵)

﴿وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾

یعنی جو شخص کوئی خطا یا گناہ کرے اور پھر کسی ایسے شخص پر وہ گناہ لگاوے جس پر وہ گناہ ایک ثابت شدہ امر نہیں تو اُس نے ایک کھلے کھلے بہتان اور گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لیا پس اس جگہ خدائے عز و جل نے بری کے لفظ سے اُس شخص کو مراد لیا ہے جس پر کوئی گناہ ثابت نہ ہوا ہو اور اگر کوئی ہمارے اس بیان کی مخالفت کر کے یہ کہے کہ اس جگہ بری کے لفظ سے یہ معنے مراد نہیں ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسے شخص پر گناہ لگاوے جس نے شہادتوں کے ذریعہ سے عدالت میں اپنا بے گناہ ہونا بپایہ ثبوت پہنچایا ہو اور گواہوں کے ذریعہ سے اپنا پاک دامن ہونا ثابت کر دیا ہو تو یہ معنے سراسر فاسد اور قرآن شریف کی منشاء سے صریح مخالف اور ضد ہیں کیونکہ اگر یہی معنے اس آیت کے ہیں تو پھر اس صورت میں یہ بڑی خرابی لازم آتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسے شخص پر تہمت لگانا کوئی گناہ نہ ہو جس پر وہ گناہ ثابت نہیں ہے بلکہ اُسی کی نسبت گناہ ہو جس نے اپنی پاک دامنی پر عدالت میں گواہ دیدئے ہوں اور اپنا بے قصور ہونا بپایہ ثبوت پہنچا دیا ہو اور یہ معنے باتفاق تمام گروہ اسلام باطل ہیں اسی وجہ سے تمام علماء اسلام کے نزدیک ایسے شخص بھی اس آیت کے مواخذہ کے نیچے ہیں جو مستور الحال عورتوں پر زنا کا الزام لگادیں اور گو اُن عورتوں کے اعمال مخفی ہوں مگر اس آیت میں اُن کا نام بری رکھا کیونکہ شرعی طور پر اُن پر جرم کا ثبوت نہیں پس اس نص قرآنی سے ثابت ہوا کہ جس پر شرعی طور پر جرم کا ثبوت نہ ہو وہ بری ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ عرب کی زبان بھی اُس کا نام بری رکھتی ہے کیونکہ قرآن سے بڑھ کر محاورات عرب کے جاننے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں اور اسی آیت کے مفہوم کی موید قرآن شریف کی وہ آیت ہے جو جزو اٹھارہ[۱۸] سورۃ النور کی تیسری آیت ہے اور وہ یہ ہے

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ[۱] یعنی جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور اُس تہمت کے ثابت کرنے کے لیے چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسّی درّے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہ لوگ آپ ہی بدکار ہیں۔ اس جگہ محصنات کے لفظ کے وہی معنے ہیں جو آیت گذشتہ میں بری کے لفظ کے معنے ہیں۔ اب اگر بموجب قول مولوی محمد حسین ایڈیٹر اشاعۃ السنّۃ کے بری کے لفظ کا مصداق صرف وہ شخص ہو سکتا ہے کہ جس پر اول فرد قرار داد جرم لگائی جاوے اور پھر گواہوں کی شہادت سے اس کی صفائی ثابت ہو جائے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں یعنی اگر بری کے لفظ میں جو آیت ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓــًٔا[۲] میں ہے یہی منشا قرآن کا ہے تو کسی عورت پر مثلاً زنا کی تہمت لگانا کوئی جرم نہ ہوگا بجز اس صورت کے کہ اس نے معتمد گواہوں کے ذریعہ سے عدالت میں ثابت کر دیا ہو کہ وہ زانیہ نہیں۔ اور اس سے یہ لازم آئے گا کہ ہزارہا مستورالحال عورتیں جن کی بدچلنی ثابت نہیں حتی کہ نبیوں کی عورتیں اور صحابہ کی عورتیں اور اہل بیت میں سے عورتیں تہمت لگانے والوں سے بجز اس صورت کے مخلصی نہ پاسکیں اور نہ بری کہلانے کی مستحق ٹھہر سکیں جب تک کہ عدالتوں میں حاضر ہو کر اپنی عفت کا ثبوت نہ دیں حالانکہ ایسی تمام عورتوں کی نسبت جن کی بدچلنی ثابت نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے بارِ ثبوت الزام لگانے والوں پر رکھا ہے اور ان کو بری اور محصنات کے نام سے پکارا ہے جیسا کہ اسی آیت ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ سے سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کسی مخالف کو نبیوں کی عورتوں اور ان کے صحابہ کی عورتوں اور تمام شرفا کی عورتوں کی ہماری مخالفت کے لیے کچھ پرواہ نہ ہو تو پھر ذرہ شرم کر کے اپنی عورتوں کی نسبت ہی کچھ انصاف کرے کہ کیا اگر ان پر کوئی شخص ان کی عفت کے مخالف کوئی ایسی تہمت لگاوے جس کا کوئی ثبوت نہیں تو کیا وہ عورتیں آیت یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓــًٔا کی مصداق ٹھہر کر بری سمجھی جاسکتی ہیں اور ایسا تہمت لگانے والا سزا کے لائق ٹھہرتا ہے یا وہ اُس حالت میں بری سمجھی جائیں گی جبکہ وہ اپنی صفائی اور پاکدامنی کے عدالت میں گواہ گذرانیں اور جب تک وہ بذریعہ شہادتوں کے اپنی عفت کا عدالت میں ثبوت نہ دیں تب تک جو شخص چاہیے ان کی عفت پر حملہ کرے اور ان کو غیر بری قرار دے کیا آیت موصوفہ بالا میں یعنی آیت یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓــًٔا میں بری کے لفظ کا یہی منشا ہے کہ اس میں گناہ کا ثابت نہ ہونا کافی نہیں بلکہ بذریعہ قوی شہادتوں کے عفت اور صفائی ثابت ہونی چاہیئے۔ .... اور دوسری قسم بری کی جس میں شخص ملزم اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیتا ہے اس کا نام قرآن شریف میں مبرّء رکھا ہے جیسا کہ فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ[۳]۔ (تریاق القلوب صفحہ ۸۲-۸۳)

زبان عرب اور قرآن شریف کے نصوص صریحہ کے رو سے تمام انسان جو دنیا میں ہیں کیا مرد اور کیا عورت بری کہلانے کے مستحق ہیں جب تک کہ اُن پر کوئی جرم ثابت نہ ہو۔ پس قرآن کے رو سے بری کے معنے ایسے وسیع ہیں کہ جب تک کسی پر کسی

---

[۱] النور آیت ۵ [۲] النساء: ۱۱۳ [۳] النور آیت ۲۷

جرم کا ثبوت نہ ہو وہ بری کہلائے گا کیونکہ انسان کے لیے بری ہونا طبعی حالت ہے اور گناہ ایک عارضہ ہے جو پیچھے سے لاحق ہوتا ہے لہذا اُس کے لیے ثبوت درکار ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۸۴ حاشیہ)

ڈسچارج کا عربی میں ٹھیک ٹھیک ترجمہ بری ہے اور ایکیٹ کا ترجمہ مبرّء ہے عرب کے یہ دو مقولے ہیں کہ اَنَا بَرِیٌّ مِّنْ ذٰلِکَ وَاَنَا مُبَرَّءٌ مِّنْ ذٰلِکَ۔ پہلے قول کے یہ معنے ہیں کہ میرے پر کوئی تہمت ثابت نہیں کی گئی اور دوسرے قول کے یہ معنے ہیں کہ میری صفائی ثابت کی گئی ہے اور قرآن شریف میں یہ دونوں محاورے موجود ہیں چنانچہ بری کا لفظ قرآن شریف میں بعینہٖ ڈسچارج کے معنوں پر بولا گیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا الجزو نمبرہ سورہ نساء یعنی جو شخص کوئی خطا یا کوئی گناہ کرے اور پھر کسی ایسے شخص پر وہ گناہ لگا دے جس پر وہ گناہ ثابت نہیں تو اُس نے ایک کھلے کھلے بہتان اور گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لے لیا اور مبرّء کی مثال قرآن شریف میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ[1] یہ اُس مقام کی آیت ہے کہ جہاں بے لوث اور بے گناہ ہونا ایک کا ایک وقت تک مشتبہ رہا پھر خدا نے اس کی طرف سے ڈیفنس پیش کر کے اس کی بریت کی۔ اب آیت يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا سے بہ بداہت ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسے شخص کا نام بری رکھا ہے جس پر کوئی گناہ ثابت نہیں کیا گیا اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو انگریزی میں ڈسچارج کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مکابرہ کی راہ سے یہ کہے کہ اس جگہ بری کے لفظ سے وہ شخص مراد ہے جو مجرم ثابت ہونے کے بعد اپنی صفائی کے گواہوں کے ذریعہ سے اپنی بریّت ظاہر کرے تو ایسا خیال بدیہی طور پر باطل ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کا بری کے لفظ سے یہی منشاء ہے تو اس سے یہ خرابی پیدا ہو گی کہ اس آیت سے یہ فتویٰ ملے گا کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسے شخص پر جس کا گناہ ثابت نہیں کسی گناہ کی تہمت لگانا کوئی جرم نہیں ہو گا گو وہ مستور الحال شریفوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہی ہو اور صرف یہ کسر ہو کہ ابھی اُس نے بے قصور ہونا عدالت میں حاضر ہو کر ثابت نہیں کیا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا صریح باطل ہے اور اس سے تمام تعلیم قرآن شریف کی زیرو زبر ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں جائز ہو گا کہ جو لوگ مثلاً ایسی مستور الحال عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں جنہوں نے عدالت میں حاضر ہو کر اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ ہر قسم کی بدکاری سے مدت العمر محفوظ رہے ہیں وہ کچھ گناہ نہیں کرتے اور اُن کو روا ہے کہ مستور الحال عورتوں پر ایسی تہمتیں لگایا کریں حالانکہ ایسا خیال کرنا اس مندرجہ ذیل آیت کے رو سے صریح حرام اور معصیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً[2] یعنی جو لوگ ایسی عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں جن کا زنا کار ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ مستور الحال ہیں اگر وہ لوگ چار گواہ سے اپنے اس الزام کو ثابت نہ کریں تو ان کو اسّی درّے مارنے چاہئیں۔ اب دیکھو کہ ان عورتوں کا نام خدا نے بری رکھا ہے جن کا زانیہ ہونا ثابت نہیں۔ پس بری کے لفظ کی یہ تشریح بعینہٖ ڈسچارج کے مفہوم سے مطابق ہے کیونکہ اگر

---

[1] النور آیت ۲۷ [2] النور آیت ۵

بری کا لفظ جو قرآن نے یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا میں استعمال کیا ہے صرف ایسی صورت پر بولا جاتا ہے کہ جبکہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر اس پر فرد قرار داد جرم لگائی جائے اور پھر وہ گواہوں کی شہادت سے اپنی صفائی ثابت کرے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں ہر ایک شریر کو آزادی ہوگی کہ ایسی تمام عورتوں پر زنا کا الزام لگاوے جنہوں نے معتمد گواہوں کے ذریعہ سے عدالت میں ثابت نہیں کر دیا کہ وہ زانیہ نہیں ہیں خواہ وہ رسولوں اور نبیوں کی عورتیں ہوں اور خواہ صحابہ کی اور خواہ اولیاء اللہ کی اور خواہ اہل بیت کی عورتیں ہوں اور ظاہر ہے کہ آیت یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا میں بری کے لفظ سے ایسے معنے کرنے صاف الحاد ہے جو ہرگز خدا تعالیٰ کا منشا نہیں ہے بلکہ بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں بری کے لفظ سے خدا تعالیٰ کا یہی منشاء ہے کہ جو مستور الحال لوگ ہیں خواہ مرد ہیں خواہ عورتیں ہیں جن کا کوئی گناہ ثابت نہیں وہ سب بری کے نام کے مستحق ہیں اور بغیر ثبوت ان پر کوئی تہمت لگانا فسق ہے جس سے خدا تعالیٰ اس آیت میں منع فرماتا ہے اور اگر کسی کو نبیوں اور رسولوں کی کچھ پرواہ نہ ہو اور اپنی ضد سے باز نہ آوے تو پھر ذرا شرم کر کے اپنی عورتوں کی نسبت ہی کچھ انصاف کرے کہ کیا اگر ان پر کوئی شخص ان کی عفت کے مخالف کوئی ایسی ناپاک تہمت لگاوے جس کا کوئی ثبوت نہ ہو تو کیا وہ عورتیں آیت یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا کی مصداق ٹھہر کر بری سمجھی جا سکتی ہیں اور ایسا تہمت لگانے والا سزا کے لائق ٹھہرتا ہے یا وہ محض اس حالت میں بری سمجھی جائیں گی جبکہ وہ اپنی صفائی اور پاک دامنی کے بارے میں عدالت میں گواہ گذرانیں اور جب تک وہ بذریعہ شہادتوں کے اپنی عفت کا عدالت میں ثبوت نہ دیں تب تک جو شخص چاہے ان کی عفت پر حملہ کیا کرے اور ان کو غیر بری قرار دے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ میں بار ثبوت تہمت لگانے والے پر رکھا ہے اور جب تک تہمت لگانے والا کسی گناہ کو ثابت نہ کرے تب تک تمام مردوں اور عورتوں کو بری کہلانے کے مستحق ٹھہرایا ہے۔ پس قرآن اور زبان عرب کے رو سے بری کے معنے ایسے وسیع ہیں کہ جب تک کسی پر کسی جرم کا ثبوت نہ ہو وہ بری کہلائے گا کیونکہ انسان کے لیے بری ہونا طبعی حالت ہے اور گناہ ایک عارضہ ہے جو پیچھے سے لاحق ہوتا ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۳۵-۱۳۷)

﴿۱۱۴﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝

یعنی خدا نے تجھ پر کتاب اُتاری اور حکمت یعنی دلائل حقیت کتاب وحقیت رسالت تجھ پر ظاہر کیے اور تجھے وہ علوم سکھائے جنہیں تو خود بخود جان نہیں سکتا تھا اور تجھ پر اُس کا ایک عظیم فضل ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۶)

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا یعنی تیرے پر خدا کا سب سے زیادہ فضل ہے اور کوئی نبی تیرے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی تعریف بطور پیشگوئی زبور باب ۴۵ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں موجود ہے جیسا کہ فرمایا کہ خدا نے جو تیرا خدا ہے خوشی کے روغن سے تیرے مصاحبوں سے زیادہ تجھے مُعطّر کیا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۲۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یعنی خدا تعالیٰ نے تجھ کو وہ علوم عطا کیے جو تو خود بخود نہیں جان سکتا تھا اور فضل الٰہی سے فیضان الٰہی سب سے زیادہ تیرے پر ہوا یعنی تو معارف الٰہیہ اور اسرار اور علوم ربّانی میں سب سے بڑھ گیا اور خدا تعالیٰ نے اپنی معرفت کے عطر کے ساتھ سب سے زیادہ تجھے معطر کیا۔ غرض علم اور معرفت کو خدا تعالیٰ نے حقیقت اسلامیہ کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اگرچہ حصول حقیقت اسلام کے وسایل اور بھی ہیں جیسے صوم وصلوٰۃ اور دُعا اور تمام احکام الٰہی جو چھ سو سے بھی کچھ زیادہ ہیں لیکن علم عظمت ووحدانیت ذات اور معرفت شیون وصفات جلالی وجمالی حضرت باری عزّ اسمہٗ وسیلۃ الوسایل اور سب کا موقوف علیہ ہے کیونکہ جو شخص غافل دل اور معرفت الٰہی سے بکلّی بے نصیب ہے۔ وہ کب توفیق پا سکتا ہے کہ صوم اور صلوٰۃ بجالاوے یا دُعا کرے یا اور خیرات کی طرف مشغول ہو۔ اِن سب اعمال صالح کا محرک تو معرفت ہی ہے اور یہ تمام دوسرے وسایل دراصل اسی کے پیدا کردہ اور اُسی کے بنین وبنات ہیں اور ابتدا اِس معرفت کی پرتوہ اسم رحمانیت سے ہے نہ کسی عمل سے نہ کسی دُعا سے بلکہ بلا علت فیضان سے صرف ایک موہبت ہے۔ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ[1] مگر پھر یہ معرفت اعمال صالحہ اور حسن ایمان کے شمول سے زیادہ ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر الہام اور کلام الٰہی کے رنگ میں نزول پکڑ کر تمام صحن سینہ کو اُس نور سے منوّر کر دیتی ہے جس کا نام اسلام ہے اور اِس معرفت تامہ کے درجہ پر پہنچ کر اسلام صرف لفظی اسلام نہیں رہتا بلکہ وہ تمام حقیقت اُس کی جو ہم بیان کر چکے ہیں حاصل ہو جاتی ہے اور انسانی روح نہایت انکسار سے حضرت احدیت میں اپنا سر رکھ دیتی ہے تب دونوں طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ جو میرا سو تیرا ہے یعنی بندہ کی روح بھی بولتی ہے اور اقرار کرتی ہے کہ یا الٰہی جو میرا ہے سو تیرا ہے۔ اور خدا تعالیٰ بھی بولتا ہے اور بشارت دیتا ہے کہ اے میرے بندے جو کچھ زمین وآسمان وغیرہ میرے ساتھ ہے وہ سب تیرے ساتھ ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۸۶-۱۸۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کا بہت بڑا فضل تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ اور اصل یہ ہے کہ انسان بچتا بھی فضل سے ہی ہے۔ پس جس شخص پر خدا تعالیٰ کا فضل عظیم ہو۔ اور جس کو کل دنیا کے لیے مبعوث کیا گیا ہو اور جو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہو کر آیا ہو۔ اس کی عصمت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ عظیم الشان بلندی پر جو شخص کھڑا ہے ایک نیچے کھڑا ہوا اُس کا مقابلہ کیا کر سکتا ہے۔ مسیح کی ہمت اور دعوت صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں تک محدود ہے۔ پھر اس کی عصمت کا درجہ بھی اسی حد تک ہونا چاہیئے۔ لیکن جو شخص کُل عالم کی نجات اور رستگاری کے واسطے آیا

---

[1] النحل آیت ۹۴

ہے ایک دانشمند خود سوچ سکتا ہے کہ اس کی تعلیم کیسی عالمگیر صداقتوں پر مشتمل ہوگی اور اسی لیے وہ اپنی تعلیم اور تبلیغ میں کس درجہ کا معصوم ہوگا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

حقیقت یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی فضیلت ہے جو کسی نبی میں نہیں ہے میں اس کو عزیز رکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کو جو شخص بیان نہیں کرتا وہ میرے نزدیک کافر ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ہم قرآن سے کیا۔ بلکہ کل کتابوں سے دکھا سکتے ہیں۔ کہ جس قدر اخلاق اور خوبیاں کل انبیاء میں تھیں۔ وہ سب کی سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع تھیں۔ کَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

۱۲۳ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ۝

یعنی خدا مومنینِ صالحین کو ہمیشہ کی بہشت میں داخل کریگا خدا کی طرف سے یہ سچا وعدہ ہے اور خدا سے زیادہ تر سچا اپنی باتوں میں اَور کون ہے۔ اب خود منصف ہو کر بتلاؤ کہ کیا اس صریح وعدہ سے صرف اپنے ہی دل کے خیالات برابر ہو سکتے ہیں کیا کبھی یہ دونوں صورتیں یکساں ہو سکتی ہیں کہ ایک کو ایک راستباز کسی قدر مال دینے کا اپنی زبان سے وعدہ کرے اور دوسرے کو وہ راستباز اپنی زبان سے کچھ بھی وعدہ نہ کرے کیا مُبشّر اور غیر مُبشّر دونوں برابر ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں اب اپنے ہی دل میں سوچو کہ زیادہ صاف اور کُھلا ہوا اور باطمینان وہ کام ہے کہ جس میں خدا کی طرف سے نیک اجر دینے کا وعدہ ہو یا وہ کام کہ جو فقط اپنے ہی دل کا منصوبہ ہو اور خدا کی طرف سے خاموشی ہو کون دانا ہے کہ جو وعدہ کو غیر وعدہ سے بہتر نہیں جانتا کونسا دل ہے جو وعدہ کے لیے نہیں تڑپتا اگر خدا کی طرف سے ہمیشہ چُپ چاپ ہی ہو تو پھر اگر خدا کی راہ میں کوئی محنت بھی کرے تو کس بھروسہ پر۔ کیا وہ اپنے ہی تصورات کو خدا کے وعدے قرار دے سکتا ہے ہرگز نہیں جس کا ارادہ ہی معلوم نہیں کہ وہ کونسا بدلہ دیگا اور کیونکر دیگا اور کب تک دیگا اُس کے کام پر کون خود بخود پختہ اُمید کر سکتا ہے اور نااُمیدی کی حالت میں کیونکر محنتوں اور کوششوں پر دل لگا سکتا ہے انسان کی کوششوں کو حرکت دینے والے اور انسان کے دل میں کامل جوش پیدا کرنے والے خدا کے وعدے ہیں اُنہیں پر نظر کر کے عقلمند انسان اس دُنیا کی محبّت کو چھوڑتا ہے اور ہزاروں پیوندوں اور تعلقوں اور زنجیروں سے خدا کے لیے الگ ہو جاتا ہے وہی وعدے ہیں کہ جو ایک آوہ حرص و ہوا کو ایکبارگی خدا کی طرف

کھینچ لاتے ہیں جس سے کہ ایک شخص پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ خدا کا کلام برحق ہے اور اُس کا ہر یک وعدہ ضرور ایک دن ہونے والا ہے تو اُسی وقت دُنیا کی محبت اُس پر سرد ہو جاتی ہے ایک دم میں وہ کچھ اَور ہی چیز ہو جاتا ہے اور کسی اَور ہی مقام پر پہنچ جاتا ہے خلاصہ کلام یہ کہ کیا ایمان کے رو سے اور کیا عمل کے رو سے اور کیا جزا سزا کی اُمید کے رو سے کھلا ہوا اور مفتوح دروازہ خدا کے سچے الہام اور پاک کلام کا دروازہ ہے وبس۔

کلامِ پاکِ آں بیچوں دہد صد جامِ عرفاں را — کسے کو بےخبر زاں می چہ داند ذوقِ ایماں را
نہ چشم است آنکہ در کوری ہمہ عمرے بسر کردست — نہ گوش ست آنکہ نہ شنیدست گاہے قولِ جاناں را

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۲-۲۰۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

النساء:۱۲۷ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا۝

خدا وہ ہے جو ہر یک چیز پر احاطہ کر رہا ہے۔ کیا ایسی پاک اور کامل (کتاب) کی نسبت کوئی عقلمند شبہ کر سکتا ہے کہ اُس نے خدا کو جسم اور جسمانی ٹھیرا کر بزمرۂ عالمین داخل کر دیا ہے۔ مگر جو کچھ ویدوں پر وارد ہوتا ہے ہم نہیں جانتا کہ آریہ لوگ اُس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔ (شحنہ حق صفحہ ۵۵)

یعنی خدا ہر ایک چیز پر احاطہ کرنے والا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۱)

النساء:۱۲۹ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۝

(اَلصُّلْحُ خَيْرٌ) صلح میں خیر ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۰)

قرآن شریف میں آیا ہے۔ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ۔ اس لیے اگر آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے۔ تو صلح کر لینی چاہیئے کیونکہ اس میں خیر اور برکت ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ غیر مذاہب کے ساتھ بھی یہ بات رکھی جائے بلکہ ان کے ساتھ سخت مذہبی عداوت

رکھنا چاہیئے جب تک مذہب کی غیرت نہ ہو۔ انسان کا مذہب ٹھیک نہیں ہوتا۔ اب یہ جو ہندو عیسائی ہمارے آنحضرت کو گالیاں نکالتے ہیں تو کیا ہم ان کے ساتھ صلح رکھ سکتے ہیں بلکہ ان کی محفلوں میں بیٹھنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اور ان کے گھروں میں جانا تو معصیت میں داخل ہے۔ ہاں آپس میں جو ایک فرقہ میں ہوں تو لڑائی جھگڑا کی زیادہ تر بنیاد بدظنی ہوتی ہے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

۱۳۶- يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ اور چاہیئے کہ ہر ایک گواہی تمہاری خدا کے لیے ہو۔ جھوٹ مت بولو اگرچہ سچ بولنے سے تمہاری جانوں کو نقصان پہنچے یا اس سے تمہارے ماں باپ کو ضرر پہنچے اور قریبیوں کو جیسے بیٹے وغیرہ کو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۳)

(عیسائیوں کا) ایک یہ اعتراض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے اور اپنے دین کو چھپا لینے کے واسطے قرآن میں صاف حکم دے دیا ہے مگر انجیل نے ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

اما الجواب واضح ہو کہ جسقدر راستی کے التزام کے لیے قرآن شریف میں تاکید ہے میں ہرگز باور نہیں کر سکتا کہ انجیل میں اُس کا عشر عشیر بھی تاکید ہو۔ بیس برس کے قریب عرصہ ہو گیا کہ میں نے اسی بارہ میں ایک اشتہار دیا تھا اور قرآنی آیات لکھ کر اور عیسائیوں وغیرہ کو ایک رقم کثیر بطور انعام دینا کر کے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ جیسے ان آیات میں راست گوئی کی تاکید ہے اگر کوئی عیسائی اس زور و شور کی تاکید انجیل میں سے نکال کر دکھلا دے تو اس قدر انعام اُس کو دیا جائے گا مگر پادری صاحبان اب تک ایسے چُپ رہے گویا اُن میں جان نہیں اب مدت کے بعد فتح مسیح صاحب کفن میں سے بولے شاید بوجہ امتداد زمانہ ہمارا وہ اشتہار اُن کو یاد نہیں رہا پادری صاحب آپ خس و خاشاک کو سونا بنانا چاہتے ہیں اور سونے کی کان سے مُنہ مروڑ کر ادھر اُدھر بھاگتے ہیں اگر یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے قرآن شریف نے دروغ گوئی کو بُت پرستی کے برابر ٹھیرایا ہے جیسا کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ[1] یعنی بتوں کی پلیدی اور جھوٹ کی پلیدی سے پرہیز کرو اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ (الجزو نمبر ۵) یعنی اے ایمان والو انصاف اور راستی پر قائم ہو جاؤ اور سچی گواہیوں کو لِلّٰہ ادا کرو اگرچہ تمہاری جانوں پر اُن کا ضرر پہنچے یا تمہارے ماں باپ اور تمہارے اقارب اُن گواہیوں سے نقصان اُٹھاویں اب اے ناخدا ترس ذرا انجیل کو کھول اور ہمیں بتلا کہ راست گوئی کے لیے ایسی تاکید انجیل میں کہاں ہیں۔

(نور القرآن ۲ صفحہ ۱۷-۱۸)

(النساء:۱۳۷) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ۝

اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول پر اور اُس کی اس کتاب پر جو اس رسول پر نازل ہوئی ہے یعنی قرآن شریف پر اور اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو پہلے نازل ہوئی یعنی توریت وغیرہ پر اور جو شخص خدا پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لائے گا وہ حق سے بہت دور جا پڑا یعنی نجات سے محروم رہا۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۶)

(النساء:۱۴۲) الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ ۚ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ ۖ وَاِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ۝

لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا یعنی خدائے تعالیٰ ہرگز کافروں کو مومنوں پر راہ نہیں دے گا۔ سو دیکھو خدائے تعالیٰ نے قرآن کریم میں مقابلہ کے وقت مومنوں کو فتح کی بشارت دے رکھی ہے اور خود ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ

[1] الحج آیت ۳۱

مومن کا ہی حامی اور ناصر ہوتا ہے مفتری کا ہرگز ناصر اور حامی نہیں ہو سکتا۔ (آسمانی فیصلہ صفحہ ۲۵ بار سوم ۱۹۰۱ء)

خدائے تعالیٰ...... کا وعدہ ہے کہ مومن بہر حال غالب رہے گا چنانچہ وہ خود فرماتا ہے لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو گا کہ کافر مومن پر راہ پاوے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۹۶)

لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یہ ہرگز نہیں ہو گا کہ کافر مومنوں کو ملزم کرنے کے لیے راہ پاسکیں۔ (شحنہ حق ٹائیٹل پیج صفحہ ۱)

اللہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دیتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے پاک بندوں کو ذلیل نہیں کرتا اور لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا اس کا سچا وعدہ ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

۱۴۶ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝

ذلت صرف اسی کا نام نہیں کہ بر سر بازار کسی کے سر پر جوتے پڑیں بلکہ جو شخص مولوی اور متقی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا منافقانہ چلن اگر ثابت ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اس کی کوئی ذلت نہیں منافق سے ذلیل تر اور کوئی نہیں ہوتا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ (اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۱۲)

یعنی منافق دوزخ کے نیچے کے طبقے میں ڈالے جائیں گے اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ مَا زَنَا زَانٍ وَّهُوَ مُؤْمِنٌ وَّمَا سَرَقَ سَارِقٌ وَّهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی کوئی زانی زنا کی حالت میں اور کوئی چور چوری کی حالت میں مومن نہیں ہوتا۔ پھر منافق نفاق کی حالت میں کیونکر مومن ہو سکتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۵)

اگر مومن کو خاص امتیاز نہ بخشا جائے۔ تو مومنوں کے واسطے جو وعدے ہیں۔ وہ کیونکر پورے ہونگے لیکن جب تک دورنگی اور منافقت ہو۔ تب تک انسان کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۸ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

میں منافقوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یقیناً یاد رکھو منافق کافر سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ کافر میں شجاعت اور قوت فیصلہ تو ہوتی ہے وہ دلیری کے ساتھ اپنی مخالفت کا اظہار کر دیتا ہے۔ مگر منافق میں شجاعت اور قوت فیصلہ نہیں ہوتی وہ چھپاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ اس امت کو منافق نہیں بنانا چاہتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو نفاق سے ڈراتا ہے اور اس طریق زندگی کو بدترین حالت بیان فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کسی پکے مسلمان کی غیرت اور حمیت یہ کب گوارا کر سکتی ہے کہ اپنے معتقدات اور مذہبی مسلمہ پیارے عقاید کے خلاف سُن سکے یا ان کی توہین ہوتے دیکھ سکے۔ یا ایسے لوگوں سے جو اس کے بزرگوں کو جن کو وہ دین کا پیشوا یقین کرتا ہے بُرا کہنے والے یا گالیاں دینے والوں سے سچی محبت اور اتفاق رکھ سکے۔ ہمارے نزدیک تو ایسا انسان جو باایں ہمہ کسی سے محبت ومودت رکھتا ہے دنیا کا کتا اور منافق ہے۔ کیونکہ ایک سچے مسلمان کی غیرت یہ چاہ سکتی ہی نہیں کہ وہ نفاق کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

آیت ۱۴۸

مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا ۝

اگر تم ایمان بھی لاؤ اور شکر گزار بھی بنو کہ تمہاری نجات کے لیے خدا نے آپ ہی ذریعہ مقرر کر دیا تو پھر خدا کو کیا ضرورت جو تمہیں عذاب دے۔ (کشتی نوح ٹائیٹل پیج صفحہ ۱)

یعنی خدا تعالیٰ تمہیں عذاب دیکر کیا کریگا اگر تم شکر گذار اور مومن بن جاؤ گے۔ اس پیشگوئی میں ظاہر فرمایا کہ آنے والا عذاب شکر اور ایمان کے ساتھ دور ہو جائے گا۔ (ایام الصلح صفحہ ۵ حاشیہ)

یعنی خدا نے تم کو عذاب دیکر کیا کرنا ہے اگر تم دیندار ہو جاؤ۔ (الحکم جلد ۶ ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

یہ تو اس کا فضل ہے کہ سوتے ہوؤں کو ایک تازیانہ سے جگا رہا ہے ورنہ اُسے کیا پڑی ہے کہ کسی کو عذاب دیوے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (پ ۶) کہ اگر تم میری راہ اختیار کرو تو تم کو کیوں عذاب ہو۔ (البدر جلد ۲ ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

یعنی اگر تم شکریہ ادا کرو اور ایمان لاؤ تو خدا نے تمہیں عذاب کر کے کیا لینا ہے۔ یہ تمہارے بداعمال ہی تم کو عذاب میں گراتے ہیں۔ بدر جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ۔ (الحکم جلد ۱۱ ۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

یعنی خدا تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور خدا پر ایمان لاؤ اور اس کی عظمت اور سزا کے دن سے ڈرو۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۰-۱۰۱)

آیات ۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ

يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

وہ لوگ جو خدا اور رسول سے منکر ہیں اور ارادہ رکھتے ہیں کہ خدا اور اُس کے رسولوں میں تفرقہ ڈال دیں اور کہتے ہیں کہ بعض پر ہم ایمان لائیں گے اور بعض پر نہیں یعنی صرف خدا کا ماننا یا صرف بعض رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ خدا کے ساتھ رسول پر بھی ایمان لاویں یا سب نبیوں پر ایمان لاویں اور چاہتے ہیں کہ خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر بین بین مذہب اختیار کریں۔ وہی پکّے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب مہیا کر رکھا ہے اور وہ لوگ جو خدا اور رسول پر ایمان لاتے ہیں اور خدا اور اُس کے رسولوں میں تفرقہ نہیں ڈالتے یعنی یہ تفرقہ اختیار نہیں کرتے کہ صرف خدا پر ایمان لاویں مگر اُس کے رسولوں پر ایمان نہ لاویں اور نہ یہ تفرقہ پسند کرتے ہیں کہ بعض رسولوں پر تو ایمان لاویں اور بعض سے برگشتہ رہیں ان لوگوں کو خدا اُن کا اجر دیگا۔

اب کہاں ہیں میاں عبد الحکیم خان مُرتد۔ جو میری اِس تحریر سے مجھ سے برگشتہ ہوگیا۔ چاہیئے کہ اب آنکھ کھول کر دیکھے کہ کس طرح خدا نے اپنی ذات پر ایمان لانا رسولوں پر ایمان لانے سے وابستہ کیا ہے اِس میں یہ راز ہے کہ انسان میں توحید قبول کرنے کی استعداد اُس آگ کی طرح رکھی گئی ہے جو پتھر میں مخفی ہوتی ہے اور رسول کا وجود چقماق کی طرح ہے جو اس پتھر پر ضرب توجہ لگا کر اُس آگ کو باہر نکالتا ہے پس ہرگز ممکن نہیں کہ بغیر رسول کی چقماق کے توحید کی آگ کسی دل میں پیدا ہو سکے توحید کو صرف رسول زمین پر لاتا ہے اور اُسی کی معرفت یہ حاصل ہوتی ہے خدا مخفی ہے اور وہ اپنا چہرہ رسول کے ذریعہ دکھلاتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۰)

یعنی جو لوگ ایسا ایمان لانا نہیں چاہتے جو خدا پر بھی ایمان لاویں اور اُس کے رسولوں پر بھی اور چاہتے ہیں کہ خدا کو اُس کے رسولوں سے علیحدہ کردیں اور کہتے ہیں کہ بعض پر ہم ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں یعنی خدا پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر نہیں یا بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ بین بین راہ اختیار کرلیں

یہی لوگ واقعی طور پر کافر اور پکّے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۹۹)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ یعنی خدا تعالیٰ نے بباعث ان کی بے ایمانیوں کے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیں۔
(جنگ مقدس پرچہ یکم جون ۱۸۹۳ء ص۱)

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

اس آیت میں دونوں جملوں کا جواب ہے اور خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ نہ تو عیسیٰ کی ناجائز ولادت ہے اور نہ وہ صلیب پر مرا بلکہ دھوکے سے سمجھ لیا گیا کہ مر گیا ہے اس لیے وہ مقبول ہے اور اس کا اور نبیوں کی طرح خدا کی طرف رفع ہو گیا ہے۔ اب کہاں ہیں وہ مولوی جو آسمان پر حضرت عیسیٰ کا جسم پہنچاتے ہیں یہاں تو سب جھگڑا ان کی روح کے متعلق تھا جسم سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔ (اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح ص۱۳)

مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ مسیح فوت نہیں ہوا کیا مرنے کے لیے یہی ایک راہ ہے کہ انسان قتل کیا جائے یا صلیب پر کھینچا جائے بلکہ اس نفی سے مدعا اور مطلب یہ ہے کہ توریت استثنا۔ باب ۲۱ آیت ۲۳ میں لکھا ہے کہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے اور یہود جنہوں نے اپنے زعم میں حضرت عیسیٰ کو

پھانسی دیدیا تھا وہ بہ تمسک اِس آیت کے یہ خیال رکھتے تھے کہ مسیح ابن مریم نہ نبی تھا اور نہ مقبول الٰہی کیونکہ وہ پھانسی دیا گیا اور توریت بیان کر رہی ہے کہ جو شخص پھانسی دیا جائے وہ لعنتی ہوتا ہے سو خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ اصل حقیقت ظاہر کر کے اُن کے اِس قول کو رد کرے سو اُس نے فرمایا کہ مسیح ابن مریم درحقیقت مصلوب نہیں ہوا اور نہ مقتول ہوا بلکہ اپنی موت سے فوت ہوا۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۴۶،۳۴۷)

اور یہودی جو خدائے تعالیٰ کی رحمت اور ایمان سے بے نصیب ہو گئے اُس کا سبب اُن کے وہ بُرے کام ہیں جو اُنہوں نے کیے منجملہ اُن کے یہ ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ لو ہم نے اُس مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا جو رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا (یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ رسول اللہ کو قتل کر دیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حضرت مسیح کو رسول جانتے تھے کیونکہ اگر وہ اُس کو سچا رسول جانتے تو سولی دینے کے لیے کیوں آمادہ ہوتے بلکہ یہ قول اُن کا کہ لو ہم نے اِس رسول کو پھانسی دیدیا بطور استہزا کے تھا اور اِس ہنسی ٹھٹھا کی بنا توریت کے اُس قول پر تھی جو لکھا ہے کہ جو پھانسی دیا جائے وہ ملعون ہے یعنی خدائے تعالیٰ کی رحمت اور قُربِ الٰہی سے دور و مہجور ہے اور یہودیوں کے اِس قول سے مدّعا یہ تھا کہ اگر عیسیٰ ابن مریم سچا رسول ہوتا تو ہم اُس کو پھانسی دینے پر ہرگز قادر نہ ہو سکتے کیونکہ توریت بلند آواز سے پُکار رہی ہے کہ مصلوب لعنتی ہوتا ہے) اب قرآن شریف اِس آیت کے بعد فرماتا ہے کہ درحقیقت یہودیوں نے مسیح ابن مریم کو قتل نہیں کیا اور نہ پھانسی دیا بلکہ یہ خیال اُن کے دلوں میں شبہ کے طور پر ہے یقینی نہیں اور خدائے تعالیٰ نے اُن کو آپ ہی شبہ میں ڈال دیا ہے تا اُن کی بیوقوفی اُن پر اور نیز اپنی قادریت اُن پر ظاہر کرے اور پھر فرمایا کہ وہ لوگ جو اس شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ شاید مسیح پھانسی ہی مل گیا ہو اُن کے پاس کوئی یقینی وقطعی دلیل اس بات پر نہیں صرف ایک ظن کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اُنہیں یقینی طور پر اس بات کا علم نہیں کہ مسیح پھانسی دیا گیا بلکہ یقینی امر یہ ہے کہ وہ فوت ہو گیا اور اپنی طبعی موت سے مرا اور خدائے تعالیٰ نے اُس کو راست باز بندوں کی طرح اپنی طرف اُٹھا لیا اور خدا عزیز ہے ان کو عزت دیتا ہے جو اُس کے ہو رہتے ہیں اور حکیم ہے اپنی حکمتوں سے اُن لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جو اُس پر توکل کرتے ہیں اور پھر فرمایا کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو ہمارے اِس بیان مذکورہ بالا پر جو ہم نے اہل کتاب کے خیالات کی نسبت ظاہر کیا ہے ایمان نہ رکھتا ہو قبل اس کے جو وہ اس حقیقت پر ایمان لا دے جو مسیح اپنی طبعی موت سے مر گیا یعنی ہم جو پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کوئی اہل کتاب اس بات پر دلی یقین نہیں رکھتا کہ درحقیقت مسیح مصلوب ہو گیا ہے کیا عیسائی اور کیا یہودی صرف ظن اور شُبہ کے طور پر اُن کے مصلوب ہونے کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا بیان صحیح ہے کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں اُس کی موت کے بارہ میں اُنہیں خبر نہیں کہ وہ کب مرا سو اُس کی ہم خبر دیتے ہیں کہ وہ مر گیا اور اُس کی روح عزت کے ساتھ ہماری طرف اُٹھائی گئی۔

اِس جگہ یاد رہے کہ خدائے تعالیٰ کا یہ کہنا کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں کہ ہمارے اِس بیان پر جو اُن کے خیالات کے بارہ میں ہم نے ظاہر کیا ایمان نہ رکھتا ہو یہ ایک اعجازی بیان ہے اور یہ اس آیت کے موافق ہے جیسا کہ یہودیوں کو فرمایا

تھا فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔[1] سو اس فرمانے سے مدعا یہ تھا کہ درحقیقت یہودیوں کا یہ بیان کہ ہم نے درحقیقت مسیح کو پھانسی دیدیا جس سے یہ نتیجہ نکالنا منظور تھا کہ نعوذ باللہ مسیح ملعون ہے اور نبی صادق نہیں اور ایسا ہی عیسائیوں کا یہ بیان کہ درحقیقت مسیح پھانسی کی موت سے مرگیا جس سے یہ نتیجہ نکالنا منظور تھا کہ مسیح عیسائیوں کے گناہ کے لیے کفارہ ہوا۔ یہ دونوں خیال یہودیوں اور عیسائیوں کے غلط ہیں اور کسی کو ان دونوں گروہ میں سے ان خیالات پر دلی یقین نہیں بلکہ دلی ایمان ان کا صرف اسی پر ہے کہ مسیح یقینی طور پر مصلوب نہیں ہوا اس تقریر سے خدائے تعالیٰ کا یہ مطلب تھا کہ تا یہودیوں اور عیسائیوں کی خاموشی سے منصفین قطعی طور پر سمجھ لیویں کہ اس بارے میں بجز شک کے ان کے پاس کچھ نہیں اور یہودی اور عیسائی جو اس آیت کو سن کر چپ رہے اور انکار کے لیے میدان میں نہ آئے تو اُس کی یہ وجہ تھی کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر ہم مقابل پر آئے اور وہ دعویٰ کیا جو ہمارے دل میں نہیں تو ہم سخت رُسوا کیے جائیں گے اور کوئی ایسا نشان خدائے تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہو جائے گا جس سے ہمارا جُھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا اس لیے اُنہوں نے دم نہ مارا اور چپ رہے اور اگرچہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہماری اس خاموشی سے ہمارا مان لینا ثابت ہو جائے گا جس سے ایک طرف تو ان کفار کے اس عقیدہ کی بیخکنی ہو گی اور ایک طرف یہ یہودی عقیدہ باطل ثابت ہو جائیگا کہ مسیح خدائے تعالیٰ کا سچا رسول اور راست باز نہیں اور ان میں سے نہیں جن کا خدائے تعالیٰ کی طرف عزت کے ساتھ رفع ہوتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی چمکتی ہوئی تلوار اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی پس جیسا کہ قرآن شریف میں اُنہیں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو لیکن مارے خوف کے کسی نے یہ تمنا نہ کی اسی طرح اس جگہ بھی مارے خوف کے انکار نہ کرسکے یعنی یہ دعویٰ نہ کرسکے کہ ہم تو مسیح کے مصلوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں ہمیں کیوں بے یقینوں میں داخل کیا جاتا ہے سو اُن کا نبی کے زمانہ میں خاموشی اختیار کرنا ہمیشہ کے لیے حجت ہو گئی اور اُن کے ساختہ پرداختہ کا اثر اُن کی آنے والی ذریتوں پر بھی پڑا کیونکہ سلف خلف کے لیے بطور وکیل کے ہوتے ہیں اور اُن کی شہادتیں آنے والی ذُریت کو ماننی پڑتی ہیں۔

اب ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے جو اس بحث کو چھیڑا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا بلکہ اپنی موت سے فوت ہوا اس تمام بحث سے یہی غرض تھی کہ مسیح کے مصلوب ہونے سے دو مختلف فرقے یعنی یہود اور عیسائی دو مختلف نتیجے اپنی اپنی اغراض کی تائید میں نکالتے تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ مسیح مصلوب ہو گیا اور توریت کی رو سے مصلوب لعنتی ہوتا ہے یعنی قرب الٰہی سے مہجور اور رفع کی عزت سے بے نصیب رہتا ہے اور شان نبوت اِس حالت ذلت سے برتر و اعلیٰ ہے۔ اور عیسائیوں نے یہودیوں کی لعن طعن سے گھبرا کر یہ جواب بنایا تھا کہ مسیح کا مصلوب ہونا اُس کے لیے مُضر نہیں بلکہ یہ لعنت اُس نے اِس لیے اپنے ذمہ لے لی کہ تا گنہ گاروں کو لعنت سے چھڑا دے سو خدائے تعالیٰ نے ایسا فیصلہ کیا کہ اِن دونوں فریق کے بیانات مذکورہ بالا کو کالعدم کر دیا اور ظاہر فرما دیا کہ کسی کو اِن دونوں گروہ میں سے مسیح کے مصلوب ہونے پر یقین نہیں اور اگر ہے تو وہ سامنے آوے سو وُہ بھاگ گئے اور کسی نے دم بھی نہ مارا اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف کا ایک معجزہ

[1] البقرۃ آیت ۹۵

ہے جو اِس زمانہ کے نادان مولویوں کی نگاہ سے چھپا ہوا ہے اور مجھے اُس ذات کی قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ابھی اور اسی وقت کشفی طور پر یہ صداقت مذکورہ بالا میرے پر ظاہر کی گئی ہے اور اُسی مُعلّم حقیقی کی تعلیم سے میں نے وہ سب لکھا ہے جو ابھی لکھا ہے فالحمدللہ علیٰ ذٰلک۔

اور عقلی طور پر بھی اگر دیکھا جائے تو اِس بیان کی سچائی پر ہر یک عقل سلیم گواہی دیگی کیونکہ خدائے تعالیٰ کا کلام لغو باتوں سے منزہ ہونا چاہیئے اور ہر یک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر اس بحث میں یہ مقاصد عظمیٰ درمیان نہ ہوں تو یہ سارا بیان ایسا لغو ہوگا جس کے تحت کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ جھگڑا کہ کوئی نبی پھانسی ملا یا اپنی طبعی موت سے مرا بالکل بیفائدہ جھگڑا ہے جس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ سو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ اپنے اِس پُرجوش اور کرّوفر کے بیان میں کہ کسی یہودی یا عیسائی کو یقینی طور پر مسیح کی مصلوبیت پر ایمان نہیں کونسی بڑی غرض رکھتا ہے اور کونسا بھارا مُدعا اُس کے زیرنظر ہے جس کے اثبات کے لیے اُس نے دونوں فریق یہود اور نصاریٰ کو خاموش اور لاجواب کر دیا ہے سو یہی مُدعا ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنے اِس عاجز بندہ پر کہ جو مولویوں کی نظر میں کافر اور مُلحد ہے اپنے خاص کشف کے ذریعہ سے کھول دیا ہے۔

اے خدا جانم بر اسرارت فدا — اُمّیاں را مے دہی فہم و ذکا

در جہانت ہیچو من اُمّی کجاست — در جہالت ہا مرا نشو و نماست

کِرمکے بودم مرا کردی بشر — من عجب تر از مسیحے بے پدر

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ مسیح کی عدم مصلوبیت پر انجیل کی رو سے کوئی استدلال پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں یعنی یہ ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں کہ گو بظاہر صورت مسیح کو صلیب ہی دی گئی ہو مگر تکمیل اُس فعل کی نہ ہوئی ہو یعنی اُس صلیب کی وجہ سے وفات یاب نہ ہوا ہو۔

تو اِس کا جواب یہ ہے کہ اناجیل اربعہ قرآن شریف کے اِس قول پر کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ صاف شہادت دے رہی ہیں کیونکہ قرآن کریم کا منشا مَا صَلَبُوْهُ کے لفظ سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسیح صلیب پر چڑھایا نہیں گیا بلکہ منشاء یہ ہے کہ جو صلیب پر چڑھانے کا اصل مدعا تھا یعنی قتل کرنا اس سے خدائے تعالیٰ نے مسیح کو محفوظ رکھا اور یہودیوں کی طرف سے اُس فعل یعنی قتل عمد کا اقدام تو ہوا مگر قدرت اور حکمت الٰہی سے تکمیل نہ پا سکا اور جیسا کہ انجیلوں میں لکھا ہے یہ واقعہ پیش آیا کہ جب پلاطوس سے صلیب دینے کے لیے یہودیوں نے مسیح کو جو حوالات میں تھا مانگا تو پلاطوس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مسیح کو چھوڑ دے کیونکہ وہ صاف دیکھتا تھا کہ مسیح بے گناہ ہے لیکن یہودیوں نے بہت اصرار کیا کہ اس کو صلیب دے اور سب مولوی اور فقیہ یہودیوں کے اکٹھے ہو کر کہنے لگے کہ یہ کافر ہے اور توریت کے احکام سے لوگوں کو پھیرتا ہے۔ پلاطوس اپنے دل میں خوب سمجھتا تھا کہ اِن جُزئی اختلافات کی وجہ سے ایک راست باز آدمی کو قتل کر دینا بے شک سخت گناہ ہے اسی وجہ سے وہ حیلے پیدا کرتا تھا کہ کسی طرح مسیح کو چھوڑ دیا جائے مگر حضرات

مولوی کب باز آنے والے تھے۔ اُنہوں نے جھٹ ایک اور بات بنائی کہ یہ شخص یہ بھی کہتا ہے کہ میں یہودیوں کا بادشاہ ہوں اور درپردہ قیصر کی گورنمنٹ سے باغی ہے اگر تو نے اس کو چھوڑ دیا تو پھر یاد رکھ کہ ایک باغی کو تو نے پناہ دی تب پلاطوس ڈر گیا کیونکہ وہ قیصر کا ماتحت تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی اُس خون ناحق سے ڈرتا رہا اور اُس کی عورت نے خواب دیکھی کہ یہ شخص راست باز ہے اگر پلاطوس اِس کو قتل کرے گا تو پھر اسی میں اُس کی تباہی ہے سو پلاطوس اِس خواب کو سُن کر اور بھی ڈھیلا ہوگیا اِس خواب پر غور کرنے سے جو انجیل میں لکھی ہے ہر یک ناظر بصیر سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ الٰہی یہی تھا کہ مسیح کو قتل ہوجانے سے بچاوے سو پہلا اشارہ منشاءِ الٰہی کا اس خواب سے ہی نکلتا ہے اس پر خوب غور کرو۔

بعد اِس کے ایسا ہوا کہ پلاطوس نے آخری فیصلہ کے لیے اجلاس کیا اور نابکار مولویوں اور فقیہوں کو بہتیرا سمجھایا کہ مسیح کے خون سے باز آجاؤ مگر وہ باز نہ آئے بلکہ چیخ چیخ کر بولنے لگے کہ ضرور صلیب دیا جاوے دین سے پھر گیا ہے تب پلاطوس نے پانی منگوا کر ہاتھ دھوئے کہ دیکھو میں اِس کے خون سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ تب سب یہودیوں اور فقیہوں اور مولویوں نے کہا کہ اِس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر۔

پھر بعد اس کے مسیح اُن کے حوالہ کیا گیا اور اُس کو تازیانے لگائے گئے اور جس قدر گالیاں سُننا اور فقیہوں اور مولویوں کے اشارہ سے طمانچے کھانا اور ہنسی اور ٹھٹھے سے اُڑائے جانا اُس کے حق میں مقدر تھا سب اُس نے دیکھا آخر صلیب دینے کے لیے طیار ہوئے یہ جمعہ کا دن تھا اور عصر کا وقت اور اتفاقاً یہ یہودیوں کی عید فسح کا بھی دن تھا اس لیے فرصت بہت کم تھی اور آگے سبت کا دن آنے والا تھا جس کی ابتدا غروب آفتاب سے ہی سمجھی جاتی تھی کیونکہ یہودی لوگ مسلمانوں کی طرح پہلی رات کو اگلے دن کے ساتھ شامل کر لیتے تھے اور یہ ایک شرعی تاکید تھی کہ سبت میں کوئی لاش صلیب پر لٹکی نہ رہے۔ تب یہودیوں نے جلدی سے مسیح کو دو چوروں کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا تا شام سے پہلے ہی لاشیں اُتاری جائیں مگر اتفاق سے اُسی وقت ایک سخت آندھی آگئی جس سے سخت اندھیرا ہوگیا یہودیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ اب اگر اندھیری میں ہی شام ہوگئی تو ہم اِس جرم کے مرتکب ہو جائیں گے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے سو اُنہوں نے اُس فکر کی وجہ سے تینوں مصلوبوں کو صلیب پر سے اُتار لیا۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بالاتفاق مان لیا گیا ہے کہ وہ صلیب اِس قسم کی نہیں تھی جیسا کہ آج کل کی پھانسی ہوتی ہے اور گلے میں رسّہ ڈال کر ایک گھنٹہ میں کام تمام کیا جاتا ہے بلکہ اِس قسم کا کوئی رسہ گلے میں نہیں ڈالا جاتا تھا صرف بعض اعضا میں کیلیں ٹھوکتے تھے اور پھر احتیاط کی غرض سے تین تین دن مصلوب بھوکے پیاسے صلیب پر چڑھائے رہتے تھے اور پھر بعد اس کے ہڈیاں توڑی جاتی تھیں اور پھر یقین کیا جاتا تھا کہ اب مصلوب مر گیا مگر خدائے تعالیٰ کی قدرت سے مسیح کے ساتھ ایسا نہ ہوا عید فسح کی کم فرصتی اور عصر کا تھوڑا سا وقت اور آگے سبت کا خوف اور پھر آندھی کا آجانا ایسے اسباب یک دفعہ پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے چند منٹ میں ہی مسیح کو صلیب پر سے اُتار لیا گیا اور دونوں چور بھی اُتارے گئے اور پھر ہڈیوں کے توڑنے کے وقت خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ نمونہ دکھایا کہ بعض سپاہی پلاطوس کے

جن کو دریردہ خواب کا خطرناک انجام سمجھایا گیا تھا وہ اُس وقت موجود تھے جن کا مدعا یہی تھا کہ کسی طرح یہ بلا مسیح کے سر پر سے ٹل جائے ایسا نہ ہو کہ مسیح کے قتل ہونے کی وجہ سے وہ خواب سچی ہو جائے جو پلاطوس کی عورت نے دیکھی تھی اور ایسا نہ ہو کہ پلاطوس کسی بلا میں پڑے۔ سو پہلے اُنہوں نے چوروں کی ہڈیاں توڑائیں اور چونکہ سخت آندھی تھی اور تاریکی ہو گئی تھی اور ہوا تیز چل رہی تھی اس لیے لوگ گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں جلد گھروں کو جاویں سو سپاہیوں کا اس موقعہ پر خوب داؤ لگا جب چوروں کی ہڈیاں توڑ چکے اور مسیح کی نوبت آئی تو ایک سپاہی نے یونہی ہاتھ رکھ کر کہہ دیا کہ یہ تو مر چکا ہے کچھ ضرور نہیں کہ اس کی ہڈیاں توڑی جائیں اور ایک نے کہا کہ میں ہی اس لاش کو دفن کروں گا اور آندھی ایسی چلی کہ یہودیوں کو اُس نے دھکے دیکر اس جگہ سے نکالا پس اس طور سے مسیح زندہ بچ گیا اور پھر وہ حواریوں کو ملا اور اُن سے مچھلی لیکر کھائی لیکن یہودی جب گھروں میں پہنچے اور آندھی فرو ہو گئی تو اپنی ناتمام کارروائی سے شک میں پڑ گئے اور سپاہیوں کی نسبت بھی اُن کے دلوں میں ظن پیدا ہو گیا چنانچہ اب تک عیسائیوں اور یہودیوں کا یہی حال ہے کہ کوئی اُن میں سے قسم کھا کر اور اپنے نفس کے لیے بلا اور عذاب کا وعدہ دیکر نہیں کہہ سکتا کہ مجھے درحقیقت یہی یقین ہے کہ سچ مچ مسیح قتل کیا گیا۔ یہ شکوک اُسی وقت پیدا ہو گئے تھے اور پولس نے اپنی چالاکی سے کوشش بھی کی کہ ان شکوک کو مٹا دے مگر وہ اَور بھی بڑھتے گئے چنانچہ پولس کے بعض خطوط سے صاف ظاہر ہوتا ہے مسیح جب صلیب پر سے اُتارا گیا تو اُس کے زندہ ہونے پر ایک اور پختہ ثبوت یہ پیدا ہو گیا کہ اُس کی پسلی کے چھیدنے سے فی الفور اُس میں سے خون رواں ہوا۔ یہودی اپنی شتاب کاری کی وجہ سے اور عیسائی انجیل کی روئداد موجودہ کے لحاظ سے اس شک میں شریک ہیں اور کوئی عیسائی ایسا نہیں جو انجیل پر غور کرے اور پھر یقینی طور پر یہ اعتقاد رکھے کہ سچ مچ مسیح صلیب کے ذریعہ فوت ہو گیا بلکہ ان کے دل آج تک شک میں پڑے ہوئے ہیں اور جس کفارہ کو وہ لیے پھرتے ہیں اُس کی ایسے ریگ کے تودہ پر بناء ہے جس کو انجیل کے بیانات نے ہی برباد کر دیا ہے..... غرض قرآن شریف میں تین جگہ مسیح کا فوت ہو جانا بیان کیا گیا ہے پھر افسوس کہ ہمارے مولوی صاحبان ان مقامات پر نظر نہیں ڈالتے اور بعض اُن میں سے بڑی چالاکی سے کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نے مانا کہ قرآن کریم یہی فرماتا ہے کہ مسیح فوت ہو گیا مگر کیا اللہ جل شانہٗ اس بات پر قادر نہیں کہ پھر زندہ کر کے اُس کو دُنیا میں لاوے مگر ان عُلماء کے علم اور فہم پر رونا آتا ہے اے حضرات! ہم نے یہ بھی مانا کہ خدائے تعالیٰ ہر یک چیز پر قادر ہے چاہے تو تمام نبیوں کو زندہ کر دیوے مگر آپ سے سوال تو یہ کیا تھا کہ قرآن شریف تو حضرت مسیح کو وفات تک پہنچا کر پھر چُپ ہو گیا ہے اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسی آیت قرآن کریم میں ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ مسیح کو مارنے کے بعد پھر ہم نے زندہ کر دیا تو وہ آیت پیش کیجئے ورنہ یہ قرآن شریف کا مخالفانہ مقابلہ ہے کہ وہ تو مسیح کا فوت ہو جانا بیان کرے اور آپ اُس کے برخلاف یہ دعوٰی کریں کہ مسیح مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۸۷-۳۸۰)

تیسری دلیل آپ نے یہ پیش کی ہے کہ سورت نساء میں ہے وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ آپ اس میں بھی قبول کرتے ہیں کہ یہ آیت قطعیۃ الدلالۃ نہیں مگر باوجود اس کے آپ کے دل میں یہ

خیال ہے کہ اس رفع سے رفع مع الجسد مراد ہے کیونکہ مَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ کے ضمیر کا مرجع بھی روح مع الجسد ہے لیکن حضرت آپ کی یہ سخت غلطی ہے۔ نفی قتل اور نفی مصلوبیت سے تو صرف یہ مدعا اللہ جل شانہ کا ہے کہ مسیح کو اللہ جل شانہ نے مصلوب ہونے سے بچالیا اور آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ اس وعدہ کے ایفا کی طرف اشارہ ہے جو دوسری آیت میں ہو چکا ہے اور اس آیت کے ٹھیک ٹھیک معنے سمجھنے کے لیے اس آیت کو بغور پڑھنا چاہیئے جس میں رفع کا وعدہ ہوا تھا۔ اور وہ آیت یہ ہے یَاعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[1]۔ حضرت اس رَافِعُكَ اِلَیَّ میں جو رفع کا وعدہ دیا گیا تھا یہ وہی وعدہ ہے جو آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں پورا کیا گیا اب آپ وعدہ کی آیت پر نظر ڈال کر دیکھیئے کہ اس کے پہلے کون لفظ موجود ہیں تو فی الفور آپ کو نظر آجائے گا کہ اس سے پہلے انی متوفیک ہے اب ان دونوں آیتوں کے ملانے سے جن میں سے ایک وعدہ کی آیت اور ایک ایفا وعدہ کی آیت ہے آپ پر کھل جائے گا کہ جس طرز سے وعدہ تھا اسی طرز سے وہ پورا ہونا چاہیئے تھا یعنی وعدہ یہ تھا کہ اے عیسٰی میں تجھے مارنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اس سے صاف کھل گیا کہ اُن کی روح اٹھائی گئی ہے کیونکہ موت کے بعد روح ہی اٹھائی جاتی ہے نہ کہ جسم۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں کہا کہ میں تجھے آسمان کی طرف اٹھانے والا ہوں بلکہ یہ کہا کہ اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور جو لوگ موت کے ذریعہ سے اُس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اسی قسم کے لفظ اُن کے حق میں بولے جاتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اٹھائے گئے یا خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کر گئے۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۷-۳۸)

وَمَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ یعنی عیسٰی نہ مصلوب ہوا نہ مقتول ہوا اس بیان سے یہ بات منافی نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر زخمی ہوگئے کیونکہ مصلوبیّت سے مراد وہ امر ہے جو صلیب پر چڑھانے کی علت غائی ہے اور وہ قتل ہے اور کچھ شک نہیں کہ خدا تعالیٰ نے دشمنوں کے اس اصل مقصود سے ان کو محفوظ رکھا اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ[2] یعنی خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔ حالانکہ لوگوں نے طرح طرح کے دکھ دئے وطن سے نکالا دانت شہید کیا انگلی کو زخمی کیا اور کئی زخم تلوار کے پیشانی پر لگائے سو درحقیقت اس پیشگوئی میں بھی اعتراض کا محل نہیں کیونکہ کفار کے حملوں کی علت غائی اور اصل مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی کرنا یا دانت کا شہید کرنا نہ تھا بلکہ قتل کرنا مقصود بالذات تھا سو کفار کے اصل ارادے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے محفوظ رکھا اسی طرح جن لوگوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھایا تھا ان کی اس کارروائی کی علت غائی حضرت مسیح کا زخمی ہونا نہ تھا بلکہ ان کا اصل ارادہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو سولی کے ذریعہ سے قتل کر دینا تھا سو خدا نے ان کو اس بدارادہ سے محفوظ رکھا اور کچھ شک نہیں کہ وہ مصلوب نہیں ہوئے پس قول مَاصَلَبُوْہُ ان پر صادق آیا۔ (ست بچن حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶۴ صفحہ حاشیہ)

مجھ سے پہلے یہودیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نسبت بھی یہی ارادہ کیا کہ ناحق مجرم ٹھہرا کر سولی دلادیں۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ کس طرح اُس نے اپنے اُس مقبول کو بچالیا۔ اُس نے پیلاطوس کے دل میں ڈال دیا کہ یہ شخص بے گناہ ہے اور

---

[1] آل عمران آیت ۵۶ [2] المائدہ آیت ۶۸

فرشتہ نے خواب میں اُس کی بیوی کو ایک رُعب ناک نظارہ میں ڈرایا کہ اس شخص کے مصلوب ہونے میں تمہاری تباہی ہے۔ پس وہ ڈر گئے اور اُس نے اپنے خاوند کو اس بات پر مستعد کیا کہ کسی حیلہ سے مسیح کو یہودیوں کے بد ارادہ سے بچا لے پس اگرچہ وہ بظاہر یہودیوں کے آنسو پونچھنے کے لیے صلیب پر چڑھایا گیا لیکن وہ قدیم رسم کے موافق نہ تین دن صلیب پر رکھا گیا جو کسی کے مارنے کے لیے ضروری تھا اور نہ ہڈیاں توڑی گئیں بلکہ یہ کہہ کر بچا لیا گیا کہ "اُس کی تو جان نکل گئی"۔ اور ضرور تھا کہ ایسا ہی ہوتا تا خدا کا مقبول اور راست باز نبی جرائم پیشہ کی موت سے مر کر یعنی صلیب کے ذریعہ سے جان دیکر اُس لعنت کا حصّہ نہ لیوے جو روز ازل سے اُن شریروں کے لیے مقرر ہے جن کے تمام علاقے خدا سے ٹوٹ جاتے ہیں اور در حقیقت جیسا کہ لعنت کا مفہوم ہے وہ خدا کے دشمن اور خدا اُن کا دشمن ہو جاتا ہے پس کیونکر وہ لعنت جس کا یہ ناپاک مفہوم ہے ایک برگزیدہ پر وارد ہو سکتی ہے؟ سو اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیبی موت سے بچائے گئے۔ اور جیسا کہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے وہ کشمیر میں آکر فوت ہوئے اور اب تک نبی شہزادہ کے نام پر کشمیر میں اُن کی قبر موجود ہے۔ اور لوگ بہت تعظیم سے اُس کی زیارت کرتے ہیں اور عام خیال ہے کہ وہ ایک شہزادہ نبی تھا جو اسلامی ملکوں کی طرف سے اسلام سے پہلے کشمیر میں آیا تھا اور اس شہزادہ کا نام غلطی سے بجائے یسوع کے کشمیر میں یوز آسف کر کے مشہور ہے جس کے معنے ہیں کہ یسوع غم ناک۔ اور جب پلاطوس کی بیوی کو فرشتہ نظر آیا اور اُس نے اُس کو دھمکایا کہ اگر یسوع مارا گیا تو تمہاری تباہی ہوگی یہی اشارہ خدا تعالےٰ کی طرف سے بچانے کے لیے تھا۔ ایسا دُنیا میں کبھی نہیں ہوا کہ اس طرح پر کسی راستباز کی حمایت کے لیے فرشتہ ظاہر ہوا ہو اور پھر ردیا میں فرشتہ کا ظاہر ہونا عبث اور لا حاصل گیا ہو اور جس کی سفارش کے لیے آیا ہو وہ ہلاک ہو گیا ہو۔ غرض یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اُس وقت کے یہودی اپنے ارادہ میں نامراد رہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس کوٹھے میں رکھے گئے تھے جو قبر کے نام سے مشہور تھا اور دراصل ایک بڑا وسیع کوٹھا تھا وہ اُس سے تیسرے دن بخیر و عافیت باہر آگئے اور شاگردوں کو ملے اور اُن کو مبارک باد دی کہ میں خدا کے فضل سے دنیوی زندگی کے ساتھ بدستور اب تک زندہ ہوں اور پھر اُن کے ہاتھ سے لیکر روٹی اور کباب کھائے اور اپنے زخم اُن کو دکھلائے اور چالیس دن تک اُن کے اُن زخموں کا اُس مرہم کے ساتھ علاج ہوتا رہا جس کو قرابا دینوں میں مرہم عیسیٰ یا مرہم رُسل یا مرہم حواریین کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ مرہم چوٹ وغیرہ کے زخموں کے لیے بہت مفید ہے اور قریباً طب کی ہزار کتاب میں اس مرہم کا ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چوٹوں کے لیے اُس کو بنایا گیا تھا۔ وہ پورانی طب کی کتابیں عیسائیوں کی جو آج سے چودہ سو برس پہلے رومی زبان میں تصنیف ہو چکی تھیں اُن میں اِس مرہم کا ذکر ہے اور یہودیوں اور مجوسیوں کی طبابت کی کتابوں میں بھی یہ نسخہ مرہم عیسیٰ کا لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرہم الہامی ہے اور اُس وقت جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر کسی قدر زخم پہنچے تھے انہیں دنوں میں خدا تعالےٰ نے بطور الہام یہ دوائیں اُن پر ظاہر کی تھیں۔

یہ مرہم پوشیدہ راز کا نہایت یقینی طور پر پتہ لگاتی ہے اور قطعی طور پر ظاہر کرتی ہے کہ در حقیقت حضرت عیسیٰ علیہ

السّلام صلیبی موت سے بچائے گئے تھے کیونکہ اِس مرہم کا تذکرہ صرف اہل اسلام کی ہی کتابوں میں نہیں کیا گیا بلکہ قدیم سے عیسائی یہودی مجوسی اور اطبّاء اسلام اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ اور نیز یہ بھی لکھتے آئے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی چوٹوں کے لیے یہ مرہم طیار کی گئی تھی حسنِ اتفاق سے یہ سب کتابیں موجود ہیں اور اکثر چھپ چکی ہیں اگر کسی کو سچائی کا پتہ لگانا اور راستی کا سُراغ چلانا منظور ہو تو ضرور ان کتابوں کا ملاحظہ کرے شاید آسمانی روشنی اُس کے دل پر پڑ کر ایک بھاری بلا سے نجات پا جائے اور حقیقت کھُل جائے۔ اس مرہم کو ادنیٰ ادنیٰ اطبابت کا مذاق رکھنے والے بھی جانتے ہیں یہاں تک کہ قرابا دینِ قادری میں بھی جو ایک فارسی کی کتاب ہے تمام مرہموں کے ذکر کے باب میں اس مرہم کا نسخہ بھی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہی مرہم حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے لیے بنائی گئی تھی۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ دُنیا کے تمام طبیبوں کے اتفاق سے جو ایک گروہ خواص ہے جن کو سب سے زیادہ تحقیق کرنے کی عادت ہوتی ہے اور مذہبی تعصبات سے پاک ہوتے ہیں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ مرہم حواریوں نے حضرت عیسٰے علیہ السّلام کی چوٹوں کے لیے طیّار کی تھی۔

ایک عجیب فائدہ اِس مرہم کے واقعہ کا یہ ہے کہ اس سے حضرت عیسٰی کے آسمان پر چڑھنے کی بھی ساری حقیقت کھل گئی اور ثابت ہوگیا کہ یہ تمام باتیں بے اصل اور بیہودہ تصوّرات ہیں۔ اور نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ رفع جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے حقیقت میں وفات کے بعد تھا اور اُسی رفع مسیح سے خُدا تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اُس جھگڑے کا فیصلہ کیا جو صدہا برس سے اُن کے درمیان چلا آتا تھا یعنی یہ کہ حضرت عیسٰی مردودوں اور ملعونوں سے نہیں ہیں اور نہ کفّار میں سے جن کا رفع نہیں ہوتا بلکہ وہ سچّے نبی ہیں اور درحقیقت اُن کا رفع روحانی ہوا ہے جیسا کہ دوسرے نبیوں کا ہوا۔ یہی جھگڑا تھا اور رفع جسمانی کی نسبت کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ وہ غیر متعلق بات تھی جس پر کذب اور صدق کا مدار نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ یہود یہ چاہتے تھے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو صلیب کا الزام دے کر ملعون ٹھہرا دیں یعنی ایسا شخص جس کا مرنے کے بعد خدا کی طرف روحانی رفع نہیں ہوتا اور نجات سے جو قربِ الٰہی پر موقوف ہے بے نصیب رہتا ہے سو خُدا نے اس جھگڑے کو یوں فیصلہ کیا کہ یہ گواہی دی کہ وہ صلیبی موت جو روحانی رفع سے مانع ہے حضرت مسیح پر ہرگز وارد نہیں ہوئی اور اُن کا وفات کے بعد رفع الی اللہ ہوگیا ہے۔ اور وہ قربِ الٰہی پاکر کامل نجات کو پہنچ گیا۔ کیونکہ جس کیفیت کا نام نجات ہے اسی کا دوسرے لفظوں میں نام رفع ہے اسی کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے کہ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ ۔ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ۔ (کتاب البریہ صـ۲۰۵)

ایک بڑا دھوکہ ان کم فہم علماء کو یہ لگا ہوا ہے کہ جب قرآن شریف میں یہ لوگ یہ آیت پڑھتے ہیں کہ مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ اور نیز یہ آیت کہ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ تو اپنی غایت درجہ کی نادانی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ نفیٔ قتل اور نفیٔ صلیب اور لفظ رفع اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام یہود کے ہاتھ سے بچ کر

اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے گئے۔ گویا بجز آسمان کے اور کوئی جگہ اُن کے پوشیدہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو زمین پر نہیں ملتی تھی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے لیے تو ایک وحشت ناک اور سانپوں سے بھری ہوئی غار کفایت ہو گئی مگر مسیح کے دشمن زمین پر اُس کو نہیں چھوڑ سکتے تھے خواہ اللہ تعالیٰ ان کو بچانے کے لیے زمین پر کیسی ہی تدبیر کرتا اس لیے مجبوراً یہودیوں سے اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ عاجز آ کر اُن کے لیے آسمان تجویز کیا۔ قرآن میں تو رفع الی السّماء کا ذکر بھی نہیں بلکہ رفع الی اللہ کا ذکر ہے جو ہر ایک مومن کے لیے ہوتا ہے۔

یہ لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اگر یہی قصّہ صحیح ہے تو قرآن شریف نے جو اس قصّہ کو لکھا تو ان آیات کی شان نزول کیا تھی اور کونسا جھگڑا یہود اور نصاریٰ میں حضرت عیسیٰ کے آسمان پر مع جسم عنصری کے جانے کے متعلق تھا جس جھگڑے کو قرآن شریف نے ان آیات کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہا۔ ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے اختلافات کو حق اور راستی کے ساتھ فیصلہ کرے۔ سو یاد رہے کہ یہود اور نصاریٰ میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اختلاف تھا اور اب بھی ہے وہ اختلاف اُن کے رفع روحانی کے بارے میں ہے۔ یہود نے صلیب دئے جانے سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ حضرت عیسیٰ کا رفع روحانی نہیں ہوا اور نعوذ باللہ وہ ملعون ہیں۔ کیونکہ اُن کے مذہب کی رو سے ہر ایک مومن کا مرنے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص صلیب کے ذریعہ سے مارا جائے اُس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا یعنی وہ شخص لعنتی ہوتا ہے پس یہودیوں کی یہی حجت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام مصلوب ہو گئے اس لیے اُن کا رفع روحانی نہیں ہوا اور وہ لعنتی ہیں اور نالائق عیسائیوں نے بھی تین دن کے لیے حضرت عیسیٰ کو رفع سے محروم سمجھا اور لعنتی ٹھہرایا۔ اب قرآن شریف کا اس ذکر سے مدعا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے روحانی رفع پر گواہی دے سو اللہ تعالیٰ نے مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ کہہ کر نفی صلیب کی اور پھر اُس کا نتیجہ یہ نکالا کہ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ اور اس طرح پر جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔

اب انصافاً دیکھو کہ اس جگہ رفع جسمانی کا تعلق اور واسطہ کیا ہے۔ یہودیوں میں سے اب تک لاکھوں تک زندہ موجود ہیں۔ اُن کے عالموں فاضلوں کو پوچھ لو کہ کیا آپ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے مصلوب ہونے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کا رفع روحانی نہیں ہوا یا یہ کہ ان کا رفع جسمانی نہیں ہوا۔ ایسا ہی یہود یہ کہتے تھے کہ سچّا مسیح اُس وقت آئے گا کہ جب ایلیا نبی ملاکی کی پیشگوئی کے موافق دوبارہ دنیا میں آجائے گا۔ پھر جبکہ خدا تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے جس کی حقیقت انسانوں پر نہیں کھل سکتی یہود کو اس امتحان میں ڈالا کہ ایلیا نبی جس کا ان کو انتظار تھا آسمان سے نازل نہ ہوا اور حضرت ابن مریم نے مسیح ہونے کا دعویٰ کر دیا تو یہ دعویٰ یہودیوں کو خلاف نصوص صریحہ معلوم ہوا۔ اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ شخص سچّا ہے تو پھر نعوذ باللہ توریت باطل ہے اور ممکن نہیں کہ خدا کی کتابیں باطل ہوں۔ پس تمام جھگڑا انکار کی یہی تھی۔ اسی وجہ سے یہودی حضرت مسیح کے سخت دشمن ہو گئے اور ان کو کافر اور مرتد اور دجّال اور ملحد کہنے لگے اور تمام علما

کا فتویٰ اُن کے کفر پر ہو گیا اور ان میں زاہد اور راہب اور ربّانی بھی تھے وہ سب اُن کے کفر پر متفق ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ یہ شخص ظاہر نصوص کو چھوڑتا ہے۔ یہ تمام فتنہ صرف اس بات سے پڑا کہ حضرت مسیح نے ایلیا نبی کے دوبارہ آنے کے بارے میں یہ تاویل پیش کی تھی کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اس کی خو اور طبیعت پر ہو۔ اور وہ یوحنا یعنی یحییٰ زکریا کا بیٹا ہے۔ مگر یہ تاویل یہودیوں کو پسند نہ آئی۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے انہوں نے ان کو ملحد قرار دیا کہ جو نصوص کو اُن کے ظاہر سے پھیرتا ہے۔ لیکن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام درحقیقت سچا نبی تھا اور اُن کی تاویل بھی گو بظاہر کیسی ہی بعید از قیاس تھی مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک درست تھی اس لیے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ بھی خیال تھا کہ اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو راستبازی کے انوار کیوں اس میں پائے جاتے ہیں اور کیوں سچے رسولوں کی طرح اس سے نشان ظاہر ہوتے ہیں۔ پس اس خیال کے دور کرنے کے لیے یہودیوں کے مولوی ہر وقت اسی تدبیر میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح عوام کو یہ یقین دلایا جائے کہ یہ شخص نعوذ باللہ کاذب اور ملعون ہے آخر ان کو یہ بات سوجھی کہ اگر اس کو صلیب دی جائے تو البتہ ہر ایک پر صاف طور پر ثابت ہو جائے گا کہ یہ شخص نعوذ باللہ لعنتی اور اس رفع سے بے نصیب ہے جو راستبازوں کا خدا تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور اس سے اس کا کاذب ہونا ثابت ہوگا۔ کیونکہ توریت میں یہ لکھا تھا کہ جو شخص صلیب پر کھینچا جائے وہ لعنتی ہے یعنی اُس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا۔ سو انہوں نے اپنی دانست میں ایسا ہی کیا یعنی صلیب دیا۔ اور یہ امر نصاریٰ پر بھی مشتبہ ہو گیا۔ اور انہوں نے بھی گمان کیا کہ حضرت مسیح حقیقت میں مصلوب ہو گئے ہیں۔ اور پھر اس اعتقاد سے یہ دوسرا عقیدہ بھی انہیں اختیار کرنا پڑا کہ وہ لعنتی بھی ہیں۔ مگر لعنت کے چھپانے کے لیے اور اُس کا کلنک دور کرنے کے لیے یہ تجویز سوچی گئی کہ اُن کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنایا جائے۔ ایسا بیٹا جس نے دنیا کے تمام گنہگاروں کی لعنتیں اپنے سر پر اٹھا لیں اور بجائے دوسرے ملعونوں کے آپ ملعون بن گیا اور پھر ملعونوں کی موت سے مرا یعنی مصلوب ہوا۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں قدیم سے یہ رسم تھی کہ جرائم پیشہ اور قتل کے مجرموں کو بذریعہ صلیب ہی ہلاک کیا کرتے تھے۔ اس مناسبت سے صلیبی موت لعنتی موت شمار کی گئی تھی مگر عیسائیوں کو یہ بڑا دھوکہ لگا کہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد اور نبی کو ملعون ٹھہرایا۔ وہ بہت ہی شرمندہ ہوں گے جب وہ اس بات پر غور کریں گے کہ لعنت کا مفہوم لُغت کی رو سے اس بات کو چاہتا ہے کہ شخص ملعون درحقیقت خدا سے مرتد ہو گیا ہو۔ کیونکہ لعنت ایک خدا کا فعل ہے اور یہ فعل انسان کے اُس فعل کے بعد ظہور میں آتا ہے کہ جب انسان عمداً بے ایمان ہو کر خدا تعالیٰ سے تمام تعلقات توڑ دے اور خدا سے بیزار ہو جائے اور خدا اُس سے بیزار ہو جائے سو جب ایسے شخص سے خدا بھی بیزار ہو جائے اور اُس کو اپنی درگاہ سے ردّ کر دے اور اُس کو دشمن پکڑے تو اس صورت میں اس مردود کا نام ملعون ہوتا ہے اور یہ امر ضروری ہوتا ہے کہ یہ شخص ملعون خدا سے بیزار ہو اور خدا تعالیٰ اس سے بیزار ہو اور شخص ملعون خدا تعالیٰ کا دشمن ہو جائے اور خدا تعالیٰ اُس کا دشمن ہو جائے۔ اور شخص ملعون خدا تعالیٰ کی معرفت سے بکلّی بے نصیب ہو جائے اور اندھا اور گمراہ ہو جائے اور ایک ذرّہ خدا کی محبت اُس کے دل میں نہ رہے۔ اسی لیے لُغت کے رو سے لعین شیطان کا نام ہے۔

پس ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بالکل اس تہمت سے پاک ہیں کہ نعوذ باللہ ان کو ملعون کہا جائے اور رفع الی اللہ سے ان کو بے نصیب سمجھا جائے لیکن عیسائیوں نے اپنی حماقت سے اور یہودیوں نے اپنی شرارت سے ان کو ملعون قرار دیا اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں لعنت کا لفظ رفع کے لفظ کی نقیض ہے۔ پس اس سے یہ لازم آیا کہ وہ نعوذ باللہ موت کے بعد خدا کی طرف نہیں بلکہ جہنم کی طرف گئے کیونکہ لعنتی یعنی وہ شخص جس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہ ہو وہ جہنم کی طرف جاتا ہے یہ متفق علیہ اہل اسلام اور یہود کا عقیدہ ہے اسی لیے نصاریٰ کو یہ عقیدہ رکھنا پڑا کہ حضرت عیسیٰ مرنے کے بعد تین دن تک جہنم میں رہے۔ بہرحال ایک سچے نبی کی ان دونوں قوموں نے بڑی بے ادبی کی۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس الزام سے بری کرے۔ پس اوّل تو خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ فرمایا کہ مسیح ابن مریم درحقیقت سچا نبی اور وجیہ اور خدا تعالیٰ کے مقربوں میں سے تھا۔ اور پھر یہود اور نصاریٰ کے اس وسوسہ کو بھی دور کیا کہ وہ مصلوب ہو کر لعنتی ہوا۔ اور فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ اور یہ بھی فرمایا۔ کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ پس اس طرح پر وہ لعنت اور عدم رفع کی تہمت جو چھ سو برس سے یہود اور نصاریٰ کی طرف سے ان پر وارد کی گئی تھی اس کو دور فرمایا۔ سو ان آیات کی شان نزول یہی ہے کہ اس وقت کے یہود اور نصاریٰ حضرت مسیح کو ملعون خیال کرتے تھے اور نہایت ضروری تھا کہ اُن شریروں اور احمقوں کی غلطی ظاہر کر کے اُن کے جھوٹے الزام سے حضرت مسیح کو بری کر دیا جائے۔ پس اس ضرورت کے لیے قرآن شریف نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور جبکہ مصلوب نہ ہوا تو یہ اعتراض سراسر غلط ٹھہرا کہ خدا کی طرف اس کا رفع نہیں ہوا اور نعوذ باللہ وہ ملعون ہوا بلکہ خدا تعالیٰ نے اور مقربوں کی طرح اس کو بھی رفع کی خلعت سے ممتاز کیا اور خدا تعالےٰ نے اس فیصلہ میں حضرت عیسیٰ کے ملعون اور غیر مرفوع ہونے کے بارے میں عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو جھوٹا ٹھہرایا۔

اب اس تمام تحقیق سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بریّت اور ان کا صادق اور غیر کاذب ہونا جسمانی رفع پر موقوف نہ تھا۔ اور جسمانی رفع کے نہ ہونے سے اُن کا کاذب اور ملعون ہونا لازم نہ آتا تھا۔ کیونکہ اگر صادق اور مقرب الٰہی ہونے کے لیے جسمانی رفع کی ضرورت ہے تو بموجب عقیدہ ان نادان علما کے لازم آتا ہے کہ صرف حضرت عیسیٰ ہی خدا کے مقرب ہوں اور باقی تمام نبی جن کا جسمانی رفع جسم عنصری کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوا وہ نعوذ باللہ قرب الٰہی سے بے نصیب ہوں۔ اور جبکہ جسمانی رفع کچھ شئی نہ تھا اور کسی نبی کے صادق اور مقرب الٰہی ہونے کے لیے جسمانی طور پر اُس کا آسمان پر جانا ضروری نہ تھا تو کیونکر ممکن تھا کہ خدا کی کلام میں جو پرحکمت ہے یہ فضول اور لغو اور بے تعلق جھگڑا شروع کیا جاتا۔ حالانکہ یہود کا یہ مدعا اور مقصود نہ تھا کہ حضرت مسیح کے رفع جسمانی میں بحثیں کریں اور ایسی بحث سے اُن کو کچھ حاصل نہ تھا۔ اُن کا تمام مقصد جس کے لیے اُن کی قوم میں معاندانہ جوش پیدا ہوا تھا اور اب تک ہے صرف یہ تھا کہ وہ اُن کے مصلوب ہونے سے یہ نتیجہ نکالیں کہ ان کا روحانی رفع نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی دانست میں ان کو صلیب دیا۔ اور توریت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ جو شخص لکڑی پر لٹکایا جائے یعنی صلیب دیا جائے وہ لعنتی ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب اس کو میسر نہیں ہوتا

دوسرے لفظوں میں یہ کہ رفع الی اللہ نہیں ہوتا بلکہ اسفل السافلین میں گرایا جاتا ہے۔ پس یہ صلیب کا لفظ اور جو اُس کا نتیجہ لعنت بیان کیا گیا ہے یہی پکار پکار گواہی دے رہا ہے کہ یہود کا تمام شور و غوغا اس وقت یہی تھا کہ صلیب ملنے سے مسیح کا لعنتی ہونا ثابت ہے اور لعنتی ہونے سے عدم رفع ثابت۔ پس جو جھوٹا الزام لگایا گیا تھا خدا نے اُسی کا فیصلہ کرنا تھا۔ ہاں اگر مصلوب ہونے کا نتیجہ توریت کے رو سے یہ بیان کیا جاتا کہ جو شخص مصلوب ہو اُس کا جسمانی رفع نہیں ہوتا تو ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ مسیح کو جسمانی طور پر آسمان پر پہنچاتا اور کچھ بھی شبہ نہ رہنے دیتا مگر اب تو یہ خیال سراسر بے تعلق اور اصل جھگڑے اور اُس کے فیصلہ سے کچھ لگاؤ نہیں رکھتا اور خدا تعالیٰ کی شان اس سے منزہ ہے کہ اس بیہودہ اور لغو اور بے تعلق امر کے بحث میں اپنے تئیں ڈالے۔ خدا کی تعلیمیں نجات اور قرب الٰہی کی راہیں بتلاتی ہیں اور اُن الزاموں کا نبیوں پر سے ذب اور دفع کرتی ہیں جن کی رو سے اُن کے مقرب اور ناجی ہونے پر حرف آتا ہے۔ مگر آسمان پر اس جسم کے ساتھ چڑھ جانا نجات اور قرب الٰہی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ورنہ ماننا پڑتا ہے کہ بجز حضرت مسیح کے نعوذ باللہ باقی تمام نبی نجات اور قرب الٰہی سے محروم ہیں اور یہ خیال صریح کفر ہے۔

ہمارے نادان مولوی اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ تمام جھگڑا رفع اور عدم رفع کا صلیب کے مقدمہ سے شروع ہوا ہے یعنی توریت نے صلیب پر مرنیوالوں کو روحانی رفع سے محروم ٹھہرایا ہے۔ پھر اگر توریت کے معنے یہ کیے جائیں کہ صلیب پر مرنیوالا رفع جسمانی سے بے نصیب رہتا ہے تو ایسے عدم رفع سے نبیوں اور تمام مومنوں کا کیا حرج ہے۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیں کہ نجات کے لیے رفع جسمانی شرط ہے تو نعوذ باللہ ماننا پڑتا ہے کہ بجز مسیح تمام انبیا نجات سے محروم ہیں۔ اور اگر رفع جسمانی کو نجات اور ایمان اور نیک بختی اور مراتب قرب سے کچھ بھی تعلق نہیں جیسا کہ فی الواقع یہی سچ ہے تو قرآن کے لفظ رفع کو اصل مقصد اور مراد سے پھیر کر اور اُس کی شان نزول سے لاپرواہ ہو کر خود بخود رفع جسمانی مراد لے لینا کس قدر گمراہی ہے قرآن شریف میں تو یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بلعم کا رفع کرنا چاہا تھا لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا۔ تو کیا اس جگہ بھی یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تھا کہ بلعم کو بجسم عنصری آسمان پر اٹھاوے سو ہر ایک شخص یاد رکھے اور بے ایمانی کی راہ کو اختیار نہ کرے کہ قرآن شریف میں ہر ایک جگہ رفع سے مراد رفع روحانی ہے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۲۰۳ حاشیہ)

یہ کس کو معلوم تھا کہ مرہم عیسیٰ کا نسخہ صدہا طبی کتابوں میں لکھا ہوا پیدا ہو جائے گا۔ اس بات کی کس کو خبر تھی کہ بدھ مذہب کی پرانی کتابوں سے یہ ثبوت مل جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلاد شام کے یہودیوں سے نومید ہو کر ہندوستان اور کشمیر اور تبت کی طرف آئے تھے۔ یہ بات کون جانتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کشمیر میں قبر ہے۔ کیا انسان کی طاقت میں تھا کہ ان تمام باتوں کو اپنے زور سے پیدا کر سکتا۔ اب یہ واقعات اس طرح سے عیسائی مذہب کو مٹاتے ہیں جیسا کہ دن چڑھ جانے سے رات مٹ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے ثابت ہونے سے عیسائی مذہب کو وہ صدمہ پہنچتا ہے جو اُس چھت کو پہنچ سکتا ہے جس کا تمام بوجھ ایک شہتیر پر تھا۔ شہتیر ٹوٹا اور چھت گر گئی۔ پس اسی طرح اس واقعہ کے ثبوت سے عیسائی مذہب کا

خاتمہ ہے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہی قدرتوں سے وہ پہچانا گیا ہے۔ دیکھو کیسے عمدہ معنے اس آیت کے ثابت ہوئے کہ مَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ یعنی قتل کرنا اور صلیب سے مسیح کا مارنا سب جھوٹ ہے اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو دھوکہ لگا ہے اور مسیح خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق صلیب سے بچ کر نکل گیا۔ اور اگر انجیل کو غور سے دیکھا جائے تو انجیل بھی یہی گواہی دیتی ہے۔ کیا مسیح کی تمام رات کی دردمندانہ دعا ردّ ہوسکتی تھی۔ کیا مسیح کا یہ کہنا کہ میں یونس کی طرح تین دن قبر میں رہوں گا اس کے یہ معنے ہوسکتے ہیں کہ وہ مردہ قبر میں رہا۔ کیا یونس مچھلی کے پیٹ میں تین دن مرا رہا تھا۔ کیا پیلاطوس کی بیوی کے خواب سے خدا کا یہ منشاء معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کو صلیب سے بچالے۔ ایسا ہی مسیح کا جمعہ کی آخری گھڑی صلیب پر چڑھائے جانا اور شام سے پہلے اتارے جانا اور رسم قدیم کے موافق تین دن تک صلیب پر نہ رہنا اور ہڈی نہ توڑے جانا اور خون کا نکلنا کیا یہ تمام وہ امور نہیں ہیں جو بآواز بلند پکار رہے ہیں کہ یہ تمام اسباب مسیح کی جان بچانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور دعا کرنے کے ساتھ ہی یہ رحمت کے اسباب ظہور میں آئے۔ بھلا مقبول کی ایسی دعا جو تمام رات رو رو کر کی گئی کب رد ہوسکتی تھی۔ پھر مسیح کا صلیب کے بعد حواریوں کو ملنا اور زخم دکھلانا کس قدر مضبوط دلیل اس بات پر ہے کہ وہ صلیب پر نہیں مرا۔ اور اگر یہ صحیح نہیں ہے تو بھلا اب مسیح کو پکارو کہ تمہیں آکر مل جائے کہ حواریوں کو ملا تھا۔ غرض ہر ایک پہلو سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کی صلیب سے جان بچائی گئی اور وہ اس ملک ہند میں آئے کیونکہ بنی اسرائیل کے دس فرقے ان ہی ملکوں میں آگئے تھے جو آخر کار مسلمان ہوگئے اور پھر اسلام کے بعد بموجب وعدہ توریت کے ان میں کئی بادشاہ بھی ہوئے۔ اور یہ ایک دلیل صدق نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے کیونکہ توریت میں وعدہ تھا کہ بنی اسرائیل نبی موعود کے پیرو ہوکر حکومت اور سلطنت پائیں گے۔ غرض مسیح ابن مریم کو صلیبی موت سے مارنا یہ ایک ایسا اصل ہے کہ اسی پر مذہب کے تمام اصولوں کفارہ اور تثلیث وغیرہ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور یہی وہ خیال ہے کہ جو نصاریٰ کے چالیس کروڑ انسانوں کے دلوں میں سرایت کر گیا ہے اور اس کے غلط ثابت ہونے سے عیسائی مذہب کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اگر عیسائیوں میں کوئی فرقہ دینی تحقیق کا جوش رکھتا ہے تو ممکن ہے کہ ان ثبوتوں پر اطلاع پانے سے وہ بہت جلد عیسائی مذہب کو الوداع کہیں اور اگر اس تلاش کی آگ یورپ کے تمام دلوں میں بھڑک اٹھے تو جو گروہ چالیس کروڑ انسان کا انیس سو برس میں طیار ہوا ہے ممکن ہے کہ انیس ماہ کے اندر دست غیب سے ایک پلٹا کھا کر مسلمان ہوجائے کیونکہ صلیبی اعتقاد کے بعد یہ ثابت ہونا کہ حضرت مسیح صلیب پر نہیں مارے گئے بلکہ دوسرے ملکوں میں پھرتے رہے۔ یہ ایسا امر ہے کہ یکدفعہ عیسائی عقاید کو دلوں سے اڑاتا ہے۔ اور عیسائیت کی دنیا میں انقلاب عظیم ڈالتا ہے۔

(راز حقیقت ص۱۲۔۱۴ حاشیہ)

حال میں مسلمانوں کی تالیف بھی چند پرانی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں صریح یہ بیان موجود ہے کہ یوز آسف ایک پیغمبر تھا جو کسی ملک سے آیا تھا اور شہزادہ بھی تھا اور کشمیر میں اُس نے انتقال کیا اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ نبی چھ سو برس پہلے ہمارے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گذرا ہے۔ (نوٹ بر حاشیہ راز حقیقت صہ ۱۲)

میں نے طاعون کے علاج کے لیے ایک مرہم بھی طیار کی ہے۔ یہ ایک پُرانا نسخہ ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت سے چلا آتا ہے اور اس کا نام مرہم عیسیٰ ہے...... اور مرہم حواریین بھی اسے کہتے ہیں اور مرہم الرسل بھی اس کا نام ہے کیونکہ عیسائی لوگ حواریوں کو مسیح کے رسول یعنی ایلچی کہتے تھے۔ کیونکہ اُن کو جس جگہ جانے کے لیے حکم دیا جاتا تھا وہ ایلچی کی طرح جاتے تھے۔ یہ نہایت عجیب بات ہے کہ جیسا کہ یہ نسخہ طب کے تمام نسخوں سے قدیم اور پُرانا ثابت ہوا ہے ایسا ہی یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ دنیا کی اکثر قوموں کے طبیبوں نے اس نسخہ کو اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے چنانچہ جس طرح عیسائی طبیب اس نسخہ کو اپنی کتابوں میں لکھتے آئے ہیں ایسا ہی رومی طبابت کی قدیم کتابوں میں بھی یہ نسخہ پایا جاتا ہے اور زیادہ تر تعجب یہ کہ یہودی طبیبوں نے بھی اس نسخہ کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور وہ بھی اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ نسخہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چوٹوں کے لیے بنایا گیا تھا اور نصرانی طبیبوں کی کتابوں اور مجوسیوں اور مسلمان طبیبوں اور دوسرے تمام طبیبوں نے جو مختلف قوموں میں گذرے ہیں اس بات کو بالاتفاق تسلیم کر لیا ہے کہ یہ نسخہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ان مختلف فرقوں کی کتابوں میں سے ہزار کتاب ایسی پائی گئی ہے جن میں یہ نسخہ مع وجہ تسمیہ درج ہے اور وہ کتابیں اب تک موجود ہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اکثر وہ کتابیں ہمارے کتب خانہ میں ہیں اور شیخ الرئیس بوعلی سینا نے بھی اس نسخہ کو اپنے قانون میں لکھا ہے۔ چنانچہ میرے کتب خانہ میں شیخ بوعلی سینا کے قانون کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو پانسو برس کا لکھا ہوا ہے اس میں بھی یہ نسخہ مع وجہ تسمیہ موجود ہے۔ ان تمام کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرہم عیسیٰ اُس وقت طیار کی گئی تھی کہ جب نالائق یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے صلیب پر چڑھا دیا تھا اور اُن کے پیروں اور ہاتھوں میں لوہے کے کیل ٹھونک دئے تھے لیکن خدا تعالیٰ کا ارادہ تھا کہ ان کو صلیبی موت سے بچاوے اِس لیے خدائے عزوجل نے اپنے فضل و کرم سے ایسے اسباب جمع کر دئے جن کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان بچ گئی منجملہ اُن کے ایک یہ سبب تھا کہ آنجناب جمعہ کو قریب عصر کے صلیب پر چڑھائے گئے۔ اور صلیب پر چڑھانے سے پہلے اُسی رات پیلاطوس کی بیوی نے جو اُس ملک کا بادشاہ تھا ایک ہولناک خواب دیکھا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر یہ شخص جو یسوع کہلاتا ہے قتل کیا گیا تو تم پر تباہی آئے گی۔ اُس نے یہ خواب اپنے خاوند یعنی پیلاطوس کو بتلایا اور چونکہ دنیا دار لوگ اکثر وہمی اور بزدل ہوتے ہیں اس لیے پیلاطوس خاوند اُس کا اس خواب کو سُن کر بہت ہی گھبرایا اور اندر ہی اندر اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح یسوع کو قتل سے بچا لیا جائے۔ سو اس دلی منصوبہ کے انجام کے لیے پہلا داؤ جو اس نے یہودیوں کے ساتھ کھیلا وہ یہی تھا کہ یہ تدبیر کی کہ یسوع کو جمعہ کے روز عصر کے وقت صلیب دی جائے۔ اور اُسے معلوم تھا کہ یہودی صرف اُسے صلیب دینا چاہتے ہیں کسی اور طریق سے قتل کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہودیوں کے مذہب کے رو سے جس شخص کو صلیب کے ذریعہ قتل کیا جائے خدا کی لعنت اُس پر پڑ جاتی ہے اور پھر خدا کی طرف اُس کا رفع نہیں ہوتا۔ اور بعد اُس کے یہ امر ممکن ہی نہیں ہوتا کہ خدا اُس سے محبت کرے

اور یا وہ خدا کی نظر میں ایمانداروں اور راست بازوں میں شمار کیا جائے۔ لہٰذا یہودیوں کی یہ خواہش تھی کہ یسوع کو صلیب دیکر پھر توریت کے رو سے اس بات کا اعلان دیدیں کہ اگر یہ سچا نبی ہوتا تو ہرگز مصلوب نہ ہو سکتا اور اس طرح پر مسیح کی جماعت کو متفرق کر دیں یا جو لوگ اندر ہی اندر کچھ نیک ظن رکھتے تھے اُن کی طبیعتوں کو خراب کر دیں۔ اور خدانخواستہ اگر واقعہ صلیب وقوع میں آجاتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ ایک ایسا داغ ہوتا کہ کسی طرح اُن کی نبوت دُرست نہ ٹھہر سکتی اور نہ وہ راستباز ٹھہر سکتے اس لیے خدا تعالیٰ کی حمایت نے وہ تمام اسباب جمع کر دئے جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہونے سے بچ گئے۔ اُن اسباب میں سے پہلا سبب یہی تھا کہ پیلاطوس کی بیوی کو خواب آیا اور اُس سے ڈر کر پیلاطوس نے یہ تدبیر سوچی کہ یسوع جمعہ کے دن عصر کے وقت صلیب دیا جائے۔ اِس تدبیر میں پیلاطوس نے یہ سوچا تھا کہ غالباً اس قلیل مدت کی وجہ سے جو صرف جمعہ کے ایک دو گھنٹے ہیں یسوع کی جان بچ جائے گی کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ جمعہ ختم ہونے کے بعد مسیح صلیب پر رہ سکتا۔ وجہ یہ کہ یہودیوں کی شریعت کے رو سے یہ حرام تھا کہ کوئی شخص سبت میں یا سبت سے پہلی رات میں صلیب پر رہے۔ اور صلیب دینے کا یہ طریق تھا کہ صرف مجرم کو صلیب کے ساتھ جوڑ کر اُس کے پیروں اور ہاتھوں میں کیل ٹھونکے جاتے تھے اور تین دن تک وہ اسی حالت میں دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔ اور آخر کئی اسباب جمع ہو کر یعنی درد اور دھوپ اور تین دن کا فاقہ اور پیاس مجرم مر جاتا تھا۔ مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا ہے جو شخص جمعہ میں صلیب پر کھینچا جاتا تھا وہ اُسی دن اتار لیا جاتا تھا کیونکہ سبت کے دن صلیب پر رکھنا سخت گناہ اور موجب تاوان اور سزا تھا۔ سو یہ داؤ پیلاطوس کا چل گیا کہ یسوع جمعہ کی آخری گھڑی میں صلیب پر چڑھایا گیا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل نے چند اور اسباب بھی ایسے پیدا کر دئے جو پیلاطوس کے اختیار میں نہ تھے اور وہ یہ کہ عصر کے تنگ وقت میں تو یہودیوں نے حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھایا اور ساتھ ہی ایک سخت آندھی آئی جس نے دن کو رات کے مشابہ کر دیا۔ اب یہودی ڈرے کہ شاید شام ہو گئی کیونکہ یہودیوں کو سبت کے دن یا سبت کی رات کسی کو صلیب پر رکھنے کی سخت ممانعت تھی اور یہودیوں کے مذہب کے رو سے دن سے پہلے جو رات آتی ہے وہ آنے والے دن میں شمار کی جاتی ہے۔ اس لیے جمعہ کے بعد جو رات تھی وہ سبت کی رات تھی۔ لہٰذا یہودی آندھی کے پھیلنے کے وقت میں اس بات سے بہت گھبرائے کہ ایسا نہ ہو کہ سبت کی رات میں یہ شخص صلیب پر ہو۔ اس لیے جلدی سے انہوں نے اتار لیا اور دو چور جو ساتھ صلیب دئے گئے تھے اُن کی ہڈیاں توڑی گئیں۔ لیکن مسیح کی ہڈیاں نہیں توڑیں کیونکہ پیلاطوس کے سپاہیوں نے جن کو پوشیدہ طور پر سمجھایا گیا تھا کہہ دیا کہ اب نبض نہیں ہے اور یسوع مر چکا ہے۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ راست باز کا قتل کرنا کچھ سہل امر نہیں اس لیے اُس وقت نہ صرف پیلاطوس کے سپاہی یسوع کے بچانے کے لیے تدبیریں کر رہے تھے بلکہ یہود بھی حواس باختہ تھے۔ اور آثار قہر دیکھ کر یہودیوں کے دل بھی کانپ گئے تھے اور اُس وقت وہ پہلے زمانہ کے آسمانی عذاب جو اُن پر آتے رہے اُن کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس لیے کسی یہودی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ یہ کہے کہ ہم تو ضرور ہڈیاں توڑیں گے اور ہم باز نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اُس وقت رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض

نہایت غضب میں تھا اور جلال الٰہی یہودیوں کے دلوں پر ایک رعب ناک کام کر رہا تھا۔ لہذا انہوں نے جن کے باپ دادے ہمیشہ خدا تعالیٰ کے غضب کا تجربہ کرتے آئے تھے جب سخت اور سیاہ آندھی اور عذاب کے آثار دیکھے اور آسمان پر سے خوفناک آثار نظر آئے تو وہ سراسیمہ ہو کر گھروں کی طرف بھاگے۔

اس بات پر یقین کرنے کے لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز صلیب پر فوت نہیں ہوئے پہلی دلیل یہ ہے کہ وہ انجیل میں یونس نبی سے اپنی مشابہت بیان فرماتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یونس کی طرح میں بھی قبر میں تین دن رہوں گا جیسا کہ یونس مچھلی کے پیٹ میں رہا تھا اب یہ مشابہت جو نبی کے مونہہ سے نکلی ہے قابل غور ہے۔ کیونکہ اگر حضرت مسیح مردہ ہونے کی حالت میں قبر میں رکھے گئے تھے تو پھر مردہ اور زندہ کی کس طرح مشابہت ہو سکتی ہے؟ کیا یونس مچھلی کے پیٹ میں مرا رہا تھا؟ سو یہ ایک بڑی دلیل اس بات پر ہے کہ ہرگز مسیح علیہ السلام صلیب پر فوت نہیں ہوئے اور نہ وہ مردہ ہونے کی حالت میں قبر میں داخل ہوئے۔ پھر دوسری دلیل یہ ہے کہ پیلاطوس کی بیوی کو خواب میں دکھلایا گیا کہ اگر یہ شخص مارا گیا تو اس میں تمہاری تباہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حقیقت میں عیسیٰ علیہ السلام صلیب دئے جاتے یعنی صلیبی موت سے مر جاتے تو ضرور تھا کہ جو فرشتہ نے پیلاطوس کی بیوی کو کہا تھا وہ وعید پورا ہوتا۔ حالانکہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ پیلاطوس پر کوئی تباہی نہیں آئی۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیح نے خود اپنے بچنے کے لیے تمام رات دعا مانگی تھی اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ ایسا مقبول درگاہ الٰہی تمام رات رو رو کر دعا مانگے اور وہ دُعا قبول نہ ہو۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ صلیب پر پھر مسیح نے اپنے بچنے کے لیے یہ دعا کی ایلی ایلی لما سبقتانی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اب کیونکر ممکن ہے کہ جب کہ اس حد تک اُن کی گداز ش اور سوزش پہنچ گئی تھی پھر خدا ان پر رحم نہ کرتا۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رکھے گئے اور شاید اس سے بھی کم اور پھر اتارے گئے اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ اس تھوڑے عرصہ اور تھوڑی تکلیف میں ان کی جان نکل گئی ہو اور یہود کو بھی پختہ ظن سے اس بات کا دھڑکا تھا کہ یسوع صلیب پر نہیں مرا۔ چنانچہ اس کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا ہے وَمَا قَتَلُوْہُ يَقِيْنًا یعنی یہود قتل مسیح کے بارے میں ظن میں رہے اور یقینی طور پر انہوں نے نہیں سمجھا کہ درحقیقت ہم نے قتل کر دیا۔ چھٹی دلیل یہ ہے کہ جب یسوع کے پہلو میں ایک خفیف سا چھید دیا گیا تو اس میں سے خون نکلا اور خون بہتا ہوا نظر آیا اور ممکن نہیں کہ مردہ میں خون بہتا ہوا نظر آئے ساتویں دلیل یہ ہے کہ یسوع کی ہڈیاں توڑی نہ گئیں جو مصلوبوں کے مارنے کے لیے ایک ضروری فعل تھا۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ تین دن صلیب پر رکھ کر پھر بھی بعض آدمی زندہ رہ جاتے تھے پھر کیونکر ایسا شخص جو صرف چند منٹ صلیب پر رہا اور ہڈیاں نہ توڑی گئیں وہ مر گیا؟ آٹھویں دلیل یہ ہے کہ انجیل سے ثابت ہے کہ یسوع صلیب سے نجات پا کر پھر اپنے حواریوں کو ملا اور اُن کو اپنے زخم دکھلائے اور ممکن نہیں کہ یہ زخم اُس حالت میں موجود رہ سکتے کہ جب کہ یسوع مرنے کے بعد ایک تازہ اور نیا جلالی جسم پاتا۔ نویں دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیبی موت سے محفوظ رہنے پر یہی نسخہ مرہم عیسیٰ ہے۔ کیونکہ ہرگز خیال نہیں ہو سکتا کہ مسلمان طبیبوں

اور عیسائی ڈاکٹروں اور رومی مجوسی اور یہودی طبیبوں نے باہم سازش کر کے یہ بے بنیاد قصہ بنا لیا ہو۔ بلکہ یہ نسخہ طبابت کی صدہا کتابوں میں لکھا ہوا اب تک موجود ہے۔ ایک ادنیٰ استعداد کا آدمی بھی قرابادین قادری میں اس نسخہ کو امراض الجلد میں لکھا ہوا پائے گا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مذہبی رنگ کی تحریروں میں کئی قسم کی کمی زیادتی ممکن ہے۔ کیونکہ تعصبات کی اکثر آمیزش ہو جاتی ہے۔ لیکن جو کتابیں علمی رنگ میں لکھی گئیں ان میں نہایت تحقیق اور تدقیق سے کام لیا جاتا ہے۔ لہذا یہ نسخہ مرہم عیسیٰ اصل حقیقت کے دریافت کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کا ذریعہ ہے۔ اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہ خیالات کہ گویا حضرت عیسیٰ آسمان پر چلے گئے تھے کیسے اور کس پایہ کے ہیں۔ اور خود ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کے جسم کو آسمان پر اٹھانے کے لیے کوئی بھی ضرورت نہیں تھی۔ خدا تعالیٰ حکیم ہے عبث کام کبھی نہیں کرتا۔ جبکہ اُس نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غار ثور میں صرف دو تین میل کے فاصلے پر مکہ سے چھپا دیا اور سب ڈھونڈنے والے ناکام اور نامراد واپس گئے تو کیا وہ حضرت مسیح کو کسی پہاڑ کی غار میں چھپا نہیں سکتا تھا اور بجز دوسرے آسمان پر پہنچانے کے یہودیوں کی ہمت اور تلاش پر اُس کو دل میں کھٹکا تھا۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

حدیث صحیح میں حضرت عیسیٰ کی عمر ایک سو بیس برس مقرر کردی گئی ہے۔ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ اس عالم کو چھوڑ کر عالم اموات میں گئے اور اب تک اُن لوگوں میں رہتے ہیں جو فوت ہو چکے ہیں نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں اور نہ کوئی اور خاصہ اس دنیا کی زندگی کا ان میں موجود ہے۔ یحییٰ نبی جو فوت ہو کر دوسرے عالم میں گیا ہے وہ بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۱۵ حاشیہ)

انجیل کو پڑھ کر دیکھو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاف دعویٰ کرتے ہیں کہ میں جہان کا نور ہوں۔ میں ہادی ہوں اور میں خدا سے اعلیٰ درجہ کی محبت کا تعلق رکھتا ہوں۔ اور میں نے اُس سے پاک پیدائش پائی ہے اور میں خدا کا پیارا بیٹا ہوں۔ پھر باوجود ان غیر منفک اور پاک تعلقات کے لعنت کا ناپاک مفہوم کیونکر مسیح کے دل پر صادق آسکتا ہے ہرگز نہیں پس بلاشبہ یہ بات ثابت ہے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا یعنی صلیب پر نہیں مرا کیونکہ اُس کی ذات صلیب کے نتیجہ سے پاک ہے۔ اور جبکہ مصلوب نہیں ہوا تو لعنت کی ناپاک کیفیت سے بیشک اس کے دل کو بچایا گیا۔ اور بلاشبہ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ وہ آسمان پر ہرگز نہیں گیا کیونکہ آسمان پر جانا اس منصوبہ کی ایک جز تھی اور مصلوب ہونے کی ایک فرع تھی پس جبکہ ثابت ہوا کہ وہ نہ لعنتی ہوا اور نہ تین دن کے لیے دوزخ میں گیا اور نہ مرا تو پھر یہ دوسری جز آسمان پر جانے کی بھی باطل ثابت ہوئی اور اس پر اور بھی دلائل ہیں جو انجیل سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ منجملہ اُن کے ایک قول ہے جو مسیح کے مُنہ سے نکلا "لیکن میں اپنے جی اٹھنے کے بعد تم سے آگے جلیل کو جاؤں گا۔" دیکھو متی باب ۲۶ آیت ۳۲۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح قبر سے نکلنے کے بعد جلیل کی طرف گیا تھا نہ آسمان کی طرف۔ اور مسیح کا یہ کلمہ کہ "اپنے جی اُٹھنے کے بعد" اس سے مرنے کے بعد جینا مراد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ چونکہ یہودیوں اور عام لوگوں کی نظر میں وہ صلیب پر مر چکا تھا

اس لیے مسیح نے پہلے سے اُن کے آیندہ خیالات کے موافق یہ کلمہ استعمال کیا۔ اور درحقیقت جس شخص کو صلیب پر کھینچا گیا اُس کے پیروں اور ہاتھوں میں کیل ٹھوکے گئے یہاں تک کہ وہ اُس تکلیف سے غشی میں ہو کر مردہ کی سی حالت میں ہو گیا اگر وہ ایسے صدمہ سے نجات پا کر پھر ہوش کی حالت میں آجائے تو اُس کا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ میں پھر زندہ ہو گیا اور بلاشبہ اس صدمہ عظیمہ کے بعد مسیح کا بچ جانا ایک معجزہ تھا معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ درست نہیں ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ مسیح کی جان نکل گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ انجیلوں میں ایسے لفظ موجود ہیں لیکن یہ اُسی قسم کی انجیل نویسوں کی غلطی ہے جیسا کہ اور بہت سے تاریخی واقعات کے لکھنے میں انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ انجیلوں کے مُحقق شارحوں نے اس بات کو مان لیا ہے کہ انجیل میں دو حصّے ہیں (۱) ایک دینی تعلیم ہے جو حواریوں کو حضرت مسیح علیہ السلام سے ملی تھی جو اصل روح انجیل کا ہے (۲) دوسرے تاریخی واقعات ہیں جیسے حضرت عیسٰی کا شجرہ نسب اور اُن کا پکڑا جانا اور مارا جانا اور مسیح کے وقت میں ایک معجزہ نما تالاب کا ہونا وغیرہ یہ وہ امور ہیں جو لکھنے والوں نے اپنی طرف سے لکھے تھے۔ سو یہ باتیں الہامی نہیں ہیں بلکہ لکھنے والوں نے اپنے خیال کے موافق لکھے ہیں اور بعض جگہ مبالغہ بھی حد سے زیادہ کیا ہے جیسا کہ ایک جگہ لکھا ہے کہ جس قدر مسیح نے کام کیے یعنی معجزات دکھلائے اگر وہ کتابوں میں لکھے جاتے تو وہ کتابیں دنیا میں سما نہ سکتیں۔ یہ کس قدر مبالغہ ہے۔

ماسوا اس کے ایسے بڑے صدمہ کو جو مسیح پر وارد ہوا تھا موت کے ساتھ تعبیر کرنا خلاف محاورہ نہیں ہے۔ ہر ایک قوم میں قریباً یہ محاورہ پایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک مہلک صدمہ میں مبتلا ہو کر پھر آخر بچ جائے اس کو کہا جاتا ہے کہ نئے سرے زندہ ہوا اور کسی قوم اور ملک کے محاورہ میں ایسی بول چال میں کچھ بھی تکلف نہیں۔

ان سب امور کے بعد ایک اور بات ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ برنباس کی انجیل میں جو غالباً لندن کے کتب خانہ میں بھی ہو گی یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور نہ صلیب پر جان دی۔ اب ہم اس جگہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ گو یہ کتاب انجیلوں میں داخل نہیں کی گئی اور بغیر کسی فیصلہ کے رد کر دی گئی ہے مگر اس میں کیا شک ہے کہ یہ ایک پُرانی کتاب ہے اور اُسی زمانہ کی ہے جبکہ دوسری انجیلیں لکھی گئیں۔ کیا ہمیں اختیار نہیں ہے کہ اس پرانی اور دیرینہ کتاب کو عہد قدیم کی ایک تاریخی کتاب سمجھ لیں اور تاریخی کتابوں کے مرتبہ پر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھاویں؟ اور کیا کم سے کم اس کتاب کے پڑھنے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مسیح علیہ السلام کے صلیب کے وقت تمام لوگ اس بات پر اتفاق نہیں رکھتے تھے کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت ہو گئے۔ پھر ماسوا اس کے جبکہ خود ان چار انجیلوں میں ایسے استعارات موجود ہیں کہ ایک مردہ کو کہہ دیا ہے کہ یہ سوتا ہے مرا نہیں تو اس حالت میں اگر غشی کی حالت میں مردہ کا لفظ بولا گیا تو کیا یہ بعید ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ نبی کے کلام میں جھوٹ جائز نہیں۔ مسیح نے اپنی قبر میں رہنے کے تین دن کو یونس کے تین دنوں سے مشابہت دی ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ یونس تین دن مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا ایسا ہی مسیح بھی تین دن قبر میں زندہ رہا اور یہودیوں میں اُس وقت کی قبریں اس زمانہ کی قبروں کے مشابہ نہ تھیں بلکہ وہ ایک کوٹھے کی طرح اندر سے بہت فراخ ہوتی تھیں اور ایک طرف

کھڑکی ہوتی تھی جس کو ایک بڑے پتھر سے ڈھانکا ہوا ہوتا تھا۔ اور عنقریب ہم اپنے موقعہ پر ثابت کریں گے کہ عیسٰی علیہ السلام کی قبر جو حال میں سری نگر کشمیر میں ثابت ہوئی ہے وہ بعینہ اسی طرز کی قبر ہے جیسا کہ یہ قبر تھی جس میں حضرت مسیح غشی کی حالت میں رکھے گئے۔

غرض یہ آیت جس کو ابھی ہم نے لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح قبر سے نکل کر گلیل کی طرف گیا۔ اور مرقس کی انجیل میں لکھا ہے کہ وہ قبر سے نکل کر جلیل کی سڑک پر جاتا ہوا دکھائی دیا اور آخر اُن گیارہ حواریوں کو ملا جبکہ وہ کھانا کھا رہے تھے اور اپنے ہاتھ اور پاؤں جو زخمی تھے دکھائے اور انہوں نے گمان کیا کہ شاید یہ روح ہے۔ تب اس نے کہا کہ مجھے چھوؤ اور دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو اور اُن سے ایک بھونی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتا لیا اور اُن کے سامنے کھایا۔ دیکھو مرقس باب ۱۶ آیت ۱۴۔ اور لوقا باب ۲۴ آیت ۳۹۔ اور ۴۰ اور ۴۱۔ اور ۴۲۔ ان آیات سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ مسیح ہرگز آسمان پر نہیں گیا بلکہ قبر سے نکل کر جلیل کی طرف گیا اور معمولی جسم اور معمولی کپڑوں میں انسانوں کی طرح تھا اگر وہ مر کر زندہ ہوتا تو کیونکر ممکن تھا کہ جلالی جسم میں صلیب کے زخم باقی رہ جاتے اور اس کو روٹی کھانے کی کیا حاجت تھی اور اگر تھی تو پھر اب بھی روٹی کھانے کا محتاج ہوگا۔

ناظرین کو اس دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ یہودیوں کی صلیب اس زمانہ کی پھانسی کی طرح ہوگی جس سے نجات پانا قریباً محال ہے کیونکہ اُس زمانہ کی صلیب میں کوئی رسّا گلے میں نہیں ڈالا جاتا تھا اور نہ تختہ پر سے گرا کر لٹکایا جاتا تھا بلکہ صرف صلیب پر کھینچ کر ہاتھوں اور پیروں میں کیل ٹھونکے جاتے تھے اور یہ بات ممکن ہوتی تھی کہ اگر صلیب پر کھینچنے اور کیل ٹھونکنے کے بعد ایک دو دن تک کسی کی جان بخشی کا ارادہ ہو تو اُسی قدر عذاب پر کفایت کر کے ہڈیاں توڑنے سے پہلے اس کو زندہ اتار لیا جائے۔ اور اگر مارنا ہی منظور ہوتا تھا تو کم سے کم تین دن تک صلیب پر کھنچا ہوا رہنے دیتے تھے اور پانی اور روٹی نزدیک نہ آنے دیتے تھے اور اسی طرح دھوپ میں تین دن یا اس سے زیادہ چھوڑ دیتے تھے اور پھر اس کے بعد اس کی ہڈیاں توڑتے تھے اور پھر آخر ان تمام عذابوں کے بعد وہ مر جاتا تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے فضل و کرم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اس درجہ کے عذاب سے بچا لیا جس سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ انجیلوں کو ذرہ غور کی نظر سے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ تین دن تک صلیب پر رہے اور نہ تین دن کی بھوکھ اور پیاس اٹھائی اور نہ اُن کی ہڈیاں توڑی گئیں بلکہ قریباً دو گھنٹہ تک صلیب پر رہے اور خدا کے رحم اور فضل نے ان کے لیے یہ تقریب قائم کر دی کہ دن کے اخیر حصے میں صلیب دینے کی تجویز ہوئی اور وہ جمعہ کا دن تھا اور صرف تھوڑا سا دن باقی تھا اور اگلے دن سبت اور یہودیوں کی عید فسح تھی اور یہودیوں کے لیے یہ حرام اور قابل سزا جرم تھا کہ کسی کو سبت یا سبت کی رات میں صلیب پر رہنے دیں اور مسلمانوں کی طرح یہودی بھی قمری حساب رکھتے تھے اور رات دن پر مقدم سمجھی جاتی تھی پس ایک طرف تو یہ تقریب تھی کہ جو زمینی اسباب سے پیدا ہوئی۔ اور دوسری طرف آسمانی اسباب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پیدا ہوئے کہ جب چھٹا گھنٹہ ہوا تو ایک ایسی آندھی

آئی جس سے ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور وہ اندھیرا تین گھنٹے برابر رہا۔ دیکھو مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳۔ یہ چھٹا گھنٹہ بارہ بجے کے بعد تھا یعنی وہ وقت جو شام کے قریب ہوتا ہے۔ اب یہودیوں کو اس شدت اندھیرے میں یہ فکر پڑی کہ مبادا سبت کی رات آجائے اور وہ سبت کے مجرم ہو کر تاوان کے لائق ٹھہریں۔ اس لیے انہوں نے جلدی سے مسیح کو اور اُس کیساتھ کے دو چوروں کو بھی صلیب پر سے اتار لیا۔ اور اس کے ساتھ ایک اور آسمانی سبب یہ پیدا ہوا کہ جب پلاطوس کچہری کی مسند پر بیٹھا تھا اُس کی جورو نے اُسے کہلا بھیجا کہ اس راست باز سے کچھ کام نہ رکھ (یعنی اس کے قتل کرنے کے لیے سعی نہ کر) کیونکہ میں نے آج رات خواب میں اس کے سبب سے بہت تکلیف پائی دیکھو متی باب ۲۷ آیت ۱۹۔ سو یہ فرشتہ جو خواب میں پلاطس کی بیوی کو دکھایا گیا۔ اس سے ہم اور ہر ایک منصف یقینی طور پر یہ سمجھے گا کہ خدا کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا کہ مسیح صلیب پر وفات پاوے۔ جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی آج تک یہ کبھی نہ ہوا کہ جس شخص کے بچانے کے لیے خدائے تعالیٰ رویا میں کسی کو ترغیب دے کہ ایسا کرنا چاہیئے تو وہ بات خطا جائے۔ مثلاً انجیل متی میں لکھا ہے کہ خداوند کے ایک فرشتہ نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کے کہا "اٹھ اس لڑکے اور اس کی ماں کو ساتھ لیکر مصر کو بھاگ جا اور وہاں جب تک میں تجھے خبر نہ دوں ٹھہرا رہ کیونکہ ہیرودوس اس لڑکے کو ڈھونڈے گا کہ مار ڈالے" دیکھو انجیل متی باب ۲ آیت ۱۳۔ اب کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ یسوع کا مصر میں پہنچ کر مارا جانا ممکن تھا اسی طرح خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک تدبیر تھی کہ پلاطوس کی جورو کو مسیح کے لیے خواب آئی۔ اور ممکن نہ تھا کہ یہ تدبیر خطا جاتی اور جس طرح مصر کے قصہ میں مسیح کے مارے جانے کا اندیشہ ایک ایسا خیال ہے جو خدائے تعالیٰ کے ایک مقرر شدہ وعدہ کے برخلاف ہے اسی طرح اس جگہ بھی یہ خلاف قیاس بات ہے کہ خدائے تعالیٰ کا فرشتہ پلاطوس کی جورو کو نظر آوے اور وہ اس ہدایت کی طرف اشارہ کرے کہ اگر مسیح صلیب پر فوت ہو گیا تو یہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا تو پھر اس غرض سے فرشتہ کا ظاہر ہونا بے سود جاوے اور مسیح صلیب پر مارا جائے کیا اس کی دنیا میں کوئی نظیر ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہر ایک نیک دل انسان کا پاک کانشنس جب پلاطوس کی بیوی کے خواب پر اطلاع پائے گا تو بیشک وہ اپنے اندر اس شہادت کو محسوس کرے گا کہ درحقیقت اس خواب کا منشاء یہی تھا کہ مسیح کے چھوڑانے کی ایک بنیاد ڈالی جائے۔ یوں تو دنیا میں ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنے عقیدہ کے تعصب سے ایک کھلی کھلی سچائی کو رد کر دے اور قبول نہ کرے لیکن انصاف کے رو سے ماننا پڑتا ہے کہ پلاطوس کی بیوی کی خواب مسیح کے صلیب سے بچنے پر ایک بڑے وزن کی شہادت ہے۔ اور سب سے اول درجہ کی انجیل یعنی متی نے اس شہادت کو قلمبند کیا ہے۔ اگرچہ ایسی شہادتوں سے جو میں بڑے زور سے اس کتاب میں لکھوں گا مسیح کی خدائی اور مسئلہ کفارہ یک لخت باطل ہوتا ہے لیکن ایمانداری اور حق پسندی کا ہمیشہ یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ ہم سچائی کے قبول کرنے میں قوم اور برادری اور عقاید رسمیہ کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے آجتک اُس کی کوتہ اندیشیوں نے ہزاروں چیزوں کو خدا بنا ڈالا ہے یہاں تک کہ بلیوں اور سانپوں کو بھی پوجا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی عقلمند لوگ خداداد توفیق سے اس قسم کے مشرکانہ عقیدوں سے نجات پاتے آئے ہیں۔

اور منجملہ اُن شہادتوں کے جو انجیل سے ہمیں مسیح ابن مریم کی صلیبی موت سے محفوظ رہنے پر ملتی ہیں اس کا وہ سفر دور دراز ہے جو قبر سے نکل کر جلیل کی طرف اُس نے کیا۔ چنانچہ اتوار کی صبح کو پہلے وہ مریم مگدلینی کو ملا۔ مریم نے فی الفور حواریوں کو خبر کی کہ مسیح تو جیتا ہے لیکن وہ یقین نہ لائے پھر وہ حواریوں میں سے دو کو جبکہ وہ دیہات کی طرف جاتے تھے دکھائی دیا آخر وہ گیارھوں کو جبکہ وہ کھانے بیٹھے تھے دکھائی دیا اور اُن کی بے ایمانی اور سخت دلی پر ملامت کی۔ دیکھو انجیل مرقس باب ۱۶ آیت ۹ سے آیت ۱۴ تک۔ اور جب مسیح کے حواری سفر کرتے ہوئے اُس بستی کی طرف جا رہے تھے جس کا نام املوس ہے جو یروشلم سے پونے چار کوس کے فاصلہ پر ہے تب مسیح اُن کو ملا۔ اور جب وہ اس بستی کے نزدیک پہنچے تو مسیح نے آگے بڑھ کر چاہا کہ اُن سے الگ ہو جائے۔ تب انہوں نے اُس کو جانے سے روک لیا کہ آج رات ہم اکٹھے رہیں گے اور اس نے اُن کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھائی اور وہ سب مع مسیح کے املوس نام ایک گاؤں میں رات رہے۔ دیکھو لوقا باب ۲۴ آیت ۱۳ سے ۳۱ تک اب ظاہر ہے کہ ایک جلالی جسم کے ساتھ جو موت کے بعد خیال کیا گیا ہے مسیح سے فانی جسم کے عادات صادر ہونا اور کھانا اور پینا اور سونا اور جلیل کی طرف ایک لمبا سفر کرنا جو یروشلم سے تقریباً ستر کوس کے فاصلے پر تھا بالکل غیر ممکن اور نامعقول بات ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خیالات کے میلان کی وجہ سے انجیلوں کے ان قصوں میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے تاہم جس قدر الفاظ پائے جاتے ہیں اُن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مسیح اُسی فانی اور معمولی جسم سے اپنے حواریوں کو ملا اور پیادہ پا جلیل کی طرف ایک لمبا سفر کیا اور حواریوں کو اپنے زخم دکھلائے اور رات اُن کے پاس روٹی کھائی اور سویا۔ اور آگے چل کر ہم ثابت کریں گے کہ اُس نے اپنے زخموں کا ایک مرہم کے استعمال سے علاج کیا۔

اب یہ مقام ایک سوچنے کا مقام ہے کہ کیا ایک جلالی اور ابدی جسم پانے کے بعد یعنی اُس غیر فانی جسم کے بعد جو اس لائق تھا کہ کھانے پینے سے پاک ہو کر ہمیشہ خدائے تعالیٰ کے دائیں ہاتھ بیٹھے اور ہر ایک داغ اور درد اور نقصان سے منزہ ہو اور ازلی ابدی خدا کے جلال کا اپنے اندر رنگ رکھتا ہو ابھی اس میں یہ نقص باقی رہ گیا کہ اُس پر صلیب اور کیلوں کے تازہ زخم موجود تھے جن سے خون بہتا تھا اور درد اور تکلیف اُن کے ساتھ تھی جن کے واسطے ایک مرہم بھی طیار کی گئی تھی۔ اور جلالی اور غیر فانی جسم کے بعد بھی جو ابد تک سلامت اور بے عیب اور کامل اور غیر متغیر چاہیئے تھا کئی قسم کے نقصانوں سے بھرا رہا اور خود مسیح نے حواریوں کو اپنا گوشت اور ہڈیاں دکھلائیں اور پھر اسی پر کفایت نہیں بلکہ اس فانی جسم کے لوازم میں سے بھوکھ اور پیاس کی درد بھی موجود تھی ورنہ اس لغو حرکت کی کیا ضرورت تھی کہ مسیح جلیل کے سفر میں کھانا کھاتا اور پانی پیتا اور آرام کرتا اور سوتا۔ اس میں کیا شک ہے کہ اس عالم میں جسم فانی کے لیے بھوکھ اور پیاس بھی ایک درد ہے جس کے حد سے زیادہ ہونے سے انسان مر سکتا ہے پس بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا اور نہ کوئی جلالی جسم پایا بلکہ ایک غشی کی حالت ہو گئی تھی جو موت سے مشابہ تھی۔ اور خدائے تعالیٰ کے فضل سے یہ اتفاق ہوا کہ جس قبر میں وہ رکھا گیا وہ اس ملک کی قبروں کی طرح نہ تھی بلکہ ایک ہوادار کوٹھہ تھا جس میں ایک کھڑکی تھی اور اس زمانہ میں یہودیوں میں یہ رسم تھی کہ قبر کو ایک ہوادار اور کشادہ کوٹھہ کی

طرح بناتے تھے اور اس میں ایک کھڑکی رکھتے تھے اور ایسی قبریں پہلے سے موجود رہتی تھیں اور پھر وقت پر میت اس میں رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ گواہی انجیلوں سے صاف طور پر ملتی ہے۔ انجیل لوقا میں یہ عبارت ہے۔ "اور وے یعنی عورتیں اتوار کے دن بڑے تڑکے یعنی کچھ اندھیرے سے ہی اُن خوشبوؤں کو جو طیار کی تھیں لے کر قبر پر آئیں اور اُن کے ساتھ کئی اور بھی عورتیں تھیں۔ اور انہوں نے پتھر کو قبر پر سے ڈھلکا ہوا پایا (اس مقام میں ذرہ غور کرو) اور اندر جا کے خداوند یسوع کی لاش نہ پائی"۔ دیکھو لوقا باب ۲۴ آیت ۱-۲-۳۔ اب اندر جانے کے لفظ کو ذرہ سوچو۔ ظاہر ہے کہ اُسی قبر کے اندر انسان جا سکتا ہے کہ جو ایک کوٹھے کی طرح ہو اور اس میں کھڑکی ہو۔ اور ہم اپنے محل پر اسی کتاب میں بیان کریں گے کہ حال میں جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قبر سری نگر کشمیر میں پائی گئی ہے وہ بھی اس قبر کی طرح کھڑکی دار ہے۔ اور یہ ایک بڑے راز کی بات ہے جس پر توجہ کرنے سے محققین کے دل ایک عظیم الشان نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

اور منجملہ اُن شہادتوں کے جو انجیل سے ہم کو ملی ہیں پلاطس کا وہ قول ہے جو انجیل مرقس میں لکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے "اور جبکہ شام ہوئی اس لیے کہ تیاری کا دن تھا جو سبت سے پہلے ہوتا۔ یوسف ارمتیا جو نامور مشیر اور وہ خود خدا کی بادشاہت کا منتظر تھا آیا اور دلیری سے پلاطس پاس جا کے یسوع کی لاش مانگی اور پلاطس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ وہ یعنی مسیح ایسا جلد مر گیا"۔ دیکھو مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲ سے ۴۴ تک۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عین صلیب کی گھڑی میں ہی یسوع کے مرنے پر شبہ ہوا۔ اور شبہ بھی ایسے شخص نے کیا جس کو اس بات کا تجربہ تھا کہ اس قدر مدت میں صلیب پر جان نکلتی ہے۔

اور منجملہ اُن شہادتوں کے جو انجیل سے ہم کو ملی ہیں انجیل کی وہ عبارت ہے جو ذیل میں لکھتا ہوں "پھر یہودیوں نے اُس لحاظ سے کہ لاشیں سبت کے دن صلیب پر نہ رہ جائیں۔ کیونکہ وہ دن طیاری کا تھا۔ بلکہ بڑا ہی سبت تھا پلاطوس سے عرض کی کہ اُن کی ٹانگیں توڑی اور لاشیں اتاری جائیں۔ تب سپاہیوں نے آکر پہلے اور دوسرے کی ٹانگیں جو اس کے ساتھ صلیب پر کھینچے گئے تھے توڑیں۔ لیکن جب انہوں نے یسوع کی طرف آ کے دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں۔ پر سپاہیوں میں سے ایک نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے لہو اور پانی نکلا"۔ دیکھو یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱ سے آیت ۳۴ تک۔ ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کسی مصلوب کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے یہ دستور تھا کہ جو صلیب پر کھینچا گیا ہو اُس کو کئی دن صلیب پر رکھتے تھے اور پھر اُس کی ہڈیاں توڑتے تھے لیکن مسیح کی ہڈیاں دانستہ نہیں توڑی گئیں اور وہ ضرور صلیب پر سے ان دو چوروں کی طرح زندہ اتارا گیا۔ اسی وجہ سے پسلی چھیدنے سے خون بھی نکلا۔ مردہ کا خون جم جاتا ہے اور اس جگہ یہ بھی صریح معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر یہ کچھ سازش کی بات تھی۔ پلاطوس ایک خدا ترس اور نیک دل آدمی تھا۔ کھلی کھلی رعایت سے قیصر سے ڈرتا تھا کیونکہ یہودی مسیح کو باغی ٹھہراتے تھے مگر وہ خوش قسمت تھا کہ اُس نے مسیح کو دیکھا۔ لیکن قیصر نے اس نعمت کو نہ پایا۔ اُس نے نہ صرف دیکھا بلکہ بہت رعایت کی اور اُسکا ہرگز منشا نہ تھا کہ مسیح صلیب پاوے۔ چنانچہ انجیلوں کے دیکھنے سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ پلاطوس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ مسیح کو

چھوڑ دے۔ لیکن یہودیوں نے کہا کہ اگر تو اس مرد کو چھوڑ دیتا ہے تو تو قیصر کا خیر خواہ نہیں اور یہ کہا کہ یہ باغی ہے اور خود بادشاہ بننا چاہتا ہے دیکھو یوحنا باب ۱۹ آیت ۱۲۔ اور پلاطوس کی بیوی کی خواب اور بھی اس بات کی محرک ہوئی تھی کہ کسی طرح مسیح کو مصلوب ہونے سے بچایا جائے ورنہ اُن کی اپنی تباہی ہے۔ مگر چونکہ یہودی ایک شریر قوم تھی اور پلاطوس پر قیصر کے حضور میں مخبری کرنے کو بھی طیار تھے اس لیے پلاطوس نے مسیح کے چھڑانے میں حکمت عملی سے کام لیا۔ اول تو مسیح کا مصلوب ہونا ایسے دن پر ڈال دیا کہ وہ جمعہ کا دن تھا اور صرف چند گھنٹے دن سے باقی تھے اور بڑے سبت کی رات قریب تھی اور پلاطوس خوب جانتا تھا کہ یہودی اپنی شریعت کے حکموں کے موافق صرف شام کے وقت تک ہی مسیح کو صلیب پر رکھ سکتے ہیں۔ اور پھر شام ہوتے ہی اُن کا سبت ہے جس میں صلیب پر رکھنا روا نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مسیح شام سے پہلے صلیب پر سے اُتار اگیا۔ اور یہ قریب قیاس نہیں کہ دونوں چور جو مسیح کے ساتھ صلیب پر کھینچے گئے تھے وہ زندہ رہے۔ مگر مسیح صرف دو گھنٹہ تک مر گیا بلکہ یہ صرف ایک بہانہ تھا جو مسیح کو ہڈیاں توڑنے سے بچانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ سمجھدار آدمی کے لیے یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ دونوں چور صلیب پر سے زندہ اُتارے گئے اور ہمیشہ معمول تھا کہ صلیب پر سے لوگ زندہ اُتارے جاتے تھے اور صرف اس حالت میں مرتے تھے کہ ہڈیاں توڑی جائیں اور یا بھوک اور پیاس کی حالت میں چند روز صلیب پر رہ کر جان نکلتی تھی۔ مگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی مسیح کو پیش نہ آئی نہ وہ کئی دن صلیب پر بھوکا پیاسا رکھا گیا اور نہ اس کی ہڈیاں توڑی گئیں اور یہ کہہ کر کہ مسیح مر چکا ہے یہودیوں کو اس کی طرف سے غافل کر دیا گیا۔ مگر چوروں کی ہڈیاں توڑ کر اسی وقت اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بات تو تب تھی کہ اُن دونوں چوروں میں سے بھی کسی کی نسبت کہا جاتا کہ وہ مر چکا ہے اس کی ہڈیاں توڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور یوسف نام پلاطوس کا ایک معزز دوست تھا جو اس نواح کا رئیس تھا اور مسیح کے پوشیدہ شاگردوں میں داخل تھا وہ عین وقت پر پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پلاطوس کے اشارہ سے بلایا گیا تھا مسیح کو ایک لاش قرار دیکر اس کے سپرد کر دیا گیا کیونکہ وہ ایک بڑا آدمی تھا اور یہودی اس کے ساتھ کچھ پرخاش نہیں کر سکتے تھے۔ جب وہ پہنچا تو مسیح کو جو غشی میں تھا ایک لاش قرار دیکر اس نے لیا اور اُسی جگہ ایک وسیع مکان تھا جو اُس زمانہ کی رسم پر قبر کے طور پر بنایا گیا تھا اور اس میں ایک کھڑکی بھی تھی اور ایسے موقع پر تھا جو یہودیوں کے تعلق سے الگ تھا اُسی جگہ پلاطوس کے اشارہ سے مسیح کو رکھا گیا یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ حضرت موسیٰ کی وفات پر چودھویں صدی گزر رہی تھی اور اسرائیلی شریعت کے زندہ کرنے کے لیے مسیح چودھویں صدی کا مجدد تھا۔ اور اگرچہ یہودیوں کو اس چودھویں صدی میں مسیح موعود کا انتظار بھی تھا اور گذشتہ نبیوں کی پیشگوئیاں بھی اس وقت پر گواہی دیتی تھیں۔ لیکن افسوس کہ یہودیوں کے نالائق مولویوں نے اُس وقت اور موسم کو شناخت نہ کیا اور مسیح موعود کو جھوٹا قرار دیدیا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس کو کافر قرار دیا اس کا نام ملحد رکھا اور آخر اس کے قتل پر فتویٰ لکھا اور اس کو عدالت میں کھینچا۔ اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ خدا نے چودھویں صدی میں کچھ تاثیر ہی ایسی رکھی ہے جس میں قوم کے دل سخت اور مولوی دنیا پرست اور اندھے اور حق کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ اگر موسیٰ کی چودھویں صدی اور موسیٰ کے مثیل کی چودھویں

صدی کا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں باہم مقابلہ کیا جائے تو اوّل یہ نظر آئے گا کہ ان دونوں چودھویں صدیوں میں دو ایسے شخص ہیں جنہوں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور وہ دعویٰ سچا تھا اور خدا کی طرف سے تھا۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ قوم کے علماء نے اُن دونوں کو کافر قرار دیا اور ان دونوں کا نام ملحد اور دجال رکھا اور ان دونوں کی نسبت قتل کے فتوے لکھے گئے اور دونوں کو عدالتوں کی طرف کھینچا گیا جن میں سے ایک رومی عدالت تھی اور دوسری انگریزی۔ آخر دونوں بچائے گئے اور دونوں قسم کے مولوی یہودی اور مسلمان ناکام رہے۔ اور خدا نے ارادہ کیا کہ دونوں مسیحوں کو ایک بڑی جماعت بنا دے اور دونوں قسم کے دشمنوں کو نامراد رکھے۔ غرض موسیٰ کی چودھویں صدی اور ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چودھویں صدی اپنے اپنے مسیحوں کے لیے سخت بھی ہیں اور انجام کار مبارک بھی۔

اور منجملہ اُن شہادتوں کے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب سے محفوظ رہنے کے بارے میں ہمیں انجیل سے ملتی ہیں وہ شہادت ہے جو انجیل متی باب ۲۶ میں یعنی آیت ۳۶ سے ۴۶ تک مرقوم ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام گرفتار کیے جانے کا الہام پاکر تمام رات جناب الٰہی میں رو رو کر سجدے کرتے ہوئے دعا کرتے رہے۔ اور ضرور تھا کہ ایسی تضرع کی دعا جس کے لیے مسیح کو بہت لمبا وقت دیا گیا تھا قبول کی جاتی کیونکہ مقبول کا سوال جو بیقراری کے وقت کا سوال ہو ہرگز رد نہیں ہوتا۔ پھر کیوں مسیح کی ساری رات کی دعا اور درد مند دل کی دعا اور مظلومانہ حالت کی دعا رد ہو گئی۔ حالانکہ مسیح دعویٰ کرتا ہے کہ باپ جو آسمان پر ہے میری سنتا ہے پس کیونکر باور کیا جائے کہ خدا اُس کی سنتا تھا جبکہ ایسی بیقراری کی دعا سنی نہ گئی۔ اور انجیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دلی یقین تھا کہ اس کی وہ دعا ضرور قبول ہو گئی اور اس دعا پر اس کو بہت بھروسہ تھا۔ اسی وجہ سے جب وہ پکڑا گیا اور صلیب پر کھینچا گیا اور ظاہری علامات کو اُس نے اپنی امید کے موافق نہ پایا تو بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا کہ "ایلی ایلی لما سبقتانی" اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا۔ یعنی مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ میرا انجام یہ ہوگا اور میں صلیب پر مروں گا۔ اور میں یقین رکھتا تھا کہ تو میری دعا سنے گا۔ پس ان دونوں مقامات انجیل سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح کو خود دلی یقین تھا کہ میری دعا ضرور قبول ہو گی اور میرا تمام رات کا رو رو کر دعا کرنا ضایع نہیں جائے گا۔ اور خود اُس نے خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے شاگردوں کو تعلیم دی تھی کہ اگر دعا کرو گے تو قبول کی جائے گی بلکہ ایک مثال کے طور پر ایک قاضی کی کہانی بھی بیان کی تھی کہ جو نہ خلقت سے اور نہ خدا سے ڈرتا تھا اور اس کہانی سے بھی مدعا یہ تھا کہ تا حواریوں کو یقین آجائے کہ بیشک خدائے تعالیٰ دعا سنتا ہے۔ اور اگرچہ مسیح کو اپنے پر ایک بڑی مصیبت کے آنے کا خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم تھا۔ مگر مسیح نے عارفوں کی طرح اس بنا پر دعا کی کہ خدائے تعالیٰ کے آگے کوئی بات انہونی نہیں اور ہر ایک محو و اثبات اس کے اختیار میں ہے۔ لہذا یہ واقعہ کہ نعوذ باللہ مسیح کی خود دعا قبول نہ ہوئی یہ ایسا امر ہے جو شاگردوں پر نہایت بداثر پیدا کرنے والا تھا۔ سو کیونکر ممکن تھا کہ ایسا نمونہ جو ایمان کو ضایع کرنے والا تھا حواریوں کو دیا جاتا جبکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مسیح جیسے بزرگ نبی کی تمام رات کی پرسوز دعا قبول نہ ہو سکی تو اس بدنمونہ سے ان کا ایمان ایک

سخت امتحان میں پڑا تھا۔ لہذا خدائے تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس دعا کو قبول کرتا یقیناً سمجھو کہ وہ دعا جو گتسمینی نام مقام میں کی گئی تھی ضرور قبول ہو گئی تھی۔ (مسیح ہندوستان میں صفحہ ۱۷-۲۹)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ الآیۃ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا الآیۃ یعنی یہودیوں نے نہ حضرت مسیح کو درحقیقت قتل کیا اور نہ بذریعہ صلیب ہلاک کیا بلکہ اُن کو محض ایک شبہ پیدا ہوا۔ کہ گویا حضرت عیسیٰ صلیب پر فوت ہو گئے ہیں اور اُن کے پاس وہ دلائل نہیں ہیں جن کی وجہ سے اُن کے دل اس بات پر مطمئن ہو سکیں کہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام کی صلیب پر جان نکل گئی تھی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ بظاہر مسیح صلیب پر کھینچا گیا اور اس کے مارنے کا ارادہ کیا گیا مگر یہ محض ایک دھوکا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ایسا خیال کر لیا کہ درحقیقت حضرت مسیح علیہ السلام کی جان صلیب پر نکل گئی تھی بلکہ خدا نے ایسے اسباب پیدا کر دئے جن کی وجہ سے وہ صلیبی موت سے بچ رہا۔ اب انصاف کرنے کا مقام ہے کہ جو کچھ قرآن کریم نے یہود اور نصاریٰ کے برخلاف فرمایا تھا آخر کار وہی بات سچی نکلی اور اس زمانہ کی اعلیٰ درجہ کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مسیح درحقیقت صلیبی موت سے بچائے گئے تھے۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہودی اس بات کا جواب دینے سے قاصر رہے کہ کیونکر حضرت مسیح علیہ السلام کی جان بغیر ہڈیاں توڑنے کے صرف دو تین گھنٹہ میں نکل گئی۔ اسی وجہ سے بعض یہودیوں نے ایک اور بات بنائی ہے کہ ہم نے مسیح کو تلوار سے قتل کر دیا تھا حالانکہ یہودیوں کی پرانی تاریخ کے رو سے مسیح کو تلوار کے ذریعہ سے قتل کرنا ثابت نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ مسیح کے بچانے کے لیے اندھیرا ہوا بھونچال آیا پلاطوس کی بیوی کو خواب آئی سبت کے دن کی رات قریب آگئی جس میں مصلوبوں کو صلیب پر رکھنا روا نہ تھا۔ حاکم کا دل بوجہ ہولناک خواب کے مسیح کے چھڑانے کے لیے متوجہ ہوا۔ یہ تمام واقعات خدا نے اس لیے ایک ہی دفعہ پیدا کر دئے کہ تا مسیح کی جان بچ جائے۔ اس کے علاوہ مسیح کو غشی کی حالت میں کر دیا کہ ہر ایک کو مردہ معلوم ہو۔ اور یہودیوں پر اُس وقت ہیبت ناک نشان بھونچال وغیرہ کے دکھلا کر بزدلی اور خوف اور عذاب کا اندیشہ طاری کر دیا۔ اور یہ دھڑکا اس کے علاوہ تھا کہ سبت کی رات میں لاشیں صلیب پر نہ رہ جائیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ یہودیوں نے مسیح کو غشی میں دیکھ کر سمجھ لیا کہ فوت ہو گیا ہے۔ اندھیرے اور بھونچال اور گھبراہٹ کا وقت تھا۔ گھروں کا بھی اُن کو فکر پڑا کہ شاید اس بھونچال اور اندھیرے سے بچوں پر کیا گذرتی ہو گی اور یہ دہشت بھی دلوں پر غالب ہوئی کہ اگر یہ شخص کاذب اور کافر تھا جیسا کہ ہم نے دل میں سمجھا ہے تو اس کے اس دُکھ دینے کے وقت ایسے ہولناک آثار کیوں ظاہر ہوئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے لہذا اُن کے دل بیقرار ہو کر اس لائق نہ رہے کہ وہ مسیح کو اچھی طرح دیکھتے کہ آیا مر گیا یا کیا حال ہے۔ مگر درحقیقت یہ سب امور مسیح کے بچانے کے لیے خدائی تدبیریں تھیں۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ یعنی یہود نے مسیح کو جان سے مارا نہیں ہے لیکن خدا نے اُن کو شبہ میں ڈال دیا کہ گویا جان سے مار دیا ہے۔

اس سے راست بازوں کو خدائے تعالیٰ کے فضل پر بڑی امید بڑھتی ہے کہ جس طرح اپنے بندوں کو چاہے بچالے۔

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۴۹-۵۰)

افسوس کس قدر قرآن شریف کی تحریف کی جاتی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں مَاقَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ موجود ہے اِس سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ مگر ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ کسی شخص کا نہ مقتول ہونا نہ مصلوب ہونا اِس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ مع جسم عنصری آسمان پر اٹھا یا گیا ہو اگلی آیت میں صریح یہ لفظ موجود ہیں کہ لٰکِنْ شُبِّهَ لَھُمْ یعنی یہودی قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مگر اُن کو شبہ میں ڈالا گیا کہ ہم نے قتل کر دیا ہے پس شبہ میں ڈالنے کے لیے اِس بات کی کیا ضرورت تھی کہ کسی اور مومن کو مصلوب کرکے لعنتی بنایا جائے یا خود یہودیوں میں سے کسی کو حضرت عیسیٰ کی شکل بناکر صلیب پر چڑھایا جاوے۔ کیونکہ اِس صورت میں ایسا شخص اپنے تئیں حضرت عیسیٰ کا دشمن ظاہر کرکے اور اپنے اہل وعیال کے پتے اور نشان دیکر ایک دم میں مخلصی حاصل کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ عیسیٰ نے جادو سے مجھے اپنی شکل پر بنادیا ہے یہ کس قدر مجنونانہ توہمات ہیں کیوں لٰکِنْ شُبِّهَ لَھُمْ کے معنے یہ نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر فوت نہیں ہوئے مگر غشی کی حالت اُن پر طاری ہو گئی تھی بعد میں دو تین روز تک ہوش میں آگئے اور مرہم عیسیٰ کے استعمال سے (جو آج تک صدہا طبّی کتابوں میں موجود ہے جو حضرت عیسیٰ کے لیے بنائی گئی تھی) اُن کے زخم بھی اچھے ہو گئے۔

پھر ایک اور بدقسمتی ہے کہ وہ ان آیتوں کے شان نزول کو نہیں دیکھتے۔ قرآن شریف یہود و نصاریٰ کے اختلافات دُور کرنے کے لیے بطور حکم کے تھا تا اُن کے اختلافات کا فیصلہ کرے اور اُس کا فرض تھا کہ اُن کے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کرتا پس منجملہ متنازعہ فیہ امور کے ایک یہ امر بھی متنازعہ فیہ تھا کہ یہود کہتے تھے کہ ہماری توریت میں لکھا ہے کہ جو کاٹھ پر لٹکایا جاوے وہ لعنتی ہوتا ہے اس کی رُوح مرنے کے بعد خدا کی طرف نہیں جاتی۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مرگئے اِس لیے وُہ خدا کی طرف نہیں گئے اور آسمان کے دروازے اُن کے لیے نہیں کھولے گئے۔ اور عیسائیوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں عیسائی تھے اپنا یہ عقیدہ مشہور کیا تھا چنانچہ آج تک وہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر جان دیکر لعنتی تو بن گئے مگر یہ لعنت اَوروں کو نجات دینے کے لیے اُنہوں نے خود اپنے سر پر لے لی تھی اور آخر وہ نہ جسم عنصری کے ساتھ بلکہ ایک نئے اور ایک جلالی جسم کے ساتھ جو خون اور گوشت اور ہڈی اور زوال پذیر ہونے والے مادّہ سے پاک تھا خدا کی طرف اُٹھائے گئے۔ اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ان دونوں متخاصمین کی نسبت یہ فیصلہ دیا کہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ عیسیٰ کی صلیب پر جان نکلی یا وہ قتل ہوا تا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وُہ بموجب حکم توریت لعنتی ہے بلکہ وہ صلیبی موت سے بچایا گیا اور مومنوں کی طرح اُس کا خدا کی طرف رفع ہُوا اور جیسا کہ ہر ایک مومن ایک جلالی جسم خدا سے پاکر خدائے عزوجل کی طرف اُٹھایا جاتا ہے وہ بھی اُٹھائے گئے۔ اور اُن نبیوں میں جا ملے جو ان سے پہلے گذر چکے تھے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان سے سمجھا جاتا ہے کہ جو آپ نے معراج سے واپس آکر بیان فرمایا کہ

جیسے اور نبیوں کے مقدس اجسام دیکھے ویسا ہی حضرت عیسیٰ کو بھی انہیں کے رنگ میں پایا اور اُن کے ساتھ پایا کوئی نرالا جسم نہیں دیکھا۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۶-۳۸)

کہتے ہیں کہ آیت وما قتلوہ وما صلبوہ حضرت عیسیٰؑ کی حیات پر دلالت کرتی ہے اُن کی ایسی سمجھ پر رونا آتا ہے کیا جو شخص مصلوب نہیں ہوتا وہ مرتا نہیں ؟ میں نے بار بار بیان کیا ہے کہ قرآن شریف میں نفی صلیب اور رفع عیسیٰؑ کا ذکر اس لیے نہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کی حیات ثابت کرے بلکہ اس لیے یہ ذکر ہے کہ تا یہ ثابت کرے کہ عیسیٰ لعنتی موت سے نہیں مرا اور مومنوں کی طرح اُس کا رفع روحانی ہوا ہے اس میں یہود کا رد مقصود ہے کیونکہ وہ اُن کے رفع ہونے کے منکر ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص۵۹ حاشیہ)

وَفِی اٰیَۃِ وَمَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ اِشَارَۃٌ اُخْرٰی وَھُوَ اَنَّ النَّصَارٰی زَعَمُوْا اَنَّ عِیْسٰی صُلِبَ لِاَجْلِ تَطْہِیْرِھِمْ مِنَ الْمَعَاصِیْ وَظَنُّوْا کَاَنَّہٗ حَمَلَ بَعْدَ الصَّلْبِ جَمِیْعَ ذُنُوْبِھِمْ عَلٰی نَفْسِہٖ وَھُوَ کَفَّارَۃٌ لَّھُمْ وَمُطَہِّرُھُمْ مِنْ جَمِیْعِ الْمَعَاصِیْ وَالْخَطِیَّاتِ فَفِیْ نَفْیِ الصَّلْبِ رَدٌّ عَلَی النَّصَارٰی وَھَدْمٌ لِعَقِیْدَۃِ الْکَفَّارَۃِ وَمَعَ ذٰلِکَ رَدٌّ عَلَی الْیَھُوْدِ وَاسْتِیْصَالٌ لِکَیْدِھِمُ الَّذِیْ اخْتَالُوْا اعْتِصَامًا بِالتَّوْرَاتِ وَاِظْھَارُ الْبَرِیَّۃِ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ مِنْ بُھْتَانِ تِلْکَ الْاَقْوَامِ فَھٰذَا ھُوَ السَّبَبُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ قِصَّۃَ صَلْبِ عِیْسٰی فِی الْقُرْاٰنِ وَکَذَّبَہٗ وَاِلَّا فَمَا کَانَ فَائِدَۃٌ فِیْ ذِکْرِہٖ وَکَمْ مِنْ نَبِیٍّ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَاجَاءَ ذِکْرُ قَتْلِھِمْ فِی الْقُرْاٰنِ فَخُذْ مِنِّیْ ھٰذِہِ النُّکْتَۃَ وَکُنْ مِّنَ الْمُصَدِّقِیْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ ص۳۶)

(ترجمہ) اور آیت مَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ میں ایک اور بھی اشارہ ہے اور وہ یہ کہ نصاریٰ کا خیال ہے کہ اُنہیں گناہوں سے پاک کرنے کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیا گیا۔ اور اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ صلیبی موت کے بعد حضرت مسیح نے ان کے تمام گناہ اپنے اوپر اُٹھا لیے اور وہ اُن کے لیے کفارہ ہو گئے۔ اور انہیں تمام گناہوں اور خطاؤں سے پاک کرنے والے ہیں۔ پس صلیب کی نفی میں نصاریٰ کا ردّ اور ان کے عقیدۂ کفارہ کا توڑ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہود کا بھی ردّ ہے۔ اور اُن کے اس مکر کی بھی بیخ کنی ہے جو انہوں نے تورات کی آڑ لے کر اختیار کیا۔ نیز اس میں ان قوموں کے بہتان سے حضرت مسیح علیہ السلام کی بریت کا اظہار مقصود ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب دئے جانے کے قصہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی تردید کی ہے ورنہ اس کے ذکر کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ایسے کئی نبی گزرے ہیں جو خدا کی راہ میں قتل کیے گئے تھے۔ لیکن قرآن کریم میں ان کے قتل کا ذکر موجود نہیں۔ پس تم اس نکتہ کو مجھ سے سمجھ لو۔ اور تصدیق کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ۔

(حمامۃ البشریٰ ص۳۶)

یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے مسئلہ کو مسلمان عیسائیوں سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں کیونکہ قرآن شریف میں اُس کی موت کا بار بار ذکر ہے لیکن بعض نادانوں کو یہ دھوکہ لگا ہوا ہے کہ اس آیت قرآن شریف میں یعنی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ میں لفظ شُبِّهَ سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی جگہ کسی اور کو سولی دیا گیا اور وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہر ایک شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے پس اگر کوئی اور شخص حضرت عیسیٰ کی جگہ صلیب دیا جاتا تو صلیب دینے کے وقت ضرور وہ شور مچاتا کہ میں تو عیسیٰ نہیں ہوں اور کئی دلائل اور کئی امتیازی اسرار پیش کر کے ضرور اپنے تئیں بچا لیتا نہ یہ کہ بار بار ایسے الفاظ منہ پر لاتا جن سے اس کا عیسیٰ ہونا ثابت ہوتا۔ رہا لفظ شُبِّهَ لَهُمْ۔ سو اس کے وہ معنے نہیں ہیں جو سمجھے گئے ہیں اور نہ ان معنوں کی تائید میں قرآن اور احادیث نبویہ سے کچھ پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ معنے ہیں کہ موت کا واقعہ یہودیوں پر مشتبہ کیا گیا وہ یہی سمجھ بیٹھے کہ ہم نے قتل کر دیا ہے حالانکہ مسیح قتل ہونے سے بچ گیا۔ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس آیت میں شُبِّهَ لَهُمْ کے یہی معنے ہیں اور یہ سُنّت اللہ ہے خدا جب اپنے محبوبوں کو بچانا چاہتا ہے تو ایسے ہی دھوکہ میں مخالفین کو ڈال دیتا ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غار ثور میں پوشیدہ ہوئے تو وہاں بھی ایک قسم کے شُبِّهَ لَهُمْ سے خدا نے کام لیا یعنی مخالفین کو اس دھوکہ میں ڈال دیا کہ انہوں نے خیال کیا کہ اس غار کے مُنہ پر عنکبوت نے اپنا جالا بُنا ہوا ہے اور کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں پس کیونکر ممکن ہے کہ اس میں آدمی داخل ہو سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس غار میں جو قبر کی مانند تھی تین دن رہے جیسا کہ حضرت مسیح بھی اپنی شامی قبر میں جب غشی کی حالت میں داخل کیے گئے تین دن ہی رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو یونس پر بزرگی مت دو یہ بھی اشارہ اس مماثلت کی طرف تھا کیونکہ غار میں داخل ہونا اور مچھلی کے پیٹ میں داخل ہونا یہ دونوں واقعہ باہم ملتے ہیں پس نفی تفضیل اس وجہ سے ہے نہ کہ ہر ایک پہلو سے اس میں کیا شک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یونس سے بلکہ ہر ایک نبی سے افضل ہیں۔

اب خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سُنّتوں اور عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب مخالف اُس کے نبیوں اور ماموروں کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو ان کے ہاتھ سے اس طرح بھی بچا لیتا ہے کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اس شخص کو ہلاک کر دیا حالانکہ موت تک اُس کی نوبت نہیں پہنچتی اور یا وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا حالانکہ وہیں چھپا ہوا ہوتا ہے اور اُن کے شر سے بچ جاتا ہے۔ پس شُبِّهَ لَهُمْ کے یہی معنے ہیں اور یہ فقرہ شُبِّهَ لَهُمْ صرف حضرت مسیح سے خاص نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تب بھی یہ عادت اللہ ظہور میں آئی ابراہیم آگ سے جدا نہیں کیا گیا اور نہ آسمان پر چڑھایا گیا لیکن حسب منطوق آیت قُلْنَا يَا نَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا[1] آگ اُس کو جلا نہ سکی اسی طرح یوسفؑ بھی جب کوئیں میں پھینکا گیا آسمان پر نہیں گیا بلکہ کنواں اُس کو ہلاک نہ کر سکا اور ابراہیمؑ کا پیارا فرزند اسماعیل بھی ذبح کے وقت آسمان پر نہیں اُٹھایا گیا .... تھا بلکہ چھری اس کو ذبح نہ کر سکی ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محاصرہ غار ثور کے وقت آسمان پر نہیں گئے بلکہ خونخوار دشمنوں کی آنکھیں اُن کو دیکھ نہیں سکیں اسی طرح مسیح بھی صلیب کے وقت آسمان پر نہیں

[1] الانبیاء آیت ۷۰۔

گیا بلکہ صلیب اُس کو قتل نہیں کرسکا۔ غرض ان تمام نبیوں میں سے کوئی بھی مصیبتوں کے وقت آسمان پر نہیں گیا ہاں آسمانی فرشتے اُن کے پاس آئے اور اُنہوں نے مدد کی۔ یہ واقعات بہت صاف ہیں اور صاف طور پر ان سے ثبوت ملتا ہے کہ حضرت مسیح آسمان پر نہیں گئے اور اُن کا اُسی قسم کا رفع ہوا جیسا کہ ابراہیم اور تمام نبیوں کا ہوا تھا اور وہ آخر وفات پا گئے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۴۱-۱۴۲)

قرآن شریف یہود و نصاریٰ کی غلطیوں اور اختلافات کو دور کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور قرآن شریف کی کسی آیت کے معنے کرنے کے وقت جو یہود و نصاریٰ کے متعلق ہو یہ ضرور دیکھ لینا چاہیئے کہ اُن میں کیا جھگڑا تھا جس کو قرآن شریف فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ اب اِس اصول کو مدّنظر رکھ کر اس آیت کے معنے کہ مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ..... بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ بڑی آسانی سے ایک منصف مزاج سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہود کے عقیدہ کے رو سے جو شخص صلیب کے ذریعہ سے قتل کیا جائے وہ ملعون ہوتا ہے۔ اور اُس کا رفع روحانی خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتا اور وہ شیطان کی طرف جاتا ہے۔ اب خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ حضرت عیسیٰ کا رفع روحانی خدائے تعالیٰ کی طرف ہوا یا نہ ہوا۔ سو خدا نے اول یہود کے اِس وہم کو مٹایا کہ حضرت عیسےٰ بذریعہ صلیب قتل ہو چکے ہیں۔ اور فرمایا کہ یہود کا صرف یہ ایک شبہ تھا جو خدا نے اُن کے دلوں میں ڈال دیا عیسیٰ بذریعہ صلیب قتل نہیں ہوا تا اُس کو ملعون قرار دیا جائے بلکہ اُس کا رفع روحانی ہوا جیسے کہ ہر مومنوں کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ کو اس فضول بحث اور فیصلہ کی ضرورت نہ تھی کہ حضرت عیسےٰ بجسم عنصری آسمان پر گیا یا نہ گیا۔ کیونکہ یہود کا یہ متنازع فیہ امر نہ تھا۔ اور یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جو شخص مصلوب ہو جائے وہ مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جاتا۔ کیونکہ اِس سے تو لازم آتا ہے کہ جو شخص مصلوب نہ ہو وہ مع جسم عنصری آسمان پر چلا جاتا ہے اور نہ یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ بے ایمان اور لعنتی آدمی مع جسم آسمان پر نہیں جاتا۔ مگر مومن مع جسم عنصری آسمان پر چلا جاتا ہے کیونکہ موسیٰؑ جو یہود کے نزدیک سب سے بڑا نبی تھا اُس کی نسبت بھی یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ مع جسم آسمان پر چلا گیا پس تمام جھگڑا تو رفع روحانی کا تھا یہود کی طرف سے اپنے عقیدہ کے موافق یہ بحث تھی کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ ملعون ہیں کیونکہ اُن کا رفع روحانی نہیں ہُوا وجہ یہ کہ وہ صلیب کے ذریعہ سے مارے گئے پس اِسی غلطی کو خدا تعالیٰ نے دور کرنا تھا سو خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ عیسیٰ ملعون نہیں ہے بلکہ اُس کا رفع روحانی اور مومنوں کی طرح ہو گیا۔

یاد رہے کہ ملعون کا لفظ مرفوع کے مقابل پڑا ہے جبکہ مرفوع کے معنے روحانی طور پر مرفوع ہو پس جو لوگ حضرت عیسیٰ کو بوجہ مصلوب ہونے کے ملعون ٹھہراتے ہیں اُن کے نزدیک ملعون کے معنے صرف اِس قدر ہیں کہ ایسے شخص کا رفع روحانی نہیں ہوتا۔ عیسائیوں نے بھی اپنی غلطی سے تین دن کے لیے حضرت عیسیٰ کو ملعون مان لیا یعنی تین دن اُس کا رفع روحانی نہیں ہُوا۔ اور بموجب ان کے عقیدہ کے حضرت عیسیٰؑ ملعون ہونے کی حالت میں تحت الثریٰ میں گئے اور ساتھ کوئی جسم نہ تھا پھر مرفوع ہونے کی حالت میں کیوں جسم کی ضرورت ہوئی دونوں حالتیں ایک ہی رنگ کی ہونی چاہئیں۔ یہ ہماری طرف سے عیسائیوں پر

الزام ہے کہ وہ بھی رفع کے بارے میں غلطی میں پھنس گئے وہ اب تک اِس بات کے اقراری ہیں کہ صلیب کا نتیجہ توریت کی رو سے ایک روحانی امر تھا یعنی لعنتی ہونا جس کو دوسرے لفظوں میں عدم رفع کہتے ہیں پس بموجب ان کے عقیدہ کے عدم رفع رُوحانی طور پر ہی ہُوا اِس حالت میں رفع بھی روحانی ہونا چاہیئے تھا تا تقابل قائم رہے۔ عیسائی صاحبان مانتے ہیں کہ حضرت عیسٰی ملعون ہونے کی حالت میں صرف روحانی طور پر تحت الثریٰ اور دوزخ کی طرف گئے اُس وقت اُن کے ساتھ کوئی جسم نہ تھا پھر جبکہ یہ حالت ہے تو پھر مرفوع ہونے کی حالت میں کیوں جسم کی ضرورت پڑی اور کیوں جسم کو ساتھ ملایا گیا حالانکہ قدیم سے توریت کے ماننے والے تمام نبی اور تمام یہود کے فقیہ صلیبی لعنت کے یہی معنے کرتے آئے ہیں کہ روحانی طور پر رفع نہ ہو۔ اور اب بھی یہی کرتے ہیں کہ جو شخص صلیب کے ذریعہ سے مارا جائے اُس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا لعنت کے معنے عدم رفع ہے۔ بہرحال جبکہ خدا تعالیٰ نے یہود کا اعتراض دور کرنا تھا اور یہود اب تک عدم رفع سے مراد روحانی معنے لیتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ روحانی طور پر عیسٰی کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہُوا اور وہ کاذب تھا تو پھر خدا تعالیٰ اصل بات کو چھوڑ کر اور طرف کیوں چلا گیا گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے یہود کا اصل جھگڑا سمجھا ہی نہیں اور ایسے جج کی طرح فیصلہ کیا جو سراسر روئداد مثل کے برخلاف فیصلہ لکھ مارتا ہے ایسا گمان اگر عمداً خدا تعالیٰ کی نسبت کیا جائے۔ تو پھر کفر میں کیا شک ہے۔

پھر ماسوا اس کے ہم کہتے ہیں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے یہود کے اصل جھگڑے کی اس جگہ پرواہ نہ رکھ کر ایک نئی بات بیان کر دی ہے جس کا بیان کرنا محض ایک فضول اور غیر ضروری امر تھا یعنی یہ کہ حضرت عیسٰی کو مع جسم عنصری دوسرے آسمان پر بٹھا یا گیا۔ تو پھر اس خیال کا بُطلان اس طرح پر ہوتا ہے کہ اوّل تو قرآن شریف میں کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسٰی کو مع جسم عنصری دوسرے آسمان پر بٹھا یا گیا بلکہ قرآن شریف کے لفظ تو یہ ہیں کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ[1] یعنی خدا نے عیسٰی کو اپنی طرف اُٹھا لیا پس سوچو کہ کیا خدا دوسرے آسمان پر مجسم چیزوں کی طرح بیٹھا ہُوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہمیشہ روحانی ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی تمام نبیوں کی تعلیم ہے۔ خدا جسم نہیں ہے کہ تا جسمانی رفع اُس کی طرف ہو تمام قرآن شریف میں یہی محاورہ ہے کہ جب کسی کی نسبت فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی طرف وہ گیا یا خدا کی طرف اُس کا رفع ہوا تو اُس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ روحانی طور پر اُس کا رفع ہُوا جیسا کہ اس آیت میں بھی یہی معنے ہیں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ[2] الخ کہ اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف واپس آجا۔ پس کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ مع جسم عنصری آجا۔

ماسوا اس کے اس جگہ یہ سوال ہوگا کہ اگر اس جگہ رفع روحانی کا بیان نہیں ہے اور اس جگہ وہ جھگڑا فیصلہ نہیں کیا گیا جو یہود نے حضرت مسیح کے رفع روحانی کی نسبت انکار کیا تھا۔ اور نعوذ باللہ ملعون قرار دیا تھا تو پھر قرآن شریف کے کس مقام میں یہود کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جس کا جواب دینا بموجب وعدۂ الٰہی کے ضروری تھا۔ پس اس تمام بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰی کے رفع کو رفع جسمانی ٹھہرانا سراسر ہٹ دھرمی اور حماقت ہے۔ بلکہ یہ وہی رفع ہے جو ہر ایک مومن کے لیے وعدۂ الٰہی کے موافق موت کے بعد ہونا ضروری ہے۔ اور کافر کے لیے حکم ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ[3] یعنی اُن کے لیے آسمان

[1] النساء: ۱۵۹ [2] الفجر آیت ۲۸ و ۲۹ [3] الاعراف آیت ۴۱

کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی اُن کا رفع نہیں ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ[1]۔ پس سیدھی بات کو اُلٹا دینا تقویٰ اور طہارت کے برخلاف اور ایک طور سے تحریف کلام الٰہی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۴)

اور اُن کا (یعنی یہود کا) یہ کہنا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے حالانکہ نہ اُنہوں نے اُس کو قتل کیا اور نہ صلیب دیا بلکہ یہ امر اُن پر مشتبہ ہو گیا اور جو لوگ عیسیٰ کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں (یعنی عیسائی کہتے ہیں کہ عیسیٰ زندہ آسمان پر اُٹھایا گیا اور یہودی کہتے ہیں کہ ہم نے اُس کو ہلاک کر دیا) یہ دونوں گروہ محض شک میں پڑے ہوئے ہیں حقیقت حال کی اُن کو کچھ بھی خبر نہیں اور صحیح علم اُن کو حاصل نہیں محض اٹکلوں کی پیروی کرتے ہیں یعنی نہ عیسیٰ آسمان پر گیا جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے اور نہ یہودیوں کے ہاتھ سے ہلاک کیا گیا جیسا کہ یہودیوں کا گمان ہے بلکہ صحیح بات ایک تیسری بات ہے کہ وہ مخلصی پا کر ایک دوسرے ملک میں چلا گیا اور خود یہودی یقین نہیں رکھتے کہ اُنہوں نے اُس کو قتل کر دیا بلکہ خدا نے اُس کو اپنی طرف اُٹھا لیا اور خدا غالب اور حکمتوں والا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان آیات کے سر پر یہ قول یہودیوں کی طرف سے منقول ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ یعنی ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا سو جس قول کو خدا تعالیٰ نے یہودیوں کی طرف سے بیان فرمایا ہے ضرور تھا کہ پہلے اُسی کو رد کیا جاتا اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قَتَلُوْا کے لفظ کو صَلَبُوْا کے لفظ پر مقدم بیان کیا کیونکہ جو دعویٰ اس مقام میں یہودیوں کی طرف سے بیان کیا گیا ہے وہ تو یہی ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔

پھر بعد اس کے یہ بھی معلوم ہو کہ حضرت عیسیٰ کے ہلاک کرنے کے بارے میں کہ کس طرح اُن کو ہلاک کیا یہودیوں کے مذہب قدیم سے دو ہیں۔ ایک فرقہ تو کہتا ہے کہ تلوار کے ساتھ پہلے اُن کو قتل کیا گیا تھا اور پھر اُن کی لاش کو لوگوں کی عبرت کے لیے صلیب یا درخت پر لٹکایا گیا۔ اور دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے کہ اُن کو صلیب دیا گیا تھا اور بعد صلیب اُن کو قتل کیا گیا۔ اور یہ دونوں فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں پس چونکہ ہلاک کرنے کے وسائل میں یہودیوں کو اختلاف تھا بعض ان کی ہلاکت کا ذریعہ اوّل قتل قرار دیکر پھر صلیب کے قائل تھے اور بعض صلیب کو قتل پر مقدم سمجھتے تھے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے چاہا کہ دونوں کا رد کر دے۔ مگر چونکہ جس فرقہ کی تحریک سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہ وہی ہیں جو قبل از صلیب قتل کا عقیدہ رکھتے تھے اس لیے قتل کے گمان کا ازالہ پہلے کر دیا گیا اور صلیب کے خیال کا ازالہ بعد میں۔

افسوس کہ یہ شبہات دلوں میں اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ عموماً اکثر مسلمانوں کو نہ یہودیوں کے فرقوں اور ان کے عقیدہ سے پوری واقفیت ہے اور نہ عیسائیوں کے عقیدوں کی پوری اطلاع ہے۔ لہٰذا میں مناسب دیکھتا ہوں کہ اس جگہ میں یہودیوں کی ایک پُرانی کتاب میں سے جو قریباً انیس سو برس کی تالیف ہے اور اس جگہ ہمارے پاس موجود ہے اُن کے اس عقیدہ کی نسبت جو حضرت مسیح کے قتل کرنے کے بارے میں ایک فرقہ ان کا رکھتا ہے بیان کر دوں۔ اور یاد رہے کہ اس کتاب کا نام تولیدُوت یشوع ہے جو ایک قدیم زمانہ کی ایک عبرانی کتاب مصنفہ بعض علماء یہود ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے پھر وہ

---

[1] ص آیت ۵۱

(یعنی یہودی لوگ) یسوع کو باہر سزا کے میدان میں لے گئے اور اُس کو سنگسار کر کے مار ڈالا اور جب وہ مر گیا تب اُس کو کاٹھ پر لٹکا دیا تاکہ اس کی لاش کو جانور کھائیں اور اس طرح مردہ کی ذلّت ہو۔ اس قول کی تائید انجیل کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جہاں لکھا ہے کہ یسوع جسے تم نے قتل کر کے کاٹھ پر لٹکایا۔ دیکھو اعمال باب ۵ آیت ۳۰۔

انجیل کے اِس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے قتل کیا پھر کاٹھ پر لٹکایا اور یاد رہے کہ جیسا کہ پادریوں کی عادت ہے انجیلوں کے بعض اردو ترجمہ میں اِس فقرہ کو بدلا کر لکھ دیا گیا ہے مگر انگریزی انجیلوں میں اب تک وہی فقرہ ہے جو ابھی ہم نے نقل کیا ہے۔

بہرحال یہ ثابت شدہ امر ہے کہ یہودیوں کے حضرت عیسٰی کے ہلاک کرنے کے بارے میں دو مذہب ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اول قتل کیا اور پھر صلیب دیا پس اِس مذہب کا بھی رّد کرنا ضروری تھا اور ایسے خیال کے لوگوں کا پہلی آیت میں ذکر بھی ہے یعنی اِس آیت میں کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ پس جبکہ دعوٰی یہ تھا کہ ہم نے عیسٰی کو قتل کیا تو ضرور تھا کہ پہلے اِسی دعوٰی کو ردّ کیا جاتا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ردّ کو مکمل کرنے کے لیے دوسرے فرقہ کا بھی اس جگہ ردّ کر دیا جو کہتے تھے کہ ہم نے پہلے صلیب دیا ہے پس اس کے ردّ کے لیے مَا صَلَبُوْهُ فرمادیا۔ اور بعد اس کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا۔ ترجمہ یعنی عیسٰی نہ قتل کیا گیا اور نہ صلیب دیا گیا بلکہ اُن لوگوں پر حقیقتِ حال مشتبہ کی گئی۔ اور یہود و نصاریٰ جو مسیح کے قتل یا رفع روحانی میں اختلاف رکھتے ہیں محض شک میں مبتلا ہیں ان میں سے کسی کو بھی علم صحیح حاصل نہیں محض ظنوں اور شکوک میں گرفتار ہیں اور وہ خود یقین نہیں رکھتے کہ مسیح ابن مریم عیسٰی کو قتل کر دیا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں میں بعض فرقے اِس بات کے قائل ہیں کہ مسیح کی آمد ثانی الیاس نبی کی طرح بروزی طور پر ہے یعنی یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ مسیح زندہ آسمان پر بیٹھا ہے بلکہ درحقیقت وہ فوت ہو چکا ہے اور یہ جو وعدہ ہے کہ آخری زمانہ میں مسیح دوبارہ آئے گا اِس آمد ثانی سے مراد ایک ایسے آدمی کا آنا ہے کہ جو عیسٰی مسیح کی خو اور خُلق پر ہوگا نہ یہ کہ عیسٰی خود آجائے گا چنانچہ کتاب نیو لائف آف جیزس جلد اوّل صفحہ ۴۱۰ مصنفہ ڈی ایف سٹراس میں اِس کے متعلق ایک عبارت ہے جس کو میں اپنی کتاب تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۷ میں درج کر چکا ہوں اور اُس جگہ اس کے ترجمہ پر کفایت کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے

”اگرچہ صلیب کے وقت ہاتھ اور پاؤں دونوں پر میخیں ماری جائیں پھر بھی بہت تھوڑا خون انسان کے بدن سے نکلتا ہے اس واسطے صلیب پر لوگ رفتہ رفتہ اعضاء پر زور پڑنے کے سبب تشنج میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں یا بھوک سے مر جاتے ہیں پس اگر فرض بھی کر لیا جاوے کہ قریب چھ گھنٹہ صلیب پر رہنے کے بعد یسوع جب اُتارا گیا تو وہ مرا ہوا تھا تب بھی نہایت ہی اغلب بات یہ ہے کہ وہ صرف ایک موت کی سی بیہوشی تھی اور جب شفا دینے والی مرہمیں اور نہایت خوشبودار دوائیاں مَل کر اُسے غار کی ٹھنڈی جگہ میں رکھا گیا تو اُس کی بیہوشی دور ہوئی اِس دعوٰی کی دلیل میں عموماً یوسفس کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جہاں یوسفس نے لکھا ہے کہ مَیں ایک دفعہ ایک فوجی کام سے واپس آ رہا تھا تو راستہ میں مَیں نے دیکھا کہ کئی ایک یہودی

قیدی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں ان میں سے مَیں نے پہچانا کہ تین میرے واقف تھے پس ٹیٹس (حاکم وقت) سے اُن کے اُتار لینے کی اجازت حاصل کی اور اُن کو فوراً اُتار کر اُن کی خبر گیری کی تو ایک بالآخر تندرست ہوگیا پر باقی دو مرگئے۔"

اور کتاب ماڈرن ڈوٹ اینڈ کرسچین بیلیف کے صفحہ ۴۵۵ و ۴۵۷ و ۳۴۷ میں انگریزی میں ایک عبارت ہے جس کو ہم اپنی کتاب تحفہ گولڑویہ کے صفحہ ۱۳۸ میں لکھ چکے ہیں ترجمہ اُس کا ذیل میں لکھا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔

" شلیر میخر اور نیز قدیم محققین کا یہ مذہب تھا کہ یسوع صلیب پر نہیں مرا بلکہ ایک ظاہرا موت کی سی حالت ہوگئی تھی اور قبر سے نکلنے کے بعد کچھ مدّت تک اپنے حواریوں کے ساتھ پھرتا رہا اور پھر دوسری یعنی اصلی موت کے واسطے کسی علیحدگی کے مقام کی طرف روانہ ہوگیا۔"

اور یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۵۳ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اپنی دعا بھی جو انجیل میں میں موجود ہے یہی ظاہر کر رہی ہے جیسا کہ اس میں لکھا ہے دَعَا بِدُمُوْعٍ جَارِیَۃٍ وَّعَبَرَاتٍ مُّتَحَدِّرَۃٍ فَسُمِعَ لِتَقْوَاہُ۔ یعنی عیسٰی نے بہت گریہ و زاری سے دعا کی اور اس کے آنسو اُس کے رُخساروں پر پڑتے تھے پس بوجہ اُس کے تقویٰ کے وہ دعا منظور ہوگئی۔

اور کریئرؔ دلا سیرا جنوبی اٹلی کے سب سے مشہور اخبار نے مندرجہ ذیل عجیب خبر شائع کی ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۸۷۹ء کو یروشلم میں ایک بوڑھا راہب مسمی کورمرا جو اپنی زندگی میں ایک ولی مشہور تھا اس کے پیچھے اس کی کچھ جائداد رہی اور گورنر نے اس کے رشتہ داروں کو تلاش کر کے ان کے حوالہ دو لاکھ فرینک (ایک لاکھ پونے اُنیس ہزار روپیہ) کیے جو مختلف ملکوں کے سکوں میں تھے اور اس غار میں سے ملے جہاں وہ راہب بہت عرصہ سے رہتا تھا۔ روپیہ کے ساتھ بعض کاغذات بھی ان رشتہ داروں کو ملے جن کو وہ پڑھ نہ سکتے تھے۔ چند عبرانی زبان کے فاضلوں کو ان کاغذات کے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ یہ کاغذات بہت ہی پُرانی عبرانی زبان میں تھے جب اُن کو پڑھا گیا تو ان میں یہ عبارت تھی۔

"پطرس ماہی گیر یسوع مریم کے بیٹے کا خادم اِس طرح پر لوگوں کو خدا تعالیٰ کے نام میں اور اُس کی مرضی کے مطابق خطاب کرتا ہے" اور یہ خط اس طرح ختم ہوتا ہے۔

"مَیں پطرس ماہی گیر نے یسوع کے نام میں اور اپنی عمر کے نوّے سال میں یہ محبت کے الفاظ اپنے آقا اور مولیٰ یسوع مسیح مریم کے بیٹے کی موت کے تین عید فسح بعد (یعنی تین سال بعد) خداوند کے مُقدّس گھر کے نزدیک بولیر کے مکان میں لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

ان فاضلوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نسخہ پطرس کے وقت کا چلا آتا ہے۔ لنڈن بائبل سوسائٹی کی بھی یہی رائے ہے اور ان کا اچھی طرح امتحان کرانے کے بعد بائبل سوسائٹی اب ان کے عوض چار لاکھ لیرا (دو لاکھ ساڑھے سینتیس ہزار روپیہ) مالکوں کو دیکر کاغذات کو لینا چاہتی ہے۔

یسوع ابن مریم کی دعا ان دونوں پر سلام ہو۔اس نے کہا اے میرے خدا میں اس قابل نہیں کہ اس چیز پر غالب ہوں جس کو میں بُرا سمجھتا ہوں نہ میں نے اس نیکی کو حاصل کیا ہے جس کی مجھے خواہش تھی مگر دوسرے لوگ اپنے اجر کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور میں نہیں لیکن میری بڑائی میرے کام میں ہے مجھ سے زیادہ بُری حالت میں کوئی شخص نہیں ہے اے خدا جو سب سے بلند تر ہے میرے گناہ معاف کر۔ اے خدا ایسا نہ کر کہ میں اپنے دشمنوں کے لیے الزام کا سبب ہوں نہ مجھے اپنے دوستوں کی نظر میں حقیر ٹھہرا۔ اور ایسا نہ ہو کہ میرا تقویٰ مجھے مصائب میں ڈالے۔ ایسا نہ کر کہ یہی دنیا میری بڑی خوشی کی جگہ یا میرا بڑا مقصد ہو اور ایسے شخص کو مجھ پر مسلط نہ کر جو مجھ پر رحم نہ کرے اے خدا جو بڑے رحم والا ہے اپنے رحم کی خاطر ایسا ہی کر تُو اُن سب پر رحم کرتا ہے جو تیرے رحم کے حاجت مند ہیں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۶۸-۱۷۵)

یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کر دیا اِس قول سے یہودیوں کا مطلب یہ تھا کہ عیسیٰ کا مومنوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہُوا کیونکہ توریت میں لکھا ہے کہ جھوٹا پیغمبر قتل کیا جاتا ہے پس خدا نے اُس کا جواب دیا کہ عیسیٰ قتل نہیں ہُوا بلکہ ایمانداروں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف اُس کا رفع ہُوا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۶۹ حاشیہ)

(سوال پیش ہوا کہ) ”آیت کریمہ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں یہ شبہ باقی ہے کہ لفظ بَلْ فقرہ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کو مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے ساتھ ایک خاص ربط بخشتا ہے جس سے ان دونوں واقعات کا باہم اتصال سمجھا جاتا ہے پس یہ بظاہر مقتضی اِس بات کا ہے کہ واقع رفع کا زمانہ واقع قتل کے زمانہ کے ساتھ متحد و متصل ہو اور دونوں زمانوں میں کچھ فاصلہ نہ ہو حالانکہ حضرت کے بیان مبارک کے مطابق واقع رفع کے زمانہ اور واقع قتل کے زمانہ میں بہت فاصلہ اور ایک دور و دراز مدّت ہے۔ اِس تقدیر میں اگر آیت قرآن شریف کی اس طرح ہوتی کہ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ خَلَّصَهُ اللّٰهُ مِنْ اَيْدِيْهِمْ حَيًّا ثُمَّ رَفَعَهُ اِلَيْهِ تب البتہ یہ معنے ظاہر ہوتے۔“

(فرمایا) یہ شبہ صرف سرسری خیال سے آپ کے دل میں پیدا ہُوا ہے ورنہ اگر اصل واقعات آپ کے ملحوظ خاطر ہوتے تو یہ شبہ ہرگز پیدا نہ ہو سکتا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ توریت کی رُو سے یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر نبوّت کا دعویٰ کرنیوالا مقتول ہو جائے تو وہ مفتری ہوتا ہے سچّا نبی نہیں ہوتا اور اگر کوئی صلیب دیا جائے تو وہ لعنتی ہوتا ہے اور اُس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا ہے۔ اور یہودیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ قتل بھی کیے گئے اور صلیب بھی دئے گئے بعض کہتے ہیں کہ پہلے قتل کر کے پھر صلیب پر لٹکائے گئے اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے صلیب دیکر پھر اُن کو قتل کیا گیا پس اِن وجوہ سے یہودی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع روحانی کے مُنکر تھے اور اب تک منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قتل کیے گئے اور صلیب دئے گئے اس لیے اُن کا خدا تعالیٰ کی طرف مومنوں کی طرح رفع نہیں ہُوا۔ یہودیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ کافر کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا مگر مومن مرنے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھایا جاتا ہے اور اُن کے زعم میں حضرت عیسیٰ مصلوب ہو کر نعوذ باللہ کافر اور لعنتی ہو گئے اس لیے وہ خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے

نہیں گئے۔ یہ امر تھا جس کا قرآن شریف نے فیصلہ کرنا تھا پس خدا تعالیٰ نے ان آیات سے جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں یہ فیصلہ کر دیا چنانچہ آیت وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اسی فیصلہ کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ رفع الی اللہ یہودیوں اور اسلام کے عقیدہ کے موافق اُس موت کو کہتے ہیں جو ایمانداری کی حالت میں ہو اور روح خدا تعالیٰ کی طرف جاوے اور قتل اور صلیب کے اعتقاد سے یہودیوں کا منشاء یہ تھا کہ مرنے کے وقت روح خدا تعالیٰ کی طرف نہیں گئی پس یہودیوں کے دعویٰ قتل اور صلیب کا یہی جواب تھا جو خدا نے دیا۔ اور دوسرے لفظوں میں ماحصل آیت کا یہ ہے کہ یہودی قتل اور صلیب کا عذر پیش کر کے کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح کا خدا تعالیٰ کی طرف مرنے کے وقت رفع نہیں ہوا اور خدا تعالیٰ جواب میں کہتا ہے کہ بلکہ عیسیٰ کی روح کا خدا تعالیٰ کی طرف مرنے کے وقت رفع ہو گیا ہے پس تفسیر عبارت کی یہ ہے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ عِنْدَ مَوْتِهٖ چونکہ رفع الی اللہ موت کے وقت ہی ہوتا ہے بلکہ ایمان کی حالت میں جو موت ہو اس کا نام رفع الی اللہ ہے پس گویا یہودی یہ کہتے تھے کہ مَاتَ عِيْسٰى كَافِرًا غَيْرَ مَرْفُوْعٍ اِلَى اللّٰهِ۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ جواب دیا ہے بَلْ مَاتَ مُؤْمِنًا مَّرْفُوْعًا اِلَى اللّٰهِ سو بَلْ کا لفظ اس جگہ غیر محل نہیں بلکہ عین محاورۂ زبان عرب کے مطابق ہے۔ یہودیوں کی یہ غلطی تھی کہ وہ خیال کرتے تھے کہ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام درحقیقت مصلوب ہو گئے ہیں اس لیے وہ ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑ گئے کہ موت کے وقت ان کے رفع الی اللہ سے انکار کر دیا لیکن خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ہرگز مقتول اور مصلوب نہیں ہوئے اور موت کے وقت اُن کا رفع خدا تعالیٰ کی طرف ہُوا ہے پس اس طرز کلام میں کوئی اشکال نہیں اور بَلْ کا لفظ ہرگز ہرگز ان معنوں کی رُو سے غیر محل پر نہیں بلکہ جس حالت میں باتفاق یہود و اہل اسلام رفع الی اللہ کہتے ہی اُس کو ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی روح خدا تعالیٰ کی طرف جائے تو اس صورت میں اس مقام میں کسی دوسرے معنوں کی گنجائش ہی نہیں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۷۶-۱۷۷)

یاد رہے کہ قرآن شریف صاف لفظوں میں بلند آواز سے فرما رہا ہے کہ عیسیٰ اپنی طبعی موت سے فوت ہو گیا ہے جیسا کہ ایک جگہ تو اللہ تعالیٰ وعدہ کے طور پر یہ فرماتا ہے يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ[1]۔ اور دوسری آیت میں اُس وعدہ کے پورا ہونے کی طرف اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ اُس کا یہ قول ہے وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ پہلی آیت کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسیٰ مَیں تجھے طبعی موت دوں گا یعنی قتل اور صلیب کے ذریعہ سے تُو ہلاک نہیں کیا جائے گا اور مَیں تجھے اپنی طرف اُٹھاؤں گا پس یہ آیت تو بطور ایک وعدہ کے تھی۔ اور دوسری آیت ممدوحہ بالا میں اس وعدہ کے ایفاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ترجمہ مع تشریح یہ ہے کہ یہود خود یقیناً اعتقاد نہیں رکھتے کہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا ہے اور جب قتل ثابت نہیں تو پھر موت طبعی ثابت ہے جو ہر ایک انسان کے لیے ضروری ہے پس اس صورت میں جس امر کو یہودیوں نے اپنے خیال میں حضرت عیسیٰ کے رفع الی اللہ کے لیے مانع ٹھہرایا تھا یعنی قتل اور صلیب وہ مانع باطل ہُوا اور خدا نے اپنے وعدہ کے موافق اُن کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲۰۵)

علامہ امام زمخشری نے زیر آیت اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ[2] یہ لکھا ہے کہ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ حَتْفَ اَنْفِكَ یعنی اے عیسیٰ مَیں

---

[1] و [2] آل عمران آیت ۵۶

تجھے تیری طبعی موت سے ماروں گا ان معنوں کے کرنے میں علامہ موصوف نے صرف لفظ توفّی کی اصل وضع استعمال پر نظر نہیں رکھی بلکہ مقابل پر اس آیت کو دیکھ کر کہ مَاقَتَلُوْهُ يَقِيْنًا اور اس آیت کو دیکھ کر کہ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ اس بات پر قرینہ قویہ پایا کہ اس جگہ لفظ مُتَوَفِّيْكَ کا استعمال اپنی اصلی وضع پر ضروری اور واجب ہے یعنی اس جگہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسیٰ میں تجھے تیری طبعی موت سے ماروں گا اسی وجہ سے اس نے آیت اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ کی یہ تفسیر کی کہ اِنِّيْ مُمِيْتُكَ حَتْفَ اَنْفِكَ یعنی میں تجھے طبعی موت سے ماروں گا پس امام زمخشری کی نظر عمیق نہایت قابل تعریف ہے کہ انہوں نے لفظ توفّی کے صرف اصل وضع استعمال پر حصر نہیں رکھا بلکہ بالمقابل قرآن شریف کی ان آیتوں پر نظر ڈال کر کہ عیسیٰ قتل نہیں کیا گیا اور نہ صلیب دیا گیا اصل وضع لفظ کے مطابق مُتَوَفِّيْكَ کی تفسیر کر دی۔ اور ایسی تفسیر بجز ماہر فن علم لغت کے ہر ایک نہیں کر سکتا یاد رہے کہ علامہ امام زمخشری لسان العرب کا مسلّم عالم ہے۔ اور اس فن میں اس کے آگے تمام مابعد آنیوالوں کا سر تسلیم خم ہے اور کتب لغت کے لکھنے والے اس کے قول کو سند میں لاتے ہیں جیسا کہ صاحب تاج العروس بھی جا بجا اس کے قول کی سند پیش کرتا ہے۔

اب ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ جب کہ آیت مَاقَتَلُوْهُ يَقِيْنًا اور آیت وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ صرف توفّی کے لفظ کی توضیح کے لیے بیان فرمائی گئی ہے کوئی نیا مضمون نہیں ہے بلکہ صرف یہ تشریح مطلوب ہے کہ جیسا کہ لفظ مُتَوَفِّيْكَ میں یہ وعدہ تھا کہ عیسیٰ کو اُس کی طبعی موت سے مارا جائے گا ایسا ہی وہ طبعی موت سے مر گیا نہ کسی نے قتل کیا اور نہ کسی نے صلیب دیا پس یہ خیال بھی جو یہود کے دل میں پیدا ہؤا تھا جو عیسیٰ نعوذ باللہ لعنتی ہے اور اس کا روحانی رفع نہیں ہؤا ساتھ ہی باطل ہو گیا۔ کیونکہ اس خیال کی تمام بنا صرف قتل اور صلیب پر تھی اور اسی سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ ملعون اور راندہ درگاہ الٰہی ہیں جن کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہؤا۔ پس چونکہ مُتَوَفِّيْكَ کے لفظ کے ساتھ خدا تعالیٰ نے یہ شہادت دی کہ عیسیٰ اپنی طبعی موت سے مرا ہے۔ اور پھر خدا نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ مُتَوَفِّيْكَ کے لفظ کا جو اصل منشا تھا یعنی طبعی موت سے مرنا اس منشاء کی آیت مَاقَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ اور آیت وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے ساتھ پورے طور پر تشریح کر دی۔ کیونکہ جس شخص کی موت قتل وغیرہ خارجی ذریعوں سے نہیں ہوئی اُس کی نسبت یہی سمجھا جائے گا کہ وہ طبعی موت سے مرا ہے پس اس میں کچھ شک نہیں کہ فقرہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ مُتَوَفِّيْكَ کے لفظ کے لیے بطور تشریح واقع ہؤا ہے اور جب قتل اور صلیب کی نفی ثابت ہوئی تو بموجب اس قول کے کہ اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ رفع الی اللہ حضرت عیسیٰ کا ثابت ہو گیا۔ اور یہی مطلوب تھا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۹-۲۱۰)

چونکہ یہودیوں کے عقیدہ کے موافق کسی نبی کا رفع روحانی طبعی موت پر موقوف ہے اور قتل اور صلیب رفع روحانی کا مانع ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے اوّل یہود کے ردّ کے لیے یہ ذکر فرمایا کہ عیسیٰ کے لیے طبعی موت ہو گی اور پھر چونکہ رفع روحانی طبعی موت کا ایک نتیجہ ہے اس لیے لفظ مُتَوَفِّيْكَ کے بعد رَافِعُكَ اِلَيَّ لکھ دیا تا یہودیوں کے خیالات کا پورا

رد ہو جائے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صہ ۲۰۹ حاشیہ)

کہتے ہیں کہ مسیح کی شبیہ کو سولی دی گئی مگر میں کہتا ہوں کہ اس میں حصر عقلی یہی بتاتا ہے کہ وہ شخص جو مسیح کی شبیہ بنایا گیا یا دشمن ہوگا یا دوست اگر وہ دشمن تھا تو ضرور تھا کہ وہ شور مچاتا کہ میں مسیح نہیں ہوں اور میرے فلاں رشتہ دار موجود ہیں میرا اپنی بیوی کے ساتھ فلاں راز ہے مسیح کو تو میں ایسا سمجھتا ہوں غرض وہ شور مچا کر اپنی صفائی اور بریت کرتا حالانکہ کسی تاریخ صحیح سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جو شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا اُس نے شور مچا کر رہائی حاصل کر لی تھی۔

اور اگر وہ مسیح کا دوست اور حواری ہی تھا پھر صاف بات ہے کہ وہ مومن باللہ تھا اور وہ صلیب پر مرنے کی وجہ سے بلا وجہ ملعون ہوا اور خدا نے اس کو ملعون بنایا۔ رہی یہ بات کہ مصلوب ملعون کیوں ہوتا ہے؟ یہ عام بات ہے کہ جو چیز کسی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے وہ اس کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے سولی کو مجرموں کے ساتھ تعلق ہے جو گویا کاٹ دینے کے قابل ہوتے ہیں اور خدا کا تعلق مجرم کے ساتھ کبھی نہیں ہوتا یہی لعنت ہے اس وجہ سے وہ لعنتی ہوتا ہے۔

اس لیے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک مومن ناکردہ گناہ ملعون قرار دیا جاوے پس یہ دونوں باتیں غلط ہیں اصل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر ظاہر کی کہ مسیح کی حالت غشی وغیرہ سے ایسی ہوگئی جیسے مردہ ہوتے ہیں۔

(الحکم جلدہ ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صہ ۸)

میں اس کو نہیں مانتا کہ وہ (حضرت مسیح علیہ السلام) صلیب پر مرے ہوں بلکہ میری تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے اور خود مسیح علیہ السلام بھی میری رائے کے ساتھ متفق ہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا بڑا معجزہ یہی تھا کہ وہ صلیب پر نہیں مریں گے۔ کیونکہ یونس نبی کے نشان کا انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ اب اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ عیسائیوں نے غلطی سے مان رکھا ہے کہ وہ صلیب پر مر گئے تھے تو پھر یہ نشان کہاں گیا؟ اور یونس نبی کے ساتھ مماثلت کیسی ہوگی۔ یہ کہنا کہ وہ قبر میں داخل ہو کر تین دن کے بعد زندہ ہوئے بہت بیہودہ بات ہے اس لیے کہ یونس تو زندہ مچھلی کے پیٹ میں داخل ہوئے تھے نہ مر کر۔ یہ نبی کی بے ادبی ہے اگر ہم اس کی تاویل کرنے لگیں اصل بات یہی ہے کہ وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے۔ ہر ایک سلیم الفطرۃ انسان کو واجب ہے کہ جو کچھ مسیح نے صاف لفظوں میں کہا اُس کو محکم طور پر پکڑیں۔ حضرت عیسیٰ پر ایک غشی کی حالت تھی۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اور اسباب اور واقعات بھی اس قسم کے پیش آگئے تھے کہ وہ صلیب کی موت سے بچ جائیں چنانچہ سبت کے شروع ہونے کا خیال۔ حاکم کا مسیح کے خون سے ہاتھ دھونا اُس کی بیوی کا خواب دیکھنا وغیرہ خدا تعالیٰ نے ہم کو سمجھا دیا ہے اور ایک بہت بڑا ذخیرہ دلائل اور براہین کا دیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہرگز ہرگز صلیب پر نہیں مرے صلیب پر سے زندہ اُتر آئے بغشی کی حالت بجائے خود موت ہوتی ہے دیکھو سکتہ کی حالت میں نہ نبض رہتی ہے نہ دل کا مقام حرکت کرتا ہے بالکل مردہ ہی ہوتا ہے مگر پھر وہ زندہ ہو جاتا ہے مسیح کے نہ مرنے کے دو بڑے زبردست گواہ ہیں اول تو یہ ہے کہ یہ ایک نشان اور معجزہ تھا ہم نہیں چاہتے کہ اس کی کسر شان کی جاوے اور وہ آدمی سخت حقارت

اور نفرت کے لائق ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کو حقیر سمجھ لیتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصدیق نہیں کرتے کہ وہ صلیب پر مرے ہیں بلکہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے اور پھر اپنی طبعی موت سے مرنے کی تصدیق فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اگر انجیل کی ساری باتوں کو جو اس واقعہ صلیب کے متعلق ہیں یکجائی نظر سے دیکھیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ مسیح صلیب پر مرے ہوں۔ حواریوں کو ملنا۔ زخم دکھانا کباب کھانا۔ سفر کرنا یہ سب امور ہیں جو اس بات کی نفی کرتے ہیں اگرچہ خوش اعتقادی سے ان واقعات کی کچھ بھی تاویل کیوں نہ کی جاوے لیکن ایک منصف مزاج کہہ اُٹھے گا کہ زخم لگے رہے اور کھانے کے محتاج رہے یہ زندہ آدمی کے واقعات ہیں۔ یہ واقعات اور صلیب کے بعد کے دوسرے واقعات گواہی دیتے ہیں اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دو تین گھنٹہ سے زیادہ صلیب پر نہیں رہے اور وہ صلیب اس قسم کی نہ تھی جیسے آج کل کی پھانسی ہوتی ہے جس پر لٹکاتے ہی دو تین منٹ کے اندر ہی کام تمام ہو جاتا ہے بلکہ اس میں تو کیل وغیرہ ٹھونک دیا کرتے تھے اور کئی دن رہ کر انسان بھوکا پیاسا مر جاتا تھا۔ مسیح کے لیے اس قسم کا واقعہ پیش نہیں آیا وہ صرف دو تین گھنٹہ کے اندر ہی صلیب سے اُتار لیے گئے۔ یہ تو وہ واقعات ہیں جو انجیل میں موجود ہیں جو مسیح کے صلیب پر نہ مرنے کے لیے زبردست گواہ ہیں۔

پھر ایک اور بڑی شہادت ہے جو اس کی تائید میں ہے وہ مرہم عیسیٰ ہے جو طب کی ہزاروں کتابوں میں برابر درج ہے اور اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ مرہم مسیح کے زخموں کے واسطے حواریوں نے طیار کی تھی۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کی طبی کتابوں میں اس مرہم کا ذکر موجود ہے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صلیب پر مر گئے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور امر پیدا ہو گیا ہے جس نے قطعی طور سے ثابت کر دیا ہے کہ مسیح کا صلیب پر مرنا بالکل غلط اور جھوٹ ہے وہ ہرگز ہرگز صلیب پر نہیں مرے اور وہ ہے مسیح کی قبر۔ مسیح کی قبر سرینگر خانیار کے محلہ میں ثابت ہو گئی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو دنیا کو ایک زلزلہ میں ڈال دیگی کیونکہ اگر مسیح صلیب پر مرے تھے تو یہ قبر کہاں سے آ گئی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

سوال کیا گیا کہ مسیح کو صلیب پر چڑھانا قرآن میں کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ فرمایا وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے یہ واقعہ عیسائیوں اور یہودیوں کے متواترات سے ہے قرآن شریف اس کا انکار کیوں کرنے لگا تھا۔ قرآن یا حدیث صحیح میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ مسیح چھت پھاڑ کر آسمان پر چلا گیا یہ صرف خیالی امر ہے کیونکہ اگر مسیح صلیب پر چڑھایا نہیں گیا اور وہ کوئی اور شخص تھا تو دو صورتوں سے خالی نہیں یا دوست ہو گا یا دشمن پہلی صورت میں مسیح نے اپنے ہاتھ سے ایک دوست کو ملعون بنایا۔ جس لعنت سے خود بچنا چاہتا تھا اس کا نشانہ دوست کو بنایا۔ یہ کون شریف پسند کر سکتا ہے۔ پس وہ حواری تو ہو نہیں سکتا۔ اگر دشمن تھا۔ تو چاہیئے تھا کہ وہ دہائی دیتا اور شور مچاتا کہ میں تو فلاں شخص ہوں مجھے کیوں صلیب دیتے ہو۔ میری بیوی اور رشتہ داروں کو بلاؤ میرے فلاں اسرار ان کے ساتھ ہیں تم دریافت کر لو۔

غرض اس تواتر کا انکار فضول ہے اور قرآن شریف نے ہرگز اس کا انکار نہیں کیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن شریف نے تکمیل صلیب کی نفی کی ہے جو لعنت کا موجب ہوتی تھی۔ نفس صلیب پر چڑھائے جانے کی نفی نہیں کی اس لیے مَا قَتَلُوْهُ کہا اگر یہ مطلب نہ تھا تو پھر مَا قَتَلُوْهُ کا کہنا فضول ہو جائے گا۔ یہ ان کے تواترات میں کہاں تھا؟ یہ اس لیے فرمایا کہ صلیب کے ذریعہ قتل نہیں کیا پھر مَا صَلَبُوْهُ سے اور صراحت کی اور لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے اور واضح کر دیا کہ وہ زندہ ہی تھا یہودیوں نے مردہ سمجھ لیا۔

اگر آسمان پر اٹھایا جاتا تو خدا تعالیٰ کی قدرت پر مبنی ہوتی کہ اصل مقصود تو بچانا تھا یہ کیا تماشا کیا کہ دوسرے آسمان سے پہلے بچا ہی نہ سکا۔ چاہیئے تھا کہ ایک یہودی کو ساتھ لے جاتے اور آسمان سے گرا دیتے تاکہ ان کو معلوم ہو جاتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

یہود لوگ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو دو وجہ سے ملعون ٹھہراتے تھے ایک اُن کو ولد الزنا کہہ کر دوسرا مصلوب کرنے کے لحاظ سے جب خدا تعالیٰ نے اُن کے ولد الزنا ہونے کا ذب کیا ہے تو چاہیئے تھا کہ اُن کے مصلوب ہونے کا بھی ذب کرتا جسم کے ساتھ آسمان پر جانا تو ایک الگ تھلگ امر ہے اول ذب دلالت کرتا ہے کہ دوسرا بھی ذب ہو۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۱-۲۲)

عام محاورہ زبان میں اگر یہ کہا جاوے کہ فلاں مصلوب ہوا یا پھانسی دیا گیا تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ صلیب پر اس کی جان نکل گئی۔ اگر کوئی مجرم پھانسی پر لٹکایا جاوے مگر اس کی جان نہ نکلے اور زندہ اتار لیا جاوے تو کیا اس کی نسبت پھانسی دیا گیا یا مصلوب کا لفظ بولا جاوے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ اُس کی نسبت یہ الفاظ بولنے ہی جرم ہوں گے۔ مصلوب اُسے کہتے ہیں کہ جس کی جان صلیب پر نکل جاوے اور جس کی جان نہ نکلے اُسے مصلوب نہیں کہتے خواہ وہ صلیب پر چڑھا کر اتار لیا گیا ہو۔ یہودی زندہ موجود ہیں ان سے دریافت کر لو کہ آیا مصلوب کے یہ معنے ہیں جو ہم کرتے ہیں یا وہ جو ہمارے مخالف کرتے ہیں۔ پھر محاورہ زبان کو بھی دیکھنا چاہیئے مَا صَلَبُوْهُ کے ساتھ ہی مَا قَتَلُوْهُ رکھ دیا کہ بات سمجھ میں آجاوے کہ صلیب سے مراد جان لینی تھی جو کہ نہیں لی گئی اور صلیبی قتل وقوع میں نہیں آیا۔

شُبِّهَ لَهُمْ کے معنے ہیں مُشَبَّه بالمصلوب ہو گیا۔ اس میں ان لوگوں کا یہ قول کہ کوئی اور آدمی مسیح کی شکل میں بن گیا تھا بالکل باطل ہے عقل بھی اُسے قبول نہیں کرتی اور نہ کوئی روایت اس کے بارے میں صحیح موجود ہے۔ بھلا سوچ کر دیکھو کہ اگر کوئی اور آدمی مسیح کی شکل بن گیا تھا تو وہ دو حال سے خالی نہ ہو گا یا تو مسیح کا دوست ہو گا۔ یا اس کا دشمن۔ اگر دوست ہو گا تو یہ اعتراض ہے کہ جس لعنت سے خدا نے مسیح کو بچانا چاہا۔ وہ اس کے دوست کو کیوں دی۔ اس سے خدا ظالم ٹھہرتا ہے اور اگر وہ دشمن تھا تو اُسے کیا ضرورت تھی کہ وہ مسیح کی جگہ پھانسی ملتا اُس نے دوہائی دی ہو گی اور چلایا ہو گا کہ میرے بیوی بچوں سے پوچھو میرا فلاں نام ہے اور میں مسیح نہیں ہوں پھر اکثر موجودہ آدمیوں کی تعداد میں سے بھی ایک آدمی کم

ہو گیا ہوگا جس سے معاینہ لگ سکتا ہے کہ یہ شخص مسیح نہیں غرضیکہ ہر طرح سے یہ خیال باطل ہے اور شُبِّهَ لَهُمْ سے مراد مُشَبَّهٌ بِالْمَصْلُوبِ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۱-۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر۔ ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۲-۳۲۳)

یہود کا اعتراض جو قرآن شریف میں درج ہے۔ وہ یہی ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ یعنی ہم نے مسیح کو قتل کیا۔ چونکہ انہوں نے قتل کا لفظ بولا تھا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے پہلے لفظ قتل کی ہی نفی کی۔ دوم یہ کہ یہود میں دو روایتیں تھیں۔ ایک یہ کہ ہم نے یسوع کو تلوار سے قتل کر دیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس کو صلیب پر مارا ہے پس اللہ تعالیٰ نے ہر دو کی جدا جدا نفی کی تیسری بات یہ ہے کہ یہودیوں کی بعض پرانی کتب میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یسوع کو پہلے سنگسار کیا گیا تھا۔ اور جب وہ مر گیا تو بعد میں اس کو کاٹھ پر لٹکایا گیا۔ یعنی پہلے قتل ہوا اور پیچھے صلیب۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی نفی کی اور فرمایا کہ یہود جھوٹے ہیں۔ نہ حضرت مسیح ان کے ہاتھوں قتل ہوئے اور نہ صلیب کے ذریعے مارے گئے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

انجیل کے دو مقام پر غور کرنے سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سولی پر ہر گز نہیں مرا چنانچہ ایک جگہ مسیح خود اپنے قصہ کو یونس بن متی کے قصہ سے مشابہت دیتا ہے بلکہ اس قصہ کو بطور نشان کے قرار دیتا ہے اب ظاہر ہے کہ یونس مچھلی کے پیٹ کے اندر نہیں مرا تھا اور نہ مُردہ ہونے کی حالت میں شکم ماہی میں داخل ہوا تھا تو پھر اگر فرض کیا جائے کہ مسیح مُردہ ہونے کی حالت میں قبر میں داخل ہوا تھا تو یونس کے قصہ سے اس کے قصہ کو کسی طرح مشابہت نہیں رہتی پس یہ مثال جو اپنے لیے مسیح نے پیش کی ہے ایک دانشمند کے لیے بشرطیکہ اس کی عقل کسی تعصّب یا عادت کے نیچے دبی ہوئی نہ ہو۔ مسیح کی طرف سے ایک صاف گواہی ہے کہ وہ سولی پر نہیں مرا تھا اور قبر میں زندہ داخل ہوا تھا جیسا کہ یونس بھی مچھلی کے پیٹ میں زندہ ہی داخل ہوا تھا اور یونس نبی پر جو ابتلا آیا تھا اصل جڑھ اس کی وہ پیشگوئی تھی جو قوم کی نسبت اس نے کی تھی یعنی یہ کہ چالیس دن کے اندر اُن پر عذاب نازل ہوگا اور وہ عذاب ان پر نازل نہ ہوا اس لیے یونس کے دل پر اس سے بہت صدمہ پہنچا کہ اس کی پیشگوئی غلط نکلی اور وہ قوم سے ڈر کر کسی دوسرے ملک کی طرف بھاگ گیا۔ اسی طرح مسیح ابن مریم پر جو ابتلا آیا اس کی جڑھ بھی اس کی وہ پیشگوئی تھی جو قوم کی نسبت اس نے کی تھی یعنی یہ کہ وہ اس قوم پر حکمران اور بادشاہ ہو جائے گا اور داؤد کا تخت اسے ملے گا مگر وہ پیشگوئی ان معنوں کی رُو سے جو مسیح نے سمجھی پوری نہ ہوئی اور غلط نکلی اس لیے مسیح کو اس کی وجہ سے بہت صدمہ پہنچا اور وہ جیسا کہ اس نے انجیل میں اشارہ کیا ہے ارادہ رکھتا تھا کہ یونس کی طرح کسی اَور ملک کی طرف بھاگ جائے کیونکہ اس نے کہا کہ نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں پس اس کے دل میں تھا کہ کسی اَور جگہ ہجرت کر کے عزّت پاوے اور ہجرت انبیاء علیہم السّلام کی سُنّت میں سے بھی ہے۔ لیکن چونکہ کسی قدر قوم کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھانا اس کی قسمت میں تھا اس لیے اس ارادہ کے پورا کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا اور سولی پر کھینچا گیا مگر جیسا کہ یونس کے قصہ کے خیال سے سمجھا جاتا ہے خُدا نے اس کو اس موت سے بچا لیا اور اُس کی دُعا کو جو باغ میں کی تھی اس کے تقویٰ کی وجہ سے قبول کیا تب اس نے اپنے اس ارادہ کو پورا کیا جو اس کے دل میں تھا اور دوسری گُم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں وہ دُور دراز ملکوں کی طرف نکل گیا اسی وجہ سے اس کا

یشوع آسف نام ہُوا یعنی گُم شدہ قوم کو تلاش کرنے والا۔ پھر کثرتِ استعمال سے یہ لفظ یوز آسف کے نام سے مشہور ہو گیا۔ غرض یُونس نبی سے مسیح کی یہی مماثلت تھی کہ وُہ زِندگی کی حالت میں ہی یُونس کی طرح قبر میں داخل ہُوا اور نیز قوم کے ڈر سے دُوسرے ملک کی طرف بھاگا۔ اگر اس مماثلت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر مسیح کا بیان خلاف واقع ٹھہرتا ہے اور نیز بجائے مماثلت کے منافات ثابت ہوتی ہے اور مماثلت کے قبول کرنے سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔

پھر دوسری دلیل اس بات پر کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ اس کی وہ دعا ہے جو اس نے باغ میں نہایت تضرّع اور عاجزی سے کی تھی جس کا مفصّل ذکر انجیلوں میں موجود ہے اور مَیں ہرگز سمجھ نہیں سکتا کہ اس قسم کی دُعا کہ مسیح جیسا ایک راستباز ساری رات کرے اور گریہ اور زاری اور تضرع کو انتہا تک پہنچا دے تب بھی وُہ دعا قبول نہ ہو۔ دعا کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ سُولی سے بچایا جاوے کیونکہ یہودیوں نے یہ سوچا تھا کہ مسیح کو سُولی دیکر یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کریں کہ وہ نعوذ باللہ صادق نہیں ہے اور ان کاذبوں میں سے ہے جن پر خُدا کی لعنت ہے یہی غم تھا جس کی وجہ سے مسیح نے ساری رات دعا کی تھی ورنہ اس کو موت کا کوئی غم نہ تھا اور ایسی حالت میں ضروری تھا کہ خُدا تعالیٰ مسیح کی بریّت کے لیے اس کی دعا منظور فرماتا سو وہ دعا منظور کی گئی۔ چُنانچہ انجیل میں صریح الفاظ میں اس کا ذکر ہے کہ مسیح رات کو روتا رہا اور وہ جناب الٰہی میں چیخیں مارتا رہا اور ساری رات اس کے آنسُو جاری رہے پس اس کے تقویٰ کی وجہ سے وہ دُعا قبول کی گئی دیکھو عبرانیوں ۵۔ اس مقام میں عیسائیوں کی عقل اور سمجھ پر بہت سخت تعجب ہے کہ جس حالت میں انجیل خود گواہی دیتی ہے کہ باغ والی دُعا قبول کی گئی تو پھر قبول ہونے کے بجز اس کے اَور کیا معنے ہیں کہ وہ صلیب پر مرنے سے بچایا گیا۔

پھر تیسری دلیل اس بات پر کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا اس کا زِندہ دیکھا جانا ہے یعنی وہ بعد صلیب کے اپنے حواریوں کو مِلا اور اپنے زخم دِکھلائے اور ان کے ساتھ گلیل کی طرف گیا اس جگہ عقل کو اس فتوے کے لیے کوئی راہ نہیں کہ وہ مرکر پھر زندہ ہو گیا کیونکہ یہ امر غیر معقول اور سخت بعید از قیاس ہے جو بودی اور کمزور شہادتوں سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ عقل کے لیے سہل طریق یہی ہے کہ صلیب پر اس کی جان نہیں نکلی تھی جیسا کہ اس سے پہلے بھی ایسے اتّفاق کئی ہوئے تھے کہ بعض آدمی صلیب پر نہیں مرے تھے۔ پس طریق معقول کو چھوڑ کر طریق نامعقول کو اختیار کرنا سراسر سچائی سے دشمنی اور جہالت سے دوستی ہے اگر مسیح نئے سرے زندہ کیا جاتا تو اس کو قوم کا کچھ خوف نہ ہوتا کیونکہ جس خُدا نے اس کو مار کر پھر زندہ کیا وُہ خُدا اس کو ضرور بچاتا اور اس کا یقین بڑھ جاتا۔ پھر اس کے کیا معنے ہیں کہ مسیح دوبارہ زندگی کے بعد یہُود سے ڈرتا رہا کہ مجھے پکڑ نہ لیں اور اپنے شاگردوں کو منع کرتا رہا کہ یہُود کو میری اطلاع نہ ہو تا اَیسا نہ ہو کہ وہ لوگ پھر آکر مجھے پکڑ لیں۔ پھر عجیب در عجیب یہ بات ہے کہ مسیح کو دوبارہ خدا نے زندہ تو کیا مگر اس کے زخموں کے اچھا کرنے پر وُہ قادر نہ ہو سکا اور آخر اچھا کرنے کے لیے اس مرہم کی حاجت پڑی جو آج تک مرہم عیسیٰ کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔

پھر چوتھی دلیل اس بات پر کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا نُسخہ مرہم عیسیٰ ہے جو طب کی کتابوں میں جو ہزار کے قریب ہیں بلکہ

غالباً اس سے زیادہ ہوں گی اب تک پایا جاتا ہے موجود ہے اور یہ کتابیں یونانی رُومی عبرانی فارسی میں موجود ہیں اور اس زمانہ سے عیسوی تاریخ کی دوسری صدی تک ان کتابوں کا پتہ مِلتا ہے۔ اِس نسخہ مرہم عیسٰی کی نسبت طبیب لوگ یہ لکھتے چلے آئے ہیں کہ یہ مرہم حواریوں نے عیسٰی کے لیئے تیّار کی تھی اور چُونکہ اس مرہم کے فوائد میں یہ لکھّا ہے کہ وہ چوٹوں کے لیے بُہت مفید ہے اور زخم کو اچھّا کرتی ہے اور خُون جاری کو بند کرتی ہے پس اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مرہم حضرت مسیح کی اُن چوٹوں کے لیے تیار کی گئی تھی جو صلیب سے اس کو پہنچی تھیں یہ شہادت یعنی نسخہ مرہم عیسٰی بڑی توجہ کے لائق ہے کیونکہ علمی کتابوں میں یہ درج ہے اور ہزارہا طبیب اس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔

پھر پانچویں دلیل اِس بات پر کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ نقودیموس کی انجیل ہے جو لنڈن میں بزبان انگریزی ۱۸۲۰ء میں چھپی تھی اس انجیل کے دسویں باب میں لکھّا ہے کہ رُومی سپاہیوں نے یہودیوں کو کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ تُم نے یوسف کو جس نے یسُوع کی نعش کو کفنایا تھا ایک کوٹھہ میں بند کیا ہے جس کی کلید مہر بند کر کے رکھّی تھی اور جب تم نے اس کوٹھہ کو کھولا تو یوسف کو تم نے نہ پایا ہم کو یوسف کو دو جس کو تم نے ایک کوٹھہ میں بند کیا تھا تو ہم تم کو یسُوع کو (یعنی عیسٰی علیہ السلام کو) دیدیں گے جس کی ہم نے قبر میں حفاظت کی تھی یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم تم کو یوسف کو دیدیں گے تم ہم کو یسوع کو دو۔ یوسف اپنے شہر اری ماتھی میں ہے سپاہیوں نے جواب دیا کہ اگر یوسف اری ماتھی میں ہے تو یسُوع گلیل میں ہے"۔ اِس لفظ میں صریح اشارہ ہے کہ یسُوع یعنی حضرت عیسٰے صلیب سے بچ کر اپنے شہر گلیل میں چلا گیا تھا۔ اور اس انجیل پر کچھ موقوف نہیں مروجہ چار انجیلوں پر غور کر کے بھی اِس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسیح قبر سے نکل کر گلیل کی طرف گیا تھا پس ایک امر قریب القیاس کو چھوڑ کر جو صاف اور سیدھے طور پر معلُوم ہو رہا ہے ایک اعجوبہ بعید از قیاس بنانا اور مسیح کو مار کر پھر اس کو زِندہ کرنا ایک ایسا بیہودہ خیال ہے کہ کوئی عقلمند اس کو قبُول نہیں کریگا۔ کیوں یہ بات نہ مان لی جائے کہ یسُوع صلیب پر نہیں مرا۔ اور مرنے کے اسباب بھی پیدا نہیں ہوئے تھے نہ اِس کی ٹانگیں توڑی گئیں اور نہ وُہ بُہت دیر تک صلیب پر رکھّا گیا پھر کچھ تعجّب کی بات نہیں تھی کہ وہ صلیب پر نہ مرتا بلکہ تعجّب کی بات یہ تھی کہ باوجود ٹانگیں نہ توڑنے کے وہ صرف تین چار گھنٹہ کی مُدّت میں صلیب پر مرجاتا۔ اِس واقعہ کی نظیر کِسی مصلوب میں نہ پاؤگے کہ وہ باوجود ٹانگوں کے نہ توڑنے کے اِس قدر جلد مرگیا۔ قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ خُدا کی جان بہ نسبت اِنسان کی جان کے بُہت دیر کے بعد نکلتی۔ کیونکہ جس قدر خُدا اور انسان میں فرق ہے اسی قدر ان کے مرنے میں بھی فرق ہونا چاہیئے پس یہ کیا بات ہے کہ اِنسانوں کی تو صلیب پر چھ چھ سات سات دِن کے بعد جان نکلے اور جو خُدا کہلاتا تھا جس نے اپنی قوی طاقتوں سے دُنیا کو نجات دینا تھا وہ تین چار گھنٹہ میں مرجائے۔ اور یہ جواب صحیح نہیں ہے کہ اگرچہ وہ خُدا تھا لیکن تمام دُنیا کے گناہ جو یک دفعہ اکٹّھے ہو کر اس کی گردن پر پڑے اس لیے وُہ کمزور ہوگیا اور ان گناہوں کے بوجھ کی برداشت نہ کرسکا۔ اِس لیے وہ جلد تر مرگیا۔ کیونکہ اگر وہ گناہوں کے بوجھ کی برداشت نہیں کرسکتا تھا تو کیوں اس نے ایسی فضولی کی کہ مَیں برداشت کرلُوں گا۔ اور کیوں اس نے کہا کہ مَیں تمام دُنیا کے گناہ اپنے سر پر لے سکتا ہُوں۔

جس حالت میں گناہ غالب رہے جنہوں نے بہت جلد اس کو ہلاک کر دیا اس لیے قوی طاقت کے لحاظ سے گناہ قابلِ تعریف ہیں نہ کہ یسوع مسیح کہ جو ایسا جلد ان کے نیچے دب کر مر گیا جیسا کہ ایک کمزور بچہ تھوڑے سے صدمہ سے مر جاتا ہے بہرحال عجیب بات ہے کہ خدا پر گناہ غالب آ گئے یہاں تک کہ ان گناہوں نے صرف تین گھنٹوں تک اس کا کام تمام کر دیا۔ ایسے کمزور خدا پر ایمان لانا جس کی موت کا باعث اس کی کمزوری ہے۔ اگر بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تو پادری صاحبوں کا عجیب عقیدہ ہے مگر ان کی ان سکلوپیڈیا جلد ۱۳ صفحہ ۶۶۹ میں لکھا ہے کہ مسیح نے واقعہ صلیب کے بعد دس دفعہ لوگوں سے ملاقات کی اور وہ صرف تین گھنٹہ تک صلیب پر رہا تھا اب اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ ضرور صلیب سے زندہ بچ گیا جیسا کہ اس سے پہلے بھی وہ یہودیوں کے حملوں سے بچتا رہا۔

پھر چھٹی دلیل اس بات پر کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا یہ ہے کہ عیسائی فرقوں میں سے بعض فرقے خود اس بات کے قائل ہیں کہ مسیح کی آمد ثانی الیاس نبی کی طرح بروزی رنگ میں ہوگی نہ کہ حقیقی یعنی اس کی خُو اور صفت پر کوئی اور آ جائیگا کیونکہ وہ مر چکا ہے۔ چنانچہ نیو لائف آف جیزس جلد اول ص۴۱۰ مصنفہ ڈی الیف سٹراس میں یہ عبارت ہے جس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔

جرمن کے محقق عیسائی یہ دلائل دیتے ہیں کہ اگرچہ صلیب کے وقت ہاتھ اور پاؤں دونوں پر میخیں ماری جائیں پھر بھی بہت تھوڑا خون انسان کے بدن سے نکلتا ہے اس واسطے صلیب پر لوگ رفتہ رفتہ اعضا پر زور پڑنے کے سبب تشنج میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں یا بھوک سے مر جاتے ہیں پس اگر فرض بھی کر لیا جائے تو قریب چھ گھنٹے صلیب پر رہنے کے بعد یسوع جب اُتارا گیا تو وہ مرا ہوا تھا تب بھی نہایت ہی اغلب بات یہ ہے کہ وہ صرف ایک موت کی سی بیہوشی تھی اور جب شفا دینے والی مرہمیں اور نہایت ہی خوشبودار دوائیاں مل کر اسے غار کی ٹھنڈی جگہ میں رکھا گیا تو اس کی بیہوشی دور ہوئی۔ اس دعویٰ کی دلیل میں عموماً یوسفس کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جہاں یوسفس نے لکھا ہے کہ میں ایک دفعہ ایک فوجی کام سے واپس آ رہا تھا تو راستہ میں میں نے دیکھا کہ کئی ایک یہودی قیدی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں ان میں سے میں نے پہچانا کہ تین میرے واقف تھے پس میں نے ٹیٹس (حاکم وقت) سے ان کے اُتار لینے کی اجازت حاصل کی اور ان کو فوراً اُتار کر ان کی خبرگیری کی تو ایک بالآخر تندرست ہو گیا پر باقی دو مر گئے۔

اور کتاب ماڈرن ڈوٹ اینڈ کرسچن بیلیف کے صفحہ ۴۵۵-۴۵۷ میں یہ عبارت ہے جس کا ذیل میں ترجمہ لکھا جاتا ہے۔

شلیر میخر اور نیز قدیم محققین کا یہ مذہب تھا کہ یسوع صلیب پر نہیں مرا بلکہ ایک ظاہرا موت کی سی حالت ہو گئی تھی اور قبر سے نکلنے کے بعد کچھ مدت تک اپنے حواریوں کے ساتھ پھرتا رہا اور پھر دوسری یعنی اصل موت کے واسطے کسی علیحدگی کے مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایسا ہی کتاب سوپر نیچرل ریلجن کے صفحہ ۸۷۵ پر لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ پہلی تفسیر جو بعض لائق محققین نے

کی ہے وہ یہ ہے۔ کہ یسوع دراصل صلیب پر نہیں مرا بلکہ صلیب سے زندہ اُتار کر اس کا جسم اِس کے دوستوں کے حوالہ کیا گیا اور وہ آخر بچ نکلا۔ اِس عقیدہ کی تائید میں یہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں کہ اناجیل کے بیان کے مطابق یسوع صلیب پر تین گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے رہ کر فوت ہوا۔ لیکن صلیب پر ایسی جلدی کی موت کبھی پہلے واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ صرف اس کے ہاتھوں پر میخیں لگائی گئی تھیں اور پاؤں پر نہیں تھیں چونکہ یہ عام قاعدہ نہ تھا کہ ہر ایک مصلوب کی ٹانگ توڑی جاوے اس واسطے تین انجیل نویسوں نے تو اس کا کچھ ذکر بھی نہیں کیا اور چوتھے نے صرف اپنی کسی خاص غرض کی تکمیل کے لیے اس کا ذکر کیا ہے اور جہاں ٹانگ توڑنے کا ذکر نہیں ہے تو ساتھ ہی برچھی کا واقعہ بھی کالعدم ہو جاتا ہے پس ظاہرا موت جو واقع ہوئی وہ ایک سخت بیہوشی تھی جو کہ چھ گھنٹے کے جسمانی اور دماغی صدموں کے بعد واقع ہوئی اور اس کے علاوہ گذشتہ شب بھی بیداری اور تکلیف میں گذری تھی۔ جب اسے کافی صحت پھر حاصل ہو گئی تو اپنے حواریوں کو پھر یقین دلانے کے واسطے کئی دفعہ ملا لیکن یہودیوں کے ڈر سے وہ بڑی احتیاط سے نکلتا تھا۔ حواریوں نے یہی سمجھا کہ وُہ مر کر زندہ ہوا ہے اور چونکہ موت کی سی بیہوشی تک پہنچ کر وہ پھر بحال ہوا۔ اس لیے ممکن ہے کہ اِس نے خود بھی یہی خیال کیا ہو کہ مَیں مر کر پھر زندہ ہوا ہوں۔ اب جب اُستاد نے دیکھا کہ اس ظاہری موت نے میرے کام کی تکمیل کر دی ہے تو پھر وہ کسی نامعلوم تنہائی کی جگہ میں چلا گیا اور مفقود الخبر ہو گیا۔

ایسا ہی مشہور و معروف رینن اپنی کتاب میں لکھتا ہے (لائف آف جیزس صفحہ ۲۶۹) یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یسوع کی موت کی اصلیت کی نسبت بہت شکوک پیدا ہو گئے تھے جو لوگ صلیب پر موت کو دیکھنے کے عادی تھے وُہ کبھی اِس بات کو تسلیم کر ہی نہ سکتے تھے کہ چند گھنٹے صلیب پر رہ کر جیسا کہ یسوع رہا موت واقع ہو سکتی ہے وُہ بہت ساری مثالیں مصلوب آدمیوں کی پیش کرتے تھے جن کو وقت پر صلیب سے اُتار لیا تو آخر کار علاج کرنے سے وہ بالکل شفایاب ہو گئے۔ آری گن کا ابتدائی زمانہ کا ایک مشہور عیسائی فاضل) کچھ عرصہ یہ خیال تھا کہ اس قدر جلدی موت کا واقع ہونا مسیح کا معجزہ ہے۔ یہی حیرت مرقس کے بیان میں بھی پائی جاتی ہے۔

اب اِس کے بعد ایک بھاری ثبوت اِس بات کا کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام صلیب سے مخلصی پا کر آسمان کی طرف نہیں اُٹھائے گئے بلکہ کسی اَور ملک کی طرف چلے گئے۔ ایک اَور ہے جو ہم ذیل میں لکھتے ہیں لیکن قبل تحریر اس واقعہ کے ہم ناظرین پر ظاہر کرتے ہیں کہ یہ قصّہ کہ گویا حضرت مسیح مصلوب ہونے کے بعد یا مصلوب ہونے سے پہلے آسمان پر چلے گئے تھے ایسا ایک بیہودہ قصّہ ہے کہ ایک غور کرنے والی طبیعت اس کو بدیہی طور پر جھوٹا قرار دیگی۔ خدا تعالیٰ کا یہ عام قانون قدرت ہے کہ کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جا سکتا اور نہ نازل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی نظیر الیاس کا قصّہ ہے کیونکہ ایلیاس کا قصّہ جس کی دوبارہ آمد پر مسیح کی نبوّت موقوف تھی۔ آخر مسیح کی زبان سے ہی قابل تاویل ٹھہرا اور دوبارہ آنا اُس کا محض ایک مجاز کے طور پر تصوّر کیا گیا پھر کیونکر اعتبار کیا جائے کہ مسیح کے صعود اور نزول سے مُراد حقیقی صعود اور نزول ہے۔

جس امر کی دُنیا کی ابتدا سے کوئی بھی نظیر نہیں۔ اس امر پر اصرار کرنا اپنے تئیں ہلاکت کے گڑھے میں ڈالنا ہے۔ ماسوا اس کے یہ امر سراسر غیر معقول ہے کہ ایک نبی اپنے فرض منصبی کو ناتمام چھوڑ کر آسمان پر جا بیٹھے مسیح کو اس بات کا اقرار ہے کہ اس کی اَور بھی بھیڑیں ہیں جن کو پیغام پہنچانا ضروری ہے اور یہ اِس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ یہودی جو دُوسرے ملکوں میں منتشر ہو گئے تھے ابھی ان کو ہدایت کرنا باقی ہے پس صلیب سے مخلصی پا کر مسیح کا یہ فرض تھا کہ ان بد قسمت یہودیوں کو اپنے آنے سے مطلع کرتا جن کو اِس کے آنے کی خبر بھی نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ ہندوستان کے بعض حصّوں میں خاص کر کشمیر میں مدّت سے سکونت پذیر ہو گئے تھے اور مسیح نے خود اِس بات کو بیان کر دیا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ منتشر شُدہ بنی اسرائیل کو بھی ان سے مُلاقات کر کے ان کو اپنی ہدایتوں سے فیض یاب کرے پس ایک راست باز کے بدن پر اس سے لرزہ پڑتا ہے کہ یہ گناہ عظیم مسیح کی طرف منسُوب کر سکے کہ وہ منصبی کام کو ناتمام چھوڑ کر آسمان پر جا بیٹھا اور نہ ہم اس لغو اور بیہودہ امر کو خُدائے حکیم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں کہ وہ ایک زندہ شخص کو جس میں اچھے اچھے کام کرنے کی قوتیں موجود ہیں اور مخلُوق کو اپنی ہدایتوں سے نفع پہنچا سکتا ہے تمام کاموں سے معطّل کر کے آسمان پر بٹھا وے اور اس قیدی کی طرح جو قید محض میں ایام گذارتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا چھوڑ دے۔

کیا مسیح کے لیے یہ بہتر تھا کہ وہ اپنی اس لمبی عُمر کو بنی نوع اِنسان کی خدمت میں مصروف کرتا اور ہر ایک ملک میں سفر کر کے جیسا کہ خُود اس کو ایک نبی سیّاح سمجھا گیا ہے اپنی منتشر قوم کو فائدہ پہنچاتا یا یہ کہ اپنی تبلیغ کا کام ناتمام چھوڑ کر اور قوم کو طرح طرح کی گمراہیوں میں پا کر آسمان پر جا بیٹھتا۔ بالخصوص اُن بد قسمت لوگوں کا کیا گناہ تھا جنہوں نے ابھی اس کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

اور یہ کہ وہ مختلف ملکوں کا سَیر کرتا ہوا آخر کشمیر میں چلا گیا اور تمام عمر وہاں سَیر کر کے آخر سری نگر محلہ یار خاں میں بعد وفات مدفون ہُوا۔ اس کا ثبوت اس طرح پر ملتا ہے کہ عیسائی اور مسلمان اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ یوز آسف نام ایک نبی جس کا زمانہ وہی زمانہ ہے جو مسیح کا زمانہ تھا دُور دراز سفر کر کے کشمیر میں پہنچا اور وہ نہ صرف نبی بلکہ شاہزادہ بھی کہلاتا تھا اور جس ملک میں یسُوع مسیح رہتا تھا اسی ملک کا وہ باشندہ تھا اور اس کی تعلیم بہت سی باتوں میں مسیح کی تعلیم سے ملتی تھی بلکہ بعض مثالیں اور بعض فقرے اس کی تعلیم کے بعینہٖ مسیح کے ان تعلیمی فقرات سے ملتے ہیں جو اب تک انجیلوں میں پائے جاتے ہیں اور عیسائی نہایت مجبور اور حیرت زدہ ہو کر اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شخص جو یوز آسف اور شاہزاد نبی کہلاتا ہے وہ مسیح کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھا اسی بناء پر اس کو بڑا مُقدّس سمجھا گیا ہے یہاں تک کہ سسلی میں اس کے نام کا ایک گرجا بھی بنایا ہُوا ہے جو پورانا اور قدیم زمانہ سے ہے اور اسی تعلق کے قبول کرنے کے بعد یوز آسف کا قصّہ یُورپ کی تمام زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قدر پُر جوش محبّت سے یُورپ کی تمام زبانوں میں یوز آسف کی تعلیم کا ترجمہ ہونا اس بات پر دلیل ہے کہ کم سے کم یوز آسف کو ایک مُقدّس حواری سمجھا گیا ہے پس اس

صورت میں تمام عیسائی صاحبان اس مطالبہ کے نیچے ہیں کہ انہوں نے بہرحال یوز آسف کا عیسائی مذہب سے ایک تعلق مان لیا ہے اور اس کے ظہور کا بھی وہی زمانہ قرار دیا ہے جو مسیح کا زمانہ تھا اور اس کی سوانح کا بڑی محبّت اور دلچسپی سے ترجمہ بھی کیا اور اس کی یادگار کا ایک گرجا بھی بنایا اور یہ بھی اقرار کیا کہ اس کی تعلیم کا اخلاقی حصّہ انجیل کی تعلیم سے ملتا ہے اور اس نے بھی اپنی تعلیم کا نام انجیل ہی رکھا ہے پس اس صورت میں اگر یوز آسف یسُوع نہیں ہے تو یہ بارِ ثبوت عیسائی صاحبوں کی گردن پر ہے کہ وُہ ثابت کر کے دکھلاویں کہ کبھی مسیح کا کوئی شاگرد شہزادہ نبی بھی کہلاتا تھا اور کبھی اس نے مسیح کی تعلیم کو اپنی تعلیم بھی قرار دیا اور اس کا نام انجیل رکھا اور میں بڑے دعوے اور ثبوت سے کہتا ہوں کہ یہ ثبوت ہرگز ان کے لیے ممکن نہیں کیونکہ ان کے نزدیک شاہزادہ نبی ایک ہی ہے یعنی یسوع ابن مریم۔

اور یوز آسف کے حالات کے بیان کرنے کے بارے میں مسلمانوں کی کتابوں میں بعض ہزار برس سے زیادہ زمانہ کی تالیف ہیں جیسا کہ کتاب اکمال الدّین جس میں یہ تمام باتیں درج ہیں اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ یوز آسف نے جو شاہزادہ نبی تھا اپنی کتاب کا نام انجیل رکھا تھا۔ ماسوا اس کتاب کے خاص سری نگر میں جہاں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی قبر ہے ایسے پرانے نوشتے اور تاریخی کتابیں پائی گئی ہیں جن میں لکھا ہے کہ یہ نبی جس کا نام یوز آسف ہے اور اسے عیسٰی نبی بھی کہتے ہیں اور شاہزادہ نبی کے نام سے بھی موسُوم کرتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایک نبی ہے جو اس پرانے زمانہ میں کشمیر میں آیا تھا جس کو ان کتابوں کی تالیف کے وقت تک قریباً سولہ سو برس گذر گئے تھے یعنی اس موجودہ زمانہ تک اُنیس سو برس گذرا ہے۔ اور اس قسم کی تحریریں کشمیر کے باشندوں کے پاس کچھ تھوڑی نہیں بلکہ بہت سی کتابیں پائی جاتی ہیں اور میں نے سُنا ہے کہ اُس جگہ کے ہندوؤں کے پاس بھی اپنی زبان میں ایک کتاب ہے جس میں اس شہزادہ نبی کا ذکر ہے پس ایک حق کے طالب کو یہ تمام ثبوت اس بات کے قبول کرنے کے لیے مجبُور کرتے ہیں کہ درحقیقت یہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی قبر ہے۔ بالخصوص جبکہ ان تمام باتوں کو یکجائی نظر سے دیکھا جائے کہ اوّل تو خود انجیل سے یہ پتہ لگتا ہے کہ یسُوع صلیب پر نہیں مرا بلکہ وہ صلیب پر غشی کی حالت میں ہوگیا تھا جیسا کہ اس نے خود کہا کہ یُونس نبی کا معجزہ دکھایا جاویگا۔ پس اگر صلیب پر مر گیا تھا اور مُردہ ہونے کی حالت میں قبر میں داخل ہُوا تو اس کے اِس واقعہ کو یونس کے واقعہ سے کیا مُشابہت ہوئی۔ پھر یہ کہ انہیں انجیلوں میں لکھا ہے کہ وہ قبر سے زندہ نکلا اور ابھی زخم اس کے اچھے نہیں ہوئے تھے اور وہ اپنے حواریوں کو ملا اور منع کیا کہ میرا حال کسی سے مت کہو اور ان کے ساتھ اپنے وطن کی طرف چلا گیا اور ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور پھر طب کی کتابوں سے متواتر طور پر ثابت ہُوا ہے کہ یسوع کے زخموں کے لیے مرہم عیسٰی بنائی گئی تھی جس کے استعمال سے اس کے زخم اچھے ہُوئے اور چونکہ وہ یہود کے دوبارہ حملے سے ڈرتا تھا اس لیے وہ اس مُلک سے نکل گیا اور یہ رائے کچھ ہماری خاص رائے نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے محقق پادریوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے جیسا کہ جرمن کے پچاس پادریوں کی رائے ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور کئی پرانی تحریریں اَور بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یسُوع واقعہ صلیب کے بعد مُدّت تک مختلف ملکوں میں سیاحت

کرتارہا یہاں تک کہ اس کا نام نبی سیّاح ہو گیا اور ان باتوں کو مسلمانوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ مسیح نبوت پانے کے بعد ایک مدت تک مختلف بلاد میں سیاحت کرتا رہا ہے پس ان تمام باتوں کو ایک ہی جگہ جمع کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یسوع ہرگز آسمان پر نہیں چڑھا اور جیسا کہ یہ تمام واقعات ایسے قریب قیاس ہیں کہ بڑی سُرعت سے عقل ان کو قبول کرتی ہے ایسا ہی آسمان پر چڑھنا ایسا بعید از قیاس ہے کہ عقل اس کو فی الفور رد کرتی ہے اور دھکے دیتی ہے پس کیا وجہ کہ جو واقعات ثابت شدہ اور قریب قیاس ہیں ان کو تو قبول نہ کیا جائے اور جو خیالات ثابت نہیں ہو سکے اور نہ وہ قریب قیاس ہیں اُن کو قبول کیا جائے سچ تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات اور دلائل میں سے جو ہم نے پیش کیے ہیں ایک بھی پیش نہ کیا جاتا تب بھی عقل سلیم کا یہی فتویٰ تھا کہ یسوع ابن مریم آسمان پر ہرگز نہیں گیا وہ ہمیشہ انسانوں کی طرح کمزوریاں دکھلاتا رہا اور بسا اوقات اس نے ماریں کھائیں اور جب شیطان نے اسے کہا کہ اُوپر سے اپنے تئیں نیچے گرا دے تو وہ اپنے تئیں نیچے نہ گرا سکا اور کوئی امر اس میں ایسا نہ تھا کہ جو انسان سے بڑھ کر شمار کیا جائے۔ بلکہ بعض نبیوں نے اس سے بڑھ کر معجزات دکھلائے پھر یہ امر بغیر عقلی دلائل اور یقینی براہین کے کیونکر مان لیا جائے کہ وہ درحقیقت آسمان پر چڑھ گیا تھا اور اب تک زندہ موجود ہے اور اگر آسمان پر چڑھنا ممکن بھی ہو تب بھی اس کے لیے ناجائز بلکہ ایک جُرم کا ارتکاب تھا کیونکہ ابھی وہ اپنے فرض تبلیغ کو تمام نہیں کر چکا تھا اور یہود کے اَور بہت سے فرقے ہنوز اَور اَور ملکوں میں ایسے تھے جنہوں نے مسیح کا نام بھی نہیں سُنا تھا جن کو پیغام پہنچانا باقی تھا اور آسمان پر تو یہود کی کوئی قوم آباد نہیں تھی تا یہ کہا جائے کہ آسمان پر بھی ان کا جانا ضروری تھا پس جیسے کہ یہ امر نامعقول ہے کہ یسُوع نے صلیب کو اپنے لیے پسند کیا اور خودکشی کو روا رکھا ایسا ہی یہ بھی نامعقول ہے کہ وہ اب تک ایک عُمدہ زمانہ اپنی زندگی کا محض بیکاری سے گذار رہا ہے حالانکہ اس کو چاہیئے تھا کہ اپنے اس وقت عزیز کو اپنی قوم کی ہمدردی میں خرچ کرتا نہ یہ کہ ایسی بیہُودہ حرکتیں کہ دوسروں کے لیے خودکشی کرے۔ اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر جا بیٹھے۔ پس ایک عقلمند بجز اس کے کیا کرے کہ ان قصّوں کو جھوٹے قرار دے۔ سچائی ایک ایسی چیز ہے کہ وہ صرف واقعات سے ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ دلائل عقلیہ بھی اس پر شہادت دیتے ہیں لیکن جو جھوٹ ہے نہ اس کے لیے واقعات صحیحہ ثابت شدہ ملتے ہیں اور نہ عقلی دلائل اس پر قائم ہو سکتے ہیں۔ افسوس کہ عیسائی کسی بات پر بھی غور نہیں کرتے انہیں کے اِن سائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ تھوما رسول جس کا ذکر انجیلوں میں درج ہے ہندوستان میں آیا تھا اور میلاپور میں شہید ہوا۔ اور یہ بھی اسی میں لکھا تھا کہ یسُوع کا ایک بھائی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اب جائے غور ہے کہ ایک طرف تو عیسائی صاحبان قبول کرتے ہیں کہ اسی بلاد شام سے ہندوستان میں انہیں دنوں میں ایک شاہزادہ نبی آیا تھا جو آخر سری نگر کشمیر میں فوت ہوا اور پھر انہیں ایّام میں تھوما حواری اور ایک یسوع کا بھائی بھی ہندوستان میں آیا تھا اور پھر دوسری طرف اس بات کو نہیں مانتے کہ وہ جو شاہزادہ نبی کہلاتا تھا اور بیان کرتا تھا کہ میرے پر انجیل نازل ہوئی ہے وہی یسُوع مسیح ہے یہ واقعات بہت ہی صاف تھے اور ان کا نتیجہ بھی بہت ہی صاف تھا مگر ہائے افسوس کہ پادری صاحبوں نے تاریکی سے پیار کیا اور نُور سے دشمنی۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۹ صفحہ ۳۳۱-۳۴۲)

حضرت مسیح علیہ السلام وہ انسان تھے جو مخلوق کی بھلائی کے لیے صلیب پر چڑھے۔ گو خدا کے رحم نے ان کو بچالیا۔ اور مرہم عیسیٰ نے ان کے زخموں کو اچھا کرکے آخر کشمیر جنت نظیر میں ان کو پہنچا دیا۔ سو انہوں نے سچائی کے لیے صلیب سے پیار کیا اور اس طرح اُس پر چڑھ گئے۔ جیسا کہ ایک بہادر سوار خوش عنان گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ سو ایسا ہی میں بھی مخلوق کی بھلائی کے لیے صلیب سے پیار کرتا ہوں اور میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ جس طرح خدا تعالیٰ کے فضل اور کرم نے حضرت مسیح کو صلیب سے بچالیا۔ اور ان کی تمام رات کی دُعا جو باغ میں کی گئی تھی۔ قبول کرکے اُن کو صلیب اور صلیب کے نتیجوں سے نجات دی۔ ایسا ہی مجھے بھی بچائے گا۔ اور حضرت مسیح صلیب سے نجات پاکر نصیبین کی طرف آئے اور پھر افغانستان کے ملک میں ہوتے ہوئے کوہ نعمان میں پہنچے۔ اور جیسا کہ شہزادہ نبی کا چبوترہ اب تک گواہی دے رہا ہے۔ وہ ایک مدت تک کوہ نعمان میں رہے۔ اور پھر اس کے بعد پنجاب کی طرف آئے۔ آخر کشمیر میں گئے۔ اور کوہ سلیمان پر ایک مدت تک عبادت کرتے رہے۔ اور سکھوں کے زمانہ تک ان کی یادگار کا کوہ سلیمان پر کتبہ موجود تھا۔ آخر سری نگر میں ایک سو پچیس برس کی عمر میں وفات پائی اور خان یار کے محلہ کے قریب آپ کا مقدس مزار ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۵۹-۶۰)

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ یعنی مسیح ابن مریم مقتول اور مصلوب ہو کر مردود اور ملعون لوگوں کی موت سے نہیں مرا جیسا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا خیال ہے بلکہ خدائے تعالیٰ نے عزت کے ساتھ اُس کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔ جاننا چاہیئے کہ اِس جگہ رفع سے مراد وہ موت ہے جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ دوسری آیت اِس پر دلالت کرتی ہے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا[1]۔ یہ آیت حضرت ادریس کے حق میں ہے اور کچھ شک نہیں کہ اِس آیت کے یہی معنے ہیں کہ ہم نے ادریس کو موت دیکر مکان بلند میں پہنچا دیا کیونکہ اگر وہ بغیر موت کے آسمان پر چڑھ گئے تو پھر بوجہ ضرورت موت جو ایک انسان کے لیے ایک لازمی امر ہے یہ تجویز کرنا پڑے گا کہ یا تو وہ کسی وقت اوپر ہی فوت ہو جائیں اور یا زمین پر آکر فوت ہوں مگر یہ دونوں شق ممتنع ہیں کیونکہ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ جسم خاکی موت کے بعد پھر خاک ہی میں داخل کیا جاتا ہے اور خاک ہی کی طرف عود کرتا ہے اور خاک ہی سے اُس کا حشر ہوگا اور ادریس کا پھر زمین پر آنا اور دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں لہذا یہ امر ثابت ہے کہ رفع سے مراد اس جگہ موت ہے مگر ایسی موت جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ مقربین کے لیے ہوتی ہے کہ بعد موت اُن کی رُوحیں علّیین تک پہنچائی جاتی ہیں فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ[2] (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۹۸-۶۰۰)

وَقَالَ بَعْضُ النَّاسِ الَّذِيْ لَا عِلْمَ عِنْدَهٗ اِنَّ اٰيَةَ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ وَ اٰيَةَ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْمَسِيْحَ رُفِعَ حَيًّا بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ هٰذَا قَوْلُهٗ وَاِسْتِدْلَالُهٗ

ایک ایسے شخص نے جو علم سے بالکل بے بہرہ ہے یہ کہا ہے کہ آیت وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم اور آیت بل رفعہ اللہ الیہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مسیح ناصری اپنے جسم عنصری کے ساتھ زندہ اُٹھائے گئے۔ یہ محض اس کا

[1] مریم آیت ۵۸ ۔ [2] القمر آیت ۵۶۔

وَلٰكِنْ لَوْكَانَ هٰذَا الرَّجُلُ مُطَّلِعًا عَلٰى شَانِ نُزُوْلِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ لَرَجَعَ مِنْ قَوْلِهٖ بَلْ مَا الْتَفَتَ اِلٰى مَعْنًى يُّخَالِفُ طَرِيْقَ الْمَعْقُوْلِ وَالْمَنْقُوْلِ وَمَا تَكَلَّمَ بِالْفُضُوْلِ وَكَانَ مِنَ الْمُتَنَدِّمِيْنَ فَاسْمَعْ اَيُّهَا الْعَزِيْزُ اَنَّ الْيَهُوْدَ كَانُوْا يَقْرَءُوْنَ فِي التَّوْرَاتِ اَنَّ الْكَاذِبَ فِيْ دَعْوَى النُّبُوَّةِ يُقْتَلُ وَ اَنَّ الَّذِيْ صُلِبَ فَهُوَ مَلْعُوْنٌ لَا يُرْفَعُ اِلَى اللّٰهِ وَكَانَتْ عَقِيْدَتُهُمْ مُسْتَحْكِمَةً عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ شُبِّهَ لَهُمْ اِبْتِلَاءً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ كَاَنَّهُمْ صَلَبُوا الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَقَتَلُوْهُ فَحَسِبُوْهُ مَلْعُوْنًا غَيْرَ مَرْفُوْعٍ وَرَتَّبُوا الشَّكْلَ هٰكَذَا اَلْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ مَصْلُوْبٌ ۔ وَكُلُّ مَصْلُوْبٍ مَّلْعُوْنٌ وَّلَيْسَ بِمَرْفُوْعٍ فَثَبَتَ عِنْدَهُمْ مِنَ الشَّكْلِ الْاَوَّلِ الَّذِيْ هُوَ بَيِّنُ الْاِنْتَاجِ اَنَّ عِيْسٰى (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ) مَلْعُوْنٌ وَّلَيْسَ بِمَرْفُوْعٍ فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يُّزِيْلَ هٰذَا الْوَهْمَ وَيُبَرِّءَ عِيْسٰى مِنْ هٰذَا الْبُهْتَانِ فَقَالَ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ ۔ وَحَاصِلُ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَنَّ شَانَ عِيْسٰى مُنَزَّهٌ عَنِ الصَّلْبِ وَالنَّتِيْجَةِ الَّتِيْ هِيَ الْمَلْعُوْنِيَّةُ وَعَدَمُ الرَّفْعِ بَلْ هُوَ مَاتَ حَتْفَ اَنْفِهٖ وَرُفِعَ اِلَى اللّٰهِ كَمَا يُرْفَعُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَا كَانَ مِنَ الْمَلْعُوْنِيْنَ ۔ وَهٰذَا هُوَ السَّبَبُ الَّذِيْ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِاَجْلِهٖ قِصَّةَ

قول اور استدلال ہے لیکن اگر یہ شخص اس آیت کے شانِ نزول سے واقف ہوتا تو اپنے اس قول سے ضرور رجوع کر لیتا بلکہ ان معنی کی طرف جو معقول اور منقول طریق کے مخالف ہیں توجہ ہی نہ کرتا اور ایسی فضول باتیں منہ پر نہ لاتا جن کے نتیجہ میں وہ نادم اور شرمندہ ہوتا پس اے عزیز سنو! یہودی لوگ تورات میں یہ پڑھا کرتے تھے کہ جھوٹا دعویٰ نبوت کرنے والا قتل کیا جائے گا اور یہ کہ جس کو صلیب پر مارا جائے وہ ملعون ہوتا ہے اس کا اللہ کی طرف رفع نہیں ہوتا۔ یہ ان کا پختہ اعتقاد تھا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ابتلاء انہیں اس شبہ میں ڈال دیا گیا کہ گویا انہوں نے حضرت مسیح ابن مریم کو صلیب پر مار دیا ہے اور قتل کر دیا ہے پس انہوں نے حضرت مسیح کو مرفوع نہیں بلکہ ملعون خیال کر لیا اور قضیہ کو اس شکل میں مرتب کیا کہ مسیح ابن مریم صلیب پر مارا گیا ۔ اور ہر مصلوب ملعون ہوتا ہے ۔مرفوع الی اللہ نہیں ہوتا۔ پس ان کے نزدیک اس شکل اوّل سے جو بیّن الانتاج ہوتی ہے یہ ثابت ہو گیا کہ عیسیٰ نعوذ باللہ ملعون ہیں اور ان کا رفع خدا کی طرف نہیں ہوا پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ یہود کے اس وہم کو دُور کرے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اس بہتان سے بری ٹھہرائے سو اس لیے فرمایا کہ وماقتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لھم...... بل رفعہ اللہ الیہ۔ خدا تعالیٰ کے اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان صلیب پر مارے جانے اور اس کے نتیجہ یعنی ملعونیت اور عدم رفع سے پاک ہے بلکہ انہوں (یعنی حضرت عیسیٰ) نے اپنی طبعی موت سے وفات پائی تھی اور مقرّب الی اللہ لوگوں کی طرح ان کا بھی خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہوا تھا اور آپ ہرگز ملعون لوگوں میں سے نہیں تھے اور اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر وفات نہ پانے کے

عَدَمِ صَلْبِ عِیْسٰی وَبَرَّأَہٗ مِمَّا قَالُوْا وَاِلَّا فَاَیُّ ضَرُوْرَۃٍ کَانَتْ دَاعِیَۃً اِلٰی ذِکْرِ ھٰذِہِ الْقِصَّۃِ وَمَا کَانَ مَوْتُ الْقَتْلِ نَقْصًا لِلْاَنْبِیَاءِ وَکَسْرًا لِشَاْنِہِمْ وَعِزَّتِہِمْ وَکَاَیِّنْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَیَحْیٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاَبِیْہِ فَتَفَکَّرْ وَاطْلُبْ صِرَاطَ الْمُہْتَدِیْنَ وَلَا تَجْلِسْ مَعَ الْغَاوِیْنَ۔

(حمامۃ البشری ص۵۶ حاشیہ)

وَقَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَالَ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ وَیَحْتَجُّوْنَ بِہٰذِہِ الْاٰیَۃِ عَلٰی رَفْعِ جِسْمِ الْمَسِیْحِ وَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ اَنَّ الْاَمْرَ لَوْ کَانَ کَذٰلِکَ لَتَعَارَضَ الْاٰیَتَانِ اَعْنِیْ اٰیَۃَ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَاٰیَۃَ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ مُنَزَّہٌ عَنِ التَّعَارُضِ وَالتَّخَالُفِ وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَاَشَارَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَنَّ الْاِخْتِلَافَ لَا یُوْجَدُ فِی الْقُرْاٰنِ وَھُوَ کِتَابُ اللّٰہِ وَشَاْنُہٗ اَرْفَعُ مِنْ ھٰذَا وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ کِتَابَ اللّٰہِ مُنَزَّہٌ عَنِ الْاِخْتِلَافَاتِ فَوَجَبَ عَلَیْنَا اَنْ لَّا نَخْتَارَ فِیْ تَفْسِیْرِہٖ طَرِیْقًا یُّوْجِبُ التَّعَارُضَ وَالتَّنَاقُضَ وَمَا کَانَ لِلْیَھُوْدِ غَرَضٌ وَّبَحْثٌ فِیْ رَفْعِ جِسْمِہٖ اَوْ عَدَمِ رَفْعِہٖ فَلَابُدَّ مِنْ اَنْ تُفَسَّرَ الرَّفْعَ فِیْ اٰیَۃِ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ بِالرَّفْعِ الرُّوْحَانِیْ

قصّہ کو بیان کیا ہے۔ اور انہیں لوگوں کے الزام سے بری قرار دیا ہے ورنہ اس قصّہ کے بیان کی کونسی ضرورت مقتضی تھی قتل کے ذریعہ انبیاء کا وفات پانا ان کی تنقیص اور کسرِ شان اور ان کی عزّت کے منافی نہیں ہوتا۔ اور کئی ایک نبی اللہ تعالےٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے جیسے یحییٰ علیہ السلام اور ان کے باپ زکریا علیہ السلام۔ پس غور کرو اور ہدایت یافتہ لوگوں کا طریق تلاش کرو اور گمراہ ہونے والوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ (حمامۃ البشریٰ ص۵۶ حاشیہ)

ہمارے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ اللہ عزّوجل نے قرآن مجید میں فرمایا ہے بل رفعہ اللہ الیہ۔ وہ اس آیت سے مسیح علیہ السلام کے جسم کے اُٹھائے جانے پر استدلال کرتے ہیں اور اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو قرآن مجید کی دو آیتیں باہم ٹکرا جاتیں۔ میری مراد ایک تو آیت بل رفعہ اللہ الیہ سے ہے اور دوسری آیت فیہا تحیون وفیہا تموتون ومنہا تخرجون[1] سے۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ قرآن کریم تعارض اور تخالف سے پاک ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا[2]۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس کی شان اس قسم کے اختلاف سے بہت بلند ہے اور جب یہ ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب اختلافات سے پاک ہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی تفسیر کرتے وقت کوئی ایسا طریق اختیار نہ کریں جو کسی تناقض یا تعارض کا موجب ہو۔ اور یہ بات مدّنظر رہے کہ یہود کو حضرت مسیح کے جسم کے اٹھائے جانے یا نہ اُٹھائے جانے سے کوئی غرض اور بحث نہیں تھی پس ضروری ہے کہ ہم آیت بل رفعہ اللہ الیہ میں رفع سے مراد رفع

---

[1] الاعراف آیت ۲۶ ؛ [2] النساء آیت ۸۳ ؛

كَمَا هُوَ مَفْهُوْمُ آيَتِ اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَاِنَّ الرُّجُوْعَ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً وَّالرَّفْعَ اِلَيْهِ اَمْرٌ وَّاحِدٌ لَا فَرْقَ بَيْنَهُمَا مَعْنًى ثُمَّ انْظُرُوْا وَتَدَبَّرُوْا وَهَبَكَ اللّٰهُ مِنْ عِنْدِهٖ قُوَّةَ الْفَيْصَلَةِ اَنَّ النِّزَاعَ كَانَ فِي الرَّفْعِ الرُّوْحَانِيِّ لَا فِي الرَّفْعِ الْجِسْمَانِيِّ فَاِنَّ الْيَهُوْدَ كَانُوْا مُنْكِرِيْنَ مِنْ رَّفْعِ عِيْسٰى اِلَى اللّٰهِ كَمَا يُرْفَعُ الْمُطَهَّرُوْنَ الْمُقَرَّبُوْنَ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ (لَعَنَهُمُ اللّٰهُ) عَلٰى اَنَّ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْمَلْعُوْنِيْنَ لَا مِنَ الْمَرْفُوْعِيْنَ كَمَا اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِلٰى هٰذِهِ الْاَيَّامِ وَكَانُوْا يَسْتَدِلُّوْنَ (غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ) عَلٰى مَلْعُوْنِيَّتِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ مَّصْلُوْبِيَّتِهٖ فَاِنَّ الْمَصْلُوْبَ مَلْعُوْنٌ غَيْرُ مَرْفُوْعٍ فِيْ دِيْنِهِمْ كَمَا جَآءَ فِي التَّوْرَاتِ فِيْ كِتَابِ الْاِسْتِثْنَاءِ فَاَرَادَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يُّبَرِّءَ نَبِيَّهٗ عِيْسٰى مِنْ هٰذَا الْبُهْتَانِ الَّذِيْ بُنِيَ عَلٰى اٰيَةِ التَّوْرَاتِ وَوَاقِعَةِ الصَّلْبِ فَاِنَّ التَّوْرَاتَ يَجْعَلُ الْمَصْلُوْبَ مَلْعُوْنًا غَيْرَ مَرْفُوْعٍ اِذَا كَانَ يَدَّعِي النُّبُوَّةَ ثُمَّ مَعَ ذٰلِكَ كَانَ قُتِلَ وَصُلِبَ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ لِدَفْعِ بُهْتَانِهِمْ عَنْ عِيْسٰى مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَعْنِي الصَّلْبَ الَّذِيْ يَسْتَلْزِمُ الْمَلْعُوْنِيَّةَ وَعَدَمَ الرَّفْعِ مِنْ حُكْمِ التَّوْرَاتِ لَيْسَ بِصَحِيْحٍ بَلْ رَّفَعَ اللّٰهُ عِيْسٰى اِلَيْهِ يَعْنِيْ اِذَا لَمْ يَثْبُتِ الصَّلْبُ وَالْقَتْلُ لَمْ يَثْبُتِ الْمَلْعُوْنِيَّةُ وَعَدَمُ الرَّفْعِ فَثَبَتَ الرَّفْعُ الرُّوْحَانِيُّ كَالْاَنْبِيَآءِ الصَّادِقِيْنَ

روحانی ہیں جیسا کہ آیت یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربك راضیۃ مرضیۃ کا مفہوم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف راضیۃ مرضیۃ کی حالت میں رجوع اور اس کی طرف رفع دونوں ایک ہی ہیں اور ان دونوں میں معناً کوئی فرق نہیں پھر نظر ڈالو اور غور و فکر کرو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے پاس سے قوت فیصلہ عطا کرے کہ جھگڑا تو رفع روحانی میں ہے نہ کہ رفع جسمانی میں کیونکہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس رفع الی اللہ کے منکر تھے جو خدا تعالیٰ کے پاک اور مقربین انبیاء کو نصیب ہوتا ہے اور وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام ملعونوں میں سے ہیں نہ کہ ان لوگوں میں سے جن کا رفع اللہ کی طرف ہوتا ہے (لعنھم اللہ) جیسا کہ وہ آج کے دن تک کہہ رہے ہیں اور وہ (غضب اللہ علیہم) مسیح علیہ السلام کی ملعونیت پر آپ کے صلیب دیئے جانے سے استدلال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب میں مصلوب ملعون ہوتا ہے مرفوع نہیں ہوتا۔ جیسا کہ تورات کی کتاب استثناء میں بیان ہوا ہے پس اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس بہتان سے بری قرار دے جس کی بنیاد تورات کی آیت اور واقعہ صلیب پر رکھی گئی ہے۔ کیونکہ تورات ہر اس شخص کو ملعون قرار دیتی ہے مرفوع نہیں ٹھہراتی جبکہ وہ نبوت کا مدعی ہو پھر وہ قتل کیا جائے اور صلیب پر مارا جائے۔ پس اللہ عز و جل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس بہتان کے دور کرنے کے لیے فرمایا وما قتلوہ وما صلبوہ .... بل رفعہ اللہ الیہ۔ یعنی وہ مصلوبیت جو از روئے حکم تورات لعنت اور عدم رفع کو مستلزم ہے وہ درست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی طرف رفع فرمایا۔ یعنی جب قتل اور صلیب دیا جانا ثابت نہیں تو ملعونیت اور عدم رفع بھی ثابت نہیں ہوتا۔ پس دوسرے سچے نبیوں کی طرح مسیح کا رفع روحانی ثابت ہو گیا اور یہی اصل مطلوب ہے اور یہی اس قصہ کی حقیقت

وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ هٰذِهٖ حَقِيْقَةُ هٰذِهِ الْقِصَّةِ وَمَا كَانَ هٰهُنَا جِدَالٌ وَّنِزَاعٌ فِي الرَّفْعِ الْجِسْمَانِيِّ وَمَا كَانَ هٰذَا الْاَمْرُ تَحْتَ بَحْثِ الْيَهُوْدِ اَصْلًا وَّمَا كَانَ غَرَضُهُمْ مُتَعَلِّقًا بِهٖ بَلْ عُلَمَاءُ الْيَهُوْدِ كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ لِتَكْذِيْبِ الْمَسِيْحِ وَتَكْفِيْرِهٖ وَيَفْتِشُوْنَ لِتَكْذِيْبِهٖ وَتَكْفِيْرِهٖ حِيْلَةً شَرْعِيَّةً فَبَدَءَ لَهُمْ اَنْ يَّصْلِبُوْهُ لِيُثْبِتُوْا مَلْعُوْنِيَّتَهٗ وَعَدَمَ رَفْعِهِ الرُّوْحَانِيِّ كَالْاَنْبِيَآءِ الصَّادِقِيْنَ بِنَصِّ التَّوْرَاتِ لِئَلَّا يَكُوْنَ حُجَّةٌ لِّاَحَدٍ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ. فَصَلَبُوْهُ بِزَعْمِهِمْ وَفَرِحُوْا بِاَنَّهُمْ اَثْبَتُوْا مَلْعُوْنِيَّتَهٗ وَعَدَمَ رَفْعِهٖ بِالتَّوْرَاتِ وَلٰكِنِ اللّٰهَ نَجَّاهُ مِنْ حِيَلِهِمْ وَقَتْلِهِمْ فَاَخْبَرَ عَنْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ فِيْ كِتَابِهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ بَعْدَ الْاِنْجِيْلِ حَكَمًا عَدْلًا وَّمُبَيِّنًا لِّظُلْمِ كُلِّ قَوْمٍ وَّاِيْذَائِهِمْ وَكَيْدِهِمْ وَمُكَذِّبًا لِّلْكٰفِرِيْنَ. فَكَاَنَّهٗ يَقُوْلُ يَا حِزْبَ الْمَاكِرِيْنَ يَا اَعْدَاءَ الصِّدْقِ وَالصَّادِقِيْنَ لِمَ تَقُوْلُوْنَ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَصَلَبْنَا وَاَثْبَتْنَا اَنَّهٗ مَلْعُوْنٌ غَيْرُ مَرْفُوْعٍ فَاُخْبِرُكُمْ اَيُّهَا الْقَوْمُ الْخَبِيْثُوْنَ اَنَّكُمْ مَا قَتَلْتُمُوْهُ وَمَا صَلَبْتُمُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَنَّكُمْ مَا قَتَلْتُمُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ نَجَّاهُ اللّٰهُ مِنْ مَّكْرِكُمْ وَرَزَقَهُ الرَّفْعَ الرُّوْحَانِيَّ الَّذِيْ كُنْتُمْ لَا تُرِيْدُوْنَ لَهٗ وَتَمْكُرُوْنَ لِئَلَّا يَحْصُلَ لَهٗ ذٰلِكَ الْمَقَامُ فَقَدْ حَصَلَ لَهٗ وَرَفَعَهُ اللّٰهُ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا وَهٰذَا الْقَوْلُ يَعْنِيْ قَوْلَهٗ تَعَالٰى عَزِيْزًا حَكِيْمًا

ہے۔ یہاں رفع جسمانی کے بارہ میں کوئی جھگڑا اور نزاع نہیں تھا اور یہ بات ہرگز یہود کے زیر بحث نہیں تھی اور اس سے ان کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی بلکہ یہودی علماء مسیح علیہ السلام کو جھوٹا اور کافر ثابت کرنے کے لیے مکر کر رہے تھے اور وہ ان کی تکذیب اور تکفیر کے لیے بزعم خود شرعی حیلہ کی تلاش میں تھے۔ پس ان کو یہ تدبیر نظر آئی کہ وہ مسیح کو صلیب دیدیں تاکہ تورات کی نصّ کے مطابق مسیح کی ملعونیت اور ان کے اس رفع روحانی کے عدم کو ثابت کر سکیں جو راستباز نبیوں کو حاصل ہوتا ہے تاکتاب اللہ کے حکم کے بعد کسی کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے سو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق اس کو صلیب پر مار دیا اور اس بات پر خوش ہو گئے کہ انہوں نے تورات کے مطابق مسیح کی ملعونیت اور عدم رفع کو ثابت کر دیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے حیلوں اور قتل کی کوششوں سے نجات دی پھر اس قصہ کو اپنی کتاب میں بیان فرما دیا جس کو انجیل کے بعد بطور حکم وعدل نازل کیا تھا۔ اور جو ہر قوم کے ظلم اور ان کی ایذا رسانی اور ان کی تدبیروں کو واضح کرنے والی اور کافروں کو جھوٹا ٹھہرانے والی ہے گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے مکر کرنے والوں کے گروہ اور اے سچائی اور صادقوں کے دشمنو۔ تم کیوں یہ کہتے ہو کہ ہم نے مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا اور صلیب پر مار دیا اور ثابت کر دیا کہ آپ ملعون ہیں مرفوع نہیں پس اے خبیث قوم میں تم کو بتاتا ہوں کہ نہ تم نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہی صلیب پر مارا ہے بلکہ درحقیقت مسیح مقتول اور مصلوب کے مشابہ بنایا گیا تھا اور تم خود بھی اپنے دلوں میں خوب سمجھتے ہو کہ تم نے مسیح کو ہرگز قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے مکر سے بچا لیا۔ اور اسے وہ روحانی رفع عطا کیا جو تم اس کے لیے نہیں چاہتے تھے۔ اور تم حیلے کر رہے تھے کہ اسے یہ مقام حاصل نہ ہو۔ مگر اسے یہ مقام حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا رفع فرمایا اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے

إِشَارَةٌ إِلَى أَنَّ اللّٰهَ يُعِزُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَحْفَظُ عِزَّةَ أَصْفِيَآئِهِ بِحِكْمَتِهِ الدَّقِيْقَةِ الْبَالِغَةِ اللَّطِيْفَةِ لَا يَضُرُّهَا مَكْرُ مَاكِرٍ كَمَا مَا أَضَرَّ عِزَّةَ عِيْسٰى مَكْرُ الْيَهُوْدِ بَلْ أَعَزَّهُ وَرَفَعَهُ وَدَمَّرَ الْمَاكِرِيْنَ۔

فَاعْلَمْ أَيُّهَا الْعَزِيْزُ هٰذَا تَفْسِيْرُ قَوْلِهِ تَعَالٰى بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَلٰكِنْ لَّا يَقْبَلُهُ قَوْمُنَا وَيُحَرِّفُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ وَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ فِي شَانِ نُزُوْلِهِ وَيَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ مُسْتَكْبِرِيْنَ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ قَدْ شَهِدَا عَلٰى وَفَاتِ الْمَسِيْحِ وَكَذٰلِكَ شَهِدُوْا عَلَيْهِ أَكَابِرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَأَئِمَّةِ الْمُحَدِّثِيْنَ فَكَانَ آخِرُ جَوَابِهِمْ أَنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُّحْيِيَهُ بَعْدَ وَفَاتِهِ مَرَّةً أُخْرٰى وَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ أَنَّ قُدْرَةَ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا يَتَعَلَّقُ بِمَا يُخَالِفُ مَوَاعِيْدَهُ الصَّادِقَةَ وَقَدْ قَالَ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَقَالَ وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ وَقَالَ وَلَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُوْلٰى وَلَا شَكَّ أَنَّهُ مَنْ مَّاتَ مِنَ الصُّلَحَاءِ وَفَاتَهُ نَالَ حَظًّا مِّنَ الْجَنَّةِ وَحُرِّمَ عَلَيْهِ الْمَوْتَةُ الثَّانِيَةُ فَكَيْفَ يَجُوْزُ أَنْ يُّرَدَّ عِيْسٰى إِلَى الدُّنْيَا وَيُخْرَجَ مِنْ حَظِّ الْجَنَّةِ وَنَعِيْمِهَا

اور یہ قول یعنی عزیزاً حکیماً اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور اپنے برگزیدہ لوگوں کی عزت کی دقیق کامل اور لطیف حکمت کے ساتھ حفاظت کرتا ہے۔ کسی مکر کرنے والے کا مکر اصفیاء کی عزت کو ضرر نہیں پہنچا سکتا جیسا کہ یہودیوں کے مکر نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی عزت کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی عزت کو بڑھایا اور بلند درجہ عطا فرمایا۔ اور ہلاکت کی تدابیر کرنے والوں کو تباہ و برباد کر دیا پس اے عزیز تم سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے قول بل رفعہ اللہ الیہ کی تفسیر یہی ہے مگر ہمارے لوگ اسے قبول نہیں کرتے وہ اللہ تعالےٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔ وہ اس آیت کے شانِ نزول میں غور نہیں کرتے اور زمین میں اکڑ کر چلتے ہیں اور جب انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے وفات مسیح پر شہادت دی ہے اور اسی طرح مومنوں میں سے جلیل القدر صحابہ تابعین اور ائمہ حدیث نے بھی اس پر شہادت دی ہے تو ان کا آخری جواب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ مسیح کو موت کے بعد ایک مرتبہ پھر زندہ کر دے اور یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں جو اس کے سچے وعدوں کے مخالف ہوں اور خود اس نے فرمایا ہے فیمسک الّتی قضی علیھا الموت[1]۔ اسی طرح فرمایا وماھم منھا بمخرجین[2] نیز فرمایا لایذوقون فیھا الموت الّا الموتۃ الاولیٰ[3]۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو بھی نیک لوگوں میں سے وفات پا جاتا ہے وہ جنت میں سے حصہ پا لیتا ہے اور اس پر دوسری موت واقع نہیں ہوتی پس یہ کس طرح جائز ٹھہرتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کو دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور وہ جنت اور اس کی نعمتوں سے باہر نکالا جائے اور اس پر اس کے بالاخانوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں پھر وہ دوسری مرتبہ

---

[1] الزمر آیت ۴۳؛ [2] الحجر آیت ۴۹؛ [3] الدخان آیت ۵۷؛

اَوْ يُسَدَّ عَلَيْهِ غُرْفَتُهَا ثُمَّ يُتَوَفّٰى فِيْ مَرَّةٍ ثَانِيَةٍ مَعَ اَنَّ الْاٰيَةَ الْمُتَقَدِّمَةَ اَعْنِيْ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى تَدُلُّ عَلٰى دَوَامِ الْحَيَاتِ وَعَدَمِ ذَوْقِ الْمَوْتِ۔

(حمامۃ البشریٰ حاشیہ متعلقہ ص۵۶ آخر کتاب ص۳)

اَلرَّفْعُ الَّذِيْ جَاءَ فِيْ ذِكْرِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْقُرْاٰنِ۔ فَهُوَ لَيْسَ رَفْعٌ جِسْمَانِيٌّ وَلِذَالِكَ قُدِّمَ عَلَيْهِ لَفْظُ التَّوَفِّيْ فِي الْبَيَانِ۔ لِيَعْلَمَ النَّاسُ اَنَّهٗ رَفْعٌ رُوْحَانِيٌّ كَمَا جَرَتْ عَلَيْهِ سُنَّتُ اللّٰهِ بَعْدَ مَوْتِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ۔ فَاِنَّهُمْ يُرْفَعُوْنَ اِلَى اللّٰهِ بَعْدَ قَبْضِ الرُّوْحِ وَيُدْخَلُوْنَ فِيْ نَعِيْمِ الْجِنَانِ۔ فَرِحِيْنَ۔ وَالْاٰيَةُ نَزَلَتْ لِيَقْضِيَ بَيْنَ الْيَهُوْدِ وَالْمَسِيْحِيِّيْنَ۔ فَاِنَّ الْيَهُوْدَ زَعَمُوْا اَنَّ الْمَسِيْحَ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ۔ وَمَلْعُوْنًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ الْمَرْفُوْعِيْنَ۔ وَقَالُوْا اِنَّهٗ صُلِبَ وَالْمَصْلُوْبُ لَا يُرْفَعُ اِلَى اللّٰهِ بِحُكْمِ التَّوْرَاتِ بَلْ يُلْعَنُ مِنْ حَضْرَتِهٖ وَيُجْعَلُ مِنَ الْمَرْدُوْدِيْنَ۔ وَقَالَ النَّصَارٰى اِنَّهٗ كَانَ ابْنُ اللّٰهِ فَصُلِبَ لِاِنْجَاءِ الْخَلْقِ وَمُنِعَ مِنَ الرَّفْعِ فِيْ اَوَّلِ الْاَمْرِ وَلُعِنَ وَعُذِّبَ وَاُدْخِلَ فِيْ جَهَنَّمَ اِلٰى ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ كَالْفَاسِقِيْنَ۔ ثُمَّ رُفِعَ اِلَى الْعَرْشِ وَاَوَاهُ اللّٰهُ اِلٰى يَمِيْنِهٖ اِلٰى اَبَدِ الْاٰبِدِيْنَ۔ فَالْيَهُوْدُ ذَهَبُوْا اِلٰى تَفْرِيْطٍ وَّهَمْطٍ وَّاِهْبَاطٍ۔ وَّالنَّصَارٰى مَعَ التَّفْرِيْطِ اِلٰى اِفْرَاطٍ۔ فَبَيَّنَ اللّٰهُ مَا كَانَ اَحَقَّ وَاَقْوَمَ فِيْ اَمْرِ عِيْسٰى۔ فَقَالَ اِنَّهٗ مَا صُلِبَ بَلْ تُوُفِّيَ بِحَتْفِ اَنْفِهٖ وَاُلْحِقَ بِالْمَوْتٰى۔ ثُمَّ رُفِعَ

وفات پائیں باوجودیکہ آیت مذکورہ بالا لایذوقون فیھا الموت الّا الموتۃ الاولیٰ۔ آپ کے مرنے کے بعد دائمی زندگی پانے اور دوبارہ موت کو نہ چکھنے پر دلالت کرتی ہے۔ (حمامۃ البشریٰ ص۵۶ حاشیہ آخر کتاب)

قرآن مجید میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ذکر کے دوران جس رفع کا ذکر کیا گیا ہے وہ رفع جسمانی نہیں اسی لیے اس سے پہلے لفظ توفی بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ وہ رفع روحانی ہے جیسا کہ اللہ کی سنت ہمیشہ سے جاری ہے کہ اہل ایمان کا موت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے اور خوش خوش اس کی جنتوں میں داخل کیے جاتے ہیں۔ اور یہ آیت یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے کیونکہ یہودی یہ دعوے کرتے تھے کہ حضرت مسیح کاذبوں میں سے تھا اور ملعون تھا اور وہ ان مقربین میں شامل نہیں تھا جن کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسیح مصلوب ہُوا اور جو مصلوب ہو وہ تورات کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف مرفوع نہیں ہوتا بلکہ بارگاہ الٰہی سے دھتکارا جاتا ہے اور مردودلوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور مخلوق کو نجات دلانے کی خاطر صلیب پر مارا گیا۔ اور بلاشک شروع میں اس کا رفع نہیں ہوا بلکہ اس پر لعنت ڈالی گئی اور اسے عذاب دیا گیا اور بدکار لوگوں کی طرح تین دن تک جہنم میں رکھا گیا لیکن اس کے بعد اسے عرش کی طرف اُٹھایا گیا اور اللہ نے اسے ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے دائیں ہاتھ بٹھا لیا گو یا یہود تفریط، ظلم اور تنقیص کی طرف چلے گئے۔ اور نصاریٰ نے تفریط کے ساتھ افراط کو اختیار کرلیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارہ میں جو درست اور حقیقت پر مبنی بات تھی اسے بیان کردیا اور فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ

كَالْمُقَرَّبِيْنَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّلْعَنَ وَيُدْخَلَ فِي اللَّظٰى۔ فَالْحَاصِلُ أَنَّ هٰذَا قَضَآءٌ مِّنَ اللّٰهِ الْأَعْلٰى۔ بَيْنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى۔ لِيُبَرِّءَ عَبْدَهٗ مِنْ بُهْتَانِ اللَّعْنِ۔ وَعَدَمِ الرَّفْعِ وَيَقْضِيَ بِمَا هُوَ أَحَقُّ وَأَوْلٰى۔ فَحَكَمَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ۔

وَلَوْلَا هٰذَا الْغَرَضُ فَمَا كَانَ وَجْهٌ لِّذِكْرِ هٰذِهِ الْقِصَّةِ۔ بَلْ لَوْ فُرِضَتِ الْقِصَّةُ عَلٰى خِلَافِ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ۔ لَكَانَ لَغْوًا كُلُّهَا وَمَحَلَّ اعْتِرَاضٍ عَلٰى فِعْلِ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ۔ أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَيُخْفِي الْمَسِيْحَ فِيْ مَغَارَةٍ مِّنَ الْمَغَارَاتِ۔ كَمَا أَخْفٰى أَفْضَلَ الرُّسُلِ عِنْدَ التَّعَاقُبَاتِ۔ فَفَكِّرْ أَيُّ حَاجَةٍ اشْتَدَّتْ لِرَفْعِهٖ إِلَى السَّمَاوَاتِ۔ أَخَشِيَ اللّٰهُ رُعْبَ الْيَهُوْدِ الْمَخْذُوْلِيْنَ۔ وَظَنَّ أَنَّهُمْ يُخْرِجُوْنَهٗ مِنَ الْأَرَضِيْنَ۔ أَلَا تَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ حَكِيْمٌ لَّا يَفْعَلُ فِعْلًا إِلَّا بِقَدْرِ ضَرُوْرَةٍ۔ وَلَا يَتَوَجَّهُ إِلٰى لَغْوٍ بِغَيْرِ حِكْمَةٍ دَاعِيَةٍ۔ فَأَيُّ حِكْمَةٍ أَلْجَأَ اللّٰهَ لِرَفْعِ الْمَسِيْحِ إِلَى السَّمَآءِ أَمَا وَجَدَ مَوْضِعًا فِي الْأَرْضِ لِلْإِخْفَاءِ۔ فَفَكِّرْ كَالْمُبْصِرِيْنَ۔ (انجام آتھم صفحہ ۱۶۸-۱۶۷ حاشیہ)

یہودیوں نے ایک پاک نبی کو ملعون کہہ کر خدا کے غضب کی راہ اختیار کی۔ اور عیسائیوں نے اپنے پاک نبی اور مرشد اور ہادی کے دل کو بوجہ لعنت کے مفہوم کے ناپاک اور خدا سے پھرا ہوا قرار دیکر ضلالت کی راہ اختیار کی اس لیے ضروری ہوا کہ قرآن بحیثیت حکم ہونے کے اس امر کا فیصلہ کرے پس یہ آیات بطور فیصلہ ہیں کہ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

السلام کو صلیب پر نہیں مارا گیا بلکہ انہوں نے طبعی موت سے وفات پائی اور وفات یافتوں سے جا ملے۔ پھر بغیر لعنتی ہونے کے اور جہنم میں ڈالے جانے کے مقربین کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا رفع ہوا۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے درمیان یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے تا وہ اپنے بندہ کو ملعون ہونے اور عدم رفع کے بہتان سے بری کرے اور صحیح اور درست فیصلہ فرمائے پس اس نے ان کے درمیان جو اختلاف تھا اس کا فیصلہ کر دیا اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اور اگر یہ غرض نہ تھی تو پھر اس قصّہ کے بیان کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ اگر اس قصّہ کو اس طرز پر نہ سمجھا جائے تو یہ پورا قصّہ لغو ٹھہرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فعل محلِ اعتراض بن جاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ وہ مسیح علیہ السلام کو غاروں میں سے کسی غار میں چھپا لیتا جیسا کہ اس نے دشمنوں کے تعاقب کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا تھا۔ پس سوچو مسیح کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کے لیے کونسی شدید ضرورت اسے پیش آئی تھی کیا اللہ تعالیٰ ان ذلیل یہودیوں کے رُعب سے ڈر گیا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ وہ اسے زمین کے ہر حصّہ سے نکال دیں گے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور ہر فعل بقدر ضرورت اور حکمت کے تقاضا کے مطابق کرتا ہے اور کسی لغویات کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ پس مسیح علیہ السلام کو آسمان کی طرف اُٹھانے کے لیے کونسی حکمت نے اللہ تعالیٰ کو مجبور کیا تھا۔ کیا اسے زمین میں چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ پس آنکھوں والوں کی طرح غور کرو۔ (انجام آتھم صفحہ ۱۶۸-۱۶۷ حاشیہ)

......بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ - یعنی یہ سرے سے بات غلط ہے کہ یہودیوں نے بذریعہ صلیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے اس لیے اس کا نتیجہ بھی غلط ہے کہ حضرت مسیح کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوا اور نعوذ باللہ شیطان کی طرف گیا ہے بلکہ خدا نے اپنی طرف اس کا رفع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہود اور نصاریٰ میں رفع جسمانی کا کوئی جھگڑا نہ تھا اور نہ یہود کا یہ اعتقاد تھا کہ جس کا رفع جسمانی نہ ہو وہ مومن نہیں ہوتا اور ملعون ہوتا ہے اور خدا کی طرف نہیں جاتا بلکہ شیطان کی طرف جاتا ہے۔ خود یہود قائل ہیں کہ حضرت موسیٰ کا رفع جسمانی نہیں ہوا حالانکہ وہ حضرت موسیٰ کو تمام اسرائیلی نبیوں سے افضل اور صاحب الشریعت سمجھتے ہیں اب تک یہود زندہ موجود ہیں اُن کو پوچھ کر دیکھ لو کہ انہوں نے حضرت مسیح کے مصلوب ہونے سے کیا نتیجہ نکالا تھا کیا یہ کہ اُن کا رفع جسمانی نہیں ہوا یا یہ کہ ان کا رفع روحانی نہیں ہوا اور وہ نعوذ باللہ اوپر کو خدا کی طرف نہیں گئے بلکہ نیچے کو شیطان کی طرف گئے۔ بڑی حماقت انسان کی یہ ہے کہ وہ ایسی بحث شروع کر دے جس کو اصل تنازع سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ بمبئی کلکتہ میں صدہا یہودی رہتے ہیں بعض اہل علم اور اپنے مذہب کے فاضل ہیں ان سے بذریعہ خط دریافت کر کے پوچھ لو کہ انہوں نے حضرت مسیح پر کیا الزام لگایا تھا اور صلیبی موت کا کیا نتیجہ نکالا تھا کیا عدم رفع جسمانی یا عدم رفع روحانی۔ غرض حضرت مسیح کے رفع کا مسئلہ بھی قرآن شریف میں بے فائدہ اور بغیر کسی محرک کے بیان نہیں کیا گیا بلکہ اس میں یہود کے ان خیالات کا ذبّ اور رد فع مقصود ہے جن میں وہ حضرت مسیح کے رفع روحانی کے منکر ہیں۔ بھلا اگر تنزل کے طور پر ہم مان بھی لیں کہ یہ لغو حرکت نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے اپنے لیے پسند کی کہ مسیح کو مع جسم اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنے نفس پر جسم اور جسمانی ہونے کا اعتراض بھی وارد کر لیا کیونکہ جسم جسم کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پھر بھی طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن شریف یہود اور نصاریٰ کی غلطی کی اصلاح کرنے آیا ہے اور یہود نے یہ ایک بڑی غلطی اختیار کی تھی کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کو نعوذ باللہ ملعون قرار دیا اور ان کے روحانی رفع سے انکار کیا۔ اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مر کر خدا کی طرف نہیں گیا ہے بلکہ شیطان کی طرف گیا تو اس الزام کا دفع اور ذبّ قرآن میں کہاں ہے جو اصل منصب قرآن کا تھا کیونکہ جس حالت میں آیت رَافِعُكَ اِلَيَّ[1] اور آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ جسمانی رفع کے لیے خاص ہو گئیں تو روحانی رفع کا بیان کسی اور آیت میں ہونا چاہیئے اور یہود اور نصاریٰ کی غلطی دور کرنے کے لیے کہ جو عقیدہ لعنت کے متعلق ہے۔ ایسی آیت کی ضرورت ہے کیونکہ جسمانی رفع لعنت کے مقابل پر نہیں، بلکہ جیسا کہ لعنت بھی ایک روحانی امر ہے ایسا ہی رفع بھی ایک امر روحانی ہونا چاہیے۔ پس وہی مقصود بالذات امر تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ جو امر تصفیہ کے متعلق تھا وہ اعتراض تو بدستور گلے پڑا رہا اور خدا نے خواہ نخواہ ایک غیر متعلق بات جو یہود کے عقیدہ اور باطل استنباط سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی یعنی رفع جسمانی اس کا قصہ بار بار قرآن شریف میں لکھ مارا گویا سوال دیگر اور جواب دگر۔ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی یہود اور نصاریٰ اور اہل اسلام تینوں فرقوں کے عقائد کے رو سے مدار نجات نہیں بلکہ کچھ بھی نجات اس پر موقوف نہیں تو پھر کیوں خدا نے اس کو بار بار ذکر کرنا شروع کر دیا۔ یہود کا یہ کب مذہب ہے کہ بغیر جسمانی رفع کے نجات نہیں ہو سکتی اور نہ سچا نبی ٹھہر سکتا ہے پھر اس لغو ذکر سے فائدہ کیا ہوا کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جو تصفیہ کے

[1] آل عمران آیت ۵۶

لائق امر تھا جس کے عدم تصفیہ سے ایک سچا نبی جھوٹا ٹھہرتا ہے بلکہ نعوذ باللہ کافر بنتا ہے اور لعنتی کہلاتا ہے اُس کا تو قرآن نے کچھ ذکر نہ کیا اور ایک بیہودہ قصہ رفع جسمانی کا جس سے کچھ بھی فائدہ نہیں شروع کر دیا۔ غرض حضرت مسیح کی موت اور رفع جسمانی پر یہ دلائل ہیں جو ہم نے بہت بسط سے اپنی کتابوں میں بیان کیے ہیں اور اب تک ہمارے مخالف عدم جواب کی وجہ سے ہمارے مدیون ہیں۔ پھر اس میں اب ہم پیر مہر علی شاہ یا کسی اور پیر صاحب یا مولوی صاحب سے کیا بحث کریں۔ ہم تو باطل کو ذبح کر چکے اب ذبح کے بعد کیوں اپنے ذبیحہ پر بے فائدہ چھری پھیریں۔ اے حضرات ان امور میں اب بحثوں کا وقت نہیں اب تو ہمارے مخالفوں کے لیے ڈرنے اور توبہ کرنے کا وقت ہے کیونکہ جہاں تک اس دنیا میں ثبوت ممکن ہے اور جہاں تک حقائق اور دعاوی کو ثابت کیا جاتا ہے اسی طرح ہم نے حضرت مسیح کی موت اور اُن کے رفع روحانی کو ثابت کر دیا ہے فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ۔[1] (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۵-۱۷)

یہود حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اُس رفع سے منکر تھے جو ہر یک مومن کے لیے مدار نجات ہے کیونکہ مسلمانوں کی طرح ان کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جان نکلنے (کے) بعد ہر یک مومن کی روح کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں مگر کافر پر آسمان کے دروازے بند ہوتے ہیں اس لیے اُس کی روح نیچے شیطان کی طرف پھینک دی جاتی ہے جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں بھی شیطان کی طرف ہی جاتا تھا لیکن مومن اپنی زندگی میں اوپر کی طرف جاتا ہے اس لیے مرنے کے بعد بھی خدا کی طرف اُس کا رفع ہوتا ہے اور اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ[2] کی آواز آتی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۶ حاشیہ)

رفع جسمانی کا خیال اُس وقت نصاریٰ کے دل میں پیدا ہوا جبکہ اُن کا ارادہ ہوا کہ مسیح کو خدا بنا دیں اور دنیا کا منجی قرار دیں ورنہ نصاریٰ بھی خود اس بات کے قائل ہیں کہ نجات کے لیے تو صرف روحانی رفع کافی ہے پس افسوس کہ جس امر کو نصاریٰ حضرت مسیح کی خدائی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ان کی ایک خصوصیت ٹھہراتے ہیں وہی امر مسلمانوں نے بھی اپنے عقیدہ میں داخل کر لیا ہے اگر مسلمان یہ جواب دیں کہ ہم تو ادریس کو بھی مسیح کی طرح آسمان پر عقیدہ رکھتے ہیں یہ دوسرا جھوٹھ ہے کیونکہ جیسا کہ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے کہ اہل سُنت کا یہی عقیدہ ہے کہ ادریس آسمان پر زندہ بجسم عنصری نہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی کسی دن زمین پر مرنے کے لیے آئے گا تو اب خواہ نخواہ رفع جسمانی میں مسیح کی خصوصیت ماننی پڑی اور قبول کرنا پڑا کہ اُس کا جسم غیر فانی ہے اور خدا کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور یہ صریح باطل ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۷ حاشیہ)

خدا کی طرف جانے کا نام رفع ہے اور شیطان کی طرف جانے کا نام لعنت ہے۔ ان دونوں لفظوں میں تقابل اضداد ہے۔ نادان لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر رفع کے معنے مع جسم اٹھانا ہے تو اس کے مقابل کا

---

[1] یونس آیت ۳۳ ۔ [2] الفجر آیت ۳۰ ۔

لفظ کیا ہوا جیسا کہ رفع روحانی کے مقابل پر لعنت ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صـ۱۴۰)

یہ خیال کہ قرآن شریف میں ان (حضرت مسیح) کی نسبت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ آیا ہے اور بل دلالت کرتا ہے کہ وہ مع جسم آسمان پر اٹھائے گئے۔ یہ خیال نہایت ذلیل خیال اور بچوں کا سا خیال ہے اس قسم کا رفع تو بلعم کی نسبت بھی مذکور ہے یعنی لکھا ہے کہ ہم نے ارادہ کیا تھا کہ بلعم کا رفع کریں مگر وہ زمین کی طرف جھک گیا۔ ظاہر ہے کہ مسیح کے لیے جو لفظ رفع میں استعمال کیے گئے وہی لفظ بلعم کی نسبت استعمال کیے گئے۔ مگر کیا خدا کا ارادہ تھا کہ بلعم کو مع جسم آسمان پر پہنچادے بلکہ صرف اس کی روح کا رفع مراد تھا۔ اے حضرات! خدا سے خوف کرو رفع جسمانی تو یہودیوں کے الزام میں معرض بحث میں ہی نہیں تمام جھگڑا تو رفع روحانی کے متعلق ہے کیونکہ یہود نے حضرت مسیح کو صلیب پر کھینچ کر بموجب نص توریت کے یہ خیال کر لیا تھا کہ اب اس کا رفع روحانی نہیں ہوگا اور وہ نعوذ باللہ خدا کی طرف نہیں جائے گا بلکہ ملعون ہو کر شیطان کی طرف جائیگا یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف بلایا جاتا ہے اس کو مرفوع کہتے ہیں اور جو شیطان کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے اس کو ملعون کہتے ہیں سو یہی وہ یہودیوں کی غلطی تھی جس کا قرآن شریف نے بحیثیت حکم ہونے کے فیصلہ کیا اور فرمایا کہ مسیح صلیب پر قتل نہیں کیا گیا اور فعل صلیب پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا اس لیے مسیح رفع روحانی سے محروم نہیں ہو سکتا۔ (تحفہ گولڑویہ صـ۱۰۱)

وَ اَثْبَتَ بِثُبُوْتٍ بَيِّنٍ وَّ وَاضِحٍ اَنَّ عِيْسٰى مَا صُلِبَ وَ مَا رُفِعَ اِلَى السَّمَآءِ۔ وَ مَا كَانَ رَفْعُهٗ اَمْرًا جَدِيْدًا مَّخْصُوْصًا بِهٖ بَلْ كَانَ رَفْعَ الرُّوْحِ فَقَطْ كَمِثْلِ رَفْعِ اِخْوَانِهٖ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ۔ وَ اَمَّا ذِكْرُ رَفْعِهٖ بِالْخُصُوْصِيَّةِ فِي الْقُرْاٰنِ۔ فَكَانَ لِـذَبِّ مَا زَعَمَ الْيَهُوْدُ وَ اَهْلُ الصُّلْبَانِ۔ فَاِنَّهُمْ ظَنُّوْا اَنَّهٗ صُلِبَ وَلُعِنَ بِحُكْمِ التَّوْرَاتِ۔ وَاللَّعْنُ يُنَافِي الرَّفْعَ بَلْ هُوَ ضِدٌّ هٗ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى ذَوِي الْحَصَاةِ۔ فَرَدَّ اللّٰهُ عَلٰى هَاتَيْنِ الطَّائِفَتَيْنِ بِقَوْلِهٖ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ وَالْمَقْصُوْدُ مِنْهُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِمَلْعُوْنٍ بَلْ مِنَ الَّذِيْنَ يُرْفَعُوْنَ وَيُكْرَمُوْنَ اَمَامَ عَيْنَيْهِ۔ وَمَا كَانَ اِنْكَارُ الْيَهُوْدِ اِلَّا مِنَ الرَّفْعِ الرُّوْحَانِيِّ الَّذِيْ لَا يَسْتَحِقُّهُ الْمَصْلُوْبُ۔

اللہ تعالٰے نے ایک بیّن اور واضح ثبوت کے ذریعہ سے ثابت کر دیا کہ عیسٰی علیہ السلام کو صلیب پر نہیں مارا گیا اور نہ وہ آسمان کی طرف اُٹھائے گئے اور نہ آپ کا رفع کوئی نئی بات تھی جو آپ کے ساتھ مخصوص تھی بلکہ یہ تو آپ کے بھائیوں یعنی دوسرے انبیاء کی طرح صرف روحانی رفع تھا اور یہ جو قرآن کریم میں آپ کے رفع کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے وہ تو محض یہودیوں اور صلیب پرستوں کے خیالات کا ردّ تھا۔ کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ آپ کو صلیب دیا گیا اور آپ تورات کے حکم کے مطابق ملعون ہو گئے۔ اور لعنت رفع کی منافی ہے بلکہ اس کی ضد ہے جیسا کہ اہل عقل پر مخفی نہیں پس اللہ تعالیٰ نے بل رفعہ اللہ الیہ کہہ کر ان دونوں گروہوں کا ردّ کر دیا اور اس سے مقصد یہ تھا کہ عیسٰی علیہ السلام ملعون نہیں ہیں بلکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا رفع کیا جاتا ہے اور جو خدا کی نگاہ میں معزز ہوتے ہیں نیز یہود کا انکار بھی اسی رفع روحانی سے تھا جس کا کسی مصلوب کو حق نہیں پہنچتا ورنہ ان کے نزدیک

وَلَيْسَ عِنْدَهُمْ رَفْعُ الْجِسْمِ مَدَارَ النَّجَاتِ فَالْبَحْثُ عَنْهُ لَغْوٌ لَا يَلْزَمُ مِنْهُ اللَّعْنُ وَالذُّنُوبُ۔ فَإِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَمُوسٰى۔ مَا رُفِعَ أَحَدٌ مِّنْهُمْ إِلَى السَّمَآءِ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ كَمَا لَا يَخْفٰى۔ وَلَا شَكَّ أَنَّهُمْ بُعِّدُوْا مِنَ اللَّعْنَةِ وَجُعِلُوْا مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ وَنَجَوْا بِفَضْلِ اللّٰهِ بَلْ كَانُوْا سَادَةَ النَّاجِيْنَ۔ فَلَوْ كَانَ رَفْعُ الْجِسْمِ إِلَى السَّمَآءِ مِنْ شَرَائِطِ النَّجَاتِ۔ لَكَانَ عَقِيْدَةُ الْيَهُوْدِ فِيْ أَنْبِيَائِهِمْ أَنَّهُمْ رُفِعُوْا مَعَ الْجِسْمِ إِلَى السَّمٰوٰتِ۔ فَالْحَاصِلُ أَنَّ رَفْعَ الْجِسْمِ مَا كَانَ عِنْدَ الْيَهُوْدِ مِنْ عَلَامَاتِ أَهْلِ الْإِيْمَانِ۔ وَمَا كَانَ إِنْكَارُهُمْ إِلَّا مِنْ رَفْعِ رُوْحِ عِيْسٰى وَكَذٰلِكَ يَقُوْلُوْنَ إِلٰى هٰذَا الزَّمَانِ۔ فَإِنْ فَرَضْنَا أَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰى بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ كَانَ لِبَيَانِ رَفْعِ جِسْمِ عِيْسٰى إِلَى السَّمَآءِ۔ فَأَيْنَ ذِكْرُ رَفْعِ رُوْحِهِ الَّذِيْ فِيْهِ تَطْهِيْرُهٗ مِنَ اللَّعْنَةِ وَشَهَادَةُ الْإِبْرَاءِ مَعَ أَنَّ ذِكْرَهٗ كَانَ وَاجِبًا لِّرَدِّ مَا زَعَمَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى مِنَ الْخَطَاءِ۔ وَكَفَاكَ هٰذَا إِنْ كُنْتَ مِنْ أَهْلِ الرُّشْدِ وَالدَّهَاءِ۔ أَتَظُنُّ أَنَّ اللّٰهَ تَرَكَ بَيَانَ رَفْعِ الرُّوْحِ الَّذِيْ يُنْجِيْ عِيْسٰى مِمَّا أُفْتِيَ عَلَيْهِ فِي الشَّرِيْعَةِ الْمُوْسَوِيَّةِ۔ وَتَصَدّٰى لِذِكْرِ رَفْعِ الْجِسْمِ الَّذِيْ لَا يَتَعَلَّقُ بِأَمْرٍ تَسْتَلْزِمُ اللَّعْنَةَ عِنْدَ هٰذِهِ الْفِرْقَةِ۔ بَلْ أَمْرٌ لَغْوٌ اشْتَهَرَ بَيْنَ زُمَعِ النَّصَارٰى وَالْعَامَّةِ۔ وَلَيْسَ تَحْتَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْحَقِيْقَةِ۔ وَمَا حَمَلَ النَّصَارٰى عَلٰى

رفع جسمانی نجات کا مدار نہیں پس رفع جسمانی کے متعلق ایسی بحث کرنا لغو ہے جس سے گناہ اور لعنت لازم نہ آئیں دیکھو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور موسیٰ میں سے کوئی بھی اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان کی طرف نہیں اٹھایا گیا جیسا کہ سب پر ظاہر ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ سب لعنت سے دور رکھے گئے تھے اور اللہ کے مقرب بنائے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ انہوں نے نجات حاصل کی تھی بلکہ وہ نجات پانے والوں کے سردار تھے اگر جسم کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا نجات کی شرائط میں سے ہوتا تو یہود کا عقیدہ اپنے انبیاء کے بارہ میں یہ ہوتا کہ وہ بجسم عنصری آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جسم کا اُٹھایا جانا یہود کے نزدیک اہل ایمان کی علامت نہیں تھا اور ان کا انکار محض عیسیٰؑ کے رفع روحانی سے تھا اور وہ اب تک یہی مانتے ہیں۔ اگر ہم فرض کریں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان بل رفعہ اللّٰہ الیہ کا مقصد یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بجسم عنصری آسمان پر اُٹھائے جانے کا ذکر کیا جائے تو آپ کے رفع روحانی کا ذکر کہاں ہے جس میں آپ کے لعنت سے پاک ہونے اور الزامات سے بری ہونے کی شہادت ہے حالانکہ اس کا ذکر یہود اور نصاریٰ کے جھوٹے خیالات کی تردید کے لیے ضروری تھا اور اگر تو اہل رشد و عقل میں سے ہے تو تیرے لیے اسی قدر بیان کافی ہے۔ کیا تو خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رفع روحانی کا ذکر تو چھوڑ دیا جو حضرت مسیح علیہ السلام کو شریعت موسویہ کی رو سے دئے گئے فتویٰ سے نجات یافتہ اور مخلصی پانے والا قرار دیتا تھا اور اللہ تعالیٰ جسم کے رفع کے ذکر کے پیچھے پڑ گیا جو کسی ایسے امر سے تعلق نہیں رکھتا جو ان لوگوں کے نزدیک لعنت کو مستلزم ہو۔ بلکہ وہ ایسی لغو بات ہے جو نصاریٰ کے کم فہم افراد اور عوام میں مشہور ہو گئی تھی اور جس میں کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اس بات پر نصاریٰ کو صرف یہودیوں کے پے در پے طعنوں اور ان کے اس الزام نے اُکسایا کہ عیسیٰ علیہ السلام

ذٰلِكَ اِلَّا طَعْنُ الْیَهُوْدِ بِالْاِصْرَارِ۔ وَقَوْلُهُمْ اِنَّ عِیْسٰی مَلْعُوْنٌ بِمَا صُلِبَ كَالْاَشْرَارِ۔ وَالْمَصْلُوْبُ مَلْعُوْنٌ بِحُكْمِ التَّوْرَاتِ وَلَیْسَ هٰهُنَا سَعَةُ الْفِرَارِ۔ فَضَاقَتِ الْاَرْضُ بِهٰذَا الطَّعْنِ عَلَى النَّصَارٰی۔ وَصَارُوْا فِیْ اَیْدِی الْیَهُوْدِ كَالْاُسَارٰی۔ فَنَحَتُوْا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ حِیْلَةَ صُعُوْدِ عِیْسٰی اِلَی السَّمَآءِ لَعَلَّهُمْ یُطَهِّرُوْهُ مِنَ اللَّعْنَةِ بِهٰذَا الْاِفْتِرَاءِ۔ وَمَا كَانَ مَفَرٌّ مِّنْ تِلْكَ الْحَادِثَةِ الشَّهِیْرَةِ الَّتِیْ اشْتَهَرَتْ بَیْنَ الْخَوَآصِّ وَالْعَوَآمِّ۔ فَاِنَّ الصَّلِیْبَ كَانَ مُوْجِبًا لِّلَّعْنَةِ بِاتِّفَاقِ جَمِیْعِ فِرَقِ الْیَهُوْدِ وَعُلَمَآءِهِمُ الْعِظَامِ۔ فَلِذٰلِكَ نُحِتَتْ قِصَّةُ صُعُوْدِ الْمَسِیْحِ مَعَ الْجِسْمِ حِیْلَةً لِّلْاِبْرَاءِ۔ فَمَا قُبِلَتْ لِعَدَمِ الشُّهَدَآءِ۔ فَرَجَعُوْا مُضْطَرِّیْنَ اِلٰی قُبُوْلِ اِلْزَامِ اللَّعْنَةِ۔ وَقَالُوْا حَمَلَهَا الْمَسِیْحُ تَنْجِیَةً لِّلْاُمَّةِ۔ وَمَا كَانَتْ هٰذِهِ الْمَعَاذِیْرُ اِلَّا كَخَبْطِ عَشْوَآءَ۔ ثُمَّ بَعْدَ مُدَّةٍ اتَّبَعُوا الْاَهْوَاءَ۔ وَجَعَلُوْا مُتَعَمِّدِیْنَ ابْنَ مَرْیَمَ لِلّٰهِ كَشُرَكَاءَ۔ وَصَارَ صُعُوْدُ الْمَسِیْحِ وَحَمْلُهُ اللَّعْنَةَ عَقِیْدَةً بَعْدَ ثَلٰثِ مِائَةِ سَنَةٍ عِنْدَ الْمَسِیْحِیِّیْنَ ثُمَّ تَبِعَ بَعْضَ خَیَالَاتِهِمْ بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ الْفَیْجُ الْاَعْوَجُ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاعْلَمْ اَرْشَدَكَ اللّٰهُ اَنَّ رَسُوْلَنَا صلعم مَا رَاٰی عِیْسٰی لَیْلَةَ الْمِعْرَاجِ اِلَّا فِیْ اَرْوَاحِ الْاَمْوَاتِ۔ وَاِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّذَوِی الْحَصَاةِ۔ وَكُلُّ مُؤْمِنٍ یُّرْفَعُ رُوْحُهٗ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ

ملعون ہیں کیونکہ آپ کو شریروں کی طرح صلیب پر مارا گیا۔ اور مصلوب شخص تورات کے حکم کے مطابق ملعون ہوتا ہے۔ اور اس جگہ اس الزام سے فرار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ پس ان طعنوں سے عیسائیوں پر زمین تنگ ہوگئی اور وہ یہودیوں کے ہاتھوں میں قیدیوں کی طرح ہو گئے۔ پس انہوں نے اپنے پاس سے عیسٰی علیہ السلام کے آسمان پر چڑھ جانے کا حیلہ تراش لیا۔ تا وہ اس جھوٹے عقیدہ کے ذریعہ مسیح کو لعنت سے پاک قرار دے سکیں اُنہیں اس مشہور واقعہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی جو خواص اور عوام میں شہرت پا چکا تھا۔ کیونکہ تمام یہودی فرقوں اور ان کے بڑے بڑے علماء کے اتفاق سے صلیبی موت موجب لعنت ہے اس لیے انہوں نے عیسٰیؑ کی بریت کے لیے بطور ایک حیلہ کے بجسدہ العنصری آپ کے آسمان پر چڑھ جانے کا قصّہ گھڑ لیا۔ لیکن گواہوں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس حیلہ کو قبولیت عامہ حاصل نہ ہوئی پس وہ لعنت کے الزام کو قبول کرنے کے لیے بے بس ہو گئے۔ اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسیح علیہ السلام نے امت کی نجات کی خاطر اس لعنت کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن یہ سب عذر اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے کے مترادف تھے۔ پھر کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی شروع کی اور جان بوجھ کر ابن مریم کو اللہ کا شریک قرار دیدیا۔ اور تین سو سال بعد مسیح علیہ السلام کا آسمان پر چڑھ جانا اور لعنت کو قبول کرنا عیسائیوں کے نزدیک ایک عقیدہ قرار پا گیا۔ پھر مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سو سال بعد فیج اعوج میں عیسائیوں کے بعض خیالات کی تقلید شروع کر دی لو رلے مخاطب اللہ تعالٰی تجھے ہدایت دے خوب سمجھ لو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات حضرت عیسٰی علیہ السلام کو وفات یافتہ لوگوں کی روحوں میں ہی دیکھا تھا اور اس میں عقلمندوں کے لیے ایک نشان ہے۔ اور موت کے بعد ہی مومنوں کی روح کا رفع ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے

تُفۡتَحُ لَہٗ اَبۡوَابُ السَّمٰوٰتِ ۔ فَكَیۡفَ وَصَلَ الۡمَسِیۡحُ اِلَی الۡمَوۡتٰی وَمَقَامَاتِھِمۡ مَعَ اَنَّہٗ کَانَ فِیۡ رِبۡقَةِ الۡحَیَاتِ ۔ (الھدیٰ صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

یہود کا جھگڑا تو صرف رفع روحانی کے بارہ میں تھا۔ اور ان کا خیال تھا۔ کہ ایمانداروں کی طرح حضرت عیسیٰ کی رُوح آسمان پر نہیں اٹھائی گئی۔ کیونکہ وہ صلیب دئے گئے تھے۔ اور جو صلیب دیا جائے وہ لعنتی ہے۔ یعنی آسمان پر خدا کی طرف اُس کی روح نہیں اٹھائی جاتی۔ اور قرآن شریف نے صرف اسی جھگڑے کو فیصلہ کرنا تھا۔ جیسا کہ قرآن شریف کا دعوٰے ہے کہ وہ یہود و نصارٰی کی غلطیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ان کے تنازعات کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہود کا جھگڑا تو یہ تھا۔ کہ عیسیٰ مسیح ایماندار لوگوں میں سے نہیں ہے۔ اور اُس کی نجات نہیں ہوئی۔ اور اس کی روح کا رفع خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوا۔ پس فیصلہ طلب یہ امر تھا۔ کہ عیسیٰ مسیح ایماندار اور خدا کا سچا نبی ہے یا نہیں۔ اور اس کی روح کا رفع مومنوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف ہوا یا نہیں۔ یہی قرآن شریف نے فیصلہ کرنا تھا۔ پس اگر آیت بل رفعہ اللہ الیہ سے یہ مطلب ہے کہ خدا تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ کو مع جسم عنصری دوسرے آسمان پر اٹھا لیا۔ تو اس کارروائی سے متنازعہ فیہ امر کا کیا فیصلہ ہوا۔ گویا خدا نے امر متنازعہ فیہ کو سمجھا ہی نہیں۔ اور وہ فیصلہ دیا جو یہودیوں کے دعوٰی سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتا۔ پھر آیت میں تو یہ صاف لکھا ہے۔ کہ عیسیٰ کا رفع خدا کی طرف ہوا۔ یہ تو نہیں لکھا۔ کہ دوسرے آسمان کی طرف رفع ہوا۔ کیا خدائے عزّوجلّ دوسرے آسمان پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا نجات اور ایمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم بھی ساتھ ہی اٹھایا جائے۔ اور عجب بات یہ ہے۔ کہ آیت بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ میں آسمان کا ذکر بھی نہیں۔ بلکہ اس آیت کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ خدا نے اپنی طرف مسیح کو اٹھا لیا۔ اب تبلاؤ۔ کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت موسٰیؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کسی اور طرف اُٹھائے گئے تھے۔ خدا کی طرف نہیں۔ میں اس جگہ زور سے کہتا ہوں کہ اس آیت کی حضرت مسیح سے تخصیص سمجھنا یعنی رفع الی اللہ انہیں کے ساتھ خاص کرنا۔ اور دوسرے نبیوں کو اس سے باہر رکھنا۔ یہ کلمہ کفر ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسے معنوں سے باستثناء حضرت عیسیٰؑ تمام انبیاء کو رفع سے جواب دیا گیا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج سے آکر ان کی رفع کی گواہی بھی دی اور یہ یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ کی رُفع کا ذکر صرف یہودیوں کی تنبیہ اور دفع اعتراض کے لیے تھا۔ ورنہ یہ رفع تمام انبیاء اور رسل اور مومنوں میں عام ہے۔ مرنے کے بعد ہر ایک مومن کا رفع ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت ھٰذَا ذِکۡرٌ ؕ وَ اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ ۔ جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّھُمُ الۡاَبۡوَابُ[1] (سورۃ ص پارہ ۲۳ ع ۱۳) میں اس رفع کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن کافر کا رفع نہیں ہوتا۔ چنانچہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَھُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ[2] اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۱۸-۲۰)

آسمانوں کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں پھر حضرت مسیح علیہ السلام بقید حیات ہونے کے باوجود وفات یافتہ لوگوں اور ان کے مقامات تک کیسے پہنچے۔ (الھدیٰ صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

---

[1] ص آیت ۵۰-۵۱ ۔ [2] الاعراف آیت ۴۱ ۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ آیت بل رفعہ اللہ الیہ کے یہی معنے ہیں۔ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان دوم کی طرف اٹھائے گئے۔ تو پھر پیش کرنا چاہیئے۔ کہ اصل متنازعہ فیہ امر کا فیصلہ کس آیت میں تبلایا گیا ہے۔ یہودی جواب تک زندہ اور موجود ہیں وہ تو حضرت مسیح کے رفع کے انہیں معنوں سے منکر ہیں۔ کہ وہ نعوذ باللہ مومن اور صادق نہ تھے۔ اور ان کی روح کا خدا کی طرف رفع نہیں ہوا۔ اور شک ہو تو یہودیوں کے علماء سے جا کر پوچھ لو۔ کہ وہ صلیبی موت سے یہ نتیجہ نہیں نکالتے کہ اس موت سے روح مع جسم آسمان پر نہیں جاتی۔ بلکہ وہ بالاتفاق یہ کہتے ہیں۔ کہ جو شخص صلیب کے ذریعہ سے مارا جائے۔ وہ ملعون ہے اس کا خدا کی طرف رفع نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں حضرت عیسٰی کی صلیبی موت سے انکار کیا۔ اور فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اور صَلَبُوْهُ کے ساتھ آیت میں قَتَلُوْهُ کا لفظ بڑھا دیا۔ تا اس بات پر دلالت کرے کہ صرف صلیب پر چڑھایا جانا موجب لعنت نہیں۔ بلکہ شرط یہ ہے۔ کہ صلیب پر چڑھایا بھی جائے۔ اور بہ نیت قتل اس کی ٹانگیں بھی توڑی جائیں اور اس کو مار ابھی جائے۔ تب وہ موت ملعون کی موت کہلائے گی۔ مگر خدا نے حضرت عیسٰی کو اس موت سے بچا لیا۔ وہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ مگر صلیب کے ذریعہ سے اُن کی موت نہیں ہوئی۔ ہاں یہود کے دلوں میں یہ شبہ ڈال دیا۔ کہ گویا وہ صلیب پر مر گئے ہیں۔ اور یہی دھوکا نصاریٰ کو بھی لگ گیا۔ ہاں انہوں نے خیال کیا کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اصل بات صرف اتنی تھی۔ کہ اس صلیب کے صدمہ سے بیہوش ہو گئے تھے۔ اور یہی معنے شُبِّهَ لَهُمْ کے ہیں۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۲-۲۳)

یہودی فاضل جواب تک موجود ہیں اور بمبئی اور کلکتہ میں بھی پائے جاتے ہیں عیسائیوں کے اِس قول پر کہ حضرت عیسٰی آسمان پر چلے گئے ہیں بڑا ٹھٹھا اور ہنسی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے نادان ہیں جنہوں نے اصل بات کو سمجھا نہیں کیونکہ قدیم یہودیوں کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جو شخص صلیب دیا جائے وہ بے دین ہوتا ہے اور اُس کی رُوح آسمان پر اُٹھائی نہیں جاتی۔ اِس دعویٰ کے ردّ کرنے کے لیے عیسائیوں نے یہ بات بنائی کہ گویا حضرت عیسٰی مع جسم آسمان پر چلے گئے ہیں تا وہ داغ جو مصلوب ہونے سے حضرت عیسٰی پر لگتا تھا وہ دور کر دیں مگر اس منصوبہ میں انہوں نے نہایت نادانی ظاہر کی۔ کیونکہ یہودیوں کا یہ تو عقیدہ نہیں کہ جو شخص مع جسم آسمان پر نہ جاوے وہ بے دین اور کافر ہوتا ہے اور اُس کی نجات نہیں ہوتی کیونکہ بموجب عقیدہ یہودیوں کے حضرت موسیٰ بھی مع جسم آسمان پر نہیں گئے۔ یہودیوں کی حُجّت تو یہ تھی کہ بموجب حکم توریت کے جو شخص کاٹھ پر لٹکایا جائے اُس کی رُوح آسمان پر اُٹھائی نہیں جاتی کیونکہ صلیب جرائم پیشہ لوگوں کے ہلاک کرنے کا آلہ ہے پس خدا اِس سے پاک تر ہے کہ ایک مطہر اور راست باز مومن کو صلیب کے ذریعہ سے ہلاک کرے سو توریت میں یہی حکم لکھ دیا گیا کہ جو شخص صلیب کے ذریعہ سے مارا جائے وہ مومن نہیں اور اُس کی رُوح خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائی نہیں جاتی یعنی رفع الی اللہ نہیں ہوتا۔ اور جبکہ مسیح صلیب کے ذریعہ سے ہلاک ہو گیا تو اِس سے نعوذ باللہ بقول یہود ثابت ہو گیا کہ وہ ایماندار نہ تھا اور اس کی رُوح خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائی نہیں گئی پس اس کے مقابل پر یہ کہنا کہ مسیح مع جسم آسمان پر چلا گیا یہ حماقت ہے اور ایسے بیہودہ جواب سے

یہودیوں کا اعتراض بدستور قائم رہتا ہے کیونکہ ان کا اعتراض رفع روحانی کے متعلق ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہو نہ رفع جسمانی کے متعلق جو آسمان کی طرف ہو۔ اور قرآن شریف جو اختلاف نصاریٰ اور یہود کا فیصلہ کرنے والا ہے اُس نے اپنے فیصلہ میں یہی فرمایا کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یعنی خدا نے عیسیٰ کو اپنی طرف اُٹھا لیا اور ظاہر ہے کہ خدا کی طرف روح اُٹھائی جاتی ہے نہ جسم۔ خدا نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ بلکہ فرمایا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اور اس مقام میں خدا تعالیٰ کا صرف یہ کام تھا جو یہودیوں کا اعتراض دور کرتا جو رفع روحانی کے انکار میں ہے اور نیز عیسائیوں کی غلطی کو دور فرماتا پس خدا تعالیٰ نے ایک ایسا جامع لفظ فرمایا جس سے دونوں فریق کی غلطی کو ثابت کر دیا کیونکہ خدا تعالیٰ کا یہ قول کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ صرف یہی ثابت نہیں کرتا کہ مسیح کا رفع روحانی خدا تعالیٰ کی طرف ہو گیا اور وہ مومن ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ آسمان کی طرف اس کا رفع نہیں ہوا کیونکہ خدا تعالیٰ جو تجسم اور جہات اور احتیاج مکان سے پاک ہے اس کی طرف رفع ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ جسمانی رفع نہیں بلکہ جس طرح اور تمام مومنوں کی روحیں اُس کی طرف جاتی ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح بھی اُس کی طرف گئی ہر ایک ذی علم جانتا ہے کہ قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہے کہ جب مومن فوت ہوتا ہے اُس کی روح خدا کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ[1]

یعنی اے روح اطمینان یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلی آ وہ تجھ سے راضی اور تو اُس سے راضی۔ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔ اور یہی یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ مومن کی روح کا رفع خدا تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور بے دین اور کافر کا رفع خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتا اور وہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کافر اور بے دین سمجھتے تھے کہ اس شخص نے خدا پر افتراء کیا ہے اور یہ سچا نبی نہیں ہے اور اگر سچا ہوتا تو اُس کے آنے سے پہلے الیاس نبی دوبارہ دنیا میں آتا اسی لیے وہ لوگ یہی عقیدہ رکھتے تھے اور اب تک رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی روح مومنوں کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف نہیں گئی بلکہ نعوذ باللہ شیطان کی طرف گئی۔ اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہود کو جھوٹا ٹھہرایا اور ساتھ ہی عیسائیوں کو بھی دروغگو قرار دیا۔ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑے بڑے افتراء کیے ہیں ایک جگہ طالمود میں جو یہودیوں کی حدیثوں کی کتاب ہے لکھا ہے کہ یسوع کی لاش کو جب دفن کیا گیا تو ایک باغبان نے جس کا نام یہوداؔ اسکریوطی تھا لاش کو قبر سے نکال کر ایک جگہ پانی کے روکنے کے واسطے بطور بندھ کے رکھ دیا یسوع کے شاگردوں نے جب قبر کو خالی پایا تو شور مچا دیا کہ وہ مع جسم آسمان پر چلا گیا تب وہ لاش ملکہ ہیلنیا کے روبرو سب کو دکھائی گئی اور یسوع کے شاگرد سخت شرمندہ ہوئے دیکھو جیوئش انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۱۷۲ جلد ۷۔ یہ انسائیکلوپیڈیا یہودیوں کی ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۷۰-۱۷۳ حاشیہ)

---

[1] الفجر آیات ۲۸-۳۱

اگر خدا تعالیٰ کی ان آیات میں یعنی بل رفعہ اللہ الیہ میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مع جسم عنصری دوسرے یا چوتھے آسمان پر پہنچائے گئے تھے تو ہمیں کوئی بتلائے کہ یہودیوں کے اِس اعتراض کا کن آیات میں جواب ہے جو وہ کہتے ہیں جو مومنوں کی طرح حضرت عیسیٰ کا رفع روحانی خدا تعالیٰ کی طرف نہیں ہوا یہ تو نعوذ باللہ قرآن شریف کی ہتک ہے کہ اعتراض تو یہودیوں کا کوئی اور تھا اور جواب کوئی اور دیا گیا گویا خدا تعالیٰ نے یہودیوں کا منشا نہیں سمجھا یہودی تو اس بارے میں حضرت عیسیٰ سے کوئی خصوصیت کا معجزہ نہیں چاہتے تھے ان کا تو یہی اعتراض تھا کہ عام مومنوں کی طرح اُن کا رفع نہیں ہوا اور اُن کا جواب تو صرف ان الفاظ سے دینا چاہیئے تھا کہ اُن کا رفع خدا تعالیٰ کی طرف ہو گیا ہے پس اگر ممدوحہ بالا آیت کا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ آسمان پر بٹھانے کا مطلب ہے تو یہ تو یہودیوں کے اعتراض کا جواب نہیں ہے قرآن شریف کی نسبت یہ خیال کہ سوال دیگر اور جواب دیگر۔ ایسا خیال تو کفر تک پہنچ جاتا ہے جب کہ قرآن شریف کا یہ بھی منصب ہے کہ یہود کی اُن غلط تہمتوں کو دُور کرے جو حضرت عیسیٰ پر اُنہوں نے لگائی تھیں تو منجملہ اُن تہمتوں کے یہ بھی یہود کی ایک تہمت تھی کہ وہ حضرت عیسیٰ کے رفع روحانی کے منکر تھے اور اس طور سے نعوذ باللہ اُن کو کافر ٹھہراتے تھے پس قرآن شریف کا فرض تھا کہ اس تہمت سے اُن کو بری کرتا سو اگر ان آیتوں میں اُس نے حضرت عیسیٰ کو اِس تہمت سے بری نہیں کیا تو قرآن شریف میں سے اور ایسی آیتیں پیش کرنی چاہئیں جن میں اُس نے اس تہمت سے حضرت عیسیٰ کو بری کر دیا ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۶۷ حاشیہ)

خدا تعالیٰ کے اس کلام سے کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یہ معنی نکالنا کہ حضرت عیسیٰ مع جسم عنصری دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰ کے پاس جا بیٹھے کس قدر نافہمی اور نادانی ہے۔ کیا خدائے عزّ وجلّ دوسرے آسمان پر بیٹھا ہوا ہے اور کیا قرآن میں رَفع اِلَى اللّٰهِ کے معنی کسی اور محل میں بھی یہ آئے ہیں کہ آسمان پر مع جسم عنصری اُٹھا لینا اور کیا قرآن شریف میں اس کی کوئی نظیر ہے کہ جسم عنصری بھی آسمان کی طرف اُٹھایا جاتا ہے اور اس آیت کے مشابہ دوسری آیت بھی قرآن شریف میں موجود ہے اور وہ یہ کہ :- يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [1] پس کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ اے نفس مطمئنہ مع جسم عنصری دوسرے آسمان پر چلا جا! اور خدا تعالیٰ قرآن شریف میں بلعم باعور کی نسبت فرماتا ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے اُس کا رفع چاہا مگر وہ زمین کی طرف جُھک گیا۔ کیا اِس آیت کے بھی یہی معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ بلعم باعور کو مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھانا چاہتا تھا مگر بلعم نے زمین پر رہنا ہی پسند کیا۔ افسوس کس قدر قرآن شریف کی تحریف کی جاتی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ موجود ہے اِس سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ مگر ہر یک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ کسی شخص کا نہ مقتول ہونا نہ مصلوب ہونا اِس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ مع جسم عنصری آسمان پر اٹھایا گیا ہو اگلی آیت میں صریح یہ لفظ موجود ہیں کہ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ یعنی یہودی قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مگر اُن کو شبہ میں ڈالا گیا کہ ہم نے قتل کر دیا ہے۔ پس شبہ میں ڈالنے کے لیے اِس بات کی کیا ضرورت

[1] الفجر آیت ۲۸-۲۹

تھی کہ کسی اور مومن کو مصلوب کر کے لعنتی بنایا جائے۔ یا خود یہودیوں میں سے کسی کو حضرت عیسیٰ کی شکل بنا کر صلیب پر چڑھایا جاوے۔ کیونکہ اس صورت میں ایسا شخص اپنے تئیں حضرت عیسیٰ کا دشمن ظاہر کر کے اور اپنے اہل و عیال کے پتے اور نشان دیکر ایک دم میں مخلصی حاصل کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ عیسیٰ نے جادو سے مجھے اپنی شکل پر بنا دیا ہے یہ کس قدر مجنونانہ توہمات ہیں کیوں لٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کے معنے یہ نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر فوت نہیں ہوئے مگر غشی کی حالت اُن پر طاری ہو گئی تھی بعد میں دو تین روز تک ہوش میں آگئے اور مرہم عیسیٰ کے استعمال سے (جو آج تک صد ہا طبّی کتابوں میں موجود ہے جو حضرت عیسیٰ کے لیے بنائی گئی تھی) اُن کے زخم بھی اچھے ہو گئے۔

پھر ایک اور بد قسمتی ہے کہ وہ ان آیتوں کے شان نزول کو نہیں دیکھتے۔ قرآن شریف یہود و نصاریٰ کے اختلافات دور کرنے کے لیے بطور حکم کے تھا تا اُن کے اختلافات کا فیصلہ کرے اور اُس کا فرض تھا کہ اُن کے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کرنا پس منجملہ متنازعہ فیہ امور کے ایک یہ امر بھی متنازعہ فیہ تھا کہ یہود کہتے تھے کہ ہماری توریت میں لکھا ہے کہ جو کاٹھ پر لٹکایا جاوے وہ لعنتی ہوتا ہے اس کی رُوح مرنے کے بعد خدا کی طرف نہیں جاتی۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مر گئے اس لیے وہ خدا کی طرف نہیں گئے اور آسمان کے دروازے اُن کے لیے نہیں کھولے گئے۔ اور عیسائیوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں عیسائی تھے اپنا یہ عقیدہ مشہور کیا تھا چنانچہ آج تک وہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر جان دیکر لعنتی تو بن گئے مگر یہ لعنت اَوروں کو نجات دینے کے لیے اُنہوں نے خود اپنے سر پر لے لی تھی۔ اور آخر وہ نہ جسم عنصری کے ساتھ بلکہ ایک نئے اور ایک جلالی جسم کے ساتھ جو خون اور گوشت اور ہڈی اور زوال پذیر ہونے والے مادہ سے پاک تھا خدا کی طرف اُٹھائے گئے۔ اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ان دونوں متخاصمین کی نسبت یہ فیصلہ دیا کہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ عیسیٰ کی صلیب پر جان نکلی یا وہ قتل ہوا تا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وہ بموجب حکم توریت لعنتی ہے بلکہ وہ صلیبی موت سے بچایا گیا اور مومنوں کی طرح اُس کا خدا کی طرف رفع ہُوا اور جیسا کہ ہر ایک مومن ایک جلالی جسم خدا سے پا کر خدائے عزّ وجل کی طرف اُٹھایا جاتا ہے وہ بھی اُٹھائے گئے۔ اور اُن نبیوں میں جا ملے جو ان سے پہلے گذر چکے تھے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان سے سمجھا جاتا ہے کہ جو آپ نے معراج سے واپس آکر بیان فرمایا کہ جیسے اور نبیوں کے مقدس اجسام دیکھے ویسا ہی حضرت عیسیٰ کو بھی اُنہیں کے رنگ میں پایا اور اُن کے ساتھ پایا کوئی نرالا جسم نہیں دیکھا۔

پس یہ مسئلہ کیسا صاف اور صریح تھا کہ یہودیوں کا انکار محض رفع روحانی سے تھا کیونکہ وہی رفع ہے جو لعنت کے مفہوم کے برخلاف ہے مگر مسلمانوں نے محض اپنی ناواقفیت کی وجہ سے رفع روحانی کو رفع جسمانی بنا دیا یہودیوں کا ہرگز یہ اعتقاد نہیں کہ جو شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہ جاوے وہ مومن نہیں بلکہ وہ تو آج تک اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ جس کا رفع روحانی نہ ہو اور اُس کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں وہ مومن نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن شریف بھی فرماتا ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ[1] یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ مگر مومنوں کے لیے فرماتا ہے

[1] الاعراف آیت ۴۱

مُفَتَّحَۃً لَّھُمُ الْاَبْوَابُ[1] یعنی مومنوں کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے پس یہودیوں کا یہی جھگڑا تھا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کافر ہیں اس لیے خدا تعالیٰ کی طرف اُن کا رفع نہیں ہوا۔ یہودی اب تک زندہ ہیں مَر تو نہیں گئے۔ ان کو پوچھ کر دیکھ لو کہ جو صلیب پر لٹکایا گیا کیا اس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جاتا اور اس کے جسم کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع نہیں ہوتا۔ جہالت بھی ایک عجیب بلا ہے مسلمانوں نے اپنی ناسمجھی سے کہاں کی بات کہاں تک پہنچا دی اور ایک فوت شدہ انسان کے دوبارہ آنے کے منتظر ہو گئے حالانکہ حدیثوں میں حضرت عیسیٰ کی عمر ایک سو بیس[120] برس مقرر ہو چکی ہے۔ کیا وہ ایک سو بیس[120] برس اب تک نہیں گذرے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۵-۳۸)

اگر آیت بل رفعہ اللہ الیہ کے یہ معنی ہیں کہ حضرت عیسیٰ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھائے گئے تو ہمیں کوئی دکھلائے کہ قرآن شریف میں وہ آیت کہاں ہے جو امر متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرتی ہے یعنی جس میں یہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا بعد موت مومنوں کی طرح خدا کی طرف رفع ہو گا اور وہ مرنے کے بعد یحییٰ وغیرہ انبیا کے ساتھ جا ملیں گے کیا نعوذ باللہ خدا کو یہ دھوکہ لگا کہ یہود کی طرف سے انکار تو تھا اُن کی رفع روحانی کا جو مومن کا بعد موت ہوتا ہے اور خدا نے کچھ اور کا اور سمجھ لیا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ھٰذَا الْاِفْتِرَاءِ عَلَی اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۷ حاشیہ)

یہود کا اعتراض تو یہی تھا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ چونکہ سولی چڑھائے گئے ہیں اس واسطے وہ ملعون ہیں اور صاف بات ہے کہ ملعون کا رفع روحانی نہیں ہو سکتا۔ اسی کے جواب میں قرآن شریف نے فرمایا ہے بل رفعہ اللہ الیہ۔

اچھا ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا یہی اعتراض تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا رفع جسمانی نہیں ہوا تو پھر قرآن شریف جو کہ ان دونوں قوموں میں حکم ہو کر آیا ہے اس نے یہود کے اس اعتراض کا کیا جواب دیا ہے۔ کیا وجہ کہ قرآن شریف نے یہود کے اصل اعتراض کا تو کہیں جواب نہ دیا اور رفع روحانی پر اتنا زور دیا اور رفعہ اللہ الیہ فرمایا رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَی السَّمَآءِ کیوں نہ فرمایا

عرش الٰہی ایک وراء الوراء مخلوق ہے۔ جو زمین سے اور آسمان سے بلکہ تمام جہات سے برابر ہے۔ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ عرش الٰہی آسمان سے قریب اور زمین سے دور ہے۔ لعنتی ہے وہ شخص جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے۔ عرش مقام تنزیہ ہے اور اسی لیے خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ[2]۔ اور مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ[3] اور فرماتا ہے کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ[4]۔

غرض اصل جھگڑا تو صرف اُن کے رفع روحانی اور مقرب بارگاہ سلطانی ہونے کے متعلق تھا سو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ہی کر دیا یہ فرما کر کہ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ۔ اب کوئی بتائے کہ بھلا اس سے اُن کا آسمان پر چڑھ جانا کیسے ثابت ہوتا ہے کیا خدا آسمان پر ہے اور زمین پر نہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۱ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

اصل جھگڑا تو یہود کا یہ تھا۔ کہ حضرت مسیحؑ کا رفع روحانی نہیں ہوا۔ وہ تو اس بات کو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ کہ نعوذ باللہ مسیح لعین اور مردود ہیں اسی واسطے وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہم نے مسیح کو صلیب دیا اور اس طرح سے ان کو قتل کرنے کے

---

[1] صٓ آیت ۵۱ ٭ [2] الحدید آیت ۵ ٭ [3] المجادلہ آیت ۸ ٭ [4] قٓ آیت ۱۷ ٭

مدعی تھے تاکہ اپنی کتاب کے فرمودہ کے مطابق ان کو جھوٹا نبی ثابت کریں رفع جسمانی کے متعلق تو کوئی جھگڑا ہی نہ تھا۔ قرآن شریف چونکہ بنی اسرائیل کے متنازعہ فیہ امور میں حکم اور قول فیصل ہے اس نے یہود کے اس اعتراض اور بہتان کا جو انہوں نے مسیح کو لعنتی اور جھوٹا نبی ثابت کرنے کے واسطے باندھا تھا۔ جواب دیا کہ مَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ کہ یہود نے جیساکہ ان کا زعم ہے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس طرح سے وہ اُن کو جھوٹا نبی ثابت کرنے کے دعویٰ میں کامیاب ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا رفع روحانی کیا اور ان کو ایسی ذلّت اور ادبار سے بچا لیا۔ اگر رفع جسمانی ہی نجات اور پاکیزگی اور مقبول اور محبوب الٰہی ہونے کا موجب ہے تو پھر تو سارے ہی نبی جھوٹے ٹھہرتے ہیں اور کوئی بھی نجات یافتہ نہیں رہتا چہ جائیکہ کوئی خدا کا محبوب اور مقبول بھی ہو۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ تعصّب نے ان کو کسی کام کا نہ چھوڑا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ

سوال (پیش ہوا کہ) قرآن شریف کی آیت مندرجہ ذیل مسیح ابن مریم کی زندگی پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کیونکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ مسیح کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب اُس پر ایمان لے آویں گے سو اس آیت کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور ہے کہ مسیح اُس وقت تک جیتا رہے جب تک کہ تمام اہل کتاب اُس پر ایمان لے آویں۔

اما الجواب (حضور نے فرمایا) پس واضح ہو کہ سایل کو یہ دھوکہ لگا ہے کہ اُس نے اپنے دل میں یہ خیال کر لیا ہے۔ آیت فرقانی کا یہ منشاء ہے کہ مسیح کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب کے فرقوں کا اس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ اگر ہم فرض کے طور پر تسلیم کرلیں کہ آیت موصوفہ بالا کے یہی معنے ہیں جیسا کہ سایل سمجھا ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ زمانہ صعود مسیح سے اُس زمانہ تک کہ مسیح نازل ہو جس قدر اہل کتاب دنیا میں گذرے ہیں یا اب موجود ہیں یا آیندہ ہوں گے وہ سب مسیح پر ایمان لانے والے ہوں حالانکہ یہ خیال بہ بداہت باطل ہے ہر یک شخص خوب جانتا ہے کہ بے شمار اہل کتاب مسیح کی نبوت سے کافر رہ کر اب تک واصل جہنم ہو چکے ہیں اور خدا جانے آیندہ بھی کس قدر کفران کی وجہ سے اُس آتشی تنور میں پڑیں گے اگر خدائے تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ وہ تمام اہل کتاب فوت شدہ مسیح کے نازل ہونے کے وقت اس پر ایمان لاویں گے تو وہ اُن سب کو اس وقت تک زندہ رکھتا جب تک کہ مسیح آسمان سے نازل ہوتا لیکن اب مرنے کے بعد اُن کا ایمان لانا کیونکر ممکن ہے۔

بعض لوگ نہایت تکلف اختیار کر کے یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مسیح کے نزول کے وقت خدائے تعالیٰ اُن سب

اہل کتاب کو پھر زندہ کرے جو مسیح کے وقت بعث سے مسیح کے دوبارہ نزول تک کفر کی حالت میں مر گئے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو کوئی کام خدائے تعالیٰ سے غیر ممکن نہیں لیکن زیر بحث تو یہ امر ہے کہ کیا قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں ان خیالات کا کچھ نشان پایا جاتا ہے اگر پایا جاتا ہے تو کیوں وہ پیش نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگ کچھ شرمندے سے ہو کر دبی زبان یہ تاویل پیش کرتے ہیں۔ کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسیح کے دوبارہ آنے کے وقت دُنیا میں موجود ہوں گے اور وہ سب مسیح کو دیکھتے ہی ایمان لے آویں گے اور قبل اس کے جو مسیح فوت ہو وہ سب مومنوں کی فوج میں داخل ہو جائیں گے لیکن یہ خیال بھی ایسا باطل ہے کہ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں اول تو آیت موصوفہ بالا صاف طور پر فائدہ تعمیم کا دے رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے لفظ سے تمام وہ اہل کتاب مُراد ہیں جو مسیح کے وقت میں یا مسیح کے بعد برابر ہوتے رہیں گے اور آیت میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں جو آیت کو کسی خاص محدود زمانہ سے متعلق اور وابستہ کرتا ہو علاوہ اِس کے یہ معنے بھی جو پیش کیے گئے ہیں بہ بداہت فاسد ہیں کیونکہ احادیث صحیحہ باآواز بلند بتلا رہی ہیں کہ مسیح کے دم سے اُس کے منکر خواہ وہ اہل کتاب ہیں یا غیر اہل کتاب کفر کی حالت میں مریں گے اور کچھ ضرور نہیں کہ ہم بار بار اُن حدیثوں کو نقل کریں اِسی رسالہ میں اپنے موقعہ پر دیکھ لینا چاہیئے ماسوا اس کے مسلمانوں کا یہ عقیدہ مسلّمہ ہے کہ دجّال بھی اہل کتاب میں سے ہی ہو گا اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ مسیح پر ایمان نہیں لائے گا اب میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس خیال کے پیرو اِن حدیثوں کو پڑھ کر کس قدر شرمندہ ہوں گے یہ بھی مانا گیا اور مسلم میں موجود ہے کہ مسیح کے بعد شریر رہ جائیں گے جن پر قیامت آئے گی اگر کوئی کافر نہیں رہے گا تو وہ کہاں سے آجائے گی۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۶۶-۳۶۹)

اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ پیشگوئی کی صورت پر نہیں جیسا کہ ہمارے بھائی مولوی صاحبان جو بڑے علم کا دم مارتے ہیں خیال کر رہے ہیں بلکہ یہ تو اُس واقعہ کا بیان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھا یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات کی جو اس وقت حالت تھی خدائے تعالیٰ اتماماً للحجت اُنہیں سُنا رہا ہے اور اُن کے دلوں کی حقیقت اُن پر ظاہر کر رہا ہے۔ اور اُن کو ملزم کر کے انہیں یہ سمجھا رہا ہے کہ اگر ہمارا یہ بیان صحیح نہیں ہے، تو مقابل پر آ کر صاف طور پر دعویٰ کرو کہ یہ خبر غلط بتائی گئی ہے اور ہم لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ یقینی طور پر سمجھ بیٹھے ہیں کہ سچ مچ مسیح مصلوب ہو گیا ہے۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ آخر آیت میں جو یہ لفظ واقعہ ہے کہ قَبْلَ مَوْتِهٖ اِس کلام سے اللہ جلّ شانہ کا یہ مطلب ہے کہ کوئی شخص مسیح کی عدم مصلوبیت سے یہ نتیجہ نہ نکال لیوے کہ چونکہ مسیح صلیب کے ذریعہ سے مارا نہیں گیا اس لیے وہ مرا بھی نہیں سو بیان فرما دیا کہ یہ تمام حال تو قبل از موت طبعی ہے اِس لیے اُس موت کی نفی نہ نکال لینا جو بعد اس کے طبعی طور پر مسیح کو پیش آگئی گویا اس آیت میں یوں فرماتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ ہمارے اِس بیان پر بالاتفاق ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح یقینی طور پر صلیب کی موت سے نہیں مرا صرف شکوک و شبہات ہیں سو قبل اِس کے جو وہ لوگ مسیح کی موت طبعی پر ایمان لاویں جو درحقیقت

واقعہ ہوگئی ہے اُس موت کے مقدمہ پر انہیں ایمان ہے کیونکہ جب مسیح صلیب کی موت نہیں مرا جس سے یہود اور نصاری اپنے اپنے اغراض کی وجہ سے خاص خاص نتیجے نکالنے چاہتے تھے تو پھر اُس کی طبعی موت پر بھی ایمان لانا اُن کے لیے ضروری ہے کیونکہ پیدائش کے لیے موت لازمی ہے۔ سو قبل موتہٖ کی تفسیر یہ ہے کہ قَبْلَ اِیْمَانِہٖ بِمَوْتِہٖ۔

اور دوسرے طور پر آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ مسیح تو ابھی مرا بھی نہیں تھا کہ جب سے یہ خیالات شک و شبہ کے یہود و نصاریٰ کے دلوں میں چلے آتے ہیں پس ان معنوں کی رو سے بھی قرآن کریم بطور اشارۃ النص مسیح کے فوت ہوجانے کی شہادت دے رہا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۸۳-۳۸۵)

بعض نافہم مولوی بطور جرح یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ مسیح ابن مریم کی یہ علامت لکھی ہے کہ دجال معہود کو وہ قتل کریگا اور تمام اہل کتاب اُس پر ایمان لے آویں گے اور اس خیال کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ مسیح کے نزول کے وقت تمام اہل کتاب ایمان لے آئیں گے تو پھر ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ دجّال کفر کی حالت میں ہی قتل کیا جائے گا۔ ماسوا اس کے مُسلم کی حدیث میں صاف لکھا ہے کہ دجّال کے ساتھ ستر ہزار اہل کتاب شامل ہوجائیں گے اور اکثر کی اُن میں سے کفر پر موت ہوگی اور مسیح کی وفات کے بعد بھی اکثر لوگ کافر اور بے دین باقی رہ جائیں گے جن پر قیامت آئے گی اور قرآن کریم بھی صریح اور صاف طور پر اس پر شہادت دیتا ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے ...... میں تیرے متبعین کو تیرے منکرین پر یعنی یہود پر قیامت تک غلبہ دوں گا۔[1] پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت کے دن تک یہود کی نسل تھوڑی بہت باقی رہ جائے گی اور پھر فرماتا ہے کہ اَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ[2] یعنی ہم نے یہود اور نصاری میں قیامت کے دن تک عداوت اور بغض ڈال دیا ہے اِس آیت سے بھی صاف طور پر ثابت ہے کہ یہودی قیامت کے دن تک رہیں گے کیونکہ اگر وہ پہلے ہی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سلسلہ عداوت اور بغض کا قیامت تک کیونکر ممتد ہوگا لہذا ماننا پڑا کہ ایسا خیال کہ حضرت مسیح کے نزول کی یہ علامت ہے کہ تمام اہل کتاب اُس پر ایمان لے آئیں گے صریح نص قرآن اور حدیث سے مخالف ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۳۷-۳۹)

اگر فرض کے طور پر یہ مان لیا جائے کہ آیت موصوفہ میں لفظ لَیُؤْمِنَنَّ استقبال کے ہی معنے رکھتا ہے پھر بھی کیونکر یہ آیت مسیح کی زندگی پر قطعیۃ الدلالت ہوسکتی ہے کیا استقبالی طور پر یہ دوسرے معنے بھی نہیں ہوسکتے کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہیں لائیگا دیکھو یہ بھی تو خالص استقبال ہی ہے کیونکہ آیت اپنے نزول کے بعد کے زمانہ کی خبر دیتی ہے بلکہ ان معنوں پر آیت کی دلالت صریحہ ہے اس واسطے کہ دوسری قرأت میں یوں آیا ہے جو بیضاوی وغیرہ میں لکھی ہے اِلَّا لَیُؤْمِنُنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِھِمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اہل کتاب اپنی موت سے پہلے مسیح ابن مریم پر ایمان لے آئیں گے اب دیکھئے کہ قَبْلَ مَوْتِہٖ کی ضمیر جو آپ حضرت مسیح کی طرف پھیرتے تھے دوسری

[1] اٰل عمران آیت ۵۶ ۔ [2] المائدہ آیت ۱۵ ۔

قرأت سے یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت مسیح کی طرف نہیں بلکہ اہل کتاب کے فرقہ کی طرف پھرتی ہے آپ جانتے ہیں کہ قرأت غیر متواترہ بھی حکم حدیث احاد کا رکھتی ہے اور آیات کے معنوں کے وقت ایسے معنے زیادہ تر قبول کے لائق ہیں جو دوسری قرأت کے مخالف نہ ہوں اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ یہ آیت جس کی دوسری قرأت آپ کے خیال کو بکلی باطل ٹھہرا رہی ہے کیونکر قطعیۃ الدلالت ٹھہر سکتی ہے۔

ماسوا اس کے ...... ہر ایک جگہ اور ہر ایک مقام میں نون ثقیلہ کے ملانے سے مضارع استقبال نہیں بن سکتا قرآن کریم کے لیے قرآن کریم کی نظیریں کافی ہیں اگرچہ یہ سچ ہے کہ بعض جگہ قرآن کریم کے مضارعات پر جب نون ثقیلہ ملا ہے تو وہ استقبال کے معنوں پر مستعمل ہوئے ہیں۔ لیکن بعض جگہ ایسی بھی ہیں کہ حال کے معنے قائم رہے ہیں یا حال اور استقبال بلکہ ماضی بھی اشتراکی طور پر ایک سلسلہ متصلہ ممتدہ کی طرح مراد لیے گئے ہیں یعنی ایسا سلسلہ جو حال یا ماضی سے شروع ہوا اور استقبال کی انتہا تک بلا انقطاع برابر چلا گیا۔ (الحق دہلی صـ۳۲)

فرض کے طور پر اگر آیت کے یہ معنے کیے جائیں کہ حضرت عیسٰی کے نزول کے وقت جس قدر اہل کتاب ہوں گے سب مسلمان ہو جائیں گے جیسا کہ ابو مالک سے آپ نے روایت کیا ہے تو مجھے مہربانی فرما کر سمجھا دیں کہ یہ معنے کیونکر درست ٹھہر سکتے ہیں۔ آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ مسیح کے دم سے اُس کے نزول کے بعد ہزارہا لوگ کفر کی حالت میں مریں گے اب اگر آپ ان کفار کو جو کفر پر مر گئے مومن ٹھہراتے ہیں یا اس جگہ ایمان سے مراد یقین رکھتے ہیں تو اس دعوے پر آپ کے پاس دلیل کیا ہے حدیث میں تو صرف کفر پر مرنا اُن کا لکھا ہے یہ آپ نے کہاں سے اور کس جگہ سے نکال لیا ہے کہ کفر پر تو مریں گے مگر اُن کو حضرت عیسٰی کی رسالت پر یقین ہوگا اور کس نص قرآن یا حدیث سے آپ کو معلوم ہوا کہ اس جگہ ایمان سے مراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ یقین مراد ہے ظاہر لفظ ایمان کا حقیقی ایمان پر دلالت کرتا ہے اور صرف عن الظاہر کے لیے کوئی قرینہ آپ کے پاس چاہیئے۔ جبکہ لفظ لفظ آیت میں یہ شبہات ہیں تو پھر آیت قطعیۃ الدلالت کیونکر ہوئی۔ اگر آپ لیومنن سے بغیر کسی قرینہ کے مجازی ایمان مراد لیں گے تو آپ کے مخالف کا حق ہوگا کہ وہ حقیقی معنے مراد لیوے۔ آپ کو سوچنا چاہیئے کہ ایسے ایمان سے فائدہ ہی کیا ہے اور مسیح کی خصوصیت کیا ٹھہری ایسا تو ہر ایک نبی کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے کہ بد بخت لوگ زبان سے اس کے منکر ہوتے ہیں اور دل سے یقین کر جاتے ہیں ...... آیت کے یہ معنی ہیں کہ مسیح کی موت سے پہلے ایک زمانہ ایسا آویگا کہ اس زمانہ کے اہل کتاب اُن پر ایمان لے آویں گے اور اس زمانہ سے پہلے کفر پر مرنیوالے کفر پر مریں گے ...... اَن کا لفظ تو ایسا کامل حصر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ اگر ایک فرد بھی باہر رہ جائے تو یہ لفظ بیکار اور غیر موثر ٹھہرتا ہے۔ (الحق دہلی صـ۳۵-۳۶)

میں ثابت کرتا ہوں کہ اگر فی الحقیقت نحویوں کا یہی مذہب ہے کہ نون ثقیلہ سے مضارع خالص مستقبل کے معنوں میں آجاتا ہے اور کبھی اور کسی مقام اور کسی صورت میں اس کے برخلاف نہیں ہوتا تو انہوں نے سخت غلطی کی ہے قرآن کریم

اُن کی غلطی ظاہر کر رہا ہے اور اکابر صحابہ اُس پر شہادت دے رہے ہیں حضرت انسانوں کی اور کوششوں کی طرح نحویں کی کوششیں بھی خطا سے خالی نہیں آپ حدیث اور قرآن کو چھوڑ کر کس جھگڑے میں پڑ گئے۔ اور اس خیال خام کی نحوست سے آپ کو تمام اکابر کی نسبت بدظنی کرنی پڑی کہ وہ سب تفسیر آیت لَيُؤْمِنَنَّ بِہٖ میں غلطی کرتے رہے ابھی میں انشاءاللہ القدیر آپ پر ثابت کرونگا کہ آیت لَيُؤْمِنَنَّ بِہٖ آپ کے معنوں پر اس صورت میں قطعیۃ الدلالت ٹھہر سکتی ہے کہ ان سب بزرگوں کی قطعیۃ الجہالت ہونے پر فتویٰ لکھا جائے اور نعوذ باللہ نبی معصوم کو بھی اُن میں داخل کر دیا جائے ورنہ آپ کبھی اور کسی صورت میں قطعیۃ کا فایدہ حاصل نہیں کر سکتے اور کوئی تقویٰ شعار علماء میں سے اس قطعیۃ کے دعویٰ میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوگا اور کیونکر شریک ہو۔ شریک تو تب ہو کہ بہت سے بزرگوں اور صحابہ کو جاہل قرار دیوے اور نبی صلعم پر بھی اعتراض کرے۔ سبحانہ ھذا بہتان عظیم۔

اب میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اکابر مفسرین نے اس آیت کو حضرت عیسیٰ کے نزول کے لیے قطعیۃ الدلالت قرار دیا ہے یا کچھ اور ہی معنے لکھے ہیں۔ سو واضح ہو کہ کشاف صفحہ ۱۹۹ میں لَيُؤْمِنَنَّ بِہٖ کی آیت کے نیچے یہ تفسیر ہے۔ جُمْلَةٌ قَسَمِيَّةٌ وَاقِعَةٌ صِفَةً لِمَوْصُوْفٍ مَحْذُوْفٍ تَقْدِيْرُهٗ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اَحَدٌ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِعِيْسٰى وَبِاَنَّهٗ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ يَعْنِيْ اِذَا عَايَنَ قَبْلَ اَنْ تَزْهَقَ رُوْحُهٗ حِيْنَ لَا يَنْفَعُهٗ اِيْمَانُهٗ لِانْقِطَاعِ وَقْتِ التَّكْلِيْفِ وَعَنْ شَهْرِ بْنِ حَوْشَبٍ قَالَ لِيَ الْحَجَّاجُ اٰيَةٌ مَّا قَرَأْتُهَا اِلَّا تَخَالَجَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِّنْهَا يَعْنِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اِنِّيْ اَضْرِبُ عُنُقَ الْاَسِيْرِ مِنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى۔ فَلَا اَسْمَعُ مِنْهُ ذٰلِكَ فَقُلْتُ اِنَّ الْيَهُوْدِيَّ اِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ دُبُرَهٗ وَوَجْهَهٗ وَقَالُوْا يَا عَدُوَّ اللّٰهِ اَتَاكَ عِيْسٰى نَبِيًّا فَكَذَّبْتَ بِهٖ فَيَقُوْلُ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ عَبْدٌ نَّبِيٌّ وَتَقُوْلُ لِلنَّصْرَانِيِّ اَتَاكَ عِيْسٰى نَبِيًّا فَزَعَمْتَ اَنَّهُ اللّٰهُ اَوِ ابْنُ اللّٰهِ فَيُؤْمِنُ اَنَّهٗ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ فَسَّرَهٗ كَذٰلِكَ فَقَالَ لَهٗ عِكْرَمَةُ فَاِنْ اَتَاهُ رَجُلٌ فَضَرَبَ عُنُقَهٗ۔ قَالَ لَا تَخْرُجُ نَفْسُهٗ حَتّٰى يُحَرِّكَ بِهَا شَفَتَيْهِ قَالَ عِكْرَمَةُ وَاِنْ خَرَّ مِنْ فَوْقِ بَيْتٍ اَوِ احْتَرَقَ اَوْ اَكَلَهٗ سَبُعٌ قَالَ يَتَكَلَّمُ بِهَا فِي الْهَوَاءِ وَلَا تَخْرُجُ رُوْحُهٗ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِهٖ وَتَدُلُّ عَلَيْهِ قِرَاءَةُ اُبَيٍّ اِلَّا لَيُؤْمِنُنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِمْ بِضَمِّ النُّوْنِ عَلٰى مَعْنٰى وَاِنْ مِّنْهُمْ اَحَدٌ اِلَّا لَيُؤْمِنُوْنَ قَبْلَ مَوْتِهِمْ۔ قِيْلَ الضَّمِيْرَانِ لِعِيْسٰى يَعْنِيْ وَاِنْ مِّنْهُمْ اَحَدٌ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ قَبْلَ مَوْتِ عِيْسٰى وَهُمْ اَهْلُ الْكِتٰبِ الَّذِيْنَ يَكُوْنُوْنَ فِيْ زَمَانِ نُزُوْلِهٖ رُوِيَ اَنَّهٗ يَنْزِلُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ فَلَا يَبْقٰى اَحَدٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا يُؤْمِنُ بِهٖ حَتّٰى تَكُوْنَ الْمِلَّةُ وَاحِدَةً وَهِيَ مِلَّةُ الْاِسْلَامِ وَقِيْلَ الضَّمِيْرُ فِيْ بِهٖ يَرْجِعُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَقِيْلَ اِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

ترجمہ۔ یعنی لیومنن بہ جملہ قسمیہ ہے اور آیت موصوف محذوف کے لیے صفت ہے اور محذوف کو ملانے کے ساتھ

اصل عبارت یوں ہے کہ کوئی اہل کتاب میں سے نہیں جو اپنی موت سے پہلے عیسٰی پر ایمان نہ لاوے اور نیز اس بات پر ایمان لاوے کہ وہ اللہ کا رسول اور اس کا بندہ ہے یعنی جس وقت جان کندن کا وقت ہو جب کہ ایمان بوجہ انقطاع وقت تکلیف کے کچھ نفع نہیں دیتا۔ اور شہر بن حوشب سے روایت ہے کہ مجھے حجاج نے کہا کہ ایک آیت ہے کہ جب کبھی میں نے اُس کو پڑھا۔ تو اُس کی نسبت میرے دل میں ایک خلجان گذرا یعنی یہی آیت اور خلجان یہ ہے کہ مجھے کتابی اسیر قتل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے اور میں یہود یا نصاری کی گردن مارتا ہوں اور میں اُس کے مرنے کے وقت یہ نہیں سنتا کہ میں عیسٰی پر ایمان لایا۔ ابن حوشب کہتا ہے کہ میں نے اس کو کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ جب یہودیوں پر جان کندن کا وقت آتا ہے تو فرشتے اس کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دشمن خدا تیرے پاس عیسٰی نبی آیا اور تو نے اُس کی تکذیب کی پس وہ کہتا ہے کہ اب میں عیسٰی پر ایمان لایا کہ وہ بندہ اور پیغمبر ہے اور نصرانی کو فرشتے کہتے ہیں کہ تیرے پاس عیسٰی نبی آیا اور تو نے اُس کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا تب وہ کہتا ہے کہ اب میں نے قبول کیا کہ وہ خدا کا بندہ اور رسول ہے اور ابن عباس سے روایت ہے کہ اس نے ایک موقعہ پر یہی تفسیر کی تب عکرمہ نے اس کو کہا کہ اگر ناگاہ کسی شخص کی گردن کاٹ دی جائے تو کس وقت اور کیونکر وہ عیسٰی کی نبوت کا اقرار کریگا تب ابن عباس نے کہا کہ اس کی اس وقت تک جان نہیں نکلے گی جب تک اس کے لبوں پر کلمہ اقرار نبوت مسیح کا جاری نہ ہولے پھر عکرمہ نے کہا کہ اگر وہ گھر کی چھت پر سے گرے یا جل جائے یا کوئی درندہ اس کو کھالیوے تو کیا پھر بھی اقرار نبوت عیسی کا اُس کو موقعہ ملیگا تب ابن عباس نے جواب دیا کہ وہ گرتے گرتے ہوا میں یہ اقرار کردے گا۔ اور جب تک یہ اقرار نہ کرلے تب تک اُس کی جان نہیں نکلے گی اور اسی پر دلالت کرتی ہے قرأت ابی بن کعب کی الا لیومنن بہ قبل موتھم بضم النون یعنی دوسری قرأت میں بجائے قبل موتہ کے قبل موتہم لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت موتہ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے نہ حضرت عیسٰی کی طرف۔ اور ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ دونوں ضمیریں بہ اور موتہ کی حضرت عیسٰی کی طرف پھرتی ہیں جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عیسٰی کے نزول کے بعد تمام اہل کتاب اُن کی نبوت پر ایمان لے آویں گے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ضمیر بہ کی اللہ تعالی کی طرف پھرتی ہے اور ایک قول یہ بھی ہے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضمیر بہ کی پھرتی ہے۔

پھر نووی میں عبارت لکھی ہے ذَهَبَ كَثِيْرُوْنَ بَلْ اَكْثَرُوْنَ اِلٰى اَنَّ الضَّمِيْرَ فِىْ اٰيَةِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ يَعُوْدُ اِلٰى اَهْلِ الْكِتَابِ وَيُؤَيِّدُ هٰذَا اَيْضًا قِرَاۤءَةُ مَنْ قَرَاَ قَبْلَ مَوْتِهِمْ۔ یعنی بہت سے لوگ بلکہ نہایت کثرت سے لوگ اسی طرف گئے ہیں کہ آیت الا لیومنن بہ میں بہ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے اور اسی کی موید قرأت قبل موتہم ہے۔

پھر تفسیر مدارک میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے والمعنی ما من الیھود والنصاری احد الا لیومنن قبل موتہ بعیسی وبانہ عبد اللہ ورسولہ وروی ان الضمیر فی بہ یرجع الی اللہ او الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم والضمیر الثانی الی الکتابی یعنی اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ یہود اور نصاری میں سے ایسا کوئی

نہیں کہ جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ پر ایمان نہ لاوے اور اس کی رسالت اور عبدیت کو قبول نہ کرے اور یہ بھی روایت ہے کہ ضمیر بہ کی اللہ کی طرف پھرتی ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے ایسا ہی بیضاوی میں زیر آیت لیؤمنن بہ یہ تفسیر کی ہے والمعنی ما من الیھود والنصاری احد الا لیؤمنن بان عیسی عبد اللہ ورسولہ قبل ان یموت ولو بعد ذالک ان قرئ الا لیؤمنن بہ قبل موتھم وقیل الضمیران لعیسی یعنی اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ یہود اور نصاری میں سے ایسا کوئی نہیں جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ پر ایمان نہ لاوے اور قبل موتہم کی قراءت انہیں معنوں کی موید ہے اور ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ دونوں ضمیریں عیسیٰ کی طرف پھرتی ہیں۔

اور تفسیر مظہری کے صفحہ ۱۳۱۷ اور ۳۲ ۷ میں زیر آیت موصوفہ یعنی لیؤمنن بہ کے لکھا ہے۔ روی عن عکرمہ ان الضمیر فی بہ یرجع الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وقیل راجعۃ الی اللہ عزوجل والمآل واحد فان الایمان باللہ لایعتد مالم یومن بجمیع رسلہ والایمان بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم یستلزم الایمان بعیسی علیہ السلام۔ قبل موتہ۔ ای قبل موت ذالک الاحد من اھل الکتاب عند معاینۃ ملائکۃ العذاب عند الموت حین لاینفعہ ایمانہ ھذا روایۃ علی بن طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال فقیل لابن عباس ارئیت ان خر من فوق بیت قال یتکلم فی الھواء فقیل ارئیت ان ضرب عنقہ قال تلجلج لسانہ والحاصل انہ لایموت کتابی حتی یومن باللہ عزوجل وحدہ لاشریک لہ وان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم عبدہ ورسولہ وان عیسٰی عبد اللہ ورسولہ قبل یومن الکتابی فی حین من الاحیان ولو عند معاینۃ العذاب۔ وقال الضمیران لعیسٰی والمعنی انہ اذا نزل اٰمن بہ اھل الکتاب اجمعون ولایبقی احد الا لیؤمنن بہ وھذا التاویل مروی عن ابی ھریرۃ لکن کونہ مستفاداً من ھذہ الایۃ وتاویل الایۃ بارجاع الضمیر الثانی الی عیسے ممنوع انما ھو زعم من ابی ھریرۃ لیس ذالک فی شئ من الاحادیث المرفوعۃ وکیف یصح ھذا التاویل مع ان کلمۃ ان من اھل الکتاب شامل للموجودین فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم البتۃ سواء کان ھذا الحکم خاصًا بھم اولا فان حقیقۃ الکلام للحال ولاوجہ لان یراد بہ فریق من اھل الکتاب یوجدون حین نزول عیسٰی علیہ السلام فالتاویل الصحیح ھو الاول ویؤیدہ قراءۃ ابی بن کعب اخرج ابن المنذر عن ابی ھاشم وعروۃ قال فی مصحف ابی بن کعب وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتھم۔

ترجمہ عکرمہ سے روایت ہے آیت لیؤمنن بہ میں۔ بہ کی ضمیر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی طرف راجع ہے اور مآل واحد ہے کیونکہ ایمان باللہ معتبر نہیں جب تک تمام رسولوں پر ایمان نہ لایا جائے اور محمد مصطفےٰ صلعم پر ایمان لانا عیسیٰ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ اور قبل موتہ کی یہ تفسیر ہے کہ ہر ایک کتابی اپنی موت سے پہلے عذاب کے فرشتوں کے دیکھنے کے بعد رسول اللہ صلعم پر ایمان لائے گا جبکہ اس کو ایمان کچھ

فائدہ نہیں دیگا۔ یہ علی بن طلحہ کی روایت ابن عباس ہے رضی اللہ عنہما۔ علی بن طلحہ کہتا ہے کہ ابن عباس کو کہا گیا۔ کہ اگر کوئی چھت پر سے گر پڑے تو پھر وہ کیونکر ایمان لائے گا ابن عباس نے جواب دیا کہ وہ ہوا میں اس اقرار کو ادا کریگا پھر پوچھا گیا کہ اگر کسی کی گردن ماری جائے تو وہ کیونکر ایمان لاوے گا تو ابن عباس نے کہا کہ اس وقت بھی اس کی زبان میں اقرار کے الفاظ جاری ہو جائیں گے حاصل کلام یہ کہ کتابی نہیں مریگا۔ جب تک اللہ جل شانہ۔ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ پر ایمان نہ لاوے۔ بعض کہتے ہیں کہ کتابی فی حین من الاحیان ایمان لائے گا۔ اگرچہ عذاب کے معائنہ کے وقت ہو اور بعض کہتے ہیں کہ دونوں ضمیریں عیسیٰ کی طرف پھرتی ہیں۔ اور یہ معنے لیتے ہیں کہ جب عیسیٰ نازل ہوگا تو تمام اہل ملل اُس پر ایمان لے آئیں گے اور کوئی منکر باقی نہ رہے گا اور یہ تاویل ابوہریرہ سے مروی ہے لیکن آیت لیومنن بہ سے یہ معنے جو ابوہریرہ نے خیال کیے ہیں ہرگز نہیں نکلتے اور قبل موتہ کی ضمیر عیسیٰ کی طرف کسی طرح پھر نہیں سکتی یہ صرف ابوہریرہ کا گمان ہے احادیث مرفوعہ میں اس کا کوئی اصل صحیح نہیں پایا جاتا اور کیونکر یہ تاویل صحیح ہو سکتی ہے باوجودیکہ کلمہ ان موجودین کو بھی تو شامل ہے یعنی ان اہل کتاب کو جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں موجود تھے۔ خواہ یہ کلمہ انہیں سے خاص ہو یا خاص نہ ہو لیکن حقیقت کلام کا مصداق ٹھہرانے کے لیے حال سب زمانوں سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے اور کوئی وجہ اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کیوں وہی اہل کتاب خاص کیے جائیں جو حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت موجود ہوں گے پھر صحیح تاویل وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی ضمیر بہ کی عیسیٰ کی طرف نہیں پھرتی بلکہ کتابی کی طرف پھرتی ہے اور اسی کی قرأت ابی بن کعب مویّد ہے جس کو ابن المنذر نے ابی ہاشم سے لیا ہے اور نیز عروہ سے بھی۔ اور وہ قرأت یہ ہے۔ وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موتهم یعنی اہل کتاب اپنی موت سے پہلے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ پر ایمان لاویں گے۔ اسی کے قریب قریب ابن کثیر اور تفسیر کبیر اور فتح البیان و معالم التنزیل وغیرہ تفاسیر میں لکھا ہے۔ اب دیکھئے کہ حضرت عکرمہ اور حضرت ابن عباس اور علی بن طلحہ رضی اللہ عنہم یہی تاویل لیومنن بہ کی کرتے ہیں کہ پہلی ضمیر محمد مصطفےٰ صلعم اور عیسیٰ کی طرف پھرتی ہے اور دوسری ضمیر قبل موتہ اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے اور قرأت قبل موتہم کس قدر وثوق سے ثابت ہوتی ہے پھر باوجودیکہ یہ تاویل صحابہ کرام کی طرف سے ہے اور بلاشبہ قرأت شاذہ حدیث صحیح کا حکم رکھتی ہے مگر آپ اس کو نظر انداز کر کے اور نحوی قواعد کو اپنے زعم میں اس کے مخالف سمجھ کر تمام بزرگ اور اکابر قوم اور صحابہ کرام کی صریح ہجو اور توہین کر رہے ہیں گویا آپ کے نحوی قواعد کی صحابہ کو بھی خبر نہیں تھی اور ابن عباس جیسا صحابی جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فہم قرآن کی دعا بھی ہے وہ بھی آپ کے ان عجیب معنوں سے بے خبر رہا آپ پر قرأت قبل موتہم کا بھی وثوق کھل گیا ہے اب فرض کے طور پر اگر قبول کر لیں کہ ابن عباس اور علی بن طلحہ اور عکرمہ وغیرہ صحابہ ان معنوں کے سمجھنے میں خطا پر تھے اور قرأت ابی بن کعب بھی یعنی قبل موتہم۔ کامل درجہ پر ثابت نہیں۔ تو کیا آپ کے دعوے قطعیۃ الدلالت ہونے آیت لیومنن بہ پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ کیا وہ دعوی جس کے مخالف صحابہ کرام بلند آواز سے شہادت دے رہے ہیں اور دنیا کی تمام مبسوط تفسیریں بالاتفاق اس پر شہادت دے رہی ہیں اب تک

قطعیۃ الدلالت ہے۔ یا اخی اتق اللہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا[۱] اور جب ان روایتوں کے ساتھ وہ روایتیں بھی ملا دیں جن میں انی متوفیک کے معنے ممیتک لکھے ہیں جیسے ابن عباس کی روایت اور وہب اور محمد بن اسحاق کی روایت کے کوئی ان میں سے عام طور پر حضرت مسیح کی موت کا قائل ہے اور کوئی کہتا ہے کہ تین گھنٹہ تک مر گئے تھے اور کوئی سات گھنٹہ تک اُن کی موت کا قائل ہے اور کوئی تین دن تک جیسا کہ فتح البیان اور معالم التنزیل اور تفسیر کبیر وغیرہ تفاسیر سے ظاہر ہے تو پھر اس صورت میں اس وہم کی اور بھی بیخ کنی ہوتی ہے کہ مسیح کی موت سے پہلے سب اہل کتاب ایمان لے آویں گے غرض آپ کا نور قلب شہادت دے سکتا ہے کہ جس قدر میں نے لکھا ہے آپ کے دعوے قطعیۃ الدلالت کے توڑنے کے لیے کافی ہے قطعیۃ الدلالت اُس کو کہتے ہیں جس میں کوئی دوسرا احتمال پیدا نہ ہو سکے مگر آپ جانتے ہیں کہ اکابر صحابہ اور تابعین کے گروہ نے آپ کے معنے قبول نہیں کیے اور مفسرین نے جا بجا اس آپ کی تاویل کو قیل کے لفظ سے بیان کیا ہے جو ضعف روایت پر دلالت کرتا ہے۔ عام رائے تفسیروں کی یہی پائی جاتی ہے کہ قرأت قبل موتہم کے موافق معنے کرنے چاہئیے اور ضمیر بہ کا نہ صرف عیسیٰ کی طرف بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ جل شانہ کی پھیرتے ہیں۔ اب آپ کی رائے کی قطعیت کیونکر باقی رہ سکتی ہے۔

(الحق دہلی صفحہ ۵۴-۶۰)

مولوی صاحب (مولوی محمد بشیر صاحب) اس آیت کو حضرت عیسیٰ کی جسمانی زندگی پر قطعیۃ الدلالت قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس آیت کے قطعی طور پر یہی معنے ہیں کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں کہ جو عیسیٰ پر اس کی موت سے پہلے ایمان نہیں لائے گا۔ اور چونکہ اب تک تمام اہل کتاب کیا عیسائی اور کیا یہودی حضرت عیسیٰ پر سچا اور حقیقی ایمان نہیں لائے بلکہ کوئی اُن کو خدا قرار دیتا ہے اور کوئی اُن کی نبوت کا منکر ہے اس لیے ضروری ہے کہ حسب منشاء اس آیت کے حضرت عیسیٰ کو اُس زمانہ تک زندہ تسلیم کر لیا جائے جب تک کہ سب اہل کتاب اُس پر ایمان لے آویں۔ مولوی صاحب اس بات پر حد سے زیادہ ضد کر رہے ہیں کہ ضرور یہ آیت موصوفہ بالا حضرت مسیح کی جسمانی زندگی پر قطعی طور پر دلالت کرتی ہے اور یہی صحیح معنے اس کے ہیں کسی دوسرے معنے کا احتمال اس میں ہرگز نہیں اور اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ گو بعض صحابہ اور تابعین اور مفسرین نے اور بھی کتنے معنے اس آیت کے کیے ہیں مگر وہ معنے صحیح نہیں ہیں۔ کیوں صحیح نہیں ہیں؟ اس کا سبب یہ تبلاتے ہیں کہ اس جگہ لَيُؤْمِنَنَّ کا صیغہ نون ثقیلہ کے لگنے کی وجہ سے خالص استقبال کے معنوں میں ہو گیا ہے اور خالص استقبال کے معنے صرف اسی طریق بیان سے محفوظ رہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا کسی آیندہ زمانہ میں نازل ہونا قبول کر کے پھر اُس زمانہ کے اہل کتاب کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ سب کے سب حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آویں گے اور فرماتے ہیں کہ جو حضرت ابن عباس وغیرہ صحابہ نے اس کے مخالف معنے کیے ہیں اور قبل موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف پھیری ہے یہ معنے ان کی نحو کے اجماعی قاعدہ کے مخالف ہیں۔ کیوں مخالف ہیں؟ اس وجہ سے کہ ایسے معنوں کے کرنے سے

---

[۱] بنی اسرائیل آیت ۳۷۔

لفظ لیومنن کا خالص استقبال کے لیے مخصوص نہیں رہتا۔ سو مولوی صاحب کی اس تقریر کا حاصل کلام یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ابن عباس اور عکرمہ اور اُبی ابن کعب وغیرہ صحابہ نحو نہیں پڑھے ہوئے تھے اور نحو کے وہ اجماعی قواعد جو مولوی صاحب کو معلوم ہیں انہیں معلوم نہیں تھے اس لیے وہ ایسی صریح غلطی میں ڈوب گئے جو انہیں وہ قاعدہ یاد نہ رہا جس پر تمام نحویوں کا اجماع اور اتفاق ہو چکا تھا بلکہ انہوں نے اپنی زبان کا قدیمی محاورہ بھی چھوڑ دیا جس کی پابندی طبعاً اُن کی فطرت کے لیے لازم تھی۔ ناظرین برائے خدا غور فرماویں کہ کیا مولوی صاحب اس بات کے مجاز ٹھہر سکتے ہیں کہ ابن عباس جیسے جلیل الشان صحابی کو نحوی غلطی کا الزام دیویں اور اگر مولوی صاحب نحوی غلطی کا ابن عباس پر الزام قائم نہیں کرتے تو پھر کیا کوئی اور بھی وجہ ہے جس کے رو سے مولوی صاحب کے خیال میں ابن عباس کے وہ معنے اس آیت متنازع فیہ میں رد کے لائق ہیں جن کی تائید میں ایک قرأت شاذہ بھی موجود ہے یعنی قَبْلَ مَوْتِهِمْ فرض کرو کہ وہ قرأت بقول حضرت مولوی صاحب ایک ضعیف حدیث ہے مگر آخر حدیث تو ہے یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ وہ کسی مفتری کا افترا ہے پس وہ کیا ابن عباس کے معنوں کو ترجیح دینے کے لیے کچھ بھی اثر نہیں ڈالتی یہ کس قسم کا تحکم ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ ابن عباس کے یہ معنے نحوی قاعدہ کے مخالف ہیں اور قرأت قَبْلَ مَوْتِهِمْ کسی راوی کا افترا ہے۔ ابن عباس اور عکرمہ پر یہ الزام دینا کہ وہ نحوی قاعدہ سے بے خبر تھے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مولوی صاحب یا کسی اور کا حق ہے کہ اُن بزرگوں پر ایسا الزام رکھ سکے جن کے گھر سے ہی نحو نکلی ہے۔ ظاہر ہے کہ نحو کو اُن کے محاورات اور اُن کے فہم کی تابع ٹھہرانا چاہیئے نہ کہ اُن کی بول چال اور اُن کے فہم کا محک اپنی خود تراشیدہ نحو کو قرار دیا جائے۔

اب اگر مولوی صاحب اپنی ضد کو کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے اور ابن عباس اور عکرمہ کو نحو کے اجماعی قاعدہ سے بے خبر ٹھہراتے ہیں اور قرأت اُبی بن کعب کو بھی جو قَبْلَ مَوْتِهِمْ ہے بکلّی مردود اور متحقق الافترا خیال کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ صرف اُن کے دعوے سے ہی یہ اُن کا بہتان قابل تسلیم نہیں ٹھہر سکتا بلکہ اگر وہ اپنے معنوں کو قطعیۃ الدلالت بنانا چاہتے ہیں تو اُن پر فرض ہے کہ ان دونوں باتوں کا قطعی طور پر پہلے فیصلہ کرلیں۔ کیونکہ جب تک ابن عباس اور عکرمہ کے مخالفانہ معنوں میں احتمال صحت باقی ہے اور ایسا ہی گو حدیث قرأت شاذہ بقول مولوی صاحب ضعیف ہے مگر احتمال صحت رکھتی ہے تب تک مولوی صاحب کے معنے باوجود قائم ہونے ان تمام احتمالات کے کیونکر قطعی ٹھہر سکتے ہیں۔

ناظرین آپ لوگ خود سوچ لیں کہ قطعی معنے تو اُنہی معنوں کو کہا جاتا ہے جن کی دوسری وجوہ سرے سے پیدا نہ ہوں یا پیدا تو ہوں لیکن قطعیت کا مدعی دلائل شافیہ سے اُن تمام مخالف معنے کو توڑ دے لیکن مولوی صاحب نے اب تک ابن عباس اور عکرمہ کے معنوں اور قَبْلَ مَوْتِهِمْ کی قرأت کو توڑ کر نہیں دکھلایا۔ اُن کا توڑنا تو صرف ان دو باتوں میں محدود تھا اول یہ کہ مولوی صاحب صاف بیان سے اس بات کو ثابت کر دیتے کہ ابن عباس اور عکرمہ ان کے اجماعی قاعدہ نحو سے بکلی بے خبر اور غافل تھے اور انہوں نے سخت غلطی کی کہ اپنے بیان کے وقت نحو کے قواعد کو نظر انداز کر دیا۔

دوسرے مولوی صاحب پر یہ بھی فرض تھا کہ قرأت شاذہ قبل موتھم کے راوی کا صریح افترا ثابت کرتے اور یہ ثابت کرکے دکھلاتے کہ یہ حدیث موضوعات میں سے ہے۔ مجرد ضعف حدیث کا بیان کرنا اس کو بکلی اثر سے روک نہیں سکتا۔ امام بزرگ حضرت ابوحنیفہ فخر الائمہ سے مروی ہے کہ میں ایک ضعیف حدیث کے ساتھ بھی قیاس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اب کیا جس قدر حدیثیں صحاح ستہ میں بباعث بعض راویوں کے قابل جرح یا مرسل اور منقطع الاسناد ہیں وہ بالکل پایہ اعتبار سے خالی اور بے اعتبار محض ہیں؟ اور کیا وہ محدثین کے نزدیک موضوعات کے برابر سمجھی گئی ہیں۔

ناظرین متوجہ ہو کر سنو اب میں اس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر فرض کے طور پر ابن عباس اور عکرمہ اور مجاہد اور ضحاک وغیرہ کے معنے جو مخالف مولوی صاحب کے معنوں کے ہیں غلط ٹھہرائے جاویں اور قبول کیا جاوے کہ یہ تمام اکابر اور بزرگ مولوی صاحب کے اجماعی قاعدہ نحو سے عمداً یا سہواً باہر چلے گئے تو پھر بھی مولوی صاحب کے معنے قطعیۃ الدلالت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟ اس کی وجوہ ذیل میں لکھتا ہوں۔

(۱) اول یہ کہ مولوی صاحب کے ان معنوں میں کئی امور ہنوز قابل بحث ہیں جن کا وہ یقینی طور پر فیصلہ نہیں کر سکے اور نہ اُن کا ایک ہی معنوں پر قطعیۃ الدلالت ہونا بپایۂ ثبوت پہنچا چکے ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ کہ اہل الکتاب کا لفظ اکثر قرآن کریم میں موجودہ اہل کتاب کے لیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے بیان فرمایا گیا ہے اور ہر یک ایسی آیت کا جس میں اہل کتاب کا ذکر ہے وہی مصداق اور شان نزول قرار دیئے گئے ہیں۔ پھر مولوی صاحب کے پاس باوجود اُس دوسرے معنے ابن عباس اور عکرمہ کی کونسی قطعی دلیل اس بات پر ہے کہ اس ذکر اہل کتاب سے وہ لوگ قطعاً باہر رکھے گئے ہیں اور کونسی حجت شرعی یقینی قطعیۃ الدلالت اس بات پر ہے کہ اہل کتاب سے مراد اُس زمانہ نامعلوم کے اہل کتاب ہیں جس میں تمام وہ لوگ حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے۔

ازاں جملہ ایک یہ کہ مولوی صاحب نے تعیین مرجع لیؤمنن بہٖ میں کوئی قطعی ثبوت پیش نہیں کیا۔ کیونکہ تفسیر معالم التنزیل وغیرہ تفاسیر معتبرہ میں حضرت عکرمہ وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ بھی روایت ہے کہ ضمیر بہٖ کی جناب خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے اور یہ روایت قوی ہے۔ کیونکہ مجرد مسیح ابن مریم پر ایمان لانا موجب نجات نہیں ٹھہر سکتا۔ ہاں خاتم الانبیا پر ایمان لانا بلاشبہ موجب نجات ہے۔ کیونکہ وہ ایمان تمام نبیوں پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ پس اگر حضرت عیسٰی کو بہٖ کے ضمیر کا مرجع ٹھہرایا جائے تو اس کا فساد ظاہر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اہل کتاب شرک سے توبہ کرکے صرف حضرت عیسٰی کی رسالت اور عبدیت کا قائل ہو۔ لیکن ساتھ اس کے ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے قطعاً منکر ہو تو کیا وہ اسی ایمان سے نجات پا سکتا ہے ہرگز نہیں۔ پھر یہ ضمیر بہٖ کی حضرت عیسٰی کی طرف آپ کے معنوں کی رو سے کیونکر پھر سکتی ہے۔ اگر یہ تثنیہ کی ضمیر ہوتی تو ہم یہ خیال کر لیتے کہ اس میں حضرت عیسٰی بھی داخل ہیں لیکن ضمیر تو واحد کی ہے صرف ایک کی طرف پھرے گی۔ اور اگر وہ ایک بجز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کے کوئی دوسرا ٹھہرایا جائے تو معنے فاسد ہوتے ہیں۔ لہذا بالضرورت ماننا پڑا۔ کہ اس ضمیر کا مرجع ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس صورت میں موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف پھیری جائے گی۔

اگر آپ اس جگہ یہ اعتراض کریں کہ ایسے معنوں سے لیؤمننّ کا لفظ استقبال کے خالص معنوں ہیں کیونکر رہے گا۔ تو میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ جیسے آپ کے معنوں میں رہا ہوا ہے۔ اس وقت ذرہ آپ متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں اور اُس قادر سے مدد چاہیں جو سینوں کو کھولتا اور دلوں میں سچائی کا نور نازل کرتا ہے۔ حضرت سنیئے آپ اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ ایک زمانہ قبل موت عیسیٰؑ کے ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ کے موجودہ اہل کتاب سب کے سب حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور بموجب روایت عکرمہ برعایت آپ کے نحوی قاعدہ کے یہ معنے ٹھہریں گے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ کے موجودہ اہل کتاب سب کے سب نبی خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی موت سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔

جس ایمان کی طفیل مسیح ابن مریم پر بھی ایمان لانا اُنہیں نصیب ہو جائیگا۔ اب حضرت اللہ جل شانہ سے ڈر کر فرمایئے کہ کیا آپ کے قطعیۃ الدلالت ہونے کا دعویٰ بالکل نابود ہو گیا۔ یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ آپ خوب سوچ کر اور دل کو تھام کر بیان فرماویں کہ آپ کی طرز تاویل میں کونسی خالص استقبال کی علامت خاص طور پر پائی جاتی ہے جو اس تاویل میں وہ نہیں پائی جاتی۔ ناظرین برائے خدا آپ بھی ذرا سوچیں۔ بہت صاف بات ہے ذرہ توجہ فرماویں۔ اے ناظرین آپ لوگ جانتے ہیں کہ کئی دن سے مولوی صاحب کی یہی بحث لگی ہوئی تھی۔ اور فقط اسی بات پر اُن کی ضد تھی کہ لفظ لیؤمننّ لام اور نون ثقیلہ کی وجہ سے خالص استقبال کے معنوں میں ہو گیا ہے۔ اور مولوی صاحب اپنے گمان میں یہ سمجھ رہے تھے کہ خالص استقبال صرف اس طور کے معنے کرنے سے متحقق ہوتا ہے کہ قبل موتہ کی ضمیر مسیح ابن مریم کی طرف پھیریں اور اُس کی حیات کے قائل ہو جائیں۔ اور اب اے بھائیو میں نے ثابت کر کے دکھلا دیا۔ کہ خالص استقبال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ قبل موتہ کی ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھیری جائے بلکہ اس جگہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف ضمیر بہٖ اور ضمیر قبل موتہ پھیرنے سے معنے ہی فاسد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ فقط عیسیٰؑ پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ سچے اور واقعی معنے اس طرز پر یہی ہیں کہ ضمیر بہٖ کی ہمارے سید و مولیٰ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیری جائے اور ضمیر قبل موتہ کی کتابی کی طرف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں خود حضرت عیسیٰؑ وغیرہ انبیاء سب ہی آجائیں گے۔ ؎

نامِ احمد نامِ جملہ انبیاست   چونکہ صد آمد نود ہم نزد ماست

بھائیو برائے خدا خود سوچ لو کہ ان معنوں میں اور حضرت مولوی صاحب کے معنوں میں خالص مستقبل ہونے میں برابری کا درجہ ہے یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ بھائیو میں محض للہ آپ لوگوں کے سمجھانے کے لیے پھر دوہرا کر کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب آیت لیؤمننّ بہٖ کے معنے یوں کرتے ہیں۔ کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ کے موجودہ اہل کتاب حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے سب کے سب اُن پر ایمان لے آئیں گے اور میں حسب روایت حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جیسا کہ معالم وغیرہ

میں لکھا ہے۔ مولوی صاحب کی ہی طرز پر یہ معنے کرتا ہوں۔ کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ کے سب موجودہ اہل کتاب اپنی موت سے پہلے ہمارے نبی کریم صلعم پر ایمان لے آئیں گے۔ بھائیو برائے خدا ذرہ نظر ڈال کر دیکھو۔ کہ کیا خالص استقبال میری تاویل اور مولوی صاحب کی تاویل میں برابر درجہ کا ہے۔ یا ابھی فرق رہا ہوا ہے۔ اب بھائیو انصافاً دیکھو کہ ان معنوں میں بہ نسبت مولوی صاحب کے معنوں کے کس قدر خوبیاں جمع ہیں وہ اعتراض جو مولوی صاحب کی طرز پر ضمیر بہٖ کے تعین مرجع میں ہوتا تھا۔ وہ اس جگہ نہیں ہو سکتا۔ قرأت شاذہ اس تاویل کی مویّد ہے۔ اور باایں ہمہ خالص استقبال موجود ہے۔ اب اے حاضرین مبارک۔ مولوی صاحب کے دعوے قطعیّت کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ مگر تعصب اور طرفداری سے خالی ہو کر غور کرنا۔ مولوی صاحب نے اس بحث حیات مسیح کا حصر پانچ دلیلوں پر کیا تھا۔ چار دلیلوں کو تو انہوں نے خود چھوڑ دیا اور پانچویں کو خدا تعالیٰ نے حق کی تائید کر کے نیست و نابود کیا جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا[1]۔ اب اے حاضرین۔ اے خدا تعالیٰ کے نیک دل بندو سوچ کر دیکھو اور ذرہ اپنے فکر کو خرچ کر کے نگاہ کرو۔ کہ حضرت مولوی محمد بشیر صاحب کا کیا دعویٰ تھا یہی تو تھا۔ کہ آیت لَيُؤْمِنَنَّ بِہٖ کے وہ سچے اور صحیح معنے ٹھہر سکتے ہیں جن میں لفظ لَيُؤْمِنَنَّ کو خالص مستقبل ٹھہرایا جائے اور مولوی صاحب نے اپنے مضمون کے صفحوں کے صفحے اسی بات کے ثابت کرنے کے لیے لکھ مارے کہ نون ثقیلہ مضارع کے آخر مل کر خالص مستقبل کے معنوں میں لے آتا ہے اسی دُھن میں مولوی صاحب نے حضرت ابن عباس کے معنوں کو قبول نہیں کیا۔ اور یہ عذر پیش کیا کہ وہ معنے بھی نحویوں کے اجماعی عقیدہ کے برخلاف ہیں۔ سو ہم نے مولوی صاحب کی خاطر سے ابن عباس کے معنوں کو پیش کرنے سے موقوف رکھا اور روایت عکرمہ کی بنا پر وہ معنے پیش کیے جو خالص مستقبل ہونے میں بکلی مولوی صاحب کے معنوں سے ہم رنگ اور ان نقصوں سے مبرّا ہیں جو مولوی صاحب کے معنوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مسیح پر ایمان لانے کے وقت ہمارے سید و مولا خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اور اُس کے ضمن میں ہر یک نبی پر ایمان لانا داخل ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ اس ایمان کے لیے حضرت مسیح کو آسمانوں کے دارالسرور سے اس دارالابتلا میں دوبارہ لایا جائے۔ مثلاً دیکھئے کہ جو لوگ بقول آپ کے آخری زمانہ میں آنحضرت صلعم پر ایمان لائیں گے۔ یا اب ایمان لاتے ہیں۔ کیا اُن کے ایمان کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے آویں۔ پس ایسا ہی یقین کیجئے کہ حضرت مسیح پر ایمان لانے کے لیے بھی دوبارہ اُن کا دنیا میں آنا ضروری نہیں اور ایمان لانے اور دوبارہ آنے میں کچھ تلازم نہیں پایا جاتا۔ اور اگر آپ اپنی ضد نہ چھوڑیں اور ضمیر لَيُؤْمِنَنَّ بِہٖ کو خواہ نخواہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھیرنا چاہیں باوجود اس فساد معنے کے جس کا نقصان آپ کی طرف عائد ہے ہماری طرز بیان کا کچھ بھی حرج نہیں۔ کیونکہ ہمارے طور پر برعایت خالص استقبال کے پھر اُس کے یہ معنے ہونگے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا۔ کہ اُس زمانہ کے سب اہل کتاب اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آویں گے۔ سو یہ معنے بھی خالص استقبال ہونے میں آپ کے معنے کے ہم رنگ ہیں کیونکہ اس میں کچھ شک

[1] بنی اسرائیل آیت ۸۲ ۔

نہیں کہ ابھی تک وہ زمانہ نہیں آیا جو سب کے سب موجودہ اہل کتاب حضرت عیسیٰؑ پر یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے ہوں۔ لہذا خالص استقبال کے رنگ میں اب تک یہ پیشگوئی موافق ان معنوں کے چلی آتی ہے۔ اب اگر ہماری اس تاویل میں آپ کوئی جرح کریں گے تو وہی جرح آپ کی تاویل میں ہو گی۔ یہاں تک کہ آپ پیچھا چھوڑا نہیں سکیں گے۔ جن باتوں کو آپ اپنے پرچوں میں قبول کر بیٹھے ہیں۔ اُنہیں کی بنا پر میں نے یہ تطبیق کی ہے۔ اور جس طرز سے آپ نے آخری زمانہ میں اہل کتاب کا ایمان لانا قرار دیا ہے اُسی طرز کے موافق میں نے آپ کو ملزم کیا ہے۔ اور اُسی خالص استقبال کے موافق خالص استقبال پیش کر دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کے وقت سے اس آیت کو ذوالوجوہ قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ ابن کثیر نے زیر ترجمہ اس آیت کے یہ لکھا ہے قال ابن جریر اختلف اهل التاويل في معنى ذالك فقال بعضهم معنى ذالك وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ يعني قبل موت عيسٰى وقال اٰخرون يعني بذالك وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن بعيسٰى قبل موت الكتابي ذكر من كان يوجه ذالك الى انه اذا عاين علم الحق من الباطل۔ قال علي بن ابي طلحة عن ابن عباس في الاية قال لا يموت يهودي حتى يؤمن بعيسٰى وكذا روى ابوداؤد الطيالسي عن شعبة عن ابي هارون الغنوي عن عكرمة عن ابن عباس فهذه كلها اسانيد صحيحة الى ابن عباس وقال اٰخرون معنى ذالك وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن بمحمدؐ قبل موت الكتابي یعنی اس آیت کے معنے میں اہل تاویل کا اختلاف چلا آیا ہے۔ کوئی ضمیر قبل موتہ کی عیسیٰؑ کی طرف پھیرتا ہے اور کوئی کتابی کی طرف اور کوئی بہٖ کی ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھیرتا ہے اور کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ پس گو ابن جریر یا ابن کثیر کا اپنا مذہب کچھ ہو یہ شہادت تو انہوں نے بڑی بسط سے بیان کر دی ہے۔ کہ اس آیت کے معنے اہل تاویل میں مختلف فیہ ہیں اور ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ مسیح ابن مریم کے نزول اور حیات پر قطعی دلالت اس آیت کی ہرگز نہیں۔ اور یہی ثابت کرنا تھا۔ (الحق دہلی ص۸۳ تا ۸۴)

ثُمَّ الْقَرِيْنَةُ الثَّانِيَةُ عَلٰى خَطَاءٍ...... فِيْ اٰيَةِ قَبْلَ مَوْتِهٖ مَا جَآءَ فِيْ قِرَاءَةِ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اَعْنِيْ مَوْتِهِمْ فَاِنَّهٗ يَقْرَءُ هٰكَذَا وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِمْ۔ فَثَبَتَ مِنْ هٰذِهِ الْقِرَاءَةِ اَنَّ ضَمِيْرَ لَفْظِ مَوْتِهٖ لَا يَرْجِعُ اِلٰى عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ بَلْ يَرْجِعُ اِلٰى اَهْلِ الْكِتَابِ فَاَلٰى اَيِّ ثُبُوْتٍ حَاجَةٌ بَعْدَ قِرَاءَةِ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ بِقَوْمٍ طَالِبِيْنَ۔ ثُمَّ مَعَ ذَالِكَ قَدِ اخْتَلَفَ اَهْلُ التَّفْسِيْرِ فِيْ مَرْجِعِ ضَمِيْرِ بِهٖ فَقَالَ بَعْضُهُمْ

آیت قبل موتہ کے معنوں میں ابوہریرہؓ کے غلطی کھانے پر دوسرا قرینہ حضرت ابی بن کعب کی قرأت موتہم ہے۔ وہ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِمْ پس اس قرأت سے ثابت ہو گیا کہ مَوْتِهٖ کے لفظ میں ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نہیں جاتی بلکہ اہل کتاب کی طرف جاتی ہے پس طالبان حق کے لیے ابی ابن کعب کی قرأت کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں مفسرین نے بھی بہٖ کی ضمیر کے مرجع کے بارہ اختلاف کیا ہے ان میں سے بعض نے

اِنَّ ھٰذَا الضَّمِیْرَ الَّذِیْ یُوْجَدُ فِیْ اٰیَۃِ لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ رَاجِعٌ اِلٰی نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھٰذَا اَرْجَحُ الْاَقْوَالِ وَقَالَ بَعْضُھُمْ اِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَی الْفُرْقَانِ وَقَالَ بَعْضُھُمْ اِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی وَقِیْلَ اِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلٰی عِیْسٰی وَھٰذَا قَوْلٌ ضَعِیْفٌ مَّا الْتَفَتَ اِلَیْہِ اَحَدٌ مِّنَ الْمُحَقِّقِیْنَ ۔ فَیَاحَسْرَۃً عَلٰٓی اَعْدَآئِنَا الْمُخَالِفِیْنَ اَنَّھُمْ یَتْرُکُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَبَیِّنَاتِہٖ بَلْ قُلُوْبُھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ مِّنْ ھٰذَا وَیَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاھِھِمْ اِنَّا نَتَّبِعُ اَخْبَارَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَیْسُوْا بِمُتَّبِعِیْنَ ۔ بَلْ یَتْرُکُوْنَ اَقْوَالًا ثَابِتَۃً مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ یُبَدِّلُوْنَ الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَکَانُوْا عَارِفِیْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۷-۴۸)

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بار بار حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات پر اسی لیے زور دیا ہے کہ تا آئندہ زمانہ میں ایسے لوگوں پر حجت ہو جائے جو ناحق اس دھوکہ میں مبتلا ہونے والے تھے کہ گویا حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں اور مسیح کی حیات پر کوئی دلیل ان کے پاس نہیں اور جو دلائل پیش کرتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر سخت درجہ کی غباوت غالب آگئی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ آیت وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ حضرت مسیح کی زندگی پر دلالت کرتی ہے اور ان کے مرنے سے پہلے تمام اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے مگر افسوس کہ وہ اپنے خود تراشیدہ معنوں سے قرآن میں اختلاف ڈالنا چاہتے ہیں جس حالت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ[1] جس کے یہ معنے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ میں قیامت تک بغض اور دشمنی رہے گی تو اب بتلاؤ کہ جب تمام یہودی قیامت سے پہلے ہی حضرت مسیح پر ایمان لے آئیں گے تو پھر بغض اور دشمنی قیامت تک کون لوگ کریں گے جب یہودی نہ رہے اور سب ایمان لے آئے تو پھر بغض اور دشمنی کے لیے کون موقعہ اور محل رہا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ[2] اس کے بھی یہی معنے ہیں جو اوپر گذر چکے اور وہی اعتراض ہے جو اوپر بیان ہو چکا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ[3] اس جگہ کفر والے سے مراد بھی یہود ہیں کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام محض یہودیوں کے لیے آئے تھے اور اس آیت میں وعدہ ہے کہ

کہا ہے کہ یہ ضمیر جو لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ میں پائی جاتی ہے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے اور یہ سب سے زیادہ مرجّح قول ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ضمیر قرآن کریم کی طرف جاتی ہے اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے اور بعض کے نزدیک اس ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ لیکن یہ ایک ضعیف قول ہے جس کو کسی محقق نے قابل اعتنا نہیں ٹھہرایا۔ پس ہمارے مخالف دشمنوں پر افسوس ہے کہ وہ قرآن کریم اور اس کے بیّنات کو چھوڑتے ہیں۔ بلکہ اس کے متعلق ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مونہوں سے تو کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی پیروی کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ پیروی کرنے والے نہیں۔ بلکہ وہ ایسے اقوال کو بھی ترک کر دیتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اور طیّب کے بدلے خبیث کو اختیار کرتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپاتے ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۷-۴۸)

---

[1] المائدہ آیت ۶۵ ؛ [2] المائدہ آیت ۱۵ ؛ [3] آل عمران آیت ۵۶

حضرت مسیح کو ماننے والے یہود پر قیامت تک غالب رہیں گے ۔ اب تبلاؤ کہ جب اِن معنوں کے رو سے جو ہمارے مخالف آیت و ان من اہل الکتاب کے کرتے ہیں تمام یہودی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے تو پھر یہ آیتیں کیونکر صحیح ٹھہر سکتی ہیں کہ یہود اور نصارٰی کی قیامت تک باہم دشمنی رہے گی اور نیز یہ کہ قیامت تک یہود ایسے فرقوں کے مغلوب رہیں گے جو حضرت مسیح کو صادق سمجھتے ہوں گے ایسا ہی اگر مان لیا جاوے کہ حضرت مسیح زندہ بجسم عنصری آسمان پر تشریف لے گئے تو پھر آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[۴] کیونکر صحیح ٹھہر سکتی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ حضرت مسیح کی وفات کے بعد عیسائی بگڑ گئے جب تک کہ وہ زندہ تھے عیسائی نہیں بگڑے ۔ اور پھر اس آیت کے کیا معنے ہو سکتے ہیں کہ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ[۵] کہ زمین پر ہی تم زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے ۔ کیا وہ شخص جو اٹھارہ سو برس ۱۸۰۰ سے آسمان پر بقول مخالفین زندگی بسر کر رہا ہے وہ انسانوں کی قسم میں سے نہیں ہے اگر مسیح انسان ہے تو نعوذ باللہ مسیح کے اس مدت دراز تک آسمان پر ٹھہرنے سے یہ آیت جھوٹی ٹھہرتی ہے اور اگر ہمارے مخالفوں کے نزدیک انسان نہیں ہے بلکہ خدا ہے تو ایسے عقیدہ سے وہ خود مسلمان نہیں ٹھہر سکتے پھر یہ آیت قرآن شریف کی کہ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ[۶] جس کے یہ معنے ہیں کہ جن لوگوں کی خدا کے سوا تم عبادت کرتے ہو وہ سب مر چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں صاف تبلا رہی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں ۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۵-۱۲۶)

بعض لوگ محض نادانی سے یا نہایت درجہ کے تعصّب اور دھوکہ دینے کی غرض سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی پر اس آیت کو بطور دلیل لاتے ہیں کہ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ[۱] اور اس سے یہ معنے نکالنا چاہتے ہیں کہ اُس وقت تک حضرت عیسٰی فوت نہیں ہوں گے جب تک کل اہل کتاب ان پر ایمان لے آویں لیکن ایسے معنے وہی کریگا جس کو فہم قرآن شریف سے پورا حصہ نہیں ہے یا جو دیانت کے طریق سے دُور ہے کیونکہ ایسے معنے کرنے سے قرآن شریف کی ایک پیشگوئی باطل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[۲] اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[۳]۔ ان آیتوں کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے قیامت تک یہود اور نصارٰی میں دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے پس اگر آیت ممدوحہ بالا کے یہ معنے ہیں کہ قیامت سے پہلے تمام یہودی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے تو اس سے لازم آتا ہے کہ کسی وقت یہود و نصارٰی کا بغض باہمی دُور بھی ہو جائے گا اور یہودی مذہب کا تخم زمین پر نہیں رہے گا حالانکہ قرآن شریف کی ان آیات سے اور کئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی مذہب قیامت تک رہے گا ۔ ہاں ذلت اور مسکنت اُن کے شامل حال ہوگی اور وہ دوسری طاقتوں کی پناہ میں زندگی بسر کریں گے پس آیت ممدوحہ بالا کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو اہل کتاب میں سے ہے وہ اپنی موت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یا حضرت عیسٰی پر ایمان لے آویں گے ۔ غرض موتہٖ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے نہ حضرت عیسٰی کی طرف ۔ اسی وجہ سے اس آیت کی دوسری قرأت میں مَوْتِهِمْ واقع ہے اگر حضرت عیسٰی کی طرف یہ ضمیر پھرتی

---

[۱] المائدۃ آیت ۱۱۸ ، [۲] الاعراف آیت ۲۶ ، [۳] النحل آیت ۲۲ ، [۴] المائدۃ آیت ۱۵ ، [۵] المائدۃ آیت ۶۵ ،

تو دوسری قرأت میں مَوْتِہِم کیوں ہوتا ہے دیکھو تفسیر ثنائی کہ اس میں بڑے زور سے ہمارے اس بیان کی تصدیق موجود ہے۔ اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہی معنے ہیں مگر صاحب تفسیر لکھتا ہے کہ ابوہریرہ فہم قرآن میں ناقص ہے اور اس کی درائت پر محدثین کو اعتراض ہے ابوہریرہ میں نقل کرنے کا مادّہ تھا اور درائت اور فہم سے بہت ہی کم حصّہ رکھتا تھا اور مَیں کہتا ہوں کہ اگر ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے ایسے معنے کیے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہے جیسا کہ اور کئی مقام میں محدثین نے ثابت کیا ہے کہ جو امور فہم اور درائت کے متعلق ہیں اکثر ابوہریرہؓ ان کے سمجھنے میں ٹھوکر کھاتا ہے اور غلطی کرتا ہے۔ یہ مسلّم امر ہے کہ ایک صحابی کی رائے شرعی حُجّت نہیں ہو سکتی۔ شرعی حُجّت صرف اجماع صحابہؓ ہے۔ سو ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس بات پر اجماع صحابہؓ ہو چکا ہے کہ تمام انبیاء فوت ہو چکے ہیں۔

اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جبکہ آیت قبل موتہٖ کی دوسری قرأت قبل موتہم موجود ہے جو بموجب اصول محدثین کے حکم صحیح حدیث کا رکھتی ہے یعنی ایسی حدیث جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس صورت میں محض ابوہریرہ کا اپنا قول ردّ کرنے کے لائق ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے مقابل پر ہیچ اور لغو ہے اور اُس پر اصرار کرنا کفر تک پہنچا سکتا ہے اور پھر صرف اسی قدر نہیں بلکہ ابوہریرہ کے قول سے قرآن شریف کا باطل ہونا لازم آتا ہے کیونکہ قرآن شریف تو جابجا فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ قیامت تک رہیں گے اُن کا بکلی استیصال نہیں ہوگا۔ اور ابوہریرہ کہتا ہے کہ یہود کا استیصال بکلی ہو جائے گا اور یہ سراسر مخالف قرآن شریف ہے۔ جو شخص قرآن شریف پر ایمان لاتا ہے اُس کو چاہیئے کہ ابوہریرہؓ کے قول کو ایک ردّی متاع کی طرح پھینک دے بلکہ چونکہ قرأت ثانی حسب اصول محدثین حدیث صحیح کا حکم رکھتی ہے اور اس جگہ آیت قبل موتہٖ کی دوسری قرأت قبل موتہم موجود ہے جس کو حدیث صحیح سمجھنا چاہیئے۔ اِس صورت میں ابوہریرہ کا قول قرآن اور حدیث دونوں کے مخالف ہے فلا شك انّہ باطل ومن تبعہ فانہ مفسد بطّال۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۳۳-۲۳۵)

یہ عقیدہ کھلے طور پر قرآن شریف کے مخالف ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ سب لوگ حضرت عیسٰی کو قبول کر لیں گے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۴)

"دنیا میں خدا پر ایمان لانے کا یہ اجر ملتا ہے کہ ایسے شخص کو خدا تعالیٰ پوری ہدایت بخشتا ہے اور ضائع نہیں کرتا اسی کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کرتی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ یعنی وہ لوگ جو درحقیقت اہل کتاب ہیں اور سچے دل سے خدا پر اور اُس کی کتابوں پر ایمان لاتے اور عمل کرتے ہیں وہ آخر کار اس نبی پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہاں خبیث آدمی جن کو اہل کتاب نہیں کہنا چاہیئے وہ ایمان نہیں لاتے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۵)

یعنی ایسا کوئی اہل کتاب نہیں جو اپنی موت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عیسٰی پر ایمان نہ لاوے۔ اور تفاسیر میں لکھا ہے کہ اہل کتاب کو یہ الہام اس وقت ہوتا ہے جب وہ جان کندن کی حالت میں ہوتے ہیں یا موت کا وقت بہت قریب ہوتا ہے اور اب ظاہر ہے کہ وہ تبھی ایمان لاتے ہیں جب اُن کو منجانب اللہ الہام ہوتا ہے کہ فلاں

رسول سچا ہے مگر اس الہام سے وہ خدا کے برگزیدہ نہیں ٹھہر سکتے اور خدا تعالیٰ کی سنّت اسی طرح جاری ہے کہ موت کے قریب اکثر لوگوں کو کوئی خواب یا الہام ہو جاتا ہے اس میں کسی مذہب کی خصوصیت نہیں اور نہ صالح اور نکوکار ہونے کی شرط ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۱-۱۲۲)

وَاَمَّا اِیْمَانُ اَھْلِ الْکِتَابِ کُلِّھِمْ بِعِیْسٰی کَمَا ظَنَنْتُمْ فِیْ مَعْنَی الْاٰیَۃِ الْمَذْکُوْرَۃِ فَاَنْتَ تَعْلَمُ حَقِیْقَۃَ اِیْمَانِھِمْ لَا حَاجَۃَ اِلَی التَّذْکِرَۃِ۔ وَتَعْلَمُ اَنَّ اَفْوَاجًا مِّنَ الْیَھُوْدِ قَدْ مَاتُوْا وَلَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖ فَلَا تُحَرِّفْ کَلَامَ اللّٰہِ لِعَقِیْدَۃٍ ھِیَ بَاطِلَۃٌ بِالْبَدَاھَۃِ۔ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ فَکَیْفَ الْعَدَاوَۃُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ بِعِیْسٰی اَلَمْ یَبْقَ فِیْ رَاْسِکُمْ ذَرَّۃٌ مِّنَ الْفِطْنَۃِ۔ اَلَیْسَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ رَدٌّ عَلٰی مَنْ زَعَمَ اَنَّ جَمِیْعَ فِرَقِ الْیَھُوْدِ یُؤْمِنُوْنَ بِعِیْسٰی فَمَا لَکُمْ تُخَالِفُوْنَ النَّصَّ الَّذِیْ ھُوَ اَظْھَرُ وَاَجْلٰی۔ فَاَیُّ اٰیَۃٍ بَقِیَتْ فِیْ اَیْدِیْکُمْ بِھَا تَتَمَسَّکُوْنَ۔ (الاستفتاء صفحہ ۴۹ ضمیمہ حقیقۃ الوحی)

ہمارے مخالف اس آیت کو بھی پیش کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسیح کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب مومن ہو جائیں گے ان کو اتنا معلوم نہیں کہ مَوْتِہٖ کی ضمیر اس طرف نہیں جاتی۔ تفسیر مظہری میں اس آیت پر خوب بحث کی گئی ہے اور انہوں نے دوسری قرأت قَبْلَ مَوْتِھِمْ کی لکھی ہے اور ابوہریرہ کی حدیث جو اس کی تائید میں مخالف پیش کرتے ہیں اس پر بھی جرح کی گئی ہے خود انہوں نے مانا ہے کہ ابوہریرہ کی درایت ٹھیک نہیں۔

علاوہ بریں یہ معنی قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو مخاطب کرکے فرمایا ہے وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ[1]۔ اب اس آیۃ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کا وجود قیامۃ تک رہے گا۔ کیونکہ اگر منکرین ہی کا وجود نہیں تو پھر غلبہ کیسا؟ پھر دوسری جگہ فرمایا وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ[2] اور پھر تیسری جگہ فرمایا فَاَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ[3] ان سب آیتوں پر یکجائی نظر کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ کُل فرقے باقی رہیں گے یہ کہنا کہ کُل مسلمان ہو جائیں گے غلط ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

تمام اہل کتاب کا حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آنا جیسا کہ آیت مذکورہ کے بارہ میں ان کا خیال ہے تو تم ان کے ایمان کی حقیقت کو جانتے ہو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ نیز تم یہ بھی جانتے ہو کہ فوج در فوج یہودی فوت ہو چکے ہیں اور وہ مسیح پر ایمان نہیں لائے تھے پس تو اس عقیدہ کی خاطر جو بالبداہت باطل ہے اللہ کے کلام میں تحریف نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ پھر ایمان لانے کے بعد مسیح سے عداوت کیسی۔ کیا تمہارے سروں میں ذرا بھی سمجھ نہیں رہی۔ کیا اس آیت میں ان تمام لوگوں کا ردّ نہیں ہے جو گمان کرتے ہیں کہ تمام فرقہائے یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک ایسی نص کی مخالفت کرتے ہو جو نہایت واضح اور روشن ہے تمہارے پاس وہ کونسی آیت ہے جس سے تم استدلال کرتے ہو۔ (الاستفتاء صفحہ ۴۹)

---

[1] اٰل عمران آیت ۵۶۔ [2] المائدہ آیت ۶۵۔ [3] المائدہ آیت ۱۵۔

النساء ۱۶۵-۱۶۶ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

کیا ہم یہ گمان کر سکتے ہیں کہ پہلی اُمتوں پر تو خدا تعالیٰ کا رحم تھا اس لیے اُس نے توریت کو بھیج کر پھر ہزار ہا رسول اور محدث توریت کی تائید کے لیے اور دلوں کو بار بار زندہ کرنے کے لیے بھیجے لیکن یہ امت مورد غضب تھی اس لیے اُس نے قرآن کریم کو نازل کر کے اِن سب باتوں کو بھلا دیا اور ہمیشہ کے لیے علماء کو ان کی عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ کی نسبت تو صاف فرمایا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۔ یعنی خدا موسیٰ سے ہمکلام ہوا اور اس کی تائید اور تصدیق کے لیے رسول بھیجے جو مبشر اور منذر تھے تا کہ لوگوں کی کوئی حجت باقی نہ رہے اور نبیوں کا مسلسل گروہ دیکھ کر توریت پر دلی صدق سے ایمان لاویں۔ اور فرمایا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ یعنی ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور بعض کا تو ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر بھی نہیں کیا لیکن دین اسلام کے طالبوں کے لیے وہ انتظام نہ کیا گویا جو رحمت اور عنایت باری حضرت موسیٰ کی قوم پر تھی وہ اس امت پر نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ امتداد زمانہ کے بعد پہلے معجزات اور کرامات قصّہ کے رنگ میں ہو جاتے ہیں۔ اور پھر آنیوالی نسلیں اپنے گروہ کو ہر یک امر خارق عادت سے بے بہرہ دیکھ کر آخر گذشتہ معجزات کی نسبت شک پیدا کرتی ہیں پھر جس حالت میں بنی اسرائیل کے ہزار ہا انبیاء کا نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے تو اس سے اور بھی بیدلی اس امت کو پیدا ہوگی اور اپنے تئیں بد قسمت پا کر بنی اسرائیل کو رشک کی نگہ سے دیکھیں گے یا بدخیالات میں گرفتار ہو کر اُن کے قصوں کو بھی صرف افسانجات خیال کریں گے اور یہ قول کہ پہلے اس سے ہزار ہا انبیاء ہو چکے اور معجزات بھی بکثرت ہوئے۔ اِس لیے اس امت کو خوارق اور کرامات اور برکات کی کچھ ضرورت نہیں تھی۔ لہذا خدا تعالیٰ نے اِن کو سب باتوں سے محروم رکھا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں جنہیں وہ لوگ مُنہ پر لاتے ہیں جن کو ایمان کی کچھ بھی پروا نہیں ورنہ انسان نہایت ضعیف اور ہمیشہ تقویت ایمان کا محتاج ہے اور اس راہ میں اپنے خود ساختہ دلائل کبھی کام نہیں آ سکتے جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے ہاں جھوٹا ایمان جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے اور

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اس بات کو مستلزم نہیں جو اس کی مناسب حفاظت سے بکلی دست بردار ہو جائے مثلاً اگر کوئی گھر بناوے اور اُس کے تمام کمرے سلیقہ سے طیار کرے اور اُس کی تمام ضرورتیں جو عمارت کے متعلق ہیں باحسن وجہ پوری کردیوے اور پھر مدت کے بعد اندھیریاں چلیں اور بارشیں ہوں اور اُس گھر کے نقش و نگار پر گرد و غبار بیٹھ جاوے اور اُس کی خوبصورتی چھپ جاوے اور پھر اُس کا کوئی وارث اُس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے مگر اُس کو منع کردیا جاوے کہ گھر تو مکمل ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے افسوس کہ ایسے اعتراضات کرنے والے نہیں سوچتے کہ تکمیل شی دیگر ہے اور وقتاً فوقتاً ایک مکمل عمارت کی صفائی کرنا یہ اور بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجدد لوگ دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے ہاں گمشدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں اور یہ کہنا کہ مجددوں پر ایمان لانا کچھ فرض نہیں خدا تعالیٰ کے حکم سے انحراف ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ[1] یعنی بعد اس کے جو خلیفے بھیجے جائیں پھر جو شخص ان کا منکر رہے وہ فاسقوں میں سے ہے۔ (شہادت القرآن صفحہ ۴۷-۴۸)

[۱۷۰-۱۶۹] اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

باطنی بشارتوں کی طرف اشارہ فرما کر کہا۔ کافر اور مشرک کہ جو شرک اور کفر پر مریں اُن کے گناہ نہیں بخشے جائیں گے اور خدا اُن کو اُن کے کفر کی حالت میں اپنی معرفت کا راہ نہیں دکھلائیگا۔ ہاں جہنّم کا راہ دکھلائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۴۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

[۱۷۱] يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

یعنی اے لوگو حق اور ضرورت حقہ کے ساتھ تمہارے پاس یہ نبی آیا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۱ صفحہ ۳-۴)

---

[1] النور آیت ۵۶۔

اے لوگو! تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ آیا ہے پس تم اُس رسول پر ایمان لاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے اور اگر تم کفر اختیار کرو تو خدا کو تمہاری کیا پرواہ ہے زمین و آسمان سب اُسی کا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں اور خدا علیم اور حکیم ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۸-۱۲۹)

يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ط إِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ج أَلْقٰهَا إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ز فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ قف وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ط إِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ط إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ م لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ع

اِس جگہ خدائے تعالیٰ نے روح کا نام کلمہ رکھا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت تمام ارواح کلماتُ اللہ ہی ہیں جو ایک لا یُدرک بھید کے طور پر جس کی تہ تک انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی رُوحیں بن گئی ہیں اسی بنا پر اس آیت کا مضمون بھی ہے وَ كَلِمَتُهٗ أَلْقٰهَا إِلٰى مَرْيَمَ اور چونکہ یہ سرّ ربوبیت ہے اس لیے کسی کی مجال نہیں کہ اِس سے بڑھ کر کچھ بول سکے کہ کلمات اللہ ہی بحکم و باذن ربّی لباس رُوح کا پہن لیتے ہیں اور اُن میں وہ تمام طاقتیں اور قوتیں اور خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو روحوں میں پائی جاتی ہیں اور پھر چونکہ ارواح طیّبہ فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں اپنے تمام قُویٰ کو چھوڑ دیتی ہیں اور اطاعت الٰہی میں فانی ہو جاتی ہیں تو گویا پھر وہ روح کی حالت سے باہر آ کر کلمۃ اللہ ہی بن جاتی ہیں جیسا کہ ابتدا میں وہ کلمۃ اللہ تھے سو کلمۃ اللہ کے نام سے اُن پاک روحوں کو یاد کرنا اُن کے اعلیٰ درجہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے سو اُنہیں نور کا لباس ملتا ہے اور اعمال صالح کی طاقت سے اُن کا خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۴۰-۴۴۱)

وَإِنْ كُنْتُمْ تَظُنُّوْنَ أَنَّ الْقُرْاٰنَ صَدَّقَ قَوْلَكُمْ وَأَعَانَ وَقَالَ فِيْ شَانِ عِيْسٰى رُوْحٌ مِّنْهُ وَقَبِلَ أَنَّهٗ

اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ قرآن تمہارے قول کی تصدیق کرتا اور تمہیں مدد دیتا ہے اور عیسٰی کے بارہ میں کہتا ہے کہ وہ اُس سے

خَرَجَ مِنْ لَّدُنْهُ فَمَا هٰذَا اِلَّاجَهْلٌ صَرِيْحٌ وَّوَهْمٌ قَبِيْحٌ وَّخَطَاءٌ مُّبِيْنٌ - ثُمَّ اِنْ فُرِضَ اَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰی رُوْحٌ مِّنْهُ يَزِيْدُ شَانَ ابْنِ مَرْيَمَ وَيَجْعَلُهُ ابْنَ اللّٰهِ وَاَعْلٰى وَاَكْرَمَ فَيَجِبُ اَنْ يَّكُوْنَ مَقَامُ اٰدَمَ اَرْفَعَ مِنْهُ وَاَعْظَمَ وَيَكُوْنُ اٰدَمُ اَوَّلَ اَبْنَآءِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - فَاِنَّ فِيْ شَانِ اٰدَمَ مَبَانٍ اَكْبَرُ مِنْ شَانِ عِيْسٰى فَتَفَكَّرْ فِيْ اٰيَةِ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ وَتَدَبَّرْ كَاُولِي النُّهٰى وَفَكِّرْ فِيْ لَفْظِ خَلَقْتُ بِيَدَيَّ وَلَفْظِ سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ وَاَلْفَاظٍ اُخْرٰى لِيَظْهَرَ عَلَيْكَ جَلَالَتُ اٰدَمَ وَشَانُهُ الْاَعْلٰى فَاِنَّ مَنْطُوْقَ الْاٰيَةِ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ رُوْحَ اللّٰهِ نَزَلَ فِيْ اٰدَمَ بِنُزُوْلٍ اَجْلٰى حَتّٰى جَعَلَهٗ مَسْجُوْدَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَمَظْهَرَ تَجَلِّيَاتٍ وَّاَقْرَبَ اِلَى اللّٰهِ الْاَغْنٰى وَاَعْلَمَ وَاَفْضَلَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اَجْمَعِيْنَ وَخَلِيْفَةَ اللّٰهِ عَلَى الْاَرَضِيْنَ وَاَمَّا الْاٰيَةُ الَّتِيْ نَزَلَتْ فِيْ شَانِ عِيْسٰى فَمَا تَجْعَلُهٗ اَرْفَعَ وَاَعْلٰى وَلَا اَصْفٰى وَاَزْكٰى بَلْ يَثْبُتُ مِنْهُ اَنَّ عِيْسٰى رُوْحٌ مِّنَ اللّٰهِ وَعَبْدُهُ الْعَاجِزُ كَاَشْيَآءَ اُخْرٰى وَمِنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ مَا سَجَدَهٗ اِبْلِيْسُ بَلْ اَمَرَهٗ اَنْ يَّسْجُدَ لَهٗ وَمَعَ ذٰلِكَ جَرَّبَهٗ ذٰلِكَ الْخَبِيْثُ وَسَجَدَ لِاٰدَمَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعِيْنَ - وَاِنَّ اٰدَمَ اَنْبَأَ الْمَلٰٓئِكَةَ بِاَسْمَآءِ سَآئِرِ الْاَشْيَآءِ فَثَبَتَ اَنَّهٗ اَعْلَمُ وَسِرُّهٗ مُحِيْطٌ عَلَى الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ وَلٰكِنْ عِيْسٰى اَقَرَّ بِاَنَّهٗ لَا يَعْلَمُ السَّاعَةَ وَاَشَارَ اِلٰى اَنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ قَدْ فَاقُوْهُ

رُوح ہے اور اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ وہ اس سے نکلا ہے تو یہ خیال تمہارا صریح جہل اور مکروہ وہم ہے اور کھلا کھلا خطا ہے۔ پھر اگر ہم فرض کریں کہ روح منہ کا لفظ حضرت عیسٰی کی شان بڑھاتا ہے اس کو ابن اللہ اور بلند تر ٹھہراتا ہے۔ سو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت آدم کا مقام حضرت مسیح سے زیادہ بلند ہو اور پہلا بیٹا خدا تعالیٰ کا حضرت آدم ہی ہو کیونکہ حضرت آدم کی شان میں حضرت عیسٰی کی نسبت زیادہ تعریف بیان کی گئی ہے سو عقلمندوں کی طرح لفظ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ[1] میں غور کر اور پھر اس لفظ پر غور کر جو خَلَقْتُ بِيَدَيَّ[2] اور سَوَّيْتُهٗ[3] اور نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ہے اور دوسرے لفظوں کو بھی سوچ تاکہ تیرے پر حضرت آدم کی شان اعلیٰ ظاہر ہو کیونکہ منطوق آیت کا دلالت کرتا ہے کہ روح اللہ آدم میں اُترا تھا اور وہ اُترنا بہت روشن تھا یہاں تک کہ آدم ملائکہ کا سجدہ گاہ ٹھہرا اور تجلیات عظمیٰ کا مظہر بنا اور خدائے غنی سے بہت قریب ہوا اور افضل ٹھہرا اور خدا تعالیٰ کا خلیفہ بنا مگر وہ آیت جو حضرت عیسٰی کی شان میں نازل ہوئی ہے سو وہ اس کو کچھ بہت اونچا نہیں بناتی اور نہ زیادہ پاک اور صاف بناتی ہے بلکہ اس سے تو صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک روح ہیں جیسا کہ دوسری چیزیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ مخلوق ہے شیطان نے اس کو سجدہ نہ کیا بلکہ چاہا کہ وہ شیطان کو سجدہ کرے اور اُس کا امتحان لیا اور آدم کو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا اور آدم نے فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتلائے پس ثابت ہوا کہ وہ ان سے زیادہ عالم تھا اور اُس کا سِر تمام کائنات پر محیط تھا مگر حضرت عیسٰی نے تو اقرار کیا کہ اس کو قیامت کا علم نہیں

[1] الحجر آیت ۳۰ ۔ [2] ص آیت ۷۶ ۔ [3] الحجر آیت ۳۰

عِلْمًا وَّ اَكْمَلُوا الْخَوْفَ وَالطَّاعَةَ فَتَفَكَّرُوْا فِيْ هٰذَا وَلَا تَمْشُوْا كَقَوْمٍ عَمِيْنَ ثُمَّ اِذَا دَقَّقْتَ النَّظَرَ اَوْ اَمْعَنْتَ فِيْمَا حَضَرَ فَيَظْهَرُ عَلَيْكَ اَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰى رُوْحٌ مِّنْهُ يُشَابِهُ قَوْلَهٗ تَعَالٰى جَمِيْعًا مِّنْهُ فَمِنَ الْغَبَاوَةِ اَنْ تُثْبِتَ مِنْ لَفْظِ رُوْحٌ مِّنْهُ اُلُوْهِيَّتَ عِيْسٰى وَلَا تُقِرَّ مِنْ لَفْظِ جَمِيْعًا مِّنْهُ بِاُلُوْهِيَّةِ اَرْوَاحِ الْكِلَابِ وَالْقِرَدَةِ وَالْخَنَازِيْرِ وَاَشْيَاءَ اُخْرٰى فَاِنَّ مَنْطُوْقَ الْاٰيَةِ يَشْهَدُ عَلٰى اَنَّهَا جَمِيْعًا مِّنْهُ فَمُتْ مِنَ النَّدَامَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُسْتَحْيِيْنَ وَتَفَكَّرُوْا يَا مَعْشَرَ النَّصَارٰى اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ مِّنَ الْمُتَفَكِّرِيْنَ - وَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَرْفَعَ فِيْ جَوَابِنَا الصَّوْتَ وَاِنْ تَلَاقِيَ مِنْ فِكْرِكَ الْمَوْتَ فَاِنَّ مَثَلَ الْكَاذِبِ كَخَذْرُوْفٍ مُّدَحْرَجٍ وَّلَا قَرَارَ لَهٗ عِنْدَ الصَّادِقِيْنَ ۔ (نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۱۰۲-۱۰۴)

لوگوں نے کلمۃ اللہ کے لفظ پر جو مسیح کی نسبت آیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اور مسیح کی کوئی خصوصیت سمجھی ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے ہر انسان جب نفسانی ظلمتوں اور گندگیوں اور تیرگیوں سے نکل آتا ہے اُس وقت وہ کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ انسان کلمۃ اللہ ہے کیونکہ اس کے اندر روح ہے جس کا نام قرآن شریف میں امر ربی رکھا گیا ہے لیکن انسان نادانی اور ناواقفی سے روح کی کچھ قدر نہ کرنے کے باعث اُس کو انواع و اقسام کی سلاسل اور زنجیروں میں مقید کر دیتا ہے اور اس کی روشنی اور صفائی کو خطرناک تاریکیوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے اندھا اور سیاہ کر دیتا ہے اور ایسا دھندلا بنا تا ہے کہ پتہ بھی نہیں لگتا لیکن جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی ناپاک اور تاریک زندگی کی چادر اُتار دیتا ہے۔ تو قلب منور ہونے لگتا ہے اور پھر اصل مبدء کی طرف رجوع شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ تقویٰ کے انتہائی درجہ پر پہنچ کر سارا میل کچیل اُتر کر پھر وہ کلمۃ اللہ ہی رہ جاتا ہے۔ یہ ایک باریک علم اور معرفت کا نکتہ ہے ہر شخص اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

کو کب آئے گی اور یہ بھی اشارہ کیا کہ ملائک اس سے علم اور طاعت میں افضل ہیں سو اس بات کو سوچو اور اندھوں کی طرح مت چلو پھر اگر تو غور سے دیکھے اور واقعات موجودہ میں غور کرے تو تیرے پر ظاہر ہوگا ۔ کہ اللہ جل شانہ کا یہ قول کہ رُوْحٌ مِّنْهُ ایسا ہی قول ہے جیسا کہ اس کا دوسرا قول سو بڑی نادانی کی بات ہے۔ کہ رُوْحٌ مِّنْهُ کے لفظ سے حضرت عیسیٰ کی خدائی تو ثابت کرے اور جَمِيْعًا مِّنْهُ[1] کے لفظ سے کتّوں اور بلّیوں اور سوروں اور دوسری تمام چیزوں کی خدائی کا اقرار نہ کرے کیونکہ منطوق آیت کا دلالت کر رہا ہے کہ ہر یک چیز جَمِيْعًا مِّنْهُ میں داخل ہے یعنی تمام ارواح وغیرہ خدا سے ہی نکلے ہیں پس اب ندامت سے مرجا اگر کچھ شرم ہے اور اے نصرانی لوگو اس میں غور کرو کیا تم میں کوئی بھی غور کرنے والا نہیں ہے اور کبھی ممکن نہیں جو تو ہمارا جواب دے سکے اگرچہ اسی فکر میں مرجائے کیونکہ جھوٹا آدمی ایک گیند کی طرح گردش میں ہوتا ہے اور سچوں کے سامنے اس کو قرار نہیں۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۱۰۲-۱۰۴)

[1] الجاثیۃ آیت ۱۴

قرآن شریف اور احادیث میں جو حضرت عیسیٰ کے نیک اور معصوم ہونے کا ذکر ہے اس سے یہ مطلب نہیں کہ دوسرا کوئی نیک یا معصوم نہیں بلکہ قرآن شریف اور حدیث نے ضرورتاً یہود کے منہ کو بند کرنے کے لیے یہ فقرے بولے ہیں کہ یہود نعوذ باللہ مریم کو زناکار عورت اور حضرت عیسیٰ کو ولد الزنا کہتے تھے اس لیے قرآن شریف نے ان کا ذب کیا ہے کہ وہ ایسا کہنے سے باز آویں۔ (الحکم جلد ۶ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

مسیح کو جو روح اللہ کہتے ہیں اور عیسائی اس پر ناز کرتے ہیں کہ یہ مسیح کی خصوصیت ہے یہ ان کی صریح غلطی ہے ان کو معلوم نہیں کہ قرآن شریف میں مسیح پر رُوْحُ اللّٰہ کیوں بولا گیا ہے اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف نے مسیح ابن مریم پر خصوصیت کے ساتھ بہت بڑا احسان کیا ہے جو ان کا تبریہ کیا ہے۔ بعض ناپاک فطرت یہودی حضرت مسیح کی ولادت پر بہت ہی ناپاک اور خطرناک الزام لگاتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ بعض ولد اس قسم کے ہوتے ہیں کہ شیطان ان کی پیدائش میں شریک ہوجاتا ہے! اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرۃ مسیح اور حضرۃ مریم کے دامن کو اُن اعتراضوں سے پاک کرنے کے لیے اور اس اعتراض سے بچانے کے لیے جو ولد شیطان کا ہوتا ہے قرآن شریف میں رُوْحُ اللّٰہ کہا۔ اس سے خدائی ثابت کرنا حماقت ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ حضرۃ آدم کے لیے نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] بھی تو آیا ہے یہ صرف تبریہ کیا ہے لیکن جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں وہ ان سے بحث خاک کریں گے۔ (الحکم جلد ۶ ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے کلمۃ اللہ خصوصیت سے کیوں کہا اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی ولادت پر لوگ بڑے گندے اعتراض کرتے تھے اس واسطہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان الزاموں سے بری کرنے کے لیے فرمایا کہ وہ تو کلمۃ اللہ ہیں اُن کی ماں بھی صدیقہ ہے یعنی بڑی پاک باز اور عفیفہ ہے ورنہ یوں تو کلمۃ اللہ ہر شخص ہے اُن کی خصوصیت کیا تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمے اتنے ہیں کہ وہ ختم نہیں ہوسکتے۔ انہی اعتراضوں سے ہی بری کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اُن کو کہا کہ وہ شیطان کے مس سے پاک ہیں ورنہ کیا دوسرے انبیا شیطان کے ہاتھ سے مس شدہ ہیں جو نعوذ باللہ دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ اُن پر شیطان کا تسلط ہوتا ہے اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ شیطان کو کسی معمولی انسان پر بھی تسلط نہیں ہوتا تو انبیا پر کس طرح ہوسکتا ہے اصل وجہ یہی تھی کہ ان پر بڑے اعتراض کیے گئے تھے اسی واسطے ان کی بریت کا اظہار فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ[2] کوئی کہے کہ کیا انبیا بھی کافر ہوا کرتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ بت پرست ہو گئے تھے ایک عورۃ کے لیے اُس اعتراض کا جواب دیا یہی حال ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق۔ (الحکم جلد ۷ ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱-۱۲)

ان کو کلمہ اس لیے کہا گیا تھا کہ یہود ان کو ناجائز ولادت قرار دیتے تھے ورنہ کیا دوسرے انبیاء کلمۃ اللہ نہ تھے اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اور عورتیں صدیقہ نہ تھیں یہ بھی اسی لیے کہا کہ یہودی ان پر تہمت لگاتے تھے تو قرآن نے اس تہمت کو دور کیا۔ (البدر جلد ۲ ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

---

[1] الحجر آیت ۳۰
[2] البقرہ آیت ۱۰۳

اللہ تعالیٰ کا حضرت مسیح کو رُوْحٌ مِّنْہُ فرمانے سے اصل مطلب یہ ہے کہ تا ان تمام اعتراضات کا جواب دیا جاوے جو اُن کی ولادت کے متعلق کیے جاتے ہیں۔ یاد رکھو ولادت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ولادت تو وہ ہوتی ہے کہ اُس میں روح الٰہی کا جلوہ ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتی ہے کہ اس میں شیطانی حصہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ[1] یہ شیطان کو خطاب ہے غرض خدا تعالیٰ نے رُوْحٌ مِّنْہُ فرما کر یہودیوں کے اس اعتراض کو رد کیا ہے جو وہ نعوذ باللہ حضرت مسیح کی ولادت کو ناجائز ٹھہراتے تھے۔ رُوْحٌ مِّنْہُ کہہ کر صاف کر دیا کہ ان کی ولادت پاک ہے۔

یہودی تو ایسے بیباک اور دلیر تھے کہ اُن کے مُنہ پر بھی اُن کی ولادت پر حملہ کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ مس شیطان سے پاک ہے اس میں بھی اسی کی تصدیق ہے ورنہ تمام انبیاء اور صلحا مس شیطان سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اُن کی صراحت اس واسطے کی ہے کہ ان پر ایسے ایسے اعتراض ہوئے اور کسی نبی پر چونکہ نہیں ہوئے اس لیے اُن کے لیے صراحت کی ضرورت بھی نہ پڑی دوسرے نبیوں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ ہوتے تو یہ بھی ایک قسم کی توہین ہے۔ کیونکہ اگر ایک مسلم و مقبول نیک آدمی کی نسبت کہا جاوے کہ وہ تو زانی نہیں یہ اُس کی ایک رنگ میں ہتک ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو خود اہل مکہ تسلیم کر چکے ہوئے تھے کہ وہ مس شیطان سے پاک ہے تب ہی تو آپ کا نام اُنھوں نے امین رکھا ہوا تھا اور آپ نے ان پر تحدی کیا کہ قَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا[2] پھر کیا ضرورت تھی کہ آپ کی نسبت بھی کہا جاتا۔ یہ الفاظ حضرت مسیح کی عزت کو بڑھانے والے نہیں ہیں اُن کی براءت کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کلنک کا بھی پتہ دے دیتے ہیں کہ اُن پر الزام تھا۔

یاد رکھو کہ کلمہ اور روح کا لفظ عام ہے حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت اس میں نہیں ہے یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ[3]۔ اب اللہ تعالیٰ کے کلمات تو لاانتہا ہیں۔ اور ایسا ہی صحابہ کی تعریف میں آیا ہے اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ[4] پھر مسیح کی کیا خصوصیت رہی۔

حضرت مسیح کی ماں کی نسبت جو صدیقہ کا لفظ آیا ہے یہ بھی دراصل رفع الزام ہی کے لیے آیا ہے۔ یہودی جو معاذ اللہ ان کو فاسقہ فاجرہ ٹھہراتے تھے قرآن شریف نے صدیقہ کہہ کر اُن کے الزاموں کو دور کیا ہے کہ وہ صدیقہ تھیں۔ اس سے کوئی خصوصیت اور فخر ثابت نہیں ہوتا اور نہ عیسائی کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بلکہ ان کو تو یہ امور پیش بھی نہیں کرنے چاہئیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

ہم بھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو مس شیطان سے پاک سمجھتے اور دوسرے نبیوں کی ارواح کی طرح اس کی روح کو بھی رُوْحٌ مِّنْہُ مانتے ہیں اور یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ[3] پر یقین رکھتے ہیں مگر اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوسرے انبیاء سے کوئی فضیلت تو ثابت نہیں ہو سکتی۔ آپ ہی بتائیں کہ ہر ایک شخص رُوْحٌ مِّنْہُ ہوتا ہے یا کسی اور طرف سے؟ سب ارواح خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اسی کی طرف سے ہوتی ہیں کہ کسی اور طرف سے ہاں اس میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے

[1] بنی اسرائیل آیت ۶۵۔ [2] یونس آیت ۱۷۔ [3] الاعراف آیت ۱۵۹۔ [4] المجادلۃ آیت ۲۳۔

اور وہ یہ کہ فاسقوں فاجروں کی ارواح کو بسبب ان کے فسق و فجور اور شرک کی گندگی کے رُوْحٌ مِّنْہُ نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ روح الشیطان ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے (وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ[1]) اور اس طرح سے ہم مانتے ہیں کہ بعض روح الشیطان ہوتے ہیں اور بعض رُوْحٌ مِّنْہُ ہوتے ہیں۔ بعض آدمی ایسے خراب ہوتے ہیں کہ وہ نہایت ہی خبیث الفطرت اور شیطان خصلت ہوتے ہیں ان سے توقع ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ کبھی رجوع الی اللہ کر سکیں۔ ایسے لوگوں پر رُوْحٌ مِّنْہُ کا لفظ نہیں بولا جاتا بلکہ وہ روح الشیطان ہوتے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو رُوْحٌ مِّنْہُ یا کلمتہ کا لفظ بولا گیا ہے تو وہ بطور ذب اور دفع کے ہے۔ اور اس الزام کو دور کیا گیا ہے جو ان پر لگایا گیا تھا ورنہ کل راستباز اور نیکوکار لوگ رُوْحٌ مِّنْہُ ہی ہوتے ہیں...... اگر بے باپ ہونا دلیل الوہیت اور ابنیت ہے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام بدرجۂ اولیٰ اس کے مستحق ہیں۔ کیونکہ نہ ان کی ماں ہے نہ باپ۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

(فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ...... اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔) سو تم خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور یہ مت کہو کہ تین ہیں باز آجاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

(اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ...... وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا۔) خدا ہر یک نقصان سے پاک ہے وہ تو غنی اور بے نیاز ہے جس کو کسی کی حاجت نہیں جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اسی کا ہے کیا تم خدا پر ایسا بہتان لگاتے ہو جس کی تائید میں تمہارے پاس کسی نوع کا علم نہیں خدا کیوں بیٹوں کا محتاج ہونے لگا وہ کامل ہے اور فرائض الوہیت کے ادا کرنے کے لیے وہ ہی اکیلا کافی ہے کسی اور منصوبہ کی حاجت نہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۴-۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

۱۷۵۔ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۝

لوگو تمہارے پاس یہ یقینی برہان پہنچی ہے اور ایک کھلا نور تمہاری طرف ہم نے اتارا ہے۔

(نور القرآن نمبر ۱ صفحہ ۴)

اے لوگو! قرآن ایک برہان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو ملی ہے اور ایک کھلا کھلا نور ہے جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۴)

---

[1] بنی اسرائیل : ۶۵

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سُورۃ المائدۃ

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

منجملہ انسان کے طبعی امور کے جو اس کی طبیعت کے لازم حال ہیں ہمدردی خلق کا ایک جوش ہے قومی حمایت کا ایک جوش بالطبع ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی ہمدردی کے لیے دوسروں پر ظلم کر دیتے ہیں گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے سو اس حالت کو خلق نہیں کہہ سکتے یہ فقط ایک طبعی جوش ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو

یہ حالت طبعی کوّوں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک کوّے کے مرنے پر ہزارہا کوّے جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اس وقت داخل ہوگی جبکہ یہ ہمدردی انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو اس وقت یہ ایک عظیم الشان خلق ہوگا جس کا نام عربی میں مواسات اور فارسی میں ہمدردی ہے اسی کی طرف اللہ جلّ شانہ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ...... یعنی اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیئے اور ظلم اور زیادتی کے کاموں میں ان کی اعانت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۵)

انسان کی ظاہری بناوٹ اس کے دو ہاتھ دو پاؤں کی ساخت ایک دوسرے کی امداد کا ایک قدرتی راہنما ہے جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے معنے سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

یہ دستور ہونا چاہیئے کہ کمزور بھائیوں کی مدد کی جاوے اور اُن کو طاقت دی جاوے یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ دو بھائی ہیں ایک تیرنا جانتا ہے اور دوسرا نہیں تو کیا پہلے کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے کو ڈوبنے سے بچاوے یا اُس کو ڈوبنے دے؟ اُس کا فرض ہے کہ اُس کو غرق ہونے سے بچاوے۔ اسی لیے قرآن شریف میں آیا ہے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ کمزور بھائیوں کا بار اُٹھاؤ عملی ایمانی اور مالی کمزوریوں میں بھی شریک ہو جاؤ۔ بدنی کمزوریوں کا بھی علاج کرو کوئی جماعت جماعت نہیں ہو سکتی جب تک کمزوروں کو طاقت والے سہارا نہیں دیتے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ ان کی پردہ پوشی کی جاوے۔ صحابہ کو یہی تعلیم ہوئی۔ کہ نئے مسلموں کی کمزوریاں دیکھ کر نہ چڑو کیونکہ تم بھی ایسے ہی کمزور تھے۔ اسی طرح یہ ضرور ہے کہ بڑا چھوٹے کی خدمت کرے اور محبت ملائمت کے ساتھ برتاؤ کرے۔

دیکھو وہ جماعت جماعت نہیں ہو سکتی جو ایک دوسرے کو کھائے اور جب چار مل کر بیٹھیں تو ایک اپنے غریب بھائی کا گلہ کریں اور نکتہ چینیاں کرتے رہیں اور کمزوروں اور غریبوں کی حقارت کریں اور ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھیں ایسا ہرگز نہیں چاہیئے بلکہ اجماع میں چاہیئے قوت آجاوے اور وحدت پیدا ہو جاوے جس سے محبت آتی ہے اور برکات پیدا ہوتے ہیں...... کیوں نہیں کیا جاتا ہے کہ اخلاقی قوتوں کو وسیع کیا جاوے اور یہ تب ہوتا ہے کہ جب ہمدردی، محبت اور عفو اور کرم کو عام کیا جاوے اور تمام عادتوں پر رحم اور ہمدردی پردہ پوشی کو مقدم کر لیا جاوے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایسی سخت گرفتیں نہیں ہونی چاہئیں جو دل شکنی اور رنج کا موجب ہوتی ہیں...... جماعت تب بنتی ہے کہ بعض بعض کی ہمدردی کرے۔ پردہ پوشی کی جاوے۔ جب یہ حالت پیدا ہو تب ایک وجود ہو کر ایک دوسرے کے جوارح ہو جاتے ہیں اور اپنے تئیں حقیقی بھائی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں...... خدا تعالیٰ نے صحابہ کو بھی یہی طریق و نعمت اخوت یاد دلائی ہے۔ اگر وہ سونے کے پہاڑ بھی خرچ کرتے تو وہ اخوت اُن کو نہ ملتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملی۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ

نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور اسی قسم کی اخوت وہ یہاں قائم کرے گا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

انسان کی کمزوریاں جو ہمیشہ اُس کی فطرت کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ہمیشہ اس کو تمدن اور تعاون کا محتاج رکھتی ہیں اور یہ حاجت تمدن اور تعاون کی ایک ایسا بدیہی امر ہے کہ جس میں کسی عاقل کو کلام نہیں خود ہمارے وجود کی ہی ترکیب ایسی ہے کہ جو تعاون کی ضرورت پر اور ثبوت ہے ہمارے ہاتھ اور پاؤں اور کان اور ناک اور آنکھ وغیرہ اعضاء اور ہماری سب اندرونی و بیرونی طاقتیں ایسی طرز پر واقع ہیں کہ جب تک وہ باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تب تک افعال ہمارے وجود کے علی مجری الصحت ہرگز جاری نہیں ہو سکتے اور انسانیت کی کل ہی معطل پڑی رہتی ہے۔ جو کام دو ہاتھ کے ملنے سے ہونا چاہیئے۔ وہ محض ایک ہی ہاتھ سے انجام نہیں ہو سکتا اور جس راہ کو دو پاؤں مل کر طے کرتے ہیں وہ فقط ایک ہی پاؤں سے طے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تمام کامیابی ہماری معاشرت اور آخرت کے تعاون پر ہی موقوف ہو رہی ہے کیا کوئی اکیلا انسان کسی کام دین یا دنیا کو انجام دے سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی کام دینی ہو یا دنیوی بغیر معاونت باہمی کے چل ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک گروہ کہ جس کا مدعا اور مقصد ایک ہی مثل اعضائے یک دیگر ہے اور ممکن نہیں۔ جو کوئی فعل جو متعلق غرض مشترک اس گروہ کے ہے بغیر معاونت باہمی ان کی کے بخوبی و خوش اسلوبی ہو سکے۔ بالخصوص جس قدر جلیل القدر کام ہیں اور جن کی علت غائی کوئی فائدہ عظیمہ جمہوری ہے وہ تو بجز جمہوری اعانت کے کسی طور پر انجام پذیر ہی نہیں ہو سکتے اور صرف ایک ہی شخص ان کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ہوا۔ انبیاء علیہم السلام جو توکل اور تفویض اور تحمل اور مجاہدات افعال خیر میں سب سے بڑھ کر ہیں ان کو بھی برعایت اسباب ظاہری مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ[1] کہنا پڑا۔ خدا نے بھی اپنے قانون تشریعی میں بتصدیق اپنے قانون قدرت کے تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی کا حکم فرمایا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۲۶)

۴۔ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِکُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

[1] آل عمران آیت ۵۳ اور الصف آیت ۱۵

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝

مُردار مت کھاؤ۔ خنزیر کا گوشت مت کھاؤ۔ بتوں کے چڑھاوے مت کھاؤ۔ لاٹھی سے مارا ہُوا مت کھاؤ۔ گر کے مرا ہُوا مت کھاؤ۔ سینگ لگنے سے مرا ہوا مت کھاؤ۔ درندہ کا پھاڑا ہوا مت کھاؤ۔ بُت پر چڑھایا ہوا مت کھاؤ کیونکہ یہ سب مردار کا حکم رکھتے ہیں۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۹۶)

ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے خدا نے ابتدا سے اس کے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور آر سے مرکب ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ میں اس کو بہت فاسد اور خراب دیکھتا ہوں خنز کے معنے بہت فاسد اور آر کے معنے دیکھتا ہوں۔ پس اس جانور کا نام جو ابتدا سے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اس کی پلیدی پر دلالت کرتا ہے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی میں اس جانور کو سُؤر کہتے ہیں یہ لفظ بھی سُو اور آر سے مرکب ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بہت بُرا دیکھتا ہوں۔ اس سے تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ سوء کا لفظ عربی کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنی کتاب منن الرحمان میں ثابت کیا ہے کہ تمام زبانوں کی ماں عربی زبان ہے اور عربی کے لفظ ہر ایک زبان میں نہ ایک نہ دو بلکہ ہزاروں ملے ہوئے ہیں سو سُو عربی لفظ ہے اس لیے ہندی میں سُوء کا ترجمہ بد ہے۔ پس اس جانور کو بد بھی کہتے ہیں۔ اس میں کچھ بھی شک معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تمام دنیا کی زبان عربی تھی اس ملک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا جو خنزیر کے نام کے ہم معنی ہے۔ پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شاستری میں اس کے قریب قریب ہی لفظ متغیر ہو کر اور کچھ بن گیا ہو مگر صحیح لفظ یہی ہے کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے جس پر لفظ خنزیر گواہ ناطق ہے اور یہ معنے جو اس لفظ کے ہیں یعنی بہت فاسد اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور روح پر پلید ہی ہو کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے اور مردار کا کھانا بھی اسی لیے اس شریعت میں منع ہے کہ مردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے اور نیز ظاہری صحت کے لیے بھی مضر ہے اور جن جانوروں کا خون اندر ہی رہتا ہے جیسے گلا گھونٹا ہوا۔ یا لاٹھی سے مارا۔ یہ تمام جانور درحقیقت مردار کے حکم میں ہی ہیں۔ کیا مردہ کا خون اندر رہنے سے اپنی حالت پر رہ سکتا ہے؟ نہیں بلکہ وہ

بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ ہوگا اور اپنی عفونت سے تمام گوشت کو خراب کرے گا اور نیز خون کے کیڑے جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوتے ہیں مر کر ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دینگے (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۹۷-۹۸)

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا آج کافر کی ناامید ہوگئی گویا آپ کو کامیابی کے اس اعلیٰ نقطہ تک پہنچا دیا کہ کافر نامراد ہوگئے کیا انجیل میں اس کے مقابل کوئی آیت ہے ہرگز نہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (الجزو نمبر ۶) آج میں نے اس کتاب کے نازل کرنے سے علم دین کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا اور اپنی تمام نعمتیں ایمانداروں پر پوری کر دیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

آج میں نے علمِ دین کو مرتبہ کمال تک پہنچایا اور اپنی نعمت کو اُمّتِ محمدیہ پر پورا کیا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۳۶۴-۳۶۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

میرا یہ مذہب نہیں ہے کہ قرآن ناقص ہے اور حدیث کا محتاج ہے بلکہ وہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کا تاج لازوال اپنے سر پر رکھتا ہے اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کے وسیع اور مرصع تخت پر جلوہ افروز ہے قرآن میں نقصان ہرگز نہیں اور وہ داغ ناتمام اور ناقص ہونے سے پاک ہے (الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰۴)

آج میں نے تمہارے لیے دین تمہارا کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو پسندیدہ کر لیا۔ (جنگ مقدس ابتدائی تقریر ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۴)

قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ میں کامل کتاب ہوں جیسا کہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ..... آج میں نے دین تمہارا تمہارے لیے کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا۔

(جنگ مقدس پرچہ ۲۳ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۳)

اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں اپنی کمال تعلیم کا آپ دعویٰ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الخ آج میں نے تمہارے لیے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت یعنی تعلیم قرآنی کو تم پر پورا کیا۔ اور ایک دوسرے محل میں اس اکمال کی تشریح کے لیے کہ اکمال کس کو کہتے ہیں فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ کیا تو نے نہیں دیکھا کیونکر بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑ ثابت ہو اور شاخیں اس کی آسمان میں ہوں اور وہ ہر ایک وقت اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہو اور یہ مثالیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تا لوگ اُن کو یاد کر لیں اور

---

[1] النحل آیت ۹۰۔ [2] ابراہیم آیت ۲۵ تا ۲۸۔

نصیحت پکڑیں اور ناپاک کلمہ کی مثال اُس ناپاک درخت کی ہے جو زمین پر سے اُکھڑا ہوا ہے اور اُس کو قرار وثبات نہیں سو اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثابت کے ساتھ یعنی جو قول ثابت شدہ اور مدلل ہے اس دُنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم کرتا ہے اور جو لوگ ظلم اختیار کرتے ہیں اُن کو گمراہ کرتا ہے یعنی ظالم خدا تعالیٰ سے ہدایت کی مدد نہیں پاتا جب تک ہدایت کا طالب نہ ہو..... کسی آیۃ کے وہ معنے کرنے چاہئیے کہ الہامی کتاب آپ کرے اور الہامی کتاب کی شرح دوسری شرحوں پر مقدم ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ان آیات میں کلام پاک اور مقدس کا کمال تین باتوں پر موقوف قرار دیتا ہے۔

اوّل یہ کہ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ یعنی اصول ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور فی حد ذاتہ یقین کامل کے درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور فطرت انسانی اس کو قبول کرے کیونکہ اَرض کے لفظ سے اِس جگہ فطرۃ انسانی مراد ہے جیسا کہ من فوق الارض کا لفظ صاف بیان کر رہا ہے..... خلاصہ یہ کہ اصول ایمانیہ ایسے چاہئیں کہ ثابت شدہ اور انسانی فطرۃ کے موافق ہوں۔ پھر دوسری نشانی کمال کی یہ فرماتا ہے کہ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ یعنی اس کی شاخیں آسمان پر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھیں یعنی صحیفہ قدرت کو غور کی نگاہ سے مطالعہ کریں تو اس کی صداقت ان پر کھل جائے اور دوسری یہ کہ وہ تعلیم یعنی فروعات اِس تعلیم کے جیسے اعمال کا بیان احکام کا بیان اخلاق کا بیان یہ کمال درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں جس پر کوئی زیادۃ متصور نہ ہو جیسا کہ ایک چیز جب زمین سے شروع ہو کر آسمان تک پہنچ جائے تو اس پر کوئی زیادۃ متصور نہیں۔

پھر تیسری نشانی کمال کی یہ فرمائی کہ تُؤۡتِیۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍ ہر ایک وقت اور ہمیشہ کے لیے وہ اپنا پھل دیتا ہے ایسا نہ ہو کہ کسی وقت خشک درخت کی طرح ہو جاوے۔ جو پھل پھول سے بالکل خالی ہے اب صاحبو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمودہ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ کی تشریح آپ ہی فرما دی کہ اس میں تین نشانیوں کا ہونا ازبس ضروری ہے سو جیسا کہ اس نے یہ تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں اسی طرح پر اس نے اِن کو ثابت کر کے بھی دکھلا دیا ہے اور اصول ایمانیہ جو پہلی نشانی ہے جس سے مراد کلمہ لا الہ الا اللہ ہے اُس کو اس قدر بسط سے قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ اگر میں تمام دلایل لکھوں تو پھر چند جزو میں بھی ختم نہ ہوں گے مگر تھوڑا سا ان میں سے بطور نمونہ کے ذیل میں لکھتا ہوں۔

جیسا کہ ایک جگہ یعنی سیپارہ دوسرا سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ [1] یعنی تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف اور ان کشتیوں کے چلنے میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کے لیے چلتی ہیں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے پانی اُتارا اور اسی سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور زمین میں ہر ایک قسم کے جانور بکھیر دیئے اور ہواؤں کو پھیرا اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں مسخر کیا یہ سب خدا تعالیٰ کے وجود

---

[1] البقرہ آیت ۱۶۵

اور اس کی توحید اور اُس کے الہام اور اُس کے مدبر بالارادہ ہونے پر نشانات ہیں۔ اب دیکھئے اس آیت میں اللہ جل شانہ نے اپنے اس اصول ایمانی پر کیسا استدلال اپنے اس قانون قدرت سے کیا یعنی اپنے ان مصنوعات سے جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے مطابق منشاء اس آیت کریمہ کے صاف صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بیشک اس عالم کا ایک صانع قدیم اور کامل اور وحدہ لاشریک اور مدبر بالارادہ اور اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے والا ہے۔ وجہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی یہ تمام مصنوعات اور یہ سلسلہ نظام عالم کا جو ہماری نظر کے سامنے موجود ہے یہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ یہ عالم خود بخود نہیں بلکہ اس کا ایک موجد اور صانع ہے جس کے لیے یہ ضروری صفات ہیں کہ وہ رحمان بھی ہو اور رحیم بھی ہو اور قادر مطلق بھی ہو اور واحد لاشریک بھی ہو اور ازلی ابدی بھی ہو اور مدبر بالارادہ بھی ہو اور مستجمع جمیع صفات کاملہ بھی ہو اور وحی کو نازل کرنے والا بھی ہو۔

دوسری نشانی یعنی فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ جس کے معنے یہ ہیں کہ آسمان تک اس کی شاخیں پہنچی ہوئی ہیں اور آسمان پر نظر ڈالنے والے یعنی قانون قدرت کے مشاہدہ کرنے والے اس کو دیکھ سکیں اور نیز وہ انتہائی درجہ کی تعلیم ثابت ہو۔ اس کے ثبوت کا ایک حصہ تو اسی آیتہ موصوفہ بالا سے پیدا ہوتا ہے کس لیے کہ جیسا کہ اللہ جل شانہ نے مثلاً قرآن کریم میں یہ تعلیم بیان فرمائی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ جلّ شانہ تمام عالموں کا رب ہے یعنی علّۃ العلل ہر ایک ربوبیت کا وہی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ رحمان بھی ہے یعنی بغیر ضرورت کسی عمل کے اپنی طرف سے طرح طرح کے آلاء اور نعماء شامل حال اپنی مخلوق کے رکھتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ اعمال صالحہ کے بجالانے والوں کا مددگار ہوتا ہے اور اُن کے مقاصد کو کمال تک پہنچاتا ہے اور مالک یوم الدین بھی ہے کہ ہر ایک جزا سزا اس کے ہاتھ میں ہے جس طرح پر چاہے اپنے بندہ سے معاملہ کرے چاہے تو اس کے ایک عمل بد کے عوض میں وہ سزا دیوے جو اس عمل بد کے مناسب حال ہے اور چاہے تو اس کے لیے مغفرت کے سامان میسّر کرے یہ تمام امور اللہ جلّ شانہ کے اس نظام کو دیکھ کر صاف ثابت ہوتے ہیں۔

پھر تیسری نشانی جو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ یعنی کامل کتاب کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ جس پھل کا وہ وعدہ کرتی ہے وہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہ ہو بلکہ وہ پھل ہمیشہ اور ہر وقت میں دیتی رہے اور پھل سے مراد اللہ جل شانہ نے اپنا لقاء مع اس کے تمام لوازم کے جو برکات سماوی اور مکالمات الٰہیہ اور ہر ایک قسم کی قبولیتیں اور خوارق ہیں رکھی ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝ (سۃ۔ ۱۸۔ ۱۸) وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر انہوں نے استقامت اختیار کی یعنی اپنی بات سے نہ پھرے اور

ؔ حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۱۔۳۳

طرح طرح کے زلازل ان پر آئے مگر انہوں نے ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ان پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کچھ حُزن اور اس بہشت سے خوش ہو جس کا تم وعدہ دیئے گئے تھے یعنی اب وہ بہشت تمہیں مل گیا اور بہشتی زندگی اب شروع ہوگئی کس طرح شروع ہوگئی۔ نَحْنُ اَوْلِيَآؤُكُمْ الخ اس طرح کہ ہم تمہارے متولی اور متکفل ہوگئے اس دُنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لیے اِس بہشتی زندگی میں جو کچھ تم مانگو وہی موجود ہے یہ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی ہے۔ مہمانی کے لفظ سے اس پھل کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیہ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ میں فرمایا گیا تھا۔ اور آیت فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ کے متعلق ایک بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ کمال اِس تعلیم کا باعتبار اِس کے انتہائی درجہ ترقی کے کیونکر ہے اِس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن شریف سے پہلے جس قدر تعلیمیں آئیں درحقیقت وہ ایک قانون مختص القوم یا مختص الزمان کی طرح تھیں اور عام افادہ کی قوت اِن میں نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن قرآن کریم تمام قوموں اور تمام زمانوں کی تعلیم اور تکمیل کے لیے آیا ہے مثلاً نظیر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم میں بڑا زور سزا دہی اور انتقام میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دانت کے عوض دانت اور آنکھ کے عوض آنکھ کے فقروں سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت مسیح کی تعلیم میں بڑا زور عفو اور درگذر پر پایا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں تعلیمیں ناقص ہیں نہ ہمیشہ انتقام سے کام چلتا ہے اور نہ ہمیشہ عفو سے بلکہ اپنے اپنے موقعہ پر نرمی اور درشتی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (ش ۲۵ ۔ ۱۸) یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ بدی کا عوض تو اسی قدر بدی ہے جو پہنچ گئی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور عفو کا نتیجہ کوئی اصلاح ہو نہ کہ کوئی فساد یعنی عفو اپنے محل پر ہو نہ غیر محل پر پس اجر اس کا اللہ پر ہے یعنی یہ نہایت احسن طریق ہے۔

اب دیکھئے اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہوگی کہ عفو کو عفو کی جگہ اور انتقام کو انتقام کی جگہ رکھا۔ اور پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى (ش ۱۹) یعنی اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ ہے کہ باوجود رعایت عدل کے احسان کرو اور احسان سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ایسے طور سے لوگوں سے مروّت کرو کہ جیسے کہ گویا وہ تمہارے پیارے اور ذوی القربیٰ ہیں اب سوچنا چاہیئے کہ مراتب تین ہی ہیں اول انسان عدل کرتا ہے یعنی حق کے مقابل حق کی درخواست کرتا ہے پھر اگر اس سے بڑھے تو مرتبہ احسان ہے اور اگر اس سے بڑھے تو احسان کو بھی نظر انداز کردیتا ہے اور ایسی محبت سے لوگوں کی ہمدردی کرتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی ہمدردی کرتی ہے یعنی ایک طبعی جوش سے نہ کہ احسان کے ارادہ سے۔ (جنگ مقدس پرچہ ۲۵ رمئی ۱۸۹۳ء صـ)

جس قدر انسان کو قوتیں دی گئی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اپنے محل پر خرچ کرنا اور ہر یک قوت کا خدا تعالیٰ کی مرضی اور رضا کی راہ میں جنبش اور سکون کرنا بھی وہ حالت ہے ..... جس کا قرآن شریف کی رُو سے اسلام نام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اسلام کی یہ تعریف فرماتا ہے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ

ۃ الشوریٰ آیت ۴۱ ۔ ۲ النحل آیت ۹۱

مُحْسِنٌ یعنی انسان کا اپنی ذات کو اپنے تمام قویٰ کے ساتھ خدا تعالےٰ کی راہ میں وقف کر دینا اور پھر اپنی معرفت کو احسان کی حد تک پہنچا دینا یعنی ایسا پردہ غفلت درمیان سے اٹھانا کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یہی اسلام ہے پس ایک شخص کو مسلمان اس وقت کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ تمام قوتیں اس کی خدا تعالیٰ کی راہ میں لگ جائیں اور اس کے زیر حکم واجب طور پر اپنے اپنے محل پر مستعمل ہوں اور کوئی قوت بھی اپنی خود روی سے نہ چلے یہ تو ظاہر ہے کہ نئی زندگی کامل تبدیلی سے ملتی ہے اور کامل تبدیلی ہرگز ممکن نہیں جب تک انسان کی تمام قوتیں جو اس کی انسانیت کا نچوڑ اور لب لباب ہیں اطاعت الٰہی کے نیچے نہ آجائیں اور جب تمام قوتیں اطاعت الٰہی کے نیچے آگئیں اور اپنے نیچرل خواص کے ساتھ خط استقامت پر چلنے لگیں تو ایسے شخص کا نام مسلمان ہوگا لیکن ان تمام قوتوں کا اپنے اپنے مطالب میں پورے پورے طور پر کامیاب ہوجانا اور رضائے الٰہی کے نیچے گم ہو کر اعتدال مطلوب کو حاصل کرنا بجز تعلیم الٰہی اور تائید الٰہی غیر ممکن اور محال ہے اور ضرور تھا کہ کوئی کتاب دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نازل ہوتی کہ جو اسلام کا طریق خدا کے بندوں کو سکھاتی کیونکہ جس طرح ہم اپنے ماتحت جانوروں گھوڑوں گدھوں بیلوں وغیرہ کو تربیت کرتے ہیں تا ان کی مخفی استعدادیں ظاہر کریں اور اپنی مرضی کے موافق اُن کو چلاویں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ پاک فطرت انسانوں کی فطرتی قوتیں ظاہر کرنے کے لیے ان کی طرف توجہ فرماتا ہے اور کسی کامل الفطرۃ پر وحی نازل کر کے دوسروں کی اس کے ذریعہ سے اصلاح کرتا ہے تا وہ اس کی اطاعت میں محو ہو جاویں یہی قدیم سے سنۃ اللہ ہے اور ہمیشہ خدا تعالےٰ ہریک زمانہ کی استعداد کے موافق اسلام کا طریق اُس زمانہ کو سکھلاتا رہا ہے اور چونکہ پہلے نبی ایک خاص قوم اور خاص ملک کے لیے آیا کرتے تھے اس لیے اُن کی تعلیم جو ابھی ابتدائی تھی مجمل اور ناقص رہتی تھی کیونکہ بوجہ کمی قوم اصلاح کی کم حاجت پڑتی تھی اور چونکہ انسانیت کے پودہ نے ابھی پورا نشو ونما بھی نہیں کیا تھا اس لیے استعدادیں بھی کم درجہ پر تھیں اور اعلیٰ تعلیم کی برداشت نہیں کر سکتی تھیں پھر ایسا زمانہ آیا کہ استعدادیں تو بڑھ گئیں مگر زمین گناہ اور بدکاری اور مخلوق پرستی سے بھر گئی اور سچی توحید اور سچی راستبازی نہ ہندوستان میں باقی رہی اور نہ مجوسیوں میں اور نہ یہودیوں میں اور نہ عیسائیوں میں اور تمام قومیں ضلالت اور نفسانی جذبات کے نیچے دب گئیں اُس وقت خدا نے قرآن شریف کو اپنے پاک نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کر کے دنیا کو کامل اسلام سکھایا اور پہلے نبی ایک ایک قوم کے لیے آیا کرتے اور اسی قدر سکھاتے تھے جو اسی قوم کی استعداد کے اندازہ کے موافق ہو اور جن تعلیموں کی وہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ تعلیمیں اسلام کی ان کو نہیں بتلاتے تھے اس لیے ان لوگوں کا اسلام ناقص رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان دینوں میں سے کسی دین کا نام اسلام نہیں رکھا گیا۔ مگر یہ دین جو ہمارے پاک نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دنیا میں آیا اس میں تمام دنیا کی اصلاح منظور تھی اور تمام استعدادوں کے موافق تعلیم دینا مدنظر تھا اس لیے یہ دین تمام دنیا کے دینوں کی نسبت اکمل اور اتم ہوا اور اسی کا نام بالخصوصیت اسلام رکھا گیا اور اسی دین کو خدا نے کامل کہا جیسا کہ قرآن شریف میں ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔[1]

[1] المائدۃ آیت ۴

یعنی آج میں نے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت کو پورا کیا اور میں راضی ہوا جو تمہارا دین اسلام ہو۔ چونکہ پہلے دین کامل نہیں تھے اور اُن قوانین کی طرح تھے جو مختص القوم یا مختص الزمان ہوتے ہیں اس لیے خدا نے اُن دینوں کا نام اسلام نہ رکھا اور ضرور تھا کہ ایسا ہوتا کیونکہ وہ انبیاء تمام قوموں کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ اپنی اپنی قوم کے لیے آئے تھے اور اسی خرابی کی طرف اُن کی توجہ ہوتی تھی جو ان کی قوم میں پھیلی ہوئی ہوتی تھی اور انسانیت کی تمام شاخوں کی اصلاح کرنا اُن کا کام نہیں تھا کیونکہ اُن کے زیر علاج ایک خاص قوم تھی جو خاص آفتوں اور بیماریوں میں مبتلا تھی اور اُن کی استعدادیں بھی ناقص تھیں اسی لیے وہ کتابیں ناقص رہیں کیونکہ تعلیم کی اغراض خاص خاص قوم تک محدود تھی مگر اسلام تمام دنیا اور تمام استعدادوں کے لیے آیا اور قرآن کو تمام دنیا کی کامل اصلاح مدنظر تھی جن میں عوام بھی تھے اور خواص بھی تھے اور حکما اور فلاسفر بھی اس لیے انسانیت کے تمام قویٰ پر قرآن نے بحث کی اور یہ چاہا کہ انسان کی ساری قوتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں فدا ہوں اور یہ اس لیے ہوا کہ قرآن کے مدنظر انسان کی تمام استعدادیں تھیں اور ہر ایک استعداد کی اصلاح منظور تھی اور اسی وجہ سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ٹھہرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر وہ تمام کام پورا ہو گیا جو پہلے اس سے کسی نبی کے ہاتھ پر پورا نہیں ہوا تھا۔ چونکہ قرآن کو تمام نوع انسان کی تمام استعدادوں سے کام پڑتا تھا اور وہ دنیا کی عام اصلاح کے لیے نازل کیا گیا تھا اس لیے تمام اصلاح اس میں رکھی گئی اور اسی لیے قرآنی تعلیم کا دین اسلام کہلایا اور اسلام کا لقب کسی دوسرے دین کو نہ مل سکا کیونکہ وہ تمام ادیان ناقص اور محدود تھے غرض جبکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے تو کوئی عقلمند مسلمان کہلانے سے عار نہیں کر سکتا ہاں اسلام کا دعویٰ اسی قرآنی دین نے کیا ہے اور اسی نے اس عظیم الشان دعویٰ کے دلائل بھی پیش کیے ہیں اور یہ بات کہنی کہ میں مسلمان نہیں ہوں یہ اس قول کے مساوی ہے کہ میرا دین ناقص ہے۔ (ست بچن بار دوم مطبوعہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲۹-۱۳۰)

ایسی کامل کتاب کے بعد کس کتاب کا انتظار کریں جس نے سارا کام انسانی اصلاح کا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پہلی کتابوں کی طرح صرف ایک قوم سے واسطہ نہیں رکھا بلکہ تمام قوموں کی اصلاح چاہی اور انسانی تربیت کے تمام مراتب بیان فرمائے وحشیوں کو انسانیت کے آداب سکھائے پھر انسانی صورت بنانے کے بعد اخلاق فاضلہ کا سبق دیا۔ یہ قرآن نے ہی دنیا پر احسان کیا کہ طبعی حالتوں اور اخلاق فاضلہ میں فرق کر کے دکھلایا اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کے محل عالی تک پہنچایا تو فقط اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اور مرحلہ جو باقی تھا یعنی روحانی حالتوں کا مقام اس تک پہنچنے کے لیے پاک معرفت کے دروازے کھول دئے اور نہ صرف کھول دیئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس تک پہنچا بھی دیا اور اس طرح پر تینوں قسم کی تعلیم جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کمال خوبی سے بیان فرمائی پس چونکہ وہ تمام تعلیموں کا جن پر دینی تربیت کی ضرورتوں کا مدار ہے کامل طور پر جامع ہے اس لیے یہ دعویٰ اس نے کیا کہ میں نے ہی دائرہ دینی تعلیم کو کمال تک پہنچایا جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا یعنی

آج میں نے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا اور میں تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر خوش ہوا یعنی دین کا انتہائی مرتبہ وہ امر ہے جو اسلام کے مفہوم میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ محض خدا کے لیے ہو جانا اور اپنی نجات اپنے وجود کی قربانی سے چاہنا اور طریق سے اور اس نیت اور اس ارادہ کو عملی طور پر دکھلا دینا یہ وہ نقطہ ہے جس پر تمام کمالات ختم ہوتے ہیں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۹-۶۰)

معترض صاحب نے ..... اعتراض کیا ہے کہ جبکہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کر کے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے کیونکہ قرآن کریم نے اس امت میں خلیفوں کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے اور فرمایا ہے کہ اُن کے وقتوں میں دین استحکام پکڑیگا اور تزلزل اور تذبذب دور ہوگا اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا پھر اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے کیونکہ جب دین مکمل ہو چکا تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ لیکن افسوس کہ معترض بے خبر نے ناحق آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کو پیش کر دیا ہم کب کہتے ہیں کہ مجدد اور محدّث دُنیا میں آ کر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے تب اس خوبصورت چہرہ کو دکھلانے کے لیے مجدد اور محدث اور روحانی خلیفے آتے ہیں نہ معلوم کہ بیچارہ معترض نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ مجدّد اور روحانی خلیفے دنیا میں آ کر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں اور معترض کا یہ خیال کہ اُن کی ضرورت ہی کیا ہے صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پروا نہیں اور کبھی اُس نے غور نہیں کی کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور حقیقی ترقی کیونکر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے یہی وجہ ہے کہ معترض صاحب اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن موجود ہے اور علماء موجود ہیں اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے پھر کسی مجدد کی کیا ضرورت ہے لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجددوں اور روحانی خلیفوں کی اس امت میں ایسے ہی طور سے ضرورت ہے جیسا کہ قدیم سے انبیا کی ضرورت پیش آتی رہی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے اور اُن کی توریت بنی اسرائیل کی تعلیم کے لیے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں یہ آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ ہے اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے جس کا نام توریت ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے کہ کوئی نئی کتاب اُن کے ساتھ نہیں تھی بلکہ اُن انبیا کے ظہور کے مطالب یہ ہوتے تھے کہ تا اُن کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ توریت سے دور پڑ گئے ہوں پھر اُن کو توریت کے اصلی منشاء کی طرف کھینچیں اور جن کے دلوں میں

کچھ شکوک اور دہریت اور بے ایمانی ہوگئی ہو اُن کو پھر زندہ ایمان بخشیں چنانچہ اللہ جل شانہ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ[۱] یعنی موسٰی کو ہم نے توریت دی اور پھر اُس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے تا توریت کی تعلیم کی تائید اور تصدیق کریں اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا[۲] یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اُس کی تائید اور تصدیق کے لیے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید کے لیے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائبل شہادت دے رہی ہے۔ (شہادت القرآن ص۴۳-۴۵)

وَاَمَّا ذِكْرُ نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّحْمِلَ هٰذَا الْاِسْمَ الْمَذْكُوْرَ فِي الْاَحَادِيْثِ عَلٰى ظَاهِرِ مَعْنَاهُ لِاَنَّهٗ يُخَالِفُ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[۳] اَلَا تَعْلَمُ اَنَّ الرَّبَّ الرَّحِيْمَ الْمُتَفَضِّلَ سَمّٰى نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْاَنْبِيَآءِ بِغَيْرِ اِسْتِثْنَآءٍ فَفَسَّرَهٗ نَبِيُّنَا فِيْ قَوْلِهٖ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ بِبَيَانٍ وَّاضِحٍ لِّلطَّالِبِيْنَ ۔ وَلَوْ جَوَّزْنَا ظُهُوْرَ نَبِيٍّ بَعْدَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَجَوَّزْنَا انْفِتَاحَ بَابِ وَحْيِ النُّبُوَّةِ بَعْدَ تَغْلِيْقِهَا وَهٰذَا خُلْفٌ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَكَيْفَ يَجِيْءُ نَبِيٌّ بَعْدَ رَسُوْلِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَخَتَمَ اللّٰهُ بِهِ النَّبِيّٖنَ ۔ اَنَعْتَقِدُ بِاَنَّ عِيْسَى الَّذِيْ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْاِنْجِيْلُ هُوَ خَاتَمُ الْاَنْبِيَآءِ لَا رَسُوْلُنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ اَنَعْتَقِدُ اَنَّ ابْنَ مَرْيَمَ يَاْتِيْ فَيَنْسَخُ بَعْضَ اَحْكَامِ الْقُرْاٰنِ وَيَزِيْدُ بَعْضًا فَلَا يَقْبَلُ الْجِزْيَةَ وَلَا يَضَعُ الْحَرْبَ وَقَدْ اَمَرَ اللّٰهُ بِاَخْذِهَا وَاَمَرَ بِوَضْعِ الْحَرْبِ بَعْدَ اَخْذِ الْجِزْيَةِ ۔ اَلَا تَقْرَءُ اٰيَةَ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ[۴] فَكَيْفَ يَنْسَخُ الْمَسِيْحُ

ترجمہ: اور جو عیسٰی بن مریم کے نزول کا ذکر ہے پس کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ احادیث میں اس نام کو ظاہر پر محمول کرے۔ کیوں کہ خدا تعالٰی کے اس قول کے خلاف ہے کہ ہم نے محمدؐ کو کسی مرد کا باپ نہیں بنایا ہاں وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس محسن رب نے ہمارے نبی کا نام خاتم الانبیاء رکھا ہے اور کسی کو مستثنٰی نہیں کیا اور آنحضرتؐ نے طالبوں کے لیے بیان واضح سے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور اگر ہم آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی کا ظہور جائز رکھیں تو لازم آتا ہے کہ وحی نبوت کے دروازہ کا انفتاح بھی بند ہونے کے بعد جائز خیال کریں اور یہ باطل ہے جیسا کہ مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں۔ اور آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی کیونکر آوے حالانکہ آپ کی وفات کے بعد وحی نبوت منقطع ہوگئی ہے اور آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔ کیا ہم اعتقاد کرلیں کہ ہمارے نبی خاتم الانبیاء نہیں بلکہ عیسٰی جو صاحب انجیل ہے وہ خاتم الانبیاء ہے یا ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ابن مریم آکر قرآن کے بعض احکام کو منسوخ اور کچھ زیادہ کرے گا اور نہ جزیہ لے گا اور نہ جنگ چھوڑیگا حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جزیہ لے لو اور جزیہ لینے کے بعد جنگ چھوڑ دو۔ کیا تو آیت نہیں پڑھتا کہ ذلت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ دلویں۔ پس قرآن کے محکمات کو کیونکر مسیح منسوخ کریگا اور کتاب عزیز میں

[۱] البقرہ آیت ۸۸ ۔ [۲] المومنون آیت ۴۵ ۔ [۳] الاحزاب آیت ۴۱ ۔ [۴] التوبہ آیت ۲۹

مُحْكَمَاتِ الْفُرْقَانِ وَكَيْفَ يَتَصَرَّفُ فِي الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ وَيَطْمِسُ بَعْضَ اَحْكَامِهٖ بَعْدَ تَكْمِيْلِهَا فَاَعْجَبَنِيْ اَنَّهُمْ يَجْعَلُوْنَ الْمَسِيْحَ نَاسِخَ بَعْضِ اَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلٰى اٰيَةِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ اَنَّهٗ لَوْ كَانَتْ لِتَكْمِيْلِ دِيْنِ الْاِسْلَامِ حَالَةٌ مُّنْتَظَرَةٌ تُرْجٰى ظُهُوْرُهَا بَعْدَ انْقِضَآءِ اُلُوْفٍ مِّنَ السَّنَوَاتِ لَفَسَدَ مَعْنَى اِكْمَالِ الدِّيْنِ وَالْفَرَاغِ مِنْ كَمَالِهٖ بِاِنْزَالِ الْقُرْاٰنِ وَلَكَانَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ مِنْ نَوْعِ الْكِذْبِ وَخِلَافَ الْوَاقِعَةِ بَلْ كَانَ الْوَاجِبُ فِيْ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ اَنْ يَّقُوْلَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اِنِّيْ مَا اَنْزَلْتُ هٰذَا الْقُرْاٰنَ كَامِلًا عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ سَاُنْزِلُ بَعْضَ اٰيٰتِهٖ عَلٰى عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ فَيَوْمَئِذٍ يَكْمُلُ الْقُرْاٰنُ وَمَا كَمَلَ اِلٰى هٰذَا الْحِيْنِ۔ (حمامۃ البشریٰ ص۲۱ ۱۹۰۰ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں دنیا سے اپنے مولیٰ کی طرف بلائے گئے جبکہ وہ اپنے کام کو پورے طور پر انجام دے چکے اور یہ امر قرآن شریف سے بخوبی ثابت ہے کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ یعنی آج میں نے قرآن کے اتارنے اور تکمیل نفوس سے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کر لیا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ جس قدر قرآن نازل ہونا تھا نازل ہو چکا اور مستعد دلوں میں نہایت عجیب اور حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر چکا اور تربیت کو کمال تک پہنچا دیا اور اپنی نعمت کو ان پر پورا کر دیا۔ اور یہی دو رکن ضروری ہیں جو ایک نبی کے آنے کی علت غائی ہوتے ہیں۔ اب دیکھو یہ آیت کس زور شور سے تبلا رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز اس دنیا سے کوچ نہ کیا جب تک کہ دین اسلام کو تنزیل قرآن اور تکمیل نفوس سے کامل نہ کیا گیا۔[1] اور یہی ایک خاص علامت منجانب اللہ ہونے کی ہے جو کاذب کو ہرگز نہیں دی جاتی

[1] خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں صحابہ کو مخاطب کیا کہ میں نے تمہارے دین کو کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کی اور آیت کو اس طور سے نہ فرمایا کہ اے نبی آج میں نے قرآن کو کامل کر دیا اس میں حکمت یہ ہے کہ تا ظاہر ہو کہ صرف قرآن شریف کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ ان کی تکمیل بھی ہو گئی جن کو قرآن پہنچایا گیا اور رسالت کی علت غائی کمال تک پہنچ گئی منہ

کیونکر تصرف کر کے کچھ احکام کو تکمیل کے بعد مٹا دے گا۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ وہ فرقان کے بعض احکام کا مسیح کو ناسخ بناتے ہیں اور اس آیت کو نہیں دیکھتے کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا ہے اور وہ فکر نہیں کرتے۔ اگر دین اسلام کی تکمیل کے لیے کوئی حالت منتظرہ ہوتی جو کئی ہزار سال گذرنے کے بعد اس کے ظہور کی امید ہو سکتی تو قرآن کے ساتھ اکمال دین ہونا فاسد ہو جاتا اور خدا کا یہ کہنا کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا ہے جھوٹ اور خلاف واقع ہو جاتا بلکہ اس صورت میں تو واجب تھا کہ یوں کہتا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو کامل نہیں اتارا بلکہ آخر زمانہ میں عیسیٰ بن مریم پر اس کی کچھ آیات اتاروں گا پس اس دن قرآن کامل ہو گا اور ابھی کامل نہیں۔ (حمامۃ البشریٰ مترجم ص۶۵ تا ۶۶ مطبوعہ ۱۹۰۰ء)

بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی صادق نبی نے بھی اس اعلیٰ شان کے کمال کا نمونہ نہیں دکھلایا کہ ایک طرف کتاب اللہ بھی آرام اور امن کے ساتھ پوری ہو جائے اور دوسری طرف تکمیل نفوس بھی ہو اور باایں ہمہ کفر کو ہر یک پہلو سے شکست اور اسلام کو ہر یک پہلو سے فتح ہو۔ (نور القرآن ۱ صفحہ ۱۹)

خدا تعالیٰ نے چاہا کہ جیسا کہ اس نے حضور نبوی کی مشابہت حضرت آدم سے مکمل کرنے کے لیے تکمیل ہدایت قرآنی کا چھٹا دن مقرر کیا یعنی روز جمعہ اور اسی دن یہ آیت نازل ہوئی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ایسا ہی تکمیل اشاعت ہدایت کے لیے الف سادس یعنی چھٹا ہزار مقرر فرمایا جو حسب تصریح آیات قرآنی بمنزلہ روز ششم ہے۔

اب میں دوبارہ یاد دلاتا ہوں کہ تکمیل ہدایت کے دن میں تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود تھے اور وہ روز یعنی جمعہ کا دن جو دنوں میں سے چھٹا دن تھا مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کا دن تھا جب آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ نازل ہوئی اور قرآن جو تمام آسمانی کتابوں کا آدم اور جمیع معارف صحف سابقہ کا جامع تھا اور مظہر جمیع صفات الٰہیہ تھا اس نے آدم کی طرح چھٹے دن یعنی جمعہ کے دن اپنے وجود باجود کو اتم اور اکمل طور پر ظاہر فرمایا۔ یہ تو تکمیل ہدایت کا دن تھا مگر تکمیل اشاعت کا دن اس دن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی وہ وسائل پیدا نہیں ہوئے تھے جو تمام دنیا کے تعلقات کو باہم ملا دیتے اور برّی اور بحری سفروں کو مسافروں کے لیے سہل کر دیتے اور دینی کتابوں کی ایک کثیر مقدار قلمبند کرنے کے لیے جو تمام دنیا کے حصہ میں آسکے آلات زود نویسی کے مہیا کر دیتے اور نہ مختلف زبانوں کا علم نوع انسان کو حاصل ہوا تھا اور نہ تمام مذاہب ایک دوسرے کے مقابل پر آشکارا طور پر ایک جگہ موجود تھے اس لیے وہ حقیقی اشاعت جو اتمام حجت کے ساتھ ہر ایک قوم پر ہو سکتی ہے اور ہر ایک ملک تک پہنچ سکتی ہے نہ اس کا وجود تھا اور نہ معمولی اشاعت کے وسائل موجود تھے۔ لہٰذا تکمیل اشاعت کے لیے ایک اور زمانہ علم الٰہی نے مقرر فرمایا جس میں کامل تبلیغ کے لیے کامل وسائل موجود تھے اور ضرور تھا کہ جیسا کہ تکمیل ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہوئی ایسا ہی تکمیل اشاعت ہدایت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہو کیونکہ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبی کام تھے لیکن سنت اللہ کے لحاظ سے اس قدر غلو د آپ کے لیے غیر ممکن تھا کہ آپ اُس آخری زمانہ کو پاتے اور نیز ایسا غلو د شرک کے پھیلنے کا ایک ذریعہ تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خدمت منصبی کو ایک ایسے امتی کے ہاتھ سے پورا کیا کہ جو اپنی خو اور روحانیت کے رو سے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کا ایک ٹکڑا تھا یا یوں کہو کہ وہی تھا اور آسمان پر ظلّی طور پر آپ کے نام کا شریک تھا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۶-۹۹)

قرآن شریف نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انجیل یا توریت سے صلح کریگا بلکہ ان کتابوں کو محرّف مبدل اور ناقص اور ناتمام قرار دیا ہے اور تاج خاص اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا اپنے لیے رکھا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ سب کتابیں انجیل توریت قرآن شریف کے مقابل پر کچھ بھی نہیں اور ناقص اور محرف اور مبدل ہیں اور تمام بھلائی قرآن میں ہے۔ (دافع البلاء صفحہ ۱۹)

یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن شریف نے دین کے کامل کرنے کا حق ادا کر دیا ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور میں اسلام کو تمہارا دین مقرر کر کے خوش ہوا۔ سو قرآن شریف کے بعد کسی کتاب کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ جس قدر انسان کی حاجت تھی وہ سب کچھ قرآن شریف بیان کر چکا اب صرف مکالمات الٰہیہ کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی خود بخود نہیں بلکہ سچے اور پاک مکالمات جو صریح اور کھلے طور پر نصرت الٰہی کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اور بہت سے امور غیبیہ پر مشتمل ہوتے ہیں وہ بعد تزکیہ نفس محض پیروی قرآن شریف اور اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتے ہیں۔ (چشمہ معرفت صـ۳۲)

یہ بات ہر ایک عقل سلیم قبول کرے گی کہ کمال اصلاح کی نوبت کمال فساد کے بعد آتی ہے طبیب کا یہ کام نہیں کہ وہ چنگے بھلے لوگوں کو وہ دوائیں دے جو عین بیماری کے غلبہ کے وقت دینی چاہئیں اس لیے قرآن شریف نے پہلے یہ بیان کر دیا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[1] یعنی تمام دنیا میں فساد پھیل گیا اور ہر ایک قسم کے گناہ اور معاصی کا طوفان برپا ہو گیا اور پھر ہر ایک بدعقیدگی اور بدعملی کے بارے میں مکمل ہدایتیں پیش کر کے فرمایا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ یعنی آج میں نے تمہارا دین کامل مکمل کر دیا مگر کسی پہلے زمانہ میں جس میں ابھی طوفان ضلالت بھی جوش میں نہیں آیا تھا مکمل کتاب کیونکر انسانوں کو مل سکتی ہے۔ (چشمہ معرفت صـ۱۳۹۔۱۴۰)

یاد رہے کہ کسی مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یعنی اس بات کے ثبوت کے لیے کہ وہ مذہب منجانب اللہ ہے دو قسم کی فتح کا اُس میں پایا جانا ضروری ہے۔ اول یہ کہ وہ مذہب اپنے عقاید اور اپنی تعلیم اور اپنے احکام کی رو سے ایسا جامع اور اکمل اور اتم اور نقص سے دور ہو کہ اس سے بڑھ کر عقل تجویز نہ کر سکے اور کوئی نقص اور کمی اُس میں دکھلائی نہ دے اور اس کمال میں وہ ہر ایک مذہب کو فتح کرنے والا ہو یعنی ان خوبیوں میں کوئی مذہب اس کے برابر نہ ہو۔ جیسا کہ یہ دعوے قرآن شریف نے آپ کیا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا یعنی آج میں نے تمہارے لیے اپنا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کیا اور میں نے پسند کیا کہ اسلام تمہارا مذہب ہو یعنی وہ حقیقت جو اسلام کے لفظ میں پائی جاتی ہے جس کی تشریح خود خدا تعالیٰ نے اسلام کے لفظ کے بارہ میں بیان کی ہے اس حقیقت پر تم قائم ہو جاؤ۔ اس آیت میں صریح یہ بیان ہے کہ قرآن شریف نے ہی کامل تعلیم عطا کی ہے اور قرآن شریف کا ہی ایسا زمانہ تھا جس میں کامل تعلیم عطا کی جاتی۔ پس یہ دعویٰ کامل تعلیم کا جو قرآن شریف نے کیا یہ اسی کا حق تھا اس کے سوا کسی آسمانی کتاب نے ایسا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ دیکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ توریت اور انجیل دونوں اس دعوی سے دست بردار ہیں۔ کیونکہ توریت میں خدا تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ میں تمہارے بھائیوں میں سے ایک نبی قائم کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو شخص اُس کے کلام کو نہ سنے گا میں اُس سے مطالبہ کروں گا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر آیندہ زمانہ کی ضرورتوں کی رو سے توریت کا سننا

[1] الروم آیت ۴۲

کافی ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ کوئی اور نبی آتا اور مواخذہ الٰہیہ سے مخلصی پانا اُس کلام کے سُننے پر موقوف ہوتا جو اس پر نازل ہوتا۔ ایسا ہی انجیل نے کسی مقام میں دعویٰ نہیں کیا کہ انجیل کی تعلیم کامل اور جامع ہے بلکہ صاف اور کھلا کھلا اقرار کیا ہے کہ اور بہت سی باتیں قابل بیان تھیں مگر تم برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب فارقلیط آئے گا تو وہ سب کچھ بیان کرے گا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی توریت کو ناقص تسلیم کر کے آنے والے نبی کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ایسا ہی حضرت عیسیٰ نے بھی اپنی تعلیم کا نامکمل ہونا قبول کر کے یہ عذر پیش کر دیا کہ ابھی کامل تعلیم بیان کرنے کا وقت نہیں ہے لیکن جب فارقلیط آئے گا تو وہ کامل تعلیم بیان کر دیگا مگر قرآن شریف نے توریت اور انجیل کی طرح کسی دوسرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اپنی کامل تعلیم کا تمام دنیا میں اعلان کر دیا اور فرمایا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اس سے ظاہر ہے کہ کامل تعلیم کا دعویٰ کرنے والا صرف قرآن شریف ہی ہے اور ہم اپنے موقعہ پر بیان کریں گے کہ جیسا کہ قرآن شریف نے دعویٰ کیا ہے ویسا ہی اُس نے اس دعوے کو پورا کر کے دکھلا بھی دیا ہے اور اس نے ایک ایسی کامل تعلیم پیش کی ہے جس کو نہ توریت پیش کر سکی اور نہ انجیل بیان کر سکی پس اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ وہ تعلیم کی رُو سے ہر ایک مذہب کو فتح کرنے والا ہے اور کامل تعلیم کے لحاظ سے کوئی مذہب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(دیباچہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴)

ختم نبوت کے متعلق میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ خاتم النبیین کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے امور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ تو موٹے اور ظاہر معنی ہیں دوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالات نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا۔ اور نبوت ختم ہو گئی اس لیے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا مصداق اسلام ہو گیا۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ رجنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸-۹)

حضرت ابو بکرؓ ہی کو قرآن شریف کا یہ فہم ملا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ پڑھی تو حضرت ابو بکرؓ رو پڑے کسی نے پوچھا کہ یہ بڈھا کیوں روتا ہے تو آپ نے کہا کہ مجھے اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بو آتی ہے انبیاء علیہم السلام بطور حکام کے ہوتے ہیں جیسے بندوبست کا ملازم جب اپنا کام کر چکتا ہے تو وہاں سے چل دیتا ہے اسی طرح پر انبیاء علیہم السلام جس کام کے واسطے دنیا میں آتے ہیں جب اس کو کر لیتے ہیں تو پھر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں پس جب اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی صدا پہنچی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ یہ آخری صدا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کا فہم بہت بڑھا ہوا تھا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور کامیاب زندگی کی تصویر یہ ہے کہ آپ ایک کام کے لیے آئے اور اسے پورا کر کے اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے جس طرح بندوبست والے پورے کاغذات پانچ برس میں مرتب کر کے آخری رپورٹ کرتے ہیں

اور پھر چلے جاتے ہیں اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے اس دن سے لے کر جب قُمْ فَأَنْذِرْ کی آواز آئی پھر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ[1] اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے دن تک نظر کریں تو آپ کی لانظیر کامیابی کا پتہ چلتا ہے ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص طور پر مامور تھے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا پکا کام ہے اُس وقت سے جب سے کہا کہ میں ایک کام کرنے کے لیے آیا ہوں جب تک یہ نہ سُن لیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ آپ دنیا سے نہ اُٹھے۔

(الحکم جلد ۶ ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

آپ کی صدق نبوت پر آپ کی زندگی سب سے بڑا نشان ہے کوئی ہے جو اس پر نظر کرے! آپ کو دنیا میں ایسے وقت پر بھیجا کہ دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اُس وقت تک زندہ رکھا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کی آواز آپ کو نہ آ گئی اور فوجوں کی فوجیں اسلام میں داخل ہوتی ہوئیں آپ نے نہ دیکھ لیں۔ غرض اسی قسم کی بہت سی وجوہ ہیں جن سے آپ کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ (الحکم جلد ۵ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

میں ان مخالفوں سے جو بڑے بڑے مشائخ اور گدّی نشین اور صاحب سلسلہ ہیں پوچھتا ہوں کہ کیا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے وِرد و وظائف اور چلہ کشیاں اُلٹے سیدھے لٹکنا بھول گئے تھے اگر معرفت اور حقیقت شناسی کا یہی ذریعہ اصل تھے۔ مجھے بہت ہی تعجب آتا ہے کہ ایک طرف قرآن شریف میں یہ پڑھتے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور دوسری طرف اپنی ایجادوں اور بدعتوں سے اس تکمیل کو توڑ کر ناقص ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

جس شخص کو خدا تعالیٰ سے تعلقات قوی اور شدید ہوتے ہیں اور فنا فی اللہ کے درجہ پر ہوتا ہے تو اس سے بسا اوقات خارق عادت معجزات صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایک قسم کی اقتداری قوت کا نمونہ رکھتے ہیں لوگ اپنی غلط فہمی اور کمزوری سے یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ خدا ہو۔ شہودی حالت میں اکثر امور اُن کی مرضی کے موافق ہو جاتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعلوں کو خدا تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا ہے اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ[2] کی صدا آپ کو آ گئی۔ (الحکم جلد ۶ ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

مباحثہ میں بھی اصول رکھا جاوے کہ قرآن شریف مقدم ہے یہ منوا کر اُن سے کہا جاوے کہ تقدم قرآن تو اب مقبولہ فریقین ہے باقی امور اسی سے فیصلہ کر لو۔ اگر حدیثوں پر سارا مدار ہے تو قرآن کی کیا ضرورت ہے جو کہتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔

(البدر جلد ۱ ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۸)

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنے اقبال کے ساتھ تمام مذاہب کو اپنے پیروں میں لے لیا ہوا ہے۔ اسلام ایسے ملک سے شروع ہوا جہاں لوگ درندوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور طرح طرح کی بداعمالیوں میں مبتلا تھے ان کو حیوانیت سے انسانیت میں اسلام ہی لایا۔ ہر طرف اس کی مخالفت ہوئی لوگوں نے دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا پھر بھی وہ تمام کام پورے ہو کر رہے

[1] سورۃ النصر آیت ۲
[2] سورۃ النصر آیت ۲

جو کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمائے تھے اور کوئی فردِ بشر بھی اس کا بال نہ بگاڑ سکا حتیٰ کہ ندا آ گئی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (البدر جلد ۲ ۱۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۲)

ہم اعجازی احیاء کے قائل ہیں مگر یہ بات بالکل ٹھیک نہیں ہے کہ ایک مردہ اس طرح زندہ ہوا ہو کہ وہ پھر اپنے گھر میں آیا اور رہا اور ایک عمر اُس نے بسر کی اگر ایسا ہوتا تو قرآن ناقص ٹھہرتا ہے کہ اُس نے ایسے شخص کی وراثت کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کیا ہوا۔ (البدر جلد ۲ ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے، کیا ان کی نسبت اہل الرائے کی یہ رائے تھی کون تھا جو یقین کرتا کہ ایک غریب (آنحضرت صلعم) کے پاس نہ قوت نہ شوکت نہ فوج نہ مال ہے اور ہر طرف مخالفت ہے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور جو وعدے فتح اور نصرت اور اقبال مندی کے وہ دیتا ہے پورے ہو کر رہیں گے مگر باوجود اس ناامیدی کے پھر کسی امید بندھ گئی اور تمام وعدے پورے ہو گئے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی گواہی مل گئی۔ (البدر جلد ۳ ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

صحابہ کرام سارے ہی باخدا اور عاقل تھے مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن سے بڑھ کر ایسے وفادار تھے کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے آپ کو سانپوں اور درندوں اور خار دار کانٹوں والا جنگل اُس کے درندے حیوانات انسانی شکل میں دکھلائے گئے پھر ملک بھی ایسا اُس کے سپرد کیا کہ جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شریر النفس نہ تھا۔ پھر آپ ایسے وقت پر کہ تمام مردہ اور فساد کی جڑ تھے جیسے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ[1] اور گئے ایسے وقت پر کہ فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ الآیۃ۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ[2] الآیۃ۔ اس کو معجزہ کہتے ہیں۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی محبت الٰہی اور قوت جاذبہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر تھی۔ (الحکم جلد ۸ ۳۸-۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

اسلام کے ثمرات اب بھی ایسے ہی ہیں اگر کوئی ان پھلوں کو نہیں کھاتا تو اسلام کا کیا قصور۔ طبیب اگر ایک نسخہ بتا دے اور کوئی اسے استعمال نہ کرے تو اس میں طبیب کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اسلام میں یہ ایسی نعمت ہے جو کسی اور دین میں نہیں مل سکتی اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ لیکن یہ نعمت نہیں مل سکتی جب تک اس طرف قدم نہ اٹھاوے اور افسوس کہ ہمارے مخالف اس نعمت کی طرف متوجہ نہیں۔

(الحکم جلد ۹ ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

اگر دن تھوڑے بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں بسر ہوں تو غنیمت ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس ملک میں رہے تھے وہاں کی زندگی صرف ساڑھے تین سال کی ہی رسالت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ رسالت ۲۳ سال تھا مگر میں جانتا ہوں کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ امور رسالت میں یہ کامیابی اور سعادت کسی اور کو نہیں ملی۔ آپ کی آمد کا وہ وقت تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے خود ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ[1] سے بیان کیا ہے یعنی نہ خشکی میں امن تھا نہ تری میں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب بگڑ چکے تھے اور قسم قسم کے فساد

---

[1] الروم آیت ۴۲ ✦ [2] النصر آیت ۲۔

اور خرابیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں گویا زمانہ کی حالت بالطبع تقاضا کرتی تھی کہ اس وقت ایک زبردست ہادی اور مصلح پیدا ہو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ اور پھر آپ ایسے وقت دنیا سے رخصت ہوئے جب آپ کو یہ آواز آگئی۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یہ آواز کسی اور نبی اور رسول کو نہیں آئی کہتے ہیں جب یہ آیت اُتری اور پڑھی گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کو سن کر رو پڑے۔ ایک صحابی نے کہا کہ اے بڈھے آدمی تجھے کیا ہو گیا آج تو خوشی کا دن ہے تو کیوں رو پڑا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ تو نہیں جانتا۔ مجھے اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بُو آتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی فراست بہت تیز تھی انہوں نے سمجھ لیا کہ جب کام ہو چکا تو پھر یہاں کیا کام۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی بندوبست کا افسر کسی ضلع کا بندوبست کرنے کو بھیجا جاتا ہے وہ اس وقت تک وہاں رہتا ہے جب تک وہ کام ختم نہ ہو لے جب کام ختم ہو جاتا ہے تو پھر کسی اور جگہ بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح پر مرسلین کے متعلق بھی یہی سنّت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ امر دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا ابوبکر سچ کہتا ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر میں کسی کو دنیا میں دوست رکھتا تو ابوبکرؓ کو۔ (الحکم جلد ۹ ۴۳ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت ایسی واضح اور روشن ہے کہ کسی دوسرے نبی کا زمانہ ایسی نظیر نہیں رکھتا۔ اب دوسرا حصہ دیکھو کہ آپ فوت نہیں ہوئے جب تک اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی آواز نہیں سُن لی اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا نظارہ آپ نے نہیں دیکھ لیا۔ یہ آیت نہ توریت میں ہے، نہ انجیل میں۔ توریت کا تو یہ حال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام راستہ ہی میں فوت ہو گئے اور قوم کو وعدہ کی سرزمین میں داخل نہ کر سکے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ بہت ہی باتیں بیان کرنے کی تھیں کیا قرآن شریف میں بھی ایسا لکھا ہے؟ وہاں تو اَکْمَلْتُ لَکُمْ ہے۔ رہی ان کی تکمیل۔ صحابہ کی جو تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نسبت فرماتا ہے مِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ الآیۃ اور پھر ان کی نسبت رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ فرمایا۔ لیکن انجیل میں مسیح کے حواریوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ جابجا ان کو لالچی اور کم ایمان کہا گیا ہے اور عملی رنگ ان کا یہ ہے کہ ان میں سے ایک نے تیس روپیہ لیکر پکڑوا دیا اور پھر اس نے سامنے لعنت کی۔ انصاف کر کے کہو کہ یہ کیسی تکمیل ہے۔ اس کے بالمقابل قرآن شریف صحابہ کی تعریف سے بھرا پڑا ہے۔ اور ان کی ایسی تکمیل ہوئی کہ دوسری کوئی قوم ان کی نظیر نہیں رکھتی۔ پھر ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جزا بھی بڑی دی یہاں تک کہ اگر باہم کوئی رنجش بھی ہو گئی تو اس کے لیے فرمایا وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ الآیۃ۔ حضرت عیسیٰ نے بھی حواریوں کو تختوں کا وعدہ دیا تھا مگر وہ ٹوٹ گیا کیونکہ بارہ تختوں کا وعدہ تھا۔ مگر یہودا اسکریوطی کا ٹوٹ گیا جب وہ قائم نہ رہا تو اوروں کا کیا بھروسہ کریں۔ مگر صحابہ کے تخت قائم رہے دنیا میں بھی رہے اور آخرت میں بھی۔ غرض یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ مسلمانوں کے لیے کیسے فخر کی بات ہے۔ ...... اکمال سے یہی مطلب نہیں کہ سورتیں اتار دیں بلکہ تکمیل نفس اور تطہیر قلب کی وحشیوں سے انسان پھر اس کے بعد عقل مند اور با اخلاق انسان اور پھر باخدا انسان بنا دیا۔ اور تطہیر نفس تکمیل اور تہذیب نفس کے مدارج

---

۱ النصر آیت ۲ و ۳ ۔ ۲ الاحزاب آیت ۲۴ ۔ ۳ التوبہ آیت ۱۰۰ ۔ ۴ الاعراف آیت ۴۴

مے کرا دئے اور اسی طرح پر کتاب اللہ کو بھی پورا اور کامل کر دیا یہاں تک کہ کوئی سچائی اور صداقت نہیں جو قرآن شریف میں نہ ہو۔ میں نے اگنی ہوتری کو بارہا کہا کہ کوئی ایسی سچائی بتاؤ جو قرآن شریف میں نہ ہو مگر وہ نہ بتا سکا۔ ایسا ہی ایک زمانہ مجھ پر گذرا ہے کہ میں نے بائبل کو سامنے رکھ کر دیکھا جن باتوں پر عیسائی ناز کرتے ہیں وہ تمام سچائیاں مستقل طور پر اور نہایت ہی اکمل طور پر قرآن مجید میں موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ نہیں وہ قرآن شریف پر تدبر ہی نہیں کرتے اور نہ ان کے دل میں کچھ عظمت ہے ورنہ یہ تو ایسا فخر کا مقام ہے کہ اس کی نظیر دوسروں میں ہے ہی نہیں۔

غرض اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کی آیت دو پہلو رکھتی ہے ایک یہ کہ تمہاری تطہیر کر چکا دوئم کتاب مکمل کر چکا کہتے ہیں جب یہ آیت اُتری وہ جمعہ کا دن تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی یہودی نے کہا کہ اس آیت کے نزول کے دن عید کر لیتے حضرت عمر نے کہا کہ جمعہ عید ہی ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس عید سے بے خبر ہیں دوسری عیدوں کو کپڑے بدلتے ہیں لیکن اس عید کی پروا نہیں کرتے اور میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ آتے ہیں میرے نزدیک یہ عید دوسری عیدوں سے افضل ہے اسی عید کے لیے سورۃ جمعہ ہے اور اسی کے لیے قصر نماز ہے اور جمعہ وہ ہے جس میں عصر کے وقت آدم پیدا ہوئے اور یہ عید اس زمانہ پر بھی دلالت کرتی ہے کہ پہلا انسان اس عید کو پیدا ہوا۔ قرآن شریف کا خاتمہ اسی پر ہوا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۶ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴-۵)

شریعت وہی ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے اور جو قرآن شریف نے دنیا کو سکھلائی۔ ایک نقطہ نہ گھٹایا گیا نہ بڑھایا گیا ہے۔ خدا جس طرح پہلے دیکھتا تھا اب بھی دیکھتا ہے اسی طرح جس طرح پہلے کلام کرتا تھا اسی طرح اب بھی صفت تکلم اس میں موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب خدا کلام نہیں کرتا۔ کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ پہلے تو خدا سنتا تھا۔ مگر اب نہیں سنتا۔ پس اللہ تعالیٰ کے تمام صفات جو پہلے موجود تھے اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ خدا میں تغیر نہیں۔ شریعت چونکہ تکمیل پا چکی ہے۔ لہٰذا اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پس اکمال دین کے بعد اور کسی نئی شریعت کی حاجت نہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۵ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

اگر یہ لوگ پوچھیں کہ پھر کھائیں کیا تو جواب یہ دے کہ دنیا کی تمام پاک چیزیں کھاؤ صرف مردار اور مردار کے مشابہ اور پلید چیزیں مت کھاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۶)

اصل اشیاء میں حلت ہے حرمت جب تک نص قطعی سے ثابت نہ ہو تب تک نہیں ہوتی۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۹)

۲: اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۠ ○

(طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ) تمدن کے طور پر ہندوؤں کی چیز بھی کھا لیتے ہیں اسی طرح عیسائیوں کا کھانا بھی درست ہے مگر با ایں ہمہ یہ خیال ضروری ہے کہ برتن پاک ہوں کوئی ناپاک چیز نہ ہو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

چونکہ نصاریٰ اس وقت ایک ایسی قوم ہوگئی ہے جس نے دین کی حدود اور اس کے حلال وحرام کی کوئی پروا نہیں رکھی اور کثرت سے سور کا گوشت ان میں استعمال ہوتا ہے اور جو ذبح کرتے ہیں اُس پر بھی خدا کا نام ہرگز نہیں لیتے بلکہ جھٹکے کی طرح جانوروں کے سر جیسا کہ سنا گیا ہے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اس لیے شبہ پڑ سکتا ہے کہ بسکٹ اور دودھ وغیرہ جو ان کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہوں اُن میں سور کی چربی اور سور کے دودھ کی آمیزش ہو اس لیے ہمارے نزدیک ولایتی بسکٹ اور اس قسم کے دودھ اور شوربے وغیرہ استعمال کرنے بالکل خلاف تقویٰ اور ناجائز ہیں جس حالت میں کہ سور کے پالنے اور کھانے کا عام رواج ان لوگوں میں ولایت میں ہے تو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری اشیائے خوردنی جو کہ یہ لوگ طیار کر کے ارسال کرتے ہیں اُن میں کوئی نہ کوئی حصہ اُس کا نہ ہوتا ہو...... ہمارے نزدیک نصاریٰ

کا وہ طعام حلال ہے جس میں شبہ نہ ہو اور ازرُوے قرآن مجید کے وہ حرام نہ ہو ورنہ اس کے یہی معنے ہونگے کہ بعض اشیاء کو حرام جان کر گھر میں تو نہ کھایا مگر باہر نصاریٰ کے ہاتھ سے کھا لیا اور نصاریٰ پر ہی کیا منحصر ہے اگر ایک مسلمان بھی مشکوک الحال ہو تو اُس کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے مثلاً ایک مسلمان دیوانہ ہے اور اُسے حرام و حلال کی خبر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اُس کے طعام یا طیار کردہ چیزوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہم گھر میں ولایتی بسکٹ نہیں استعمال کرنے دیتے بلکہ ہندوستان کی ہندو کمپنی کے منگوایا کرتے ہیں۔

عیسائیوں کی نسبت ہندوؤں کی حالت اضطراری ہے کیونکہ یہ کثرت سے ہم لوگوں میں مل جُل گئے ہیں اور ہر جگہ انہیں کی دوکانیں ہوتی ہیں اگر مسلمانوں کی دوکانیں موجود ہوں اور سب شے وہاں ہی سے مل جاوے تو پھر البتہ ان سے خوردنی اشیاء نہ خریدنی چاہئیں۔

علاوہ ازیں میرے نزدیک اہل کتاب سے غالباً مراد یہودی ہی ہیں کیونکہ وہ کثرت سے اُس وقت عرب میں آباد تھے اور قرآن شریف میں بار بار خطاب بھی انہیں کو ہے اور صرف توریت ہی کتاب اُس وقت تھی جو کہ حلت اور حرمت کے مسئلے بیان کر سکتی تھی اور یہود کا اُس پر اس امر میں جیسے عمل درآمد اُس وقت تھا ویسے ہی اب بھی ہے۔ انجیل کوئی کتاب نہیں ہے۔ (البدر جلد ۳ ۲۷ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

(وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ ...... وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ) پاک دامن عورتیں تم ہیں سے یا پہلے اہل کتاب میں سے تمہارے لیے حلال ہیں کہ ان سے شادی کرو لیکن جب مہر قرار پاکر نکاح ہو جائے بدکاری جائز نہیں اور نہ چھپا ہوا یارانہ۔ عرب کے جاہلوں میں جس شخص کے اولاد نہ ہوتی تھی بعض میں یہ رسم تھی کہ ان کی بیوی اولاد کے لیے دوسرے سے آشنائی کرتی۔ قرآن شریف نے اس صورت کو حرام کر دیا۔ مسافحت اسی بد رسم کا نام ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۶)

قرآن نے تو یہ تعلیم دی ہے کہ پرہیزگار رہنے کی غرض سے نکاح کرو اور اولاد صالح طلب کرنے کے لیے دعا کرو جیسا کہ وہ اپنی پاک کلام میں فرماتا ہے مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ الجزو نمبر ۵۔ یعنی چاہیئے کہ تمہارا نکاح اس نیّت سے ہو کہ تا تم تقویٰ اور پرہیزگاری کے قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حیوانات کی طرح محض نطفہ نکالنا ہی تمہارا مطلب ہو۔ اور محصنین کے لفظ سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو شادی نہیں کرتا وہ نہ صرف روحانی آفات میں گرتا ہے بلکہ جسمانی آفات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے سو قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے تین فائدے ہیں ایک عفت اور پرہیزگاری۔ دوسری حفظ صحت۔ تیسری اولاد۔ (آریہ دھرم صفحہ ۱۹)

واضح ہو کہ احصان کا لفظ حصن سے مشتق ہے اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں اور نکاح کرنے کا نام احصان اس واسطے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے انسان عفت کے قلعہ میں داخل ہو جاتا ہے اور بدکاری اور بدنظری سے بچ سکتا ہے اور نیز اولاد ہو کر خاندان بھی ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے اور جسم بھی بے اعتدالی سے بچا رہتا ہے پس گویا نکاح ہر یک پہلو سے قلعہ کا حکم

رکھتا ہے۔ (آریہ دھرم صفحہ ۱۹ حاشیہ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

نماز کا پڑھنا اور وضو کا کرنا طبّی فوائد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اطبّا کہتے ہیں کہ اگر کوئی ہر روز منہ نہ دھوئے تو آنکھ آجاتی ہے اور یہ نزول الماء کا مقدمہ ہے۔ اور بہت سی بیماریاں اس سے پیدا ہوتی ہیں پھر بتلاؤ کہ وضو کرتے ہوئے کیوں موت آتی ہے۔ بظاہر کیسی عمدہ بات ہے منہ میں پانی ڈال کر کلی کرنا ہوتا ہے مسواک کرنے سے منہ کی بدبو دور ہوتی ہے دانت مضبوط ہو جاتے ہیں اور دانتوں کی مضبوطی غذا کے عمدہ طور پر چبانے اور جلد ہضم ہو جانے کا باعث ہوتی ہے پھر ناک صاف کرنا ہوتا ہے ناک میں کوئی بدبو داخل ہو تو دماغ کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ اب بتلاؤ اس میں برائی کیا ہے اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجات لے جاتا ہے اور اس کو اپنے مطالب عرض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دعا کرنے کے لیے فرصت ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى...... فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ اگر تم مریض ہو یا سفر پر یا پاخانہ سے آؤ یا عورتوں سے مباشرت کرو اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمم کرلو۔ (شہادت القرآن صفحہ ۳۶)

(وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا) جنابت کی حالت میں غسل کرلیا کرو۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۲۷)

۹۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ٘ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا١ؕ اِعْدِلُوْا١۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى٘ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝۹

حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ اور چاہیئے کہ ہر ایک گواہی تمہاری خدا کے لیے ہو...... اور چاہیئے کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں سچی گواہی سے نہ روکے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۳)

خداتعالیٰ نے عدل کے بارے میں جو بغیر سچائی پر پورا قدم مارنے کے حاصل نہیں ہو سکتی فرمایا ہے لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یعنی دشمن قوموں کی دشمنی تمہیں انصاف سے مانع نہ ہو انصاف پر قائم رہو کہ تقویٰ اسی میں ہے اب آپ کو معلوم ہے کہ جو قومیں ناحق ستاویں اور دکھ دیویں اور خون ریزیاں کریں اور تعاقب کریں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کریں جیسا کہ مکہ والے کافروں نے کیا تھا اور پھر لڑائیوں سے باز نہ آویں ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کے ساتھ برتاؤ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے مگر قرآنی تعلیم نے ایسے جانی دشمنوں کے حقوق کو بھی ضائع نہیں کیا اور انصاف اور راستی کے لیے وصیت کی...... میں سچ سچ کہتا ہوں کہ دشمن سے مدارات سے پیش آنا آسان ہے مگر دشمن کے حقوق کی حفاظت کرنا اور مقدمات میں عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ دینا یہ بہت مشکل اور فقط جوانمردوں کا کام ہے۔ اکثر لوگ اپنے شریک دشمنوں سے محبت تو کرتے ہیں اور میٹھی میٹھی باتوں سے پیش آتے ہیں مگر ان کے حقوق دبا لیتے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی سے محبت کرتا ہے اور محبت کے پردہ میں دھوکا دیکر اُس کے حقوق دبا لیتا ہے مثلاً اگر زمیندار ہے تو چالاکی سے اس کا نام کاغذات بند وبست میں نہیں لکھواتا اور یوں اتنی محبت کہ اس پر قربان ہوا جاتا ہے پس خداتعالیٰ نے اس آیت میں محبت کا ذکر نہ کیا بلکہ معیار محبت کا ذکر کیا کیونکہ جو شخص اپنے جانی دشمن سے عدل کرے گا اور سچائی اور انصاف سے درگذر نہیں کرے گا وہی ہے جو سچی محبت بھی کرتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۲۱-۲۲)

نیکی کی جڑ یہی ہے۔ کہ دنیا کی لذات اور شہوات جو کہ جائز ہیں ان کو بھی حد اعتدال سے زیادہ نہ لیوے جب کہ کھانا پینا اللہ تعالیٰ نے حرام تو نہیں کیا۔ مگر اب اسی کھانے پینے کو ایک شخص نے رات دن کا شغل بنا لیا ہے اس کا نام دین پر بڑھانا ہے۔ ورنہ یہ لذات دنیا کی اس واسطے ہیں کہ اس کے ذریعہ نفس کا گھوڑا جو کہ دنیا کی راہ میں ہے کمزور نہ ہو۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ یکہ والے جب لمبا سفر کرتے ہیں۔ تو سات یا آٹھ کوس کے بعد وہ گھوڑے کی کمزوری کو محسوس کر کے اسے دم دے دیتے ہیں۔ اور نہاری وغیرہ کھلاتے ہیں۔ تاکہ اس کا پچھلا تکان رفع ہو جاوے تو انبیاء نے جو حظ دنیا کا لیا ہے وہ اسی

طرح ہے کیونکہ ایک بڑا کام دنیا کے اصلاح کا ان کے سپرد تھا۔ اگر خدا کا فضل ان کی دستگیری نہ کرتا تو ہلاک ہو جاتے۔ اسی واسطے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی وقت (حضرت) عائشہ کے زانو پر ہاتھ مار کر فرماتے کہ اے عائشہ راحت پہونچا۔ مگر انبیا کا یہ دستور نہ تھا۔ کہ اس میں ہی منہمک ہو جاتے۔ انہماک بیشک ایک زہر ہے۔ ایک بد معاش آدمی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کھاتا ہے اسی طرح اگر ایک صالح بھی کرے تو خدا کی راہیں اس پر نہیں کھلتی جو خدا کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ خدا کو ضرور اس کا پاس ہوتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى تنعم اور کھانے پینے میں بھی اعتدال کرنے کا نام تقویٰ ہے صرف یہی گناہ نہیں ہے کہ انسان زنا نہ کرے۔ چوری نہ کرے بلکہ جائز امور میں بھی حد اعتدال سے نہ بڑھے۔ (البدر جلد ۲ ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۶)

۱۵ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

اَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی ہم نے یہود اور نصاریٰ میں قیامت کے دن تک عداوت اور بغض ڈال دیا ہے اس آیت سے بھی صاف طور پر ثابت ہے کہ یہودی قیامت کے دن تک رہیں گے کیونکہ اگر وہ پہلے ہی حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سلسلہ عداوت اور بغض کا قیامت تک کیوں کر ممتد ہوگا لہٰذا ماننا پڑا کہ ایسا خیال کہ حضرت مسیح کے نزول کی یہ علامت ہے کہ تمام اہل کتاب اس پر ایمان لے آئیں گے صریح نص قرآن اور حدیث سے مخالف ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۳۸-۴۳۹)

وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ يَخْرُجُوْنَ فِىْ زَمَنِ الْمَسِيْحِ وَيَنْسِلُوْنَ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ وَّيَمْلِكُوْنَ الْاَرْضَ كُلَّهَا كَمَا وَرَدَ فِى الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ فَهٰذَا الْحَقُّ لَا نُجَادِلُهُمْ فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْمَسِيْحَ لَا يُحَارِبُهُمْ بَلْ يَدْعُوْا عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْنَ كُلُّهُمْ بِدُعَآئِهٖ بِدُوْدٍ تَتَوَلَّدُ فِىْ رِقَابِهِمْ وَهٰذَا اَيْضًا

ترجمہ: اور جو کہتے ہیں کہ مسیح کے زمانہ میں یاجوج و ماجوج نکلیں گے اور ہر ایک بلندی سے اُتریں گے اور تمام زمین کے مالک ہو جائیں گے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ پس یہ حق ہے ہم اس میں ان کی مخالفت نہیں کرتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ مسیح ان سے لڑیگا نہیں بلکہ ان پر بد دعا کرے گا اور اس سے ان کے گلے میں کیڑا پیدا ہوگا جس سے وہ سب

حَقٌّ وَلَيْسَ عِنْدَنَا إِلَّا التَّسْلِيْمُ۔ وَلٰكِنَّهُمْ أَخْطَأُوْا فِيْمَا قَالُوْا إِنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ يَمُوْتُوْنَ فِيْ زَمَنِ عِيْسٰى كُلُّهُمْ
...... وَقَدْ أَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْ وُجُوْدِ النَّصَارٰى وَالْيَهُوْدِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَقَالَ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَآءَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَكَيْفَ يَمُوْتُوْنَ كُلُّهُمْ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَوْ أَرَدْنَا مِنَ الْإِمَاتَةِ الْإِمَاتَةَ
الْجِسْمَانِيَّةَ لَخَالَفَ الْحَدِيْثُ الْقُرْاٰنَ وَعَارَضَهٗ فَإِنَّ الْقُرْاٰنَ يُخْبِرُنَا عَنْ بَقَآءِهِمْ وَبَقَآءِ نَسْلِهِمْ إِلٰى
يَوْمِ الْقِيَامَةِ بَلْ يُشِيْرُ إِلٰى أَنَّ السَّمٰوٰتِ يَتَفَطَّرْنَ عَلَيْهِمْ وَتَقُوْمُ الْقِيَامَةُ عَلٰى أَشْرَارِهِمُ الْبَاقِيْنَ۔

(حمامۃ البشریٰ ص۲۸)

فَإِنَّ الْقُرْاٰنَ يُعَلِّمُ بِتَعْلِيْمٍ وَّاضِحٍ وَّيَشْهَدُ بِصَوْتٍ عَالٍ عَلٰى أَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى يَبْقُوْنَ إِلٰى
يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَمَا قَالَ عَزَّ وَجَلَّ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَعْلُوْمٌ
أَنَّ وُجُوْدَ الْعَدَاوَاتِ وَالْبَغْضَآءِ فَرْعٌ لِّوُجُوْدِ الْمُعَانِدِيْنَ وَالْمُبَاغِضِيْنَ وَلَا يَتَحَقَّقُ إِلَّا بَعْدَ وُجُوْدِهِمْ
وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ وَقُلْنَا غَيْرَ مَرَّةٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ أَوْ يَكُوْنُوْنَ مِنَ الْخَآئِفِيْنَ۔
فَكَيْفَ نُؤْمِنُ بِأَنَّ أَهْلَ الْمِلَلِ كُلِّهَا تَهْلِكُ فِيْ وَقْتٍ مِّنَ الْأَوْقَاتِ أَنَكْفُرُ بِاٰيَاتِ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔

(حمامۃ البشریٰ ص۴۶)

مرجائیں گے۔ یہ بھی حق ہے۔ ہم اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔لیکن انہوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ یاجوج ماجوج سب کے سب مرجاویں گے۔کیونکہ یاجوج ماجوج سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جو روس اور برطانیہ قوموں سے ہیں اور
...... خدا تعالیٰ نے خبر دیدی ہے کہ یہود اور نصاریٰ قیامت تک رہیں گے چنانچہ فرمایا کہ ہم نے قیامت تک ان میں مخالفت ڈال دی ہے پس قیامت سے پہلے سب کے سب کس طرح مرسکتے ہیں پس اگر موت سے جسمانی موت مراد ہو تو حدیث قرآن کے معارض ہوجاتی ہے کیونکہ قرآن تو بتاتا ہے کہ وہ قیامت تک باقی رہیں گے بلکہ قرآن تو اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ آسمان انہیں پر ٹوٹیں گے اور قیامت انہی شریروں پر قائم ہوگی۔ (حمامۃ البشریٰ مترجم ص۸۰ تا ۸۲ مطبوعہ ۱۹۰۳ء)

قرآن کریم واضح طور پر یہ بتا رہا ہے اور بلند آواز سے یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہود اور نصاریٰ قیامت تک موجود رہیں گے جیسا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضآء الی یوم القیامۃ۔ اور ظاہر ہے کہ دشمنی اور بغض کا وجود دشمنوں اور بغض کے رکھنے والوں کے وجود ہی کی فرع ہے جو ان کے موجود ہونے کے بغیر متحقق نہیں ہوسکتی۔ اور ہم یہ بات متواتر اور بار بار بیان کرآئے ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں۔ اور اپنے انجام سے ڈریں پس اس بات پر ہم کس طرح ایمان لاسکتے ہیں کہ جملہ مذاہب کے پیروکار کسی وقت تمام کے تمام ہلاک ہوجائیں گے؟ کیا ہم قرآن مبین کی آیات کا انکار کردیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ کہ ہم نے قیامت تک یہود اور نصاریٰ میں دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے پس اگر آیت ممدوحہ بالا کے یہ معنے ہیں کہ قیامت سے پہلے تمام یہودی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے تو اس سے لازم آتا ہے کہ کسی وقت یہود و نصاریٰ کا بغض باہمی دُور بھی ہو جائیگا اور یہودی مذہب کا تخم زمین پر نہیں رہے گا۔ حالانکہ قرآن شریف کی ان آیات سے اور کئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی مذہب قیامت تک رہے گا۔ ہاں ذلت اور مسکنت اُن کے شامل حال ہوگی اور وہ دوسری طاقتوں کی پناہ میں زندگی بسر کریں گے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۳،۲۲۴)

قرآن کریم اس بات کا گواہ ہے کہ سلسلہ کفر کا بلافصل قیامت کے دن تک قائم رہے گا اور یہ کبھی نہیں ہوگا کہ سب لوگ ایک ہی مذہب پر ہو جائیں اور اختلاف کفر اور ایمان اور بدعت اور توحید کا درمیان سے اٹھ جائے چنانچہ اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ضروری الوجود انسانوں کی فطرت کے لیے قرار دیتا ہے اور کفر کا تخم قیامت تک قائم رہنے کے لیے یہ آیات صریحۃ الدلالت ہیں جو پہلے پرچہ میں لکھ چکا ہوں یعنی وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اور آیت اَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ (الحق دہلی صفحہ ۶۳)

یعنی قیامت تک عیسائیوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

۱۶۔ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ۭ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝

وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے سو اُن نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحی الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اُس نور کے وارد ہونے سے وجود باجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔ انبیا منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نور مجسم ہو گئے ہیں اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا نمبر ۲۔ یہی حکمت ہے کہ نور وحی جس کے لیے نور فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیا کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہوا۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۹۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

ظلمانی زمانہ کے تدارک کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے نور آتا ہے وہ نور اُس کا رسول اور اُس کی کتاب ہے خدا اُس نور سے ان لوگوں کو راہ دکھلاتا ہے کہ جو اُس کی خوشنودی کے خواہاں ہیں سو اُن کو خدا ظلمات سے نور کی طرف

۱؎ المائدہ آیت ۶۵ ؛ ۲؎ آل عمران آیت ۵۶ ؛ ۳؎ المائدہ آیت ۱۶ ؛ ۴؎ الاحزاب آیت ۴۷ ؛

نکالتا ہے اور سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۹۵)

اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ انسان خدا کا پیارا ہو جائے پس جس کی راہ پر چلنا انسان کو محبوب الٰہی بنا دیتا ہے اس سے زیادہ کس کا حق ہے کہ اپنے تئیں روشنی کے نام سے موسوم کرے۔ اسی لیے اللہ جل شانہ نے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ۔ یعنی تمہارے پاس خدا کا نور آیا ہے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۴۶)

قرآن کے ذریعہ سے سلامتی کی راہوں کی ہدایت ملتی ہے اور لوگ ظلمت سے نور کی طرف نکالے جاتے ہیں۔

{ مکتوبات جلد۳ ص۳۷ حاشیہ
و
ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات ص۸ }

۱۹: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۝

خدا تعالیٰ نے یہودیوں کا ایک قول بطور حکایت عن الیہود قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے اور وہ قول یہ ہے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ اس جگہ ابناء کے لفظ کا خدا تعالیٰ نے کچھ ردّ نہیں کیا کہ تم کفر بکتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ اگر تم خدا کے پیارے ہو تو پھر وہ تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے اور ابناء کا دوبارہ ذکر بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیوں کی کتابوں میں خدا کے پیاروں کو بیٹا کر کے بھی پکارتے تھے۔

(حقیقۃ الوحی ص۶۴-۶۵)

جب انسان خدا کی طرف بکلی آجاتا ہے اور نفس کی طرف کو بکلی چھوڑ دیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کا دوست ہو جاتا ہے تو کیا وہ پھر دوست کو دوزخ میں ڈال دیگا نَحْنُ اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ سے ظاہر ہے کہ احباء کو دوزخ میں نہیں ڈالتے۔

(البدر جلد ۲ ۴۱-۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء ص۳۲۲)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنے اولیاء کو کبھی عذاب نہیں کرتے بلکہ اس دلیل سے یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کی تردید کرتا

ہے ان دونوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قَالَتِ الْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کہ ہم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس کی اولاد کے ہیں تو اس کا جواب خدا تعالےٰ نے یہ دیا قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ کہ اگر تم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس کی اولاد کے ہو تو پھر تمہاری شامت اعمال پر تم کو وہ دکھ اور تکالیف کیوں دیتا ہے پس اس سے ثابت ہے کہ جو خدا کے پیارے ہوتے ہیں ان کو دنیا میں دُکھ نہیں ہوتا اور وہ ہر ایک قسم کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں پس اگر اس کے پیاروں کو عذاب ہوتا ہے تو پھر کافروں میں اور ان میں کیا فرق ہوا۔

(البدر جلد ۲ ۴۵ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۵)

خوب یاد رکھو کہ جب تک خدا تعالےٰ سے رشتہ نہ ہو اور سچا تعلق اس کے ساتھ نہ ہو جاوے کوئی چیز نفع نہیں دے سکتی۔ یہودیوں کو دیکھو کہ کیا وہ پیغمبروں کی اولاد نہیں ہیں وہ قوم ہے جو اس پر ناز کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم اللہ کے فرزند اور اس کے محبوب ہیں۔ مگر جب انہوں نے خدا تعالیٰ سے رشتہ توڑ دیا۔ اور دنیا ہی دنیا کو مقدم کر لیا کیا نتیجہ ہوا۔ خدا تعالیٰ نے اسے سور اور بندر کہا اور اب جو حالت ان کی مال و دولت ہوتے ہوئے بھی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ (الحکم جلد ۹ ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ نے جو ہم کو مخاطب کیا ہے کہ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ اَوْلَادِیْ۔ اس جگہ یہ تو نہیں کہا کہ تو میری اولاد ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ بمنزلہ اولاد کے ہے یعنی اولاد کی طرح ہے اور دراصل یہ عیسائیوں کی اس بات کا جواب ہے جو وہ حضرت عیسٰی کو حقیقی طور پر ابن اللہ مانتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی کوئی اولاد نہیں اور خدا نے یہودیوں کے اس قول کا عام طور پر کوئی ردّ نہیں کیا جو کہتے تھے۔ کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ۔ بلکہ یہ ظاہر کیا ہے کہ تم ان ناموں کے مستحق نہیں ہو۔ دراصل یہ ایک محاورہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدوں کے حق میں اکرام کے طور پر ایسے الفاظ بولتا ہے جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ میں اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں اور میں اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں اور جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ اے بندے میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ دیا اور میں بھوکا تھا تو مجھے روٹی نہ دی۔ ایسا ہی توریت میں بھی لکھا ہے کہ یعقوب خدا کا فرزند بلکہ نخست زادہ ہے۔ سو یہ سب استعارے ہیں۔ جو عام طور پر خدا تعالیٰ کی عام کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور احادیث میں ہے اور خدا تعالیٰ نے یہ الفاظ میرے حق میں اسی واسطے استعمال کیے ہیں کہ تا عیسائیوں کا ردّ ہو۔ کیونکہ باوجود ان لفظوں کے میں کبھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ کہ نعوذ باللہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔ بلکہ ایسا دعویٰ کرنا کفر سمجھتے ہیں اور ایسے الفاظ جو انبیاء کے حق میں خدا تعالیٰ نے بولے ہیں ان میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑا عزت کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ[1] جس کے معنے ہیں کہ اے میرے بندو!

اب ظاہر ہے۔ کہ وہ لوگ خدا تعالےٰ کے بندے تھے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے اس فقرہ سے

[1] الزمر آیت ۵۴۔

ثابت ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کا اطلاق استعارہ کے رنگ میں کہاں تک وسیع ہے۔ (بدر جلد ۲ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۰۳ء)

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت ایک ایسی ظلمانی حالت پر زمانہ آچکا تھا کہ جو آفتاب صداقت کے ظاہر ہونے کے متقاضی تھے اِسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنے رسول کا بار بار یہی کام بیان کیا ہے کہ اُس نے زمانہ کو سخت ظلمت میں پایا اور پھر ظلمت سے اُن کو باہر نکالا (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۳۹-۵۴۰)

نذیر کا لفظ اُسی مرسل کے لیے خدا تعالیٰ استعمال کرتا ہے جس کی تائید میں یہ مقدر ہوتا ہے کہ اُس کے منکروں پر کوئی عذاب نازل ہوگا کیونکہ نذیر ڈرانے والے کو کہتے ہیں اور وہی نبی ڈرانے والا کہلاتا ہے جس کے وقت میں کوئی عذاب نازل ہونا مقدر ہوتا ہے پس آج سے چھبیس برس پہلے جو براہین احمدیہ میں میرا نام نذیر رکھا گیا اس میں صاف اشارہ تھا کہ میرے وقت میں عذاب نازل ہوگا۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۵۲)

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۝

توریت میں جا بجا حضرت موسیٰ کے صحابہ کا نام ایک سرکش اور سخت دل اور مرتکب معاصی اور مفسد قوم لکھا ہے جن کی نافرمانیوں کی نسبت قرآن شریف میں بھی یہ بیان ہے کہ ایک لڑائی کے موقع کے وقت میں انہوں نے حضرت موسیٰ کو یہ جواب دیا تھا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ یعنی تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمنوں سے لڑائی کرو ہم تو اسی جگہ بیٹھیں گے یہ حال تھا ان کی فرماں برداری کا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے دلوں میں وہ جوش عشق الٰہی پیدا ہوا اور توجہ قدسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تاثیر اُن کے دلوں میں ظاہر ہوئی کہ انہوں نے خدا کی راہ میں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح سر کٹا دیے۔ کیا کوئی پہلی امت میں ہمیں دکھا سکتا ہے یا نشان دے سکتا ہے کہ انہوں نے بھی صدق اور صفا دکھلایا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۸ حاشیہ)

بنی اسرائیل کے حالات اور واقعات کو بنظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی اصل غرض موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی کیا تھی ؟ بڑی بھاری غرض یہی تھی کہ وہ فرعون کی غلامی سے نکلیں چنانچہ روحانی امور اور خدا پرستی کے متعلق وہ ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے اور بے جا گستاخیوں اور شوخیوں سے کام لیتے رہے یہاں تک کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً[1] اور اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ[2] جیسے کلمات کہنے اور ذراسی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی کرنے سے باز نہ آئے۔ اور بات بات میں ضد اور اعتراض سے کام لیتے ان کے حالات پر پوری نظر کے بعد صاف معلوم دیتا ہے کہ وہ صرف (اور) صرف فرعون کی غلامی سے ہی آزاد ہونا چاہتے تھے خود اپنے آپ میں رہبری اور سرداری کی قوت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام کی بات سنتے ہی طیار ہو گئے۔ چونکہ بہت تنگ آچکے تھے اور مرتا کیا نہ کرتا اپنی سرخروئی اُنہوں نے اسی میں سمجھی حضرت موسیٰ کے ساتھ نکل پڑے لیکن آخر موسیٰ کی کامیابیوں کی راہ میں ٹھوکر کا پتھر بنے۔ غرض حضرت موسیٰ کو بہت محنت و مشقت کرنے کی ضرورت نہ پڑی قوم زندان غلامی میں گرفتار تھی اور طیار تھی کہ کوئی آئے۔ تو اُسے قبول کریں۔ ایسی حالت میں کئی لاکھ آدمیوں نے ایک دن میں قبول کر لیا۔ اور انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ وہ کیسی قوم ہے اور موسیٰ کی تعلیم سے انہوں نے کیا فائدہ اُٹھایا ہے۔ پس یہاں تک کہ ان کو مصر سے نکال لیا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ اصلاح کا زمانہ جب آیا اور موسیٰ نے جب چاہا کہ ان کو خدا پرست قوم بنا کر وعدہ کی سرزمین میں داخل کریں وہ ان کی شوخیوں اور گستاخیوں اور اندرونی بداعمالیوں میں گذرا یہاں تک کہ خود حضرت موسیٰ بھی اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو کہا کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کرو تو انہوں نے کیا شرمناک جواب دیا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تو اور تیرا رب جاؤ اور لڑو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے صحابہ کی لائف میں ایسا کوئی موقع نہیں آیا بلکہ اُنہوں نے کہا کہ ہم اُن میں سے نہیں ہیں جنہوں نے یہ کہا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ ۔ ایسی قوت اور شجاعت اور وفاداری کا جوش کیونکر پیدا ہو گیا تھا ؟ یہ سب ایمان اور یقین کا نتیجہ تھا جو آپ کی قوت قدسی اور تاثیر کا اثر تھا آپ نے ان کو ایمان سے بھر دیا تھا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰-۱۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر نکلتے ہیں مگر وہ اُس قوم کو کجرو کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بات بات پر اعتراض کرنے والے اور انکار کرنے والی قوم تھی۔ یہاں تک کہ کہہ دیا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۔ مگر اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو دیکھو۔ کہ اُنہوں نے بکریوں کی طرح اپنا خون بہا دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے گم ہو گئے تھے کہ وہ اس کے لیے ہر ایک تکلیف اور مصیبت کو اُٹھانے کو ہر وقت طیار تھے اُنہوں نے یہاں تک ترقی کی کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ[3] کا سرٹیفکیٹ ان کو دیا گیا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱-۲)

[آیت ۲۸] وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ

[1] البقرہ آیت ۵۶ - [2] المائدہ آیت ۱۲۰ - وغیرہ -

اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○

دُعا کی راہ میں دو بڑے مشکل امر ہیں جن کی وجہ سے اکثر دلوں سے عظمت دُعا کی پوشیدہ رہتی ہے (۱) اوّل تو شرط تقویٰ اور راست بازی اور خدا ترسی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ پرہیزگار لوگوں کی دُعا قبول کرتا ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۳۱)

تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت ہیں۔ لیکن اگر طالب صادق ہو کر ابتدائی مراتب اور مراحل کو استقلال اور خلوص سے طے کرے تو وہ اُس راستی اور طلب صدق کی وجہ سے اعلیٰ مدارج کو پالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ گویا اللہ تعالیٰ متقیوں کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ یہ گویا اُس کا وعدہ ہے۔ اور اس کے وعدوں میں تخلّف نہیں ہوتا جیسے کہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ[1] (رپورٹ جلسہ سالانہ صفحہ ۱۳۳)

اللہ تعالیٰ متقیوں کی دعائیں قبول کرتا ہے جو لوگ متقی نہیں ہیں اُن کی دعائیں قبولیت کے لباس سے ننگی ہیں ہاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمانیت ان لوگوں کی پرورش میں اپنا کام کر رہی ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

جن لوگوں نے جلد بازی کے ساتھ بدظنی کر کے اس سلسلہ کو جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے رد کر دیا ہے اور اس قدر نشانوں کو (دیکھ کر) پروا نہیں کی اور اسلام پر جو مصائب ہیں اُس سے لاپروا پڑے ہیں اُن لوگوں نے تقویٰ سے کام نہیں لیا اور اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے کہ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ خدا صرف متقی لوگوں کی نماز قبول کرتا ہے اس واسطے کہا گیا ہے کہ ایسے آدمی کے پیچھے نماز نہ پڑھو جس کی نماز خود قبولیت کے درجہ تک پہنچنے والی نہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ نے ذاتوں اور قوموں کو اُڑا دیا ہے یہ دنیا کے انتظام اور عرف کے لیے قبائل ہیں۔ مگر ہم نے خوب غور کر لیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور جو مدارج ملتے ہیں ان کا اصل باعث تقویٰ ہی ہے جو متقی ہے وہ جنت میں جائے گا خدا تعالیٰ اُس کے لیے فیصلہ کر چکا ہے۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک معزز متقی ہی ہے پھر یہ جو فرمایا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ کہ اعمال اور دعائیں متقیوں کی قبول ہوتی ہیں یہ نہیں کہا کہ مِنَ السَّيِّدِيْنَ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

جب تک انسان اپنا ایمان اس حد تک نہیں پہنچاتا کہ سنت سے فائدہ اُٹھاوے تو خدا تعالیٰ کیسے اس کے لیے سنت بدل دیوے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۳)

اللہ تعالیٰ کی اجابت بھی ... ن ... کے لیے ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ

---

[1] آل عمران : ۱۰

الْمُتَّقِيْنَ درحقیقت جب تک انسان تقویٰ اختیار نہ کرے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں بے نظیر صفات ہیں جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں انہیں کو اس سے اطلاع ملتی ہے اور وہی اس سے مزہ پاتے ہیں۔ خدا سے رشتہ میں اس قدر شیرینی اور لذت ہوتی ہے کہ کوئی پھل ایسا شیریں نہیں ہوتا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

بار بار قرآن شریف کو پڑھو اور تمہیں چاہیئے کہ بُرے کاموں کی تفصیل لکھتے جاؤ اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید سے کوشش کرو کہ ان بدیوں سے بچتے رہو۔ یہ تقویٰ کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ جب تم ایسی سعی کرو گے تو اللہ تعالیٰ پھر تمہیں توفیق دے گا اور وہ کافوری شربت تمہیں دیا جاوے گا جس سے تمہارے گناہ کے جذبات بالکل سرد ہو جائیں گے اس کے بعد نیکیاں ہی سرزد ہونگی۔ جب تک انسان متقی نہیں بنتا یہ جام اسے نہیں دیا جاتا اور نہ اس کی عبادات اور دعاؤں میں قبولیت کا رنگ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ یعنی بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کی عبادات کو قبول فرماتا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ نماز روزہ بھی متقیوں ہی کا قبول ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

پہلے ایمان کو درست کرو یہ ریاضتیں جو طریقہ نبوی سے باہر ہیں۔ یہ تو کسی کام نہ آئیں گی اور نہ منزل مقصود کو پہنچائیں گی۔ دیکھو بعض جوگی اس قدر ریاضتیں کرتے ہیں کہ اپنے بازو سکھا دیتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک مقبول نہیں کیونکہ ایک تو ارشاد نبوی کے خلاف دوم ایمان ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ یعنی اللہ ان کی عبادت قبول کرتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور ڈرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے منشاء کے مطابق کام کرتے ہیں اور سب سے پہلا کام تو یہ ہے۔ کہ اس کے مامور کو مانیں۔ دیکھو یہودی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک بھی نہیں۔ قبلہ بھی اُن کا وہ ہے جو پہلے مسلمانوں کا رہ چکا ہے مگر پھر بھی خدا کے حضور مقبول نہیں صرف اِس لیے کہ اللہ کے رسول کو نہ مانا۔ رسولوں کو نہ ماننے سے وہی جنہیں عالمین پر فضیلت دی گئی تھی۔ ملعون ہوئے۔ کیونکہ گناہ تو اور بھی ہیں مگر سب سے بڑا گناہ مامور من اللہ کا انکار ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

انسان کو چاہیئے کہ نیکی میں کوشش کرے اور ہر وقت دعا میں لگا رہے یقیناً جانو کہ جماعت کے لوگوں میں اور اُن کے غیر میں اگر کوئی مابہ الامتیاز ہی نہیں ہے تو پھر خدا کوئی کسی کا رشتہ دار تو نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اِن کو عزت دے اور ہر طرح حفاظت میں رکھے اور اُن کو ذلت دے اور عذاب میں گرفتار کرے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ متقی وہی ہیں کہ خدا سے ڈر کر ایسی باتوں کو ترک کر دیتے ہیں جو منشاء الٰہی کے خلاف ہیں۔ نفس اور خواہشات نفسانی کو اور دنیا و مافیہا کو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ہیچ سمجھیں۔ ایمان کا پتہ مقابلے کے وقت لگتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ

نَفۡسًا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِي الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِي الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ○

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا..... قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا جس نے ایک انسان کو ناحق بے موجب قتل کر دیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۳۵۶-۳۵۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یہ بالکل خطا ہے کہ اسی ایک امر کو پلے باندھ لو کہ طاعون والے سے پرہیز کریں تو طاعون نہ ہوگا۔ پرہیز کرو جہاں تک مناسب ہے لیکن اس پرہیز سے باہمی اخوت اور ہمدردی نہ اٹھ جاوے اور اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرو۔ یاد رکھو کہ مردہ کی تجہیز و تکفین میں مدد دینا اور اپنے بھائی کی ہمدردی کرنا صدقات خیرات کی طرح ہی ہے یہ بھی ایک قسم کی خیرات ہے اور یہ حق حق العباد کا ہے جو فرض ہے..... جو شخص ہمدردی کو چھوڑتا ہے وہ دین کو چھوڑتا ہے۔ قرآن شریف فرماتا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ الآیۃ یعنی جو شخص کسی نفس کو بلا وجہ قتل کر دیتا ہے وہ گویا ساری دنیا کو قتل کرتا ہے ایسا ہی میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے اپنے بھائی کے ساتھ ہمدردی نہیں کی تو اس نے ساری دنیا کے ساتھ ہمدردی نہیں کی۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جس شخص نے ایسے شخص کو قتل کیا کہ اُس نے کوئی ناحق کا خون نہیں کیا تھا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جو نہ بغاوت کے طور پر امن عامہ میں خلل ڈالتا تھا اور نہ زمین میں فساد پھیلاتا تھا تو اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ یعنی بیوجہ ایک انسان کو قتل کر دینا خدا کے نزدیک ایسا ہے کہ گویا تمام بنی آدم کو ہلاک کر دیا۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ بے وجہ کسی انسان کا خون کرنا کس قدر اسلام میں جُرم کبیر ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۳-۲۴)

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ

أَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

یعنی سوا اس کے نہیں کہ بدلہ ان لوگوں کا کہ جو خدا اور رسول سے لڑتے اور زمین پر فساد کے لیے دوڑتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرف سے کاٹے جائیں یا جلاوطن کر کے قید رکھے جائیں یہ رسوائی اُن کی دُنیا میں ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کے نزدیک ہمارے رسول کریم کی عدول حکمی اور اُس کا مقابلہ کچھ چیز نہیں تھا تو ایسے منکروں کو جو موحد تھے (جیسا کہ یہودی) انکار اور مقابلہ کی وجہ سے اس قدر سخت سزا یعنی طرح طرح کے عذابوں سے موت کی سزا دینے کے لیے خدا تعالیٰ کی کتاب میں کیوں حکم لکھا گیا اور کیوں ایسی سخت سزائیں دی گئیں کیونکہ دونوں طرف موحد تھے اس طرف بھی اور اُس طرف بھی اور کسی گروہ میں کوئی مشرک نہ تھا اور باوجود اس کے یہودیوں پر کچھ بھی رحم نہ آیا اور اُن موحد لوگوں کو محض انکار اور مقابلہ رسول کی وجہ سے بُری طرح قتل کیا گیا یہاں تک کہ ایک دفعہ دس ہزار یہودی ایک ہی دن میں قتل کیے گئے حالانکہ اُنہوں نے صرف اپنے دین کی حفاظت کے لیے انکار اور مقابلہ کیا تھا اور اپنے خیال میں پکے موحد تھے اور خدا کو ایک جانتے تھے۔

ہاں یہ بات ضرور یاد رکھو کہ بیشک ہزاروں یہودی قتل کیے گئے مگر اس غرض سے نہیں کہ تا وہ مسلمان ہو جائیں بلکہ محض اس غرض سے کہ خدا کے رسول کا مقابلہ کیا اِس لیے وہ خدا کے نزدیک مستوجب سزا ہو گئے اور پانی کی طرح اُن کا خون زمین پر بہایا گیا پس ظاہر ہے کہ اگر توحید کافی ہوتی تو یہودیوں کا کوئی جرم نہ تھا وہ بھی تو موحد تھے وہ محض انکار اور مقابلہ رسول کی وجہ سے کیوں خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل سزا ٹھیرے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۷-۱۵۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (۳۶)

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ درود شریف کے پڑھنے میں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ایک زمانہ تک مجھے بہت استغراق رہا کیونکہ میرا یقین تھا کہ خدا تعالیٰ کی راہیں نہایت دقیق راہیں ہیں۔ وہ بجز وسیلہ نبی کریمؐ کے مل نہیں

سکتیں جیسا کہ خدا بھی فرماتا ہے وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ تب ایک مدت کے بعد کشفی حالت میں مَیں نے دیکھا کہ دو سقے یعنی ماشکی آئے اور ایک اندرونی راستے سے اور ایک بیرونی راہ سے میرے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور اُن کے کاندھوں پر نور کی مشکیں ہیں اور کہتے ہیں ھٰذَا مَا صَلَّیْتَ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۸ حاشیہ)

وَقَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَھُدًی وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝

وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ ؕ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

اِنَّ الْقُرْاٰنَ لَا یَاْمُرُ الْیَھُوْدَ وَلَا النَّصَارٰی اَنْ یَّتَّبِعُوْا کُتُبَھُمْ وَیَثْبُتُوْا عَلٰی شَرَآئِعِھِمْ بَلْ یَدْعُوْھُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ وَاَوَامِرِہٖ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہِ الْعَزِیْزِ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ[1] وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[2] فَکَیْفَ یُظَنُّ فِی اللّٰہِ الْقُدُّوْسِ اَنَّہٗ یَدْعُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اِلَی الْاِسْلَامِ وَیَقُوْلُ اِنَّکُمْ لَا تُفْلِحُوْنَ

(ترجمہ) قرآن کریم یہود و نصاریٰ کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں کی پیروی کریں اور نہ یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی شریعتوں پر ہی قائم رہیں بلکہ وہ انہیں اسلام اور اس کے احکام کی طرف بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز قرآن شریف میں فرمایا ہے

ان الدّین عند اللّٰہ الاسلام فمن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین ۔ پس خدائے قدوس کی ذات کے بارہ میں یہ خیال کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک طرف تو ان آیات میں یہود و نصاریٰ کو اسلام

[1][2] آل عمران آیت ۲۰، ۸۶

اَبَدًا اَوْلَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا بَعْدَ اَنْ تَكُوْنُوْا مُسْلِمِيْنَ - وَلَا يَنْفَعُكُمْ تَوْرَاتُكُمْ وَلَا اِنْجِيْلُكُمْ اِلَّا الْقُرْاٰنُ - ثُمَّ يَنْسٰى قَوْلَهُ الْاَوَّلَ وَيَاْمُرُ كُلَّ فِرْقَةٍ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اَنْ يَّثْبُتُوْا عَلٰى شَرَائِعِهِمْ وَيَتَمَسَّكُوْا بِكُتُبِهِمْ وَيَكْفِيْهِمْ هٰذَا لِنَجَاتِهِمْ وَاِنَّ هٰذَا اِلَّا جَمْعُ الضِّدَّيْنِ وَاخْتِلَافٌ فِي الْقُرْاٰنِ وَاللّٰهُ نَزَّهَ كِتَابَهُ عَنِ الْاِخْتِلَافِ بِقَوْلِهِ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا بَلِ الْاٰيٰتُ الَّتِيْ حَرَّفَ الْمُعْتَرِضُ مَعْنَاهَا كَمِثْلِ الْيَهُوْدِ تُشِيْرُ اِلٰى اَنَّ بِشَارَتَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ مَوْجُوْدَةً فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ فَكَاَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ مَا لَهُمْ لَا يَعْمَلُوْنَ عَلٰى وَصَايَا التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَلَا يُسْلِمُوْنَ...... وَاَمَّا بَقِيَّةُ اَلْفَاظِ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ اَعْنِيْ لَفْظَ فِيْهِ نُوْرٌ وَّهُدًى فَلَيْسَ هٰذَا دَلِيْلًا عَلٰى كَوْنِ الْاِنْجِيْلِ شَرِيْعَةً مُّسْتَقِلَّةً اَلَيْسَ الزَّبُوْرُ وَغَيْرُهٗ مِنْ كُتُبِ اَنْبِيَآءِ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ هُدًى لِّلنَّاسِ اَيُوْجَدُ فِيْهَا ظُلْمَةٌ وَّلَا يُوْجَدُ نُوْرٌ فَتَفَكَّرْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ -

(خطبہ الہامیہ - اعلان صٓ ۲ حاشیہ)

(مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ) مصدق کے معنے قرآنی طور پر یہ ہیں کہ جو کچھ صحیح تھا اس کی تو نقل کر دی اور جو نہیں لیا وہ غلط

کی طرف بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہرگز کامیابی نہیں پا سکتے ہو اور نہ ہی جنت میں داخل ہو سکتے ہو۔ سوائے اس کے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اور تمہیں قرآن مجید کے سوا تمہاری تورات اور تمہاری انجیل فائدہ نہیں دے سکتیں۔ پھر دوسری طرف اپنے پہلے قول کو بھول جائے اور یہود و نصاریٰ کے ہر فرقہ کو حکم دے کہ وہ اپنی شریعتوں پر ہی قائم رہیں اور اپنی اپنی کتابوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور یہ بات ان کی نجات کے لیے کافی ہو گی۔ یہ تو اجتماع ضدّین ہے اور قرآن مجید میں اختلاف کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب کو ہر قسم کے اختلاف سے پاک قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافًا کثیرا۔[1] اگر یہ کتاب منجانب اللہ نہ ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔ بلکہ وہ آیت جس کے معنی کرنے میں معترض نے یہودیوں کی طرح تحریف کی ہے اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تورات اور انجیل میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آمد کی بشارت موجود تھی۔ تو گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ تورات اور انجیل کے تاکیدی حکموں پر عمل نہیں کرتے اور اسلام نہیں لاتے ان آیات کے بقایا الفاظ یعنی فِیْہِ نُوْرٌ وَّھُدًی اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ انجیل کوئی مستقل شریعت ہے کیا زبور و غیرہ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے لوگوں کے لیے ہدایت نہیں تھے۔ کیا ان میں ظلمت پائی جاتی تھی اور اُن میں نور نہیں پایا جاتا تھا۔ پس غور سے کام لو اور جاہلوں میں سے نہ بنو۔

---

[1] النساء آیت ۸۳۔

تھا پھر انجیلوں کا آپس میں اختلاف ہے اگر قرآن نے تصدیق کی ہے تو بتلاؤ کونسی انجیل کی کی ہے قرآن نے یوحنا متی وغیرہ کی انجیل کی کہیں تصدیق نہیں کی ہاں پطرس کی دعا کی تصدیق کی ہے اسی طرح کونسی توریت کہیں جس کی تصدیق قرآن نے کی پہلے توریت تو ایک بتلاؤ قرآن تو تمہاری توریت کو محرف بتلاتا ہے اور تم میں خود اختلاف ہے کہ توریت مختلف ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

قرآن شریف انجیل کی تصدیق قول سے نہیں کرتا بلکہ فعل سے کرتا ہے کیونکہ جو حصہ انجیل کی تعلیم کا قرآن کے اندر شامل ہے اس پر قرآن نے عمل درآمد کرواکے دکھلا دیا ہے اور اسی لیے ہم اسی حصہ انجیل کی تصدیق کر سکتے ہیں جس کی قرآن کریم نے تصدیق کی ہیں کیا معلوم کہ باقی کا رطب و یابس کہاں سے آیا ہاں اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پھر آیت وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ میں جو لفظ انجیل عام ہے اس سے کیا مراد ہے وہاں یہ بیان نہیں ہے کہ انجیل کا وہ حصہ جس کا مصدق قرآن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں الانجیل سے مراد اصل انجیل اور توریت ہے جو قرآن کریم میں درج ہو چکیں۔ اگر یہ نہ مانا جاوے تو پھر بتلایا جاوے کہ اصلی انجیل کونسی ہے کیونکہ آج کل کی مروجہ اناجیل تو اصل ہو نہیں سکتیں ان کی اصلیت کس کو معلوم ہے اور یہ بھی خود عیسائی مانتے ہیں کہ اس کا فلاں حصہ الحاقی ہے۔ پھر ایک اور بات دیکھنے والی ہے کہ انجیل میں سے عیسیٰؑ کی موت اور بعد کے حالات اور توریت میں موسیٰؑ کی موت کا حال درج ہے تو کیا اب ان کتابوں کا نزول دونوں نبیوں کی وفات کے بعد تک ہوتا رہا اس سے ثابت ہے کہ موجودہ کتب اصل کتب نہیں ہیں اور نہ اب ان کا میسر آنا ممکن ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۸ راگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵)

وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ

پہلے نوع انسان صرف ایک قوم کی طرح تھی اور پھر وہ تمام زمین پر پھیل گئے تو خدا نے ان کی سہولت تعارف کے لیے ان کو قوموں پر منقسم کر دیا اور ہر ایک قوم کے لیے اس کے مناسب حال ایک مذہب مقرر کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ..... فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ .... ہر ایک قوم کے لیے ہم نے ایک مشرب اور مذہب مقرر کیا تا ہم مختلف فطرتوں کے جوہر بذریعہ اپنی مختلف ہدایتوں کے ظاہر کر دیں پس تم اے مسلمانو! تمام بھلائیوں کو دوڑ کر لو کیونکہ تم تمام قوموں کا مجموعہ ہو اور تمام فطرتیں تمہارے اندر ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۳۸)

۵۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ان آیتوں کو پڑھ کر نادان عیسائی دھوکہ کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ عیسائی وغیرہ بے دین فرقوں سے محبت نہ کریں لیکن نہیں سوچتے کہ ہر یک لفظ اپنے محل پر استعمال ہوتا ہے جس چیز کا نام محبت ہے وہ فاسقوں اور کافروں سے اُسی صورت میں بجا لانا متصور ہے کہ جب اُن کے کفر اور فسق سے کچھ حصہ لے لیوے نہایت سخت جاہل وہ شخص ہوگا جس نے یہ تعلیم دی کہ اپنے دین کے دشمنوں سے پیار کرو ہم بار ہا لکھ چکے ہیں کہ پیار اور محبت اسی کا نام ہے کہ اُس شخص کے قول اور فعل اور عادت اور خلق اور مذہب کو رضا کے رنگ میں دیکھیں اور اُس پر خوش ہوں اور اُس کا اثر اپنے دل پر ڈال لیں اور ایسا ہونا مومن سے کافر کی نسبت ہرگز ممکن نہیں ہاں مومن کافر پر شفقت کرے گا اور تمام دقائق ہمدردی بجا لائے گا اور اُس کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا غمگسار ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ بغیر لحاظ مذہب ملت کے تم لوگوں سے ہمدردی کرو بھوکوں کو کھلاؤ غلاموں کو آزاد کرو قرضداروں کے قرض دو اور زیر باروں کے بار اُٹھاؤ اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کا حق ادا کرو۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۷)

۵۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

اے ایمان لانے والو اگر کوئی تم میں سے دینِ اسلام کو چھوڑ دیگا تو خدا اُس کے عوض میں ایک ایسی قوم لائے گا جن سے وہ محبّت کرے گا اور وہ اُس سے محبّت کریں گے وہ مومنین کے آگے تذلّل اختیار کریں گے اور کافروں پر غالب اور بھاری ہوں گے۔ یعنی خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ ہمیشہ یہ حال ہوتا رہے گا کہ اگر کوئی ناقص الفہم دین اسلام سے مرتد ہو جائے گا تو اُس کے مرتد ہونے سے دین میں کچھ کمی نہیں ہوگی بلکہ اُس ایک شخص کے عوض میں خدا کئی وفادار بندوں کو دینِ اسلام میں داخل کرے گا کہ جو اخلاص سے اُس پر ایمان لائیں گے اور خدا کے محبّ اور محبوب ٹھہریں گے

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

میں نے سنا ہے کہ شیخ بٹالوی اس عاجز کے مخلصوں کی نسبت قسم کھا چکے ہیں کہ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اور اس قدر غلو ہے کہ شیخ نجدی کا استثنا بھی اُن کی کلام میں نہیں پایا جاتا تا صالحین کو باہر رکھ لیتے اگرچہ وہ بعض برگشتہ ارادت مندوں کی وجہ سے بہت خوش ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک ٹہنی کے خشک ہو جانے سے سارا باغ برباد نہیں ہو سکتا جس ٹہنی کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے خشک کر دیتا ہے اور کاٹ دیتا ہے اور اُس کی جگہ اور ٹہنیاں پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی پیدا کر دیتا ہے۔ بٹالوی صاحب یاد رکھیں کہ اگر اس جماعت سے ایک نکل جائے گا تو خدا تعالیٰ اُس کی جگہ بیس لائے گا اور اس آیت پر غور کریں فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

(آسمانی فیصلہ بار سوم صفحہ ۴۱-۴۲)

عبد الغفور نامی ایک شخص کے آریہ مذہب اختیار کرنے پر فرمایا کہ اس طرح کے ارتداد سے اسلام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ یکجائی نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ آیا اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جو بعض لوگ مرتد ہو جاتے تھے تو کیا ان سے اسلام کو نقصان پہنچتا تھا ہرگز نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ پہلو انجام کار اسلام کو ہی مفید پڑتا ہے اور اس طرح سے اہل اسلام کے ساتھ اختلاط کی ایک راہ کھلتی ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ نے ایک جماعت کی جماعت اسلام میں داخل کرنی ہوتی ہے تو ایسا ہوا کرتا ہے کہ اہل اسلام میں (سے) کچھ اُدھر چلے جاویں۔ خدا کے کام بڑے دقیق اور اسرار سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۹)

خدا تعالیٰ نے مومنوں کی صفت فرمائی ہے۔ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں خوف کھاتے۔ اور صرف اپنے مولا کی رضامندی کو مقدم رکھتے ہیں۔ مومن ایک لاپروا انسان ہوتا ہے اُسے صرف خدا کی رضامندی کی حاجت ہوتی ہے اور اسی کی اطاعت کو وہ ہر دم مدِ نظر رکھتا ہے کیونکہ جب اس کا معاملہ

لہ الحجر آیت ۴۰

خدا سے ہے۔ تو پھر اُسے کسی کی ضرر اور نفع کا کیا خوف ہے۔ (البدر جلد ۳ ۳۲ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

دیکھو جو امور سماوی ہوتے ہیں ان کے بیان کرنے میں ڈرنا نہیں چاہیئے اور کسی قسم کا خوف کرنا اہل حق کا قاعدہ نہیں صحابہ کرام کے طرزِ عمل پر نظر کرو وہ بادشاہوں کے درباروں میں گئے اور جو کچھ ان کا عقیدہ تھا وہ صاف صاف کہہ دیا اور حق کہنے سے ذرا نہیں جھجکے۔ جبھی تو لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ کے مصداق ہوئے۔

(بدر جلد ۷ عـ۹ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۶۱۔ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۚ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ أَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝

یہ ضرور نہیں کہ آنے والے کا نام درحقیقت عیسٰی بن مریم ہی ہو بلکہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قطعی طور پر اس کا نام عیسٰی بن مریم ہے جیسے یہودیوں کے نام خدا تعالیٰ نے بندر اور سور رکھا اور فرمادیا وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ ایسا ہی اُس نے اِس اُمت کے مفسد طبع لوگوں کو یہودی ٹھہرا کر اس عاجز کا نام مسیح ابن مریم رکھ دیا اور اپنے الہام میں فرما دیا جَعَلْنٰكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۲۳)

خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کا رشتہ نہیں اور وہ کسی کی پروا نہیں کرتا وہ اولاد جو انبیاء کی اولاد کہلاتی تھی یعنی بنی اسرائیل جن میں کثرت سے نبی اور رسول آئے۔ اور خدا تعالیٰ کے عظیم الشان فضلوں کے وہ وارث اور حقدار ٹھہرائے گئے تھے۔ لیکن جب اس کی روحانی حالت بگڑی اور اس نے راہ مستقیم کو چھوڑ دیا سرکشی فسق و فجور کو اختیار کیا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ[1] کی مصداق ہوئی خدا تعالیٰ کا غضب اُن پر ٹوٹ پڑا اور ان کا نام سور اور بندر رکھا گیا۔ یہاں تک وہ گر گئے کہ انسانیت سے بھی اُن کو خارج کیا گیا۔ یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے۔ بنی اسرائیل کی حالت ہر وقت ایک مفید سبق ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳ ۔ ذلفرییوں کا مجموعہ صفحہ ۴۳)

۶۳، ۶۴۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ

[1] البقرۃ آیت ۶۲

وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۝

اور اکثر اہل کتاب کو تو دیکھے گا کہ گناہ کے کاموں کی طرف دوڑتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں کیا ہی بُرے یہ کام اور بداعمالیاں ہیں کہ یہ لوگ کر رہے ہیں اُن کے مشائخ اور علماء کیوں اِن بُرے کاموں سے اُن کو منع نہیں کرتے اور دیکھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتے اور جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں پھر بھی چپ رہتے ہیں پس یہ اُن کے علماء بھی بُرے کام کر رہے ہیں کہ خاموش رہ کر اُن کی بدی میں آپ بھی شریک ہیں۔ (چشمہ معرفت ۲۲۹-۲۳۰)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝

یہود نے کہا کہ خدا کا ہاتھ باندھا ہوا ہے یعنی جو کچھ ہے انسان کی تدبیروں سے ہوتا ہے اور خدا اپنے قادرانہ تصرّفات سے عاجز ہے سو خدا نے ہمیشہ کے لیے یہودیوں کے ہاتھ کو باندھ دیا ہے تا اگر اُن کے فکر اور اُن کی تدبیریں کچھ چیز ہیں تو اُن کے زور سے دنیا کی حکومتیں اور بادشاہتیں حاصل کریں۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم ۲۲۵ حاشیہ نمبر ۱)

ہمارے مخالف مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ آخری زمانہ میں ایک خونی مہدی ظاہر ہوگا اور وہ تمام عیسائیوں کو ہلاک کر دیگا اور زمین کو خون سے بھر دیگا اور جہاد ختم نہیں ہوگا جب تک وہ ظاہر نہ ہو اور اپنی تلوار سے ایک دنیا کو ہلاک نہ کرے یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو قرآن کے نص صریح وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ سے مخالف اور منافی ہیں ہر ایک مسلمان کو چاہیئے کہ ان باتوں پر ہرگز اعتقاد نہ رکھے۔ (تحفہ گولڑویہ ۷۹)

یہود اور نصاریٰ میں قیامت تک بغض اور دشمنی رہے گی تو اب تبلاؤ کہ جب تمام یہودی قیامت سے پہلے ہی حضرت مسیح پر ایمان لے آئیں گے تو پھر بغض اور دشمنی قیامت تک کون لوگ کریں گے۔ جب یہودی نہ رہے اور سب

ایمان لے آئے تو پھر بغض اور دشمنی کے لیے کون موقعہ اور محل رہا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[1] اس کے بھی یہی معنے ہیں جو اوپر گذر چکے اور وہی اعتراض ہے جو اوپر بیان ہو چکا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[2] اس جگہ کفروا سے مراد بھی یہود ہیں کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام محض یہودیوں کے لیے آئے تھے اور اس آیت میں وعدہ ہے کہ حضرت مسیح کو ماننے والے یہود پر قیامت تک غالب رہیں گے۔ اب بتلاؤ کہ جب ان معنوں کے رو سے جو ہمارے مخالف آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے کرتے ہیں تمام یہودی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آئیں گے تو پھر یہ آیتیں کیونکر صحیح ٹھہر سکتی ہیں کہ یہود اور نصاریٰ کی قیامت تک باہم دشمنی رہے گی اور نیز یہ کہ قیامت تک یہود ایسے فرقوں کے مغلوب رہیں گے جو حضرت مسیح کو صادق سمجھتے ہوں گے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۶)

آیت اَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اور آیت وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[3]۔ اور آیت وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[4] اور آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ[5]۔ یہ تمام آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیامت تک اختلاف رہے گا منعم علیہم بھی رہیں گے مغضوب علیہم بھی رہیں گے۔ ہاں ملل باطلہ دلیل کے رو سے ہلاک ہو جائیں گی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۱ حاشیہ در حاشیہ)

یہود اور نصاریٰ میں قیامت تک عداوت رہے گی پس ظاہر ہے کہ اگر تمام یہود قیامت سے پہلے ہی حضرت عیسٰی پر ایمان لے آویں گے تو قیامت تک عداوت رکھنے والا کون رہے گا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۴)

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ۝ (۶۸)

وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ خدا تجھے ان لوگوں کے شر سے بچائے گا کہ جو تیرے قتل کرنے کی گھات میں ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۶ حاشیہ نمبر ۱)

یہ اسلام ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آوے اس سے انکار نہ کرے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عصمت کے فکر میں خود لگتے تو وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کی آیت نہ نازل ہوتی۔ حفاظت الٰہی کا یہی سر ہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۳)

---

[1] المائدہ آیت ۱۵ [2] ال عمران آیت ۵۶ [3] المائدہ آیت ۶۵ [4] ال عمران آیت ۵۶ [5] الفاتحہ آیت ۵ تا ۷

خدا نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے وہ وعدہ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کا ہے پس اُسے کوئی مخالف آزما لے اور آگ جلا کر ہمیں اس میں ڈال دے آگ ہرگز ہم پر کام نہ کریگی اور وہ ضرور ہمیں اپنے وعدہ کے موافق بچا لے گا لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم خود آگ میں کودتے پھریں یہ طریق انبیاء کا نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ پس ہم خود آگ میں دیدہ دانستہ نہیں پڑتے بلکہ یہ حفاظت کا وعدہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہے کہ اگر وہ آگ میں ہمیں جلانا چاہیں تو ہم ہرگز نہ جلیں گے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۳)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کسی کے ہاتھ سے قتل نہ کیا جانا ایک بڑا بھاری معجزہ ہے اور قرآن شریف کی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ قرآن شریف کی یہ پیشگوئی ہے کہ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اور پہلی کتابوں میں یہ پیشگوئی درج تھی کہ نبی آخر زمان کسی کے ہاتھ سے قتل نہ ہوگا۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۳ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ یعنی خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔ حالانکہ لوگوں نے طرح طرح کے دکھ دئے وطن سے نکالا دانت شہید کیا انگلی کو زخمی کیا اور کئی زخم تلوار کے پیشانی پر لگائے سو درحقیقت اس پیشگوئی میں بھی اعتراض کا محل نہیں کیونکہ کفار کے حملوں کی علت غائی اور اصل مقصود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زخمی کرنا یا دانت کا شہید کرنا نہ تھا بلکہ قتل کرنا مقصود بالذات تھا سو کفار کے اصل ارادے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا نے محفوظ رکھا۔ (ست بچن حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶۴ (حاشیہ)

لکھا ہے کہ اول مرتبہ میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابی کو برعایت ظاہر اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہمراہ رکھا کرتے تھے۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ یعنی خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو رخصت کر دیا اور فرمایا کہ اب مجھ کو تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ء صفحہ ۲)

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ حَتّٰی تُقِیۡمُوا التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَ لَیَزِیۡدَنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ○ [69]

اے پیغمبر! تو یہود اور نصاریٰ کو کہہ دے کہ جب تک تم توریت اور انجیل کے احکام پر نہ چلو اور ایسا ہی اُن دوسری

ـــلہ البقرہ ۵ آیت ۱۹۶ ء

تمام کتابوں پر قائم نہ ہو جاؤ جو خدا کی طرف سے تمہیں دی گئی ہیں تب تک تمہارا کچھ بھی مذہب نہیں محض لامذہب ہو کر اپنے نفسوں کی پیروی کر رہے ہو پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عرب کے یہود اور عیسائی ایسے بگڑ گئے تھے اور اس درجہ پر دہ بدچلن ہو گئے تھے کہ جو کچھ خدا نے اُن کی کتابوں میں حرام کیا تھا یعنی یہ کہ چوری نہ کریں۔ لوگوں کا ناحق مال نہ کھاویں۔ ناحق کا خون نہ کریں جھوٹی گواہی نہ دیں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں یہ تمام ناجائز کام ایسی دلی رغبت سے کرتے تھے کہ گویا اُن بُرے کاموں کو انہوں نے اپنا مذہب قرار دیدیا تھا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

یعنی جو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جو لوگ یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرست ہیں جو شخص اُن میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور اعمال صالحہ بجا لائے گا خدا اُس کو ضائع نہیں کرے گا اور ایسے لوگوں کا اجر اُن کے ربّ کے پاس ہے اور اُن کو کچھ خوف نہیں ہو گا اور نہ غم۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۱)

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝

یعنی مسیح صرف ایک رسول ہے اُس سے پہلے نبی فوت ہو چکے ہیں اور ماں اُس کی صدیقہ ہے جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔ یہ آیت بھی صریح نص حضرت مسیح کی موت پر ہے کیونکہ اس آیت میں بتصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب حضرت عیسیٰ اور اُن کی والدہ مریم طعام نہیں کھاتے ہاں کسی زمانہ میں کھایا کرتے تھے جیسا کہ کَانَا کا لفظ اُس پر دلالت کر رہا ہے جو حال کو چھوڑ کر گذشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے اب ہر یک شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مریم طعام کھانے سے اِسی وجہ سے روکی گئی کہ وہ فوت ہو گئی اور چونکہ کَانَا کے لفظ میں جو تثنیہ کا صیغہ ہے حضرت عیسیٰ بھی حضرت مریم کے ساتھ شامل ہیں اور دونوں ایک ہی حکم کے نیچے داخل ہیں لہٰذا حضرت مریم کی موت کے ساتھ ان کی موت بھی ماننی پڑی

کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں ہرگز یہ بیان نہیں کیا گیا کہ حضرت مریم تو بوجہ موت طعام کھانے سے رو کے گئے لیکن حضرت ابن مریم کسی اور وجہ سے اور جب ہم اس آیت مذکورہ بالا کو اِس دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھیں کہ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ[1] جس کے یہ معنے ہیں کہ کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو تو اس یقینی اور قطعی نتیجہ تک ہم پہنچ جائیں گے کہ فی الواقع حضرت مسیح فوت ہو گئے کیونکہ پہلی آیت سے ثابت ہو گیا کہ اب وہ کھانا نہیں کھاتے اور دوسری آیت بتلا رہی ہے کہ جب تک یہ جسم خاکی زندہ ہے طعام کھانا اس کے لیے ضروری ہے اس سے قطعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۰۳-۶۰۴)

مخلوق کی شناخت کی بڑی علامت یہی ہے کہ بعض بعض سے مشارکت و مشابہت رکھتے ہیں اور کوئی فرد کوئی ایسی ذاتی خاصیت اور خصوصیت نہیں رکھتا جو دوسرے کسی فرد کو اُس سے حصہ نہ ہو خواہ اصلاً یا ظلاً تو پھر اگر اِس صورت میں ہم کوئی ایسا فرد افراد بشریہ سے تسلیم کریں جو اپنی بعض صفات یا افعال میں دوسروں سے بکلّی ممتاز اور لوازم بشریت سے بڑھ کر ہے اور خدا تعالیٰ کی طرح اپنے اُس فعل یا صفت میں یگانگت رکھتا ہے تو گویا ہم نے خدا تعالیٰ کی صفت وحدانیت میں ایک شریک قرار دیا۔ یہ ایک دقیق راز ہے اِس کو خوب سوچو۔ خدا تعالیٰ نے جو اپنی کلام میں کئی دفعہ حضرت مسیح کی وفات کا ذکر کیا ہے یہاں تک کہ اُن کی والدہ مریم صدیقہ کے ساتھ جو باتفاق فوت شدہ ہے ان کے ذکر کو ملا کر بیان کیا کہ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ کہ وہ دونوں جب زندہ تھے طعام کھایا کرتے تھے اِس تاکید کی یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے علم قدیم سے خوب جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں لوگ بباعث خیال حیات مسیح سخت فتنہ میں پڑیں گے اور وہ فتنہ اسلام کے لیے سخت مُضر ہو گا اس لیے اُس نے پہلے ہی سے فیصلہ کر دیا اور بخوبی ظاہر کر دیا کہ مسیح فوت ہو گیا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۵)

حضرت مسیح ابن مریم میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ وہ صرف ایک رسول ہے اور اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں۔ یہ کلمہ کہ اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں۔ یہ قیاس استقرائی کے طور پر ایک استدلال لطیف ہے کیونکہ قیاسات کے جمیع اقسام میں سے استقراء کا مرتبہ وہ اعلیٰ شان کا مرتبہ ہے کہ اگر یقینی اور قطعی مرتبہ سے اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو دین و دنیا کا تمام سلسلہ بگڑ جاتا ہے اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ حصہ کثیرہ دنیا کا اور ازمنہ گذشتہ کے واقعات کا ثبوت اسی استقراء کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ مثلاً ہم جو اس وقت کہتے ہیں کہ انسان مُنہ سے کھاتا اور آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا اور ناک سے سونگھتا اور زبان سے بولتا ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی مقدس کتاب پیش کرے اور اس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ یہ واقعات زمانہ گذشتہ کے متعلق نہیں ہیں بلکہ پہلے زمانہ میں انسان آنکھوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا اور کان کے ذریعہ سے بولتا تھا اور ناک کے ذریعہ سے دیکھتا تھا ایسا ہی اور باتوں کو بھی بدل دے یا مثلاً یہ کہے کہ کسی زمانہ میں انسان کی آنکھیں دو نہیں ہوتی تھیں بلکہ بیس ہوتی تھیں دس تو سامنے چہرہ میں اور دس پشت پر لگی ہوئی تھیں تو اب ناظرین سوچ سکتے ہیں کہ گو فرض کے طور پر

---

[1] الانبیاء آیت ۹

ہم تسلیم بھی کرلیں کہ ان عجیب تحریروں کا لکھنے والا کوئی مقدس اور راست باز آدمی تھا مگر ہم اس یقینی نتیجہ سے کہاں اور کدھر گریز کرسکتے ہیں جو قیاس استقرائی سے پیدا ہوا ہے۔ میری رائے میں ایسا بزرگ اگر نہ صرف ایک بلکہ کروڑ سے بھی زیادہ ہوں اور قیاس استقرائی سے نتائج قطعیہ یقینیہ کو توڑنا چاہیں تو ہرگز ٹوٹ نہیں سکیں گے بلکہ اگر ہم منصف ہوں اور حق پسندی ہمارا شیوہ ہو تو اس حالت میں کہ اس بزرگ کو ہم درحقیقت ہم ایک بزرگ سمجھتے ہیں اور اس کے الفاظ میں ایسے ایسے کلمات خلاف حقایق مشہودہ محسوسہ کے پاتے ہیں تو ہم اس کی بزرگی کی خاطر سے صرف عن الظاہر کریں گے۔ اور ایسی تاویل کریں گے جس سے اس بزرگ کی عزت قایم رہ جاوے ورنہ یہ تو ہرگز نہ ہوگا کہ جو حقایق استقراء کے یقینی اور قطعی ذریعہ سے ثابت ہوچکے ہیں وہ ایک روایت دیکھ کر ٹال دیئے جائیں۔ اگر ایسا کسی کا خیال ہو۔ تو یہ بار ثبوت اس کی گردن پر ہے کہ وہ استقرا مثبتہ موجودہ قطعیہ یقینیہ کے برخلاف اس روایت کی تائید اور تصدیق میں کوئی امر پیش کر دیوے مثلاً جو شخص اس بات پر بحث کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے۔ کہ صاحب ضرور پہلے زمانہ میں لوگ زبان کے ساتھ دیکھنے اور ناک کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ تو اس کا ثبوت پیش کرے اور جب تک ایسا ثبوت پیش نہ کرے تب تک ایک مہذب عقلمند کی شان سے بہت بعید ہے کہ ان تحریرات پر بھروسہ کرکے کہ جن کے بصورت صحت بھی بیّن بیّن معنے ہوسکتے ہیں وہ معنی اختیار کرے جو حقایق ثابت شدہ سے بالکل مغایر اور منافی پڑے ہوئے ہیں مثلاً اگر ایک ڈاکٹر ہی سے اس بات (کا) تذکرہ ہو کہ سم الفار اور وہ زہر جو تلخ بادام سے تیار کیا جاتا ہے اور بیش یہ تمام زہریں نہیں ہیں۔ اور اگر ان کو دو دو سیر کے قدر پر بھی انسان کے بچوں کو کھلایا جاوے تو کچھ حرج نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ دیوے کہ فلاں مقدس کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اور راوی معتبر ہے۔ تو کیا وہ ڈاکٹر صاحب اس مقدس کتاب کا لحاظ کرکے ایک ایسے امر کو چھوڑ دیں گے جو قیاس استقرائی سے ثابت ہوچکا ہے۔

غرض جب کہ قیاس استقرائی دنیا کے حقایق ثابت کرنے کے لیے اوّل درجہ کا مرتبہ رکھتا ہے تو اسی جہت سے اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے قیاس استقرائی کو ہی پیش کیا۔ اور فرمایا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[۱] یعنی حضرت مسیح علیہ السلام بیشک نبی تھے اور اللہ جل شانہ کے پیارے رسول تھے مگر وہ انسان تھے تم نظر اٹھا کر دیکھو کہ جب سے یہ سلسلہ تبلیغ اور کلام الٰہی کے نازل کرنے کا شروع ہوا ہے ہمیشہ اور قدیم سے انسان ہی رسالت کا مرتبہ پاکر دنیا میں آتے رہے ہیں یا کبھی اللہ تعالیٰ کا بیٹا بھی آیا ہے اور خلت کے لفظ سے اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جہاں تک تمہاری نظر تاریخی سلسلہ کو دیکھنے کے لیے وفا کرسکتی ہے۔ اور گذشتہ لوگوں کا حال معلوم کرسکتے ہو خوب سوچو اور سمجھو کہ کبھی یہ سلسلہ ٹوٹا بھی ہے کیا تم کوئی ایسی نظیر پیش کرسکتے ہو جس سے ثابت ہوسکے کہ یہ امر ممکنات میں سے ہے پہلے بھی کبھی کبھی ہوتا ہی آیا ہے۔ سو عقلمند آدمی اس جگہ ذرہ ٹھہر کر اور اللہ جل شانہ کا خوف کرکے دل میں سوچے کہ حادثات کا سلسلہ اس بات کو چاہتا ہے کہ اس کی نظیر بھی کہیں کسی زمانہ میں پائی جاوے۔ ہاں اگر بائبل کے وہ تمام انبیاء اور صلحاء جن کی نسبت

---

[۱] آل عمران آیت ۱۴۵

بائبل میں بھی الفاظ موجود ہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کے بیٹے تھے یا خدا تھے حقیقی معنوں پر حمل کر لیے جاویں تو بیشک اس صورت میں ہمیں اقرار کرنا پڑیگا کہ خدائے تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ بیٹے بھی بھیجا کرتا ہے بلکہ بیٹے کیا کبھی کبھی بیٹیاں بھی اور بظاہر یہ دلیل تو عمدہ معلوم ہوتی ہے اگر حضرات عیسائی صاحبان اس کو پسند فرماویں اور کوئی اُس کو توڑ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ حقیقی غیر حقیقی کا تو وہاں کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ بعض کو تو پہلوٹھا ہی لکھ دیا۔ ہاں اس صورت میں بیٹوں کی میزان بہت بڑھ جائے گی۔ غرض اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے ابطال الوہیت کے لیے یہ دلیل استقرائی پیش کی ہے پھر بعد اُس کے ایک اور دلیل پیش کرتا ہے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ یعنی والدہ حضرت مسیح علیہ السلام کی راستباز تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر حضرت مسیح کو اللہ جل شانہ کا حقیقی بیٹا فرض کر لیا جاوے تو پھر یہ ضروری امر ہے کہ وہ دوسروں کی طرح اسی والدہ کے اپنے تولد میں محتاج نہ ہو جو باتفاق فریقین انسان تھی کیونکہ یہ بات نہایت ظاہر اور کھلی کھلی ہے کہ قانون قدرت اللہ جلّ شانہ کا اسی طرح پر واقع ہے کہ ہر ایک جاندار کی اولاد اس کی نوع کے موافق ہوا کرتی ہے مثلاً دیکھو کہ جس قدر جانور ہیں مثلاً انسان اور گھوڑا اور گدھا اور ہر ایک پرندہ اپنی اپنی نوع کے لحاظ سے وجود پذیر ہوتے ہیں یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان کسی پرندہ سے پیدا ہو جاوے یا پرند انسان کے پیٹ سے نکلے پھر ایک تیسری دلیل یہ پیش کی ہے کَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ یعنی وہ دونوں حضرت مسیح اور آپ کی والدہ صدیقہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کیوں کھانا کھاتا ہے اور کیوں کھانے کا محتاج ہے۔ اس میں اصل بھید یہ ہے کہ ہمیشہ انسان کے بدن میں سلسلہ تحلیل کا جاری ہے یہاں تک کہ تحقیقات قدیمہ اور جدیدہ سے ثابت ہے کہ چند سال میں پہلا جسم تحلیل پاکر معدوم ہو جاتا ہے اور دوسرا بدن بدل مایتحلل ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک قسم کی جو غذا کھائی جاتی ہے اُس کا بھی روح پر اثر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر بھی ثابت شدہ ہے کہ کبھی روح جسم پر اپنا اثر ڈالتا ہے اور کبھی جسم روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے جیسے اگر روح کو ایک دفعہ کوئی خوشی پہنچتی ہے تو اس خوشی کے آثار یعنی بشاشت اور چمک چہرہ پر بھی نمودار ہوتی ہے اور کبھی جسم کے آثار ہنسنے رونے کے روح پر پڑتے ہیں اب جبکہ یہ حال ہے تو کس قدر مرتبہ خدائی سے یہ بعید ہوگا کہ اپنے اللہ کا جسم بھی ہمیشہ اُڑتا رہے اور تین چار برس کے بعد اور جسم آوے ماسوا اس کے کھانے کا محتاج ہونا بالکل اس مفہوم کے مخالف ہے جو خدائے تعالیٰ کی ذات میں مسلم ہے اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح اُن حاجت مندیوں سے بری نہیں تھے جو تمام انسانوں کو لگی ہوئی ہیں۔ پھر یہ ایک عمدہ دلیل اس بات کی ہے کہ وہ باوجود ان دردوں اور دکھوں کے خدا ہی تھے یا ابن اللہ تھے اور دردہم نے اس لیے کہا کہ بھوک بھی ایک قسم درد کی ہے اور اگر زیادہ ہو جائے تو موت تک نوبت پہنچاتی ہے۔ (جنگ مقدس پرچہ ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۸تا۱۲)

عیسیٰ مسیح ایک رسول ہے پہلے اُس سے سب رسول فوت ہو چکے ہیں اور ماں اُس کی ایک عورت راستباز تھی اور دونوں جب زندہ تھے روٹی کھایا کرتے تھے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کا ابطال کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ پہلے اِس سے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔ اور پھر باوجود اس کے یہ خیال کہ مسیح زندہ آسمان پر بیٹھا ہے باطل ہے۔ پس کس طرح

اس دلیل سے اس کی خدائی ثابت کی جاتی ہے کیونکہ یہ دلیل ہی فاسد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ موت نے کسی کو نہیں چھوڑا سب مرگئے۔ دوسری دلیل اُس کی عبودیت پر یہ ہے کہ اُس کی ماں تھی جس سے وہ پیدا ہُوا اور خدا کی کوئی ماں نہیں۔ تیسری دلیل اس کی عبودیت پر یہ ہے کہ جب وہ اور اس کی ماں زندہ تھے دونوں روٹی کھایا کرتے تھے اور خدا روٹی کھانے سے پاک ہے یعنی روٹی بدل ما یتحلّل ہوتی ہے اور خدا اِس سے بلند تر ہے کہ اُس میں تحلیل پانے کی صفت ہو مگر مسیح روٹی کھاتا رہتا تھا۔ پس اگر وہ خدا ہے تو کیا خدا کا وجود بھی تحلیل پاتا رہتا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طبعی تحقیقات کی رُو سے انسان کا بدن تین برس تک بالکل بدل جاتا ہے اور پہلے اجزا تحلیل ہو کر دوسرے اجزاء اُن کے قائمقام پیدا ہو جاتے ہیں مگر خدا میں یہ نقص ہرگز نہیں۔ یہ دلیل ہے جس کو خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ کے انسان ہونے پر لایا ہے۔

مگر افسوس اِن لوگوں پر کہ جو حضرت عیسیٰ کو آسمان پر پہنچا کر پھر اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے وجود میں انسانوں کی طرح یہ خاصیّت نہیں کہ سلسلہ تحلیل کا اُن میں جاری رہے اور بغیر اس کے جو بذریعہ غذا بدل ما یتحلّل اُن کو ملتا ہو اُن کا وجود فنا سے بچا ہُوا ہوگا۔ اس طرح پر وہ خدا کی اُس بُرہان اور دلیل کو توڑنا چاہتے ہیں جو آیت ممدوحہ بالا میں اُس نے قائم کی ہے یعنی خدا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے کی یہ دلیل دیتا ہے کہ اور انسانوں کی طرح وہ بھی محتاج غذا تھا اور بغیر غذا کے اُس کا بدن قائم نہیں رہ سکتا تھا بلکہ بدل ما یتحلّل کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ لوگ جو حضرت عیسیٰ کو مع جسم عنصری آسمان پر پہنچاتے ہیں وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اُن کا وجود بغیر غذا کے قائم رہ سکتا ہے تو گویا وہ برخلاف منشاء اللہ تعالیٰ کے حضرت عیسیٰ کی خدائی کی ایک دلیل پیش کرتے ہیں شرم کی جگہ ہے کہ جس دلیل کو خدا نے اِس غرض سے پیش کیا ہے کہ تا حضرت عیسیٰ کی انسانیت ثابت ہو یہ لوگ اُس دلیل کی بے عزّتی کرتے ہیں۔ کیونکہ جس بات سے خدا تعالیٰ انکار کرتا ہے کہ وہ بات مسیح میں موجود نہیں تا اُس کو خدا ٹھہرایا جائے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بات اُس میں موجود ہے۔ پس یہ خدا کی اُس حجّت کاملہ کی بے عزّتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے انسان ہونے کے لیے وہ پیش کرتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ حضرت عیسیٰ باوجود جسم عنصری کے روٹی کھانے کے محتاج نہیں اور اُن کا بدن خدا کے وجود کی طرح خود بخود قائم رہ سکتا ہے تو یہ تو اُن کی خدائی کی ایک دلیل ہے جو قدیم سے عیسائی پیش کیا کرتے ہیں اور اُس کے جواب میں یہ کہنا کافی نہیں کہ زمین پر تو وہ روٹی کھایا کرتے تھے گو وہ آسمان پر نہیں کھاتے کیونکہ مخالف کہہ سکتا ہے کہ زمین پر وہ محض اپنے اختیار سے کھاتے تھے انسانوں کی طرح روٹی کے محتاج نہ تھے اور اگر محتاج ہوتے تو آسمان پر بھی ضرور محتاج ہوتے مجھے بار بار اِس قوم پر افسوس آتا ہے کہ خدا تو حضرت مسیح کا روٹی کھانا اُن کی انسانیت پر دلیل لاوے۔ اور یہ لوگ اعتقاد رکھیں کہ گو حضرت مسیح نے زمین پر تیس۳۰ برس تک روٹی کھائی۔ مگر آسمان پر اُنیس سَو۱۹۰۰ برس سے بغیر روٹی

کھانے کے جیتے ہیں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۶-۲۱۸)

مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اور عورتیں صدیقہ نہ تھیں یہ بھی اسی لیے کہا کہ یہودی ان پر تہمت لگاتے تھے تو قرآن نے اس تہمت کو دُور کیا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۹)

حضرت مسیح کی ماں کی نسبت جو صدیقہ کا لفظ آیا ہے یہ بھی دراصل رفع الزام ہی کے لیے آیا ہے یہودی جو معاذ اللہ ان کو فاسقہ فاجرہ ٹھہراتے تھے قرآن شریف نے صدیقہ کہہ کر اُن کے الزاموں کو دُور کیا ہے کہ وہ صدیقہ تھیں۔ اس سے کوئی خصوصیت اور فخر ثابت نہیں ہوتا۔ اور نہ عیسائی کچھ فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بلکہ ان کو تو یہ امور پیش بھی نہیں کرنے چاہئیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

حضرت مسیح اور ان کی ماں مریم پر یہود کا اعتراض تھا مسیح کو وہ لوگ ناجائز ولادت کا الزام لگاتے اور مریم کو زانیہ کہتے تھے۔ قرآن شریف کا کام ہے کہ انبیاء پر سے اعتراضات کو رفع کرے۔ اس لیے اس نے مریم کے حق میں زانیہ کی بجائے صدیقہ کا لفظ رکھا اور مسیح کو مس شیطان سے پاک کہا اگر ایک محلہ میں صرف ایک عورت کا تبریہ کیا جاوے اور اس کی نسبت کہا جاوے کہ وہ بدکار نہیں ہے تو اس سے یہ التزام لازم نہیں آتا کہ باقی کی سب ضرور بدکار ہیں صرف یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس پر جو الزام ہے وہ غلط ہے یا اگر ایک آدمی کو کہا جاوے کہ وہ بھلا مانس ہے تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی کے سب لوگ بھلے مانس نہیں بلکہ بدکار ہیں اسی طرح یہ ایک مقدمہ تھا کہ مسیح اور اس کی ماں پر الزام لگائے گئے تھے خدا نے شہادت دی کہ وہ الزاموں سے بری اور پاک ہیں۔ کیا عدالت اگر ایک ملزم کو قتل کے مقدمہ میں بری کر دے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ باقی کے سب لوگ اس شہر کے ضرور قاتل اور خونخوار ہیں۔ غرضیکہ اس قسم کی بدعات اور فساد پھیلے ہوئے تھے جن کے دور کرنے کے لیے خدا نے ہمیں مبعوث کیا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○

سب فرقوں میں سے مسلمانوں کی طرف زیادہ تر رغبت کرنے والے عیسائی ہیں کیونکہ اُن میں بعض بعض

اہلِ علم اور راہب بھی ہیں جو تکبر نہیں کرتے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۸۵)

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○

اور جب خدا کے کلام کو جو اُس کے رسول پر نازل ہوا ہے سنتے ہیں تب تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ حقانیت کلامِ الٰہی کو پہچان جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو ان لوگوں میں لکھ لے جو تیرے دین کی سچائی کے گواہ ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۸۵)

پانی کا لحاظ تو ہر ایک نے رکھا ہے ان لوگوں نے تالاب وغیرہ رکھا ہے اور قرآن نے گریہ و بکا کا پانی رکھا ہے۔ تو وہ ظاہر پر گئے ہیں اور قرآن شریف حقیقت پر گیا ہے جیسے تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ○

اور کیوں ہم خدا اور خدا کے سچے کلام پر ایمان نہ لاویں حالانکہ ہماری آرزو ہے کہ خدا ہم کو ان بندوں میں داخل کرے جو نیکوکار ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۸۵)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

اَيۡمَانِكُمۡ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيۡمَانِكُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ ؕ وَ احۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ○

وَاحۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ یعنی تم قسم کھاؤ۔ تو جھوٹ اور بد عہدی اور بدنیتی سے اپنی قسم کو بچاؤ۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۸ حاشیہ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ○

شراب اور قمار بازی اور بُت پرستی اور شگون لینا یہ سب پلید اور شیطانی کام ہیں ان سے بچو۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۲۶)

جب انسان تعصّب اور فاسقانہ زندگی سے اندھا ہو جاتا ہے تو اُسے حق اور باطل میں فرق نظر نہیں آتا ہر ایک حلال کو حرام اور ہر ایک حرام کو حلال سمجھتا ہے اور نیکی کے ترک کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا شراب جوام الخبائث ہے عیسائیوں میں حلال سمجھی جاتی ہے مگر ہماری شریعت میں اس کو قطعاً منع کیا گیا ہے اور اس کو رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ کہا گیا ہے کیا کوئی پادری ہے جو یہ دکھا دے کہ انجیل میں حرمت شراب کی لکھی ہے بلکہ شراب ایسی متبرک خیال کی گئی ہے کہ پہلا معجزہ مسیح کا شراب کا ہی تھا تو پھر دلیری کیوں نہ ہو جو بڑا پرہیزگار ان میں ہوگا وہ کم از کم ایک بوتل برانڈی کی ضرور استعمال کرتا ہوگا چنانچہ کثرت شراب نے ولایت میں آئے دن نئے نئے جرائم کو ایجاد کر دیا ہے ...... قمار بازی میں اتلاف حقوق ہوتا ہے شراب نوشی کے ساتھ دوسرے گناہ مثل زنا قتل وغیرہ لازمی پڑے ہوئے ہیں جہاں تک ہمیں مجرموں کے حالات سے شہادت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شراب سے زنا ترقی کرتا ہے چنانچہ شراب نوشی میں اس وقت یورپ اول درجہ پر ہے اور زنا میں بھی اول نمبر پر۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـئَلُوۡا عَنۡ اَشۡيَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ ۚ وَاِنۡ تَسۡـئَلُوۡا عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَكُمۡ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا ؕ وَاللّٰهُ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۝

جو امر یہاں پیدا ہوتا ہے اُس پر اگر غور کیا جاوے اور نیک نیتی اور تقوٰی کے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر سوچا جاوے تو اس سے ایک علم پیدا ہوتا ہے۔ میں اس کو آپ کی صفائی قلب اور نیک نیتی کا نشان سمجھتا ہوں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اُس کو پوچھ لیتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اُس کو نکالتے نہیں اور پوچھتے نہیں جس سے وہ اندر ہی اندر نشو و نما پاتا رہتا ہے اور پھر اپنے شکوک اور شبہات کے انڈے بچے دیدیتا ہے اور روح کو تباہ کر دیتا ہے۔ ایسی کمزوری نفاق تک پہنچا دیتی ہے کہ جب کوئی امر سمجھ میں نہ آوے تو اسے پوچھا نہ جاوے اور خود ہی ایک رائے قائم کر لی جاوے۔ میں اس کو داخل ادب نہیں کرتا کہ انسان اپنی روح کو ہلاک کر لے ہاں یہ سچ ہے کہ ذرا ذراسی بات پر سوال کرنا بھی مناسب نہیں۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اور ایسا ہی اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ آدمی جاسوسی کر کے دوسروں کی بُرائیوں کو نکالتا رہے یہ دونوں طریق بُرے ہیں لیکن اگر کوئی امر اہم دل میں کھٹکے تو اُسے ضرور پیش کر کے پوچھ لینا چاہیئے۔ (الحکم جلد ۷ عـ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صـ۱)

اللہ تعالیٰ نے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ بھی فرمایا ہے بہت کھودنا اچھا نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ عـ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صـ۲۰)

۱۰۶۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝

یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو پہلے اپنے نفسوں کی اصلاح کرو پھر تم دوسروں کی اصلاح کے قابل بنو گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ پہلے اپنے آپ کو درست کیا جاوے۔ جب تک ہم خود اپنے اعمال سے خدا کو راضی نہیں کرتے دوسروں کو خدا کی رضا کی طرف بلانا عبث ہے جس شخص کے اندر خود روشنی اور نور نہیں وہ دوسروں کو کیا روشنی دے سکتا ہے۔ اور جو آپ ٹھوکریں کھا رہا ہے وہ دوسروں کو کیا سہارا دے سکتا ہے۔ جو خود پاک نہیں وہ دوسروں کو کیا پاک کر سکتا ہے۔ جو شخص محض زبان سے کام لیتا ہے وہ مذہب کو بچوں کا کھیل بناتا ہے۔ ایسے مصلحوں سے بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ پہنچے ملک کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے...... میں کہوں گا کہ جو شخص مصلح بننا چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ

پہلے خود اپنی اصلاح کرے۔ پہلے اپنے اندر روشنی پیدا کرے تو پھر دوسروں کو بھی اُس سے روشنی پہنچ سکتی ہے۔ سورج کو دیکھ لو کہ پہلے خود روشنی حاصل کرکے روشن ہُوا تو پھر دوسروں کو روشنی پہنچانے کے قابل ہوا۔ ایسا ہی چاند پہلے خود سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے پھر دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳۵۰-۳۵۱)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو درست کرو جس شخص کے اندر خود روشنی اور نور نہیں ہے۔ وہ اگر زبان سے کام لیگا۔ تو وہ مذہب کو بچوں کا کھیل بنا دیگا۔ اور حقیقت میں ایسے ہی مصلحوں سے ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کی زبان پر تو منطق اور فلسفہ جاری رہتا ہے مگر اندر خالی ہوتا ہے۔

خدا تعالےٰ جانتا ہے کہ مَیں نہایت خیر خواہی سے کہہ رہا ہوں خواہ کوئی میری باتوں کو نیک ظنی سے سُنے یا بدظنی سے۔ مگر میں کہوں گا کہ جو شخص مصلح بننا چاہتا ہے۔ اُسے چاہیئے کہ پہلے خود روشن ہو۔ اور اپنی اصلاح کرے دیکھو یہ سورج جو روشن ہے پہلے اس نے خود روشنی حاصل کی ہے۔

میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ ہر ایک قوم کے معلم نے یہی تعلیم دی ہے لیکن اب دوسرے پر لاٹھی مارنا آسان ہے۔ لیکن اپنی قربانی دینا مشکل ہو گیا ہے۔ پس جو چاہتا ہے کہ قوم کی اصلاح کرے اور خیر خواہی کرے وہ اس کو اپنی اصلاح سے شروع کرے قدیم کے زمانہ کے رِشی اور اوتار جنگلوں اور بنوں میں جا کر اپنی اصلاح کیوں کرتے تھے وہ آجکل کے لیکچرار(ار) وں کی طرح زبان نہ کھولتے تھے جب تک خود عمل نہ کر لیتے تھے یہی خدا تعالیٰ کے قرب اور محبت کی راہ ہے۔ جو شخص دل میں کچھ نہیں رکھتا اس کا بیان کرنا پرنالہ کے پانی کی طرح ہے جو جھگڑے پیدا کرتا ہے اور جو نور معرفت اور عمل سے بھر کر بولتا ہے وہ بارش کی طرح ہے جو رحمت سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت میری نصیحت یاد رکھیں آج کے بعد آپ مجھے یہاں نہ دیکھیں گے اور میں نہیں جانتا کہ پھر موقعہ ہو یا نہ ہو لیکن ان تفرقوں کو مٹانے کی کوشش کرو میری نسبت خواہ آپ کا کچھ ہی خیال ہو لیکن یہ سمجھ کر کہ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　　　ور نوشت است پند بر دیوار

میری نصیحت پر عمل کرو جو شخص خود زہر کھا چکا ہے وہ دوسروں کی زہر کا کیا علاج کرے گا اگر علاج کرتا ہے تو خود بھی مرے گا اور دوسروں کو بھی ہلاک کرے گا کیونکہ زہر اس میں اثر کر چکا ہے اور اس کے حواس چونکہ قائم نہیں رہے اس لیے اس کا علاج بجائے مفید ہونے کے مضر ہوگا۔ غرض جس قدر تفرقہ بڑھتا جاتا ہے اُس کا باعث وہی لوگ ہیں جنہوں نے زبانوں کو تیز کرنا ہی سیکھا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

تم اپنی تبدیلی کے واسطے تین باتیں یاد رکھو (۱) نفس امارہ کے مقابل پر تدابیر اور جد و جہد سے کام لو۔ (۲) دعاؤں سے کام لو۔ (۳) سست اور کاہل نہ بنو اور تھکو نہیں۔

ہماری جماعت بھی اگر بیج کا بیج ہی رہے گی۔ تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جو ردّی رہتے ہیں خدا ان کو بڑھاتا نہیں پس تقویٰ عبادۃ اور ایمانی حالت میں ترقی کرو۔ اگر کوئی شخص مجھے دجال اور کافر وغیرہ ناموں سے پکارتا ہے تو تم اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہ کرو۔ کیونکہ جب خدا میرے ساتھ ہے تو مجھے ان کے ایسے بدکلمات اور گالیوں کا کیا ڈر ہے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کافر کہا تھا ایک زمانہ ایسا آگیا کہ پکار اُٹھا کہ مَیں اس خدا پر ایمان لایا جس پر موسیٰ اور اس کے متبع ایمان لائے ہیں۔ ایسے لوگ یاد رکھو کہ مخنث اور نامرد ہوتے ہیں یہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ بعض اوقات اپنی ماں اور باپ کو بھی ناسمجھی کی وجہ سے گالی دیدیتا ہے مگر اس کے اس فعل کو کوئی بُرا نہیں سمجھتا۔

یہ بھی یاد رکھو کہ نری بیعت اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنا کچھ بھی سودمند نہیں۔ جب کوئی شخص شدۃ پیاس سے مرنے کے قریب ہوجاوے۔ یا شدۃ بھوک سے مرنے تک پہنچ جاوے تو کیا اس وقت ایک قطرہ پانی یا ایک دانہ کھانے کا اس کو موت سے بچالے گا۔ ہرگز نہیں جس طرح اس بدن کو بچانے کے واسطے کافی خوراک اور کافی پانی بہم پہنچانے کے سوائے مفر نہیں۔ اسی طرح پورے جہنم سے تھوڑی سی نیکی سے تم بھی بچ نہیں سکتے۔ پس اس دھوکہ میں نہ رہو کہ ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھدیا ہے اب ہمیں کیا غم ہے۔ ہدایت بھی ایک موت ہے جو شخص یہ موت اپنے اوپر وارد کرتا ہے اس کو پھر نئی زندگی دی جاتی ہے۔ اور یہی اصفیاء کا اعتقاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی ابتدائی حالت کے واسطے فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ یعنی پہلے اپنے آپ کو درست کرو اپنے امراض کو دور کرو۔ دوسروں کا فکر مت کرو۔ ہاں رات کو اپنے آپ کو درست کرو۔ اور دن کو دوسروں کو بھی کچھ ہدایت کردیا کرو۔ خدا تعالےٰ تمہیں بخشے اور تمہارے گناہوں سے تمہیں مخلصی دے۔ اور تمہاری کمزوریوں کو تم سے دور کرے۔ اور اعمال صالح اور نیکی میں ترقی کرنے کی توفیق دیوے۔ (آمین)

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸و۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

بیان میں جب تک روحانیّت اور تقویٰ و طہارت اور سچا جوش نہ ہو اس کا کچھ نیک نتیجہ مرتب نہیں ہوتا ہے۔ وہ بیان جو کہ بغیر روحانیت و خلوص کے ہے وہ اس پرنالہ کے پانی کی مانند ہے جو موقعہ بے موقعہ جوش سے پڑا جاتا ہے اور جس پر پڑتا ہے اُسے بجائے پاک وصاف کرنے کے پلید کردیتا ہے۔ انسان کو پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیئے پھر دوسروں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ یعنی اے مومنو! پہلے اپنی جان کا فکر کرو۔ اگر تم اپنے وجود کو مفید ثابت کرنا چاہو۔ تو پہلے خود پاکیزہ وجود بن جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ باتیں ہی باتیں ہوں اور عملی زندگی میں ان کا کچھ اثر دکھائی نہ دے۔ ایسے شخص کی مثال اس طرح سے ہے کہ کوئی شخص ہے۔ جو سخت تاریکی

میں بیٹھا ہے۔ اب اگر یہ بھی تاریکی ہی لے گیا تو سوائے اس کے کہ کسی پر گر پڑے اور کیا ہوگا اسے چراغ بن کر جانا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسرے روشنی پائیں۔ (البدر جلد ۶ ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ۞

یہ لاعلمی انبیاء کی اُن کی اُس اُمت کے بارے میں ہوتی ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوتی ہے مسیح بھی کہتا ہے کُنۡتُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡہِمۡ تو پھر اگر اُن کو علم نہیں تو وہ شہید کس طرح ہوئے اور کس بات کے ہوئے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حالات سے تو لاعلمی ظاہر کر سکتے ہیں مگر صحابہ کرام کی نسبت نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کو اُن کے حالات معلوم تھے اور آپ اُن میں رہتے تھے۔ اس قسم کی لاعلمی سے وہی لاعلمی مراد ہے یعنی اُس امت کا ذکر جو کہ نبی کے بعد آیا کرتی ہے یا بہت آخری وقت پر آتی ہے کہ اُسے نبی کی صحبت سے کچھ حصّہ نہیں ملتا۔ (البدر جلد ۱ ۳ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۱)

اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ اذۡکُرۡ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ ۘ اِذۡ اَیَّدۡتُّکَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ۟ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَ کَہۡلًا ۚ وَ اِذۡ عَلَّمۡتُکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۚ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ فَتَنۡفُخُ فِیۡہَا فَتَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِیۡ وَ تُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ کَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡکَ اِذۡ جِئۡتَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۞

سے المائدہ آیت ۱۱۸ +

عصمت سے مراد یہ ہے کہ بڑی آفتوں سے جو دشمنوں کا اصل مقصود تھا بچایا جاوے دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عصمت کا وعدہ کیا گیا تھا حالانکہ اُحد کی لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت زخم پہنچے تھے اور یہ حادثہ وعدۂ عصمت کے بعد ظہور میں آیا تھا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فرمایا تھا اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ یعنی یاد کرو وہ زمانہ کہ جب بنی اسرائیل کو جو قتل کا ارادہ رکھتے تھے میں نے تجھ سے روک دیا حالانکہ تواتر قومی سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے گرفتار کرلیا تھا اور صلیب پر کھینچ دیا تھا لیکن خدا نے آخر جان بچادی پس یہی معنے اِذْ كَفَفْتُ کے ہیں جیسا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے ہیں۔ (نزول المسیح ص۱۵۱)

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۝

قرآن شریف کے ایک مقام پر غور کرتے کرتے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی بڑی عظمت اور کامیابی معلوم ہوئی جس کے مقابل میں حضرت مسیح بہت ہی کمزور ثابت ہوئے ہیں۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ نزول مائدہ کی درخواست جب حواریوں نے کی تو وہاں صاف لکھا ہے قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر معجزات مسیح کے بیان کیے جاتے ہیں اور جو حواریوں نے دیکھے تھے ان سب کے بعد ان کا یہ درخواست کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے قلوب پہلے مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ورنہ یہ الفاظ کہنے کی ان کو کیا ضرورت تھی وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا مسیح کی صداقت میں بھی اس سے پہلے کچھ شک ہی سا تھا اور وہ اس جھاڑ پھونک کو معجزہ کی حد تک نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں صحابہ کرام ایسے مطمئن اور قوی الایمان تھے کہ قرآن شریف نے ان کی نسبت رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ[2] فرمایا اور یہ بھی بیان کیا کہ ان پر سکینت نازل فرمائی یہ آیت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی حقیقت کھولتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قائم کرتی ہے صحابہ کا کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہم اطمینان قلب چاہتے ہیں بلکہ صحابہ کا یہ حال کہ ان پر سکینت نازل ہوئی اور یہود کا یہ حال يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ[3] ان کی حالت بتائی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت یہاں تک کھل گئی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کی طرح شناخت کرتے تھے اور نصاریٰ کا یہ حال کہ ان کی آنکھوں سے آپ کو دیکھیں تو آنسو جاری ہوجاتے

[1] المائدہ آیت ۶۸ ◆ [2] المائدہ آیت ۱۲۰ ◆ [3] البقرہ آیت ۱۴۷ وغیرہا۔

تھے یہ مراتب مسیح کو کہاں نصیب! (الحکم جلد ۶ ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

صحابہ کرام کے نمونے ایسے ہیں کہ کل انبیاء کی نظیر ہیں خدا کو تو عمل ہی پسند ہیں انہوں نے بکریوں کی طرح جان دیدی اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے نبوت کی ایک ہیکل آدم سے لیکر چلی آتی تھی اور سمجھ نہ آتی تھی مگر صحابہ کرام نے چمکا کر دکھلا دی اور تبلا دیا کہ صدق اور وفا اسے کہتے ہیں حضرت عیسیٰ کا تو حال ہی نہ پوچھو۔ موسیٰ کو کسی نے فروخت نہ کیا مگر عیسیٰ کو ان کے حواریوں نے ۳۰ (تیس) روپے لیکر فروخت کر دیا۔ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ حواریوں کو عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر شک تھا جبھی تو مائدہ مانگا اور کہا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا تاکہ تیرا سچا اور جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول مائدہ سے پیشتر ان کی حالت نَعْلَمُ کی نہ تھی پھر جیسی بے آرامی کی زندگی انہوں نے بسر کی اس کی نظیر کہیں نہیں پائی جاتی صحابہ کرام کا گروہ عجیب گروہ قابل قدر اور قابل پیروی گروہ تھا ان کے دل یقین سے بھر گئے ہوئے تھے جب یقین ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اول مال وغیرہ دینے کو جی چاہتا ہے پھر جب بڑھ جاتا ہے تو صاحب یقین خدا کی خاطر جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ (البدر جلد ۲ ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵)

۱۱۷-۱۱۸ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا..... تمام قرآن شریف میں توفی کے معنی یہ ہیں

کہ روح کو قبض کرنا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ[۱] پھر فرماتا ہے وَلٰکِنْ اَعْبُدُ اللّٰہَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ[۲] اور پھر فرماتا ہے کہ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ[۳] اور پھر فرماتا ہے حَتّٰی اِذَا جَآءَتْھُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَھُمْ[۴] (الجزو ۸ سورۃ الاعراف) اور پھر فرماتا ہے تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا[۵]۔

ایسا ہی قرآن شریف کے تیئیس مقام میں برابر توفی کے معنی اماتت اور قبض روح ہے لیکن افسوس کہ بعض علماء نے محض الحاد اور تحریف کی رو سے اِس جگہ تَوَفَّیْتَنِیْ سے مراد رَفَعْتَنِیْ لیا ہے اور اس طرف ذرہ خیال نہیں کیا کہ یہ معنے نہ صرف لغت کے مخالف بلکہ سارے قرآن کے مخالف ہیں پس یہی تو الحاد ہے کہ جن خاص معنوں کا قرآن کریم نے اول سے آخر تک التزام کیا ہے اُن کو بغیر کسی قرینہ قویہ کے ترک کر دیا گیا ہے توفی کا لفظ نہ صرف قرآن کریم میں بلکہ جابجا احادیث نبویہ میں بھی وفات دینے اور قبض روح کے معنوں پر ہی آتا ہے چنانچہ جب مَیں نے غور سے صحاح ستّہ کو دیکھا تو ہر یک جگہ جو توفی کا لفظ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلا ہے یا کسی صحابی کے مُنہ سے تو اِنہیں معنوں میں محدود پایا گیا۔ مَیں دعوے سے کہتا ہوں کہ کسی ایک صحیح حدیث میں بھی کوئی ایسا توفی کا لفظ نہیں ملے گا جس کے کوئی اور معنے ہوں۔ مَیں نے معلوم کیا ہے کہ اسلام میں بطور اصطلاح کے قبض روح کے لیے یہ لفظ مقرر کیا گیا ہے تا روح کی بقا پر دلالت کرے

افسوس کہ بعض علماء جب دیکھتے ہیں کہ توفی کے معنے حقیقت میں وفات دینے کے ہیں تو پھر یہ دوسری تاویل پیش کرتے ہیں کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ میں جس توفی کا ذکر ہے وُہ حضرت عیسٰی کے نزول کے بعد واقع ہوگی لیکن تعجب کہ وہ اس قدر تاویلات رکیکہ کرنے سے ذرہ بھی شرم نہیں کرتے وہ نہیں سوچتے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ سے پہلے یہ آیت ہے وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ الخ اور ظاہر ہے کہ قَالَ کا صیغہ ماضی کا ہے اور اُس کے اول اِذْ موجود ہے جو خاص واسطے ماضی کے آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصّہ وقت نزول آیت زمانہ ماضی کا ایک قصّہ تھا نہ زمانہ استقبال کا اور پھر ایسا ہی جو جواب حضرت عیسٰی کی طرف سے ہے یعنی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ وہ بھی بصیغہ ماضی ہے اور اس قصّہ سے پہلے جو بعض دوسرے قصّے قرآن کریم میں اسی طرز سے بیان کیے گئے ہیں وہ بھی اِنہیں معنوں کے مؤید ہیں مثلاً یہ قصہ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً[۶] کیا اس کے یہ معنے کرنے چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کسی استقبال کے زمانہ میں ملائکہ سے ایسا سوال کریگا ماسوا اس کے قرآن شریف اِس سے بھرا پڑا ہے اور حدیثیں بھی اس کی مصدق ہیں کہ موت کے بعد قبل از قیامت بھی بطور باز پُرس سوالات ہوا کرتے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۰۰-۶۰۲)

خدا تو بپابندی اپنے وعدوں کے ہر چیز پر قادر ہے لیکن ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دُنیا میں نہیں لاسکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ مولوی اسلام کے نادان دوست کیا جانتے ہیں کہ ایسے

---

[۱] السجدہ آیت ۱۲ ◦ [۲] یونس آیت ۱۰۵ ◦ [۳] النساء آیت ۱۶ ◦ [۴] الاعراف آیت ۳۸ ◦ [۵] الانعام آیت ۶۲ ◦ [۶] البقرۃ آیت ۳۱ ◦

عقیدوں سے کس قدر عیسائیوں کو مدد پہنچ چکی ہے۔ اب خدا تعالیٰ کو نئی عظمت ابن مریم کو دینا نہیں چاہتا بلکہ یہاں تک کہ جس قدر پہلے اس سے حضرت مسیح کی نسبت اطراء کیا گیا ہے وہ بھی خدا کو سخت ناگوار گذرا ہے اور اسی وجہ سے اس کو کہنا پڑا ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اب آسمان کی طرف دیکھنا کہ کب آسمان سے ابن مریم اترتا ہے سخت جہالت ہے۔ (دافع البلاء ص۱۵-۱۶)

ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تا اس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے...... وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰـھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۔)

قرآن شریف کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ حضرت مسیح اسی خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ قرآن شریف کے کئی مقامات میں مسیح کے فوت ہو جانے کا صریح ذکر ہے اور ایک جگہ خود مسیح کی طرف سے فوت ہو جانے کا اقرار موجود ہے اور وہ یہ ہے کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ۔ اب جبکہ فوت ہو جانا ثابت ہوا تو اس سے ظاہر ہے کہ ان کا جسم ان سب لوگوں کی طرح جو مر جاتے ہیں زمین میں دفن کیا گیا ہو گا کیونکہ قرآن شریف بصراحت ناطق ہے کہ فقط ان کی روح آسمان پر گئی نہ کہ جسم۔ تب ہی تو حضرت مسیح نے آیت موصوفہ بالا میں اپنی موت کا صاف اقرار کر دیا اگر وہ زندوں کی شکل پر خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کرتے تو اپنے مرجانے کا ہرگز ذکر نہ کرتے اور ایسا ہرگز نہ کہتے کہ میں وفات پا کر اس جہان سے رخصت کیا گیا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ آسمان پر ان کی روح ہی گئی تو پھر نازل ہونے کے وقت جسم کہاں سے ساتھ آجائے گا۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ص۲۴۴)

قرآن شریف پر نظر غور ڈالو اور ذرہ آنکھ کھول کر دیکھو کہ وہ صاف اور بیّن طور پر عیسیٰ بن مریم کے مرجانے کی خبر دے رہا ہے جس کی ہم کوئی بھی تاویل نہیں کر سکتے مثلاً یہ جو خدائے تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ کی طرف سے فرماتا ہے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ کیا ہم اس جگہ توفّی سے نیند مراد لے سکتے ہیں؟ کیا یہ معنے اس جگہ موزوں ہوں گے کہ جب تو نے مجھے سلا دیا اور میرے پر نیند غالب کر دی تو میرے سونے کے بعد تو ان کا نگہبان تھا ہرگز نہیں بلکہ توفّی کے سیدھے اور صاف معنے جو موت ہے وہی اس جگہ چسپاں ہیں لیکن موت سے مراد وہ موت نہیں جو آسمان سے اترنے کے بعد پھر وارد ہو کیونکہ جو سوال ان سے کیا گیا ہے یعنی ان کی امت کا بگڑ جانا اس وقت کی موت سے اس سوال کا کچھ علاقہ نہیں کیا نصاریٰ اب صراط مستقیم پر ہیں کیا یہ سچ نہیں کہ جس امر کے بارے میں خدائے تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم سے سوال کیا ہے وہ امر تو خود آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہی کمال کو پہنچ چکا ہے (ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۲۴۶-۲۴۷)

قرآن شریف میں اول سے آخر تک جس جس جگہ توفی کا لفظ آیا ہے ان تمام مقامات میں توفی کے معنی موت ہی لیے گئے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۲۴۶ حاشیہ)

توفی کے معنے وفات دینے کے صرف اجتہادی طور پر ہم نے معلوم نہیں کیے بلکہ مشکوٰۃ کے باب الحشر میں بخاری اور مسلم کی حدیث جو ابن عباس سے ہے صریح اور صاف طور پر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت فلمّا توفیتنی کی یہی تفسیر فرماتے ہیں کہ درحقیقت اُس سے وفات ہی مراد ہے بلکہ اُسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سوال حضرت مسیح سے عالم برزخ میں اُن کی وفات کے بعد کیا گیا تھا نہ یہ کہ قیامت میں کیا جائے گا پس جس آیت کی تفسیر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی کھول دیا پھر اگر کوئی تفسیر نبوی کو بھی سن کر شک میں رہے تو اُس کے ایمان اور اسلام پر اگر افسوس اور تعجب نہ کریں تو اور کیا کریں دیکھو اس حدیث کو امام بخاری انہیں معنوں کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے اپنی صحیح کی کتاب التفسیر میں لایا ہے دیکھو صفحہ ۶۶۵ بخاری۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۴۷-۴۴۸)

امام بخاری رحمۃ اللہ (علیہ) اسی غرض سے آیہ کریمہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ کو کتاب التفسیر میں لایا ہے اور اس ایراد سے اُس کا منشا یہ ہے کہ تا لوگوں پر ظاہر کرے کہ تَوَفَّيْتَنِيْ کے لفظ کی صحیح تفسیر وہی ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ فرماتے ہیں یعنی مار دیا اور وفات دیدی اور حدیث یہ ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ يُجَاءُ بِرِجَالٍ مِّنْ اُمَّتِيْ فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ يَارَبِّ اُصَيْحَابِيْ فَيُقَالُ اِنَّكَ لَاتَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (صفحہ ۶۶۵ بخاری ۶۹۳ بخاری) یعنی قیامت کے دن میں بعض لوگ میری اُمت میں سے آگ کی طرف لائے جائیں گے تب میں کہوں گا کہ اے میرے رب یہ تو میرے اصحاب ہیں تب کہا جائے گا کہ تجھے اُن کاموں کی خبر نہیں جو تیرے پیچھے ان لوگوں نے کیے سو اُس وقت میں وہی بات کہوں گا جو ایک نیک بندہ نے کہی تھی یعنی مسیح ابن مریم نے جب کہ اُس کو پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ تو نے تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا اور وہ بات (جو میں ابن مریم کی طرح کہوں گا) یہ ہے کہ میں جب تک اُن میں تھا اُن پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو اس وقت تو تو ہی اُن کا نگہبان اور محافظ اور نگران تھا۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قصّہ اور مسیح ابن مریم کے قصہ کو ایک ہی رنگ کا قصّہ قرار دیکر وہی لفظ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کا اپنے حق میں استعمال کیا ہے جس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ سے وفات ہی مراد لی ہے کیونکہ اس میں کسی کو اختلاف

نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مزار شریف موجود ہے پس جبکہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کی شرح اور تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وفات پانا ہے ثابت ہوا اور وہی لفظ حضرت مسیح کے منہ سے نکلا تھا اور کھلے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ جن الفاظ کو مسیح ابن مریم نے استعمال کیا تھا وہی الفاظ میں استعمال کروں گا پس اس سے بکلی منکشف ہو گیا کہ مسیح ابن مریم بھی وفات پا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وفات پا گئے اور دونوں برابر طور پر اثر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے متاثر ہیں اسی وجہ سے امام بخاری اِس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو قصداً کتاب التفسیر میں لایا تا وہ مسیح ابن مریم کی نسبت اپنے مذہب کو ظاہر کرے کہ حقیقت میں وہ اُس کے نزدیک فوت ہو گیا ہے۔ یہ مقام سوچنے اور غور کرنے کا ہے کہ امام بخاری آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو کتاب التفسیر میں کیوں لایا۔ پس ادنیٰ سوچ سے صاف ظاہر ہوگا کہ جیسا کہ امام بخاری کی عادت ہے اُس کا منشاء یہ تھا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے حقیقی اور واقعی معنی وہی ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے سو اُس کا مدعا اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ اِس آیت کی یہی تفسیر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروارد کر کے آپ فرمائی ہے یہ بھی واضح رہے کہ اِس طرز کو امام بخاری نے اختیار کر کے صرف اپنا ہی مذہب ظاہر نہیں کیا بلکہ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس آیت فلمّا توفّیتنی کے یہی معنی سمجھتے تھے تبھی تو اُنہیں الفاظ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو بغیر کسی تبدیل و تغییر کے اپنی نسبت استعمال کر لیا۔ پھر امام صاحب نے اسی مقام میں ایک اور کمال کیا ہے کہ اس معنی کے زیادہ پختہ کرنے کے لیے اسی صفحہ ۶۶۵ میں آیت يَعِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ[1] کی بحوالہ ابن عباس کے اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ مُتَوَفِّيكَ مُمِيتُكَ (دیکھو وہی صفحہ ۶۶۵ بخاری) (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۹۲-۸۸۹)

حضرت مسیح علیہ السلام نے آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں صاف صاف اپنا اظہار دیدیا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے دنیا سے اٹھایا گیا کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ جب مجھے وفات دی گئی تو پھر اے میرے رب میرے بعد تو میری اُمت کا نگہبان تھا صاف شہادت دے رہا ہے کہ وہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے وفات پا گئے کیونکہ اگر ان کا دنیا میں پھر آنا مقدر ہوتا تو وہ ضرور ان دونوں واقعات کا ذکر کرتے اور نزول کے بعد کی تبلیغ کا بھی بیان فرماتے نہ یہ کہ صرف اپنی وفات کا ذکر کر کے پھر بعد اپنے خدا تعالیٰ کو قیامت تک نگہبان ٹھہراتے فتدبّر۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ حاشیہ در حاشیہ)

دوسری دلیل مسیح ابن مریم کی وفات پر خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس کو امام بخاری اپنی کتاب التفسیر میں اسی غرض سے لایا ہے کہ تا یہ ظاہر کرے کہ لَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے معنے لمّا

[1] آل عمران ۵۶۔

اَمَتَّنِیْ ہے اور نیز اسی غرض سے اس موقع پر ابن عباس کی روایت سے متوفیک ممیتک کی بھی روایت لایا ہے تا ظاہر کرے کہ لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے وہی معنے ہیں جو اِنّی متوفیک کے معنے ابن عباس نے ظاہر فرمائے ہیں۔ اس مقام پر بخاری کو غور سے دیکھ کر ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ توفیتنی کے معنے امتنی ہیں یعنی تو نے مجھے مار دیا۔ اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں آپ کا مزار موجود ہے پھر جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی لفظ فلما توفیتنی کا حدیث بخاری میں اپنے لیے اختیار کیا ہے اور اپنے حق میں ویسا ہی استعمال کیا ہے جیسا کہ وہ حضرت عیسٰی کے حق میں مستعمل تھا تو کیا اس بات کو سمجھنے میں کچھ کسر رہ گئی کہ جیسا کہ آنحضرت صلعم وفات پا گئے ویسا ہی حضرت مسیح ابن مریم بھی وفات پا گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور مفہوم آیات میں کسی طور سے تحریف جائز نہیں اور جو کچھ اصل منشاء اور اصل مفہوم اور اصل مراد ہر یک لفظ کی ہے اُس سے عمداً اُس کو اور معنوں کی طرف پھیر دینا ایک الحاد ہے جس کے ارتکاب کا کوئی نبی یا غیر نبی مجاز نہیں ہے اس لیے کیونکر ہو سکتا ہے کہ نبی معصوم بجز حالت تطابق کلی کے جو فی الواقع مسیح کی وفات سے اس کی وفات کو تھی لفظ فلما توفیتنی کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا اور نعوذ باللہ تحریف کا مرتکب ہوتا بلکہ ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم امام المعصومین و سید المحفوظین نے (روحی فداہ سبیلہ) لفظ فلما توفیتنی کا نہایت دیانت و امانت کے ساتھ اُنہیں مقررہ معینہ معنوں کے ساتھ اپنے حق میں استعمال کیا ہے کہ جیسا کہ وہ بعینہٖ حضرت عیسیٰؑ کے حق میں وارد ہے۔ اب بھائیو اگر حضرت سید و مولانا بجسدہ العنصری آسمان کی طرف اُٹھائے گئے ہیں اور فوت نہیں ہوئے اور مدینہ میں ان کا مزار مطہر نہیں تو گواہ رہو کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ بھی آسمان کی طرف بجسدہ العنصری اٹھائے گئے ہونگے۔ اور اگر ہمارے سید و مولیٰ و سید الکل ختم المرسلین افضل الاولین والآخرین اول المحبوبین والمقربین درحقیقت فوت ہو چکے ہیں تو آؤ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور فلما توفیتنی کے پیارے لفظوں پر غور کرو جو ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے میں اور اُس عبد صالح میں مشترک بیان کیے جس کا نام مسیح ابن مریم ہے بخاری اس مقام میں سورۂ آل عمران کی یہ آیت اِنّی متوفیک کیوں لایا اور کیوں ابن عباس سے روایت کی کہ متوفیک ممیتک اس کی وجہ بخاری کے صفحہ ۶۶۵ میں شارح بخاری نے یہ لکھی ہے ھذہ الایۃ متوفیک من سورۃ اٰل عمران ذکرھٰھنا لمناسبت فلما توفیتنی یعنی یہ آیت انی متوفیک سورۃ آل عمران میں ہے اور بخاری نے جو اس جگہ اس آیت کے ابن عباس سے یہ معنے کیے کہ متوفیک ممیتک تو اس کا یہ سبب ہے کہ بخاری نے فلما توفیتنی کے معنے کھولنے کے لیے بوجہ مناسبت یہ فقرہ لکھ دیا ورنہ آل عمران کی آیت کو اس جگہ ذکر کرنے کا کوئی محل نہ تھا۔ اب دیکھئے شارح نے بھی اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ امام بخاری اِنّی متوفیک ممیتک کے لفظ کو شہادت کے طور پر بہ تقریب تفسیر آیت فلما

توفیتنی لایا ہے اور کتاب التفسیر میں جو بخاری نے ان دونوں متفرق آیتوں کو جمع کر کے لکھا ہے تو بجز اس کے اُس کا اور کیا مدعا تھا کہ وہ حضرت عیسٰیؑ کی وفات خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت کر چکا ہے۔ اب جبکہ اصح الکتاب کی حدیث مرفوع متصل سے جس کے آپ طالب تھے حضرت عیسٰیؑ کی وفات ثابت ہوئی۔ اور قرآن کی قطعیۃ الدلالت شہادت اس کے ساتھ متفق ہو گئی۔ اور ابن عباس جیسے صحابی نے بھی موت مسیح کا اظہار کر دیا۔ تو اس دوہرے ثبوت کے بعد اور کس ثبوت کی حاجت رہی۔ (الحق دہلی ص۸۶-۸۸)

یاد رہے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ میں اُسی وعدہ کے پورا ہونے کی طرف اشارہ ہے جو آیت یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[۱] میں کیا گیا تھا۔ اور تَوَفِّی کے اُن معنوں کے سمجھنے کے لیے جو مراد اور منشاء اللہ جل شانہ کا ہے ضرور ہے کہ اِن دونوں آیتوں وعدہ اور تحقق وعدہ کو یکجائی نظر سے دیکھا جائے مگر افسوس کہ ہمارے علماء کو اِن تحقیقوں سے کچھ سروکار نہیں۔ یہی توفّی کا لفظ جو قرآن کریم کے دو مقام میں حضرت مسیح کے بارے میں درج ہے ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہی لفظ قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ[۲] اگر ہمارے علماء اس جگہ بھی توفی کے معنے یہی لیتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں تو ہمیں اُن پر کچھ بھی افسوس نہ ہوتا مگر اُن کی بیباکی اور گستاخی تو دیکھو کہ توفی کا لفظ جہاں کہیں قرآن کریم میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے تو اُس کے معنے وفات کے لیتے ہیں اور پھر جب وہی لفظ حضرت مسیح کے حق میں آتا ہے تو اُس کے معنے زندہ اُٹھائے جانے کے بیان کرتے ہیں اور کوئی ان میں سے نہیں دیکھتا کہ لفظ تو ایک ہی ہے اندھے کی طرح ایک دوسرے کی بات کو مانتے جاتے ہیں جس لفظ کو خدا تعالیٰ نے پچیس مرتبہ اپنی کتاب قرآن کریم میں بیان کر کے صاف طور پر کھول دیا کہ اُس کے معنے رُوح کا قبض کرنا ہے نہ اَور کچھ اب تک یہ لوگ اُس لفظ کے معنی مسیح کے حق میں کچھ اَور کے اَور کر جاتے ہیں گویا تمام جہان کے لیے توفی کے معنی تو قبض رُوح ہی ہیں۔ مگر حضرت ابن مریم کے لیے زندہ اُٹھا لینا اُس کے معنے ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۴۳)

اَلَا يَرَوْنَ اَنَّ اللّٰهَ اَخْبَرَ مِنْ وَّفَاتِ الْمَسِيْحِ فِیْ مَقَامَاتٍ شَتّٰی۔ وَالْقُرْاٰنُ كُلُّهٗ مَمْلُوٌّ مِّنْ ذَالِكَ وَلَا تَجِدُ فِيْهِ لِاِثْبَاتِ حَيَاتِهٖ حَرْفًا اَوْ لَفْظًا۔ وَنَهَاكَ قَوْلُ الْمَسِيْحِ فِی الْقُرْاٰنِ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ فَانْظُرْ كَيْفَ

(ترجمہ) کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کی خبر دی ہے اور سارا قرآن کریم اسی خبر سے بھرا پڑا ہے۔ اے مخاطب تو مسیح کی حیات ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید میں ایک حرف یا ایک لفظ بھی نہیں پائے گا اور تیرے لیے قرآن مجید میں حضرت مسیح کا یہ قول کافی ہے وکنت علیھم شھیدا مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت

[۱] آل عمران آیت ۵۶ [۲] یونس آیت ۴۷

يَثْبُتُ مِنْ هٰهُنَا اَنَّ الْمَسِيْحَ تُوُفِّيَ وَخَلَا۔ وَلَوْ كَانَ نُزُوْلُ الْمَسِيْحِ وَمَجِيْئُهٗ مُقَدَّرًا ثَانِيًا لَذَكَرَ الْمَسِيْحُ فِيْ قَوْلِهٖ شَهَادَتَيْنِ وَلَقَالَ مَعَ قَوْلِهٖ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا۔ وَّ اَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّرَّةً اُخْرٰى۔ وَمَا حَصَرَ فِي الشَّهَادَةِ الْاُوْلٰى۔ (آئینہ کمالات الاسلام صفحہ ۴۳۲-۴۳۳)

یاد رہے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ رسل کے لفظ کے ساتھ بھی مسیح موعود کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ سوال کہ انہی الفاظ کے ساتھ جو احادیث میں آئے ہیں کیوں قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تا پڑھنے والوں کو دھوکہ نہ لگ جاوے کہ مسیح موعود سے مراد درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام ہی ہیں جن پر انجیل نازل ہوئی تھی اور ایسا ہی دجّال سے کوئی خاص مفسد مراد ہے سو خدا تعالیٰ نے فرقان حمید میں ان تمام شبہات کو دور کر دیا۔ اس طرح پر کہ اوّل نہایت تصریح اور توضیح سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات کی خبر دی جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ سے ظاہر ہے اور پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا بھی ظاہر کر دیا جیسا کہ فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[1] اور پھر یہودیوں کی بہت سی نافرمانیاں جابجا ذکر کر کے متواتر طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ آخری حالت عام مسلمانوں اور مسلمانوں کے علماء کی یہی ہو جائے گی اور پھر ذکر کیا کہ آخری زمانہ میں غلبہ نصاریٰ کا ہوگا اور اُن کے ہاتھ سے طرح طرح کے فساد پھیلیں گے اور ہر طرف سے امواج فتن اُٹھیں گی اور وہ ہر یک بلندی سے دوڑیں گی۔ (شہادت القرآن صفحہ ۶۵-۶۶)

اِنَّ اللّٰهَ صَرَّحَ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ بِاَنَّ الْمُتَنَصِّرِيْنَ مَا اَشْرَكُوْا وَمَا ضَلُّوْٓا اِلَّا بَعْدَ وَفَاتِ الْمَسِيْحِ كَمَا يُفْهَمُ مِنْ اٰيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ فَلَوْ لَمْ يُتَوَفَّ الْمَسِيْحُ اِلٰى هٰذَا الزَّمَانِ لَلَزِمَ مِنْ هٰذَا اَنْ يَكُوْنَ الْمُتَنَصِّرُوْنَ عَلَى الْحَقِّ اِلٰى هٰذَا الْوَقْتِ وَيَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ مُوَحِّدِيْنَ۔ يَا حَسْرَةً عَلَيْهِمْ لِمَ لَا يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ اَلَيْسَ فِيْهِمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ وَّ فَهِيْمٌ وَّ اَمِيْنٌ وَّ اَنْتَ تَعْلَمُ

انت الرقیب علیھم۔ پس دیکھو کہ اس جگہ سے کیسے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مسیح وفات پا چکے ہیں اور گزر چکے ہیں کیونکہ اگر حضرت مسیح کا نزول اور آپ کا دوبارہ اس دُنیا میں آنا مقدر ہوتا تو مسیح اپنے مذکورہ بالا قول میں دو شہادتوں کا ذکر کرتے اور اپنے قول کنت علیھم شھیدًا کے ساتھ یہ بھی کہتے کہ اکون علیھم شھیدًا مرۃ اخرٰی یعنی میں دوبارہ آکر بھی اُن پر گواہ ہونگا اور صرف پہلی گواہی پر حصر نہ کرتے۔

(ترجمہ) خدائے تعالیٰ نے قرآن میں تصریح کر دی ہے کہ نصاریٰ مسیح کی وفات کے بعد ہی مشرک بنے ہیں جیسا کہ اس آیت سے سمجھا جاتا ہے پس جبکہ تو نے مجھے مار دیا تو پھر تو ہی اُن کا نگہبان تھا پس اگر مسیح نے اب تک وفات نہیں پائی تو لازم آئے گا کہ نصاریٰ اب تک حق پر ہیں اور مومن اور موحد بھی ہیں۔ ان پر افسوس یہ کیوں ان آیتوں میں فکر نہیں کرتے کیا ان میں کوئی بھی رشید اور فہیم اور امین نہیں ہے اور تم بخوبی جانتے ہو کہ بڑی وضاحت سے

---

[1] احزاب آیت ۴۱

إِنَّ اٰيَةَ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ قَدْ دَلَّتْ بِدَلَالَةٍ صَرِيْحَةٍ وَّاضِحَةٍ بَيِّنَةٍ عَلٰى اَنَّ ضَلَالَةَ النَّصَارٰى وَ اتِّخَاذَهُمُ الْعَبْدَ اِلٰهًا مَّشْرُوْطَةٌ بِوَفَاتِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَا يُنْكِرُهٗ اِلَّا مَنْ عَانَدَ الْحَقَّ بِسُوْءِ تَمْيِيْزِهٖ وَاسْتَعْمَلَ الْمُكَابَرَةَ وَالتَّحَكُّمَ بِجَهْلِهٖ وَحُمْقِهٖ وَاَبٰى مُتَعَمِّدًا مِّنْ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا صَرَّحَ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ مِنْ وَّفَاتِ الْمَسِيْحِ وَضَلَالَةِ النَّصَارٰى بَعْدَ وَفَاتِهٖ لَا فِيْ زَمَنِ حَيَاتِهٖ قَالُوْا اَنُؤْمِنُ بِمَعَانِيْ تُخَالِفُ الْاَحَادِيْثَ وَقَدْ كَانُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ اَنَّ الْخَبَرَ الْوَاحِدَ يُرَدُّ بِمُعَارَضَةِ كِتَابِ اللّٰهِ فَنَسُوْا مَا ذَكَّرُوا النَّاسَ وَانْقَلَبُوْا اِلَى الْجَهْلِ بَعْدَ مَا كَانُوْا عَالِمِيْنَ۔ وَمَا نَجِدُ فِيْ حَدِيْثٍ ذِكْرَ رَفْعِ الْمَسِيْحِ حَيًّا بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ بَلْ نَجِدُ ذِكْرَ وَفَاتِ الْمَسِيْحِ فِي الْبُخَارِيِّ وَالطَّبْرَانِيِّ وَغَيْرِهِمَا مِنْ كُتُبِ الْحَدِيْثِ فَلْيَرْجِعْ اِلٰى تِلْكَ الْكُتُبِ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُرْتَابِيْنَ۔

(حمامة البشریٰ مترجم صفحہ ۹۵،۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۳ء)

وَكَذٰلِكَ اَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مَّوْتِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ حَدِيْثٍ اٰخَرَ وَ قَالَ اِذَا سَئَلَنِيْ رَبِّيْ عَنْ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَاَقُوْلُ فِيْ جَوَابِهٖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ مِنْ قَبْلِيْ يَعْنِيْ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَانْظُرْ كَيْفَ اَشَارَ اِلٰى وَفَاتِ الْمَسِيْحِ بِحَيْثُ اسْتَعْمَلَ

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ نصاریٰ کا گمراہ ہونا اور ایک بندہ کو خدا بنانا مسیح کی وفات سے مشروط ہے اور اس سے وہی انکار کرسکتا ہے جو اپنی بے تمیزی سے حق کا دشمن اور مکابرہ کو استعمال میں لائے اور دیدہ و دانستہ ہدایت یاب ہونے سے انکار کرے اور جب ان کو کہا جاتا ہے جس طرح کہ خدا نے اپنی کتاب میں کھلے طور پر بیان کیا ہے کہ مسیح فوت ہوگیا اور ان کی وفات کے بعد نصاریٰ گمراہ ہوئے نہ اُن کی عین حیات میں تم بھی مان لو تو کہتے ہیں کیا ہم ایسے معنی مان لیں جو احادیث کے مخالف ہیں اور حال یہ ہے کہ پہلے خود لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے کہ خبر واحد جب کتاب اللہ کے معارض ہو تو وہ خبر واحد ردّ کی جاتی ہے جو لوگوں کو سناتے تھے اب خود بھول گئے اور عالم ہونے کے بعد جاہل ہوگئے اور ہم کسی حدیث میں نہیں پاتے کہ مسیح زندہ بجسم عنصری آسمان پر اُٹھایا گیا بلکہ بخاری اور طبرانی وغیرہما میں مسیح کی موت ہی کا ذکر پاتے ہیں۔ اور جس کو شک ہے ان کتابوں کا مطالعہ کرلے۔

(ترجمہ) اسی طرح ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے مسیح کی وفات کی خبر دی ہے چنانچہ فرمایا کہ جب میرا خدا میری امت کے فساد کی بابت مجھ سے دریافت فرمائیگا تو میں عرض کرونگا کہ جب تو نے مجھے ماردیا تو پھر تو ہی ان پر نگہبان تھا جیسا کہ عبد صالح یعنی عیسیٰ نے مجھ سے پہلے عرض کی تھی دیکھو آنحضرتؐ نے مسیح کی وفات کی طرف کیا ہی عجیب اشارہ کیا ہے کہ اپنی ذات مبارکہ

لِنَفْسِہٖ جُمْلَۃَ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کَمَا اسْتَعْمَلَہُ الْمَسِیْحُ لِنَفْسِہٖ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ تُوُفِّیَ وَقَبْرُہُ الْمُبَارَکُ مَوْجُوْدٌ فِی الْمَدِیْنَۃِ فَانْکَشَفَ مَعْنَی التَّوَفِّیْ بِجَعْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ .... وَاقِعَۃَ الْمَسِیْحِ وَوَاقِعَۃَ نَفْسِہٖ وَاقِعَۃً وَّاحِدَۃً وَّظَھَرَ اَنَّ مَعْنَی التَّوَفِّیْ فِیْ اٰیَۃِ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ اَلْاِمَاتَۃُ لَا غَیْرُھَا مِنَ الْمَعَانِی الْمَنْحُوْتَۃِ الَّتِیْ لَا اَصْلَ لَھَا فِیْ لُغَتِ الْعَرَبِ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ مَاتَ وَلَوْ کَانَ مَعْنَاہُ الرَّفْعَ اِلَی السَّمَآءِ حَیًّا مَّعَ الْجِسْمِ الْعُنْصُرِیِّ کَمَا ھُوَ زَعْمُ الْقَوْمِ فَرُفِعَ اِذًا نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی السَّمَآءِ حَیًّا مَّعَ الْجِسْمِ الْعُنْصُرِیِّ فَاِنَّہٗ جَعَلَ نَفْسَہٗ شَرِیْکَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ لَفْظِ التَّوَفِّی الَّذِیْ یُوْجَدُ فِیْ اٰیَۃِ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کَمَا جَآءَ فِیْ حَدِیْثِ الْبُخَارِیِّ وَلَوْ جَعَلْنَا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِنَا لِلْمَسِیْحِ مَعْنًی خَاصًّا فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ وَقُلْنَا اِنَّ التَّوَفِّیَ فِیْ حَقِّ رَسُوْلِنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ الْوَفَاتُ وَلٰکِنْ فِیْ حَقِّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ اُرِیْدَ مِنْہُ الرَّفْعُ مَعَ الْجِسْمِ الْعُنْصُرِیِّ لَاشَرِیْکَ لَہٗ فِیْ ھٰذَا الْمَعْنٰی فَھٰذَا ظُلْمٌ وَّزُوْرٌ وَّخِیَانَۃٌ شَنِیْعَۃٌ وَّتَرْجِیْحٌ بِلَا مُرَجِّحٍ وَّاسْتِخْفَافٌ فِیْ شَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَادِّعَآءٌ بِلَا دَلِیْلٍ وَّاضِحٍ وَّحُجَّۃٍ سَاطِعَۃٍ وَّبُرْھَانٍ مُّبِیْنٍ۔

(حمامۃ البشریٰ مترجم ص۲۱۰ تا ۲۱۴ حاشیہ مطبوعہ ۱۹۰۳ء)

کے واسطے فلما توفیتنی کا جملہ ایسا ہی استعمال فرمایا ہے جیسا کہ مسیح نے اپنے لیے استعمال کیا تھا اور تم جانتے ہو کہ آنحضرتؐ تو وفات پا گئے ہیں اور آپ کی قبر مبارک مدینہ طیبہ میں موجود ہے پس جبکہ آنحضرتؐ نے مسیح کے واقعہ کو اپنے واقعہ سے مشابہ اور متحد کر دیا ہے تو اس سے آیت فلما توفیتنی میں توفی کے معنے بخوبی کھل گئے کہ بجز موت کے اور معنے نہیں اور جو معنی من گھڑت بنائے جاتے ہیں لغت عرب میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے (پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں) اور اگر جسم (سمیت) زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا اس کے معنی ہوتے تو اس سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مع جسم عنصری زندہ آسمان پر اُٹھائے جاتے کیونکہ آپؐ نے اپنی ذات مبارکہ کو عیسیٰؑ کے ساتھ لفظ توفی میں شریک کیا ہے جو آیت فلما توفیتنی میں ہے جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آیا ہے۔ اور اگر ہم اپنی طرف سے مسیح کے لیے آیت میں کوئی خاص معنی لے لیویں اور کہیں کہ آنحضرتؐ کے حق میں توفی کے معنے وفات ہیں اور عیسیٰ کے حق میں اس کے معنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اُٹھائے جانے کے ہیں اور یہ معنی عیسیٰ سے مختص ہیں اور دوسرا کوئی ان میں شریک نہیں ہے تو یہ سخت ظلم اور جھوٹ اور خیانت اور ترجیح بلا مرجّح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی کا استخفاف ہے اور یہ ایک دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی روشن دلیل ہے اور نہ کوئی چمکتی ہوئی حجّت اور نہ کوئی بیّن شہادت ہے۔

نَعَمْ يُوجَدُ فِي بَعْضِ الْاَحَادِيْثِ لَفْظُ نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَلٰكِنْ لَّنْ تَجِدَ فِي حَدِيْثٍ ذِكْرَ نُزُوْلِهٖ مِنَ السَّمَآءِ بَلْ ذِكْرُ وَفَاتِهٖ مَوْجُوْدٌ فِي الْقُرْاٰنِ وَمَا جَازَ اَنْ يَّكُوْنَ هٰذَا التَّوَفِّيْ بَعْدَ النُّزُوْلِ لِاَنَّ الْفِتَنَ الَّتِيْ اُشِيْرَ اِلَيْهَا فِيْ اٰيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ اِنَّمَا هَاجَتْ وَظَهَرَتْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مِنْ مُّدَّةٍ طَوِيْلَةٍ وَّتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ كَمَا قَالَ وَتَرَى النَّصَارٰى يَنْحِتُوْنَ لَهُمْ اِلٰهًا وَّابْنَ اِلٰهٍ۔ (حمامۃ البشریٰ مترجم ص ۹۰-۹۱ مطبوعہ ۱۹۰۳ء)

وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ اٰيَةَ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ حَقٌّ وَّلَا شَكَّ اَنَّهَا يَدُلُّ عَلٰى وَفَاتِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ بِدَلَالَةٍ قَطْعِيَّةٍ وَّاَنَّهٗ مَاتَ وَاِنَّا نُؤْمِنُ بِهٖ وَكُتُبُ التَّفْسِيْرِ مَمْلُوَّةٌ مِّنْ هٰذَا الْبَيَانِ وَلٰكِنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا بَقِيَ مَيِّتًا بَلْ بُعِثَ حَيًّا بَعْدَ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ اَوْ سَبْعِ سَاعَاتٍ ثُمَّ رُفِعَ اِلَى السَّمَآءِ بِجَسَدِهِ الْعُنْصُرِيِّ ثُمَّ يَنْزِلُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ عَلَى الْاَرْضِ وَيَمْكُثُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَمُوْتُ مَرَّةً ثَانِيَةً وَّيُدْفَنُ فِيْ اَرْضِ الْمَدِيْنَةِ فِيْ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَاصِلُ كَلَامِهِمْ اَنَّ لِلْخَلْقِ كُلِّهِمْ مَوْتٌ وَّاحِدٌ وَّلِلْمَسِيْحِ مَوْتَتَيْنِ وَلٰكِنَّا اِذَا نَظَرْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ لَمْ نَجِدْ هٰذَا الْقَوْلَ مُخَالِفًا لِنُصُوْصِهِ الْبَيِّنَةِ اَلَا تَرٰى اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ حِكَايَةً عَنْ مُّؤْمِنٍ مُّغْتَبِطًا نَفْسَهٗ بِمَا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مِنَ الْخُلْدِ فِي الْجَنَّةِ وَالْاِقَامَةِ فِيْ دَارِ الْكَرَامَةِ بِلَا مَوْتٍ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ

(ترجمہ) ہاں بعض احادیث میں عیسیٰ بن مریم کے نزول کا لفظ پایا جاتا ہے۔ لیکن کسی حدیث میں یہ نہیں پاؤ گے کہ اس کا نزول آسمان سے ہو گا بلکہ قرآن میں اُس کی وفات کا ذکر موجود ہے اور جائز نہیں کہ یہ وفات نزول کے بعد ہو کیونکہ جن فتنوں کی طرف آیت فلما توفیتنی میں اشارہ ہے اُن کا روئے زمین پر ظہور اور غلبہ تو ایک لمبے زمانہ سے ہو چکا ہے اور جیسا خدا نے فرمایا ایسا ہی پورا ہو چکا ہے اور تو دیکھ رہا ہے کہ نصاریٰ نے اپنے لیے ایک خدا اور ابن اللہ گھڑ لیا ہے۔

(ترجمہ) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت فلما توفیتنی برحق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ قطعی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ آپ وفات پا گئے ہیں اور ہم اس پر ایمان بھی لاتے ہیں اور تفاسیر کی کتب اس بیان سے بھری پڑی ہیں لیکن بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مرنے کے بعد موت کی حالت میں باقی نہیں رہے تھے بلکہ تین دن یا سات گھنٹوں کے بعد دوبارہ زندہ کر دیئے گئے تھے پھر آسمان کی طرف بجسد عنصری اُٹھا لیے گئے۔ پھر آپ آخری زمانہ میں زمین پر اُتریں گے اور چالیس سال گذاریں گے۔ پھر دوبارہ وفات پائیں گے اور مدینہ کی زمین میں نبی کریم صلعم کی قبر میں دفن کیے جائیں گے۔ گویا ان کا حاصل کلام یہ ہے کہ تمام مخلوق کیلئے تو ایک ہی موت ہے لیکن مسیح علیہ السلام کے لیے دو موتیں ہیں لیکن جب ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو اس قول کو اس کی نصوص بینہ کے خلاف پاتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں ایک ایسے مومن کی طرف سے حکایتاً بیان فرمایا ہے جو ان نعماء پر اپنے نفس کو قابل رشک قرار دیتا تھا

إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۔ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ فَانْظُرْ أَيُّهَا الْعَزِيْزُ كَيْفَ أَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِلٰى امْتِنَاعِ الْمَوْتِ الثَّانِيْ بَعْدَ الْمَوْتَةِ الْأُولٰى وَبَشَّرَنَا بِالْخُلُوْدِ فِي الْعَالَمِ الثَّانِيْ بَعْدَ الْمَوْتِ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُنْكِرِيْنَ۔ (حمامة البشریٰ ص۴۵)

بخاری کھول کر دیکھو اور پاک دل کے ساتھ اس آیت میں غور کرو کہ میں قیامت کے دن اسی طرح فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کہوں گا جیسا کہ ایک عبد صالح یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کہا اور سوچو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلمہ لفظ توفی کے لیے کیسی ایک تفسیر لطیف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی تغیر اور تبدیل کے لفظ متنازعہ فیہ کا مصداق اپنے تئیں ایسا ٹھہرا لیا جیسا کہ آیت موصوفہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام اس کے مصداق تھے۔ اب کیا ہمیں جائز ہے کہ ہم یہ بات زبان پر لاویں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کے حقیقی مصداق نہیں تھے اور حقیقی مصداق عیسٰی علیہ السلام ہی تھے اور جو کچھ اس آیت سے درحقیقت خدا تعالیٰ کا منشاء تھا اور جو معنے توفی کے واقعی طور پر اس جگہ مراد الٰہی تھی اور قدیم سے وہ مراد علم الٰہی میں قرار پا چکی تھی یعنی زندہ آسمان پر اُٹھائے جانا نعوذ باللہ اُس خاص معنی میں آنحضرت صلعم شریک نہیں تھے بلکہ آنحضرت نے اس آیت کو اپنی طرف منسوب کرنے کے وقت اُس کے معنوں میں تغیر و تبدیل کر دی ہے اور دراصل جب اس لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کریں تو اس کے اَور معنے ہیں اور جب حضرت مسیح کی طرف یہ لفظ منسوب کریں تو پھر اُس کے وُہی حقیقی معنے لیے جاویں گے جو خدائے تعالیٰ کے قدیم ارادہ میں تھے پس اگر یہی بات سچ ہے تو علاوہ اِس فساد صریح کے کہ ایک نبی کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ ایک قرار دادہ معنوں کو توڑ کر اُن میں ایک ایسا تصرف کرے کہ بجز تحریف معنوی کے اور کوئی دوسرا نام اُس کا ہو ہی نہیں سکتا دوسرا فساد یہ ہے کہ جس اتحاد مقولہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا یعنی فلمّا توفیتنی کا وہ اتحاد بھی تو قائم نہ رہا کیونکہ اتحاد تو تب قائم رہتا کہ توفی کے معنوں میں آنحضرتؐ اور حضرت عیسٰی شریک ہو جاتے مگر وہ شرکت تو میسّر نہ آئی پھر اتحاد کس بات میں ہُوا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا جو آپ نے ناحق ایک ایسے اشتراک کی طرف ہاتھ پھیلایا جس کا آپ کو کسی طرح سے حق نہیں پہنچتا تھا بھلا زمین میں دفن ہونے والے اور آسمان پر زندہ اُٹھائے جانے والے میں ایک ایسے لفظ میں کہ یا مرنے کے اور یا زندہ اُٹھائے

جو اسے ہمیشہ رہنے والی جنت اور عزت والے گھر میں موت کے بغیر ہمیشہ کے لیے دی گئیں۔

پس اے عزیز دیکھ کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کس طرح پہلی موت کے بعد دوسری موت کے ناممکن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہمیں موت کے بعد عالم ثانی میں ہمیشہ رہنے کی بشارت دی ہے پس تو انکار کرنے والوں میں سے نہ بن۔

لہ الصّٰفّٰت آیت ۶۰ ؎

جانے کے معنی رکھتا ہے کیونکر اشتراک ہو گیا ضدین ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور اگر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں توفی کے معنے مارنا نہیں تھا تو پھر کیا امام بخاری کی عقل ماری گئی کہ وہ اپنی صحیح میں اس معنے کی تائید کے لیے ایک اور آیت دوسرے مقام سے اُٹھا کر اس مقام میں لے آیا یعنی آیت انی متوفیک اور پھر اسی پر بس نہ کیا بلکہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی اس جگہ جڑ دیا کہ متوفیک ممیتک یعنی متوفیک کے یہ معنی ہیں کہ میں تجھے مارنے والا ہوں۔ اگر بخاری کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمثیلی معنوں کو ابن عباس کے صریح معنوں کے ساتھ زیادہ کھول دے تو اِن دونوں آیتوں کو جمع کرنے اور ابن عباس کے معنوں کے ذکر سے کیا مطلب تھا اور کونسا محل تھا کہ توفی کے معنے کی بحث شروع کر دیتا۔ پس درحقیقت امام بخاری نے اس کارروائی سے توفی کے معنوں میں جو کچھ اپنا مذہب تھا ظاہر کر دیا سو اس جگہ ہمارے تائید دعویٰ کے لیے تین چیزیں ہو گئیں اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک کہ جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰ نے فلما توفیتنی کہا میں بھی فلما توفیتنی کہوں گا۔ دوسرے ابن عباس سے توفی کے لفظ کے معنے مارنا ہے تیسرے امام بخاری کی شہادت جو اُس کی عملی کارروائی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ (سر الخلافہ صفحہ ۴۷-۴۶)

اگر مسیح کی وفات کے عقیدہ کی وجہ سے ہمیں کافر کہا جاتا ہے تو امام مالک کو بھی کافر بناؤ کہ اُن کا عقیدہ بھی یہی تھا جس سے رجوع ثابت نہیں۔ اور امام بخاری کا بھی یہی عقیدہ تھا اگر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو کیوں وہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کی شرح کے وقت تائید حدیث کے لیے ابن عباس کا یہ قول لاتا متوفیک ممیتک پس اِس حساب سے امام بخاری بھی کافر ہوئے اور یہی عقیدہ ابن قیم نے مدارج السالکین میں ظاہر کیا ہے۔ (انوار الاسلام صفحہ ۳۳)

صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ متوفیک ممیتک اور اس کی تائید میں صاحب بخاری اسی محل میں ایک حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لایا ہے پس جو معنی توفی کے ابن عباس اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام متنازعہ فیہ میں ثابت ہو چکے اس کے برخلاف کوئی اور معنی کرنا بھی ملحدانہ طریق ہے مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں کہ خود آنحضرت ؐ نے مقام متنازعہ فیہ میں یہی معنے کیے پس بڑی بے ایمانی ہے جو نبی کریم کے معنوں کو ترک کر دیا جائے اور جبکہ اس جگہ توفی کے معنی قطعی طور پر وفات دینا ہی ہُوا تو پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وفات آئندہ کے زمانہ میں ہو گی کیونکہ آیت فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم صاف صاف تبلا رہی ہے کہ وفات ہو چکی وجہ یہ کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جناب الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ عیسائی میری وفات کے بعد بگڑے ہیں پھر اگر فرض کر لیں کہ اب تک حضرت عیسیٰ فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ اب تک عیسائی بھی نہیں بگڑے حالانکہ ان کمبختوں نے عاجز انسان کو خدا بنا دیا اور نہ صرف شرک کی نجاست کھائی بلکہ سور کھانا شراب پینا زنا کرنا سب انہیں لوگوں کے حصّہ میں آ گیا کیا کوئی دنیا میں بدی ہے جو ان میں پائی نہیں جاتی۔ کیا کوئی

ایسا بدکاری کا کام ہے جس میں یہ لوگ نمبر اوّل پر نہیں پس صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ بگڑ گئے اور شرک اور ناپاکیوں کا جذام ان کو کھا گیا اور اسلام کی عداوت نے ان کو تحت الثریٰ میں پہنچا دیا اور نہ صرف آپ ہی ہلاک ہوئے بلکہ ان کی ناپاک زندگی نے ہزاروں کو ہلاک کیا۔ (ست بچن بار دوم ص۱۶۲-۱۶۳ حاشیہ در حاشیہ متعلقہ ص۱۶۴)

وَالْعَجَبُ کُلُّ الْعَجَبِ اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّا آمَنَّا بِاٰیَاتِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَلَا یُؤْمِنُوْنَ۔ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّا نَتَّبِعُ صُحُفَ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یَتَّبِعُوْنَ۔ اَلَا یَقْرَءُوْنَ فِی الْکِتَابِ الْاَجْلٰی مَا قَالَ اللّٰہُ فِیْ عِیْسٰی اِذْ قَالَ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ[۱]۔ وَقَالَ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ۔ وَمَا قَالَ اِنِّیْ مُحْیِیْکَ۔ فَمِنْ اَیْنَ عَلِمَ حَیَاتُ الْمَسِیْحِ بَعْدَ مَوْتِہِ الصَّرِیْحِ۔ یُؤْمِنُوْنَ بِاَنَّہٗ لَحِقَ الْاَمْوَاتَ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ مَا مَاتَ۔ تِلْکَ کَلِمٌ کُلُّھَا فِتَنٌ ۔ کَمِثْلِ قِصَّۃٍ۔ لَا یَنْطِقُ بِھَا اِلَّا الَّذِیْ ضَلَّتْ حَوَاسُّہٗ وَغَرَبَ عَقْلُہٗ وَقِیَاسُہٗ وَتَرَکَ طَرِیْقَ الْمُھْتَدِیْنَ۔ (انجام آتھم ص۸۳)

قرآن شریف صاف کہتا ہے کہ مسیح وفات پا کر آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔ لہٰذا اُس کا نزول بُروزی ہے نہ کہ حقیقی۔ اور آیت فلما توفیتنی میں صریح ظاہر کیا گیا ہے کہ واقعہ وفات حضرت عیسٰی علیہ السلام وقوع میں آ گیا۔ کیونکہ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات کے بعد بگڑیں گے نہ کہ ان کی زندگی میں۔ پس اگر فرض کریں کہ اب تک حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت نہیں ہوئے تو ماننا پڑیگا کہ عیسائی بھی اب تک نہیں بگڑے۔ اور یہ صریح باطل ہے۔ بلکہ آیت تو بتلاتی ہے کہ عیسائی صرف مسیح کی زندگی تک حق پر قائم رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حواریوں کے عہد میں ہی خرابی شروع ہو گئی تھی۔ اگر حواریوں کا زمانہ بھی ایسا ہوتا کہ اُس زمانہ میں بھی عیسائی حق پر قائم ہوتے تو خدا تعالیٰ اس آیت میں صرف مسیح کی زندگی کی قید نہ لگاتا بلکہ حواریوں کی زندگی کی بھی قید لگا دیتا۔ پس اس جگہ سے ایک نہایت عمدہ نکتہ عیسائیت کے زمانہ فساد کا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ درحقیقت حواریوں کے زمانہ میں ہی عیسائی مذہب میں شرک کی تخم ریزی ہو گئی تھی۔ (ضمیمہ انجام آتھم ص۳۷)

آیت فلما توفیتنی صاف ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اور صحیح بخاری میں

(ترجمہ) اور سب سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں لاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کی پیروی کرتے ہیں لیکن حقیقتاً پیروی نہیں کرتے کیا وہ برتر کتاب قرآن کریم میں اس کو نہیں پڑھتے جو عیسٰی علیہ السلام کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اذ قال اللّٰہ یا عیسٰی انی متوفیک اسی طرح فرمایا فلما توفیتنی اور یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہیں دوبارہ زندہ کرنیوالا ہوں۔ پس آپ کی صریح موت کے بعد حیات مسیح کا علم ان لوگوں کو کہاں سے ہوا۔ یہ لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح وفات یافتوں میں جا شامل ہوئے پھر بایں ہمہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ فوت نہیں ہوئے۔ یہ ساری باتیں متناقض اور پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں ایسی باتیں صرف حواس باختہ اور عقل و قیاس سے محروم اور ہدایت یافتہ لوگوں کے طریق کو ترک کرنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔ (انجام آتھم ص۸۳)

---

[۱] آل عمران آیت ۵۶

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور نیز حدیث نبوی سے اس بات کا ثبوت دیدیا ہے کہ اس جگہ توفی کے معنے مار دینے کے ہیں۔ اور یہ کہنا بیجا ہے کہ "یہ لفظ توفیتنی جو ماضی کے صیغہ میں آیا ہے دراصل اس جگہ مضارع کے معنے دیتا ہے یعنی ابھی نہیں مرے بلکہ آخری زمانہ میں جاکر مریں گے"۔ کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ میری امت کے لوگ میری زندگی میں نہیں بگڑے بلکہ میری موت کے بعد بگڑے ہیں۔ پس اگر فرض کیا جائے کہ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب تک نصاریٰ بھی نہیں بگڑے۔ کیونکہ آیت میں صاف طور پر تبلایا گیا کہ نصاریٰ کا بگڑنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد ہے اور اس سے زیادہ اور کوئی سخت بے ایمانی نہیں ہوگی کہ ایسی نص صریح سے انکار کیا جائے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۱۸۶ حاشیہ)

صحابہ..... بلاشبہ بموجب آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس بات پر ایمان لاتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں تبھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اس بات کا احساس کرکے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات میں شک رکھتے ہیں زور سے یہ بیان کیا کہ کوئی بھی نبی زندہ نہیں ہے سب فوت ہو گئے۔ اور یہ آیت پڑھی کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[1] اور کسی نے اُن کے اس بیان پر انکار نہ کیا۔ (کتاب البریہ صفحہ ۱۸۷ حاشیہ)

میں جیسا کہ اور اختلافات میں فیصلہ کرنے کے لیے حکم ہوں ایسا ہی وفات حیات کے جھگڑے میں بھی میں حکم ہوں۔ اور میں امام مالک اور ابن حزم اور معتزلہ کے قول کو مسیح کی وفات کے بارے میں صحیح قرار دیتا ہوں اور دوسرے اہل سنت کو غلطی کا مرتکب سمجھتا ہوں۔ سو میں بحیثیت حکم ہونے کے ان جھگڑا کرنے والوں میں یہ حکم صادر کرتا ہوں کہ نزول کے اجمالی معنوں میں یہ گروہ اہل سنت کا سچا ہے کیونکہ مسیح کا بروزی طور پر نزول ہونا ضروری تھا۔ ہاں نزول کی کیفیت بیان کرنے میں ان لوگوں نے غلطی کھائی ہے نزول صفت بروزی تھا نہ کہ حقیقی اور مسیح کی وفات کے مسئلہ میں معتزلہ اور امام مالک اور ابن حزم وغیرہ ہم کلام اُن کے سچے ہیں کیونکہ بموجب نص صریح آیت کریمہ یعنی آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے مسیح کا عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے وفات پانا ضروری تھا۔ یہ میری طرف سے بطور حکم کے فیصلہ ہے اب جو شخص میرے فیصلہ کو قبول نہیں کرتا وہ اس کو قبول نہیں کرتا جس نے مجھے حکم مقرر فرمایا ہے۔

(ضرورت الامام صفحہ ۲۵)

آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي نے صاف اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ عیسائی عقیدہ میں جس قدر بگاڑ اور فساد ہوا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ کو زندہ مانیں اور کہیں کہ اب تک وہ فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ نصاریٰ نے بھی اب تک اپنے عقائد کو نہیں بگاڑا۔ کیونکہ آیت موصوفہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نصاریٰ کے عقیدوں کا بگڑنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوگا۔ رہی یہ بات کہ توفی کے اس

---

[1] آل عمران آیت ۱۴۵

جگہ کیا معنے ہیں؟ اس کا فیصلہ نہایت صفائی سے صحیح بخاری میں ہو گیا ہے کہ توفّی مارنے کو کہتے ہیں۔ یہ قول ابن عباس ہے جس کو حدیث کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ کے ساتھ بخاری میں اور بھی تقویت دی گئی ہے اور شارح عینی نے اس قول کا اسناد بیان کیا ہے۔ اب ایک تسلی ڈھونڈنے والا سمجھ سکتا ہے کہ قرآن شریف اور اُسی کتاب میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے صاف گواہی دی گئی ہے کہ حضرت عیسٰی فوت ہو گئے اور اس شہادت میں صرف امام بخاری رضی اللہ عنہ منفرد نہیں بلکہ امام ابن حزم اور امام مالک رضی اللہ عنہما بھی موت عیسٰی علیہ السلام کے قائل ہیں۔ اور ان کا قائل ہونا گویا امت کے تمام اکابر کا قائل ہونا ہے کیونکہ اُس زمانہ کے اکابر علماء سے مخالفت منقول نہیں اور اگر مخالفت کرتے تو البتہ کسی کتاب میں اُس کا ذکر ہوتا۔ (ایام الصلح ص۳۸-۳۹)

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ تو اس سے ہرگز نہیں سمجھا جاتا کہ مفہوم صلوٰۃ کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا گیا ہے وہ غیر اس مفہوم کا ہے جو حضرت ابراہیم کی نسبت استعمال کیا گیا ہے ۔ ایسا خیال کرنا تو سراسر حماقت ہے۔ پس اسی طرح یہ بھی حماقت ہے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے آنجناب کی وفات مراد لی جائے اور پھر جب حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف اسی آیت کو منسوب کریں تو ان کی حیات مراد لی جائے تو یہ تشبیہ کیونکر ٹھہری یہ دونوں امر تو ایک دوسرے کے ضد واقع ہیں۔ اس سے زیادہ اور کوئی حماقت نہیں ہو گی کہ تشبیہ میں مخالفت اور منافات تلاش کی جائے۔ ہاں جس فرق کا مشبہ مشبہ بہ میں باوجود اشتراک امر مشابہت کے ہونا ضروری ہے اس جگہ وہ فرق اس طرح پر ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس بات کا جواب دینا تھا کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کی پرستش ہوئی اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا جواب دینا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد بعض لوگ اسلام کی سنتوں اور راہوں پر قائم نہ رہے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی۔ اس اختلاف سے جو دو امتوں کی ضلالت میں پایا جاتا ہے مشبّہ اور مشبہ بہ کا فرق ظاہر ہو گیا اور یہی ہونا چاہیئے تھا نہ یہ کہ مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے نقیض ہوں جیسے مردہ اور زندہ اور بزدل اور شجاع۔ (ایام الصلح ص۸۱-۸۲)

خدا نے صریح لفظوں میں حضرت عیسٰی کی وفات کو قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا ہے۔ دیکھو کیسی یہ آیت فلما توفیتنی حضرت عیسٰی کی وفات پر نص صریح ہے اور اب اس آیت کے سننے کے بعد اگر کوئی حضرت عیسٰی کی وفات سے انکار کرتا ہے تو اسے ماننا پڑتا ہے کہ عیسائی اپنے عقاید میں حق پر ہیں کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عیسائی لوگ حضرت عیسٰی کی وفات کے بعد بگڑیں گے۔ پھر جبکہ اس آیت سے موت ثابت ہوئی تو آسمان سے نازل کیونکر ہوں گے۔ آسمان پر مردے تو نہیں رہ سکتے۔ (ایام الصلح ص۸۵)

یقیناً اُس وقت عیسائیوں نے مسیح کی الوہیت کے لیے یہ حجت بھی پیش کی ہو گی کہ وہ زندہ آسمان پر موجود ہے لہٰذا اُس کے رد میں خدا تعالیٰ کو خود مسیح کے اقرار کے حوالہ سے یہ کہنا پڑا فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ

الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ (ایام الصلح ص۱۳۶ حاشیہ)

اس آیت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام صاف اقرار کرتے ہیں کہ عیسائی میرے مرنے کے بعد بگڑے ہیں میری زندگی میں ہرگز نہیں بگڑے۔ پس اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام اب تک بجسم عنصری زندہ ہیں تو ماننا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک اپنے سچے دین پر قائم ہیں اور یہ صریح باطل ہے۔ (تریاق القلوب ص۱۴۲ حاشیہ)

افسوس کہ قرآن شریف میں فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کی آیت پڑھتے ہو اور خوب جانتے ہو کہ سارے قرآن شریف میں ہر جگہ توفّی بمعنی قبض روح ہے اور ایسا ہی یقین رکھتے ہو کہ تمام حدیثوں میں بھی توفی بمعنی قبض روح ہے اور پھر افترا کے طور پر کہتے ہو کہ اس جگہ پر توفی بمعنی زندہ اُٹھا لینے کے ہیں۔ پس اگر تم اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا نہیں کرتے تو بتلاؤ اور پیش کرو کہ کس حدیث میں ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ مع جسم عنصری آسمان پر چلے گئے تھے ہائے افسوس اس قدر جھوٹ اور افترا۔ (تحفہ غزنویہ ص۳۱-۳۲)

میں تو اب بھی ماننے کو طیار ہوں اگر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کے معنے بجز مارنے اور ہلاک کرنے کے کسی حدیث سے کچھ اور ثابت کر سکو یا کسی آیت یا حدیث سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مع جسم عنصری آسمان پر چڑھنا یا مع جسم عنصری آسمان سے اُترنا ثابت کر سکو۔ یا اگر اخبار غیبیہ میں جو خدا تعالےٰ سے مجھ پر ظاہر ہوتی ہیں میرا مقابلہ کر سکو یا استجابت دعا میں میرا مقابلہ کر سکو یا تحریر زبان عربی میں میرا مقابلہ کر سکو یا اور آسمانی نشانوں میں جو مجھے عطا ہوئے ہیں میرا مقابلہ کر سکو تو میں جھوٹا ہوں۔ (تحفہ غزنویہ ص۱۳)

خود بخاری نے اسی مقام میں اس آیت یعنی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کو بغرض تظاہر آیتین ذکر کر کے جتلا دیا ہے کہ یہی تفسیر فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کی ہے اور وہی استدلال قول ابن عباس کا اس جگہ صحیح ہے جیسا کہ انّی متوفیک[۵۱] میں صحیح ہے اور نیز اس جگہ یہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ جو اصدق الصّادقین ہے اُس نے اپنے کلام میں صدق کو دو قسم قرار دیا ہے ایک صدق باعتبار ظاہر الاقوال دوسرے صدق باعتبار التاویل والمآل۔ پہلی قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسٰی مریم کا بیٹا تھا اور ابراہیم کے دو بیٹے تھے اسماعیل و اسحاق کیونکہ ظاہر واقعات بغیر تاویل کے یہی ہیں دوسری قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے قرآن شریف میں کفار یا گذشتہ مومنوں کے کلمات کچھ تصرّف کر کے بیان فرمائے گئے ہیں اور پھر کہا گیا کہ یہ اُنہی کے کلمات ہیں اور یا جو قصے توریت کے ذکر کیے گئے ہیں اور اُن میں بہت سا تصرف ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس اعجازی طرز اور طریق اور فصیح فقروں اور دلچسپ استعارات میں قرآنی عبارات ہیں اس قسم کے فصیح فقرے کافروں کے مُنہ سے ہرگز نہیں نکلتے تھے اور نہ یہ ترتیب تھی بلکہ یہ ترتیب قصوں کی جو قرآن میں ہے توریت میں بھی بالالتزام ہرگز نہیں ہے حالانکہ فرمایا ہے اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى[۵۲]۔ اور اگر یہ کلمات اپنی صورت اور ترتیب اور صیغوں کے رو سے وہی ہیں جو مثلاً کافروں کے منہ سے نکلے تھے تو اس سے

---

[۵۱] آل عمران آیت ۵۶۔ [۵۲] الاعلیٰ آیت ۱۹-۲۰۔

اعجاز قرآنی باطل ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ فصاحت کفار کی ہوئی نہ قرآن کی اور اگر وہی نہیں تو بقول تمہارے کذب لازم آتا ہے کیونکہ اُن لوگوں نے تو اور اور لفظ اور اور ترتیب اور اور صیغے اختیار کیے تھے اور جس طرح متوفیک اور توفیتنی دو مختلف صیغے ہیں اسی طرح صدہا جگہ ان کے صیغے اور قرآنی صیغے باہم اختلاف رکھتے تھے مثلاً توریت میں ایک قصہ یوسف ہے نکال کر دیکھ لو اور پھر قرآن شریف کی سورہ یوسف سے اس کا مقابلہ کرو تو دیکھو کہ کس قدر صیغوں میں اختلاف اور بیان میں کمی بیشی ہے بلکہ بعض جگہ بظاہر معنوں میں بھی اختلاف ہے ایسا ہی قرآن نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا باپ آزر تھا لیکن اکثر مفسر لکھتے ہیں کہ اس کا باپ کوئی اور تھا نہ آزر۔ اب اے نادان جلد توبہ کر کہ تو نے پادریوں کی طرح قرآن پر بھی حملہ کر دیا۔ صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اسی طرح جب ہم نے دیکھا کہ اس محل میں تمام احادیث کا مقصود مشترک یہ ہے کہ تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنے ہیں اَمَتَّنِیْ تو بصحت نیت اس کا ذکر کر دیا۔ اس طرز کے بیان کو جھوٹ سے کیا مناسبت اور جھوٹ کو اس سے کیا نسبت۔ کیا یہ سچ نہیں کہ امام بخاری کا مدعا اس فقرہ مُتَوَفِّیْکَ مُمِیْتُکَ سے یہ ثابت کرنا ہے کہ لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنی ہیں اَمَتَّنِیْ اور اسی لیے وہ دو مختلف محل کی دو آیتیں ایک جگہ ذکر کرکے اور ایک دوسرے کو بطور تظاہر قوت دیکر دکھلاتا ہے کہ ابن عباس کا یہ منشاء تھا کہ لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنے ہیں اَمَتَّنِیْ اس لیے ہم نے بھی بطور تاویل اور مآل کے یہ کہہ دیا کہ حدیثوں کے رو سے لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنے اَمَتَّنِیْ ہے بھلا اگر یہ صحیح نہیں ہے تو تو ہی بتلا کہ جبکہ مُتَوَفِّیْکَ کے معنی مُمِیْتُکَ ہوئے تو اس قول ابن عباس کے رو سے لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے کیا معنے ہوئے کیا ہمیں ضرور نہیں کہ ہم لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنے ایسی حدیث کی رو سے کریں جیسی کہ حدیث کی رو سے مُتَوَفِّیْکَ کے معنے کیے گئے ہیں۔ اگر ہم اس بات کے مجاز ہیں کہ ایک ہی محل کی دو آیتوں کی تفسیر میں ایک آیت کی تفسیر کو بطور حجت پیش کردیں تو اس میں کیا جھوٹ ہوا کہ ہم نے لکھ دیا کہ حدیث کے رو سے لَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنے لَمَّا اَمَتَّنِیْ ہیں جبکہ توفی کے ایک صیغہ میں حدیث کی رو سے یہ ستفاد ہو چکا کہ اس کے معنے وفات دینا ہے تو وہی استدلال دوسرے صیغہ میں بھی جاری کرنا کیوں حدیثی استدلال سے باہر سمجھا جاتا ہے اور یہ کہنا کہ ہم اُسی قول کو حدیث کہیں گے جس کا اسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو یعنی وہ مرفوع متصل ہو یہ اور جہالت ہے کیا جو منقطع حدیث ہو اور مرفوع متصل نہ ہو وہ حدیث نہیں کہلاتی۔ شیعہ مذہب کے امام اور محدث کسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچاتے تو کیا اُن اخبار کا نام احادیث نہیں رکھتے اور خود سنیوں کے محدثوں نے بعض اخبار کو موضوع کہہ کر پھر بھی ان کا نام حدیث رکھا ہے اور حدیث کو کئی قسموں پر منقسم کرکے سب کا نام حدیث ہی رکھ دیا ہے۔ افسوس کہ تم لوگوں کی کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ اُن باتوں کا نام بھی جھوٹ رکھتے ہو جس طرز کو قرآن شریف نے اختیار کیا ہے اور محض شرارت سے خدا کی پاک کلام پر حملہ کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً کوئی یہ کہے کہ میں نے

پلاؤ کی ساری رکابی کھالی تو اُس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ اور جھوٹ یہ کہ اس نے چاول کھائے ہیں رکابی کو توڑ کر تو نہیں کھایا۔ اور جبکہ نصوص حدیثیہ کا استدلال کلیت کا فائدہ بخشتا ہے تو یہ کہنا کہ حدیث کے رو سے لَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے معنے لَمَّا اَمَتَّنِي ہیں یعنی اس بنا پر کہ مُتَوَفِّيْكَ مُمِيْتُكَ آچکا ہے اس میں کونسا کذب اور دروغ ہے لیکن ایسے جاہل کو کون سمجھائے جو اپنی جہالت کے ساتھ تعصب کی زہر بھی مخلوط رکھتا ہے۔ مگر غنیمت ہے کہ جیسا کہ یہ لوگ تین جھوٹ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں ایسا ہی تین جھوٹ میری طرف بھی منسوب کیے۔ ہم اس ابراہیمی مشابہت پر فخر کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کے جھوٹ اور افترا کو ان کے منہ پر مارتے ہیں۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۳۶-۳۹)

ایماندار کے لیے صرف ایک آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس بات پر دلیل کافی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت ہو گئے کیونکہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے تئیس مقامات میں لفظ توفّی کو قبض روح کے موقعہ پر استعمال کیا۔ اول سے آخر تک قرآن شریف میں کسی جگہ لفظ توفّی کا ایسا نہیں جس کے بجز قبض روح اور مارنے کے اور معنے ہوں۔ اور پھر ثبوت پر ثبوت یہ کہ صحیح بخاری میں ابن عباس سے متوفیک کے معنے ممیتک لکھے ہیں۔ ایسا ہی تفسیر فوز الکبیر میں بھی یہی معنے مندرج ہیں اور کتاب عینی تفسیر بخاری میں اس قول کا اسناد بیان کیا ہے۔ اب اس نص قطعی سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے ضرور مر چکے ہیں اور احادیث میں جہاں کہیں توفّی کا لفظ کسی صیغہ میں آیا ہے اس کے معنے مارنا ہی آیا ہے جیسا کہ محدثین پر پوشیدہ نہیں اور علم لغت میں یہ مُسلّم اور مقبول اور متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جہاں خدا فاعل اور انسان مفعول بہ ہے وہاں بجز مارنے کے اور کوئی معنے توفّی کے نہیں آتے تمام دواوین عرب اس پر گواہ ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳)

ہمارے علماء کا یہ خیال ہے کہ وہی مسیح عیسٰی بن مریم جس پر انجیل نازل ہوئی تھی آخری زمانہ میں آسمان پر سے نازل ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن شریف اس خیال کے مخالف ہے اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ..... اور دوسری تمام آیتیں جن کا ہم اپنی کتابوں میں ذکر کر چکے ہیں اس امر پر قطعیۃ الدلالت ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اور ان کی فوت کا انکار قرآن سے انکار ہے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۸)

قرآن شریف جو خدا کا کلام ہے اس کے نصوص صریحہ سے تو حضرت مسیح کی موت ہی ثابت ہوتی ہے کیونکہ خدا نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ وہ وفات پا چکا جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس پر شاہد ہے۔ آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ توفّی کے معنے بجز قبض روح کے اور کچھ نہیں۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۳۱)

جیسا کہ لغت میں توفی کے معنی جہاں خدا فاعل اور انسان مفعول بہ ہو بجز مارنے کے اور کچھ نہیں ایسا ہی قرآن شریف میں اول سے آخر تک توفی کا لفظ صرف مارنے اور قبض روح پر ہی استعمال ہوا ہے بجز اس کے سارے قرآن میں اور کوئی معنی نہیں۔ (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۲۶ حاشیہ)

یہ آیت تو صاف دلالت کرتی ہے کہ وہ عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے مر چکے ہیں غرض اگر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے یہ معنے ہیں۔ کہ مع جسم زندہ عیسٰی کو آسمان پر اُٹھالیا تو کیوں خدا نے ایسے شخص کی موت کا سارے قرآن میں ذکر نہیں کیا جس کی زندگی کے خیال نے لاکھوں کو ہلاک کر دیا گویا خدا نے اس کو ہمیشہ کے لیے اس لیے زندہ رہنے دیا کہ تا لوگ مشرک اور بے دین ہو جائیں اور گویا یہ لوگوں کی غلطی نہیں بلکہ خدا نے یہ سب کچھ خود کیا تا لوگوں کو گمراہ کرے۔ (کشتی نوح ص۱۵)

اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پھر دنیا میں نہیں آئیں گے کیونکہ اگر وہ دنیا میں آنے والے ہوتے تو اس صورت میں یہ جواب حضرت عیسٰی کا محض جھوٹ ٹھہرتا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں جو شخص دوبارہ دنیا میں آیا اور چالیس برس رہا۔ اور کروڑہا عیسائیوں کو دیکھا جو اُس کو خدا جانتے تھے اور صلیب توڑا اور تمام عیسائیوں کو مسلمان کیا وہ کیونکر قیامت کو جناب الٰہی میں یہ عذر کر سکتا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں۔ (کشتی نوح ص۱۵ حاشیہ)

یاد رکھو کہ اب عیسٰی تو ہرگز نازل نہیں ہوگا کیونکہ جو اقرار اُس نے آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے رو سے قیامت کے دن کرنا ہے اس میں صفائی سے اُس کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئے گا اور قیامت کو اُس کا یہی عذر ہے کہ عیسائیوں کے بگڑنے کی مجھے خبر نہیں اور اگر وہ قیامت کے پہلے دنیا میں آتا تو کیا وہ یہی جواب دیتا کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں۔ لہذا اس آیت میں اس نے صاف اقرار کیا ہے کہ میں دوبارہ دنیا میں نہیں گیا اور اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آنے والا تھا اور برابر چالیس برس رہنے والا تب تو اُس نے خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولا کہ مجھے عیسائیوں کے حالات کی کچھ خبر نہیں اس کو تو کہنا چاہیئے تھا کہ آمد ثانی کے وقت میں نے چالیس کروڑ کے قریب دنیا میں عیسائی پایا اور ان سب کو دیکھا اور مجھے ان کے بگڑنے کی خوب خبر ہے اور میں تو انعام کے لائق ہوں کہ تمام عیسائیوں کو مسلمان کیا اور صلیبوں کو توڑا۔ کیسا جھوٹ ہے کہ عیسٰی کہے گا کہ مجھے خبر نہیں غرض اس آیت میں نہایت صفائی سے مسیح کا اقرار ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئے گا اور یہی سچ ہے کہ مسیح فوت ہو چکا اور سرینگر محلہ خانیار میں اس کی قبر ہے۔ اب خدا خود نازل ہوگا اور ان لوگوں سے آپ لڑے گا جو سچائی سے لڑتے ہیں۔ خدا کا لڑنا قابل اعتراض نہیں کیونکہ وہ نشانوں کے رنگ میں ہے لیکن انسان کا لڑنا قابل اعتراض ہے کیونکہ وہ جبر کے رنگ میں ہے۔ (کشتی نوح ص۶۹)

أَتُكَذِّبُونَنِي وَلَا تَجِيئُونَنِي وَلَا تَسْئَلُونَ إِنَّ عِيسَىٰ مَاتَ وَلَا يُحْيَى بِإِحْيَاءِكُمْ وَلَا تُكَذِّبُوا الْقُرْآنَ أَيُّهَا الْمُجْتَرِءُونَ۔ وَإِنْ كَانَ نَازِلًا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَمَا تَزْعُمُونَ۔ فَلِمَ أَنْكَرَ لَمَّا سُئِلَ عَنْ ضَلَالَةِ النَّصَارَىٰ

(ترجمہ) کیا تم مجھ کو جھٹلاتے ہو حالانکہ نہ تم میرے پاس آتے ہو اور نہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ عیسٰی علیہ السلام کس طرح فوت ہو گئے ہیں حالانکہ وہ تمہارے زندہ قرار دینے سے زندہ نہیں ہو سکتے پس اے جرأت کرنے والو تم قرآن مجید کی تکذیب نہ کرو۔ اگر مسیح قیامت

وَاَعْتَذِرْ بِعَدَمِ الْعِلْمِ كَمَا اَنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَمْ يَقُلْ اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدِيْ بِمَا رُدِدْتُ اِلَى الدُّنْيَا وَرَئَيْتُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ - وَكَانَ الْحَقُّ اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّ اِنِّيْ رَجَعْتُ اِلَى الدُّنْيَا بِاِذْنِكَ وَلَبِثْتُ فِيْهِمْ اِلٰى اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَوَجَدْتُّهُمْ يَعْبُدُوْنَنِيْ وَاُمِّيْ وَعَلَيْهِ يُصِرُّوْنَ - فَكَسَرْتُ صُلُبَانَهُمْ وَاَصْلَحْتُ زَمَانَهُمْ وَقَتَلْتُ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ قَدْ خَلُوْا فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ - فَاسْئَلُوْا عِيْسٰى كُمْ لِمَ يَكْذِبُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيُخْفِيْ شَهَادَةً كَانَتْ عِنْدَهٗ كَاَنَّهٗ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ -

(تحفہ الندوۃ - التبلیغ - ٹائیٹل ص۱)

اللہ تعالیٰ قیامت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا تو حضرت عیسیٰ جواب دیں گے کہ یا الٰہی اگر میں نے ایسا کہا ہے تو تجھے معلوم ہوگا کیونکہ تیرے علم سے کوئی چیز باہر نہیں - میں نے تو صرف وہی کہا تھا جو تو نے فرمایا تھا - پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو پھر صرف تو ہی ان کا نگہبان تھا مجھے اُن کے حال کا کیا علم ہے -

اب ظاہر ہے کہ اگر یہ بات سچ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے دوبارہ دُنیا میں آئیں گے اور چالیس برس دنیا میں ٹھہریں گے اور صلیب کو توڑیں گے اور عیسائیوں کے ساتھ لڑائیاں کریں گے تو وہ قیامت کو خدائے تعالیٰ کے حضور میں کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ جب تو نے مجھے وفات دیدی تو اس کے بعد مجھے کیا علم ہے کہ عیسائیوں نے کونسی راہ اختیار کی اگر وہ یہی جواب دیں گے کہ مجھے خبر نہیں تو ان سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی جھوٹا نہیں ہوگا کیونکہ جس شخص کو یہ علم ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ آیا تھا اور عیسائیوں کو دیکھا تھا کہ اُس کو خدا سمجھ رہے ہیں

سے قبل آسمان سے نازل ہونے والے ہوتے جیسا کہ تم خیال کرتے ہو تو پھر جب ان سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے انکار کیوں کیا - اور کیوں عدم علم کا عذر کیا جیسا کہ تم قرآن مجید میں پڑھتے ہو اور یہ نہ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے میرے بعد کیا کیا بدعتیں اختیار کیں - کیونکہ میں دنیا میں واپس گیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں پس حق یہ تھا کہ آپ کہتے کہ اے میرے پروردگار تیرے اذن سے دوبارہ دنیا میں گیا تھا اور ان میں چالیس سال رہا تھا - میں نے انہیں اپنی اور اپنی والدہ کی عبادت کرتے پایا اور وہ اس طریق پر مصر رہے - پس میں نے ان کی صلیبوں کو توڑا اور میں نے اُن کے زمانہ کی اصلاح کی اور ان میں سے بہتوں کو قتل کیا پس وہ تضرع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو گئے - پس اپنے عیسیٰ سے دریافت کرو کہ وہ قیامت کے دن کیوں جھوٹ بولیں گے اور اس طرح اس شہادت کو جو ان کے پاس تھی چھپائیں گے - گویا کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے -

اور اُس کی پرستش کرتے ہیں اور اُن سے لڑائیاں کیں اور پھر وہ خدا تعالیٰ کے روبرو انکار کرتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد انہوں نے کیا کیا اس سے زیادہ کاذب کون ٹھہر سکتا ہے۔ جواب صحیح تو یہ تھا کہ ہاں میرے خداوند مجھے عیسائیوں کی گمراہی کی خوب خبر ہے کیونکہ میں دوبارہ دنیا میں جاکر چالیس برس تک وہاں رہا اور صلیب کو توڑا پس میرا کچھ گناہ نہیں ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مشرک ہیں تو میں اُسی وقت اُن کا دشمن ہو گیا بلکہ ایسی صورت میں کہ جبکہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس برس تک دنیا میں رہ چکے ہوں گے اور اُن سب کو سزائیں دی ہوں گی جو ان کو خدا سمجھتے تھے خدا تعالیٰ کا ایسا سوال اُن سے ایک لغو سوال ہوگا کیونکہ جب کہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے کہ اس شخص نے اپنے معبود ٹھہرائے جانے کی اطلاع پاکر ایسے لوگوں کو خوب سزا دی تو پھر ایسا سوال کرنا اس کی شان سے بعید ہے۔ غرض جس قدر مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے یہ کھول کر سنا دیا ہے کہ عیسیٰ فوت ہو گیا ہے اور پھر دنیا میں نہیں آئے گا۔ ہاں اس کا مثیل آنا ضروری ہے اگر اس قسم کی تصریح ملا کی نبی کے صحیفہ میں ہوتی تو یہود ہلاک نہ ہوتے پس بلاشبہ وہ لوگ یہود سے بدتر ہیں کہ جو اس قدر تصریحات خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں پاکر پھر حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں۔ (تذکرۃ الشہادتین ص۱۸-۱۹)

خدا تعالیٰ قیامت کو حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کرکے ماننا اور ہماری پرستش کرنا اور وہ جواب دیں گے کہ اے میرے خدا اگر میں نے ایسا کہا ہے تو تجھے معلوم ہوگا کیونکہ تو عالم الغیب ہے میں نے تو وہی باتیں اُن کو کہیں جو تو نے مجھے فرمائیں یعنی یہ کہ خدا کو وحدہ لاشریک اور مجھے اُس کا رسول مانو میں اس وقت تک اُن کے حالات کا علم رکھتا تھا جب تک کہ میں اُن میں تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو اُن پر گواہ تھا مجھے کیا خبر ہے کہ میرے بعد انہوں نے کیا کیا۔ اب ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ جواب دیں گے کہ جب تک میں زندہ تھا عیسائی لوگ بگڑے نہیں تھے اور جب میں مرگیا تو مجھے خبر نہیں کہ ان کا کیا حال ہوا پس اگر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک زندہ ہیں تو ساتھ ہی ماننا پڑیگا کہ عیسائی بھی اب تک بگڑے نہیں اور سچے مذہب پر قائم ہیں ما سوا اس کے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کے بعد اپنی بے خبری ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے خدا جب تو نے مجھے وفات دیدی اس وقت سے مجھے اپنی امت کا کچھ حال معلوم نہیں پس اگر یہ بات صحیح مانی جائے کہ وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آئیں گے اور مہدی کے ساتھ مل کر کافروں سے لڑائیاں کریں گے تو نعوذ باللہ قرآن شریف کی یہ آیت غلط ٹھہرتی ہے اور یا یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے اور اس بات کو چھپائیں گے کہ وہ دوبارہ دنیا میں آئے تھے اور چالیس برس تک رہے تھے اور مہدی کے ساتھ مل کر عیسائیوں سے لڑائیاں کی تھیں۔ پس اگر کوئی قرآن شریف پر ایمان لانے والا ہو تو فقط اس ایک ہی آیت سے تمام وہ منصوبہ باطل ثابت

ہوتا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مہدی خونی پیدا ہوگا اور عیسٰے اس کی مدد کے لیے آسمان سے آئے گا بلا شبہ وہ شخص قرآن شریف کو چھوڑتا ہے جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۵۰-۵۱)

عیسٰی علیہ السلام کو خدا نے وفات دیدی جیسا کہ خدا تعالےٰ کی صاف اور صریح آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ اس پر شاہد ہے جس کے معنے آیات متعلقہ کے ساتھ یہ ہیں کہ خدا قیامت کو عیسٰی سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی اپنی اُمّت کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانو تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں ان میں تھا تو اُن پر شاہد تھا اور اُن کا نگہبان تھا اور جب تو نے مجھے وفات دیدی تو پھر مجھے کیا علم تھا کہ میرے بعد وہ کس ضلالت میں مبتلا ہوئے۔ اب اگر کوئی چاہے تو آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے یہ معنے کرے کہ جب تُو نے مجھے وفات دیدی اور چاہے تو اپنی ناحق کی ضد سے باز نہ آکر یہ معنے کرے کہ جب تو نے مع جسم عنصری مجھے آسمان پر اُٹھا لیا۔ بہرحال اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اگر وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آئے ہوتے اور صلیب توڑی ہوتی تو اس صورت میں ممکن نہیں کہ عیسٰی جو خدا کا نبی تھا ایسا صریح جھوٹ خدا تعالےٰ کے روبرو قیامت کے دن بولے گا کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد میری اُمّت نے یہ فاسد عقیدہ اختیار کیا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا قرار دیدیا۔ کیا وہ شخص جو دوبارہ دنیا میں آوے اور چالیس برس دنیا میں رہے اور عیسائیوں سے لڑائیاں کرے۔ وہ نبی کہلا کر ایسا مکروہ جھوٹ بول سکتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں پس جبکہ یہ آیت حضرت عیسٰیؑ کو دوبارہ آنے سے روکتی ہے ورنہ وہ دروغگو ٹھہرتے ہیں۔ تو اگر وہ مع جسم عنصری آسمان پر ہیں اور بموجب تصریح اس آیت کے قیامت کے دن تک زمین پر نہیں اُتریں گے تو کیا وہ آسمان پر ہی مریں گے اور آسمان میں ہی اُن کی قبر ہوگی لیکن آسمان پر مرنا آیت فِیْھَا تَمُوْتُوْنَ[۵] کے برخلاف ہے پس اس آیت سے تو یہی ثابت ہوا کہ وہ آسمان پر مع جسم عنصری نہیں گئے بلکہ مر کر گئے اور جس حالت میں کتاب اللہ نے کمال تصریح سے یہ فیصلہ کر دیا تو پھر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا اگر معصیت نہیں تو اور کیا ہے۔ (الوصیت صفحہ ۱۲-۱۳)

جو لوگ مسلمان کہلا کر حضرت عیسٰی کو مع جسم عنصری آسمان پر پہنچاتے ہیں وہ قرآن شریف کے خلاف ایک لغو بات مُنہ پر لاتے ہیں قرآن شریف تو آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ میں حضرت عیسٰیؑ کی موت ظاہر کرتا ہے اور آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا[۶] میں انسان کا مع جسم عنصری آسمان پر جانا ممتنع قرار دیتا ہے پھر یہ کیسی جہالت ہے کہ کلام الٰہی کے مخالف عقیدہ رکھتے ہیں توفّی کے یہ معنے کرنا کہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھائے جانا اس سے بڑھ کر کوئی جہالت نہیں ہوگی اول تو کسی کتاب لغت میں توفی کے یہ معنے نہیں لکھے کہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھایا جانا پھر ماسوا اس کے جبکہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ قیامت کے متعلق ہے یعنی قیامت کو حضرت عیسٰیؑ خدا تعالٰی کو یہ جواب دیں گے تو اس سے لازم آتا ہے کہ قیامت تو آجائے گی مگر حضرت عیسٰیؑ نہیں مریں گے اور مرنے سے پہلے

---

[۵] الاعراف آیت ۲۶ ؛ [۶] بنی اسرائیل آیت ۹۴

ہی مع جسم عنصری خدا کے سامنے پیش ہو جائیں گے قرآن شریف کی یہ تحریف کرنا یہودیوں سے بڑھ کر قدم ہے۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۱۰ حاشیہ)

..... دوسرا گناہ ان لوگوں کا یہ ہے کہ قرآن شریف کی نص صریح کے برخلاف حضرت عیسیٰؑ کو زندہ تصوّر کرتے ہیں قرآن شریف میں صریح یہ آیت موجود ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ اور اس آیت کے معنے یہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ جبکہ تو نے مع جسم عنصری مجھ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ یہ عجیب لُغت ہے جو حضرت عیسیٰؑ سے ہی خاص ہے۔ افسوس اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جیسا کہ قرآن شریف میں تصریح ہے یہ سوال حضرت عیسیٰؑ سے قیامت کے دن ہو گا پس ان معنوں سے جو لفظ مُتَوَفِّيكَ کے کیے جاتے ہیں لازم آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہونے سے پہلے ہی قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔ اور اگر کہو کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے یہ معنی ہیں کہ جبکہ تو نے مجھ کو وفات دیدی تو پھر مجھ کو کیا خبر تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری اُمت نے کیا طریق اختیار کیا تو یہ معنے بھی اُن کے عقیدہ کے رو سے غلط ٹھہرتے ہیں اور دونوں معنوں کے رو سے خدا تعالیٰ عیسیٰؑ کو ایسے عذر باطل کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ تُو میرے سامنے جھوٹ کیوں بولتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کیونکہ تُو تو دوبارہ دنیا میں گیا تھا اور دنیا میں چالیسؓ برس تک رہا تھا اور نصاریٰ سے لڑائیاں کی تھیں اور صلیب کو توڑا تھا۔ ماسوا اس کے ان معنوں کی رو سے یہ لازم آتا ہے کہ جب تک حضرت عیسیٰؑ زندہ رہے عیسائی نہیں بگڑے بلکہ اُن کی موت کے بعد بگڑے پس اس سے تو اُن لوگوں کو ماننا پڑتا ہے کہ عیسائی اب تک حق پر ہیں کیونکہ اب تک حضرت عیسیٰؑ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۶۸-۶۹ حاشیہ)

مولوی ثناء اللہ صاحب ..... حضرت عیسیٰ کو بھی کذاب قرار دیتے ہیں تو اگر مجھے بھی کذّاب کہیں تو ان پر کیا افسوس کرنا چاہیئے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اس سوال پر کہ کیا تُو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو عیسیٰ نے جھوٹھ بولا یعنی ایسا جواب دیا کہ سراسر جھوٹ تھا کیونکہ اُنہوں نے کہا کہ جب تک میں اپنی اُمت میں تھا تو اُن پر گواہ تھا اور جب تو نے وفات دیدی تو پھر تو اُن کا رقیب تھا مجھے کیا معلوم کہ میرے پیچھے کیا ہوا اور ظاہر ہے کہ اُس شخص سے زیادہ کون کذّاب ہو سکتا ہے جو قیامت کے دن جب عدالت کے تخت پر خدا بیٹھے گا اُس کے سامنے جھوٹھ بولے گا کیا اس سے بدتر کوئی اور جھوٹھ ہو گا کہ وہ شخص جو قیامت سے دوبارہ پہلے دنیا میں آئے گا اور چالیس برس دنیا میں رہے گا اور نصاریٰ کے ساتھ لڑائیاں کریگا اور صلیب کو توڑے گا اور خنزیر کو قتل کریگا اور تمام نصاریٰ کو مسلمان کر دیگا وہی قیامت کو ان تمام واقعات سے انکار کر کے کہے گا کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے بعد کیا ہُوا اور اس طرح پر خدا کے سامنے جھوٹھ بولے گا اور ظاہر کرے گا کہ مجھے اُس وقت سے نصاریٰ کی حالت اور ان کے مذہب کی کچھ بھی خبر نہیں جب سے تو نے مجھے وفات دیدی۔ دیکھو یہ کیسا گندہ جھوٹھ

ہے اور پھر خدا کے سامنے اس طور سے حضرت مسیح کذاب ٹھہرتے ہیں یا نہیں قرآن شریف کھولو اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو آخر تک پڑھ جاؤ اور پھر کہو کہ کیا تم نے عیسیٰ علیہ السلام کو کذاب قرار دیا یا نہیں۔

مگر اس پر کیا افسوس کریں کیونکہ آپ لوگوں کے نزدیک تو خدا بھی کاذب ہے خدا تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات آیۃ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں صاف طور بیان کر دی اور بتصریح حضرت عیسیٰ کا یہ عذر پیش کر دیا کہ میری وفات کے بعد یہ لوگ بگڑے ہیں پس خدا سمجھا رہا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ فوت نہیں ہوئے تو عیسائی بھی اب تک نہیں بگڑے کیونکہ عیسائیوں کا راہ راست پر رہنا صرف ان کی حیات تک ہی وابستہ رکھا گیا تھا اور عیسائیوں کی ضلالت کی علامت حضرت عیسیٰ کی وفات ٹھہرائی گئی تھی اب کہو اس صورت میں آپ کے نزدیک خدا کیونکر سچا ٹھہر سکتا ہے جس کا بیان باور نہیں کیا گیا۔ (اعجاز احمدی (ضمیمہ نزول المسیح) صفحہ ۱۸)

فَفَكِّرْ فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى (ابْنَ مَرْيَمَ) ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ۔ ثُمَّ فَكِّرْ فِي جَوَابِهٖ اَصَدَقَ اَمْ كَذَبَ بِنَاءً عَلٰى زَعْمِ قَوْمٍ يُّرْجِعُوْنَهٗ مِنْ وَّسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ فَاِنَّهٗ اِنْ كَانَ حَقًّا اَنْ يَّرْجِعَ عِيْسٰى قَبْلَ يَوْمِ الْحَشْرِ وَالْقِيَامِ۔ وَيَكْسِرَ الصَّلِيْبَ وَيُدْخِلَ النَّصَارٰى فِي الْاِسْلَامِ۔ فَكَيْفَ يَقُوْلُ اِنِّيْ مَا اَعْلَمُ مَا صَنَعَتْ اُمَّتِيْ بَعْدَ رَفْعِيْ اِلَى السَّمَاءِ۔ وَكَيْفَ يَصِحُّ مِنْهُ هٰذَا الْقَوْلُ مَعَ اَنَّهٗ اَطْلَعَ عَلٰى شِرْكِ النَّصَارٰى بَعْدَ رُجُوْعِهٖ اِلَى الْغَبْرَاءِ۔ وَاطَّلَعَ عَلَى اتِّخَاذِهِمْ اِيَّاهُ وَاُمَّهٗ اِلٰهَيْنِ مِنَ الْاَهْوَاءِ۔ فَمَا هٰذَا الْاِنْكَارُ عِنْدَ سُؤَالِ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَاءِ۔ اِلَّا كِذْبًا فَاحِشًا وَّتَرْكَ الْحَيَاءِ۔ وَالْعَجَبُ اَنَّهٗ كَيْفَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْكِذْبِ الْعَظِيْمِ وَيَكْذِبُ بَيْنَ يَدَيِ الْخَبِيْرِ الْعَلِيْمِ۔ مَعَ اَنَّهٗ قَدْ رَجَعَ اِلَى الدُّنْيَا وَقَتَلَ النَّصَارٰى وَكَسَرَ الصَّلِيْبَ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ کے فرمان يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ میں غور کرو۔ اور پھر غور کرو کہ آیا حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں سچ بولا تھا یا معاذ اللہ ان لوگوں کے زعم کے مطابق جو وسوسہ شیطانی کی وجہ سے انہیں دنیا میں واپس لاتے ہیں آپ نے جھوٹ بولا تھا کیونکہ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت اور حشر و نشر سے پہلے دنیا میں واپس آنے والے ہیں اور صلیب کو توڑیں گے اور نصاریٰ کو اسلام میں داخل کریں گے تو وہ یہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میرے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد میری امت نے کیا کیا۔ اور آپ کا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے حالانکہ وہ زمین پر لوٹنے کے بعد نصاریٰ کے شرک پر مطلع ہو چکے تھے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ عیسائیوں نے آپ کو اور آپ کی والدہ کو اپنی خواہشات کی بناء پر معبود قرار دے رکھا ہے۔ پس خدائے بزرگ و برتر کے سوال پر ان کا یہ انکار بجز واضح جھوٹ اور ترک حیا کے اور کچھ نہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اتنے بڑے جھوٹ پر شرم محسوس نہیں کریں گے اور خدائے علیم و خبیر کے سامنے دروغ بیانی کریں گے۔ حالانکہ آپ دنیا کی طرف لوٹے ہونگے۔ نصاریٰ کو قتل کیا ہوگا۔

وَقَتَلَ الْخِنْزِيْرَ بِالْحُسَامِ الْحَسِيْمِ۔ وَمَا كَانَ مُكْثُ سَاعَةٍ كَغَرِيْبٍ يَمُرُّ مِنْ اَرْضٍ بِاَرْضٍ غَيْرَ مُقِيْمٍ وَّلَا يُفَتِّشُ بِالْعَزْمِ الصَّمِيْمِ بَلْ لَبِثَ فِيْهِمْ اِلٰى اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَّقَتَلَهُمْ وَاَسَرَهُمْ وَاَدْخَلَهُمْ جَبْرًا فِي الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ۔ ثُمَّ يَقُوْلُ لَا اَعْلَمُ مَا صَنَعُوْا بَعْدِيْ فَالْعَجَبُ كُلُّ الْعَجَبِ مِنْ هٰذَا الْمَسِيْحِ وَكِذْبِهِ الصَّرِيْحِ اَنُؤْمِنُ بِاَنَّهٗ لَا يَخَافُ يَوْمَ الْحِسَابِ وَلَا سَوْطَ الْعِقَابِ وَيَكْذِبُ كِذْبًا فَاحِشًا تَعَافُهٗ زُمَرُ النَّاسِ وَيَرْضٰى بِزُوْرٍ يَّاْنَفُ مِنْهُ الْاَرَاذِلُ الْمُلَوَّثُوْنَ بِالْاَدْنَاسِ اَيُجَوِّزُ الْعَقْلُ فِيْ شَانِ نَبِيٍّ اَنَّهٗ رَجَعَ اِلَى الدُّنْيَا بَعْدَ الصُّعُوْدِ اِلَى السَّمَآءِ۔ وَرَاٰى قَوْمَهُ النَّصَارٰى وَشِرْكَهُمْ وَتَثْلِيْثَهُمْ بِعَيْنَيْهِ مِنْ غَيْرِ الْخَفَآءِ۔ ثُمَّ اَنْكَرَ اَمَامَ رَبِّهٖ هٰذِهِ الْقِصَّةَ وَقَالَ مَا رَجَعْتُ اِلَى الدُّنْيَا الدَّنِيَّةِ وَلَا اَعْلَمُ مَا بَالُ قَوْمِيْ مُذْ رُفِعْتُ اِلَى السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ۔ فَانْظُرُوْا اَيُّ كِذْبٍ اَكْبَرُ مِنْ هٰذَا الْكِذْبِ الَّذِيْ يَرْتَكِبُهُ الْمَسِيْحُ اَمَامَ عَيْنِ اللّٰهِ فِيْ يَوْمِ الْحِسَابِ وَالْمَسْئَلَةِ۔ وَلَا يَخَافُ حَضْرَةَ رَبِّ الْعِزَّةِ۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّهٗ لَمَّا مَنَعَ الْقُرْاٰنُ نُزُوْلَ الْمَسِيْحِ مِنَ السَّمَآءِ فِي الْاٰيَةِ الَّتِيْ هِيَ قَطْعِيَّةُ الدَّلَالَةِ تَعَيَّنَ اِذًا مِنْ غَيْرِ شَكٍّ اَنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ لَيْسَ مِنَ الْيَهُوْدِ بَلْ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَكَيْفَ وَاِنَّ الْيَهُوْدَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ فَهُمْ لَا

صلیب کو توڑا ہوگا اور سوروں کو تیز تلوار سے قتل کیا ہوگا پھر دنیا میں کسی ایسے مسافر کی طرح آپ کا قیام صرف گھڑی بھر کا نہیں تھا جو بغیر کسی جگہ قیام کرنے کے ایک ملک سے دوسرے ملک کو چلا جاتا ہے اور عزم صمیم سے کسی امر کی تحقیق و تفتیش نہیں کرسکتا بلکہ آپ ان لوگوں میں چالیس برس تک رہے اور انہیں قتل کیا۔ قید کیا اور انہیں جبرًا اسلام میں داخل کیا۔ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری قوم نے میرے بعد کیا کیا۔ پس ایسے مسیح اور اس کے ایسے جھوٹ سے تعجب پر تعجب ہے کیا ہم یہ بھی ایمان رکھیں کہ وہ یوم حساب اور سزا کے کوڑے سے نہیں ڈرتے اور ایسا واضح طور پر جھوٹ بولتے ہیں جس سے ادنیٰ لوگ بھی نفرت کریں۔ اور وہ ایسے جھوٹ پر راضی ہیں جس سے ایسے رذیل لوگ بھی ناک چڑھائیں جو گندگیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ کیا عقل کسی نبی کی شان میں جائز قرار دیتی ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ جانے کے بعد دنیا میں واپس لوٹے اور اپنی قوم نصاریٰ کے شرک اور تثلیث کے عقیدہ کو اپنی آنکھوں سے کھلم کھلا مشاہدہ کرے پھر بھی اپنے رب کے حضور اس تمام واقعہ سے انکار کردے اور کہہ دے کہ میں تو حقیر دنیا میں واپس نہیں گیا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ جب سے میں دوسرے آسمان کی طرف اٹھایا گیا میری قوم کا کیا حال ہوا پس دیکھو کہ کونسا جھوٹ اس جھوٹ سے بڑا ہوسکتا ہے جس کے مرتکب مسیح علیہ السلام ہونگے اور وہ بھی قیامت کے دن اور خدا تعالیٰ کے روبرو۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ خدا تعالیٰ سے بھی نہیں ڈریں گے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب قرآن نے اس آیت میں جو قطعیۃ الدلالت ہے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اُترنے کو رد کردیا ہے تو یہ بات بغیر کسی شک کے معین طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ آنے والا مسیح یہود میں سے نہیں ہوگا بلکہ اسی امت میں سے ہوگا اور یہ ہو ہی کیسے سکتا ہے جبکہ یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ذلت وارد کی گئی

يَسۡتَحِقُّوۡنَ الۡعِزَّةَ بَعۡدَ الۡعُقُوۡبَةِ الۡاَبَدِيَّةِ ۔ (مواھب الرحمان صفحہ ۵۰،۴۳)

اگر توفی کے معنے مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھانا تجویز کیا جائے تو یہ معنی تو بدیہی البطلان ہیں کیونکہ قرآن شریف کی انہی آیات سے ظاہر ہے کہ یہ سوال حضرت عیسیٰ سے قیامت کے دن ہوگا پس اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ موت سے پہلے اُس رفع جسمانی کی حالت میں ہی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جائیں گے اور پھر کبھی نہیں مریں گے کیونکہ قیامت کے بعد موت نہیں اور ایسا خیال بداہت باطل ہے۔

علاوہ اس کے قیامت کے دن یہ جواب اُن کا کہ اُس روز سے کہ میں مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھایا گیا مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد میری اُمّت کا کیا حال ہوا۔ یہ اِس عقیدہ کی رو سے صریح دروغ بے فروغ ٹھہرتا ہے جبکہ یہ تجویز کیا جائے کہ وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ کیونکہ جو شخص دوبارہ دنیا میں آوے اور اپنی اُمّت کی مشرکانہ حالت کو دیکھ لے بلکہ اُن سے لڑائیاں کرے اور ان کی صلیب توڑے اور اُن کے خنزیر کو قتل کرے وہ کیونکر قیامت کے روز کہہ سکتا ہے کہ مجھے اپنی اُمّت کی کچھ بھی خبر نہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۱)

قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت صاف فرما دیا ہے کہ وہ فوت ہو چکے جیسا کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے بطور حکایت ذکر کرکے فرماتا ہے فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ یعنی قیامت کو خدا تعالیٰ عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے اپنی قوم کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کرکے مانا کرو تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں اپنی قوم میں تھا میں اُن کو یہی تعلیم دیتا رہا کہ خدا ایک ہے اور میں اُس کا رسول ہوں اور پھر جب تو نے مجھ کو وفات دیدی تو بعد اُس کے مجھے اُن کے عقائد کا کچھ علم نہیں۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ اپنی وفات کا صاف اقرار کرتے ہیں اور اس میں یہ بھی اقرار ہے کہ میں دُنیا میں واپس نہیں گیا کیونکہ اگر وہ دُنیا میں واپس آئے ہوتے تو پھر اس صورت میں قیامت کے دن یہ کہنا جھوٹ تھا کہ مجھے اپنی اُمّت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد اُنہوں نے کونسا طریق اختیار کیا کیونکہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے کہ وہ قیامت سے پہلے دُنیا میں واپس آئیں گے اور عیسائیوں سے لڑائیاں کریں گے تو پھر قیامت کے دن انکار کرکے یہ کہنا کہ عیسائیوں کے بگڑنے کی مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں سراسر جھوٹ ہوگا نعوذ باللہ منہ

(چشمہ معرفت ص۲۲۰-۲۲۱)

اِس تمام آیت کے اول آخر کی آیتوں کے ساتھ یہ معنی ہیں کہ خدا قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہیگا کہ کیا تو نے ہی لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا معبود ٹھہرانا۔ تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں اپنی قوم میں تھا تو میں اُن کے حالات سے مطلع تھا اور گواہ تھا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تو ہی اُن کے حالات

اور اس ابدی سزا کے بعد وہ عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

سے واقف تھا یعنی بعد وفات مجھے اُن کے حالات کی کچھ بھی خبر نہیں۔

اب اِس آیت سے صریح طور سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔(۱) اول یہ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اِس آیت میں اقرار کرتے ہیں کہ جب تک میں اُن میں تھا میں اُن کا محافظ تھا اور وہ میرے روبرو بگڑے نہیں بلکہ میری وفات کے بعد بگڑے ہیں پس اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اب تک آسمان پر زندہ ہیں تو ساتھ ہی اقرار کرنا پڑے گا کہ اب تک عیسائی بھی بگڑے نہیں کیونکہ اِس آیت میں عیسائیوں کا بگڑنا آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کا ایک نتیجہ ٹھہرایا گیا ہے یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات پر موقوف رکھا گیا ہے۔ لیکن جبکہ ظاہر ہے کہ عیسائی بگڑ چکے ہیں تو ساتھ ہی ماننا پڑتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی فوت ہو چکے ہیں۔ ورنہ تکذیب آیت قرآنی لازم آتی ہے (۲) دوسرے یہ کہ آیت میں صریح طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام عیسائیوں کے بگڑنے کی نسبت اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے اور کہیں گے کہ مجھے تو اُس وقت تک اُن کے حالات کی نسبت علم تھا جبکہ میں اُن میں تھا اور پھر جب مجھے وفات دی گئی تب سے میں اُن کے حالات سے محض بے خبر ہوں مجھے معلوم نہیں کہ میرے پیچھے کیا ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ عذر اُن کا اُس حالت میں کہ وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دُنیا میں کسی وقت آئے ہوتے اور عیسائیوں کی ضلالت پر اطلاع پاتے محض دروغ گوئی ٹھہرتا ہے۔ اور اِس کا جواب تو خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ ہونا چاہیئے کہ اے گستاخ شخص میرے روبرو اور میری عدالت میں کیوں جھوٹ بولتا ہے اور کیوں محض دروغ کے طور پر کہتا ہے کہ مجھے اُن کے بگڑنے کی کچھ بھی خبر نہیں۔ حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ میں نے قیامت سے پہلے دوبارہ تجھے دنیا میں بھیجا تھا اور تو نے عیسائیوں سے لڑائیاں کی تھیں اور اُن کی صلیب توڑی تھی اور اُن کے خنزیر قتل کیے تھے۔ اور پھر میرے روبرو اتنا جھوٹ کہ گویا تجھے کچھ بھی خبر نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے عقیدے میں کہ گویا حضرت عیسٰی علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں آئیں گے کس قدر اُن کی ہتک ہے۔ اور نعوذ باللہ اس سے وہ دروغگو ٹھہرتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۰-۱۴۱)

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ۔ کیا اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ مجھے وفات دینے کے بعد تو ہی اُن پر رقیب تھا اور کیا اِن تمام آیات پر نظر ڈالنے سے صریح طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسٰی خدا تعالیٰ کے سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ میں جب تک اپنی اُمت میں تھا میں اُن کے اعمال کا گواہ تھا اور اُن کے حالات کا علم رکھتا تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو بعد اُس کے تو ہی اُن کا رقیب اور محافظ تھا۔ پس کیا اِن آیات کا بدیہی طور پر یہ خاص مطلب نہیں ہے کہ میری اُمت میری زندگی میں نہیں بگڑی بلکہ میری وفات کے بعد بگڑی ہے اور بعد وفات مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا کیا حال ہُوا اور کیا مذہب اختیار کیا۔ پس خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عیسٰی اب تک زندہ ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرض کرنا پڑیگا کہ عیسائی بھی اب تک بگڑے

نہیں اور سچے مذہب پر قائم ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ اپنی اُمت کا صراطِ مستقیم پر ہونا اپنی زندگی تک وابستہ کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ مَیں نے یہ تعلیم دی ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو اور جناب الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ جب تک میں اپنی اُمت میں تھا مَیں نے وہی تعلیم اُن کو دی جس کی تو نے مجھے ہدایت دی تھی اور جب تو نے مجھے وفات دیدی تو بعد کے حالات کا مجھے کچھ علم نہیں۔ اور ان آیات سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے ورنہ لازم آتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے کیونکہ اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ آئے ہوتے تو اس صورت میں اُن کا یہ کہنا کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری اُمت نے میرے بعد کیا عقیدہ اختیار کیا۔ صریح جھوٹ ٹھہرتا ہے کیونکہ جو شخص دوبارہ دنیا میں آوے اور بچشم خود دیکھ جاوے کہ اس کی اُمت بگڑ چکی ہے اور نہ صرف ایک دن بلکہ برابر چالیس برس تک اُن کے کفر کی حالت دیکھتا رہے وہ کیونکر قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے کہہ سکتا ہے کہ اپنی اُمت کی حالت سے محض بے خبر ہوں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۱۷)

حضرت عیسیٰ کا خود اپنا ایک اقرار ہے جو اُن کی وفات پر شاہد ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں کہ اے عیسیٰ کیا تُو نے ہی لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کر کے مانو۔ یہ جواب دیتے ہیں جو قرآن شریف میں مندرج ہے یعنی یہ آیت وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ یعنی مَیں تو اُسی زمانہ تک اُن پر گواہ تھا جب مَیں اُن کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے وفات دیدی تو پھر اُن کا محافظ تُو ہی تھا اس جواب میں حضرت عیسیٰ عیسائیوں کی ہدایت کو اپنی زندگی سے وابستہ کرتے ہیں پس اگر حضرت عیسیٰ اب تک زندہ ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ عیسائی بھی حق پر ہیں اور اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ قبل از قیامت دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے ورنہ نعوذ باللہ یہ لازم آتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے کہ مجھے اپنی اُمت کے بگڑنے کی کچھ بھی اطلاع نہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۸ حاشیہ)

بعض نادان اس جگہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جس حالت میں قرآن شریف کی یہ آیت کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ صاف طور پر تبلا رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حضور میں یہ عذر پیش کریں گے کہ میری وفات کے بعد لوگ بگڑے ہیں نہ میری زندگی میں تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب سے بچ کر کشمیر کی طرف چلے گئے تھے اور کشمیر میں ۸۷ برس عمر بسر کی تھی تو پھر یہ کہنا کہ میری وفات کے بعد لوگ بگڑ گئے صحیح نہیں ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میرے کشمیر کے سفر کے بعد بگڑے ہیں۔ کیونکہ وفات تو صلیب کے واقعہ سے ستاسی برس بعد ہوئی۔

پس یاد رہے کہ ایسا وسوسہ صرف قلّت تدبّر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ورنہ کشمیر کا سفر اِس فقرہ کی ضد نہیں کیونکہ مَادُمْتُ فِیْھِمْ کے یہ معنے ہیں کہ جب تک مَیں اپنی اُمّت میں تھا جو میرے پر ایمان لائے تھے یہ معنے نہیں کہ جب تک مَیں اُن کی زمین میں تھا کیونکہ ہم قبول کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی زمین شام میں سے ہجرت کرکے کشمیر کی طرف چلے گئے تھے مگر ہم یہ قبول نہیں کرتے کہ حضرت عیسٰی کی والدہ اور آپ کے حواری پیچھے رہ گئے تھے بلکہ تاریخ کی رو سے ثابت ہے کہ حواری بھی کچھ تو حضرت عیسٰی کے ساتھ اور کچھ بعد میں آپ کو آملے تھے جیسا کہ دھوما حواری حضرت عیسٰی کے ساتھ آیا تھا باقی حواری بعد میں آگئے تھے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی رفاقت کے لیے صرف ایک ہی شخص اختیار کیا تھا یعنی دُھوما کو جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے وقت صرف حضرت ابوبکر کو اختیار کیا تھا کیونکہ سلطنت رومی حضرت عیسٰی کو باغی قرار دے چکی تھی اور اسی جرم سے پیلاطوس بھی قیصر کے حکم سے قتل کیا گیا تھا کیونکہ وہ درپردہ حضرت عیسٰی کا حامی تھا اور اُس کی عورت بھی حضرت عیسٰی کی مرید تھی پس ضرور تھا کہ حضرت عیسٰی اُس مُلک سے پوشیدہ طور پر نکلتے کوئی قافلہ ساتھ نہ لیتے اس لیے اُنہوں نے اس سفر میں صرف دُھوما حواری کو ساتھ لیا جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے سفر میں صرف ابوبکر کو ساتھ لیا تھا اور جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی اصحاب مختلف راہوں سے مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا پہنچے تھے۔ ایسا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواری مختلف راہوں سے مختلف وقتوں میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی خدمت میں جا پہنچے تھے اور جب تک حضرت عیسٰی اُن میں رہے جیسا کہ آیت مَادُمْتُ فِیْھِمْ کا منشاء ہے وہ سب لوگ توحید پر قائم رہے بعد وفات حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اِن لوگوں کی اولاد بگڑ گئی یہ معلوم نہیں کہ کس پُشت میں یہ خرابی پیدا ہوئی مورّخ لکھتے ہیں کہ تیسری صدی تک دین عیسائی اپنی اصلیت پر تھا بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی کی وفات کے بعد وہ تمام لوگ پھر اپنے وطن کی طرف چلے آئے کیونکہ ایسا اتفاق ہوگیا کہ قیصر روم عیسائی ہوگیا پھر بے وطنی میں رہنا لاحاصل تھا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۵-۲۲۶)

فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ سورۃ مائدہ کی آیت پر آج پھر غور کرتے ہوئے ایک نئی بات معلوم ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حضرت مسیح سے یہ سوال ہوا کہ کیا تو نے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اِلٰہ بنالو۔ تو وہ اپنی بریت کے لیے جواب دیتے ہیں کہ میں نے تو وہی تعلیم دی تھی جو تو نے مجھے دی تھی اور جب تک میں ان میں رہا میں ان کا نگران تھا اور جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو اُن پر نگران تھا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ اگر حضرت مسیح دوبارہ دنیا میں آئے تھے اور یہ سوال ہوا تھا قیامت میں تو اس کا یہ جواب نہیں ہونا چاہیئے تھا بلکہ اُن کو تو یہ جواب دینا چاہیئے تھا کہ ہاں بیشک میرے آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد ان میں شرک پھیل گیا تھا لیکن پھر دوبارہ جاکر تو میں نے صلیبوں کو توڑا فلاں کافر کو مارا اُسے ہلاک کیا اُسے تباہ کیا نہ یہ کہ وہ یہ جواب دیتے وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ

فَبِهِمْ اس جواب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو ہرگز ہرگز خود دنیا میں نہیں آنا ہے اور یہ نص ہے ان کے عدم نزول پر۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

حضرت عیسٰی کی حیات ثابت نہیں ان کی زندگی ہی میں ایسا فتنہ برپا ہوا کہ کسی اور نبی کی زندگی میں وہ فتنہ نہیں ہُوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسٰی سے مطالبہ کرنا پڑا کہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰـھَیْنِ یعنی کیا تو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو۔ جو جماعت حضرت عیسٰیؑ نے تیار کی وہ ایسی کمزور اور ناقابل اعتبار تھی کہ خود یہی عیسائی بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ انجیل سے ثابت ہے کہ وہ بارہ شاگرد جوان کی خاص قوت قدسی اور تاثیر کا نمونہ تھے ان میں سے ایک نے جس کا نام یہودا اسکریوطی تھا اس نے تیس روپے پر اپنے آقا و مرشد کو بیچ دیا اور دوسرے نے جو سب سے اول نمبر پر ہے اور شاگرد رشید کہلاتا تھا اور جس کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں تھیں یعنی پطرس اس نے سامنے کھڑے ہو کر تین مرتبہ لعنت کی جب خود حضرت مسیح کی موجودگی میں ان کا اثر اور فیض اس قدر تھا اور اب انیس سَو (۱۹۰۰) سال گذرنے کے بعد خود اندازہ کرلو کہ کیا باقی رہا ہوگا۔ اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت طیار کی تھی وہ ایسی صادق اور وفادار جماعت تھی کہ انہوں نے آپ کے لیے جانیں دیدیں۔ وطن چھوڑ دیئے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ غرض آپ کے لیے کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ یہ کیسی زبردست تاثیر تھی اس تاثیر کا بھی مخالفوں نے اقرار کیا ہے۔ اور پھر آپ کی تاثیرات کا سلسلہ بند نہیں ہوا بلکہ اب تک وہ چلی جاتی ہیں قرآن شریف کی تعلیم میں وہی اثر وہی برکات اب بھی موجود ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

ہم علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں کہ توفی کے معنی لغت عرب میں نہ کلام خدا اور رسول میں ہرگز مع جسم عنصری اٹھائے جانے کے نہیں ہیں۔ تمام قرآن شریف کو یکجائی نظر سے دیکھنا چاہیئے قرآن خدائے علیم وخبیر کی طرف سے کامل علم اور حکمت سے نازل کیا گیا ہے اس میں اختلاف ہرگز نہیں۔ بعض آیات بعض کی تفسیر واقع ہوئی ہیں اگر ایک متشابہات ہیں تو دوسری محکمات ہیں۔

جب یہی لفظ اور مقامات میں دوسرے انبیاء کے حق میں بھی وارد ہے تو اس کے معنے بجز موت کے اور کچھ نہیں لیے جاتے تو پھر نہ معلوم کہ کیوں حضرت مسیحؑ کو ایسی خصوصیت دی جاتی ہے کیا ابھی تک مسیحؑ کو خصوصیت دینے کا انہوں نے مزہ نہیں چکھا۔

دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صاف یہ لفظ ہیں اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ[1] پھر حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی قرآن شریف میں یہی تَوَفِّیْ کا لفظ وارد ہے اور اس کے معنی بجز موت اور ہرگز

[1] سورۃ یونس آیت ۴۷

نہیں دیکھو تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ[1]۔ یہ حضرت یوسفؑ کی دعا ہے تو کیا اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے خدا مجھے زندہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھا لے اور پہلے صلحاء کے ساتھ شامل کردے جو کہ زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل میں جو ساحر فرعون نے بلائے تھے ان کے ذکر میں توفّی کا لفظ مذکور ہے جہاں فرمایا۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ[2]۔ اب ایک مسلمان کی یہ شان نہیں کہ خدا اور اس کے کلام کے مقابلہ میں دم مارے۔ قرآن حضرت عیسیٰ کو سراسر مارتا ہے اور ان کے وفات پاجانے کو دلائل اور براہین قطعیہ سے ثابت کرتا ہے اور رسول اکرمؐ نے اس کو معراج کی رات میں وفات یافتہ انبیاء میں دیکھا۔ جائے غور ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ زندہ مع جسم عنصری آسمان (پر) اٹھائے جا چکے تھے تو پھر ان کو وفات شدہ انبیاء سے کیا مناسبت۔ زندہ کو مردہ سے کیا تعلق اور کیسی نسبت؟ ان کے لیے تو کوئی الگ کوٹھڑی چاہیئے تھی۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۴ راگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

طاعون کے بارے میں خواہ کوئی حیلہ حوالہ کریں ہرگز کام نہ آوے گا آخر مستقر خدا تعالیٰ ہی ہوگا۔ لوگ جب اُس کو مانیں گے تب وہ اس سے رہائی دیگا۔ اَیْنَ الْمَفَرّ بھی اسی پر چسپاں ہے کیونکہ دوسرے آفات میں تو کوئی نہ کوئی مفر ہوتا ہے مگر طاعون میں کوئی مفر نہیں ہے۔ صرف خدا کی پناہ ہی کام آویگی خدا کی طرف ظلم کبھی منسوب نہیں ہو سکتا۔ جو صادق ہوگا وہ ضرور اپنے صدق سے نفع پاوے گا۔ یہ وہی دن ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

---

[1] سورۃ یوسف آیت ۱۰۲۔ [2] سورۃ الاعراف آیت ۱۲۷۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ   نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر

سورۃ الانعام

بیان فرمودہ سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

۶۔ فَقَدۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ ؕ فَسَوۡفَ یَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۝

سچ جب اُن کے پاس آیا تو اُنہوں نے جھٹلایا۔ سو اب عنقریب اُس صداقت کی ان کو خبریں ملیں گی جس پر وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔ (آسمانی فیصلہ ٹائیٹل پیج)

۱۱۔ وَلَقَدِ اسۡتُہۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۝

اور تجھ سے پہلے بھی پیغمبروں سے ہنسی اور ٹھٹھا ہوتا رہا ہے مگر ہمیشہ ٹھٹھا کرنے والے اپنے ٹھٹھے کا بدلہ پاتے رہے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

۱۲۔ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ۝

ان کو کہہ کہ زمین کا سیر کر کے دیکھو کہ جو لوگ خدا کے نبیوں کو جھٹلاتے رہے

ہیں اُن کا کیا انجام ہوا ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم ص۲۲۷ حاشیہ نمبر۱۱)

کبھی سفر عجائبات دنیا کے دیکھنے کے لیے بھی ہوتا ہے جس کی طرف آیت کریمہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ اشارت فرما رہی ہے اور کبھی سفر صادقین کی صحبت میں رہنے کی غرض سے جس کی طرف آیت کریمہ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ[1] ہدایت فرماتی ہے اور کبھی سفر عیادت کے لیے بلکہ اتباع جنازہ کے لیے بھی ہوتا ہے اور کبھی بیمار یا بیمار دار علاج کرانے کی غرض سے سفر کرتا ہے اور کبھی کسی مقدمہ عدالت یا تجارت وغیرہ کے لیے بھی سفر کیا جاتا ہے اور یہ تمام قسم سفر کی قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے رُو سے جائز ہیں۔

(اشتہار قیامت کی نشانی ص۲ مشمولہ آئینہ کمالات اسلام)

۱۸۔ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ ۗ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو بجز خدا اور کوئی تیرا یار نہیں کہ اُس تکلیف کو دور کرے اور اگر تجھے کچھ بھلائی پہنچے تو ہر یک بھلائی کے پہنچانے پر خدا ہی قادر ہے۔ کوئی دوسرا نہیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم ص۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر۳)

۱۹۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

اسی کا تمام بندوں پر تسلّط اور تصرّف ہے اور وہی صاحب حکمت کاملہ اور ہر یک چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم ص۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر۳)

۲۰۔ قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَأُوْحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ۚ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ أَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً أُخْرٰى ۚ قُلْ لَّآ أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّإِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ۚ یعنی لازمی ہوگا کہ جس کو قرآنی تعلیم پہنچے وہ خواہ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی ہو۔

[1] سورۃ توبہ آیت ۱۱۹

اس تعلیم کی پیروی کو اپنی گردن پر اُٹھائے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

۲۱ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○

کافر لوگ جو اہل کتاب ہیں ایسے ایسے یقینی طور پر اُس کو شناخت کرتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔
(الحق دہلی صفحہ ۳۶)

۲۲ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ○

اس سے زیادہ تر ظالم اور کون ہے جو خدا تعالیٰ پر جھوٹھ باندھے۔ بیشک مُفتری خدا تعالیٰ کی لعنت کے نیچے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والا جلد مارا جاتا ہے۔ (انجام آتھم صفحہ ۵)

افترا سے مراد ہمارے کلام میں وہ افترا ہے کہ کوئی شخص عمداً اپنی طرف سے بعض کلمات تراش کر یا ایک کتاب بنا کر پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ باتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس نے مجھے الہام کیا ہے اور ان باتوں کے بارے میں میرے پر اس کی وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ سو ہم نہایت کامل تحقیقات سے کہتے ہیں کہ ایسا افترا کبھی کسی زمانہ میں چل نہیں سکا اور خدا کی پاک کتاب صاف گواہی دیتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والے جلد ہلاک کیے گئے ہیں۔ (انجام آتھم صفحہ ۶۳ حاشیہ)

اس شخص سے ظالم تر کون ہے جو خدا پر افترا کرتا ہے یا خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتا ہے اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے خدا کے نبیوں کے ظاہر ہونے کے وقت خدا کے کلام کی تکذیب کی خدا نے ان کو زندہ نہیں چھوڑا اور بڑے بڑے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔ دیکھو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور لوط کی قوم اور فرعون اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن مکہ والے ان کا کیا انجام ہوا۔ پس جبکہ تکذیب کرنے والے اسی دنیا میں سزا پاچکے تو پھر جو شخص خدا پر افترا کرتا ہے جس کا نام اس آیت میں پہلے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے وہ کیونکر بچ سکتا ہے کیا خدا کا صادقوں اور کاذبوں سے معاملہ ایک ہو سکتا ہے اور کیا افترا کرنے والوں کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا میں کوئی سزا نہیں مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ [1]۔ (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۴)

---

[1] سورہ صٰفّٰت آیت ۱۵۵۔

بڑے کافر دو ہی ہیں ایک خدا پر افترا کرنے والا دوسرا خدا کی کلام کی تکذیب کرنے والا پس جبکہ میں نے ایک مکذب کے نزدیک خدا پر افترا کیا ہے اس صورت میں نہ میں صرف کافر بلکہ بڑا کافر ہُوا اور اگر میں مفتری نہیں تو بلاشبہ وہ کفر اس پر پڑے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرمایا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

ظالم سے مراد اس جگہ کافر ہے اس پر قرینہ یہ ہے کہ مفتری کے مقابل پر مکذّب کتاب اللہ کو ظالم ٹھہرایا ہے اور بلاشبہ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے کلام کی تکذیب کرتا ہے کافر ہے سو جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ مجھے مفتری قرار دیکر مجھے کافر ٹھہراتا ہے۔ اس لیے میری تکفیر کی وجہ سے آپ کافر بنتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳ حاشیہ)

اُس سے ظالم تر کون ہے کہ خدا پر افترا کرے یا خدا کے کلام کی تکذیب کرے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۱)

جو شخص دلائل اور نشانات کو دیکھتا ہے اور پھر دیانت امانت اور انصاف کو ہاتھ سے چھوڑتا ہے اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اردسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

وہ شخص جو رات کو ایک بات بناتا اور دن کو لوگوں کو بتاتا اور کہتا ہے کہ مجھے خدا نے ایسا کہا ہے۔ وہ کیونکر بامراد اور بابرگ و بار ہو سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳)

اس شخص سے ظالم تر کون ہے جو خدا پر افترا کرے یا خدا کی آیتوں اور نشانوں کا مکذب ہو۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۱۶)

کذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اُسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھوٹ کے لیے پھر اُسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں کیونکہ اس جھوٹ کو سچائی کا رنگ دینا ہوتا ہے۔ پس اسی طرح اندر ہی اندر اس کے اخلاقی اور روحانی قویٰ زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اسے یہاں تک جرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افترا کر لیتا اور خدا تعالیٰ کے مُرسلوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اظلم ٹھہرتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ یعنی اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے۔ یقیناً یاد رکھو کہ یہ جھوٹ بہت ہی بُری بلا ہے۔ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اس سے بڑھ کر جھوٹ کا خطرناک نتیجہ کیا ہو گا کہ انسان خدا تعالیٰ کے مرسلوں اور اس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ

يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۝

یعنی یہ لوگ تمام نشانوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لاتے۔ پھر جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے لڑتے ہیں۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝

جس شخص نے کافیہ یا ہدایت النحو بھی پڑھی ہو گی وہ خوب جانتا ہے کہ ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو۔ مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تاکہ اُس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو۔ اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ... وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ اور جیسا کہ فرماتا ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ
(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۰-۶۱)

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ۝

اور تجھ سے پہلے جو نبی آئے ان کی بھی تکذیب کی گئی تھی پس انہوں نے تکذیب پر صبر کیا اور ایک مدت تک دُکھ دئے گئے یہاں تک کہ ہماری مدد اُن کو پہنچ گئی چنانچہ گذشتہ رسولوں کی خبریں بھی تجھ کو آچکی ہیں۔
(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ خدا کی باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی اور کوئی نہیں جو ان کو روک سکے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۵۳ و ۵۵)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ کوئی نہیں جو خدا کی باتوں کو بدل دے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۸ و اربعین ۳ صفحہ ۲۷)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ خدا کی باتوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ (اربعین ۲ صفحہ ۱۴)

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

یعنی اگر تیرے پر (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ان کافروں کا اِعراض بہت بھاری ہے سو اگر تجھے طاقت ہے تو زمین میں سرنگ کھود کر یا آسمان پر زینہ لگا کر چلا جا اور ان کے لیے کوئی نشان لے آ اور اگر خدا چاہتا تو ان سب کو جو نشان مانگتے ہیں ہدایت دے دیتا۔ پس تو جاہلوں میں سے مت ہو۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۳۳۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفار کے حق میں چاہتے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور سُنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ لیکن آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کچلا اور پیسا کہ اُن کا نام و نشان مٹا دیا۔ اسی طرح پر ممکن ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگ طرح طرح کی گالیاں۔ افترا پردازیاں اور بدزبانیاں خدا تعالیٰ کے سچے سلسلے کی نسبت سُن کر اضطراب اور استعجال میں پڑیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کی اس سنّت کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی گئی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اس لیے مَیں پھر اور بار بار تاکید حکم کرتا ہوں کہ جنگ و جدال کے مجموں تحریکوں اور تقریبوں سے کنارہ کشی کرو۔ اس لیے کہ جو کام تم کرنا چاہتے ہو یعنی دشمنوں پر حجت پوری کرنا وہ اب خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

اور کافر کہتے ہیں۔ کہ اس پر کوئی نشانی اپنے رب کی طرف سے کیوں نازل نہ ہوئی کہ خدا نشانوں کے نازل

کرنے پر قادر ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۷-۲۲۸ حاشیہ نمبر ۱۱)

قدرت تو حقیقت میں اسی بات کا نام ہے جو داغ احتیاج اسباب سے منزّہ اور پاک اور ادراک انسانی سے برتر ہو۔ اول خدا کو قادر کہنا اور پھر یہ زبان پر لانا کہ اس کی قدرت اسباب مادی سے تجاوز نہیں کرتی۔ حقیقت میں اپنی بات کو آپ ردّ کرنا ہے۔ (پرانی تحریریں صفحہ ۲۸-۲۹)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ۝

کوئی صداقت علمِ الٰہی کے متعلق جو انسان کے لیے ضروری ہے اس کتاب سے باہر نہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۴۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

اس کتاب (قرآن شریف) سے کوئی دینی حقیقت باہر نہیں رہی بلکہ یہ جمیع حقائق و معارف دینیہ پر مشتمل ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۳ حاشیہ)

ہر چند میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن اپنی تعلیم میں کامل ہے اور کوئی صداقت اس سے باہر نہیں کیونکہ اللہ جلّشانہ فرماتا ہے...... مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ یعنی ہم نے اس کتاب سے کوئی چیز باہر نہیں رکھی۔ لیکن ساتھ اس کے یہ بھی میرا اعتقاد ہے کہ قرآن کریم سے تمام مسائل دینیہ کا استخراج و استنباط کرنا اور اُس کی مجملات کی تفاصیل صحیحہ پر حسب منشاء الٰہی قادر ہونا ہر ایک مجتہد اور مولوی کا کام نہیں بلکہ یہ خاص طور پر اُن کا کام ہے جو وحی الٰہی سے بطور نبوت یا بطور ولایت عظمٰی مدد دیئے گئے ہوں۔ سو ایسے لوگوں کے لیے جو استخراج و استنباط معارف قرآنی پر بعلّت غیر ملہم ہونے کے قادر نہیں ہوسکتے۔ یہی سیدھی راہ ہے کہ وہ بغیر قصد استخراج و استنباط قرآن کے اُن تمام تعلیمات کو جو سُنن متوارثہ متعاملہ کے ذریعہ سے ملی ہیں۔ بلا تامل و توقف قبول کرلیں۔ اور جو لوگ وحی ولایت عظمٰی کی روشنی سے منور ہیں اور اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[50] کے گروہ میں داخل ہیں اُن سے بلاشبہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دقائق مخفیہ قرآن کے اُن پر کھولتا رہتا ہے اور یہ بات اُن پر ثابت کردیتا ہے کہ کوئی زائد تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہیں دی بلکہ احادیث صحیحہ میں مجملات و اشارات قرآن کریم کی تفصیل ہے۔ سو اس معرفت کے پانے سے اعجاز قرآن کریم ان پر کھل جاتا ہے اور نیز اُن آیات بیّنات کی سچائی ان پر روشن ہوجاتی ہے۔ جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے جو قرآن کریم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اگرچہ علماء ظاہر بھی ایک قبض کی حالت کے ساتھ اُن آیات پر ایمان لاتے ہیں تا ان کی تکذیب لازم نہ آوے۔ لیکن وہ کامل یقین اور سکینت اور اطمینان جو ملہم کامل کو بعد معائنہ مطابقت و موافقت احادیث صحیحہ اور قرآن کریم اور بعد معلوم کرنے اُس احاطہ تام کے جو در حقیقت قرآن کو

[50] سورۃ الواقعہ آیت ۸۰

تمام احادیث پر ہے ملتی ہے۔ وہ علماء ظاہر کو کسی طرح مل نہیں سکتی بلکہ بعض تو قرآن کریم کو ناقص و ناتمام خیال کر بیٹھتے ہیں اور جن غیر محدود صداقتوں اور حقائق اور معارف پر قرآن کریم کے دائمی اور تمام تر اعجاز کی بنیاد ہے اس سے وہ منکر ہیں اور نہ صرف منکر بلکہ اپنے انکار کی وجہ سے اُن تمام آیات بینات کو جھٹلاتے ہیں جن میں صاف صاف اللہ جلشانہ نے فرمایا ہے کہ قرآن جمیع تعلیمات دینیہ کا جامع ہے۔ (الحق لدھیانہ ص۴۸-۴۹)

تعلیمات ضروریہ میں سے کوئی چیز قرآن سے باہر نہیں رہی اور قرآن ایک مکمل کتاب ہے جو کسی دوسرے مکمل کا منتظر نہیں بناتا۔ (جنگ مقدس ابتدائی تقریر ص۴)

کوئی صداقت اس سے باہر نہیں۔ (کرامات الصادقین ص۱)

میں قرآن شریف سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ سب انبیاء کے وصفی نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے کیونکہ آپ تمام انبیاء کے کمالات متفرقہ اور فضائل مختلفہ کے جامع تھے اور اسی طرح جیسے تمام انبیا کے کمالات آپ کو ملے قرآن شریف بھی جمیع کتب کی خوبیوں کا جامع ہے چنانچہ فرمایا۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ[1] اور مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ ایسا ہی ایک جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ تمام نبیوں کا اقتدا کر۔

(الحکم جلد ۷ ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء ص۳)

بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۝

اللہ تعالیٰ نے دوسری دعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ صاف فرما دیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور چاہوں تو رد کروں۔ جیسا کہ یہ آیت قرآن کی صاف بتلا رہی ہے۔ (برکات الدعاء ص۱)

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۝

[1] سورۃ بینہ آیت ۴

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ ایسے وقت آئے گا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی بلکہ لوگ ہماری تکذیب کر چکے ہونگے کہ وہ پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ قرآن شریف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۔ یہ عادت اللہ ہے کہ ایسے وقت عذاب آتا ہے جب لوگ اُسے بالکل بھول جاتے ہیں۔ ایسا ہی ان الہامات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا چھپ کر آؤں گا گویا ہر شخص کا دل یقین کرلے گا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے ۔ بَغْتَةً کا یہی منشاء ہے ۔

(الحکم جلد ۹ ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صٓ)

۴۶ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

مولوی غلام دستگیر نے میرے صدق یا کذب کا فیصلہ آیت فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا پر چھوڑا تھا جس کے اس محل پر یہ معنی ہیں کہ جو ظالم ہوگا اس کی جڑھ کاٹ دی جائے گی اور یہ امر کسی اہل علم پر مخفی نہیں کہ آیت ممدوحہ بالا کا مفہوم عام ہے جس کا اُس شخص پر اثر ہوتا ہے جو ظالم ہے پس ضرور تھا کہ ظالم اس کے اثر سے ہلاک کیا جاتا لہٰذا چونکہ غلام دستگیر خدا تعالیٰ کی نظر میں ظالم تھا اس لیے اس قدر بھی اُس کو مہلت نہ ملی جو اپنی اس کتاب کی اشاعت کو دیکھ لیتا اس سے پہلے ہی مرگیا اور سب کو معلوم ہے کہ وُہ اِس دُعا سے چند روز بعد ہی فوت ہوگیا۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۳۱)

۵۱ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۔ کیا اندھا اور بینا مساوی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پس جب ہم اس بات کو دیکھتے ہیں تو پھر کس قدر غلطی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ غرض یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیئے اور مقابلہ مومن کے لیئے تیار ہو جانا دانشمند انسان کا کام نہیں ہے۔ اور مومن کی شناخت اُنہیں آثار اور نشانات سے ہوسکتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیے ہیں۔ اِسی فراست الٰہیہ کا رعب تھا جو صحابہؓ کرام پر تھا اور ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ رعب بطور نشانِ الٰہی آتا ہے۔ وہ پوچھ لیتے تھے کہ اگر یہ وحی الٰہی ہے تو ہم مخالفت نہیں کرتے۔ اور وہ ایک ہیبت میں آجاتے تھے...... جو لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ مومن کے ساتھ

خدا ہے وہ اس کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تنہا بیٹھ کر اس پر غور کرتے ہیں
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۲-۱۴۳)

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

کفارہ کی تلاش میں لگنا ہنسی کی بات ہے کیا کفارہ وعدوں کو توڑ سکتا ہے بلکہ وعدہ سے وعدہ بدلتا ہے اور نہ کسی اور تدبیر سے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الخ)
(جنگ مقدس پرچہ ۵ رجون ۱۸۹۳ء صفحہ ۷)

جو شخص تم میں سے بوجہ اپنی جہالت کے کوئی بدی کرے اور پھر توبہ کرے اور نیک کاموں میں مشغول ہو جائے پس اللہ غفور رحیم ہے۔ (شہادت القرآن صفحہ ۳۶)

وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ ○

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ۔ تا مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی سعید لوگ الگ ہو جائیں اور شرارت پیشہ اور سرکش آدمی الگ ہو جائیں۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۰۹ حاشیہ)

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ۔ اور تا مجرموں کی راہ صاف طور پر کھل جاوے یعنی تا معلوم ہو جاوے کہ کون لوگ تیرا ساتھ اختیار کرتے ہیں اور کون لوگ بغیر بصیرت کامل کے مخالفت پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۹۲)

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ۔ تاکہ مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی معلوم ہو جائے کہ کون تجھ سے برگشتہ ہوتا ہے۔
(حقیقۃ الوحی صفحہ ۷)

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ۔ اور تا خدا کی حجت پوری ہو جائے اور مجرموں کی راہ کھل جائے۔
(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۴۵)

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ اور تاکہ مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی معلوم ہو جائے کہ کون مجرم اور

کلام طالب حق ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۵۸)

۵۸ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ○

مجھے اپنی رسالت پر کھلی کھلی دلیل اپنے رب کی طرف سے ملی ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات ص۵)
کہ میں کامل ثبوت لیکر اپنے رب کی طرف سے آیا ہوں اور تم اس ثبوت کو دیکھتے ہو اور پھر تکذیب کر رہے ہو۔ جس چیز کو تم جلدی سے مانگتے ہو (یعنی عذاب) وہ تو میرے اختیار میں نہیں۔ حکم اخیر صادر کرنا تو خدا ہی کا منصب ہے۔ وہی حق کو کھول دیگا اور وہی خیر الفاصلین ہے جو ایک دن میرا اور تمہارا فیصلہ کرے گا۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات ص۱۸)

۶۰ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○

میں نے کئی بار اشتہار دیا ہے کہ کوئی ایسی سچائی پیش کرو جو ہم قرآن شریف سے نہ نکال سکیں۔ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ یہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے اپنے حقائق اور معارف کے لحاظ سے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے رنگ میں۔ اگر بشر کا کلام ہوتا تو سطحی خیالات کا نمونہ دکھایا جاتا۔ مگر یہ طرز ہی اور ہے جو بشری طرزوں سے الگ اور ممتاز ہے۔ اس میں باوجود اعلیٰ درجہ کی بلند پردازی کے نمود و نمائش بالکل نہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)
اگر کسی کا یہ ارادہ ہو کہ بلا استصواب کتاب اللہ اس کا حرکت و سکون نہ ہوگا اور اپنی ہر ایک بات پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے گا تو یقینی امر ہے کہ کتاب اللہ مشورہ دے گی جیسے فرمایا وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ سو اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ ہم مشورہ کتاب اللہ سے لیں گے تو ہم کو ضرور مشورہ ملے گا۔
(رپورٹ جلسہ سالانہ ص۳۵)

۱ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُم بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضٰى أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

قَالَ بَعْضُ الْمُسْتَعْجِلِيْنَ اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ قَدْ جَآءَ فِي الْقُرْاٰنِ بِمَعْنَى الْاِنَامَةِ اَيْضًا كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا وَكَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى۔ فَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى مَا اَرَادَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيٰتِ مِنْ لَفْظِ التَّوَفِّيْ اِلَّا الْاِمَاتَةَ وَقَبْضَ الرُّوْحِ فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ اَقَامَ الْقَرَائِنَ وَقَالَ: وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا يَعْنِيْ وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ بِمَوْتٍ حَقِيْقِيٍّ يَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِهَا بِمَوْتٍ مَجَازِيٍّ فَانْظُرْ كَيْفَ اَشَارَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِلٰى اَنَّ قَبْضَ الرُّوْحِ فِي النَّوْمِ مَوْتٌ مَجَازِيٌّ فَذَكَرَ لَفْظَ التَّوَفِّيْ هٰهُنَا بِاِقَامَةِ قَرِيْنَةِ الْمَنَامِ تَنْبِيْهًا عَلٰى اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّيْ هٰهُنَا قَدْ نُقِلَ مِنَ الْمَعْنَى الْحَقِيْقِيِّ اِلَى الْمَعْنَى الْمَجَازِيِّ وَاِشَارَةً اِلٰى اَنَّ مَعْنٰى لَفْظِ التَّوَفِّيْ حَقِيْقَةً هُوَ الْمَوْتُ لَا غَيْرُهُ وَكَذٰلِكَ اَقَامَ قَرِيْنَةَ قَوْلِهٖ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ وَقَرِيْنَةَ الَّيْلِ فِيْ اٰيَةٍ اُخْرٰى

(ترجمہ) بعض جلدباز کہتے ہیں کہ توفی کا لفظ قرآن کریم میں نیند کے معنے میں بھی آیا ہے جیسے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا اور جیسے کہ فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى پس واضح رہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں توفی کے لفظ سے موت اور قبض روح کے علاوہ اور کوئی مفہوم مراد نہیں لیا اور اسی مفہوم کی تعیین کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرائن قائم کیے ہیں چنانچہ فرمایا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا یعنی وہ جان جو حقیقی موت نہیں مرتی اُسے اللہ تعالیٰ نیند میں موت مجازی دیکر اُس کی توفی کرتا ہے اسی لیے اللہ تعالےٰ نے توفی کا ذکر منام کے قرینے سے کیا تا یہ بتایا جائے کہ یہاں توفی کے معنی حقیقی معنوں سے مجازی معنی کی طرف منتقل کیے گئے ہیں اور یہ اشارہ ہے کہ توفی کے حقیقی معنے موت ہیں نہ کچھ اور۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ اور الَّيْل کا قرینہ بھی ساتھ لگایا ہے یعنی هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ الخ کی آیت میں۔ اور یہ قرائن اس لیے قائم

ﻟﮧ الزمر آیت ۴۳ ؂

اَعْنِیْ اٰیَۃَ هُوَالَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ الخ تَنْبِیْهًا عَلٰی اَنَّ لَفْظَ التَّوَفِّیْ هٰهُنَا لَیْسَ بِمَعْنَی الْاِنَامَۃِ بَلِ الْمَقْصُوْدُ الْاِمَاتَۃُ وَالْبَعْثُ بَعْدَ الْاِمَاتَۃِ لِیَکُوْنَ دَلِیْلاً عَلٰی بَعْثِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ فَلِاَجْلِ ذٰلِکَ ذَکَرَ بَعْثَ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ بَعْدَ هٰذِهِ الْاٰیَۃِ وَقَالَ : ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ لِیَجْعَلَ هٰذَا الْمَوْتَ الْمَجَازِیَّ وَالْبَعْثَ الْمَجَازِیَّ دَلِیْلاً عَلَی الْمَوْتِ الْحَقِیْقِیِّ۔ (حمامۃ البشریٰ ص۵۵)

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝

تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کو بھیجتا ہے...... اس مقام میں صاحب معالم نے یہ حدیث لکھی ہے کہ ہر یک بندہ کے لیے ایک فرشتہ موکل ہے جو اُس کے ساتھ ہی رہتا ہے اور اُس کی نیند اور بیداری میں شیاطین اور دوسری بلاؤں سے اُس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور اسی مضمون کی ایک اور حدیث کعب الاحبار سے بیان کی ہے اور ابن جریر اس آیت کی تائید میں یہ حدیث لکھتا ہے اِنَّ مَعَکُمْ مَنْ لَّا یُفَارِقُکُمْ اِلَّا عِنْدَ الْخَلَاءِ وَعِنْدَ الْجِمَاعِ فَاسْتَحْیُوْهُمْ وَاَکْرِمُوْهُمْ یعنی تمہارے ساتھ وہ فرشتے ہیں کہ بجز جماع اور پاخانہ کی حاجت کے تم سے جدا نہیں ہوتے سو تم اُن سے شرم کرو اور اُن کی تعظیم کرو اور اسی جگہ عکرمہ سے یہ حدیث لکھی ہے کہ ملائکہ ہر یک شر سے بچانے کے لیے انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور جب تقدیر مبرم نازل ہو تو الگ ہو جاتے ہیں اور پھر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ کوئی ایسا انسان نہیں جس کی حفاظت کے لیے دائمی طور پر ایک فرشتہ مقرر نہ ہو۔ پھر ایک اور حدیث عثمان بن عفان سے لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بیس۲۰ فرشتے مختلف خدمات کے بجالانے کے لیے انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور دن کو ابلیس اور رات کو ابلیس کے بچے ضرر رسانی کی غرض سے ہر دم گھات میں لگے رہتے ہیں اور پھر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ حدیث مندرجہ ذیل لکھی ہے :۔

حَدَّثَنَا اَسْوَدُ بْنُ عَامِرٍ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ حَدَّثَنِیْ مَنْصُوْرٌ عَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ

کیتے تا یہ بتایا جائے کہ اس جگہ توفی کے لفظ کے معنے سلانے کے نہیں۔ بلکہ اس سے مراد امانت اور امانت کے بعد بعث ہے تا کہ یہ بات بعث یوم الدین کے لیے دلیل ہو۔ اسی لیے اس آیت کے بعد بعث یوم القیامۃ کا خدا تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور فرمایا ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ (پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر آؤ گے) تا یہ مجازی موت اور مجازی بعث حقیقی موت پر دلیل ہو۔ (حمامۃ البشریٰ ص۵۵)

ؔ مزید تشریح سورۃ آل عمران آیت ۵۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُکِّلَ بِہٖ قَرِیْنُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِیْنُہٗ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ قَالُوْا وَاِیَّاکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَاِیَّایَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْہِ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ۔ الفرد باخراجہ مسلم صـ۲۴۴

یعنی توسط اسود وغیرہ عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی تم میں سے ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ ایک قرین جنّ کی نوع میں سے اور ایک قرین فرشتوں میں سے مؤکل نہ ہو۔ صحابی نے عرض کی کہ کیا آپ بھی یا رسول اللہ صلعم۔ فرمایا کہ ہاں میں بھی۔ پر خدا نے میرے جنّ کو میری تابع کر دیا۔ سو وہ بجز خیر اور نیکی کے اور کچھ بھی مجھے نہیں کہتا۔ اس کے اخراج میں مسلم منفرد ہے۔

اس حدیث سے صاف اور کھلے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ایک داعی شر انسان کے لیے مقرر ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک داعی خیر بھی ہر یک بشر کے لیے مؤکل ہے جو کبھی اُس سے جدا نہیں ہوتا اور ہمیشہ اس کا قرین اور رفیق ہے۔ اگر خدا تعالیٰ فقط ایک داعی الی الشر ہی انسان کیلئے مقرر کرتا اور داعی الی الخیر مقرر نہ کرتا تو خدا تعالیٰ کے عدل اور رحم پر دھبّہ لگتا کہ اُس نے شر انگیزی اور وسوسہ اندازی کی غرض سے ایسے ضعیف اور کمزور انسان کو فتنہ میں ڈالنے کے لیے کہ جو پہلے ہی نفس امّارہ ساتھ رکھتا ہے شیطان کو ہمیشہ کا قرین اور رفیق اس کا ٹھہرا دیا جو اُس کے خون میں بھی سرایت کر جاتا ہے اور دل میں داخل ہو کر ظلمت کی نجاست اُس میں چھوڑ دیتا ہے مگر نیکی کی طرف بلانیوالا کوئی ایسا رفیق مقرر نہ کیا تا وہ بھی دل میں داخل ہوتا اور خون میں سرایت کرتا اور تا میزان کے دونوں پلّے برابر رہتے۔ مگر اب جبکہ قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہو گیا کہ جیسے بدی کی دعوت کے لیے خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کا قرین شیطان کو مقرر کر رکھا ہے۔ ایسا ہی دوسری طرف نیکی کی دعوت کرنے کے لیے روح القدس کو اُس رحیم و کریم نے دائمی قرین انسان کا مقرر کر دیا ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ تبعاً ولقاً کی حالت میں اثر شیطان کا کالعدم ہو جاتا ہے گویا وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور روح القدس کا نور انتہائی درجہ پر چمک اُٹھتا ہے تو اُس وقت اس پاک اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر کون اعتراض کر سکتا ہے بجز اُس نادان اور اندھے کے کہ جو حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور پاک تعلیم کے نور سے کچھ بھی حصّہ نہیں رکھتا بلکہ سچ اور واقعی امر تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ تعلیم بھی منجملہ معجزات کے ایک معجزہ ہے کیونکہ جس خوبی اور اعتدال اور حکیمانہ شان سے اس تعلیم نے اس عقدہ کو حل کر دیا کہ کیوں انسان میں نہایت قوی جذبات خیر یا شر کے پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ عالم رؤیا میں بھی اُن کے انوار یا ظلمتیں صاف اور صریح طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ اس طرز محکم اور حقانی سے کسی اور کتاب نے بیان نہیں کیا اور زیادہ تر اعجاز کی صورت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بجز اس طریق کے ماننے کے اور کوئی بھی طریق بن نہیں پڑتا۔ اور اس قدر اعتراض وارد ہوتے ہیں کہ ہرگز ممکن نہیں کہ اُن سے مخلصی حاصل ہو کیونکہ خدا تعالیٰ

کا عام قانون قدرت ہم پر ثابت کر رہا ہے کہ جس قدر ہمارے نفوس و قویٰ و اجسام کو اُس ذات مبدء فیض سے فائدہ پہنچتا ہے وہ بعض اور چیزوں کے توسّط سے پہنچتا ہے مثلاً اگرچہ ہماری آنکھوں کو وہی روشنی بخشتا ہے مگر وہ روشنی آفتاب کے توسّط سے ہم کو ملتی ہے اور ایسا ہی رات کی ظلمت جو ہمارے نفوس کو آرام پہنچاتی ہے اور ہم نفس کے حقوق اُس میں ادا کر لیتے ہیں وہ بھی درحقیقت اُسی کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ درحقیقت ہریک پیدا شوندہ کی علت العلل وہی ہے۔ پھر جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بندھا ہوا قانون قدیم سے ہمارے افاضہ کے لیے چلا آتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کے توسّط سے ہریک فیض خدا تعالیٰ کا پاتے ہیں ہاں اُس فیض کے قبول کرنے کے لیے اپنے اندر قویٰ بھی رکھتے ہیں جیسے ہماری آنکھ روشنی کے قبول کرنے کے لیے ایک قسم کی روشنی اپنے اندر رکھتی ہے اور ہمارے کان بھی اُن اصوات کے قبول کرنے کے لیے جو ہوا پہنچاتی ہے ایک قسم کی حس اپنے اعصاب میں موجود رکھتے ہیں لیکن یہ تو نہیں کہ ہمارے قویٰ ایسے مستقل اور کامل طور پر اپنی بناوٹ رکھتے ہیں کہ اُن کو خارجی معینات اور معاونات کی کچھ بھی ضرورت اور حاجت نہیں ہم کبھی نہیں دیکھتے کہ کوئی ہماری جسمانی قوت صرف اپنے ملکہ موجودہ سے کام چلا سکے اور خارجی ممد و معاون کی محتاج نہ ہو۔ مثلاً اگرچہ ہماری آنکھیں کیسی ہی تیز بین ہوں مگر پھر بھی ہم آفتاب کی روشنی کے محتاج ہیں اور ہمارے کان کیسے ہی شنوا ہوں مگر پھر بھی ہم اُس ہوا کے حاجت مند ہیں جو آواز کو اپنے اندر لپیٹ کر ہمارے کانوں تک پہنچا دیتی ہے اِس سے ثابت ہے کہ صرف ہمارے قویٰ ہماری انسانیت کی کل چلانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ضرور ہمیں خارجی مُمدّوں اور معاونوں کی حاجت ہے مگر قانون قدرت ہمیں بتلا رہا ہے کہ وہ خارجی ممد و معاون اگرچہ بلحاظ علت العلل ہونے کے خدائے تعالیٰ ہی ہے مگر اُس کا انتظام ہرگز نہیں ہے کہ وہ بلا توسّط ہمارے قویٰ اور اجسام پر اثر ڈالتا ہے بلکہ جہاں تک ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قدر ہم اپنے فکر اور ذہن اور سوچ سے کام لیتے ہیں صریح اور صاف اور بدیہی طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ ہریک فیضان کے لیے ہم میں اور ہمارے خداوند کریم میں علل متوسّطہ ہیں جن کے توسّط سے ہریک قوت اپنی حاجت کے موافق فیضان پاتی ہے پس اسی دلیل سے ملایک اور جنّات کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہم نے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خیر اور شر کے اکتساب میں صرف ہمارے ہی قویٰ کافی نہیں بلکہ خارجی مُمدّات اور معاونات کی ضرورت ہے جو خارق عادت اثر رکھتے ہوں مگر وہ ممد اور معاون خدا تعالیٰ براہ راست اور بلا توسّط نہیں بلکہ بتوسّط بعض اسباب ہے سو قانون قدرت کے ملاحظہ نے قطعی اور یقینی طور پر ہم پر کھول دیا کہ وہ ممدّات اور معاونات خارج میں موجود ہیں گو اُن کی کُنہ اور کیفیت ہم کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ نہ براہ راست خدا تعالےٰ ہے اور نہ ہماری ہی قوتیں اور ہمارے ہی ملکے ہیں بلکہ وہ اِن دونوں قسموں سے الگ ایسی مخلوق چیزیں ہیں جو ایک مستقل وجود اپنا رکھتی ہیں اور جب ہم اِن میں سے کسی کا نام داعی الی الخیر رکھیں گے تو اُسی کو ہم

روح القدس یا جبرائیل کہیں گے اور جب ہم اُن میں سے کسی کا نام داعی الی الشر رکھیں گے تو اُسی کو ہم شیطان اور ابلیس کے نام سے بھی موسوم کریں گے۔ یہ تو ضرور نہیں کہ ہم روح القدس یا شیطان ہر یک تاریک دل کو دکھلا دیں۔ اگرچہ عارف اُن کو دیکھ بھی لیتے ہیں اور کشفی مشاہدات سے وہ دونوں نظر بھی آجاتی ہیں مگر محجوب کے لیے جو ابھی نہ شیطان کو دیکھ سکتا ہے نہ روح القدس کو۔ یہ ثبوت کافی ہے کیونکہ تاثر کے وجود سے مؤثر کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ قاعدہ صحیح نہیں ہے تو پھر خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی کیونکر پتہ لگ سکتا ہے کیا کوئی دکھلا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کہاں ہے۔ صرف متاثرات کی طرف دیکھ کر جو اس کی قدرت کے نمونے ہیں اس مؤثر حقیقی کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ ہاں عارف اپنے انتہائی مقام پر روحانی آنکھوں سے اُس کو دیکھتے ہیں اور اُس کی باتوں کو بھی سنتے ہیں مگر محجوب کے لیے بجز اس کے اور استدلال کا طریق کیا ہے کہ متاثرات کو دیکھ کر اُس مؤثر حقیقی کے وجود پر ایمان لاوے سو اسی طریق سے روح القدس اور شیاطین کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف ثابت ہوتا ہے بلکہ نہایت صفائی سے نظر آجاتا ہے۔ افسوس اُن لوگوں کی حالت پر جو فلسفہ باطلہ کی ظلمت سے متاثر ہو کر ملایک اور شیاطین کے وجود سے انکار کر بیٹھے ہیں اور بیّنات اور نصوصِ صریحہ قرآن کریم سے انکار کر دیا اور نادانی سے بھرے ہوئے الحاد کے گڑھے میں گر پڑے اور اس جگہ واضح رہے کہ یہ مسئلہ اُن مسائل میں سے ہے جن کے اثبات کے لیے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی استنباط حقائق میں اس عاجز کو متفرد کیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ (آئینہ کمالات اسلام صـ۷۹ ـ ۸۹)

۶۴ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○

اب ظاہر ہے کہ اِن آیات کا حاصل مطلب یہی ہے کہ جب بعض گناہگاروں کو ہلاک کرنے کے لیے خدا تعالیٰ اپنے قہری ارادہ سے اس دریا میں صورت طوفان پیدا کرتا ہے جس میں ان لوگوں کی کشتی ہو تو پھر ان کی تضرع اور رجوع پر ان کو بچا لیتا ہے۔ حالانکہ جانتا ہے کہ پھر وہ مفسدانہ حرکات میں مشغول ہونگے۔ کیا اس طوفان سے یہ غرض ہوتی ہے کہ کشتی والوں کو صرف خفیف خفیف چوٹیں لگیں مگر ہلاک نہ ہوں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات جلد سوم صـ۱۸۱)

۶۵ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ

مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○

کہہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم کو نشان دکھلانے کے لیے اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب نمودار ہو یا ایمانداروں کی لڑائی سے تم کو عذاب کا مزہ چکھاوے دیکھو ہم کیونکر آیات کو پھیرتے ہیں تا وہ سمجھ لیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

کہہ وہی پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب تم پر بھیجے اور چاہے تو تمہیں دو فریق بنا کر ایک فریق کی لڑائی کا دوسرے کو مزہ چکھا دے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور انکے جوابات صفحہ ۱۸)

یہ ضرور نہیں ہے کہ خدا ہر وقت ایک ہی رنگ میں عذاب دیوے۔ قرآن شریف میں عذاب کے کئی اقسام بیان کئے ہیں جیسے قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ

جنگ و لڑائی وغیرہ کو بھی عذاب قرار دیا ہے۔ عذاب بہت اقسام کے ہوتے ہیں کیا خدا کے پاس عذاب کی ایک ہی قسم ہے اور خدا کی عادت ہے کہ ہر نشان میں ایک پہلو اخفا کا رکھتا ہے ورنہ وہ چاہے تو چُن چُن کر بڑے بڑے بدمعاش ہلاک کر دے۔ سب لوگ ایک ہی دن میں سیدھے ہو جاویں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱-۲ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

۷۲۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ان کو کہدے کہ تمہارے خیالات کیا چیز ہیں ہدایت وہی ہے جو خدا تعالیٰ براہ راست آپ دیتا ہے ورنہ انسان اپنے غلط اجتہادات سے کتاب اللہ کے معنی بگاڑ دیتا ہے اور کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ وہ خدا ہی ہے جو غلطی نہیں کھاتا لہٰذا ہدایت اسی کی ہدایت ہے اپنے خیالی معنے بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۸)

۸۰: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۝

جب تک انسان پورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اسی سے نہ مانگے سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی کلوں کو چلاتا ہے پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکون تک کو اسی انجن کی طاقت عظمیٰ کے ماتحت نہ کر لیوے وہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہو سکتا ہے؟ اور کیونکر اپنے آپ کو إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا۔ کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے منہ سے کہہ سکتا ہے دل سے بھی ادھر کی طرف متوجہ ہو تو لاریب وہ مسلم ہے۔ وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جھکتا ہے اور روح اور دل کی طاقتیں (اس درخت کی طرح جس کی شاخیں ابتداءً ایک طرف کر دی جائیں اور پرورش پا لیں) اُدھر ہی جھکتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک سختی اور تشدد اس کے دل میں پیدا ہو کر اُسے منجمد اور پتھر بنا دیتا ہے۔ جیسے وہ شاخیں پھر دوسری طرف مڑ نہیں سکتیں۔ اسی طرح پر وہ دل اور روح دن بدن خدا تعالیٰ سے دُور ہوتی جاتی ہے پس یہ بڑی خطرناک اور دل کو کپکپا دینے والی بات ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے سے سوال کرے۔ اس لیے نماز کا التزام اور پابندی بڑی ضروری چیز ہے۔ تاکہ اوّلاً وہ ایک عادت راسخہ کی طرح قائم ہو اور رجوع الی اللہ کا خیال ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وقت خود آجاتا ہے کہ انقطاع کلّی کی حالت میں انسان ایک نور اور ایک لذت کا وارث ہو جاتا ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۲۰)

جب تک انسان پورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اسی سے نہ مانگے سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی

تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی کلوں کو چلاتا ہے پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت وسکون کو اُسی انجن کی طاقت عظمیٰ کے ماتحت نہ کر لیوے وہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہو سکتا ہے اور اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے منہ سے کہتا ہے ویسے ہی اُدھر کی طرف متوجہ ہو تو لاریب وہ مسلم ہے وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جھکتا ہے وہ یاد رکھے کہ بڑا ہی بدقسمت اور محروم ہے کہ اس پر وہ وقت آجانے والا ہے کہ وہ زبانی اور نمائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف نہ جھک سکے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

برکات اور فیوض الٰہی کے حصول کے واسطے دل کی صفائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے جب تک دل صاف نہ ہو کچھ نہیں۔ چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ دل پر نظر ڈالے تو اس کے کسی حصہ یا کسی گوشہ میں کوئی شعبہ نفاق کا نہ ہو جب یہ حالت ہو تو پھر الٰہی نظر کے ساتھ تجلیات آتی ہیں اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ایسا وفادار اور صادق ہونا چاہیئے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنا صدق دکھایا یا جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ دکھایا۔ جب انسان اس نمونہ پر قدم مارتا ہے تو وہ بابرکت آدمی ہو جاتا ہے پھر دنیا کی زندگی میں کوئی ذلّت نہیں اُٹھاتا۔ اور نہ تنگی رزق کی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس پر خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو لعنتی زندگی سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے مختصر یہ کہ جو خدا تعالیٰ سے سچا اور کامل تعلق رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ساری مرادیں پوری کر دیتا ہے اسے نامراد نہیں رکھتا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

۸۳ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۝

جب اس (انسان) کی سرشت میں محبتِ الٰہی اور موافقت باللہ بخوبی داخل ہو گئی۔ یہاں تک کہ خدا اُس کے کان ہو گیا جن سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھیں ہو گیا جن سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ ہو گیا جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پاؤں ہو گیا جس سے وہ چلتا ہے تو پھر کوئی ظلم اُس میں باقی نہ رہا اور ہر یک خطرہ سے امن میں آگیا۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا

اِیْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۰۵،۵۰۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی ظلم کو نہیں ملایا وہ امن کی حالت میں ہیں اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۱۹۵)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو کسی ظلم سے آلودہ نہیں کیا اُن کو ہر ایک بلا سے امن ہے اور وہی ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔ (اربعین ۳ صفحہ ۲۷)

جو لوگ اُن برکات و انوار پر ایمان لائیں گے کہ جو تجھ کو خدائے تعالیٰ نے عطا کیے ہیں اور ایمان اُن کا خالص اور وفاداری سے ہوگا تو ضلالت کی راہوں سے امن میں آجائیں گے اور وہی ہیں جو خدا کے نزدیک ہدایت یافتہ ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

خدا تعالیٰ نے اگرچہ جماعت کو وعدہ دیا ہے کہ وہ اسے اس بلا (طاعون) سے محفوظ رکھے گا مگر اس میں بھی ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ کہ جو لوگ اپنے ایمانوں کو ظلم سے نہ ملاویں گے وہ امن میں رہیں گے...... لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ میں شرک سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہندوؤں کی طرح پتھروں کے بتوں یا اور مخلوقات کو سجدہ کیا بلکہ جو شخص ماسوی اللہ کی طرف مائل ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے حتّٰی کہ دل میں جو منصوبے اور چالاکیاں رکھتا ہے ان پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ بھی شرک ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ رنومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۳)

بعض وقت انسان موجودہ حالتِ امن پر بھی بے خطر ہو جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ امن میں زندگی گذارتا ہوں مگر یہ غلطی ہے کیونکہ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ سابقہ زندگی میں کیا ہوا ہے اور کیا کیا بے اعتدالیاں اور کمزوریاں ہو چکی ہیں اس واسطے مومن کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کبھی بے خوف نہ ہو اور ہر وقت توبہ اور استغفار کرتا رہے کیونکہ استغفار سے انسان گذشتہ بدیوں کے بُرے نتائج سے بھی خدا کے فضل سے بچ رہتا ہے یہ سچی بات ہے کہ توبہ اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اگر ہمارا کوئی مرید طاعون سے مر جاتا ہے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے کلام میں یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف بیعت کرنے والا ہی اس سے محفوظ رہے گا بلکہ اُس نے ایک دفعہ مجھے مخاطب کرکے فرمایا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ یعنی بقدر دعویٰ کے ایمان میں کسی قسم کا ظلم نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ پوری وفا۔ پورا صدق اور اخلاص کا معاملہ ہو اور اس کی شناخت کامل ہو تو وہ شخص اس آیت کا مصداق ہو سکتا ہے لیکن یہ ایسی بات ہے کہ جس کو سوائے خدا (تعالیٰ) کے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ آیا فلاں شخص میں

پورا صدق و اخلاص ہے کہ نہیں۔ بعض وقت ایک انسان کے حق میں موت ہی اچھی ہوتی ہے کہ خدا اُسے اس ذریعہ سے آیندہ لغزش سے بچا لیتا ہے (جیسے بعض کافروں کے حق میں زندگی اس لیے بہتر ہوتی ہے.... کہ اُن کو آیندہ ایمان نصیب ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی بعض مومن کے حق میں موت اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اگروہ زندہ رہتا تو کافر ہوجاتا) کہ اس کا خاتمہ کفر پر نہ ہو۔ (البدر جلد ۳ ۲۲و۲۳ مورخہ ۸ و ۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

میرے کسی کلام میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ہر ایک شخص جو بیعت کرے وہ طاعون سے محفوظ رہے گا۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ پس کامل پیروی کرنے والے اور ہر ایک ظلم سے بچنے والے جن کا علم محض خدا کو ہے، بچائے جائیں گے اور کمزور لوگ طاعون سے شہید ہوکر شہادت کا اجر پاویں گے اور طاعون ان کے لیے تمحیص اور تطہیر کا موجب ٹھیرے گی۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۲۲)

جن لوگوں نے مجھے قبول کیا اور مجھ پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو کسی ظلم اور قصور اور کسی نوع کی ایمانی یا عملی تاریکی یا نقص کے ساتھ مختلط نہیں کیا وہ طاعون کے حملہ سے امن میں رہیں گے۔ پس وحی الٰہی سے کہاں سے یہ ثابت ہے کہ جو لوگ اپنے اندر کچھ نقص اور ظلم رکھتے ہیں یا کوئی ایمانی کمزوری ہے وہ بھی اس وعدۂ الٰہی کے نیچے داخل ہیں۔

(الحکم ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء جلد ۹ نمبر ۱۴ صفحہ ۵)

ماننا پڑتا ہے کہ بعض مومنوں کو بھی طاعون ہوسکتا ہے مگر یاد رہے وہی مومن جو کامل نہیں۔ اسی لیے میرے الہام میں ہے کہ وہ طاعون سے محفوظ رہیں گے جو لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ کے مصداق ہیں یعنی اپنے ایمان کے نور میں کسی قسم کی تاریکی شامل نہیں کرتے اور یہ مقام سوائے کاملین کے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا ۶ھ ہجری میں جب طاعون پڑا ہے تو کوئی مسلمان نہیں مرا لیکن جب حضرت عمر کے عہد میں طاعون پڑا۔ تو کئی صحابی بھی شہید ہوئے۔ وجہ یہ کہ کامل مومن ہی ایسی باتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

جن لوگوں نے مان لیا ہے اور اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کو نہ ملایا۔ ایسے لوگوں کے واسطے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ جماعت کے وہ لوگ بچائے جائیں گے جو پورے طور سے ہماری ہدایتوں پر عمل کریں اور اپنے اندرونی عیوب اور اپنی غلطیوں کی مَیل کو دور کر دیں گے اور نفس کی بدی کی طرف نہ جھکیں گے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۴ مورخہ ۴ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

۸۸۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

اَجْتَبَيْنٰهُمْ اور ہم نے اُن کو چُن لیا یعنی وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور برگزیدہ تھے اس لیے قابلِ رسالت و نبوت ٹھہرے۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۱۹۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

۹۱۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۝

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا کے نام اپنے اندر جمع رکھتے ہیں کیونکہ وہ وجود پاک جامع کمالات متفرقہ ہے پس وہ موسیٰ بھی ہے اور عیسیٰ بھی اور آدم بھی اور ابراہیم بھی اور یوسف بھی اور یعقوب بھی۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ یعنی اے رسول اللہ تو اُن تمام ہدایات متفرقہ کو اپنے وجود میں جمع کر لے۔ جو ہر یک نبی خاص طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ پس اِس سے ثابت ہے کہ تمام انبیا کی شانیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں شامل تھیں اور درحقیقت محمدؐ کا نام صلی اللہ علیہ وسلم اِسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ محمد کے یہ معنے ہیں کہ بغایت تعریف کیا گیا اور غایت درجہ کی تعریف تبھی متصور ہو سکتی ہے کہ جب انبیا کے تمام کمالات متفرقہ اور صفاتِ خاصّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں جن کا اس وقت لکھنا موجب طوالت ہے اسی پر دلالت کرتی بلکہ بصراحت بتلاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک باعتبار اپنی صفات اور کمالات کے مجموعہ انبیا تھی اور ہر یک نبی نے اپنے وجود کے ساتھ مناسبت پا کر یہی خیال کیا کہ میرے نام پر وہ آنے والا ہے۔ اور قرآن کریم ایک جگہ فرماتا ہے کہ سب سے زیادہ ابراہیم سے مناسبت رکھنے والا یہ نبی ہے اور بخاری میں ایک حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری مسیح سے بشدت مناسبت ہے اور اُس کے وجود سے میرا وجود ملا ہُوا ہے پس اِس حدیث میں حضرت مسیح کے اُس فقرہ کی تصدیق ہے کہ وہ نبی میرے نام پر آئے گا سو ایسا ہی ہُوا کہ ہمارا مسیح صلی اللہ علیہ وسلم جب آیا تو اُس نے مسیح ناصری کے ناتمام کاموں کو پورا کیا اور اُس کی صداقت کے لیے گواہی دی اور اُن تہمتوں سے اُس کو بری قرار دیا جو یہود اور نصارٰی نے اُس پر لگائی تھیں اور مسیح کی روح کو خوشی پہنچائی۔ یہ مسیح ناصری کی روحانیت کا پہلا جوش تھا جو ہمارے سیّد ہمارے مسیح خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے اپنی مراد کو پہنچا فالحمد للّٰہ۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۳۴۳)

یہ کمالات متفرقہ اِس اُمّت میں جمع کرنے کا کیوں وعدہ دیا گیا۔ اِس میں بھید یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات متفرقہ ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

یعنی تمام نبیوں کو جو ہدایتیں ملی تھیں۔ اُن سب کا اقتدا کر۔ پس ظاہر ہے کہ جو شخص اُن تمام متفرق ہدایتوں کو اپنے اندر جمع کرے گا۔ اُس کا وجود ایک جامع وجود ہو جائے گا اور تمام نبیوں سے وہ افضل ہوگا۔ پھر جو شخص اُس نبی جامع الکمالات کی پیروی کرے گا ضرور ہے کہ ظلّی طور پر وہ بھی جامع الکمالات ہو۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۶۶)

یہ جو قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ پس اُن کی یعنی گذشتہ نبیوں کی جن کا اُوپر ذکر آیا ہے اقتدا کر۔ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جس قدر گذشتہ انبیاء ہوئے۔ انہوں نے مخلوق کی ہدایت مختلف پہلوؤں سے کی اور مختلف قسم کی ان میں خوبیاں تھیں۔ کسی میں کوئی خوبی اور کمال تھا اور کسی میں کوئی۔ اور اُن تمام نبیوں کی اقتدا کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ ان تمام متفرق خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہیئے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص جامع ان تمام خوبیوں کا ہے جو متفرق طور پر تمام انبیاء میں پائی جاتی ہیں۔ وہ تمام متفرق کمالات اپنے اندر جمع رکھتا ہے اس لیے وہ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کی خوبی اس میں موجود ہے۔ اور وہ تمام متفرق خوبیوں کا جامع ہے مگر پہلے اس سے کوئی نبی ان تمام خوبیوں کا جامع نہ تھا۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ان کی ہدایت کی پیروی کر یعنی تمام گذشتہ انبیا کے کمالاتِ متفرقہ کو اپنے اندر جمع کرلے۔ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت کا اظہار کرتی ہے۔ تمام گذشتہ نبیوں اور ولیوں میں جس قدر خوبیاں اور صفات اور کمال تھے وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے۔ سب کی ہدایتوں کا اقتدا کرکے آپ جامع تمام کمالات کے ہوگئے۔ مگر جامع بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان متکبر نہ ہو۔ جو سمجھتا ہے کہ مَیں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ خاکساری سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ جہاں انسان کوئی فائدہ کی بات دیکھے۔ چاہیئے کہ اسی جگہ سے فائدہ حاصل کرے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۶ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

یہ امر جو ہے کہ تو سب کی اقتدا کر یہ امر بھی خلقی اور کونی ہے یعنی تیری فطرت کو حکم دیا کہ وہ کمالات جو جمیع انبیا علیہم السلام میں متفرق طور پر موجود تھے اس میں یکجائی طور پر موجود ہوں اور گویا اس کے ساتھ ہی وہ کمالات اور خوبیاں آپ کی ذات میں جمع ہوگئیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

۹۲ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ

مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ کَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُکُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ○

الہام کے منکروں نے اللہ تعالیٰ کی ذات با برکات کا کچھ قدر شناخت نہیں کیا اور اُس کی رحمت کو جو بندوں کی ہر یک حاجت کے وقت جوش مارتی ہے نہیں پہچانا تب ہی اُنہوں نے کہا کہ خدا نے کوئی کتاب کسی بشر پر نازل نہیں کی۔

ترا عقل تو ہر دم پائے بندِ کبر می دارد	برو عقلے طلب کن کت زخود بینی بروں آرد
ہماں بہتر کہ ما آن علمِ حق از حق بیا موزیم	کہ ایں علمیکہ ما داریم صد سہو و خطا دارد
کہ گوید بہتراز قولش گر او خاموش بنشیند	کہ گیرد دستت اے ناداں گر او دستِ تو بگذارد
برو قدرش بہ بیں واز حجّتِ بے اصل دم درکش	کہ ایں حجّت کہ می آری بلا ہا برسرت آرد

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۶۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ کہہ خدا نے یہ کلام اتارا ہے پھر ان کو لہو ولعب کے خیالات میں چھوڑ دے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۷۹)

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ اِن کو جواب دے کہ خدا اس کاروبار کا بانی ہے۔ پھر ان کو ان کی لہو و لعب میں چھوڑ دے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۴۵)

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ کہہ نہیں یہ وعدے خدا کی طرف سے ہیں اور پھر ان کو ان کے لہو و لعب میں چھوڑ دے یعنی جو بدگمانی کر رہے ہیں کرتے رہیں۔ آخر دیکھ لیں گے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں یا انسان کی۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۵)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کو محدود القویٰ ہستی سمجھتے ہیں وہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ میں داخل ہیں جو ایک حد تک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ یہ نیچریت کا شعبہ ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل ہے کہ مصنوعی خدا پر موت آوے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا نہیں وہ

مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ کے پورے مصداق ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی ابتلا پیدا ہوتا ہے تو اس کے معالجہ اور اسباب کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وقت دنیا بہت تاریکی میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کو مردہ پرستی نے ہلاک کر ڈالا ہے۔ لیکن اب خدا نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کو اس ہلاکت سے نجات دے اور اس تاریکی سے اس کو روشنی میں لاوے۔ یہ کام بہتوں کی نظر میں عجیب ہے مگر جو یقین رکھتے ہیں کہ خدا قادر ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ خدا جس نے ایک کُن کے کہنے سے سب کچھ کر دیا کیا قادر نہیں کہ اپنے قدیم ارادہ کے موافق ایسے اسباب پیدا کرے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو دنیا تسلیم کر لے۔ (الحکم جلد ۸ ۱۶ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو شناخت نہیں کیا۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔

(الحکم جلد ۹ ۳۵ صفحہ ۱۱ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اگر ہمارے پاس کبھی کچھ ہو تو دوسرے دن سب خرچ ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے جماعت کا ہوتا ہے اور وہ بھی لنگر خانہ میں خرچ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کچھ بھی نہیں رہتا اور ہمیں غم پیدا ہوتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ کہیں سے بھیج دیتا ہے اکثر لوگ خدا تعالیٰ کی پوری پوری قدر نہیں سمجھتے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ[۱]

(الحکم جلد ۱۱ ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

یاد رکھو کہ ہر یک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سنتی ہے۔ ہر یک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرف ہے اور ہر یک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر یک ذرہ کی جڑ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر یک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اس کی قدرتیں ہیں۔ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اُس گروہ میں داخل ہے جو مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ کے مصداق ہیں۔ اور چونکہ انسان کامل مظہر اتم تمام عالم کا ہوتا ہے اس لیے تمام عالم اس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے۔ وہ روحانی عالم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالم اُس کی تاریں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی سِرّ ہے۔

ہر کاروبارِ ہستی اثری ست عارفاں را | زجہاں چہ دید آں کس کہ ندید ایں جہاں را

(برکات الدعا صفحہ ۲۷ حاشیہ)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ

---

[۱] سورۃ الذاریات آیت ۲۳

پ ہ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝

فَكُنْتُ يَوْمًا أَتَذَكَّرُ قِلَّةَ الْبِضَاعِ وَارْتَعِدُ كَاللُّعَاعِ۔ وَأَقْلَقُ فِيْ هٰذِهِ الْاَحْزَانِ۔ وَأَقْرَءُ اٰيَاتِ الْقُرْاٰنِ وَأُفَكِّرُ فِيْهَا بِجُهْدِ الْجَنَانِ۔ وَأُزْجِيْ نِضْوَ التَّدَبُّرِ وَالْاِمْعَانِ وَأَدْعُو اللّٰهَ أَنْ يَّهْدِيَنِيْ طُرُقَ الْعِرْفَانِ۔ وَيُتِمَّ حُجَّتِيْ عَلٰى أَهْلِ الْعُدْوَانِ۔ وَيَتَلَافِيْ مَا سَلَفَ مِنْ جَوْرِ الْمُعْتَدِيْنَ۔ فَبَيْنَمَا أَنَا أُفَتِّشُ كَالْكَمِيْشِ۔ وَقَدْ حَمِيَ وَطِيْسُ التَّفْتِيْشِ۔ وَأَنْظُرُ بَعْضَ الْاٰيَاتِ۔ وَأَتَوَسَّمُ فَحْوَاءَ الْبَيِّنَاتِ۔ إِذَا تَلَأْلَأَتْ أَمَامَ عَيْنِيْ اٰيَةٌ مِّنْ اٰيَاتِ الْفُرْقَانِ۔ وَلَا كَتَلَأْلُؤِ دُرَرِ الْعُمَانِ۔ فَلَمَّا فَكَّرْتُ فِيْ فَحْوَاءِهَا۔ وَاتَّبَعْتُ أَنْوَاعَ ضِيَاءِهَا۔ وَأَجْرَيْتُ حَمِيَّ أَرْجَاءِهَا۔ وَأَفْضَيْتُ إِلٰى فَضَاءِهَا وَجَدْتُهَا خِزَانَةً مِّنْ خَزَائِنِ الْعُلُوْمِ۔ وَدَفِيْنَةً مِّنَ السِّرِّ الْمَكْتُوْمِ۔ فَهَزَّتْ عِطْفِيْ رُؤْيَتُهَا وَتَجَلَّتْ فِيْ كَجَمْرَةٍ قُوَّتُهَا وَأَصْبٰى قَلْبِيْ نُضَارُهَا وَنَضْرَتُهَا۔ وَاغْتَالَتِ الْعِدَا كَرِيْهَتُهَا وَسَرَّتْ مُهْجَتِيْ صَرَّتُهَا فَحَمِدْتُ وَشَكَرْتُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَرَأَيْتُ بِهَا مَا يَمْلَأُ الْعَيْنَ قُرَّةً۔ وَيُعْطِيْ مِنَ الْمَعَارِفِ دَوْلَةً وَّيَسُرُّ قُلُوْبَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ وَعُلِّمْتُ مِنْ سِرِّ اللُّغَاتِ

(ترجمہ) میں ایک دن اپنے کمی سرمایہ کو یاد کر رہا تھا اور نرم اور نوخیز سبزہ کی طرح کانپتا تھا اور انہیں غموں میں بیقرار ہو رہا تھا اور قرآن شریف کی آیتیں پڑھتا تھا اور دلی کوشش سے فکر کر رہا تھا اور تدبّر اور سوچ کی دُبلی اونٹنی کو چلا رہا تھا اور خدا تعالیٰ سے مانگ رہا تھا کہ مجھے معرفت کی راہ دکھا دے اور اہل ظلم پر میری حجت کو پوری کرے اور اس ظلم کا تدارک کرے جو زیادتی کرنے والوں سے صادر ہو چکا ہے۔ پس اُس عرصہ میں جو میں ایک سریع الحرکت انسان کی طرح فکر کر رہا تھا اور تفتیش کا تنور گرم تھا اور میں بعض آیتوں کو دیکھتا اور ان کے بیّنات میں غور کرتا تھا کہ ناگاہ میری آنکھوں کے سامنے ایک آیت قرآن شریف کی چمکی اور وہ ایسی چمک نہ تھی جیسا کہ عمان کے موتیوں کی بلکہ اس سے بڑھ کر تھی پس جبکہ میں نے ان آیتوں کے مضمون میں غور کیا اور روشنی کی پیروی کی اور اُن کے میدان تک پہنچا تو میں نے ان آیتوں کو مخزن علوم پایا اور چھپے ہوئے بھیدوں کا دفینہ دیکھا۔ سو اس کے دیکھنے نے میرے بازو کو ہلا دیا اور اس کی قوت میرے پر ہزار سوار کی طرح ظاہر ہوئی اور اس کی سبزی اور تازگی نے میرے دل کو کھینچ لیا اور اس کی لڑائی نے یک دفعہ دشمنوں کو ہلاک کر دیا اور اس کی جماعت نے میرے دل کو خوش کیا سو میں نے الحمد للہ کہا اور اللہ تعالیٰ کا شکر کیا اور میں نے ان آیات میں وہ عجائبات دیکھے جو آنکھوں کو خنکی سے بھر دیتے ہیں اور معارف کی دولت بخشتے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں کو خوش کر دیتے

وَمَثْوَاهَا۔ وَزُوِّدْتُ مِنْ فَصِّ الْكَلِمٰتِ وَنَحْوِهَا وَكَذٰلِكَ اُعْطِيْتُ مِنْ اَسْرَارٍ عُلْيَا وَنِكَاتٍ عُظْمٰى۔ لِيَزِيْدَ يَقِيْنِيْ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔ وَلِيَقْطَعَ دَابِرَ الْمُعْتَدِيْنَ۔ وَاِنْ كُنْتَ تُحِبُّ اَنْ تَعْرِفَ الْاٰيَةَ وَصَوْلَهَا۔ فَاقْرَءْ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ وَاِنَّ فِيْهَا مَدْحَ الْقُرْاٰنِ وَعَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ فَتَدَبَّرْهَا كَالْعَاقِلِيْنَ۔ وَلَا تَمُرَّ بِهَا مُرُوْرَ الْغَافِلِيْنَ۔ وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ تُعَظِّمُ الْقُرْاٰنَ وَالْعَرَبِيَّةَ وَمَكَّةَ۔ وَفِيْهَا نُوْرٌ مَّزَّقَ الْاَعْدَآءَ وَبَكَّتَ فَاقْرَءْهَا بِتَمَامِهَا وَانْظُرْ اِلٰى نِظَامِهَا وَفَتِّشْ كَالْمُسْتَبْصِرِيْنَ۔ وَاِنِّيْ تَدَبَّرْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَسْرَارًا۔ ثُمَّ اَمْعَنْتُ فَرَئَيْتُ اَنْوَارًا۔ ثُمَّ عَمَّقْتُ فَشَاهَدْتُ مُنَزِّلًا قَهَّارًا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَكُشِفَ عَلَيَّ اَنَّ الْاٰيَةَ الْمَوْصُوْفَةَ وَالْاِشَارَاتِ الْمَلْفُوْفَةَ تَهْدِيْ اِلٰى فَضَائِلِ الْعَرَبِيَّةِ۔ وَتُشِيْرُ اِلٰى اَنَّهَا اُمُّ الْاَلْسِنَةِ۔ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ اُمُّ الْكُتُبِ السَّابِقَةِ۔ وَاَنَّ مَكَّةَ اُمُّ الْاَرْضِيْنَ۔ فَاقْتَادَنِيْ بُرُوْقُ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِلٰى اَنْوَاعِ التَّنَطُّسِ وَالدِّرَايَةِ وَفَهِمْتُ سِرَّ نُزُوْلِ الْقُرْاٰنِ فِيْ هٰذَا اللِّسَانِ وَسِرَّ خَتْمِ النُّبُوَّةِ۔ عَلٰى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَخَتْمِ

ہیں اور مجھ کو لغتوں کا سرّ اور ان کی اصل جگہ بتلائی گئی۔ اور کلمات کے پیوند اور اُن کے راز سے میں توشہ دیا گیا اور اسی طرح بلند بھید مجھ کو عطا کیے گئے اور بڑے بڑے نکتے مجھ کو دیئے گئے تا خداتعالیٰ میرا یقین زیادہ کرے اور تا تجاوز کرنے والوں کا پیچھا کاٹ ڈالے اور اگر تو چاہتا ہے کہ آیۃ موصوفہ اور اس کے حملہ سے نجات ہو تو قرآن کے اس مقام کو پڑھ جہاں یہ لکھا ہے لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا جس کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے قرآن کو عربی زبان میں بھیجا تا تو اس شہر کو ڈراوے جو تمام آبادیوں کی ماں ہے اور ان آبادیوں کو جو اُس کے گرد ہیں یعنی تمام دنیا کو اور اس میں قرآن کی مدح اور عربی کی مدح ہے پس عقلمندوں کی طرح تدبر کر۔ اور غافلوں کی طرح اُن پر سے مت گذر اور جان کہ یہ آیت قرآن اور عربی اور مکّہ کی عظمت ظاہر کرتی ہے اور اس میں ایک نور ہے جس نے دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور لاجواب کر دیا۔ پس تمام آیۃ کو پڑھ اور اس کے نظام کی طرف دیکھ اور دانشمندوں کی طرح تحقیق کر اور میں نے ان آیتوں میں تدبّر کیا پس کئی بھید ان میں پائے۔ پھر ایک گہری غور کی تو کئی نور ان میں پائے پھر ایک بہت ہی عمیق نظر سے دیکھا تو اتارنے والے قہار کا مجھے مشاہدہ ہوا جو ربّ العالمین ہے اور میرے پر کھولا گیا کہ آیۃ موصوفہ اور اشارات ملفوفہ عربی کے فضائل کی طرف ہدایت کرتی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ امّ الالسنہ ہے اور قرآن پہلی کتابوں کا امّ یعنی اصل ہے اور مکّہ تمام زمین کا امّ ہے۔ سو مجھے اس آیت کی روشنی نے طرح طرح کے فہم اور درایت کی طرف کھینچا اور مجھے یہ بھید سمجھ آ گیا کہ قرآن کیوں عربی زبان میں نازل ہوا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نبوت ختم ہوئی اس میں بھید کیا ہے۔ پھر میرے پر اور آیتیں ظاہر ہوئیں اور بعض نے

الْمُرْسَلِيْنَ ۔ ثُمَّ ظَهَرَتْ عَلَيَّ اٰيَاتٌ اُخْرٰى وَاَيَّدَ بَعْضُهَا بَعْضًا تَـتْرًا حَتّٰى جَرَّنِيْ رَبِّيْ اِلٰى حَقِّ الْيَقِيْنِ ۔ وَاَدْخَلَنِيْ فِي الْمُسْتَيْقِنِيْنَ ۔ وَظَهَرَ عَلَيَّ اَنَّ الْقُرْاٰنَ هُوَ اُمُّ الْكُتُبِ الْاُوْلٰى ۔ وَالْعَرَبِيَّةَ اُمُّ الْاَلْسِنَةِ مِنَ اللّٰهِ الْاَعْلٰى ۔ وَاَمَّا الْبَاقِيَةُ مِنَ اللُّغَاتِ فَهِيَ لَهَا كَالْبَنِيْنَ اَوِ الْبَنَاتِ وَلَا شَكَّ اَنَّهَا كَمِثْلِ وِلْدَانِهَا اَوْ وَلَائِدِهَا وَكُلٌّ يَأْكُلُ مِنْ اَعْشَارِهَا وَمَوَائِدِهَا ۔ وَكُلٌّ يَجْتَنُوْنَ فَاكِهَةَ هٰذِهِ اللَّهْجَةِ وَيَمْلَأُوْنَ الْبُطُوْنَ بِتِلْكَ الْمَائِدَةِ وَيَشْرَبُوْنَ مِنْ تِلْكَ اللُّجَّةِ وَيَتَّخِذُوْنَ لِبَاسًا مِّنْ هٰذِهِ الْحُلَّةِ ۔ فَهِيَ مُرَبِّيَةٌ اَعَارَهَا الدَّسْتَ ۔ وَاخْتَارَ لِنَفْسِهَا الدَّسْتَ ۔ وَاَمَّا اخْتِلَافُ الْاَلْسِنَةِ فِيْ صُوَرِ التَّرَاكِيْبِ فَلَيْسَ مِنَ الْعَجِيْبِ وَكَذٰلِكَ الْاِخْتِلَافُ فِي التَّصْرِيْفِ وَاِطِّرَادِ الْمَوَادِّ لَيْسَ مِنْ دَلَائِلِ عَدَمِ الْاِتِّحَادِ وَلَوْلَا اخْتِلَافٌ بِهٰذَا الْقَدْرِ فِي التَّرْكِيْبَاتِ ۔ لَامْتَنَعَ تَغَايُرٌ تُوْجِبُ كَثْرَةَ اللُّغَاتِ ۔ فَاِنَّ وُجُوْدَ التَّرَاكِيْبِ الْمُخْتَلِفَةِ هُوَ الَّذِيْ غَيَّرَ صُوَرَ الْاَلْسِنَةِ ۔ وَهُوَ السَّبَبُ الْاَوَّلُ لِلتَّفْرِقَةِ ۔ فَلَا يَسُوْغُ لِمُعْتَرِضٍ اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِمِثْلِ هٰذِهِ الْكَلِمَاتِ ۔ وَاَيْنَ مُنْتَدَحَةُ هٰذِهِ الْاِعْتِرَاضَاتِ فَاِنَّهَا مُصَادَرَةٌ مِّنَ الْمَمْنُوْعَاتِ ۔ وَكَفَاكَ اَنَّ الْاَلْسِنَةَ كُلَّهَا مُشْتَرِكَةٌ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْمُفْرَدَاتِ ۔ وَمَا اَوْغَلْتُ بَلْ سَايَرْتُكَ كَاَجْلٰى

بعض کی متواتر مدد کی یہاں تک کہ میرے خدا نے حق الیقین تک مجھے کھینچ لیا اور یقین کرنے والوں میں مجھے داخل کیا۔ اور میرے پر ظاہر ہو گیا کہ قرآن ہی پہلی تمام کتابوں کی ماں ہے اور ایسا ہی عربی تمام زبانوں کی ماں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور باقی زبانیں اس کی بیٹے بیٹیوں کی طرح ہیں اور کچھ شک نہیں کہ وہ تمام زبانیں اس کے فرزند یا خانہ زاد کنیزکوں کی طرح ہیں اور ہر یک اسی کی دیگوں اور اسی کے خوان میں سے کھا رہا ہے اور ہر یک اسی کے پھل چکھ رہا ہے اور اسی خوان سے اپنے پیٹ بھر رہے ہیں اور اسی دریا سے پانی پی رہے ہیں اور اسی حُلّہ سے اُنہوں نے اپنا لباس بنایا ہے اور وہ اُن کی مربّی ہے جس نے بعاریت ان کو لباس دیا اور اپنی ذات کے لیے مسند اختیار کیا اور یہ بات کہ اگر عربی ام الالسنہ ہی ہے تو زبانوں کی ترکیبوں میں کیوں اختلاف ہے تو یہ کچھ عجیب بات نہیں اور اسی طرح جو اختلاف تصریف اور اطراد مواد میں ہے وہ بھی عدم اتحاد کی دلیل نہیں ٹھہر سکتا اور اگر یہ تھوڑا سا اختلاف بھی جو ترکیبات کا اختلاف ہے لغات میں باقی نہ رہے تو وہ تغایر درمیان سے اُٹھ جائے گا جو کثرت لغات کا موجب ہے کیونکہ مختلف ترکیبوں کا زبانوں میں پایا جانا ہی تو وہ امر ہے جس نے زبانوں کی صورت کو متغایر کر رکھا ہے اور وہی تو زبانوں کے تفرقہ کا پہلا سبب ہے پس کسی معترض کے لیے جائز نہیں جو ایسے کلمے منہ پر لاوے اور ایسے اعتراضات کی گنجائش کہاں ہے کیونکہ یہ مصادرہ علی المطلوب ہے جو مناظرات میں ممنوع ہے

اَلْبَدِیْھِیَّاتِ۔ فَاسْتَقِمْ کَمَا سَمِعْتَ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُخْطِیْنَ۔ وَ اِنِّیْ لَمَّا وَجَدْتُّ الدَّلَائِلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَ اطْمَئَنَّ قَلْبِیْ بِکِتَابِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ اَرَدْتُّ اَنْ اَطْلُبَ الشَّھَادَۃَ مِنَ الْاٰثَارِ۔ فَاِذَا فِیْھَا کَثِیْرٌ مِّنَ الْاَسْرَارِ۔ فَفَرِحْتُ بِھَا فَرْحَۃَ النَّشْوَانِ بِالطِّلَآءِ وَ وَجَدْتُّ وَجْدَ الثَّمِلِ بِالصَّھْبَآءِ وَ شَکَرْتُ اللّٰہَ نَصِیْرَ الصَّادِقِیْنَ۔ (منن الرحمان صفحہ ۳۳-۴۲)

وَ اِنَّ اللّٰہَ اَوْمٰی فِیْ مَقَامَاتٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِلٰی اَنَّ الْعَرَبِیَّۃَ ھِیَ اُمُّ الْاَلْسِنَۃِ وَ وَحْیُ الرَّحْمٰنِ۔ وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ سُمِّیَ مَکَّۃُ مَکَّۃَ وَ اُمَّ الْقُرٰی۔ فَاِنَّ النَّاسَ اُرْضِعُوْا مِنْھَا لِبَانَ اللِّسَانِ وَ الْھُدٰی۔ فَھٰذِہٖ اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّھَا ھِیَ مَنْبَعُ النُّطْقِ وَ النُّھٰی۔ فَفَکِّرْ فِیْ قَوْلِ رَبِّ الْوَرٰی۔ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی[1]۔ وَ فِیْ ذٰلِکَ اٰیَۃٌ لِّلَّذِیْ یَتَّقِی اللّٰہَ وَ یَخْشٰی۔ وَیَطْلُبُ الْحَقَّ وَلَا یَاْبٰی۔ وَلَا یَتَّبِعُ سُبُلَ الْمُعْرِضِیْنَ۔ ثُمَّ اَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ رَسُوْلَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ کَانَ نَذِیْرًا لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ وَکَذٰلِکَ سَمَّاہُ رَبُّہٗ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ۔ فَثَبَتَ اَنَّ مَکَّۃَ اُمُّ الدُّنْیَا کُلِّھَا وَ مَوْلِدُ کُثْرِھَا وَقُلِّھَا وَ مَبْدَءُ اَصْلِ اللُّغَاتِ وَ مَرْکَزُ الْکَائِنَاتِ اَجْمَعِیْنَ۔ وَ ثَبَتَ مَعَہٗ

اور مجھے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ تمام زبانیں بہت سے مفردات میں شریک ہیں اور میں نے یہ مبالغہ سے نہیں کہا۔ بلکہ میں عنقریب تجھے بدیہیات کی طرح دکھلاؤں گا۔ پس تو قائم اور ثابت قدم ہو جا جیسا کہ تو نے سن لیا اور خطاکاروں میں سے مت ہو اور میں نے جب قرآن کریم سے دلائل پائے اور کتاب اللہ کی گواہی سے میرا دل مطمئن ہو گیا تو میں نے ارادہ کیا کہ احادیث سے بھی کچھ دلائل لوں پس جبکہ میں نے حدیث کو دیکھا تو اس میں بہت بھید پائے پس میں ایسا خوش ہوا جیسا کہ نشاء پینے والا شراب سے خوش ہوتا ہے اور جیسا کہ مست کو شراب سے خوشی پہنچتی ہے اور خدا تعالیٰ کا میں نے شکر کیا جو سچوں کا حامی ہے۔ (منن الرحمان صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

(ترجمہ) خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے کئی مقامات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زبانوں کی ماں اور خدا کی وحی صرف عربی ہے اور اسی واسطے اُس نے مکّہ کا نام مکّہ اور ام القریٰ رکھا کیونکہ لوگوں نے اس سے ہدایت اور زبان کا دودھ پیا پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عربی زبان ہی نطق اور عقل کا منبع ہے پس خدا تعالیٰ کے اس قول میں فکر کر کہ یہ قرآن عربی ہے تا تو مکّہ کو جو تمام آبادیوں کی ماں ہے ڈراوے اور اس میں اس شخص کے لیے نشان ہے جو خدا سے ڈرے اور حق کو ڈھونڈے اور انکار نہ کرے اور کنارہ کش لوگوں کا پیرو نہ ہو۔ پھر تو جانتا ہے کہ ہمارا رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے نذیر ہے۔ اور یہی خدا تعالیٰ نے اُس کا نام رکھا ہے اور وہ اصدق الصادقین خدا ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ مکّہ تمام دنیا کی ماں ہے اور تمام قلیل و کثیر کا مولد ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عربی تمام زبانوں کی ماں ہے کیونکہ مکّہ تمام مکانوں کی ماں ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ

[1] الشوریٰ آیت ۸

اَنَّ الْعَرَبِيَّةَ اُمُّ الْاَلْسِنَةِ بِمَا كَانَتْ مَكَّةُ اُمَّ الْاَمْكِنَةِ مِنْ بَدْءِ الْفِطْرَةِ وَثَبَتَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ اُمُّ الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ۔ وَلِذٰلِكَ نَزَلَ فِي اللُّغَةِ الْكَامِلَةِ الْمُحِيْطَةِ۔ وَاقْتَضَتْ حِكَمُ اِرَادَاتِ الْاِلٰهِيَّةِ۔ اَنْ يَّنْزِلَ كِتَابُهُ الْكَامِلُ الْخَاتَمُ فِي اللَّهْجَةِ الَّتِيْ هِيَ اَصْلُ الْاَلْسِنَةِ وَاُمُّ كُلِّ لُغَةٍ مِّنْ لُغَاتِ الْبَرِيَّةِ وَهِيَ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ۔ (منن الرحمان ص ۶۳-۶۴)

وَاِنْ كُنْتَ تَقْتَرِحُ اَنْ تَسْمَعَ مِنِّيْ فِي اشْتِرَاكِ الْاَلْسِنَةِ فَكَفَاكَ لَفْظُ الْاُمِّ وَالْاُمَّةِ فَاِنَّ هٰذَا اللَّفْظَ تَشَارَكَ فِيْهِ اللِّسَانُ الْهِنْدِيَّةُ وَالْعَرَبِيَّةُ وَكَذٰلِكَ اللِّسَانُ الْفَارِسِيَّةُ وَالْاِنْكِلِيْزِيَّةُ۔ بَلْ كُلُّهَا كَمَا تَشْهَدُ التَّجْرِبَةُ الصَّحِيْحَةُ فَانْظُرْ كَالْمُنْتَقِدِيْنَ وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ وَجْهِ التَّسْمِيَةِ اَنَّ هٰذَا اللَّفْظَ دَخَلَ فِي الْاَلْسُنِ الْاَعْجَمِيَّةِ مِنَ الْعَرَبِيَّةِ۔ فَاِنَّ التَّسْمِيَةَ الْحَقِيْقِيَّةَ لَا تُوْجَدُ اِلَّا فِيْ هٰذَا اللِّسَانِ۔ وَاَمَّا غَيْرُهُ فَلَا يَخْلُوْ مِنَ التَّصَنُّعِ فِي الْبَيَانِ فَاِنَّ مِنْ شَاْنِ التَّسْمِيَةِ الْحَقِيْقِيَّةِ الَّتِيْ هِيَ مِنْ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ اَنْ لَّا تَنْفَكَّ بِزَمَنٍ مِّنَ الْاَزْمِنَةِ الثَّلَاثَةِ وَتَكُوْنَ لِلْمُسَمّٰى كَالْعَرَضِ اللَّازِمِ وَاَنْ تُجَايِئُوْهُ فِيْ هٰذِهِ النَّشْاَةِ وَلَا يَفْرِضُ فَرْضُ فَارِضٍ كَوْنَهَا فِيْ وَقْتٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ الْمُنْفَكَّةِ وَلَا تَكُوْنُ كَالْاُمُوْرِ الْمُسْتَحْدَثَةِ الْمَصْنُوْعَةِ وَلَا تُوْجَدُ فِيْهَا رِيْحُ التَّصَنُّعَاتِ الْاِنْسِيَّةِ وَيُقِرُّ مَنِ اسْتَشَفَّ جَوْهَرَهَا بِاَنَّهَا مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ (منن الرحمان ص ۱۰۳-۱۰۴)

قرآن تمام الٰہی کتابوں کی ماں ہے اور اسی لیے کامل زبان میں اترا ہے جو محیط کل ہے اور الٰہی ارادوں کی حکمتوں نے تقاضا کیا کہ اس کی کامل کتاب جو خاتم الکتب ہے اس زبان میں نازل ہو جو جڑ زبانوں کی ہے اور تمام مخلوقات کی زبانوں کی ماں ہے اور وہ عربی ہے۔ (منن الرحمان ص ۶۳-۶۴)

اگر اشتراک السنہ کی مثال پوچھنا چاہو تو لفظ امّ اور اُمّتہ کافی ہے یہ لفظ ہندی عربی فارسی انگریزی بلکہ سب زبانوں میں مشترک ہے اور تجربہ اس پر گواہ ہے اور وجہ تسمیہ تباتی ہے کہ یہ لفظ عربی زبان سے عجمی بولیوں میں گیا۔ کیونکہ حقیقی وجہ تسمیہ اُسی زبان میں ہے اور اوروں میں بناوٹ اور تکلّف ہے کیونکہ حقیقی وجہ تسمیہ کی شان یہ ہے کہ کسی زمانہ میں بھی وہ مسمّٰی سے الگ نہ ہو اور کبھی بھی کوئی اُس سے اس کو الگ نہ کر سکے اور انسانی تصنّع کی بُو بھی اس میں نہ پائی جائے اور دیکھنے سننے والا اس کی نسبت پکار اُٹھے کہ لاریب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (منن الرحمان ص ۱۰۳-۱۰۴)

ل نقل مطابق اصل۔ یہ لفظ غالباً منتقدین ہے۔ واللہ اعلم۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے ناحق اپنے دل سے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں اور نہیں جانتے کہ ابن مریم ایک عاجز انسان تھا۔ اگر خدا چاہے تو عیسٰی ابن مریم کی مانند کوئی اور آدمی پیدا کر دے یا اس سے بھی بہتر جیسا کہ اس نے کیا۔ (دافع البلاء ومعیار اہل الاصطفاء صفحہ ۲)

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ خدا تعالیٰ ان عیبوں سے پاک و برتر ہے جو وہ لوگ اس کی ذات پر لگاتے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۹ حاشیہ در حاشیہ ۳)

اور مُشرک لوگ ایسے نادان ہیں کہ جنّات کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور اُس کے لیے بغیر کسی علم اور اطلاع حقیقتِ حال کے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۷-۴۳۸ حاشیہ در حاشیہ ۳)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

لفظ کُل کے ساتھ جو احاطہ تامّہ کے لیے آتا ہے۔ ہر ایک چیز کو جو اس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۷)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○

آنکھیں اس کی کنہ دریافت کرنے سے عاجز ہیں اور اسکو آنکھوں کی کنہ معلوم ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ ۳)

بصارتیں اور بصیرتیں اُس کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتیں اور اُس کو ہر یک نظر اور فکر کی حدود معلوم ہیں۔ (شحنہ حق صفحہ ۵۴)

یعنی خدا کو آنکھیں نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پاسکتا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی کنہ کو ئی عقل دریافت نہیں کر سکتی۔ (ست بچن صفحہ ۸۸)

خدا تعالیٰ کی ذات تو مخفی در مخفی اور غیب در غیب اور وراء الوراء ہے اور کوئی عقل اُس کو دریافت نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ[1] یعنی بصارتیں اور بصیرتیں اُس کو پا نہیں سکتیں اور وہ اُن کے انتہا کو جانتا ہے اور اُن پر غالب ہے۔ پس اُس کی توحید محض عقل کے ذریعہ سے غیر ممکن ہے کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ انسان آفاقی باطل معبودوں سے کنارہ کرتا ہے یعنی بُتوں یا انسانوں یا سورج چاند وغیرہ کی پرستش سے دستکش ہوتا ہے ایسا ہی انفسی باطل معبودوں سے پرہیز کرے یعنی اپنی رُوحانی جسمانی طاقتوں پر بھروسہ کرنے سے اور ان کے ذریعہ سے عُجب کی بلا میں گرفتار ہونے سے اپنے تئیں بچاوے پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ بجز ترک خودی اور رسول کا دامن پکڑنے کے توحید کامل حاصل نہیں ہو سکتی اور جو شخص اپنی کسی قوت کو شریک باری ٹھہراتا ہے وہ کیونکر موحّد کہلا سکتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

آنکھیں اس کے انتہا کو نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کے انتہا تک پہنچتا ہے (چشمہ معرفت صفحہ ۸۹)

عقلیں اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتیں اور وہ تمام عقلوں پر محیط ہے (چشمہ معرفت خلاصہ مضمون صفحہ ۲۶۱)

آنکھیں تو اُس کو دیکھ نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے۔ جب وجودی ہو گیا تو پھر باقی کیا رہ گیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ اس جگہ بظاہر انکارِ دیدار ہے اور اس کے مخالف یہ آیت ہے اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ[1] اس سے دیدار ثابت ہوتا ہے۔ سو مسیح اور یحییٰ کے کلمات میں اسی قسم کا تناقض ہے جو دراصل تناقض نہیں ایک نے مجاز کو ذہن میں رکھا اور دوسرے نے حقیقت کو اس لیے کچھ تناقض نہ ہوا۔ (ضمیمہ تریاق القلوب حاشیہ صفحہ ۱۴۸)

خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے اور استعارات کو ظاہر پر حمل کر کے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے اس کی صفت ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۵ صفحہ ۳۸ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء)

---

[1] القیامۃ آیت ۲۴

خدا کی کنہ میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اسلم طریق یہی ہے کہ انسان لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ پر ایمان رکھے کہ میرا منصب نہیں کہ خدا کی کل صفات کو میں دیکھ لوں اور ان کی تحقیقات کروں۔ طبیب بیان کرتے ہیں کہ پانی سرد اور آگ گرم ہے مگر یہ نہیں بتلا سکتے کہ پانی سرد کیوں ہے اور آگ گرم کیوں ہے۔ فلاسفر بھی یہاں کنہ اشیا میں آ کر عاجز رہ گئے ہیں یہاں اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ پہ چلے کہ ہم خدا پر چھوڑ دیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

حقیقت میں محبت کے ثمرات میں سے نفی وجود ضروری ہے۔ اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا بلکہ قرآن شریف سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جو فنا فی اللہ کہلاتا ہے لیکن وجودیوں کا یہ حال نہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ گویا انہوں نے ڈاکٹروں کی طرح تشریح کر کے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا ہے۔ تب ہی تو یہ خود بھی خدا بنتے ہیں حالانکہ یہ صریح غلط اور بے ہودہ امر ہے۔ اللہ تعالیٰ تو صاف فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

بجز اس طریق کے کہ خدا خود ہی تجلی کرے اور کوئی دوسرا طریق نہیں ہے جس سے اس کی ذات پر یقین کامل حاصل ہو۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابصار پر وہ آپ ہی روشنی ڈالے تو ڈالے۔ ابصار کی مجال نہیں ہے کہ خود اپنی قوت سے اسے شناخت کر لیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۳)

۱۰۵ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝

خدا نے میری رسالت پر روشن نشان تمہیں دئے ہیں۔ سو جو اُن کو شناخت کرے اُس نے اپنے ہی نفس کو فائدہ پہنچایا اور جو اندھا ہو جائے اُس کا وبال بھی اُسی پر ہے۔ مَیں تو تم پر نگہبان نہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸)

۱۰۹ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس قدر ہمیں طریق ادب اور اخلاق کا سبق سکھلایا ہے کہ وہ فرماتا ہے۔ کہ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (سورۃ الانعام الجزو ۷) یعنی تم مشرکوں کے بتوں کو بھی گالی مت دو۔ کہ وہ پھر تمہارے خدا کو گالیاں دیں گے کیونکہ وہ اس خدا کو جانتے نہیں۔ اب دیکھو کہ باوجودیکہ خدا کی تعلیم کی رُو سے بُت کچھ چیز نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی خدا مسلمانوں کو یہ اخلاق سکھلاتا ہے کہ بتوں کی بدگوئی سے بھی اپنی زبان بند رکھو اور صرف نرمی سے سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مشتعل ہو کر خدا کو گالیاں نکالیں اور ان گالیوں کے تم باعث ٹھہر جاؤ۔ (پیغام صلح صـ۳۲)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَئِنْ جَآءَتْھُمْ اٰیَۃٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِھَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا یُشْعِرُکُمْ اَنَّھَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○

یہ لوگ سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشان دیکھیں تو ضرور ایمان لے آئیں گے ان کو کہہ دے کہ نشان تو خدا تعالیٰ کے پاس ہیں اور تمہیں خبر نہیں کہ جب نشان بھی دیکھیں گے تو کبھی ایمان نہیں لائیں گے (آئینہ کمالات اسلام صـ۳۲۳)

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ یعنی ان کو کہہ دو کہ نشان اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جس نشان کو چاہتا ہے اُسی نشان کو ظاہر کرتا ہے۔ بندہ کا اس پر زور نہیں ہے کہ جبر کے ساتھ اُس سے ایک نشان لیوے۔ (جنگ مقدس صـ۶۱ پرچہ ۲۶ر مئی ۱۸۹۳ء)

اقتراح کے نشانوں کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے نبی کبھی جرأت کر کے یہ نہیں کہے گا کہ تم جو نشان مجھ سے مانگو میں وہی دکھانے کو طیار ہوں اس کے منہ سے جب نکلے گا یہی نکلے گا اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ اور یہی اس کی صداقت کا نشان ہوتا ہے۔ کم نصیب مخالف اس قسم کی آیتوں سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ معجزات سے انکار کیا گیا ہے۔ مگر وہ آنکھوں کے اندھے ہیں۔ اُن کو معجزات کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی اس لیے وہ ایسے اعتراض کرتے ہیں اور نہ ذات باری کی عزت اور جبروت کا ادب اُن کے دل پر ہوتا ہے ہمارا خدا تعالیٰ پر کیا حق ہے کہ ہم جو کہیں وہ وہی کر دے۔ یہ سوء ادب ہے اور ایسا خدا خدا ہی نہیں ہو سکتا..... پس اقتراحی نشانات سے اس لیے منع کیا جاتا ہے اور رد کیا جاتا ہے کہ اس میں پہلی رگ سوء ادبی کی پیدا ہو جاتی ہے جو ایمان کی جڑ کاٹ ڈالتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ صـ۱۲ مورخہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۳ء صـ۳)

مجھ سے یہ درخواست کہ فعل ظاہر ہو عبث ہے۔ مَیں تو ایک عاجز بندہ ہوں۔ یہ خدا کا کام ہے کہ جو فعل وہ چاہے ظاہر کر دے۔ مَیں کیا ہوں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا کہ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ[1] انبیاؤں کا کام بازیگروں کی طرح چھٹے بٹے دکھانا نہیں ہوتا وہ تو خدا کے پیغام رساں ہوتے ہیں۔ علمی بحث الگ ہے اور الہامی بحث الگ ہے۔ مختصر فیصلہ یہی ہے کہ اگر قول میں تعارض ہے تو فعل خود فیصلہ کر دے گا۔ (البدر جلد ۴ ۶ مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۱۱۱ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

نشانوں کے دکھلانے کا ذکر قرآن شریف میں جا بجا آیا ہے۔ بعض جگہ اپنے پہلے نشانوں کا حوالہ بھی دیا ہے دیکھو آیت كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۹)

۱۱۵ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے وہی کچھ حدیث میں۔ ہاں بعض باتوں کا استنباط ایسا اعلیٰ حدیثوں نے کیا ہے کہ دوسرے گو اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ ورنہ حدیث قرآن سے باہر نہیں۔ خدا نے قرآن کا نام رکھا ہے مُفَصَّلًا اس پر ایمان ہونا چاہیئے۔ بعض تفاسیر سوائے انبیاء کے اَور کی سمجھ میں نہیں آتیں پھر اس طرح حدیث میں قرآن سے زائد کچھ نہیں۔ (الحکم جلد ۷ ۱۵ مورخہ ۲۴ را پریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

کیا بجز خدا کے مَیں کوئی اور حَکَم طلب کروں اور وہ وُہی ہے جس نے مفصّل کتاب تم پر اُتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جن کو ہم نے علم قرآن سمجھایا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ ہے سوائے پڑھنے والے تو شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

---

[1] الاعراف آیت ۱۸۹۔

اب اِن آیات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اس آیت کے جو فَلَاتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ہے۔ ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان اور علم سے کم حصّہ رکھتے ہیں بلکہ اوپر کی آیتوں سے یہ بھی کھلتا ہے کہ اس جگہ یہ حکم فَلَاتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شروع کی آیت میں جس سے یہ آیت تعلق رکھتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا سو ان تمام آیات کا بامحاورہ ترجمہ یہ ہے کہ میں بجز خدائے تعالیٰ کے کوئی اور حَکَم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا وہ وہی ہے جس نے تم پر مفصّل کتاب نازل کی۔ سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے وہ اس کا منجانب اللہ ہونا خوب جانتے ہیں سو تو (اے بیخبر آدمی) شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب تحقیق سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شک نہیں کرتے بلکہ شک کرنے والوں کو بحوالہ شواہد و دلائل منع فرماتے ہیں۔ پس باوجود ایسے کھلے کھلے بیان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شک فی الرسالت کو منسوب کرنا بیخبری و بے علمی یا محض تعصّب نہیں تو کیا ہے۔

پھر اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر شک کرنے سے بعض ایسے نومسلم یا متردّد منع کیے گئے تھے جو ضعیف الایمان تھے تو اُن کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ تم شک مت کرو نہ یہ کہ تو شک مت کر کیونکہ ضعیف الایمان آدمی صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہوتے ہیں بجائے جمع کے واحد مخاطب کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے وحدت جنسی مراد ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے اگر تم اول سے آخر تک قرآن شریف کو پڑھو تو یہ عام محاورہ اُس میں پاؤ گے کہ وہ اکثر مقامات میں جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کرتا ہے...... تمام قرآن شریف میں ایک نقطہ یا ایک شعشہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں پاؤ گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت یا قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت کچھ شک تھا بلکہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ جس قدر یقین کامل و بصیرت کامل و معرفت اکمل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکات کی نسبت دعویٰ کیا ہے اور پھر اُس کا ثبوت دیا ہے ایسا کامل ثبوت کسی دوسری موجودہ کتاب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اس کے جوابات صفحہ ۳۲ و ۶۰۵)

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○

قرآن کریم کی محکمات اور بیّنات علم ہے اور مخالف قرآن کے جو کچھ ہے وہ ظن ہے اور جو شخص علم ہوتے ظن کا اتباع کرے وہ اس آیت کے نیچے داخل ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۹۲)

(۱۲۰) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝

اس سوال کے جواب میں کہ کیا کسی غریب سیّد کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے فرمایا:۔

اصل میں منع ہے۔ اگر اضطراری حالت ہو۔ فاقہ پر فاقہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں جائز ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ حدیث سے فتویٰ تو یہ ہے کہ نہ دینی چاہئیے اگر سیّد کو اور قسم کا رزق آتا ہو تو اُسے زکوٰۃ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہاں اگر اضطراری حالت ہو تو اور بات ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

(۱۲۳) اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

کیا وہ شخص جو مُردہ تھا اور ہم نے اُس کو زندہ کیا اور ہم نے اس کو ایک نور عطا کیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے یعنی اُس نُور کی برکات لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں کیا ایسا آدمی اُس آدمی کی مانند ہو سکتا ہے جو سراسر تاریکی میں اسیر ہے اور اُس سے نکل نہیں سکتا۔ نور اور حیات سے مراد روح القدس ہے کیونکہ اُس سے ظلمت دُور ہوتی ہے اور وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ اِسی لیے اُس کا نام روح القدس ہے یعنی پاکی کی روح جس کے داخل ہونے سے ایک پاک زندگی حاصل ہوتی ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۹۹)

(۱۲۵) وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ

مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝

جس وقت قرآن کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے کوئی نشانی کفار کو دکھلائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ جب تک خود ہم پر ہی کتاب الٰہی نازل نہ ہو تب تک ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کس جگہ اور کس محل پر رسالت کو رکھنا چاہیئے یعنی قابل اور ناقابل اُسے معلوم ہے اور اُسی پر فیضان الہام کرتا ہے کہ جو جوہر قابل ہے۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ حکیم مطلق نے افرادِ بشریّہ کو بوجہ مصالحۂ مختلفہ مختلف طوروں پر پیدا کیا ہے اور تمام بنی آدم کا سلسلۂ فطرت ایک ایسے خط سے مشابہ رکھا ہے جس کی ایک طرف نہایت ارتفاع پر واقعہ ہو اور دوسری طرف نہایت انخفاض پر۔ طرف ارتفاع میں وہ نفوسِ صافیہ ہیں جن کی استعدادیں حسب مراتب متفاوتہ کامل درجہ پر ہیں اور طرفِ انخفاض میں وہ نفوس ہیں جن کو اِس سلسلہ میں ایسی پست جگہ ملی ہے کہ حیوانات لایعقل کے قریب قریب پُہنچ گئے ہیں اور درمیان میں وہ نفوس ہیں جو عقل وغیرہ میں درمیان کے درجہ میں ہیں اور اِس کے اثبات کے لیے مشاہدۂ افرادِ مختلفہ الاستعداد کافی دلیل ہے کیونکہ کوئی عاقل اِس سے انکار نہیں کرسکتا کہ افرادِ بشریّہ عقل کی رُو سے تقوٰی اور خداترسی کے لحاظ سے محبّتِ الٰہیّہ کی وجہ سے مختلف مدارج پر پڑی ہوئی ہیں اور جس طرح قُدرتی واقعات سے کوئی خوبصورت پیدا ہوتا ہے کوئی بدصورت۔ کوئی سوجاکھا۔ کوئی اندھا۔ کوئی ضعیف البصر کوئی قوی البصر کوئی تام الخلقت کوئی ناقص الخلقت اسی طرح قُوائی دماغیہ اور انوارِ قلبیہ کا تفاوتِ مراتب بھی مشہود اور محسوس ہے ہاں یہ سچ بات ہے کہ ہر یک فردِ بشر بشرطیکہ نرا مخبط الحواس اور مسلوب العقل نہ ہو عقل میں تقوٰی میں۔ محبتِ الٰہیّہ میں ترقی کرسکتا ہے مگر اِس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی نفس اپنے دائرۂ قابلیت سے زیادہ ہرگز ترقی نہیں کرسکتا۔ ایک شخص جو اپنے قُوٰی دماغیہ میں من حیث الفطرت نہایت کمزور ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک ایسا ادھورا آدمی ہے جس کو ہمارے ملک کے عوام النّاس دُولے شاہ کا چوہا کہا کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگرچہ اُس کی تعلیم و تربیت میں کیسی ہی کوشش و محنت کی جائے اور خواہ کیسا ہی کوئی بڑا فلاسفر اُس کا اتالیق بنایا جاوے لیکن تب بھی وہ اُس فطرتی حد سے جو خُدا نے اُس کے لیے مقرّر کردی ہے۔ زیادہ ترقّی کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ بباعثِ تنگیٔ دائرۂ قابلیّت اُن مراتبِ عالیہ تک ہرگز پہنچ نہیں سکتا جن تک

ایک وسیع القویٰ آدمی پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ مَیں باور نہیں کر سکتا کہ کوئی عاقل اُس میں غور کر کے پھر اس سے منکر رہے۔ ہاں جو شخص ربقۂ عقل سے قطعاً منخلع ہو۔ اگر وہ منکر ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر تفاوت فی العقول نہ ہو تو فہمِ علوم میں کیوں اختلاف پایا جاوے۔ کیوں بعض اذہان بعضوں پر سبقت لے جائیں حالانکہ جو لوگ تعلیم و تربیت کا پیشہ رکھتے ہیں وہ اِس امر کو خوب سمجھتے ہوں گے کہ بعض طالب العلم ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں۔ کہ ادنیٰ رمز اور اشارت سے مطلب کو پا جاتے ہیں بعض ایسے بیدار مغز کہ خود اپنی طبع سے عُمدہ عُمدہ باتیں نکالتے ہیں اور بعضوں کی طبیعتیں اصل فطرت سے کچھ ایسی غبی و بلید واقع ہوتی ہیں کہ ہزار تم اُن سے مغز زنی کرو کیسا ہی کھول کر سمجھاؤ بات کو نہیں سمجھتے اور اگر تعب شدید کے بعد کچھ سمجھے بھی تو پھر حافظہ ندارد ایسے جلد بھولتے ہیں جیسے پانی کا نقش مٹ جاتا ہے اسی طرح قُویٰ اخلاقیہ اور انوارِ قلبیہ میں بغایت درجہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ ایک ہی باپ کے دو بیٹے ہوتے ہیں اور ایک ہی استاد سے تربیت پاتے ہیں پر کوئی اُن میں سے سلیم الطّبع اور نیک ذات نکلتا ہے اور کوئی خبیث اور شریر النفس اور کوئی بُزدل اور کوئی شجاع اور کوئی غیورّ اور کوئی بے غیرت۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شریر النّفس بھی وعظ و نصیحت سے کسی قدر صلاحیت پر آ جاتا ہے کبھی بُزدل بھی بوجہ کسی نفسانی طمع کے کچھ دلیری ظاہر کرتا ہے جس سے کم تجربہ آدمی اس غلطی میں پڑ جاتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی اصلیت کو چھوڑ دیا ہے لیکن ہم بار بار یاد دلاتے ہیں کہ کوئی نفس اپنی قابلیّت کی حدّ سے آگے قدم نہیں رکھتا۔ اگر کچھ ترقّی کرتا ہے تو اُسی دائرہ کے اندر اندر کرتا ہے جو اُس کی فطرتی طاقتوں کا دائرہ ہے۔ بہت سے کم فہم لوگوں نے یہ دھوکا کھایا ہے کہ قُویٰ فطرتیہ بذریعۂ ریاضاتِ مناسبہ اپنے پیدائشی اندازہ سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اِس سے بھی زیادہ ترمہمل اور دور از عقل عیسائیوں کا قول ہے کہ صرف مسیح کو خدا ماننے سے انسان کی فطرت منقلب ہو جاتی ہے۔ اور گو کیسا ہی کوئی من حیث الخلقت قُویٰ سبعیہ یا قُویٰ شہویہ کا مغلوب ہو یا قوّتِ عقلیہ میں ضعیف ہو وہ فقط حضرت عیسٰی کو خدا تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا کہنے سے اپنی جبلّی حالت چھوڑ دیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسے خیالات اُنہیں لوگوں کے دل میں اُٹھتے ہیں جنہوں نے علومِ طبعی اور طبابت میں کبھی غور نہیں کی یا جن کی آنکھیں فرطِ تعصّب اور مخلوق پرستی سے اندھی ہو گئی ہیں ورنہ طبائع مختلفہ کا مسئلہ یہاں تک ثابت ہے کہ حکماء نے جب اِس بارہ میں تحقیق کی تو متواتر تجربوں سے اُن پر یہ امر کھُل گیا کہ بُزدل یا شجاع ہونا اور طبعاً ممسک ہونا یا سخی ہونا اور ضعیف العقل یا قوی العقل ہونا اور دنی الہمّت یا رفیع الہمّت ہونا اور بُردبار یا مغلوب الغضب ہونا اور فاسد الخیال یا صالح الخیال ہونا یہ اِس قسم کے عوارض نہیں ہیں کہ سرسری اور اتفاقی ہوں بلکہ صانعِ قدیم نے بنی آدم کی کیفیّتِ مواد اور کمیّتِ اخلاط اور سینہ اور دل اور کھوپری کی وضعِ خلقت میں مختلف طور پر طرح طرح کے فرق رکھے ہیں اُنہیں فرقوں کے باعث

سے افرادِ انسانی کی قوتی اخلاقیہ اور عقلیہ میں فرق بیّن نظر آتا ہے۔ اِس قدیم رائے کو ڈاکٹروں نے بھی تسلیم کرلیا ہے اُن کا بھی یہ قول ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی کھوپریوں کو جب غور سے دیکھا گیا تو ان کی وضع ترکیب ایسی پائی گئی جو اُسی فرقہ فاسد الخیال سے مخصوص ہے۔ بعض یونانیوں نے اس سے بھی کچھ بڑھ کر لکھا ہے۔ بعض گردن اور آنکھ اور پیشانی اور ناک اور دوسرے کئی اعضاء سے بھی اندرونی حالات کا استنباط کرتے ہیں۔ بہر حال یہ ثابت ہو چکا ہے اور اُس کے ماننے سے کچھ چارہ نہیں کہ بنی آدم کا خلقی اور عقلی استعدادوں میں فطرتی تفاوت واقع ہے اور ہر یک نفس کسی قدر صلاحیت کی طرف تو قدم رکھتا ہے مگر اپنی قابلیت کے دائرہ سے زیادہ نہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۱۶۹-۱۷۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

جب کوئی نشان پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں مانیں گے جب تک ہمیں خود ہی وہ باتیں حاصل نہ ہوں جو رسولوں کو ملتی ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اوران کے جوابات صفحہ ۱۸)

ذرا غور کرنے سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جسے خدا تعالیٰ مامور کرتا ہے ضرور ہے کہ اس کے لیے اجتبا اور اصطفا ہو اور کچھ نہ کچھ اس میں ضرور خصوصیت چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کل مخلوق میں سے اسے برگزیدہ کرے۔ خدا کی نظر خطا جانے والی نہیں ہوتی۔ پس جب وہ کسی کو منتخب کرتا ہے وہ معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

(۱۳۵) اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ○

جو کچھ تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے یعنی دینِ اسلام کا عزّت کے ساتھ دُنیا میں پھیل جانا اور اُس کے روکنے والوں کا ذلیل اور رُسوا ہو جانا۔ یہ وعدہ عنقریب پورا ہونے والا ہے اور تم ہرگز اُس کو روک نہیں سکو گے

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۲۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

(۱۳۶) قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

اگر تم بھی کچھ چیز ہو تو اپنے مکان پر فیصلہ کے لیے کوشش کرو اور میں بھی کروں گا پھر تم دیکھو گے کہ خدا کس کے ساتھ ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۶۲ حاشیہ)

اس وقت خود اسلام میں کئی فرقے موجود ہیں جو کہ ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ پھر دوسرے مذاہب کے حملے الگ ہیں... اور ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ہم حق پر ہیں پس ایسی حالت میں فیصلہ کرنا ایک آسان امر نہیں ہے یا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو فہم دے اور رشد عطا کرے اور یا خود انسان جلدی نہ کرے اور صبر اور دعا سے کام لے تاکہ وقت پر حقیقت کھل جاوے کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے کیونکہ جھوٹے مذہب کے ساتھ اس کی نصرت اور تائید کبھی شامل نہیں ہو سکتی۔ اگر جھوٹے مذہب کی بھی وہی خاطر خدا کو ہو جو کہ سچے مذہب کی ہوتی ہے تو پھر سچ اور جھوٹ کا امتیاز کرنا محال ہو جائیگا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے کہ قرآن شریف میں درج ہے یہ جواب دیا کہ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ کہ اگر تم لوگوں پر میرا سچا ہونا مشتبہ ہے تو تم بھی اپنی اپنی جگہ عمل کرو میں بھی کرتا ہوں انجام پر دیکھ لینا کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۶ صفحہ ۲ مورخہ ۸ افروری ۱۹۰۵ء و الحکم جلد ۹ نمبر ۷ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۵ء)

اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ تم اپنی جگہ کام کرو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۳۶ صفحہ ۵ مورخہ ۷ ارنومبر ۱۹۰۵ء)

ان کو کہہ کہ تم اپنے طور پر اپنی کامیابی کے لیے عمل میں مشغول رہو اور میں بھی مشغول ہوں۔ پھر دیکھو گے کہ کس کے عمل میں قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۲)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝

دیکھو سود کا کس قدر سنگین گناہ ہے کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں۔ سور کا کھانا تو بحالت اضطرار جائز رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ؁ یعنی جو شخص باغی نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ غفور رحیم ہے۔ مگر سود کے لیے نہیں فرمایا کہ بحالتِ اضطرار جائز ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۵ صفحہ ۶ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء)

وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ

ـــــــــــــ

لہ۔ البقرۃ آیت ۱۷۴؁

وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ٘ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝

عیسائی نامہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ اگر انبیاء کی نسبت جُرم کا لفظ نہیں آیا تو یہودیوں کی نسبت بھی نہیں آیا یہ ان کی جہالت کا دُوسرا ثبوت ہے۔ یہُودیوں کی نسبت کئی جگہ جرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہے۔ نمونہ کے لیے صرف تین آیتیں لکھنی کافی ہوں گی۔ ایک آیت یہ ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ٘ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝[1] اس آیت میں یہُودیوں کا ذکر ہے جن کی نسبت لفظ مجرمین آیا ہے۔ دوسری آیت یہ ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۚ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الرّوم ع ۵)[2] اس آیت میں گذشتہ انبیاء کے دشمنوں کو مجرم بیان کیا ہے حضرت مسیح بھی انہیں نبیوں میں شامل ہیں اس لیے ان کے دشمن قرآن شریف کی رُو سے مجرم ٹھہرتے ہیں۔ اب ہم عیسائی صاحبان سے پوچھتے ہیں کہ آیا یہودی حضرت مسیح کے دشمن تھے یا دوست۔ اگر وہ آپ کے دوست تھے تو بیشک وہ مجرم نہیں ہیں لیکن اگر وہ آپ کے دشمن تھے تو پھر قرآن شریف کی رُو سے وہ مجرم ٹھہرتے ہیں۔ تیسری آیت یہ ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ[3] (پارہ ۱۹ ع ۱) اس آیت سے بھی انبیاء کے دشمن مجرمین کے لفظ سے پکارے گئے ہیں اور اس لیے یہودی بھی مجرم ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے جانی دشمن تھے اور آنحضرت ؐ کے بھی دشمن تھے۔

عیسائی نامہ نگاروں کو اپنے اس بیہودہ قول سے شرم کرنی چاہیئے کہ قرآن شریف میں جرم کا لفظ یہودیوں کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ انکا یہ قول بھی ایسا ہی بیہودہ ہے جیسا کہ ان کا پہلا قول۔ کہ جرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہی نہیں۔ اس سے عیسائی نامہ نگاروں نے صرف اپنی کم علمی کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنی کم فہمی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اگر قرآن شریف میں یہودیوں کی نسبت جُرم کا لفظ نہ بھی آتا تو کیا پھر وہ انبیاء سے مساوی ٹھہر سکتے تھے۔ خُدا ان کی نسبت ان کی بدعملی اور بدی بیان کرتے ہوئے ہر ایک لفظ سے کام لیتا ہے جو خیال میں آسکتا ہے۔ ان کو فاسق۔ ملعون۔ کافر۔ معتدین۔ شیاطین۔ ظالم۔ بندر۔ مغضوب علیہم وغیرہ بیان کرتا ہے۔ ان الفاظ کے مقابل اگر قرآن شریف یہودیوں کی نسبت جرم کا لفظ نہ بھی بیان کرتا تو کیا وہ انبیاء

[1] الانعام آیت ۱۴۷، ۱۴۸ [2] آیت ۴۸ [3] الفرقان آیت ۳۲

کی طرح بے گناہ ثابت ہو سکتے تھے جن کے متعلق ان الفاظ میں سے کوئی بھی استعمال نہیں ہُوا۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ ع۶ صفحہ ۲۴۸-۲۴۹)

الانعام ۱۴۸ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ○

اگر یہ لوگ تکذیب پر کمربستہ ہوں تو اُن کو کہہ دے کہ اگر تم ایمان لاؤ تو خدا کی وسیع رحمت سے تمہیں حِصّہ ملیگا اور اگر تکذیب سے باز نہ آؤ تو اُس کا عذاب ایسا نہیں کہ کسی حیلہ او رتدبیر سے ٹل سکے۔

(ایام الصلح صفحہ ۵-۶ حاشیہ)

الانعام ۱۵۲ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۳)

الانعام ۱۵۳ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۚ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اور جب تم بولو تو وہی بات مُنہ پر لاؤ جو سراسر سچ اور عدالت کی بات ہے اگرچہ تم اپنے کسی قریبی پر گواہی دو۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۳)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

اِن کو کہہ دے کہ میری راہ جو ہے وہی راہ سیدھی ہے سو تم اُسی کی پیروی کرو اور اَور راہوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ سے دُور ڈال دینگی۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۴-۱۶۵)

یہ میری راہ ہے سو آؤ میری راہ اختیار کرو اور اس کے مخالف کوئی راہ اختیار نہ کرو کہ خدا سے دُور جا پڑو گے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۴)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○

جب بعض نشان ظاہر ہوں گے تو اُس دن ایمان لانا بیسُود ہوگا اور جو شخص صرف نشان کے دیکھنے کے بعد ایمان لایا ہے اُس کو وہ ایمان نفع نہیں دے گا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۳۳۳)

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

مخالفین کو کہہ دے کہ مَیں جان کو دوست نہیں رکھتا۔ میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا خدا کے لیے ہے وہی خدا جس نے ہر یک چیز کو پیدا کیا ہے۔ (شحنۂ حق صفحہ ۴ حاشیہ)

اِن کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا

سب خدا کے لیے اور اس کی راہ میں ہے۔ وُہی خدا جو تمام عالموں کا ربّ ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اِس بات کا حکم دیا گیا ہے اور مَیں اوّل المسلمین ہوں یعنی دُنیا کی ابتدا سے اُس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنا فی اللہ ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اُس کو واپس دینے والا ہو۔ اِس آیت میں اُن نادان موحدوں کا ردّ ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کلّی ثابت نہیں اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن متّٰی سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلّل ہے جو ہمیشہ ہمارے سیّد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی۔ ہر ایک بات کا ایک موقعہ اور محل ہوتا ہے اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اُس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دُنیا یہاں تک کہ بُت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عباد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارتِ نفس ہے۔

غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں اللہ جلّ شانہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اوّل المسلمین رکھتا ہے اور تمام مطیعوں اور فرماں برداروں کا سردار ٹھہراتا ہے اور سب سے پہلے امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلعم کو قرار دیتا ہے تو پھر کیا بعد اس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اعلیٰ میں کسی طرح کا جرح کر سکے۔ خدا تعالےٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لیے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو عنایت فرمایا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا اَعْظَمَ شَانَکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ؎

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خیلِ تواند   جملہ دریں راہ طفیلِ تواند

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۲-۱۶۴)

نجات اُس کو ملتی ہے جس نے اپنا سارا وجود اللہ کی راہ میں سونپ دیا یعنی اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا اور اس کی راہ میں لگا دیا اور وہ بعد وقف کرنے اپنی زندگی کے نیک کاموں میں مشغول ہو گیا اور ہر ایک قسم کے اعمالِ حسنہ بجالانے لگا پس وہی شخص ہے جس کو اس کا اجر اُس کے رب کے پاس سے ملیگا اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہونگے یعنی وہ پورے اور کامل طور پر نجات پا جائیں گے۔ اس مقام میں اللہ جلّ شانہ نے عیسائیوں اور یہودیوں کی نسبت فرمادیا کہ جو وہ اپنی اپنی نجات یابی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صرف اُن کی آرزوئیں ہیں اور اُن آرزوؤں کی حقیقت جو زندگی کی روح ہے ان میں ہرگز پائی نہیں جاتی بلکہ اصلی اور حقیقی نجات وہ ہے جو اِسی دنیا میں اُس کی حقیقت نجات یابندہ کو محسوس ہو جائے اور وہ اس طرح پر ہے کہ نجات

یا بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دے۔ اس طرح پر کہ اس کا مرنا اور جینا اور اس کے تمام اعمال خدا تعالیٰ کے لیے ہو جائیں اور اپنے نفس سے وہ بالکل کھویا جائے اور اس کی مرضی خدا تعالیٰ کی مرضی ہو جائے اور پھر نہ صرف دل کے عزم تک یہ بات محدود رہے بلکہ اس کی تمام جوارح اور اُس کے تمام قُویٰ اور اس کی عقل اور اُس کا فکر اور اُس کی تمام طاقتیں اسی راہ میں لگ جائیں تب اس کو کہا جائے گا کہ وہ مُحسن ہے یعنی خدمتگاری کا اور فرماں برداری کا حق بجالایا۔ جہاں تک اُس کی بشریت سے ہو سکتا تھا سو ایسا شخص نجات یاب ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں فرماتا ہے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (پ سورۃ انعام ع)۔ کہہ نماز میری اور عبادتیں میری اور زندگی میری اور موت میری تمام اُس اللہ (کے) واسطے ہیں جو رب ہے عالموں کا جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی درجہ کے حاصل کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور مَیں اوّل مسلمانوں کا ہوں۔ (جنگ مقدس صفحہ ۸۵ پرچہ ۲۶ مئی ۱۸۹۳ء)

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے (ست بچن صفحہ ۹)

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لیے ہے اور جب انسان کی محبّت خدا کے ساتھ اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کا مرنا اور جینا اپنے لیے نہیں بلکہ خدا ہی کے لیے ہو جائے تب خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا ہے اپنی محبت کو اُس پر اُتارتا ہے اور ان دونوں محبّتوں کے ملنے سے انسان کے اندر ایک نُور پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا نہیں پہچانتی اور نہ سمجھ سکتی ہے اور ہزاروں صدّیقوں اور برگزیدوں کا اسی لیے خون ہُوا کہ دنیا نے ان کو نہیں پہچانا۔ وہ اسی لیے مکّار اور خود غرض کہلائے کہ دنیا اُن کے نورانی چہرہ کو دیکھ نہ سکی۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۷۶)

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا اس خدا کے لیے ہے جس کی ربوبیت تمام چیزوں پر مُحیط ہے۔ کوئی چیز اور کوئی شخص اس کا شریک نہیں۔ اور مخلوق کو کسی قسم کی شراکت اس کے ساتھ نہیں مجھے یہی حکم ہے کہ مَیں ایسا کروں اور اسلام کے مفہوم پر قائم ہونے والا یعنی خدا کی راہ میں اپنے وجود کی قربانی دینے والا سب سے اوّل مَیں ہوں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۳-۱۴)

ان کو کہہ دے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنی اُس کا جلال ظاہر کرنے کے لیے اور نیز اُس کے بندوں کے آرام دینے کے لیے ہے تا میرے مرنے سے اُن کو زندگی حاصل ہو۔ اس جگہ جو خدا کی راہ میں اور بندوں کی بھلائی کے لیے مرنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ آپ نے نعوذ باللہ جاہلوں یا دیوانوں کی طرح درحقیقت خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا اس وہم سے کہ اپنے

تئیں کسی آلۂ قتل کے ذریعہ سے ہلاک کر دینا اَوروں کو فائدہ پہنچائے گا بلکہ آپ ان بیہودہ باتوں کے سخت مخالف تھے اور قرآن ایسی خودکشی کے مرتکب کو سخت مجرم اور قابل سزا ٹھہراتا ہے ...... غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اُٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لیے جان کو وقف کر دیا تھا اور دعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور اُن کے جور و جفا اُٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۳۷)

فَلِاَجْلِ ذَالِکَ سُمِّیَ الضَّحَایَا قُرْبَانًا بِمَا وَرَدَ اِنَّھَا تَزِیْدُ قُرْبًا وَّلُقْیَانًا کُلَّ مَنْ قَرَّبَ اِخْلَاصًا وَّتَعَبُّدًا وَّاِیْمَانًا وَّاِنَّھَا مِنْ اَعْظَمِ نُسُکِ الشَّرِیْعَۃِ وَلِذَالِکَ سُمِّیَتْ بِالنَّسِیْکَۃِ۔ وَالنُّسُکُ الطَّاعَۃُ وَالْعِبَادَۃُ فِی اللِّسَانِ الْعَرَبِیَّۃِ وَکَذَالِکَ جَآءَ لَفْظُ النُّسُکِ بِمَعْنٰی ذَبْحِ الذَّبِیْحَۃِ۔ فَھٰذَا الْاِشْتِرَاکُ یَدُلُّ قَطْعًا عَلٰی اَنَّ الْعَابِدَ فِی الْحَقِیْقَۃِ ھُوَ الَّذِیْ ذَبَحَ نَفْسَہٗ وَقُوَاہُ وَکُلَّ مَنْ اَصْبَاہُ لِرِضٰی رَبِّ الْخَلِیْقَۃِ وَذَبَّ الْھَوٰی حَتّٰی تَھَافَتَ وَامَّحٰی۔ وَذَابَ وَغَابَ وَاخْتَفٰی۔ وَھَبَّتْ عَلَیْہِ عَوَاصِفُ الْفَنَآءِ وَسَفَتْ ذَرَّاتِہٖ شَدَآئِدُ ھٰذِہِ الْھَوْجَآءِ۔ وَمَنْ فَکَّرَ فِیْ ھٰذَیْنِ الْمَفْھُوْمَیْنِ الْمُشْتَرِکَیْنِ۔ وَتَدَبَّرَ الْمَقَامَ بِتَیَقُّظِ

(ترجمہ) اور اسی وجہ سے ان ذبح ہونے والے جانوروں کا نام قربانی رکھا گیا۔ کیونکہ حدیثوں میں آیا ہے۔ کہ یہ قربانیاں خدا تعالیٰ کے قرب اور ملاقات کا موجب ہیں اس شخص کے لیے کہ جو قربانی کو اخلاص اور خدا پرستی اور ایمانداری سے ادا کرتا ہے اور یہ قربانیاں شریعت کی بزرگتر عبادتوں میں سے ہیں اور اسی لیے قربانی کا نام عربی میں نسیکہ ہے اور نُسک کا لفظ عربی زبان میں فرماں برداری اور بندگی کے معنوں میں آتا ہے اور ایسا ہی یہ لفظ یعنی نُسک اُن جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی زبان مذکور میں استعمال پاتا ہے جن کا ذبح کرنا مشروع ہے۔ پس یہ اشتراک کہ جو نُسک کے معنوں میں پایا جاتا ہے قطعی طور پر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقی پرستار اور سچا عابد وہی شخص ہے جس نے اپنے نفس کو مع اس کی تمام قوتوں اور مع اس کے اُن محبوبوں کے جن کی طرف اُس کا دل کھینچا گیا ہے اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے ذبح کر ڈالا ہے۔ اور خواہش نفسانی کو دفع کیا یہاں تک کہ تمام خواہشیں پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں اور نابود ہو گئیں اور وہ خود بھی گداز ہو گیا اور اس کے وجود کا کچھ نمود نہ رہا اور چھپ گیا اور فنا کی تند ہوائیں اُس پر چلیں اور اس کے وجود کے ذرات کو اس ہوا کے سخت دھکّے اڑا کر لے گئے۔ اور جس شخص نے ان دونوں مفہوموں میں کہ جو باہم نُسک کے لفظ میں مشارکت رکھتے ہیں غور کی ہو گی اور اس مقام کو تدبّر کی نگاہ سے دیکھا ہو گا اور اپنے دل کی بیداری اور دونوں آنکھوں کے کھولنے

الْقَلْبِ وَفَتْحِ الْعَيْنَيْنِ۔ فَلَا يَبْقٰى لَهٗ خِفَاءٌ وَّلَا مِرَاءٌ۔ فَإِنَّ هٰذَا إِيْمَاءٌ إِلٰى أَنَّ الْعِبَادَةَ الْمُنْجِيَةَ مِنَ الْخَسَارَةِ هِيَ ذَبْحُ النَّفْسِ الْأَمَّارَةِ وَنَحْرُهَا بِمُدَى الْإِنْقِطَاعِ إِلَى اللّٰهِ ذِي الْآلَاءِ وَالْأَمْرِ وَالْإِمَارَةِ مَعَ تَحَمُّلِ أَنْوَاعِ الْمَرَارَةِ۔ لِتَنْجُوَ النَّفْسُ مِنْ مَّوْتِ الْغَرَارَةِ وَهٰذَا هُوَ مَعْنَى الْإِسْلَامِ وَحَقِيْقَةُ الْإِنْقِيَادِ التَّامِّ۔

(خطبہ الہامیہ ص۳-۵)

فَانْظُرْ كَيْفَ فَسَّرَ النُّسُكَ بِلَفْظِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ۔ وَأَشَارَ بِهٖ إِلٰى حَقِيْقَةِ الْأَضْحَاةِ۔ فَفَكِّرُوْا فِيْهِ يَا ذَوِي الْحَصَاةِ۔ وَمَنْ ضَحّٰى مَعَ عِلْمِ حَقِيْقَةِ ضَحِيَّتِهٖ وَصِدْقِ طَوِيَّتِهٖ۔ وَخُلُوْصِ نِيَّتِهٖ فَقَدْ ضَحّٰى بِنَفْسِهٖ وَمُهْجَتِهٖ۔ وَأَبْنَائِهٖ وَحَفَدَتِهٖ۔ وَلَهٗ أَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ كَأَجْرِ إِبْرَاهِيْمَ عِنْدَ رَبِّهِ الْكَرِيْمِ۔ وَإِلَيْهِ أَشَارَ سَيِّدُنَا الْمُصْطَفٰى وَرَسُوْلُنَا الْمُجْتَبٰى وَإِمَامُ الْمُتَّقِيْنَ وَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ وَقَالَ وَهُوَ بَعْدَ اللّٰهِ أَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ۔ إِنَّ الضَّحَايَا هِيَ الْمَطَايَا۔ تُوْصِلُ إِلٰى رَبِّ الْبَرَايَا وَتَمْحُو الْخَطَايَا۔ وَتَدْفَعُ الْبَلَايَا۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۲-۱۳)

سے پیش دل کو زیر نظر رکھا ہوگا پس اُس پر پوشیدہ نہیں رہے گا اور اس امر میں کسی قسم کی نزاع اس کے دامن کو نہیں پکڑے گی کہ یہ دو معنوں کا اشتراک کہ جو نُسک کے لفظ میں پایا جاتا ہے اِس بھید کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عبادت جو آخرت کے خسارہ سے نجات دیتی ہے وہ اُس نفس امّارہ کا ذبح کرنا ہے کہ جو بُرے کاموں کے لیے زیادہ سے زیادہ جوش رکھتا ہے اور ایسا حاکم ہے کہ ہر وقت بدی کا حکم دیتا رہتا ہے پس نجات اس میں ہے کہ اس بُرا حکم دینے والے کو انقطاع الی اللہ کے کاردوں سے ذبح کر دیا جائے اور خلقت سے قطع تعلق کرکے خدا تعالیٰ کو اپنا مونس اور آرامِ جان قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ انواع اقسام کی تلخیوں کی برداشت بھی کی جائے تا نفس غفلت کی موت سے نجات پاوے اور یہی اسلام کے معنے ہیں اور یہی کامل اطاعت کی حقیقت ہے۔

(خطبہ الہامیہ ص۳-۵)

(ترجمہ) پس دیکھ کہ کیونکر نُسک کے لفظ کی حیات اور ممات کے لفظ سے تفسیر کی ہے اور اس تفسیر سے قربانی کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے پس اے عقلمندو اس میں غور کرو اور جس نے اپنی قربانی کی حقیقت کو معلوم کرکے قربانی ادا کی اور صدق دل اور خلوص نیّت کے ساتھ ادا کی۔ پس بہ تحقیق اس نے اپنی جان اور اپنے بیٹوں اور اپنے پوتوں کی قربانی کردی اور اس کے لیے اجر بزرگ ہے جیسا کہ ابراہیم کے لیے اس کے رب کے نزدیک اجر تھا۔ اور اسی کی طرف ہمارے سیّد برگزیدہ اور رسول برگزیدہ نے جو پرہیزگاروں کا امام اور انبیاء کا خاتم ہے اشارہ کیا اور فرمایا اور وہ خدا کے بعد سب سچوں سے زیادہ تر سچا ہے۔ بہ تحقیق قربانیاں وہی سواریاں ہیں کہ جو خدا تعالیٰ تک پہنچاتی ہیں اور خطاؤں کو محو کرتی ہیں۔ اور بلاؤں کو دُور کرتی ہیں۔ (خطبہ الہامیہ ص۱۲-۱۳)

ان کو جو تیری پیروی کرنا چاہتے ہیں یہ کہہ دے کہ (میری نماز اور) میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا زندہ رہنا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو میری پیروی کرنا چاہتا ہے وہ بھی اس قربانی کو ادا کرے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۲۷)

اے نبی لوگوں کو کہہ دے کہ مَیں صرف خدا کا پرستار ہوں دوسری کسی چیز سے میرا تعلق نہیں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا صرف اُس خدا کے لیے ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ دیکھو اس آیت میں کیسی ماسوی اللہ سے بے تعلقی ظاہر کی گئی ہے ؎

چنان زندگی کن کہ باصد عیال ندارى بدل غیر آن ذوالجلال

(چشمہ معرفت ص۲۸۷)

صحابہ کرامؓ کے تعلقات بھی تو آخر دنیا سے تھے ہی۔ جائدادیں تھیں۔ مال تھا زر تھا۔ مگر ان کی زندگی پر کس قدر انقلاب آیا کہ سب کے سب ایک ہی دفعہ دستبردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہمارا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اگر اس قسم کے لوگ ہم میں ہو جاویں تو کونسی آسمانی برکت اس سے بزرگ تر ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء ص۱۰)

اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اُسی کو یگانہ ویکتا معبود سمجھو۔ جب تک انسان ایمان نہیں لاتا کچھ نہیں۔ اور ایسا ہی نماز روزہ میں اگر دنیا کو کوئی حصہ دیتا ہے تو وہ نماز و روزہ اُسے منزلِ مقصود تک نہیں لے جا سکتا بلکہ محض خدا کے لیے ہو جاوے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا سچا مصداق ہو تب مسلمان کہلائے گا۔ ابراہیم کی طرح صادق اور وفادار ہونا چاہیئے جس طرح پر وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی طرح انسان ساری دنیا کی خواہشوں اور آرزوؤں کو جب تک قربان نہیں کر دیتا کچھ نہیں بنتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو ایک جذبہ پیدا ہو جاوے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ خود اس کا متکفل اور کارساز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کبھی بدظنی نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر نقص اور خرابی ہوگی تو ہم میں ہوگی۔

پس یاد رکھو کہ جب تک انسان خدا کا نہ ہو جاوے بات نہیں بنتی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے اس میں شتاب کاری نہیں رہتی۔ مشکل یہی ہے کہ لوگ جلد گھبرا جاتے ہیں اور پھر شکوہ کرنے لگتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء ص۱۰)

آپ کے الٰہی قرب کی نسبت یوں فرمایا قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی لوگوں کو اطلاع دیدے کہ میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے وجود سے بالکل کھویا گیا ہوں

میری تمام عبادتیں خدا کے لیے ہو گئی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر ایک انسان جب تک وہ کامل نہیں خدا کیلئے خالص طور پر عبادت نہیں کر سکتا بلکہ کچھ عبادت اُس کی خدا کے لیے ہوتی ہے اور کچھ اپنے نفس کیلئے کیونکہ وہ اپنے نفس کی عظمت اور بزرگی چاہتا ہے جیسا کہ خدا کی عظمت اور بزرگی کرنی چاہیئے اور یہی عبادت کی حقیقت ہے اور ایسا ہی ایک حصہ اس کی عبادت کا مخلوق کے لیے ہوتا ہے کیونکہ جس عظمت اور بزرگی اور قدرت اور تصرّف کو خدا سے مخصوص کرنا چاہیئے اُس عظمت اور قدرت کا حصّہ مخلوق کو بھی دیتا ہے۔ اِس لیے جیسا کہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہے نفس اور مخلوق کی بھی پرستش کرتا ہے بلکہ عام طور پر جمیع اسباب سفلیہ کو اپنی پرستش سے حصہ دیتا ہے کیونکہ خدا کے ارادہ اور تقدیر کے مقابل ان اسباب کو بھی کارخانہ محو و اسباب میں دخیل سمجھتا ہے پس ایسا انسان خدا تعالیٰ کا سچا پرستار نہیں ٹھہر سکتا۔ جو کبھی خدا کی عظمت کا اپنے نفس کو شریک ٹھہراتا ہے اور کبھی مخلوق اور کبھی اسباب کو بلکہ سچا پرستار وہ ہے جو خدا کی تمام عظمتیں اور تمام بزرگیاں اور تمام تصرّف خدا ہی کو دیتا ہے نہ کسی اور کو۔ اور جب اس مرتبہ توحید پر انسان کی پرستش پہنچ جائے تب حقیقی طور پر وہ خدا کا پرستار کہلاتا ہے اور ایسا انسان جیسا کہ زبان سے کہتا ہے کہ خداوند وحدہٗ لاشریک ہے ایسا ہی وہ اپنے فعل سے یعنی اپنی عبادت سے بھی خدا کی توحید پر گواہی دیتا ہے پس اسی مرتبہ کاملہ کی طرف اشارہ ہے جو آیت مذکورہ بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ تو لوگوں کو کہہ دے کہ میری تمام عبادتیں خدا کے لیے ہیں یعنی نفس کو اور مخلوق کو اور اسباب کو میری عبادت میں سے کوئی حصہ نہیں۔

اور پھر بعد اس کے فرمایا کہ میری قربانی بھی خاص خدا کے لیے ہے اور میرا جینا بھی خدا کے لیے ہے اور میرا مرنا بھی خدا کے لیے۔ یاد رہے کہ نسیکہ لغت عرب میں قربانی کو کہتے ہیں اور لفظ نسک جو آیت میں موجود ہے اس کی جمع ہے اور نیز دوسرے معنے اس کے عبادت کے بھی ہیں پس اس جگہ ایسا لفظ استعمال کیا گیا جس کے معنے عبادت اور قربانی دونوں پر اطلاق پاتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کامل عبادت جس میں نفس اور مخلوق اور اسباب شریک نہیں ہیں درحقیقت ایک قربانی ہے اور کامل قربانی درحقیقت کامل عبادت ہے اور پھر بعد اس کے جو فرمایا کہ میرا جینا بھی خدا کے لیے ہے اور میرا مرنا بھی خدا کے لیے۔ یہ آخری فقرہ قربانی کے لفظ کی تشریح ہے تا کوئی اس وہم میں نہ پڑے کہ قربانی سے مراد بکرے کی قربانی یا گائے کی قربانی یا اونٹ کی قربانی ہے او رتا اس لفظ سے کہ میرا جینا اور میرا مرنا خاص خدا کے لیے ہے۔ صاف طور پر سمجھا جائے کہ اس قربانی سے مراد روح کی قربانی ہے اور قربانی کا لفظ قرب سے لیا گیا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا قرب تب حاصل ہوتا ہے کہ جب تمام نفسانی قویٰ اور نفسانی جنبشوں پر موت آجائے۔ غرض یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب تام پر ایک بڑی دلیل ہے اور یہ آیت بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم اس قدر خدا میں گم اور محو ہو گئے تھے کہ آپ کی زندگی کے تمام انفاس اور آپ کی موت محض خدا کے لیے ہو گئی تھی اور آپ کے وجود میں نفس اور مخلوق اور اسباب کا کچھ حصہ باقی نہیں رہا تھا اور آپ کی روح خدا کے آستانہ پر ایسے اخلاص سے گری تھی کہ اس میں غیر کی ایک ذرہ آمیزش نہیں رہی تھی پس اس طرح آپ نے اس شرط کے ایک حصہ کو پورا کیا جو شفیع کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور آخری فقرہ آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ میرا جینا اور مرنا اس خدا کے لیے ہے جو تمام جہان کی پرورش میں لگا ہوا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ میری قربانی بھی تمام جہان کی بھلائی کے لیے ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۸۲-۱۸۴)

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اوّل المسلمین ٹھہرے تو اس کا یہی باعث ہوا کہ اوروں کی نسبت علوم معرفت الٰہی میں اعلم ہیں یعنی علم ان کا معارف الٰہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے اس لیے ان کا اسلام بھی سب سے اعلیٰ ہے اور وہ اوّل المسلمین ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۸۶-۱۸۷)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

آیت اور حدیث میں باہم تعارض واقع ہونے کی حالت میں اصول مفسرین و محدثین یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ حدیث کے معنوں میں تاویل کر کے اس کو قرآن کریم کے مطابق کیا جائے جیسا کہ صحیح بخاری کے کتاب الجنائز صفحہ ۱۷۲ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث اِنَّ الْمَیِّتَ یُعَذَّبُ بِبَعْضِ بُکَاءِ اَھْلِہٖ کو قرآن کریم کی اس آیت سے لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی معارض و مخالف پا کر حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ یہ مومنوں کے متعلق نہیں بلکہ کفار کے متعلق ہے جو متعلقین کے جزع فزع پر راضی تھے بلکہ وصیت کر جاتے تھے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۲۶-۹۲۷)

قرآن کوئی لعنتی قربانی پیش نہیں کرتا بلکہ ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ ایک کا گناہ یا ایک کی لعنت کسی دوسرے پر ڈالی جائے چہ جائیکہ کروڑہا لوگوں کی لعنتیں اکٹھی کر کے ایک کے گلے میں ڈال دی جائیں قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا لیکن قبل اس کے

جو میں مسئلہ نجات کے متعلق قرآنی ہدایت بیان کروں مناسب دیکھتا ہوں کہ عیسائیوں کے اس اصول کی غلطی لوگوں پر ظاہر کردوں تا وہ شخص جو اس مسئلہ میں قرآن اور انجیل کی تعلیم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے وہ آسانی سے مقابلہ کرسکے۔

پس واضح ہو کہ عیسائیوں کا یہ اصول کہ خدا نے دنیا سے پیار کر کے دنیا کو نجات دینے کے لیے یہ انتظام کیا کہ نافرمانوں اور کافروں اور بدکاروں کا گناہ اپنے پیارے بیٹے یسوع پر ڈال دیا اور دنیا کو گناہ سے چھوڑانے کے لیے اُس کو لعنتی بنایا اور لعنت کی لکڑی سے لٹکایا۔ یہ اصول ہر ایک پہلو سے فاسد اور قابل شرم ہے اگر میزان عدل کے لحاظ سے اس کو جانچا جائے تو صریح یہ بات ظلم کی صورت میں ہے کہ زید کا گناہ بکر پر ڈال دیا جائے انسانی کانشنس اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک مجرم کو چھوڑ کر اس مجرم کی سزا غیر مجرم کو دی جائے اور اگر روحانی فلاسفی کے رُو سے گنہ کی حقیقت پر غور کی جائے تو اس تحقیق کے رُو سے بھی یہ عقیدہ فاسد ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ گناہ درحقیقت ایک ایسا زہر ہے جو اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خدا کی اطاعت اور خدا کی پر جوش محبت اور محبانہ یادِ الٰہی سے محروم اور بے نصیب ہو اور جیسا کہ ایک درخت جب زمین سے اکھڑ جائے اور پانی چوسنے کے قابل نہ رہے تو وہ دن بدن خشک ہونے لگتا ہے اور اُس کی تمام سرسبزی برباد ہو جاتی ہے۔ یہی حال اُس انسان کا ہوتا ہے جس کا دل خدا کی محبت سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے پس خشکی کی طرح گناہ اُس پر غلبہ کرتا ہے سو اس خشکی کا علاج خدا کے قانون قدرت میں تین طور سے ہے (۱) ایک محبت (۲) استغفار جس کے معنے ہیں دبانے اور ڈھانکنے کی خواہش۔ کیونکہ جب تک مٹی میں درخت کی جڑ جمی رہے۔ تب تک وہ سرسبزی کا امیدوار ہوتا ہے (۳) تیسرا علاج توبہ ہے۔ یعنی زندگی کا پانی کھینچنے کے لیے تذلل کے ساتھ خدا کی طرف پھرنا اور اُس سے اپنے تئیں نزدیک کرنا اور معصیت کے حجاب سے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنے تئیں باہر نکالنا۔ اور توبہ صرف زبان سے نہیں ہے بلکہ توبہ کا کمال اعمال صالحہ کے ساتھ ہے۔ تمام نیکیاں توبہ کی تکمیل کے لیے ہیں۔ کیونکہ سب سے مطلب یہ ہے کہ ہم خدا سے نزدیک ہو جائیں۔ دعا بھی توبہ ہے کیونکہ اُس سے بھی ہم خدا کا قرب ڈھونڈتے ہیں۔ اس لیے خدا نے انسان کی جان کو پیدا کر کے اُس کا نام روح رکھا۔ کیونکہ اُس کی حقیقی راحت اور آرام خدا کے اقرار اور اُس کی محبت اور اُس کی اطاعت میں ہے اور اُس کا نام نفس رکھا[1]۔ کیونکہ وہ خدا سے اتحاد پیدا کرنے والا ہے خدا سے دل لگانا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ باغ میں وہ درخت ہوتا ہے جو باغ کی زمین سے خوب پیوستہ ہوتا ہے۔ یہی انسان کی جنت ہے اور جس طرح درخت زمین کے پانی کو چوستا اور اپنے اندر کھینچتا اور اُس سے اپنے زہریلے بخارات باہر نکالتا ہے اسی طرح انسان کے دل کی

[1] نوٹ۔ نفس لغت میں عینِ شے کے معنے رکھتا ہے۔ منہ

حالت ہوتی ہے کہ وہ خدا کی محبت کا پانی چوس کر زہریلے مواد کے نکالنے پر قوت پاتا ہے اور بڑی آسانی سے اُن مواد کو دفع کرتا ہے اور خدا میں ہو کر پاک نشوونما پاتا جاتا ہے اور بہت پھیلتا اور خوشنما سرسبزی دکھلاتا اور اچھے پھل لاتا ہے مگر جو خدا میں پیوستہ نہیں وہ نشوونما دینے والے پانی کو چوس نہیں سکتا۔ اس لیے دم بدم خشک ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر پتے بھی گر جاتے ہیں اور خشک اور بدشکل ٹہنیاں رہ جاتی ہیں پس چونکہ گناہ کی خشکی بے تعلقی سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اُس خشکی کے دور کرنے کے لیے سیدھا علاج مستحکم تعلق ہے جس پر قانون قدرت گواہی دیتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اشارہ کرکے فرماتا ہے یَاۤ اَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۔[۵] یعنی اے وہ نفس جو خدا سے آرام یافتہ ہے اپنے رب کی طرف واپس چلا آ وہ تجھ سے راضی اور تو اُس سے راضی پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت کے اندر آ۔

غرض گناہ کے دور کرنے کا علاج صرف خدا کی محبت اور عشق ہے۔ لہٰذا وہ تمام اعمال صالحہ جو محبت اور عشق کے سرچشمہ سے نکلتے ہیں گناہ کی آگ پر پانی چھڑکتے ہیں کیونکہ انسان خدا کے لیے نیک کام کرکے اپنی محبت پر مُہر لگاتا ہے۔ خدا کو اس طرح پر مان لینا کہ اُس کو ہر ایک چیز پر مقدم رکھنا یہاں تک کہ اپنی جان پر بھی۔ یہ وہ پہلا مرتبہ محبت ہے جو درخت کی اُس حالت سے مُشابہ ہے جبکہ وہ زمین میں لگایا جاتا ہے اور پھر دوسرا مرتبہ استغفار جس سے یہ مطلب ہے کہ خدا سے الگ ہو کر انسانی وجود کا پردہ نہ کُھل جائے اور یہ مرتبہ درخت کی اُس حالت سے مُشابہ ہے جبکہ وہ زور کرکے پورے طور پر اپنی جڑ زمین میں قائم کر لیتا ہے اور پھر تیسرا مرتبہ توبہ جو اُس حالت کے مُشابہ ہے کہ جب درخت اپنی جڑیں پانی سے قریب کرکے بچہ کی طرح اُس کو چوستا ہے۔ غرض گناہ کی فلاسفی یہی ہے کہ وہ خدا سے جُدا ہو کر پیدا ہوتا ہے لہٰذا اُس کا دور کرنا خدا کے تعلق سے وابستہ ہے۔ پس وہ کیسے نادان لوگ ہیں جو کسی کی خودکُشی کو گناہ کا علاج کہتے ہیں۔

یہ ہنسی کی بات ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے سردرد پر رحم کرکے اپنے سر پر پتھر مار لے یا دوسرے کے بچانے کے خیال سے خودکُشی کر لے۔ میرے خیال میں ہے کہ دُنیا میں کوئی ایسا دانا نہیں ہوگا کہ ایسی خودکُشی کو انسانی ہمدردی میں خیال کر سکے۔ بیشک انسانی ہمدردی عمدہ چیز ہے اور دوسروں کے بچانے کے لیے تکالیف اُٹھانا بڑے بہادروں کا کام ہے۔ مگر کیا اُن تکلیفوں کے اُٹھانے کی یہی راہ ہے جو یسوع کی نسبت بیان کیا جاتا ہے۔ کاش اگر یسوع خودکُشی سے اپنے تئیں بچاتا اور دوسروں کے آرام کے لیے معقول طور پر عقلمندوں کی طرح تکلیفیں اٹھاتا تو اُس کی ذات سے دُنیا کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً اگر ایک غریب آدمی گھر کا محتاج ہے اور معمار لگانے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس صورت میں اگر ایک معمار اُس پر رحم کرکے اُس کا گھر بنانے میں

[۵] سورۃ الفجر آیت ۲۸ تا ۳۱۔

مشغول ہو جائے اور بغیر لینے اُجرت کے چند روز سخت مشقت اُٹھا کر اُس کا گھر بنا دیوے تو بیشک یہ معمار تعریف کے قابل ہوگا اور بیشک اُس نے ایک مسکین پر احسان بھی کیا ہے جس کا گھر بنا دیا۔ لیکن اگر وہ اُس شخص پر رحم کر کے اپنے سر پر پتھر مار لے تو اُس غریب کو اُس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ افسوس دُنیا میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جو نیکی اور رحم کرنے کے معقول طریقوں پر چلتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ یسوع نے اس خیال سے کہ میرے مرنے سے لوگ نجات پا جائیں گے درحقیقت خودکشی کی ہے تو یسوع کی حالت نہایت ہی لائق رحم ہے اور یہ واقعہ پیش کرنے کے لائق نہیں بلکہ چھپانے کے لائق ہے۔

اور اگر ہم عیسائیوں کے اس اصول کو لعنت کے مفہوم کے رو سے جانچیں جو مسیح کی نسبت تجویز کی گئی ہے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس اصول کو قائم کر کے عیسائیوں نے یسوع مسیح کی وہ بے ادبی کی ہے جو دُنیا میں کسی قوم نے اپنے رسول یا نبی کی نہیں کی ہوگی۔ کیونکہ یسوع کا لعنتی ہو جانا گو وہ تین دن کے لیے ہی سہی عیسائیوں کے عقیدہ میں داخل ہے اور اگر یسوع کو لعنتی نہ بنایا جائے تو مسیحی عقیدہ کے رُو سے کفّارہ اور قربانی وغیرہ سب باطل ہو جاتے ہیں۔ گویا اس تمام عقیدہ کا شہتیر لعنت ہی ہے۔

اور یہ باتیں جو یسوع نوع انسان کی محبت کے لیے دُنیا میں بھیجا گیا اور نوع انسان کی خاطر اُس نے اپنے تئیں قربان کیا۔ یہ تمام کارروائی عیسائیوں کے خیال میں اس شرط سے مُفید ہے کہ جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یسوع اوّل دنیا کے گناہوں کے باعث ملعون ہوا اور لعنت کی لکڑی پر لٹکایا گیا اسی لیے ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں کہ یسوع مسیح کی قربانی لعنتی قربانی ہے۔ گناہ سے لعنت آئی اور لعنت سے صلیب ہوئی اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ کیا لعنت کا مفہوم کسی راستباز کی طرف منسوب کر سکتے ہیں؟ سو واضح ہو کہ عیسائیوں نے یہ بڑی غلطی کی ہے کہ یسوع کی نسبت لعنت کا اطلاق جائز رکھا۔ گو وہ تین دن تک ہی ہو یا اس سے بھی کم۔ کیونکہ لعنت ایک ایسا مفہوم ہے جو شخص ملعون کے دل سے تعلق رکھتا ہے اور کسی شخص کو اُس وقت لعنتی کہا جاتا ہے جبکہ اس کا دل خُدا سے بالکل برگشتہ اور اُس کا دشمن ہو جائے اسی لیے لعین شیطان کا نام ہے اور اس بات کو کون نہیں جانتا کہ لعنت قُرب کے مقام سے ردّ کرنے کو کہتے ہیں اور یہ لفظ اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کا دل خُدا کی محبت اور اطاعت سے دور جا پڑے اور درحقیقت وہ خُدا کا دشمن ہو جائے۔ لفظ لعنت کے یہی معنے ہیں جس پر تمام اہل لغت نے اتفاق کیا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر درحقیقت یسوع مسیح پر لعنت پڑ گئی تھی تو اس سے لازم آتا ہے کہ درحقیقت وہ موردِ غضب الٰہی ہو گیا تھا اور خُدا کی معرفت اور اطاعت اور محبت اُس کے دل سے جاتی رہی تھی اور خُدا اُس کا دشمن اور وہ خُدا کا دشمن ہو گیا تھا۔ اور خدا اُس سے بیزار اور وہ خُدا سے بیزار ہو گیا تھا جیسا کہ لعنت کا مفہوم ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ لعنت کے دنوں میں درحقیقت

کافر اور خدا سے برگشتہ اور خدا کا دشمن اور شیطان کا حصہ اپنے اندر رکھتا تھا پس یسوع کی نسبت ایسا اعتقاد کرنا گویا نعوذ باللہ اس کو شیطان کا بھائی بنانا ہے اور میرے خیال میں ایک راستباز نبی کی نسبت ایسی بیباکی کوئی خدا ترس نہیں کرے گا بجز اُس شخص کے جو خبیث طبع اور ناپاک طبع ہو۔

پس جبکہ یہ بات باطل ہوئی کہ حقیقی طور پر یسوع مسیح کا دل موردِ لعنت ہو گیا تھا پس ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ایسی لعنتی قربانی بھی باطل اور فقط ان لوگوں کا اپنا منصوبہ ہے اگر نجات اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اول یسوع کو شیطان اور خدا سے برگشتہ اور خدا سے بیزار ٹھہرایا جائے تو لعنت ہے ایسی نجات پر!! اس سے بہتر تھا کہ عیسائی اپنے لیے دوزخ قبول کر لیتے لیکن خدا کے ایک مقرب کو شیطان کا لقب نہ دیتے۔ افسوس کہ ان لوگوں نے کیسی بیہودہ اور ناپاک باتوں پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ ایک طرف تو خدا کا بیٹا اور خدا سے نکلا ہوا اور خدا سے ملا ہوا فرض کرتے ہیں اور دوسری طرف شیطان کا لقب اُس کو دیتے ہیں کیونکہ لعنت شیطان سے مخصوص ہے اور لعین شیطان کا نام ہے اور لعنتی وہ ہوتا ہے جو شیطان سے نکلا اور شیطان سے ملا ہوا اور خود شیطان ہے پس عیسائیوں کے عقیدہ کے رُو سے یسوع میں دو قسم کی تثلیث پائی گئی۔ ایک رحمانی اور ایک شیطانی اور نعوذ باللہ یسوع نے شیطان میں ہو کر شیطان کے ساتھ اپنا وجود ملایا اور لعنت کے ذریعہ سے شیطانی خواص اپنے اندر لیے یعنی یہ کہ خدا کا نافرمان ہوا۔ خدا سے بیزار ہوا۔ خدا کا دشمن ہوا۔ اب میاں سراج الدین آپ انصافاً فرماویں کہ کیا یہ شان جو مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی روحانی یا معقولی پاکیزگی اپنے اندر رکھتا ہے؟ کیا دُنیا میں اس سے بدتر کوئی اور عقیدہ بھی ہو گا کہ ایک راستباز کو اپنی نجات کے لیے خدا کا دشمن اور خدا کا نافرمان اور شیطان قرار دیا جائے؟ خدا کو جو قادر مطلق اور رحیم و کریم تھا۔ لعنتی قربانی کی کیا ضرورت پڑی؟ (سراج دین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۵)

خدا ایک کے گناہ کے لیے دوسرے کو ہلاک نہیں کرتا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم ص۱۲۶)

اور یہ خیال کہ تناسخ کے طور پر حضرت مسیح بن مریم دُنیا میں آئیں گے سب سے زیادہ ردّی اور شرم کے لائق ہے تناسخ کے ماننے والے تو ایسے شخص کا دُنیا میں دوبارہ آنا تجویز کرتے ہیں جس کے تزکیہ نفس میں کچھ کسر رہ گئی ہو لیکن جو لوگ کُلی مراحل کمالات طے کر کے اس دُنیا سے سفر کرتے ہیں وہ بزعم اُن کے ایک مدت دراز کے لیے مکتی خانہ میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ماسوائے اس کے ہمارے عقیدہ کے موافق خدائے تعالیٰ کا بہشتیوں کے لیے یہ وعدہ ہے کہ وہ کبھی اُس سے نکالے نہیں جائیں گے پھر تعجب کہ ہمارے علماء کیوں حضرت مسیح کو اُس فردوس بریں سے نکالنا چاہتے ہیں آپ ہی یہ قصے سناتے ہیں کہ حضرت ادریس جب فرشتہ ملک الموت سے اجازت لیکر بہشت میں داخل ہوئے تو ملک الموت نے چاہا کہ پھر باہر آویں لیکن حضرت ادریس نے باہر آنے سے انکار کیا اور یہ آیت سنادی وَمَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ[1] اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا حضرت مسیح اس آیت سے فائدہ حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں کیا یہ آیت اُن کے حق میں منسوخ کا حکم رکھتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس لیے اس تنزل کی حالت میں بھیجے جائیں گے کہ بعض لوگوں نے انہیں ناحق خدا بنایا تھا تو یہ اُن کا قصور نہیں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ص۸۷-۸۸-۸۹ طبع اول)

---

[1] الحجر آیت ۴۹

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخم کاری سے مجروح ہوئے تو صہیب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے اُن کے پاس گئے کہ ہائے میرے بھائی ہائے میرے دوست۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے صہیب مجھ پر تو روتا ہے کیا تجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میت پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب حال حدیث پیش کرنیکا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سُنایا تو انہوں نے کہا کہ خدا عمرؓ پر رحم کرے۔ بخدا کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیان نہیں فرمایا کہ مومن پر اُس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے اور فرمایا کہ تمہارے لیے قرآن کافی ہے اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے باوجود محدود علم کے فقط اس لیے قسم کھائی کہ اگر اس حدیث کے ایسے معنی کیے جائیں کہ خواہ ہر ایک میت اُس کے اہل کے رونے سے معذب ہوتی ہے تو یہ حدیث قرآن کے مخالف اور معارض ٹھہرے گی اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ قبول کے لائق نہیں۔ (الحق بحث لدھیانہ صـ۱۰۹)

قرآن شریف پر حدیث کو قاضی بنانا سخت غلطی ہے اور قرآن شریف کی بے ادبی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بڑھیا نے حدیث پیش کی تو انہوں نے یہی کہا کہ میں ایک بوڑھیا کے لیے قرآن شریف نہیں چھوڑ سکتا ایسا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کسی نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے ماتم کرنے سے مُردہ کو تکلیف ہوتی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ قرآن میں تو آیا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ پس قرآن پر حدیث کو قاضی .... بنانے میں اہل حدیث نے سخت غلطی کھائی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ صـ۳ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء)

میں یہ تعلیم کبھی دینا نہیں چاہتا اور نہ اسلام نے دی کہ تم اپنے گناہوں کی گٹھڑی کسی دوسرے کی گردن پر لاد دو اور خود اباحت کی زندگی بسر کرنے لگو۔ قرآن شریف نے صاف فیصلہ کر دیا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا اور نہ دنیا میں اُس کی کوئی نظیر خدا تعالیٰ کے عام قانون قدرت میں ملتی ہے کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ زید مثلاً سنکھیا کھا لیوے اور اُسی سنکھیا کا اثر بکر پر ہو جاوے اور وہ مر جاوے۔ یا ایک مریض ہو اور وہ دوسرے آدمی کے دوا کھا لینے سے اچھا ہو جاوے بلکہ ہر ایک بجائے خود متاثر ہوگا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص ساری عمر گناہ کرتا رہے اور دلیری کے ساتھ خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا رہے اور لکھ دے کہ میرے گناہوں کا بوجھ دوسرے شخص کی گردن پر ہے جو شخص ایسی امید کرتا ہے وہ

دماغ بیہدہ پخت وخیال باطل بست

کا مصداق ہے۔

پس اسلام کسی سہارے پر رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ سہارے پر رکھنے سے ابطالِ اعمال لازم آجاتا ہے لیکن

جب انسان سہارے کے بغیر زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اس وقت اس کو اعمال کی ضرورت پڑتی ہے اور کچھ کرنا پڑتا ہے اسی لیے قرآن شریف نے فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ فلاح وہی پاتا ہے جو اپنا تزکیہ کرتا ہے۔ خود اگر انسان ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو بات نہیں بنتی۔

(الحکم جلد ۷ ۹ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صـ۲)

یہ کہنا کہ انسانی رنج و محن حوا کے سیب کھانے کی وجہ سے ہیں اسلام کا یہ عقیدہ نہیں ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ زید کے بدلے بکر کو سزا نہیں مل سکتی اور نہ ہی اُس سے کچھ فائدہ متصور ہے حوا کی سیب خوری ان مشکلات اور رنج و سزا کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کے وجوہات قرآن نے کچھ اور ہی بیان فرمائے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۶ مورخہ ۲ رجون ۱۹۰۸ء صـ)



تفسیر

سُورۃ الاعراف

بیان فرمودہ

حضرت سیدنا مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

۴ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ۝

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ کیسے فیصلہ کرنے والی آیت ہے جس سے صریح اور صاف طور پر صاف ثابت ہوتا ہے کہ اول توجہ مومن کی قرآن کریم کی طرف ہونی چاہیئے پھر اگر اس توجہ کے بعد کسی حدیث یا قول من دونہٖ میں دخل دیکھے تو اس سے منہ پھیر لیوے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۳۹-۴۰)

۹ وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ اس دن اعمال تولے جائیں گے۔ (ست بچن صفحہ ۹۱)

۱۳ قَالَ مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۝

شیطان نے جو تکبر کیا تو اس کی یہ بنا تھی جو وہ اپنے تئیں نجیب الخلقت سمجھتا تھا اور خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ کا دم مار کر حضرت صفی اللہ پر خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ کی نکتہ چینی کرتا تھا...... (آئینہ کمالات اسلام ص۵۹۹)

یاد رکھو تکبر شیطان سے آتا ہے اور شیطان بنا دیتا ہے۔ جب تک انسان اس سے دور نہ ہو یہ قبول حق اور فیضانِ الوہیت کی راہ میں روک ہو جاتا ہے۔ کسی طرح سے بھی تکبر نہیں کرنا چاہیئے نہ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے نہ وجاہت کے لحاظ سے نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے۔ کیونکہ زیادہ تر انہیں باتوں سے یہ تکبر پیدا ہوتا ہے اور جب تک انسان ان گھمنڈوں سے اپنے آپ کو پاک صاف نہ کرے گا اس وقت تک وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک برگزیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ معرفت جو جذبات کے مواد ردّیہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ شیطان کا حصہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ شیطان نے بھی تکبر کیا تھا اور آدم سے اپنے آپکو بہتر سمجھا اور کہہ دیا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خدا تعالیٰ کے حضور سے مردود ہو گیا اور آدم لغزش پر (چونکہ اسے معرفت دی گئی تھی) اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے لگا اور خدا تعالےٰ کے فضل کا وارث ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[۵۲] یہی وہ سِرّ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کہ اے نیک استاد۔ تو انہوں نے کہا کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ اس پر آجکل کے نادان عیسائی تو یہ کہتے ہیں کہ ان کا مطلب اس فقرہ سے یہ تھا کہ تو مجھے خدا کیوں نہیں کہتا۔ حالانکہ حضرت مسیح نے بہت ہی لطیف بات کہی تھی جو انبیاء علیہم السلام کی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ حقیقی نیکی تو خدا تعالےٰ ہی سے آتی ہے۔ وہی اس کا چشمہ ہے اور وہیں سے وہ اُترتی ہے۔ وہ جس کو چاہے عطا کرے اور جب چاہے سلب کر لے مگر ان نادانوں نے ایک عمدہ اور قابل قدر بات کو معیوب بنا دیا اور حضرت عیسیٰ کو متکبر ثابت کیا!!! حالانکہ وہ ایک منکسر المزاج انسان تھے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

توریت میں ممالک مغربیہ کی بعض قوموں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے اور ان کا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ٹھہرایا ہے۔ قرآن شریف نے اس قوم کے لیے ایک نشانی یہ لکھی ہے کہ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ[۵۱] یعنی ہر ایک فوقیت ارضی ان کو حاصل ہو جائے گی اور ہر ایک قوم پر وہ فتحیاب ہو جائیں گے۔ دوسرے اس نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ آگ کے کاموں میں ماہر ہونگے یعنی آگ کے ذریعہ سے ان کی لڑائیاں ہوں گی اور آگ کے ذریعہ سے اُن کے انجن چلیں گے اور آگ سے کام لینے میں وہ بڑی مہارت رکھیں گے۔ اسی وجہ سے اُن کا نام یاجوج ماجوج ہے کیونکہ اجیج آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں اور شیطان کے وجود کی بناوٹ بھی آگ سے ہے جیسا کہ آیت خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ سے ظاہر ہے۔ اس لیے قوم یاجوج ماجوج سے اس کو ایک فطرتی مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے یہی قوم اس کے

[۵۱] سورۃ انبیاء آیت ۹۷ ؛ [۵۲] الاعراف آیت ۲۴

اسمِ اعظم کی تجلی کے لیے اور اس کا مظہرِ اتم بننے کے لیے موزوں ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

تکبر ایسی بلا ہے کہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یاد رکھو تکبر شیطان سے آتا ہے اور تکبر کرنے والے کو شیطان بنا دیتا ہے۔ جب تک انسان اس راہ سے قطعاً دُور نہ ہو۔ قبولِ حق و فیضانِ الوہیّت ہرگز پا نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ تکبر اس کی راہ میں روک ہو جاتا ہے پس کسی طرح سے بھی تکبر نہیں کرنا چاہیئے۔ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے نہ وجاہت کے لحاظ سے نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے۔ کیونکہ زیادہ تر تکبر انہیں باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو ان گھمنڈوں سے پاک و صاف نہ کرے گا اس وقت تک وہ اللہ جلشانہ کے نزدیک پسندیدہ و برگزیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ معرفتِ الٰہی جو جذباتِ نفسانی کے موادِ ردّیہ کو جلا دیتی ہے اُس کو عطا نہیں ہوتی کیونکہ یہ گھمنڈ شیطان کا حصہ ہے اس کو اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا۔ شیطان نے بھی یہی گھمنڈ کیا اور اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا اور کہہ دیا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ[۲۳] (میں اس سے اچھا ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اُسکو مٹی سے) نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ بارگاہِ الٰہی سے مردود ہو گیا۔ اس لیے ہر ایک کو اس سے بچنا چاہیئے۔ جب تک انسان کو کامل معرفتِ الٰہی حاصل نہ ہو وہ لغزش کھاتا ہے اور اس سے متنبہ نہیں ہوتا مگر معرفتِ الٰہی جس کو حاصل ہو جائے اگرچہ اُس سے کوئی لغزش ہو بھی جاوے تب بھی اللہ تعالےٰ اُس کی محافظت کرتا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے اپنی لغزش پر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا اور سمجھ لیا کہ سوائے فضلِ الٰہی کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دعا کر کے وہ اللہ تعالےٰ کے فضل کا وارث ہُوا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[۹] (اے رب ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تیری حفاظت ہمیں نہ بچاوے اور تیرا رحم ہماری دستگیری نہ کرے تو ہم ضرور ٹوٹے والوں میں سے ہو جاویں) (تقریر جلسہ سالانہ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۹، ۲۰)

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ○

قرآن شریف اس شخص کو جس کا نام حدیثوں میں دجّال ہے شیطان قرار دیتا ہے جیسا کہ وہ شیطان کی طرف سے حکایت کر کے فرماتا ہے قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ○ یعنی شیطان نے جنابِ الٰہی میں عرض کی کہ میں اس وقت تک ہلاک نہ کیا جاؤں جب تک کہ وہ مُردے جن کے دل مر گئے ہیں دوبارہ زندہ ہوں خدا نے کہا کہ میں نے تجھے اُس وقت تک مہلت دی۔ سو وہ دجّال جس کا حدیثوں میں ذکر ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخر زمانہ میں قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ دانیال نے بھی یہی لکھا ہے اور بعض حدیثیں بھی یہی کہتی ہیں اور چونکہ مظہر اتم شیطان کا نصرانیت ہے۔ اس لیے سورۃ فاتحہ میں دجّال کا تو کہیں ذکر نہیں مگر نصاریٰ کے شر سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اگر دجال کوئی الگ مفسد ہوتا تو قرآن شریف میں بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ولا الضالّین

۱؎ الاعراف آیت ۲۴۔

یہ فرمانا چاہیے تھا کہ ولا اللہ تجلّ اور آیت اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ سے مراد جسمانی بعث نہیں کیونکہ شیطان صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ بنی آدم زندہ ہیں۔ ہاں شیطان اپنے طور سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بذریعہ اپنے مظاہر کے کرتا ہے۔ سو وہ مظاہر یہی انسان کو خدا بنانے والے ہیں اور چونکہ وہ گروہ ہے اِس لیے اس کا نام دجّال رکھا گیا ہے کیونکہ عربی زبان میں دجال گروہ کو بھی کہتے ہیں اور اگر دجّال کو نصرانیت کے گمراہ واعظوں سے الگ سمجھا جائے تو ایک محذور لازم آتا ہے وہ یہ کہ جن حدیثوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ آخری دنوں میں دجّال تمام زمین پر محیط ہوجائیگا۔ انہیں حدیثوں سے یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ آخری دنوں میں کلیسیا کی طاقت تمام مذاہب پر غالب آجائے گی۔ پس یہ تناقض بجز اس کے کیونکر دور ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص ۳۸ و ۳۹)

۲۴ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۝

بہت لوگ ہیں کہ خدا پر شکوہ کرتے ہیں اور اپنے نفس کو نہیں دیکھتے۔ انسان کے اپنے نفس کے ہی ظلم ہوتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ رحیم اور کریم ہے۔ بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کو گناہ کی خبر ہوتی ہے اور بعض ایسے کہ اُن کو گناہ کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے استغفار کا التزام کرایا ہے کہ انسان ہر ایک گناہ کے لیے خواہ وہ ظاہر کا ہو خواہ باطن کا۔ خواہ اسے علم ہو یا نہ ہو اور ہاتھ اور پاؤں اور زبان اور ناک اور کان اور آنکھ اور سب قسم کے گناہوں سے استغفار کرتا رہے۔ آجکل آدم علیہ السلام کی دعا پڑھنی چاہیئے۔ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۝ یہ دعا اوّل ہی قبول ہوچکی ہے۔ (البدر جلد ۱ ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۶)

دعا ایسی شے ہے کہ جب آدم کا شیطان سے جنگ ہوا تو اس وقت سوائے دعا کے اور کوئی حربہ کام نہ آیا۔ آخر شیطان پر آدمؑ نے فتح بذریعہ دعا پائی۔ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۝

(بدر جلد ۲ ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

ہمارا اعتقاد ہے کہ جس طرح ابتدا میں دعا کے ذریعہ سے شیطان کو آدم کے ذریعہ زیر کیا تھا اسی طرح اب آخری زمانہ میں بھی دعا ہی کے ذریعہ سے غلبہ اور تسلّط عطا کرے گا نہ تلوار سے...... آدم اوّل کو شیطان پر فتح دعا ہی سے ہوئی تھی رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا.... الخ اور آدم ثانی کو بھی جو آخری زمانہ میں شیطان سے آخری جنگ کرنا ہے۔ اسی طرح دعا ہی کے ذریعہ فتح ہوگی۔ (الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اگر خدا پر تمہارا کامل ایمان ہو تو پھر تو تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ؎ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔

اور اس ایمان والے کے شیطان قریب بھی نہیں آتا وہ بھی تو وہاں ہی آجاتا ہے جہاں اس کو تھوڑی سی بھی گنجائش مل جاتی ہے جب خدا کو مقدم رکھا جاتا ہے تو برکات کا نزول ہوتا ہے...... یہ باتیں اور کامل ایمان حاصل ہوتا ہے تو بہ استغفار سے اس کی کثرت کرو اور رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ پڑھا کرو اور اس کی کثرت کرو۔ (الحکم ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱ و البدر ۲۴ نومبر یکم دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۲۵ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

"تمہارے قرار کی جگہ زمین ہی رہے گی پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسٰی کی قرارگاہ صدہا برس سے آسمان پر ہو۔"

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۳۳ حاشیہ)

یعنی تمہارا قرارگاہ زمین ہی رہے گی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳)

۲۶ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝

قرآن شریف صاف اور صریح لفظوں میں فرماتا ہے کہ کوئی انسان بجز زمین کے کسی اور جگہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ یعنی تم زمین میں ہی زندہ رہو گے اور زمین میں ہی مرو گے اور زمین سے ہی نکالے جاؤ گے۔ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ "نہیں اس زمین اور کرہ ہوا سے باہر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ اب تک جو قریباً اُنیسویں صدی گزر رہی ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں۔" حالانکہ زمین پر جو قرآن کے رُو سے انسانوں کے زندہ رہنے کی جگہ ہے باوجود زندگی کے قائم رکھنے کے سامانوں کے کوئی شخص اُنیس سو برس تک ابتداء سے آج تک کبھی زندہ نہیں رہا تو پھر آسمان پر اُنیس سو برس تک زندگی بسر کرنا باوجود اس امر کے کہ قرآن کے رُو سے ایک قدر قلیل بھی بغیر زمین کے انسان زندگی بسر نہیں کر سکتا کس قدر خلاف نصوص صریح قرآن ہے جس پر ہمارے مخالف ناحق اصرار کر رہے ہیں (کتاب البریہ صفحہ ۱۸۹-۱۹۰ حاشیہ)

اگر حضرت ادریس مع جسم عنصری آسمان پر گئے ہوتے تو بموجب نص صریح آیت فِيْهَا تَحْيَوْنَ جیسا کہ حضرت مسیح کا آسمانوں پر سکونت اختیار کر لینا ممتنع تھا ایسا ہی ان کا بھی آسمان پر ٹھہرنا ممتنع ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ اس آیت میں قطعی فیصلہ دے چکا ہے کہ کوئی شخص آسمان پر زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ تمام انسانوں کے لیے زندہ رہنے کی جگہ زمین ہے۔

علاوہ اس کے اس آیت کے دوسرے فقرہ میں جو فِیْھَا تَمُوْتُوْنَ ہے یعنی زمین پر ہی مرو گے صاف فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک شخص کی موت زمین پر ہوگی پس اس سے ہمارے مخالفوں کو یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم آیا کہ کسی وقت حضرت ادریس بھی آسمان پر سے نازل ہونگے۔ حالانکہ دنیا میں کسی کا عقیدہ نہیں اور طرفہ یہ کہ زمین پر حضرت ادریس کی قبر بھی موجود ہے جیسا کہ حضرت عیسٰی کی قبر موجود ہے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۰۳-۲۰۴ حاشیہ)

اَتَکْفُرُ بِالْقُرْاٰنِ اَوْنَسِیْتَ یَوْمَ الْمُجَازَاتِ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ فَکَیْفَ عَاشَ عِیْسٰی اِلَی الْاَلْفَیْنِ فِی السَّمَآءِ مَالَکُمْ لَا تُفَکِّرُوْنَ۔[1] (الھدی والتبصرۃ لمن یرٰی صفحہ ۱۱۳)

اگر وہ (حضرت عیسٰی علیہ السلام ناقل) مع جسم عنصری آسمان پر ہیں اور بموجب تصریح اس آیت کے قیامت کے دن تک زمین پر نہیں اُتریں گے تو کیا وہ آسمان پر ہی مریں گے اور آسمان میں ہی ان کی قبر ہوگی لیکن آسمان پر مرنا آیت فِیْھَا تَمُوْتُوْنَ کے برخلاف ہے پس اس سے تو یہی ثابت ہُوا کہ وہ آسمان پر مع جسم عنصری نہیں گئے بلکہ مر کر گئے۔ اور جس حالت میں کتاب اللہ نے کمال تصریح سے یہ فیصلہ کر دیا تو پھر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا اگر معصیت نہیں تو اور کیا ہے۔ (الوصیت صفحہ ۱۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْھَا تُخْرَجُوْنَ یعنی تم زمین پر ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے اور زمین سے ہی نکالے جاؤ گے پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک شخص صدہا برس تک آسمان پر زندگی بسر کرے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۳۳ حاشیہ)

خدا تعالےٰ اس سے پاک ہے کہ وعدہ کے برخلاف کسی بشر کو آسمان پر چڑھاوے حالانکہ وہ وعدہ کر چکا ہے کہ تمام بشر زمین پر ہی اپنی زندگی بسر کریں گے لیکن حضرت مسیح کو خدا نے آسمان پر مع جسم چڑھا دیا اور اس وعدہ کا کچھ پاس نہ کیا جیسا کہ فرمایا تھا:۔ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْھَا تُخْرَجُوْنَ۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۳)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کافروں نے قسمیں کھا کر بار بار سوال کیا کہ آپ مع جسم عنصری آسمان پر چڑھ کر دکھلائیے ہم ابھی ایمان لائیں گے۔ ان کو جواب دیا گیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا[2] یعنی ان کو کہدے کہ میرا خدا عہد شکنی سے پاک ہے اور بموجب اس قول کے مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جا سکتا کیونکہ یہ امر خدا کے وعدہ کے برخلاف ہے وجہ یہ کہ وہ فرماتا ہے کہ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ (چشمہ مسیحی حاشیہ صفحہ ۲)

---

[1] ترجمہ: کیا تم قرآن کریم کا انکار کرتے ہو یا جزا سزا کے دن کو بھول گئے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ (کہ تم زمین پر ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے۔) پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان پر دو ہزار سال سے کیسے زندہ ہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سوچتے نہیں۔ [2] بنی اسرائیل آیت ۹۴

ایک اور دلیل حضرت عیسٰی کی وفات پر قرآن شریف کی یہ آیت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیۡہَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡہَا تَمُوۡتُوۡنَ وَ مِنۡہَا تُخۡرَجُوۡنَ۔ (ترجمہ) تم (اے بنی آدم) زمین میں ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین میں ہی مرو گے اور زمین میں سے ہی نکالے جاؤ گے۔ پس باوجود اس قدر نص صریح کے کیونکر ممکن ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بجائے زمین پر رہنے کے قریباً دو ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ کسی نامعلوم مدت تک آسمان پر رہیں۔ ایسی صورت میں تو قرآن شریف کا ابطال لازم آتا ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲۱۸)

قرآن شریف میں کئی جگہ صاف فرما دیا ہے کہ کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جائے گا بلکہ تمام زندگی زمین پر بسر کریں گے یہ خدا کا وعدہ ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے فِیۡہَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡہَا تَمُوۡتُوۡنَ وَ مِنۡہَا تُخۡرَجُوۡنَ یعنی زمین پر ہی تم زندہ رہو گے اور زمین پر ہی تم مرو گے اور زمین میں سے ہی تم نکالے جاؤ گے۔ پس اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کا مع جسم عنصری آسمان پر جانا اس وعدہ کے برخلاف ہے اور خدا پر تخلف وعدہ جائز نہیں اور اس وعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ (چشمہ معرفت ص۲۱۹)

اللہ جل شانہ کا قرآن شریف میں فرمانا فِیۡہَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡہَا تَمُوۡتُوۡنَ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کرۂ زمین کے سوا دوسری جگہ نہ زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نام مسیح یعنی بہت سیاح ہونا بھی ان کی موت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سیاحت زمین کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ صلیب سے نجات پاکر زمین پر ہی رہے ہوں ورنہ بجز اس زمانہ کے جو صلیب سے نجات پاکر ملکوں کا سیر کیا ہو اور کوئی زمانہ سیاحت ثابت نہیں ہو سکتا۔ صلیب کے زمانہ تک نبوت کا زمانہ صرف ساڑھے تین برس تھے یہ زمانہ تبلیغ کے لیے بھی تھوڑا تھا چہ جائیکہ اس میں تمام ملک کی سیاحت کرتے ایسا ہی مرہم عیسٰی جو قریباً طب کی ہزار کتاب میں لکھی ہے ثابت کرتی ہے کہ صلیب کے واقعہ کے وقت حضرت عیسٰی آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے بلکہ اپنے زخموں کا اس مرہم کے ساتھ علاج کراتے رہے اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ زمین پر ہی رہے اور زمین پر ہی فوت ہوئے۔ (ایام الصلح ص۴۲)

آدم جس بہشت سے نکالا گیا تھا وہ زمین پر ہی تھا بلکہ توریت میں اس کی حدود بھی بیان کیے گئے ہیں نصوص قرآنیہ سے یہی ثابت ہے کہ انسان کے رہنے اور مرنے کے واسطے یہی زمین ہے جو شخص اس کے برخلاف کچھ مذہب رکھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے کلام کی بے ادبی کرتا ہے۔ (بدر جلد ۶ ص۸ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۷ء ص۵)

درحقیقت حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام بر طبق آیت فِیۡہَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡہَا تَمُوۡتُوۡنَ زمین پر ہی اپنی جسمانی زندگی کے دن بسر کر کے فوت ہو چکے ہیں اور قرآن کریم کی سولہ آیتوں اور بہت سی حدیثوں بخاری اور مسلم اور دیگر صحاح سے ثابت ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر آباد ہونے اور بسنے کے لیے دنیا میں بھیجے نہیں جاتے اور نہ حقیقی اور واقعی طور پر دو موتیں کسی پر واقع ہوتی ہیں اور نہ قرآن کریم میں واپس آنے والوں کے لیے کوئی قانون وراثت موجود ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۹۱۵)

وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ خَصَّصَ حَیَاۃَ النَّاسِ بِالۡاَرۡضِ کَمَا خَصَّصَ مَوۡتَهُمۡ بِالثَّرٰی۔ اَتَتۡرُکُوۡنَ کَلَامَ اللّٰهِ وَ شَهَادَۃَ نَبِیِّهٖ وَتَتَّبِعُوۡنَ اَقۡوَالًا اُخۡرٰی بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا۔ اَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ اَعۡثَرَنِیَ اللّٰهُ عَلٰی هٰذَا السِّرِّ وَعَلَّمَنِیۡ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا وَاَرۡسَلَنِیۡ اِلَیۡکُمۡ حَکَمًا عَدۡلًا لِاَکۡشِفَ عَلَیۡکُمۡ مَا کَانَ عَلَیۡکُمۡ مُسۡتَتِرًا۔ فَلَا تُمَارُوۡا وَلَا تُجَادِلُوۡا۔[1] (آئینہ کمالات اسلام ص۴۳۴)

زمین پر ہی تم زندگی بسر کرو گے۔ اب دیکھو اگر کوئی آسمان پر جا کر بھی کچھ حصہ زندگی کا بسر کرتا ہے تو اس سے اس آیت کی تکذیب لازم آتی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۳)

اگر مان لیا جائے کہ حضرت مسیح زندہ بجسم عنصری آسمان پر تشریف لے گئے۔ تو پھر آیت فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کیونکر صحیح ٹھہر سکتی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ حضرت مسیح کی وفات کے بعد عیسائی بگڑ گئے۔ جب تک کہ وہ زندہ تھے عیسائی نہیں بگڑے اور پھر اس آیت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ وَفِیۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ کہ زمین پر ہی تم زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے۔ کیا وہ شخص جو اٹھارہ سو برس سے آسمان پر بقول مخالفین زندگی بسر کر رہا ہے وہ انسانوں کی قسم میں سے نہیں ہے اگر مسیح انسان ہے تو نعوذ باللہ مسیح کے اس مدت دراز تک آسمان پر ٹھہرنے سے یہ آیت جھوٹی ٹھہرتی ہے اور اگر ہمارے مخالفوں کے نزدیک انسان نہیں ہے بلکہ خدا ہے تو ایسے عقیدہ سے وہ خود مسلمان نہیں ٹھہر سکتے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۲۶)

بعض نادان کہتے ہیں کہ یہ بھی تو عقیدہ اہل اسلام کا ہے کہ الیاس اور خضر زمین پر زندہ موجود ہیں اور ادریس آسمان پر مگر اُن کو معلوم نہیں کہ علمائے محققین ان کو زندہ نہیں سمجھتے کیونکہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ آج سے ایک سو برس کے گزرنے پر زمین پر کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ پس جو شخص خضر اور الیاس کو زندہ جانتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکذّب ہے اور ادریس کو اگر آسمان پر زندہ مانیں تو پھر ماننا پڑیگا کہ وہ آسمان پر ہی مریں گے کیونکہ اُن کا دوبارہ زمین پر آنا نصوص سے ثابت نہیں اور آسمان پر مرنا آیت فِیۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ کے منافی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۸ حاشیہ)

---

[1] (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ (کہ تم اسی زمین میں زندہ رہو گے) پس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی زندگی کو زمین سے مخصوص فرمایا ہے جس طرح اُن کی موت کو مٹی سے خاص کر دیا۔ اے لوگو کیا تم اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے نبیؐ کی شہادت کو چھوڑ کر دوسری باتوں کی اتباع کرتے ہو۔ ظالموں کا بدلہ نہایت ہی بُرا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس راز سے آگاہ فرمایا ہے اور مجھے وہ کچھ سکھایا ہے جس کا تم کو علم نہیں اور مجھے تمہاری طرف حکم و عدل بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم پر وہ باتیں کھولوں جو پہلے تم پر پوشیدہ تھیں پس شک نہ کرو اور نہ جھگڑا کرو۔ ۵؎ المائدہ آیت ۱۱۸

قرآن شریف کی آیت فِيهَا تَحْيَوْنَ سے موت ثابت ہوئی اور پھر قرآن شریف کی آیت وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ سے موت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ آسمان پر جسمانی زندگی اور قرارگاہ کسی انسان کا نہیں ہو سکتا۔ (ایام الصلح ص۱۳۹)

اِعْلَمْ أَنَّ وَفَاةَ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ ثَابِتٌ بِالنُّصُوصِ الْقَطْعِيَّةِ الْيَقِينِيَّةِ وَإِنْ تَطْلُبِ الثُّبُوتَ مِنَ الْقُرْآنِ فَتَجِدُ فِيهِ آيَةَ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَآيَةَ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي وَآيَةَ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ وَآيَةَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَآيَةَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَهٰذِهِ الْآيَةُ الْأَخِيرَةُ تَدُلُّ بِمَنْطُوقِهَا عَلَى أَنَّ بَنِي آدَمَ يَحْيَوْنَ فِي الْأَرْضِ خَاصَّةً وَلَا يَصْعَدُونَ إِلَى السَّمَاءِ بِجِسْمِهِمُ الْعُنْصُرِيِّ لِأَنَّ لَفْظَ فِيهَا الَّذِي هُوَ مُقَدَّمٌ عَلَى لَفْظِ تَحْيَوْنَ يُوجِبُ تَخْصِيصَ الْحَيَاةِ بِالْأَرْضِ وَيُقَيِّدُهَا وَفِيهِ رَدٌّ عَلَى الَّذِينَ يَقُولُونَ لِمَ لَا يَجُوزُ أَنْ يُرْفَعَ أَحَدٌ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ إِلَى السَّمَاءِ وَيَحْيَى فِيهَا إِلَى مُدَّةٍ أَرَادَهَا اللّٰهُ وَالْعَجَبُ مِنْهُمْ أَنَّهُمْ يَفْتَرُونَ عَلَيْنَا وَيَحْسَبُونَ هٰذَا أَنَّا تَرَكْنَا النُّصُوصَ الْقُرْآنِيَّةَ فِي رَفْعِ الْمَسِيحِ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ فَلْيَتَدَبَّرِ الْعَاقِلُ هٰهُنَا أَنَحْنُ تَرَكْنَا الْقُرْآنَ وَنُصُوصَهُ فِي هٰذِهِ الْعَقِيدَةِ أَمْ هُمْ كَانُوا تَارِكِينَ۔ وَقَالُوا إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ وَيَحْتَجُّونَ بِهٰذِهِ

(ترجمہ) واضح رہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نصوص قطعیہ یقینیہ سے ثابت ہے۔ اور اگر تم اس بات کا ثبوت قرآن سے طلب کرو تو تم اس میں یہ آیات پاؤ گے یَا عِیسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ اور آیت کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ اور آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور آیت فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ۔ اس آخری آیت کا مضمون اس بات پر صریحاً دلالت کرتا ہے کہ بنی آدم خاص طور پر زمین میں ہی زندگی گزاریں گے اور (یہ کہ) وہ آسمان پر اپنے جسم عنصری کے ساتھ صعود نہیں کریں گے۔ یہ اس لیے کہ لفظ فِیْهَا جو تَحْیَوْنَ پر مقدم ہے زمین پر ہی حیات کی تخصیص کرتا اور انسانی زندگی کو زمین سے مقیّد کر دیتا ہے اور اس آیت میں ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ کیوں کسی انسان کا جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانا جائز نہیں اور (یہ کہ) وہ وہاں اس عرصہ تک زندہ رہے جب تک کہ منشاء الٰہی ہے۔ اور ان لوگوں پر تعجب ہے جو ہم پر افترا کرتے اور ہمارے متعلق گمان کرتے ہیں کہ ہم نے مسیح کے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانے سے متعلق نصوص قرآنیہ کو ترک کر دیا ہے۔ پس عقلمندوں کو اس مقام پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا ہم نے اس عقیدہ سے متعلق قرآن کریم اور اس کی نصوص کو چھوڑ دیا ہے یا ہمارے مخالفین خود ترک کرنے والے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ عزّ وجل نے فرمایا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اور وہ اس آیت سے مسیح کے جسم کے اُٹھائے جانے پر

ل آل عمران آیت ۵۶ ٭ ۲ المائدۃ آیت ۱۱۸ ٭ ۳ المائدۃ آیت ۷۶ ٭ ۴ آل عمران آیت ۱۴۵ ٭ ۵ النساء آیت ۱۵۹ ٭

الْاٰیَۃِ عَلٰی رَفْعِ جِسْمِ الْمَسِیْحِ وَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ اَنَّ الْاَمْرَ لَوْ کَانَ کَذٰلِکَ لَتَعَارَضَ الْاٰیَتَانِ اَعْنِیْ اٰیَۃَ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَاٰیَۃَ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ مُنَزَّہٌ عَنِ التَّعَارُضِ وَالتَّخَالُفِ وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔[1] فَاَشَارَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَنَّ الْاِخْتِلَافَ لَا یُوْجَدُ فِی الْقُرْاٰنِ وَھُوَ کِتَابُ اللّٰہِ وَشَانُہٗ اَرْفَعُ مِنْ ھٰذَا وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ کِتَابَ اللّٰہِ مُنَزَّہٌ عَنِ الْاِخْتِلَافَاتِ فَوَجَبَ عَلَیْنَا اَنْ لَّا نَخْتَارَ فِیْ تَفْسِیْرِہٖ طَرِیْقًا یُّوْجِبُ التَّعَارُضَ وَالتَّنَاقُضَ۔ (حمامۃ البشریٰ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۶)

"سچی اور بالکل سچی اور صاف بات یہی ہے کہ اجسام ضرور ملتے ہیں لیکن عنصری اجسام یہاں ہی رہ جاتے ہیں یہ اوپر نہیں جا سکتے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جواب میں فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان کو کہہ دے میرا رب اس سے پاک ہے جو اپنے وعدوں کے خلاف کرے جو وہ پہلے کر چکا ہے۔ میں تو صرف ایک بشر رسول ہوں۔ سبحان کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سابق جو وعدے ہو چکے ہیں ان کی خلاف ورزی وہ نہیں کرتا۔ وہ وعدہ کیا ہے؟ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ اور ایسا ہی فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتًا اور پھر فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَفِیْھَا تَمُوْتُوْنَ۔ ان سب آیتوں پر اگر یکجائی نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسم جو کھانے پینے کا محتاج ہے آسمان پر نہیں جاتا۔"

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ؕ

استدلال کرتے ہیں اور وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر بات اسی طرح ہی ہو تو (اس صورت میں) دونوں آیات میں تعارض پیدا ہو جاتا ہے یعنی آیت: بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ اور آیت: فِیْھَا تَحْیَوْنَ میں۔ اور تم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ قرآن تعارض اور تخالف سے پاک ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتا ہے: وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے) پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ قرآن میں ہرگز اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اور اس کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ جو اللہ کی کتاب ہے اس میں اختلاف پایا جائے۔ پس جبکہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ کتاب اللہ اختلافات سے پاک و منزہ ہے تو ہم پر ضروری ٹھہرا کہ اس کی تفسیر کے سلسلہ میں کوئی ایسا طریق اختیار نہ کریں جو تعارض اور تناقض پیدا کرنے کا موجب ہو۔

[1] النساء آیت ۸۳

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا۔ ہم نے تم پر لباس اُتارا۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۸۵ حاشیہ)

ثُمَّ انْظُرْ اَنَّهٗ تَعَالٰى قَالَ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا۔ وَقَالَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ۔ وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ هٰذِهِ الْاَشْيَآءَ لَا تَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ فَمَا عَزَاهَا اللّٰهُ اِلَيْهَا اِلَّا اِشَارَةً اِلٰى اَنَّ الْعِلَّةَ الْاُوْلٰى مِنَ الْعِلَلِ الَّتِيْ قَدَّرَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِخَلْقِ تِلْكَ الْاَشْيَآءِ وَتَوَلُّدِهَا وَتَكَوُّنِهَا تَاْثِيْرَاتٌ فَلَكِيَّةٌ وَّشَمْسِيَّةٌ وَّقَمَرِيَّةٌ وَّنُجُوْمِيَّةٌ وَّاَشَارَ عَزَّ وَجَلَّ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ اِلٰى اَنَّ الْاَرْضَ كَامْرَاَةٍ وَّالسَّمَآءَ كَبَعْلِهَا وَلَا يَتِمُّ فِعْلُ اَحَدِهِمَا اِلَّا بِالْاُخْرٰى فَزَوَّجَهُمَا حِكْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (حمامة البشریٰ صفحہ ۷۴)

نزول سے مراد عزّت و جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰى قرآن شریف کا لفظ ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تابمقدور کاربند ہو جائے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۰)

تقویٰ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو شریعت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر شریعت کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہیں تو

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا اور پھر فرمایا اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ[1] نیز فرمایا اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ[2] اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ یہ سب چیزیں آسمان سے نہیں اُترتیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی طرف یہ اشارہ کرنے کے لیے منسوب کیا ہے کہ ان اسباب میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کی تخلیق اور تکوین اور پیدا کرنے کے لیے مقدر فرمائے ہیں ان میں سے پہلی علت آسمان، سورج، چاند اور ستاروں کی تاثیرات ہیں اور ان آیات میں اللہ عزّ وجلّ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ زمین عورت کی مانند ہے اور آسمان اس کے خاوند کے مانند ہے ان میں سے ایک کا کام دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا پس ان دونوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمت کے تحت جوڑ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

---

[1] الحدید آیت ۲۶ [2] الزمر آیت ۷

مغز شریعت تقویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت ہیں لیکن اگر طالب صادق ہو کر ابتدائی مراتب اور مراحل کو استقلال اور خلوص سے طے کرے تو وہ اُس راستی اور طلب صدق کی وجہ سے اعلیٰ مدارج کو پالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ[1] ...... ہماری جماعت کو لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر ایک اِن میں سے تقویٰ کی راہوں پر قدم مارے تاکہ قبولیت دعا کا سرور اور حظ حاصل کرے اور زیادتی ایمان کا حصّہ لے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۳)

تقویٰ خلاصہ ہے تمام صحف مقدسہ اور توریت و انجیل کی تعلیمات کا۔ قرآن کریم نے ایک ہی لفظ میں خدا تعالیٰ کی عظیم الشان مرضی اور پوری رضا کا اظہار کر دیا ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

تقویٰ ایک تریاق ہے جو اسے استعمال کرتا ہے تمام زہروں سے نجات پاتا ہے مگر تقویٰ کامل ہونا چاہیئے تقویٰ کی کسی شاخ پر عمل پیدا ہونا ایسا ہے جیسے کسی کو بھوک لگی ہو اور وہ دانہ کھالے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کھانا اور نہ کھانا برابر ہے۔ ایسا ہی پانی کی پیاس ایک قطرہ سے نہیں بجھ سکتی۔ یہی حال تقویٰ کا ہے۔ کسی ایک شاخ پر عمل موجب ناز نہیں ہو سکتا پس تقویٰ وہی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا[2]۔ خدا تعالیٰ کی معیت بتا دیتی ہے کہ یہ متقی ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

اگر بار بار اللہ کریم کا رحم چاہتے ہو تو تقوےٰ اختیار کرو اور وہ سب باتیں جو خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہیں چھوڑ دو۔ جب تک خوفِ الٰہی کی حالت نہ ہو تب تک حقیقی تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کوشش کرو کہ متقی بن جاؤ۔ جب وہ لوگ ہلاک ہونے لگتے ہیں جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ تب وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں۔ ایسے وقت اُن کی نافرمانی انہیں ہلاک کر دیتی ہے اور اِن کا تقویٰ انہیں بچا لیتا ہے۔ انسان اپنی چالاکیوں شرارتوں اور غداریوں کے ساتھ اگر بچنا چاہے تو ہرگز نہیں بچ سکتا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

یاد رکھو کہ دعائیں منظور نہ ہوں گی جب تک تم متقی نہ ہو اور تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کی دو قسم ہیں۔ ایک علم کے متعلق دوسرا عمل کے متعلق۔ علم کے متعلق تو میں نے بیان کر دیا کہ علومِ دین نہیں آتے اور حقائق معارف نہیں کھلتے جب تک متقی نہ ہو۔ اور عمل کے متعلق یہ ہے کہ نماز۔ روزہ اور دوسری عبادات اس وقت تک ناقص رہتی ہیں جب تک متقی نہ ہو۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

٣٠ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝

---

[1] المائدۃ آیت ۲۸ [2] النحل آیت ۱۲۹

اسلام کی ظاہری اور جسمانی صورت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ وہ قوت اور شوکت اسلامی سلطنت کو حاصل نہیں اور دینی طور پر بھی وہ بات جو مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں سکھائی گئی تھی اس کا نمونہ نظر نہیں آتا ہے اندرونی طور پر اسلام کی حالت بہت ضعیف ہوگئی ہے اور بیرونی حملہ آور چاہتے ہیں کہ اسلام کو نابود کردیں ان کے نزدیک مسلمان کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہیں ان کی غرض اور ارادے یہی ہیں کہ وہ اسلام کو تباہ کردیں اور مسلمانوں کو ہلاک کردیں..... اب خدا کی کتاب کے بغیر اور اس کی تائید اور روشن نشانوں کے سوا ان کا مقابلہ ممکن نہیں اور اسی غرض کے لیے خدا تعالےٰ نے اپنے ہاتھ سے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

اس وقت اسلام جس چیز کا نام ہے اس میں فرق آگیا ہے تمام اخلاق ذمیمہ بھر گئے ہیں اور وہ اخلاص جس کا ذکر مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں ہوا ہے آسمان پر اُٹھ گیا ہے۔ خدا کے ساتھ صدق وفاداری اخلاص محبت اور خدا پر توکّل کالعدم ہو گئے ہیں اب خدا تعالےٰ نے ارادہ کیا ہے کہ پھر نئے سرے سے ان قوتوں کو زندہ کرے۔

(الحکم جلد ۸ ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

اب یہ زمانہ ہے کہ اس میں ریاکاری۔عجب۔خود بینی۔تکبر۔نخوت۔رعونت وغیرہ صفات رذیلہ تو ترقی کر گئے ہیں اور مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وغیرہ صفاتِ حسنہ جو تھے وہ آسمان پر اُٹھ گئے۔ توکّل تفویض وغیرہ سب باتیں کالعدم ہیں۔اب خدا کا ارادہ ہے کہ ان کی تخم ریزی ہو۔ (البدر جلد ۳ ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اعمال کے لیے اخلاص شرط ہے جیسا کہ فرمایا مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ یہ اخلاص ان لوگوں میں ہوتا ہے جو ابدال ہیں۔ یہ لوگ ابدال ہو جاتے ہیں اور وہ اس دنیا کے نہیں رہتے۔ان کے ہر کام میں ایک خلوص اور اہلیت ہوتی ہے...... یہ خوب یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالےٰ کے لیے ہو جاوے خدا تعالےٰ اس کا ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ ۱۷ مورخہ ۱۷ رمئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۵ و ۱۷ رجون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

(ایک شخص نے سوال کیا کہ نماز میں کھڑے ہو کر اللہ جلشانہ کا کس طرح کا نقشہ پیش نظر ہونا چاہیئے ؟ فرمایا:)
موٹی بات ہے قرآن شریف میں لکھا ہے اُدْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (پ۸) اخلاص سے خدا تعالےٰ کو یاد کرنا چاہیئے اور اس کے احسانوں کا بہت مطالعہ کرنا چاہیئے۔ چاہیئے کہ اخلاص ہو۔احسان ہو اور اس کی طرف ایسا رجوع ہو کہ بس وہی ایک رب اور حقیقی کارساز ہے۔عبادت کے اصول کا خلاصہ اصل میں یہی ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح سے کھڑا کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے اور یا یہ کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ہر قسم کی ملونی اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو جاوے اور اسی کی عظمت اور اسی کی ربوبیت کا خیال رکھے۔ ادعیہ ماثورہ اور دوسری دعائیں خدا سے بہت مانگے اور بہت توبہ و استغفار کرے اور بار بار اپنی کمزوری کا اظہار کرے تاکہ تزکیہ نفس ہو جاوے اور خدا سے سچا تعلق ہو جاوے اور اسی کی محبت میں محو ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۱۱ ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

واضح ہو کہ قرآن شریف کے رُو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اس کی اخلاقی اور روحانی حالتوں سے نہایت ہی شدید تعلقات واقع ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے کھانے پینے کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی اور روحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں اور اگر ان طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایت کے موافق کام لیا جائے تو جیسا کہ نمک کی کان میں پڑ کر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ تمام حالتیں اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں اور روحانیت پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اسی واسطے قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرونی پاکیزگی کے اغراض اور خشوع خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو بہت ملحوظ رکھا ہے اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا روح پر بہت قوی اثر ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طبعی افعال گو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری روحانی حالتوں پر ضرور ان کا اثر ہے مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کریں اور گو تکلّف سے ہی روویں مگر فی الفور ان آنسوؤں کا ایک شعلہ اُٹھ کر دل پر جا پڑتا ہے۔ تب دل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی جب ہم تکلّف سے ہنسنا شروع کریں تو دل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی روح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے مقابل پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم گردن کو اونچی کھینچ کر اور چھاتی کو اُبھار کر چلیں تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبّر اور خود بینی پیدا کرتی ہے۔ تو ان نمونوں سے پورے انکشاف کے ساتھ کھل جاتا ہے کہ بے شک جسمانی اوضاع کا روحانی حالتوں پر اثر ہے۔

ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دلی قوتوں پر ضرور اثر ہے۔ مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے۔ رفتہ رفتہ اُن کی شجاعت کی قوت کم ہو جاتی ہے یہانتک کہ نہایت دل کے کمزور ہو جاتے ہیں اور ایک خداداد اور قابلِ تعریف قوت کو کھو بیٹھتے ہیں اس کی شہادت خدا کے قانونِ قدرت سے اس طرح پر بھی ملتی ہے کہ چارپایوں میں سے جس قدر گھاس خور جانور ہیں۔ کوئی بھی ان میں سے وہ شجاعت نہیں رکھتا جو ایک گوشت خور جانور رکھتا ہے۔ پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ ہوتی ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے۔ ہاں جو لوگ دن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتاتی غذاؤں سے بہت ہی کم حصّہ رکھتے ہیں وہ بھی حلم اور انکسار کے خُلق میں کم ہو جاتے ہیں اور میانہ روش کو اختیار

کرنے والے دونوں خُلق کے وارث ہوتے ہیں اسی حکمت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَاتُسْرِفُوْا یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دوسری چیزیں بھی کھاؤ مگر کسی چیز کی حد سے زیادہ کثرت نہ کرو۔ تا اُس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے اور تا یہ کثرت مضر صحت بھی نہ ہو اور جیسا کہ جسمانی افعال اور اعمال کا روح پر اثر پڑتا ہے ایسا ہی کبھی رُوح کا اثر بھی جسم پر جا پڑتا ہے جس شخص کو کوئی غم پہنچے۔ آخر وہ چشم پُرآب ہو جاتا ہے اور جس کو خوشی ہو آخر وہ تبسّم کرتا ہے۔ جس قدر ہمارا کھانا پینا سونا جاگنا حرکت کرنا۔ آرام کرنا۔ غسل کرنا وغیرہ افعال طبعیہ ہیں یہ تمام افعال ضروری ہمارے روحانی حالات پر اثر کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی بناوٹ کا ہماری انسانیت سے بڑا تعلق ہے۔ دماغ کے ایک مقام پر چوٹ لگنے سے یک لخت حافظہ جاتا رہتا ہے اور دوسرے مقام پر چوٹ لگنے سے ہوش و حواس رخصت ہوتے ہیں۔ وباء کی ایک زہریلی ہوا کس قدر جلدی سے جسم میں اثر کر کے پھر دل میں اثر کرتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ اندرونی سلسلہ جس کے ساتھ تمام نظام اخلاق کا ہے درہم برہم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان دیوانہ سا ہو کر چند منٹ میں گذر جاتا ہے۔ غرض جسمانی صدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روح اور جسم کا ایک ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۸۴-۸۵)

مومنوں کو کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کا حکم دیا..... کُلُوْا ایک امر ہے جب مومن اس کو امر سمجھ کر بجا لاوے تو اس کا ثواب ہوگا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸- ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

گوشت دال وغیرہ سب چیزیں جو پاک ہوں بیشک کھاؤ مگر ایک طرف کی کثرت مت کرو۔ اور اسراف اور زیادہ خوری سے اپنے تئیں بچاؤ۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۹۷)

یہ خدا تعالیٰ کا اُن (عرب کے لوگوں ناقل) پر اور تمام دنیا پر احسان تھا کہ حفظان صحت کے قواعد مقرر فرمائے یہاں تک کہ یہ بھی فرما دیا کہ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَاتُسْرِفُوْا یعنی بے شک کھاؤ پیو مگر کھانے پینے میں بے جا طور پر کوئی زیادت کیفیت یا کمیّت کی مت کرو۔ (ایام الصلح صفحہ ۹۵)

(۳۴) قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝

خدا نے ظاہری اور اندرونی گناہ دونوں حرام کر دئے۔ اب میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ عمدہ تعلیم بھی انجیل

میں موجود نہیں کہ تمام عضووں کے گناہوں کا ذکر کیا ہو اور عزیمت اور خطرات میں فرق کیا ہو اور ممکن نہ تھا کہ انجیل میں یہ تعلیم ہوسکتی کیونکہ یہ تعلیم نہایت لطیف اور حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہے اور انجیل تو ایک موٹے خیالات کا مجموعہ ہے جس سے اب ہر یک محقق نفرت کرتا جاتا ہے۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۳۵)

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ [1]

(پھر اصل مضمون تقویٰ پر فرمایا) کہ

متقی بننے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ بعد اس کے کہ موٹی باتوں جیسے زنا، چوری، تلف حقوق، ریا، عجب، حقارت، بخل کے ترک میں پکا ہو تو اخلاق رذیلہ سے پرہیز کر کے ان کے مقابل اخلاق فاضلہ میں ترقی کرے لوگوں سے مروت، خوش خلقی، ہمدردی سے پیش آوے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ سچی وفا اور صدق دکھلاوے۔ خدمات کے مقام محمود تلاش کرے۔ ان باتوں سے انسان متقی کہلاتا ہے اور جو لوگ ان باتوں کے جامع ہوتے ہیں وہی اصل متقی ہوتے ہیں (یعنی اگر ایک ایک خلق فرداً فرداً کسی میں ہوں تو اسے متقی نہ کہیں گے۔ جب تک بحیثیت مجموعی اخلاق فاضلہ اس میں نہ ہوں) اور ایسے ہی شخصوں کے لیے لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہے اور اس کے بعد ان کو کیا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کا متولی ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ فرماتا ہے وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتے ہیں۔ ان کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں ان کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتے ہیں۔ ان کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے کہ جو میرے ولی کی دشمنی کرتا ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ میرے مقابلہ کے لیے تیار رہو۔ ایک جگہ فرمایا ہے کہ جب کوئی خدا کے ولی پر حملہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس پر ایسے جھپٹ کر آتا ہے جیسے ایک شیرنی سے کوئی اس کا بچہ چھینے تو وہ غضب سے جھپٹتی ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ صفحہ ۲۶ تا ۲۹ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء)

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمۡ نَصِیۡبُہُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَہُمۡ ۙ [2]

---

[1] الاعراف آیت ۳۶
[2] الاعراف آیت ۳۷

قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا پر افتراء کرنے والا سب کافروں سے بڑھ کر کافر ہے جیسا کہ فرماتا ہے کہ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ یعنی بڑے کافر دو ہی ہیں ایک خدا پر افترا کرنے والا دوسرا خدا کی کلام کی تکذیب کرنے والا۔ پس جبکہ میں نے ایک مکذب کے نزدیک خدا پر افتریٰ کیا ہے اس صورت میں نہ صرف میں کافر بلکہ بڑا کافر ہوا اور اگر میں مفتری نہیں تو بلا شبہ وہ کفر اس پر پڑے گا۔ (حقیقۃ الوحی صـ۱۶۳ طبع اول)

ظالم سے مراد اس جگہ کافر ہے اس پر قرینہ یہ ہے کہ مفتری کے مقابل پر مکذب کتاب اللہ کو ظالم ٹھہرایا ہے اور بلاشبہ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے کلام کی تکذیب کرتا ہے کافر ہے سو جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ مجھے مفتری قرار دیکر مجھے کافر ٹھہراتا ہے اس لیے میری تکفیر کی وجہ سے آپ کافر بنتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صـ۱۶۳ حاشیہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ○

ایک اور طرح آنا جانا روحوں کا قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بدکاروں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے اور پھر وہ زمین کی طرف رد کیے جاتے ہیں۔ قال اللہ تعالےٰ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ۔ (ست بچن صـ۱۶۷ حاشیہ)

تمام مومنوں اور رسولوں اور نبیوں کا مرنے کے بعد رفع روحانی ہوتا ہے اور کافر کا رفع روحانی نہیں ہوتا چنانچہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (کتاب البریہ صـ۲۰۳ حاشیہ)

کافر کے لیے حکم ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کا رفع نہیں ہوگا۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صـ۲۴۳)

یہودیوں کا ہرگز یہ اعتقاد نہیں کہ جو شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہ جاوے وہ مومن نہیں بلکہ وہ تو آج تک اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ جس کا رفع روحانی نہ ہو اور اُس کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں

وہ مومن نہیں ہوتا۔ جیساکہ قرآن شریف بھی فرماتا ہے وَلَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۸)

یہ خوب یاد رہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر روح بلاجسم ہرگز نہیں مانتے ہم مانتے ہیں کہ وہ وہاں جسم ہی کے ساتھ ہیں۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ یہ لوگ جسم عنصری کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ جسم وہی ہے جو دوسرے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ دوزخیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاویں گے اور مومنوں کے لیے فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔ اب ان آیات میں لَهُمْ کا لفظ اجسام کو چاہتا ہے تو کیا یہ سب کے سب پھر اس جسم عنصری کے ساتھ جاتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں جسم تو ہوتے ہیں مگر وہ جسم ہیں جو مرنے کے بعد دیئے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

مسلمانوں اور یہود کا متفقہ اور مسلّم اعتقاد اس پر ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا بعد وفات رفع روحانی ہُوا کرتا ہے اور یہی قابلِ بڑائی بات ہے۔ رفع جسمانی کے یہ نہ قائل ہیں اور نہ کوئی فضیلت اس میں مدّنظر ہے۔ چنانچہ قرآن شریف بھی اسی اصول کو یوں بیان فرماتا ہے کہ مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یعنی جو خدا کے نزدیک متقی اور برگزیدہ انسان ہوتے ہیں خدا ان کے لیے آسمانی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اور ان کا رفع رُوحانی بعد الموت کیا جاتا ہے۔ اور ان کے مقابل میں جو لوگ بدکار اور خدا (تعالیٰ) سے دُور ہوتے ہیں اور اُن کو خدا (تعالیٰ) سے کوئی تعلق صدق و اخلاص نہیں ہوتا اُن کے واسطے آسمانی دروازے نہیں کھولے جاتے جیساکہ فرمایا۔ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ یعنی کفار جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے۔ مفسّرین اس کا مطلب ظاہری طور پر لیتے ہیں مگر میں یہی کہتا ہوں کہ نجات کے طلب گار کو خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے شتر بے مہار کو مجاہدات سے ایسا دُبلا کر دینا چاہیئے کہ وہ سوئی کے ناکہ میں سے گذر جائے جب تک نفس دنیوی لذائذ و شہوانی حظوظ سے موٹا ہوا ہوا ہے تب تک یہ شریعت کے پاک راہ سے گذر کر بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ دنیوی لذائذ پر موت وارد کرو اور خوف و خشیت الٰہی سے دُبلے ہوجاؤ تب تم گذر سکو گے اور یہی گذرنا تمہیں جنت میں پہنچا کر نجات اخروی کا موجب ہوگا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

شریعت نے دو طرفوں کو مانا ہے۔ ایک خدا کی طرف اور وہ اونچی ہے جس کا مقام انتہائی عرش ہے

اور دوسری شیطان کی اور وہ بہت نیچی ہے اور اس کا انتہا زمین کا پاتال ہے غرض یہ تینوں شریعتوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ مومن مرکر خدا کی طرف جاتا ہے اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں جیسا کہ آیت اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ اس کی شاہد ہے اور کافر نیچے کی طرف جو شیطان کی طرف ہے جاتا ہے جیسا کہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ اس کی گواہ ہے۔ خدا کی طرف جانے کا نام رفع ہے اور شیطان کی طرف جانے کا نام لعنت ہے۔ ان دونوں لفظوں میں تقابل اضداد ہے۔ نادان لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر رفع کے معنی جسم اٹھانا ہے تو اس کے مقابل کا لفظ کیا ہوا جیسا کہ رفع روحانی کے مقابل پر لعنت ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۴۱)

[۴۴] وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

یہ تو شیعوں کا مذہب ہے کہ صحابہؓ کے درمیان آپس میں ایسی سخت دشمنی تھی یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اس کی تردید کرتا ہے کہ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ برادریوں کے درمیان آپس میں دشمنیاں ہوا کرتی ہیں۔ مگر شادی مرگ کے وقت وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ انبیاء میں خونی دشمنی کبھی نہیں ہوتی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

.... اس طرح آزمائش کرو کہ خدا اور رسول کی راہ میں کس نے صدق دکھلایا آپس کی رنجشیں خانگی امور ہوتے ہیں اُن کا اثر اُن (صحابہ) پر نہیں پڑ سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ[۱] یہ ایک پیشگوئی ہے کہ آئندہ زمانہ میں آپس میں رنجشیں ہوں گی لیکن غلّ اُن کے سینوں میں سے کھینچ لیں گے وہ بھائی ہوں گے تختوں پر بیٹھنے والے اب شیعوں سے پوچھو کہ اُس وقت زمانہ نبوی میں تو کوئی رنجش نہ تھی اور اگر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت آپس میں صلح کرا دیتے۔ آخر یہ بات آئندہ زمانہ میں ہونے والی تھی ورنہ اس طرح پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف آتا ہے کہ انہوں نے صلح کی کوشش تو کی مگر کامیاب

[۱] الفجر آیت ۲۹، ۳۰ [۲] الحجر آیت ۴۸

نہ ہوتے۔

یہ بات شیعہ پر بڑی دلیل ہے وہ صرف دو آدمیوں کا نام لیتے ہیں جو کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آیت تو پیغمبر خدا پر اُتری تھی نہ علیؓ پر اور نہ کسی اَور پر۔ اگر کہو کہ اُس وقت ہی غِلّ تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ صحابہ ایسے سخت دل تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار کہا اور سمجھایا مگر کسی نے آپ کا کہنا نہ مانا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ تو بڑی بے ادبی ہے۔

اس کا پتہ لگتا ہے کہ یہ بعد کی خبر ہے مگر خدا تعالیٰ کے سامنے یہ کوئی شئی نہیں اسی لیے فرماتا ہے کہ تم اس پر خیال نہ کرو یہ بشریت کے اختلاف ہیں۔ ہم ان کو بھائی بھائی بنا دینگے۔ خدا تعالیٰ ہی نے یہ پیشگوئی کی کہ ایسا ہو گا بعض آپس میں لڑیں گے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

وَقَدْ جَرَتْ سُنَّتُهٗ أَنَّهٗ يَقْضِيْ بَيْنَ الصَّالِحِيْنَ عَلٰى طَرِيْقٍ لَا يَقْضِيْ عَلَيْهِ قَضَايَا الْفَاسِقِيْنَ فَإِنَّهُمْ كُلُّهُمْ أَحِبَّاءُهٗ وَكُلُّهُمْ مِنَ الْمُجْتَبِيْنَ الْمَقْبُوْلِيْنَ۔ وَلِأَجْلِ ذٰلِكَ أَخْبَرَنَا رَبُّنَا عَنْ مَآلِ نِزَاعِهِمْ وَقَالَ وَهُوَ أَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ۔ هٰذَا هُوَ الْأَصْلُ الصَّحِيْحُ وَالْحَقُّ الصَّرِيْحُ۔ (سر الخلافۃ صفحہ ۲۶)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ (الجزو ۸) سب تعریفیں خدا کو ہیں جس نے جنت کی طرف ہم کو آپ راہبری کی اور ہم کیا چیز تھے کہ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جاتے اگر خدا رہبری نہ کرتا۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۶۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ سب تعریف اس خدا کو جس نے ہمیں بہشت میں داخل ہونے کے لیے آپ ہی سب توفیق بخشی آپ ہی ایمان بخشا آپ ہی نیک عمل کرائے۔ آپ ہی ہمارے دلوں کو پاک کیا اگر وہ خود مدد نہ کرتا تو ہم آپ تو کچھ بھی چیز نہ تھے۔ (ست بچن صفحہ ۵۰)

سب حمدیں اس خداوند تعالیٰ کے لیے جس نے ہم کو دارالسلام کی ہدایت کی اور ہم کیا چیز تھے جو خود بخود یہاں تک پہنچتے اگر وہ ہدایت نہ دیتا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ صالحین کے درمیان ایسے طریق پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ فاسقوں کے معاملات کا اُس طریق پر فیصلہ نہیں فرماتا۔ کیونکہ وہ (صحابہ۔ ناقل) سب کے سب اس کے دوست۔ اس کے محبّ اور اس کے مقبول ہیں۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے جھگڑوں کے انجام سے اطلاع دی اور اس نے جو اصدق الصادقین ہے فرمایا۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ اور یہی صحیح اصل اور حق صریح ہے۔

۵۳ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝

فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ (قرآن کریم) مفصل کتاب ہے۔۔۔۔ یہ عظمتیں اور خوبیاں کہ جو قرآن کریم کی نسبت بیان فرمائی گئیں احادیث کی نسبت ایسی تعریفوں کا کہاں ذکر ہے؟ پس میرا مذہب "فرقہ ضالہ نیچریہ" کی طرح یہ نہیں ہے کہ میں عقل کو مقدم رکھ کر قال اللہ اور قال الرسول پر کچھ نکتہ چینی کروں۔ ایسے نکتہ چینی کرنے والوں کو ملحد اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہم کو پہنچایا ہے اس سب پر ایمان لاتا ہوں۔ صرف عاجزی اور انکسار کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ قرآن کریم ہر یک وجہ سے احادیث پر مقدم ہے اور احادیث کی صحت و عدم پرکھنے کے لیے وہ محک ہے اور مجھ کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی اشاعت کے لیے مامور کیا ہے تا میں جو ٹھیک ٹھیک منشا قرآن کریم کا ہے لوگوں پر ظاہر کروں۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۸)

۵۵ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝

قرآن شریف میں لفظ عرش کا جہاں جہاں استعمال ہوا ہے اس سے مراد خدا کی عظمت اور جبروت اور بلندی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مخلوق چیزوں میں داخل نہیں کیا۔ اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مظہر چار ہیں۔ جو وید کے رُو سے چار دیوتے کہلاتے ہیں۔ مگر قرآنی اصطلاح کی رُو سے اُن کا نام فرشتے بھی ہے اور وہ یہ ہیں۔ اکاش جس کا نام اِندر بھی ہے۔ سورج دیوتا جس کو عربی میں شمس کہتے ہیں۔ چاند جس کو عربی میں قمر کہتے ہیں دھرتی جس کو عربی میں ارض کہتے ہیں۔ یہ چاروں دیوتا جیسا کہ ہم اس رسالہ میں بیان کر چکے ہیں خدا کی چار صفتوں کو جو اس کے جبروت اور عظمت کا اتم مظہر ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا جاتا ہے اٹھا رہے ہیں یعنی عالم پر یہ ظاہر کر رہے ہیں۔

تصریح کی حاجت نہیں۔ اس بیان کو ہم مفصل لکھ آئے ہیں اور قرآن شریف میں تین قسم کے فرشتے لکھے ہیں۔

۱۔ ذرات اجسام ارضی اور روحوں کی قوتیں۔

۲۔ اکاش۔ سورج۔ چاند۔ زمین کی قوتیں جو کام کر رہی ہیں۔

۳۔ اُن سب پر اعلیٰ طاقتیں جو جبرئیل و میکائیل و عزرائیل وغیرہ نام رکھتی ہیں۔ جن کو وید میں جم لکھا ہے مگر اس جگہ فرشتوں سے یہ چار دیوتے مراد ہیں یعنی اکاش اور سورج وغیرہ جو خدا تعالیٰ کی چار صفتوں کو اُٹھا رہے ہیں۔ یہ وہی صفتیں ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا گیا ہے۔ اس فلسفہ کا وید کو بھی اقرار ہے مگر یہ لوگ خوب وید دان ہیں جو اپنے گھر کے مسئلہ سے بھی انکار کر رہے ہیں۔

غرض وید کے یہ چار دیوتے یعنی اکاش۔ سورج۔ چاند۔ دھرتی۔ خدا کے عرش کو جو صفت ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مالک یوم الدین ہے اٹھا رہے ہیں اور فرشتہ کا لفظ قرآن شریف میں عام ہے ہر ایک چیز جو اس کی آواز سنتی ہے وہ اُس کا فرشتہ ہے پس دنیا کا ذرہ ذرہ خدا کا فرشتہ ہے کیونکہ وہ اس کی آواز سنتے ہیں اور اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ اور اگر ذرہ ذرہ اس کی آواز نہیں سُنتا تو خدا تعالیٰ نے زمین آسمان کے اجرام کو کس طرح پیدا کر لیا اور یہ استعارہ جو ہم نے بیان کیا ہے اس طرح خدا کے کلام میں بہت سے استعارات ہیں جو نہایت لطیف علم اور حکمت پر مشتمل ہیں۔ (نسیم دعوت صفحہ ۸۵-۸۶)

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ (سورۃ فاتحہ ناقل) میں ان چار صفتوں کو اپنی الوہیت کا مظہر اتم قرار دیا ہے اور اسی لیے صرف اس قدر ذکر پر یہ نتیجہ مترتب کیا ہے کہ ایسا خدا کہ یہ چار صفتیں اپنے اندر رکھتا ہے وہی لائق پرستش ہے اور درحقیقت یہ صفتیں بہر وجہ کامل ہیں اور ایک دائرہ کے طور پر الوہیت کے تمام لوازم اور شرائط پر محیط ہیں کیونکہ ان صفتوں میں خدا کی ابتدائی صفات کا بھی ذکر ہے اور درمیانی زمانہ کی رحمانیت اور رحیمیت کا بھی ذکر ہے اور پھر آخری زمانہ کی صفت مجازات کا بھی ذکر ہے اور اصولی طور پر کوئی فعل اللہ تعالیٰ کا ان چار صفتوں سے باہر نہیں پس یہ چار صفتیں خدا تعالیٰ کی پوری صورت دکھلاتی ہیں۔ سو درحقیقت استواء علی العرش کے یہی معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفات جب دنیا کو پیدا کر کے ظہور میں آگئیں تو اللہ تعالیٰ ان معنوں سے اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ کوئی صفت صفاتِ لازمہ اُلوہیت سے باہر نہیں رہی اور تمام صفات کی پورے طور پر تجلّی ہو گئی جیسا کہ جب اپنے تخت پر بادشاہ بیٹھتا ہے تو تخت نشینی کے وقت اُس کی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف شاہی ضرورتوں کے لیے طرح طرح کے سامان تیار ہونے کا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور ہو جاتے ہیں اور وہی حقیقت ربوبیت عامہ ہیں دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جود و سخاوت سے مالامال کیا جاتا ہے۔ تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات کے انجام کے لیے

مدد دی جاتی ہے چوتھی طرف جزا سزا کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ چار صفتیں تخت نشینی کے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چار صفتوں کو دنیا پر نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے جس کا نام عرش ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس کے کیا معنے ہیں کہ اس تخت کو چار فرشتے اُٹھا رہے ہیں پس اس کا یہی جواب ہے کہ ان چار صفتوں پر چار فرشتے موکل ہیں۔ جو دنیا پر یہ صفات خدا تعالیٰ کی ظاہر کرتے ہیں اور ان کے ماتحت چار ستارے ہیں جو چار رب النوع کہلاتے ہیں جن کو وید میں دیوتا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ پس وہ ان چاروں صفتوں کی حقیقت کو دنیا میں پھیلاتے ہیں گویا اس رُوحانی تخت کو اُٹھا رہے ہیں بت پرستوں کا جیسا کہ وید سے ظاہر ہے۔ صاف طور پر یہ خیال تھا کہ یہ چار صفتیں مستقل طور پر دیوتاؤں کو حاصل ہیں۔ اسی وجہ سے وید میں جا بجا ان کی اُستت اور مہما کی گئی۔ اور ان سے مرادیں مانگی گئیں پس خدا تعالیٰ نے استعارہ کے طور پر سمجھایا کہ یہ چار دیوتا جن کو بت پرست اپنا معبود قرار دیتے ہیں۔ یہ مخدوم نہیں بلکہ چاروں خادم ہیں اور خدا تعالیٰ کے عرش کو اُٹھا رہے ہیں یعنی خادموں کی طرح ان الٰہی صفات کو اپنے آئینوں میں ظاہر کر رہے ہیں اور عرش سے مراد لوازم صفات تخت نشینی ہیں جیسا کہ ابھی میں نے بیان کر دیا ہے۔ (نسیم دعوت حاشیہ متعلقہ ص۸۵)

قرآن شریف میں ایک طرف تو یہ بیان کیا کہ خدا کا اپنی مخلوق سے شدید تعلق ہے اور وہ ہر ایک جان کی جان ہے اور ہر ایک ہستی اُسی کے سہارے سے ہے۔ پھر دوسری طرف اِس غلطی سے محفوظ رکھنے کے لیے کہ تا اُس کے تعلق سے جو انسان کے ساتھ ہے کوئی شخص انسان کو اُس کا عین ہی نہ سمجھ بیٹھے جیسا کہ ویدانت والے سمجھتے ہیں۔ یہ بھی فرما دیا کہ وہ سب سے برتر اور تمام مخلوقات سے وراء الوراء مقام پر ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں عرش کہتے ہیں اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے۔ صرف وراء الوراء مرتبہ کا نام ہے نہ یہ کہ کوئی ایسا تخت ہے جس پر خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح بیٹھا ہوا تصوّر کیا جائے بلکہ جو مخلوق سے بہت دُور اور تنزّہ اور تقدّس کا مقام ہے اس کو عرش کہتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ سب کے ساتھ خالقیت و مخلوقیت کا تعلق قائم کر کے پھر عرش پر قائم ہو گیا یعنی تمام تعلقات کے بعد الگ کا الگ رہا اور مخلوق کے ساتھ مخلوط نہیں ہُوا۔ غرض خدا کا انسان کے ساتھ ہونا اور ہر ایک چیز پر محیط ہونا یہ خدا کی تشبیہی صفت ہے۔ اور خدا نے قرآن شریف میں اِس لیے اس صفت کا ذکر کیا ہے کہ تا وہ انسان پر اپنا قرب ثابت کرے اور خدا کا تمام مخلوقات سے وراء الوراء ہونا اور سب سے برتر اور اعلیٰ اور دور تر ہونا اور اس تنزہ اور تقدس کے مقام پر ہونا جو مخلوقیت سے دور ہے جو عرش کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس صفت کا نام تنزیہی صفت ہے اور خدا نے قرآن شریف میں اِس لیے اس صفت کا ذکر کیا تا وہ اِس سے اپنی توحید اور اپنا وحدہٗ لاشریک ہونا اور مخلوق کی صفات

سے اپنی ذات کا منزہ ہونا ثابت کرے۔ دوسری قوموں نے خداتعالیٰ کی ذات کی نسبت یا تو تنزیہی صفت اختیار کی ہے یعنی نرگن کے نام سے پکارا ہے اور یا اس کو سرگن مان کر ایسی تشبیہ قرار دی ہے کہ گویا وہ عین مخلوقات ہے اور ان دونوں صفات کو جمع نہیں کیا۔ مگر خداتعالیٰ نے قرآن شریف میں ان دونوں صفات کے آئینہ میں اپنا چہرہ دکھلایا ہے اور یہی کمال توحید ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۹۰-۹۱)

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی اوّل اس نے اس دنیا کے تمام اجرام سماوی و ارضی کو پیدا کیا اور چھ دن میں سب کو بنایا (چھ دن سے مراد ایک بڑا زمانہ ہے) اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی تنزہ کے مقام کو اختیار کیا۔ یاد رہے کہ استواء کے لفظ کا جب علیٰ صلہ آتا ہے تو اُس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ایک چیز کا اس مکان پر قرار پکڑنا جو اُس کے مناسب حال ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ بھی آیت ہے وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ یعنی نوح کی کشتی نے طوفان کے بعد ایسی جگہ پر قرار پکڑا جو اس کے مناسب حال تھا یعنی اُس جگہ زمین پر اُترنے کے لیے بہت آسانی تھی سو اسی لحاظ سے خداتعالیٰ کے لیے استواء کا لفظ اختیار کیا یعنی خدا نے ایسی وراء الوراء جگہ پر قرار پکڑا جو اس کی تنزہ اور تقدس کے مناسب حال تھی چونکہ تنزّہ اور تقدس کا مقام ماسوی اللہ کے فنا کو چاہتا ہے سو یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے خدا بعض اوقات اپنی خالقیت کے اسم کے تقاضا سے مخلوقات کو پیدا کرتا ہے پھر دوسری مرتبہ اپنی تنزہ اور وحدت ذاتی کے تقاضا سے ان سب کا نقش ہستی مٹا دیتا ہے۔ غرض عرش پر قرار پکڑنا مقام تنزّہ کی طرف اشارہ ہے تا ایسا نہ ہو کہ خدا اور مخلوق کو باہم مخلوط سمجھا جائے پس کہاں سے معلوم ہوا کہ خدا عرش پر یعنی اس وراء الوراء مقام پر مقیّد کی طرح ہے اور محدود ہے۔ قرآن شریف میں تو جا بجا بیان فرمایا گیا ہے کہ خدا ہر جگہ حاظر و ناظر ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۱)

مضمون پڑھنے والے نے قرآن شریف پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں لکھا ہے کہ خدا عرش پر کرسی نشین ہے اس لغو اعتراض کا جواب پہلے ہم مبسوط اور مفصل طور پر لکھ آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لیے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دو رنگ پر ظاہر کیا ہے۔ (۱) اوّل اس طور پر بیان کیا ہے جس سے اس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہم شکل ہیں جیسا کہ وہ کریم رحیم ہے محسن ہے اور وہ غضب بھی رکھتا ہے اور اُس میں محبت بھی ہے اور اس کے ہاتھ بھی ہیں اور اس کی آنکھیں بھی ہیں اور اُس کی ساقین بھی ہیں اور اس کے کان بھی ہیں اور نیز یہ کہ قدیم سے سلسلہ مخلوق کا اس کے ساتھ چلا آیا ہے مگر کسی چیز کو اس کے مقابل پر قدامت شخصی نہیں ہاں قدامت نوعی ہے۔ اور وہ بھی خدا کی صفت خلق کے لیے ایک لازمی امر نہیں کیونکہ جیسا کہ خلق یعنی پیدا کرنا اُس کی صفات میں سے ہے ایسا ہی کبھی اور کسی زمانہ میں تجلّی وحدت اور تجرّد اُس کی صفات میں سے ہے اور کسی صفت کے لیے تعطّل دائمی جائز نہیں ہاں تعطّل میعادی جائز ہے۔

غرض چونکہ خدا نے انسان کو پیدا کر کے اپنی اُن تشبیہی صفات کو اُس پر ظاہر کیا جن صفات کے ساتھ انسان بظاہر شراکت رکھتا ہے جیسے خالق ہونا کیونکہ انسان بھی اپنی حد تک بعض چیزوں کا خالق یعنی موجد ہے۔ ایسا ہی انسان کو کریم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک کرم کی صفت بھی اپنے اندر رکھتا اور اسی طرح انسان کو رحیم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک قوت رحم بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور قوت غضب بھی اس میں ہے اور ایسا ہی آنکھ کان وغیرہ سب انسان میں موجود ہیں۔ پس ان تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں خدا سے مشابہ ہے اور خدا انسان سے مشابہ ہے اس لیے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا یعنی ایسی صفات کا ذکر کیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اُس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے نہ اس کا خَلق یعنی پیدا کرنا انسان کی خَلق کی طرح ہے نہ اس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے۔ نہ اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے نہ اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے.....

فرماتا ہے اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ (ترجمہ) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا یعنی اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لیے مقام تنزّہ اور تجرّد کی طرف رُخ کیا جو وراء الوراء مقام اور مخلوق کے قرب و جوار سے دُور تر ہے وہی بلند تر مقام ہے جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق چیز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الوراء مقام میں اپنی تجلّیات ظاہر کر رہا تھا جس کا نام عرش ہے یعنی وہ مقام جو ہر ایک عالم سے بلند تر اور برتر ہے اور اسی کا ظہور اور پرتو تھا اور اس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا پھر اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اُس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعہ سے شناخت کیا جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دائمی طور پر تعطّل صفات الٰہیہ کبھی نہیں ہوتا اور بجز خدا کے کسی چیز کے لیے قدامت شخصی تو نہیں مگر قدامت نوعی ضروری ہے اور خدا کی کسی صفت کے لیے تعطّل دائمی تو نہیں مگر تعطّل میعادی کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ صفت ایجاد اور صفت اِفناء باہم متضاد ہیں اس لیے جب اِفناء کی صفت کا ایک کامل دَور آجاتا ہے تو صفت ایجاد ایک میعاد تک معطّل رہتی ہے غرض ابتداء میں خدا کی صفت وحدت کا دَور تھا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دور نے کتنی دفعہ ظہور کیا بلکہ یہ دَور قدیم اور غیر متناہی ہے بہرحال صفت وحدت کے دور کو دوسری صفات پر تقدم زمانی ہے پس اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں خدا اکیلا تھا اور اس کے ساتھ

کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور اسی تعلق کی وجہ سے اُس نے اپنے یہ اسماء ظاہر کیے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے مگر جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور باز نہ آوے اُس کو وہ بے سزا نہیں چھوڑتا اور اُس نے اپنا یہ اسم بھی ظاہر کیا کہ وہ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے اور اُس کا غضب صرف اُنہیں لوگوں پر بھڑکتا ہے جو ظلم اور شرارت اور معصیت سے باز نہیں آتے اور اُس نے اپنی یہ صفات اپنی کتاب میں بیان فرمائیں کہ وہ دیکھتا ہے اور سُنتا ہے اور محبت کرتا ہے اور غضب کرتا ہے اور اپنے ہاتھ اور پیر اور آنکھ اور کان کا بھی ذکر کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کا دیکھنا انسان کے دیکھنے کی طرح نہیں اور اُس کا سُننا انسان کے سُننے کی طرح نہیں اور اُس کا محبت کرنا انسان کے محبت کرنے کی طرح نہیں اور اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح نہیں اور اُس کے ہاتھ پَیر اور آنکھ کان مخلوق کے اعضا کی طرح نہیں بلکہ وہ ہر ایک بات میں بے مثل ہے اور بار بار صاف فرما دیا کہ یہ اُس کی تمام صفات اُس کی ذات کے مناسب حال ہیں۔ انسان کی صفات کی مانند نہیں اور اس کی آنکھ وغیرہ جسم اور جسمانی نہیں اور اُس کی کسی صفت کو انسان کی کسی صفت سے مشابہت نہیں مثلاً انسان اپنے غضب کے وقت پہلے غضب کی تکلیف آپ اُٹھاتا ہے اور جوش غضب میں فوراً اس کا سرور دُور ہو کر ایک جلن سی اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور ایک مادّہ سوداوی اُس کے دماغ میں چڑھ جاتا ہے اور ایک تغیّر اُس کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے مگر خدا ان تغیّرات سے پاک ہے اور اُس کا غضب ان معنوں سے ہے کہ وہ اُس شخص سے جو شرارت سے باز نہ آوے اپنا سایۂ حمایت اُٹھا لیتا ہے اور اپنے قدیم قانون قدرت کے موافق اس سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا کہ ایک غضب ناک انسان کرتا ہے لہٰذا استعارہ کے رنگ میں وہ معاملہ اُس کا غضب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں۔ کیونکہ انسان غلبۂ محبت میں بھی دُکھ اُٹھاتا ہے اور محبوب کے علیحدہ اور جدا ہونے سے اس کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے مگر خدا ان تکالیف سے پاک ہے۔ ایسا ہی اس کا قرب بھی انسان کے قرب کی طرح نہیں کیونکہ انسان جب ایک کے قریب ہوتا ہے تو اپنے پہلے مرکز کو چھوڑ دیتا ہے مگر وہ باوجود قریب ہونے کے دُور ہوتا ہے اور باوجود دُور ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر ایک صفت انسانی صفات سے الگ ہے اور صرف اشتراک لفظی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اسی لیے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ[1] یعنی کوئی چیز اپنی ذات یا صفات میں خدا تعالیٰ کے برابر نہیں۔

اب ناظرین با انصاف پر ظاہر ہو کہ اسی مطلب کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی خدا وہ ہے جس نے سب کچھ چھ دن میں پیدا کر کے پھر اپنے مقام وراء الوراء کی طرف توجہ کی اور عرش پر قرار پکڑا۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ عرش سے

[1] الشوریٰ آیت ۱۲

مراد قرآن شریف میں وہ مقام ہے جو تشبیہی مرتبہ سے بالاتر اور ہر ایک عالم سے برتر اور نہاں در نہاں اور تقدس اور تنزّہ کا مقام ہے وہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ پتھر یا اینٹ یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو اور خدا اس پر بیٹھا ہوا ہو اسی لیے عرش کو غیر مخلوق کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ جیسا کہ یہ فرماتا ہے کہ کبھی وہ مومن کے دل پر اپنی تجلّی کرتا ہے۔ ایسا ہی وہ فرماتا ہے کہ عرش پر اس کی تجلّی ہوتی ہے اور صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز کو میں نے اٹھایا ہوا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ کسی چیز نے مجھے بھی اٹھایا ہوا ہے۔ اور عرش جو ہر ایک عالم سے برتر مقام ہے وہ اُس کی تنزیہی صفت کا مظہر ہے اور ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ازل سے اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت تشبیہی دوسری صفت تنزیہی اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت اس لیے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لیے اپنے ہاتھ آنکھ محبت غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے اور پھر جبکہ احتمال تشبیہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ کہہ دیا اور بعض جگہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کہہ دیا جیسا کہ سورہ رعد جزو نمبر ۱۳ میں بھی یہ آیت ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (ترجمہ) تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس آیت کے ظاہری معنی کے رُو سے اس جگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا۔ اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الوراء ہونے کی ایک حالت ہے جو اُس کی صفت ہے۔ پس جبکہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلّی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اس میں پھونک دیئے تو اس طور سے خدا نے اپنے لیے ایک تشبیہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اس لیے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزّہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراء مقام پر ہے اور پھر سورۃ طٰہٰ جزو ۱۶ میں یہ آیت ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (ترجمہ) خدا رحمٰن ہے جس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس قرار پکڑنے سے یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اُس نے انسان کو پیدا کر کے بہت سا قرب اپنا اُس کو دیا مگر یہ تمام تجلّیات مختص الزمان ہیں یعنی تمام تشبیہی تجلیات اُس کی کسی خاص وقت میں ہیں جو پہلے نہیں تھیں مگر ازلی طور پر قرارگاہ خدا تعالیٰ کی عرش ہے۔ جو تنزیہ کا مقام ہے کیونکہ جو فانی چیزوں سے تعلق کر کے تشبیہ کا مقام پیدا ہوتا ہے وہ خدا کی قرارگاہ نہیں کہلا سکتا۔ وجہ یہ کہ وہ معرض زوال میں ہے اور ہر ایک وقت میں زوال اُس کے سر پر ہے بلکہ خدا کی قرارگاہ وہ مقام ہے جو فنا اور زوال سے پاک ہے پس وہ مقام عرش ہے۔

اس جگہ ایک اور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم

ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے جس سے اشارۃ النص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے عرش کو اُٹھاتے ہیں۔ اور اب اس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اُس کے عرش کو اُٹھاوے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سُن چکے ہو کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اُٹھائی جائے یا اُٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزّہ اور تقدس کے مقام کا نام عرش ہے۔ اسی لیے اِس کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔ ورنہ ایک مجسّم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اسی سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سُناتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے تنزّہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزّہ اُس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اُس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے۔ تب خدا عقول انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اُس کو دریافت کر سکے۔ تب اُس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو دنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں (۱) اول ربوبیت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے چنانچہ روح اور جسم کا ظہور ربوبیّت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضا سے ہے (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آچکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لیے میسّر کی ہیں۔ یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر اُن کو آفات سے بچاتا ہے۔ یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔ (۴) چوتھی صفت مالک یوم الدین ہے۔ یہ بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں یعنی اس کے پوشیدہ وجود کا اِن صفات کے ذریعہ سے اس دنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالم آخرت میں دو چند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۶-۲۶۷)

اس آیت سے مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے تشبیہی صفات کا اظہار فرما کر پھر اس مقام کی طرف توجہ کی جو بے مثل و مانند ہونے کا مقام ہے۔ جس کو زبان شرع میں عرش کہتے ہیں جو تمام عالموں سے برتر اور وہم و خیال سے بلند ہے اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے۔ بلکہ وراء الوراء مقام کا نام عرش ہے۔ جس سے مخلوق کو کوئی اشتراک نہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۴ حاشیہ)

خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی و ارضی پیدا کر کے پھر اپنے وجود کو وراء الوراء مقام میں مخفی کیا جس کا نام عرش ہے اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں جو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات میں ہی درج ہیں تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا یعنی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالک یوم الجزا ہونا سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کی کلام میں قرار دیئے گئے ہیں جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی اس وراء الوراء مقام میں جو خدا ہے اُس مخفی مقام سے اس کو دکھلا رہے ہیں ورنہ خدا کی شناخت کے لیے کوئی ذریعہ نہ تھا۔ (چشمہ معرفت ص۲۶۷ حاشیہ)

عرش کا کلمہ خدا تعالیٰ کی عظمت کے لیے آتا ہے۔ کیونکہ وہ سب اُونچوں سے زیادہ اونچا اور جلال رکھتا ہے یہ نہیں کہ وہ کسی انسان کی طرح کسی تخت کا محتاج ہے۔ خود قرآن میں ہے کہ ہر ایک چیز کو اُس نے تھاما ہوا ہے اور وہ قیّوم ہے جس کو کسی چیز کا سہارا نہیں۔ (استفتاء ص۹۵)

خدا تعالیٰ نے یونانیوں کی محدد کی طرح اپنے عرش کو قرار نہیں دیا اور نہ اُس کو محدود قرار دیا۔ ہاں اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ ایک طبقہ قرار دیا ہے جس سے باعتبار اس کی کیفیت اور کمیّت کے اور کوئی اعلیٰ طبقہ نہیں ہے اور یہ امر ایک مخلوق اور موجود کے لیے ممتنع اور محال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ جو طبقہ عرش اللہ کہلاتا ہے وہ اپنی وسعتوں میں خدائے غیر محدود کے مناسب حال اور غیر محدود ہو۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۱۴۸ و ۱۴۹ حاشیہ در حاشیہ)

وَحَقِیْقَةُ الْعَرْشِ وَاسْتِوَاءُ اللّٰهِ عَلَیْهِ سِرٌّ عَظِیْمٌ مِّنْ أَسْرَارِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَحِکْمَةٌ بَالِغَةٌ وَّمَعْنًی رُّوْحَانِیٌّ وَّسُمِّیَ عَرْشًا لِتَفْهِیْمِ عُقُوْلِ هٰذَا الْعَالَمِ وَلِتَقْرِیْبِ الْأَمْرِ إِلٰی اسْتِعْدَادَاتِهِمْ وَهُوَ وَاسِطَةٌ فِیْ وُصُوْلِ الْفَیْضِ الْإِلٰهِیِّ وَالتَّجَلِّی الرَّحْمَانِیِّ مِنْ حَضْرَةِ الْحَقِّ إِلَی الْمَلَائِکَةِ وَمِنَ الْمَلٰئِکَةِ إِلَی الرُّسُلِ۔ (کرامات الصادقین ص۹۶)

ہم لوگ جو خدا تعالیٰ کو رب العرش کہتے ہیں تو اُس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ جسمانی اور جسم ہے اور عرش کا محتاج ہے بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے جو اس جہان اور آنے والے جہان سے برابر نسبت رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں سے مترادف ہے کہ وہ مالک الکونین ہے اور جیسا کہ ایک شخص اونچی جگہ

(ترجمہ) اور عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا اس پر مستوی ہونا الٰہی اسرار میں سے ایک بہت بڑا سرّ ہے۔ اور ایک بلیغ حکمت اور روحانی معنی پر مشتمل ہے اور اس کا نام عرش اس لیے رکھا گیا ہے۔ تا اس جہان کے اہل عقل کو اس کا مفہوم سمجھایا جائے اور اس بات کا سمجھنا ان کی استعدادوں کے قریب کر دیا جائے اور وہ (عرش) الٰہی فیض اور اللہ تعالیٰ کی رحمانی تجلّی کو ملائکہ تک پہنچانے میں واسطہ ہے اور اسی طرح ملائکہ سے رسولوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

بیٹھ کر یا کسی نہایت اونچے محل پر چڑھ کر یمین و یسار نظر رکھتا ہے۔ ایسا ہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔ نہ اس عالم کی اور نہ اس دوسرے عالم کی۔ ہاں اس مقام کو عام سمجھوں کے لیے اوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ حقیقت میں سب سے اوپر ہے اور ہر یک چیز اُس کے پیروں پر گری ہوئی ہے تو اوپر کی طرف سے اس کی ذات کو مناسبت ہے مگر اوپر کی طرف وہی ہے جس کے نیچے دونوں عالم واقع ہیں اور وہ ایک انتہائی نقطہ کی طرح ہے جس کے نیچے سے دو عظیم الشان عالم کی دو شاخیں نکلتی ہیں اور ہر یک شاخ ہزارہا عالم پر مشتمل ہے جن کا علم بجز اس ذات کے کسی کو نہیں جو اُس نقطۂ انتہائی پر مستوی ہے جس کا نام عرش ہے۔ اس لیے ظاہری طور پر بھی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بلندی جو اُوپر کی سمت میں اس انتہائی نقطہ میں متصور ہو جو دونوں عالم کے اوپر ہے۔ وہی عرش کے نام سے عند الشرع موسوم ہے اور یہ بلندی باعتبار جامعیت ذات باری کی ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مبدء ہے ہر یک فیض کا اور مرجع ہے ہر یک چیز کا اور مسجود ہے ہر یک مخلوق کا اور سب سے اونچا ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور کمالات میں ورنہ قرآن فرماتا ہے کہ وہ ہر یک جگہ ہے جیسا کہ فرمایا اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ[1] جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے اور فرماتا ہے ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ[2] یعنی جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور فرماتا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ[3] یعنی ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں یہ تینوں تعلیموں کا نمونہ ہے۔ (رسالہ معیار المذاہب ص۳۸)

عرش اللہ تعالیٰ کی جلالی و جمالی صفات کا مظہر اتم ہے عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق کے متعلق ہم کچھ نہیں کہتا۔ اس کی تفصیل حوالہ بخدا کرنی چاہیئے۔ جنہوں نے مخلوق کہا ہے اُنہوں نے بھی غلطی کھائی ہے کیونکہ پھر اس سے وہ محدود و لازم آتا ہے۔ اور جو غیر مخلوق کہتے ہیں وہ توحید کے خلاف کہتے ہیں کیونکہ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ اگر یہ غیر مخلوق ہو تو پھر اس سے باہر رہ جاتی ہے۔ مومن موحّد اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جیسے اُفْطِرُ وَاَصُوْمُ یا اُخْطِئُ وَاُصِیْبُ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ استعارات کے ذریعہ کلام کرتا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی کیفیت کو حوالہ بخدا کرتے ہیں۔ پس ہمارا مذہب عرش کے متعلق یہی ہے کہ اس کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث میں دخل نہ دو۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جلالی و جمالی تجلیات کا مظہر ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴-۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کا جھگڑا عبث ہے۔ احادیث سے اس کا جسم کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ ایک قسم کے علوّ کے مقام کا اظہار عرش کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اگر اُسے جسم کہو تو پھر خدا کو بھی مجسّم کہنا چاہیئے یاد

[1] بقرہ آیت ۱۱۶ [2] حدید آیت ۵ [3] قٓ آیت ۱۷

رکھنا چاہیئے کہ اس کو علو جسمانی نہیں کہ جس کا تعلق جہات سے ہو بلکہ یہ روحانی علو ہے۔

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کی بحث بھی ایک بدعت ہے۔ جو کہ پیچھے ایجاد کی گئی۔ صحابہؓ نے اس کو مطلق نہیں چھیڑا۔ تو اب یہ لوگ چھیڑ کر نافہم لوگوں کو اپنے گلے ڈالتے ہیں۔ لیکن عرش کے اصل معنے اس وقت سمجھ آسکتے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ کی دوسری صفات پر بھی ساتھ ہی نظر ہو۔ (الحکم جلد ۸ ۲۶-۲۵ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۴)

بعض لوگ ناسمجھی سے عرش کو جو ایک مخلوق چیز مانتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ عرش کوئی ایسی چیز نہیں جس کو مخلوق کہہ سکیں وہ تو تقدس اور تنزہ کا ایک وراء الوراء مقام ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ ویسے ہی خدا بھی عرش پر جلوہ گر ہے جس سے لازم آتا ہے کہ محدود ہے لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر تک نہیں کہ عرش ایک تخت کی طرح ہے جس پر خدا بیٹھا ہے کیونکہ نعوذ باللہ اگر عرش سے مراد ایک تخت لیا جاوے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ تو پھر ان آیات کا کیا ترجمہ کیا جاویگا جہاں لکھا ہے کہ خدا ہر ایک چیز پر محیط ہے اور جہاں تین ہیں وہاں چوتھا ان کا خدا۔ اور جہاں چار ہیں وہاں پانچواں ان کا خدا۔ اور پھر لکھا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ ۲۶/۱۴ اور وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ۲۷/۱۸ غرض اس بات کو اچھی طرح سے یاد رکھنا چاہیئے کہ کلام الٰہی میں استعارات بہت پائے جاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ دل کو بھی عرش کہا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی تجلّی بھی دل پر ہوتی ہے اور ایسا ہی عرش اس وراء الوراء مقام کو کہتے ہیں جہاں مخلوق کا نقطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اہل علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ایک تو تشبیہ ہوتی ہے اور ایک تنزیہ ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بات کہ جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جہاں پانچ ہوں وہاں چھٹا ان کا خدا ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے جس سے دھوکا لگتا ہے کہ کیا خدا پھر محدود ہے؟ اسی لیے اس دھوکا کے دُور کرنے کے لیے بطور جواب کے کہا گیا ہے کہ وہ تو عرش پر ہے۔ جہاں مخلوقات کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ کوئی اس قسم کا تخت نہیں ہے جو سونے چاندی وغیرہ کا بنا ہوا ہو اور اس پر جواہرات وغیرہ جڑے ہوئے ہوں۔ بلکہ وہ تو ایک اعلیٰ ارفع اور وراء الوراء مقام ہے اور اس قسم کے استعارات قرآن مجید میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۱۵/۱ ظاہر تو اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس جگہ اندھے ہیں وہ آخرت کو بھی اندھے ہی رہیں گے۔ مگر یہ معنی کون قبول کرے گا۔ جبکہ دوسری جگہ پر صاف طور پر لکھا ہے۔ کہ خواہ کوئی سوجاکھا ہو۔ خواہ اندھا جو ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ جاویگا وہ تو بینا ہو گا۔ لیکن جو اس جگہ ایمانی روشنی سے بے نصیب رہے گا۔ اور خدا کی معرفت حاصل نہیں کریگا وہ آخر کو بھی اندھا ہی رہے گا۔ (الحکم جلد ۱۲ ۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

عرش الٰہی ایک وراء الوراء مخلوق ہے۔ جو زمین سے اور آسمان سے بلکہ تمام جہات سے برابر ہے۔ یہ

۱؎ بنی اسرائیل آیت ۷۳۔

نہیں کہ نعوذ باللہ عرش الٰہی آسمان سے قریب اور زمین سے دور ہے۔ بعنتی ہے وہ شخص جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے۔ عرش مقام تنزیہ ہے اور اسی لیے خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے جیسا کہ فرماتا ہے هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ[۱] اور مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ[۲] اور فرماتا ہے کہ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ[۳]۔

(الحکم جلد ۱۲ ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

(ثم استوٰی علی العرش کے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا)

اس (عرش) کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کوئی تو اسے مخلوق کہتا ہے اور کوئی غیر مخلوق لیکن اگر ہم غیر مخلوق نہ کہیں تو پھر استوٰی باطل ہوتا ہے اس میں شک نہیں ہے کہ عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث ہی عبث ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ درجے کی بلندی کو بیان کیا ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو کہ ہر ایک جسم اور ہر ایک نقص سے پاک ہے اور اس کے مقابلہ پر یہ دنیا اور تمام عالم ہے کہ جس کی انسان کو پوری پوری خبر بھی نہیں ہے ایسے مقام کو قدیم کہا جا سکتا ہے لوگ اس میں حیران ہیں اور غلطی سے اسے ایک مادی شئے خیال کرتے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے جو اعتراض لفظ ثُمَّ کا آتا ہے تو بات یہ ہے کہ قدامت میں ثُمَّ آجاتا ہے جیسے قلم ہاتھ میں ہوتا ہے تو جیسے قلم حرکت کرتا ہے ویسے ہاتھ حرکت کرتا ہے مگر ہاتھ کو تقدّم ہوتا ہے۔ آریہ لوگ خدا کی قدامت کے متعلق اہل اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا خدا چھ سات ہزار برس سے چلا آتا ہے یہ ان کی غلطی ہے اس مخلوق کو دیکھ کر خدا کی عمر کا اندازہ کرنا نادانی ہے ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ آدم سے اول کیا تھا اور کس قسم کی مخلوق تھی۔ اُس وقت کی بات وہی جانے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[۴]۔ وہ اور اس کی صفات قدیم ہی سے ہیں مگر اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر ایک صفت کا علم ہم کو دے دیوے اور نہ اس کے کام اس دنیا میں سما سکتے ہیں خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے اور استعارات کو ظاہر پر حمل کرکے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے۔ اس کی صفت ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ[۵] ہم عرش اور استوٰی پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حقیقت اور کنہ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں، جب دنیا وغیرہ نہ تھی عرش تب بھی تھا جیسے لکھا ہے كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ[۶]۔

اس کے متعلق خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک مجہول الکنہ امر ہے اور خدا تعالیٰ کی تجلیات کی طرف اشارہ ہے وہ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ[۷] چاہتی تھی اس لیے اوّل وہ ہو کر استوٰی علی العرش ہوا۔ اگرچہ توریت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے مگر وہ اچھے الفاظ میں نہیں ہے اور لکھا ہے کہ خدا.... ماندہ ہو کر تھک گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک انسان کسی کام میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے چہرہ اور خد و خال وغیرہ اور دیگر اعضاء کا

---

[۱] حدید آیت ۵ [۲] مجادلہ آیت ۸ [۳] ق آیت ۱۷ [۴] رحمٰن آیت ۳۰ [۵] انعام آیت ۱۰۴ [۶] ہود آیت ۸ [۷] الروم آیت ۲۳

پورا پورا پتہ نہیں لگتا مگر جب وہ فارغ ہو کر ایک تخت یا چارپائی پر آرام کی حالت میں ہو تو اس کے ہر ایک عضو کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح استعارہ کے طور پر خدا کی صفات کے ظہور کو ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ سے بیان کیا ہے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہوا صفات اس کے ازلی ابدی ہیں مگر جب مخلوق ہو تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہوں تو رازق کو پہچانیں۔ اسی طرح اس کے علم اور قادرِ مطلق ہونے کا پتہ لگتا ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ خدا کی اس تجلی کی طرف اشارہ ہے جو خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] کے بعد ہوئی۔

اسی طرح اس تجلّی کے بعد ایک اور تجلّی ہوگی جب کہ ہر شئے فنا ہوگی پھر ایک اور تیسری تجلّی ہوگی کہ احیاءِ اموات ہوگا۔ غرضیکہ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جس کے اندر داخل ہونا روا نہیں ہے صرف ایک تجلّی سے اسے تعبیر کرسکتے ہیں قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ خداتعالےٰ نے عرش کو اپنی صفات میں داخل کیا ہے جیسے ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ[2] گویا خداتعالیٰ کے کمالِ علوّ کو دوسرے معنوں میں عرش سے بیان کیا ہے اور وہ کوئی مادی اور جسمانی شئے نہیں ہے ورنہ زمین و آسمان وغیرہ کی طرح عرش کی پیدائش کا ذکر بھی ہوتا۔ اس لیے شبہ گزرتا ہے کہ ہے تو شئے مگر غیر مخلوق اور یہاں سے دھوکہ کھا کر آریوں کی طرف انسان چلا جاتا ہے کہ جیسے وہ خدا کے وجود کے علاوہ اور اشیاء کو غیر مخلوق مانتے ہیں۔ ویسے ہی یہ عرش کو ایک شئے غیر مخلوق جُز از خدا ماننے لگتا ہے یہ گمراہی ہے اصل میں یہ کوئی شئے خدا کے وجود سے باہر نہیں ہے جنہوں نے اُسے ایک شئے غیر مخلوق قرار دیا وہ اسے اتم اور اکمل نہیں مانتے اور جنہوں نے مادی مانا وہ گمراہی پر ہیں کہ خدا کو ایک مجسم شئے کا محتاج مانتے ہیں کہ ایک ڈولہ کی طرح فرشتوں نے اُسے اُٹھایا ہوا ہے لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا[3]۔

چار ملائک کا عرش کو اُٹھانا یہ بھی ایک استعارہ ہے ربّ۔ رحمان۔ رحیم اور مالک یوم الدین یہ صفات الٰہی کے مظہر ہیں اور اصل میں ملائکہ ہیں اور یہی صفات جب زیادہ جوش سے کام میں ہوں گے تو اُن کو (آٹھ) ملائک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص اُسے بیان نہ کرسکے وہ یہ کہے کہ یہ ایک مجہول الکنہ حقیقت ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور حقیقت خدا کے سپرد کرے اطاعت کا طریق یہی ہے کہ خدا کی باتیں خدا کے سپرد کرے اور ان پر ایمان رکھے اور اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ خدا کی تجلیاتِ ثلٰثہ کی طرف اشارہ ہے۔

كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ یہ بھی ایک تجلّی تھی اور مَاء کے معنے یہاں پانی بھی نہیں کرسکتے۔ خدا معلوم کہ اس کے نزدیک مَاء کے کیا معنے ہیں۔ اس کی کُنہ خدا کو معلوم ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ تمام قرآن شریف کو اوّل سے آخر تک پڑھو اس میں ہرگز نہیں پاؤ گے کہ عرش بھی کوئی چیز محدود اور مخلوق ہے خدا نے بار بار قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو کوئی وجود رکھتی ہے اس کا میں ہی پیدا کرنے والا ہوں۔ مَیں ہی زمین آسمان

---

[1] الروم آیت ۲۳ [2] البروج آیت ۱۶ [3] البقرۃ آیت ۲۵۶

اور رُوحوں اور ان کی تمام قوتوں کا خالق ہوں۔ مَیں اپنی ذات میں آپ قائم ہوں اور ہر ایک چیز میرے ساتھ قائم ہے۔ ہر ایک ذرّہ اور ہر ایک چیز جو موجود ہے وہ میری ہی پیدائش ہے مگر کہیں نہیں فرمایا۔ کہ عرش بھی کوئی جسمانی چیز ہے جس کا میں پیدا کرنے والا ہوں۔ اگر کوئی آریہ قرآن شریف میں سے نکال دے کہ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز ہے تو مَیں اس کو قبل اس کے جو قادیان سے باہر جائے ایک ہزار روپیہ انعام دونگا۔ مَیں اُس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کی جھوٹی قسم کھانا لعنتی کا کام ہے کہ مَیں قرآن شریف کی وہ آیت دکھاتے ہی ہزار روپیہ حوالہ کروں گا۔ ورنہ میں باادب کہتا ہوں کہ ایسا شخص خود لعنت کا محل ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔ (نسیم دعوت صفحہ ۸۳-۸۴)

(اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ پہلے اس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں امر ہے اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اُس طرز پیدائش کا نام خلق ہے خُلاصہ کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا عالم امر میں سے ہے اور مُرکّب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے مُتشکّل کرنا عالم خلق سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یعنی بسائط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مُرکّبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خُدا کا فعل ہیں اور بسیط اور مُرکّب دونوں خدائے تعالیٰ کی پیدائش ہے...... یہ کیسی اعلیٰ اور عمدہ صداقت ہے جس کو ایک مختصر آیت اور چند معدود لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے بیان کر دیا۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۷-۱۲۸)

۵۷. وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ یعنی رحمت الٰہی انہیں لوگوں سے قریب ہے جو نیکوکار ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۳۷۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

۵۸. وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

خدائے تعالیٰ وہ ذات کریم و رحیم ہے جس کا قدیم سے یہ قانون قدرت ہے کہ وہ ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے یعنی بارش سے پہلے چلاتا ہے یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بدلیوں کو اٹھا لاتی ہیں تو ہم کسی مُردہ شہر کی طرف یعنی جس ضلع میں بباعث امساک باراں زمین مُردہ کی طرح خشک ہو گئی ہو۔ ان ہواؤں کو ہانک دیتے ہیں پھر اُس سے پانی اتارتے ہیں اور اُس کے ذریعہ سے قسم قسم کے میوے پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح روحانی مُردوں کو موت کے گڑھے سے نکالا کرتے ہیں اور یہ مثال اس لیے بیان کی گئی تاکہ تم دھیان کرو اور اس بات کو سمجھ جاؤ کہ جیسا کہ ہم امساکِ باراں کی شدت کے وقت مُردہ زمین کو زندہ کر دیا کرتے ہیں ایسا ہی ہمارا قاعدہ ہے کہ جب سخت درجہ پر گمراہی پھیل جاتی ہے اور دل جو زمین سے مشابہ ہیں مر جاتے ہیں تو ہم ان میں زندگی کی روح ڈال دیتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۲۵-۵۲۶)

۵۹۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ۝

اور جو زمین پاکیزہ ہے اس کی تو کھیتی اللہ کے اذن سے جیسی کہ چاہیئے نکلتی ہے اور جو خراب زمین ہے اُس کی صرف تھوڑی سی کھیتی نکلتی ہے اور عمدہ کھیتی نہیں نکلتی۔ اسی طرح سے ہم پھیر پھیر کر بتاتے ہیں تا جو شکر کرنے والے ہیں شکر کریں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۲۶-۵۲۷)

یہ عام محاورہ قرآن شریف کا ہے کہ زمین کے لفظ سے انسانوں کے دل اور اُن کی باطنی قویٰ مراد ہوتی ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۴-۱۳۵ حصہ اول)

وَمِنْ عَلَامَاتِهِمْ أَنَّكَ تَرَاهُمْ فِي سُبُلِ اللّٰهِ مُسَارِعِيْنَ كَالدَّعْكَنَةِ۔ وَأَمَّا أُمُوْرُ الدُّنْيَا فَيَتَزَحْزَحُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُؤْثِرُوْنَهَا إِلَّا بِالْكَرَاهَةِ وَيُظْهِرُ اللّٰهُ بِهِمْ مَا صَلُحَ مِنْ أَخْلَاقِ النَّاسِ وَمَا كَانَ كَالدَّاءِ الدَّفِيْنِ۔ فَيُشَابِهُوْنَ مَطَرًا يُظْهِرُ خَوَاصَّ الْأَرَضِيْنَ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْفَاسِقِيْنَ۔ (سیرۃ الابدال صفحہ ۳)

(ترجمہ) اور ان کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ تو انہیں اللہ تعالیٰ کی راہوں پر ایک تیز رفتار اونٹنی کی مانند دوڑتا ہوا دیکھتا ہے لیکن جہاں تک دنیاوی امور کا تعلق ہے وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں اور انہیں ترجیح نہیں دیتے مگر حقارت کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ لوگوں کے عمدہ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے اور انکی اندرونی بیماری کو بھی ظاہر کرتا ہے اور وہ ایک ایسی بارش کی مانند ہیں جو زمینوں کے خواص ظاہر کرتی ہے اور پاکیزہ شہر کی نباتات اللہ کے اذن سے نکلتی ہے اور وہ جو ناپاک (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن شریف نے انبیاء و رسل کی بعثت کی مثال مینہ سے دی ہے وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا۔ یہ تمثیل اسلام کی ہے جب کوئی رسول آتا ہے تو انسانی فطرتوں کے سارے خواص ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کے ظہور کا یہ خاصہ اور علامات ہیں۔ کہ مخلص سعید الفطرت اور مستعد طبیعت کے لوگ اپنے اخلاص اور ارادت میں ترقی کرتے ہیں اور شریر شرارت میں بڑھ جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ عـ ۳۸ مورخہ ۳۱ ؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء صـ ۲)

وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا۔ نہیں نکلتی کھیتی اس کی مگر تھوڑی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم (یادداشتیں) صـ ۴)

۸۳۔ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ○

لوط کی قوم نے فسق و فجور میں جنر تک نوبت پہنچائی اور جب ان کو سمجھایا گیا تو لوط اور اس کے اصحاب کی نسبت انہوں نے اپنے رفیقوں کو وہ کہا کہ جو قرآن شریف میں درج ہے اور وہ یہ ہے أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ یعنی ان لوگوں کو اپنے گاؤں سے باہر نکالو۔ یہ تو طہارت اور تقوے لیے پھرتے ہیں یعنی ہمارے مخالف اور اور باتیں لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس خدا کا غضب انہیں قوموں پر بھڑکا اور ان کو صفحہ زمین سے ناپدید کر دیا۔

(الحکم جلد ۹ عـ ۱۴ مورخہ ۲۴ ؍ اپریل ۱۹۰۵ء صـ ۶)

۸۶۔ وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا

(بقیہ ترجمہ صفحہ سابقہ ہے (اس کی نباتات) ردّی صورت میں نکلتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور فاسقوں کے لیے مثال بیان کی ہے۔

تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ اور کسی طور سے لوگوں کو اُن کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ۔
(تقریر جلسہ مذاہب صـ۱۰۵)

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ○

رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا الخ اے ہمارے خدا ہم میں اور ہماری قوم میں سچا فیصلہ کر اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
(مسیح ہندوستان میں۔ دیباچہ صـ۱)

رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ۔ اے ہمارے خدا ہم میں اور ہماری قوم میں سچا سچا فیصلہ کر اور تو ہی ہے جو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (اعجاز احمدی صـ۱)

اے خدا ہم میں اور ہماری قوم میں سچا فیصلہ کر اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صـ۱ واربعین ۳ صـ۲۴)

اے ہمارے خدا ہم میں اور ہماری قوم میں سچا فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
(اشتہار ابتدا چشمہ معرفت) صـ۱)

اے ہمارے خدا ہم میں اور ہماری قوم میں سچا فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔
اشتہار (ابتداء انجام آتھم صـ۴۵) (سراج منیر صـ۶)

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا

بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ۝

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی رسول نہیں بھیجا۔ مگر ہم نے ان کو انکار کی حالت میں قحط اور وبا کے ساتھ پکڑا۔ تا اس طرح پر وہ عاجزی کریں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم یادداشتیں ص۸۔ و پیغام صلح ص۵۳)

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ۝

یعنی پہلی اُمتوں میں جب اُن کے نبیوں نے نشان دکھلائے تو اُن نشانوں کو دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہ لائے کیونکہ وہ نشان دیکھنے سے پہلے تکذیب کر چکے تھے اسی طرح خدا اُن کے دِلوں پر مُہریں لگا دیتا ہے جو اِس قسم کے کافر ہیں جو نشان سے پہلے ایمان نہیں لاتے۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۳۳۳-۳۳۴)

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۝

اے خدا اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر جس سے صبر آ جائے اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو۔ جاننا چاہیئے کہ دُکھوں اور مصیبتوں کے وقت میں خدا تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کے دل پر ایک نُور اتارتا ہے جس سے وہ قوّت پا کر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور حلاوت ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اُس کی راہ میں اُن کے پیروں میں پڑیں۔ جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ربّ کریم سے خواہ نخواہ کا جھگڑا شروع نہیں کرتا کہ مجھے ان بلاؤں سے بچا کیونکہ اس وقت عافیت کی دعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقت تامہ کے مخالف ہے بلکہ سچا محبّ بلا کے اُترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا بکلّی تابع ہو جاتا ہے اور اُس کی رضا چاہتا ہے اُسی کے حق میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا

ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ[1] یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا تعالیٰ کی مرضی خرید لیتا ہے وُہی لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی رحمتِ خاص کے مورد ہیں۔ غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اُس کی یہی روح ہے جو بیان کی گئی جس کو سمجھنا ہو سمجھے۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۸۸)

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○ (۱۲۸)

فرعون نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھیں گے اور تحقیقاً ہم ان پر غالب ہیں۔

(شہادت القرآن صفحہ ۲۹)

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (۱۲۹)

موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ زمین خدا کی ہے جس کو اپنے بندوں سے چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے۔

(شہادۃ القرآن صفحہ ۲۹)

جو لوگ حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ جب اُن کو پکڑتا بھی ہے تو پھر جان لینے ہی کے لیے پکڑتا ہے مگر مومن کے حق میں اُس کی یہ عادت نہیں ہے ان کی تکالیف کا انجام اچھا ہوتا ہے اور انجام کار متقی کے لیے ہی ہے۔ جیسے فرمایا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ اُن کو جو تکالیف اور مصائب آتے ہیں وہ بھی ان کی ترقیوں کا باعث بنتی ہیں تاکہ اُن کو تجربہ ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ پھر ان کے دن پھیر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

ہم اپنے مخالفوں کی مخالفت کی کیا پروا کریں۔ یہ مخالف نوبت بہ نوبت اپنے فرضِ منصبی کو سرانجام دیتے ہیں۔ ابتداء ان کی ہوتی ہے اور انجام متقیوں کا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

[1] البقرة آیت ۲۰۸۔

ہر قسم کے حسد۔ کینہ۔ بغض۔ غیبت اور کبر اور رعونت اور فسق و فجور کی ظاہری اور باطنی راہوں اور کسل اور غفلت سے بچو اور خوب یاد رکھو کہ انجام کار ہمیشہ متقیوں کا ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اس لیے متقی بننے کی فکر کرو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حکم خواتیم پر ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ سنت اللہ اسی طور پر جاری ہے کہ صادق لوگ اپنے انجام سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ یہ عاجز خوب جانتا ہے کہ جس کام کو میں نے اُٹھایا ہے۔ ابھی وہ لوگوں پر بہت مشتبہ ہے۔ اور شاید اس بات میں کچھ مبالغہ نہ ہو کہ ہنوز ایسی حالت ہے کہ بجائے فائدہ کے آثار و علامت نقصان کے نظر آتے ہیں۔ یعنی بجائے ہدایت کے ضلالت و بدظنی سہل لگتی ہے۔ مگر میں جب ایک طرف آیات قرآنی پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اوائل میں نبیوں پر ایسے سخت زلازل آئے کہ مدتوں تک کوئی صورت کامیابی کی دکھلائی نہ دی اور پھر انجام کار نسیم نصرت الٰہی کا چلنا شروع ہوا۔ اور دوسری طرف مواعید صادقہ حضرت احدیت سے بشارتیں پاتا ہوں۔ تو میرا غم دور اور بالکل دور ہو جاتا ہے اور اس بات پر تازہ ایمان آتا ہے۔ (مکتوبات احمدیہ جلد ۵ نمبر ۲ صفحہ ۵۸-۵۹ و مکتوب نمبر ۳۶ صفحہ ۵۸/۵۹)

(مباحثہ مُدّ کے ذکر پر فرمایا)

درحقیقت تو ہم نے فتح پا لی ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ دیہات کے لوگ تھے اُن کو ان باریک باتوں کی سمجھ نہیں آئی مجھے خوشبو آتی ہے کہ آخر کار فتح ہماری ہے دسمبر کے آخر تک جو نشان ظاہر ہونے والے ہیں شاید یہ بھی اُن میں سے ایک عظیم الشان نشان ہو جاوے یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے جیسے فرمایا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی (تیرہ)[13] برس تک مکروہات ہی پہنچتے رہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ رنومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۰)

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

موسیٰ کی قوم نے اُس کو جواب دیا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے جاتے تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ستائے گئے تو موسیٰ نے ان کے جواب میں کہا کہ قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین پر تمہیں خلیفے

مقرر کر دے اور پھر دیکھے کہ تم کس طور کے کام کرتے ہو۔

اب ان آیات (۱۲۸-۱۳۰ ناقل) میں صریح اور صاف طور پر وہی لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے اُن کے سامنے زندہ موجود تھے اور انہوں نے فرعون کے ظلموں کا شکوہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی اور انہیں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ تم ان تکلیفات پر صبر کرو خدا تمہاری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گا اور تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیگا اور تم کو زمین پر خلیفے بنا دیگا لیکن تاریخ دانوں پر ظاہر ہے اور یہودیوں اور نصاریٰ کی کتابوں کو دیکھنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ کہ گو اس قوم کا دشمن یعنی فرعون اُن کے سامنے ہلاک ہوا مگر وہ خود تو زمین پر نہ ظاہری خلافت پر پہنچے نہ باطنی خلافت پر۔ بلکہ اکثر اُن کی نافرمانیوں سے ہلاک کیے گئے اور چالیس برس تک بیابان لق و دق میں آوارہ رہ کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ پھر بعد ان کی ہلاکت کے ان کی اولاد میں ایسا سلسلہ خلافت کا شروع ہوا کہ بہت سے بادشاہ اِس قوم میں ہوئے اور داؤد اور سلیمان جیسے خلیفۃ اللہ اسی قوم میں سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ آخر یہ سلسلہ خلافت کا چودھویں صدی میں حضرت مسیح پر ختم ہوا۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۲۹-۳۰)

موسیٰ نے ظاہر ہو کر تین بڑے کھلے کھلے کام کیے جو دنیا پر روشن ہو گئے ایسے ہی کھلے کھلے تین کام جو دنیا پر بدیہی طور پر ظاہر ہو گئے ہوں جس نبی سے ظہور میں آئے ہوں وہی نبی مثیل موسیٰ ہو گا۔ اور وہ کام یہ ہیں (۱) اوّل یہ کہ موسیٰ نے اُس دشمن کو ہلاک کیا جو ان کی اور اُن کی شریعت کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ (۲) دوسرے یہ کہ موسےٰ نے ایک نادان قوم کو جو خدا اور اس کی کتابوں سے ناواقف تھی اور وحشیوں کی طرح چار سَو برس سے زندگی بسر کرتے تھے۔ کتاب اور خدا کی شریعت دی یعنی توریت عنایت کی اور ان میں شریعت کی بنیاد ڈالی۔ (۳) تیسرے یہ کہ بعد اس کے کہ وہ لوگ ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے ان کو حکومت اور بادشاہت عنایت کی اور ان میں سے بادشاہ بنائے۔ ان تینوں انعامات کا قرآن شریف میں ذکر ہے جیسا کہ فرمایا قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ دیکھو سورۃ الاعراف الجزو نمبر ۹ اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (سورہ نساء الجزو ۵) اب سوچکر دیکھ لو کہ ان تینوں کاموں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ذرّہ بھی مناسبت نہیں نہ وہ پیدا ہو کر یہودیوں کے دشمنوں کو ہلاک کر سکے اور نہ وہ ان کے لیے کوئی نئی شریعت لائے اور نہ انہوں نے بنی اسرائیل یا ان کے بھائیوں کو بادشاہت بخشی۔ انجیل کیا تھی وہ صرف توریت کے چند احکام کا خلاصہ ہے جس سے پہلے یہود بے خبر نہیں تھے گو اس پر

کار بند نہ تھے۔ یہود گو حضرت مسیح کے وقت میں اکثر بدکار تھے مگر پھر بھی اُن کے ہاتھ میں توریت تھی پس انصاف ہمیں اس گواہی کے لیے مجبور کرتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کچھ مماثلت نہیں رکھتے۔ اور یہ کہنا کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی اسی طرح حضرت عیسٰی نے اپنے تابعین کو شیطان کے ہاتھ سے نجات دی یہ ایسا بیہودہ خیال ہے کہ کوئی شخص گو کیسا ہی اغماض کرنے والا ہو اس خیال پر اطلاع پا کر اپنے تئیں ہنسنے سے روک نہیں سکے گا۔ مخالف کے سامنے اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ عیسٰی نے ضرور اپنے پیروؤں کو شیطان سے اسی طرح نجات دیدی جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی۔ موسیٰ کا بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دینا ایک تاریخی امر ہے جس سے نہ کوئی یہودی منکر ہو سکتا ہے نہ عیسائی نہ مسلمان نہ گبر نہ ہندو کیونکہ وہ دنیا کے واقعات میں سے ایک واقعہ مشہورہ ہے۔ مگر عیسٰی کا اپنے تابعین کو شیطان کے ہاتھ سے نجات دینا صرف اعتقادی امر ہے جو محض نصاریٰ کے خیالات میں ہے۔ خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں جس کو دیکھ کر ہر ایک شخص بدیہی طور پر قائل ہو سکے کہ ہاں یہ لوگ درحقیقت شیطان اور ہر ایک بدکاری سے نجات پا گئے ہیں اور ان کا گروہ ہر ایک بدی سے پاک ہے ..... اس پیشگوئی کا تو یہ مطلب ہے کہ وہ نبی موسیٰ کی طرح بنی اسرائیل کو یا اُن کے بھائیوں کو ایک عذاب سے نجات دیگا۔ اُسی طرح جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو عذاب سے نجات دی تھی اور نہ صرف نجات دیگا بلکہ ان کو ایّام ذلت کے بعد سلطنت بھی عطا کریگا جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو چار سو برس کی ذلت کے بعد نجات دی اور پھر سلطنت عطا کی اور پھر اس وحشی قوم کو موسیٰ کی طرح ایک نئی شریعت سے تہذیب یافتہ کریگا۔ اور وہ قوم بنی اسرائیل کے بھائی ہوں گے۔ اب دیکھو کہ کیسی صفائی اور روشنی سے یہ پیشگوئی سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری ہو گئی ہے اور ایسی صفائی سے پوری ہو گئی ہے کہ اگر مثلاً ایک ہندو کے سامنے بھی جو عقل سلیم رکھتا ہو یہ دونوں تاریخی واقعات رکھے جائیں یعنی جس طرح موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی اور پھر سلطنت بخشی اور پھر ان وحشی لوگوں کو جو غلامی میں بسر کر رہے تھے ایک شریعت بخشی اور جس طرح سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن غریبوں اور کمزوروں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے عرب کے خونخوار درندوں سے نجات دی اور سلطنت عطا کی اور پھر اس وحشیانہ حالت کے بعد ان کو ایک شریعت عطا کی تو بلاشبہ وہ ہندو دونوں واقعات کو ایک ہی رنگ میں سمجھے گا اور ان کی مماثلت کی گواہی دیگا۔ اور خود ہم جبکہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کو عرب کے خونریز ظالموں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے پروں کے نیچے لے لیا اور پھر ان لوگوں کو جو صد ہا سال سے وحشیانہ حالت میں بسر کر رہے تھے ایک نئی شریعت عطا فرمائی اور بعد ایّام ذلّت اور غلامی کے سلطنت عطا فرمائی تو بلا تکلّف موسیٰ کے زمانہ کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور پھر ذرا

اور غور کرکے جب حضرت موسیٰ کے سلسلۂ خلفاء پر نظر ڈالتے ہیں جو چودہ سو برس تک دنیا میں قائم رہا۔ تو اس کے مقابل پر سلسلہ محمدیہ بھی اسی مقدار پر ہمیں نظر آتا ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کے سلسلۂ خلفاء کے آخر میں ایک مسیح ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے ایسا ہی اس سلسلہ کے آخر میں بھی جو مقدار اور مدت میں سلسلہ موسوی کی مانند ہے ایک مسیح دکھائی دیتا ہے اور دونوں سلسلے ایک دوسرے کے مقابل پر ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ جس طرح ایک انسان کی دو آنکھیں ایک دوسری کے مقابل پر ہوتی ہیں پس اس سے بڑھ کر مماثلت کے کیا معنے ہیں اور یہی حقیقت یہ آیت ظاہر فرماتی ہے کہ رْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔[۱] (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۰-۱۲۲)

قرآن شریف کی رُو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسی کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے کہ ایک جگہ یہود کے حق میں لکھا ہے۔ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ[۲] دوسری جگہ مسلمانوں کے حق میں لکھا ہے۔ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ[۳] ان دونوں آیتوں کے یہ معنے ہیں کہ خدا تمہیں خلافت اور حکومت عطا کرکے پھر دیکھے گا کہ تم راستبازی پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ ان آیتوں میں جو الفاظ یہود کے لیے استعمال کیے ہیں وہی مسلمانوں کے لیے۔ یعنی ایک ہی آیت کے نیچے ان دونوں کو رکھا ہے پس ان آیتوں سے بڑھ کر اس بات کے لیے اور کونسا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دیدیا ہے۔ اور صاف اشارہ کر دیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء ان کے۔ اس امت کے علماء بھی انہیں بدیوں کے مرتکب ہوں گے۔ اور اسی مفہوم کی طرف آیت غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں بھی اشارہ ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۰)

یہودیوں کے بادشاہوں کے ان مثیلوں کا جو اسلام میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان دو بالمقابل آیتوں سے جن کے الفاظ باہم ملتے ہیں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں :۔

یہودیوں کے بادشاہوں کی نسبت	اسلام کے بادشاہوں کی نسبت
قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (الجزو ۹ سورہ الاعراف صفحہ ۲۶۵)	ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (الجزو ۱۱ سورہ یونس صفحہ ۳۳۵)

یہ دو فقرے یعنی فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ جو یہودیوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے اور اس کے مقابل پر دوسرا فقرہ یعنی لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ جو مسلمانوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے صاف بتلا رہے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے بادشاہوں کے واقعات بھی باہم متشابہ ہوں گے۔ سو ایسا ہی ظہور میں آیا اور جس طرح یہودی بادشاہوں سے قابل شرم خانہ جنگیاں ظہور میں آئیں اور اکثر کے چال چلن بھی خراب ہو گئے یہاں تک کہ بعض ان میں سے بدکاری شراب نوشی۔ خونریزی اور سخت بے رحمی میں ضرب المثل ہو گئے یہی طریق اکثر مسلمانوں کے بادشاہوں نے اختیار

[۱] المزمل آیت ۱۶ [۲] اعراف آیت ۱۳۰ [۳] یونس۔ آیت ۱۵

گیے۔ ہاں بعض یہودیوں کے نیک اور عادل بادشاہوں کی طرح نیک اور عادل بادشاہ بھی بنے جیسا کہ عمر بن عبدالعزیز۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۴-۱۲۵)

ایک جگہ مسلمانوں کے آخری زمانہ کے لیے قرآن شریف نے وہ لفظ استعمال کیا ہے جو یہود کے لیے استعمال کیا تھا یعنی فرمایا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ تم کو خلافت اور سلطنت دی جائیگی۔ مگر آخری زمانہ میں تمہاری بداعمالی کی وجہ سے وہ سلطنت تم سے چھین لی جائے گی۔ جیسا کہ یہودیوں سے چھین لی گئی تھی۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۱۴)

حضرت اقدس نے فرمایا :-

وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ - یہ آیتیں بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایک ان میں سے اہل اسلام کی نسبت ہے اور ایک یہود کی نسبت پس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر طرح کا انعام کرونگا اور پھر دیکھونگا کہ کس طرح شکر کرتے ہو۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اہل یہود کو کونسی بڑی مصیبت تھی تو وہ دو بڑی مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ عیسٰی علیہ السلام کا انکار کیا گیا اور ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا پس مماثلت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے بھی وہی دو انکار رکھے تھے۔ مگر وہاں شمار میں الگ الگ دو وجود تھے اور یہاں نام الگ الگ ہیں مگر وہ وجود جس میں ان دونوں کا بروز ہو ایک ہی ہے ایک بروز عیسوی اور ایک محمدی۔ اور صرف نام کے لحاظ سے اہل اسلام یہود کے بروز اس طرح سے قرار پائے کہ انہوں نے مسیح اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا اور وہ مماثلت پوری ہوگئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس امت میں بُرزی طور پر وہی کرتوت یہودیوں والی پوری ہونی تھی اور یہ اس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ آنے والا دو رنگ لیکر آوے گا اسی لیے مہدی اور مسیح کے زمانہ کی علامات ایک ہی ہیں اور ان دونوں کا فعل بھی ایک ہی رہے)

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۸-۲۵۹)

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

بعض آدمیوں نے کہا ہے کہ یہ طاعون گویا ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی کہا گیا تھا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ مگر مجھے

یہ تعجب ہے کہ یہ لوگ طاعون کو ہماری شامتِ اعمال کا نتیجہ بتاتے ہیں لیکن مبتلا خود ہوتے ہیں حالانکہ اگر شامت اعمال تھی تو چاہیئے تھا کہ طاعون کی خبر تم کو دی جاتی مگر یہ کیا ہوا کہ خبر بھی ہم کو دی گئی اور موتیں تم میں ہوتی ہیں برخلاف اس کے کہ ہماری حفاظت کا وعدہ کیا جاتا اور اسے ایک نشان ٹھہرایا جاتا ہے۔ کچھ تو خدا سے ڈرو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

(الاعراف: ۱۴۳) وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○

پھر ہم کہتے ہیں کہ جس حالت میں وعدہ کی تاریخ ٹلنا نصوص قرآنیہ قطعیہ یقینیہ سے ثابت ہے جیسا کہ آیت وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً اس کی شاہد ناطق ہے تو وعید کی تاریخیں جو نزول عذاب پر دال ہوتی ہیں جس کا ٹلنا اور ردبلا ہونا توبہ استغفار اور صدقات سے باتفاق جمیع انبیاء علیہم السلام ثابت ہے پس ان تاریخوں کا ٹلنا بوجہ اولیٰ ثابت ہوا اور اس سے انکار کرنا صرف سفیہ اور نادان کا کام ہے نہ کسی صاحب بصیرت کا۔

(ضمیمہ انوار الاسلام ـــــ اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ صفحہ ۱۳)

(الاعراف: ۱۴۴) وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا پس جب کہ خدا نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کو پاش پاش کر دیا۔ یعنی مشکلات کے پہاڑ آسان ہوئے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جب خدا مشکلات کے پہاڑ پر تجلّی کریگا تو انہیں پاش پاش کر دیگا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴ و سراج منیر صفحہ ۲۹)

اور تجلّی کی اس کے رب نے پہاڑ پر یعنی مشکلات کے پہاڑ پر اور کر دیا اس کو پاش پاش اور گرا موسیٰ بیہوش ہو کر یعنی ایسی تجلّی ہیبت ناک تھی کہ اس کی ہیبت کا اثر موسیٰ پر بھی پڑا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب خدا پہاڑ پر تجلّی کرے گا تو اس کو پارہ پارہ کر دیگا۔ (تبلیغ رسالت مجموعہ اشتہارات جلد ۱ صفحہ ۹۱و۹۲)

جب طالب کمال وصال کا خدا کے لیے اپنے تمام وجود سے الگ ہو جاتا ہے اور کوئی حرکت اور سکون اس کا اپنے لیے نہیں رہتا بلکہ سب کچھ خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو اس حالت میں اس کو ایک روحانی موت پیش آتی ہے جو بقا کو مستلزم ہے پس اس حالت میں گویا وہ بعد موت کے زندہ کیا جاتا ہے اور غیر اللہ کا وجود اس کی آنکھ میں باقی نہیں رہتا یہاں تک کہ غلبہ شہود ہستی الٰہی سے وہ اپنے وجود کو بھی نابود ہی خیال کرتا ہے پس یہ مقام عبودیت و فناء اتم ہے جو غایت سیر اولیاء ہے اور اسی مقام میں غیب سے باذن اللہ ایک نور سالک کے قلب پر نازل ہوتا ہے جو تقریر اور تحریر سے باہر ہے۔

غلبہ شہود کی ایک ایسی حالت ہے کہ جو علم الیقین اور عین الیقین کے مرتبہ سے برتر ہے۔ صاحب شہود تام کو ایک علم تو ہے مگر ایسا علم جو اپنے ہی نفس پر وارد ہو گیا ہے جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہے۔ سو اگرچہ وہ بھی جلنے کا ایک علم رکھتا ہے مگر وہ علم الیقین اور عین الیقین سے برتر ہے۔ کبھی شہود تام بے خبری تک بھی نوبت پہنچا دیتا اور حالت سُکر اور بیہوشی کی غلبہ کرتی ہے اس حالت سے یہ آیت مشابہ ہے فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا لیکن حالت تام وہ ہے جس کی طرف اشارہ ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى یہ حالت اہل جنت کے نصیب ہوگی (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء حاشیہ)

موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہو کر گرنا ایک واقعہ نورانی تھا جس کا موجب کوئی جسمانی ظلمت نہ تھی بلکہ تجلیات صفات الٰہیہ جو بغایت اشراق نور ظہور میں آئی تھیں۔ وہ اس کا موجب اور باعث تھیں جن کی اشراق تام کی وجہ سے ایک عاجز بندہ عمران کا بیٹا بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اور اگر عنایت الٰہیہ اُس کا تدارک نہ کرتیں۔ تو اُسی حالت میں گداز ہو کر نابود ہو جاتا۔ مگر یہ مرتبہ ترقیات کاملہ کا انتہائی درجہ نہیں ہے۔ انتہائی درجہ وہ ہے جس کی نسبت لکھا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى [1] (مکتوبات جلد ۱ صفحہ ۱۲)

(۱۴۹) وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۝

جب لیکھرام نے نہایت اصرار کے ساتھ اپنی موت کے لیے مجھ سے پیشگوئی چاہی تو مجھے دعا کے بعد

[1] النجم ۔ آیت ۱۸

یہ الہام ہوا۔ عِجْلٌ جَسَدٌ لَّہٗ خُوَارٌ۔ لَہٗ نَصَبٌ وَّعَذَابٌ یعنی یہ ایک بیجان گوسالہ ہے جس میں مارے جانے کے وقت گوسالہ کی طرح ایک آواز نکلے گی اور اس میں جان نہیں اور اس کے لیے نصب اور عذاب ہے۔ لسان العرب میں جو لغتِ عرب میں ایک پرانی اور معتبر کتاب ہے لفظ نصب کے معنے علاوہ اور کئی معنوں کے ایک یہ بھی لکھے ہیں کہ جب کہا جائے نَصَبَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کسی شخص نے اس شخص پر جان لینے کے لیے حملہ کیا اور دشمنی کی راہ سے اس کے فنا کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ لسان العرب کے اس مقام میں اپنے لفظ یہ ہیں نَصَبَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ نَصْبًا اِذَا قَصَدَ لَہٗ وَعَادَاہُ وَتَجَرَّدَ لَہٗ جس کے یہی معنے ہیں جو اوپر کیے گئے۔ دیکھو لسان العرب لفظ نصب صفحہ ۲۵۸ سطر ۲۔ اور خوار کا لفظ لغت عرب میں گوسالہ کی آواز کے لیے آتا ہے۔ لیکن جب انسان پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس موقع پر کرتے ہیں جبکہ کوئی مقتول قتل ہونے کے وقت گوسالہ کی طرح آواز نکالتا ہے جیسا کہ اُسی لسان العرب میں خوار کے لفظ کے بیان میں صفحہ ۳۴۵ میں ان معنوں کی تصدیق کے لیے ایک حدیث لکھی ہے اور وہ یہ ہے وَفِیْ حَدِیْثِ مَقْتَلِ اُبَیِّ ابْنِ خَلَفٍ فَخَرَّ یَخُوْرُ کَمَا یَخُوْرُ الثَّوْرُ یعنی جب اُبیّ بن خلف قتل کیا گیا تو یوں آواز نکالتا تھا جیسے کہ بیل آواز نکالتا ہے اور کبھی خوار کا لفظ عرب کی زبان میں اُس ہتھیار کی آواز پر بولا جاتا ہے جو چلایا جاتا ہے چنانچہ لسان العرب کے اُسی صفحہ ۳۴۵ میں ایک نامی شاعر عرب کا اس محاورہ کے حوالہ میں ایک شعر لکھا ہے اور وہ یہ ہے:۔

یَخُرْنَ اِذَا اُنْفِزْنَ فِیْ سَاقِطِ النَّدٰی ‏ ‏ ‏ وَاِنْ کَانَ یَوْمًا ذَا اَھَاضِیْبَ مُخْضِلًا

یعنی ان تیروں میں سے جو چلائے جاتے ہیں اور پھر نکالے جاتے ہیں گوسالہ کی آواز کی طرح ایک آواز آتی ہے۔ اگرچہ ایسا دن ہو جس میں متواتر بارش ہوئی ہو اور ہر ایک چیز کو تر کر دیتا ہو۔ ...... غرض اس نہایت معتبر کتاب سے جو لسان العرب ہے ثابت ہوتا ہے کہ خور اور خوار کے لفظ کو انسان پر اُس حالت میں بھی بولتے ہیں کہ جب وہ قتل ہونے کے وقت فریاد کرتا ہے اور قتل کے وقت جو ہتھیار کی آواز ہوتی ہے اس کا نام بھی خوار ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۰۶ و ۱۰۷)

خروج باب ۳۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ گوسالہ سامری کے نیست و نابود کرنے کا ارادہ یہود کی عید کے دن میں کیا گیا تھا مگر آگ میں جلانا اور باریک پیسنا اور غبار کی مانند بنانا جیسا کہ ۳۲/۲۰ خروج میں لکھا ہے یہ فرصت طلب کام تھا اس بڑے کام نے ضروررات کا کچھ حصہ لیا ہوگا کیونکہ حضرت موسیٰ اُس وقت اترے تھے جب گوسالہ پرستی کا میلہ خوب گرم ہوگیا تھا اور یہ وقت غالباً دوپہر کے بعد میں ہوگا اور پھر کچھ عرصہ ناراضگی اور غضب میں گذرا۔ لہٰذا یہ قطعی امر ہے کہ سونے کا جلانا اور خاک کی طرح کرنا کچھ حصہ رات تک جو دوسرے دن میں محسوب ہوتے ہی ختم ہوا ہوگا۔

(سراج منیر صفحہ ۵۸-۵۹ حاشیہ)

یہ گوسالہ بیجان ہے جس میں سے مہمل آواز آرہی ہے پس اس کے لیے دُکھ کی مار اور عذاب ہے (ست بچن صفحہ ۱۰۴ استفتاء صفحہ ۱)

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ○

جنہوں نے گوسالہ پرستی کی اُن پر غضب کا عذاب پڑیگا اور دنیا کی زندگی میں اُن کو ذلت پہنچے گی اور اسی طرح ہم دوسرے مفتریوں کو سزا دیں گے اور یہ ایک لطیف اشارہ اُن گوسالہ پرستوں کی طرف بھی ہے جو اس دوسرے گوسالہ یعنی لیکھرام کی پرستش کرنے میں ظلم اور خونریزی کے ارادوں تک پہنچ گئے خدا تعالیٰ کے علم سے کوئی شے باہر نہیں وہ خوب جانتا تھا کہ ہندو بھی لیکھرام کی پرستش کر کے اُس کو گوسالہ بنائیں گے اس لیے اس نے کذالک کے لفظ سے لیکھرام کے قصہ کی طرف اشارہ کر دیا توریت خروج باب ۳۲ آیت ۳۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر گوسالہ پرستی کے سبب سے موت بھیجی تھی یعنی ایک وبا ان میں پڑ گئی تھی جس سے وہ مر گئے تھے اور اس عذاب کی خبر کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جو لوگ ایمان لائیں گے میں ان کو نجات دوں گا جیسا کہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی جنہوں نے گوسالہ پرستی کی دُھن میں بُرے کام کیے پھر بعد اس کے توبہ کی اور ایمان لائے تو خدا تعالیٰ ایمان کے بعد اُن کے گناہ بخش دیگا اور ان پر رحم کرے گا کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے۔ (سراج منیر صفحہ ۵۹)

جنہوں نے گوسالہ کو عزت دی اور اُس کی پرستش کی۔ اُن پر غضب آئے گا اور ذلت کی مار اُن پر پڑے گی۔ سو دنیا میں غضب نازل ہونے سے مراد طاعون ہے (نزول المسیح صفحہ ۱۵۵ پیشگوئی نمبر ۳۴)

جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں عنقریب خدا تعالیٰ کا غضب ان پر وارد ہوگا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۸ صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳)

جو لوگ عداوت سے باز نہیں آتے۔ عنقریب ان پر غضب الٰہی نازل ہوگا۔ (تبلیغ رسالت مجموعہ اشتہارات جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)

وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ ۭ قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

الاعراف آیت ۱۵۲،۱۵۴

وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ۝

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ میں اپنا عذاب جس کو لائق اُس کے دیکھتا ہوں۔ پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر ایک چیز کو گھیر رکھا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۳۷۵ حاشیہ نمبر ۱)

مَیں جس کو چاہتا ہوں عذاب پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز پر احاطہ کر رکھا ہے سو میں اُن کے لیے جو ہر ایک طرح کے شرک اور کفر اور فواحش سے پرہیز کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور نیز اُن کے لیے جو ہماری نشانیوں پر ایمان کامل لاتے ہیں اپنی رحمت لکھونگا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۶۳)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت عام اور وسیع ہے اور غضب یعنی صفت عدل بعد کسی خصوصیت کے پیدا ہوتی ہے یعنی یہ صفت قانون الٰہی سے تجاوز کرنے کے بعد اپنا حق پیدا کرتی ہے اور اس کے لیے ضرور ہے کہ اوّل قانون الٰہی ہو اور قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی سے گناہ پیدا ہو اور پھر یہ صفت ظہور میں آتی ہے اور اپنا تقاضا پورا کرنا چاہتی ہے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۲ ۔ روئداد جلسہ مباحثہ ۳۱؍ مئی ۱۸۹۳ء)

وعید میں دراصل کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدوسیت کی وجہ سے تقاضا فرماتا ہے کہ شخص مجرم کو سزا دے اور بسا اوقات اس تقاضا سے اپنے ملہمین کو اطلاع بھی دیدیتا ہے پھر جب شخص مجرم توبہ اور استغفار اور تضرّع اور زاری سے اُس تقاضا کا حق پورا کر دیتا ہے تو رحمت الٰہی کا تقاضا غضب کے تقاضا پر سبقت لے جاتا ہے اور اس غضب کو اپنے اندر محجوب و مستور کر دیتا ہے یہی معنے ہیں اس آیت کے کہ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ۔ یعنی رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ. اگر یہ اصول نہ مانا جائے تو تمام شریعتیں باطل ہو جاتی ہیں۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۶)

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ۔ عذاب تو میرا خاص صورتوں میں ہے جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر ایک چیز کو پہنچ رہی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۷)

آریہ وغیرہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کو غضب ناک کہا گیا ہے۔ یہ ان کی صریح غلطی ہے ان کو چاہیئے تھا کہ قرآن مجید کی دوسری جگہوں پر نظر کرتے۔ وہاں تو صاف طور پر لکھا ہے۔ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ خدا کی رحمت تو کل چیزوں کے شامل حال ہے۔ مگر ان کو دقت ہے تو یہ ہے کہ خدا کی رحمت کے تو وہ قائل ہی نہیں۔ اُن کے مذہبی اصول کے بموجب اگر کوئی شخص بعد شکل مکتی حاصل کر بھی لے۔ تو آخر پھر وہاں سے نکلنا ہی پڑے گا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

چالاکی سے علوم القرآن نہیں آتے۔ دماغی قوت اور ذہنی ترقی قرآنی علوم کو جذب کرنے کا اکیلا باعث نہیں ہو سکتا۔ اصل ذریعہ تقویٰ ہی ہے متقی کا معلّم خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں پر امیّت غالب ہوتی ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے اُمّی بھیجا کہ باوجودیکہ آپ نے نہ کسی مکتب میں تعلیم پائی اور نہ کسی کو استاد بنایا۔ پھر آپ نے وہ معارف اور حقائق بیان کیے جنہوں نے دنیوی علوم کے ماہروں کو دنگ اور حیران کر دیا قرآن شریف جیسی پاک کامل کتاب آپ کے لبوں پر جاری ہوئی جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے عرب کو خاموش کرا دیا۔ وہ کیا بات تھی جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علوم میں سب سے بڑھ گئے۔ وہ تقویٰ ہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مطہر زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف جیسی کتاب وہ لائے جس کے علوم نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔

آپ کا اُمّی ہونا ایک نمونہ اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی علوم یا آسمانی علوم کے لیے تقویٰ مطلوب ہے نہ دنیوی چالاکیاں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۲و۳)

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ مَعَهٗٓ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ یہ نبی ان باتوں کے لیے حکم دیتا ہے جو خلافِ عقل نہیں ہیں اور ان باتوں سے منع کرتا ہے جن سے عقل بھی منع کرتی ہے۔ اور پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک کو حرام

ٹھہراتا ہے۔ اور قوموں کے سر پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جس کے نیچے وہ دبی ہوئی تھیں اور ان گردنوں کے طوقوں سے وہ رہائی بخشتا ہے جن کی وجہ سے گردنیں سیدھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے۔ اور اپنی شمولیت کے ساتھ اس کو قوت دیں گے اور اس کی مدد کریں گے۔ اور اُس نور کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہ دنیا اور آخرت کی مشکلات سے نجات پائیں گے۔ (براہین احمدیہ پنجم یادداشتیں ص۵ دپیغام صلح ص۵)

وہ وہی لوگ ہیں جو اُس رسول نبی پر ایمان لاتے ہیں کہ جس میں ہماری قدرتِ کاملہ کی دو نشانیاں ہیں ایک تو بیرونی نشانی کہ توریت اور انجیل میں اُس کی نسبت پیشین گوئیاں موجود ہیں جن کو وہ آپ بھی اپنی کتابوں میں موجود پاتے ہیں دوسری وہ نشانی کہ خود اُس نبی کی ذات میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ باوجود اُمّی اور ناخواندہ ہونے کے ایسی ہدایت کامل لایا ہے کہ ہر ایک قسم کی حقیقی صداقتیں جن کی سچائی کو عقل و شرع شناخت کرتی ہے اور جو صفحۂ دُنیا پر باقی نہیں رہی تھیں لوگوں کی ہدایت کے لیے بیان فرماتا ہے اور اُن کو اُس کے بجالانے کے لیے حکم کرتا ہے اور ہر ایک نامعقول بات سے کہ جس کی سچائی سے عقل و شرع انکار کرتی ہے منع کرتا ہے اور پاک چیزوں کو پاک اور پلید چیزوں کو پلید ٹھہراتا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے سر پر سے وہ بھاری بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر پڑے ہوئے تھے اور جن طوقوں میں وہ گرفتار تھے اُن سے خلاصی بخشتا ہے سو جو لوگ اس پر ایمان لا دیں اور اس کو قوت دیں اور اُس کی مدد کریں اور اُس نور کی بکلّی متابعت اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ وہی لوگ نجات یافتہ ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۷۳-۴۷۵)

۱۵۹۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

یہ وسواس کہ خدا نے اپنی کتاب اُمّیوں اور بدوؤں کے لیے بھیجی ہے (اُن کی سمجھ کے موافق چاہیئے) ٹھیک نہیں ہے۔ اوّل تو اس میں یہ جھوٹ ہے کہ وہ کلام نرا اُمّیوں کی تعلیم کے لیے نازل ہوا ہے خدا نے تو آپ ہی فرما دیا ہے کہ تمام دُنیا اور مختلف طبائع کی اصلاح کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے جیسے اُمّی اس کتاب میں مخاطب ہیں ایسے ہی عیسائی اور یہودی اور مجوسی اور صابئین اور لامذہب اور دہریہ وغیرہ تمام

فرقے مخاطب ہیں اور سب کے خیالات فاسدہ کا اس میں ردّ موجود ہے سب کو سنایا گیا ہے قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا الجزو۹ پھر جبکہ ثابت ہے کہ قرآن شریف کو تمام دنیا کے طبائع سے کام پڑا تو تم خود ہی سوچو کہ اس صورت میں لازم تھا یا نہیں کہ وہ ہر ایک طور کی طبیعت پر اپنی عظمت اور حقّانیّت کو ظاہر کرتا اور ہر ایک طور کے شبہات کو مٹاتا۔ ماسوا اس کے اگرچہ اس کلام میں اُمّی بھی مخاطب ہیں مگر یہ تو نہیں کہ خدا اُمّیوں کو اُمّی ہی رکھنا چاہتا تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ جو طاقتیں انسانیت اور عقل کی اُن کی فطرت میں موجود ہیں وہ مکمن قوّت سے حیّز فعل میں آجائیں۔ اگر نادان کو ہمیشہ کے لیے نادان ہی رکھنا ہے تو پھر تعلیم کا کیا فائدہ ہوا خدا نے تو علم اور حکمت کی طرف آپ ہی رغبت دیدی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۱۲-۴۱۶)

لوگوں کو کہہ دے کہ مَیں خدا کی طرف سے تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ وہ خدا جو بلا شرکت الغیری آسمان اور زمین کا مالک ہے جس کے سوا اور کوئی خدا اور قابل پرستش نہیں۔ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پس اس خدا پر اور اس کے رسول پر جو نبی اُمّی ہے ایمان لاؤ۔ وہ نبی جو اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تا تم ہدایت پاؤ۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۷۵-۴۷۶)

یہ ہرگز سچ نہیں کہ جو کچھ قرآن کریم کے معارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اُن سے زیادہ قرآن کریم میں کچھ بھی نہیں۔ یہ اقوال ہمارے مخالفوں کے صاف دلالت کر رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی غیر محدودہ عظمتوں اور خوبیوں پر ایمان نہیں لاتے اور ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم ایسوں کے لیے اُترا ہے جو اُمّی تھے اَور بھی اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ قرآن شناسی کی بصیرت سے بکلی بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض امیوں کے لیے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہر یک رتبہ اور طبقہ کے انسان اُن کی اُمّت میں داخل ہیں۔ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا پس اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہر یک استعداد کی تکمیل کے لیے نازل ہوا ہے اور درحقیقت آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ[۱] میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (کرامات الصادقین ص۱۹)

وہ قانون جو عام عدل اور احسان اور ہمدردی کے لیے دنیا میں آیا وہ صرف قرآن شریف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ یعنی کہو اے لوگو مَیں تم سب کی طرف رسول کرکے بھیجا گیا ہوں (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۳)

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا لوگوں کو کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف پیغمبر ہو کر آیا ہوں۔ (نور القرآن ۱ ص۲)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں نہیں کہا کہ مَیں صرف عرب کے لیے بھیجا گیا ہوں بلکہ قرآن شریف میں یہ ہے

[۱] الاحزاب آیت ۴۱

قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا یعنی لوگوں سے کہہ دے کہ میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

(پیغام صلح ص۴۴)

قرآن شریف میں یہ نہیں لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے لیے بھیجے گئے ہیں بلکہ لکھا ہے کہ وہ تمام دنیا کے لیے بھیجے گئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ یعنی لوگوں کو کہہ دے کہ میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں نہ صرف ایک قوم کے لیے ہوں۔

(لیکچر چشمہ معرفت ص۱۶)

اے تمام انسانو۔ جو زمین پر رہتے ہو۔ میں سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ نہ کسی خاص قوم کی طرف اور سب کی ہمدردی میرا مقصد ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت ص۲۴)

اِس وقت کے تمام مخالف مولویوں کو ضرور یہ بات ماننی پڑے گی کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاءؑ تھے اور آپ کی شریعت تمام دنیا کے لیے عام تھی اور آپ کی نسبت فرمایا گیا تھا وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور نیز آپ کو یہ خطاب عطا ہوا تھا قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ سو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد حیات میں وہ تمام متفرق ہدایتیں جو حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک تھیں۔ قرآن شریف میں جمع کی گئیں لیکن مضمون آیت قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عملی طور پر پورا نہیں ہوسکا۔ کیونکہ کامل اشاعت اس پر موقوف تھی کہ تمام ممالک مختلفہ یعنی ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکہ اور آبادی دنیا کے انتہائی گوشوں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تبلیغ قرآن ہوجاتی اور یہ اس وقت غیر ممکن تھا بلکہ اس وقت تک تو دنیا کی کئی آبادیوں کا ابھی پتہ بھی نہیں لگا تھا اور دور دراز سفروں کے ذرائع ایسے مشکل تھے کہ گویا معدوم تھے بلکہ اگر وہ ساٹھ برس الگ کر دیئے جائیں جو اس عاجز کی عمر کے ہیں تو ۱۲۵۰ ہجری تک بھی اشاعت کے وسائل کاملہ گویا کالعدم تھے اور اس زمانہ تک امریکہ کل اور یورپ کا اکثر حصہ قرآنی تبلیغ اور اس کے دلائل سے بے نصیب رہا ہوا تھا بلکہ دور دور ملکوں کے گوشوں میں تو ایسی بے خبری تھی کہ گویا وہ لوگ اسلام کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ غرض آیت موصوفہ بالا میں جو فرمایا گیا تھا کہ اے زمین کے باشندو! میں تم سب کی طرف رسول ہوں عملی طور پر اس آیت کے مطابق تمام دنیا کو ان دنوں سے پہلے ہرگز تبلیغ نہیں ہوسکی اور نہ اتمام حجت ہوا کیونکہ وسائل اشاعت موجود نہیں تھے اور نیز زبانوں کی اجنبیت سخت روک تھی اور نیز یہ کہ دلائل حقانیت اسلام کی واقفیت اس پر موقوف تھی کہ اسلامی ہدایتیں غیر زبانوں میں ترجمہ ہوں اور یا وہ لوگ خود اسلام کی زبان سے واقفیت پیدا کرلیں اور یہ دونوں امر اس وقت غیر ممکن تھے۔ لیکن قرآن شریف کا یہ فرمانا کہ وَمَنْ بَلَغَ (انعام ۲۰) یہ امید دلاتا تھا کہ ابھی اور بہت سے لوگ ہیں جو ابھی تبلیغ قرآنی اُن تک نہیں پہنچی ایسا ہی آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (جمعہ ۴) اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ

گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہدایت کا ذخیرہ کامل ہوگیا مگر ابھی اشاعت ناقص ہے اور اس آیت میں جو مِنْھُمْ کا لفظ ہے وہ ظاہر کر رہا تھا کہ ایک شخص اُس زمانہ میں جو تکمیل اشاعت کے لیے موزوں ہے مبعوث ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں ہوگا اور اس کے دوست مخلص صحابہ کے رنگ میں ہوں گے .... اس وقت حسب منطوق آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ اور نیز حسب منطوق آیت قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے بعث کی ضرورت ہوئی اور ان تمام خادموں نے جو ریل اور تار اور اگن بوٹ اور مطابع اور احسن انتظام ڈاک اور باہمی زبانوں کا علم اور خاص کر ملک ہند میں اردو نے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک زبان مشترک ہوگئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بزبان حال درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تمام خدام حاضر ہیں اور فرض اشاعت پورا کرنے کے لیے بدل وجان سرگرم ہیں۔ آپ تشریف لائیے اور اس اپنے فرض کو پورا کیجیئے کیونکہ آپ کا دعوٰے ہے کہ میں تمام کافہ ناس کے لیے آیا ہوں اور اب یہ وہ وقت ہے کہ آپ اُن تمام قوموں کو جو زمین پر رہتی ہیں قرآنی تبلیغ کر سکتے ہیں اور اشاعت کو کمال تک پہنچا سکتے ہیں اور اتمام حجت کے لیے تمام لوگوں میں دلائل حقانیت قرآن پھیلا سکتے ہیں۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے جواب دیا کہ دیکھو میں بروز کے طور پر آتا ہوں۔ مگر میں ملک ہند میں آؤں گا کیونکہ جوش مذاہب و اجتماع جمیع ادیان اور مقابلہ جمیع ملل ونحل اور امن اور آزادی اسی جگہ ہے اور نیز آدم علیہ السلام اسی جگہ نازل ہوا تھا پس ختم دور زمانہ کے وقت بھی وہ جو آدم کے رنگ میں آتا ہے اسی ملک میں اس کو آنا چاہیئے تا آخر اور اوّل کا ایک ہی جگہ اجتماع ہو کر دائرہ پورا ہو جائے۔ (تحفہ گولڑویہ ص ۹۹-۱۰۱)

قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا۔ انسانی آداب سے مہذب انسان بنانا۔ تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو۔ اور پھر باخدا انسان بنانا۔ گو یہ لفظ مختصر ہیں مگر ان کے ہزارہا شعبے ہیں۔ چونکہ یہودیوں۔ طبیعیوں۔ آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں بدروشنی کی رُوح کام کر رہی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلام الٰہی سب کو مخاطب کر کے کہا یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ اس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف ان تعلیمات کا جامع ہوتا جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں۔ اور ان تمام صداقتوں کو اپنے اندر رکھتا جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعہ سے زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ قرآن کریم کے مدّنظر تمام نوع انسان تھا نہ کوئی خاص قوم اور ملک اور زمانہ۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص ۸۶)

قرآن شریف کے دوسرے مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اُمّی فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے آپ کا کوئی استاد نہ تھا۔ مگر بایں ہمہ کہ آپ اُمّی تھے۔ حضور کے دین میں اُمّیّوْنَ اوسط درجہ کے آدمیوں کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور عالموں کو بھی کر دیا جس سے قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ کے معنے نہایت ہی لطیف طور پر سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ جمیعًا کے دو معنے ہیں۔ اوّل تمام بنی نوع انسان یا تمام مخلوق۔ دوّم تمام طبقہ کے آدمیوں کے لیے یعنی متوسط ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفروں اور ہر ایک قسم کی عقل رکھنے والوں کے لیے۔ غرض ہر عقل اور ہر مزاج کا آدمی مجھ سے تعلق کر سکتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

ایک شخص جو کل دنیا کی اصلاح کے لیے آنے والا تھا کب ہو سکتا تھا کہ وہ ایک معمولی انسان ہوتا! جس قدر انبیاء علیہم السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آئے وہ سب ایک ایک خاص قوم کے لیے آئے تھے اس لیے ان کی شریعت مختص القوم اور مختص الزمان تھی۔ مگر ہمارے نبی وہ عظیم الشان نبی ہیں جن کے لیے حکم ہوا کہ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[1] اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ اس لیے جس قدر عظمتیں آپ کی بیان ہوئی ہیں مصلحت الٰہی کا بھی یہی تقاضا تھا کیونکہ جس پر ختم نبوت ہونا تھا اگر وہ اپنے کمالات میں کوئی کمی رکھتا تو پھر وہی کمی آئندہ اُمت میں رہتی۔ کیونکہ جس قدر کمالات اللہ تعالیٰ کسی نبی میں پیدا کرتا ہے اسی قدر اس کی اُمت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جس قدر کمزور تعلیم وہ لاتا ہے اتنا ہی ضعف اس کی اُمت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمّت و استعداد اور عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا اس لیے آپ کو جو کلام ملا وہ بھی اس پایہ اور رتبہ کا ہے کہ دوسرا کوئی شخص اس ہمّت اور حوصلہ کا کبھی پیدا نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کی دعوت کسی محدود وقت یا مخصوص قوم کے لیے نہ تھی جیسے آپ سے پہلے نبیوں کی ہوتی تھی بلکہ آپ کے لیے فرمایا گیا قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ جس شخص کی بعثت اور رسالت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

عادت اللہ اسی طرح پر ہے زمانہ ترقی کرتا ہے آخر وہ زمانہ آ گیا جو خاتم النبیین کا زمانہ تھا جو ایک ہی شخص تھا جس نے یہ کہا يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا کہنے کو تو یہ چند لفظ ہیں اور ایک اندھا کہہ سکتا ہے کہ معمولی بات ہے مگر جو دل رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے اور جو کان رکھتا ہے وہ سنتا ہے جو آنکھیں رکھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی نہیں ہیں میں کہتا ہوں اگر یہ معمولی لفظ تھے تو بتلاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام کو یا مسیح علیہ السلام یا کسی نبی کو بھی یہ طاقت کیوں نہ ہوئی کہ وہ یہ لفظ کہہ دیتا۔ اصل یہی ہے جس کو یہ قوت یہ منصب نہیں ملا وہ وہ کیونکر کہہ سکتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کسی نبی کو یہ شوکت یہ جلال نہ ملا جو ہمارے نبی کریمؐ کو ملا۔ بکری کو اگر ہر روز گوشت کھلاؤ تو وہ گوشت کھاتے سے شیر نہ بن سکے گی شیر کا بچہ ہی شیر ہوگا۔ پس یاد رکھو یہی بات سچ ہے کہ اس

[1] انبیاء آیت ۱۰۸

نام کا مستحق اور واقعی حقدار ایک تھا جو محمد کہلایا۔ یہ دادِ الٰہی ہے جس کے دل و دماغ میں چاہے یہ قوتیں رکھ دیتی ہے۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ ان قوتوں کا محل اور موقعہ کون ہے۔ ہر ایک کا کام نہیں کہ اس راز کو سمجھ سکے اور ہر ایک کے منہ میں وہ زبان نہیں جو یہ کہہ سکے کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا جب تک روح القدس کی خاص تائید نہ ہو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ رسول اللہؐ میں وہ ساری قوتیں اور طاقتیں رکھی گئی تھیں جو محمدؐ بنا دیتی ہیں تاکہ بالقوہ باتیں بالفعل میں بھی آجاویں۔ اس لیے آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔

ایک قوم کے ساتھ جو مشقت کرنی پڑتی ہے تو کس قدر مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایک خدمتگار شریر ہو تو اس کا درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے آخر تنگ اور عاجز آکر اس کو بھی نکال دیتا ہے لیکن وہ کس قدر قابل تعریف ہوگا جو اسے درست کرلے اور پھر وہ تو بڑا ہی مرد میدان ہے جو اپنی قوم کو درست کرسکے حالانکہ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر وہ جو مختلف قوموں کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا سوچو تو سہی کس قدر کامل اور زبردست قویٰ کا مالک ہوگا..... اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کی طرف غور کرو تو پھر کیسا روشن طور پر معلوم ہوگا کہ آپ ہی اس قابل تھے کہ محمدؐ نام سے موسوم ہوتے اور اس دعویٰ کو جیسا کہ زبان سے کیا گیا تھا کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا اپنے عمل سے بھی کرکے دکھاتے چنانچہ وہ وقت آگیا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔[۱] اس میں اس امر کی طرف صریح اشارہ ہے کہ آپ اس وقت دنیا میں آئے جب دین اللہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور عالمگیر تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور گئے اس وقت کہ جبکہ اس نظارہ کو دیکھ لیا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ (الحکم جلد ۵ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

جب دل میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے۔ تو اس میں ترقی کے لیے ایک خاص طاقت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں اور وہ ترقی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ کہ بالکل اکیلے تھے۔ اور اس بیکسی کی حالت میں دعویٰ کرتے ہیں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا کون اس وقت خیال کرسکتا تھا کہ یہ دعوےٰ ایسے بے یار و مددگار شخص کا بار آور ہوگا پھر ساتھ ہی اس قدر مشکلات آپؐ کو پیش آئے کہ ہمیں تو ان کا ہزارواں حصہ بھی نہیں آئے۔

(بدر جلد ۱ ۲۸ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳۔ والحکم جلد ۹ ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹-۱۱)

قرآن شریف نے ہی کھلے طور پر یہ دعوےٰ کیا ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا یعنی تمام لوگوں کو کہدے کہ مَیں تم سب کے لیے رسول ہو کر آیا ہوں اور پھر فرماتا ہے (کہ) وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ[۲] یعنی میں نے تمام عالموں کے لیے تجھے رحمت کرکے بھیجا ہے اور پھر فرماتا ہے لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا[۳] یعنی ہم نے اس لیے

[۱] النصر آیت ۲ و ۳ ۔ [۲] الانبیاء آیت ۱۰۸ ۔ [۳] الفرقان آیت ۲ ۔

بھیجا ہے کہ تمام دنیا کو ڈراوے لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا اُس کے منہ سے بھی یہی نکلا کہ "میں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا" اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغ عام کا عین موقعہ پر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغ عام کا دروازہ کھل گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے بعد نزول اس آیت کے کہ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کی طرف دعوت اسلام کے خط لکھے تھے کسی اور نبی نے غیر قوموں کے بادشاہوں کی طرف دعوت دین کے ہرگز خط نہیں لکھے کیونکہ وہ دوسری قوموں کی دعوت کے لیے مامور نہ تھے۔ یہ عام دعوت کی تحریک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہی شروع ہوئی اور مسیح موعود کے زمانہ میں اس کے ہاتھ سے کمال تک پہنچی۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۶۸-۶۹)

نہ حضرت عیسٰی نے اور نہ حضرت موسیٰ نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ تمام دنیا کے واسطے رسول ہو کر آئے تھے بلکہ وہ تو صرف اسرائیلی بھیڑوں تک ہی اپنی تعلیم محدود کرتے ہیں ان کا اپنا اقرار موجود ہے[1]۔ پس بلحاظ ضرورت کے ان کو جو کتاب ملی وہ بھی ایک قانون مختص الزمان اور مختص القوم تھا۔

اب ظاہر ہے کہ ایک چیز جو ایک خاص ضرورت کے لیے ایک خاص زمانے اور مکان کے واسطے آئی تھی اگر اس کو زبردستی اور خوانخواہ تمام دنیا پر محیط ہونے کے واسطے کھینچ تان کی جائے گی تو اس کا لازماً یہی نتیجہ ہوگا کہ وہ اس کام سے عاری رہے گی جس بوجھ کے اٹھانے کے واسطے وہ وضع ہی نہیں کی گئی اس کی کیسے متحمل ہو سکے گی؟ اور یہی وجہ ہے کہ ان تعلیمات میں موجودہ زمانہ کے حالات کے ماتحت نقص ہیں مگر قرآن مجید مختص الزمان نہیں مختص القوم نہیں اور نہ ہی مختص المکان ہے بلکہ اس کامل اور مکمل کتاب کے لانے والے کا دعویٰ ہے کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ اور ایک دوسری آیت میں یوں بھی آیا ہے لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ[2] یعنی لازمی ہوگا کہ جس کو قرآنی تعلیم پہنچے وہ خواہ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی ہو اس تعلیم کی پیروی کو اپنی گردن پر اٹھائے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ صفحہ ۶ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے "جیسے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا اس دعوے کے مناسب حال یہ ضروری تھا کہ کل دنیا کے مکر و مکاید متفق طور پر آپ کی مخالفت میں کیے جاتے۔ آپ نے کس حوصلہ اور دلیری کے ساتھ مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا کہ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا[3] یعنی کوئی دقیقہ مکر کا باقی نہ رکھو سارے فریب مکر استعمال کرو قتل کے منصوبے کرو اخراج اور قید کی تدبیریں کرو مگر یاد رکھو سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ[4] آخر فتح میری ہے"

[1] بدر سے: چنانچہ حضرت عیسٰی نے خود کہا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا قرآن مجید نے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ[5]۔ (بدر حوالہ مذکور صفحہ ۶)

[2] الانعام آیت ۲۰ ۔ [3] ہود آیت ۵۶ ۔ [4] قمر آیت ۴۶ ۔ [5] آل عمران آیت ۵۰ ۔

تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے تمہاری ساری جماعتیں منتشر اور پراگندہ ہو جاویں گی اور پیٹھ دے نکلینگی جیسے وہ عظیم الشان دعویٰ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا کسی نے نہیں کیا اور جیسے فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا کہنے کو کسی کی ہمت نہ ہوئی یہ بھی کسی کے منہ سے نہ نکلا سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

یہ الفاظ اسی منہ سے نکلے جو خدا تعالیٰ کے سائے کے نیچے الوہیت کی چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ صفحہ ۸ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء)

یعنی آپ تمام جہان کے رسول ہیں۔ (اخبار بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا[1] یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے سب خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے کیونکہ وہ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اور پھر ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے تا محدود چیزیں ایک محدِّد پر دلالت کریں جو خدا تعالیٰ ہے سو ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اجسام اپنے حدود میں مقیّد ہیں اور اس حد سے باہر نہیں ہو سکتے اسی طرح ارواح بھی مقید ہیں اور اپنی مقررہ طاقتوں سے زیادہ کوئی طاقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اب پہلے ہم اجسام کے محدود ہونے کے بارہ میں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مثلاً چاند ایک مہینہ میں اپنا دورہ ختم کر لیتا ہے یعنی انتیس ۲۹ یا تیس ۳۰ دن تک مگر سورج تین سو چونسٹھ ۳۶۴ دن میں اپنے دورہ کو پورا کرتا ہے اور سورج کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے دورہ کو اس قدر کم کر دے جیسا کہ چاند کے دورہ کا مقدار ہے اور نہ چاند کی یہ طاقت ہے کہ اس قدر اپنے دَورہ کے دن بڑھا دے کہ جس قدر سورج کے لیے دن مقرر ہیں اور اگر تمام دنیا اِس بات کے لیے اتفاق بھی کر لے کہ اِن دونوں نیّروں کے دَوروں میں کچھ کمی بیشی کر دیں تو یہ ہرگز اُن کے لیے ممکن نہیں ہو گا اور نہ خود سورج اور چاند میں یہ طاقت ہے کہ اپنے اپنے دَوروں میں کچھ تغیّر و تبدّل کر ڈالیں۔

پس وُہ ذات جس نے اِن ستاروں کو اپنی اپنی حدّ پر ٹھہرا رکھا ہے یعنی جو اُن کا محدِّد اور حد باندھنے والا ہے وہی خدا ہے۔ ایسا ہی انسان کے جسم اور ہاتھی کے جسم میں بڑا فرق ہے اگر تمام ڈاکٹر اس بات کے لیے اکٹھے ہوں کہ انسان اپنی جسمانی طاقتوں اور جسم کی ضخامت میں ہاتھی کے برابر ہو جاوے تو یہ ان کے لیے غیر ممکن ہے اور اگر یہ چاہیں کہ ہاتھی محض انسان کے قد تک محدود رہے تو یہ بھی ان کے لیے غیر ممکن ہے پس اس جگہ بھی ایک تحدید ہے یعنی حد باندھنا جیسا کہ سورج اور چاند میں ایک تحدید ہے اور وہی تحدید ایک محدِّد یعنی حد باندھنے والے پر دلالت کرتی ہے یعنی اُس ذات پر دلالت کرتی ہے جس نے ہاتھی کو وہ مقدار بخشا اور انسان کے لیے وہ مقدار مقرر کیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اِن تمام جسمانی چیزوں میں عجیب طور سے خدا تعالیٰ کا ایک پوشیدہ تصرّف نظر آتا ہے اور عجیب طور پر اُس کی حد بندی مشاہدہ ہوتی ہے اُن کیڑوں کی مقدار سے لیکر جو بغیر دوربین کے دکھائی نہیں دے سکتے ان بڑی بڑی مچھلیوں کی مقدار تک جو ایک بڑے جہاز کو بھی چھوٹے سے لُقمہ کی طرح نگل سکتی ہیں حیوانی اجسام میں ایک عجیب نظارہ حد بندی کا نظر آتا ہے کوئی جانور اپنے

[1] الفرقان آیت ۳

جسم کی رو سے اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی وہ تمام ستارے جو آسمان پر نظر آتے ہیں اپنی اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے پس یہ حد بندی دلالت کر رہی ہے کہ در پردہ کوئی حد باندھنے والا ہے یہی معنی اس مذکورہ بالا کی آیت کے ہیں کہ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔

اب واضح ہو کہ جیسا کہ یہ حد بندی اجسام میں پائی جاتی ہے ایسا ہی یہ حد بندی ارواح میں بھی ثابت ہے تم سمجھ سکتے ہو کہ جس قدر انسانی روح اپنے کمالات ظاہر کر سکتا ہے یا یوں کہو کہ جس قدر کمالات کی طرف ترقی کر سکتا ہے وہ کمالات ایک ہاتھی کی روح کو باوجود ضخیم اور جسیم ہونے کے حاصل نہیں ہو سکتے اِسی طرح ہر ایک حیوان کی روح بلحاظ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے اپنے نوع کے دائرہ کے اندر محدود ہے اور وہی کمالات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو اس کے نوع کے لیے مقرر اور مقدر ہیں۔ پس جس طرح اجسام کی حد بندی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کا کوئی حد باندھنے والا اور خالق ہے اسی طرح ارواح کی طاقتوں کی حد بندی اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ان کا بھی کوئی خالق اور حد باندھنے والا ہے اور اس جگہ تناسخ کا لغو اور بیہودہ جھگڑا پیش کرنا خدا تعالیٰ کے کاموں میں اختلاف ڈالنا ہے کیونکہ عقل صریح شہادت دیتی ہے کہ یہ دونوں حد بندیاں ایک ہی انتظام کے ماتحت ہیں اور ان دونوں حد بندیوں سے ایک ہی مقصود ہے اور وہ یہ کہ تا حد بندی سے حد باندھنے والے کا پتہ لگ جائے اور تا معلوم ہو جائے کہ جیسا کہ وہ اجسام کا خالق اور حد باندھنے والا ہے ایسا ہی وہ ارواح کا خالق اور حد باندھنے والا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۰۹-۱۱۱)

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۱۶۸)

خدا نے یہود کے لیے ہمیشہ کے لیے یہ وعدہ کیا ہے کہ ایسے بادشاہ ان پر مقرر کرتا رہے گا جو انواع و اقسام کے عذاب ان کو دیتے رہیں گے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑی وجہ یہود کے مغضوب علیہم ہونے کی یہی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سخت ایذاء دی ان کی تکفیر کی اُن کی تفسیق کی ان کی توہین کی اُن کو مصلوب قرار دیا تا وہ نعوذ باللہ لعنتی قرار دیئے جائیں اور اُن کو اس حد تک دُکھ دیا کہ حسب منطوق آیت وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا[1] اُن کی ماں پر بھی سخت بہتان لگایا۔ غرض جس قدر ایذاء کی قسمیں ہو سکتی ہیں کہ تکذیب کرنا گالیاں دینا اور افتراء کے طور پر کئی تہمتیں لگانا اور کفر کا فتویٰ دینا اور ان کی جماعت کو متفرق کرنے کے لیے کوشش کرنا اور حکام کے حضور میں اُن کی نسبت جھوٹی مخبریاں کرنا اور کوئی دقیقہ توہین کا نہ چھوڑنا۔

[1] النساء آیت ۱۵۷۔

اور بالآخر قتل کے لیے آمادہ ہونا یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہود بدقسمت سے ظہور میں آیا۔ اور آیت وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ کو غور سے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آیت ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کی سزا بھی حضرت مسیح کی ایذاء کی وجہ سے ہی یہود کو دی گئی ہے کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں یہود کے لیے یہ دائمی وعید ہے کہ وہ ہمیشہ محکومیّت میں جو ہر ایک عذاب اور ذلت کی جڑ ہے زندگی بسر کریں گے جیسا کہ اب بھی یہود کی ذلت کے حالات کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک خدا تعالےٰ کا وہ غصہ نہیں اترا جو اس وقت بھڑکا تھا جبکہ اُس وجیہ نبی کو گرفتار کرا کر مصلوب کرنے کے لیے کھوپری کے مقام پر لے گئے تھے اور جہاں تک بس چلا تھا ہر ایک قسم کی ذلت پہنچائی تھی۔ اور کوشش کی گئی تھی کہ وہ مصلوب ہو کر توریت کی نصوص صریحہ کے رُو سے ملعون سمجھا جائے اور اس کا نام ان میں لکھا جائے جو مرنے کے بعد تحت الثریٰ کی طرف جاتے ہیں اور خدا کی طرف اُن کا رفع نہیں ہوتا۔ (تحفہ گولڑویہ ص۶۶-۶۷)

﴿۱۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ۝

اور جو لوگ محکم پکڑتے ہیں کتاب کو اور نماز کو قائم کرتے ہیں اُن کے ہم اجر ضائع نہیں کرتے۔
(پیغام صلح ص۴۵ و براہین احمدیہ حصہ پنجم ریادداشتیں) ص۶)

﴿۱۷۲﴾ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۝

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (الجزو ۹) ہر یک روح نے ربوبیّت الٰہیّہ کا اقرار کیا۔ کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی فطرتی اقرار کی طرف اشارہ ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۱۶۷-۱۶۸ حاشیہ نمبر ۱۱)

ایسی چیز جو مظہر جمیع عجائبات صنعتِ الٰہی ہے مصنوع اور مخلوق ہونے سے باہر نہیں رہ سکتی بلکہ وہ سب چیزوں سے اوّل درجہ پر مصنوعیت کی مُہر اپنے وجود پر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ تر اور کامل تر صانع قدیم کے وجود پر

﴿ آل عمران آیت ۵۶ ﴾ ﴿ البقرہ آیت ۶۲ ﴾

دلالت کرتی ہے سو اس دلیل سے روحوں کی مخلوقیت صرف نظری طور پر ثابت نہیں بلکہ درحقیقت اجلی بدیہیات ہے۔ ماسوا اس کے دوسری چیزوں کو اپنی مخلوقیت کا علم نہیں مگر روحیں فطرتی طور پر اپنی مخلوقیت کا علم رکھتی ہیں ایک جنگلی آدمی کی روح بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود بخود ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی یعنی روحوں سے میں نے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا ربّ (پیدا کنندہ) نہیں ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ یہ سوال و جواب حقیقت میں اُس پیوند کی طرف اشارہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے قدرتی طور پر متحقق ہے جس کی شہادت روحوں کی فطرت میں نقش کی گئی ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲)

وہ خدا جس کا پتہ قرآن شریف تبلاتا ہے اپنی موجودات پر فقط قہری حکومت نہیں رکھتا بلکہ موافق آیت کریمہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی کے ہریک ذرہ ذرہ اپنی طبیعت اور روحانیت سے اُس کا حکم بردار ہے۔ اس کی طرف جھکنے کے لیے ہریک طبیعت میں ایک کشش پائی جاتی ہے اس کشش سے ایک ذرہ بھی خالی نہیں اور یہ ایک بڑی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ ہریک چیز کا خالق ہے۔ کیونکہ نورِ قلب اس بات کو مانتا ہے کہ وہ کشش جو اس کی طرف جھکنے کے لیے تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ بلاشبہ اُسی کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن شریف نے اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ[1] یعنی ہریک چیز اس کی پاکی اور اس کے محامد بیان کر رہی ہے اگر خدا ان چیزوں کا خالق نہیں تھا تو اُن چیزوں میں خدا کی طرف کشش کیوں پائی جاتی ہے ایک غور کرنے والا انسان ضرور اس بات کو قبول کرلے گا کہ کسی مخفی تعلق کی وجہ سے یہ کشش ہے پس اگر وہ تعلق خدا کا خالق ہونا نہیں تو کوئی آریہ وغیرہ اس بات کا جواب دیں کہ اس تعلق کی وید وغیرہ میں کیا ماہیت لکھی ہے اور اس کا کیا نام ہے۔ (رسالہ معیار المذاہب صفحہ ۲۰-۲۱)

اِس مذہب (اسلام۔ ناقل) کی خداشناسی نہایت صاف صاف اور انسانی فطرت کے مطابق ہے اگر تمام مذہبوں کی کتابیں نابُود ہو کر اُن کے سارے تعلیمی خیالات اور تصوّرات بھی محو ہو جائیں تب بھی وہ خدا جس کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے آئینہ قانون قدرت میں صاف صاف نظر آئے گا اور اس کی قدرت اور حکمت سے بھری ہوئی صورت ہریک ذرّہ میں چمکتی ہوئی دکھائی دیگی۔ غرض وہ خدا جس کا پتہ قرآن شریف تبلاتا ہے اپنی موجودات پر فقط قہری حکومت نہیں رکھتا بلکہ موافق آیت کریمہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی کے ہریک ذرّہ ذرّہ اپنی طبیعت اور روحانیت سے اس کا حکم بردار ہے۔ اس کی طرف جُھکنے کے لیے ہریک طبیعت میں ایک کشش پائی جاتی ہے اس کشش سے ایک ذرّہ بھی خالی نہیں اور یہ ایک بڑی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ ہریک چیز کا خالق ہے کیونکہ نُورِ قلب اس بات کو مانتا ہے کہ وہ کشش جو اُس کی طرف جُھکنے کے لیے تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ بلاشبہ اُسی کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن شریف نے اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ یعنی ہر ایک چیز اس کی پاکی اور اس کے محامد بیان کر رہی ہے اگر خدا اِن چیزوں کا خالق نہیں تھا تو اُن چیزوں میں خدا کی طرف کشش کیوں پائی جاتی

[1] بنی اسرائیل آیت ۴۵

ہے ایک غور کرنے والا انسان ضرور اِس بات کو قبول کریگا کہ کسی مخفی تعلق کی وجہ سے یہ کشش ہے پس اگر وہ تعلق خدا کا خالق ہونا نہیں تو کوئی آریہ وغیرہ اس بات کا جواب دیں کہ اُس تعلق کی وید وغیرہ میں کیا ماہیّت لکھی ہے اور اس کا کیا نام ہے۔ کیا یہی سچ ہے کہ خدا صرف زبردستی ہر یک چیز پر حکومت کر رہا ہے اور ان چیزوں میں کوئی طبعی قوت اور شوق خدا تعالےٰ کی طرف جھکنے کا نہیں ہے۔ معاذ اللہ ہرگز ایسا نہیں بلکہ ایسا خیال کرنا نہ صرف حماقت بلکہ پرلے درجہ کی خباثت بھی ہے مگر افسوس کہ آریوں کے وید نے خدا تعالےٰ کی خالقیت سے انکار کرکے اس رُوحانی تعلق کو قبول نہیں کیا جس پر طبعی اطاعت ہر یک چیز کی موقوف ہے اور چونکہ دقیق معرفت اور دقیق گیان سے وہ ہزاروں کوس دُور تھے لہٰذا یہ سچا فلسفہ اُن سے پوشیدہ رہا ہے کہ ضرور تمام اجسام اور ارواح کو ایک فطرتی تعلق اس ذات قدیم سے پڑا ہوا ہے اور خدا کی حکومت صرف بناوٹ اور زبردستی کی حکومت نہیں بلکہ ہر یک چیز اپنی روح سے اس کو سجدہ کر رہی ہے کیونکہ ذرّہ ذرّہ اس کے بے انتہا احسانوں میں مستغرق اور اس کے ہاتھ سے نکلا ہُوا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۵۱-۱۵۲)

ایک اور دلیل اپنی ہستی پر قرآن شریف میں پیش کرتا ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی یعنی مَیں نے روحوں کو کہا کہ کیا مَیں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں اس آیت میں خدائے تعالےٰ قصّہ کے رنگ میں روحوں کی اُس خاصیت کو بیان فرماتا ہے جو ان کی فطرت میں اُس نے رکھی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی روح فطرت کی رو سے خدائے تعالیٰ کا انکار نہیں کر سکتی صرف منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار ہے مگر باوجود اس انکار کے وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ہر ایک حادث کے واسطے ضرور ایک مُحدِث ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو تو وہ اس بات پر اصرار کرے کہ در پردہ اس بیماری کے ظہور کی کوئی علّت نہیں اگر یہ سلسلہ دنیا کا علل اور معلول سے مربوط نہ ہوتا تو قبل از وقت یہ بتا دینا کہ فلاں تاریخ طوفان آئے گا یا آندھی آئے گی یا خسوف ہوگا یا کسوف ہوگا یا فلاں وقت بیمار مرجائے گا یا فلاں وقت تک ایک بیماری کے ساتھ فلاں بیماری لاحق ہو جائے گی یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جاتیں۔ پس ایسا محقّق اگرچہ خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتا مگر ایک طور سے تو اُس نے اقرار کر ہی دیا کہ وہ بھی ہماری طرح معلولات کے لیے علل کی تلاش میں ہے۔ پس یہ بھی ایک قسم کا اقرار ہے اگرچہ کامل اقرار نہیں۔ ماسوا اس کے اگر کسی ترکیب سے ایک منکر وجود باری کو ایسے طور سے بیہوش کیا جائے کہ وہ اس سفلی زندگی کے خیالات سے بالکل الگ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطل رہ کر اعلیٰ ہستی کے قبضہ میں ہو جائے تو وہ اس صورت میں خدا کے وجود کا اقرار کرے گا انکار نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اس پر بڑے بڑے مجربین کا تجربہ شاہد ہے۔ سو ایسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ انکار وجود باری صرف سفلی زندگی تک ہے ورنہ اصل فطرت میں اقرار بھرا ہوا ہے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۲۱-۱۲۲)

نجات کا تمام مدار خدا تعالیٰ کی محبّت ذاتیہ پر ہے اور محبت ذاتیہ اُس محبّت کا نام ہے جو روحوں کی فطرت میں

خدا تعالیٰ کی طرف سے مخلوق ہے پھر جس حالت میں ارواح پرمیشر کی مخلوق ہی نہیں ہیں تو پھر ان کی فطرتی محبت پرمیشر سے کیونکر ہو سکتی ہے اور کب اور کس وقت پرمیشر نے ان کی فطرت کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ محبت اُس میں رکھ دی یہ تو غیر ممکن ہے وجہ یہ کہ فطرتی محبت اُس محبت کا نام ہے جو فطرت کے ساتھ ہمیشہ سے لگی ہوئی ہو اور پیچھے سے لاحق نہ ہو جیسا کہ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کا یہ قول ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی یعنی میں نے روحوں سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا پیدا کنندہ نہیں ہوں تو روحوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسانی روح کی فطرت میں یہ شہادت موجود ہے کہ اس کا خدا پیدا کنندہ ہے۔ پس رُوح کو اپنے پیدا کنندہ سے طبعًا و فطرتًا محبت ہے اس لیے کہ وہ اس کی پیدائش ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۴۰)

انسانی روح میں بڑے بڑے عجیب و غریب خواص اور تغیرات رکھے گئے ہیں کہ وہ اجسام میں نہیں اور روحوں پر غور کر کے جلد تر انسان اپنے رب کی شناخت کر سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو شناخت کر لیا اُس نے اپنے رب کو شناخت کر لیا۔ پھر ایک اور جگہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی یعنی مَیں نے روحوں کو پوچھا کہ کیا میں تمہارا پیدا کرنے والا نہیں تو تمام روحوں نے یہی جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ روحوں کی فطرت میں یہی منقش اور مرکوز ہے کہ وہ اپنے پیدا کنندہ کی قائل ہیں اور پھر بعض انسان غفلت کی تاریکی میں پڑ کر اور پلید تعلیموں سے متاثر ہو کر کوئی دہریہ بن جاتا ہے اور کوئی آریہ اور اپنی فطرت کے مخالف اپنے پیدا کنندہ سے انکار کرنے لگتے ہیں ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے باپ اور ماں کی محبّت رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض بچے ماں کے مرنے کے بعد مر جاتے ہیں پھر اگر انسانی روحیں خدا کے ہاتھ سے نہیں نکلیں اور اس کی پیدا کردہ نہیں تو خدا کی محبت کا نمک کس نے ان کی فطرت پر چھڑک دیا ہے اور کیوں انسان جب اُس کی آنکھ کھلتی ہے اور پردۂ غفلت دور ہوتا ہے تو دل اس کا خدا کی طرف کھینچا جاتا ہے اور محبت الٰہی کا دریا اس کے صحن سینہ میں بہنے لگتا ہے۔ آخر ان روحوں کا خدا سے کوئی رشتہ تو ہوتا ہے جو اُن کو محبّت الٰہی میں دیوانہ کی طرح بنا دیتا ہے وہ خدا کی محبت میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ تمام چیزیں اس کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب تعلق ہے۔ ایسا تعلق نہ ماں کا ہوتا ہے نہ باپ کا۔ پس اگر بقول آریوں کے روحیں خود بخود ہیں تو یہ تعلق کیوں پیدا ہو گیا اور کس نے یہ محبت اور عشق کی قوتیں خدا تعالیٰ کے ساتھ روحوں میں رکھ دیں یہ مقام سوچنے کا مقام ہے اور یہی مقام ایک سچی معرفت کی کنجی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۸-۱۵۹)

انسان تعبّد ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے پس اس وجہ سے انسان کی رُوح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ازلی ہے جیسا کہ آیت اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی سے ظاہر ہوتا ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۳)

روحوں کے قویٰ جن میں خدا تعالےٰ کا عشق پیدا ہوا ہے بزبانِ حال گواہی دے رہے ہیں جو وہ خدا کے ہاتھ سے نکلے ہیں۔ (براہین احمدیہ پنجم یادداشتیں ص۶)

انسان کی فطرت ہی میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی نقش کیا گیا ہے۔ اور تثلیث سے کوئی مناسبت جبلت انسانی اور تمام اشیائے عالم کو نہیں ایک قطرہ پانی کا دیکھو تو وہ گول نکلتا ہے۔ مثلث کی شکل میں نہیں نکلتا اس سے بھی صاف طور پر یہی پایا جاتا ہے کہ توحید کا نقش قدرت کی ہر چیز میں رکھا ہوا ہے۔ خوب غور سے دیکھو کہ پانی کا قطرہ گول ہوتا ہے۔ اور کُروی شکل میں توحید ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جہت کو نہیں چاہتی۔ اور مثلث شکل جہت کو چاہتی ہے چنانچہ آگ کو دیکھو شکل بھی مخروطی ہے۔ اور وہ بھی کُرویت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اُس سے بھی توحید کا نور چمکتا ہے۔ زمین کو لو اور انگریزوں ہی سے پوچھو کہ اس کی شکل کیسی ہے؟ کہیں گے گول۔ الغرض طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی چلی جائے گی۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۶ء ص۱)

سوال پیش ہوا کہ جب ایک شخص نے ایک بات تحصیل کی ہے تو دوبارہ اسی کے تحصیل کرنے سے کیا حاصل ہے؟

فرمایا: ہم اس اصول کو کَانْ نَسِیًّا کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قرآن میں لکھا ہے قَالَ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی یعنی جب روحوں سے خدا (تعالیٰ) نے سوال کیا کہ "میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ تو وہ بولیں کہ ہاں! تو اب سوال ہو سکتا ہے کہ روحوں کو علم تو تھا پھر انبیاء کو خدا (تعالیٰ) نے کیوں بھیجا گویا تحصیل حاصل کرائی۔ یہ اصل میں غلط ہے۔ ایک تحصیل پھیکی ہوتی ہے۔ ایک گاڑھی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق ہوتا ہے وہ علم جو کہ نبیوں سے ملتا ہے اس کی تین اقسام ہیں علم الیقین عین الیقین حق الیقین۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے ایک شخص دور سے دھواں دیکھے تو اسے علم ہوگا کہ وہاں آگ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں آگ ہوتی ہے وہاں دھواں بھی ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا علم ہے جس کا نام علم الیقین ہے۔ مگر اور نزدیک جاکر وہ اُس آگ کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اسے عین الیقین کہتے ہیں پھر اگر اپنا ہاتھ اس آگ پر رکھ کر اس کی حرارت وغیرہ کو بھی دیکھ لیوے تو اسے کوئی شبہ اس کے بارے میں نہ رہیگا اور اس طرح سے جو علم اسے حاصل ہوگا اس کا نام حق الیقین ہوگا اب کیا ہم اسے تحصیل حاصل کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! (البدر جلد ۲ ۱۸ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء ص۱۳۷)

خدا (تعالیٰ) کے ساتھ تو انسان کا فطرتی تعلق ہے کیونکہ اس کی فطرت خدا تعالےٰ کے حضور میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں قَالُوْا بَلٰی کا اقرار کر چکی ہوئی ہے۔ (بدر جلد ۶ ۱۱ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء ص۶)

(۱۷۷) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ

يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ابتدائی رؤیا یا الہام کے ذریعہ سے خدا بندہ کو بلانا چاہتا ہے مگر وہ اُس کے واسطے کوئی حالت قابل تشفی نہیں ہوتی چنانچہ بلعم کو الہامات ہوتے تھے مگر اللہ تعالےٰ کے اس فرمان سے کہ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا رفع نہیں ہوا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں وہ کوئی برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ابھی تک نہیں بنا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گر گیا۔ ان الہامات وغیرہ سے انسان کچھ بن نہیں سکتا۔ انسان خدا کا بن نہیں سکتا جب تک کہ ہزاروں موتیں اُس پر نہ آویں اور بیضۂ بشریت سے وہ نکل نہ آتے۔ (الحکم جلد ۵ ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۴)

نجات کامل خدا ہی کی طرف مرفوع ہو کر ہوتی ہے اور جس کا رفع نہ ہو وہ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

انسان اگر اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی وقف نہیں کرتا تو وہ یاد رکھے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالےٰ نے جہنم کو پیدا کیا ہے۔ اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ بعض عام خام خیال کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر ایک آدمی کو جہنم میں ضرور جانا ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ تھوڑے ہیں جو جہنم کی سزا سے بالکل محفوظ ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ[1]

اب سمجھنا چاہیئے کہ جہنم کیا چیز ہے؟ ایک جہنم تو وہ ہے جس کا مرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے وعدہ دیا ہے اور دوسرے یہ زندگی بھی اگر خدا تعالےٰ کے لیے نہ ہو تو جہنم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے انسان کا تکلیف سے بچانے اور آرام دینے کے لیے متولّی نہیں ہوتا۔ یہ خیال مت کرو کہ کوئی ظاہر دولت یا حکومت یا مال و عزت اولاد کی کثرت کسی شخص کے لیے کوئی راحت یا اطمینان اور سکینت کا موجب ہو جاتی ہے اور وہ دم نقد بہشت میں ہوتا ہے

[1] سبا آیت ۱۴

ہرگز نہیں۔ وہ اطمینان اور تسلی اور وہ تسکین جو بہشت کے انعامات میں سے ہے۔ ان باتوں سے نہیں ملتی وہ خدا ہی میں زندہ رہنے اور مرنے سے مل سکتی ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام خصوصاً ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی بھی وصیت تھی کہ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[1]۔ لذات دنیا تو ایک قسم کی ناپاک حرص پیدا کر کے طلب اور پیاس کو بڑھا دیتی ہیں استسقاء کے مریض کی طرح پیاس نہیں بجھتی یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے ہیں پس یہ بے جا آرزوؤں اور حسرتوں کی آگ بھی منجملہ اسی جہنم کی آگ کے ہے۔ جو انسان کے دل کو راحت اور قرار نہیں لینے دیتی بلکہ اس کو ایک تذبذب اور اضطراب میں غلطاں و پیچاں رکھتی ہے اس لیے میرے دوستوں کی نظر سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ رہے کہ انسان مال و دولت یا زن و فرزند کی محبت کے جوش اور نشے میں ایسا دیوانہ اور از خود رفتہ نہ ہو جاوے کہ اس میں اور خدا تعالیٰ میں ایک حجاب پیدا ہو جاوے مال اور اولاد اسی لیے تو فتنہ کہلاتی ہے ان سے بھی انسان کے لیے ایک دوزخ تیار ہوتا ہے اور جب وہ ان سے الگ کیا جاتا ہے تو سخت بے چینی اور گھبراہٹ ظاہر کرتا ہے اور اس طرح پر یہ بات کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ[2]۔ منقولی رنگ میں نہیں رہتا بلکہ معقولی شکل اختیار کر لیتا ہے پس یہ آگ جو انسانی دل کو جلا کر کباب کر دیتی ہے اور ایک جلے ہوئے کوئلے سے بھی سیاہ اور تاریک بنا دیتی ہے یہ وہی غیر اللہ کی محبّت ہے۔

دو چیزوں کے باہم ملنے اور رگڑ سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح پر انسان کی محبت اور دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت کی رگڑ سے الٰہی محبت جل جاتی ہے اور دل تاریک ہو کر خدا سے دُور ہو جاتا اور ہر قسم کی بیقراری کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جبکہ دنیا کی چیزوں سے جو تعلق ہو وہ خدا میں ہو کر ایک تعلق ہو۔ اور ان کی محبت خدا کی محبت میں ہو کر ہو اُس وقت باہمی رگڑ سے غیر اللہ کی محبّت جل جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک روشنی اور نور بھر دیا جاتا ہے پھر خدا کی رضا اُس کی رضا اور اس کی رضا خدا کی رضا کا منشاء ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں پہنچ کر خدا کی محبت اس کے لیے بمنزلہ جان ہوتی ہے اور جس طرح زندگی کے واسطے لوازمِ زندگی ہیں۔ اُس کی زندگی کے واسطے خدا اور صرف خدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی خوشی اور راحت خدا ہی میں ہوتی ہے۔ پھر دنیا داروں کے نزدیک اگر اُسے کوئی رنج اور کرب پہنچے تو پہنچے لیکن اصل یہی بات ہے کہ اس ہمّ و غم میں بھی وہ اطمینان اور سکینت سے الٰہی لذت لیتا ہے جو کسی دنیادار کی نظر کے بڑے سے بڑے فارغ البال کو بھی نصیب نہیں۔

برخلاف اس کے جو کچھ حالت انسان کی ہے وہ جہنم ہے گویا خدا تعالیٰ کے سوا زندگی بسر کرنا یہ بھی جہنم ہے۔

پھر حدیث شریف سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ تپ بھی حرارت جہنم ہی ہے۔ امراض اور مصائب جو مختلف قسم کے انسان کو لاحق حال ہوتے ہیں یہ بھی جہنم ہی کا نمونہ ہیں اور یہ اس لیے کہ تا دوسرے عالم پر گواہ ہوں اور جزا و سزا کے مسئلے کی حقیقت پر دلیل ہوں اور کفّارہ جیسے لغو مسئلہ کی تردید کریں۔ مثلاً جذام ہی کو دیکھو کہ اعضاء گر گئے ہیں اور رقیق

---

[1] البقرۃ آیت ۱۳۳ [2] الھمزۃ آیت ۷، ۸

مادہ اعضاء سے جاری ہے۔ آواز بیٹھ گئی ہے۔ ایک تو یہ بجائے خود جہنم ہے پھر لوگ نفرت کرتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں۔ عزیز سے عزیز بیوی فرزند ماں باپ تک کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بعض اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں بعض اور خطرناک امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پتھریاں ہو جاتی ہیں۔ اندر پیٹ میں رسولیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری بلائیں اس لیے انسان پر آتی ہیں کہ وہ خدا سے دور ہو کر زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کی عزت اور پرواہ نہیں کرتا۔ اُس وقت ایک جہنم پیدا ہو جاتا ہے۔

اب پھر میں اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کے لیے اکثر انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا ہے اور پھر فرمایا کہ وہ جہنم انہوں نے خود ہی بنا لیا ہے اُن کو جنت کی طرف بلایا جاتا ہے۔ پاک دل پاکیزگی سے باتیں سنتا ہے اور ناپاک خیال انسان اپنی کورانہ عقل پر عمل کر لیتا ہے۔ پس آخرت کا جہنم بھی ہوگا اور دنیا کے جہنم سے بھی مخلصی اور رہائی نہ ہوگی کیونکہ دنیا کا جہنم تو اس جہنم کے لیے بطور دلیل اور ثبوت کے ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۷،۶)

وہ لوگ جو صرف باپ دادے کی تقلید پر چلنے والے ہیں وہ دل تو رکھتے ہیں پر دلوں سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں بھی ہیں پر آنکھوں کو دیکھنے سے معطل چھوڑا ہوا ہے اور کان بھی رکھتے ہیں پر وہ بھی بیکار پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ (براہین احمدیہ حصہ دوم صفحہ ۱۰۱ حاشیہ نمبر ۵)

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ الجزو نمبر ۹ یعنی ایسے ہیں جیسے چارپائے۔ اور نور فطرتی اُن کا اس قدر کم ہے کہ اُن میں اور مویشی میں کچھ تھوڑا ہی فرق ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۸۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

۱۸۱ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

خدا کے تمام کامل نام اسی سے مخصوص ہیں اور اُن میں شرکت غیر کی جائز نہیں۔ سو خدا کو انہیں ناموں سے پکارو جو بلا شرکت غیرے ہیں یعنی نہ مخلوقات ارضی و سماوی کے نام خدا کے لیے وضع کرو اور نہ خدا کے نام مخلوق چیزوں پر اطلاق کرو اور اُن لوگوں سے جدا رہو جو کہ خدا کے ناموں میں شرکت غیر جائز رکھتے ہیں۔ عنقریب وہ اپنے کاموں کا بدلہ پائیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۶-۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

۱۸۶ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ

مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّ اَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ؁

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ قرآن کریم کے بعد کس حدیث پر ایمان لاؤ گے اور ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس وہ نص جو اوّل درجہ پر قطعی اور یقینی ہے قرآن کریم ہی ہے اکثر احادیث اگر صحیح بھی ہوں تو مفید ظن ہیں وَالظَّنُّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا۔ (ازالہ اوہام ص۶۵۴)

حسب آیت کریمہ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ہر ایک حدیث جو صریح آیت کے معارض پڑے رد کرنے کے لائق ہے۔ اور آخری نصیحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تم نے تمسک بکتاب اللہ کرنا۔

(ازالہ اوہام ص۹۷۸)

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ یعنی خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے۔ اس جگہ حدیث کے لفظ کی تنکیر جو فائدہ عموم کا دیتی ہے صاف بتلا رہی ہے کہ جو حدیث قرآن کے معارض اور مخالف پڑے اور کوئی راہ تطبیق کی پیدا نہ ہو۔ اس کو رد کردو۔ اور اس حدیث میں ایک پیشگوئی بھی ہے جو بطور اشارۃ النص اس آیت سے مترشح ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ آیۃ ممدوحہ میں اس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی اس اُمّت پر آنے والا ہے کہ جب بعض افراد اس اُمّت کے قرآن شریف کو چھوڑ کر ایسی حدیثوں پر بھی عمل کریں گے جن کے بیان کردہ بیان قرآن شریف کے بیانات سے مخالف اور معارض ہونگے۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی ص۲)

اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ یعنی تم بعد اللہ اور اس کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے اس آیت میں صریح اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قرآن کریم کسی امر کی نسبت قطعی اور یقینی فیصلہ دیوے یہاں تک کہ اُس فیصلہ میں کسی طور سے شک باقی نہ رہ جاوے اور منشاء اچھی طرح سے کھل جائے تو پھر بعد اُس کے کسی ایسی حدیث پر ایمان لانا جو صریح اُس کے مخالف پڑی ہو مومن کا کام نہیں ہے پھر فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ان دونوں آیتوں کے ایک ہی معنی ہیں اس لیے اس جگہ تصریح کی ضرورت نہیں۔ سو آیات متذکرہ بالا کے رُو سے ہر ایک مومن کا یہی مذہب ہونا چاہیئے کہ کتاب اللہ کو بلا شرط اور حدیث کو شرطی طور پر حجت شرعی قرار دیوے اور یہی میرا مذہب ہے۔

.... جو امر قول یا فعل یا تقریر کے طور پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف احادیث میں بیان کیا گیا ہے

؁ الجاثیہ آیت ۷

ہم اُس امر کو بھی اسی محک سے آزمائیں گے اور دیکھیں گے کہ حسب آیت شریفہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ وہ حدیث قولی یا فعلی قرآن کریم کی کسی صریح اور بیّن آیت سے مخالف تو نہیں اگر مخالف نہیں ہوگی تو ہم بسر و چشم اُس کو قبول کریں گے اور اگر بظاہر مخالف نظر آئے گی تو ہم حتی الوسع اُس کی تطبیق اور توفیق کے لیے کوشش کریں گے اور اگر ہم باوجود پوری پوری کوشش کے اس امر تطبیق میں ناکام رہیں گے اور صاف صاف کھلے طور پر ہمیں مخالف معلوم ہوگی تو ہم افسوس کے ساتھ اس حدیث کو ترک کر دیں گے کیونکہ حدیث کا پایہ قرآن کریم کے پایہ اور مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ قرآن کریم وحی متلو ہے اور اس کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے میں وہ اہتمام بلیغ کیا گیا ہے کہ احادیث کے اہتمام کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اکثر احادیث غایت درجہ مفید ظن ہیں۔ اور ظنی نتیجہ کی منتج ہیں اور اگر کوئی حدیث تواتر کے درجہ پر بھی ہو۔ تاہم قرآن کریم کے تواتر سے اس کو ہرگز مساوات نہیں۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰-۱۱ بابت ماہ ذی الحجہ، محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۸۹۱ء)

ہمارا ضرور یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ہم ہر ایک حدیث اور ہر ایک قول کو قرآن کریم پر عرض کریں تا ہمیں معلوم ہو کہ وہ واقعی طور پر اسی مشکوٰۃ وحی سے نور حاصل کرنے والے ہیں جس سے قرآن نکلا ہے یا اس کے مخالف ہیں۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۲۰ بابت ماہ ذی الحجہ، محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۸۹۱ء)

بعد اللہ جلّ شانہٗ کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے؟ اس آیت میں صریح اس بات کی طرف ترغیب ہے کہ ہر ایک قول اور حدیث کتاب اللہ پر عرض کر لینا چاہیئے۔ اگر کتاب اللہ نے ایک امر کی نسبت ایک فیصلہ ناطق اور مؤید دیدیا ہے جو قابل تغیر اور تبدیل نہیں تو پھر ایسی حدیث دائرہ صحت سے خارج ہوگی جو اس کے مخالف ہے۔ لیکن اگر کتاب اللہ فیصلہ مؤیدہ اور ناقابل تبدیل نہیں دیتی تو پھر اگر وہ حدیث قانون روایت کے رُو سے صحیح ثابت ہو تو ماننے کے لائق ہے۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰۵-۱۰۶ بابت ماہ ذی الحجہ، محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۸۹۱ء)

۱۸۸ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ۘؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

وَالْكَلَامُ الْمُفَصَّلُ فِيْ ذٰلِكَ أَنَّ أَمَارَاتِ الْقِيَامَةِ عَلٰى قِسْمَيْنِ۔ اَلْاَمَارَاتُ الصُّغْرٰى وَالْاَمَارَاتُ الْكُبْرٰى۔ اَمَّا الْاَمَارَاتُ الصُّغْرٰى فَقَدْ تَبْدُوْ وَتَظْهَرُ عَلٰى صُوْرَتِهَا الظَّاهِرَةِ وَقَدْ تَنْكَشِفُ وُجُوْدُهَا فِيْ حُلَلِ الْاِسْتِعَارَاتِ وَلٰكِنَّ الْاَمَارَاتِ الْكُبْرٰى فَلَا تَظْهَرُ عَلٰى صُوْرَتِهَا الظَّاهِرَةِ اَصْلًا وَّلَا بُدَّ فِيْهَا اَنْ تَظْهَرَ فِيْ حُلَلِ الْاِسْتِعَارَاتِ وَالْمَجَازَاتِ وَالسِّرُّ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ اَنَّ السَّاعَةَ لَا تَأْتِيْ اِلَّا بَغْتَةً كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۸۳)

سوال پیش ہوا کہ جو لوگ لڑائیوں میں جاتے ہیں اور وہاں قتل کرتے ہیں۔کیا وہ قتل ان کا گناہ ہے یا نہیں؟
فرمایا: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس نے اچھا کیا یا بُرا کیا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

۱۹۶۔ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں۔کیا اُن کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں کیا اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۲۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)
قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ الخ ان کو کہہ کہ تم میرے مغلوب کرنے کے لیے اپنے معبودوں سے کہ جو تمہارے

(ترجمہ از مرتب) تفصیلی کلام اس بارہ میں یوں ہے کہ قیامت کی نشانیوں کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ امارات صغریٰ ۲۔ امارات کبریٰ۔ امارات صغریٰ کبھی کبھی اپنی ظاہری صورت پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں اور کبھی ان کا ظہور استعارات کے لباس میں ہوتا ہے لیکن امارات کبریٰ کبھی بھی ظاہری صورت میں ظاہر نہیں ہوتیں ان کے بارہ میں ضروری ہے کہ وہ استعارات اور مجازات کے رنگ میں ظاہر ہوں اور اس میں بھید یہ ہے کہ قیامت کا اچانک آنا مقدر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ الخ

زعم میں خدا کے شریک ہیں مدد طلب کرو اور میرے ناکام رہنے کے لیے ہر ایک طور کا مکر کرو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۲۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

حق کی یہ بھی ایک پہچان ہے اور اس کی شناخت کا یہ ایک عمدہ معیار ہے کہ دنیا اپنے سارے ہتھیاروں سے اس کی مخالفت پر ٹوٹ پڑے۔ جان سے۔ مال سے۔ اعضاء سے۔ عزت سے اور اندرونی اور بیرونی لوگ اور اپنے اور پرائے گویا سب ہی اس کی مخالفت پر کھڑے ہو جائیں اور پھر بھی وہ (حق) آگے ہی آگے قدم رکھتا جائے اور کوئی روک اس کی ترقی کو روک نہ سکے چنانچہ قرآن شریف میں ہے فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ الخ سو اس معیار سے ہمارے سلسلہ کو پرکھا جائے تو ایک طالب حق کے واسطے کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا دیکھو نہ ہمارا کوئی واعظ ہے نہ لیکچرار اور دشمن بھی کیا اندرونی اور کیا بیرونی سب اکٹھے ہو کر ہمارے تباہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے مگر اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں ہمیں کامیاب کیا اور دشمن ذلیل ہوئے کفر کے فتوے لگائے قتل کا مقدمہ کیا۔ غرضکہ انہوں نے کوئی دقیقہ ہماری بربادی کا اٹھا نہ رکھا مگر کیا خدا (تعالیٰ) سے کوئی جنگ کر سکتا ہے ہماری ترقی کے خود مخالف ہی باعث اور محرک ہیں۔ بہت لوگوں نے انہیں کے رسائل سے اطلاع پاکر ہماری بیعت کی اگر واعظ وغیرہ ہماری طرف سے ہوتے تو ہمیں ان کا بھی مشکور ہونا پڑتا اور یہ بھی ایک شعبہ شرک کا ہو جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچایا ایک آبپاشی اور تخم ریزی تو کسان کرتا ہے اور ایک خود خدا کرتا ہے ہم اور ہماری جماعت خدا (تعالیٰ) کی تخم ریزی اور آبپاشی سے ہیں خدا کے لگائے ہوئے پودا کو کون اکھاڑ سکتا ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۷)

إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ○

میرا کارساز وہ خدا ہے جس نے اپنی کتاب کو نازل کیا ہے اور اس کا یہی قانونِ قدرت ہے کہ وہ صالحین کے کاموں کو آپ کرتا ہے اور ان کی مہمات کا خود متولی ہوتا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۲۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

یہ بات سمجھ رکھو کہ میرا حامی اور ناصر اور کارساز وہ خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور وہ اپنے سچے اور صالح رسولوں کی آپ کارسازی کرتا ہے (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۴۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

ایک مقام توکّل ہے جس پر نہایت مضبوطی سے ان کو قائم کیا جاتا ہے اور اُن کے غیر کو وہ چشمہ صافی ہرگز میسّر نہیں آسکتا بلکہ اُنہیں کے لیے وہ خوشگوار اور موافق کیا جاتا ہے اور نور معرفت ایسا اُن کو تھامے رہتا ہے کہ وہ بسا اوقات طرح طرح کی بے سامانی میں ہو کر اور اسباب عادیہ سے بکلی اپنے تئیں دُور پاکر پھر بھی ایسی بشاشت اور انشراح خاطر سے زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسی خوشحالی سے دنوں کو کاٹتے ہیں کہ گویا اُن کے پاس ہزارہا خزائن ہیں ان کے چہروں پر تونگری کی تازگی نظر آتی ہے اور صاحب دولت ہونے کی مستقل مزاجی دکھائی دیتی ہے اور تنگیوں کی حالت میں بکمال کشادہ دلی اور یقین

کامل اپنے مولیٰ کریم پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ سیرتِ ایثار اُنکا مشرب ہوتا ہے اور خدمتِ خلق اُن کی عادت ہوتی ہے اور کبھی انقباض اُن کی حالت میں راہ نہیں پاتا اگرچہ سارا جہان اُن کا عیال ہو جائے اور فی الحقیقت خدا تعالےٰ کی ستاری مستوجب شکر ہے جو ہر جگہ ان کی پردہ پوشی کرتی ہے اور قبل اس کے جو کوئی آفت فوق الطاقت نازل ہو اُن کو دامن عاطفت میں لے لیتی ہے کیونکہ اُن کے تمام کاموں کا خدا متولی ہوتا ہے جیسا کہ اُس نے آپ ہی فرمایا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ۔ لیکن دوسروں کو دُنیاداری کے دل آزار اسباب میں چھوڑا جاتا ہے اور خارقِ عادت سیرت جو خاص اُن لوگوں کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے کسی دوسرے کے ساتھ ظاہر نہیں کی جاتی۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۲۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر۳)

خدا تعالیٰ متقی اور مومن کی زندگی کا ذمہ دار ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّٰلِحِينَ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے دُور اور چوپاؤں کے مشابہ ہیں۔ ان کی زندگی کا کفیل نہیں۔ (الحکم جلد ۴ ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء ص۳)

نیکوں کا وہ آپ والی بن جاتا ہے پس کون ہے جو مردِ صالح کو ضرر دے سکے۔

(الحکم جلد ۵ ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء ص۱۴)

قرآن شریف اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے کہ وہ متقیوں کا متولّی اور متکفّل ہوتا ہے۔ تو پھر جب انسان اسباب پر تکیہ اور توکل کرتا ہے تو گویا خدا تعالےٰ کی ان صفات کا انکار کرتا ہے اور ان اسباب کو ان صفات سے حصّہ دیتا ہے اور ایک اور خدا اپنے لیے ان اسباب کا تجویز کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء ص۶)

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّٰلِحِينَ جیسے ماں اپنی اولاد کی والی ہوتی ہے ویسے ہی وہ نیکوں کا والی ہوتا ہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء ص۹۲)

جس طرح پر ماں بچے کی متولی ہوتی ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں صالحین کا متکفل ہوتا ہوں اللہ تعالےٰ اس کے دشمنوں کو ذلیل کرتا ہے اور اس کے مال میں طرح طرح کی برکتیں ڈال دیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء ص۲۱۷)

جب تک انسان اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں رکھتا اور اس کے وعدوں پر سچا یقین نہیں کرتا اور ہر ایک مقصود کا دینے والا اسی کو نہیں سمجھتا اور کامل صلاح اور تقویٰ اختیار نہیں کر لیتا تو اس وقت تک وہ حقیقی راحت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ یعنی جو صلاحیت اختیار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کا متولی ہو جاتا ہے انسان جو متولی رکھتا ہے۔ اس کے بہت بوجھ کم ہو جاتے ہیں بہت ساری ذمہ داریاں گھٹ جاتی ہیں بچپن میں ماں بچے کی متولّی ہوتی ہے۔ تو بچے کو کوئی فکر اپنی ضروریات کا نہیں رہتا۔ وہ خود ہی اس کی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے اس کے کپڑوں اور کھانے پینے کے خود ہی فکر میں لگی رہتی ہے اس کی صحت قائم رکھنے کا دھیان اسی کو رہتا ہے اسکو نہلاتی اور دھلاتی ہے اور کھلاتی اور پلاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت اس کو مار کر کھانا کھلاتی اور پانی پلاتی اور کپڑا پہناتی

ہے۔ بچہ اپنی ضرورتوں کو نہیں سمجھتا بلکہ ماں ہی اس کی ضرورتوں کو خوب سمجھتی اور اُن کو پورا کرنے کے خیال میں لگی رہتی ہے اسی طرح جب ماں کی تولیت سے نکل آئے تو انسان کو بالطبع ایک متوّلی کی ضرورت پڑتی ہے طرح طرح سے اپنے متوّلی اور لوگوں کو بناتا ہے جو خود کمزور ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات میں غلطاں ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے کی خبر نہیں لے سکتے۔ لیکن جو لوگ ان سب سے منقطع ہو کر اس قسم کا تقویٰ اور اصلاح اختیار کرتے ہیں۔ اُن کا وہ خود متولی ہوجاتا ہے اور ان کی ضروریات اور حاجات کا خود ہی کفیل ہوجاتا ہے۔ انہیں کسی بناوٹ کی ضرورت ہی نہیں رہتی وہ اس کی ضروریات کو ایسے طور سے سمجھتا ہے کہ یہ خود بھی اس طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس پر اس طرح فضل کرتا ہے کہ انسان خود حیران رہتا ہے۔ گر نہ ستانی بستم ے رسد والی نوبت ہوتی ہے۔ لیکن انسان بہت سے زمانے پالیتا ہے جب اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ خدا اس کا متولی ہوجائے یعنی اس کو خدا تعالےٰ کی تولیت حاصل کرنے سے پہلے کئی متولیوں کی تولیت سے گزرنا پڑتا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰـهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۝ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ پہلے حاجت ماں باپ کی پڑتی ہے پھر جب بڑا ہوتا ہے تو بادشاہوں اور حاکموں کی حاجت پڑتی ہے پھر جب اس سے آگے قدم بڑھاتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جن کو میں نے متولی سمجھا ہوا تھا وہ خود ایسے کمزور تھے کہ اُن کو متوّلی سمجھنا میری غلطی تھی کیونکہ انہیں متولی بنانے میں نہ تو میری ضروریات ہی حاصل ہوسکتی تھیں اور نہ ہی وہ میرے لیے کافی ہوسکتے تھے پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور ثابت قدمی دکھانے سے خدا کو اپنا متولی پاتا ہے اس وقت اس کو بڑی راحت حاصل ہوتی ہے اور ایک عجیب طمانیت کی زندگی میں داخل ہوجاتا ہے۔ خصوصاً جب خدا کسی کو خود کہے کہ میں تیرا متولی ہوا۔ تو اس وقت جو راحت اور طمانیت اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایسی حالت پیدا کرتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حالت تمام تلخیوں سے پاک ہوتی ہے۔ دنیاوی حالتوں میں انسان تلخی سے خالی نہیں ہوسکتا۔ دشتِ دنیا کانٹوں اور تلخیوں سے بھری ہوئی ہے ؎

دشتِ دنیا جز دد و جز دام نیست
جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

جن کا اللہ تعالیٰ متوّلی ہوجاتا ہے وہ دنیا کے آلام سے نجات پاجاتے ہیں اور ایک سچی راحت اور طمانیت کی زندگی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اولاد کا ابتلا بھی بہت بڑا ابتلا ہے اگر اولاد صالح ہو تو پھر کس بات کی پروا ہوسکتی ہے۔ خدا تعالےٰ خود فرماتا ہے هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ یعنی اللہ تعالےٰ آپ صالحین کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ اگر بدبخت ہے تو خواہ لاکھوں روپیہ اس کے لیے چھوڑ جاؤ وہ بدکاریوں میں تباہ کر کے پھر قلاش ہوجائے گی۔ اور ان مصائب اور مشکلات

میں پڑے گی جو اس کے لیے لازمی ہیں۔ جو شخص اپنی رائے کو خدا تعالیٰ کی رائے اور منشاء سے متفق کرتا ہے وہ اولاد کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ اسی طرح پر ہے کہ اس کی صلاحیت کے لیے کوشش کرے اور دعائیں کرے۔ اس صورت میں خود اللہ تعالیٰ اس کا تکفل کرے گا اور اگر بدچلن ہے تو جائے جہنم میں اس کی پرواتک نہ کرے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

انبیاء علیہم السلام..... دنیا اور دنیا کی مددیں ان لوگوں کے سامنے کالمیّت ہوتی ہیں اور مردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں.... وہ حقیقت میں اپنے کاروبار کا متولی خدا تعالیٰ ہی کو جانتے ہیں اور یہ بات بالکل سچ ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ۔ [(۱) ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۲ (۲) الحکم جلد ۳ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۳ (۳) بدر جلد ۲ نمبر ۲۵ صفحہ ۴ مورخہ ۲۱ جون ۱۹۰۶ء]

۱۹۸۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۝

جن چیزوں کو تم لوگ اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو۔ وہ ممکن نہیں ہے جو تمہاری مدد کر سکیں اور نہ کچھ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

۱۹۹۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۝

اس کا مرنا اور جینا اپنے لیے نہیں بلکہ خدا ہی کے لیے ہو جائے تب وہ خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا ہے اپنی محبت کو اس پر اتارتا ہے اور ان دونوں محبتوں کے ملنے سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا نہیں پہچانتی اور نہ سمجھ سکتی ہے اور ہزاروں صدیقوں اور برگزیدوں کا اسی لیے خون ہوا کہ دنیا نے ان کو نہیں پہچانا وہ اسی لیے مکار اور خود غرض کہلائے کہ دنیا ان کے نورانی چہرہ کو دیکھ نہ سکی جیسا کہ فرمایا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ یعنی وہ جو منکر ہیں تیری طرف دیکھتے تو ہیں مگر تو انہیں نظر نہیں آتا۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۳۱)

یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے مراتب معلوم تھے اور ہر ایک کی نورانیت باطنی کا اندازہ اس قلب منور پر مکشوف تھا۔ ہاں جو لوگ بیگانہ ہیں۔ وہ یگانہ حضرت احدیت کو شناخت نہیں کر سکتے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ یعنی وہ تیری طرف (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں پر تو انہیں نظر نہیں آتا۔ اور وہ تیری صورت کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ انوار روحانی کا سخت چمکارا بیگانہ محض پر بھی جا پڑتا ہے۔ جیسے ایک عیسائی نے جبکہ مباہلہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع حسنین و حضرت علیؓ و فاطمہ رضی اللہ عنہم عیسائیوں کے سامنے آئے۔ دیکھ کر اپنے بھائیوں کو کہا۔ کہ مباہلہ مت کرو۔ مجھ کو پروردگار کی قسم ہے کہ میں ایسے منہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ اگر اس پہاڑ کو بھی کہیں گے کہ یہاں سے اُٹھ جا تو فی الفور اُٹھ جائیگا۔ سو خدا جانے کہ اس وقت نور نبوت و ولایت کیسا جلال میں تھا کہ اس کافر۔ بد باطن۔ سیاہ دل کو بھی نظر آ گیا۔

(مکتوبات جلد ۱ صفحہ ۵۱-۵۲)

۲۰۰ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ○

مجھے ایک حکایت یاد آ گئی۔ جو سعدی نے بوستان میں لکھی ہے کہ ایک بزرگ کو کتے نے کاٹا۔ گھر آیا تو گھر والوں نے دیکھا کہ اُسے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک بھولی بھالی چھوٹی لڑکی بھی تھی۔ وہ بولی آپ نے کیوں نہ کاٹ کھایا؟ اُس نے جواب دیا۔ بیٹی انسان سے کُت پن نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے انسان کو چاہیئے کہ جب کوئی شریر گالی دے تو مومن کو لازم ہے کہ اعراض کرے۔ نہیں تو وہی کُت پن کی مثال صادق آئے گی خدا کے مقربوں کو بڑی بڑی گالیاں دی گئیں۔ بہت بُری طرح ستایا گیا۔ مگر ان کو اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ کا ہی خطاب ہوا۔ خود اُس انسان کامل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بُری طرح تکلیفیں دی گئیں اور گالیاں۔ بدزبانی اور شوخیاں کی گئیں مگر اس خلق مجسم ذات نے اس کے مقابلہ میں کیا کیا۔ اُن کے لیے دعا کی۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کرے گا تو تیری عزت اور جان کو ہم صحیح وسلامت رکھیں گے اور یہ بازاری آدمی اس پر حملہ نہ کر سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضور کے مخالف آپ کی عزت پر حرف نہ لا سکے اور خود ہی ذلیل و خوار ہو کر آپ کے قدموں پر گرے یا سامنے تباہ ہوئے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۹)

۲۰۴ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ

یُؤْمِنُوْنَ﴿۲۰۳﴾

اُور جس دن تو اُن کو کوئی آیت نہیں سناتا۔ اُس دن کہتے ہیں کہ آج تو نے کوئی آیت کیوں نہ گھڑی اُن کو کہہ کہ میں تو اُسی کلام کی پیروی کرتا ہوں کہ جو میرے ربّ کی طرف سے مجھ پر نازل ہو رہا ہے اپنے دل سے گھڑ لینا میرا کام نہیں اور نہ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن کو انسان اپنے افتراء سے گھڑ سکے۔ یہ تو میرے ربّ کی طرف سے بصائر ہیں یعنی اپنے منجانب اللہ ہونے پر آپ ہی روشن دلیلیں ہیں اور ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۲ حاشیہ نمبر ۱۱)



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تفسیر

سورۃ الانفال

بیان فرمودہ

حضرت سیّدنا مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

۲ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ یعنی آپس میں صلح کاری اختیار کرو۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۰۶)

۸ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ○

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ خدا کا یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ اپنے کلام سے حق کو ثابت کرے اور کافروں کے عقائد باطلہ کو جڑ سے کاٹ دے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۳۲ حاشیہ نمبر۱۱)

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

تا سچے مذہب کی سچائی اور جھوٹے مذہبوں کا جھوٹ ثابت کر کے دکھلا دے اگرچہ مجرم لوگ کراہت ہی کریں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۳۲ حاشیہ نمبر۱۱)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝

اَیْ هَاتُوْا قُلُوْبَهُمْ وَاَلْقُوْا فِيْهَا كَلِمٰتِ التَّثْبِيْتِ يَعْنِيْ قُوْلُوْا لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَكَمِثْلِهٖ مِنْ كَلِمٰتٍ تَطْمَئِنُّ بِهَا قُلُوْبُهُمْ فَهٰذِهِ الْاٰيٰتُ كُلُّهَا تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ اللّٰهَ قَدْ يُكَلِّمُ اَوْلِيَآءَهٗ وَيُخَاطِبُهُمْ لِيَزْدَادَ يَقِيْنُهُمْ وَبَصِيْرَتُهُمْ وَلِيَكُوْنُوْا مِنَ الْمُطْمَئِنِّيْنَ۔

(حمامۃ البشریٰ ص۸۰)

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(ترجمہ) یعنی ان کے دلوں پر اثر انداز ہو جاؤ اور ان میں ثابت قدم رہنے کے کلمات ڈالو یعنی ان سے کہو کہ تم خوف نہ کھاؤ اور تم غم نہ کرو اور اسی قسم کے دوسرے کلمات جن کے ساتھ ان کے قلوب مطمئن ہو جائیں۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء سے کبھی کبھی کلام کرتا ہے اور ان سے مخاطب ہوتا ہے تا ان کا یقین اور بصیرت زیادہ ہو اور تا وہ اطمینان یافتہ ہو جائیں۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۔ تو نے نہیں چلایا ۔ خدا نے ہی چلایا جب کہ تو نے چلایا۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۲۸ حاشیہ)

ہمارے سید و مولیٰ سید الرسل حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دُعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اُس کا اثر پڑا کہ کوئی ان میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اُس کا اثر نہ پہنچا ہو۔ اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے اور ایسی سراسیمگی اور پریشانی اُن میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اسی معجزہ کی طرف اللہ جل شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی یعنی جب تو نے اُس مٹھی کو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالیٰ نے پھینکا یعنی درپردہ الٰہی طاقت کام کر گئی اِنسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۶۵)

یاد رہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے دو ہاتھ جلالی و جمالی ہیں ۔ اسی نمونہ پر چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جلّ شانہٗ کے مظہر اتم ہیں۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے آپ کو بھی وہ دونوں ہاتھ رحمت اور شوکت کے عطا فرمائے۔ جمالی ہاتھ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن شریف میں ہے وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی ہم نے تمام دنیا پر رحمت کر کے تجھے بھیجا ہے اور جلالی ہاتھ کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۱ حاشیہ و اربعین نمبر ۳ صفحہ ۳۲ حاشیہ)

اہل اللہ قرب الٰہی میں ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں جبکہ ربّانی رنگ بشریت کے رنگ و بُو کو تمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متواری کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ظلّی طور پر وہ صفات الٰہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ اُس وقت اُس سے بدُوں دعا و التماس ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُلوہیت کے خواص رکھتے ہیں اور وہ ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں جو جس طرح کہتے ہیں اُسی طرح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور زبان سے ایسے امور کے صدور کی بصراحت بحث ہے جیسا کہ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۱)

۱۹۔ ذٰلِکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ مُوْہِنُ کَیْدِ الْکٰفِرِیْنَ ○

خدا تعالیٰ کافروں کے مکر کو سُست کر دے گا اور ان کو مغلوب اور ذلیل کر کے دکھلائے گا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

لہ الانبیاء آیت ۱۰۸۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝

اس میں بھی خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ فلاں فلاں مسلمان عالم ہمارے سلسلہ میں داخل نہیں اگر یہ داخل ہوتے تو خدا جانے کیا کیا فتنے برپا کرتے۔ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ۔

(بدر جلد ۶ عـ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صـ۴)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُس کے ہاتھ پر مُردے زندہ ہوتے ہیں لِمَا یُحْیِیْكُمْ اور سب کو معلوم ہے کہ اس سے مراد روحانی مُردوں کا زندہ ہونا ہے۔

(بدر جلد ۷ عـ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صـ۵)

اور جانو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان آجاتا ہے یعنی جیسا کہ دور اور نزدیک ہونا اس کی صفت ہے ایسا ہی درمیان آجانا بھی اس کی صفت ہے۔ (ست بچن صـ۹۲)

اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ یعنی خدا وہ ہے جو انسان اور اس کے دل میں حایل ہو جاتا ہے۔

(چشمہ معرفت صـ۸۹)

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۝

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اولاد اور مال انسان کے لیے فتنہ ہوتے ہیں۔ دیکھو اگر خدا کسی کو کہے کہ تیری کُل اولاد جو مر چکی ہے زندہ کر دیتا ہوں مگر پھر میرا تجھ سے کچھ تعلق نہ ہوگا تو کیا اگر وہ عقلمند ہے اپنی اولاد کی طرف جانے کا خیال بھی کرے گا؟ پس انسان کی نیک بختی یہی ہے کہ خدا کو ہر ایک چیز

پر مقدم رکھے جو شخص اپنی اولاد کی وفات پر بُرا مناتا ہے وہ بخیل بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ اس امانت کے دینے میں جو خدا نے اس کے سپرد کی تھی بخل کرتا ہے اور بخیل کی نسبت حدیث میں آتا ہے کہ اگر وہ جنگل کے دریاؤں کے برابر بھی عبادت کرے تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۸ صفحہ ۲ ۔ ۲۲ اگست ۱۹۰۸ء)

اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۔ اَمْوَالُكُمْ میں عورتیں داخل ہیں۔ عورت چونکہ پردہ میں رہتی ہے اس لیے اس کا نام بھی پردہ ہی میں رکھا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ عورتوں کو انسان مال خرچ کر کے لاتا ہے۔ مال کا لفظ مائل سے لیا گیا ہے یعنی جس کی طرف طبعاً توجہ اور رغبت کرتا ہے۔ عورت کی طرف بھی چونکہ طبعاً توجہ کرتا ہے اس لیے اس کو مال میں داخل فرمایا ہے۔ مال کا لفظ اس لیے رکھا تا کہ عام محبوبات پر حاوی نہ ہو۔ ورنہ اگر صرف نساء کا لفظ ہوتا تو اولاد اور عورت دو چیزیں قرار دی جاتیں۔ اور اگر محبوبات کی تفصیل کی جاتی۔ تو پھر دس جزو میں بھی ختم نہ ہوتا بغرض مال سے مراد كُلَّمَا يَمِيْلُ اِلَيْهِ الْقَلْبُ ہے۔ اولاد کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان اولاد کو جگر کا ٹکڑا اور اپنا وارث سمجھتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے محبوبات میں ضد ہے۔ دونوں باتیں ایک جا جمع نہیں ہو سکتیں اس سے یہ مت سمجھو کہ پھر عورتیں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو بہت ذلیل اور حقیر قرار دیا جاوے۔ نہیں نہیں۔ ہمارے ہادی کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ ۔ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہو۔ بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں وہ نیک کہاں۔ دوسرے کے ساتھ نیکی اور بھلائی تب کر سکتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو اور عمدہ معاشرت رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ ہر ادنیٰ بات پر زدو کوب کرے۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک غصہ سے بھرا ہوا انسان بیوی سے ادنیٰ سی بات پر ناراض ہو کر اس کو مارتا ہے اور کسی نازک مقام پر چوٹ لگی ہے اور بیوی مر گئی ہے اس لیے اُن کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ ہاں اگر وہ بیجا کام کرے تو تنبیہ ضروری چیز ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ عورتوں کے دل میں یہ بات جما دے کہ وہ کوئی ایسا کام جو دین اور شریعت کے خلاف ہو کبھی بھی پسند نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی وہ ایسا جابر اور ستم شعار نہیں کہ اس کی کسی غلطی پر بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا ایک فرق رکھ دے گا اور تمہیں پاک کر یگا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہارا خدا صاحبِ فضل بزرگ ہے۔ (پیغام صلح متفرق یادداشتیں ص۵۵)

روح القدس کے بارہ میں جو قرآن کریم میں آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے کامل مومنوں کو روح القدس دیا جاتا ہے منجملہ ان کے ایک یہ آیت ہے.... یعنی اے وے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور اللہ جلشانہٗ سے ڈرتے رہو تو خدا تعالیٰ تمہیں وہ چیز عطا کرے گا (یعنی روح القدس) جس کے ساتھ تم غیروں سے امتیاز کلّی پیدا کر لوگے اور تمہارے لیے ایک نور مقرر کر دیگا (یعنی روح القدس) جو تمہارے ساتھ ساتھ چلے گا۔ قرآن کریم میں روح القدس کا نام نور ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۹۷-۹۸)

اے ایمان لانے والو۔ اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے اتّقاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دیگا۔ وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائیگا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آجائیگا تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں میں تم چلوگے وہ راہ نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

اب اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی ہاں فہم اور ادراک حسب مراتب تقویٰ کم وبیش ہو سکتا ہے۔ اِسی مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی اور اعلیٰ درجہ کی کرامت جو اولیاء اللہ کو دی جاتی ہے جن کو تقویٰ میں کمال ہوتا ہے وہ یہی دی جاتی ہے کہ اُن کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے اور اُن کی قوت کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کر لیتی ہے کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اُن کے حواس نہایت باریک بین ہو جاتے ہیں اور معارف اور دقائق کے پاک چشمے ان پر کھولے جاتے ہیں اور فیض سائغ ربّانی اُن کے رگ وریشہ میں خون کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۱۷۷تا۱۷۹)

اے ایمان والو اگر تم خدا تعالیٰ سے ڈرو تو خدا تم میں اور تمہارے غیروں میں ما بہ الامتیاز رکھ دے گا۔

(جنگ مقدس ص۱ روئداد مباحثہ ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء)

اے مومنو اگر تم متقی بن جاؤ۔ تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا تعالیٰ ایک فرق رکھ دیگا۔ وہ فرق کیا ہے کہ تمہیں ایک نور عطا کیا جائے گا جو تمہارے غیر میں ہرگز نہیں پایا جائے گا یعنی نورِ الہام اور نورِ اجابتِ دعا اور نورِ کراماتِ اصطفاء۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۹۶)

قرآن شریف میں بار بار اور صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ قیامت تو مجازاتِ کبریٰ کا وقت ہے مگر ایک قسم کی مجازات اسی دنیا میں شروع ہے جس کی طرف آیت یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا اشارہ کرتی ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۹)

اے ایمان والو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا ایک فرق رکھ دے گا اور تمہیں پاک کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہارا خدا صاحب فضل بزرگ ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم یادداشتیں صفحہ ۶)

سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت و پیروی و تصدیق رسالت اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور ان انعامات کا وارث جو اگلے برگزیدہ انبیاء پر ہوئے چنانچہ فرمایا یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا یعنی وہ تمہیں ایک فرقان دیگا۔ پس دوسرے مذاہب اور اس میں ایک مابہ الامتیاز اسی جہان میں ہونا ضروری ہے۔

(بدر جلد ۷ ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

" کامل پیروی کرنے والے کی روح القدس سے تائید کی جائے گی یعنی اُن کے فہم اور عقل کو غیب سے ایک روشنی ملے گی اور ان کی کشفی حالت نہایت صفا کی جائے گی۔ اور ان کے کلام اور کام میں تاثیر رکھی جائے گی۔ اور ان کے ایمان نہایت مضبوط کیے جائیں گے " اور پھر فرمایا کہ خدا ان میں اور ان کے غیر میں ایک فرق بیّن رکھ دیگا یعنی بمقابل ان کے باریک معارف کے جو اُن کو دیئے جائیں گے اور بمقابل ان کے کرامات اور خوارق کے جو ان کو عطا ہوں گی دوسری تمام قومیں عاجز رہیں گی۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۴۱)

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (۳۱)

اور تو وہ وقت یاد کر کہ جب کافر لوگ تیرے قید کرنے یا قتل کرنے یا نکال دینے پر مکر کر کے منصوبے باندھتے تھے اور مکر کر رہے تھے اور خدا بھی مکر کر رہا تھا اور خدا سب مکر کرنے والوں سے بہتر ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۳ حاشیہ)

اور اے پیغمبر وہ وقت یاد کر جب کافر لوگ تجھ پر داؤ چلانا چاہتے تھے تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا تجھے مار ڈالیں اور یا تجھے جلا وطن کر دیں اور حال یہ تھا کہ کافر تو قتل کے لیے اپنا داؤ کر رہے تھے اور خدا ان کو مغلوب کرنے کے لیے اپنا داؤ کر رہا تھا اور خدا سب داؤ کرنے والوں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے جس کے داؤ میں سراسر مخلوق کی بھلائی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۶)

خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ یعنی ایسا مکر کرنے والا جس میں کوئی شر نہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۷)

واضح رہے کہ اسلام کی لڑائیاں ایسے طور سے نہیں ہوئیں کہ جیسے ایک زبردست بادشاہ کمزور لوگوں پر چڑھائی کرکے اُن کو قتل کرڈالتا ہے بلکہ صحیح نقشہ ان لڑائیوں کا یہ ہے کہ جب ایک مدّت دراز تک خدا تعالیٰ کا پاک نبی اور اُس کے پیرو مخالفوں کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھاتے رہے چنانچہ اُن میں سے کئی قتل کیے گئے اور کئی بُرے بُرے عذابوں سے مارے گئے یہاں تک کہ ہمارے نبی صلعم کے قتل کردینے کے لیے منصوبہ کیا گیا اور یہ تمام کامیابیاں اُن کے بتوں کے معبود برحق ہونے پر حمل کی گئیں اور ہجرت کی حالت میں بھی آنحضرت صلعم کو امن میں نہ چھوڑا گیا بلکہ خود آٹھ پڑاؤ تک چڑھائی کرکے خود جنگ کرنے کے لیے آئے تو اُس وقت اُن کے حملہ کو روکنے کے لیے اور نیز اُن لوگوں کو امن میں لانے کے لیے جو اُن کے ہاتھ میں قیدیوں کی طرح تھے اور نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ اُن کے معبود جن کی تائید پر یہ سابقہ کامیابیاں حمل کی گئی ہیں لڑائیاں کرنے کا حکم ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْیَقْتُلُوْکَ اَوْیُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُاللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُالْمٰکِرِیْنَ○ (جنگ مقدس صفحہ ۶ روئداد مباحثہ ۲ رجون ۱۸۹۳ء)

۳۲: وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ○

لَوْنَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا کہ اگر ہم چاہیں تو اس کی مانند کہہ دیں۔ (نزول المسیح صفحہ ۶۲)

۳۴: وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ○

"اَیْ مَاکَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمْ بِعَذَابٍ کَامِلٍ وَاَنْتَ سَاکِنٌ فِیْہِمْ (ترجمہ از مرتب) (یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ ان کو کامل عذاب میں مبتلا کرے جب کہ تو ان میں سکونت پذیر ہے) (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۴۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

اور خدا ایسا نہیں جو اُن کو عذاب پہنچاوے جب تک تو اُن کے درمیان ہے یا جب وہ استغفار کریں۔

براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

خدا ایسا نہیں کہ مکہ والوں پر عذاب نازل کرے اور تو ان میں ہو۔ کیونکہ وہ آفتاب تھا اور یہ غیر ممکن ہے کہ آفتاب کے ہوتے عذاب کی ظلمت نازل ہو۔ (انوار الاسلام صفحہ ۴۴)

اور خدا ایسا نہیں ہے کہ ان سب کو عذاب سے ہلاک کر دیتا حالانکہ تو انہیں میں رہتا ہے۔
(حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۳۱-۲۳۲)

استغفار عذاب الٰہی اور مصائب شدیدہ کے لیے سپر کا کام دیتا ہے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

یہ تمام اقوام کا مذہب ہے کہ صدقہ سے ردّ بلا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ بھی فرماتا ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ استغفار عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے تجربوں کی طرف کوئی جائے تو ایک منذر امر صبح کو ہو تو شام کو منسوخ ہو جاتا ہے (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

تمام انبیاء کرام کا اجماعی مسئلہ ہے کہ صدقہ و استغفار سے ردّ بلا ہوتا ہے۔ بلا کیا چیز ہے یعنی وہ تکلیف دہ امر جو خدا کے ارادہ میں مقدر ہو چکا ہے۔ اب اس بلا کی اطلاع جب کوئی نبی دے تو وہ پیشگوئی بن جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ وہ تضرع کرنے والوں پر اپنی رحمت سے رجوع کرتا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ وعید کی پیشگوئیاں اٹل ہیں۔ بلکہ وہ ٹل جاتی ہیں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۳۵ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اللہ کے ولی وہ ہیں جو متقی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست۔
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۵)

تقویٰ سے زینت اعمال پیدا ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب ملتا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی بن جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ کامل طور پر جب تقویٰ کا کوئی مرحلہ باقی نہ رہے تو پھر یہ اولیاء اللہ میں داخل ہو جاتا ہے اور تقویٰ حقیقت میں اپنے کامل درجہ پر ایک موت ہے۔
(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

ولایت کا حصہ تقویٰ ہی ہے۔ خدا تعالیٰ سے ترساں اور لرزاں ہو کر اگر اسے حاصل کرو گے تو کمال تک پہنچ جاؤ گے
(البدر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۳۷ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ ط فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ۵ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَھَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ ○

اور وہ تمام کافر کہ جو دین اسلام کے روکنے اور بند کرنے کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کر رہے ہیں وہ جہاں تک ان کا بس چلے گا خرچ کریں گے پر آخر کار وہ تمام خرچ اُن کے لیے تاسف اور حسرت کا موجب ہوگا اور پھر مغلوب ہو جائیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

۴۰. وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ج فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○

یعنی اس حد تک ان کا مقابلہ کرو کہ اُن کی بغاوت دُور ہو جائے اور دین کی روکیں اُٹھ جائیں اور حکومت اللہ کے دین کی ہو جائے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱۸ مباحثہ ۲ جون ۱۸۹۳ء)

قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ یعنی عرب کے ان مشرکوں کو قتل کرو یہاں تک کہ بغاوت باقی نہ رہ جاوے اور دین یعنی حکومت اللہ تعالیٰ کی ہو جائے۔ اس سے کہاں جبر نکلتا ہے۔ اس سے تو صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ اُس حد تک لڑو کہ ان کا زور ٹوٹ جائے اور شرارت اور فساد اُٹھ جائے اور بعض لوگ جیسے خفیہ طور پر اسلام لائے ہوئے ہیں ظاہر بھی اسلامی احکام ادا کر سکیں۔ اگر اللہ جلشانہ کا ایمان بالجبر منشا ہوتا جیسا کہ ڈپٹی صاحب سمجھ رہے ہیں تو پھر جزیہ اور صلح اور معاہدات کیوں جائز رکھے جاتے اور کیا وجہ تھی کہ یہود اور عیسائیوں کے لیے یہ اجازت دی جاتی کہ وہ جزیہ دے کر امن میں آجائیں اور مسلمانوں کے زیر سایہ امن کے ساتھ بسر کریں۔

(جنگ مقدس صفحہ ۷ مباحثہ ۳ جون ۱۸۹۳ء)

۴۳. اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَۃِ الْقُصْوٰی وَ الرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ ط وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ لا وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۵ لِّیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْۢ بَیِّنَۃٍ وَّ

يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

يَضَعُ الْحَرْبَ کا لفظ ہی کسرِ صلیب کی حقیقت کو بتاتا ہے کہ اس سے مراد...... لکڑی یا دوسری چیزوں کی صلیبوں کو توڑنا نہیں بلکہ صلیبی ملّت کی شکست ہے اور ملّت کی شکست بیّنہ اور براہین سے ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لِیَھْلِكَ مَنْ ھَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

لِیَھْلِكَ مَنْ ھَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ۔ جو ہلاک ہو وہ بھی بیّن آیات دیکھ کر ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ بھی بیّن آیات دیکھ کر زندہ ہو۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

تکرار...... بھی تو انسانی فطرت میں ہے کہ جب تک بار بار ایک بات کو دہراتے نہیں وہ یاد نہیں ہوتی۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ بار بار کیوں کہلوایا؟ ایک بار ہی کافی تھا۔ نہیں اس میں یہی سِر ہے کہ کثرت تکرار اپنا ایک اثر ڈالتی ہے اور غافل سے غافل قوتوں میں بھی ایک بیداری پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ جس طرح پر ذہنی تعلق ہوتا ہے اور کثرت تکرار ایک بات کو حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے اسی طرح ایک روحانی تعلق بھی ہے اس میں بھی تکرار کی حاجت ہے۔ بدون تکرار وہ روحانی پیوند اور رشتہ قائم نہیں رہتا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۹ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا کے یہ معنے ہیں کہ اس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام کنٹھ ہو جاوے انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ وہ ایک امر کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ تا مخلوق کو نفع پہنچے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۹ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

اسلامی فرقوں میں دن بدن پھوٹ پڑتی جاتی ہے۔ پھوٹ اسلام کے لیے سخت مضر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ جب سے اسلام کے اندر پھوٹ پڑی ہے۔ دم بدم تنزل کرتا جاتا ہے۔ اس لیے خدا نے اس سلسلہ کو قائم کیا تا لوگ فرقہ بندیوں سے نکل کر اس جماعت میں شامل ہوں جو بے ہودہ مخالفتوں سے بالکل محفوظ ہے اور اس سیدھے راہ پر چل رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○

یعنی بہادر وہ ہیں کہ...... جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ قرین مصلحت ہے تو نہ صرف جوش نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کے لیے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کرکے بلکہ خدا پر بھروسہ کرکے بہادری دکھاتے ہیں اور ان کی شجاعت میں کوئی ریاکاری اور خود بینی نہیں ہوتی اور نہ نفس کی پیروی بلکہ ہر ایک پہلو سے خدا کی رضا مقدم ہوتی ہے۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۱۳)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

جیسے فرعون کے خاندان اور اُس سے پہلے کافروں کا حال ہوا کہ جب انہوں نے خدا کے نشانوں سے انکار کرنا اختیار کیا تو خدا نے ان سے ان کے گناہوں کا مواخذہ کیا اور بہ تحقیق خدا بڑا طاقت والا اور سزا دینے میں سخت ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۹)

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۝

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ یعنی دینی دشمنوں کے لیے ہر یک قسم کی طیاری جو کر سکتے ہو کرو اور اعلاء کلمہ اسلام کے لیے جو قوت لگا سکتے ہو لگاؤ۔ اب دیکھو کہ آیت کریمہ کس قدر بلند آواز سے ہدایت فرما رہی ہے، کہ جو تدبیریں خدمت اسلام کے لیے کارگر ہوں سب بجالاؤ اور تمام قوت اپنے فکر کی اپنے بازو کی اپنی مالی طاقت کی اپنے احسن انتظام کی اپنی تدبیر شائستہ کی اس راہ میں خرچ کرو تا تم فتح پاؤ۔ اب نادان اور اندھے اور دشمن دین مولوی اس صرف قوت اور حکمت عملی کا نام بدعت رکھتے ہیں اِس وقت کے یہ لوگ عالم کہلاتے ہیں جن کو قرآن کریم کی ہی خبر نہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اس آیت موصوفہ بالا پر غور کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ بر طبق حدیث نبوی کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کوئی احسن انتظام اسلام کی خدمت کے لیے سوچنا بدعت اور ضلالت میں داخل نہیں ہے جیسے جیسے بوجہ تبدل زمانہ کے اسلام کو نئی نئی صورتیں مشکلات کی پیش آتی ہیں یا نئے نئے طور پر ہم لوگوں پر مخالفوں کے حملے ہوتے ہیں ویسی ہی ہمیں نئی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں پس اگر حالت موجودہ کے موافق ان حملوں کے روکنے کی کوئی تدبیر اور تدارک سوچیں تو وہ ایک تدبیر ہے۔ بدعات سے اس کو کچھ تعلق نہیں اور ممکن ہے کہ بباعث انقلاب زمانہ کے ہمیں بعض ایسی نئی مشکلات پیش آجائیں جو ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اُس رنگ اور طرز کی مشکلات پیش نہ آئی ہوں مثلاً ہم اس وقت کی لڑائیوں میں پہلی طرز کو جو مسنون ہے اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ اس زمانہ میں طریق جنگ و جدل بالکل بدل گیا ہے اور پہلے ہتھیار بیکار ہو گئے اور نئے ہتھیار لڑائیوں کے پیدا ہوئے۔ اب اگر ان ہتھیاروں کو پکڑنا اور اٹھانا اور ان سے کام لینا ملوک اسلام بدعت سمجھیں اور میاں رحیم بخش جیسے مولوی کی بات پر کان دھر کے ان اسلحہ جدیدہ کا استعمال کرنا ضلالت اور معصیت خیال کریں اور یہ کہیں کہ یہ وہ طریق جنگ ہے کہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اختیار کیا اور نہ صحابہ اور تابعین نے تو فرمائیے کہ بجز اس کے کہ ایک ذلت کے ساتھ اپنی ٹوٹی پھوٹی سلطنتوں سے الگ کیے جائیں اور دشمن فتحیاب ہو جائے کوئی اور بھی اس کا نتیجہ ہوگا۔ پس ایسے مقامات تدبیر اور انتظام میں خواہ وہ مشابہ جنگ وجدل ظاہری ہو یا باطنی اور خواہ تلوار کی لڑائی ہو یا قلم کی ہماری ہدایت پانے کے لیے یہ آیت کریمہ موصوفہ بالا کافی ہے یعنی یہ کہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ اللہ جلّ شانہ اس آیت میں ہمیں عام اختیار دیتا ہے کہ دشمن کے مقابل پر جو احسن تدبیر تمہیں معلوم ہو اور جو طرز تمہیں مؤثر اور بہتر دکھائی دے وہی طریق اختیار کرو۔
پس اب ظاہر ہے کہ اس احسن انتظام کا نام بدعت اور معصیت رکھنا اور انصارِ دین کو جو دن رات اعلاء کلمۂ اسلام کے فکر میں ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حُبُّ الْاَنْصَارِ مِنَ الْاِیْمَانِ ان کو مردود ٹھہرانا نیک طینت انسانوں کا کام نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ اُن لوگوں کا کام ہے جن کی روحانی صورتیں مسخ شدہ ہیں اور اگر یہ کہو کہ یہ حدیث کہ حُبُّ الْاَنْصَارِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَبُغْضُ الْاَنْصَارِ مِنَ النِّفَاقِ یعنی انصار کی محبت ایمان کی نشانی اور انصار سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے۔ یہ اُن انصار کے حق میں ہے جو مدینہ کے رہنے والے تھے نہ عام اور تمام انصار۔ تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ جو اس زمانہ کے بعد انصارِ رسول اللہ ہوں اُن سے بُغض رکھنا جائز ہے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ یہ حدیث گو ایک خاص گروہ کے لیے فرمائی گئی مگر اپنے اندر عموم کا فائدہ رکھتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اکثر آیتیں خاص گروہ کے لیے نازل ہوئیں مگر اُن کا مصداق عام قرار دیا گیا ہے۔

نادان یہ بھی نہیں جانتے کہ تدبیر اور انتظام کو بدعات کی مد میں داخل نہیں کر سکتے۔ ہر یک وقت اور زمانہ انتظامات جدیدہ کو چاہتا ہے اگر مشکلات کی جدید صورتیں پیش آویں تو بجز جدید طور کی تدبیروں کے اور ہم کیا کر سکتے ہیں پس کیا یہ تدبیریں بدعات میں داخل ہو جائیں گی۔ جب اصل سنت محفوظ ہو اور اُسی کی حفاظت کے لیے بعض تدابیر کی ہمیں حاجت پڑے تو کیا وہ تدابیر بدعت کہلائیں گی معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ بدعت وہ ہے جو اپنی حقیقت میں سنت نبویہ کے معارض اور نقیض واقع ہو اور آثار نبویہ میں اُس کام کے کرنے کے بارے میں زجر اور تہدید پائی جائے اور اگر صرف جدت انتظام اور نئی تدبیر پر بدعت کا نام رکھنا ہے تو پھر اسلام میں بدعتوں کو گنتے جاؤ۔ کچھ شمار بھی ہے۔ علم صرف بھی بدعت ہوگا اور علم نحو بھی اور علم کلام بھی اور حدیث کا لکھنا اور اس کا مبوّب اور مرتّب کرنا سب بدعات ہوں گے۔ ایسا ہی ریل کی سواری میں چڑھنا۔ کلوں کا کپڑا پہننا۔ ڈاک میں خط ڈالنا۔ تار کے ذریعہ سے کوئی خبر منگوانا اور بندوق اور توپوں سے لڑائی کرنا تمام یہ کام بدعات میں داخل ہوں گے بلکہ بندوق اور توپوں سے لڑائی کرنا نہ صرف بدعت بلکہ ایک گناہ عظیم ٹھہرے گا کیونکہ ایک حدیث صحیح میں ہے کہ آگ کے عذاب سے کسی کو ہلاک کرنا سخت ممنوع ہے۔ صحابہ سے زیادہ سنت کا متبع کون ہو سکتا ہے مگر انہوں نے بھی سنت کے وہ معنی نہ سمجھے جو میاں رحیم بخش نے سمجھے انہوں نے تدبیر اور انتظام کے طور پر بہت سے ایسے جدید کام کیے کہ جو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے

اور نہ قرآن کریم میں وارد ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محدثات ہی دیکھو جن کا ایک رسالہ بنتا ہے۔ اسلام کے لیے ہجری تاریخ انہوں نے مقرر کی۔ اور شہروں کی حفاظت کے لیے کوتوال مقرر کیے اور بیت المال کے لیے ایک باضابطہ دفتر تجویز کیا۔ جنگی فوج کے لیے قواعد رخصت اور حاضری ٹھہرائے اور ان کے لڑنے کے دستور مقرر کیے اور مقدمات مال وغیرہ کے رجوع کے لیے خاص خاص ہدایتیں مرتب کیں اور حفاظت رعایا کے لیے بہت سے قواعد اپنی طرف سے تجویز کرکے شائع کیے اور خود کبھی کبھی اپنے عہد خلافت میں پوشیدہ طور پر رات کو پھرنا اور رعایا کا حال اس طرح سے معلوم کرنا اپنا خاص کام ٹھہرایا لیکن کوئی ایسا نیا کام اس عاجز نے تو نہیں کیا۔ صرف طلب علم اور مشورہ امداد اسلام اور ملاقات اخوان کے لیے یہ جلسہ تجویز کیا۔ (آئینہ کمالات اسلام قیامت کی نشانی ص۱۰تا۲)

اور سرحد پر اپنے گھوڑے باندھے رکھو کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن اس تمہاری تیاری اور استعداد سے ڈرتے رہیں......

رباط ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحابہ کو اعداء کے مقابلہ کے لیے مستعد رہنے کا حکم دیتا ہے اور اس رباط کے لفظ سے انہیں پوری اور سچی تیاری کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان کے سپرد دو کام تھے۔ ایک ظاہری دشمنوں کا مقابلہ دوسرا ایک وہ روحانی مقابلہ کرنے تھے اور رباط لغت میں نفس اور انسانی دل کو بھی کہتے ہیں اور یہ ایک لطیف بات ہے کہ گھوڑے وہی کام آتے ہیں جو سدھائے ہوئے اور تعلیم یافتہ ہوں آج کل گھوڑوں کی تعلیم و تربیت کا اسی انداز پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور اسی طرح ان کو سدھایا سکھایا جاتا ہے جس طرح بچوں کو سکولوں میں خاص احتیاط اور اہتمام سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر ان کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ سدھائے نہ جائیں تو وہ بالکل نکمے ہوں اور بجائے مفید ہونے کے خوفناک اور مضر ثابت ہوں۔

یہ اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ انسانوں کے نفوس یعنی رباط بھی تعلیم یافتہ چاہئیں اور ان کے قویٰ اور طاقتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کے نیچے نیچے چلیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اس حرب اور جدال کا کام نہ دے سکیں گے جو انسان اور اس کے خوفناک دشمن یعنی شیطان کے درمیان اندرونی طور پر ہر لحظہ اور ہر آن جاری ہے۔ جیسا کہ لڑائی اور میدانِ جنگ میں علاوہ فوائے بدنی کے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس اندرونی حرب اور جہاد کے لیے نفوسِ انسانی کی تربیت اور مناسب تعلیم مطلوب ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان اس پر غالب آجائے گا اور وہ بہت بُری طرح ذلیل اور رسوا ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص توپ و تفنگ۔ اسلحہ حرب بندوق وغیرہ تو رکھتا ہو لیکن اس کے استعمال اور چلانے سے ناواقف محض ہو تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور تیر و تفنگ اور سامانِ حرب بھی ایک شخص رکھتا ہو اور اُن کا استعمال بھی جانتا ہو لیکن اس کے بازو میں طاقت نہ ہو تو بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف طریق اور طرز استعمال کا سیکھ لینا بھی کارآمد اور

مفید نہیں ہوسکتا جب تک کہ ورزش اور مشق کرکے بازو میں توانائی اور قوت پیدا نہ کی جائے۔ اب اگر ایک شخص جو تلوار چلانا تو جانتا ہے لیکن ورزش اور مشق نہیں رکھتا تو میدانِ حرب میں جاکر جونہی ہیں چار دفعہ تلوار کو حرکت دیگا اور دو ایک ہاتھ ماریگا۔ اس کے بازو نکمے ہوجائینگے اور وہ تھک کر بالکل بیکار ہوجائے گا اور خود ہی آخر دشمن کا شکار ہوجائے گا۔

پس سمجھ لو اور خوب سمجھ لو کہ نِرا علم وفن اور خشک تعلیم بھی کچھ کام نہیں دے سکتی۔ جب تک کہ عمل اور مجاہدہ اور ریاضت نہ ہو۔ دیکھو۔ سرکار بھی فوجوں کو اسی خیال سے بیکار نہیں رہنے دیتی یعنی امن وآرام کے دنوں میں بھی مصنوعی جنگ برپا کرکے فوجوں کو بیکار نہیں ہونے دیتی اور معمولی طور پر چاند ماری اور پریڈ وغیرہ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ میدانِ کارزار میں کامیاب ہونے کے لیے جہاں ایک طرف طریق استعمال اسلحہ وغیرہ کی تعلیم اور واقفیت کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف ورزش اور محل استعمال کی بھی بڑی بھاری ضرورت ہے اور نیز حرب وضرب میں تعلیم یافتہ گھوڑے چاہئیں۔ یعنی ایسے گھوڑے جو توپوں اور بندوقوں کی آواز سے نہ ڈریں اور گرد وغبار سے پراگندہ ہوکر پیچھے نہ ہٹیں۔ بلکہ آگے ہی بڑھیں۔ اسی طرح نفوسِ انسانی کامل ورزش اور پوری ریاضت اور حقیقی تعلیم کے بغیر اعداء اللہ کے مقابل میدانِ کارزار میں کامیاب نہیں ہوسکتے

لغت عرب بھی عجیب چیز ہے۔ مقابلہ بھی اسی پر ختم ہے۔ رباط کا لفظ جو آیہ مذکورہ میں آیا ہے جہاں دنیاوی جنگ وجدل اور فنونِ جنگ کی فلاسفی پر مشتمل ہے۔ وہاں روحانی طور پر اندرونی جنگ اور مجاہدہ نفس کی حقیقت اور خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے..... اب دیکھو کہ یہی رباط کا لفظ جو اُن گھوڑوں پر بولا جاتا ہے جو سرحد پر دشمنوں سے حفاظت کے لیے باندھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ لفظ اُن نفسوں پر بھی بولا جاتا ہے جو اس جنگ کی تیاری کے لیے تعلیم یافتہ ہوں جو انسان کے اندر ہی اندر شیطان سے ہر وقت جاری ہے۔ یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئی تھیں ایک قوت وہ تھی جس کا استعمال صدرِ اوّل میں بطور مدافعت وانتقام کے ہوا۔ یعنی مشرکین عرب نے جب ستایا اور تکلیفیں دیں تو ایک ہزار نے ایک لاکھ کفّار کا مقابلہ کرکے شجاعت کا جوہر دکھایا اور ہر امتحان میں اس پاک قوّت وشوکت کا ثبوت دیا۔ وہ زمانہ گذر گیا اور رباط کے لفظ میں جو فلاسفی ظاہر ہے قوت جنگ اور فنونِ جنگ کی مخفی تھی وہ ظاہر ہوگئی ہے۔

اب اس زمانہ میں جس میں ہم ہیں جنگ ظاہری کی مطلق ضرورت اور حاجت نہیں بلکہ آخری دنوں میں جنگ باطنی کے نمونے دکھانے مطلوب تھے۔ اور روحانی مقابلہ زیرِ نظر تھا۔ کیونکہ اس وقت باطنی ارتداد اور الحاد کی اشاعت کے لیے بڑے بڑے سامان اور اسلحہ بنائے گئے۔ اس لیے ان کا مقابلہ بھی اسی قسم کے اسلحوں سے ضروری ہے کیوں کہ آج کل امن وامان کا زمانہ ہے اور ہم کو ہر طرح کی آسائش اور امن حاصل ہے۔ آزادی سے ہر آدمی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ اور احکام کی بجاآوری کرسکتا ہے۔ پھر اسلام جو امن کا سچا حامی ہے بلکہ حقیقتًہ امن اور سلم اور

آشتی کا اشاعت کنندہ ہی اسلام ہے کیونکہ اس زمانۂ امن و آزادی میں اُس پہلے نمونہ کو دکھانا پسند کرسکتا تھا پس آجکل وہی دوسرا نمونہ یعنی روحانی مجاہدہ مطلوب ہے کیونکہ ؏

کہ حلوا چو یک بار خوردند وبس

ایک اور بات بھی ہے کہ اُس پہلے نمونہ کے دکھانے میں ایک اور امر بھی ملحوظ تھا یعنی اس وقت اظہار شجاعت بھی مقصود تھا جو اُس وقت کی دنیا میں سب سے زیادہ محمود اور محبوب وصف سمجھی جاتی تھی اور اس وقت تو حرب ایک فن ہوگیا ہے کہ دُور بیٹھے ہوئے بھی ایک آدمی توپ اور بندوق چلا سکتا ہے۔ ان دِنوں میں سچا بہادر وہ تھا جو تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہوتا اور آجکل کا فنِ حرب تو بُزدلوں کا پردہ پوش ہے۔ اب شجاعت کا کام نہیں۔ بلکہ جو شخص آلات حرب جدید اور نئی توپیں وغیرہ رکھتا اور چلا سکتا ہے۔ وہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اُس حرب کا مدعا اور مقصد مومنوں کے مخفی مادۂ شجاعت کا اظہار تھا۔ اور خدا تعالیٰ نے جیسا چاہا۔ خوب طرح اُسے دنیا پر ظاہر کیا اب اس کی حاجت نہیں رہی۔ اس لیے کہ اب جنگ نے فن اور مکیدۃ اور خدیعہ کی صورت اختیار کر لی ہے اور نئے نئے آلات حرب اور پیچیدار فنون نے اس قیمتی اور قابل فخر جوہر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور جسمانی جنگوں کی اس لیے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوتِ اسلام کرنے والے کا جواب اُن دنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا۔ اس لیے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا۔ لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا کہ سیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جائے اور تحریر سے مقابلہ کرکے مخالفوں کو پست کیا جاوے اسی لیے اب کسی کو شایاں نہیں کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اس وقت جو ضرورت ہے وہ یقیناً سمجھ لو سیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے۔ ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کیے ہیں اور مختلف سائنسوں اور مکائد کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے۔ اس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ میں قلمی اسلحہ پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدانِ کارزار میں اُتروں اور اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھاؤں۔ میں کب اس میدان کے قابل ہوسکتا تھا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بیحد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اُس کے دین کی عزت ظاہر ہو۔ میں نے ایک وقت اُن اعتراضات اور حملات کو شمار کیا تھا جو اسلام پر ہمارے مخالفین نے کیے ہیں تو ان کی تعداد اس وقت میرے خیال اور اندازہ میں تین ہزار ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو اور بھی تعداد بڑھ گئی ہوگی۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اسلام کی بناء ایسی کمزور باتوں پر ہے کہ اس پر تین ہزار اعتراض وارد ہوسکتا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ یہ اعتراضات تو

کوتاہ اندیشوں اور نادانوں کی نظر میں اعتراض ہیں مگر میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جہاں ان اعتراضات کو شمار کیا وہاں یہ بھی غور کیا ہے کہ ان اعتراضات کی تہ میں دراصل بہت ہی نادر صداقتیں موجود ہیں جو عدم بصیرت کی وجہ سے ان کو دکھائی نہیں دیں اور حقیقت میں یہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جہاں نابینا معترض آ کر اٹکا ہے۔ وہیں حقائق و معارف کا مخفی خزانہ رکھا ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے کہ میں ان خزائن مدفونہ کو دنیا کو دکھاؤں اور ناپاک اعتراضات کا کیچڑ جو اُن درخشاں جواہرات پر تھوپا گیا ہے۔ اسے پاک صاف کروں۔ خدا تعالیٰ کی غیرت اس وقت بڑی جوش میں ہے کہ قرآن شریف کی ساحت عزت کو ہر ایک خبیث دشمن کے داغ اعتراض سے منزہ و مقدس کرے۔

الغرض ایسی صورت میں کہ مخالفین قلم سے ہم پر وار کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کس قدر بیوقوفی ہو گی کہ ہم اُن سے لٹھم لٹھا ہونے کو تیار ہو جائیں میں تمہیں کھول کر بتلاتا ہوں کہ ایسی صورت میں اگر کوئی اسلام کا نام لیکر جنگ جدال کا طریق جواب میں اختیار کرے تو وہ اسلام کا بدنام کرنے والا ہوگا اور اسلام کا کبھی ایسا منشاء نہ تھا کہ بے مطلب اور بلا ضرورت تلوار اُٹھائی جائے۔ اب لڑائیوں کی اغراض جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ فن کی شکل میں آکر دینی نہیں رہیں۔ بلکہ دنیوی اغراض اُن کا موضوع ہو گیا ہے۔ پس کس قدر ظلم ہوگا کہ اعتراض کرنے والوں کو جواب دینے کی بجائے تلوار دکھائی جائے۔ اب زمانہ کے ساتھ حرب کا پہلو بدل گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل اور دماغ سے کام لیں اور نفوس کا تزکیہ کریں۔ راست بازی اور تقویٰ سے خدا تعالیٰ سے امداد اور فتح چاہیں یہ خدا تعالیٰ کا ایک اٹل قانون اور مستحکم اصول ہے کہ اگر مسلمان صرف قیل و قال اور باتوں سے مقابلہ میں کامیابی اور فتح پانا چاہیں تو یہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ لاف گزاف اور لفظوں کو نہیں چاہتا۔ وہ تو حقیقی تقویٰ کو چاہتا اور سچی طہارت کو پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔[۱] (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۱)

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝

جب وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۰۶)

اور اگر مخالف لوگ صلح کے واسطے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر توکل کرو۔ (پیغام صلح صفحہ ۵۶)

اصل میں مومن کو بھی تبلیغ دین میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جہاں نرمی کا موقعہ ہو وہاں سختی اور درشتی نہ کرے اور جہاں بجز سختی کرنے کے کام ہوتا نظر نہ آوے وہاں نرمی کرنا بھی گناہ ہے گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی۔

[۱] النحل آیت ۱۲۹

دیکھو فرعون بظاہر کیسا سخت کافر انسان تھا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو یہی ہدایت ہوئی کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا۔[1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بھی قرآن شریف میں اسی قسم کا حکم ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ مومنوں اور مسلمانوں کے واسطے نرمی اور شفقت کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی ایسی ہی حالت بیان کی گئی جہاں فرمایا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔[2]

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۷ صفحہ ۳ ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء)

اور اگر مخالف صلح کے واسطے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر توکل کرو۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم یادداشتیں صفحہ ۶ طبع اوّل)

۶۳ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور اگر صلح کے وقت دل میں دغا رکھیں تو اس دغا کے تدارک کے لیے خدا تجھے کافی ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم یادداشتیں صفحہ ۶)

۶۴ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ہمارے ہادی اکمل کے صحابہؓ نے اپنے خدا اور رسول کے لیے کیا کیا جاں نثاریاں کیں۔ جلا وطن ہوئے۔ ظلم اُٹھائے۔ طرح طرح کے مصائب اٹھائے۔ جانیں دے دیں لیکن صدق و وفا کے ساتھ قدم مارتے ہی گئے۔ پس وہ کیا بات تھی کہ جس نے انہیں ایسا جان نثار بنا دیا وہ سچی الٰہی محبت کا جوش تھا جس کی شعاع اُن کے دل میں پڑ چکی تھی۔ سو خواہ کسی نبی کے ساتھ مقابلہ کر لیا جاوے۔ آپ کی تعلیم۔ تزکیہ نفس۔ پیروؤں کو دنیا سے متنفر کرا دینا۔ شجاعت کے ساتھ صداقت کے لیے خون بہا دینا۔ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے گی۔ سو یہ مقام حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ کا ہے اور اُن میں جو آپس میں تالیف و محبت تھی اس کا نقشہ دو فقروں میں بیان کیا

[1] طٰہٰ آیت ۴۵۔ [2] الفتح آیت ۳۰۔

ہے۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ رپ یعنی جو تالیف ان میں ہے۔ وہ ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ خواہ سونے کا پہاڑ بھی دیا جاتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۴-۵۵)

ہماری کوششیں تو بچوں کا کھیل ہیں۔ نہ لوگوں کے دلوں سے ہم وہ گند نکال سکتے ہیں جو آج کل دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے نہ کمال محبتِ الٰہی کا ان کے اندر بھر سکتے ہیں نہ ان کے درمیان باہمی کمال الفت پیدا کر سکتے ہیں جس سے وہ سب مثل ایک وجود کے ہو جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں صحابہؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے هُوَ الَّذِيْ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ پ۱۰ وہ خدا جس نے اپنی نصرت سے اور مومنوں سے تیری تائید کی اور اُن کے دلوں میں ایسی اُلفت ڈالی کہ اگر تو ساری زمین کے ذخیرے خرچ کرتا تو بھی ایسی اُلفت پیدا نہ کر سکتا لیکن خدا نے ان میں یہ الفت پیدا کر دی وہ غالب اور حکمتوں والا خدا ہے جس خدا نے پہلے یہ کام کیا وہ اب بھی کر سکتا ہے۔ آئندہ بھی اسی پر توکل ہے۔ جو کام ہونے والا ہوتا ہے۔ اس میں خدا کے فضل کی رُوح پھونکی جاتی ہے جیسا کہ باغبان اپنے باغ کی آبپاشی کرتا ہے تو وہ تروتازہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ اپنے مرسلین کے سلسلہ کو ترقی اور تازگی عطا فرماتا ہے جو فرقے صرف اپنی تدبیر سے بنتے ہیں ان کے درمیان چند روز میں ہی تفرقے پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ برہمو تھوڑے دن تک ترقی کرتے کرتے آخر رُک گئے اور دن بدن نابود ہوتے جاتے ہیں کیونکہ اُن کی بنا صرف انسانی خیال پر ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت قوم عرب کے تمدن اور اخلاق اور روحانیت کا کیا حال تھا گھر گھر میں جنگ اور شراب نوشی اور زنا اور لُوٹ مار غرض ہر ایک بدی موجود تھی۔ کوئی نسبت اور تعلق خدا کے ساتھ اور اخلاق فاضلہ کے ساتھ کسی کو حاصل نہ تھا۔ ہر ایک فرعون بنا پھرتا تھا لیکن آنحضرتؐ کے آنے سے جب اسلام میں داخل ہوئے تو ایسی محبت الٰہی اور وحدت کی رُوح اُن میں پیدا ہو گئی کہ ہر ایک خدا کی راہ میں مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ انہوں نے بیعت کی حقیقت کو ظاہر کر دیا اور اپنے عمل سے اس کا نمونہ دکھا دیا۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

کیا کوئی اس قوم کی نسبت خیال کر سکتا تھا کہ یہ قوم باہم متحد ہو گی۔ اور خدا تعالیٰ سے ایسا قوی تعلق پیدا کریں گے کہ باوجودیکہ یہ فرعون سیرت ہیں لیکن اس کی اطاعت میں ایسے محو اور فنا ہوں گے کہ جان عزیز کو بھی اس کی راہ میں دیدیں گے غور کرو کہ کیا یہ آسان امر تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم میں ایسی محبّت الٰہی کا پیدا کر دینا کہ وہ مرنے کو تیار ہو جائیں خود آپ کی اعلیٰ درجہ کی قوت قدسی کو ظاہر کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سورۃ توبہ

بیان فرمودہ

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۲۔ فَسِیۡحُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ ۙ وَاَنَّ اللّٰہَ مُخۡزِی الۡکٰفِرِیۡنَ ۝

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ الخ اور تم یقیناً جانو کہ تم خدا کو اُس کے کاموں میں کبھی عاجز نہیں کر سکتے۔ اور خدا انہیں رسوا کرے گا۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۳۵ حاشیہ نمبر۱۱)

۶۔ وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبۡلِغۡہُ مَاۡمَنَہٗ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ ۝

اگر تجھ سے اے رسول کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ کا خواستگار ہو تو اُس کو پناہ دے دو اور اس وقت تک اس کو اپنی پناہ میں رکھو کہ وہ اطمینان سے خدا کی کلام کو سن سمجھ لے اور پھر اس کو اُس کے امن کی جگہ پر واپس پہنچا دو۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے حق میں اس وجہ سے کرنی ضرور ہے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن شریف جبر کی تعلیم کرتا تو یہ حکم نہ دیتا کہ جو کافر قرآن شریف کو سُننا چاہے تو جب وہ سُن چکے اور مسلمان نہ ہو تو اُس کو اس کے امن کی جگہ پر پہنچا دینا چاہئے بلکہ یہ حکم دیتا کہ جب ایسا کافر قابو میں آجاوے تو وہیں اس کو مسلمان کر لو۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۴)

اگر کوئی مشرک قرآن شریف کو سننا چاہے تو اس کو اپنی پناہ میں لے آؤ جب تک وہ کلام الٰہی کو سُنے پھر اس کو اُسی کے مامن میں پہنچا دو اور اس آیت کے آگے یہ آیت ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ یعنی یہ رعایت اس لیے ہے کہ یہ قوم بے خبر ہے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۸۔ ۳ر جون ۱۸۹۳ء)

یعنی اگر لڑائی کے ایّام میں کوئی شخص مشرکوں میں سے خدا کے کلام کو سننا چاہے تو اس کو پناہ دے دو جب تک کہ وہ خدا کے کلام کو سُن لے اور پھر اس کو اپنے امن کی جگہ میں پہنچا دو کیونکہ وہ ایک جاہل قوم ہے اور نہیں جانتے کہ وہ کس سے لڑائی کر رہے ہیں۔ (لیکچر چشمۂ معرفت صفحہ ۲۲)

۸﴾ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ جس کا مطلب یہی ہے کہ بعد عہدوں کے توڑنے کے اُن کے قول و اقرار کا کیا اعتبار رہا۔ (جنگ مقدس صفحہ ۸۔ ۳ر جون ۱۸۹۳ء)

۱۰﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ۝

یہ مشرک نہ کسی عہد کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی قرابت کا اور حد سے نکل جانے والے ہیں۔

(جنگ مقدس صفحہ ۸۔ ۳ر جون ۱۸۹۳ء)

۱۲، ۱۳﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۝۱۲ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ

اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳﴾

یہ نہایت درجہ کا ظلم ہے کہ اسلام کو ظالم کہا جاتا ہے حالانکہ ظالم وہ خود ہیں جو تعصب کی وجہ سے بے سوچے سمجھے اسلام پر بے جا اعتراض کرتے ہیں اور باوجود بار بار سمجھانے کے نہیں سمجھتے کہ اسلام کے کل جنگ اور مقابلے کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر دفاعی رنگ میں حفاظت جان و مال کی غرض سے کیے تھے اور کوئی بھی حرکت مسلمانوں کی طرف سے ایسی سرزد نہیں ہوئی جس کا ارتکاب اور ابتداء پہلے کفار کی طرف سے نہ ہوئی ہو۔ بلکہ بعض قابل نفرین حرکات کا مقابلہ بتقاضائے وسعت اخلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمداً ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا مثلاً کفار میں ایک سخت قابل نفرت رسم تھی جو کہ وہ مسلمان مُردوں سے کیا کرتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیح فعل سے مسلمانوں کو قطعاً روک دیا۔

قرآن شریف میں بڑی بسط اور تفصیل سے اس امر کا ذکر موجود ہے مگر کوئی غور کرنے والا اور بے تعصب دل سچائی اور حق کی پیاس بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ قرآن شریف میں صاف طور سے اس امر کا ذکر آگیا ہے وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی ہر ایک شرارت اور فساد کی ابتداء پہلے کفار کی طرف سے ہوئی ہے ....

اب جائے غور ہے کہ قرآن شریف نے جن اضطراری حالتوں میں جنگ کرنے کی اجازت دی ہے ان میں سے آج اس زمانہ میں کوئی بھی حالت موجود ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی جبر و تشدد کسی دینی معاملہ میں ہم پر نہیں کیا جاتا بلکہ ہر ایک کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ اب نہ کوئی جنگ کرتا ہے کسی دینی غرض کے لیے اور نہ ہی لونڈی غلام کوئی بناتا ہے نہ کوئی نماز روزے اذان حج اور ارکان اسلام کی ادائیگی سے روکتا ہے تو پھر جہاد کیسا اور لونڈی غلام کیسے؟ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۸ ۲۶ مارچ ۱۹۰۸ء)

اگر یہ مشرک توڑیں قسمیں اپنی بعد عہد کرنے کے اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم کفر کے سرداروں سے لڑو کیونکہ وہ اپنی قسموں پر قائم نہیں رہتے تاکہ وہ باز آجائیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا اور رسول کو نکال دینے کا قصد کیا اور انہوں نے ہی اوّل ایذا اور قتل کے لیے اقدام کیا۔

اب تمام ان آیات پر نظر غور ڈال کر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس مقام سے جبر کو کچھ بھی تعلق نہیں بلکہ مشرکین عرب نے اپنے ایذاء اور خون ریزیوں کو یہاں تک پہنچا کر اپنے تئیں اس لائق کر دیا تھا کہ جیسا کہ انہوں نے مسلمانوں کے مَردوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو سخت بے رحمی سے مارا اور ان کے بچوں کو قتل کیا۔ وہ اس لائق ٹھہر گئے تھے کہ حضرت موسیٰ کے قانون جہاد کے موافق ان کی عورتیں بھی قتل کی جائیں ان کے بچے بھی قتل کیے جائیں اور ان کے جوان و بڈھے سب تہ تیغ کیے جاویں اور ان کو اپنے وطنوں سے جلا وطن کر کے ان کے شہروں اور دیہات

کو پھونکا جائے۔ لیکن ہمارے نبی صلعم نے ایسا نہ کیا بلکہ ہر طرح سے اُن کو رعایت دی یہاں تک کہ باوجود اُن کے واجب القتل ہونے کے جو اپنی خونریزیوں کی وجہ سے وہ اس لائق ہو گئے تھے ان کو یہ بھی رعایت دی گئی کہ اگر کوئی ان میں سے اپنی مرضی سے دین اسلام اختیار کرے تو امن میں آجائے۔

اب اس نرم اور پُر رحم طریق پر اعتراض کیا جاتا ہے اور حضرت موسیٰ کی لڑائیوں کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ افسوس ہزار افسوس اگر اس وقت انصاف ہو تو اس فرق کا سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تعجب کہ وہ خدا جس نے حضرت موسےٰ کو حکم دیدیا کہ تم مصر سے ناحق بے موجب لوگوں کے برتن اور زیور مستعار طور پر لیکر اور دروغگوئی کے طور پر ان چیزوں کو اپنے قبضہ میں کر کے پھر اپنا مال سمجھ لو اور دشمنوں کے مقابل پر ایسی بے رحمی کرو کہ کئی لاکھ بچے اُن کے قتل کردو اور لوٹ کا مال لے لو اور ایک حصہ خدا کا اس میں سے نکالو اور حضرت موسیٰ جس عورت کو چاہیں اپنے لیے پسند کریں اور بعض صورتوں میں جزیہ بھی لیا جائے اور مخالفوں کے شہر اور دیہات پھونکے جائیں اور وہی خدا ہمارے نبی صلعم کے وقت میں باوجود اپنی ایسی نرمیوں کے فرماتا ہے۔ بچوں کو قتل نہ کرو۔ عورتوں کو قتل نہ کرو۔ راہبوں سے کچھ تعلق نہ رکھو۔ کھیتوں کو مت جلاؤ۔ گرجاؤں کو مسمار مت کرو اور اُنہیں کا مقابلہ کرو جنہوں نے اوّل تمہارے قتل کرنے کے لیے پیش قدمی کی ہے اور پھر اگر وہ جزیہ دیدیں یا اگر عرب کے گروہ میں سے ہیں جو اپنی سابقہ خونریزیوں کی وجہ سے واجب القتل ہیں تو ایمان لانے پر ان کو چھوڑ دو اگر کوئی شخص کلام الٰہی سننا چاہتا ہے تو اس کو اپنی پناہ میں لے آؤ اور وہ جب سُن چکے تو اُس کو اس کی امن کی جگہ پر پہنچا دو۔ افسوس کہ اب وہی خدا مورد اعتراض ٹھہرایا گیا ہے افسوس کہ ایسی عمدہ اور اعلیٰ تعلیم پر وہ لوگ اعتراض کر رہے ہیں جو توریت کی اُن خونریزیوں کو جن سے بچے بھی باہر نہیں رہے خدائے تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱۰۰ ۳ رجون ۱۸۹۳ء)

جہاد میں یعنی لڑنے میں اسلام سے ابتداء نہیں ہوئی جیسا کہ فرماتا ہے وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی اُنہیں مخالفوں نے لڑنے میں ابتداء کی پھر جب کہ انہوں نے آپ ابتداء کی۔ وطن سے نکالا۔ صدہا بے گناہوں کو قتل کیا۔ تعاقب کیا اور اپنے بتوں کی کامیابی کی شہرت دی تو پھر بجز اُن کی سرکوبی کے اور کونسا طریق حق اور حکمت کے مناسب حال تھا۔ اس کے مقابل حضرت موسیٰ کی لڑائیاں دیکھیئے جن لوگوں کے ساتھ ہوئیں۔ کون سی تکلیفیں اور دُکھ اُن سے پہنچے تھے اور کیسی بے رحمی اُن لڑائیوں میں کی گئی کہ کئی لاکھ بچے بے گناہ قتل کیے گئے۔

(جنگ مقدس صفحہ ۱۸ ۲ رجون ۱۸۹۳ء)

اس خدا نے جو اسلام کا بانی ہے یہ نہیں چاہا کہ اسلام دشمنوں کے حملوں سے فنا ہو جائے بلکہ اس نے دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور حفاظت خود اختیاری کے طور پر مقابلہ کرنے کا اذن دیدیا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (توبہ)

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال)[1] کیا تم ایسی قوم سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور چاہا کہ رسول خدا کو جلا وطن کر دیں اور انہوں نے ہی پہلے تمہیں قتل کرنا شروع کیا۔

(چشمہ معرفت لیکچر صفحہ ۲۳)

(التوبہ) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اۨقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۝

یعنی ان کو کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری سوداگری جس کے بند ہونے کا تمہیں خوف ہے اور تمہاری حویلیاں جو تمہارے دل پسند ہیں خدا سے اور اس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں اپنی جانوں کو لڑانے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم اس وقت تک منتظر رہو کہ جب تک خدا اپنا حکم ظاہر کرے اور خدا بدکاروں کو کبھی اپنی راہ نہیں دکھائے گا۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے عزیزوں اور مالوں سے پیار کرتے ہیں وہ خدا کی نظروں میں بدکار ہیں۔ وہ ضرور ہلاک ہوں گے کیونکہ انہوں نے غیر کو خدا پر مقدم رکھا۔ یہی وہ تیسرا مرتبہ ہے جس میں وہ شخص باخدا بنتا ہے جو اس کے لیے ہزاروں بلائیں خرید لے اور خدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جھک جائے کہ خدا کے سوا کوئی اس کا نہ رہے گویا سب مر گئے۔

پس سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود نہ مریں۔ زندہ خدا نظر نہیں آ سکتا۔ خدا کے ظہور کا وہی دن ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی زندگی پر موت آوے۔ ہم اندھے ہیں جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے نہ ہو جائیں۔ ہم مردہ ہیں جب تک خدا کے ہاتھ میں مُردہ کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب ہمارا منہ ٹھیک ٹھیک اس کے محاذات میں پڑے گا تب وہ واقعی استقامت جو تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہو گی اس سے پہلے نہیں اور یہی وہ

[1] الانفال آیت ۶۲

استقامت ہے جس سے نفسانی زندگی پر موت آجاتی ہے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۳۱-۱۳۰)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

ان بے ایمانوں سے لڑو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی عملی طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور حرام کو حرام نہیں جانتے اور سچائی کی راہیں اختیار نہیں کرتے جو اہل کتاب میں سے ہیں جب تک کہ وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے دیں اور وہ ذلیل ہوں۔ دیکھو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ جو اپنی بغاوتوں کی وجہ سے حق کے روکنے والے ہیں اور ناجائز طریقوں سے حق پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اُن سے لڑو اور اُن سے دین کے طالبوں کو نجات دو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوگیا کہ یہ لڑائی ابتداءً بغیر اُن کے کسی حملہ کے ہوئی تھی۔ لڑائیوں کے سلسلہ کو دیکھنا ازبس ضروری ہے اور جب تک آپ سلسلہ کو نہ دیکھو گے اپنے تئیں عمداً یا سہواً بڑی غلطیوں میں ڈالو گے۔ سلسلہ تو یہ ہے کہ اوّل کفار نے ہمارے نبی صلعم کے قتل کا ارادہ کرکے آخر اپنے حملوں کی وجہ سے اُن کو مکہ سے نکال دیا اور پھر تعاقب کیا اور جب تکلیف حد سے بڑھی تو پہلا حکم جو لڑائی کے لیے نازل ہوا وہ یہ تھا اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج۔ آیت ۴۰-۴۱)...... اہل کتاب دعوت حق کے مزاحم ہوئے اور مشرکوں کو انہوں نے مددیں کیں اور اُن کے ساتھ مل کر اسلام کو نابود کرنا چاہا جیسا کہ مفصل ذکر اس کا قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر بجز لڑنے اور دفع حملہ کے اور کیا تدبیر تھی مگر پھر بھی ان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ یعنی اُس وقت تک اُن سے لڑو جب تک یہ جزیہ ذلّت کے ساتھ دیدیں اور صاف طور پر فرمادیا یعنی جہاد میں یعنی لڑنے میں اسلام سے ابتداء نہیں ہوئی۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱۸۰۔ ۱۸؍جون ۱۸۹۳ء)

وہ اہل کتاب کہ جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دیانت اور سچائی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اُن سے تم لڑو یہاں تک کہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔

یہ آیات ہیں جن سے نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ کا حکم مسلمان کرنے کے لیے ہے لیکن ان آیات کو اخیر تک پڑھ کر دیکھ لو۔ ان آیات میں مسلمان کرنے کا کہیں بھی حکم نہیں بلکہ اگر تم ان آیات کو آیت اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوۡرِ[1] تک پڑھو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہے کہ جو کھلے کھلے طور پر جرائم پیشہ ہو گئے تھے اور عیسائیت اور یہودیت صرف نام کے لیے تھی۔ ورنہ ان کو خدا پر بھی ایمان نہیں رہا تھا۔ ....

ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عرب کے یہود اور عیسائی ایسے بگڑ گئے تھے اور اس درجہ پردہ بدچلن ہو گئے تھے کہ جو کچھ خدا نے اُن کی کتابوں میں حرام کیا تھا یعنی یہ کہ چوری نہ کریں۔ لوگوں کا ناحق مال نہ کھاویں۔ ناحق کا خون نہ کریں۔ جھوٹی گواہی نہ دیں۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ یہ تمام ناجائز کام ایسی دلی رغبت سے کرتے ہیں کہ گویا اُن بُرے کاموں کو انہوں نے اپنا مذہب قرار دیدیا تھا...... اور ملک کے لیے ان کا وجود خطرناک تھا اور ان کے مفاسد حد سے بڑھ گئے تھے...... پس ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ امن عامہ قائم کرنے کے لیے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کا تدارک ضروری تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف پیغمبری کا عہدہ رکھتے تھے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بادشاہ بااختیار کی طرح ملکی مصالح قائم رکھنے کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے۔ اس صورت میں آپ کا فرض تھا کہ بحیثیت ایک بادشاہ اور والی ملک کے شریروں اور بدمعاشوں کا قرار واقعی بندوبست کریں اور مظلوموں کو جو ان کی شرارتوں سے تباہ ہو گئے تھے ان کے پنجہ سے چھڑا دیں۔ پس یوں سمجھنا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے آپ کے دو عہدے تھے ایک عہدہ رسالت کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ملتا تھا وہ لوگوں کو پہنچا دیتے تھے اور دوسرا عہدہ بادشاہت اور خلافت کا جس عہدہ کی رُو سے وہ ہر ایک مفسد اور مخلّ امن کو سزا دیکر امن عامہ کو ملک میں قائم کر دیتے تھے۔

اور ملک عرب کا ان دنوں یہ حال تھا کہ ایک طرف تو خود عرب کے لوگ اکثر لٹیرے اور قزاق اور طرح طرح کے جرائم کرنے والے تھے اور دوسری طرف جو اہل کتاب کہلاتے تھے وہ بھی سخت بدچلن تھے اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اگر عرب رات کو لوٹتے تھے تو یہ لوگ دن کو ہی غریب لوگوں کی گردن پر چھری پھیرتے تھے پس جبکہ خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک عرب کی بادشاہی دی تو بلاشبہ آنجناب کا یہ فرض تھا کہ بدمعاشوں اور مجرموں اور چوروں اور ڈاکوؤں اور مفسدوں کا بندوبست کریں اور جو لوگ جرائم سے باز نہیں آتے اُن کو سزا دیں اور ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ بادشاہ کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے کہ مثلاً اگر کسی بادشاہ کی رعایا پر لوگ ڈاکہ ماریں اور ان کا مال لوٹ کر لے جاویں یا نقب لگا کر مال لے جاویں یا طمع نفسانی سے لوگوں کو قتل کریں تو کیا اس بادشاہ کا فرض نہیں ہوگا کہ ایسے مفسد لوگوں پر چڑھائی کرے اور ایسے مفسد لوگوں کو قرار واقعی سزا دیکر ملک میں امن قائم کر دے۔ سو یہ لڑائی اہل کتاب سے اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان کو مسلمان کیا جاوے بلکہ اس وجہ سے تھی کہ ان کی شرارتوں سے ملک کو بچایا جائے۔ (حقیقۃ معرفت صفحہ ۲۲۹-۲۳۱)

---

[1] التوبہ آیت ۳۶

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں یہ سب ان کے منہ کی باتیں ہیں جن کی صداقت پر کوئی حجت قائم نہیں کر سکتے بلکہ صرف پہلے زمانہ کے مشرکوں کی ریس کر رہے ہیں۔ ملعونوں نے سچائی کا راستہ کیسا چھوڑ دیا۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۸ حاشیہ نمبر ۳)

کہا بعض یہود نے کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور کہا نصاریٰ نے مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ اُن کے منہ کی باتیں ہیں جن کا کوئی بھی ثبوت نہیں۔ ریس کرنے لگے اُن لوگوں کی جو پہلے اس سے کافر ہو چکے یعنی جو انسانوں کو خدا اور خدا کے بیٹے قرار دے چکے۔ یہ ہلاک کیے جائیں گے۔ کیسے یہ تعلیم سے پھر گئے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱۰۔ ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء)

یہود نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ سب اُن کے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ لوگ ان لوگوں کی ریس کرتے ہیں جو ان سے پہلے بعض انسانوں کو خدا بنا کر کافر ہو گئے۔ خدا کے ماروں نے کہاں سے کہاں پلٹا کھایا۔

سو یہ آیت صریح ہندیوں اور یونانیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور بتلا رہی ہے جو پہلے انسانوں کو انہیں لوگوں نے خدا قرار دیا پھر عیسائیوں کی بدقسمتی سے یہ اصول ان تک پہنچ گئے۔ تب انہوں نے کہا کہ ہم ان قوموں سے کیوں پیچھے رہیں اور ان کی بدبختی سے توریت میں پہلے سے یہ محاورہ تھا کہ انسانوں کو بعض مقامات میں خدا کے بیٹے قرار دیا تھا بلکہ خدا کی بیٹیاں بھی بلکہ بعض گزشتہ لوگوں کو خدا بھی کہا گیا تھا۔ اس عام محاورہ کے لحاظ سے مسیح پر بھی انجیل میں ایسا ہی لفظ بولا گیا۔ پس وہی لفظ نادانوں کے لیے زہر قاتل ہو گیا۔ تمام بائبل دوہائی دے رہی ہے کہ یہ لفظ ابن مریم سے کچھ خاص نہیں۔ ہر یک نبی اور راست باز پر بولا گیا ہے بلکہ یعقوب نخست زادہ کہلایا ہے مگر بدقسمت انسان جب کسی پیچ میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس سے نکل نہیں سکتا۔ پھر عجیب تر یہ کہ جو کچھ مسیح کی خدائی کے لیے قواعد بیان کیے گئے ہیں کہ وہ خدا بھی ہے انسان بھی۔ یہ تمام قواعد کرشن اور رام چندر کے لیے ہندوؤں کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں اور اس نئی تعلیم سے ایسے مطابق پڑے ہیں کہ ہم بجز اس کے اور کوئی بھی رائے ظاہر نہیں کر سکتے کہ تمام ہندوؤں کے عقیدوں کی نقل کی گئی ہے۔ ہندوؤں میں ترے مورتی کا بھی عقیدہ تھا جس سے برہما

بشن۔ مہادیو کا مجموعہ مراد ہے سو تثلیث ایسے عقیدے کا عکس کھینچا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ
جو کچھ مسیح کے خدا بنانے کے لیے اور عقلی اعتراضوں سے بچنے کے لیے عیسائی لوگ جوڑ توڑ کر رہے ہیں اور مسیح کی
انسانیت کو خدائی کے ساتھ ایسے طور سے پیوند دے رہے ہیں جس سے ان کی غرض یہ ہے کہ کسی طرح عقلی اعتراضوں
سے بچ جائیں اور پھر بھی وہ کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے۔ اور آخر سرّ الٰہی میں داخل کر کے پیچھا چھڑاتے ہیں۔ بعینہٖ یہی نقشہ
ان ہندوؤں کا ہے جو رام چندر اور کرشن کو ایشر قرار دیتے ہیں یعنی وہ بھی بعینہٖ وہی باتیں سناتے ہیں جو عیسائی سنایا
کرتے تھے اور جب ہر یک پہلو سے عاجز آجاتے ہیں تب کہتے ہیں کہ یہ ایک ایشر کا بھید ہے اور انہیں پر کھلتا ہے جو
جوگ کماتے اور دنیا کو تیاگتے اور تپشیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ بھید تو اُسی وقت کھل گیا کہ جب کہ
اُن جھوٹے خداؤں نے اپنی خدائی کا کوئی ایسا نمونہ نہ دکھلایا جو انسان نے نہ دکھلایا ہو۔ سچ ہے کہ گرنتھوں میں یہ قصّے
بھرے پڑے ہیں کہ ان اوتاروں نے بڑی بڑی شکتی کے کام کیے ہیں۔ مُردے جلائے اور پہاڑوں کو سر پر اُٹھا لیا۔
لیکن اگر ہم ان کہانیوں کو سچ مان لیں تو یہ لوگ خود قائل ہیں کہ بعض ایسے لوگوں نے بھی کرشمے دکھلائے جنہوں نے
خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ مثلاً ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا مسیح کے کام موسیٰ کے کاموں سے بڑھ کر تھے۔ بلکہ مسیح کے
نشانوں کو تو تالاب کے قصہ نے خاک میں ملا دیا۔ کیا آپ لوگ معجزہ نما تالاب سے واقف نہیں جو اس زمانہ میں تھا اور
کیا اسرائیل میں ایسے نبی نہیں گزرے جن کے بدن کے چھونے سے مُردے زندہ ہوئے۔ پھر خدائی کی شیخی مارنے کے
لیے کون سی وجوہات ہیں۔ جائے شرم!!!

اور اگرچہ ہندوؤں نے اپنے اوتاروں کی نسبت شکتی کے کام بہت لکھے ہیں اور خواہ نخواہ اُن کو پرمیشر ثابت کرنا
چاہا ہے مگر وہ قصّے بھی عیسائیوں کے بیہودہ قصوں سے کچھ کم نہیں ہیں اور اگر فرض بھی کریں کہ کچھ ان میں سے صحیح بھی
ہیں تب بھی عاجز انسان جو ضعف اور ناتوانی کا خمیر رکھتا ہے پرمیشر نہیں ہو سکتا اور احیاءِ حقیقی تو خود باطل اور الٰہی
کتابوں کے مخالف۔ ہاں اعجازی احیاء جس میں دنیا کی طرف رجوع کرنا اور دنیا میں پھر آباد ہونا نہیں ہوتا ممکن
تو ہے مگر خدائی کی دلیل نہیں کیونکہ اس کے مدعی عام ہیں۔ مُردوں سے باتیں کرا دینے والے بہت گذرے ہیں مگر یہ
طریق کشف قبور کے قسم میں سے ہے۔ ہاں ہندوؤں کو عیسائیوں پر ایک فضیلت بیشک ہے اس کے بلاشبہ ہم
قائل ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو خدا بنانے میں عیسائیوں کے پیش رو ہیں۔ اُنہیں کی ایجاد کی عیسائیوں نے
بھی پیروی کی۔ ہم کسی طرح اس بات کو چھپا نہیں سکتے کہ جو کچھ عیسائیوں نے عقلی اعتراضوں سے بچنے کے لیے باتیں بنائی
ہیں۔ یہ باتیں انہوں نے اپنے دماغ سے نہیں نکالیں بلکہ شاستروں اور گرنتھوں میں سے چُرائی ہیں یہ تمام تودہ طوفان
پہلے ہی سے برہمنوں نے کرشن اور رام چندر کے لیے بنا رکھا تھا جو عیسائیوں کے کام آیا۔ پس یہ خیال بدیہی البطلان
ہے کہ شاید ہندوؤں نے عیسائیوں کی کتابوں میں سے چرایا ہے کیونکہ ان کی یہ تحریریں اُس وقت کی ہیں کہ جب حضرت

عیسےٰ کا وجود بھی دنیا میں نہیں تھا پس ناچار ماننا پڑا کہ چور عیسائی ہی ہیں چنانچہ پوٹ صاحب بھی اس بات کے قائل ہیں کہ تثلیث افلاطون کے لیے ایک غلط خیال کی پیروی کا نتیجہ ہے مگر اصل یہ ہے کہ یونان اور ہند اپنے خیالات میں سراپا مقابلہ کی طرح تھے۔ قریب قیاس یہ ہے کہ یہ شرک کے انبار پہلے ہند سے وید ودیا کی صورت میں یونان میں گئے پھر وہاں سے نادان عیسائیوں نے چرا چرا کر انجیل پر حاشیے چڑھائے اور اپنا نامۂ اعمال درست کیا۔ (نور القرآن ۱ صفحہ ۲۴-۲۶ حاشیہ)

۳۱ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

یعنی یہودیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو کہ جو مخلوق اور غیر خدا ہیں اپنے رب اور قاضی الحاجات ٹھہرا رکھے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۳۸۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

ملعونوں نے سچائی کا راستہ کیسا چھوڑ دیا۔ اپنے فقیہوں اور درویشوں اور مریم کے بیٹے کو خدا ٹھہرا لیا ہے حالانکہ حکم یہ تھا کہ فقط خدائے واحد کی پرستش کرو خدا اپنی ذات میں کامل ہے۔ اس کو کچھ حاجت نہیں کہ بیٹا بنا دے۔ کونسی کسر اس کی ذات میں رہ گئی تھی جو بیٹے کے وجود سے پوری ہو گئی۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

انہوں نے اپنے عالموں کو اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا پروردگار ٹھہرا لیا اور ایسا ہی مسیح ابن مریم کو حالانکہ ہم نے یہ حکم کیا تھا کہ تم کسی کی بندگی نہ کرو مگر ایک کی جو خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

(جنگ مقدس صفحہ ۱ روئیداد ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء)

۳۲ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○

چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھائیں پر خدا اپنے کام سے ہرگز نہیں رکے گا جب تک اس نور کو کامل طور پر پورا نہ کرے اگرچہ کافر لوگ کراہت ہی کریں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

چاہتے ہیں کہ اپنے مونہوں کی پھونکوں سے حق کو بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ باز نہیں رہے گا جب تک اپنے نور

کو پورا نہ کرے اگرچہ کافر ناخوش ہوں۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱ روئیداد ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء)

یہ لوگ اپنے منہ کی لاف و گزاف سے بکتے ہیں کہ اس دین کو کبھی کامیابی نہ ہوگی یہ دین ہمارے ہاتھ سے تباہ ہو جاوے گا لیکن خدا کبھی اس دین کو ضائع نہیں کرے گا اور نہیں چھوڑے گا جب تک اس کو پورا نہ کرے..... اب قرآن شریف موجود ہے۔ حافظ بھی بیٹھے ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ کفار نے کس دعوی کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا اور ہم اس کو کالعدم کر دیں گے اور اُن کے مقابل پر یہ پیشین گوئی کی گئی جو قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہرگز تباہ نہیں ہوگا یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائے گا اور پھیل جائے گا اور اس میں بادشاہ ہوں گے۔

(جنگ مقدس صفحہ ۱۶ روئیداد ۵ جون ۱۸۹۳ء)

یہ شریر کافر اپنے منہ کی پھونکوں سے نور اللہ کو بجھانا چاہتے ہیں اللہ اپنے نور کو کامل کرنے والا ہے۔ کافر بُرا مناتے ہیں۔

منہ کی پھونکیں کیا ہوتی ہیں۔ یہی کسی نے ٹھگ کہہ دیا۔ کسی نے دکاندار اور کافر و بیدین کہہ دیا۔ غرض یہ لوگ ایسی باتوں سے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو بجھا دیں مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نور اللہ کو بجھاتے بجھاتے خود ہی جل کر ذلیل ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

۳۴ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ..... یعنی خدا وہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے ..... یہ آیات قرآنی الہامی پیرایہ میں اس عاجز کے حق میں ہیں اور رسول سے مراد مامور اور فرستادہ ہے جو دین اسلام کی تائید کے لیے ظاہر ہوا۔ اس پیشگوئی کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے جو اس مامور کو مبعوث فرمایا ہے یہ اس لیے فرمایا کہ تا اس کے ہاتھ سے دین اسلام کو تمام دینوں پر غلبہ بخشے اور ابتداء میں ضرور ہے کہ اس مامور اور اس کی جماعت پر ظلم ہو لیکن آخر میں فتح ہوگی اور یہ دین اس مامور کے ذریعہ سے تمام ادیان پر غالب آ جائے گا اور دوسری تمام ملتیں بیّنہ کے ساتھ ہلاک ہو جائیں گی۔

دیکھو یہ کس قدر عظیم الشان پیشگوئی ہے اور یہ وہی پیشگوئی ہے جو ابتدا سے اکثر علماء کہتے آئے ہیں کہ مسیح موعود کے حق میں ہے اور اس کے وقت میں پوری ہوگی اور براہین احمدیہ میں سترہ برس سے مسیح موعود کے دعوے سے پہلے درج ہے تا خدا ان لوگوں کو شرمندہ کرے کہ جو اس عاجز کے دعویٰ کو انسان کا افترا خیال کرتے ہیں۔ براہین خود

گواہی دیتی ہے کہ اس وقت اس عاجز کو اپنی نسبت مسیح موعود ہونے کا خیال بھی نہیں تھا اور پرانے عقیدہ پر نظر تھی۔ لیکن خدا کے الہام نے اسی وقت گواہی دی تھی کہ تو مسیح موعود ہے۔ کیونکہ جو کچھ آثارِ نبویہ نے مسیح کے حق میں فرمایا تھا الہام الٰہی نے اس عاجز پر چسپاں دیا تھا۔ (سراج منیر صفحہ ۳۶ تا ۳۷)

وہ خدا وہ قادرِ ذوالجلال ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا ہے تا دنیا کے تمام دینوں پر اس کو غالب کرے اگرچہ مشرک لوگ کراہت ہی کریں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ اَیْ لِیُظْهِرَ دِیْنَ الْاِسْلَامِ بِالْحُجَجِ الْقَاطِعَةِ وَالْبَرَاهِیْنِ السَّاطِعَةِ عَلٰی كُلِّ دِیْنٍ مَّا سِوَاهُ اَیْ یَنْصُرُ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْمَظْلُوْمِیْنَ بِاِشْرَاقِ دِیْنِهِمْ وَاِتْمَامِ حُجَّتِهِمْ۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

خدا وہ قادر ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچائی دین دے کر بھیجا تا سب دینوں پر حجت کی رو سے اس کو غالب کرے (یہ وہ پیشگوئی ہے جو پہلے سے قرآن شریف میں انہیں دنوں کے لیے لکھی گئی ہے (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۹۲)

وہ وہی خدا ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا تا وہ دین سب دینوں پر غالب ہو جائے اگرچہ مشرک ناخوش ہوں۔

اب دیکھیئے کہ ان آیات کریمہ .... میں اللہ جلّ شانہٗ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ عیسائیوں سے پہلے یہودی یعنی بعض یہودی بھی عزیر کو ابن اللہ قرار دے چکے اور نہ صرف وہی بلکہ مقدم زمانہ کے کافر بھی اپنے پیشواؤں اور اپنے اماموں کو یہی منصب دے چکے پھر اُن کے پاس اس بات پر کیا دلیل ہے کہ وہ لوگ اپنے اماموں کو خدا ٹھہرانے میں جھوٹے تھے اور یہ سچے ہیں اور پھر اس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ یہی خرابیاں دنیا میں پڑ گئی تھیں جن کی اصلاح کے لیے اس رسول کو بھیجا گیا کہ کامل تعلیم کے ساتھ اُن خرابیوں کو دُور کرے کیونکہ اگر یہودیوں کے ہاتھ میں کوئی کامل تعلیم ہوتی تو وہ برخلاف توریت کے اپنے عالموں اور درویشوں کو ہرگز خدا نہ ٹھہراتے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ وہ کامل تعلیم کے محتاج تھے جیسا کہ حضرت مسیح نے بھی اس بات کا اقرار کیا کہ ابھی بہت سی باتیں تعلیم کی باقی ہیں کہ تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے یعنی جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سُنے گی وہ کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگی۔ حضرات عیسائی صاحبان اس جگہ روح حق سے روح القدس مراد لیتے ہیں اور اس طرف توجہ نہیں فرماتے کہ روح القدس تو اُن کے اصول کے موافق خدا ہے تو پھر وہ کس سے سُنے گا حالانکہ لفظ پیشگوئی کے یہ ہیں کہ جو کچھ وہ سُنے گی وہ کہے گی۔

(جنگ مقدس صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۱ روئیداد ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ

لَيَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَ
الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

مسلمانو۔ اہل کتاب کے اکثر عالم اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں یعنی ناجائز طور پر اُن کا روپیہ اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے رہتے ہیں اور اس طرح پر ناجائز طور پر لوگوں کے مال لے کر سونا اور چاندی جمع کر لیتے ہیں اور خدا کی راہ میں کچھ بھی خرچ نہیں کرتے سو اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

(چشمۂ معرفت ص۲۳۲)

۱۰ ۝ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ
اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا
وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۗ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

وَمِنْ حَسَنَاتِ الصِّدِّيْقِ وَمَزَايَاهُ الْخَاصَّةِ أَنَّهُ خُصَّ لِمُرَافَقَةِ سَفَرِ الْهِجْرَةِ وَجُعِلَ شَرِيْكَ مَضَائِقِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَأَنِيْسَهُ الْخَاصَّ فِيْ بَاكُوْرَةِ الْمُصِيْبَةِ لِيَثْبُتَ تَخَصُّصُهُ۔

(ترجمہ) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیکیوں اور آپ کے خاص فضائل میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کی مرافقت کے لیے خاص کیا گیا اور آپ کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب میں شریک بنایا گیا

بِمَحْبُوْبِ الْحَضْرَةِ وَسِرُّ ذٰلِكَ اَنَّ اللّٰهَ كَانَ يَعْلَمُ بِاَنَّ الصِّدِّيْقَ اَشْجَعُ الصَّحَابَةِ وَمِنَ التُّقَاةِ وَاَحَبُّهُمْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنَ الْكُمَاةِ وَكَانَ فَانِيًا فِيْ حُبِّ سَيِّدِ الْكَائِنَاتِ وَكَانَ اِعْتَادَ مِنَ الْقَدِيْمِ اَنْ يَمُوْنَهُ وَيُرَاعِيَ شُئُوْنَهُ فَاَسْلَاهُ بِهِ اللّٰهُ نَبِيَّهُ فِيْ وَقْتِ عَبُوْسٍ وَّعَيْشٍ بُؤْسٍ وَّخُصَّ بِاسْمِ الصِّدِّيْقِ وَقُرْبِ نَبِيِّ الثَّقَلَيْنِ وَاَفَاضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ خِلْعَةَ ثَانِيَ اثْنَيْنِ۔

(سرّ الخلافۃ صفحہ ۱۸)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صدق اس مصیبت کے وقت ظاہر ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا گو بعض کفار کی رائے اخراج کی بھی تھی لیکن اصل مقصد قتل ہی تھا۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے صدق و صفا کا وہ نمونہ دکھایا جو ابدالآباد تک کے لیے نمونہ رہے گا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب ہی حضرت صدیق رضؓ کی فضیلت اور اعلیٰ وفاداری کی ایک زبردست دلیل ہے۔ دیکھو اگر وائسرائے ہند کسی شخص کو کسی خاص کام کے لیے انتخاب کرے تو وہ رائے بہتر اور صائب ہوگی یا ایک چوکیدار کی۔ ماننا پڑے گا کہ وائسرائے کا انتخاب بہر حال موزوں اور مناسب ہوگا کیونکہ جس حال میں کہ وہ سلطنت کی طرف سے نائب السلطنت مقرر کیا گیا ہے تو اس کی وفاداری۔ فراست اور تجربہ کاری پر سلطنت نے اعتماد کیا ہے تب زمام سلطنت اس کے ہاتھ میں دی ہے پھر اس کی صائب تدبیری اور معاملہ فہمی کو پس پشت ڈال کر ایک چوکیدار کے انتخاب اور رائے کو صحیح سمجھ لیا جاوے نامناسب امر ہے۔

اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب تھا۔ اس وقت آپ کے پاس ۷۰-۸۰ صحابہؓ موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے پاس ہی تھے مگر آپ نے ان سب میں سے حضرت ابوبکرؓ کو ہی منتخب کیا۔ اس میں سرّ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ نبی خدا تعالیٰ کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کا فہم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے اس لیے

اور آپ کو آغاز مصیبت میں ہی آپ کا دوست قرار دیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا تخصص ثابت ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق صحابہ میں سے بہادر ترین اور متقی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب صحابہ سے زیادہ محبوب ہیں اور آپ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) بہادر ترین لوگوں میں سے ہیں اور آپ کی محبت میں فنا ہیں اور وہ قدیم سے اس بات کے عادی تھے کہ آپؐ کی ضروریات پوری کریں اور آپکے کاموں کی نگرانی کریں پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق کے وجود کے ساتھ تنگی کے وقت اور شدّت کی گھڑیوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کے لقب اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب سے خاص کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثانی اثنین کا خلعت پہنایا۔

اللہ تعالیٰ نے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کشف اور الہام سے بتادیا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر اور موزوں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

حضرت ابو بکرؓ اس ساعت عسر میں آپ کے ساتھ ہوئے۔ یہ وقت خطرناک آزمائش کا تھا۔ حضرت مسیحؑ پر جب اس قسم کا وقت آیا تو ان کے شاگرد ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک نے سامنے ہی لعنت بھی کی۔ مگر صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک نے پوری وفاداری کا نمونہ دکھایا غرض حضرت ابو بکر صدیق نے آپ کا پورا ساتھ دیا اور ایک غار میں جس کو غارِ ثور کہتے ہیں۔ آپ جا چھپے۔ شریر کفار جو آپ کی ایذا رسانی کے لیے منصوبے کر چکے تھے۔ تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے عرض کی کہ اب تو یہ بالکل سر پر ہی آپہنچے ہیں اور اگر کسی نے ذرا نیچے نگاہ کی تو وہ دیکھ لیگا اور ہم پکڑے جائیں گے۔ اس وقت آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کچھ غم نہ کھاؤ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لفظ پر غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں یہ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ مَعَنَا میں آپ دونوں شریک۔ یعنی تیرے اور میرے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پلّہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا ہے اور دوسرے پر حضرت صدیق کو۔ اس وقت دونوں ابتلا میں ہیں کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے یا تو اسلام کی بنیاد پڑنے والی ہے یا خاتمہ ہو جانے والا ہے۔ دشمن غار پر موجود ہیں اور مختلف قسم کی رائے زنیاں ہو رہی ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس غار کی تلاشی کرو کیونکہ نشانِ پا یہاں تک ہی آکر ختم ہو جاتا ہے لیکن ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہاں انسان کا گذر اور دخل کیسے ہوگا۔ مکڑی نے جالا تنا ہوا ہے۔ کبوتر نے انڈے دیئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کی آوازیں اندر پہنچ رہی ہیں اور آپ بڑی صفائی سے اُن کو سُن رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن آئے ہیں کہ وہ خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور دیوانے کی طرح بڑھے آئے ہیں لیکن آپ کی کمال شجاعت کو دیکھو کہ دشمن سر پر ہے اور آپ اپنے رفیق صادق صدیقؓ کو فرماتے ہیں لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا یہ الفاظ بڑی صفائی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ نے زبان ہی سے فرمایا کیونکہ یہ آواز کو چاہتے ہیں اشارہ سے کام نہیں چلتا۔ باہر دشمن مشورہ کر رہے ہیں اور اندر غار میں خادم و مخدوم بھی باتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس امر کی پروا نہیں کی گئی کہ دشمن آواز سُن لیں گے یہ اللہ تعالیٰ پر کمال ایمان اور معرفت کا ثبوت ہے۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں پر پورا بھروسہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے لیے تو یہ نمونہ کافی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا اس معیت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں اور گویا کل جماعت آپ کی آگئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ اس میں کیا سرّ تھا کہ انہوں نے اپنے ہی ساتھ معیت کا اظہار کیا اس میں یہ راز ہے کہ اللہ جامع جمیع شیون کا ہے اور اسم اعظم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے ساتھ اسم اعظم کی معیت مع تمام صفات کے پائی جاتی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام

کی قوم شریر اور فاسق فاجر تھی۔ آئے دن لڑنے اور پتھر مارنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ اس لیے ان کی طرف معیّت کو منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی ذات تک اُسے رکھا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مدارج کا اظہار مقصود ہے۔

(الحکم جلد ۷، ۱۰ تا ۱۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی نظیر موجود ہے حالانکہ مکّہ میں آپؐ کے وفادار اور جاں نثار خدام موجود تھے لیکن جب آپ نے ہجرت کی تو صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا مگر اس کے بعد جب آپ مدینہ پہنچ گئے تو دوسرے اصحاب بھی یکے بعد دیگرے وہیں جا پہنچے لکھا ہے کہ جب آپ ہجرت کر کے نکلے اور غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے تو دشمن بھی تلاش کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ اُن کی آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ گھبرائے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کہتے ہیں کہ وہ نیچے اُتر کر اس کو دیکھنے بھی گئے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا اسے دیکھ کر ایک نے کہا کہ یہ جالا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کا ہے اس لیے وہ واپس چلے آئے۔ یہی وجہ ہے جو اکثر اکابر عنکبوت سے محبت کرتے آئے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

۴۱ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

اصل مقصود کے پانے کے لیے خدا تعالیٰ نے مجاہدہ ٹھہرایا ہے یعنی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی طاقتوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی عقل کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اس کو ڈھونڈا جائے جیسا کہ وہ فرماتا ہے جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ .... یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع اُن کی تمام طاقتوں کے خدا کی راہ میں خرچ کرو۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۸۷)

۵۱ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝

دکھ ہمیں کوئی مصیبت ہرگز نہیں پہنچ سکتی بجز اس مصیبت کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہی ہمارا

کارساز اور مولیٰ ہے اور مومنوں کو چاہیئے کہ بس اسی پر بھروسہ رکھیں۔ (کشتی نوح صلہ)

مصر کے اخبار اللواء نے کشتی نوح کی کسی آیت پر اعتراض کیا تھا کہ یہ لوگ قرآن کو نہیں سمجھتے اور ان کو پتہ نہیں کہ مَامِنْ دَاءٍ اِلَّا وَلَهٗ دَوَاءٌ حدیث بیں ہے۔ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حضور نے فرمایا کہ

اس نے ہمارے مطلب کو نہیں سمجھا اور پہلی آیت کو دیکھ کر صرف اپنے اندرونی بغض کی وجہ سے ایک شاعرانہ مذاق میں مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ ہم دواؤں سے کب انکار کرتے ہیں۔ ہم تو قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک شے میں فوائد رکھے ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (طاعون) کے متعلق ہمیں قبل از وقت سمجھا دیا ہے کہ یہ اس کا حقیقی علاج ہے اور یہ امر اس نے ہمیں بطور نشان کے دیا ہے تو اب ہم نشان کو کیسے مشتبہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی نشان دے تو اس کی بے قدری کرنا صرف معصیت ہی نہیں بلکہ کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔

ہر مرتبہ از وجود اثرے دارد گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

(بدر جلد ۱ نمبر ۵-۶ صفحہ ۳۸-۳۹ مورخہ ۸ نومبر- ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء)

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۝ (۵۴)

یعنی اس بات کا سبب جو کفار کے صدقات قبول نہیں کیے جاتے صرف یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے منکر ہیں۔ اب دیکھو..... صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ رسول پر ایمان نہیں لاتے ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ خدا ان کو قبول نہیں کرتا اور پھر جب اعمال ضائع ہوئے تو نجات کیونکر ہو گی۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۹)

یہ تمام آیات اُن لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے رسول کے وجود پر اطلاع پائی اور رسول کی دعوت ان کو پہنچ گئی اور جو لوگ رسول کے وجود سے بالکل بے خبر رہے اور نہ ان کو دعوت پہنچی۔ ان کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اُن کے حالات کا علم خدا کو ہے۔ اُن سے وہ معاملہ کرے گا جو اُس کے رحم اور انصاف کا مقتضاء ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۹ حاشیہ)

لہ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

خیرات اور صدقات وغیرہ پر جو مال دیا جائے اس میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ پہلے جس قدر محتاج ہیں ان کو دیا جائے۔ ہاں جو خیرات کے مال کا تعہد کریں یا اس کے لیے انتظام و اہتمام کریں ان کو خیرات کے مال سے کچھ مل سکتا ہے اور نیز کسی کو بدی سے بچانے کے لیے بھی اس مال میں سے دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی وہ مال غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے اور محتاج اور قرضداروں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کے لیے بھی اور دوسری راہوں میں جو محض خدا کے لیے ہوں وہ مال خرچ ہو گا۔ (تقریر جلسہ مذاہب صـــ۱۱۲ـــ)

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جو شخص خدا اور رسول کی مخالفت کرے۔ خدا اس کو جہنم میں ڈالے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہ ایک بڑی رسوائی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صـــ۱۳۰ـــ)

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

اعلیٰ درجہ کی خوشی خدا میں ملتی ہے جس سے پرے کوئی خوشی نہیں ہے جنت پوشیدہ کو کہتے ہیں۔ جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ نعمتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اصل جنت خدا ہے جس کی طرف تردد منسوب ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے بہشت

کے اعظم ترین انعامات میں رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ ہی رکھا ہے۔ انسان انسان کی حیثیت سے کسی نہ کسی دُکھ اور تردّد میں ہوتا ہے مگر جس قدر قربِ الٰہی حاصل کرتا جاتا ہے اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ سے رنگین ہوتا جاتا ہے اسی قدر اصل سکھ اور آرام پاتا ہے جس قدر قربِ الٰہی ہو گا۔ لازمی طور پر اُسی قدر خدا کی نعمتوں سے حصّہ لے گا اور رفع کے معنی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

۷۳۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

دشنام اور سبّ اور شتم فقط اس مفہوم کا نام ہے جو خلافِ واقعہ اور دروغ کے طور پر محض آزار رسانی کی غرض سے استعمال کیا جائے اور اگر ہر یک سخت اور آزار دہ تقریر کو محض بوجہ اس کے مرارت اور تلخی اور ایذا رسانی کے دشنام کے مفہوم میں داخل کر سکتے ہیں تو پھر اقرار کرنا پڑے گا کہ سارا قرآن شریف گالیوں سے پُر ہے کیونکہ جو کچھ بُتوں کی ذلّت اور بُت پرستوں کی حقارت اور ان کے بارہ میں لعنت ملامت کے سخت الفاظ قرآن شریف میں استعمال کیے گئے ہیں یہ ہرگز ایسے نہیں ہیں جن کے سننے سے بُت پرستوں کے دل خوش ہوئے ہوں بلکہ بلاشبہ ان الفاظ نے اُن کے غصہ کی حالت کی بہت تحریک کی ہو گی کیا خدائے تعالیٰ کا کفارِ مکّہ کو مخاطب کر کے یہ فرمانا کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ[1] معترض کے من گھڑت قاعدہ کے موافق گالی میں داخل نہیں ہے کیا خدائے تعالیٰ کا قرآن شریف میں کفار کو شرّ البریہ قرار دینا اور تمام رذیل اور پلید مخلوقات سے انہیں بدتر ظاہر کرنا یہ معترض کے خیال کے رُو سے دشنام دہی میں داخل نہیں ہو گا۔ کیا خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ نہیں فرمایا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۳،۱۴)

کفار میں سے بعض میں مادہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ان کو سختی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح سے بعض بیماریوں یا زخموں میں ایک حکیم حاذق کو چیر پھاڑی اور عمل جرّاحی سے کام لینا پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۸۱۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝

[1] الانبیاء آیت ۹۹۔

ہماری جماعت کا ایمان تو صحابہ والا چاہیئے جنہوں نے اپنے سر خدا تعالیٰ کی راہ میں کٹوا دیئے تھے۔ اگر آج ہماری جماعت کو یوروپ اور امریکہ میں اشاعت اسلام کے لیے جانے کو کہا جاوے تو اکثر یہی کہہ دینگے جی ہمارے بال بچوں کو تکلیف ہوگی۔ ہمارے گھروں کا ایسا حال ہے یہ ہے وہ ہے اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ [۱] اور ہم نے یہ تو نہیں کہنا کہ جا کر سر کٹوائیں بلکہ یہی ہے کہ دین کے لیے سفر کی تکالیف اور صدمے اٹھاویں مگر اکثر یہی کہہ دیں گے جی گرمی بہت ہے۔ زیادہ تکلیف کا اندیشہ ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ جہنم کی گرمی اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ صحابہؓ کا نمونہ مسلمان بننے کے لیے پکا نمونہ ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝

دنیاوی تمتع کا حصہ انسانی زندگی میں بہت ہی کم ہونا چاہیئے تاکہ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا یعنی ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت کا مصداق بنو لیکن جس شخص کی دنیاوی تمتع کثرت سے ہیں اور وہ رات دن بیویوں میں مصروف ہے اُس کو رقّت اور رونا کب نصیب ہوگا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

صوفیوں نے لکھا ہے کہ اگر چالیس دن تک رونا نہ آوے تو جانو کہ دل سخت ہوگیا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا کہ ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت مگر اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ہنستے بہت ہیں اب دیکھو کہ زمانہ کی کیا حالت ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان ہر وقت آنکھوں سے آنسو بہاتا رہے بلکہ جس کا دل اندر سے رو رہا ہے وہی روتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ دروازہ بند کر کے اندر بیٹھ کر خشوع اور خضوع سے دعا میں مشغول ہو۔ اور بالکل عجز و نیاز سے خدا تعالیٰ کے آستانہ پر گر پڑے تا کہ وہ اس آیت کے نیچے نہ آوے۔ جو بہت ہنستا ہے وہ مومن نہیں اگر سارے دن کا نفس کا محاسبہ کیا جاوے تو معلوم ہو کہ ہنسی اور تمسخر کی میزان زیادہ ہے اور رونے کی بہت کم ہے بلکہ اکثر جگہ بالکل ہی نہیں۔ اب دیکھو کہ زندگی کس غفلت میں گذر رہی ہے اور ایمان کی راہ کس قدر مشکل ہے گویا ایک طرح سے مرنا ہے اور اصل میں اسی کا نام ایمان ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝

[۱] الاحزاب آیت ۱۴

غلام دستگیر قصوری کے بارے میں ذکر تھا حضور نے فرمایا:۔

بطریق تنزل ہم مان لیتے ہیں کہ اس نے صرف ہمارے لیے بد دُعا کی مگر اب بتاؤ کہ اس کی دعا کا اثر کیا ہوا؟ کیا وہ الفاظ جو میرے حق میں کہے اور وہ دعا جو میرے برخلاف کی اُلٹی اس پر ہی نہیں پڑی؟ اب بتلاؤ کہ کیا مقبولان الٰہی کا یہی نشان ہے کہ جو دعا وہ نہایت تضرع و ابتہال سے کریں اس کا اُلٹا اثر ہوا اور اثر بھی یہ کہ خود ہی ہلاک ہو کر اپنے کاذب ہونے پر مہر لگا جاویں۔ خصوصاً ایسے شخص کے مقابل میں جسے وہ مفتری اور کیا کیا سمجھتا ہے۔ دراصل وہ مجمع البحار والے کی مثال دیکر خود اس کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اگر مجھے کوئی نقصان پہنچ جاتا تو بڑے لمبے لمبے اشتہار شائع ہوتے لیکن خدا تعالیٰ نے دشمن کو بالکل موقع نہ دیا کہ وہ کسی قسم کی خوشی منائے۔ اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے میرے خلاف بد دعا کی اور خدا تعالیٰ سے میری جڑ کے کٹ جانے کی درخواست کی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جڑ کٹ گئی اور مجھے روز افزوں ترقی حاصل ہوئی۔ کیا یہ متعصب مخالف کے لیے عبرت کا مقام نہیں افسوس کہ یہ لوگ ذرا بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ قرآن مجید کی وہ آیت یہاں کیسی صادق آرہی ہے کہ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ صفحہ ۸ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء)

خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ میری پیشگوئیوں میں کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی نظیر پہلے انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں میں نہیں ہے۔ یہ جاہل اور بے تمیز لوگ چونکہ دین کے باریک علوم اور معارف سے بے بہرہ ہیں اس لیے قبل اس کے جو عادۃ اللہ سے واقف ہوں عجل کے جوش سے اعتراض کرنے کے لیے دوڑتے ہیں اور ہمیشہ بموجب آیت کریمہ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ میری کسی گردش کے منتظر ہیں اور عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ کے مضمون سے بے خبر..... یاد رکھنا چاہیئے کہ زندگی کے درمیانی حصوں میں انبیاء علیہم السلام بھی بلاؤں سے محفوظ نہیں رہے مگر انجام بخیر ہوا۔ اسی طرح اگر ہمیں بھی اس درمیانی مراحل میں کوئی غم پہنچے یا کوئی مصیبت پیش آوے تو اس کو خدا تعالیٰ کا آخری حکم سمجھنا غلطی ہے۔ خدا تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے کہ وہ ہمارے سلسلہ میں برکت ڈالے گا اور اپنے اس بندہ کو بہت برکت دیگا یہاں تک کہ بادشاہ اس بندہ کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے وہ ہر یک ابتلا درپیش آمدہ ابتلا کا بھی انجام بخیر کرے گا اور دشمنوں کے ہر ایک بہتان سے انجام کار بریّت ظاہر کردے گا۔

(حقیقۃ المہدی ص۱۰)

یعنی اے نبی تجھ پر یہ بد نہاد دشمن طرح طرح کی گردشیں چاہتے ہیں۔ انہیں پر گردشیں پڑیں گی پس اس آیت کریمہ کی رُو سے یہ سنت اللہ ہے کہ جو شخص صادق پر کوئی بددعا کرتا ہے وہی بدعا اس پر پڑتی ہے یہ سنت اللہ نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ سے ظاہر ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۲۳۲)

۱۰۱۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ

اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝

اصل میں صفات کل نیک ہوتے ہیں۔ جب ان کو بے موقع اور ناجائز طور پر استعمال کیا جاوے تو وہ بُرے ہو جاتے ہیں اور ان کو گندہ کر دیا جاتا ہے لیکن جب ان ہی صفات کو افراط و تفریط سے بچا کر محل اور موقعہ پر استعمال کیا جاوے تو ثواب کا موجب ہو جاتے ہیں قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ[1] اور دوسری جگہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اب سبقت لے جانا بھی تو ایک قسم کا حسد ہی ہے۔ سبقت لے جانیوالا کب چاہتا ہے کہ اس سے اور کوئی آگے بڑھ جاوے۔ یہ صفت بچپن ہی سے انسان میں پائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کو آگے بڑھنے کی خواہش نہ ہو تو وہ محنت نہیں کرتے اور کوشش کرنے والے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ سابقون گویا حاسد ہی ہوتے ہیں لیکن اس جگہ حسد کا مادہ مصفّیٰ ہو کر سابق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حاسد ہی بہشت میں سبقت لے جائیں گے۔

(البدر جلد ۲ ۱۲ مورخہ ۱۰ راپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۹)

۱۰۳ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝

تیری صلوٰۃ سے ان کو ٹھنڈ پڑ جاتی ہے اور جوش اور جذبات کی آگ سرد ہو جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ ۹ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منافق کو کُرتہ دیا اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ ممکن ہے اس نے غرغرہ کے وقت توبہ کر لی ہو۔ مومن کا کام ہے کہ حسن ظن رکھے۔ اس لیے نماز جنازہ کا جواز رکھا ہے کہ ہر ایک کی پڑھ لی جائے ہاں اگر کوئی سخت معاند ہو یا فساد کا اندیشہ ہو تو پھر نہ پڑھنی چاہیئے۔ ہماری جماعت کے سر پر فرضیت نہیں ہے بطور احسان کے ہماری جماعت دوسرے غیر از جماعت کا جنازہ پڑھ سکتی ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ اس میں صلوٰۃ سے مراد جنازہ کی نماز ہے اور سَكَنٌ لَّهُمْ دلالت

---

[1] الفلق آیت ۶

کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا گنہ گار کو سکینت اور ٹھنڈک بخشتی ہے۔

(البدر جلد ۱ عـ۳ـ مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۰۲ء صـ۱۹ـ)

ہمارا ایمان ہے کہ شفاعت حق ہے اور اس پر یہ نص صریح ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یہ شفاعت کا فلسفہ ہے یعنی جو گناہوں میں نفسانیت کا جوش ہے جو ٹھنڈا پڑ جاوے۔ شفاعت کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ گناہ کی زندگی پر ایک موت وارد ہو جاتی ہے اور نفسانی جوشوں اور جذبات میں ایک برودت آ جاتی ہے جس سے گناہوں کا صدور بند ہو کر اُن کے بالمقابل نیکیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پس شفاعت کے مسئلے نے اعمال کو بیکار نہیں کیا۔ بلکہ اعمال حسنہ کی تحریک کی ہے۔ (الحکم جلد ۷ عـ۹ـ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۳ء صـ۲ـ)

صدقہ صدق سے لیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں صدقہ دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ خدا سے صدق رکھتا ہے۔ دوسرا دعا۔ دعا کے ساتھ قلب پر سوز و گداز اور رقت پیدا ہوتی ہے دعا میں ایک قربانی ہے۔ صدق اور دعا اگر یہ دو باتیں میسّر آ جاویں تو اکسیر ہیں۔ (الحکم جلد ۸ عـ۲۲ـ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۴ء صـ۱۲ـ)

۱۱۲ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

وہ لوگ خوش وقت ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خدا کی پرستش میں مشغول ہوتے ہیں اور خدا کی تعریف میں لگے رہتے ہیں اور خدا کی راہ کی منادی کے لیے دنیا میں پھرتے ہیں اور خدا کے آگے جھکے رہتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں وہی مومن ہیں جن کو نجات کی خوش خبری دی گئی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم یادداشتیں صـ۴ـ)

۱۱۶ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

مسیح کا باغ میں اپنے بچ جانے کے لیے ساری رات دعا کرنا اور دعا قبول بھی ہو جانا جیسا کہ عبرانیاں ۵ آیت ۷ میں لکھا ہے۔ مگر پھر بھی خدا کا اس کے چھڑانے پر قادر نہ ہونا یہ بزعم عیسائیاں ایک دلیل ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی بادشا ہت

زمین پر نہیں تھی مگر ہم نے اس سے بڑھ کر ابتلا دیکھے ہیں اور ان سے نجات پائی ہے ہم کیونکر خدا کی بادشاہت کا انکار کر سکتے ہیں۔ کیا وہ خون کا مقدمہ جو میرے قتل کرنے کے لیے مارٹن کلارک کی طرف سے عدالت کپتان ڈگلس میں پیش ہوا تھا۔ وہ اُس مقدمہ سے کچھ خفیف تھا جو محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہ کسی خون کے اتہام سے یہودیوں کی طرف سے عدالت پیلاطوس میں دائر کیا گیا تھا مگر چونکہ خدا زمین کا بھی بادشاہ ہے جیسا کہ آسمان کا۔ اس لیے اس نے اس مقدمہ کی پہلے سے مجھے خبر دے دی کہ یہ ابتلا آنے والا ہے اور پھر خبر دیدی کہ میں تم کو بَری کروں گا اور وہ خبر صدہا انسانوں کو قبل از وقت سُنائی گئی اور آخر مجھے بَری کیا گیا پس یہ خدا کی بادشاہت تھی جس نے اس مقدمہ سے مجھے بچا لیا جو مسلمانوں ہندوؤں اور عیسائیوں کے اتفاق سے مجھ پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ایسا ہی نہ ایک دفعہ بلکہ بیسیوں دفعہ میں نے خدا کی بادشاہت کو زمین پر دیکھا اور مجھے خدا کی اِس آیت پر ایمان لانا پڑا کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی زمین پر بھی خدا کی بادشاہت ہے اور آسمان پر بھی۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۴-۳۵)

۱۱۹ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ○

شریعت کی کتابیں حقائق اور معارف کا ذخیرہ ہوتی ہیں لیکن حقائق اور معارف پر کبھی پوری اطلاع نہیں مل سکتی جب تک صادق کی صحبت اخلاص اور صدق سے اختیار نہ کی جاوے اسی لیے قرآن شریف فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور ارتقاء کے مدارج کامل طور پر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جب تک صادق کی معیت اور صحبت نہ ہو کیونکہ اس کی صحبت میں رہ کر وہ اس کے انفاس طیبہ عقد ہمت اور توجہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ صفحہ ۷۔ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء)

انبیاء علیہم السلام تھوڑے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے وقت پر آیا کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کو رسم اور عادت سے نجات دینے اور سچا اخلاص اور ایمان حاصل کرنے کی یہ راہ بتائی ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یہ سچی بات ہے اس کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ جس نے نبی کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر دیا۔ رسم اور عادت کی غلامی سے انسان اسی وقت نکل سکتا ہے جب وہ عرصہ دراز تک صادقوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰۔ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

خان صاحب نواب خان صاحب جاگیردار مالیرکوٹلہ نے ایک شخص کا ذکر کیا کہ وہ ارادت کا اظہار کرتا ہے مگر چاہتا ہے کہ اس کی توجہ نماز کی طرف ہو جاوے۔ فرمایا کہ

یہ لوگ خدا تعالیٰ سے ایسی شرطیں کیوں کرتے ہیں پہلے خود کوشش کرنی چاہیئے قرآن میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ مقدم ہے۔ خدا تعالیٰ پر کسی کا حق واجب نہیں اگر وہ خود کوشش کرنا چاہتے ہیں تو مہینہ تک یہاں آ کر رہیں خدا نے فرمایا

ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یہاں وہ نماز پڑھنے والوں کو دیکھیں گے باتیں سنیں گے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

انسان کو انوار و برکات سے حصّہ نہیں مل سکتا جب تک وہ اسی طرح عمل نہ کرے جس طرح خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۔ بات یہی ہے کہ خمیر سے خمیر لگتا ہے اور یہی قاعدہ ابتداء سے چلا آتا ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو آپ کے ساتھ انوار و برکات تھے جن میں سے صحابہ نے بھی حصہ لیا پھر اسی طرح خمیر کی لاگ کی طرح آہستہ آہستہ ایک لاکھ تک ان کی نوبت پہنچی۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۳۱ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء)

ملعون لوگ (یعنی جو خدا سے دور ہیں) جو زندگی بسر کرتے ہیں وہ کیا زندگی ہے۔ بادشاہ اور سلاطین کی کیا زندگیاں ہیں مثل بہائم کے ہیں جب انسان مومن ہوتا ہے تو خود ان سے نفرت کرتا ہے..... ایمان لانے اور خدا کی عظمت کے دل میں ہونے کی اوّل نشانی یہ ہے کہ انسان ان تمام کو مثل کیڑوں کے خیال کرے ان کو دیکھ کر دل میں نہ ترسے کہ یہ فاخرہ لباس پہن کر گھوڑوں پر سوار ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کی زندگی بد اور کتوں کی سی زندگی ہے کہ مُردار دنیا پر دانت مار رہے ہیں۔ انسان کو اگر دیکھنے کی آرزو ہو تو ان کو دیکھیں جو منقطعین ہیں اور خدا کی طرف آ گئے ہیں اور خدا ان کو زندہ کرتا ہے۔ ان کی زیارت سے مصائب دور ہوتے ہیں۔ جو شخص رحمت والے کے پاس آوے گا تو وہ رحمت کے قریب تر ہوگا۔ دنیا میں یہی بات غور کے قابل ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اے بندو تمہارا بچاؤ اسی میں ہے کہ صادقوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

یہاں کا رہنا تو ایک قسم کا آستانۂ ایزدی پر رہنا ہے اس حوض کوثر سے وہ آب حیات ملتا ہے کہ جس کے پینے سے حیات جاودانی نصیب ہوتی ہے جس پر ابدالآباد تک موت ہرگز نہیں آ سکتی اچھی طرح کمر بستہ ہو کر پورے استقلال سے اس صراطِ مستقیم کے راہ رو بنیں اور ہر قسم کی دنیاوی رکاوٹوں اور نفسانی خواہشوں کی ذرا پروا نہ کر کے اللہ تعالیٰ کے صادق مامور کی پوری معیت کریں تاکہ حکم کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کی فرمانبرداری کا سنہری تمغہ آپ کو حاصل ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۵ صفحہ ۳۵۲ تا ۳۵۴ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء۔ نیز الحکم جلد ۷ نمبر ۴۴-۴۵ صفحہ ۷-۸ مورخہ ۳۰ نومبر و ۱۰ دسمبر ۱۹۰۳ء)

سال گزشتہ میں بمشورہ اکثر احباب یہ بات قرار پائی تھی کہ ہماری جماعت کے لوگ کم سے کم ایک مرتبہ سال میں بہ نیت استفادہ ضروریاتِ دین و مشورہ اعلاءِ کلمۂ اسلام و شرع متین اس عاجز سے ملاقات کریں اور اس مشورہ کے وقت یہ بھی قرین مصلحت سمجھ کر مقرر کیا گیا تھا کہ ۲۷ دسمبر کو اس غرض سے قادیان میں آنا انسب اور اولیٰ ہے کیونکہ یہ تعطیل کے دن ہیں اور ملازمت پیشہ لوگ ان دنوں میں فرصت اور فراغت رکھتے ہیں اور بباعث ایام سرمایہ دن سفر کے مناسب حال بھی ہیں...... جس حالت میں یہ عاجز اپنے صریح صریح اور ظاہر ظاہر الفاظ سے اشتہار میں لکھ چکا ہے کہ یہ سفر ہر یک مخلص کا طلب علم کی نیت سے ہوگا۔ پھر یہ فتویٰ دینا کہ جو

شخص اسلام میں ایسا امر پیدا کرے وہ مردود ہے کس قدر دیانت اور امانت اور انصاف اور تقویٰ اور طہارت سے دور ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک تاریخ مقررہ پر تمام بھائیوں کا جمع ہونا تو یہ صرف انتظام ہے اور انتظام سے کوئی کام کرنا اسلام میں کوئی مذموم امر اور بدعت نہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ بدظنی کے مادہ فاسدہ کو ذرا دور کرکے دیکھو کہ ایک تاریخ پر آنے میں کونسی بدعت ہے جبکہ ۲۷ر دسمبر کو ہر یک مخلص بآسانی ہمیں مل سکتا ہے اور اس کے ضمن میں ان کی باہم ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو اس سہل طریق سے فائدہ اُٹھانا کیوں حرام ہے تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے اس عاجز کا نام مردود تو رکھ دیا مگر آپ کو وہ حدیثیں یاد نہ رہیں جن میں طلب علم کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی نسبت ترغیب دی ہے اور جن میں ایک بھائی مسلمان کی ملاقات کے لیے جانا موجب خوشنودی خدائے عز وجل قرار دیا ہے اور جن میں سفر کرکے زیارتِ صالحین کرنا موجب مغفرت اور کفارہ گناہاں لکھا ہے۔......

مسلمانوں کو مختلف اغراض کے لیے سفر کرنے پڑتے ہیں کبھی سفر طلب علم ہی کے لیے ہوتا ہے اور کبھی سفر ایک رشتہ دار یا بھائی یا بہن یا بیوی کی ملاقات کے لیے.... کبھی سفر عجائبات دنیا کے دیکھنے کے لیے بھی ہوتا ہے جس کی طرف آیت کریمہ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ اشارت فرما رہی ہے۔ کبھی سفر صادقین کی صحبت میں رہنے کی غرض سے جس کی طرف آیت کریمہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ہدایت فرماتی ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام اشتہار قیامت کی نشانی ص ۶۱۲ تا ۶۱۷)

زیارتِ صالحین کے لیے سفر کرنا قدیم سے سنت سلف صالح چلی آئی ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب قیامت کے دن ایک شخص اپنی بداعمالی کی وجہ سے سخت مواخذہ میں ہوگا تو اللہ جل شانہ اس سے پوچھے گا کہ فلاں صالح آدمی کی ملاقات کے لیے کبھی تو گیا تھا تو وہ کہے گا بالارادہ تو کبھی نہیں گیا مگر ایک دفعہ ایک راہ میں اس کی ملاقات ہو گئی تھی تب خدا تعالےٰ کہے گا کہ جا بہشت میں داخل ہو جا میں نے اسی ملاقات کی وجہ سے تجھے بخشدیا۔

(آئینہ کمالات اسلام اشتہار قیامت کی نشانی ص ۶۱۷)

انسان ایسا جاندار ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے تربیت ایمانی کے لیے فیوض و برکات نہ ہوں وہ خود بخود پاک صاف نہیں ہو سکتا اور حقیقت میں پاک صاف ہونا اور تقویٰ پر قدم مارنا آسان امر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید سے یہ نعمت ملتی ہے اور سچا تقویٰ جس سے خدا تعالےٰ راضی ہو اس کے حاصل کرنے کے لیے بار بار اللہ تعالےٰ نے فرمایا یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ اور پھر یہ بھی کہا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ[1]۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ ص ۳ مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۰۶ء)

صادقوں کی صحبت میں رہنا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو دور بیٹھے رہتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ کبھی آئینگے

[1] النحل آیت ۱۲۹۔

اس وقت فرصت نہیں ہے۔ بھلا تیرہ سو سال کے موعود سلسلہ کو جو لوگ پالیں اور اس کی نصرت میں شامل نہ ہوں اور خدا اور رسول کے موعود کے پاس نہ بیٹھیں وہ فلاح پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دُوں　　این خیال است و محال است و جنوں

دین تو چاہتا ہے کہ مصاحبت ہو۔ پھر مصاحبت سے گریز ہو تو دینداری کے حصول کی امّید کیوں رکھتا ہے۔ ہم نے بارہا اپنے دوستوں کو نصیحت کی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ وہ بار بار یہاں آکر رہیں اور فائدہ اُٹھائیں۔ مگر بہت کم توجہ کی جاتی ہے لوگ ہاتھ میں ہاتھ دیکر دین کو دنیا پر مقدم کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی پروا کچھ نہیں کرتے ..... وہ لوگ جو یہاں آکر میرے پاس کثرت سے نہیں رہتے اور اُن باتوں سے جو خدا تعالیٰ ہر روز اپنے سلسلہ کی تائید میں ظاہر کرتا ہے نہیں سنتے اور دیکھتے۔ وہ اپنی جگہ پر کیسے ہی نیک اور متقی اور پرہیزگار ہوں مگر میں یہی کہوں گا کہ جیسا چاہیئے انہوں نے قدر نہیں کی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تکمیل علمی کے بعد تکمیل عملی کی ضرورت ہے پس تکمیلِ عملی بدُوں تکمیل علمی کے محال ہے اور جب تک یہاں آکر نہیں رہتے تکمیلِ علمی مشکل ہے۔ بارہا خطوط آتے ہیں کہ فلاں شخص نے اعتراض کیا اور ہم جواب نہ دے سکے اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ لوگ یہاں نہیں آتے اور اُن باتوں کو نہیں سنتے جو خدا تعالےٰ اپنے سلسلہ کی تائید میں علمی طور پر ظاہر کر رہا ہے۔ پس اگر تم واقعی اس سلسلہ کو شناخت کرتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو اور دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا سچا وعدہ کرتے ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ اس پر عمل کیا ہوتا ہے کیا کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اگر تم واقعی ایمان لاتے ہو اور سچّی خوش قسمتی یہی ہے تو اللہ تعالےٰ کو مقدّم کر لو۔ اگر ان باتوں کو ردّی اور فضول سمجھو گے تو یاد رکھو خدا تعالےٰ سے ہنسی کرنے والے ٹھہرو گے۔

(الحکم جلد ۵ عـ۳۱ـ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۱ء صـ۳ـ)

صدق ایسی شئ ہے جو انسان کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نجات دیتا ہے۔ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ ؎

کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست۔ پس جس قدر انسان صدق کو اختیار کرتا ہے اور صدق سے محبت کرتا ہے اسی قدر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے کلام اور انبیاء کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام راست بازوں کے نمونے اور چشمے ہوتے ہیں۔ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کا ارشاد اسی اصول پر ہے۔

(الحکم جلد ۹ عـ۱۴ـ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۵ء صـ۲ـ)

اللہ تعالیٰ نے ..... کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کا حکم دیکر زندوں کی صحبت میں رہنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو بار بار یہاں آنے اور رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور ہم جو کسی دوست کو یہاں رہنے کے واسطے کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ محض اس کی حالت پر رحم کرکے ہمدردی اور خیر خواہی سے کہتے ہیں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایمان درست نہیں ہوتا جب تک انسان صاحبِ ایمان کی صحبت میں نہ رہے اور یہ اس لیے کہ

چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ایک ہی وقت میں ہر قسم کی طبیعت کے موافق حال تقریر ناصح کے منہ سے نہیں نکلا کرتی۔ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کی سمجھ اور فہم کے مطابق اس کے مذاق پر گفتگو ہو جاتی ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچ جاتا ہے اور اگر آدمی بار بار نہ آئے اور زیادہ دنوں تک نہ رہے تو ممکن ہے کہ ایک وقت ایسی تقریر ہو جو اُس کے مذاق کے موافق نہیں ہے اور اُس سے اس کی بد دلی پیدا ہو اور وہ حُسن ظن کی راہ سے دور جا پڑے اور ہلاک ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۶ عـ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۵)

اوّل خدا تعالیٰ مدد دیتا ہے پھر دوسرے درجہ پر ماموں من اللہ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں جوش ڈالا ہے اور وہ اسی جوش اور تقاضائے فطرت کے ساتھ مخلوق کی بہتری میں ہر ایک قسم کی کوشش کرتے ہیں جیسے ماں اپنے بچے کو دودھ دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔اس لیے کہ والدہ کا نفس مزکّی نہیں ہے اور یہ مزکّی النفس لوگ ہوتے ہیں انہیں کو صادقین اس آیت کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ میں فرمایا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ عـ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۶)

یاد رکھو! میں جو اصلاحِ خلق کے لیے آیا ہوں جو میرے پاس آتا ہے وہ اپنی استعداد کے موافق ایک فضل کا وارث بنتا ہے لیکن میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ وہ جو سرسری طور پر بیعت کر کے چلا جاتا ہے اور پھر اس کا پتہ بھی نہیں ملتا کہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے اس کے لیے کچھ نہیں ہے وہ جیسا تہی دست آیا تھا۔تہی دست جاتا ہے۔

یہ فضل اور برکت صحبت میں رہنے سے ملتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صحابہ بیٹھے۔آخر نتیجہ یہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَصْحَابِیْ گویا صحابہؓ خدا کا رُوپ ہو گئے۔یہ درجہ ممکن نہ تھا کہ ان کو ملتا اور دُور ہی بیٹھے رہتے۔یہ بہت ضروری مسئلہ ہے۔خدا تعالیٰ کا قرب بندگانِ خدا کا قرب ہے اور خدا تعالیٰ کا ارشاد کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اس پر شاہد ہے۔یہ ایک سِرّ ہے جس کو تھوڑے ہیں جو سمجھتے ہیں۔ماموں من اللہ ایک ہی وقت میں ساری باتیں کبھی بیان نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے دوستوں کے امراض کی تشخیص کر کے حسب موقع ان کی اصلاح بذریعہ وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ ان کے امراض کا ازالہ کرتا رہتا ہے۔اب جیسے آج میں ساری باتیں بیان نہیں کر سکتا۔ممکن ہے کہ بعض آدمی ایسے ہوں جو آج ہی تقریر سُن کر چلے جاویں اور بعض باتیں اُن میں اُن کے مذاق اور مرضی کے خلاف ہوں تو وہ محروم گئے۔لیکن جو متواتر یہاں رہتا ہے وہ ساتھ ساتھ ایک تبدیلی کرتا جاتا ہے اور آخر اپنے مقصد کو پا لیتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ عـ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۱۱)

دل کی پاکیزگی کا حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ حاصل نہیں ہو سکتی جب تک منہاجِ نبوت پر آئے ہوئے پاک انسان کی صحبت میں نہ بیٹھے۔اس کی صحبت کی توفیق نہیں مل سکتی۔اوّلاً انسان یہ یقین نہ کرے کہ وہ ایک مرنے والی ہستی ہے۔یہی ایک بات ہے جو اس کو صادق کی صحبت کی توفیق عطا فرماوے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لیے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کے دل میں ایک واعظ پیدا کر دیتا ہے۔سب سے بڑھ کر

واعظ یہ ہے کہ وہ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کی حقیقت کو سمجھ لے۔

صحابہ کرام کی حالت کو دیکھو کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ جو کچھ انہوں نے کیا اسی طرح پر ہماری جماعت کو لازم ہے کہ وہی رنگ اپنے اندر پیدا کریں۔ بدوں اس کے کہ وہ اس اصلی مطلب کو جس کے لیے میں بھیجا گیا ہوں۔ پا نہیں سکتے کیا ہماری جماعت کو زیادہ حاجتیں اور ضرورتیں لگی ہوئی ہیں جو صحابہ کو نہ تھیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے اور آپ کی باتیں سننے کے واسطے کیسے حریص تھے۔ (الحکم جلد ۴ ۴۶ مورخہ ۲۴ ر دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

صادق سے صرف یہی مراد نہیں کہ انسان زبان سے جھوٹ نہ بولے۔ یہ بات تو بہت سے ہندوؤں اور دہریوں میں بھی ہو سکتی ہے بلکہ صادق سے مراد وہ شخص ہے جس کی ہر بات صداقت اور راستی ہونے کے علاوہ اس کے ہر حرکات و سکنات و قول سب صدق سے بھرے ہوئے ہوں۔ گویا یہ کہو کہ اس کا وجود ہی صدق ہو گیا ہو اور اس کے اس صدق پر بہت سے تائیدی نشان اور آسمانی خوارق گواہ ہوں۔ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے جو شخص ایسے آدمی کے پاس جو حرکات و سکنات۔ افعال و اقوال میں خدائی نمونہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ صحت نیت اور پاک ارادہ اور مستقیم جستجو سے ایک مدت تک رہے گا تو یقین کامل ہے کہ اگر وہ دہریہ بھی ہو تو آخر خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لے آئے گا۔ کیونکہ صادق کا وجود خدا نما وجود ہوتا ہے۔

انسان اصل میں اُنسان ہے یعنی دو محبتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اُنس وہ خدا سے کرتا ہے دوسرا اُنس انسان سے۔ چونکہ انسان کو تو اپنے قریب پاتا اور دیکھتا ہے اور اپنی بنی نوع کی وجہ سے اس سے جھٹ پٹ متاثر ہو جاتا ہے اس لیے کامل انسان کی صحبت اور صادق کی معیت اُسے وہ نور عطا کرتی ہے جس سے خدا کو دیکھ لیتا ہے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۴۲ مورخہ ۱۰ ر نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کہ صادقوں کے ساتھ رہو یہ معیت چاہتی ہے کہ کسی وقت تک صحبت میں رہے کیونکہ جب تک ایک حد تک صحبت میں نہ رہے وہ اسرار اور حقائق کھل نہیں سکتے۔ وہ اجنبی کا اجنبی اور بیگانہ ہی رہتا ہے اور کوئی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۷ ۶ مورخہ ۱۴ ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

سادھ سنگت بھی ایک ضرب المثل ہے پس یہ ضروری بات ہے کہ انسان باوجود علم کے اور باوجود قوت اور شوکت کے امام کے پاس ایک سادہ لوح کی طرح پڑا رہے تا اس پر عمدہ رنگت آوے۔ سفید کپڑا اچھا رنگا جاتا ہے اور جس میں اپنی خودی اور علم کا پہلے سے کوئی میل کچیل ہوتا ہے اس پر عمدہ رنگ نہیں چڑھتا۔ صادق کی معیت میں انسان کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اور اُسے نشانات دیئے جاتے ہیں جن سے اس کا جسم منور اور روح تازہ ہو جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ ۹ مورخہ ۱۰ ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

اعمالِ نیک کے واسطے صحبت صادقین کا نصیب ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ خدا کی سنت ہے ورنہ اگر چاہتا تو آسمان سے قرآن یونہی بھیج دیتا اور کوئی رسول نہ آتا۔ مگر انسان کو عمل درآمد کے لیے نمونہ کی ضرورت ہے پس اگر وہ نمونہ نہ بھیجتا رہتا تو حق مشتبہ ہوجاتا۔ (البدر جلد ۲ عث مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ)

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ یعنی صادق لوگوں کے ساتھ معیّت اختیار کرو۔ ان کی صحبت میں مدت ہائے دراز تک رہو کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چندروز ان کے پاس رہ جاوے اور ان ایّام میں حکمت الٰہی سے کوئی ایسا امر واقع نہ ہو کیونکہ ان لوگوں کے اختیار میں تو نہیں کہ جب چاہیں کوئی نشان دکھادیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ ان کی صحبت میں لمبا عرصہ اور دراز مدت گذر جاوے۔ بلکہ نشان دکھانا تو درکنار یہ لوگ تو اپنے خدا کے ساتھ تعلقات کا اظہار بھی گناہ جانتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اگر کوئی ولی خلوت میں اپنے خدا کے ساتھ خاص حالت اور تعلق کے جوش میں ہو اور اس پر وہ حالت طاری ہو تو ایسے وقت میں اگر کوئی شخص اس کے اس حال سے آگاہ ہو جائے تو وہ ولی شخص ایسا شرمندہ اور پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے جیسے کوئی زانی عین زنا کی حالت میں پکڑا جاوے کیونکہ یہ لوگ اپنے راز کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

چونکہ طبعاً ایسا معاملہ تھا خدا تعالےٰ نے اسی واسطے کہا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ[1] تو انہوں نے بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی یہ کلمہ منہ سے نکالا تھا کہ کیا ہے جی۔ یہ تو ہمارے جیسا آدمی ہی ہے۔ کھاتا پیتا بازاروں میں پھرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض نہ تھا کہ اُن کو کوئی رسالت کا امر نظر آتا۔ وہ معذور تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تھا۔ اسی کے مطابق رائے زنی کردی۔ پس اس واسطے ضروری ہے کہ مامور من اللہ کی صحبت میں دیر تک رہا جاوے۔ ممکن ہے کہ کوئی جس نے نشان کوئی نہ دیکھا ہو کہدے کہ اجی ہماری طرح نماز روزہ کرتا ہے اور کیا ہے۔

دیکھو حج کے واسطے جانا خلوص اور محبت سے آسان ہے۔ مگر واپسی ایسی حالت میں مشکل۔ بہت ہیں جو وہاں سے نامراد اور سخت دل ہوکر آتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی حقیقت اُن کو نہیں ملتی۔ قشر کو دیکھ کر رائے زنی کرنے لگ جاتے ہیں وہاں کے فیوض سے محروم ہوتے ہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے اور پھر الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ مامور کی خدمت میں صدق اور استقلال سے کچھ عرصہ رہا جاوے تاکہ اس کے اندرونی حالات سے بھی آگاہی ہو اور صدق پورے طور پر نورانی ہوجاوے۔

(الحکم جلد ۷ عنا مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

دو چیزیں ہیں۔ ایک تو دعا کرنی چاہیئے۔ دوسرا طریق یہ ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ راست بازوں کی صحبت

[1] الفرقان آیت ۸

میں رہو تاکہ ان کی صحبت میں رہ کر کے تم کو پتہ لگ جاوے کہ تمہارا خدا قادر ہے۔ بینا ہے سننے والا ہے۔ دعائیں قبول کرتا ہے اور اپنی رحمت سے بندوں کو صدہا نعمتیں دیتا ہے۔ (البدر جلد ۲ ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

اصلاح نفس کی ایک راہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی جو لوگ قولی فعلی عملی اور حالی رنگ میں سچائی پر قائم ہیں ان کے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اے ایمان والو تقویٰ اللہ اختیار کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے ایمان ہو پھر سنت کے طور پر بدی کی جگہ کو چھوڑ دے اور صادقوں کی صحبت میں رہے۔ صحبت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے جو اندر ہی اندر ہوتا چلا جاتا ہے اگر کوئی شخص ہر روز کنجریوں کے ہاں جاتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ کیا میں زنا کرتا ہوں۔ اُس سے کہنا چاہیئے کہ ہاں تو کرے گا اور وہ ایک نہ ایک دن اس میں مبتلا ہو جاوے گا کیونکہ صحبت میں تاثیر ہوتی ہے۔ اسی طرح پر جو شخص شراب خانہ میں جاتا ہے خواہ وہ کتنا ہی پرہیز کرے اور کہے کہ میں نہیں پیتا ہوں لیکن ایک دن آئے گا کہ وہ ضرور پئے گا۔

پس اس سے کبھی بے خبر نہیں رہنا چاہیئے کہ صحبت میں بہت بڑی تاثیر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصلاحِ نفس کے لیے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کا حکم دیا ہے۔ جو شخص نیک صحبت میں جاتا ہے خواہ وہ مخالفت ہی کے رنگ میں ہو لیکن وہ صحبت اپنا اثر کیے بغیر نہ رہے گی اور ایک نہ ایک دن وہ اس مخالفت سے باز آجائے گا

ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ ہمارے مخالف اسی صحبت کے نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہ گئے۔ اگر وہ ہمارے پاس آکر رہتے۔ ہماری باتیں سنتے تو ایک وقت آجاتا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن غلطیوں پر متنبہ کر دیتا اور وہ حق کو پا لیتے لیکن اب چونکہ اس صحبت سے محروم ہیں اور انہوں نے ہماری باتیں سننے کا موقع کھو دیا ہے اس لیے کبھی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ یہ دہریے ہیں شراب پیتے ہیں۔ زانی ہیں اور کبھی یہ اتہام لگاتے ہیں کہ نعوذ باللہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ صحبت نہیں اور یہ قہر الٰہی ہے کہ صحبت نہ ہو۔

لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کی ہے تو صلح حدیبیہ کی مبارک ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس آنے کا موقع ملا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں تو ان میں سے صدہا مسلمان ہو گئے۔ جب تک انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں نہ سنی تھیں۔ اُن میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک دیوار حائل تھی جو آپ کے حسن و جمال پر اُن کو اطلاع نہ پانے دیتی تھی۔ اور جیسا دوسرے لوگ کذّاب کہتے تھے (معاذ اللہ) وہ بھی کہہ دیتے تھے اور ان فیوض و برکات سے

بے نصیب تھے جو آپ لیکر آئے تھے اس لیے کہ دور تھے لیکن جب حجاب اُٹھ گیا اور پاس آکر دیکھا اور سُنا تو وہ محرومی نہ رہی اور سعیدوں کے گروہ میں داخل ہو گئے۔ اس طرح پر ہنتوں کی بدنصیبی کا اب بھی یہی باعث ہے جب ان سے پوچھا جاوے کہ تم نے ان کے دعوے اور دلائل کو کہاں تک سمجھا ہے تو بجز چند بہتانوں اور افتراؤں کے کچھ نہیں کہتے جو بعض مفتری سُنا دیتے ہیں اور وہ ان کو سچ مان لیتے ہیں اور خود کوشش نہیں کرتے کہ یہاں آکر خود تحقیق کریں اور ہماری صحبت میں آکر دیکھیں۔ اس سے اُن کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اور حق کو نہیں پا سکتے لیکن اگر تقویٰ سے کام لیتے تو کوئی گناہ نہ تھا کہ وہ آکر ہم سے ملتے جلتے رہتے اور ہماری باتیں سنتے رہتے حالانکہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے بھی ملتے ہیں اور ان کی باتیں سنتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں جاتے ہیں پھر کونسا امر مانع تھا جو ہمارے پاس آنے سے انہوں نے پرہیز کیا۔

غرض یہ بڑی ہی بدنصیبی ہے اور انسان اس کے سبب سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ اس میں بڑا نکتہ معرفت یہی ہے کہ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے ایک راستباز کی صحبت میں رہ کر انسان راستبازی سیکھتا ہے اور اس کے پاک انفاس کا اندر ہی اندر اثر ہونے لگتا ہے جو اس کو خدا تعالیٰ پر ایک سچا یقین اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ اس صحبت میں صدق دل سے رہ کر وہ خدا تعالیٰ کی آیات اور نشانات کو دیکھتا ہے جو ایمان کو بڑھانے کے ذریعے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ عل مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

جب انسان ایک راستباز اور صادق کے پاس بیٹھتا ہے تو صدق اس میں کام کرتا ہے لیکن جو راستبازوں کی صحبت کو چھوڑ کر بدوں اور شریروں کی صحبت کو اختیار کرتا ہے تو ان میں بدی اثر کرتی جاتی ہے۔ اسی لیے احادیث اور قرآن شریف میں صحبتِ بد سے پرہیز کرنے کی تاکید اور تہدید پائی جاتی ہے اور لکھا ہے کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت ہوتی ہو اس مجلس سے فی الفور اُٹھ جاؤ ورنہ جو اہانت سُن کر نہیں اُٹھتا اس کا شمار بھی ان میں ہی ہوگا۔

صادقوں اور راستبازوں کے پاس رہنے والا بھی ان میں ہی شریک ہوتا ہے۔ اس لیے کس قدر ضرورت ہے اس امر کی کہ انسان کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے پاک ارشاد پر عمل کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ وہ پاک لوگوں کی مجلس میں آتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے کیا دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مجلس دیکھی ہے جس میں تیرا ذکر کر رہے تھے مگر ایک شخص ان میں سے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں وہ بھی ان میں ہی سے ہے کیونکہ اِنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَشْقٰی جَلِیْسُهُمْ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صادقوں کی صحبت سے کس قدر فائدے

ہیں۔ سخت بدنصیب ہے وہ شخص جو صحبت سے دور ہے۔

غرض نفس مطمئنہ کی تاثیروں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اطمینان یافتہ لوگوں کی صحبت میں اطمینان پاتے ہیں۔ امّارہ والے میں نفس امّارہ کی تاثیریں ہوتی ہیں اور لوّامہ والے میں لوّامہ کی تاثیریں ہوتی ہیں۔ اور جو شخص نفس مطمئنہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے اس پر بھی اطمینان اور سکینت کے آثار ہونے لگتے ہیں اور اندر ہی اندر اُسے تسلی ملنے لگتی ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

نفس اور اخلاق کی پاکیزگی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ صحبت صادقین بھی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی تم خدا تعالیٰ کے صادق اور راست باز لوگوں کی صحبت اختیار کرو تاکہ ان کے صدق کے انوار سے تم کو بھی حصّہ ملے جو مذاہب کہ تفرقہ پسند کرتے ہیں اور الگ الگ رہنے کی تعلیم دیتے ہیں وہ یقیناً وحدت جمہوری کی برکات سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا کہ ایک نبی ہو جو کہ جماعت بنادے اور اخلاق کے ذریعہ آپس میں تعارف اور وحدت پیدا کرے۔

(البدر جلد ۳ ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

(حقیقی پاکیزگی کے حاصل کرنے اور خاتمہ بالخیر کے لیے) تیسرا پہلو جو قرآن سے ثابت ہے وہ صحبت صادقین ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی صادقوں کے ساتھ رہو۔ صادقوں کی صحبت میں ایک خاص اثر ہوتا ہے ان کا نور صدق و استقلال دوسروں پر اثر ڈالتا ہے اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

تیسرا پہلو حصول نجات اور تقویٰ کا صادقوں کی معیت ہے جس کا حکم قرآن شریف میں ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اکیلے نہ رہو کہ اس حالت میں شیطان کا داؤ انسان پر ہوتا ہے بلکہ صادقوں کی معیت اختیار کرو ان کی جمعیت میں رہو تاکہ ان کے انوار و برکات کا پرتو تم پر پڑتا رہے اور خانۂ قلب کے ہر ایک خس و خاشاک کو محبت الٰہی کی آگ سے جلا کر نور الٰہی سے بھر دے۔ (البدر جلد ۴ ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

متقی کے ساتھ چونکہ اللہ تعالیٰ کی معیت ہوتی ہے اس لیے دشمن پر بھی متقی کا رعب ہوتا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سچا تقویٰ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان صادقوں اور مردانِ خدا کی صحبت اختیار نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کے فرستادوں کی اطاعت میں ایک فنا اپنے اوپر طاری نہیں کر لیتا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اور صادقوں کے ساتھ رہو۔ ان کی معیت سے قوت پکڑو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پوری حقیقت متقی ہونے کے بعد کھلتی ہے اور تقویٰ اللہ کی حقیقت اس وقت تک متحقق نہیں

ہو سکتی جب تک ایک فانی مرد کی پاک صحبت میں رہ کر فائدہ نہ اٹھایا جائے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف صحبت میں رہنا چنداں مفید اور کارگر نہیں ہوتا بلکہ صادقوں کی صحبت کے اختیار کرنے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی اطاعت اختیار کی جائے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۵ - ۱۰ر فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

صادقوں کے ساتھ ہونے سے وہ تاثیرات اور انوار دل پر پڑتے ہیں جو پاکیزگی بخش اور نجات کے چشمہ تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ دنیا میں یہی قاعدہ ہے کہ صادقوں کی کشش اپنا اثر کرتی ہے۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود کیسا بابرکت تھا کہ صحابہ میں آپ تاثیر ہوئی۔ اسی طرح سے اب بھی خدا نے تاثیر کا ایک سلسلہ رکھا ہے یہ قانون قدرت ہے حصول فضل کا جو نجات کا موجب ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۱ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

صحبت میں بڑا شرف ہے۔ اس کی تاثیر کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا ہی دیتی ہے۔ کسی کے پاس اگر خوشبو ہو تو پاس والے کو بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح پر صادقوں کی صحبت ایک رُوح صدق کی نفخ کر دیتی ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ گہری صُحبت نبی اور صاحب نبی کو ایک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن شریف میں کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ فرمایا ہے اور اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ایک بے نظیر خوبی ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے صادق موجود رہتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

صادق کی صحبت میں رہو تو خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت سے امور میں مشکلات آسان ہو جاتے ہیں۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۴۶ مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

اگرچہ یہ علوم لدنیہ وکشوف صادقہ وتائیدات خاصہ الٰہیہ و توجہات جلیلہ صمدیہ غیر فانی کو ذاتی طور پر حاصل نہیں ہو سکتے لیکن بتوسط صحبت شیخ فانی بھی حاصل ہو سکتے ہیں یعنی اگرچہ براہ راست نہیں لیکن سالک اپنے شیخ کامل میں ان تمام تائیدات سماویہ کو معائنہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ پس یہی مشاہدہ اس کے یقین کی کمالیت کا موجب ہو جاتا ہے۔ اگر جلدی نہیں تو ایک زمانہ دراز کی صحبت سے ضرور شکوک و شبہات کی تاریکی دل پر سے اُٹھ جاتی ہے۔ اسی جہت سے فانیوں کی معیت کے لیے قرآن شریف میں سخت تاکید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ اَیْ كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ وَ الصّٰدِقُوْنَ هُمُ الْفَانُوْنَ لَا غَيْرُهُمْ اور جو شخص نہ فانی ہے اور نہ فانیوں سے اس کا کچھ تعلق اور محبت ہے۔ وہ معرض ہلاکت میں ہے اور اس کے سوء خاتمہ کا سخت اندیشہ ہے۔ (مکتوبات جلد ۱ صفحہ ۴۹ مکتوب نمبر ۲۶ بنام میر عباس علی شاہ صاحب) طبع اول)

یہ کہنا کہ ہمارے لیے قرآن اور احادیث کافی ہیں اور صحبت صادقین کی ضرورت نہیں یہ خود مخالفت تعلیم قرآن ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ اور صادق وہ ہیں جنہوں نے صدق کو

علیٰ وجہ البصیرت شناخت کیا اور پھر اس پر دل و جان سے قائم ہو گئے اور یہ اعلیٰ درجہ بصیرت کا بجز اس کے ممکن نہیں کہ سماوی تائید شامل حال ہو کر اعلیٰ مرتبہ حق الیقین تک پہنچا دیوے۔ پس ان معنوں کر کے صادق حقیقی انبیاء اور رسل اور محدث اور اولیاء کاملین مکملین ہیں جن پر آسمانی روشنی پڑی اور جنہوں نے خدا تعالےٰ کو اسی جہان میں یقین کی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آیت موصوفہ بالا بطور اشارت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیا صادقوں کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوتی کیونکہ دوام حکم کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ دوام وجود صادقین کو مستلزم ہے علاوہ اس کے مشاہدہ صاف بتلا رہا ہے کہ جو لوگ صادقوں کی صحبت سے لاپروا ہو کر عمر گزارتے ہیں ان کے علوم و فنون جسمانی جذبات سے اُن کو ہرگز صاف نہیں کر سکتے اور کم سے کم اتنا ہی مرتبہ اسلام کا کہ دلی یقین اس بات پر ہو کہ خدا ہے اُن کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا اور جس طرح وہ اپنی اس دولت پر یقین رکھتے ہیں جو ان کے صندوقوں میں بند ہو یا اپنے ان مکانات پر جو ان کے قبضہ میں ہوں ہرگز ان کو ایسا یقین خدا تعالیٰ پر نہیں ہوتا۔ وہ سمّ الفار کھانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ ایک زہر مہلک ہے لیکن گناہوں کی زہر سے نہیں ڈرتے۔

(شہادت القرآن صـ۵۱)

جاننا چاہیئے کہ انبیاء کی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ انسان طبعاً کامل نمونہ کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو زیادہ کرتا ہے اور ہمّت کو بڑھاتا ہے اور جو نمونہ کا پیرو نہیں وہ سُست ہو جاتا ہے اور بہک جاتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ...... تم ان لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو راست باز ہیں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صـ۱۸۸-۱۸۹)

اگر خدا سے ملنا چاہتے ہو تو دعا بھی کرو اور کوشش بھی کرو اور صادقوں کی صحبت میں بھی رہو۔ کیوں کہ اس راہ میں صحبت بھی شرط ہے۔ (لیکچر لاہور صـ۱۳-۱۴)

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۱)

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اخیار اور ابرار کا نام ابدالآباد تک زندہ رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے کے بادشاہوں یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ برخلاف اس کے خدا تعالیٰ کے راست بازوں اور برگزیدوں کی دنیا مداح ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۴ پرچہ ۳۰ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدنظر نہیں رکھنا چاہیئے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

دنیا تماشا گاہ ہے۔ کبھی انسان عروج میں گویا افلاک تک پہنچتا ہے اور کبھی خاک میں مگر جو لوگ خدا کی طرف اور خدا کے بندوں کی طرف جھکتے ہیں وہ ضائع نہیں کیے جاتے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (مکتوبات جلد ۵ حصہ اول۔ مکتوب نمبر ۴۵ بنام حضرت سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسیؓ)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝

یعنی ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو تفقہ فی الدّین کریں یعنی جو دین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے اس میں تفقہ کر سکیں۔ یہ نہیں کہ طوطے کی طرح یاد ہو اور اس میں غور و فکر کی مطلق عادت اور مذاق ہی نہ ہو۔ اس سے وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے.... لیکن چونکہ سب کے سب ایسے نہیں ہو سکتے اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ سب کے سب ایسے ہو جائیں بلکہ یہ فرمایا کہ ہر جماعت اور گروہ میں سے ایک ایک آدمی ہو اور گویا ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہونی چاہیئے جو تبلیغ اور اشاعت کا کام کر سکیں۔ اس لیے بھی کہ ہر شخص ایسی طبیعت اور مذاق کا نہیں ہوتا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ○

جذب اور عقد ہمت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے آجاتا ہے اور ظل اللہ بنتا ہے پھر وہ مخلوق کی ہمدردی اور بہتری کے لیے اپنے اندر ایک اضطراب پاتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبہ میں کل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے اس لیے آپ مخلوق کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ یعنی یہ رسول تمہاری تکالیف کو دیکھ نہیں سکتا وہ اس پر سخت گراں ہے اور اسے ہر وقت اس بات کی تڑپ لگی رہتی ہے کہ تم کو بڑے بڑے منافع پہنچیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء)

تعلیم قرآنی ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ نیکوں اور ابرار اخیار سے محبت کرو اور فاسقوں اور کافروں پر شفقت کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ یعنی اے کافرو۔ یہ نبی ایسا مشفق ہے جو تمہارے رنج کو دیکھ نہیں سکتا اور نہایت درجہ خواہش مند ہے کہ تم ان بلاؤں سے نجات پا جاؤ۔ (نور القرآن ۲ ص ۳۹)

جیسا کہ خدا تعالیٰ قادر ہے حکیم بھی ہے اور اس کی حکمت اور مصلحت چاہتی ہے کہ اپنے نبیوں اور ماموروں کو ایسی اعلیٰ قوم اور خاندان اور ذاتی نیک چال چلن کے ساتھ بھیجے تاکہ کوئی دل ان کی اطاعت سے کراہت نہ کرے یہی وجہ ہے کہ جو تمام نبی علیہم السلام اعلیٰ قوم اور خاندان میں سے آتے رہے ہیں۔ اسی حکمت اور مصلحت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کی نسبت ان دونوں خوبیوں کا تذکرہ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ یعنی تمہارے پاس وہ رسول آیا ہے جو خاندان اور قبیلہ اور قوم کے لحاظ سے تمام دنیا سے بڑھ کر ہے اور سب سے زیادہ پاک اور بزرگ خاندان رکھتا ہے۔ (تریاق القلوب ص۶۰)

اَنْفُس کے لفظ میں ایک قرأت زبر کے ساتھ ہے یعنی حرف فا کی فتح کے ساتھ اور اسی قرأت کو ہم اس جگہ ذکر کرتے ہیں اور دوسری قرأت بھی یعنی حرف فا کے پیش کے ساتھ بھی اسی کے ہم معنی ہے۔ کیوں کہ خدا قریش کو مخاطب کرتا ہے کہ تم جو ایک بڑے خاندان میں سے ہو۔ یہ رسول بھی تو تمہیں میں سے ہے یعنی عالی خاندان ہے۔ (تریاق القلوب ص۶۰ حاشیہ)

فَاَشَارَ اللّٰہُ فِیْ قَوْلِہٖ عَزِیْزٌ وَّفِیْ قَوْلِہٖ حَرِیْصٌ اِلٰی اَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ مَظْھَرُ صِفَتِہِ الرَّحْمٰنِ بِفَضْلِہِ الْعَظِیْمِ لِاَنَّہٗ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ کُلِّھِمْ وَلِنَوْعِ الْاِنْسَانِ وَالْحَیْوَانِ وَاَھْلِ الْکُفْرِ وَ الْاِیْمَانِ۔ ثُمَّ قَالَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ فَجَعَلَہٗ رَحْمَانًا وَّرَحِیْمًا۔[1]

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۱۴-۱۱۵)

۱۲۹ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

ہم لوگ جو خدا تعالیٰ کو ربّ العرش کہتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ جسمانی اور جسم ہے اور عرش کا محتاج ہے بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے جو اس جہان اور آنے والے جہان سے برابر نسبت رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں سے مترادف ہے کہ وہ مالک الکونین ہے اور جیسا کہ ایک شخص اونچی جگہ بیٹھ کر یا کسی نہایت اونچے محل پر چڑھ کر یمین و یسار نظر رکھتا ہے ایسا ہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ اس عالم کی اور نہ اس دوسرے عالم کی ہاں اس مقام کو عام سمجھوں کے لیے اوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے

(رسالہ معیار المذاہب صفحہ ۲۴)

---

[1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عزیز اور حریص کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے فضلِ عظیم سے اس کی صفت رحمٰن کے مظہر ہیں کیونکہ آپ کا وجود مبارک سب جہانوں کے لیے رحمت ہے۔ بنی نوع انسان حیوانات۔ کافروں۔ مومنوں سبھی کے لیے۔ پھر فرمایا بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ اور اس میں آپ کو رحمان اور رحیم کے نام دیئے۔

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ——— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ یونس

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۲ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ۝

یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں کہ جو جامع علوم حکمیہ ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۱۹ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

قرآن حکیم ہے یعنی حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱ طبع اوّل)

۳ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ۝

کیا لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک کی طرف یہ وحی بھیجی کہ تُو لوگوں کو ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے یہ خوشخبری دے کہ ان کے لئے اُن کے ربّ کے نزدیک قدم صدق ہے۔ کافروں نے اس

رسول کی نسبت کہا کہ یہ تو صریح جادوگر ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۱۹ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

جو لوگ ارادت سے رجوع کرتے ہیں ان کا عمل مقبول ہے اور ان کے لئے قدم صدق ہے۔

(مکتوبات جلد ۵ نمبر ۵ صفحہ ۱۰ مکتوب بنام حضرت منشی احمد جان صاحبؓ)

۵۴۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝

اِس جگہ کے متعلق ایک اور اعتراض ہے جو بعض ناواقف آریہ پیش کیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی خدا نے جو تمہارا ربّ ہے زمین اور آسمانوں کو چھ دِن میں بنایا اور پھر عرش پر ٹھہرا۔ یہ چھ دِن کی کیوں تخصیص ہے۔ یہ تو تسلیم کیا کہ خدا تعالیٰ کے کام اکثر تدریجی ہیں جیسا کہ اب بھی اس کی خالقیت جو جمادات اور نباتات اور حیوانات میں اپنا کام کر رہی ہے۔ تدریجی طور پر ہی ہر ایک چیز کو اس کی خلقت کاملہ تک پہنچاتی ہے لیکن چھ دِن کی تخصیص کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

امّا الجواب پس واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر درحقیقت مراتب تکوینی کی طرف اشارہ ہے یعنی ہر یک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ہے اور جسم اور جسمانی ہے خواہ وہ مجموعہ عالم ہے اور خواہ ایک فرد از افرادِ عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے جو زمین و آسمان و مافیہا سے مراد ہے اور خواہ وہ عالم صغیر جو اِنسان سے مراد ہے وہ حکمت و قدرت باری تعالیٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کرکے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے اور یہ عام قانونِ قدرت ہے کچھ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں چنانچہ اللہ جلّ شانہٗ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہیں مراتب ستّہ کا ذکر فرماتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اٹھارویں سیپارے سُورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝[1] یعنی پہلے تو ہم نے اِنسان کو اُس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام انواع اور اقسام

---

[1] آیت ۱۳-۱۵۔

کا لُبِّ لباب تھا اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا تا وہ باعتبار جسم بھی عالَمِ صغیر ٹھہرے اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو جیسا کہ وہ برطبق آیت فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] باعتبار رُوح عالمِ صغیر ہے اور بلحاظ شیون و صفاتِ کاملہ وظلّیت تام رُوح الٰہی کا مظہرِ تام ہے پھر بعد اس کے اِنسان کو ہم نے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا جو انسان کے اندر نطفہ پیدا کیا اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں جو ساتھ ہی رِحم میں بنتی جاتی ہے جگہ دی (قَرَارٍ مَّکِیْنٍ کا لفظ اِس لئے اختیار کیا کہ تا رِحم اور تھیلی دونوں پر اطلاق پا سکے) اور پھر ہم نے نطفہ سے علقہ بنایا اور علقہ سے مُضغہ اور مُضغہ کے بعض حصّوں میں سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر پوست پیدا کیا۔ پھر اس کو ایک اَور پیدائش دی یعنی رُوح اُس میں ڈال دی۔ پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا جو اپنی صنعت کاری میں تمام صنّاعوں سے بلحاظ حُسنِ صنعت و کمال عجائباتِ خلقت بڑھا ہُوا ہے۔

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اِس جگہ بھی اپنا قانونِ قدرت یہی بیان فرمایا کہ اِنسان چھ طور کے خلقت کے مدارج طے کر کے اپنے کمالِ اِنسانیت کو پہنچتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالَمِ صغیر اور عالَمِ کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے اور قرآن سے انسان کا عالَمِ صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ[2] اِسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویمِ عالَم کی متفرق خوبیوں اور حُسنوں کا ایک ایک حِصّہ اِنسان کو دے کر بوجہ جامعیّت جمیع شمائل و شیون عالَم اُس کو اَحسن ٹھہرایا گیا ہے۔ پس اب بوجہ تشابہ عالمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعالِ صانع واحد ماننا پڑتا ہے کہ جو عالَمِ صغیر میں مراتبِ تکوین موجود ہیں وہی مراتبِ تکوین عالَمِ کبیر میں بھی ملحوظ ہوں اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالَمِ صغیر جو اِنسان کے اِسم سے موسوم ہے اپنی پیدائش میں چھ طریق رکھتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ عالَم عالَمِ کبیر کے کوائفِ مخفیہ کی شناخت کے لئے ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ پس جبکہ اُس کی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے تو قطعی طور پر یہ حکم دے سکتے ہیں کہ عالَمِ کبیر کے بھی مراتبِ تکوین چھ ہی ہیں جو بلحاظ موثرات ستّہ یعنی تجلیاتِ ستّہ جن کے آثارِ باقیہ نجوم ستّہ میں محفوظ رہ گئے ہیں معقولی طور پر متحقق ہوتے ہیں اور نجوم ستّہ کا اب بھی علوم حکمیہ میں جنین کی تکمیل کے لئے تعلق مانا جاتا ہے چنانچہ سدیدی میں اس کے متعلق ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔

بعض نادان اِس جگہ اِس آیت کی نسبت یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حال کی طبّی تحقیقاتوں کی رُو سے یہ طرز بچّہ کے بننے کی جو رِحمِ عورت میں بنتا ہے ثابت نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اِس کے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض سخت درجہ کی کم فہمی یا صریح تعصب پر مبنی ہے۔ اِس بات کے تجربہ کے لئے کسی ڈاکٹر یا طبیب کی حاجت نہیں خود

[1] الحجر: ۳۰ ۔ [2] التّین: ۵

ہر یک اِنسان اِس آزمائش کے لئے وقت خرچ کرکے اور اُن بچّوں کو دیکھ کر جو تام خلقت یا ناتمام خلقت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں یا سقوطِ حمل کے طور پر گرتے ہیں حقیقتِ واقعیہ تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ ہم اپنے ذاتی مشاہدہ سے جانتے ہیں بلاشُبہ یہ بات صحیح ہے کہ جب خدا تعالیٰ اِنسانی نطفہ سے کسی بچّہ کو رِحم میں بنانے کیلئے ارادہ فرماتا ہے تو پہلے مَرد اور عورت کا نطفہ رِحم میں ٹھہرتا ہے اور صرف چند روز تک اُن دونوں مَنیوں کے اِمتزاج سے کچھ تغیّر طاری ہو کر جمے ہوئے خُون کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے جس پر ایک نرم سی جھلّی ہوتی ہے۔ یہ جھلّی جیسے جیسے بچّہ بڑھتا ہے بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ خاکی رنگ کی ایک تھیلی سی ہو جاتی ہے جو گٹھڑی کی طرح نظر آتی ہے اور اپنی تکمیلِ خلقت کے دنوں تک بچّہ اسی میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اس کی مصدّق ہیں کہ عالَمِ کبیر بھی اپنے کمالِ خلقت کے وقت تک ایک گٹھڑی کی طرح تھا جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ[1] الجزو نمبر ۱ یعنی فرماتا ہے کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا کہ گٹھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو کھول دیا۔ سو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ ان کی گٹھڑی دیکھی لیکن اِس جگہ رُوحانی آسمان اور رُوحانی زمین کی طرف اشارہ ہے جس کی گٹھڑی عرب کے رُوبرو کُھل گئی اور فیضانِ سماوی زمین پر جاری ہو گئے۔

اَب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف عَود کرکے کہتے ہیں کہ نطفتین مَرد اور عورت کے جو آپس میں مِل جاتے ہیں وہ اوّل مرتبہ تکوین کا ہے اور پھر اُن میں ایک جوش آکر وہ مجموعہ نطفتین جو قوّت قاعدہ اور منعقدہ اپنے اندر رکھتا ہے سُرخی کی طرف مائل ہو جاتا ہے گویا وہ مَنی جو پہلے خُون سے بنی تھی پھر اپنے اصلی رنگ کی طرف جو خُونی ہے عَود کر آتی ہے یہ دوسرا درجہ ہے۔ پھر وہ خُون جما ہوا جس کا نام علقہ ہے ایک گوشت کا مُضغہ ہو جاتا ہے جو اِنسانی شکل کا کچھ خاکہ نہایت دقیق طور پر اپنے اندر رکھتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے اور اس درجہ پر اگر بچّہ ساقط ہو جائے تو اس کے دیکھنے سے غور کی نظر سے کچھ خطوط انسان بننے کے اس میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اکثر بچّے اس حالت میں بھی ساقط ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو کبھی یہ اِتّفاق پیش آیا ہے یا وہ دایہ کا کام کرتی ہیں وہ اس حال سے خُوب واقف ہیں۔ پھر چوتھا درجہ وہ ہے جب مُضغہ سے ہڈیاں بنائی جاتی ہیں جیسا کہ آیت فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا[2] بیان فرما رہی ہے مگر المضغہ پر جو الف لام ہے وہ تخصیص کیلئے ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام مُضغہ ہڈی نہیں بن جاتا بلکہ جہاں جہاں ہڈیاں درکار ہیں باذنہٖ تعالیٰ وہی نرم گوشت کسی قدر صلب ہو کر ہڈی کی صُورت بن جاتا ہے اور کسی قدر بدستور نرم گوشت رہتا ہے اور

[1] الانبیاء: ۳۱ [2] المؤمنون: ۱۵

اِس درجہ پر اِنسانی شکل کا کُھلا کُھلا خاکہ طیار ہو جاتا ہے جس کے دیکھنے کے لئے کسی خُوردبین کی ضرورت نہیں اس خاکہ میں اِنسان کا اصل وجود جو کچھ بننا چاہیئے تھا بن چکتا ہے لیکن وہ ابھی اُس لحم سے خالی ہوتا ہے جو انسان کے لئے بطور ایک موٹے اور شاندار اور چمکیلے لباس کے ہے جس سے اِنسان کے تمام خط و خال ظاہر ہوتے ہیں اور بدن پر تازگی آتی ہے اور خوبصورتی نمایاں ہو جاتی ہے اور تناسب اعضاء پیدا ہوتا ہے۔ پھر بعد اس کے پانچواں درجہ وہ ہے کہ جب اس خاکہ پر لحم یعنی موٹا گوشت برعایت مواضع مناسبہ چڑھایا جاتا ہے یہ وہی گوشت ہے کہ جب اِنسان تپ وغیرہ سے بیمار رہتا ہے تو فاقہ اور بیماری کی تکلیفِ شاقہ سے وہ گوشت تحلیل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اِنسان ایسی لاغری کی حالت پر پہنچ جاتا ہے جو وہی پانچویں درجہ کا خاکہ یعنی مُشتِ استخوان رہ جاتا ہے جیسے مدقوقوں اور مسلولوں اور اصحابِ ذیابیطس میں مرض کے انتہائی درجہ میں یہ صُورت ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر کسی کی حیات مقدّر ہوتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ اُس کے بدن پر گوشت چڑھاتا ہے۔ غرض یہ وہی گوشت ہے جس سے خوبصُورتی اور تناسب اعضا اور رونقِ بدن پیدا ہوتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ گوشت خاکہ کے طیار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ جنین پر چڑھتا رہتا ہے اور جب جنین ایک کافی حِصّہ اس کا لے لیتا ہے تب باذنہٖ تعالیٰ اُس میں جان پڑ جاتی ہے تب وہ نباتی حالت سے جو صرف نشوونما ہے منتقل ہو کر حیوانی حالت کی خاصیّت پیدا کر لیتا ہے اور پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ غرض یہ ثابت شدہ بات ہے کہ بچہ اپنی نباتی صُورت سے حیوانی صُورت کو کامل طور پر اُس وقت قبول کرتا ہے کہ جبکہ عام طور پر موٹا گوشت اُس کے بدن پر مناسب کمی بیشی کے ساتھ چڑھ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جس کو آج تک اِنسان کے مسلسل تجارب اور مشاہدات نے ثابت کیا ہے۔ یہ وہی تمام صُورت ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور مشاہدات کے ذریعہ سے بتواتر ثابت ہے۔ پھر اس پر اعتراض کرنا اگر نادانوں کا کام نہیں تو اَور کس کا ہے۔

اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف رجوع کرکے لکھتے ہیں کہ چونکہ عالَمِ صغیر میں جو انسان ہے سُنّت اللہ یہی ثابت ہوئی ہے کہ اس کے وجود کی تکمیل چھ۶ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے تو اسی قانونِ قدرت کی رہبری سے ہمیں معقولی طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دُنیا کی ابتدا میں جو اللہ جلّ شانہٗ نے عالَمِ کبیر کو پیدا کیا تو اس کی طرزِ پیدائش میں بھی یہی مراتبِ ستّہ ملحوظ رکھے ہوں گے اور ہر یک مرتبہ کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دن یا ایک وقت سے مخصوص کیا ہوگا جیسا کہ اِنسان کی پیدائش کے مراتبِ ستّہ چھ۶ وقتوں سے خاص ہیں اور دُنیا کی تمام قوموں کا سات دنوں پر اتفاق ہونا اور ایک دن تعطیل کا نکال کر چھ۶ دنوں کو کاموں کے لئے خاص کرنا اِسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چھ دن اُن چھ دنوں کی یادگار چلے آتے ہیں کہ جن میں زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے بنایا گیا تھا۔

اور اگر کوئی اب بھی تسلیم نہ کرے اور انکار سے باز نہ آوے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو عالمِ کبیر کے لئے عالمِ صغیر کی پیدائش کے مراتبِ ستّہ کا ثبوت دے دیا اور جو کام کرنے کے دن بالاتفاق ہر یک قوم میں مسلّم ہیں اُن کا چھ ہونا بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے تمام پیدائشی کام اِس دُنیا میں تدریجی ہیں تو پھر اگر منکر کی نظر میں یہ دلیل کافی نہیں تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ بھی تو اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے یہ عالمِ جسمانی صرف ایک دَم میں پیدا کر دیا تھا تدریجی طور پر پیدا نہیں کیا تھا۔ ہر یک شخص جانتا ہے کہ وہی خدا اَب بھی ہے جو پہلے تھا اور وہی خالقیّت کا سِلسلہ اب بھی جاری ہے جو پہلے جاری تھا اور صاف بدیہی طور پر نظر آ رہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر یک مخلوق کو تدریجی طور پر اپنے کمال وجود تک پہنچاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے وہ قوی تھا اور جلد کام کر لیتا تھا اور اَب ضعیف ہے اور دیر سے کرتا ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ اس کا قانونِ قدرت ہی ابتدا سے یہی ہے کہ وہ ہر یک مخلوق کو بتدریج پیدا کرتا ہے۔ سو حال کے افعالِ الٰہی ہمیں بتلا رہے ہیں کہ گذشتہ اور ابتدائی زمانہ میں بھی یہی تدریج ملحوظ تھی جو اَب ہے۔ ہم سخت نادان ہوں گے اگر ہم حال کے آئینہ میں گذشتہ کی صُورت نہ دیکھ لیں اور حال کی طرزِ خالقیت پر نظر ڈال کر صرف اتنا ہی ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ اپنی پیدائش کے سِلسلہ کو تدریج سے کمال وجود تک پہنچاتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر یک مخلوق کی پیدائش میں چھ ہی مرتبے رکھے ہیں اور حکمتِ الٰہی نے ہر یک مخلوق کی پیدائش میں یہی تقاضا کیا کہ اس کے پیدا ہونے کے چھ مرتبے ہوں جو چھ وقتوں میں انجام پذیر ہوں کسی مخلوق پر نظر ڈال کر دیکھ لو یہی چھ مراتب اُس میں متحقق ہوں گے یعنی بنظرِ تحقیق یہ ثابت ہوگا کہ ہر یک جسمانی مخلوق کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور انسان پر کچھ موقوف نہیں۔ زمین پر جو ہزارہا حیوانات ہیں اُنکے وجود کی تکمیل بھی انہیں مراتبِ ستّہ پر موقوف پاؤ گے۔

پھر ایک اَور عجیب بات یہ ہے کہ یہ سِلسلہ مراتبِ ستّہ تکوین کا صرف جسمانی مخلوق میں ہی محدود نہیں بلکہ روحانی امور میں بھی اِس کا وجود پایا جاتا ہے مثلاً تھوڑے سے غور سے معلوم ہوگا کہ انسان کی رُوحانی پیدائش کے مراتب بھی چھ ہی ہیں پہلے وہ نطفہ کی صُورت پر صرف حق کے قبول کرنے کی ایک استعدادِ بعیدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور پھر جب اُس استعداد کے ساتھ ایک قطرۂ رحمتِ الٰہی مل جاتا ہے اُسی طرز کے موافق کہ جب عورت کے نطفہ میں مرد کا نطفہ پڑتا ہے تو تب اِنسان کی باطنی حالت نطفہ کی صُورت سے علقہ کی صُورت میں آجاتی ہے اور کچھ رشتہ باری تعالیٰ سے پیدا ہونے لگتا ہے جیسا کہ علقہ کے لفظ سے تعلق کا لفظ مفہوم ہوتا ہے اور پھر وہ علقہ اعمالِ صالحہ کے خون کی مدد سے مضغہ بنتا ہے اُسی طرز سے کہ جیسے خُونِ حیض کی مدد سے علقہ مضغہ بن جاتا ہے اور مضغہ کی طرح ابھی اس کے اعضا ناتمام ہوتے ہیں جیسا کہ مضغہ میں ہڈی والے عضو ابھی ناپدید ہوتے ہیں ایسا ہی اس میں بھی شدّت للّٰہ اور

ثبات للہ اور استقامت للہ کے عضو ابھی کما حقہٗ پیدا نہیں ہوتے گو تواضع اور نرمی موجود ہوجاتی ہے اور اگرچہ پُوری شدّت اور صلابت اس مرتبہ میں پیدا نہیں ہوتی مگر مضغہ کی طرح کسی قدر قضاو قدر کی مضغ کے لائق ہو جاتا ہے یعنی کسی قدر اِس لائق ہوجاتا ہے کہ قضاو قدر کا دانت اس پر چلے اور وہ اس کے نیچے ٹھہر سکے کیونکہ علقہ جو ایک سیّال رطوبت کے قریب قریب ہے وہ تو اِس لائق ہی نہیں کہ دانتوں کے نیچے پیسا جاوے اور ٹھہرا رہے لیکن مضغہ مضغ کے لائق ہے اِس لئے اس کا نام مضغہ ہے سو مضغہ ہونے کی وہ حالت ہے کہ جب کچھ چاشنی محبّتِ الٰہی کی دِل میں پڑجاتی ہے اور تجلّی جلالی توجہ فرماتی ہے کہ بلاؤں کے ساتھ اُس کی آزمائش کرے تب وہ مضغہ کی طرح قضا و قدر کے دانتوں میں پیسا جاتا ہے اور خُوب قیمہ کیا جاتا ہے۔ غرض تیسرا درجہ سالک کے وجود کا مضغہ ہونیکی حالت ہے اور پھر چوتھا درجہ وہ ہے کہ جب اِنسان استقامت اور بلاؤں کی برداشت کی برکت سے آزمائے جانے کے بعد نقوشِ انسانی کا پُورے طور پر انعام پاتا ہے یعنی رُوحانی طور پر اُس کے لئے ایک صُورت انسانی عطا ہوتی ہے اور انسان کی طرح اس کو دُو آنکھیں دُو کان اور دِل اور دماغ اور تمام ضروری قویٰ اور اعضا عطا کئے جاتے ہیں اور بمقتضائے آیت اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ[1] سختی اور نرمی مواضع مناسبہ میں ظاہر ہوجاتی ہے یعنی ہر ایک خلق اُس کا اپنے اپنے محل پر صادر ہوتا ہے اور آدابِ طریقت تمام محفوظ ہوتے ہیں اور ہر یک کام اور کلام حفظ حدود کے لحاظ سے بجا لاتا ہے یعنی نرمی کی جگہ پر نرمی اور سختی کی جگہ پر سختی اور تواضع کی جگہ پر تواضع اور ترفع کی جگہ پر ترفع۔ ایسا ہی تمام قویٰ سے اپنے اپنے محل پر کام لیتا ہے۔ یہ درجہ جنین کے اُس درجہ سے مشابہت رکھتا ہے کہ جب وہ مضغہ کی حالت سے ترقی کرکے اِنسان کی صُورت کا ایک پُورا خاکہ حاصل کرلیتا ہے اور ہڈی کی جگہ پر ہڈی نمودار ہوجاتی ہے اور گوشت کی جگہ پر گوشت باقی رہتا ہے ہڈی نہیں بنتی اور تمام اعضا میں باہم تمیز کُلّی پیدا ہوجاتی ہے لیکن ابھی خوبصورتی اور تازگی اور تناسب اعضا نہیں ہوتا صرف خاکہ ہوتا ہے جو نظرِ دقیق سے دکھائی دیتا ہے پھر بعد اس کے عنایتِ الٰہی توفیقاتِ متواترہ سے موفّق کرکے اور تزکیہ نفس کے کمال تک پہنچا کر اور فنا فی اللہ کے انتہائی نقطہ تک کھینچ کر اُس کے خاکہ کے بدن پر انواع اقسام کی برکات کا گوشت بھر دیتی ہے اور اس گوشت سے اس کی شکل کو چمکیلی اور اس کی تمام ہیکل کو آبدار کر دیتی ہے تب اس کے چہرہ پر کاملیّت کا نُور برستا ہے اور اس کے بدن پر کمالِ تام کی آب و تاب نظر آتی ہے اور یہ درجہ پیدائش کا جسمانی پیدائش کے اُس درجہ سے مشابہ ہوتا ہے کہ جب جنین کے خاکہ کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور خوبصورتی اور تناسب اعضا ظاہر کیا جاتا ہے پھر بعد اس کے رُوحانی پیدائش کا چھٹا درجہ ہے جو مصداق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[2] کا ہی وہ مرتبہ بقا ہے جو فنا کے بعد ملتا ہے جس میں رُوح القدس کامل

---

[1] الفتح : ۳۰ ٭ [2] المؤمنون : ۱۵ ٭

طور پر عطا کیا جاتا ہے اور ایک رُوحانی زندگی کی رُوح اِنسان کے اندر پھُونک دی جاتی ہے ایسا ہی یہ چھ مراتب خدا تعالیٰ کی پاک کلام میں بھی جمع ہیں۔اوّل حروف کا مرتبہ جو حامل کلامِ الٰہی اور کلمات کتاب اللہ کے لئے بطور تخم کے ہیں جن کو معانی مقصودہ سے کچھ بھی حِصّہ نہیں ہاں ان کے حصول کے لئے ایک استعداد بعیدہ رکھتے ہیں دوم کلمات کا مرتبہ جو اس تخم کے ذریعہ سے ظہور خارجی کے رنگ میں آئے جن کو معانی مقصودہ سے کچھ حِصّہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں۔سوم ان فقراتِ ناتمام کا مرتبہ جو ابھی کلامِ مقصودہ کے پُورے درجہ تک نہیں پہنچے تھے کیونکہ ہنوز تنزیل کا سلسلہ ناتمام تھا اور خدا تعالیٰ کے کلام نے ابھی اپنا کامل چہرہ نہیں دکھلایا تھا مگر ان فقرات کو معانی مقصودہ سے ایک وافر حِصّہ تھا اِس لئے وہ کلام تام الٰہی کے لئے بطور بعض اعضا کے ٹھہرے جن کا نام بلحاظ قِلت وکثرت آیتیں اور سُورتیں رکھا گیا۔چہارم اس کلام جامع تام مفصّل ممیّز کا مرتبہ جو سب نازل ہوچکا اور جمیع مضامین مقصودہ اور علوم حکمیہ وقصص واخبار واحکام وقوانین و ضوابط وحدود ومواعید وانذارات وتبشیرات اور درشتی اور نرمی اور شدّت اور رحم اور حقائق ونکات پر بالاستیفا مشتمل ہے۔پنجم بلاغت وفصاحت کا مرتبہ جو زینت اور آرائش کے لئے اُس کلام پر ازل سے چڑھائی گئی۔ششم برکت اور تاثیر اور کشش کی رُوح کا مرتبہ جو اِس پاک کلام میں موجود ہے جس نے تمام کلام پر اپنی روشنی ڈالی اور اس کو زندہ اور منوّر کلام ثابت کیا۔

اسی طرح ہر یک عاقل اور فصیح منشی کے کلام میں یہی چھ مراتب جمع ہوسکتے ہیں گو وہ کلام اعجازی حد تک نہیں پہنچتا کیونکہ جن حروف میں کوئی کلام لکھا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی یا ہندی پہلے ان کا وجود ضروری ہے۔سو یہ تو پہلا مرتبہ ہوا جو مضامینِ مقصودہ کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ بعیدہ ہے مگر ان سے کچھ حصّہ نہیں رکھتا۔پھر بعد اس کے دوسرا مرتبہ کلمات کا ہے جو حروفِ قرارداده سے پیدا ہوں گے جن کو معانی ومضامینِ مقصودہ سے ابھی کچھ حِصّہ نہیں مگر اُن کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں۔پھر اس کے بعد تیسرا مرتبہ فقرات کا ہے جو ابھی معانی مقصودہ کے پُورے جامع تو نہیں مگر اُن میں سے کچھ حِصّہ رکھتے ہیں اور اُس مضمون کے لئے جو منشی کے ذہن میں ہے بطور بعض اعضا کے ہیں۔پھر چوتھا مرتبہ کلام جامع تام کا ہے جو منشی کے دِل میں سے نکل کر بہ تمام وکمال کاغذ پر اندراج پاگیا ہے اور تمام معانی اور مضامین مقصودہ کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔پھر پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ اُن سادہ فقرات اور عبارتوں پر بلاغت اور فصاحت کا رنگ چڑھایا جائے اور خوش بیانی کے نمک سے ملیح کیا جائے۔پھر چھٹا مرتبہ جو بلاتوقف اُس مرتبہ کے تابع ہے یہ ہے کہ کلام میں اثر اندازی کی ایک جان پیدا ہو جائے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیوے اور طبیعتوں میں گھر کر لیوے۔ اب غور کرکے دیکھ لو کہ یہ مراتب ستّہ بکلّی ان مراتبِ ستّہ کی مانند اور انکی مثیل ہیں جن کا قرآن کریم میں نطفہ

علقہ مضغہ اور کچھ مضغہ اور کچھ عظام یعنی انسان کی شکل کا خاکہ اور انسان کی پوری شکل اور جاندار انسان نام رکھا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱۶۲-۲۱۱ حاشیہ در حاشیہ طبع اول)

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی اوّل اُس نے اِس دُنیا کے تمام اجرامِ سماوی اور ارضی کو پیدا کیا اور چھ دن میں سب کو بنایا (چھ دن سے مراد ایک بڑا زمانہ ہے) اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی تنزہ کے مقام کو اختیار کیا۔ یاد رہے کہ استوا کے لفظ کا جب علیٰ صلہ آتا ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ایک چیز کا اس مکان پر قرار پکڑنا جو اس کے مناسبِ حال ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ بھی آیت ہے وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ[1] یعنی نوح کی کشتی نے طوفانوں کے بعد ایسی جگہ پر قرار پکڑا جو اس کے مناسبِ حال تھا یعنی اس جگہ زمین پر اُترنے کے لئے بہت آسانی تھی سو اِس لحاظ سے خدا تعالیٰ کے لئے استوا کا لفظ اختیار کیا یعنی خدا نے ایسی وراء الوراء جگہ پر قرار پکڑا جو اس کی تنزہ اور تقدّس کے مناسبِ حال تھی چونکہ تنزہ اور تقدّس کا مقام ماسوی اللہ کے فنا کو چاہتا ہے سو یہ اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے خدا بعض اوقات اپنی خالقیت کے اسم کے تقاضا سے مخلوقات کو پیدا کرتا ہے پھر دوسری مرتبہ اپنی تنزہ اور وحدتِ ذاتی کے تقاضا سے اُن سب کا نقشِ ہستی مٹا دیتا ہے۔ غرض عرش پر قرار پکڑنا مقامِ تنزہ کی طرف اشارہ ہے تا ایسا نہ ہو کہ خدا اور مخلوق کو باہم مخلوط سمجھا جائے۔ پس کہاں سے معلوم ہُوا کہ خدا عرش پر یعنی اس وراء الوراء مقام پر مقیّد کی طرح ہے اور محدود ہے۔ قرآن شریف میں تو جا بجا بیان فرمایا گیا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

(چشمہ معرفت ص۱۱۰-۱۱۱ طبع اوّل)

قرآن شریف اسی وجہ سے ہر ایک دھوکہ دہی کی بات سے محفوظ ہے کہ اس نے خدا تعالیٰ کے ایسے طور سے صفات بیان کئے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ شرک کی آلائش سے بکلّی پاک رہتی ہے کیونکہ اوّل اُس نے خدا تعالیٰ کے وہ صفات بیان کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کیونکر وہ انسان سے قریب ہے اور کیونکر اُسکے اخلاق سے انسان حصہ لیتا ہے ان صفات کا نام تو تشبیہی صفات ہیں۔ پھر چونکہ تشبیہی صفات سے یہ اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو محدود خیال نہ کیا جائے یا مخلوق چیزوں سے مشابہ خیال نہ کیا جائے اِس لئے ان اوہام کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنی ایک دوسری صفت بیان کر دی یعنی عرش پر قرار پکڑنے کی صفت جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا سب مصنوعات سے برتر و اعلیٰ مقام پر ہے کوئی چیز اُس کی شبیہ اور شریک نہیں اور اس طرح پر خدا تعالیٰ کی توحید کامل طور پر ثابت ہو گئی۔ (چشمہ معرفت ص۱۱۳ طبع اوّل)

---

[1] ہود : ۴۵

ﷺ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

یہ مسلّم اور مشہود امر ہے کہ جب ہیبتِ الٰہی اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو اُس وقت فاسق انسان کی اَور صورت ہوتی ہے اور جب ہیبت کا وقت نکل جاتا ہے تو پھر اپنی شقاوتِ فطرتی سے اصلی صورت کی طرف عود کر آتا ہے۔ ایسے لوگ بہتیرے تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب اُن پر کوئی مقدمہ دائر ہو جس سے سخت قید یا پھانسی یا سزاء موت کا خطرہ ہو گو یہ بھی گمان ہو کہ شاید رہا ہو جائیں تو وہ ایسی ہیبت کو مشاہدہ کرکے اپنی فاسقانہ چال چلن کو بدلا لیتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے اور لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں اور پھر جب اُن کی اس تضرع کی حالت پر خدا تعالیٰ رحم کرکے اُن کو اس بلا سے خلاصی دیتا ہے تو فی الفور اُن کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ یہ رہائی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اتفاقی امر ہے تب وہ اپنے فسق میں پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں اور چند روز میں ہی اپنی پہلی عادات کی طرف رجوع کر آتے ہیں۔ اِس کی اَور بھی مثالیں ہیں مگر اِس جگہ کلامِ الٰہی کافی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1] یعنی جب انسان کو کوئی دُکھ پہنچتا ہے تو ہماری جناب میں دعائیں کرنے لگتا ہے کروٹ کی حالت میں اور بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر اور جب ہم اُس دُکھ کو اُس سے دفع کر دیتے ہیں تو ایسا چلا جاتا ہے کہ گویا نہ کبھی اُس کو دُکھ پہنچا اور نہ کبھی دُعا کی۔

(انوار الاسلام صفحہ ۴۱-۴۲ طبع اوّل)

ﷺ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ○

قرآن شریف کی رُو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے اِسی

[1] یونس: ۱۳

کی طرف اِن آیتوں میں اشارہ ہے کہ ایک جگہ یہود کے حق میں لکھا ہے فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ[1] دوسری جگہ مسلمان کے حق میں لکھا ہے لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ اِن دونوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ خدا تمہیں خلافت و حکومت عطا کر کے پھر دیکھے گا کہ تم راستبازی پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ اِن آیتوں میں جو الفاظ یہود کے لئے استعمال کئے ہیں وہی مسلمانوں کے لئے یعنی ایک ہی آیت کے نیچے اِن دونوں کو رکھا ہے پس اِن آیتوں سے بڑھ کر اِس بات کے لئے اَور کونسا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دے دیا ہے اور صاف اشارہ کر دیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء ان کے اِس اُمّت کے علماء بھی انہیں بدیوں کے مرتکب ہوں گے اور اسی مفہوم کی طرف آیت غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں بھی اشارہ ہے کیونکہ اِس آیت میں باتفاق کُل مفسّرین مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ یہود ہیں جن پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے انکار کی وجہ سے غضب نازل ہُوا تھا اور احادیثِ صحیحہ میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مُراد وہ یہود ہیں جو موردِ غضبِ الٰہی دُنیا میں ہی ہوئے تھے اور قرآن شریف یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہود کو مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ٹھیرانے کے لئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان پر لعنت جاری ہوئی تھی پس یقینی اور قطعی طور پر مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ یہود ہیں جنہوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو سُولی پر ہلاک کرنا چاہا تھا۔ اَب خدا تعالیٰ کا یہ دعا سکھلانا کہ خدایا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف بتلا رہا ہے کہ اُمّتِ محمدیہ میں بھی ایک عیسٰی پیدا ہونے والا ہے ورنہ اِس دعا کی کیا ضرورت تھی۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۰-۱۱)

قرآن شریف کے رُو سے کئی انسانوں کا بروزی طور پر آنا مقدّر تھا.... یہودیوں کے بادشاہوں کے ان مثیلوں کا جو اِسلام میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان دو بالمقابل آیتوں سے جن کے الفاظ باہم ملتے ہیں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں :-

یہودیوں کے بادشاہوں کی نسبت	اِسلام کے بادشاہوں کی نسبت
قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝	ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝
الجزو نمبر ۹ سُورۃ الاعراف[1] صفحہ ۲۶۵	الجزو نمبر ۱۱ سُورۃ یُونس صفحہ ۳۳۵

یہ دو فقرے یعنی فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ جو یہودیوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے اور اس کے مقابل پر دوسرا فقرہ یعنی لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ جو مسلمانوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے صاف بتلا رہے ہیں کہ ان دونوں

[1] الاعراف : ۱۳۰

قوموں کے بادشاہوں کے واقعات بھی باہم متشابہ ہوں گے سو ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اور جس طرح یہودی بادشاہوں سے قابلِ شرم خانہ جنگیاں ظہور میں آئیں اور اکثر کے چال چلن بھی خراب ہوگئے یہاں تک کہ بعض اُن میں سے بدکاری شراب نوشی خوں ریزی اور سخت بے رحمی میں ضرب المثل ہوگئے یہی طریق اکثر مسلمانوں کے بادشاہوں نے اختیار کئے۔ ہاں بعض یہودیوں کے نیک اور عادل بادشاہوں کی طرح نیک اور عادل بادشاہ بھی بنے جیساکہ عمر بن عبدالعزیز۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۴-۱۲۵ طبع اوّل)

(بروز کے متعلق سائل کے جواب میں فرمایا) جیسے شیشہ میں اِنسان کی شکل نظر آتی ہے حالانکہ وہ شکل بذاتِ خود الگ قائم ہوتی ہے اس کا نام بروز ہے .... یہ آیتیں بھی اُس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک ان میں سے اہلِ اسلام کی نسبت ہے اور ایک یہود کی نسبت۔ پس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں ہر طرح کا انعام کروں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کس طرح شکر کرتے ہو۔

اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اہلِ یہود کو کونسی بڑی مصیبت تھی تو وہ دو بڑی مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ عیسیٰ علیہ السّلام کا انکار کیا گیا اور ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا۔ پس مماثلت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بھی وہی دو انکار لکھے تھے مگر وہاں شمار میں الگ الگ دو وجود تھے اور یہاں نام الگ الگ ہیں مگر وہ وجود جس میں ان دونوں کا بروز ہوا ایک ہی ہے۔ ایک بروز عیسوی اور ایک محمدی۔ اور صرف نام کے لحاظ سے اہلِ اسلام یہود کے بروز اسی طرح قرار پائے کہ انہوں نے مسیح اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا اور وہ مماثلت پُوری ہوگئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اُمت میں بروزی طور پر وہی کرتوت یہودیوں والی پُوری ہونی تھی اور یہ اِس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ آنے والا دو رنگ لے کر آوے گا (اِسی لئے مہدی اور مسیح کے زمانہ کی علامات ایک ہی ہیں اور ان دونوں کا فعل بھی ایک ہی)۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۸-۲۵۹)

۱۶ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

جب مکّہ کے بعض نادانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن کی توحید ہمیں پسند نہیں آتی کوئی ایسا قرآن لاؤ جس میں بُتوں کی تعظیم اور پرستش کا ذکر ہو یا اسی میں کچھ تبدّل تغیّر کر کے بجائے توحید کے شرک بھر دو تب ہم قبول کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے تو خدا نے اُن کے سوال کا جواب اپنے نبی کو وہ تعلیم کیا جو آنحضرتؐ کے واقعاتِ عُمری پر نظر کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے:۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا الخ الآیہ۔ وہ لوگ جو ہماری ملاقات سے نا امید ہیں یعنی ہماری طرف سے بکلّی علاقہ توڑ چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اِس قرآن کے برخلاف کوئی اَور قرآن لا جس کی تعلیم اِس کی تعلیم سے مغائر اور منافی ہو یا اسی میں تبدیل کر۔ ان کو جواب دے کہ مجھے یہ قدرت نہیں اور نہ روا ہے کہ مَیں خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کچھ تبدیل کروں مَیں تو صرف اُس وحی کا تابع ہوں جو میرے پر نازل ہوتی ہے اور اپنے خداوند کی نافرمانی سے ڈرتا ہوں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۸۱ تا ۴۸۳ طبع اوّل)

۷- قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

اگر خدا چاہتا تو مَیں تم کو یہ کلام نہ سُناتا اور خدا تم کو اس پر مطلع بھی نہ کرتا۔ پہلے اس سے اِتنی عمر یعنی چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں پھر کیا تم کو عقل نہیں یعنی کیا تم کو بخوبی معلوم نہیں کہ افترا کرنا میرا کام نہیں اور جھوٹ بولنا میری عادت نہیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۸۳ طبع اوّل)

اور مَیں ایک عمر تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں کیا تم کو عقل نہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۱۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

انبیاء وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی کامل راست بازی کی قوی حجّت پیش کر کے اپنے دشمنوں کو بھی الزام دیا جیسا کہ یہ الزام قرآن شریف میں ہے۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود ہے جہاں فرمایا ہے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (سورہ یُونس الجزو ۱۱) یعنی مَیں ایسا نہیں کہ جھوٹ بولوں اور افترا کروں۔ دیکھو مَیں چالیس برس اِس سے پہلے تم میں ہی رہتا رہا ہوں کیا کبھی تم نے میرا کوئی جھوٹ یا افترا ثابت کیا۔ پھر کیا تم کو اِتنی سمجھ نہیں یعنی یہ سمجھ کہ جس نے کبھی آج تک کسی قِسم کا جھوٹ نہیں بولا وہ اب خدا پر کیوں جھوٹ بولنے لگا۔ غرض انبیا کے واقعاتِ عمری اور ان کی سلامت روشی ایسی بدیہی اور ثابت ہے کہ اگر سب باتوں کو چھوڑ کر اُن کے واقعات کو ہی دیکھا جائے تو اُن کی صداقت اُن کے واقعات سے ہی روشن

ہو رہی ہے۔ مثلاً اگر کوئی منصف اور عاقل ان تمام براہین اور دلائل صدقِ نبوّت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے ۔۔۔۔ قطع نظر کرکے محض ان کے حالات پر ہی غور کرے تو بلاشبہ انہیں حالات پر غور کرنے سے اُن کے نبی صادق ہونے پر دِل سے یقین کرے گا اور کیونکر یقین نہ کرے وہ واقعات ہی ایسے کمال سچائی اور صفائی سے معطّر ہیں کہ حق کے طالبوں کے دِل بلا اختیار اُن کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیئے کہ کس استقلال سے آنحضرتؐ اپنے دعویٰ نبوّت پر باوجود پیدا ہو جانے ہزاروں خطرات اور کھڑے ہو جانے لاکھوں معاندوں اور مزاحموں اور ڈرانے والوں کے اوّل سے اخیر دَم تک ثابت اور قائم رہے۔ برسوں تک وہ مصیبتیں دیکھیں اور وہ دُکھ اُٹھانے پڑے جو کامیابی سے بکلّی مایوس کرتے تھے اور روز بروز بڑھتے جاتے تھے کہ جن پر صبر کرنے سے کسی دُنیوی مقصد کا حاصل ہو جانا وہم بھی نہیں گزرتا تھا بلکہ نبوّت کا دعویٰ کرنے سے ازدست اپنی پہلی جمعیّت کو بھی کھو بیٹھے اور ایک بات کہہ کر لاکھ تفرقہ خرید لیا اور ہزاروں بلاؤں کو اپنے سَر پر بُلا لیا۔ وطن سے نکالے گئے۔ قتل کے لئے تعاقب کئے گئے۔ گھر اور اسباب تباہ اور برباد ہو گیا۔ بارہا زہر دی گئی اور جو خیر خواہ تھے وہ بدخواہ بن گئے اور جو دوست تھے وہ دُشمنی کرنے لگے اور ایک زمانہ دراز تک وہ تلخیاں اُٹھانی پڑیں کہ جن پر ثابت قدمی سے ٹھہرے رہنا کسی فریبی اور مکّار کا کام نہیں اور پھر جب مدّت مدید کے بعد غلبہ اسلام کا ہوُا تو ان دولت اور اقبال کے دِنوں میں کوئی خزانہ اکٹھا نہ کیا۔ کوئی عمارت نہ بنائی۔ کوئی بارگاہ طیّار نہ ہوئی۔ کوئی سامان شاہانہ عیش وعشرت کا تجویز نہ کیا گیا۔ کوئی اور ذاتی نفع نہ اُٹھایا بلکہ جو کچھ آیا وہ سب یتیموں اور مسکینوں اور بیوہ عورتوں اور مقروضوں کی خبر گیری میں خرچ ہوتا رہا اور کبھی ایک وقت بھی سیر ہو کر نہ کھایا اور پھر صاف گوئی اِس قدر کہ توحید کا وعظ کرکے سب قوموں اور سارے فرقوں اور تمام جہان کے لوگوں کو جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے مخالف بنا لیا۔ جو اپنے اور خویش تھے ان کو بُت پرستی سے منع کرکے سب سے پہلے دشمن بنایا۔ یہودیوں سے بھی بات بگاڑلی کیونکہ ان کو طرح طرح کی مخلوق پرستی اور پیر پرستی اور بداعمالیوں سے روکا۔ حضرت مسیح کی تکذیب اور توہین سے منع کیا جس سے اُن کا نہایت دِل جل گیا اور سخت عداوت پر آمادہ ہو گئے اور ہردَم قتل کر دینے کی گھات میں رہنے لگے۔ اِسی طرح عیسائیوں کو بھی خفا کر دیا گیا کیونکہ جیسا کہ ان کا اعتقاد تھا حضرت عیسیٰؑ کو نہ خدا نہ خدا کا بیٹا قرار دیا اور نہ ان کو پھانسی مل کر دوسروں کو بچانے والا تسلیم کیا۔ آتش پرست اور ستارہ پرست بھی ناراض ہو گئے کیونکہ ان کو بھی اُن کے دیوتوں کی پرستش سے ممانعت کی گئی اور مدارِ نجات کا صرف توحید ٹھہرائی گئی۔ اب جائے اِنصاف ہے کہ کیا دُنیا حاصل کرنے کی یہی تدبیر تھی کہ ہر ایک فرقہ کو ایسی ایسی صاف اور دِل آزار باتیں سُنائی گئیں کہ جس سے سب نے مخالفت پر کمر باندھ لی اور سب کے دِل ٹوٹ گئے اور قبل اِس کے کہ اپنی کچھ ذرّہ

بھی جمعیت بنی ہوتی یا کسی کا حملہ روکنے کے لئے کچھ طاقت بہم پہنچ جاتی سب کی طبیعت کو ایسا اشتعال دے دیا کہ جس سے وہ خون کرنے کے پیاسے ہو گئے۔ زمانہ سازی کی تدبیر تو یہ تھی کہ جیسا بعضوں کو جھوٹا کہا تھا ویسا ہی بعضوں کو سچا بھی کہا جاتا تا اگر بعض مخالف ہوتے تو بعض موافق بھی رہتے۔ بلکہ اگر عربوں کو کہا جاتا کہ تمہارے ہی لات و عزّیٰ سچے ہیں تو وہ تو اُسی دم قدموں پر گر پڑتے اور جو چاہتے اُن سے کراتے کیونکہ وہ سب خویش اور اقارب اور جمعیت قومی میں بے مثل تھے اور ساری بات مانی منائی تھی صرف تعلیم بُت پرستی سے خوش ہو جاتے اور بدل و جان اطاعت اختیار کرتے لیکن سوچنا چاہیئے کہ آنحضرتؐ کا یک لخت ہر ایک خویش و بیگانہ سے بگاڑ لینا اور صرف توحید کو جو اُن دنوں میں اُس سے زیادہ دُنیا کے لئے کوئی نفرتی چیز نہ تھی اور جس کے باعث سے صدہا مشکلیں پڑتی جاتی تھیں بلکہ جان سے مارے جانا نظر آتا تھا مضبوط پکڑ لینا یہ کس مصلحتِ دُنیوی کا تقاضا تھا اور جب کہ پہلے اُسی کے باعث سے اپنی تمام دُنیا اور جمعیت برباد کر چکے تھے تو پھر اُس بلا انگیز اعتقاد پر اصرار کرنے سے کہ جس کو ظاہر کرتے ہی نو مسلمانوں کو قید اور زنجیر اور سخت سخت ماریں نصیب ہوئیں کس مقصد کا حاصل کرنا مُراد تھا۔ کیا دُنیا کمانے کے لئے یہی ڈھنگ تھا کہ ہر ایک کو کلمۂ تلخ جو اس کی طبع اور عادت اور مرضی اور اعتقاد کے برخلاف تھا سُنا کر سب کو ایک دم کے دم میں جانی دشمن بنا دیا اور کسی ایک آدھ قوم سے بھی پیوند نہ رکھا۔ جو لوگ طامع اور مکار ہوتے ہیں کیا وہ ایسی ہی تدبیریں کیا کرتے ہیں کہ جس سے دوست بھی دشمن ہو جائیں۔ جو لوگ کسی مکر سے دُنیا کو کمانا چاہتے ہیں کیا ان کا یہی اصول ہوا کرتا ہے کہ بیک بارگی ساری دُنیا کو عداوت کرنے کا جوش دلادیں اور اپنی جان کو ہر وقت کی فکر میں ڈال لیں۔ وہ تو اپنا مطلب سادھنے کے لئے سب سے صلحکاری اختیار کرتے ہیں اور ہر ایک فرقہ کو سچائی کا ہی سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ خدا کے لئے یک رنگ ہو جانا ان کی عادت کہاں ہوا کرتی ہے۔ خدا کی وحدانیّت اور عظمت کا کب وہ کچھ دھیان رکھا کرتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض کیا ہوتی ہے کہ ناحق خدا کے لئے دُکھ اٹھاتے پھریں۔ وہ تو صیّاد کی طرح وہیں دام بچھاتے ہیں کہ جو شکار مارنے کا بہت آسان راستہ ہوتا ہے اور وہی طریق اختیار کرتے ہیں کہ جس میں محنت کم اور فائدہ دُنیا کا بہت زیادہ ہو۔ نفاق ان کا پیشہ اور خوشامد ان کی سیرت ہوتی ہے۔ سب سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور ہر ایک چور اور ساہد سے برابر رابطہ رکھنا ان کا ایک خاص اصول ہوتا ہے مسلمانوں سے اللہ اللہ اور ہندوؤں سے رام رام کہنے کو ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور ہر ایک مجلس میں ہاں سے ہاں اور نہیں سے نہیں ملاتے رہتے ہیں اور اگر کوئی میر مجلس دن کو رات کہے تو چاند اور گیتیاں دکھلانے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اُن کو خدا سے کیا تعلق اور اُس کے ساتھ وفاداری کرنے سے کیا واسطہ اور اپنی خوش باش جان کو مفت میں اِدھر اُدھر کا غم لگا لینا انہیں کیا ضرورت۔ استاد نے ان کو سبق ہی ایک پڑھایا ہوا ہوتا

ہے کہ ہر ایک کو یہی بات کہنا چاہئیے کہ جو تیرا راستہ ہے وہی سیدھا ہے اور جو تیری رائے ہے وہی درست ہے اور جو تُو نے سمجھا ہے وہی ٹھیک ہے۔ غرض ان کی راست اور ناراست اور حق اور باطل اور نیک اور بد پر کچھ نظر ہی نہیں ہوتی بلکہ جس کے ہاتھ سے اُن کا کچھ مُنہ میٹھا ہو جائے وہی ان کے حساب میں بھگت اور بندھ اور جنٹلمین ہوتا ہے اور جس کی تعریف سے کچھ پیٹ کا دوزخ بھرتا نظر آوے اُسی کو مُکتی پانے والا اور سُرگ کا وارث اور حیاتِ ابدی کا مالک بنا دیتے ہیں لیکن واقعات حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر کرنے سے یہ بات نہایت واضح اور نمایاں اور روشن ہے کہ آنحضرت اعلیٰ درجہ کے یک رنگ اور صاف باطن اور خدا کے لئے جان باز اور خلقت کے بیم و امید سے بالکل مُنہ پھیرنے والے اور محض خدا پر توکّل کرنے والے تھے کہ جنہوں نے خدا کی خواہش اور مرضی میں محو اور فنا ہو کر اِس بات کی کچھ بھی پروا نہ کی کہ توحید کی منادی کرنے سے کیا کیا بلا میرے سر پر آوے گی اور مشرکوں کے ہاتھ سے کیا کچھ دُکھ اور درد اُٹھانا ہوگا بلکہ تمام شدتوں اور سختیوں اور مشکلوں کو اپنے نفس پر گوارا کر کے اپنے مولیٰ کا حکم بجا لائے اور جو جو شرط مجاہدہ اور وعظ اور نصیحت کی ہوتی ہے وہ سب پوری کی اور کسی ڈرانے والے کو کچھ حقیقت نہ سمجھا۔ ہم سچ سچ کہتے ہیں کہ تمام نبیوں کے واقعات میں ایسے مواضعاتِ خطرات اور پھر کوئی ایسا خدا پر توکّل کر کے کھلا کھلے شرک اور مخلوق پرستی سے منع کرنے والا اور اس قدر دشمن اور پھر کوئی ایسا ثابت قدم اور استقلال کرنے والا ایک بھی ثابت نہیں۔ پس ذرہ ایمانداری سے سوچنا چاہئیے کہ یہ سب حالات کیسے آنحضرتؐ کے اندرونی صداقت پر دلالت کر رہے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ دوم صفحہ ۱۱۶-۱۲۰ طبع اوّل)

دوسری خوبی جو شرط کے طور پر مامورین کے لئے ضروری ہے وہ نیک چال چلن ہے کیونکہ بدچال چلن سے بھی دِلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور یہ خوبی بھی بدیہی طور پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی ان کفار کو کہہ دے کہ اس سے پہلے مَیں نے ایک عمر تم میں ہی بسر کی ہے پس کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مَیں کس درجہ کا امین اور راستباز ہوں۔ اب دیکھو کہ یہ دونوں صفتیں جو مرتبہ نبوّت اور ماموریّت کے لئے ضروری ہیں یعنی بزرگ خاندان میں سے ہونا اور اپنی ذات میں امین اور راست باز اور خدا ترس اور نیک چلن ہونا قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کمال درجہ پر ثابت کی ہیں اور آپ کی اعلیٰ چال چلن اور اعلیٰ خاندان پر خود گواہی دی ہے اور اِس جگہ مَیں اِس شکر کے ادا کرنے سے رہ نہیں سکتا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں اپنی وحی کے ذریعہ سے کفّار کو ملزم کیا اور فرمایا کہ یہ میرا نبی اس اعلیٰ درجہ کا نیک چال چلن رکھتا ہے کہ تمہیں طاقت نہیں کہ اس کی گذشتہ چالیس برس کی زندگی میں کوئی عیب اور نقص نکال سکو باوجود اس کے کہ وہ چالیس برس

تک دن رات تمہارے درمیان ہی رہا ہے اور نہ تمہیں یہ طاقت ہے کہ اس کے اعلیٰ خاندان میں جو شرافت اور طہارت اور ریاست اور امارت کا خاندان ہے ایک ذرّہ عیب گیری کر سکو۔ پھر تم سوچو کہ جو شخص ایسے اعلیٰ اور اطہر النفس خاندان میں سے ہے اور اس کی چالیس برس کی زندگی جو تمہارے رُوبرو گذری گواہی دے رہی ہے جو افترا اور دروغ بافی اس کا کام نہیں ہے تو پھر ان خوبیوں کے ساتھ جبکہ آسمانی نشان وہ دکھلا رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی تائیدیں اس کے شاملِ حال ہو رہی ہیں اور تعلیم وہ لایا ہے جس کے مقابل پر تمہارے عقائد سراسر گندے اور ناپاک اور شرک سے بھرے ہوئے ہیں تو پھر اس کے بعد تمہیں اس نبی کے صادق ہونے میں کونسا شک باقی ہے۔ اسی طور سے خدا تعالیٰ نے میرے مخالفین اور مکذبین کو ملزم کیا ہے چنانچہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۲ میں میری نسبت یہ الہام ہے جس کے شائع کرنے پر بیس برس گذر گئے اور وہ یہ ہے وَلَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی ان مخالفین کو کہہ دے کہ مَیں چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں اور اس مدت دراز تک تم مجھے دیکھتے رہے ہو کہ میرا کام افترا اور دروغ نہیں ہے اور خدا نے ناپاکی کی زندگی سے مجھے محفوظ رکھا ہے تو پھر جو شخص اس قدر مدت دراز تک یعنی چالیس برس تک ہر ایک افترا اور شرارت اور مکر اور خباثت سے محفوظ رہا اور کبھی اس نے خلقت پر جھوٹ نہ بولا تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ برخلاف اپنی عادت قدیم کے اب وہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے لگا۔ (تریاق القلوب صفحہ ۶۸ طبع اوّل)

یونس ۱۸

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ۝

اُس شخص سے زیادہ تر اَور کون ظالم ہوگا جو خدا پر افترا باندھے یا خدا کے کلام کو کہے کہ یہ انسان کا افترا ہے بلاشبہ مجرم نجات نہیں پائیں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۸۳ طبع اوّل)

یقیناً یاد رکھو کہ انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے .... اُس کے لئے امن اور عافیت کی یہی سبیل ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ صاف ہو اور وہ اس کا سچّا اور مخلص بندہ بنے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صدق کو اختیار کرے جسمانی نظام کی کل بھی صدق ہی ہے جو شخص صدق کو چھوڑتے ہیں اور خیانت کر کے جرائم کو پناہ میں لانے والی سپر کذب کو خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ آنی اور عارضی طور پر شاید کوئی فائدہ انسان سمجھ لے لیکن فی الحقیقت کذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھوٹ کے لئے پھر اُسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں کیونکہ اس جھوٹ کو سچائی کا رنگ دینا

ہوتا ہے پس اسی طرح اندر ہی اندر اس کے اخلاق اور روحانی قوٰی زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اُسے یہاں تک جُرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افترا کر لیتا اور خدا کے مرسلوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اظلم ٹھیرتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے من اظلم ممّن افترٰی علی اللّٰہ کذبًا او کذّب بایٰتہٖ[1] یعنی اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا باندھے یا اُس کی آیات کی تکذیب کرے۔ یقیناً یاد رکھو کہ یہ جھوٹ بہت ہی بُری بَلا ہے انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اس سے بڑھ کر جھوٹ کا خطرناک نتیجہ کیا ہوگا کہ انسان خدا تعالیٰ کے مرسلوں اور اس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پس صدق اختیار کرو... جس قدر انسان صدق کو اختیار کرتا ہے اور صدق سے محبت کرتا ہے اسی قدر اس کے دل میں خدا کے کلام اور نبیوں کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۲۱ وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان تائیدِ دین کا نازل نہ ہوا۔ سو ان کو کہہ کہ علمِ غیب خدا کا خاصّہ ہے پس تم نشان کے منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۰ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

۲۲ هُوَ ٱلَّذِى يُسَيِّرُكُمْ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا كُنتُمْ فِى ٱلْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا۟ بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَآءَهُمُ ٱلْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِۦ لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلشَّٰكِرِينَ ۝

---

[1] الانعام: ۲۲

جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتی کے سواروں کو ایک خوش ہوا کے ساتھ لے کر کشتیاں چلتی ہیں اور وہ ان کشتیوں کے چلنے سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ یک دفعہ ایک تند ہوا چلنی شروع ہوتی ہے اور ہر طرف سے ان پر موج آتی ہے اور ظن غالب یہ ہو جاتا ہے کہ بس اب ہم گھیرے گئے یعنی مارے گئے تب اس وقت اخلاص سے خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کہ اے خدائے قادر اگر اب ہمیں نجات دے تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

(انوار الاسلام صـ۴۲ طبع اوّل)

اِن آیات کا حاصل مطلب یہی ہے کہ جب بعض گنہ گاروں کو ہلاک کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اپنے قہری ارادہ سے اُس دریا میں صورت طوفان پیدا کرتا ہے جس میں ان لوگوں کی کشتی ہو تو پھر اُن کی تضرّع اور رجوع پر اُن کو بچا لیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ پھر وہ مفسدانہ حرکات میں مشغول ہوں گے۔

(انوار الاسلام (اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ بمرتبہ چہارم صـ۱۲ طبع اوّل)

۲۴ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر جب خدا تعالیٰ ان کو نجات دے دیتا ہے تو پھر اسی ظلم اور فساد کی طرف رجوع کرتے ہیں جس پر پہلے جمع ہوئے تھے۔ (انوار الاسلام صـ۴۲ طبع اوّل)

۲۵ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ

تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝

اس زندگی دنیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے اس پانی کی مثال ہے جس کو ہم آسمان سے اتارتے ہیں پھر زمین کی روئیدگی اس سے مل جاتی ہے پھر وہ روئیدگی بڑھتی اور پھولتی ہے اور آخر کاٹی جاتی ہے یعنی کھیتی کی طرح انسان پیدا ہوتا ہے اور کمال کی طرف رُخ کرتا ہے پھر اس کا زوال ہوتا جاتا ہے۔ کیا اس قانون قدرت سے کبھی باہر رکھا گیا ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۱۱ طبع اوّل)

۲۷ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى یعنی ان نیکیوں کو بھی سنوار کر کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

۲۸ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ ۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝

بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے اور ان کو ذلت پہنچے گی یعنی اسی قسم کی ذلت اور اسی مقدار کی ذلت جس کے پہنچانے کا انہوں نے ارادہ کیا ان کو پہنچ جائے گی۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۱۰۳)

۳۷ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۝

جو شخص محض ظن کو نتیجہ بار تا ہے وہ مقام بلند حق سے بہت نیچے گرا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا یعنی محض ظن حق الیقین کے مقابلہ پر کچھ چیز نہیں ہے۔
(ریویو بر مباحثہ بٹالوی وچکڑالوی صـ۳ مشمولہ اعجاز احمدی)

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۞

اور کافر کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ کہ یہ وعدہ کب پورا ہو گا۔ کہہ مجھے تو اپنے نفس کے نفع و ضرر کا بھی اختیار نہیں مگر جو خدا چاہے وہی ہوتا ہے۔ ہر یک گروہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت مقررہ ان کا پہنچتا ہے تو پھر نہ اس سے ایک ساعت پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ ایک ساعت آگے ہو سکتے ہیں۔
(براہین احمدیہ حصہ سوم صـ۲۲۸ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

کافر کہتے ہیں کہ وہ نشان کب ظاہر ہوں گے اور یہ وعدہ کب پورا ہو گا سو ان کو کہہ دے کہ مجھے ان باتوں میں دخل نہیں، نہ میں اپنے نفس کے لئے ضرر کا مالک ہوں نہ نفع کا مگر جو خدا چاہے۔ ہر یک گروہ کیلئے ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صـ۳۳۳ طبع اوّل)

خدا چاہتا ہے کہ نیکوں کو بچائے اور بدوں کو ہلاک کرے اگر وقت اور تاریخ بتلائی جائے تو ہر ایک شریر سے شریر اپنے واسطے بچاؤ کا سامان کر سکتا ہے۔ اگر وقت کے نہ بتلانے سے پیشگوئی قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے تو پھر تو قرآن شریف کی پیشگوئیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی اس قسم کے لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یہ وعدہ کب پورا ہو گا ہمیں وقت اور تاریخ بتلاؤ۔ مگر بات یہ ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں تعین نہیں ہوتا ورنہ کافر بھی بھاگ کر بچ جائے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ جون ۱۹۰۵ء صـ۲)

جب اجل کی بلا آجاتی ہے تو پھر آگے پیچھے نہیں ہوا کرتی۔ انسان کو چاہیئے کہ پہلے ہی سے خدا کے ساتھ تعلق رکھے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صـ۳)

موت جب آتی ہے تو ناگہانی طور پر آجاتی ہے۔ انسان کہیں اَور تدبیروں اور دھندوں میں پھنسا

ہوا ہوتا ہے کہ یہ کام اس طرح ہو جاوے۔ یہ ایسے ہو جاوے اور اوپر سے موت آجاتی ہے اور پھر لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ والا معاملہ ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

جب عذاب الٰہی نازل ہو جاتا ہے تو اس کا ٹلنا محال ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنا کام کر کے ہی جاتا ہے اور اس آیت سے یہ بھی استنباط ہوتا ہے کہ قبل از نزول عذاب توبہ و استغفار سے وہ عذاب ٹل بھی جایا کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڤ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ ۵۴

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ بات ہے کہہ ہاں مجھے قسم ہے اپنے رب کی کہ یہ سچ ہے اور تم خدائے تعالیٰ کو اس کے وعدوں سے روک نہیں سکتے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸ طبع اوّل)

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہہ ہاں مجھے اپنے ربّ کی قسم ہے کہ یہ سچ ہے اور تم اس بات کو وقوع میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ (آسمانی فیصلہ صفحہ ۴۰)

یہ امر بالکل غلط ہے کہ اسلام میں قسم کھانا منع ہے۔ تمام نیک انسان مسلمانوں میں سے ضرورتوں کے وقت قسم کھاتے آئے ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ضرورتوں کے وقت قسم کھائی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بارہا قسمیں کھائیں۔ خود خدا تعالیٰ نے قرآن میں قسمیں کھائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مجرموں کو قسمیں دلائی گئیں۔ قسموں کا قرآن شریف میں صریح ذکر ہے۔ شریعت اسلام میں جب کسی اور ثبوت کا دروازہ بند ہو یا پیچیدہ ہو تو قسم پر مدار رکھا جاتا ہے اور صحیح البخاری[۱] جو بعد کتاب اللہ اصح الکتب ہے اس میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے قسم کھا کر فرمایا کہ مسیح موعود جو آنے والا ہے جو تمہارا امام ہوگا وہ تم میں سے ہی ہوگا یعنی اسی امت میں سے ہوگا آسمان سے نہیں آئے گا۔ پھر صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قسموں کا ایک باب باندھا ہے۔ اس باب میں بہت سی قسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہیں جو دس سے کم نہیں۔ ایسا ہی صحیح نسائی جلد ثانی صفحہ ۱۳۸ کتاب الایمان والنذور میں صفحہ ۱۳۹ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قسموں کا ذکر ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حق ہے۔ کہہ مجھے خدا کی قسم ہے کہ یہ حق

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسٰی ابن مریم علیہما السلام۔

ہے۔ ایسا ہی قرآن شریف میں یہ آیت ہے وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ[1] یعنی جب تم قسم کھاؤ تو جھوٹ اور بد عہدی اور بدنیتی سے اپنی قسم کو بچاؤ۔ ایسا ہی قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ[2] یعنی شخص ملزم چار قسمیں خدا کی کھائے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں قسم میں یہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۶۹-۷۰ حاشیہ)

اور تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہہ ہاں مجھے اپنے رب کی قسم ہے کہ یہ سچ ہے اور تم اس بات کو ظہور میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ (مکتوبات احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۱۱۶)

یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حق ہے۔ کہہ مجھے خدا کی قسم ہے کہ یہ حق ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

۵۸ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

قرآن میں دلوں کو روشن کرنے کے لئے ایک روحانی خاصیت بھی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ یعنی قرآن اپنی خاصیت سے تمام بیماریوں کو دور کرتا ہے اس لئے اس کو منقولی کتاب نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کے معقول دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور ایک چمکتا ہوا نور اس میں پایا جاتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۹۵)

یہ قرآن ظلمت سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور اس میں تمام بیماریوں کی شفاء ہے اور طرح طرح کی برکتیں یعنی معارف اور انسانوں کو فائدہ پہنچانے والے امور اس میں بھرے ہوئے ہیں۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۱۷ طبع اوّل)

۵۹ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝

---

[1] المائدۃ: ۹۰ ٭ [2] نور: ۷، ۸ ٭

خیر کثیر سے مراد اسلام ہے جیسا کہ اللہ جل شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ
(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱۸۶ طبع اوّل)

ان کو کہہ دے کہ خدائے تعالیٰ کے فضل و رحمت سے یہ قرآن ایک بیش قیمت مال ہے سو اس کو تم خوشی سے قبول کرو۔ یہ اُن مالوں سے اچھا ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم اور حکمت کی مانند کوئی مال نہیں۔ یہ وہی مال ہے جس کی نسبت پیشگوئی کے طور پر لکھا تھا کہ مسیح دنیا میں آکر اِس مال کو اِس قدر تقسیم کرے گا کہ لوگ لیتے لیتے تھک جائیں گے۔ یہ نہیں کہ مسیح درم و دینار کو جو مصداق آیت اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ[1] ہے جمع کرے گا اور دانستہ ہر یک کو مال کثیر دے کر فتنہ میں ڈال دے گا۔ مسیح کی پہلی فطرت کو بھی ایسے مال سے مناسبت نہیں۔ وہ خود انجیل میں بیان کر چکا ہے کہ مومن کا مال درم و دینار نہیں بلکہ جواہر حقائق و معارف اس کا مال ہیں۔ یہی مال انبیاء خدائے تعالیٰ سے پاتے ہیں اور اِسی کو تقسیم کرتے ہیں۔ اسی مال کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّ اللّٰہُ ھُوَ الْمُعْطِیْ۔
(ازالہ اوہام حصہ دوم ص۶۵۶-۶۵۷ طبع اوّل)

۶۳ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

خبردار ہو تحقیق وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے دوست ہیں اُن پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
(جنگِ مقدس ص۵۳ روئداد ۲۶ مئی ۱۸۹۳ء)

جو لوگ خدا کے ہو رہتے ہیں اُن کو کسی کا خوف باقی نہیں رہتا اور وہ غم نہیں کرتے۔
(ست بچن ص۸۹ طبع اوّل)

خبردار رہو۔ بتحقیق جو لوگ مقربانِ الٰہی ہوتے ہیں اُن پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ کچھ غم کرتے ہیں۔
(براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۱۹-۵۲۰ حاشیہ در حاشیہ ۳ طبع اوّل)

جو اللہ کے ولی ہیں اُن کو کوئی غم نہیں جس کا خدا متکفل ہو اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ کوئی مقابلہ کرنیوالا ضرر نہیں دے سکتا اگر خدا ولی ہو جاوے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص۳۶ طبع اوّل)

خدا تعالیٰ نے ان کو اپنا ولی کہا ہے حالانکہ وہ بے نیاز ہے اس کو کسی کی حاجت نہیں اِس لئے استثنا ایک شرط کے ساتھ ہے وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ[2] یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ ذلّت کی وجہ سے کسی کو ولی نہیں بناتا بلکہ محض اپنے فضل اور عنایت سے اپنا مقرب بنا لیتا ہے اس کو کسی کی کوئی حاجت نہیں ہے اس

[1] التغابن : ۱۶ [2] بنی اسرائیل : ۱۱۲

ولایت اور قرب کا فائدہ بھی اسی کو پہنچتا ہے.... یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا اجتبا اور اصطفا فطرتی جوہر سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے گذشتہ زندگی میں وہ کوئی صغائر یا کبائر رکھتا ہو لیکن جب اللہ تعالیٰ سے اس کا سچا تعلق ہو جاوے تو وہ کل خطائیں بخش دیتا ہے اور پھر اس کو کبھی شرمندہ نہیں کرتا نہ اس دُنیا میں اور نہ آخرۃ میں۔ یہ کس قدر احسان اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ درگذر کرتا اور عفو فرماتا ہے پھر اس کا کبھی ذکر ہی نہیں کرتا اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے پھر باوجود ایسے احسانوں اور فضلوں کے بھی اگر وہ منافقانہ زندگی بسر کرے تو پھر سخت بدقسمتی اور شامت ہے۔

برکات اور فیوض الٰہی کے حصول کے واسطے دل کی صفائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے۔ جب تک دل صاف نہ ہو کچھ نہیں چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ دل پر نظر ڈالے تو اسکے کسی حصہ یا کسی گوشہ میں کوئی شعبہ نفاق کا نہ ہو۔ جب یہ حالت ہو تو پھر الٰہی نظر کے ساتھ تجلیات آتی ہیں اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ایسا وفادار اور صادق ہونا چاہیئے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنا صدق دکھایا یا جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ دکھایا جب انسان اس نمونہ پر قدم مارتا ہے تو وہ بابرکت آدمی ہو جاتا ہے پھر دنیا کی زندگی میں کوئی ذلت نہیں اٹھاتا اور نہ تنگی رزق کی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس پر خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو لعنتی زندگی سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے مختصر یہ کہ جو خدا تعالیٰ سے سچا اور کامل تعلق رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ساری مرادیں پوری کر دیتا ہے اسے نامراد نہیں رکھتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

ولی کیا ہوتے ہیں یہی صفات تو اولیا کے ہوتے ہیں۔ اُن کی آنکھ۔ ہاتھ۔ پاؤں غرض کوئی عضو ہو منشاء الٰہی کے خلاف حرکت نہیں کرتے۔ خدا کی عظمت کا بوجھ ان پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زیارت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔ پس تم بھی کوشش کرو۔ خدا بخیل نہیں ؎

ہر کہ عارف تر است ترساں تر

(الحکم جلد ۸ نمبر ۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

خبردار ہو یعنی یقیناً سمجھ کہ جو لوگ اللہ (جلّ شانہٗ) کے دوست ہیں یعنی جو لوگ خدائے تعالیٰ سے سچی محبت رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے تو ان کی یہ نشانیاں ہیں کہ نہ ان پر خوف مستولی ہوتا ہے کہ کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا فلاں بلا سے کیونکر نجات ہو گی کیونکہ وہ تسلّی دئے جاتے ہیں اور نہ گذشتہ کے متعلق کوئی حزن و اندوہ انہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ صبر دئے جاتے ہیں۔ دوسری یہ نشانی ہے کہ وہ ایمان

رکھتے ہیں یعنی ایمان میں کامل ہوتے ہیں اور تقوی اختیار کرتے ہیں یعنی خلاف ایمان و خلاف فرماں برداری جو باتیں ہیں اُن سے بہت دُور رہتے ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات ص ۴۶ حاشیہ طبع اوّل)

۶۴،۶۵ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ؁ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؀

وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے یعنی اللہ رسول کے تابع ہوگئے اور پھر پرہیزگاری اختیار کی۔ان کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے اِس دُنیا کی زندگی اور نیز آخرت میں بُشریٰ ہے یعنی خدا تعالیٰ خواب اور الہام کے ذریعہ سے اور نیز مکاشفات سے اُن کو بشارتیں دیتا رہے گا۔خدا تعالیٰ کے وعدوں میں تخلّف نہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے جو ان کے لئے مقرر ہو گئی یعنی اس کامیابی کے ذریعہ سے اُن میں اور غیروں میں فرق ہو جائے گا اور جو سچے نجات یافتہ نہیں ان کے مقابل میں دم نہیں مار سکیں گے۔

(جنگِ مقدس ص ۵ روئیداد ۲۶ رمئی ۱۸۹۳ء)

ان کو اسی زندگی میں بشارتیں ملیں گی یعنی وہ خدا سے نورِ الہام کا پائیں گے اور بشارتیں سُنیں گے جن میں اُن کی بہتری اور مدح اور ثنا ہوگی اور خدا ان کی سچائیوں کو روشن کرے گا۔خدا نے جو جو وعدہ کیا ہے وہ سب پورا ہوگا اور کسی نوع کی تبدیل واقع نہیں ہوگی۔یہی سعادتِ عظمٰی ہے کہ جو ان لوگوں کو ملتی ہے کہ جو محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص ۲۴۰-۲۴۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

مسلمانوں کو سچی خوابیں کثرت سے آتی ہیں جیسا ان کی نسبت خدا تعالیٰ نے آپ وعدہ دے رکھا ہے اور فرمایا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لیکن کفّار اور منکرینِ اسلام کو اس کثرت سے سچی خوابیں ہرگز نصیب نہیں ہوتیں بلکہ ان کا ہزارم حصہ بھی نصیب نہیں ہوتا چنانچہ اس کا ثبوت ہماری ان ہزارہا سچی خوابوں کے ثبوت سے ہو سکتا ہے جن کو ہم نے قبل از وقوع صدہا مسلمانوں اور ہندوؤں کو بتلا دیا ہے اور جن کے مقابلہ سے غیر قوموں کا عاجز ہونا ہم ابتدا سے دعویٰ کر رہے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم ص ۲۵۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱ طبع اوّل)

یہ مومنوں کا ایک خاصہ ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے ان کی خوابیں سچی نکلتی ہیں۔(آئینہ کمالات اسلام ص ۲۹۳ طبع اوّل)

چونکہ خدائے تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ایک نہایت دقیق در دقیق راہ ہے اور اس کے ساتھ طرح طرح کے مصائب اور دُکھ لگے ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ انسان اس نادیدہ راہ میں بھول جاوے یا نا امیدی طاری ہو اور آگے قدم بڑھانا چھوڑ دے اس لئے خدا تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ اپنی طرف سے اس سفر میں ساتھ ساتھ اس کو تسلّی دیتی رہے اور اس کی دل دہی کرتی رہے اور اس کی کمرِ ہمت کو باندھتی رہے اور اس کے شوق کو زیادہ کرے سو اس کی سُنّت اس راہ کے مسافروں کے ساتھ اس طرح پر واقع ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے کلام اور الہام سے اُن کو تسلّی دیتا اور ان پر ظاہر کرتا ہے کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔ تب وہ قوّت پا کر بڑے زور سے اس سفر کو طے کرتے ہیں چنانچہ اس بارے میں وہ فرماتا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۸۷-۱۸۸)

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ یعنی خدا کے دوستوں کو الہام اور خدا کے مکالمہ کے ذریعہ سے اس دنیا میں خوشخبری ملتی ہے اور آئندہ زندگی میں بھی ملے گی۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۹۵)

یعنی دنیا کی زندگی میں مومنین کو یہ نعمت ملے گی کہ اکثر سچی خوابیں انہیں آیا کریں گی یا سچے الہام ان کو ہُوا کریں گے۔ (ضرورت الامام صفحہ ۷ طبع اوّل)

اگر بعض جاہل اور نادان جو نام کے مسلمان ہیں یہ عقیدہ رکھیں کہ اسلام میں بھی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ کا سلسلہ بند ہے تو یہ ان کی اپنی جہالت ہے کیونکہ قرآن شریف مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ کے سلسلہ کو بند نہیں کرتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے .... لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی مومنوں کے لئے مبشّر الہام باقی رہ گئے ہیں گو شریعت ختم ہوگئی ہے۔ کیونکہ عمرِ دنیا ختم ہونے کو ہے۔ پس خدا کا کلام بشارتوں کے رنگ میں قیامت تک باقی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۸ حاشیہ طبع اوّل)

یعنی ایماندار لوگ دنیوی زندگی اور آخرت میں بھی تبشیر کے نشان پاتے رہیں گے جن کے ذریعے سے وہ دُنیا اور آخرت میں معرفت اور محبت کے میدانوں میں ناپیدا کنار ترقیاں کرتے جائیں گے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو کبھی نہیں ٹلیں گی اور تبشیر کے نشانوں کو پا لینا یہی فوزِ عظیم ہے (یعنی یہی ایک امر ہے جو محبت اور معرفت کے منتہی مقام تک پہنچا دیتا ہے)۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۱ طبع اوّل)

تیسری ان (اللہ اور رسول کے تابع لوگوں) کی یہ نشانی ہے کہ انہیں (بذریعہ مکالمہ الٰہیہ و رویائے صالحہ) بشارتیں ملتی رہتی ہیں اِس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خدائے تعالیٰ کا ان کی نسبت یہ عہد ہے جو ٹل نہیں سکتا اور یہی پیارا درجہ ہے جو انہیں ملا ہُوا ہے یعنی مکالمہ الٰہیہ اور رویائے صالحہ سے

خدائے تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو جو اس کے ولی ہیں ضرور حصّہ ملتا ہے اور ان کی ولایت کا بھاری نشان یہی ہے کہ مکالمات و مخاطبات الٰہیہ سے مشرف ہوں (یہی قانون قدرت اللہ جلّ شانہٗ کا ہے)

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۴۶-۴۷ حاشیہ)

جو متقی ہوتے ہیں اُن کو اس دنیا میں بشارتیں سچّے خوابوں کے ذریعہ ملتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ صاحبِ مکاشفات و الہامات ہو جاتے ہیں۔ مکالمۃ اللہ کا شرف حاصل کرتے ہیں وہ بشریت کے لباس میں ہی ملائکہ کو دیکھ لیتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶ طبع اوّل)

لاہور میں ایک مولوی عبدالحکیم صاحب سے مباحثہ ہوا تھا تو ہم نے اس کو یہی پیش کیا کہ تم خدا تعالیٰ کے مکالمات سے کیوں ناراض ہوتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تو مُحدَّث تھے تو اس نے صاف طور پر انکار کیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرضی طور پر کہا تھا حضرت عمرؓ بھی مُحدَّث نہ تھے۔ یہ محال ہے کہ آئندہ کسی کو الہام ہو۔ ان کو اس پر بالکل ایمان نہیں ہے۔ وہ مکالمات کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کئے بیٹھے ہیں اور خدا تعالیٰ کو انہوں نے گونگا خدا مان لیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن شریف میں جو یہ آیا ہے لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اس کا اُن کے نزدیک کیا مطلب ہے اور جب ملائکہ ایسے مومنوں پر نازل ہوتے ہیں اور ان کو بشارتیں دیتے ہیں تو وہ بشارتیں کس کی طرف سے دیتے ہیں۔ اس اعتقاد سے پھر قرآن شریف کا اُن کو انکار کرنا پڑے گا کیونکہ سارا قرآن شریف اس بات سے بھرا پڑا ہے کہ خدا تعالیٰ کے مکالمہ کا شرف عطا ہوتا ہے اگر یہ شرف ہی کسی کو نہیں ملتا تو پھر قرآن شریف کی تاثیرات کا ثبوت کہاں سے ہوگا؟ اگر آفتاب دھندلا اور تاریک ہے تو اس کی روشنی پر کوئی کیا فرق کر سکے گا اور کیا یہ کہہ کر فخر کرے گا کہ اس میں روشنی نہیں بلکہ تاریکی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ان کے واسطے اِسی دنیوی زندگی میں بشارتیں نازل ہوتی ہیں اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں کہ وہی ہمارا رب ہے اور پھر اس ایمان پر استقامت دکھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر فرشتے نازل کرتا ہے جو ان کو تسلّی دیتے ہیں کہ تم کو کوئی غم اور حزن نہیں پہنچے گا خدا تعالیٰ کی شناخت کے واسطے یہ ایک بڑا طریق ہے کہ نشانات کا مشاہدہ کرایا جاوے۔ جب ایک سلسلہ نشانات اور کرامات کو مدت دراز گذر جاتی ہے تو لوگ دہریہ مزاج ہو جاتے ہیں اور بیہودہ باتیں بناتے ہیں۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

اگر قرآن کے خطابات صحابہ تک ہی محدود ہوتے تو صحابہ کے فوت ہو جانے کے ساتھ قرآن باطل ہو جاتا اور آیت متنازعہ فیہا جو خلافت کے متعلق ہے درحقیقت اس آیت سے مشابہ ہے۔ لَھُمُ الْبُشْرٰی

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کیا یہ بشریٰ صحابہ سے ہی خاص تھا یا کسی اور کو بھی اس سے حصہ ہے۔

(شہادۃ القرآن صہ ۳۹ طبع اوّل)

ان کے واسطے اسی دنیوی زندگی میں بشارتیں نازل ہوتی ہیں۔ (کلمہ طیبہ صہ ۲۵)

یہ مومنوں کا ایک خاصہ ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے اُن کی خوابیں سچی نکلتی ہیں۔

(مکتوبات جلد ۴ عدد ۲ صہ ۲۹ (مکتوب بنام مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی)

جو لوگ قرآن شریف پر ایمان لائیں گے ان کو مبشر خوابیں اور الہام دیئے جائیں گے یعنی بکثرت دیئے جائیں گے ورنہ شاذونادر کے طور پر کسی دوسرے کو بھی کوئی سچی خواب آسکتی ہے مگر ایک قطرہ کو ایک دریا کے ساتھ کچھ نسبت نہیں اور ایک پیسہ کو ایک خزانہ کے ساتھ کچھ مشابہت نہیں... چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم سے خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوتا چلا آتا ہے اور اس زمانہ میں ہم خود اس کے شاہد رویت ہیں۔

(لیکچر چشمہ معرفت صہ ۴۰-۴۱)

ایمانداروں کو خدا کی طرف سے بشارتیں ملتی رہتی ہیں۔ ایسا ہی وہ بھی اپنی ذات کے متعلق کئی قسم کی بشارتیں پاتا رہتا ہے اور جیسے جیسے بذریعہ ان بشارتوں کے اس کا ایمان قوی ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ گناہ سے پرہیز کرتا اور نیکیوں کی طرف حرکت کرتا ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت صہ ۵۹)

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ

کوئی نہیں جو خدا کی باتوں کو ٹال سکے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صہ ۱۱۶ طبع اوّل)

۶۹ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے حالانکہ بیٹے کا محتاج ہونا ایک نقصان ہے اور خدا ہر ایک نقصان سے پاک ہے۔ وہ تو غنی اور بے نیاز ہے جس کو کسی کی حاجت نہیں جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اُسی کا ہے کیا تم خدا پر ایسا بہتان لگاتے ہو جس کی تائید میں تمہارے پاس کسی نوع کا علم نہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صہ ۴۳۴ حاشیہ درحاشیہ ۳ طبع اوّل)

۹۱ وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝

یاد رکھو جو امن کی حالت میں ڈرتا ہے وہ خوف کی حالت میں بچایا جاتا ہے اور جو خوف کی حالت میں ڈرتا ہے تو وہ کوئی خوبی کی بات نہیں۔ ایسے موقع پر تو کافر مشرک بیدین بھی ڈرا کرتے ہیں۔ فرعون نے بھی ایسے موقع پر ڈر کر کہا تھا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۹۱ اِس سے صرف اتنا فائدہ اُسے ہوُا کہ خدا نے فرمایا کہ تیرا بدن تو ہم بچا لیں گے مگر تیری جان کو اب نہیں بچائیں گے آخر خدا نے اس کے بدن کو ایک کنارے پر لگا دیا۔ ایک چھوٹے سے قد کا وہ آدمی تھا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

دیکھو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پہلے نرم نرم عذاب آئے کہ حشرات الارض نکل آئے۔ خون پھیل گیا۔ قحط پڑ گیا۔ بھلا فرعون قحط کو کیا جانتا تھا۔ وہ تماشا سمجھتا ہوگا کیونکہ قحط کا اثر تو غریبوں پر پڑتا ہے مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن بطش شدید کا آنے والا ہے جب اس کے منہ سے بے اختیار نکلے گا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ ابتدائی منذرات سے ڈرو گے تو نجات پاؤ گے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

۹۹ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۝

فَالْحَاصِلُ اَنَّ قِصَّةَ یُوْنُسَ فِیْ کَلَامِ اللّٰہِ الْقَدِیْرِ۔ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّهٗ قَدْ یُؤَخَّرُ

(ترجمہ از مرتب) پس خلاصہ یہ ہے کہ خدائے قادر کے کلام میں یونس علیہ السلام کا قصہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی

عَذَابُ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ شَرْطٍ يُوْجِبُ حُكْمَ التَّاخِيْرِ كَمَا اُخِّرَ فِیْ نَبَاِ يُوْنُسَ بَعْدَ التَّشْهِيْرِ۔

(انجام آتھم ص۲۲۶ طبع اوّل)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○

ہمیں خدا تعالیٰ نے قرآن میں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ دین اسلام میں اکراہ اور جبر نہیں.... جیسا کہ فرماتا ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ۔

(میموریل ۲۴ مئی ۱۸۹۸ء ص۲ بحوالہ روحانی خزائن جلد ۱۳ ص۳۱۹)

اللہ تعالیٰ کا عذاب کسی ایسی شرط کے بغیر بھی تاخیر کے حکم کا موجب بن سکے تاخیر میں ڈال دیا جاتا ہے جیسا کہ یونس علیہ السلام کی پیشگوئی میں عذاب الٰہی کو باوجود تشہیر کے ٹال دیا گیا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ـــــ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تفسیر سورۃ ہود

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

۲ الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ۝

الف سے مراد اللہ اور لؔ سے مراد جبرائیل اور راء سے مراد رسل ہیں چونکہ اس میں یہی قصہ ہے کہ کونسی چیزیں انسانوں کو ضروری ہیں اس لئے فرمایا کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ۔ الآیۃ۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اُس کی آیات پکی اور استوار ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیموں کو اللہ تعالیٰ نے کئی طرح پر مستحکم کیا تا کہ کسی قسم کا شک نہ رہے اور اسی لئے شروع میں ہی فرمایا لَا رَیْبَ فِیْہِ[1] یہ استحکام کئی طور پر کیا گیا ہے۔

اوّلاً قانون قدرت سے استواری اور استحکام قرآنی تعلیموں کا قانونِ قدرت سے کیا گیا۔ جو کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے قانون قدرت اُس کو پوری مدد دیتا ہے۔ گویا جو قرآن میں ہے وہی کتاب مکنون میں ہے۔ اس کا راز انبیاء علیہم السلام کی پیروی کے بدُوں سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور یہی وہ سرّ ہے جو لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[2] میں رکھا گیا ہے۔ غرض پہلے قرآنی تعلیم کو قانونِ قدرت سے مستحکم کیا ہے مثلاً قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفت وحدہٗ لاشریک بتلائی۔ جب ہم قانونِ قدرت میں نظر کرتے ہیں تو ماننا

---

[1] البقرۃ آیت ۳۔ [2] الواقعۃ آیت ۸۰۔

پڑتا ہے کہ ضرور ایک ہی خالق و مالک ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ دل بھی اُسے ہی مانتا ہے اور دلائل قدرت سے بھی اسی کا پتہ لگتا ہے کیونکہ ہر ایک چیز جو دُنیا میں موجود ہے وہ اپنے اندر کُرویت رکھتی ہے جیسے پانی کا قطرہ اگر ہاتھ سے چھوڑیں تو وہ کُروی شکل کا ہوگا اور کُروی شکل توحید کو مستلزم ہے اور یہی وجہ ہے کہ پادریوں کو بھی ماننا پڑا کہ جہاں تثلیث کی تعلیم نہیں پہنچی وہاں کے رہنے والوں سے توحید کی پرسش ہوگی چنانچہ پادری فنڈر نے اپنی تصنیفات میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم دُنیا میں نہ بھی ہوتا تب بھی ایک ہی خدا کی پرستش ہوتی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ قرآن کریم کا بیان صحیح ہے کیونکہ اس کا نقش انسانی فطرت اور دل میں موجود ہے اور دلائل قدرت سے اس کی شہادت ملتی ہے برخلاف اس کے انجیلی تثلیث کا نقش نہ دل میں ہے نہ قانون قدرت اس کا مؤیّد ہے۔

یہی معنے ہیں کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ الآیہ کے یعنی قانونِ قدرت سے اُس کی تعلیموں کو ایسا احکام اور استوار کیا گیا ہے کہ مشرک وعیسائی کو بھی ماننا پڑا کہ انسان کے مادۂ فطرت سے توحید کی بازپُرس ہوگی۔

دوسری وجہ استحکام کی خدا تعالیٰ کے نشانات ہیں۔کوئی نبی۔کوئی مامور دُنیا میں ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ تائیدات الٰہی شامل نہ ہوں اور یہ تائیدات اور نشانات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت پُرشوکت اور پُرقوّت تھے۔ آپ کے حرکات سکنات میں کلام میں نشانات تھے۔گویا آپ کا وجود از سر تا پا نشاناتِ الٰہی کا پُتلا تھا۔

تیسرا احکام نبی کا پاک چال چلن اور راست بازی ہے۔ یہ منجملہ اُن باتوں کے ہے جو عقلمندوں کے نزدیک امین ہونا بھی ایک دلیل ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سے دلیل پکڑی۔

چوتھا احکام جو ایک زبردست وجہ استواری اور استحکام کی ہے نبی کی قوّتِ قدسیہ ہے جس سے فائدہ پہنچتا ہے جیسے طبیب خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ مَیں ایسا ہوں اور ویسا ہوں اور اس کو سدیدی خواہ نوک زبان ہی کیوں نہ ہو۔لیکن اگر لوگوں کو اُس سے فائدہ نہ پہنچے تو یہی کہیں گے کہ اس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ اسی طرح پر نبی کی قوّت قدسی جس قدر زبردست ہو اسی قدر اُس کی شان اعلیٰ اور بلند ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے احکام کے لئے یہ پُشتیبان بھی سب سے بڑا پُشتیبان ہے .... ان وجوہات احکام آیات کے علاوہ میرے نزدیک اور بھی بہت سے وجوہات ہیں منجملہ ان کے ایک الرٰ کے لفظ رؔ سے پتہ لگتا ہے یہ لفظ مجدّدوں اور مرسلوں کے سلسلہ جاریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قیامت تک جاری ہے۔اب اس سلسلہ میں آنے والے مجدّدوں کے خوارق۔ان کی کامیابیوں، ان کی پاک تاثیروں وغیرہ وجوہات احکام آیات کو گن بھی نہیں سکتے۔ اور یہ سب خوارق اور کامیابیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے

متبعین مجددوں کے ذریعہ سے ہوئیں اور قیامت تک ہوں گی۔ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی کامیابیاں ہیں۔ غرض ہر صدی کے سر پر مجدد کا آنا صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ مُردوں سے استمداد خدا تعالیٰ کی منشاء کے موافق نہیں۔ اگر مُردوں سے مدد کی ضرورت ہوتی تو پھر زندوں کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہزاروں ہزار جو اولیاء اللہ پیدا ہوتے ہیں اس کا کیا مطلب تھا۔ مجددین کا سلسلہ کیوں جاری کیا جاتا؟ اگر اسلام مُردوں کے حوالے کیا جاتا تو یقیناً سمجھو کہ اس کا نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔ یہودیوں کا مذہب مُردوں کے حوالے کیا گیا نتیجہ کیا ہوا؟ عیسائیوں نے مُردہ پرستی سے ابتلاء کیا پایا؟ مُردوں کو پُوجتے پُوجتے خود مُردہ ہو گئے۔ نہ مذہب میں زندگی کی رُوح رہی نہ ماننے والوں میں زندگی کے آثار باقی رہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک مُردوں ہی کا مجمع ہو گیا۔

اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اسلام کا خدا حیّ و قیّوم خدا ہے پھر وہ مُردوں سے پیار کیوں کرنے لگا۔ وہ حیّ و قیّوم خدا تو بار بار مُردوں کو جلاتا ہے يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1] تو کیا مُردوں کے ساتھ تعلق پیدا کرا کر جلاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسلام کی حفاظت کا ذمہ اُسی حیّ و قیّوم خدا نے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[2] کہہ کر اُٹھایا ہوا ہے پس ہر زمانہ میں یہ دین زندوں سے زندگی پاتا ہے اور مُردوں کو جلاتا ہے۔ یاد رکھو اس میں قدم قدم پر زندے آتے ہیں۔ پھر فرمایا ثُمَّ فُصِّلَتْ۔ ایک تو وہ تفصیل ہے جو قرآن کریم میں ہے۔ دوسری یہ کہ قرآن کریم کے معارف و حقائق کے اظہار کا سلسلہ قیامت تک دراز کیا گیا ہے۔

ہر زمانے میں نئے معارف اور اسرار ظاہر ہوتے ہیں فلسفی اپنے رنگ میں طبیب اپنے مذاق پر صوفی اپنے طرز پر بیان کرتے ہیں اور پھر یہ تفصیل بھی حکیم و خبیر خدا نے رکھی ہے۔ حکیم اس کو کہتے ہیں کہ جن چیزوں کا علم مطلوب ہو وہ کامل طور پر ہو اور پھر عمل بھی کامل ہو ایسا کہ ہر ایک چیز کو اپنے اپنے محل و موقع پر رکھ سکے۔ حکمت کے معنے وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ مَحَلِّهٖ اور خبیر مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی ایسا وسیع علم کہ کوئی چیز اس کی خبر سے باہر نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مجید کو خاتم الکتب ٹھہرایا تھا اور اس کا زمانہ قیامت تک دراز تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کس طرح پر یہ تعلیمیں ذہن نشین کرنی چاہئیں چنانچہ اسی کے مطابق تفاصیل کی ہیں۔ پھر اس کا سلسلہ جاری رکھا کہ جو مجدد و مصلح احیاء دین کے لئے آتے ہیں وہ خود مفصّل آتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

اس کتاب میں دو خوبیاں ہیں ایک تو یہ کہ حکیم مطلق نے محکم اور مدلّل طور پر یعنی علوم حکمیہ کی طرح اس کو بیان کیا ہے بطور کتھا یا قصہ نہیں۔ دوسری یہ خوبی کہ اس میں تمام ضروریات علمِ معاد کی تفصیل کی گئی

---

[1] الروم آیت ۲۰ ۔ [2] الحجر آیت ۹ ۔

ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

۳۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۝

ایک عجیب بات سوال مقدر کے جواب کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ یعنی اس قدر تفاصیل جو بیان کی جاتی ہیں ان کا خلاصہ اور مغز کیا ہے؟ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ خدا تعالیٰ کے سوا ہرگز ہرگز کسی کی پرستش نہ کرو۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کی علت غائی یہی عبادت ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] عبادت اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ انسان ہر قسم کی قساوت۔ کجی کو دور کرکے دل کی زمین کو ایسا صاف بنا دے جیسے زمیندار زمین کو صاف کرتا ہے۔ عرب کہتے ہیں مَوْرٌ مُعَبَّدٌ جیسے سرمہ کو باریک کرکے آنکھوں میں ڈالنے کے قابل بنا لیتے ہیں اسی طرح جب دل کی زمین میں کوئی کنکر۔ پتھر۔ ناہمواری نہ رہے اور ایسی صاف ہو کہ گویا روح ہی روح ہو اس کا نام عبادت ہے۔ چنانچہ اگر یہ درستی اور صفائی آئینہ کی کی جاوے تو اس میں شکل نظر آجاتی ہے اور اگر زمین کی کی جاوے تو اس میں انواع واقسام کے پھل پیدا ہوجاتے ہیں۔ پس انسان جو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری کنکر پتھر نہ رہنے دے تو اس میں خدا نظر آئے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اس میں پیدا ہوکر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں وطیب ان میں لگیں گے جو اُكُلُهَا دَآئِمٌ[2] کے مصداق ہوں گے۔ یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔ جب سالک یہاں پہنچتا ہے تو خدا ہی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس کا دل عرش الٰہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر نزول فرماتا ہے۔ سلوک کی تمام منزلیں یہاں آکر ختم ہوجاتی ہیں کہ انسان کی حالت تعبّد درست ہو جس میں روحانی باغ لگ جاتے ہیں اور آئینہ کی طرح خدا نظر آتا ہے اسی مقام پر پہنچ کر انسان دنیا میں جنت کا نمونہ پاتا ہے اور یہاں ہی هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا[3] کہنے کا حظ اور لطف اٹھاتا ہے۔ غرض حالت تعبد کی درستی کا نام عبادت ہے۔ پھر فرمایا اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ چونکہ یہ تعبّد تام کا عظیم الشان کام انسان بدوں کسی اُسوۂ حسنہ اور نمونہ کاملہ کے اور کسی قوت قدسی کے کامل اثر کے بغیر نہیں کرسکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ میں اسی خدا کی طرف سے نذیر اور بشیر ہوکر آیا ہوں اگر میری اطاعت کرو گے اور مجھے قبول کرو گے تو تمہارے لئے بڑی بڑی بشارتیں ہیں کیونکہ میں بشیر ہوں اور اگر رد کرتے ہو تو یاد رکھو کہ میں نذیر ہوکر آیا ہوں۔ پھر تم کو بڑی بڑی عقوبتوں اور دکھوں کا سامنا

[1] الذّاریات آیت ۵۷ ۔ [2] الرّعد: ۳۶ ۔ [3] البقرۃ: ۲۶ ۔

ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ بہشتی زندگی اِسی دُنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور اسی طرح پر کورانہ زلیست جو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے بالکل الگ ہو کر بسر کی جاوے جہنمی زندگی کا نمونہ ہے اور وہ بہشت جو مرنے کے بعد ملے گا اسی بہشت کا اصل ہے اور اسی لئے تو بہشتی لوگ نعماء جنّت کے حظ اُٹھاتے وقت کہیں گے هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ دُنیا میں انسان کو جو بہشت حاصل ہوتا ہے وہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا[1] پر عمل کرنے سے ملتا ہے جب انسان عبادت کا اصل مفہوم اور مغز حاصل کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ کے انعام و اکرام کا پاک سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور جو نعمتیں آئندہ بعد مردن ظاہری مرئی اور محسوس طور پر ملیں گی وہ اب روحانی طور پر پاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ جب تک بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع نہ ہو اور اس عالم میں اُس کا حظ نہ اُٹھاؤ اُس وقت تک سیر نہ ہو اور تسلی نہ پکڑو کیونکہ وہ جو اس دُنیا میں کچھ نہیں پاتا اور آئندہ جنت کی امید کرتا ہے وہ طمع خام کرتا ہے اصل میں وہ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[2] کا مصداق ہے اِس لئے جب تک ماسوائے اللہ کے کنکر اور سنگریزے زمینِ دل سے دُور نہ کر لو اور اُسے آئینہ کی طرح مصفا اور سرمہ کی طرح باریک نہ بنا لو صبر نہ کرو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ انسان کسی مزکی النفس کی امداد کے بغیر اس سلوک کی منزل کو طے نہیں کر سکتا اسی لئے اس کے انتظام و انصرام کے لئے اللہ تعالیٰ نے کامل نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجا اور پھر ہمیشہ کے لئے آپ کے سچے جانشینوں کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ نا عاقبت اندیش برہموؤں کا ردّ ہو۔ جیسے یہ امر ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ جو کسان کا بچّہ نہیں ہے نلائی (گوڈی دینے) کے وقت اصل درخت کو کاٹ دے گا اسی طرح پر یہ زمینداری جو روحانی زمینداری ہے کامل طور پر کوئی نہیں کر سکتا جب تک کسی کامل انسان کے ماتحت نہ ہو جو تخم ریزی۔ آبپاشی۔ نلائی کے تمام مرحلے طے کر چکا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد کامل کی ضرورت انسان کو ہے۔ مرشد کامل کے بغیر انسان کا عبادت کرنا اسی رنگ کا ہے جیسے ایک نادان و ناواقف بچّہ ایک کھیت میں بیٹھا ہؤا اصل پودوں کو کاٹ رہا ہے اور اپنے خیال میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ گوڈی کر رہا ہے۔ یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ عبادت خود ہی آجاوے گی نہیں جب تک رسول نہ سکھلائے۔ انقطاع الی اللہ اور تبتّل تام کی راہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹-۱۰)

۴ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْۤ

[1] الشمس: ۱۰ [2] بنی اسرائیل: ۷۳

اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ○

طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مشکل کام کیونکر حل ہو۔ اس کا علاج خود ہی بتلایا وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یاد رکھو کہ دو چیزیں اس اُمّت کو عطا فرمائی گئی ہیں ایک قوّت حاصل کرنے کے واسطے دوسری حاصل کردہ قوّت کو عملی طور پر دکھانے کے لئے۔ قوّت حاصل کرنے کے واسطے استغفار ہے جس کو دوسرے لفظوں میں استمداد اور استعانت بھی کہتے ہیں۔ صوفیوں نے لکھا ہے کہ جیسے ورزش کرنے سے مثلاً مگدروں اور موگریوں کے اُٹھانے اور پھیرنے سے جسمانی قوّت اور طاقت بڑھتی ہے اسی طرح پر روحانی مگدر استغفار ہے۔ اس کے ساتھ روح کو ایک قوّت ملتی ہے اور دل میں استقامت پیدا ہوتی ہے جسے قوّت لینی مطلوب ہو وہ استغفار کرے۔ غفر ڈھانکنے اور دبانے کو کہتے ہیں۔ استغفار سے انسان ان جذبات اور خیالات کو ڈھانپنے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے جو خدا تعالیٰ سے روکتے ہیں۔ پس استغفار کے یہی معنے ہیں کہ زہریلے مواد جو حملہ کر کے انسان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اُن پر غالب آوے اور خدا تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری کی راہ کی روکوں سے بچ کر انہیں عملی رنگ میں دکھائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قسم کے مادے رکھے ہیں ایک سمّی مادہ ہے جس کا موکل شیطان ہے اور دوسرا تریاقی مادہ ہے۔ جب انسان تکبّر کرتا ہے اور اپنے تئیں کچھ سمجھتا ہے اور تریاقی چشمہ سے مدد نہیں لیتا تو سمّی قوّت غالب آجاتی ہے لیکن جب اپنے تئیں ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اور اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک چشمہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کی روح گداز ہو کر بہہ نکلتی ہے اور یہی استغفار کے معنے ہیں یعنی یہ کہ اُس قوّت کو پاکر زہریلے مواد پر غالب آجاوے۔

غرض اس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت پر یُوں قائم رہو۔ اوّل رسول کی اطاعت کرو۔ دوسرے ہر وقت خدا سے مدد چاہو۔ ہاں پہلے اپنے ربّ سے مدد چاہو۔ جب قوّت مل گئی تو تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یعنی خدا کی طرف رجوع کرو۔

استغفار اور توبہ دو چیزیں ہیں۔ ایک وجہ سے استغفار کو توبہ پر تقدّم ہے کیونکہ استغفار مدد اور قوّت ہے جو خدا سے حاصل کی جاتی ہے اور توبہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے۔ عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے گا تو خدا تعالیٰ ایک قوّت دے دیگا اور پھر اس قوّت کے بعد انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاوے گا اور نیکیوں کے کرنے کے لئے اُس میں ایک قوّت پیدا ہو جاوے گی جس کا نام تُوْبُوْٓا

اِلَیْہِ ہے۔ اِس لئے طبعی طور پر بھی یہی ترتیب ہے۔ غرض اس میں ایک طریق ہے جو سالکوں کے لئے رکھا ہے کہ سالک ہر حالت میں خدا سے استمداد چاہے۔ سالک جب تک اللہ تعالیٰ سے قوت نہ پائے گا کیا کر سکے گا۔ توبہ کی توفیق استغفار کے بعد ملتی ہے۔ اگر استغفار نہ ہو تو یقیناً یاد رکھو کہ توبہ کی قوت مر جاتی ہے۔ پھر اگر اس طرح پر استغفار کرو گے اور پھر توبہ کرو گے تو نتیجہ یہ ہوگا یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى سنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اگر استغفار اور توبہ کرو گے تو اپنے مراتب پا لو گے۔ ہر ایک شخص کیلئے ایک دائرہ ہے جس میں وہ مدارج ترقی کو حاصل کرتا ہے۔ ہر ایک آدمی نبی۔ رسول۔ صدیق۔ شہید نہیں ہو سکتا۔

غرض اس میں شک نہیں کہ تفاضل درجات امر حق ہے۔ اس کے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان امور پر مواظبت کرنے سے ہر ایک سالک اپنی اپنی استعداد کے موافق درجات اور مراتب کو پالے گا یہی مطلب ہے اِس آیت کا۔ وَيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ لیکن اگر زیادت لے کر آیا ہے تو خدا تعالیٰ اس مجاہدہ میں اس کو زیادت دے دیگا اور اپنے فضل کو پالے گا جو طبعی طور پر اُس کا حق ہے۔ ذی الفضل کی اضافت ملکی ہے مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ محروم نہ رکھے گا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

۷۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○

زمین پر کوئی بھی ایسا چلنے والا نہیں جس کے رزق کا خدا آپ متکفل نہ ہو۔ (ست بچن صفحہ ۸۵)

اگر خدا اسے کوئی روٹی مانگے تو کیا نہ دے گا۔ اس کا وعدہ ہے مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ کتے بلی بھی تو اکثر پیٹ پالتے ہیں اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی رزق ملتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

۸۔ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ

اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ۝

کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ [1] یہ بھی ایک تجلی تھی اور ماء کے معنے یہاں پانی بھی نہیں کر سکتے۔ خدا معلوم کہ اسکے نزدیک ماء کے کیا معنے ہیں۔ اس کی کنہ خدا کو معلوم ہے۔ جنّت کے نعماء پر بھی ایسا ہی ایمان ہے۔ وہاں یہ تو نہ ہو گا کہ.... بہت سی گائے بھینسیں ہوں گی اور دُودھ دوھ کر حوض میں ڈالا جاوے گا۔ خدا فرماتا ہے کہ وہ اشیاء ہیں جو نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں اور نہ زبان نے چکھیں۔ نہ دل میں اُن کے فہم کا مادہ ہے حالانکہ ان کو دُودھ اور شہد وغیرہ ہی لکھا ہے جو کہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اور ہم اسے پیتے ہیں۔ اسی طرح کئی باتیں ہیں جو کہ ہم خود دیکھتے ہیں مگر نہ تو الفاظ ملتے ہیں کہ ان کو بیان کر سکیں نہ اُس کے بیان کرنے پر قادر ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر ان کو مادی دُنیا پر قیاس کریں تو صدہا اعتراضات پیدا ہوتے ہیں مَنۡ کَانَ فِیۡ ھٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی [2] سے ظاہر ہے کہ دیدار کا وعدہ یہاں بھی ہے مگر ہم اُسے جسمانیات پر نہیں حمل کر سکتے۔

(البدر جلد ۲ مٹ مورخہ ۲۰۔ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷ و ۳۸)

۱۵ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ فَھَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ۝

منجملہ ان کے ایک وہ وجہ ہے جو اُن نتائج متفاوتہ سے ماخوذ ہوتی ہے جن کا مختلف طور پر بحالتِ عمل صادر ہونا ضروری ہے تفصیل اِس کی یہ ہے کہ ہر یک عاقل کی نظر میں یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ جب چند مُتکلّمینِ انشا پرداز اپنی اپنی علمی طاقت کے زور سے ایک ایسا مضمون لکھنا چاہیں کہ جو فضول اور کذب اور حشو اور لغو اور ہزل اور ہر یک مُہمل بیانی اور ژولیدہ زبانی اور دوسرے تمام اُمورِ مُخلِّ حکمت و بلاغت اور آفاتِ منافیٔ کمالیت و جامعیت سے بکلّی منزّہ اور پاک ہو اور سراسر حق اور حکمت اور فصاحت اور بلاغت اور حقائق اور معارف سے بھرا ہُوا ہو تو ایسے مضمون کے لکھنے میں وہی شخص سب سے اوّل درجہ پر رہے گا کہ جو

---

[1] عرش کے متعلق مفصل بحث تفسیر سورۃ اعراف میں گزر چکی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ مائدہ تا سورۃ توبہ صفحہ ۱۶۷ تا صفحہ ۱۸۰)۔ [2] بنی اسرآءیل: ۷۳۔

علمی طاقتوں اور وسعتِ معلومات اور عام واقفیت اور ملکۂ علومِ دقیقہ میں سب سے اعلیٰ اور مشق اور ورزشِ
املا و انشا میں سب سے زیادہ تر فرسودۂ روزگار ہو اور ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ جو شخص اُس سے استعداد میں
علم میں لیاقت میں ملکہ میں عقل میں کہیں فروتر اور متنزل ہے وہ اپنی تحریر میں من حیث الکمالات اُس سے برابر
ہوجائے مثلاً ایک طبیب حاذق جو علمِ ابدان میں مہارتِ تامہ رکھتا ہے جس کو زمانۂ دراز کی مشق کے باعث سے
تشخیصِ امراض اور تحقیقِ عوارض کی پوری پوری واقفیت حاصل ہے اور علاوہ اِس کے فنِ سخن میں بھی یکتا ہے
اور نظم اور نثر میں سرآمدِ روزگار ہے جیسے وہ ایک مرض کے حدوث کی کیفیت اور اُس کی علامات اور اسباب
فصیح اور وسیع تقریر میں بکمال صحت وحقانیت اور بہ نہایت متانت و بلاغت بیان کرسکتا ہے اُس کے مقابلہ پر
کوئی دوسرا شخص جس کو فنِ طبابت سے ایک ذرہ مس نہیں اور فنِ سخن کی نزاکتوں سے بھی ناآشنا محض ہے ممکن
نہیں کہ مثل اُس کے بیان کرسکے۔ یہ بات بہت ہی ظاہر اور عام فہم ہے کہ جاہل اور عاقل کی تقریر میں ضرور کچھ نہ کچھ فرق
ہوتا ہے اور جس قدر انسان کمالاتِ علمیہ رکھتا ہے وہ کمالات ضرور اُس کی علمی تقریر میں اِس طرح پر نظر آتے ہیں
جیسے ایک آئینۂ صاف میں چہرہ نظر آتا ہے اور حق اور حکمت کے بیان کرنے کے وقت وہ الفاظ کہ جو اُس کے مونہہ
سے نکلتے ہیں اُس کی لیاقتِ علمی کا اندازہ معلوم کرنے کے لئے ایک پیمانہ تصور کئے جاتے ہیں اور جو بات وسعتِ علم
اور کمالِ عقل کے چشمہ سے نکلتی ہے اور جو بات تنگ اور منقبض اور تاریک اور محدود خیال سے پیدا ہوتی ہے
اِن دونوں طور کی باتوں میں اس قدر فرق واضح ہوتا ہے کہ جیسی قوت شامہ کے آگے بشرطیکہ کسی فطرتی یا عارضی
آفت سے ماؤف نہ ہو خوشبو اور بدبو میں فرق واضح ہے۔ جہاں تک تم چاہو فکر کرلو اور جس حد تک چاہو سوچ
لو کوئی خامی اِس صداقت میں نہیں پاؤ گے اور کسی طرف سے کوئی رخنہ نہیں دیکھو گے پس جبکہ من کل الوجوہ ثابت
ہے کہ جو فرق علمی اور عقلی طاقتوں میں مخفی ہوتا ہے وہ ضرور کلام میں ظاہر ہوجاتا ہے اور ہرگز ممکن ہی نہیں کہ جو
لوگ من حیث العقل والعلم افضل اور اعلیٰ ہیں وہ فصاحت بیانی اور رفعت معانی میں یکساں ہوجائیں اور
کچھ مابہ الامتیاز باقی نہ رہے تو اس صداقت کا ثابت ہونا اس دوسری صداقت کے ثبوت کو مستلزم ہے کہ جو
کلام خدا کا کلام ہو اُس کا انسانی کلام سے اپنے ظاہری اور باطنی کمالات میں برتر اور اعلیٰ اور عدیم المثال
ہونا ضروری ہے کیونکہ خدا کے علمِ تام سے کسی کا علم برابر نہیں ہوسکتا اور اسی کی طرف خدا نے بھی اشارہ فرما کر
کہا ہے فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ الجزو نمبر ۱۲ یعنی اگر کفار اس قرآن کی نظیر پیش
نہ کرسکیں اور مقابلہ کرنے سے عاجز رہیں تو تم جان لو کہ یہ کلام علمِ انسان سے نہیں بلکہ خدا کے علم سے نازل ہوا ہے
جس کے علم وسیع اور تام کے مقابلہ پر علومِ انسانیہ بے حقیقت اور ہیچ ہیں۔ اِس آیت میں برہانِ اِنّی کی طرز پر اثر
کے وجود کو مؤثر کے وجود کی دلیل ٹھہرائی ہے جس کا دوسرے لفظوں میں خلاصہ مطلب یہ ہے کہ علم الٰہی بوجہ اپنی

کمالیّت اور جامعیّت کے ہرگز انسان کے ناقص علم سے متشابہ نہیں ہوسکتا بلکہ ضرور ہے کہ جو کلام اس کامل اور بے مثل علم سے نکلا ہے وہ بھی کامل اور بے مثل ہی ہو اور انسانی کلاموں سے بکلّی امتیاز رکھتا ہو سو یہی کمالیّت قرآن شریف میں ثابت ہے۔ غرض خدا کے کلام کا انسان کے کلام سے ایسا فرق بیّن چاہیئے جیسا خدا اور انسان کے علم اور عقل اور قدرت میں فرق ہے۔ جس حالت میں افرادِ انسانی نوعِ واحد میں داخل ہو کر پھر بھی بوجۂ تفاوتِ علم اور عقل اور تجربہ اور مشق کے متفاوت البیان پائی جاتی ہیں اور وسیع العلم اور قوی العقل کے فکرِ رسا تک محدود العلم اور ضعیف العقل ہرگز نہیں پہنچ سکتا تو پھر خدا جو شرکت نوعی سے بکلّی پاک اور بلا شبہ مستجمع کمالاتِ تامّہ اور اپنی جمیع صفات میں واحد لاشریک ہے اُس سے مساوات کسی ذرّۂ امکان کی کیونکر جائز ہو اور کیونکر کوئی مخلوق ہو کر خالق کے علومِ غیر متناہیہ سے اپنے ہیچ اور ناچیز علم کو برابر کرسکے۔ کیا اِس صداقت کے ثابت ہونے میں ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے کہ کلام کی تمام ظاہری باطنی شوکت و عظمت علمی طاقتوں اور عملی قدرتوں کے تابع ہے۔ کیا کوئی ایسا انسان بھی ہے جس نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے کسی جزئی میں اس سچائی کو دیکھ نہیں لیا؟ پس جبکہ یہ صداقت اس قدر قوی اور مستحکم اور شائع اور متعارف ہے کہ کسی درجہ کی عقل اُس کے سمجھنے سے قاصر نہیں تو اس صورت میں نہایت درجہ کا نادان وہ شخص ہے کہ جو افرادِ ناقصۂ انسانی میں تو اِس صداقت کو مانتا ہے مگر اُس ذاتِ کامل کے کلامِ مقدّس میں جس کا اپنے علومِ تامّہ میں یکتا اور بے نظیر ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے صداقتِ مذکورہ کے ماننے سے مونہہ پھیرتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۱۹۷ تا صفحہ ۲۲۳)

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ۝

یعنی میری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا اور ظالموں کی شفاعت کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کر کہ مَیں ان کو غرق کروں گا۔ خدا نے نوح کے زمانہ میں ظالموں کو قریباً ایک ہزار سال تک مُہلت دی تھی اور اب بھی خیر القرون کی تین صدیوں کو علیحدہ رکھ کر ہزار برس ہی ہو جاتا ہے۔ اِس حساب سے اب یہ زمانہ اُس وقت پر آپہنچتا ہے جبکہ نوح کی قوم عذاب سے ہلاک کی گئی تھی۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۸۶-۸۷)

وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ اور اُن لوگوں کے بارے میں جو ظالم ہیں

میرے ساتھ مخاطبت مت کر وہ غرق کئے جائیں گے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۱۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا۔

(کشتی نوح ٹائیٹل پیج)

ایک طرف تو خدا نے کشتی کا حوالہ دیا ہے کہ جو اس میں چڑھے گا وہ نجات پاوے گا اور ایک طرف حکم دیا ہے وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یہاں بھی ظلم کی نسبت ہی فرمایا کہ جو لوگ ظالم ہیں تو انکی نسبت بات ہی نہ کر۔ خوفِ الٰہی اور تقویٰ بڑی برکت والی شے ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۳)

یعنی ہمارے رُوبرو اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کر اور ان لوگوں کے بارے میں جو ظالم ہیں مجھ سے بات نہ کر کہ میں ان سب کو غرق کروں گا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صفحہ ۸۶-۸۷)

۴۲ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اس کشتی نوح پر سوار ہو جاؤ۔ خدا کے نام پر ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا۔ (کشتی نوح ٹائیٹل پیج)

۴۴ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝

آج خدا کے سوا اس کی تقدیر سے کوئی بچا نہیں سکتا وہی رحم کرے تو کرے۔

(کشتی نوح ٹائیٹل پیج بار اوّل)

۴۵ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاۗءَكِ وَيٰسَمَاۗءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَاۗءُ وَ

قُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ یعنی نوح کی کشتی نے طوفان کے بعد ایسی جگہ پر قرار پکڑا جو اسکے مناسب حال تھا یعنی اُس جگہ زمین پر اُترنے کے لئے بہت آسانی تھی۔ (چشمہ معرفت ص۱۱۱)

بائبل اور سائینس کی آپس میں ایسی عداوت ہے جیسی کہ دو سوکنیں ہوتی ہیں۔ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ طوفان ساری دنیا میں آیا اور کشتی تین سو ہاتھ لمبی اور پچاس ہاتھ چوڑی تھی اور اس میں حضرت نوح نے ہر قسم کے پاک جانوروں میں سے سات جوڑے اور ناپاک میں سے دو جوڑے ہر قسم کے کشتی میں چڑھائے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اوّل تو اللہ تعالیٰ نے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا جب تک پہلے رسول کے ذریعہ سے اس کو تبلیغ نہ کی ہو اور حضرت نوح کی تبلیغ ساری دنیا کی قوموں پر کہاں پہنچی تھی جو سب غرق ہو جاتے دوم اتنی چھوٹی سی کشتی میں جو صرف ۳۰۰ ہاتھ لمبی اور ۵۰ ہاتھ چوڑی ہو ساری دنیا کے جانور بہائم چرند پرند سات سات جوڑے یا دو دو جوڑے کیونکر سما سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب میں تحریف ہے اور اس میں بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی ہیں تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح علماء اسلام نے بھی ان باتوں کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے مگر قرآن شریف ہی ان بے معنی باتوں سے پاک ہے۔ اُس پر ایسے اعتراض وارد نہیں ہو سکتے۔ اس میں نہ تو کشتی کی لمبائی چوڑائی کا ذکر ہے اور نہ ساری دنیا پر طوفان آنے کا ذکر ہے بلکہ صرف الارض یعنی وہ زمین جس میں نوح نے تبلیغ کی صرف اُس کا ذکر ہے۔ لفظ اراراٹ جس پر نوح کی کشتی ٹھیری اصل میں اَری رِیت ہے جس کے معنے ہیں میں پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتا ہوں۔ رِیت پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے لفظ جودی رکھا ہے جس کے معنے ہیں میرا جود و کرم یعنی وہ کشتی میرے جود و کرم پر ٹھہری۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۝

سید صاحب کا یہ قول ہے کہ گویا قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے تمام دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے حالانکہ تمام دعائیں قبول نہیں ہوتیں یہ اُن کی سخت غلط فہمی ہے اور یہ آیت اُدْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ [1]

[1] المؤمن آیت ۶۱

اُن کے مدعا کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ یہ دُعا جو آیت اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں بطور امر کے بجا لانے کے لئے فرمائی گئی ہے اِس سے مراد معمولی دُعائیں نہیں ہیں بلکہ وہ عبادت ہے جو انسان پر فرض کی گئی ہے کیونکہ امر کا صیغہ یہاں فرضیت پر دلالت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ کُل دعائیں فرض میں داخل نہیں ہیں بلکہ بعض جگہ اللہ جلّشانہٗ نے صابرین کی تعریف کی ہے جو انّا للہ پر ہی کفایت کرتے ہیں اور اس دُعا کی فرضیت پر بڑا قرینہ یہ ہے کہ صرف امر پر ہی کفایت نہیں کی گئی بلکہ اس کو عبادت کے لفظ سے یاد کرکے بحالت نافرمانی عذاب جہنّم کی وعید اس کے ساتھ لگا دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دوسری دعاؤں میں یہ وعید نہیں بلکہ بعض اوقات انبیاعلیہم الصلوٰۃ والسلام کو دعا مانگنے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے چنانچہ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ اس پر شاہد ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہر دعا عبادت ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کو لَا تَسْـَٔلْنِ کا تازیانہ کیوں لگایا جاتا! اور بعض اوقات اولیا اور انبیا دُعا کرنے کو سوءِ ادب سمجھتے رہے ہیں اور صلحاء نے ایسی دعاؤں میں استفتاءِ قلب پر عمل کیا ہے یعنی اگر مصیبت کے وقت دل نے دعا کرنے کا فتویٰ دیا تو دُعا کی طرف متوجہ ہوئے اور اگر صبر کے لئے فتویٰ دیا تو پھر صبر کیا اور دُعا سے مُنہ پھیر لیا۔ ماسوا اس کے اللہ تعالیٰ نے دوسری دعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ صاف فرما دیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور چاہوں تو ردّ کروں۔ (برکات الدُّعا صفحہ ۹-۱۰ طبع اوّل)

۵۶ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ

یعنی کوئی دقیقہ مکر کا باقی نہ رکھو۔ سارے فریب مکر استعمال کرو قتل کے منصوبے کرو۔ اخراج اور قید کی تدبیریں کرو مگر یاد رکھو..... آخر فتح میری ہے تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جاویں گے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

۸۸ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ

حلیم وہ ہے جو يَبْلُغُ الْحُلُمَ کا مصداق ہو اور جو حلم کے زمانہ تک پہنچے۔ وہ جوان مضبوط ہی ہوتا ہے کیونکہ خورد سال کے کچے اعضا شدت اور صلابت کے ساتھ بدل جاتے ہیں قاموس بھی ملاحظہ ہو اور کشاف وغیرہ بھی اور بالغ عاقل کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ (الحق دہلی صفحہ ۶۳)

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝

اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ کہ اگر تم لوگوں پر میرا سچا ہونا مشتبہ ہے تو تم بھی اپنی اپنی جگہ عمل کرو مَیں بھی کرتا ہوں انجام پر دیکھ لینا کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے۔ جو امر خدا کی طرف سے ہوگا وہ بہرحال غالب ہو کر رہے گا۔ (البدر جلد ۴ نمبر ۶ مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲
نیز دیکھئے الحکم جلد ۹ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

تم اپنی جگہ اپنا کام کرو مَیں اپنا کام کرتا ہوں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے۔
(البدر جلد ۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ۝

ایسا شخص جو ربّانی فیض کے رنگ سے کم حصہ رکھتا ہے اُسی کو قرآنی اصطلاح میں شقی کہتے ہیں اور جس نے کافی حصہ لیا اس کا نام سعید ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی پاک کلام میں مخلوقات کو سعادت اور شقاوت کے دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے مگر ان کو حُسن اور قبح کے دو حصوں پر تقسیم نہیں کیا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے صادر ہوا اس کو بُرا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس نے جو کچھ بنایا وہ سب اچھا ہے۔ ہاں اچھوں میں مراتب ہیں۔ پس جو شخص اچھا ہونے کے رنگ میں نہایت ہی کم حصہ رکھتا ہے وہ حُکمی طور پر بُرا ہے اور حقیقی طور پر کوئی بھی بُرا نہیں۔ (ست بچن صفحہ ۲۱ حاشیہ)

فَالَّذِیْ لَمْ یُعْطِهِ الْقَسَّامُ ذَرَّةَ مُنَاسَبَةٍ بِالْاَوْلِیَآءِ وَالْاَصْفِیَآءِ فَهٰذَا الْحِرْمَانُ هُوَ الَّذِیْ یُعَبَّرُ بِالشِّقْوَةِ وَالشَّقَاوَةِ عِنْدَ حَضْرَةِ الْكِبْرِیَآءِ وَالسَّعِیْدُ الْاَتَمُّ الْاَكْمَلُ

ترجمہ از مرتب: جس شخص کو قسّام ازل نے اولیا اور اصفیا کے ساتھ تھوڑی سی مناسبت بھی نہ دی ہو تو یہ وہ محرومی ہے جسے حضرت کبریا کے نزدیک شقوت اور شقاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کامل سعید وہ ہے جس نے

هُوَ الَّذِیْ اَحَاطَ عَادَاتِ الْحَبِیْبِ حَتّٰی ضَاهَاهُ فِی الْاَلْفَاظِ وَالْکَلِمَاتِ وَ الْاَسَالِیْبِ۔ وَالْاَشْقِیَاءُ لَا یَفْهَمُوْنَ[1] هٰذَا الْکَمَالَ کَالْاَکْمَهِ الَّذِیْ لَا یَرَی الْاَلْوَانَ وَ الْاَشْکَالَ وَلَا حَظَّ لِلشَّقِیِّ اِلَّا مِنْ تَجَلِّیَاتِ الْعَظَمُوْتِ وَالْهَیْبَةِ فَاِنَّ فِطْرَتَهٗ لَا تَرٰی اٰیَاتِ الرَّحْمَةِ وَلَا تَشُمُّ رِیْحَ الْجَذْبَاتِ وَ الْمَحَبَّةِ وَلَا تَدْرِیْ مَا الْمُصَافَاتُ وَ الصَّلَاحُ وَ الْاُنْسُ وَالْاِنْشِرَاحُ فَاِنَّهَا مُمْتَلِئَةٌ بِظُلُمَاتٍ فَکَیْفَ تَنَزَّلُ بِهَا اَنْوَارُ بَرَکَاتٍ بَلْ نَفْسُ الشَّقِیِّ تَتَمَوَّجُ تَمَوُّجَ الرِّیْحِ الْعَاصِفَةِ وَتَشْغَلُهٗ جَذَبَاتُهَا عَنْ رُؤْیَةِ الْحَقِّ وَالْحَقِیْقَةِ فَلَا یَجِیْءُ کَاَهْلِ السَّعَادَةِ رَاغِبًا فِی الْمَعْرِفَةِ۔

(سرّ الخلافۃ صفحہ ۳۲-۳۳ طبع اوّل)

ایمان کی حقیقت کچھ نہ کچھ مخفی رہنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے مِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ یہ دونوں فریق اسی سے بنتے ہیں۔ سعید جلد بازی نہیں کرتے بلکہ حسنِ ظن اور صبر سے کام لے کر ایمان لاتے ہیں اور جو شقی ہوتے ہیں وہ جلد بازی سے کام لے کر اعتراض کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ یعنی انسان بلحاظ اپنی استعدادوں کے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ گروہ جس کو ایسے سامانوں کے جمع کرنے میں اور ایسے اعمال بجا لانے کی توفیق ہوتی ہے جو فیوض و برکات الٰہی

محبوب کی عادات کا احاطہ کر لیا ہو یہاں تک کہ وہ الفاظ، کلمات اور اسالیب میں اپنے محبوب کے مشابہ ہو گیا ہو۔ اور اشقیاء ایسے کمال کو نہیں سمجھ سکتے۔ جیسے شبکور رنگوں اور شکلوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور شقی کو بجز عظمتِ الٰہی اور ہیبتِ الٰہی کی تجلّیات کے کوئی حصہ نہیں ملتا کیونکہ اس کی فطرت رحمت کے نشانوں کو نہیں دیکھ سکتی اور جذبات اور محبت کی خوشبو کو نہیں سونگھ سکتی اور نہیں جانتی کہ صفائی قلب۔ درستی اور صلاحیت اور انس و انشراح کیا ہیں کیونکہ وہ تاریکیوں سے بھرپور ہے۔ پس اس پر برکات کے انوار کیسے نازل ہو سکتے ہیں بلکہ شقی کے دل میں تند ہوا کی طرح تحریکات پیدا ہوتی ہیں اور اس کے جذبات اسے حق اور حقیقت کی رؤیت سے غافل رکھتے ہیں۔ پس وہ اہلِ سعادت کی طرح مامور کے پاس معرفت کے حصول کی خاطر نہیں آتا۔

---

[1] غالباً سہوِ کتابت ہے صحیح لفظ شاید یَفْهَمُوْنَ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

کے انوار کے جاذب ہوتے ہیں اور وہ سعید کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے اعمال بد اور خبث باطن ان کی ترقیوں کے آگے روک ہو کر ان کو اعمال صالحات اور خدائی فیوض و برکات سے دُور و مہجور کر دیتے ہیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ خوب زور سے تائیدات سماوی اور نشانات کی ایک بارش ہو رہی ہے اور ایک سیلاب کی طرح ترقی ہو رہی ہے مگر اس میں بھی وہی داخل ہو سکتے ہیں جن کی روحوں میں سعادت کا حصہ ہے۔ شقی اور بدبخت لوگ باوجود ہزارہا نشانات کے دیکھنے کے ان میں بھی وساوس شیطانی کو داخل کر کے سعادت اور قبولِ حق سے محروم رہ جاتے ہیں اور خدا کا بھی یہی منشا ہے کہ بعض سعادت کی وجہ سے سعید اور بعض شقاوت کی وجہ سے شقی ہو کر یہ اختلاف قیامت تک برابر قائم رہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲ را پریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۱۰۸ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝

وَاِنْ قُلْتَ فَمَا بَالُ النَّاقِصِيْنَ الَّذِيْنَ مَاتُوْا عَلٰى حَالَةِ النُّقْصَانِ وَانْتَقَلُوْا مِنْ هٰذِهِ الدُّنْيَا مَعَ اَثْقَالِ الْعِصْيَانِ فَاِنَّهُمْ مَا يُرَدُّوْنَ اِلَى الدُّنْيَا لِيَتَدَارَكُوْا مَا فَاتَ فَكَيْفَ يُكْمَلُوْنَ وَيَجِدُوْنَ النَّجَاةَ۔ اَوَيُدْخَلُوْنَ فِي الْجَنَّةِ غَيْرَ مُكَمَّلِيْنَ۔ اَوْ يُتْرَكُوْنَ اِلَى الْاَبَدِ مُعَذَّبِيْنَ۔ فَاسْمَعْ اِنَّنَا نَعْتَقِدُ بِاَنَّ جَهَنَّمَ مُكَمِّلَةٌ لِّلنَّاقِصِيْنَ۔ وَمُنَبِّهَةٌ لِّلْغَافِلِيْنَ وَمُوْقِظَةٌ لِّلنَّائِمِيْنَ وَسَمَّاهَا اللّٰهُ اُمَّ الدَّاخِلِيْنَ۔ بِمَا تُرَبِّيْهِمْ كَالْاُمَّهَاتِ لِلْبَنِيْنَ۔ وَنَعْتَقِدُ اَنَّ كُلَّ بَصَرٍ يَّكُوْنُ يَوْمَئِذٍ حَدِيْدًا بَعْدَ بُرْهَةٍ مِّنَ الزَّمَانِ۔ وَيَكُوْنُ كُلُّ

(ترجمہ از مرتب) اگر تو یہ کہے کہ ان ناقص انسانوں کا کیا حال ہوگا جو ناقص حالت میں مر گئے اور اس دُنیا سے گناہوں کے بوجھ لے کر گذر گئے کیونکہ وہ اب دوبارہ دُنیا میں واپس نہیں بھیجے جائیں گے تا تدارک مافات کر سکیں پس وہ کس طرح کامل ہو کر نجات پائیں گے یا انہیں جنت میں غیر مکمل حالت میں ہی داخل کیا جائے گا یا انہیں ہمیشہ عذاب میں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں سنو! ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جہنم ناقصوں کو کامل کرنے کا ذریعہ ہے اور غافلوں کو متنبہ کرتی ہے اور جو سوئے ہوئے ہیں ان کو جگاتی ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے جہنم کا نام "اُمّ الداخلین" رکھا ہے کیونکہ وہ انکی اسی طرح تربیت کریگی جس طرح مائیں بیٹوں کی کرتی ہیں۔ اور ہم یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ وقت بھی آئے گا جب ہر آنکھ خوب دیکھنے والی ہوگی

شَقِيٍّ سَعِيْدًا بَعْدَ حُقُبٍ مِّنَ الدَّوَرَانِ۔ وَلَا يَلْبَثُوْنَ اِلَّا اَحْقَابًا فِي النِّيْرَانِ۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مِنْ طُوْلِ الزَّمَانِ۔ فَاِنَّا مَا اُعْطِيْنَا عِلْمَ تَحْدِيْدِهٖ بِتَصْرِيْحِ الْبَيَانِ۔ فَهُوَ زَمَانٌ اَبَدِيٌّ نِسْبَةً اِلٰى ضُعْفِ الْاِنْسَانِ وَمَحْدُوْدٌ نَظَرًا عَلٰى مِنَنِ الْمَنَّانِ۔ وَلَا يُتْرَكُوْنَ كَالْاَعْمٰى اِلَى الْاَبَدِ عَلٰى وَجْهِ الْحَقِيْقَةِ۔ وَيَكُوْنُ مَآلُ اَمْرِهِمْ رُحْمَ اللّٰهِ وَالرُّشْدَ وَمَعْرِفَةَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ بَعْدَ مَا كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ۔ وَنَعْتَقِدُ اَنَّ خُلُوْدَ الْعَذَابِ لَيْسَ كَخُلُوْدِ ذَاتِ اللّٰهِ رَبِّ الْاَرْبَابِ۔ بَلْ لِكُلِّ عَذَابٍ اِنْتِهَآءٌ وَبَعْدَ كُلِّ لَعْنٍ رُحْمٌ وَاِيْوَآءٌ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ وَمَعَ ذٰلِكَ لَيْسُوْا سَوَآءً فِي مَدَارِجِ النَّجَاةِ۔ بَلِ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الدَّرَجَاتِ وَالْمَثُوْبَاتِ وَمَا يَرِدُ عَلٰى فِعْلِهٖ شَيْءٌ مِّنَ الْاِيْرَادَاتِ۔ اِنَّهٗ مَالِكُ الْمُلْكِ فَاَعْطٰى بَعْضَ عِبَادِهٖ اَعْلَى الْمَرَاتِبِ فِي الْكَمَالَاتِ۔ وَبَعْضَهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ مِنَ التَّفَضُّلَاتِ۔ لِيُثْبِتَ اَنَّهٗ هُوَ الْمَالِكُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ لَيْسَ فِيْهِ اِتْلَافُ حَقٍّ مِّنْ حُقُوْقِ الْمَخْلُوْقِيْنَ وَلَمَّا كَانَ وُجُوْدُ اللّٰهِ تَعَالٰى عِلَّةً لِّكُلِّ عِلَّةٍ وَّمَبْدَءً لِّكُلِّ سُكُوْنٍ وَّحَرَكَةٍ۔ وَهُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ۔ فَلَيْسَ مِنَ الصَّوَابِ

اور ہر شقی زمانہ کی چند صدیوں کے بعد نیک بخت ہو جائے گا۔ اور وہ لوگ جہنم میں چند صدیاں ہی ٹھہریں گے ہاں جتنا عرصہ خدا چاہے گا۔ مگر ہمیں اس زمانہ کی حد بندی کی تصریح کا علم نہیں دیا گیا۔ پس انسان کی کمزوری کے پیش نظر وہ زمانہ ابدی ہی کہلائے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے احسانوں پر نظر کی جائے تو وہ زمانہ محدود قرار پائے گا اور دوزخیوں کو سچ مچ ہمیشہ کے لئے اندھا نہیں چھوڑا جائے گا اور ان کے معاملہ کا انجام خدا کے رحم اور ہدایت اور خدائے واحد کی معرفت پر ہو گا بعد اس کے کہ وہ اندھے لوگ تھے۔

اور ہم یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ عذاب جہنّم کا دوام رب الارباب کی ذات کے دوام کی طرح نہیں ہے بلکہ ہر عذاب کے لئے ایک حد مقرر ہے اور ہر ایک لعنت کے بعد رحمت اور پناہ دینا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ یقیناً سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ وہ لوگ نجات کے درجات میں برابر نہیں ہوں گے بلکہ خدا تعالیٰ نے (جہنّم سے نکلنے والے) بعض لوگوں کو بعض پر ثواب اور درجہ میں فضیلت دی ہے۔ اور اس کے اس فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مالک الملک ہے۔ اس نے اپنے بعض بندوں کو کمالات کے اعلیٰ مراتب بخشے ہیں اور بعض کو ان سے کم درجہ کے فضل عطا کئے ہیں تا وہ ثابت کرے کہ وہ مالک ہے جو چاہے کر سکتا ہے اس میں مخلوق کے حقوق میں سے کسی قسم کی حق تلفی نہیں جب کہ خدا تعالیٰ کا وجود ہر علّت کی علّت اور ہر حرکت وسکون کا مبدء ہے۔ اور وہ ہر ایک جان پر قائم اور نگران ہے۔ تو یہ بات درست نہ ہو گی کہ اس جناب کی طرف ہمیشہ

اَنْ يُعْزِي اِخْلَادُ الْعَذَابِ اِلٰى هٰذَا الْجَنَابِ۔ وَمَا كَانَ الْعَبْدُ مُخْتَارًا مِّنْ جَمِيْعِ الْجِهَاتِ بَلْ كَانَ تَحْتَ قَضَاءِ اللّٰهِ خَالِقِ الْمَخْلُوْقَاتِ وَقَيُّوْمِ الْكَائِنَاتِ۔ وَكَانَ كُلُّ قُوَّتِهٖ مَفْطُوْرَةً مِّنْ يَدِهٖ وَمِنْ اِرَادَتِهٖ فَلَهٗ دَخْلٌ عَظِيْمٌ فِيْ شَقَاوَتِهٖ وَسَعَادَتِهٖ۔ فَكَيْفَ يَتْرُكُ عَبْدًا ضَعِيْفًا فِيْ عَذَابِ الْخُلُوْدِ مَعَ اَنَّهٗ يَعْلَمُ اَنَّهٗ خَالِقُ الشَّقِيِّ وَالْمَسْعُوْدِ۔ وَالْعَبْدُ يَفْعَلُ اَفْعَالًا وَّلٰكِنَّهٗ اَوَّلُ الْفَاعِلِيْنَ وَكُلُّ عَبْدٍ صُنْعُ يَدِهٖ وَهُوَ صَانِعُ الْعَالَمِيْنَ۔ وَاِنَّهٗ رَحِيْمٌ وَّجَوَّادٌ وَّكَرِيْمٌ۔ سَبَقَتْ رَحْمَتُهٗ غَضَبَهٗ وَرِفْقُهٗ شِدَّتَهٗ وَلَا يُسَاوِيْهِ اَحَدٌ مِّنَ الرَّاحِمِيْنَ۔ فَلَا يَبْغِيْ كُلَّ الْاِفْنَاءِ وَيَرْحَمُ فِيْ اٰخِرِ الْاَمْرِ وَانْتِهَاءِ الْبَلَاءِ۔ وَلَا يَدُوْسُ كُلَّ الدَّوْسِ بِالْاِيْذَاءِ كَالْمُتَشَدِّدِيْنَ بَلْ يَبْسُطُ فِيْ اٰخِرِ الْاَيَّامِ يَدَهٗ رَاْفَةً وَّيَاْخُذُ حُزْمَةً مِّنَ النَّادِمِيْنَ۔ فَانْظُرْ اِلٰى يَدِ اللّٰهِ وَحُزْمَتِهٖ هَلْ تُغَادِرُ اَحَدًا مِّنَ الْمُعَذَّبِيْنَ۔

(انجام آتھم ص۱۱ تا ص۱۲ حاشیہ)

یعنی دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن نہ وہ ہمیشگی جو خدا کو ہے بلکہ دور دراز مدت کے لحاظ سے۔ پھر خدا کی رحمت دستگیر ہوگی کیونکہ وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس آیت کی تصریح میں

عذاب دائمی منسوب کیا جائے حالانکہ بندہ ہر ایک لحاظ سے مختار بھی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ خالق المخلوقات اور قیوم الکائنات کے قبضہ کے نیچے ہے۔ اور انسان کی ہر ایک قوت اللہ کے ہاتھ اور اس کے ارادہ سے پیدا ہوتی ہے اور اسے انسان کے شقی اور سعید ہونے میں بڑا دخل ہے پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ ضعیف انسان کو دائمی عذاب میں چھوڑ دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شقی و سعید کا پیدا کرنے والا وہ خود ہے۔ بے شک انسان بہت کام کرتا ہے لیکن سب سے پہلا فاعل خود اللہ ہے اور انسان اس کے ہاتھ کی صنعت ہے وہ سارے جہانوں کا صانع ہے۔ وہ رحیم۔ سخی اور کریم ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر فائق ہے اور اس کی نرمی اس کی سختی پر سبقت لے گئی ہے۔ اور کوئی رحم کرنے والا اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ پس وہ انسان کو کلی طور پر فنا نہیں کرے گا بلکہ آخرکار اور مصیبت کے انتہا کو پہنچنے پر وہ ضرور رحم کرے گا۔ وہ دکھ دے کر متشدد لوگوں کی طرح پورے طور پر پاؤں تلے نہیں روندتا بلکہ آخری ایام میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ہاتھ کو لمبا کرے گا اور جہنمیوں کو مٹھی میں لے گا۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور اس کی مٹھی کا تصور کرو۔ کیا اس کا ہاتھ عذاب پانے والوں میں سے کسی کو جہنم میں چھوڑے گا۔

ہمارے سیّد و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے اور وہ یہ ہے یَاْتِیْ عَلٰی جَھَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ وَّ نَسِیْمُ الصَّبَا تُحَرِّکُ اَبْوَابَھَا یعنی جہنّم پر ایک وہ زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہ ہوگا اور نسیم صبا اس کے کواڑوں کو ہلائے گی لیکن افسوس کہ یہ قومیں خدا تعالیٰ کو ایک ایسا چڑچڑا اور کینہ ور قرار دیتی ہیں کہ کبھی اس کا غصّہ فرو نہیں ہوتا اور بے شمار اربوں تک جُونوں میں ڈال کر پھر بھی گناہ معاف نہیں کرتا۔

(لیکچر لاہور صفحہ ۲۴-۲۵ طبع اوّل)

خدا تعالیٰ (ہمیں) یہ تعلیم .... دیتا ہے کہ کفار ایک مدّت دراز تک عذاب میں رہ کر آخر وہ خدا تعالےٰ کے رحم سے حصّہ لیں گے جیسا کہ حدیث میں بھی ہے یَاْتِیْ عَلٰی جَھَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ وَّ نَسِیْمُ الصَّبَا تُحَرِّکُ اَبْوَابَھَا یعنی جہنّم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہیں ہوگا اور نسیم صبا اس کے کواڑ ہلائے گی اسی کے مطابق قرآن شریف میں یہ آیت ہے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ یعنی دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن جب خدا چاہے گا تو ان کو دوزخ سے مخلصی دے گا کیونکہ تیرا رب جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ یہ تعلیم خدا تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کے مطابق ہے کیونکہ اس کی صفات جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور وہی زخمی کرتا ہے اور وہی پھر مرہم لگاتا ہے اور یہ بات نہایت نامعقول اور خدائے عزّ و جلّ کے صفاتِ کاملہ کے برخلاف ہے کہ دوزخ میں ڈالنے کے بعد ہمیشہ اس کے صفاتِ قہر یہ ہی جلوہ گر ہوتی رہیں اور کبھی صفت رحم اور عفو کی جوش نہ مارے اور صفات کرم اور رحم کے ہمیشہ کے لئے معطّل کی طرح رہیں بلکہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدّت دراز تک جس کو انسانی کمزوری کے مناسب حال استعارہ کے رنگ میں ابد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ دوزخی دوزخ میں رہیں گے اور پھر صفت رحم اور کرم تجلّی فرمائے گی اور خدا اپنا ہاتھ دوزخ میں ڈالے گا اور جس قدر خدا کی مٹھی میں آجائیں گے سب دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ پس اس حدیث میں بھی آخر کار سب کی نجات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا کی مٹھی خدا کی طرح غیر محدود ہے جس سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔

یاد رہے کہ جس طرح ستارے ہمیشہ نوبت بہ نوبت طلوع کرتے رہتے ہیں اسی طرح خدا کے صفات بھی طلوع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی انسان خدا کے صفاتِ جلالیہ اور استغنائے ذاتی کی پرتَو کے نیچے ہوتا ہے اور کبھی صفاتِ جمالیہ کا پرتَو اس پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ[1] پس یہ سخت نادانی کا خیال ہے کہ ایسا گمان کیا جائے کہ بعد اس کے کہ مجرم لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ پھر صفاتِ کرم اور رحم ہمیشہ کے لئے معطّل ہو جائیں گی اور کبھی ان کی تجلّی نہیں ہوگی کیونکہ صفاتِ

[1] الرحمٰن آیت ۳۰ ۔

الٰہیہ کا تعطّل ممتنع ہے بلکہ حقیقی صفت خدا تعالیٰ کی محبت اور رحم ہے اور وہی اُمّ الصّفات ہے اور وہی کبھی انسانی اصلاح کے لئے صفاتِ جلالیہ اور غضبیہ کے رنگ میں جوش مارتی ہے اور جب اصلاح ہو جاتی ہے تو محبت اپنے رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے اور پھر بطور موہبت ہمیشہ کے لئے رہتی ہے۔ خدا ایک چڑچڑے انسان کی طرح نہیں ہے جو خواہ نخواہ عذاب دینے کا شائق ہو۔ اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنے پر آپ ظلم کرتے ہیں۔ اس کی محبت میں تمام نجات اور اس کو چھوڑنے میں تمام عذاب ہے۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۴۶۔۴۹ طبع اوّل)

یہ بات فی نفسہٖ غیر معقول ہے کہ انسان کو ایسی ابدی سزا دی جائے کہ جیسا خدا ہمیشہ کے لئے ہے ایسا ہی خدا کی ابدیت کے موافق ہمیشہ دوزخی دوزخ میں رہیں۔ آخر ان کے قصوروں میں خدا کا بھی دخل ہے کیونکہ اسی نے ایسی قوتیں پیدا کیں جو کمزور تھیں پس دوزخیوں کا حق ہے جو اس کمزوری سے فائدہ اٹھاویں جو ان کی فطرت کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۴۷ حاشیہ طبع اوّل)

گناہ کی سزا ہوگی اور عذاب ہوگا مگر یہ ابدیت وہ نہیں جس طرح خدا ئی ابدیت ہے۔ ایک خاص وقت تک جہنم میں رکھ کر اصلاح ہو جانے پر رہائی ہو جاوے گی۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر خدا کے کلام سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ[1] کا لفظ ہے اور جہاں جہنّم کا ذکر ہے وہاں یہ فرمایا کہ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ان آیات میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بہشتیوں کو خوف نہیں دلایا گیا مگر دوزخیوں کو مخلصی کی امید ضرور دلائی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر بہشت کے متعلق عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کا لفظ نہ ہوتا تو بہشت والوں کو بھی کھٹکا ہی رہتا مگر خدا نے عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کا لفظ بڑھا کر وہ کھٹکا ہی مٹا دیا کہ یہ خدا کی عطا ہے وہ واپس نہیں لی جاتی اور اس کی نسبت ہم نے ایک اور حدیث بھی دیکھی ہے جس میں لکھا ہے کہ يَأْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَّ نَسِيْمُ الصَّبَا تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ گناہ گاروں کو ایسی سزا ابدی ملے گی کہ اس سے پھر کبھی نجات ہی نہ ہو گی بلکہ ہمارا یہ مذہب ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم گنہ گاروں کو بچالے گا اور اسی لئے قرآن شریف میں جہاں عذاب کا ذکر کیا ہے وہاں فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

[1] ہود آیت ۱۰۹ ۞

میں بڑے زور سے اور پورے یقین اور بصیرت سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ دوسرے مذاہب کو مٹا دے اور اسلام کو غلبہ اور قوّت دے۔ اب کوئی ہاتھ اور طاقت نہیں جو خدا تعالیٰ کے اس ارادہ کا مقابلہ کرے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ ملا۴۱ مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء صلا۲)

کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن اگر تیرا رب چاہے کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اُس کے کرنے پر وہ قادر ہے لیکن بہشتیوں کے لئے ایسا نہیں فرمایا کیونکہ وہ وعدہ ہے وعید نہیں ہے۔

(حقیقۃ الوحی صلا۱۸۹)

قرآن شریف میں کفار اور مشرکین کی سزا کے لئے بار بار ابدی جہنّم کا ذکر ہے اور بار بار فرمایا ہے خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا[1] اور پھر باوجود اس کے قرآن شریف میں دوزخیوں کے حق میں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ بھی موجود ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ یَاْتِیْ عَلٰی جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْهَآ اَحَدٌ وَّ نَسِیْمُ الصَّبَا تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا یعنی جہنّم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہ ہوگا اور نسیم صبا اسکے کواڑوں کو ہلائے گی اور بعض کتب میں زبان پارسی میں یہ حدیث لکھی ہے۔ ایں مشت خاک را گر نہ بخشم چہ کنم۔

(حقیقۃ الوحی صلا۱۸۹ حاشیہ)

۱۰۹ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۝

سعید لوگ مرنے کے بعد بہشت میں داخل کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین ہے اور اگر یہ آسمان اور زمین بدلائے بھی جائیں جیسا کہ قیامت کے آنے کے وقت ہوگا تب بھی سعید لوگ بہشت سے باہر نہیں ہوسکتے اور نہ ان چیزوں کے فساد سے بہشت میں کچھ فساد ہوسکتا ہے کیونکہ بہشت ان کے لئے ایک ایسی عطا ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اُس سے محروم نہیں رہ سکتے۔

(ازالہ اوہام حصّہ اوّل صلا۳۵۳)

عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ..... وہ بخشش جس کا کبھی انقطاع نہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صلا۵۱۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

---

[1] النّساء آیت ۵۸۔

یہ وہ عطا ہے جو واپس نہیں لی جائے گی۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۵۴ حاشیہ)

بہشت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا انقطاع نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہشت کے درمیان بھی مومنوں کو کھٹکا رہتا کہ کہیں نکالے نہ جاویں لیکن برخلاف اس کے دوزخ کے متعلق ایسا نہیں بلکہ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سب دوزخ سے نکل چکے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ آخر انسان خدا کی مخلوق ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دُور کر دے گا اور اس کو رفتہ رفتہ دوزخ کے عذاب سے نجات بخشے گا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۲؍اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو صرف اس ایک حکم نے کہ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے ہی بوڑھا کر دیا کس قدر احساس موت ہے۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی صرف اِس لئے کہ تاہم اس سے سبق لیں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہادی کامل اور پھر قیامت تک کے لئے اور اس پر کُل دُنیا کے لئے مقرر فرمایا مگر آپ کی زندگی کے کُل واقعات ایک عملی تعلیمات کا مجموعہ ہیں جس طرح پر قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب ہے اور قانون قدرت اس کی فعلی کتاب ہے اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی ایک فعلی کتاب ہے جو گویا قرآن کریم کی شرح اور تفسیر ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ یعنی سیدھا ہو جا۔ کسی قسم کی بداعمالی کی کجی نہ رہے۔ پھر راضی ہوں گا۔ آپ بھی سیدھا ہو جا اور دوسروں کو بھی کر۔ عرب کے لئے سیدھا کرنا کس قدر مشکل تھا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا کہ مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا کیونکہ اس حکم کے رو سے بڑی بھاری ذمہ داری میرے سپرد ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو سیدھا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری فرماں برداری جہاں تک انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہے ممکن ہے کہ وہ اس کو پورا

کرے لیکن دوسروں کو ویسا ہی بنانا آسان نہیں ہے۔ اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند شان اور قوّتِ قدسی کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس حکم کی کیسی تعمیل کی۔ صحابہ کرام کی وہ پاک جماعت تیار کی کہ ان کو کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[1] کہا گیا اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ[2] کی آواز ان کو آگئی۔ آپ کی زندگی میں کوئی بھی منافق مدینہ طیبہ میں نہ رہا غرض ایسی کامیابی آپ کو ہوئی کہ اس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے واقعاتِ زندگی میں نہیں ملتی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ تھی کہ قیل وقال ہی تک بات نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ اگر نرے قیل وقال اور ریاکاری تک ہی بات ہو تو دوسرے لوگوں اور ہم میں پھر امتیاز کیا ہوگا اور دوسروں پر کیا شرف؟ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

استقامت کے حصول کے لئے اولاً ابتدائی مدارج اور مراتب پر کسی قدر تکالیف اور مشکلات بھی پیش آتی ہیں لیکن اس کے حاصل ہوجانے پر ایک دائمی راحت اور خوشی پیدا ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ ارشاد ہوا فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ تو لکھا ہے کہ آپ کے کوئی سفید بال نہ تھا پھر سفید بال آنے لگے تو آپ نے فرمایا مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ غرض یہ ہے کہ جب تک انسان موت احساس نہ کرے وہ نیکیوں کی طرف جُھک نہیں سکتا۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۰،۱۱)

۱۱۵ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ۝

نجات کا مفت ملنا اور اعمال کو غیرضروری ٹھہرانا جو عیسائیوں کا خیال ہے یہ ان کی سراسر غلطی ہے۔ اُنکے فرضی خدا نے بھی چالیس روزے رکھے تھے اور موسیٰ نے کوہِ سینا پر روزے رکھے۔ پس اگر اعمال کچھ چیز نہیں ہیں تو یہ دونوں بزرگ اس بیہودہ کام میں کیوں پڑے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بدی سے سخت بیزار ہے تو ہمیں اس سے سمجھ آتا ہے کہ وہ نیکی کرنے سے نہایت درجہ خوش ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں نیکی بدی کا کفّارہ ٹھہرتی ہے اور جب ایک انسان بدی کرنے کے بعد ایسی نیکی بجا لایا جس سے خدا تعالیٰ خوش ہوا تو ضرور ہے کہ پہلی بات موقوف ہو کر دوسری بات قائم ہوجائے ورنہ خلاف عدل ہوگا۔ اسی کے مطابق اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ یعنی نیکیاں بدیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بدی میں ایک زہریلی خاصیت ہے کہ وہ ہلاکت تک پہنچاتی ہے۔ اسی طرح ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ نیکی میں ایک

---

[1] آل عمران آیت ۱۱۱ ۞ [2] المائدہ آیت ۱۲۰ ۞

تریاقی خاصیت ہے کہ وہ موت سے بچاتی ہے۔ مثلاً گھر کے تمام دروازوں کو بند کر دینا یہ ایک بدی ہے جس کی لازمی تاثیر یہ ہے کہ اندھیرا ہو جائے۔ پھر اس کے مقابل پر یہ ہے کہ گھر کا دروازہ جو آفتاب کی طرف ہے کھولا جائے اور یہ ایک نیکی ہے جس کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ گھر کے اندر گم شدہ روشنی واپس آجائے یا ہم بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ عذاب ایک سلبی چیز ہے کیونکہ راحت کی نفی کا نام عذاب ہے اور نجات ایک ایجابی چیز ہے یعنی راحت اور خوش حالی کے دوبارہ حاصل ہو جانے کا نام نجات ہے۔

(کتاب البریہ صفحہ ۵۶-۵۷ طبع اوّل)

نماز کے متعلق جس زاید ہدایت کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ اس قدر طبعی جوش اور ذاتی محبت اور خشوع اور کامل حضور میسّر آجائے کہ انسان کی آنکھ اپنے محبوب حقیقی کے دیکھنے کے لئے کھل جائے اور ایک خارق عادت کیفیت مشاہدہ جمال باری کی میسّر آجائے جو لذّات روحانیہ سے سراسر معمور ہو اور دنیوی ذایل اور انواع و اقسام کے معاصی قولی اور فعلی اور بصری اور سماعی سے دل کو متنفر کر دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۶)

مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک شرابی اور نشہ باز انسان کو جب سرور نہیں آتا تو وہ پے در پے پیالے پیتا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کو ایک قسم کا نشہ آجاتا ہے۔ دانشمند اور بزرگ انسان اس سے فایدہ اُٹھا سکتا ہے اور وہ یہ کہ نماز پر دوام کرے اور پڑھتا جاوے یہاں تک کہ اس کو سرور آجاوے اور جیسے شرابی کے ذہن میں ایک لذّت ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود بالذّات ہوتا ہے۔ اُسی طرح سے ذہن میں اور ساری طاقتوں کا رجحان نماز میں اُسے سرور کا حاصل کرنا ہو اور پھر ایک خلوص اور جوش کے ساتھ کم از کم اس نشہ باز کے اضطراب اور قلق و کرب کی مانند ہی ایک دعا پیدا ہو کہ وہ لذّت حاصل ہو تو مَیں کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً وہ لذّت حاصل ہو جاوے گی۔ پھر نماز پڑھتے وقت اُن مفاد کا حاصل کرنا بھی ملحوظ ہو جو اُس سے ہوتے ہیں اور احسان پیش نظر رہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۵)

نیکیاں بدیوں کو زایل کر دیتی ہیں پس ان حسنات کو اور لذّات کو دل میں رکھ کر دعا کرے کہ وہ نماز جو صدیقوں اور محسنوں کی ہے وہ نصیب کرے۔ یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ یعنی نیکیاں یا نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے یا دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ نماز فواحش اور بُرائیوں سے بچاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیاں کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر نہ روح اور راستی کے ساتھ۔ وہ صرف رسم اور عادت کے طور پر ٹکریں مارتے ہیں ان کی رُوح مُردہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ان کا نام حسنات نہیں رکھا اور یہاں جو حسنات کا لفظ رکھا اور الصّلوٰۃ کا لفظ نہیں رکھا باوجودیکہ معنی وہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تا نماز کی خوبی اور حُسن وجمال کی طرف اشارہ کرے کہ وہ نماز بدیوں کو دُور کرتی ہے جو اپنے اندر ایک سچائی کی روح رکھتی ہے اور فیض کی تاثیر اس میں موجود ہے۔ وہ نماز یقیناً یقیناً بُرائیوں کو دُور کرتی ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ملا صفحہ ۵)

روحانی نظام میں مرکز اصلی کی طرف بازگشت کرنا ہی راحت کا موجب ہوسکتا ہے اور اس دُکھ درد سے بچاتا ہے جو اس مرکز کو چھوڑنے سے پیدا ہوا تھا اسی کا نام توبہ ہے اور یہی ظلمت جو اس طرح پر پیدا ہوتی ہے ضلالت اور جہنّم کہلاتی ہے اور مرکز اصلی کی طرف رجوع کرنا جو راحت پیدا کرتا ہی جنّت سے تعبیر ہوتا ہے اور گناہ سے ہٹ کر پھر نیکی کی طرف آنا جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوجاوے اس بدی کا کفارہ ہو کر اسے دُور کر دیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ یعنی نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ چونکہ بدی میں ہلاکت کی زہر ہے اور نیکی میں زندگی کا تریاق۔ اسی لئے بدی کے زہر کو دور کرنے کا ذریعہ نیکی ہی ہے۔ (الحکم جلد ۶ ملا مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

نماز کُل بدیوں کو دُور کر دیتی ہے۔ حسنات سے مراد نماز ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۳۸ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

نیکیاں بدیوں کو دُور کرتی ہیں۔ یہاں حسنات کے معنے نماز کے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ ۳۹،۳۸ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

۱۱۶ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (البدر جلد ۲ ۲۴ مورخہ ۳ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۶)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۹۱-۱۹۲)

۱۲۰ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝

یہ تو غیر ممکن ہے کہ تمام لوگ مان لیں کیونکہ بموجب آیت وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ اور بموجب آیت کریمہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ

فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ[1] سب کا ایمان لانا خلاف نص صریح ہے۔ پس اس جگہ سعید لوگ مراد ہیں۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صہ ۲۱ حاشیہ)

(۱۲۴) وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ خدا تعالیٰ کی طرف ہی ہر ایک امر رجوع کرتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے انسان کی مجبوری لازم آتی ہے غلط فہمی ہے۔ یوں تو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مَیں مینہ برساتا ہوں اور برق و صاعقہ کو پیدا کرتا ہوں اور کھیتیاں اُگاتا ہوں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسباب طبعیہ مینہ برسنے اور رعد و برق کے پیدا ہونے کے جو ہیں اس سے اللہ تعالیٰ انکار کرتا ہے بالکل فضول ہے کیونکہ یہ مراتب بجائے خود بیان فرمائے گئے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اسباب طبعیہ سے پیدا ہوتی ہیں پس اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ایسے بیانات سے کہ میرے حکم سے بارشیں ہوتی ہیں اور میرے حکم سے کھیتیاں اُگتی ہیں اور برق و صاعقہ پیدا ہوتا ہے اور پھل لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور ہر ایک بات میرے ہی قبضۂ اقتدار میں اور میرے ہی امر سے ہوتی ہے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ سلسلہ کائنات کا مجبورِ مطلق ہے بلکہ اپنی عظمت اور اپنا علت العلل ہونا اور اپنا مسبب الاسباب ہونا مقصود ہے کیونکہ تعلیمِ قرآنی کا اصل موضوع توحید خالص کو دُنیا میں پھیلانا اور ہر ایک قسم کے شرک کو جو پھیل رہا تھا مٹانا ہے اور چونکہ قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت عرب کے جزیرہ میں ایسے ایسے مشرکانہ عقائد پھیل رہے تھے کہ بعض بارشوں کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض دہریوں کی طرح تمام چیزوں کا ہونا اسباب طبعیہ تک محدود رکھتے تھے اور بعض دو خدا سمجھ کر اپنے نا ملائم قضا و قدر کو اہرمن کی طرف منسوب کرتے تھے اس لئے یہ خدا تعالیٰ کی کتاب کا فرض تھا جس کے لئے وہ نازل ہوئی کہ ان خیالات کو مٹا دے اور ظاہر کرے کہ اصل علت العلل اور مسبب الاسباب وہی ہے اور بعض ایسے بھی تھے جو مادہ اور روح کو قدیم سمجھ کر خدا تعالیٰ کا علت العلل ہونا بطور ضعیف اور ناقص کے خیال کرتے تھے۔ پس یہ الفاظ قرآن کریم کے کہ میرے ہی امر سے سب کچھ پیدا ہوتا ہے توحید محض کے قائم کرنے کے لئے تھے۔ ایسی آیات سے انسان کی مجبوری کا نتیجہ نکالنا تَفْسِيْرُ الْقَوْلِ بِمَا لَا يَرْضٰى بِهٖ قَائِلُهٗ ہے۔

(جنگِ مقدس یعنی "اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ" روئداد ۲؍جون ۱۸۹۳ء صہ ۲-۳ طبع اوّل)

[1] آل عمران آیت ۵۶

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ——— نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تفسیر سورۃ یوسف

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىہُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِہٖۤ اَکْرِمِیْ مَثْوٰىہُ عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا ؕ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَہٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۝

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ اور خدا اپنے امر پر غالب ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۹۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

خدا اپنے ارادہ پر غالب ہے مگر اکثر لوگ خدا کے قہر اور جبروت سے بے خبر ہیں..... زمین پر خدا مسلوب السلطنت لوگوں کی طرح بیکار نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ربوبیّت اور رحمانیّت اور رحیمیّت اور مجازات زمین پر جاری ہے اور وہ اپنے عابدوں کو مدد دینے کی طاقت رکھتا ہے اور مجرموں کو اپنے غضب

سے ہلاک کر سکتا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۵ طبع اوّل)

خدا تعالیٰ .... کسی کے منشا کے ماتحت نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے اور غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

ہمارا آخری حصہ عمر کا ہے اور ہمیشہ تجربہ ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی غالب ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸، ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۲۳۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗٓ اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۝

اَشُدَّ سے مراد .... نبوت نہیں ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ جب ہوش میں آیا۔ اَشُدّ بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وحی کی اَشُدّ اور دوسری جسمانی اَشُدّ۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

۲۵۔ وَلَقَدْ ہَمَّتْ بِہٖ ۚ وَہَمَّ بِہَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْہَانَ رَبِّہٖ ؕ کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ۝

فطرۃً انسان کو شہوات نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اس کے نزدیک مدار آسایش ہے بڑی خوشی سے شہواتِ نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے وَلَقَدْ ہَمَّتْ بِہٖ وَہَمَّ بِہَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْہَانَ رَبِّہٖ یعنی یہ ایسا مُنہ زور جوش ہے کہ اس کا فرو ہونا کسی بُرہانِ قوی کا محتاج ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۷۷ طبع اوّل)

لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ہم نے یوسف پر احسان کیا تا ہم اس سے بدی اور فحش کو روک دیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۵۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

۲۷۔ قَالَ ہِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَشَہِدَ شَاہِدٌ مِّنْ اَہْلِہَا ۚ

إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ○

یاد رہے کہ جب یوسف بن یعقوب پر زلیخا نے بے جا الزام لگایا تھا تو اُس موقعہ پر خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا یعنی زلیخا کے قریبیوں میں سے ایک شخص نے یوسف کی بریّت کی گواہی دی۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۷۵-۷۶ طبع اوّل)

فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ○

إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ یعنی اے عورتو۔ تمہارے فریب بہت بڑے ہیں۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱ طبع اوّل)

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ○

محبت اور شہود عظمت تامہ کی کمالیت اسی حالت میں ثابت ہوگی کہ جب عاشق دلدادہ محض استیلاء عشق کی وجہ سے نہ کسی اَور وجہ سے اپنے معدوم[1] کے ماسوا کو معدوم سمجھے اور اپنے معشوق کے غیر کو کالعدم خیال کرے۔ گو عقل (و) شرع اُس کو سمجھاتی ہوں کہ وہ چیزیں حقیقت میں معدوم نہیں ہیں جیسے ظاہر ہے کہ جب دن چڑھتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر نور آفتاب کا استیلاء کرتا ہے تو باوجود اس کے کہ لوگ جانتے ہیں کہ ستارے اس وقت معدوم نہیں مگر پھر بھی بوجہ استیلاء اُس نور کے کہ ستاروں کو دیکھ نہیں سکتے ایسا ہی استیلاء محبت اور عظمت اللہ کا محب صادق کی نظر میں ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا تمام عالم بجز اس کے محبوب کے معدوم

[1] نقل مطابق اصل۔ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے صحیح لفظ غالباً "محبوب" ہے۔

ہے اور اگرچہ عشق حقیقی میں یہ تمام انوار کامل اور اتم طور پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی عشق مجازی کا مبتلا بھی اس غایت درجہ عشق پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنے معشوق کے غیر کو یہاں تک کہ خود اپنے نفس کو کالعدم سمجھنے لگتا ہے چنانچہ منقول ہے کہ مجنون جس کا نام قیس ہے اپنے عشق کی آخری حالت میں ایسا دیوانہ ہو گیا کہ یہ کہنے لگا کہ مَیں آپ ہی لیلیٰ ہوں۔ سو یہ بات تو نہیں کہ فی الحقیقت وہ لیلیٰ ہی ہو گیا تھا بلکہ اس کا یہ باعث تھا کہ چونکہ وہ مدت تک تصورِ لیلیٰ میں غرق رہا اِس لئے آہستہ آہستہ اس میں خود فراموشی کا اثر ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے اس کا استغراق بہت ہی کمال کو پہنچ گیا اور محویّت کی اس حد تک جا پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنونِ عشق سے اَنَا الَیْلٰی کا دعویٰ کرنے لگا اور یہ خیال دل میں بندھ گیا کہ فی الحقیقت میں ہی لیلیٰ ہوں۔ غرض غیر کو معدوم سمجھنا لوازم کمال عشق میں سے ہے اور اگر غیر فی الحقیقت معدوم ہی ہے تو پھر وہ ایسا امر نہیں ہے کہ جس کو استیلاءِ محبت اور جنونِ عشق سے کچھ بھی تعلق ہو اور غلبہ عشق کی حالت میں محویّت کے آثار پیدا ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو انسان مشکل سے سمجھ سکے۔ شیخ مصلح الدین شیرازی نے خوب کہا ہے

نہ از چینم حکایت کن نہ از رُوم ٭ کہ دارم دلستانے اندریں بُوم
چو رُوئے خوب او آید بیادم ٭ فراموشم شود موجود و معدوم

اور پھر ایک جگہ فرماتے ہیں

باتو مشغول وباتو ہم راہم ٭ واز تو بخشایش تو میخواہم
تا مرا از تو آگہی دادند ٭ بوجودت گر از خود آگاہم

اور خود وہ محویّت کا ہی اثر تھا جس سے زلیخا کی سہیلیوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔

(مکتوبات جلد اول صفحہ ۷۷-۸۰) (مکتوب نمبر ۴۳ بنام میر عباس علی صاحب)

یوسف: ۳۴

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ۝

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ یعنی اے میرے رب مجھے تو قید بہتر ہے اُن باتوں سے کہ یہ عورتیں مجھ سے خواہش کرتی ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ کہ اگر کوئی عورت ایسی خواہش کرے تو مَیں اپنے نفس کے لئے اُس امر سے قید ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ یہ یوسف بن یعقوب علیہما السلام کی دعا تھی جس دعا کی وجہ سے وہ قید ہو گئے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۷۶ طبع اول)

نظائر سے مسائل بہت جلد حل ہو جاتے ہیں اگر گذشتہ زمانہ میں اس کی نظیر دیکھی جاوے تو پھر یوسف کا صدق ہے ایسا صدق دکھایا کہ یوسف صدیق کہلایا۔ ایک خوبصورت معزز اور جوان عورت جو بڑے بڑے دعوے کرتی ہے عین تنہائی اور تخلیہ میں ارتکابِ فعل بدچاہتی ہے لیکن آفرین ہے اس صدیق پر کہ خدا تعالیٰ کے حدود کو توڑنا پسند نہ کیا اور اس کے بالمقابل ہر قسم کی آفت اور دُکھ اُٹھانے کو آمادہ ہو گیا یہاں تک کہ قیدی کی زندگی بسر کرنی منظور کر لی۔ چنانچہ کہا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ یعنی یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں۔ اس سے حضرت یوسف کی پاک فطرت اور غیرت نبوّت کا کیسا پتہ لگتا ہے کہ دوسرے امر کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیا مطلب کہ اُس کا نام نہیں لیا۔ یوسف اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے گرویدہ اور عاشق زار تھے۔ اُن کی نظر میں اپنے محبوب کے سوا دوسری کوئی بات جچ سکتی نہ تھی۔ وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کہ حدود اللہ کو توڑیں۔

کہتے ہیں کہ ایک لمبا زمانہ جو بارہ برس کے قریب بتایا جاتا ہے وہ جیل میں رہے لیکن اس عرصہ میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر پورے راضی رہے۔ اس عرصہ میں بادشاہ کو کوئی عرضی بھی نہیں دی کہ اُن کے معاملہ کو سوچا جاوے یا انہیں رہائی دی جاوے بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس اہل غرض عورت نے تکالیف کا سلسلہ بڑھا دیا کہ کسی طرح پر وہ پھسل جاویں مگر اس صدّیق نے اپنا صدق نہ چھوڑا۔ خدا نے ان کو صدّیق ٹھہرایا۔ یہ بھی صدّیق کا ایک مقام ہے کہ دُنیا کی کوئی آفت، کوئی تکلیف اور ذلّت اُسے حدود اللہ کے توڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی جس قدر اذیتیں اور بلائیں بڑھتی جاویں وہ اُس کے مقام صدق کو زیادہ مضبوط اور لذیذ بناتی جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۴۷۔ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝

مصر کے بادشاہ فرعون نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو صدیق کا خطاب دیا کیونکہ بادشاہ نے جب دیکھا کہ اس شخص نے صدق اور پاک باطنی اور پرہیز گاری کے محفوظ رکھنے کے لئے بارہ برس کا جیل خانہ

اپنے لئے منظور کیا مگر بدکاری کی درخواست کو نہ مانا بلکہ ایک لحظہ کے لئے بھی دل پلید نہ ہوا۔ تب بادشاہ نے اس راست باز کو صدّیق کا خطاب دیا جیسا کہ قرآن شریف سورہ یوسف میں ہے یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خطابوں میں سے پہلا خطاب وہی تھا جو حضرت یوسف کو ملا۔

(ضمیمہ تریاق القلوب نمبر ۴ حاشیہ صد۲ طبع اوّل)

۵۴ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

نفسِ امّارہ میں یہ خاصیّت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جو اس کے کمال کے مخالف اور اس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے جھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بد راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اس پر طبعاً غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک طبعی حالت کہلاتی ہے جب تک کہ انسان عقل اور معرفت کے زیر سایہ نہیں چلتا بلکہ چارپایوں کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے یا غصہ اور جوش دکھلانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو رہتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صد۱۲)

فَاِنَّ النَّفْسَ الْاَمَّارَةَ ثُعْبَانٌ تَبْسُطُ شُرُكَ الْهَوٰى وَيَهْلِكُ النَّاسُ كُلُّهُمْ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّهٗ وَبَسَطَ عَلَيْهِ جَنَاحَهٗ بِاللُّطْفِ وَالْهُدٰى۔ (تذکرۃ الشہادتین صد۸۵ طبع اوّل)

یہ طوفان جو نفسانی خواہشات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے یہ نہایت سخت اور دیرپا طوفان ہے جو کسی طرح بجز رحم خداوندی کے دُور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضاء میں سے ہڈی نہایت سخت ہے اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے۔ اسی طرح اِس طوفان کے دُور کرنے والی قوّت ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کرکے پامال کر سکے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے۔ کیونکہ شہواتِ نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُر آشوب طوفان ہے کہ بجز خاص رحم حضرت احدیت کے فرو

(ترجمہ از مرتّب) نفس امّارہ ایسا اژدھا ہے جو خواہشات نفسانیہ کے جال بچھاتا ہے اور تمام کے تمام لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں سوائے ان کے کہ جن پر ان کا رب رحم کرے اور ان پر اپنے بازو لطف اور ہدایت کے ساتھ پھیلا لے۔

نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حضرت یوسف کو کہنا پڑا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ یعنی مَیں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مخلصی غیر ممکن ہے مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرماوے۔ اس آیت میں جیسا کہ فقرہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ہے طوفانِ نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ [1] پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفان شہوات نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص۴۹ طبع اوّل)

نفس کی تین قسمیں ہیں امّارہ لوّامہ مطمئنّہ مطمئنّہ کی ایک حالت نفس زکیّہ کہلاتی ہے نفس زکیہ بچّوں کا نفس ہوتا ہے جس کو کوئی ہوا نہیں لگی ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کے نشیب و فراز سے ناواقف ایک ہموار سطح پر چلتے ہیں نفس امّارہ وہ ہے جب کہ دُنیا کی ہوا لگتی ہے۔ نفس لوّامہ وہ نفس ہے جبکہ ہوش آتی ہے اور لغزشوں کو سوچتا ہے اور کوشش کرتا ہے اور بدیوں سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے اور نفس مطمئنّہ وہ ہوتا ہے جبکہ ہر قسم کی بدیوں سے بچنے کی بفضلِ الٰہی قوّت اور طاقت پاتا ہے اور ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں سے اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے اور اس طرح پر ایک برودت اور اطمینان قلب کو حاصل ہوتا ہے کسی قسم کی گھبراہٹ اور اضطراب باقی نہ رہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

انسان میں نفس بھی ہے اور اُس کی تین قسم ہیں امّارہ۔ لوّامہ مطمئنّہ۔ امّارہ کی حالت میں انسان جذبات اور بے جا جوشوں کو سنبھال نہیں سکتا اور اندازہ سے نکل جاتا اور اخلاقی حالت سے گر جاتا ہے مگر حالت لوّامہ میں سنبھال لیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۹)

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تین حالتیں ہیں ایک امّارہ۔ دوسری لوّامہ۔ تیسری مطمئنّہ۔ نفس امّارہ کی حالت میں انسان شیطان کے پنجہ میں گویا گرفتار ہوتا ہے اور اُس کی طرف بہت جھکتا ہے لیکن نفس لوّامہ کی حالت میں وہ اپنی خطا کاریوں پر نادم ہوتا اور شرمسار ہو کر خدا کی طرف جھکتا ہے مگر اس حالت میں بھی ایک جنگ رہتی ہے کبھی شیطان کی طرف جھکتا ہے اور کبھی رحمان کی طرف مگر نفس مطمئنّہ کی حالت میں وہ عبادالرحمان کے زُمرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ گویا ارتفاعی نقطہ ہے جس کے بالمقابل نیچے کی طرف امّارہ ہے۔ اس میزان کے بیچ میں لوّامہ ہے جو ترازو کی زبان کی طرح ہے۔ انخفاضی نقطہ کی طرف اگر زیادہ جھکتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر اور اَرذل ہو جاتا ہے اور اِرتفاعی نقطہ کی طرف جس قدر رجوع کرتا ہے اُسی قدر

[1] ہود آیت ۴۴

اللہ تعالیٰ کی طرف قریب ہوتا جاتا ہے اور سفلی اور اَرضی حالتوں سے نکل کر علوی اور سماوی فیضان سے حصہ لیتا ہے۔
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۳)

نفس تین قسم کے ہوتے ہیں ایک نفس امّارہ ایک لوّامہ اور تیسرا مطمئنہ۔ پہلی حالت میں تو صُمٌّ بُکْمٌ ہوتا ہے کچھ معلوم اور محسوس نہیں ہوتا کہ کدھر جا رہا ہے۔ امّارہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کا فضل ہو تو معرفت کی ابتدائی حالت میں لوّامہ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ اور نیکی میں فرق کرنے لگتا ہے گناہ سے نفرت کرتا ہے مگر پوری قدرت اور طاقت عمل کی نہیں پاتا۔ نیکی اور شیطان سے ایک قسم کا جنگ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کبھی یہ غالب ہوتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ حالت آجاتی ہے کہ یہ مطمئنہ کے رنگ میں آجاتا ہے اور پھر گناہوں سے نری نفرت ہی نہیں ہوتی بلکہ گناہ کی لڑائی میں یہ فتح پا لیتا ہے اور اُن سے بچتا ہے اور نیکیاں اس سے بلا تکلف صادر ہونے لگتی ہیں۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

جب انسان شرعی امور کو ادا کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور بُری اور مکروہ باتوں سے اس کو بچا لیتا ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ کے یہی معنے ہیں۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

نفس کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے۔ نفس امّارہ۔ نفس لوّامہ۔ نفس مطمئنہ۔ ایک نفس زکیہ بھی ہوتا ہے مگر وہ بچپن کی حالت ہے جب گناہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اس نفس کو چھوڑ کر بلوغ کے بعد تین نفسوں ہی کی بحث کی ہے۔ نفس امّارہ کی وہ حالت ہے جب انسان شیطان اور نفس کا بندہ ہوتا ہے اور نفسانی خواہشوں کا غلام اور اسیر ہو جاتا ہے۔ جو حکم نفس کرتا ہے اس کی تعمیل کے واسطے اس طرح طیار ہو جاتا ہے جیسے ایک غلام دست بستہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لئے مستعد ہوتا ہے۔ اس وقت یہ نفس کا غلام ہو کر جو وہ کہے یہ کرتا ہے۔ وہ کہے خون کر تو یہ کرتا ہے۔ زنا کہے۔ چوری کہے۔ غرض جو کچھ بھی کہے سب کے لئے طیار ہوتا ہے کوئی بدی کوئی بُرا کام ہو جو نفس کہے یہ غلاموں کی طرح کر دیتا ہے۔ یہ نفس امّارہ کی حالت ہے۔ اور یہ وہ شخص ہے جو نفس امّارہ کا تابع ہے۔

اس کے بعد نفس لوّامہ ہے۔ یہ ایسی حالت ہے کہ گناہ تو اس سے بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں مگر وہ نفس کو ملامت بھی کرتا رہتا ہے اور اس تدبیر اور کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اُسے گناہ سے نجات مل جائے۔ جو لوگ نفس لوّامہ کے ماتحت یا اس حالت میں ہوتے ہیں وہ ایک جنگ کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی شیطان اور نفس سے جنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس غالب آکر لغزش ہو جاتی ہے اور کبھی خود نفس پر غالب

آجاتے اور اس کو دبالیتے ہیں یہ لوگ نفس امّارہ والوں سے ترقی کر جاتے ہیں۔نفس امّارہ والے انسان اور دوسرے بہائم میں کوئی فرق نہیں ہوتا جیسے کتّا یا بلّی جب کوئی برتن ننگا دیکھتے ہیں تو فوراً جا پڑتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ وہ چیز ان کا حق ہے یا نہیں۔اسی طرح پر نفس امّارہ کے غلام انسان کو جب کسی بدی کا موقع ملتا ہے تو فوراً اُسے کر بیٹھتا ہے اور طیار رہتا ہے۔اگر راستہ میں دو چار روپے پڑے ہوں تو فی الفور اُن کے اٹھانے کو طیار ہوجاویگا اور نہیں سوچے گا کہ اس کو اُن کے لینے کا حق ہے یا نہیں مگر لوّامہ والے کی یہ حالت نہیں۔وہ حالت جنگ میں ہے جس میں کبھی نفس غالب کبھی وہ، ابھی کامل فتح نہیں ہوئی۔مگر تیسری حالت جو نفس مطمئنہ کی حالت ہے یہ وہ حالت ہے جب ساری لڑائیوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور کامل فتح ہوجاتی ہے اسی لئے اس کا نام نفس مطمئنہ رکھا ہے یعنی اطمینان یافتہ۔اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سچا ایمان لاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ واقعی خدا ہے۔نفس مطمئنہ کی انتہائی حد خدا پر ایمان ہوتا ہے کیونکہ کامل اطمینان اور تسلی اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو۔

یقیناً سمجھو کہ ہر ایک پاکبازی اور نیکی کی اصلی جڑ خدا پر ایمان لانا ہے۔جس قدر انسان کا ایمان باللہ کمزور ہوتا ہے اسی قدر اعمال صالحہ میں کمزوری اور سستی پائی جاتی ہے لیکن جب ایمان قوی ہو اور اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفات کاملہ کے ساتھ یقین کر لیا جائے اسی قدر عجیب رنگ کی تبدیلی انسان کے اعمال میں پیدا ہوجاتی ہے۔خدا پر ایمان رکھنے والا گناہ پر قادر نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایمان اس کی نفسانی قوتوں اور گناہ کے اعضا کو کاٹ دیتا ہے۔دیکھو اگر کسی کی آنکھیں نکال دی جاویں تو وہ آنکھوں سے بدنظری کیونکر کرسکتا ہے اور آنکھوں کا گناہ کیسے کرے گا اور اگر ایسا ہی ہاتھ کاٹ دئے جاویں یا شہوانی قویٰ کاٹ دیئے جاویں۔پھر وہ گناہ جو ان اعضا سے متعلق ہیں کیسے کرسکتا ہے ؟ ٹھیک اسی طرح پر جب ایک انسان نفس مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے تو نفس مطمئنہ اُسے اندھا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گناہ کی قوّت نہیں رہتی۔وہ دیکھتا ہے پر نہیں دیکھتا کیونکہ آنکھوں کے گناہ کی نظر سلب ہوجاتی ہے۔وہ کان رکھتا ہے مگر بہرہ ہوتا ہے اور وہ باتیں جو گناہ کی ہیں نہیں سُن سکتا۔اسی طرح پر اس کی تمام نفسانی اور شہوانی قوتیں اور اندرونی اعضا کاٹ دئے جاتے ہیں۔اس کی ان ساری طاقتوں پر جن سے گناہ صادر ہوسکتا تھا ایک موت واقع ہوجاتی ہے اور وہ بالکل ایک میّت کی طرح ہوتا ہے۔اور خدا تعالیٰ ہی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔وہ اس کے سوا ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔یہ وہ حالت ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامل اطمینان اُسے دیا جاتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جو انسان کا اصل مقصود ہونا چاہیئے اور ہماری جماعت کو اسی کی ضرورت ہے اور اطمینان کامل کے حاصل کرنے کے واسطے ایمان کامل کی ضرورت ہے پس ہماری جماعت کا پہلا فرض یہ ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان حاصل کریں۔ (الحکم جلد ۸ ۔ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زمانہ جوش شباب اور جوانی کا زمانہ ہے ایک ایسا زمانہ ہے کہ نفس امارہ نے اس کو ردّی کیا ہوا ہے لیکن اگر کوئی کار آمد ایام ہیں تو یہی ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن شریف میں ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھرا سکتا کیونکہ نفس امارہ بدی کی طرف تحریک کرتا ہے۔ اس کی اس قسم کی تحریکوں سے وہی پاک ہو سکتا ہے جس پر میرا رب رحم کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بدیوں اور جذبات سے بچنے کے واسطے نری کوشش ہی شرط نہیں بلکہ دعاؤں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ نرا زہد ظاہری ہی (جو انسان اپنی سعی اور کوشش سے کرتا ہے) کار آمد نہیں ہوتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم ساتھ نہ ہو اور اصل تو یہ ہے کہ اصل زہد اور تقویٰ تو ہے ہی وہی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ حقیقی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ اسی طرح ملتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۔ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان نفس امارہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی تدبیروں میں لگا ہوا ہوتا ہے تو اس کا نفس امارہ خدا تعالیٰ کے نزدیک لوّامہ ہو جاتا ہے اور ایسی قابل قدر تبدیلی پا لیتا ہے کہ یا تو وہ امارہ تھا جو لعنت کے قابل تھا اور یا تدبیر اور تجویز کرنے سے وہی قابل لعنت نفس امارہ لوّامہ ہو جاتا ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اس کی قسم کھاتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا شرف نہیں ہے۔ پس حقیقی تقویٰ اور طہارت کے حاصل کرنے کے واسطے اوّل یہ ضروری شرط ہے کہ جہاں تک بس چلے اور ممکن ہو تدبیر کرو اور بدی سے بچنے کی کوشش کرو۔ بدعادتوں اور بد صحبتوں کو ترک کر دو۔ ان مقامات کو چھوڑ دو جو اس قسم کی تحریکوں کا موجب ہو سکیں جس قدر دُنیا میں تدبیر کی راہ کھُلی ہے اس قدر کوشش کرو اور اس سے نہ تھکو نہ ہٹو۔ (الحکم جلد ۹ ۔ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

نفس کے تین درجہ ہیں نفس امارہ۔ لوّامہ۔ مطمئنہ۔ نفس امارہ وہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا ہے اور نافرمانی کا غلام ہے۔ ایسی حالت میں انسان نیکی کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر ایک سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے لیکن جب اس سے کچھ ترقی کرتا اور نکلتا ہے تو وہ وہ حالت ہے جو نفس لوّامہ کہلاتی ہے۔ اِسلئے کہ وہ اگر بدی کرتا ہے تو اس سے شرمندہ بھی ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت بھی کرتا ہے اور اس طرح پر نیکی کی طرف بھی توجہ کرتا ہے لیکن اس حالت میں وہ کامل طور پر اپنے نفس پر غالب نہیں آتا بلکہ اس کے اور نفس کے درمیان ایک جنگ جاری رہتی ہے جس میں کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی نفس اسے مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ سلسلہ لڑائی کا بدستور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری کرتا ہے

کرتا ہے اور آخر اُسے کامیاب اور بامراد کرتا ہے اور وہ اپنے نفس پر فتح پالیتا ہے پھر تیسری حالت میں پہنچ جاتا ہے جس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ اس وقت اس کے نفس کے تمام گند دُور ہوجاتے ہیں اور ہر قسم کے فساد مٹ جاتے ہیں نفسِ مطمئنہ کی آخری حالت ایسی حالت ہوتی ہے جیسے دو سلطنتوں کے درمیان ایک جنگ ہو کہ ایک فتح پالے اور وہ تمام مفسدہ دور کرکے امن قائم کرے اور پہلا سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے .... جب روحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آتی ہے۔ شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے۔ وہ جذبات اور شہوات جو انسان کی روحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں ان کو کچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک نیا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن و امان کی حالت پیدا ہو جاتی ہے یہی وہ حالت اور درجہ ہے جو نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے اس لئے کہ اس وقت کسی قسم کی کشمکش اور کوئی فساد پایا نہیں جاتا بلکہ نفس ایک کامل سکون اور اطمینان کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ جنگ کا خاتمہ ہوکر نئی سلطنت قائم ہوجاتی ہے اور کوئی فساد اور مفسدہ باقی نہیں رہتا بلکہ دل پر خدا تعالیٰ کی فتح کامل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ خود اس کے عرشِ دل پر نزول فرماتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

نفسِ امّارہ اس کو کہتے ہیں کہ سوائے بدی کے اَور کچھ چاہتا ہی نہیں جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ یعنی نفسِ امّارہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بد راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ جتنے بدکار، چور، ڈاکو دُنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سب اسی نفس کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ایسا شخص جو نفسِ امّارہ کے ماتحت ہو ہر ایک طرح کے بدکام کر لیتا ہے.... غرض جو انسان نفسِ امّارہ کے تابع ہوتا ہے وہ ہر ایک بدی کو شیرِ مادر کی طرح سمجھتا ہے اور جب تک کہ وہ اسی حالت میں رہتا ہے بدیاں اس سے دُور نہیں ہوسکتیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

انسان نفسِ امّارہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جب تک اللہ کا فضل اور توفیق اس کے شاملِ حال نہ ہو کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ دعائیں کرتا رہے تا کہ خدا کی طرف سے اسے نیکی پر قدرت دی جاوے اور نفسِ امّارہ کی قیدوں سے رہائی عطا کی جاوے۔ یہ انسان کا سخت دشمن ہے۔ اگر نفسِ امّارہ نہ ہوتا تو شیطان بھی نہ ہوتا۔ یہ انسان کا اندرونی دشمن اور مارِ آستین ہے اور شیطان بیرونی دشمن ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب چور کسی کے مکان میں نقب زنی کرتا ہے تو کسی گھر کے بھیدی اور واقف کار سے پہلے سازش کرنی ضروری ہوتی ہے بیرونی چور بجز اندرونی بھیدی کی سازش کے کچھ کر ہی نہیں سکتا اور کامیاب ہو ہی نہیں سکتا پس یہی وجہ ہے کہ شیطان بیرونی دشمن، نفسِ امّارہ اندرونی، اور گھر کے بھیدی سے سازش کرکے ہی انسان کے متاعِ ایمان میں نقب زنی کرتا ہے اور نورِ ایمان کو غارت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ یعنی میں اپنے نفس کو بَری نہیں ٹھیراتا اور اس کی طرف سے مطمئن نہیں کہ نفس پاک ہو گیا ہے بلکہ یہ تو شریر الحکومت ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳-۴)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں نفس انسان کے تین مرتبے بیان فرمائے ہیں امّارہ، لوّامہ، مطمئنہ۔ نفس امّارہ تو ہر وقت انسان کو گناہ اور نافرمانی کی طرف کھینچتا رہتا ہے اور بہت خطرناک ہے۔ لوّامہ وہ ہے کہ کبھی کوئی بدی ہو جاوے تو ملامت کرتا ہے مگر یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ قابلِ اطمینان صرف نفس کی وہ حالت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفس مطمئنہ کے نام سے پکارا ہے اور وہی اچھا ہے۔ وہ اسی حالت کا نام ہے کہ جب انسان خدا کے ساتھ ٹھیر جاتا ہے۔ اسی حالت میں آکر انسان گناہ کی آلائش سے پاک کیا جاتا ہے۔ یہی ایک گناہ سوز حالت ہے اور اسی درجہ کے انسانوں کے ساتھ برکات کے وعدے ہوئے ہیں۔ ملائکہ کا نزول ان پر ہوتا ہے اور حقیقی نیکی اور پاکی صرف انہیں کا حصّہ ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

امّارہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ امّارہ کہتے ہیں بدی کی طرف لے جانیوالا۔ بہت بدی کا حکم کرنے والا.... نفس امّارہ انسان کا دشمن ہے اور وہ گھر کا پوشیدہ دشمن ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اَمَّارَۃٌ مبالغہ کا صیغہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بدی کی طرف بار بار جانے والا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

۵۵۔ وَقَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ اَمِیۡنٌ ﴿۵۵﴾

اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ اَمِیۡنٌ .... تو آج ہمارے نزدیک صاحب مرتبہ اور امانتدار..... ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۵۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴ طبع اوّل)

آج تو میرے نزدیک با مرتبہ اور امین ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۰۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

۶۴۔ فَلَمَّا رَجَعُوۡۤا اِلٰۤی اَبِیۡہِمۡ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الۡکَیۡلُ فَاَرۡسِلۡ

مَعَنَآ اَخَانَا نَکْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝

اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ..... ہم ہی محافظ ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۶۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

۸۸ یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝

ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید اور فضل کے بغیر ایک انگلی کا ہلانا بھی مشکل ہے ہاں یہ انسان کا فرض ہے کہ سعی اور مجاہدہ کرے جہاں تک اس سے ممکن ہے اور اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ سے ہی چاہے۔ کبھی اس سے مایوس نہ ہو کیونکہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے خود بھی فرمایا لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر ناامید ہوتے ہیں۔ ناامیدی بہت ہی بُری چیز ہے۔ اصل میں ناامید وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ پر بدظنی کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ را پریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۹۱ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِیْ ٘ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۝

اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی جو شخص صبر کرے گا اور ڈرے گا خدا اس کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ یہ عام پیشگوئی ہے جو تقویٰ اور صبر کے ساتھ مشروط ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۵ حاشیہ طبع اوّل)

۹۳ قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ٘ وَهُوَ اَرْحَمُ

الرَّاحِمِیْنَ

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ والوں اور دوسرے لوگوں پر بکلّی فتح پا کر اور اُن کو اپنی تلوار کے نیچے دیکھ کر پھر ان کا گناہ بخش دیا اور صرف اُنہیں چند لوگوں کو سزا دی جن کو سزا دینے کے لئے حضرت احدیّت کی طرف سے قطعی حکم وارد ہو چکا تھا اور بجز ان ازلی ملعونوں کے ہر یک دشمن کا گناہ بخش دیا اور فتح پا کر سب کو لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہا اور اسی عفو تقصیر کی وجہ سے کہ جو مخالفوں کی نظر میں ایک امر محال معلوم ہوتا تھا اور اپنی شرارتوں پر نظر کرنے سے وہ اپنے تئیں اپنے مخالف کے ہاتھ میں دیکھ کر مقتول خیال کرتے تھے ہزاروں انسانوں نے ایک ساعت میں دینِ اسلام قبول کر لیا۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۵۷-۲۵۸ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ خدا تمہیں بخش دے گا اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۶۸ طبع اوّل)

.....حلم میں اپنی شان دکھاتے ہیں تو واجب القتل کو چھوڑ دیتے ہیں.... اگر حکومت کا رنگ نہ ہوتا تو یہ کیونکر ثابت ہوتا کہ آپ واجب القتل کفار مکّہ کو باوجود مقدرت انتقام بخش سکتے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام اور خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمان عورتوں کو سخت سے سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی تھیں۔ جب وہ سامنے آئے تو آپ نے فرمایا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ مَیں نے آج تم کو بخش دیا۔ اگر ایسا موقع نہ ملتا تو ایسے اخلاق فاضلہ حضور کے کیونکر ظاہر ہوتے؟ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۳)

ابوجہل اور اس کے دوسرے رفیقوں نے کونسی تکلیف تھی جو آپ کو اور آپ کے جاں نثار خادموں کو نہیں دی۔ غریب مسلمان عورتوں کو اونٹوں سے باندھ کر مخالف جہات میں دوڑایا اور وہ چیری جاتی تھیں محض اس گناہ پر کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر کیوں قائل ہوئیں مگر آپ نے اس کے مقابل صبر و برداشت سے کام لیا اور جبکہ مکّہ فتح ہؤا تو لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہہ کر معاف فرمایا۔ یہ کس قدر اخلاقی کمال ہے جو کسی دوسرے نبی میں نہیں پایا جاتا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ غرض بات یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ حاصل کرو کہ نیکیوں کی کلید اخلاق ہی ہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے دو پہلو دکھلائے ایک مکّی زندگی میں جب آپ کے ساتھ صرف چند آدمی تھے اور کچھ قوت نہ تھی۔ دوسرا مدنی زندگی میں جبکہ آپ فاتح ہوئے اور وہی کفّار جو آپ کو تکلیف دیتے تھے اور آپ اُن کی ایذا ہی پر صبر کرتے تھے اب آپ کے قابو میں آ گئے ایسا کہ جو چاہتے آپ اُن کو سزا دے سکتے تھے مگر آپ نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہہ کر اُن کو چھوڑ دیا اور کچھ سزا نہ دی۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۹

مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

مکّہ میں جن لوگوں نے دُکھ دیئے تھے جب آپ نے مکّہ کو فتح کیا تو آپ چاہتے تو سب کو ذبح کر دیتے مگر آپ نے رحم کیا اور لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہہ دیا۔ آپ کا بخشنا تھا کہ سب مسلمان ہو گئے۔ اب اس قسم کے عظیم الشان اخلاق فاضلہ کیا کسی نبی میں پائے جاتے ہیں ہرگز نہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کی ذات خاص اور عزیزوں اور صحابہ کو سخت تکلیفیں دی تھیں اور ناقابل عفو ایذائیں پہنچائی تھیں آپ نے سزا دینے کی قوّت اور اقتدار کو پا کر فی الفور ان کو بخش دیا حالانکہ اگر اُن کو سزا دی جاتی تو یہ بالکل انصاف اور عدل تھا مگر آپ نے اس وقت اپنے عفو اور کرم کا نمونہ دکھایا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ جب مکّہ والوں نے آپ کو نکالا اور تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفیں آپ کو پہنچاتے رہے۔ آپ کے صحابہ کو سخت سخت تکلیفیں دیں جن کے تصوّر سے بھی دل کانپ جاتا ہے اُس وقت جیسے صبر اور برداشت سے آپ نے کام لیا وہ ظاہر بات ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ہجرت کی اور پھر فتح مکّہ کا موقع ملا تو اس وقت ان تکالیف اور مصائب اور سختیوں کا خیال کر کے جو مکّہ والوں نے تیرہ۱۳ سال تک آپ پر اور آپ کی جماعت پر کی تھیں آپ کو حق پہنچتا تھا کہ قتل عام کر کے مکّہ والوں کو تباہ کر دیتے اور اس قتل میں کوئی مخالف بھی آپ پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان تکالیف کے لئے وہ واجب القتل ہو چکے تھے اس لئے اگر آپ میں قوّت غضبی ہوتی تو وہ بڑا عجیب موقع انتقام کا تھا کہ وہ سب گرفتار ہو چکے تھے مگر آپ نے کیا کیا؟ آپ نے اُن سب کو چھوڑ دیا اور کہا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے مکّہ کی مصائب اور تکالیف کے نظارہ کو دیکھو کہ قوّت وطاقت کے ہوتے ہوئے کس طرح پر اپنے جانستان دشمنوں کو معاف کیا جاتا ہے۔ یہ ہے نمونہ آپ کے اخلاق فاضلہ کا جس کی نظیر دُنیا میں پائی نہیں جاتی ... مکّہ والے بھی اپنی شرارتوں اور مجرمانہ حرکات کے باعث اس قابل تھے کہ اُن کو سخت سزائیں دی جائیں اور اُن کے وجود سے اس ارض مقدس اور اس کے گرد نواح کو صاف کر دیا جاتا مگر یہ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ[1] اور اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[2] کا مصداق اپنے واجب القتل دشمنوں کو بھی پوری قوّت اور مقدرت کے ہوتے ہوئے کہتا ہے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

تمام جزیرہ عرب ایک سرے سے دوسرے سرے تک غلام بنا ہوا ہے۔ کوئی مخالفت کے رنگ میں چُوں بھی نہیں کر سکتا اور ایسا اقتدار اور رعب خدا نے دیا ہوا ہے کہ اگر چاہتے تو کُل عرب کو قتل (کر) ڈالتے۔ اگر ایک نفسانی انسان ہوتے تو اُن سے اُن کی کرتوتوں کا بدلہ لینے کا عمدہ موقع تھا جب اُلٹ کر

---

[1] الانبیاء آیت ۱۰۸ [2] القلم آیت ۵

مکہ فتح کیا تو لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ فرمایا۔ (الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

ہمارے نبی کریم صلعم کو ہر ایک طرح کے اخلاق کو ظاہر کرنے کا موقع ملا حضرت موسٰی کو دیکھو کہ وہ راستہ میں ہی فوت ہو گئے تھے اور حضرت عیسٰی تو ہمیشہ مغلوب ہی رہے معلوم نہیں اگر غالب ہوتے تو کیا کرتے۔ مگر ہمارے نبی کریم صلعم نے ہر طرح سے اقتدار اور اختیار حاصل کر کے اپنے جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کو اپنے سامنے بُلا کر کہہ دیا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿۹۵﴾

ہر امر کے فیصلہ کے لئے معیار قرآن ہے۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کا پیارا بیٹا یوسف علیہ السلام جب بھائیوں کی شرارت سے اُن سے الگ ہو گیا تو آپ چالیس برس تک اُس کے لئے دعائیں کرتے رہے اگر وہ جلد باز ہوتے تو کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوتا۔ چالیس برس تک دعاؤں میں لگے رہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان رکھا آخر چالیس برس کے بعد وہ دعائیں کھینچ کر یوسف کو لے ہی آئیں۔ اس عرصہ دراز میں بعض ملامت کرنے والوں نے یہ بھی کہا کہ تو یوسف کو بے فائدہ یاد کرتا ہے مگر انہوں نے یہی کہا کہ میں خدا سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے بیشک ان کو کچھ خبر نہ تھی مگر یہ کہا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ۔ پہلے تو اتنا ہی معلوم تھا کہ دعاؤں کا سلسلہ لمبا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر دعاؤں میں محروم رکھنا ہوتا تو وہ جلد جواب دے دیتا مگر اس سلسلہ کا لمبا ہونا قبولیت کی دلیل ہے کیونکہ کریم سائل کو دیر تک بٹھا کر کبھی محروم نہیں کرتا بلکہ بخیل سے بخیل بھی ایسا نہیں کرتا وہ بھی سائل کو اگر زیادہ دیر تک دروازہ پر بٹھائے تو آخر اس کو کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دعاؤں کے زمانہ کی درازی پر وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰہُ[1] قرآن میں خود دلالت کر رہی ہیں۔ غرض دعاؤں کے سلسلہ کے دراز ہونے سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہر نبی کی تکمیل بھی جدا جدا پیرایوں میں کرتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اسی غم میں رکھی تھی۔

(الحکم جلد ۶ ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

بہت سی باتیں پیشگوئیوں کے طور پر نبیوں کی معرفت لوگوں کو پہنچتی ہیں اور جب تک وہ اپنے وقت

[1] یوسف آیت ۸۵

پرظاہر نہ ہوں ان کی بابت کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن جب ان کا ظہور ہوتا ہے اور حقیقت کھلتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پیشگوئی کا یہ مفہوم اور منشا تھا اور جو شخص اس کا مصداق ہو یا جس کے حق میں ہو اس کو اس کا علم دیا جاتا ہے ... حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں چالیس سال تک روتے رہے آخر جا کر آپ کو خبر ملی تو کہا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ ورنہ اس سے پہلے آپ کا یہ حال ہوا کہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے وَابْیَضَّتْ عَیْنٰہُ[1] تک نوبت پہنچی۔ اسی کے متعلق کیا اچھا کہا ہے ؎

کسے پُرسید ازاں گم کردہ فرزند | کہ اے روشن گہر پیر خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی | چرا در چاہِ کنعانش نہ دیدی

(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

جب سماع کے ذریعہ سے کوئی خبر دی جاتی ہے تو اسے وحی کہتے ہیں اور جب رویت کے ذریعہ سے کچھ بتلایا جاوے تو اسے کشف کہتے ہیں۔ اسی طرح مَیں نے دیکھا ہے کہ بعض وقت ایک ایسا امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف قوتِ شامہ سے ہوتا ہے مگر اس کا نام نہیں رکھ سکتے جیسے یوسفؑ کی نسبت حضرت یعقوب کو جو ہوا آئی تھی اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۴)

کشف اسے کہتے ہیں کہ انسان پر بیداری کے عالم میں ایک ایسی ربودگی طاری ہو کہ وہ سب کچھ جانتا بھی ہو اور حواس خمسہ اس کے کام بھی کر رہے ہوں اور ایک ایسی ہوا چلے کہ نئے حواس اُسے مل جاویں جن سے وہ عالم غیب کے نظارے دیکھ لے۔ وہ حواس مختلف طور سے ملتے ہیں کبھی بصر میں، کبھی شامہ (سونگھنے) میں کبھی سمع میں، شامہ میں اس طرح جیسے کہ حضرت یوسف کے والد نے کہا لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (کہ مجھے یوسف کی خوشبو آتی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا) اس سے مراد وہی نئے حواس ہیں جو کہ یعقوبؑ کو اس وقت حاصل ہوئے اور انہوں نے معلوم کیا کہ یوسفؑ زندہ موجود ہے اور ملنے والا ہے اس خوشبو کو دوسرے پاس والے نہ سونگھ سکے کیونکہ ان کو وہ حواس نہ ملے تھے جو کہ یعقوبؑ کو ملے۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ۝

---

[1] یوسف آیت ۸۵

ضال کے معنی گمراہ نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ کے تعشق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوب کی نسبت اسی کے مناسب یہ آیت ہے اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ۔ سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص جادۂ اعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہوات غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہو جاوے لیکن قرآن کریم میں عشاق کے حق میں بھی آئے ہیں جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو پیروں کے نیچے کچل دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ✧ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اس دیوانگی سے حافظ صاحب حالت تعشق اور شدت حرص اطاعت مراد لیتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۷۳ طبع اوّل)

ضلالت کے یہ بھی معنے ہیں کہ افراط محبت سے ایک شخص کو ایسا اختیار کیا جائے کہ دوسرے کا عزت کے ساتھ نام سننے کی بھی برداشت نہ رہے جیسا کہ اس آیت میں بھی یہی معنے مراد ہیں کہ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ۔

(تحفہ گولڑویہ حاشیہ در حاشیہ صفحہ ۱۰۲ طبع اوّل)

۱۰۲ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝

اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ یعنی اے میرے خدا تو دنیا اور آخرت میں میرا متولی ہے۔ مجھے اسلام پر وفات دے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۱۹ طبع اوّل)

ایسی نظیریں مجھے تین سو سے بھی زیادہ احادیث میں سے ملیں جن سے ثابت ہوا کہ جہاں کہیں توفّی کے لفظ کا خدا فاعل ہو اور وہ شخص مفعول بہ ہو جس کا نام لیا گیا ہے تو اُس جگہ صرف مار دینے کے معنی ہیں نہ اور کچھ۔ مگر باوجود تمام تر تلاش کے ایک بھی ایسی حدیث مجھے نہ ملی جس میں توفّی کے فعل کا خدا فاعل ہو اور مفعول بہ علم ہو یعنی نام لے کر کسی شخص کو مفعول بہ ٹھہرایا گیا ہو اور اس جگہ بجز مارنے کے کوئی اور معنی ہوں۔ اسی طرح جب قرآن شریف پر اوّل سے آخر تک نظر ڈالی گئی تو اس سے بھی یہی ثابت ہوا جیسا کہ آیت

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ اور آیت وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ[1] وغیرہ آیات سے ثابت ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۰۶-۲۰۷ طبع اوّل)

۱۰۹ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

کہہ کہ یہ میری راہ ہے۔ مَیں اللہ کی طرف بصیرت کاملہ کے ساتھ بلاتا ہوں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۸ طبع اوّل)

۱۱۱ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ○

بعض پیشگوئیاں باریک اسرار اپنے اندر رکھتی ہیں اور دقیق امور کی وجہ سے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں جو دُور بین آنکھیں نہیں رکھتے اور موٹی موٹی باتوں کو صرف سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی ہی پیشگوئیوں پر عموماً تکذیب ہوتی ہے اور جلد باز اور شتاب کار کہہ اُٹھتے ہیں کہ وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا۔ اِن پیشگوئیوں میں لوگ شبہات پیدا کرتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ پیشگوئیاں خدا تعالیٰ کی سُنن کے ماتحت پوری ہوجاتی ہیں تاہم اگر وہ سمجھ میں نہ بھی آئیں تو مومن اور خدا ترس انسان کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان پیشگوئیوں پر نظر کرے جن میں دقائق نہیں یعنی جو موٹی موٹی پیشگوئیاں ہیں۔ پھر دیکھے کہ وہ کس قدر تعداد میں پوری ہوچکی ہیں۔ یونہی منہ سے انکار کر دینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ دیانت اور خدا ترسی سے ان پیشگوئیوں کو دیکھنا چاہیئے جو پوری ہوچکی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

۱۱۲ لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ

---

[1] الرعد آیت ۴۱

حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

قرآن ایسی کتاب نہیں کہ انسان اس کو بنا سکے بلکہ اس کے آثارِ صدق ظاہر ہیں کیونکہ وہ پہلی کتابوں کو سچا کرتا ہے یعنی کتب سابقہ انبیاء میں جو اس کے بارہ میں پیشین گوئیں موجود تھیں وہ اس کے ظہور سے بہ پایۂ صداقت پہنچ گئیں اور جن عقائد حقّہ کے بارہ میں ان کتابوں میں دلائلِ واضح موجود نہ تھیں اُنکے قرآن نے دلائل بتلائے اور ان کی تعلیم کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔ اس طور پر ان کتابوں کو سچا کیا جس سے خود سچائی اُس کی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے نشانِ صدق یہ کہ ہر یک صداقتِ دینی کو وہ بیان کرتا ہے اور تمام وہ امور بتلاتا ہے کہ جو ہدایتِ کامل پانے کے لئے ضروری ہیں۔ اور یہ اس لئے نشانِ صدق ٹھہرا کہ انسان کی طاقت سے یہ بات باہر ہے کہ اس کا علم ایسا وسیع و محیط ہو جس سے کوئی دینی صداقت و حقائق دقیقہ باہر نہ رہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ——— نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سُورۃ الرَّعۡد

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۳ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ۝

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس آیت کے ظاہری معنے کے رُو سے اِس جگہ شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الوراء ہونے کی ایک حالت ہے جو اُس کی صفت ہے پس جب کہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلّی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اُس میں پھونک دئے تو اِس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ

سے پاک ہے اس لئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزّہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراء مقام پر ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۵-۲۶۶ طبع اوّل)

خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی و ارضی پیدا کر کے پھر اپنے وجود کو وراء الوراء مقام میں مخفی کیا جس کا نام عرش ہے اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں جو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات میں ہی درج ہیں تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا یعنی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکِ یوم الجزاء ہونا سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کی کلام میں قرار دئے گئے ہیں جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی اس وراء الوراء مقام میں جو خدا ہے اُس مخفی مقام سے اُس کو دکھلا رہے ہیں ورنہ خدا کی شناخت کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۷ حاشیہ طبع اوّل)

استعارہ کے طور پر خدا کے صفات کے ظہور کو ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ سے بیان کیا ہے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہوا۔ صفات اس کے ازلی ابدی ہیں مگر جب مخلوق ہو تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہوں تو رازق کو پہچانیں اسی طرح اُس کے علم اور قادر مطلق ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ خدا کی اُس تجلّی کی طرف اشارہ ہے جو خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ[1] کے بعد ہوئی۔

(البدر نمبر ۵ جلد ۲ صفحہ ۳۵ ۲۰ر فروری ۱۹۰۳ء)

۱۲ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ... خدا تعالیٰ کی طرف سے چوکیدار مقرر ہیں جو اس کے بندوں کی ہر طرف سے یعنی کیا ظاہری طور پر اور کیا باطنی طور پر حفاظت کرتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۷۹)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ارادہ کی

---

[1] الانعام آیت ۲

اس وقت تبدیلی ہوگی جب دلوں کی تبدیلی ہوگی۔ پس خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے قہر سے خوف کھاؤ۔ کوئی کسی کا ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ معمولی مقدمہ کسی پر ہو تو اکثر لوگ وفا نہیں کر سکتے پھر آخرت میں کیا بھروسہ رکھ سکتے ہو۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ اُس نیکی یا بدی کو جو کسی قوم کے شاملِ حال ہے دُور نہیں کرتا جب تک وہ قوم ان باتوں کو اپنے سے دُور نہ کرے جو اس کے دل میں ہیں۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۰۳ طبع اوّل)

جب تک دلوں کی وبا معصیت دُور نہ ہو تب تک ظاہری وبا بھی دُور نہیں ہوگی۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہفتم صفحہ ۵)

میری رائے ہے جب تک کہ لوگ کامل طور پر رجوع نہ کریں تقدیر نہ بدلے گی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

جب تک انسان مجاہدہ نہ کرے گا۔ دعا سے کام نہ لے گا وہ غمرہ جو دل پر پڑ جاتا ہے دُور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی آفت اور بلا کو جو قوم پر آتی ہے دُور نہیں کرتا ہے جب تک خود قوم اس کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمت نہ کرے شجاعت سے کام نہ لے تو کیونکر تبدیلی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک لاتبدیل سُنّت ہے جیسے فرمایا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[1]۔ پس ہماری جماعت ہو یا کوئی ہو وہ تبدیل اخلاق اُسی صورت میں کر سکتے ہیں جبکہ مجاہدہ اور دعا سے کام لیں ورنہ ممکن نہیں ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۶ جلد اوّل)

نیک بختی اور تقویٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور سعادت کی راہیں اختیار کرنی چاہئیں تب ہی کچھ ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ الایہ س ۱۳۔ خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ خود قوم اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے۔ خوانخواہ کے ظن کرنا اور بات کو انتہا تک پہنچانا بالکل بیہودہ بات ہے ضروری بات یہ ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ نماز پڑھیں۔ زکوٰۃ دیں۔ اتلاف حقوق اور بدکاریوں سے باز آئیں۔ (الانذار صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ اپنا قانون کبھی نہیں بدلتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ خدا تعالیٰ نے میرے الہام میں جو طاعون کے متعلق ہے یہ آیت رکھی ہے جو اس امر کی طرف رہبری کرتی ہے کہ تبدیلی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات ہے کہ انسان سُن کر کانوں تک ہی رہنے دے اور دل تک نہ

[1] الاحزاب آیت ۶۳

پہنچے۔ بڑا ہی ظالم وہ شخص ہے جو ظاہری حالت پر خوش ہو جاتا ہے اور سچی اطاعت کی حالت نہیں دکھاتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

انسان کو عذاب ہمیشہ گناہ کے باعث ہوتا ہے۔ خدا فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو صاف نہ کرے تب تک خدا عذاب کو دور نہیں کرتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

خدا نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ باوجود گنہگار ہونے کے اللہ تعالیٰ بغیر عذاب کے چھوڑ دے۔ ایک طرف تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ طاعون سے کوئی بستی خالی نہیں رہے گی اور طاعون کی وجہ صرف یہی ہے جو اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے الہام سے ظاہر ہے یعنی جب لوگوں نے اپنے افعال اور اعمال سے غضبِ الٰہی کے جوش کو بھڑکایا اور بدعملیوں سے اپنی حالتوں کو ایسا بدل لیا کہ خوفِ خدا اور تقویٰ وطہارت کی ہر ایک راہ کو چھوڑ دیا اور بجائے اس کے طرح طرح کے فسق وفجور کو اختیار کر لیا اور خدا پر ایمان سے بالکل ہاتھ دھو دیا۔ دہریت اندھیری رات کی طرح دُنیا پر محیط ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے نورانی چہرے کو ظلمت کے نیچے دبا دیا تو خدا نے اس عذاب کو نازل کیا تا لوگ خدا کے چہرے کو دیکھ لیں اور اس کی طرف رجوع کریں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لئے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دُکھوں سے رہائی پائے جو شامتِ اعمال نے اس کے لئے طیار کئے ہیں۔ اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ میں کیا ہے اس کے عذاب اور دُکھ کو بدلا دیتا ہے اور دُکھ کو سُکھ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ جب انسان اپنے اندر تبدیلی کرتا ہے تو اس کے لئے ضرور نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بھی دکھاتا پھرے۔ وہ رحیم کریم خدا جو دلوں کا مالک ہے اس کی تبدیلی کو دیکھ لیتا ہے کہ یہ پہلا انسان نہیں ہے اس لئے وہ اس پر فضل کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کبھی حالتِ قوم میں تبدیلی نہ کرے گا جب تک لوگ دلوں کی تبدیلی نہ کریں گے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو درست نہ کر لیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۹ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

یاد رکھیں کہ اللہ اس حالت کو نہیں بدلائے گا جب تک دلوں کی حالت میں یہ لوگ خود تبدیلی نہ کریں۔
(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

خدا انہیں چھوڑے گا اور ہرگز نہیں چھوڑے گا جب تک لوگ اپنے اخلاق۔ اعمال اور خیالات میں ایک تبدیلی پیدا نہ کرلیں گے۔
(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴؍مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۱۵: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○

تمام حاجتوں کو اس سے مانگنا چاہیئے اور جو لوگ بجز اُس کے اَور اَور چیزوں سے اپنی حاجت مانگتے ہیں وہ چیزیں اُن کی دعاؤں کا کچھ جواب نہیں دیتیں۔ ایسے لوگوں کی یہ مثال ہے جیسے کوئی پانی کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے کہ اے پانی میرے مونہہ میں آجا سو ظاہر ہے کہ پانی میں یہ طاقت نہیں کہ کسی کی آواز سُنے اور خود بخود اس کے مونہہ میں پہنچ جائے۔ اسی طرح مشرک لوگ بھی اپنے معبودوں سے عبث طور پر مدد طلب کرتے ہیں جس پر کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوسکتا۔
(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

دعا کرنے کے لائق وہی سچا خدا ہے جو ہر ایک بات پر قادر ہے اور جو لوگ اس کے سوا اَوروں کو پکارتے ہیں وہ کچھ بھی اُن کا جواب نہیں دے سکتے۔ اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلا وے کہ اے پانی میرے منہ میں آجا۔ کیا وہ اس کے مُنہ میں آجائے گا ہرگز نہیں۔ سو جو لوگ سچے خدا سے بے خبر ہیں اُن کی تمام دعائیں باطل ہیں۔
(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۸ طبع اوّل)

۱۷: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۵ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۵

اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوۡا کَخَلۡقِہٖ فَتَشَابَہَ الۡخَلۡقُ عَلَیۡہِمۡ ؕ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ ۝

کیا انہوں نے خدا تعالیٰ کے شریک ایسی صفات کے ٹھہرا رکھے ہیں کہ جیسے خدا تعالیٰ خالق ہے وہ بھی خالق ہیں تا اِس دلیل سے انہوں نے اُن کو خدا مان لیا۔ ان کو کہہ دے کہ ثابت شدہ یہی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہر ایک چیز کا ہے اور وہی اکیلا ہر ایک چیز پر غالب اور قاہر ہے۔

(جنگِ مقدس یعنی "اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ" ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء ص ۱۱ بیان حضرت مرزا صاحب۔ طبع اول)

یعنی خدا ہر ایک چیز کا خالق ہے کیونکہ وہ اپنی ذات اور صفات میں واحد ہے اور واحد بھی ایسا کہ قہار ہے یعنی سب چیزوں کو اپنے ماتحت رکھتا ہے اور اُن پر غالب ہے۔ یہ دلیل بذریعہ شکل اوّل کے جو بدیہی الانتاج ہے اِس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ صغریٰ اس کا یہ ہے جو خدا واحد اور قہار ہے اور کبریٰ یہ کہ ہر ایک جو واحد اور قہار ہو وہ تمام موجودات ماسوائے اپنے کا خالق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا جو خدا تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اثبات قضیۂ اولیٰ یعنی صغریٰ کا اس طور سے ہے کہ واحد اور قہار ہونا خدائے تعالیٰ کا اصولی مسئلہ فریقِ ثانی بلکہ تمام دُنیا کا اصول ہے۔ اور اثبات قضیہ ثانیہ یعنی مفہوم کبریٰ کا اس طرح پر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ باوصف واحد اور قہار ہونے کے وجود ماسوائے اپنے کا خالق نہ ہو بلکہ وجود تمام موجودات کا مثل اس کے قدیم سے چلا آتا ہو تو اس صورت میں وہ واحد اور قہار بھی نہیں ہو سکتا۔ واحد اس باعث سے نہیں ہو سکتا کہ وحدانیت کے معنے سوائے اس کے اَور کچھ نہیں کہ شرکت غیر سے بکلّی پاک ہو۔ اور جب خدائے تعالیٰ خالق ارواح نہ ہو تو اس سے دو طور کا شرکت لازم آیا۔ اوّل یہ کہ سب ارواح غیر مخلوق ہو کر مثل اس کے قدیم الوجود ہو گئے دوّم یہ کہ ان کے لئے بھی مثل پرورد گار کے ہستی حقیقی ماننی پڑے جو مستفاض عن الغیر نہیں۔ پس اسی کا نام شرکت بالغیر ہے اور شرکت بالغیر ذات باری کا بہ بداہت عقل باطل ہے کیونکہ اس سے شریک الباری پیدا ہوتا ہے اور شریک الباری ممتنع اور محال ہے۔ پس جو امر مستلزم محال ہو وہ بھی محال ہے اور قہار اس باعث سے نہیں ہو سکتا کہ صفت قہاری کے یہ معنے ہیں کہ دوسروں کو اپنے ماتحت میں کر لینا اور ان پر قابض اور متصرف ہو جانا۔ سو غیر مخلوق اور روحوں کو خدا اپنے ماتحت نہیں کر سکتا کیونکہ جو چیزیں اپنی ذات میں قدیم اور غیر مصنوع ہیں وہ بالضرورت اپنی ذات میں واجب الوجود ہیں اس لئے کہ اپنے تحقیق وجود میں دوسرے کسی علّت کے محتاج نہیں اور اسی کا نام واجب ہے جس کو فارسی میں خدا یعنی خود آیندہ کہتے ہیں۔ پس جب سب ارواح

مثل ذات باری تعالیٰ کے خدا اور واجب الوجود ٹھہرے تو ان کا باری تعالیٰ کے ماتحت رہنا عند العقل محال اور ممتنع ہوا کیونکہ ایک واجب الوجود دوسرے واجب الوجود کے ماتحت نہیں ہوسکتا۔ اس سے دَور یا تسلسل لازم آتا ہے لیکن حال واقعہ جو مسلّم فریقین ہے یہ ہے کہ سب ارواح خدائے تعالیٰ کے ماتحت ہیں کوئی اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ وہ سب حادث اور مخلوق ہیں کوئی ان میں سے خدا اور واجب الوجود نہیں اور یہی مطلب تھا۔ (پُرانی تحریریں صفحہ ۴ تا ۶ طبع اول ۱۸۹۹ء)

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ کیا اندھا اور بینا مساوی ہوسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۲ طبع اوّل)

۱۸ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۥ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ۝

خدا نے آسمان سے پانی (اپنا کلام) اتارا سو اُس پانی سے ہر یک وادی اپنی قدر کے موافق بہ نکلا یعنی ہر یک کو اُس میں سے اپنی طبیعت اور خیال اور لیاقت کے موافق حصہ ملا طبایع عالیہ اسرارِ حکمیہ سے متمتع ہوئیں اور جو ان سے بھی اعلیٰ تھے انہوں نے ایک عجیب روشنی پائی کہ جو حدّ تحریر و تقریر سے خارج ہے اور جو کم درجہ پر تھے انہوں نے مخبرِ صادق کی عظمت اور کمالیتِ ذاتی کو دیکھ کر دلی اعتقاد سے اس کی خبروں پر یقین کر لیا اور اس طرح پر وہ بھی یقین کی کشتی میں بیٹھ کر ساحلِ نجات تک جا پہنچے اور صرف وہی لوگ باہر رہ گئے جن کو خدا سے کچھ غرض نہ تھی اور فقط دُنیا کے ہی کیڑے تھے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۹۵ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

اُسی نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہر یک وادی اپنے اندازہ اور قدر کے موافق بہ نکلا یعنی ہر یک شخص نے اپنی استعداد کے موافق فائدہ اٹھایا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۲۹ طبع اوّل)

اے غافلو۔ اس اُمت مرحومہ میں وحی کی نالیاں قیامت تک جاری ہیں مگر حسب مراتب۔
(ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۴۲۲)

آسمان سے پانی اتارا پس ہر ایک وادی اپنے اپنے قدر میں بہ نکلا۔
(جنگ مقدس یعنی "اہل اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ" ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء ص۹ طبع اوّل)

یعنی خدا نے آسمان سے پانی (اپنا کلام) اتارا سو ہر یک نالی حسب قدر اپنے بہ نکلی جس قدر پیاس ہے اسی قدر پانی ملتا ہے۔ (مکتوبات جلد اوّل ص۶۵،۶۶ (مکتوب ۳۴ بنام میر عباس علی شاہ صاحب)

خدا تعالیٰ نے آسمان پر سے پانی اتارا پس اپنے اپنے قدر پر ہر یک وادی بہ نکلی یعنی جس قدر دنیا میں طبائع انسانی ہیں قرآن کریم اُن کے ہر یک مرتبہ فہم اور عقل اور ادراک کی تربیت کرنے والا ہے اور یہ امر مستلزم کمال تام ہے کیونکہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم اس قدر وسیع دریائے معارف ہے کہ محبت الٰہی کے تمام پیاسے اور معارف حقہ کے تمام تشنہ لب اُسی سے پیتے ہیں۔
(کرامات الصادقین ص۱۷ طبع اوّل)

ایسا پانی اتارا جس سے ہر ایک وادی بقدر اپنی وسعت کے بہ نکلا ہے۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات ص۸)

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ یعنی جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے وہ زمین پر باقی رہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں زیادہ تر انسانوں کو نفع پہنچانے والے گروہ انبیاء ہیں کہ جو خوارق سے معجزات سے پیشگوئیوں سے حقائق سے معارف سے اپنی راست بازی کے نمونہ سے انسانوں کے ایمان کو قوی کرتے ہیں اور حق کے طالبوں کو دینی نفع پہنچاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دنیا میں کچھ بہت مدت تک نہیں رہتے بلکہ تھوڑی سی زندگی بسر کرکے اِس عالم سے اٹھائے جاتے ہیں لیکن آیت کے مضمون میں خلاف نہیں اور ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام خلاف واقع ہو۔ پس انبیاء کی طرف نسبت دے کر معنی آیت کے یوں ہوں گے کہ انبیاء من حیث الظل باقی رکھے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ظلی طور پر ہر یک ضرورت کے وقت میں کسی اپنے بندہ کو اُن کی نظیر اور مثیل پیدا کر دیتا ہے جو انہیں کے رنگ میں ہو کر ان کی دائمی زندگی کا موجب ہوتا ہے۔ (شہادت القرآن ص۵۵-۵۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں اور مفید وجود ہوتے ہیں اُن کی عمر دراز ہوتی ہے جیسے کہ فرمایا اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ اور دوسری قسم کی ہمدردیاں چونکہ محدود ہیں اِس لئے خصوصیت کے ساتھ جو خیر جاری قرار دی جا سکتی ہے وہ یہی دعا کی خیر

جاری ہے جب کہ خیر کا نفع کثرت سے ہے تو اس آیت کا فائدہ ہم سب سے زیادہ وعا کے ساتھ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ جو دُنیا میں خیر کا موجب ہوتا ہے اُس کی عمر دراز ہوتی ہے اور جو شر کا موجب ہوتا ہے وہ جلدی اٹھالیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شیر سنگھ چڑیوں کو زندہ پکڑ کر آگ پر رکھا کرتا تھا وہ دو برس کے اندر ہی مارا گیا۔ پس انسان کو لازم ہے کہ وہ خیر الناس من ینفع الناس بننے کے واسطے سوچتا رہے اور مطالعہ کرتا رہے۔

جس طرح طبابت میں حیلہ کام آتا ہے اسی طرح نفع رسانی اور خیر میں بھی حیلہ ہی کام دیتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ انسان ہر وقت اس تاک اور فکر میں لگا رہے کہ کس راہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

ہر ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو لیکن بہت ہی کم ہیں وہ لوگ جنہوں نے کبھی اس اصول اور طریق پر غور کی ہو جس سے انسان کی عمر دراز ہو۔ قرآن شریف نے ایک اصول بتایا ہے وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ یعنی جو نفع رساں وجود ہوتے ہیں ان کی عمر دراز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو درازیٔ عمر کا وعدہ فرمایا ہے جو دوسرے لوگوں کے لئے مفید ہیں حالانکہ شریعت کے دو پہلو ہیں اوّل خدا تعالیٰ کی عبادت دوسرے بنی نوع سے ہمدردی۔ لیکن یہاں یہ پہلو اس لئے اختیار کیا ہے کہ کامل عابد وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔ پہلے پہلو میں اوّل مرتبہ خدا تعالیٰ کی محبت، اور توحید کا ہے اس میں انسان کا فرض ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچائے اور اس کی صورت یہ ہے اُن کو خدا کی محبت پیدا کرنے اور اس کی توحید پر قائم ہونے کی ہدایت کرے جیسا کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ[1] سے پایا جاتا ہے۔ انسان بعض وقت خود ایک امر کو سمجھ لیتا ہے لیکن دوسرے کو سمجھانے پر قادر نہیں ہوتا اس لئے اس کو چاہیئے کہ محنت اور کوشش کرکے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا دے۔ ہمدردیٔ خلائق یہی ہے کہ محنت کرکے دماغ خرچ کرکے ایسی راہ نکالے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے تاکہ عمر دراز ہو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

حقیقت یہی ہے کہ جو شخص دُنیا کے لئے نفع رساں ہو اس کی عمر دراز کی جاتی ہے۔ اس پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھوٹی تھی یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اوّل اس لئے کہ انسانی زندگی کا اصل منشا اور مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاصل کرلیا۔ آپ دُنیا میں اس وقت آئے جبکہ دُنیا کی حالت بالطبع مصلح کو چاہتی تھی اور پھر آپ اس وقت اٹھے جب پوری کامیابی اپنی رسالت میں حاصل کرلی۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ[2] کی صدا کسی دوسرے آدمی کو نہیں آئی اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا[3] پوری کامیابی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے

[1] العصر آیت ۴ ٭ [2] المائدہ آیت ۴ ٭ [3] النصر آیت ۲ و ۳ ٭

دیکھ لیا۔ اب جس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے طور پر کامیاب ہو کر اُٹھے پھر یہ کہنا کہ آپ کی عمر تھوڑی تھی سخت غلطی ہے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور فیوض ابدی ہیں اور ہر زمانہ میں آپ کے فیوض کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس لئے آپ کو زندہ نبی کہا جاتا ہے اور حقیقی حیات آپ کو حاصل ہے۔ طولِ عمر کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا اور اس آیت کے موافق آپ ابدالآباد کے لئے زندہ رہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

خدا تعالیٰ جب اپنا فضل کرتا ہے تو کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی مگر اس کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ انسان اپنے اندر تبدیلی کرے۔ پھر جس کو وہ دیکھتا ہے کہ یہ نافع وجود ہے تو اس کی زندگی میں ترقی دے دیتا ہے۔ ہماری کتاب میں اس کی بابت صاف لکھا ہے وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ۔ ایسا ہی پہلی کتابوں سے بھی پایا جاتا ہے۔ حزقیاہ نبی کی کتاب میں بھی درج ہے۔ انسان بہت بڑے کام کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن جب وقت آتا ہے اور وہ اس کام کو پورا نہیں کرتا تو خدا اس کا تمام کام کر دیتا ہے۔ خادم کو ہی دیکھ لو کہ جب وہ ٹھیک کام نہیں کرتا تو آقا اس کو الگ کر دیتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ اس وجود کو کیونکر قائم رکھے جو اپنے فرض کو ادا نہیں کرتا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸-۹)

یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض مخالفِ اسلام بھی لمبی عمر حاصل کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا وجود بھی بعض رنگ میں مفید ہی ہوتا ہے۔ دیکھو ابوجہل بدر کی جنگ تک زندہ رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو قرآن شریف کے ۳۰ سپارے کہاں سے آتے۔ جس کے وجود کو اللہ تعالیٰ مفید سمجھتا ہے اسے مہلت دیتا ہے۔ ہمارے مخالف بھی جو زندہ ہیں اور مخالفت کرتے ہیں اُن کے وجود سے بھی یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف کے حقائق و معارف عطا کرتا ہے۔ اب اگر مہر علی شاہ اتنا شور نہ مچاتا تو نزول مسیح کیسے لکھا جاتا۔

اس طرح پر جو دوسرے مذاہب باقی ہیں ان کے بقا کا بھی یہی باعث ہے تاکہ اسلام کے اصولوں کی خوبی اور حُسن ظاہر ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

جو لوگ دین کے لئے سچا جوش رکھتے ہیں اُن کی عمر بڑھائی جاوے گی۔ اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے وقت عمریں بڑھا دی جاویں گی اس کے معنی یہی مجھے سمجھائے گئے ہیں کہ جو لوگ خادمِ دین ہوں گے ان کی عمریں بڑھائی جاویں گی۔ جو خادم نہیں ہو سکتا وہ بڈھے بیل کی مانند ہے کہ مالک جب چاہے اُسے ذبح کر ڈالے۔ اور جو سچے دل سے خادم ہے وہ خدا کا عزیز ٹھہرتا ہے اور اس کی جان لینے میں خدا تعالیٰ کو تردّد ہوتا ہے اس لئے فرمایا وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱

مورخہ ۱۳؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

جو شخص اپنے وجود کو نافع الناس بنا دیں گے ان کی عمریں خدا زیادہ کرے گا۔ خدا تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت بہت کرو اور حقوق العباد کی بجا آوری پورے طور پر بجالانی چاہیئے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۲؍مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۸)

احادیث میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں عمریں لمبی ہو جائیں گی اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ موت کا دروازہ بالکل بند ہو جائے گا اور کوئی شخص نہیں مرے گا بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مالی۔جانی نصرت میں اس کے مخلص احباب ہوں گے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہوں گے اُن کی عمریں دراز کر دی جائیں گی اس واسطے کہ وہ لوگ نفع رساں وجود ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ۔ یہ امر قانونِ قدرت کے موافق ہے کہ عمریں دراز کر دی جائیں گی۔اس زمانہ کو جو دراز کیا ہے یہ بھی اس کی رحمت ہے اور اس میں کوئی خاص مصلحت ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جو کوئی اپنی زندگی بڑھانا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ نیک کاموں کی تبلیغ کرے اور مخلوق کو فائدہ پہنچاوے۔جب اللہ تعالیٰ کسی دل کو ایسا پاتا ہے کہ اس نے مخلوق کی نفع رسانی کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اسے توفیق دیتا اور اس کی عمر دراز کرتا ہے جس قدر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آتا ہے اُسی قدر اس کی عمر دراز ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا اسکی زندگی کی قدر کرتا ہے لیکن جس قدر وہ خدا تعالیٰ سے لاپروا اور لاابالی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا.... اِس جگہ ایک اَور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو نیک اور برگزیدہ ہوتے ہیں چھوٹی عمر میں بھی اِس جہان سے رخصت ہوتے ہیں اور اس صورت میں گویا یہ قاعدہ اور اصل ٹوٹ جاتا ہے مگر یہ ایک غلطی اور دھوکا ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہوتا یہ قاعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا مگر ایک اَور صورت پر درازی عمر کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا اصل منشا اور درازی عمر کی غائیت تو کامیابی اور بامراد ہونا ہے پس جب کوئی شخص اپنے مقاصد میں کامیاب اور بامراد ہو جاوے اور اس کو کوئی حسرت اور آرزو باقی نہ رہے اور مرتے وقت نہایت اطمینان کے ساتھ اس دُنیا سے رخصت ہو تو وہ گویا پوری عمر حاصل کر کے مرا ہے اور درازی عمر کے مقصد کو اس نے پا لیا ہے اُس کو چھوٹی عمر میں مرنے والا کہنا سخت غلطی اور نادانی ہے۔ صحابہ میں بعض ایسے تھے جنہوں نے بیس بائیس برس کی عمر پائی مگر چونکہ ان کو مرتے وقت کوئی حسرت اور نامرادی باقی نہ رہی بلکہ کامیاب ہو کر اٹھے تھے اس لئے انہوں نے زندگی کا اصل منشا حاصل

کر لیا تھا۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲-۳)

چاہیئے کہ انسان پہلے اپنے آپ کو دُکھ پہنچائے تا خدا تعالیٰ کو راضی کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر بڑھا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں تخلف نہیں ہوتا اس نے جو وعدہ فرمایا ہے اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ یہ بالکل سچ ہے۔ عام طور پر بھی یہی قاعدہ ہے کہ جو چیز نفع رساں ہو اس کو کوئی ضائع نہیں کرتا یہاں تک کہ کوئی گھوڑا بَیل یا گائے بکری اگر مفید ہو اور اس سے فائدہ پہنچتا ہو کون ہے جو اُس کو ذبح کر ڈالے لیکن جب وہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور کسی کام نہیں آسکتا تو پھر اس کا آخری علاج وہی ذبح ہے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر اَور نہیں تو دو چار روپیہ کو کھال ہی بِک جائے گی اور گوشت بھی کام آجائے گا۔ اسی طرح پر جب انسان خدا تعالیٰ کی نظر میں کسی کام کا نہیں رہتا اور اس کے وجود سے کوئی فائدہ دوسرے لوگوں کو نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ خس کم جہاں پاک کے موافق اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔
(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

جو چاہتا ہے کہ عمر زیادہ ہو..... اس کو لازم ہے کہ وہ کامل الایمان ہو اور اپنے وجود کو قابلِ قدر بناوے اور اس کی یہی صورت ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچاوے اور دین کی خدمت کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ یہ خوب یاد رکھو کہ عمر کھانے پینے سے لمبی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی اصل راہ وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ہر قسم کی راحت صحت عمر و دولت یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔ جب انسان کا وجود ایسا نافع اور سُود مند ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرتا جیسے باغ میں کوئی درخت عمدہ پھل دینے والا ہو تو اسے باغبان کاٹ نہیں ڈالتا بلکہ اس کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح نافع اور مفید وجود کو اللہ تعالیٰ بھی محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ جو لوگ دُنیا کے لئے نفع رساں لوگ بنتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمریں بڑھا دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں جو سچے ہیں اور کوئی ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور فرمانبردار بندے ایسی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔
(الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳-۴۴ مورخہ ۱۷/۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

نافع چیز کو درازی عمر نصیب ہوتی ہے اور خدا دین سے غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے پروا نہیں کرتا۔
(الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

شریعت میں ہر ایک امر جو مَا یَنْفَعُ النَّاسَ کے نیچے آئے اس کو دیرپا رکھا جاتا ہے۔
(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ۝

پیوند کرنے کی جگہ پیوند کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۴۹ طبع اوّل)

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ۝

وہ کبھی پوشیدہ خیرات کرتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اس لئے کہ تا ریاکاری سے بچیں اور ظاہر اسلئے کہ تا دوسروں کو ترغیب دیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۴۹ طبع اوّل)

یعنی بہادر وہ ہیں کہ ..... ان کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خدا کی رضامندی کے لئے ہوتا ہے اور اس کے چہرہ کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دکھانے کے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۵۱ طبع اوّل)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ؕ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ۝

یاد رکھو کہ قرآن سے دل اطمینان پکڑتے ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات ص۸ طبع اوّل)

ایک بڑی لذّت چھوٹی لذّت سے غنی کر دیتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ..... وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ[1]۔ (یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۰ طبع اوّل)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ذرا بھی غم پہنچتا تو آپ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اس لئے فرمایا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اطمینان سکینت قلب کے لئے نماز سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ (الحکم

[1] العنکبوت آیت ۴۶

جلد ۷ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسی شئے ہے جو قلوب کو اطمینان عطا کرتا ہے جیسا کہ فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ پس جہاں تک ممکن ہو ذکر الٰہی کرتا رہے اسی سے اطمینان حاصل ہو گا ہاں اِس کے واسطے صبر اور محنت درکار ہے۔ اگر گھبرا جاتا اور تھک جاتا ہے تو پھر یہ اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں لیکن اس کی حقیقت اور فلاسفی یہ ہے کہ جب انسان سچے اخلاص اور پوری وفاداری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور ہر وقت اپنے آپ کو اس کے سامنے یقین کرتا ہے۔ اس سے اس کے دل پر ایک خوف عظمت الٰہی کا پیدا ہوتا ہے۔ وہ خوف اس کو مکروہات اور منہیات سے بچاتا ہے اور انسان تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ اس پر نازل ہوتے ہیں اور وہ اس کو بشارتیں دیتے ہیں اور الہام کا دروازہ اس پر کھولا جاتا ہے اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھ لیتا ہے اور اس کی وراء الورا طاقتوں کو مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر اس کے دل پر کوئی ہمّ و غم نہیں آسکتا اور طبیعت ہمیشہ ایک نشاط اور خوشی میں رہتی ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

۳۲ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۟

اگرچہ قرآنی معجزات ایسے دیکھتے جن سے پہاڑ جنبش میں آجاتے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۹۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ اور ہمیشہ ان کافروں کو کوئی نہ کوئی کوفت پہنچتی رہے گی یہاں تک کہ وہ وقتِ موعود آجائے گا جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ خدا تخلّف وعدہ نہیں کرے گا۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۱ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

اور ہمیشہ کفار پر کسی قسم کی کوفتیں جسمانی ہوں یا روحانی پڑتی رہیں گی یا اُن کے گھر سے نزدیک آجائیں گی یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ آپہنچے گا اور خدا تعالیٰ اپنے وعدوں میں تخلّف نہیں کرتا۔

(شہادت القرآن صفحہ ۵۷ طبع اوّل)

وعدہ سے مراد وہ امر ہے جو علم الٰہی میں بطور وعدہ قرار پا چکا ہے۔ نہ وہ امر جو انسان اپنے خیال کے مطابق اس کو قطعی وعدہ خیال کرتا ہو۔ اسی وجہ سے المیعاد پر جو الف لام ہے وہ عہد ذہنی کی قسم میں سے ہے یعنی وہ امر جو ارادہ قدیمہ میں وعدہ کے نام سے موسوم ہے گو انسان کو اس کی تفاصیل پر علم ہو یا نہ ہو وہ غیر متبدل ہے ورنہ ممکن ہے جو انسان جس بشارت کو وعدہ کی صورت میں سمجھتا ہے اُس کے ساتھ کوئی ایسی شرط مخفی ہو جس کا عدم تحقق اس بشارت کے عدم تحقق کے لئے ضروری ہو کیونکہ شرائط کا ظاہر کرنا اللہ جلّشانہٗ پر حق واجب نہیں ہے۔ چنانچہ اسی بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بسط سے لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے بھی فتوح الغیب کی شرح میں اس میں بہت عمدہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کا بدر کی لڑائی میں تضرع اور دعا کرنا اسی خیال سے تھا کہ الٰہی مواعید اور بشارات میں احتمال شرط مخفی ہے اور یہ اس لئے سُنّت اللہ ہے کہ تا اُس کے خاص بندوں پر ہیبت اور عظمتِ الٰہی مستولی رہیں۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں بلاشبہ تخلّف نہیں وہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں پورے ہو جاتے ہیں لیکن انسان ناقص العقل کبھی اُن کو تخلّف کی صورت میں سمجھ لیتا ہے کیونکہ بعض ایسی مخفی شرائط پر اطلاع نہیں پاتا جو پیشگوئی کو دوسرے رنگ میں لے آتے ہیں۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۱۸۰ حاشیہ)

وعید یعنی عذاب کی پیشگوئی ٹلنے کے بارہ میں تمام نبی متفق ہیں۔ رہی وعدہ کی پیشگوئی جس کی نسبت یہ حکم ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ اس کی نسبت بھی ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا اس وعدہ کا تخلّف نہیں کرتا جو اُس کے علم کے موافق ہے لیکن اگر انسان اپنی غلطی سے ایک بات کو خدا کا وعدہ سمجھ لے جیسا کہ حضرت نوحؑ نے سمجھ لیا تھا ایسا تخلّف وعدہ جائز ہے کیونکہ دراصل وہ خدا کا وعدہ نہیں بلکہ انسانی غلطی نے خواہ مخواہ اُس کو وعدہ قرار دیا ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۴)

اسلام میں یہ مسلّم امر ہے کہ جو پیشگوئی وعید کے متعلق ہو اس کی نسبت ضروری نہیں کہ خدا اُس کو

پورا کرے یعنی جس پیشگوئی کا یہ مضمون ہو کہ کسی شخص یا گروہ پر کوئی بَلا پڑے گی اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اُس بَلا کو ٹال دے جیسا کہ یونس کی پیشگوئی کو جو چالیس دن تک محدود تھی ٹال دیا لیکن جس پیشگوئی میں وعدہ ہو یعنی کسی انعام اکرام کی نسبت پیشگوئی ہو وہ کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ مگر کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْوَعِیْدَ۔ پس اس میں راز یہی ہے کہ وعید کی پیشگوئی خوف اور دعا اور صدقہ خیرات سے ٹل سکتی ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۲ طبع اوّل)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ خدا تعالیٰ اپنے وعدوں کا خلاف نہیں کرتا۔

(الحکم جلد ۷ عـــ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ فرمایا ہے لَا یُخْلِفُ الْوَعِیْدَ نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے وعید مُعلق ہوتے ہیں جو دعا اور صدقات سے بدل جاتے ہیں۔ اس کی بے انتہا نظیریں موجود ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی فطرت میں مصیبت اور بَلا کے وقت دعا اور صدقات کی طرف رجوع کرنے کا جوش ہی نہ ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ عـــ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

۳۳ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○

پہلے بھی رسولوں پر ٹھٹھا کیا گیا پس ہم نے ان کافروں کو جو ٹھٹھا کرتے ہیں مہلت دی۔ پھر جب وہ اپنے ٹھٹھے میں کمال تک پہنچ گئے تب ہم نے ان کو پکڑ لیا اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ کیونکر ہمارا عقاب اُن پر وارد ہوا۔ (انوار الاسلام حاشیہ نمبر ۱ صفحہ ۱۲)

۳۴ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا

عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○

قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ .... ہر ایک جان پر وہ کھڑا ہے۔ اس کے عمل مشاہدہ کر رہا ہے۔
(ست بچن ص۸۹ طبع دوم)

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ○

قرآن شریف کی تعلیم ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ جیسا کہ یہ بات ٹھیک نہیں کہ بہشت کی لذات صرف روحانی ہیں اور دنیوی جسمانی لذّات سے بالکل مخالف ہیں ایسا ہی یہ بھی درست نہیں کہ وہ لذات دنیوی جسمانی لذّات سے بالکل مطابق ہے بلکہ عالم رویا کی طرح صورت میں مشابہت ہے اور حقیقت میں مغایرت ہے۔ عالم رویا کے پھل اور عالم رویا کی خوبصورت عورتیں ظاہر صورت میں وہی لذّات بخشتی ہیں جو عالم جسمانی میں ہیں مگر عالم رویا کی حقیقت اور اس عالم جسمانی کی حقیقت اَور ہے۔ (کتاب البریۃ ص۸۸ حاشیہ)

خدا نے بہشت کی خوبیاں اس پیرایہ میں بیان کی ہیں جو عرب کے لوگوں کو چیزیں دلپسند تھیں وہی بیان کر دی ہیں تا اس طرح پر اُن کے دل اس طرف مایل ہو جائیں اور دراصل وہ چیزیں اَور ہیں یہی چیزیں نہیں۔ مگر ضرور تھا کہ ایسا بیان کیا جاتا تاکہ دل مائل کئے جائیں۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ۔

(یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۹ طبع اوّل)

یہ ایک مثال ہے نہ کہ حقیقت۔ قرآن شریف کے ان الفاظ سے صاف عیاں ہے کہ وہ جنّت کوئی اَور ہی چیز ہے اور حدیث میں صاف یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان ظاہری جسمانی دنیوی امور پر نعماء جنّت کا قیاس نہ کیا جاوے کیونکہ وہ ایسی چیز ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سُنی وغیرہ مگر وہ باتیں جن کی مثال دے کر جنّت کی نعماء کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ تو ہم دیکھتے بھی ہیں اور سُنتے بھی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ملا مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

انسان جو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری

کنکر، پتھر نہ رہنے دے تو اُس میں خدا نظر آئے گا۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت کے درخت اُس میں پیدا ہو کر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں وطیّب ان میں لگیں گے جو اُکُلُهَا دَآئِمٌ کے مصداق ہوں گے۔ یاد رکھو کہ یہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

۴۰. يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ○

اللہ تعالیٰ کی شناخت کی یہ زبردست دلیل اور اس کی ہستی پر بڑی بھاری شہادت ہے کہ محو و اثبات اُس کے ہاتھ میں ہے۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

ہمارا تو اعتقاد ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ عمر کو کم بھی کر سکتا ہے اور زیادہ بھی کر سکتا ہے۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ .... عیسائیوں کا بھی یہی اعتقاد ہے ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی پندرہ دن کی عمر باقی رہ گئی تھی دعا سے پندرہ سال ہو گئے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

ہمارا خدا قادر مطلق خدا ہے۔ وہ کامل اختیارات رکھتا ہے۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۔ ہمارا ایمان ہے وہ جوتشی کی طرح نہیں۔ وہ ایک حکم صبح دیتا ہے اور رات کو اس کے بدلنے کے کامل اختیارات رکھتا ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۲)

۴۱. وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○

اگر ہمارے علماء اس جگہ بھی تَوَفِّی کے معنے یہی لیتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں تو ہمیں ان پر کچھ بھی افسوس نہ ہوتا مگر اُن کی بیباکی اور گستاخی تو دیکھو کہ تَوَفِّی کا لفظ جہاں کہیں قرآن کریم میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے تو اُس کے معنے وفات کے لیتے ہیں اور پھر جب وہی لفظ حضرت مسیح کے حق میں آتا ہے تو اس کے معنی زندہ اٹھائے جانے کے بیان کرتے ہیں اور کوئی ان میں سے نہیں دیکھتا کہ لفظ تو ایک ہی ہے۔ اندھے کی طرح ایک دوسرے کی بات کو مانتے جاتے ہیں جس لفظ کو خدا تعالیٰ نے پچیس ۲۵ مرتبہ اپنی کتاب قرآن کریم میں بیان کر کے صاف طور پر کھول دیا کہ اُس کے معنے رُوح کا قبض کرنا ہے نہ اَور کچھ۔ اب تک یہ لوگ اُس لفظ کے معنی مسیح کے حق میں کچھ اَور کے اَور کر جاتے ہیں۔ گویا تمام جہان کے لئے تَوَفِّی

کے معنے تو قبض روح ہی ہیں مگر حضرت ابن مریم کے لئے زندہ اُٹھا لینا اُس کے معنی ہیں۔
(آئینہ کمالاتِ اسلام صـ۴۲۳ طبع اوّل)

۴۲ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝

سُنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی خدا کی طرف سے آتا ہے اور اس کی تکذیب کی جاتی ہے تو طرح طرح کی آفتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں جن میں اکثر ایسے لوگ پکڑے جاتے ہیں جن کا اس تکذیب سے کچھ تعلق نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ائمۃ الکفر پکڑے جاتے ہیں اور سب سے آخر بڑے شریروں کا وقت آتا ہے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ہم آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتے جاتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صـ۱۶۲ طبع اوّل)

سُنّت اللہ یہی ہے کہ ائمۃ الکفر اخیر میں پکڑے جایا کرتے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ کے وقت جس قدر عذاب پہلے نازل ہوئے اُن سب میں فرعون بچا رہا چنانچہ قرآن شریف میں بھی آیا کہ نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ابتدا عوام سے ہوتا ہے اور پھر خواص پکڑے جاتے ہیں اور بعض کے بچانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آخر میں توبہ کرنی ہوتی ہے یا اُن کی اولاد میں سے کسی نے اسلام قبول کرنا ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صـ۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ہم دُور دُور سے زمین کو گھٹاتے چلے آتے ہیں۔ یہ عادت اللہ ہے کہ اوّل عذاب ایسے لوگوں سے شروع ہوتا ہے جو دُور دُور ہوتے ہیں اور ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں۔ بیوقوف یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ صرف انہیں کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں مگر عذاب لپک کر اُن تک پہنچتا ہے جن کو خبر نہیں ہوتی اور بے پرواہ ہوتے ہیں۔ خدا کی اس میں حکمتیں ہوتی ہیں۔ چاہتا ہے کہ یہ اور شوخی کرلیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۶و۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صـ۳۷)

۴۴ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۝

یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ تُو خدا کا رسول نہیں اُن کو کہہ دے کہ تم میں اور مجھ میں خدا گواہ کافی ہے اور نیز وہ جس کو کتاب کا علم ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۱۳۱ طبع اوّل)

ان (پہلی) کتابوں سے اجتہاد کرنا حرام نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ[1] اور پھر فرمایا كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ..... جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے لئے ان کو پیش کرتا ہے تو ہمارا ان سے اجتہاد کرنا کیوں حرام ہو گیا؟ (الحکم جلد ۱۰ ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء ص۳)

محض الہام جب تک اس کے ساتھ فعلی شہادت نہ ہو ہرگز کسی کام کا نہیں۔ دیکھو جب کفار کی طرف سے اعتراض ہوا لَسْتَ مُرْسَلًا تو جواب دیا گیا كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ یعنی عنقریب خدا کی فعلی شہادت میری صداقت کو ثابت کر دے گی۔ پس الہام کے ساتھ فعلی شہادت بھی چاہیئے۔ دیکھو گورنمنٹ جب کسی کو ملازمت عطا کرتی ہے تو اس کی وجاہت کے سامان بھی مہیا کر دیتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس کا مقابلہ کرتے ہیں وہ توہین عدالت کے جُرم میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو ماموران الٰہی کے مقابلہ پر آتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

(بدر جلد ۶ ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء ص۹)

دیکھو آنحضرت صلعم نے جو صاحب وحی ہونے کا دعوٰی کیا تھا تو وہ بے نشان نہیں تھا۔ کافروں سے جب ثبوت مانگا تھا کہ آپ کی وحی کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل کیا ہے تو ان کو جواب دیا گیا تھا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۱۳/۱۲ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ تُو خدا کا رسول نہیں۔ ان کو کہہ دے کہ میرے پاس دو گواہیاں ہیں۔ ایک تو اللہ کی کہ اس کے تازہ تازہ نشانات میری تائید میں ہیں اور دوسرے وہ لوگ جن کو کتاب اللہ کا علم دیا گیا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ میں سچا ہوں۔

(الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء ص۱۲، ۱۳)

یاد رکھو کہ قول بغیر فعل کے کچھ چیز نہیں اور یہ آیت کہ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۱۳/۱۲) اس میں ایک عجیب نکتہ ہے یعنی اگر خدا میری گواہی دیتا ہے تو مانو ورنہ نہ مانو۔

(الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء ص۱۳)

---

[1] الاحقاف آیت ۱۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ——— نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تفسیر سورۃ ابراہیم

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔

یہ عالی شان کتاب، ہم نے تجھ پر نازل کی تا کہ تو لوگوں کو ہر یک قسم کی تاریکی سے نکال کر نور میں داخل کرے۔ یہ اِس طرف اشارہ ہے کہ جس قدر انسان کے نفس میں طرح طرح کے وساوس گذرتے ہیں اور شکوک و شُبہات پیدا ہوتے ہیں اُن سب کو قرآن شریف، دور کرتا ہے اور ہر یک طور کے خیالاتِ فاسدہ کو مٹاتا ہے اور معرفتِ کامل کا نور بخشتا ہے یعنی جو کچھ خدا کی طرف رجوع ہونے اور اُس پر یقین لانے کے لئے معارف و حقایق درکار ہیں سب عطا فرماتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۵ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

یہ ہماری کتاب ہے جس کو ہم نے تیرے پر اس غرض سے نازل کیا ہے کہ تا تو لوگوں کو کہ جو ظلمت میں پڑے ہوئے ہیں نور کی طرف نکالے۔ سو خدا نے اُس زمانہ کا نام ظُلمانی زمانہ رکھا۔ (براہینِ احمدیہ

(حصہ چہارم صفحہ ۵۴۰-۵۴۱ طبع اول)

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ‏ ○

بعض لوگ جہالت سے اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں ہے کہ ہر ایک قوم کی زبان میں الہام ہونا چاہیئے جیسے وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ تم کو عربی میں ہی کیوں ہوتے ہیں۔

تو ایک تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے پوچھو کہ کیوں ہوتے ہیں اور اس کا اصل ستر یہ ہے کہ صرف تعلق جتلانے کی غرض سے عربی میں الہامات ہوتے ہیں کیونکہ ہم تابع ہیں نبی کریم صلعم کے جو کہ عربی تھے۔ ہمارا کاروبار سب ظلّی ہے اور خدا کے لئے ہے۔ پھر اگر اسی زبان میں الہام نہ ہو تو تعلق نہیں رہتا اِس لئے خدا تعالیٰ عظمت دینے کے لئے عربی میں الہام کرتا ہے اور اپنے دین کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے جس بات کو ہم ذوق کہتے ہیں اسی پر وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اصل متبوع کی زبان کو نہیں چھوڑتا اور جس حال میں یہ سب کچھ اسی (آنحضرت صلعم) کی خاطر ہے اور اسی کی تائید ہے تو پھر اس سے قطع تعلق کس طرح ہو اور بعض وقت انگریزی۔ اردو و فارسی میں بھی الہام ہوتے ہیں تا کہ خدا تعالیٰ جتلا دیوے کہ وہ ہر ایک زبان سے واقف ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ رسول صلعم پر اعتراض ہوا تھا کہ کسی اور زبان میں الہام کیوں نہیں ہوتا تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے فارسی میں الہام کیا۔

"ایں مشت خاک را گر نہ بخشم چہ کنم"

آخر کار خدا تعالیٰ کی رحمت کاروبار کرے گی۔ (البدر جلد اوّل نمبر۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ‌ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ‏ ○

اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں اپنی دی ہوئی نعمت کو زیادہ کروں گا اور بصورت کفر عذاب میرا سخت ہے۔ یاد رکھو کہ جب امّت کو امّتِ مرحومہ قرار دیا ہے اور علومِ لدنیہ سے اُسے سرفرازی بخشی

ہے تو عملی طور پر شکر واجب ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۵ طبع اوّل)

لَىِٕنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ اگر تم میری نعمت کا شکر کروگے تو مَیں اسے بڑھاؤں گا اور پھر فرمایا وَلَىِٕنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ اور اگر انکار اور کفر کروگے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔ اب بتاؤ کہ ان آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور ان کو چھوڑ کر جدید کی طلب اور اقتراح یہ عذاب الٰہی کو مانگنا ہے یا کیا؟ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اگر تم میرا شکر ادا کرو تو مَیں اپنے احسانات کو اَور بھی زیادہ کرتا ہوں اور اگر تم کفر کرو تو پھر میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے یعنی انسان پر جب خدا تعالیٰ کے احسانات ہوں تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کا شکر ادا کرے اور انسانوں کی بہتری کا خیال رکھے اور اگر کوئی ایسا نہ کرے اور اُلٹا ظلم شروع کر دے تو پھر خدا تعالیٰ اس سے وہ نعمتیں چھین لیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۲۳ ؍اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

۱۱۔ قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ يَدۡعُوۡكُمۡ لِيَـغۡفِرَ لَـكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُؤَخِّرَكُمۡ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى‌ؕ قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ‏ ۝

اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یعنی کیا خدا کے وجود میں شک ہو سکتا ہے جس نے ایسے آسمان اور ایسی زمین بنائی۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۲ طبع اوّل)

کیا اللہ کے وجود میں بھی شک ہو سکتا ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ دیکھو یہ تو بڑی سیدھی اور صاف بات ہے کہ ایک مصنوع کو دیکھ کر صانع کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک عمدہ جُوتے یا صندوق کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی ضرورت کا معًا اعتراف کرنا پڑتا ہے پھر تعجب پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی میں کیونکر انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ایسے صانع کے وجود کا انکار کیونکر ہو سکتا ہے جس کے ہزارہا عجائبات سے زمین اور آسمان پُر ہیں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۲ طبع اوّل)

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝

نبیوں نے اپنے تئیں مجاہدہ کی آگ میں ڈال کر فتح چاہی۔ پھر کیا تھا ہر ایک ظالم سرکش تباہ ہوگیا اور اسی کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رُسوا نکرد

(حقیقۃ الوحی صـ۱۳۱ طبع اوّل)

یہ سُنّت اللہ ہے کہ مامور من اللہ ستائے جاتے ہیں۔ دُکھ دیئے جاتے ہیں۔ مشکل پر مشکل اُن کے سامنے آتی ہے نہ اس لئے کہ وہ ہلاک ہو جائیں بلکہ اس لئے کہ نصرت الٰہی کو جذب کریں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی مکّی زندگی کا زمانہ مدنی زندگی کے بالمقابل دراز ہے چنانچہ مکّہ میں ۱۳ برس گذرے اور مدینہ میں دس برس جیسا کہ اس آیت سے پایا جاتا ہے۔ ہر نبی اور مامور من اللہ کے ساتھ یہی حال ہوا ہے کہ اوائل میں دُکھ دیا گیا ہے۔ مکّار۔ فریبی۔ دکاندار اور کیا کیا کہا گیا ہے۔ کوئی بُرا نام نہیں ہوتا جو اُن کا نہیں رکھا جاتا۔ وہ نبی اور مامور ہر ایک بات کی برداشت کرتے اور ہر دُکھ کو سہہ لیتے ہیں لیکن جب انتہا ہو جاتی ہے تو پھر بنی نوع انسان کی ہمدردی کیلئے دوسری قوت ظہور پکڑتی ہے۔ اسی طرح پر رسول اللہ صلعم کو ہر قسم کا دُکھ دیا گیا ہے اور ہر قسم کا بُرا نام آپ کا رکھا گیا ہے۔ آخر آپ کی توجہ نے زور مارا اور وہ انتہا تک پہنچی جیسا ' اِسْتَفْتَحُوْا سے پایا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ تمام شریروں اور شرارتوں کے منصوبے کرنے والوں کا خاتمہ ہوگیا یہ توجہ مخالفوں کی شرارتوں کے انتہا پر ہوتی ہے کیونکہ اگر اوّل ہی ہو تو پھر خاتمہ ہو جاتا!! مکّہ کی زندگی میں حضرت احدیت کے حضور گرنا اور چلّانا تھا اور وہ اس حالت تک پہنچ چکا تھا کہ دیکھنے والوں اور سُننے والوں کے بدن پر لرزہ پڑ جاتا ہے مگر آخر مدنی زندگی کے جلال کو دیکھو کہ وہ جو شرارتوں میں سرگرم اور قتل اور اخراج کے منصوبوں میں مصروف رہتے تھے سب کے سب ہلاک ہوئے اور باقیوں کو اس کے حضور عاجزی اور منّت کے ساتھ اپنی خطاؤں کا اقرار کر کے معافی مانگنی پڑی۔

(الحکم جلد ۵ مـ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صـ۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انبیاء اور رُسل آتے ہیں وہ ایک وقت تک صبر کرتے ہیں اور مخالفوں کی مخالفت جب انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو ایک وقت توجہ تام سے اقبال علی اللہ کر کے فیصلہ چاہتے ہیں اور پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ۔ اِسْتَفْتَحُوْا سُنّت اللہ کو بیان کرتا ہے کہ وہ اس وقت فیصلہ چاہتے ہیں اور اس فیصلہ چاہنے کی خواہش ان میں پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب گویا فیصلہ ہو چکا

ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

جب ایسا وقت آجاتا ہے کہ انبیاء و رسل کی بات لوگ نہیں مانتے تو پھر دعا کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے مخالف متکبر و سرکش آخر نامراد اور ناکام ہو جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

ہر نبی پہلے صبر کی حالت میں ہوتا ہے پھر جب ارادۂ الٰہی کسی قوم کی تباہی سے متعلق ہوتا ہے تو نبی میں درد کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دعا کرتا ہے پھر اس قوم کی تباہی یا خیر خواہی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ دیکھو نوح علیہ السلام پہلے صبر کرتے رہے اور بڑی مدت تک قوم کی ایذائیں سہتے رہے پھر ارادۂ الٰہی جب اُن کی تباہی سے متعلق ہوا تو درد کی حالت پیدا ہوئی اور دل سے نکلا (رَبِّ) لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا[1] جب تک خدا کا ارادہ نہ ہو وہ حالت پیدا نہیں ہوتی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال پہلے صبر کرتے رہے پھر جب درد کی حالت پیدا ہوئی تو قتال کے ذریعے مخالفین پر عذاب نازل ہوا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

جب رسولوں نے دیکھا کہ وعظ اور پند سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو انہوں نے ہر ایک بات سے کنارہ کش ہو کر خدا کی طرف توجہ کی اور اس سے فیصلہ چاہا تو پھر فیصلہ ہو گیا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۷ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

(۲۵، ۲۶) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

پاک کلمات پاک درختوں سے مشابہت رکھتے ہیں جن کی جڑھ مضبوط ہے اور شاخیں آسمان میں اور ہمیشہ اور ہر وقت ترو تازہ پھل دیتے ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱ طبع اوّل صفحہ ۸۵ طبع سوم)

یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کیونکر بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ وہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑھ ثابت ہو اور جس کی شاخیں آسمان میں ہوں اور وہ ہر وقت اپنا پھل اپنے

---

[1] نوح آیت ۲۷

پروردگار کے حکم سے دیتا ہے۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ سے مراد یہ ہے کہ اصول ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور یقین کامل کے درجہ تک پہنچے ہوئے ہوں اور ہر وقت اپنا پھل دیتا رہے کسی وقت خشک درخت کی طرح نہ ہو۔

(الحکم جلد ۱۰ ۱۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

وہ ایمانی کلمہ جو ہر یک افراط تفریط اور نقص اور خلل اور کذب اور ہزل سے پاک اور من کل الوجوہ کامل ہو۔ اس درخت کے ساتھ مشابہ ہے جو ہر ایک عیب سے پاک ہو جس کی جڑ زمین میں قائم ہو اور شاخیں آسمان میں ہوں اور اپنے پھل کو ہمیشہ دیتا ہو اور کوئی وقت اس پر نہیں آتا کہ اس کی شاخوں میں پھل نہ ہوں۔ اس بیان میں خدا تعالیٰ نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھل دار درخت سے مشابہت دیکر تین علامتیں اس کی بیان فرمائیں۔

(۱) اوّل یہ کہ جڑ اس کی جو اصل مفہوم سے مراد ہے انسان کے دل کی زمین میں ثابت ہو یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی حقانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو۔

(۲) دوسری علامت یہ کہ اس کلمہ کی شاخیں آسمان میں ہوں یعنی معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو اور آسمانی قانونِ قدرت جو خدا کا فعل ہے۔ اُس فعل کے مطابق ہو۔ مطلب یہ کہ اس کی صحت اور اصلیت کے دلائل قانونِ قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہوں اور نیز یہ کہ وہ دلائل ایسے اعلیٰ ہوں کہ گویا آسمان میں ہیں جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ وہ پھل جو کھانے کے لائق ہے دائمی اور غیر منقطع ہو یعنی عملی مزاولت کے بعد اس کی برکات و تاثیرات ہمیشہ اور ہر زمانہ میں مشہود اور محسوس ہوتی ہوں یہ نہیں کہ کسی خاص زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو جائیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۳ طبع اوّل)

کیا تو نے نہیں دیکھا کیونکر بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑ ثابت ہو اور شاخیں اُس کی آسمان میں ہوں اور وہ ہر ایک وقت اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہو۔ اور یہ مثالیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تا لوگ اُن کو یاد کر لیں اور نصیحت پکڑ لیں .... اللہ تعالیٰ ان آیات میں کلام پاک اور مقدس کا کمال تین باتوں پر موقوف قرار دیتا ہے اوّل یہ کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ یعنی اصول ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور فی حد ذاتہٖ یقین کامل کے درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور فطرت انسانی اس کو قبول کرے کیونکہ ارض کے لفظ سے اس جگہ فطرت انسانی مراد ہے جیسا کہ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ[1] کا لفظ صاف بیان کر رہا ہے ... خلاصہ یہ کہ اصول ایمانیہ ایسے چاہئیں کہ ثابت شدہ

[1] ابراہیم آیت ۲۷

اور انسانی فطرت کے موافق ہوں۔ پھر دوسری نشانی کمال کی یہ فرماتا ہے کہ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ یعنی اُس کی شاخیں آسمان پر ہوں اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھیں یعنی صحیفۂ قدرت کو غور کی نگاہ سے مطالعہ کریں تو اُس کی صداقت اُن پر کُھل جائے اور دوسری یہ کہ وہ تعلیم یعنی فروعات اُس تعلیم کے جیسے اعمال کا بیان۔ احکام کا بیان۔ اخلاق کا بیان۔ یہ کمال درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں جس پر کوئی زیادہ متصوّر نہ ہو جیسا کہ ایک چیز جب زمین سے شروع ہو کر آسمان تک پہنچ جائے تو اُس پر کوئی زیادہ متصوّر نہیں۔

پھر تیسری نشانی کمال کی یہ فرمائی کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ہر ایک وقت اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنا پھل دیتا رہے ایسا نہ ہو کہ کسی وقت خشک درخت کی طرح ہو جاوے جو پھل پھول سے بالکل خالی ہے۔ اب صاحبو دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمودہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ[1] کی تشریح آپ ہی فرما دی کہ اس میں تین نشانیوں کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ سو جیسا کہ اُس نے یہ تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں اسی طرح پر اس نے ان کو ثابت کر کے بھی دکھلا دیا ہے اور اصول ایمانیہ جو پہلی نشانی ہے جس سے مراد کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اس کو اس قدر بسط سے قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ اگر میں تمام دلائل لکھوں تو پھر چند جزو میں بھی ختم نہ ہوں گے مگر تھوڑا سا اُن میں سے بطور نمونہ کے ذیل میں لکھتا ہوں جیسا کہ ایک جگہ یعنی سیپارہ دوسرے سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ[2] یعنی تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف اور اُن کشتیوں کے چلنے میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کے لئے چلتی ہیں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے پانی اتارا اور اُس سے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور زمین میں ہر ایک قسم کے جانور بکھیر دئے اور ہواؤں کو پھیرا اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں مسخّر کیا یہ سب خدا تعالیٰ کے وجود اور اُس کی توحید اور اُس کے الہام اور اُس کے مدبّر بالارادہ ہونے پر نشانات ہیں۔ اب دیکھئے اِس آیت میں اللہ جلّشانہٗ نے اپنے اس اصولِ ایمانی پر کیسا استدلال اپنے اس قانونِ قدرت سے کیا یعنی اپنے اُن مصنوعات سے جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے مطابق منشاء اِس آیت کریمہ کے صاف صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بیشک اس عالم کا ایک صانع قدیم اور کامل اور وحدہٗ لاشریک اور مدبّر بالارادہ اور اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے والا ہے وجہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی تمام یہ مصنوعات اور یہ سلسلہ

[1] المائدہ آیت ۴ ؂ [2] البقرہ آیت ۱۶۵ ؂

نظامِ عالم کا جو ہماری نظر کے سامنے موجود ہے یہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ یہ عالم خود بخود نہیں بلکہ اس کا ایک موجد اور صانع ہے جس کے لئے یہ ضروری صفات ہیں کہ وہ رحمان بھی ہو اور رحیم بھی ہو اور قادرِ مطلق بھی ہو اور واحد لاشریک بھی ہو اور ازلی ابدی بھی ہو اور مدبّر بالارادہ بھی ہو اور مستجمع جمیع صفات کاملہ بھی ہو اور وحی کو نازل کرنے والا بھی ہو۔

دوسری نشانی یعنی فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ جس کے معنے یہ ہیں کہ آسمان تک اس کی شاخیں پہنچی ہوئی ہیں اور آسمان پر نظر ڈالنے والے یعنی قانون قدرت کے مشاہدہ کرنے والے اس کو دیکھ سکیں اور نیز وہ انتہائی درجہ کی تعلیم ثابت ہو۔ اِس کے ثبوت کا ایک حصّہ تو اسی آیت موصوفہ بالا سے پیدا ہوتا ہے۔ کس لئے کہ جیسا کہ اللہ جلّشانہٗ نے مثلاً قرآن کریم میں یہ تعلیم بیان فرمائی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ جلّشانہٗ تمام عالموں کا ربّ ہے یعنی علّت العِلل ہر ایک ربوبیت کا وہی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ رحمان بھی ہے یعنی بغیر ضرورت کسی عمل کے اپنی طرف سے طرح طرح کے آلاء اور نعماء شاملِ حال اپنی مخلوق کے رکھتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ اعمال صالحہ کے بجا لانے والوں کا مددگار ہوتا ہے اور اُن کے مقاصد کو کمال تک پہنچاتا ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے کہ ہر ایک جزا سزا اُس کے ہاتھ میں ہے جس طرح پر چاہے اپنے بندہ سے معاملہ کرے۔ چاہے تو اُس کو ایک عمل بد کے عوض میں وہ سزا دیوے جو اس عمل بد کے مناسب حال ہے اور چاہے تو اُس کے لئے مغفرت کے سامان میسّر کرے۔ یہ تمام امور اللہ جلّشانہٗ کے اِس نظام کو دیکھ کر صاف ثابت ہوتے ہیں۔

پھر تیسری نشانی جو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ یعنی کامل کتاب کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ جس پھل کا وہ وعدہ کرتی ہے وہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہ ہو بلکہ وہ پھل ہمیشہ اور ہر وقت میں دیتی رہے اور پھل سے مراد اللہ جلّشانہٗ نے اپنا لقاء معہ اُس کے تمام لوازم کے جو برکات سماوی اور مکالمات الٰہیہ اور ہر ایک قسم کی قبولیتیں اور خوارق ہیں رکھی ہیں جیسا کہ خود فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ[1] ۝ (س۲۴ ر۱۸) وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے پھر انہوں نے استقامت اختیار کی یعنی اپنی بات سے نہ پھرے اور طرح طرح کے زلازل اُن پر آئے مگر انہوں نے ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ دیا اُن پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ

[1] حٰم السجدۃ آیت ۳۱-۳۳

تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کچھ حزن اور اس بہشت سے خوش ہو جس کا تم وعدہ دیئے گئے تھے۔ یعنی اب وہ بہشت تمہیں مِل گیا اور بہشتی زندگی اب شروع ہوگئی۔ کس طرح شروع ہوگئی۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ [1] الخ اس طرح کہ ہم تمہارے متولّی اور متکفّل ہوگئے اس دُنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے اِس بہشتی زندگی میں جو کچھ تم مانگو وہی موجود ہے۔ یہ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی ہے۔ مہمانی کے لفظ سے اس پھل کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیۃ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ میں فرمایا گیا تھا۔ اور آیۃ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ کے متعلق ایک بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ کمال اِس تعلیم کا باعتبار اُس کے انتہائی درجہ ترقی کے کیونکر ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن شریف سے پہلے جس قدر تعلیمیں آئیں درحقیقت وہ ایک قانون مختص القوم یا مختلف الزّمان کی طرح تھیں اور عام افادہ کی قوت اِن میں نہیں پائی جاتی تھی لیکن قرآن کریم تمام قوموں اور تمام زمانوں کی تعلیم اور تکمیل کے لئے آیا ہے مثلاً نظیر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم میں بڑا زور سزا دہی اور انتقام میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دانت کے عوض دانت اور آنکھ کے عوض آنکھ کے فقروں سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں بڑا زور عفو اور درگذر پر پایا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں تعلیمیں ناقص ہیں نہ ہمیشہ انتقام سے کام چلتا ہے اور نہ ہمیشہ عفو سے بلکہ اپنے اپنے موقع پر نرمی اور درشتی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ [2] (پ ۲۵ ر ۵) یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ بدی کا عوض تو اسی قدر بدی ہے جو پہنچ گئی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور عفو کا نتیجہ کوئی اصلاح ہو نہ کہ کوئی فساد یعنی عفو اپنے محل پر ہو نہ غیر محل پر۔ پس اجر اس کا اللہ پر ہے یعنی یہ نہایت احسن طریق ہے۔

اب دیکھئے اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہوگی کہ عفو کو عفو کی جگہ اور انتقام کو انتقام کی جگہ رکھا اور پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی [3] (پ ۱۴ ر ۱۹) یعنی اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ ہے کہ باوجود رعایت عدل کے احسان کرو اور احسان سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ایسے طور پر لوگوں سے مروّت کرو کہ جیسے کہ گویا وہ تمہارے پیارے اور ذوالقربٰی ہیں۔ اب سوچنا چاہیئے کہ مراتب تین ہی ہیں۔ اوّل انسان عدل کرتا ہے یعنی حق کے مقابل حق کی درخواست کرتا ہے پھر اگر اس سے بڑھے تو مرتبہ احسان ہے اور اگر اس سے بڑھے تو احسان کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسی محبّت سے لوگوں کی ہمدردی کرتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی ہمدردی کرتی ہے یعنی ایک طبعی جوش سے نہ کہ احسان کے ارادہ سے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۷۱ پرچہ ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

[1] حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۲ ۔ [2] الشوریٰ آیت ۴۱ ۔ [3] النحل آیت ۹۱ ۔

کلمہ طیبہ درخت کی مثال ہے۔ اب اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کھول دیا کہ وہ ایمان جو ہے وہ بطور تخم اور شجر کے ہے اور اعمال جو ہیں وہ آبپاشی کی بجائے ہیں۔ قرآن شریف میں کسان کی مثال ہے کہ جیسا وہ زمین میں تخم ریزی کرتا ہے ویسا ہی یہ ایمان کی تخم ریزی ہے۔ وہاں آبپاشی ہے یہاں اعمال۔

پس یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان بغیر اعمال کے ایسا ہے جیسے کوئی باغ بغیر انہار کے۔ جو درخت لگایا جاتا ہے اگر مالک اس کی آبپاشی کی طرف توجہ نہ کرے تو ایک دن خشک ہو جائے گا اسی طرح ایمان کا حال ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا[1] یعنی تم ہلکے ہلکے کام پر نہ رہو بلکہ اس راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہے۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

کلمات قرآن کے اس درخت کی مانند ہیں جس کی جڑھ ثابت ہو اور شاخیں اُس کی آسمان میں ہوں اور وہ ہمیشہ اپنے وقت پر اپنا پھل دیتا ہے یعنی انسان کی سلیم فطرت اُس کو قبول کرتی ہے اور آسمان میں شاخوں کے ہونے سے یہ مراد ہے کہ بڑے بڑے معارف پر مشتمل ہے جو قانون قدرت کے موافق ہیں اور ہمیشہ پھل دینے سے یہ مراد ہے کہ دائمی طور پر روحانی تاثیرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۱ طبع اوّل)

پاک کلمہ پاک درخت کی مانند ہے پس جیسا کہ کوئی عمدہ اور شریف درخت بغیر پانی کے نشوونما نہیں کر سکتا۔ اسی طرح راستباز انسان کے کلمات طیبہ جو اس کے منہ سے نکلتے ہیں اپنی پوری سرسبزی دکھلا نہیں سکتے اور نہ نشوونما کر سکتے ہیں جب تک وہ پاک چشمہ ان کی جڑھوں کو استغفار کے نالے میں بہہ کر تر نہ کرے۔ سو انسان کی روحانی زندگی استغفار سے ہے جس کے نالے میں ہو کر حقیقی چشمہ انسانیت کی جڑھوں تک پہنچتا ہے اور خشک ہونے اور مرنے سے بچا لیتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۱ صفحہ ۲۱)

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۟اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۝

ناپاک کلمہ کی مثال اُس ناپاک درخت کی ہے جو زمین پر سے اُکھڑا ہوا ہے اور اُس کو قرار و ثبات نہیں۔

(جنگِ مقدس پرچہ ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۳ طبع اوّل)

پلید کلمہ اس درخت کے ساتھ مشابہ ہے جو زمین میں سے اُکھڑا ہوا ہو یعنی فطرتِ انسانی اس کو قبول نہیں کرتی اور کسی طور سے وہ قرار نہیں پکڑتا۔ نہ دلائلِ عقلیہ کے رُو سے نہ قانونِ قدرت کے رُو سے

---

[1] العنکبوت آیت ۷۰

نہ کانشنس کی رُو سے صرف قصہ اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے اور جیسا کہ قرآن شریف نے عالمِ آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو انگور اور انار اور عمدہ عمدہ میووں سے مشابہت دی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وہ ان میووں کی صورت میں متمثل ہوں گے اور دکھائی دیں گے۔ ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالمِ آخرت میں زقّوم رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ[1]
(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۶)

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثابت کے ساتھ یعنی جو قول ثابت شدہ اور مدلّل ہے اِس دُنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم کرتا ہے اور جو لوگ ظلم اختیار کرتے ہیں اُن کو گمراہ کرتا ہے یعنی ظالم خدا تعالیٰ سے ہدایت کی مدد نہیں پاتا جب تک ہدایت کا طالب نہ ہو۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۳ پرچہ ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کے رُو سے خواص ملایک کا درجہ خواص بشر سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ خواص الناس خواص الملایک سے افضل ہیں اور نظام جسمانی یا نظام روحانی میں اُن کا وسایط قرار پانا اُن کی افضلیت پر دلایل[2] نہیں کرتا بلکہ قرآن شریف کی ہدایت کے رُو سے وہ خدّام کی طرح اس کام میں لگائے گئے ہیں جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ یعنی وہ خدا جس نے سورج اور چاند کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے مثلاً دیکھنا چاہیئے کہ ایک چٹھی رساں ایک شاہ وقت کی طرف سے اُس کے کسی ملک کے صوبہ یا گورنر کی خدمت میں چٹھیاں پہنچا دیتا ہے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ چٹھی رساں جو اس بادشاہ اور گورنر جنرل میں واسطہ ہے گورنر جنرل سے افضل ہے۔ سو خوب سمجھ لو یہی مثال اُن وسایط کی ہے جو نظام جسمانی اور روحانی میں قادر مطلق کے ارادوں کو زمین پر پہنچاتے اور اُن کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

[1] الصّٰفّٰت آیت ۶۳۔ [2] شاید سہو کاتب ہے صحیح لفظ غالباً دلالت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اللہ جلشانہٗ قرآن شریف کے کئی مقامات میں بتصریح ظاہر فرماتا ہے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں پیدا کیا گیا ہے وہ تمام چیزیں اپنے وجود میں انسان کی طفیلی ہیں یعنی محض انسان کے فایدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور انسان اپنے مرتبہ میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور سب کا مخدوم ہے جس کی خدمت میں یہ چیزیں لگا دی گئی ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ...... اور مسخر کیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو جو ہمیشہ پھرنے والے ہیں یعنی جو باعتبار اپنی کیفیات اور خاصیات کے ایک حالت پر نہیں رہتے۔ مثلاً جو ربیع کے مہینوں میں آفتاب کی خاصیت ہوتی ہے وہ خزاں کے مہینوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔ پس اِس طور سے سورج اور چاند ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں کبھی ان کی گردش سے بہار کا موسم آجاتا ہے اور کبھی خزاں کا اور کبھی ایک خاص قسم کی خاصیتیں اُن سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور کبھی اس کے مخالف خواص ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا کہ مسخر کیا تمہارے لئے رات اور دن کو۔

(توضیح مرام ص۴۵-۴۷ طبع اوّل)

وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (ابراہیم)

اور دیا تم کو ہریک چیز میں سے وہ تمام سامان جس کو تمہاری فطرتوں نے مانگا یعنی اُن سب چیزوں کو دیا جن کے تم محتاج تھے اور اگر تم خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز گن نہیں سکوگے۔

(توضیح مرام ص۴۷ طبع اوّل)

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ..... اور اگر تو خدا کی نعمتوں کو گننا چاہے تو یہ تیرے لئے غیر ممکن ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۲۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

اگر تم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز گن نہیں سکتے۔

(جنگِ مقدس ص۴۴ پرچہ ۳۱ رمئی ۱۸۹۳ء)

زمین و آسمان پر نظر ڈالنے سے صریح ہمیں نظر آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نہایت ہی کریم ہے اور سچ مچ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اس کی نعمتیں شمار سے خارج ہیں۔

(شحنہ حق ص۵۹ طبع دوم)

اس کی نعمت اور بخشش اس قدر ہے کہ اگر تم اُس کو گننا چاہو تو یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ (ست بچن

صد ۸۳ طبع اوّل)
اگر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز گن نہ سکو گے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صد ۱۰۹ طبع اوّل)

۴۲ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ○

قرآن مجید میں دونوں طرح دعائیں سکھائی گئی ہیں۔ واحد کے صیغہ میں بھی جیسے رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ[1] الخ اور جمع کے صیغہ میں بھی جیسے رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ[2] اور اکثر اوقات واحد متکلم سے جمع متکلم مراد ہوتی ہے۔

(البدر جلد اوّل ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صد ۶۹)

۴۷ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ○

جہاں تک ان کا بس چل سکا اُنہوں نے مکر کیا اور اُن کے سارے مکر خدا کے قبضہ میں ہیں اور اگرچہ اُنکے مکر ایسے ہوں کہ جن سے پہاڑ ٹل جائیں۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صد ۲۳۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

۴۸ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ

تب بھی یہ گمان مت کر کہ اُن سے خدا کے وہ وعدے ٹل جائیں گے کہ جو اُس نے اپنے رسول کو دیئے ہیں۔ خدا غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صد ۲۳۳-۲۳۴ حاشیہ نمبر ۱ طبع اوّل)

---

[1] نوح آیت ۲۹ ۔ [2] البقرۃ آیت ۲۰۲ ۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۝

صورت عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزار ششم میں زمین پر ایک انقلاب عظیم آیا ہے۔ بالخصوص اس ساٹھ برس کی مدت میں کہ جو تخمیناً میری عمر کا اندازہ ہے۔ اس قدر صریح تغیر صفحہ ہستی پر ظہور پذیر ہے کہ گویا وہ دنیا ہی نہیں رہی نہ وہ سواریاں رہیں اور نہ وہ طریق تمدن رہا اور نہ بادشاہوں میں وہ وسعت اقتدار حکومت رہی نہ وہ راہ رہی اور نہ وہ مرکب۔ اور یہاں تک ہر ایک بات میں جدت ہوئی کہ انسان کی پہلی طرزیں تمدن کی گویا تمام منسوخ ہوگئیں اور زمین اور اہل زمین نے ہر ایک پہلو میں گویا پیرایہ جدید پہن لیا اور بُدِّلَتِ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔

(تحفہ گولڑویہ ص۱۱۳ طبع اول)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ——— نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تفسیر سورۃ الحجر

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

۷ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ○

اور اُنہوں نے رسول کو مخاطب کر کے کہا کہ اے وہ شخص جس پر ذِکر نازل ہوا تو تو دیوانہ ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۱۹ حاشیہ نمبر۱۱ طبع اوّل)

۱۰ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

اِس کتاب کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اُس کے محافظ رہیں گے۔ سو تیرہ سو برس سے اِس پیشین گوئی کی صداقت ثابت ہو رہی ہے۔ اب تک قرآنِ شریف میں پہلی کتابوں کی طرح کوئی مُشرکانہ تعلیم ملنے نہیں پائی اور آیندہ بھی عقل تجویز نہیں کر سکتی کہ اُس میں کسی نوع کی مُشرکانہ تعلیم مخلوط ہو سکے کیونکہ لاکھوں مسلمان اُسکے حافظ ہیں۔ ہزارہا اُس کی تفسیریں ہیں۔ پانچ وقت اُس کی آیات نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ ہر روز اُس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسی طرح تمام ملکوں میں اُس کا پھیل جانا کروڑہا نسخے اُس کے دُنیا میں موجود ہونا ہر یک قوم کا اس کی تعلیم سے مطلع ہو جانا یہ سب اُمور ایسے ہیں کہ جن کے لحاظ سے عقل اِس بات پر قطع واجب

کرتی ہے کہ آئندہ بھی کسی نوع کا تغیّر اور تبدل قرآن شریف میں واقع ہونا ممتنع اور محال ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ دوم صفحہ ۱۱۱ حاشیہ نمبر ۹ طبع اول)

ہم نے یہ کلام آپ اتارا ہے اور ہم آپ ہی اُس کے نگہبان رہیں گے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۳ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

خداوند نے کہا تھا کہ مَیں اپنے کلام کی آپ حفاظت کروں گا۔ اب دیکھو کیا یہ سچ ہے یا نہیں کہ وہی تعلیم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ اُس کی کلام کے پہنچائی تھی وہ برابر اُس کی کلام میں محفوظ چلی آتی ہے اور لاکھوں قرآن شریف کے حافظ ہیں کہ جو قدیم سے چلے آتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۴۴ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اُس کی حفاظت کرنے والے ہیں یعنی کیا صورت کے لحاظ سے اور کیا خاصیت کے لحاظ سے ہمیشہ قرآن اپنی حالتِ اصلی پر رہے گا اور الٰہی حفاظت کا اُس پر سایہ ہوگا۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۸ حاشیہ طبع اوّل)

ہم نے ہی اِس کلام کو اُتارا اور ہم ہی اِس کو بچاتے رہیں گے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۶۰ حاشیہ طبع اوّل)

ہم ہی نے اِس کلام کو اُتارا اور ہم ہی اس کی عزت اور اس کی عظمت اور اس کی تعلیم کو دشمنوں کے حملوں سے بچائیں گے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۶۵ حاشیہ طبع اوّل)

وہ پاک وعدہ جس کو یہ پیارے الفاظ ادا کر رہے ہیں کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ وہ انہیں دنوں کے لئے وعدہ ہے جو بتلا رہا کہ جب اسلام پر سخت بلا کا زمانہ آئے گا اور سخت دشمن اُس کے مقابل کھڑا ہوگا اور سخت طوفان پیدا ہوگا تب خدائے تعالیٰ آپ اُس کا معالجہ کرے گا اور آپ اُس طوفان سے بچنے کے لئے کوئی کشتی عنایت کرے گا وہ کشتی اسی عاجز کی دعوت ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۶۴ حاشیہ طبع اوّل)

فَنَظَرَ الرَّبُّ الْكَرِيْمُ اِلَى الْاَرْضِ وَرَاٰهَا مَمْلُوَّةً مِّنَ الْمُهْلِكَاتِ وَمُتْرَعَةً مِّنَ الْمُفْسِدَاتِ وَرَاَى الْخَلْقَ مَفْتُوْنًا بِنَوَادِرِهَا وَرَاَى الْمُتَنَصِّرِيْنَ اَنَّهُمْ ضَلُّوْا وَيُضِلُّوْنَ وَرَاٰى فَلَاسِفَتَهُمْ

(ترجمہ از مرتب) رب کریم نے زمین پر نظر کی اور دیکھا کہ وہ مہلکات سے بھری ہوئی ہے اور مفسدات سے پُر ہے اور مخلوق کو دیکھا کہ وہ زمینی نوادر پر لٹو ہو رہی ہے۔ اور اس نے نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کر رہے ہیں

اِخْتَلَبُوا النَّاسَ بِعُلُوْمِهِمْ وَنَوَادِرِ فُنُوْنِهِمْ فَوَقَعَتْ تِلْكَ الْعُلُوْمُ فِيْ قُلُوْبِ الْاَحْدَاثِ بِمَوْقِعٍ عَظِيْمٍ كَاَنَّهُمْ سُحِرُوْا وَجُذِبُوْا اِلَى الشَّهَوَاتِ وَاسْتِيْفَاءِ اللَّذَّاتِ وَالْتَحَقُوْا بِالْبَهَائِمِ وَالْحَشَرَاتِ وَعَصَوْا رَبَّهُمْ وَاَبَوَيْهِمْ وَاَكَابِرَهُمْ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحُرِّيَّةَ وَغَلَبَتْ عَلَيْهِمُ الْخَلَاعَةُ وَالْمُجُوْنُ فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّحْفَظَ عِزَّةَ كِتَابِهٖ وَدِيْنَ طُلَّابِهٖ مِنْ فِتَنِ تِلْكَ النَّوَادِرِ كَمَا وَعَدَ فِيْ قَوْلِهٖ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ فَاَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَاَيَّدَ عَبْدَهٗ فَضْلًا مِّنْهُ وَرَحْمَةً وَّاَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ اَقُوْمَ بِالْاِنْذَارِ وَاَنْزَلَ مَعِيَ نَوَادِرَ النِّكَاتِ وَالْعُلُوْمِ وَالتَّائِيْدَاتِ مِنَ السَّمَآءِ لِيَكْسِرَ بِهَا نَوَادِرَ الْمُتَنَصِّرِيْنَ وَصَلِيْبَهُمْ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۴۷۹-۴۸۰ طبع اوّل)

حفاظتِ قرآن کیونکر اور کس طرح سے ہوگی سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس نبی کریم کے خلیفے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا اور خلیفہ کے لفظ کو اشارہ کے لئے اختیار کیا گیا کہ وہ نبی کے جانشین ہوں گے اور اس کی برکتوں میں سے حصہ پائیں گے جیسا کہ پہلے زمانوں میں ہوتا رہا اور ان کے ہاتھ سے برجائی دین کی ہوگی اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا یعنی ایسے وقتوں میں آئیں گے کہ جب اسلام تفرقہ میں پڑا ہوگا پھر ان کے آنے کے بعد جو ان سے سرکش رہے گا وہی لوگ بدکار اور فاسق ہیں۔ (شہادت القرآن ص ۴۳)

ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا اور ہم ہی اِس تنزیل کی محافظت کریں گے۔ اِس میں اِس بات کی تصریح ہے کہ یہ کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کی تعلیم کو تازہ رکھنے والے اور اس کا نفع لوگوں کو پہنچانے والے ہمیشہ پیدا

اور ان کے فلاسفروں کو دیکھا کہ انہوں نے لوگوں کو عجیب و غریب علوم و فنون کے ذریعہ دھوکہ دیا ہے اور نوجوانوں کے دلوں میں ان علوم نے بڑی وقعت حاصل کرلی ہے گویا کہ وہ مسحور ہوگئے ہیں اور اپنی شہوتوں اور لذّتوں کے پورا کرنے کے لئے کھینچے گئے ہیں اور وہ بہائم اور حشرات کی مانند ہوگئے ہیں اور انہوں نے اپنے رب۔ اپنے والدین اور اپنے بزرگوں کی نافرمانی کی اور آزادی ان کے دلوں میں گھر کر گئی اور بے باکی اور لاابالی پن ان پر غالب آگیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی کتاب اور اپنے طالبوں کے دین کی عزّت کو ان نوادر کے فتنہ سے محفوظ رکھے جیسا کہ اس نے اپنے قول اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں وعدہ کیا تھا۔ پس اس نے اپنے وعدہ کو پورا فرمایا اور اپنے فضل اور رحمت سے اپنے بندہ کی تائید فرمائی اور میری طرف وحی کی کہ میں منذر بن کر کھڑا ہوجاؤں۔ اور میرے ساتھ نادر نکات و علوم اور آسمانی تائیدات اتاریں تا اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے عیسائیوں کے نوادر اور انکی صلیب کو پاش پاش کر دے۔

ہوتے رہیں گے۔ (شہادت القرآن ص۴۲ طبع اول)

یہ آیت کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ قرآن سینوں سے محو نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ توریت اور انجیل یہود اور نصاریٰ کے سینوں سے محو کی گئی اور گو توریت اور انجیل ان کے ہاتھوں اور ان کے صندوقوں میں تھی لیکن ان کے دلوں سے محو ہوگئی یعنی ان کے دل اس پر قائم نہ رہے اور انہوں نے توریت اور انجیل کو اپنے دلوں میں قائم اور بحال نہ کیا۔ غرض یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ کوئی حصہ تعلیم قرآن کا برباد اور ضائع نہیں ہوگا اور جس طرح روز اول سے اس کا پودا دلوں میں جمایا گیا یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (شہادت القرآن ص۵۵)

ہم نے ہی قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

(شہادت القرآن ص۵۵ طبع اول)

فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ کِتَابٌ قَدْ کَفَلَ اللّٰہُ صِحَّتَہٗ وَقَالَ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ وَاِنَّہٗ لَا یَتَغَیَّرُ بِتَغَیُّرَاتِ الْاَزْمِنَۃِ وَمُرُوْرِ الْقُرُوْنِ الْکَثِیْرَۃِ وَلَا یَنْقُصُ مِنْہُ حَرْفٌ وَّلَا تَزِیْدُ عَلَیْہِ نُقْطَۃٌ وَّلَا تَمَسُّہٗ اَیْدِی الْمَخْلُوْقِ وَلَا یُخَالِطُہٗ قَوْلُ الْاٰدَمِیِّیْنَ۔

(حمامۃ البشریٰ ص۳۷)

وَکَذَالِکَ قَالَ فِیْ اٰیَۃٍ اُخْرٰی لِقَوْمٍ یَّسْتَرْشِدُوْنَ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ فَاَمْعِنُوْا فِیْہِ اِنْ کُنْتُمْ تَفَکَّرُوْنَ فَھٰذِہٖ اِشَارَۃٌ اِلٰی بَعْثِ مُجَدِّدٍ فِیْ زَمَانٍ مُّفْسِدٍ کَمَا یَعْلَمُہُ الْعَاقِلُوْنَ وَلَا مَعْنٰی لِحِفَاظَۃِ الْقُرْاٰنِ مِنْ غَیْرِ حِفَاظَۃِ عِطْرِہٖ عِنْدَ شُیُوْعِ فِتَنٍ

(ترجمہ از مرتب) قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کی صحت لفظی و معنوی کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے اور اس نے فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ زمانہ کے تغیرات اور زیادہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کتاب میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔ اس سے نہ کوئی حرف کم ہوگا اور نہ اس میں کوئی نقطہ زیادہ ہوگا۔ نہ اس میں مخلوق دست برد کر سکے گی اور نہ اس میں انسانوں کا کلام شامل ہو سکے گا۔

(ترجمہ از مرتب) اور اسی طرح طالبان ہدایت کے لئے دوسری آیت میں فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ پس اس میں غور کرو اگر تم صاحب فکر ہو۔ اس آیت میں ایسے زمانہ میں جو فساد سے پُر ہو ایک مجدد کی بعثت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ہر عقل مند جانتا ہے کیونکہ حفاظت قرآن کے اور کوئی معنے ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس کی رُوح اور اس کے خلاصہ کو محفوظ رکھا جائے بالخصوص اس وقت جبکہ سرکشی کے فتنے بکثرت موجود

الطُّغْيَانِ وَاِثْبَاتِہٖ فِی الْقُلُوْبِ عِنْدَ ھَبِّ صَرَاصِرِ الطُّغْیَانِ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلٰی ذَوِی الْعِرْفَانِ وَالْمُتَدَبِّرِیْنَ۔ (سرالخلافۃ صفحہ ۳۷)

قرآن شریف میں یہ وعدہ تھا کہ خدا تعالیٰ فتنوں اور خطرات کے وقت میں دینِ اسلام کی حفاظت کریگا جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ سو خدا تعالیٰ نے بموجب اس وعدہ کے چار قسم کی حفاظت اپنی کلام کی کی۔ اوّل حافظوں کے ذریعہ سے اس کے الفاظ اور ترتیب کو محفوظ رکھا اور ہر ایک صدی میں لاکھوں ایسے انسان پیدا کئے جو اس کی پاک کلام کو اپنے سینوں میں حفظ رکھتے ہیں ایسا حفظ کہ اگر ایک لفظ پوچھا جائے تو اس کا اگلا پچھلا سب بتا سکتے ہیں اور اس طرح پر قرآن کو تحریف لفظی سے ہر ایک زمانہ میں بچایا۔ دوسرے ایسے ائمہ اور اکابر کے ذریعہ سے جن کو ہر ایک صدی میں فہم قرآن عطا ہوا ہے جنہوں نے قرآن شریف کے اجمالی مقامات کی احادیثِ نبویہ کی مدد سے تفسیر کر کے خدا کی پاک کلام اور پاک تعلیم کو ہر ایک زمانہ میں تحریف معنوی سے محفوظ رکھا۔ تیسرے متکلمین کے ذریعہ سے جنہوں نے قرآنی تعلیمات کو عقل کے ساتھ تطبیق دے کر خدا کی پاک کلام کو کوتہ اندیش فلسفیوں کے استخفاف سے بچایا ہے۔ چوتھے روحانی انعام پانے والوں کے ذریعہ سے جنہوں نے خدا کی پاک کلام کو ہر ایک زمانہ میں معجزات اور معارف کے منکروں کے حملہ سے بچایا ہے۔

سو یہ پیشگوئی کسی نہ کسی پہلو کی وجہ سے ہر ایک زمانہ میں پوری ہوتی رہی ہے اور جس زمانہ میں کسی پہلو پر مخالفوں کی طرف سے زیادہ زور دیا گیا تھا اُسی کے مطابق خدا تعالیٰ کی غیرت اور حمایت نے مدافعت کرنے والا پیدا کیا ہے لیکن یہ زمانہ جس میں ہم ہیں یہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں مخالفوں نے ہر چہار پہلو کے رُو سے حملہ کیا تھا اور یہ ایک سخت طوفان کے دن تھے کہ جب سے قرآن شریف کی دنیا میں اشاعت ہوئی ایسے خطرناک دن اسلام نے کبھی نہیں دیکھے۔ بدبخت اندھوں نے قرآن شریف کی لفظی صحت پر بھی حملہ کیا اور غلط ترجمے اور تفسیریں شائع کیں۔ بہتیرے عیسائیوں اور بعض نیچریوں اور کم فہم مسلمانوں نے تفسیروں اور ترجموں کے بہانہ سے تحریف معنوی کا ارادہ کیا[1] اور بہتوں نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن اکثر جگہ میں علومِ عقلیہ اور مسائلِ مسلمہ مثبتہ طبعی اور ہیئت کے مخالف ہے اور نیز یہ کہ بہت سے دعاوی اس کے عقلی تحقیقاتوں کے برعکس ہیں اور نیز یہ کہ اس کی تعلیم جبر اور ظلم اور بے اعتدالی اور ناانصافی کے

ہوں اور قرآن مجید کو دلوں میں قائم رکھا جائے جب کہ سرکشی کی تند ہوائیں چل رہی ہوں جیسا کہ صاحب علم و عرفان اور غور کرنے والے لوگوں پر مخفی نہیں۔

[1] بہتوں نے اپنی تفسیروں میں اسرائیلی بے اصل روایتیں لکھ کر ایک دُنیا کو دھوکہ دیا ہے۔ منہ

کے طریقوں کو سکھاتی ہے اور نیز یہ کہ بہت سی باتیں اس کی صفاتِ الٰہیہ کے مخالف اور قانونِ قدرت اور صحیفۂ فطرت کے منافی ہیں اور بہتوں نے پادریوں اور آریوں میں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور قرآن کریم کے نشانوں اور پیشگوئیوں سے نہایت درجہ کے اصرار سے انکار کیا اور خدا تعالیٰ کی پاک کلام اور دین اسلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایسی صورت کھینچ کر دکھلائی اور اس قدر افترا سے کام لیا جس سے ہر ایک حق کا طالب خواہ نخواہ نفرت کرے۔ لہٰذا اب یہ زمانہ ایسا زمانہ تھا کہ جو طبعاً چاہتا تھا کہ جیسا کہ مخالفوں کے فتنہ کا سیلاب بڑے زور سے چاروں پہلوؤں پر حملہ کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ ایسا ہی مدافعت بھی چاروں پہلوؤں کے لحاظ سے ہو اور اس عرصہ میں چودھویں صدی کا آغاز بھی ہو گیا۔ اس لئے خدا نے چودھویں صدی کے سرپر اپنے وعدہ کے موافق جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہے۔ اس فتنہ کی اصلاح کے لئے ایک مجدد بھیجا مگر چونکہ ہر ایک مجدد کا خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک خاص نام ہے اور جیسا کہ ایک شخص جب ایک کتاب تالیف کرتا ہے تو اس کے مضامین کے مناسب حال اس کتاب کا نام رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ نے اس مجدد کا نام خدماتِ مفوضہ کے مناسب حال مسیح رکھا کیونکہ یہ بات مقرر ہو چکی تھی کہ آخر الزمان کے صلیبی فتنوں کی مسیح اصلاح کرے گا۔ پس جس شخص کو یہ اصلاح سپرد ہوئی ضرور تھا کہ اس کا نام مسیح موعود رکھا جائے۔ پس سوچو کہ یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ کی خدمت کس کو سپرد ہے؟ اور کیا اب یہ وہی زمانہ ہے یا کوئی اور ہے؟ سوچو۔ خدا تمہیں تھام لے۔ (ایام الصلح صفحہ ۵۵-۵۶ طبع اوّل)

(یہ آیت) صاف بتلا رہی ہے کہ جب ایک قوم پیدا ہوگی کہ اس ذکر کو دنیا سے مٹانا چاہے گی تو اس وقت خدا آسمان سے اپنے کسی فرستادہ کے ذریعہ سے اس کی حفاظت کرے گا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۳ حاشیہ طبع اوّل)

ہم نے ہی قرآن شریف کو اتارا اور ہم ہی اس کی محافظت کریں گے۔ اِسی وجہ سے قرآن شریف تحریف سے محفوظ رہا۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۲ طبع اوّل)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یہ بھی مسیح موعود کے زمانہ کی طرف اشارہ ہے اور قرآن شریف کی رو سے مسیح موعود کے زمانہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے مشابہت ہے عقلمندوں کے لئے جو تدبّر کرتے ہیں یہ ثبوت قرآنی تسلی بخش ہے اور اگر کسی نادان کی نظر میں یہ کافی نہیں ہیں تو پھر اسکو اقرار کرنا چاہیئے کہ توریت میں نہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نسبت کوئی پیشگوئی ہے نہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کوئی پیش خبری ہے کیونکہ وہ الفاظ بھی محض مجمل ہیں اور اسی وجہ سے یہودیوں کو ٹھوکر لگی اور قبول نہ کیا۔۔۔۔ انبیاء کی نسبت جو پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ باریک ہوتی ہیں تا شقی اور سعید میں فرق ظاہر

ہو جاوے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۴۲-۴۳)

اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ عادت ہے کہ جب ایک قوم کو کسی فعل سے منع کرتا ہے تو ضرور اس کی تقدیر میں یہ ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے اس فعل کے ضرور مرتکب ہوں گے جیسا کہ اس نے توریت میں یہودیوں کو منع کیا تھا کہ تم نے توریت اور دوسری خدا کی کتابوں کی تحریف نہ کرنا سو آخر اُن میں سے بعض نے تحریف کی مگر قرآن میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم نے قرآن کی تحریف نہ کرنا بلکہ یہ کہا گیا اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔

(نزول المسیح صفحہ ۴۱ طبع اوّل)

اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ اسلام ہلاک ہو جاوے اور اندرونی اور بیرونی بلائیں اسے کھا جاویں تو وہ کسی کو پیدا نہ کرتا اس کا وعدہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ کا کہاں گیا۔ اوّل تو تاڑ تاڑ مجدد آئے مگر جب مسلمانوں کی حالت تنزل میں ہوئی بد اطواری ترقی کرتی جاتی ہے۔ سعادت کا مادہ ان میں نہ رہا اور اسلام غرق ہونے لگا تو خدا نے ہاتھ اٹھا لیا۔ جب کہو تو یہی جواب ہے کہ حدیثوں میں لکھا ہے کہ تیس دجّال آئیں گے۔ یہ بھی ایک دجال ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۸ صفحہ ۶۳ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء)

احادیث کے اوپر نہ تو خدا کی مہر ہے نہ رسول اللہ صلعم کی۔ اور قرآن شریف کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ اسی لئے ہمارا یہ مذہب ہے کہ قرآن شریف سے معارض نہ ہونے کی حالت میں ضعیف سے ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جاوے لیکن اگر کوئی قصہ جو کہ قرآن شریف میں مذکور ہے اور حدیث میں اس کے خلاف پایا جاوے مثلاً قرآن میں لکھا ہے کہ اسحاقؑ ابراہیمؑ کے بیٹے تھے اور حدیث میں لکھا ہوا ہو کہ وہ نہیں تھے تو ایسی صورت میں حدیث پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۹ صفحہ ۳۰۶ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء)

قرآن کریم کا نام ذکر رکھا گیا ہے اس لئے کہ وہ انسان کی اندرونی شریعت یاد دلاتا ہے۔ جب اسم فاعل کو مصدر کی صورت میں لاتے ہیں تو وہ مبالغہ کا کام دیتا ہے جیسا زَیۡدٌ عَدۡلٌ۔ کیا معنے۔ زید بہت عادل ہے۔ قرآن کوئی نئی تعلیم نہیں لایا بلکہ اُس اندرونی شریعت کو یاد دلاتا ہے جو انسان کے اندر مختلف طاقتوں کی صورت میں رکھی ہے۔ حلم ہے ایثار ہے۔ شجاعت ہے جبر ہے غضب ہے۔ قناعت ہے وغیرہ۔ غرض جو فطرت باطنی میں رکھی تھی قرآن نے اُسے یاد دلایا جیسے فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ[1] یعنی صحیفۂ فطرت میں کہ جو چھپی ہوئی کتاب تھی اور جس کو ہر ایک شخص نہ دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح اس کتاب کا نام ذکر بیان کیا تاکہ وہ پڑھی جاوے تو وہ اندرونی اور روحانی قوتوں اور اس نورِ قلب کو جو آسمانی ودیعت انسان کے اندر ہے یاد دلاوے۔ (رپورٹ

---

[1] الواقعہ آیت ۷۹

جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۲ طبع اوّل)

قرآن کریم جس کا دوسرا نام ذِکر ہے اُس ابتدائی زمانہ میں انسان کے اندر چھپی ہوئی اور فراموش ہوئی ہوئی صداقتوں اور ودیعتوں کو یاد دلانے کے لئے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدۂ واثقہ کی رُو سے کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ اس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک معلّم آیا جو اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[1] کا مصداق اور موعود ہے۔ وہ وہی ہے جو تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۵ طبع اوّل)

اللہ تعالیٰ نے جو (اِنَّا) نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ دے کر قرآن اور اسلام کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچا لیا اور فتنہ میں پڑنے نہ دیا پس مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سلسلہ کی قدر کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۳ طبع اوّل)

خدا آپ ہی اُن نقوشِ فطرت کو یاد دلانے والا ہے اور خطرہ کے وقت اُس کو بچا لے گا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۷ طبع اوّل)

ایک بارش تخم ریزی کے لئے ہوتی ہے اور پھر ایک بارش اس تخم کے نشوونما اور سرسبزی کے لئے ہوتی ہے۔ اسی طرح پر نبیوں کی بارش تخم ریزی کے لئے ہوتی ہے اور محدثین اور مجددین کی بارش جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے ضمن میں داخل ہیں اس تخم کے بارور کرنے اور نشوونما دینے کے لئے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

اسلام کی حفاظت کا ذمہ اسی حیّ وقیوم خدا نے اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کہہ کر اٹھایا ہوا ہے پس ہر زمانہ میں یہ دین زندوں سے زندگی پاتا ہے اور مُردوں کو جلاتا ہے۔ یاد رکھو اس میں قدم قدم پر زندے آتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ قرآن شریف کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے چودھویں صدی کے سر پر مجھے بھیجا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ کی تائیدیں اور نصرتیں جو ہمارے شاملِ حال ہیں یہ آج کسی مذہب کے پیرو کو نصیب نہیں اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ کیا کوئی اہل مذہب ہے جو اسلام کے سوا اپنے مذہب کی حقانیت پر تائیدی اور سماوی نشان پیش کر سکے۔

خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ جو قائم کیا ہے یہ اُس حفاظت کے وعدہ کے موافق ہے جو اس نے اِنَّا نَحْنُ

---

[1] الجمعۃ آیت ۴

نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ میں کیا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

بیشک آج وہ حالت اسلام کی ہوگئی تھی کہ اس کے مٹنے میں کوئی بھی شبہ نہیں ہوسکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی غیرت نے جوش مارا اور اس کی رحمت اور وعدہ حفاظت نے تقاضا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز کو پھر نازل کرے اور وہ اس زمانہ میں آپ کی نبوّت کو نئے سرے سے زندہ کرکے دکھاوے چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا اور مجھے مامور ومہدی بنا کر بھیجا۔۔۔۔ یہ وعدہ حفاظت چاہتا تھا کہ جب غارت گری کا موقع ہو تو وہ خبر لے۔ چوکیدار کا کام ہے کہ وہ نقب دینے والوں کو پوچھتے ہیں اور دوسرے جرائم والوں کو دیکھ کر اپنے منصبی فرائض عمل میں لاتے ہیں۔ اسی طرح پر آج چونکہ فتن جمع ہوگئے تھے اور اسلام کے قلعہ پر ہر قسم کے مخالف ہتھیار باندھ کر حملہ کرنے کو طیار ہوگئے تھے اس لئے خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ منہاج نبوّت قائم کرے یہ مواد اسلام کی مخالفت کے دراصل ایک عرصہ دراز سے پک رہے تھے اور آخر اب پھوٹ نکلے جیسے ابتدا میں نطفہ ہوتا ہے اور پھر ایک عرصہ مقررہ کے بعد بچّہ بن کر نکلتا ہے اسی طرح پر اسلام کی مخالفت کے بچّہ کا خروج ہوچکا ہے اور اب وہ بالغ ہوکر پورے جوش اور قوت میں ہے اس لئے اس کو تباہ کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے آسمان سے ایک حربہ نازل کیا اور اس مکروہ شرک کو جو اندرونی اور بیرونی طور پر پیدا ہوگیا تھا دور کرنے کے لئے اور پھر خدا تعالیٰ کی توحید اور جلال قائم کرنے کے واسطے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ یہ سلسلہ خدا کی طرف سے ہے اور مَیں بڑے دعویٰ اور بصیرت سے کہتا ہوں کہ بیشک یہ خدا کی طرف سے ہے اس نے اپنے ہاتھ سے اس کو قائم کیا ہے جیساکہ اس نے اپنی تائیدوں اور نصرتوں سے جو اس سلسلہ کے لئے اس نے ظاہر کی ہیں دکھا دیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد کو بھیجتا ہے جو دین کے اس حصّہ کو تازہ کرتا ہے جس پر کوئی آفت آئی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ مجددوں کے بھیجنے کا اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے موافق ہے جو اُس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ میں فرمایا ہے۔ پس اس وعدہ کے موافق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشگوئی کے موافق جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے وحی پاکر فرمائی تھی یہ ضروری ہوا کہ اس صدی کے سر پر جس میں سے اُنیس ۱۹ برس گذر گئے کوئی مجدّد اصلاح دین اور تجدید ملّت کے لئے مبعوث ہوتا۔ اس سے پہلے کہ کوئی خدا تعالیٰ کا مامور اس کے الہام اور وحی سے مطلع ہوکر اپنے آپ کو ظاہر کرتا مستعد اور سعید فطرتوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ صدی کا سر آجانے پر نہایت اضطراب اور بے قراری کے ساتھ اس مردِ آسمانی کی تلاش کرتے اور اُس آواز کے سُننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوجاتے جو انہیں یہ مژدہ سناتی کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کے موافق آیا ہوں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر

مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اس وقت میرے مامور ہونے پر بہت سی شہادتیں ہیں اوّل اندرونی شہادت دوم بیرونی شہادت سوم صدی کے سر پر آنے والے مجدد کی نسبت حدیث صحیح۔ چہارم اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ حفاظت۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۷؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لئے غیور ہے۔ اس نے سچ فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اس نے اس وعدہ کے موافق اپنے ذکر کی محافظت فرمائی اور مجھے مبعوث کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کے موافق کہ ہر صدی کے سر پر مجدد آتا ہے اس نے مجھے صدی چہاردہم کا مجدد کیا جس کا نام کاسر الصلیب بھی رکھا ہے۔ اگر ہم اس دعویٰ میں غلطی پر ہیں تو پھر سارا کاروبار نبوت کا ہی باطل ہوگا اور سب وعدے جھوٹے ٹھہریں گے اور پھر سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ بھی جھوٹوں کی حمایت کرنے والا ثابت ہوگا (معاذ اللہ) کیونکہ ہم ان سے تائیدیں پاتے ہیں اور اس کی نصرتیں ہمارے ساتھ ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۴ مورخہ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اسلام پر ایسا خطرناک صدمہ پہنچا ہے کہ ایک ہزار سال قبل تک اس کا نمونہ اور نظیر موجود نہیں ہے۔ یہ شیطان کا آخری حملہ ہے اور وہ اس وقت ساری طاقت اور زور کے ساتھ اسلام کو نابود کرنا چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا کیا ہے اور مجھے بھیجا ہے تا میں ہمیشہ کے لئے اُس کا سر کچل دوں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ کے سچے نبی اور افضل الرسل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی گئیں.... خدا تعالیٰ کی غیرت کب روا رکھ سکتی ہے کہ یہ گالیاں اسی طرح دی جائیں اور اسلام کی دستگیری اور نصرت نہ ہو حالانکہ اسنے آپ وعدہ فرمایا تھا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ زمانہ کی یہ حالت ہو اور اللہ تعالیٰ باوجود اس وعدہ کے پھر خاموش رہے۔ بے باک اور شوخ عیسائی قرآن شریف کی یہاں تک بے ادبی کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ استنجے کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قسم قسم کے افترا باندھتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں اور وہ لوگ ان میں زیادہ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم لیا اور مسلمانوں کے گھروں میں پرورش پائی اور پھر مرتد ہو کر اسلام کی پاک تعلیم پر ٹھٹھا کرنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے یہ حالت بیرونی طور پر اسلام کی ہو رہی ہے اور ہر طرف سے اس پر تیر اندازی ہو رہی ہے تو کیا یہ وقت خدا تعالیٰ کی غیرت کو جو وہ اپنے پاک رسول کے لئے (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھتا ہے جوش میں لانے والا نہ تھا؟ اس کی غیرت نے جوش مارا اور مجھے مامور کیا اس وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں کیا تھا۔ (الحکم

جلد ۸ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

ہم نے اس قرآن مجید کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ اس نے کیسی حفاظت فرمائی ایک لفظ اور نقطہ تک پس و پیش نہ ہوا اور کوئی ایسا نہ کر سکا کہ اس میں تحریف تبدیل کرتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی محافظت کریں گے یعنی جب اس کے معانی میں غلطیاں وارد ہوں گی تو اصلاح کے لئے ہمارے مامور آیا کریں گے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸-۳۹ مورخہ ۱۰؍۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

بیشک ہم نے ہی اس ذکر (قرآن شریف) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ قرآن شریف کی حفاظت کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ توریت یا کسی اور کتاب کے لئے نہیں اسی لئے ان کتابوں میں انسانی چالاکیوں نے اپنا کام کیا۔ قرآن شریف کی حفاظت کا یہ بڑا زبردست ذریعہ ہے کہ اس کی تاثیرات کا ہمیشہ تازہ بتازہ ثبوت ملتا رہتا ہے اور یہود نے چونکہ توریت کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ان میں کوئی اثر اور قوت باقی نہیں رہی جو ان کی موت پر دلالت کرتی ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

اسلام کی حالت جو اس وقت ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ بالاتفاق مان لیا گیا ہے کہ ہر قسم کی کمزوریوں اور تنزل کا نشانہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ ہر پہلو سے وہ گر رہے ہیں۔ ان کی زبان ساتھ ہے تو دل نہیں ہے اور اسلام یتیم ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اس کی حمایت اور سرپرستی کروں اور اپنے وعدہ کے موافق بھیجا ہے کیونکہ اس نے فرمایا تھا اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ اگر اس وقت حمایت اور نصرت اور حفاظت نہ کی جاتی تو وہ اور کونسا وقت آئے گا۔ اب اس چودھویں صدی میں وہی حالت ہو رہی ہے جو بدر کے موقع پر ہو گئی تھی۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

یہ امر قرآن شریف سے بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی حفاظت کرتا رہا ہے اور کرے گا جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ یعنی بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ کا لفظ صاف طور پر دلالت کرتا ہے کہ صدی کے سر پر ایسے آدمی آتے رہیں گے جو گم شدہ متاع کو لائیں اور لوگوں کو یاد دلائیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍ فروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

خدا کا یہی ارادہ تھا۔ اس نے اپنے وعدہ کے موافق وقت پر اپنے دین کی خبر گیری اور دستگیری فرمائی ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ اسلام کو اس نے دُنیا میں قائم کیا قرآن کی تعلیم پھیلائی

اور اس کی حفاظت کا بھی وہی خود ذمہ دار ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ملا مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صہ ۱۳)

یہ حدیث (اِنّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی رأس کُلّ مائۃ سنۃ من یجدّد لھا دینھا۔ ناقل) اِنّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَ اِنّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی شرح ہے۔ صدی ایک عام آدمی کی عمر ہوتی ہے اِس لئے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ سو سال بعد کوئی نہ رہے گا۔ جیسے صدی جسم کو مارتی ہے اسی طرح ایک روحانی موت بھی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے صدی کے بعد ایک نئی ذریّت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اناج کے کھیت۔ اب دیکھتے ہیں کہ ہرے بھرے ہیں ایک وقت میں بالکل خشک ہوں گے پھر نئے سرے سے پیدا ہو جائیں گے اس طرح پر ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پہلے اکابر سو سال کے اندر فوت ہو جاتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ ہر صدی پر نیا انتظام کر دیتا ہے جیسا رزق کا سامان کرتا ہے۔ پس قرآن کی حمایت کے ساتھ یہ حدیث تواتر کا حکم رکھتی ہے۔

کپڑا پھٹتے ہیں تو اس کی بھی تجدید کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اسی طریق پر نئی ذریّت کو تازہ کرنے کیلئے سُنّت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر صدی پر مجدّد آتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صہ)

پھر جبکہ اس حد تک اسلام کی حالت ہو گئی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ اِنّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَ اِنّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ بالکل غلط ہو گیا؟ کیا حق نہ تھا کہ اس وقت اس کی حفاظت کی جاتی؟ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ قوم پورا پورا صدمہ حریف کا اُٹھا چکی ہے اب ضروری ہے کہ اسے ربیع کا حصہ ملے اور اسلام کے پاک درخت کے پھل پھول نکلیں۔ سکھوں کے عہد میں اسلام کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ بہت ہی ناگوار ہے۔ مساجد گرا دی گئیں۔ وحشیانہ حالت ایسی تھی کہ بانگ اور نماز تک سے روکا جاتا اور شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جسے قرآن آتا ہو۔ اپنی حالت بھی انہوں نے سکھوں کی سی بنالی۔ کچھ پہن لئے اور مونچھیں بڑھالیں اور السلام علیکم کی جگہ واہ گوروجی کی فتح رہ گئی یہ تو وہ حالت تھی جو سکھوں کے عہد میں ہوئی۔ اب جب امن ہوا تو فسق و فجور میں ترقی کی اور ادھر عیسائیوں نے ہر قسم کے لالچ دے کر ان کو عیسائی بنانا چاہا اور ان کا وار خالی نہیں گیا۔ ہر گرجہ میں ہر شریف قوم کی لڑکیاں اور لڑکے پاؤ گے جو مرتد ہو کر ان میں مل گئے ہیں۔ وہ کیسا دردناک واقعہ ہوتا ہے جب کسی شریف خاندان کی لڑکی کو بہلا کر لے جاتے ہیں اور پھر وہ بے پردہ ہو کر پھرتی ہے اور ہر قسم کے معاصی سے حصہ لیتی ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر ایک معمولی عقل کا آدمی بھی کہہ اٹھے گا کہ یہ زمانہ بالطبع تقاضا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مدد آوے۔ ان لوگوں کا تو ہم منہ بند نہیں کر سکتے جو کہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑا۔ ایسے لوگوں کے نزدیک تو اگر سب کے سب دہریہ ہو جائیں تب بھی کچھ نہیں بگڑے گا لیکن سچی بات یہی ہے کہ اس وقت اسلام خدا کی مدد کا سخت محتاج ہے۔

اور یہ کیسی خوشی کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسے وقت میں اسلام کو بے مدد نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے قانون کے موافق مجھے بھیجا ہے تا میں اسے زندہ کروں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

عقل کے نزدیک بھی زمانہ مسیح کا یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کے مرتد ہو جانے پر اس میں شور پڑ جاتا تھا لیکن اب لاکھوں مرتد ہو گئے۔ رات دن مخالفت اسلام میں کتب تصنیف ہو رہی ہیں۔ اسلام کی بیخکنی کے واسطے طرح طرح کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ عقل پسند نہیں کرتی کہ جس خدا نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ دیا ہے وہ اس وقت اسلام کی حفاظت نہ کرے اور خاموش رہے۔ یہ زمانہ کس قسم کی مصیبت کا اسلام پر ہے کہ شرفا کی اولاد دشمن اسلام ہو کر گرجاؤں میں چلے گئے اور کھلے طور پر رسول اکرم کی توہین ہو رہی ہے۔ ہر ایک قسم کی گالی اور سب وشتم میں ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کو بہ ہیئت مجموعی اگر دیکھا جائے تو عقل کہتی ہے کہ یہی وقت خدا کی تائید کا ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

ایک اعتراض یہ پیش کرتے ہو کہ اس امت میں ۳۰ دجال آنے والے ہیں۔ اے بدقسمتو کیا تمہارے لئے دجال ہی رہ گئے کہ اگر ایک کے آنے سے ایمان کے تباہ ہونے میں کوئی کسر رہ جاوے تو پھر دوسرا تیسرا اور چوتھا حتّٰی کہ تیسؔ دجال آویں تا کہ ایمان کا نام ونشان نہ رہے۔ اس طرح تو موسٰی علیہ السلام کی اُمت ہی اچھی رہی کہ جس میں پے در پے چار سو نبی آیا۔ پھر موسٰی علیہ السلام کے وقت تو عورتوں سے بھی خدا نے کلام کیا۔ اُمّت محمدیہ کے مرد بھی اس قابل نہ ہوئے کہ خدا ان سے ہمکلام ہوتا۔ پھر یہ بتلاؤ کہ یہ امت مرحومہ کس طرح ہوئی اس کا نام تو بدنصیب ہونا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۳ سو برس گذر گئے اور جس قدر فیوض وبرکات تھے وہ سب سماع کے حکم میں آگئے اب اگر خدا ان کو تازہ کر کے نہ دکھائے تو صرف قصہ کہانی کے رنگ میں ان کو کون مان سکتا ہے جبکہ تازہ طور پر خدا کی مدد نہیں۔ نصرت نہیں تو خدا کی حفاظت کیا ہوئی حالانکہ اس کا وعدہ ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ و ۳۵ و ۳۶ مورخہ ۸ و ۱۶ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

یہ اس قرآن کی آیت ہے جس کا حرف حرف محفوظ ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ دار خود اللہ تعالیٰ ہے جب کہ اس نے فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

علماء کی اگر میرے دعویٰ سے پہلے کی کتابیں دیکھی جاتی ہیں تو ان سے کس قدر انتظار اور شوق کا پتہ لگتا ہے گویا وہ تیرھویں صدی کے علامات سے مضطرب اور بے قرار ہو رہے ہیں مگر جب وقت آیا تو اول الکافرین

ٹھیرتے ہیں وہ جانتے تھے اور ہمیشہ کہتے آتے تھے کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدّد اصلاح فساد کے لئے آتا ہے اور ایک روحانی طبیب مفاسد موجودہ کی اصلاح کے لئے بھیجا جاتا ہے اب چاہیئے تو یہ تھا کہ صدی کا سر پا کر وہ انتظار کرتے ضرورت کے لحاظ سے ان کو مناسب تھا کہ ایسے مجدّد کا انتظار کرتے جو کسرِ صلیب کے لئے آتا کیونکہ اس وقت سب سے بڑا یہی فتنہ ہے۔ بتاؤ ایسی حالت اور صورت میں اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ کہاں گیا؟

(الحکم جلد ۷ ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳-۴)

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○

دُنیا کی تمام چیزوں کے ہمارے پاس خزانے ہیں مگر بقدر ضرورت و مقتضائے مصلحت و حکمت ہم اُن کو اُتارتے ہیں۔ اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوا کہ ہر یک چیز جو دنیا میں پائی جاتی ہے وہ آسمان سے ہی اُتری ہے اس طرح پر کہ ان چیزوں کے علل موجبہ اُسی خالق حقیقی کی طرف سے ہیں اور نیز اس طرح پر کہ اُسی کے الہام اور القاء اور سمجھانے اور عقل اور فہم بخشنے سے ہر یک صنعت ظہور میں آتی ہے لیکن زمانہ کی ضرورت سے زیادہ ظہور میں نہیں آتے اور ہر یک مامور من اللہ کو وسعت معلومات بھی زمانہ کی ضرورت کے موافق دی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن کریم کے دقائق و معارف و حقائق بھی زمانہ کی ضرورت کے موافق ہی کھلتے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۴۹-۶۵۰ طبع اوّل)

ہر ایک چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں مگر ہم قدر ضرورت سے زیادہ اُن کو نازل نہیں کیا کرتے پس یہ حکمت الٰہیہ کے برخلاف ہے کہ ایک نبی کو امّت کی اصلاح کے لئے وہ علوم دئے جائیں جن علوم سے وہ امّت مناسبت ہی نہیں رکھتی بلکہ حیوانات میں بھی خدا تعالیٰ کا یہی قانونِ قدرت پایا جاتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۱ طبع اوّل)

انجیل ایک قانون ہے مختص المقام والزمان اور مختص القوم جیسا کہ انگریز بھی قوانین مختص المقام اور مختص الوقت نافذ کر دیتے ہیں بعد از وقت ان کا اثر نہیں رہتا۔ اسی طرح انجیل بھی ایک مختص قانون ہے عام نہیں مگر قرآن کریم کا دامن بہت وسیع ہے وہ قیامت تک ایک ہی لاتبدیل قانون ہے اور ہر قوم اور ہر وقت کے لئے ہے چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ یعنی ہم اپنے خزانوں میں سے بقدر معلوم نازل کرتے ہیں انجیل کی ضرورت اسی قدر تھی اس لئے انجیل کا خلاصہ ایک صفحہ میں آ سکتا ہے لیکن قرآن کریم کی ضرورتیں تھیں سارے زمانہ کی اصلاح۔

قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا۔ انسانی آداب سے مہذب انسان بنانا تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو اور پھر باخدا انسان بنانا۔ یہ لفظ مختصر ہیں مگر اس کے ہزار ہا شعبہ ہیں۔ چونکہ یہودیوں، طبیعیوں، آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں بدروشی کی روح کام کر رہی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلام الٰہی سب کو مخاطب کرکے کہا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ جَمِیۡعًا۔[1] اس لئے ضروری تھا کہ قرآن شریف ان تمام تعلیمات کا جامع ہوتا جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں اور ان تمام صداقتوں کو اپنے اندر رکھتا جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعے زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئیں تھیں۔ قرآن کریم کے مدنظر تمام نوع انسان تھا نہ کوئی خاص قوم اور ملک اور زمانہ اور انجیل کا مدنظر ایک خاص قوم تھی اس لئے مسیح علیہ السلام نے بار بار کہا کہ "میں اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں"۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۶)

وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ مِنۡكُمۡ وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ۝

یعنی ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں جو تم میں سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو پیچھے رہنے والے ہیں۔
(شہادت القرآن صفحہ ۳۶ طبع اول)

وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ۝

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً[2] سے استنباط ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے سے اس وقت کوئی قوم موجود ہو۔ اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ایک قوم جان بھی آدم سے پہلے موجود تھی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۷)

فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ۝

(انسان) باعتبار روح عالم صغیر ہے اور بلحاظ شیون و صفات کاملہ و ظلیت تام روح الٰہی کا مظہر تام ہے۔
(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۷۸-۱۷۹ حاشیہ در حاشیہ طبع اول)

جب میں نے اس کا قالب بنا لیا اور تجلیات کے تمام مظاہر درست کر لئے اور اپنی روح اس میں پھونک

[1] الاعراف آیت ۱۵۹ [2] البقرہ آیت ۳۱

دی تو تم سب لوگ اس کے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ سو اس آیت میں یہی اشارہ ہے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس قالب میں وہ رُوح چمک اٹھتی ہے جس کو خدا تعالیٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ دنیوی زندگی کی فنا کے بعد وہ قالب تیار ہوتا ہے اس لئے الٰہی روشنی جو پہلے دھیمی تھی یک دفعہ بھڑک اٹھتی ہے اور واجب ہوتا ہے کہ خدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ سو ہر ایک اس نور کو دیکھ کر سجدہ کرتا ہے اور طبعاً اس طرف آتا ہے بجز ابلیس کے جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ طبع اوّل)

حکمتِ الٰہیہ نے آدم کو ایسے طور سے بنایا کہ فطرت کی ابتدا سے ہی اس کی سرشت میں دو قسم کے تعلق قائم کر دیئے یعنی ایک تعلق تو خدا سے قائم کیا جیسا قرآن شریف میں فرمایا فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ یعنی جب میں اس کو ٹھیک ٹھاک بنا لوں اور میں اپنی رُوح اس میں پھونک دوں تو اے فرشتو اس وقت تم سجدہ میں گر جاؤ۔

مذکورہ بالا آیت سے صاف ثابت ہے کہ خدا نے آدم میں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی رُوح پھونک کر اُس کی فطرت کو اپنے ساتھ ایک تعلق قائم کر دیا۔ سو یہ اس لئے کیا گیا کہ تا انسان کو فطرتاً خدا سے تعلق پیدا ہو جاوے۔ ایسا ہی دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں سے بھی فطرتی تعلق ہو جو بنی نوع کہلائیں گے کیونکہ جبکہ ان کا وجود آدم کی ہڈی میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہوگا تو وہ ضرور اس رُوح میں سے بھی حصہ لیں گے جو آدم میں پھونکی گئی۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۷۷-۱۷۸ بابت مئی ۱۹۰۲ء)

اس آیت میں ایک عمیق راز کی طرف اشارہ ہے جو انتہائی درجہ کے کمال کا ایک نشان ہے اور وہ یہ کہ انسان ابتدا میں صرف صورت انسان کی ہوتی ہے مگر اندر سے وہ بیجان ہوتا ہے اور کوئی روحانیت اُس میں نہیں ہوتی اور اس صورت میں فرشتے اس کی خدمت نہیں کرتے کیونکہ وہ ایک پوست بے مغز ہے لیکن بعد اس کے رفتہ رفتہ سعید انسان پر یہ زمانہ آجاتا ہے کہ وہ خدا سے بہت ہی قریب جا رہتا ہے۔ تب جب ٹھیک ٹھیک ذوالجلال کی روشنی کے مقابل پر اس کا نفس جا پڑتا ہے اور کوئی حجاب درمیان نہیں ہوتا کہ اُس روشنی کو روک دے تو بلا توقف الوہیت کی روشنی جس کو دوسرے لفظوں میں خدا کی رُوح کہہ سکتے ہیں اس انسان کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور وہی ایک خاص حالت ہے جس کی نسبت کلامِ الٰہی میں کہا گیا کہ خدا نے آدم میں اپنی رُوح پھونک دی۔ اس حالت پر نہ کسی تکلف سے اور نہ ایسے امر سے جو شریعت کے احکام کے رنگ میں ہوتا ہے۔ فرشتوں کو یہ حکم ہوتا ہے کہ اس کے آگے سجدہ میں گریں یعنی کامل طور پر اس کی اطاعت کریں گویا وہ اس کو سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ حکم فرشتوں کی فطرت کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ کوئی مستحدث امر نہیں ہوتا یعنی ایسے

شخص کے مقابل پر جس کا وجود خدا کی صورت پر آجاتا ہے خود فرشتے طبعاً محسوس کر لیتے ہیں کہ اب اس کی خدمت کیلئے ہمیں گرنا چاہیئے اور ایسے قصّے درحقیقت قصّے نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم میں عادتِ الٰہی اسی طرح واقع ہے کہ اُن قصوں کے نیچے کوئی علمی حقیقت ہوتی ہے پس اس جگہ یہی علمی حقیقت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس قصّے کے پیرایہ میں ظاہر کرنا چاہا ہے کہ کامل انسان کی نشانی کیا ہے۔ پس فرمایا کہ انسان کامل کی پہلی نشانی یہ ہے کہ انسانی خلقت کے کسی حصّہ میں وہ کم نصیب نہ ہو اور اس کے روحانی جسمانی اعضا نے بشری بناوٹ سے پورا حصّہ لیا ہو اور کمال اعتدال پر اس کی فطرت واقع ہو (۲) اور دوسری یہ نشانی ہے کہ الٰہی رُوح نے اس کے اندر دخول کیا ہو۔ (۳) اور تیسری یہ نشانی ہے کہ فرشتے اس کو سجدہ کریں یعنی تمام فرشتے جو زمین اور آسمان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اُس کے خادم ہوں اور اس کی منشاء کے مطابق کام کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کا تمام لشکر ملائکہ کا بھی اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے اور اس کی طرف جُھک جاتا ہے۔ تب ہر ایک میدان میں اور ہر ایک مشکل کے وقت میں فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کے لئے ہردم کمربستہ رہتے ہیں۔ گویا وہ ہر وقت اس کے سامنے سجدہ میں ہیں کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ ہے لیکن ان باتوں کو زمینی خیال کے لوگ سمجھ نہیں سکتے کیونکہ آسمانی روح سے اُن کو حصّہ نہیں دیا گیا۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۷۷-۱۷۸ حاشیہ)

پھر ایک اور جگہ فرمایا اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ[1]

یعنی یاد کر وہ وقت جب تیرے خدا نے (جس کا تو مظہر اتم ہے) فرشتوں کو کہا کہ مَیں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب مَیں اس کو کمال اعتدال پر پیدا کر لوں اور اپنی روح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گرو یعنی کمال انکسار سے اس کی خدمت میں مشغول ہو جاؤ اور ایسی خدمتگذاری میں جُھک جاؤ کہ گویا تم اسے سجدہ کر رہے ہو پس سارے کے سارے فرشتے انسان مکمل کے آگے سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان جو اس سعادت سے محروم رہ گیا۔ جاننا چاہیئے کہ یہ سجدہ کا حکم اس وقت سے متعلق نہیں ہے کہ جب حضرت آدم پیدا کئے گئے بلکہ یہ علیحدہ ملایک کو حکم کیا گیا کہ جب کوئی انسان اپنی حقیقی انسانیت کے مرتبہ تک پہنچے اور اعتدال انسانی اس کو حاصل ہو جائے اور خدائے تعالیٰ کی روح اس میں سکونت اختیار کرے تو تم اس کامل کے آگے سجدہ میں گرا کرو یعنی آسمانی انوار کے ساتھ اس پر اترو اور اس پر صلوٰۃ بھیجو۔ سو یہ اس قدیم قانون کی طرف اشارہ ہے جو خدائے تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی زمانہ میں اعتدال روحانی حاصل کر لیتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی روح اس کے

[1] صٓ: ۷۲ تا ۷۵

اندر آباد ہوتی ہے یعنی اپنے نفس سے فانی ہو کر بقا باللہ کا درجہ حاصل کرتا ہے تو ایک خاص طور پر نزول ملایکہ کا اس پر شروع ہو جاتا ہے اگرچہ سلوک کی ابتدائی حالات میں بھی ملایک اس کی نصرت اور خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ نزول ایسا اتم اور اکمل ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم رکھتا ہے اور سجدہ کے لفظ سے خدائے تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا کہ ملایکہ انسان کامل سے افضل نہیں ہیں بلکہ وہ شاہی خادموں کی طرح سجدات تعظیم انسان کامل کے آگے بجا لا رہے ہیں۔ (توضیح مرام صفحہ ۴۸-۵۰)

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ۝

قرآن شریف اس شخص کو جس کا نام حدیثوں میں دجّال ہے شیطان قرار دیتا ہے جیسا کہ وہ شیطان کی طرف سے حکایت کرکے فرماتا ہے قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ یعنی شیطان نے جناب الٰہی میں عرض کی کہ میں اس وقت تک ہلاک نہ کیا جاؤں جب تک کہ وہ مُردے جن کے دل مر گئے ہیں دوبارہ زندہ ہوں۔ خدا نے کہا کہ میں نے تجھے اُس وقت تک مہلت دی۔ سو وہ دجّال جس کا حدیثوں میں ذکر ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخر زمانہ میں قتل کیا جائے گا جیسا کہ دانیال نے بھی یہی لکھا ہے اور بعض حدیثیں بھی یہی کہتی ہیں اور چونکہ مظہر اتم شیطان کا نصرانیت ہے اس لئے سورہ فاتحہ میں دجّال کا تو کہیں ذکر نہیں مگر نصاریٰ کے شر سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اگر دجّال کوئی الگ مفسد ہوتا تو قرآن شریف میں بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا وَلَا الضَّآلِّيْنَ یہ فرمانا چاہئے تھا کہ وَلَا الدَّجَّالَ اور آیت إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ سے مراد جسمانی بعث نہیں کیونکہ شیطان صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ بنی آدم زندہ ہیں۔ ہاں شیطان اپنے طور سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بذریعہ اپنے مظاہر کے کرتا ہے۔ سو وہ مظاہر یہی انسان کو خدا بنانے والے ہیں اور چونکہ وہ گروہ ہے اس لئے اس کا نام دجّال رکھا گیا ہے کیونکہ عربی زبان میں دجّال گروہ کو بھی کہتے ہیں۔
(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۸-۳۹ طبع اوّل)

وَإِنَّ اٰدَمَ هَوٰى مِنْ قَبْلُ فِيْ مَصَافٍّ۔ وَهَزَمَهُ الشَّيْطَانُ فَمَا رَأَى الْغَلَبَةَ إِلٰى سِتَّةِ الْاٰفٍ

(ترجمہ) اور یقیناً آدم اس سے قبل میدان مقابلہ میں گر گئے تھے اور شیطان نے انہیں شکست دے دی تھی پس چھ ہزار سال تک وہ غلبہ کو نہ دیکھ سکے۔ ان کی اولاد پراگندہ ہوگئی اور اطراف عالم

وَمُزِّقَتْ ذُرِّيَّتُهٗ وَفُرِّقَتْ فِيْ اَطْرَافٍ فَاِلٰى كَمْ يَكُوْنُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ۔ اَلَمْ يُغْوِ النَّاسَ
اَجْمَعِيْنَ۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْ عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔ فَقَدْ اَتَمَّ اَمْرَهٗ وَكَمَّلَ فِعْلَهٗ وَحَانَ اَنْ يُّعَانَ اٰدَمُ
مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَلَا شَكَّ وَلَا شُبْهَةَ اَنَّ اِنْظَارَ الشَّيْطَانِ۔ كَانَ اِلٰى اٰخِرِ الزَّمَانِ كَمَا يُفْهَمُ
مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ اَعْنِيْ لَفْظَ الْاِنْظَارِ الَّذِيْ جَآءَ فِي الْفُرْقَانِ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ خَاطَبَهٗ وَقَالَ اِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ[1] يَعْنِيْ يَوْمَ الْبَعْثِ الَّذِيْ يُبْعَثُ النَّاسُ فِيْهِ بَعْدَ مَوْتِ الضَّلَالَةِ
بِاِذْنِ الْحَيِّ الْقَيُّوْمِ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمٌ يُّشَابِهُ يَوْمَ خَلْقَةِ اٰدَمَ بِمَا اَرَادَ اللّٰهُ فِيْهِ اَنْ
يَّخْلُقَ مَثِيْلَ اٰدَمَ ثُمَّ يَبُثَّ فِي الْاَرْضِ ذُرِّيَّتَهُ الرُّوْحَانِيَّةَ وَيَجْعَلَهُمْ فَوْقَ كُلِّ مَنْ قُطِعَ مِنَ
اللّٰهِ وَتَجَذَّمَ وَاشْتَدَّتِ الْحَاجَةُ اِلٰى اٰدَمَ الثَّانِيْ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ لِيَتَدَارَكَ مَا فَاتَ فِيْ
اَوَّلِ الْاَوَانِ وَلِيَتِمَّ وَعِيْدُ اللّٰهِ فِي الشَّيْطَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَهٗ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى اٰخِرِ الدُّنْيَا
وَاَشَارَ فِيْهِ اِلٰى اِهْلَاكِهٖ وَاِخْرَاجِهٖ مِنْ اَمْلَاكِهٖ۔ وَمَا مَعْنَى الْاِنْظَارِ مِنْ غَيْرِ وَعِيْدِ الْقَتْلِ

میں منتشر کردی گئی پس کب تک شیطان مہلت پائے گا۔ کیا اس نے سب لوگوں کو گمراہ نہیں کیا بجز اس تھوڑی تعداد
کے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی تھی۔ سو اس نے اپنا کام پورا کر لیا اور اپنا عمل مکمل کر لیا اور اب وقت
آگیا ہے کہ خدائے رب العالمین کی طرف سے حضرت آدم کی مدد کی جائے۔ اور یہ بات بلا شک وشبہ درست
ہے کہ شیطان کا مہلت پانا جیسا کہ قرآن مجید سے سمجھا جاتا ہے آخر الزمان تک تھا۔ میری مراد لفظ "اِنْظَار"
سے ہے جو قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے مخاطب ہو کر فرمایا تھا اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى
يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ یعنی تجھے اس وقت تک مہلت دی جاتی ہے جب لوگ گمراہی کی موت کے بعد خدائے
حی وقیوم کے اِذن سے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ حقیقت میں یہ دن حضرت آدم کی پیدائش کے دن سے مشابہت
رکھتا ہے اس وجہ سے کہ اللہ نے آج ارادہ فرمایا ہے کہ مثیل آدم کو پیدا کرے اور روئے زمین پر اس کی
روحانی اولاد کو پھیلا دے اور ان تمام لوگوں پر ان کو غالب کرے جو اللہ تعالیٰ سے کٹ گئے اور اس سے
علیحدہ ہو گئے اور آخری زمانہ میں آدم ثانی کی اشد ضرورت پیدا ہو گئی تا کہ پہلے زمانہ میں جو کوتاہی ہوئی
ہے اس کی تلافی کرے اور شیطان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی وعید پوری ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا
کے آخر تک شیطان کو مہلت پانے والوں میں قرار دیا اور اشارہ کیا کہ وہ اس وقت ہلاک کیا جائے گا اور
اپنی قوتوں سے محروم کیا جائے گا اور مہلت دینے کے معنے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عرصہ مہلت اور ملکوں

---

[1] الحجر آیت ۳۸-۳۹

بَعْدَ اَیَّامِ الْاِمْهَالِ وَعَیْثِهٖ فِی الدِّیَارِ وَکَانَ الْاِهْلَاكُ جَزَآءً لِمَا اَهْلَكَ النَّاسَ بِالْفِتَنِ الْکِبَارِ وَکَانَ الْاَلْفُ السَّابِعُ لِقَتْلِهٖ اَجَلًا مُّسَمًّی فَاِنَّهٗ اَدْخَلَ النَّاسَ فِیْ جَهَنَّمَ مِنْ سَبْعَةِ اَبْوَابِهَا وَوَفّٰی حَقَّ الْعَمٰی فَالسَّابِعُ لِهٰذِهِ السَّبْعَةِ اَنْسَبُ وَاَوْفٰی وَکَتَبَ اللّٰهُ اَنَّهٗ یُقْتَلُ فِیْ اٰخِرِ حِصَّةِ الدُّنْیَا وَیُحْیٰی هُنَاكَ اَبْنَآءُ اٰدَمَ رَحْمَةً مِّنْ حَضْرَةِ الْکِبْرِیَاءِ وَیُجْعَلُ عَلَیْهِ هَزِیْمَةٌ عُظْمٰی کَمَا جُعِلَ عَلٰی اٰدَمَ فِی الْاِبْتِدَآءِ. فَهُنَاكَ تُجْزَی النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالْعِرْضُ بِالْعِرْضِ وَتُشْرِقُ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَتَهْوِیْ عَدُوُّ صَفِیِّ اللّٰهِ وَکَذَالِكَ جَزَآءُ عَدَاوَةِ الْاَصْفِیَآءِ وَکَانَ هٰذَا الْفَتْحُ حَقًّا وَّاجِبًا لِاٰدَمَ بِمَا اَذَلَّهُ الشَّیْطَانُ فِیْ حِلْیَةِ الثُّعْبَانِ وَاَلْقَاهُ فِیْ مَغَارَةِ الْهَوَانِ وَهَمَّ بَعْدَمَا اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَاَکْرَمَ وَمَا قَصَدَ اِبْلِیْسُ اِلَّا قَتْلَهٗ وَاِهْلَاکَهٗ وَاسْتِیْصَالَهٗ وَاَرَادَ اَنْ یَّعْدِمَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗ وَاٰلَهٗ فَکُتِبَ عَلَیْهِ حُکْمُ الْقَتْلِ مِنْ دِیْوَانِ قَضَآءِ الْحَضْرَةِ بَعْدَ اَیَّامِ الْمُهْلَةِ. وَاِلَیْهِ اَشَارَ سُبْحَانَهٗ فِیْ قَوْلِهٖ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ[1] کَمَا یَعْلَمُهُ الْمُتَدَبِّرُوْنَ. وَمَاعَنٰی بِهٰذَا

تھا اس کے فساد پھیلانے کے بعد اس کے قتل کی وعید اُسے سنائی جائے۔ اور اس کا یہ ہلاک کیا جانا اس کا لوگوں کو بڑے بڑے فتنوں سے ہلاک کرنے کا بدلہ ہے پس ساتواں ہزار اس کے قتل کی معیّن مدّت ہے اس نے بھی لوگوں کو جہنم میں اس کے سات دروازوں سے داخل کیا اور اندھا بنانے کا حق پورا کر دیا۔ پس ساتویں ہزار کو ان سات دروازوں کے ساتھ زیادہ مناسبت اور موافقت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر فرمادیا تھا کہ شیطان کو دُنیا کے آخری ایّام میں قتل کیا جائے اور بارگاہ ربّ العزّت کی طرف سے آدم کی اولاد کو روحانی زندگی بخشی جائے اور اُس (شیطان) کو بہت بڑی شکست دی جائے جیسے اس نے حضرت آدم کے خلاف ابتداء میں کیا تھا تب اس وقت جان کا بدلہ جان اور عزّت کا بدلہ عزّت ہوگا اور زمین اپنے ربّ کے نور سے منوّر ہو جائے گی اور صفی اللہ (آدم) کا دشمن ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا اور اصفیاء سے دشمنی کا نتیجہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ فتح حضرت آدم کے لئے بطور حق کے واجب ہوگی کیونکہ شیطان نے اژدھے کی شکل میں ان کو پھسلایا تھا اور ذلّت کے گڑھے میں گرا دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم کو عزّت و اکرام ملنے کے بعد شیطان نے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی اور ابلیس کا مقصد تو حضرت آدم کو قتل ہلاک اور برباد کرنا تھا اور اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ اُسے اور اُس کی اولاد اور جماعت کو نیست و نابود کر دے پس شیطان کے بارہ میں اس کے ایّامِ مہلت کے بعد اللہ تعالیٰ کے دفتر سے اس کے قتل کا فرمان جاری ہوا اور اللہ تعالیٰ کے قول اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ میں اسی طرف اشارہ ہے جیسا کہ تدبّر کرنے والے جانتے ہیں پس اللہ تعالیٰ

[1] الاعراف آیت ۱۵

الْقَوْلِ بَعْثُ الْاَمْوَاتِ بَلْ اُرِیْدَ فِیْهِ بَعْثُ الضَّآلِّیْنَ بَعْدَ الضَّلَالَاتِ وَیُؤَیِّدُهٗ قَوْلُهٗ تَعَالٰی فِی الْقُرْاٰنِ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ[1] کَمَا لَایَخْفٰی عَلٰی اَهْلِ الْعَقْلِ وَ الْعِرْفَانِ فَاِنَّ اِظْهَارَ الدِّیْنِ عَلٰی اَدْیَانٍ اُخْرٰی۔ لَایَتَحَقَّقُ اِلَّا بِالْبَیِّنَةِ الْکُبْرٰی وَالْحُجَجِ الْقَاطِعَةِ الْعُظْمٰی وَکَثْرَةِ اَهْلِ الصَّلَاحِ وَالتَّقْوٰی وَلَاشَكَّ اَنَّ الدِّیْنَ الَّذِیْ یُعْطِی الدَّلَآئِلَ الْمُوْصِلَةَ اِلَی الْیَقِیْنِ وَیُزَکِّی النُّفُوْسَ حَقَّ التَّزْکِیَةِ وَیُنَجِّیْهِمْ مِّنْ اَیْدِی الشَّیْطَانِ اللَّعِیْنِ هُوَ الدِّیْنُ الظَّاهِرُ الْغَالِبُ عَلَی الْاَدْیَانِ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْعَثُ الْاَمْوَاتَ مِنْ قُبُوْرِ الشَّكِّ وَ الْعِصْیَانِ وَیُحْیِیْهِمْ عِلْمًا وَّعَمَلًا بِفَضْلِ اللّٰهِ الْمَنَّانِ۔ وَکَانَ اللّٰهُ قَدْ قَدَّرَ اَنَّ دِیْنَهٗ لَایُظْهَرُ بِظُهُوْرٍ تَآمٍّ عَلَی الْاَدْیَانِ کُلِّهَا وَلَا یُرْزَقُ اَکْثَرُ الْقُلُوْبِ دَلَآئِلَ الْحَقِّ وَلَایُعْطٰی تَقْوَی الْبَاطِنِ لِاَکْثَرِهَا اِلَّا فِیْ زَمَانِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَالْمَهْدِیِّ الْمَعْهُوْدِ۔ وَ اَمَّا الْاَزْمِنَةُ الَّتِیْ هِیَ قَبْلَهٗ فَلَا تَعُمُّ فِیْهَا التَّقْوٰی وَلَا الدِّرَایَةُ بَلْ یَکْثُرُ الْفِسْقُ وَ الْغَوَایَةُ

کے قول اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے مراد جسمانی مُردوں کا اُٹھایا جانا نہیں بلکہ اس سے گمراہ لوگوں کا اپنی گمراہیوں کے بعد اُٹھایا جانا (یعنی ہدایت پانا) مراد ہے۔ اس کی تائید قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اپنے قول "لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ" سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ اہلِ علم دانشمندوں پر یہ بات مخفی نہیں کیونکہ دینِ اسلام کا باقی ادیان پر غالب آنا پختہ دلائل اور براہین قاطعہ نیز صلاحیّت رکھنے والے اور تقویٰ پر گامزن وجودوں کی کثرت سے متحقق ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ وہ دین جو یقین کی معراج تک پہنچا دینے والے دلائل پیش کرتا ہے اور لوگوں کا کماحقہٗ تزکیہ کرتا اور شیطانِ لعین کی گرفت سے ان کو آزاد کرتا ہے۔ وہی دین فوقیّت رکھنے والا اور سب دینوں پر غالب ہے۔ اور وہی ہے جو مُردوں کو شک اور نافرمانی کی قبروں سے اُٹھاتا ہے اور انہیں خدائے منّان کے فضل کے ذریعہ سے علم و عمل کے لحاظ سے زندگی بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ امر مقدّر فرمایا تھا کہ اس کا دین (دینِ اسلام) تمام ادیان پر غالب نہیں آئے گا اور نہ ہی بہت سے دلوں کو دلائلِ حقّہ عطا کرے گا اور نہ ہی اکثر قلوب میں باطنی تقویٰ پیدا کرے گا مگر مسیح موعود اور مہدی معہود کے زمانہ میں۔ باقی وہ صدیاں جو اس سے پہلے ہیں ان میں تقویٰ اور علم و عرفان عام نہیں ہوگا بلکہ فسق و فجور اور گمراہی بڑھتی رہے گی۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ عام اور وسیع ہدایت اور دلائل تامہ قاطعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسیح موعود کے زمانہ سے مختص ہیں اور اُس زمانہ

---

[1] الصّف آیت ۱۰

فَالْحَاصِلُ اَنَّ الْهِدَايَةَ الْوَسِيْعَةَ الْعَامَّةَ وَ الْحُجَجَ الْقَاطِعَةَ التَّامَّةَ تَخْتَصُّ بِزَمَانِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ مِنَ الْحَضْرَةِ وَعِنْدَ ذٰلِكَ الزَّمَانِ تَنْكَشِفُ الْحَقَائِقُ الْمُسْتَتِرَةُ وَ تُكْشَفُ مِنْ سَاقِ الْحَقِيْقَةِ وَ تَهْلِكُ الْمِلَلُ الْبَاطِلَةُ وَ الْمَذَاهِبُ الْكَاذِبَةُ وَ يَمْلِكُ الْاِسْلَامُ الشَّرْقَ وَالْغَرْبَ وَ يَدْخُلُ الْحَقُّ كُلَّ دَارٍ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَ يَتِمُّ الْاَمْرُ وَ يَضَعُ اللّٰهُ الْحَرْبَ وَتَقَعُ الْاَمَنَةُ عَلَى الْاَرْضِ وَ تَنْزِلُ السَّكِيْنَةُ وَ الصُّلْحُ فِيْ جُذُوْرِ الْقُلُوْبِ وَ تَتْرُكُ السِّبَاعُ سَبُعِيَّتَهَا وَالْاَفَاعِيْ سُمِّيَّتَهَا وَ تَتَبَيَّنُ الرُّشْدُ وَ تَهْلِكُ الْغَيُّ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْكُفْرِ وَ الشِّرْكِ اِلَّا رَسْمٌ قَلِيْلٌ وَلَا يَلْتَزِمُ الْفِسْقَ وَ الْفَاحِشَةَ اِلَّا قَلْبٌ عَلِيْلٌ وَّ يُهْدَى الضَّالُّوْنَ وَ يُبْعَثُ الْمَقْبُوْرُوْنَ فَهٰذَا هُوَ مَعْنٰى قَوْلِهٖ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ[1] فَاِنَّ هٰذَا الْبَعْثَ بَعْثٌ مَّا رَاٰهُ الْاَوَّلُوْنَ وَلَا الْمُرْسَلُوْنَ السَّابِقُوْنَ وَلَا النَّبِيُّوْنَ اَجْمَعُوْنَ وَ اِنَّ دِيْنَ اللّٰهِ وَ اِنْ كَانَ غَالِبًا مِّنْ بُدُوِّ اَمْرِهٖ عَلٰى كُلِّ دِيْنٍ مِّنْ حَيْثُ الْقُوَّةِ

میں مخفی حقیقتیں منکشف ہو جائیں گی اور حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی اور جھوٹے دین اور باطل مذاہب ہلاک ہو جائیں گے۔ نیز یہ کہ اسلام مشرق و مغرب میں غالب آ جائے گا اور حق ہر گھر میں داخل ہو جائے گا بجز تھوڑے سے مجرموں کے گھروں کے۔ اس وقت دین کا معاملہ کامل ہو گا اور اللہ تعالیٰ لڑائی کو بند کرا دے گا اور زمین پر امن قائم ہو جائے گا اور سکینت اور صلح دلوں کی گہرائیوں میں قائم ہو جائے گی۔ درندے اپنی درندگی کی عادتوں کو اور اژدھے اپنی زہرناکی کو چھوڑ دیں گے۔ رُشد اور ہدایت واضح ہو جائے گی اور گمراہی مٹ جائے گی۔ کفر اور شرک کے صرف تھوڑے سے نشان باقی رہ جائیں گے۔ فسق و فجور اور بے حیائی کو صرف بیمار دل اختیار کریں گے اور گمراہوں کو ہدایت دے دی جائے گی۔ قبروں میں پڑے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔ یہی معنے اللہ تعالیٰ کے ارشاد " اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" کے ہیں۔ یقیناً یہی وہ اٹھایا جانا ہے جو پہلے لوگوں نے نہیں دیکھا اور نہ ہی پہلے رسولوں اور نبیوں کو یہ نظارہ نظر آیا۔ اگرچہ اللہ کا دین شروع سے ہی اپنی رُوحانی قوت اور استعداد کے لحاظ سے دوسرے ہر دین پر غالب ہے لیکن اُسے کبھی یہ موقع پہلے میسّر نہیں آیا کہ اُس نے دلیل، بُرہان اور سند کے لحاظ سے باقی دینوں سے مقابلہ کیا ہو اور انہیں پُورے طور پر شکست

[1] الاعراف آیت ۱۵

وَالْاِسْتِعْدَادِ. وَلٰكِنْ لَّمْ يَتَّفِقْ لَهٗ مِنْ قَبْلُ. اَنْ يُّبَارِيَ الْاَدْيَانَ كُلَّهَا بِالْحُجَّةِ وَ الْاَسْنَادِ. وَيَهْزِمَهَا كُلَّ الْهَزْمِ وَيُثْبِتَ اَنَّهَا مَمْلُوَّةٌ مِّنَ الْفَسَادِ وَيَخْرُجَ كَالْاَبْطَالِ بِاَسْلِحَةِ الْاِسْتِدْلَالِ حَتّٰى يَعُمَّ فِيْ جَمِيْعِ الدِّيَارِ وَالْبِلَادِ وَكَانَ ذَالِكَ تَقْدِيْرًا مِّنَ اللّٰهِ الْوَدُوْدِ. بِمَا سَبَقَ مِنْهُ اَنَّ الْغَلَبَةَ التَّامَّةَ وَ الصَّلَاحَ الْاَكْبَرَ الْاَعَمَّ يَخْتَصُّ بِزَمَانِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ وَ لِذَالِكَ اسْتَمْهَلَ الشَّيْطَانُ اِلٰى هٰذَا الزَّمَانِ الْمَسْعُوْدِ فَمَهَّلَهُ اللّٰهُ لِيُتِمَّ كُلَّ مَا اَرَادَ لِلْعَالَمِيْنَ. فَاَغْوَى الشَّيْطَانُ مَنْ تَبِعَهٗ اَجْمَعِيْنَ. فَتَقَطَّعُوْا بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ وَكَانَ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحِيْنَ. وَمَا بَقِيَ عَلَى الصِّرَاطِ اِلَّا عِبَادُ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ. وَالسِّرُّ فِيْهِ اَنَّ الزَّمَانَ قُسِّمَ عَلٰى سِتَّةِ اَقْسَامٍ مِّنَ اللّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ الْعَالَمَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ فَهُوَ زَمَانُ الْاِبْتِدَاءِ وَ زَمَانُ التَّزَايُدِ وَ النَّمَاءِ. وَ زَمَانُ الْكَمَالِ وَالْاِتْمَامِ وَزَمَانُ الْاِنْحِطَاطِ وَ قِلَّةِ التَّعَلُّقِ بِاللّٰهِ وَ قِلَّةِ الْاِرْتِبَاطِ. وَ زَمَانُ الْمَوْتِ بِاَنْوَاعِ الضَّلَالَاتِ وَزَمَانُ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَمَاتِ. فَاِنَّ مَثَلَ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ وَّقْتِ اٰدَمَ اِلٰى اٰخِرِ الزَّمَانِ

دی ہو اور یہ ثابت کر دیا ہو کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب خرابیوں سے پُر ہیں اور نہ ہی ایسا موقع آیا کہ استدلال کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دینِ اسلام بہادروں کی طرح میدان میں آیا ہو یہاں تک کہ تمام شہروں اور ملکوں میں پھیل گیا ہو یقیناً یہ خدائے مہربان کی ایک آسمانی تقدیر تھی کیونکہ اُس نے پہلے سے یہ فرما دیا تھا کہ کامل غلبہ اور بہت بڑی عمومی اصلاح مسیح موعود کے زمانہ سے مختص ہے اسی لئے شیطان نے اس مبارک زمانہ تک اپنے لئے مہلت طلب کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی تا شیطان انسانوں کے بارے میں جو ارادے رکھتا ہے انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچائے سو شیطان نے اپنے سب متبعین کو گمراہ کیا اور انہوں نے باہم اپنے معاملات میں تفرقہ پیدا کیا اور ہر گروہ اپنے خیالات اور عقائد پر شاداں و فرحاں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے صراطِ مستقیم پر سوائے اس کے صالح بندوں کے کوئی قائم نہ رہا۔

اِس سارے واقعہ میں یہ راز ہے کہ زمانہ چھ قسموں پر تقسیم ہے۔ اللہ کی طرف سے جس نے اِس جہان کو چھ اوقات میں پیدا فرمایا۔ ۱۔ زمانہ ابتداء۔ ۲۔ نشوونما اور زیادتی کا زمانہ۔ ۳۔ کمال اور انتہاء کا زمانہ۔ ۴۔ انحطاط اور اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی کا زمانہ۔ ۵۔ مختلف گمراہیوں کے نتیجہ میں روحانی موت کے واقع ہونے کا زمانہ۔ ۶۔ موت کے بعد اُٹھائے جانے کا زمانہ۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں کی مثال آدم کے وقت سے لے کر آخری زمانہ تک

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ[1] ثُمَّ اصْفَرَّ فَطَفِقَ تَتَسَاقَطُ بِاِذْنِ اللّٰهِ ثُمَّ حُصِدَ فَبَقِيَتِ الْاَرْضُ خَاوِيَةً ثُمَّ اَحْيَاهَا اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاِذَا هِيَ رَاوِيَةٌ وَّاَنْبَتَ فِيْهَا نَبَاتًا مُّثْرَعِزًا مُخْضَرًّا وَّعُيُوْنَ الزُّرَّاعِ اَقَرَّ. كَذٰلِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلْعَالَمِيْنَ. فَثَبَتَ مِنْ هٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ زَمَانَ الْمَوْتِ الرُّوْحَانِيِّ كَانَ مُقَدَّرًا مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَكَانَ قُدِّرَ اَنَّ النَّاسَ يَضِلُّوْنَ كُلُّهُمْ فِي الْاَلْفِ السَّادِسِ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ. فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ قَالَ الشَّيْطَانُ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ[2] وَلَوْ لَمْ يَكُنْ هٰذَا التَّقْدِيْرُ لَمَا اجْتَرَءَ عَلٰى هٰذَا الْقَوْلِ ذٰلِكَ اللَّعِيْنُ وَلَمَّا كَانَ يَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ قَفَا هٰذِهِ الْاَزْمِنَةَ بِزَمَانِ الْبَعْثِ وَالْهِدَايَةِ وَالْفَهْمِ وَالدِّرَايَةِ قَالَ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. فَالْحَاصِلُ اَنَّ اٰخِرَ الْاَزْمِنَةِ زَمَانُ الْبَعْثِ كَمَا يَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ. فَكَاَنَّ اللّٰهَ قَسَّمَ الْاُلُوْفَ السِّتَّةَ عَلَى الْاَزْمِنَةِ السِّتَّةِ وَاَوْدَعَ بَعْضَ حِصَصِ السَّابِعِ لِلْقِيَامَةِ وَلَمَّا جَاءَ

اس کھیتی کی مثال ہے جس نے اپنی روئیدگی نکالی پھر اس کو قوت پہنچائی اور وہ مضبوط ہوگئی اور پھر اپنے تنے پر قائم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ زرد ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اس کے پتے جھڑنے لگے پھر اُسے کاٹ لیا گیا تب زمین بالکل خالی ہوگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کیا جس پر وہ سیراب ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں سرسبز اور لہرانے والی کھیتی پیدا کی اور کسانوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی یہ مثال بیان فرمائی۔ پس اس مقام سے یہ امر ثابت ہے کہ روحانی موت کا زمانہ خدائے رب العالمین کی طرف سے مقدر تھا اور یوں فیصلہ کیا گیا تھا کہ چھٹے ہزار میں سوائے تھوڑے سے نیکوکار لوگوں کے سب لوگ گمراہ ہو جائیں گے اسی وجہ سے شیطان نے کہا تھا 'لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ' مَیں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ اور اگر یہ اللہ کی تقدیر نہ ہوتی تو شیطانِ لعین ایسی بات کہنے کی جرأت نہ کرتا۔ چونکہ اُسے یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان زمانوں کے پیچھے بعث اور ہدایت اور فہم و دِرائت کا زمانہ مقدر فرمایا ہے اس لئے اس نے کہا 'اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ' کہ میرا یہ گمراہ کرنا اس وقت تک ہوگا جب تک کہ دورِ بعث و ہدایت نہ آجائے۔

مختصر یہ ہے کہ آخری زمانہ لوگوں کو اُٹھائے جانے اور ہدایت پانے کا ہے جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے چھ ہزار سال کو چھ زمانوں پر تقسیم فرمایا اور ساتویں ہزار کے بعض حصّوں کو قیامت

[1] الفتح آیت ۳۰ ☆ [2] الحجر آیت ۴۰ ☆

الْاَلْفُ السَّادِسُ الَّذِیْ هُوَ زَمَانُ الْبَعْثِ مِنَ اللّٰهِ الْکَرِیْمِ۔ تَمَّ اَمْرُ الْاِضْلَالِ وَصَارَ النَّاسُ فِرَقًا کَثِیْرَۃً مِّنَ الشَّیْطَانِ اللَّئِیْمِ وَزَادَ الطُّغْیَانُ وَ تَمَوَّجَ الْفِرَقُ کَتَمَوُّجِ الْاَمْوَاجِ الثِّقَالِ وَ شَمَخَ الضَّلَالَۃُ کَالْجِبَالِ وَمَاتَ النَّاسُ بِمَوْتِ الْجَھْلِ وَ الْفِسْقِ وَ الْفَوَاحِشِ وَعَدَمِ الْمُبَالَاتِ وَعَمَّ الْمَوْتُ فِیْ جَمِیْعِ الْاَقْوَامِ وَ الدِّیَارِ وَ الْجِھَاتِ فَھُنَالِکَ رَاَی اللّٰهُ اَنَّ وَقْتَ الْبَعْثِ قَدْ اَتٰی وَوَقْتَ الْمَوْتِ بَلَغَ اِلَی الْمُنْتَھٰی فَاَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ کَمَا جَرَتْ سُنَّتُهٗ فِیْ قُرُوْنٍ اُوْلٰی لِیُحْیِیَ الْمَوْتٰی وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا مِّنْ رَّبِّ الْوَرٰی۔

(حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ۔ یہ حاشیہ آخری صفحات میں ہے)

اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ

محققوں نے بخاری کی اس حدیث کو... کہ مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ اِلَّا وَ الشَّیْطَانُ یَمَسُّهٗ حِیْنَ یُوْلَدُ اِلَّا مَرْیَمَ وَ ابْنَھَا قرآن کریم کی ان آیات سے مخالف پاکر کہ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۔ وَاِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ[1] وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ[2] اس حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ ابن مریم اور مریم سے تمام ایسے اشخاص مراد ہیں جو ان دونوں کی صفت پر ہوں جیسا کہ شارح بخاری نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے۔

کے لئے مقرر کر دیا۔ اور جب چھٹا ہزارہ آیا جو کہ اللہ کریم کی طرف سے بعثت کا زمانہ ہے تو گمراہی کا معاملہ مکمل ہو گیا اور لوگ شیطان لئیم کے گمراہ کرنے کی وجہ سے بہت سے فرقوں میں بٹ گئے۔ سرکشی وطغیان بڑھ گیا اور یہ فرقے سمندر کی بھاری موجوں جیسے جوش وخروش سے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور ضلالت اور گمراہی پہاڑوں کی طرح اُونچی ہو گئی اور لوگ بے علمی، فسق وفجور، بے حیائی اور لاپرواہی کی موت مر گئے اور یہ رُوحانی موت ساری قوموں، سارے ملکوں اور سارے اطراف میں پھیل گئی تب اس وقت اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ بعث (یعنی اُٹھائے جانے کا وقت) آچکا ہے اور موت کا وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا جس طرح کہ پہلی صدیوں میں اس کی سُنّت جاری تھی تاکہ وہ مُردوں کو زندہ کرے اور یہ ربّ الکائنات کا وعدہ پُورا ہو کر رہنے والا تھا۔

---

[1] الحجر آیت ۴۳ ۔ [2] مریم آیت ۱۶ ۔

قَدْطَعَنَ الزَّمَخْشَرِیُّ فِیْ مَعْنٰی ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَ تَوَقَّفَ فِیْ صِحَّتِہٖ وَ قَالَ اِنْ صَحَّ فَمَعْنَاہُ کُلُّ مَنْ کَانَ فِیْ صِفَتِہِمَا لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ یعنی علامہ زمخشری نے بخاری کی اس حدیث میں طعن کیا ہے اور اس کی صحت میں اس کو شک ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث معارضِ قرآن ہے اور فقط اس صورت میں صحیح متصور ہو سکتی ہے کہ اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ مریم اور ابن مریم سے مراد تمام ایسے لوگ ہیں جو ان کے صفت پر ہوں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۲۷-۹۲۸ طبع اوّل)

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ○

آیت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ... صاف دلالت کر رہی ہے کہ مسِ شیطان سے محفوظ ہونا ابن مریم سے مخصوص نہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۰۲ طبع اوّل)

اے شیطان میرے بندے جو ہیں جنہوں نے میری مرضی کی راہوں پر قدم مارا ہے اُن پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا سو جب تک انسان تمام کجیوں اور نالائق خیالات اور بیہودہ طریقوں کو چھوڑ کر صرف آستانہ الٰہی پر گرا ہوا نہ ہو جائے تب تک وہ شیطان کی کسی عادت سے مناسبت رکھتا ہے اور شیطان مناسبت کی وجہ سے اُس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس پر دوڑتا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۴ طبع اوّل)

اور یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں جبر کے طور پر بعضوں کو جہنمی ٹھہرا دیا ہے اور خواہ نخواہ شیطان کا تسلط ان پر لازمی طور پر رکھا گیا ہے یہ ایک شرمناک غلطی ہے۔ اللہ جلّشانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ کہ اے شیطان میرے بندوں پر تیرا کچھ بھی تسلط نہیں۔ دیکھئے کس طرح پر اللہ تعالیٰ انسان کی آزادی ظاہر کرتا ہے۔ منصف کے لئے اگر کچھ دل میں انصاف رکھتا ہو تو یہی آیت کافی ہے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۸-۹ پرچہ یکم جون ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

پھر ڈپٹی صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے افسوس کہ ڈپٹی صاحب کیسے صحیح معنے سے پھر گئے۔ واضح ہو کہ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ شر کو بحیثیت شر پیدا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ یعنی اے شیطان شر پہنچانے والے میرے بندوں پر تیرا تسلط نہیں بلکہ اس فقرہ کے یہ معنی ہیں کہ ہر ایک چیز کے اسباب خواہ وہ چیز خیر میں داخل ہے یا شر میں خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہیں مثلاً اگر شراب کے اجزاء جن سے شراب بنتی ہے موجود نہ ہوں تو پھر شرابی کہاں

سے شراب بناسکیں اور پی سکیں۔ لیکن اگر اعتراض کرنا ہے تو پہلے اس آیت پر اعتراض کیجئے کہ "سلامتی کو بناتا اور بلا کو پیدا کرتا ہے" یسعیاہ ۷/۴۵۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۴۳ پرچہ ۲؍جون ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

افسوس کہ بعض پادری صاحبان نے اپنی تصنیفات میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نسبت اُس واقعہ کی تفسیر میں کہ جب اُن کو ایک پہاڑی پر شیطان لے گیا اس قدر جرأت کی ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کوئی خارجی بات نہ تھی جس کو دُنیا دیکھتی اور جس کو یہودی بھی مشاہدہ کرتے بلکہ یہ تین مرتبہ شیطانی الہام حضرت مسیح کو ہوا تھا جس کو انہوں نے قبول نہ کیا۔ مگر انجیل کی ایسی تفسیر سُننے سے ہمارا تو بدن کانپتا ہے کہ مسیح اور پھر شیطانی الہام۔ ہاں اگر اس شیطانی گفتگو کو شیطانی الہام نہ مانیں اور یہ خیال کریں کہ درحقیقت شیطان نے مجسّم ہو کر حضرت عیسٰی علیہ السلام سے ملاقات کی تھی تو یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیطان نے جو پُرانا سانپ ہے فی الحقیقت اپنے تئیں جسمانی صورت میں ظاہر کیا تھا اور وجود خارجی کے ساتھ آدمی بن کر یہودیوں کے ایسے متبرک معبد کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا جس کے اردگرد صدہا آدمی رہتے تھے تو ضرور تھا کہ اُس کے دیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے بلکہ چاہیئے تھا کہ حضرت مسیح آواز مار کر یہودیوں کو شیطان دکھلا دیتے جس کے وجود کے کئی فرقے منکر تھے اور شیطان کو دکھلا دینا حضرت مسیح کا ایک نشان ٹھہرتا جس سے بہت آدمی ہدایت پاتے اور رومی سلطنت کے معزز عہدہ دار شیطان کو دیکھ کر اور پھر اس کو پرواز کرتے ہوئے مشاہدہ کر کے ضرور حضرت مسیح کے پیرو ہو جاتے مگر ایسا نہ ہوا۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی روحانی مکالمہ تھا جس کو دوسرے لفظوں میں شیطانی الہام کہہ سکتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ بھی آتا ہے کہ یہودیوں کی کتابوں میں بہت سے شریر انسانوں کا نام بھی شیطان رکھا گیا ہے چنانچہ اسی محاورہ کے لحاظ سے مسیح نے بھی ایک اپنے بزرگ حواری کو جس کو انجیل میں اس واقعہ کی تحریر سے چند سطر ہی پہلے بہشت کی کنجیاں دی گئی تھیں شیطان کہا ہے۔ پس یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ کوئی یہودی شیطان ٹھٹھے اور ہنسی کے طور پر حضرت مسیح کے پاس آیا ہوگا اور آپ نے جیسا کہ پطرس کا نام شیطان رکھا اس کو بھی شیطان کہہ دیا ہوگا اور یہودیوں میں اس قسم کی شرارتیں بھی تھیں اور ایسے سوال کرنا یہودیوں کا خاصہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سب قصہ ہی جھوٹ ہو جو عمداً یا دھوکہ کھانے سے لکھ دیا ہو کیونکہ یہ انجیلیں حضرت مسیح کی انجیلیں نہیں ہیں اور نہ انکی تصدیق شدہ ہیں بلکہ حواریوں نے یا کسی اور نے اپنے خیال اور عقل کے موافق لکھا ہے۔ اسی وجہ سے ان میں باہمی اختلاف بھی ہے لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ ان خیالات میں لکھنے والوں سے غلطی ہو گئی جیسا کہ یہ غلطی ہوئی کہ انجیل نویسیوں میں سے بعض نے یہ گمان کیا کہ گویا حضرت مسیح صلیب پر فوت ہو گئے ہیں۔ ایسی غلطیاں حواریوں کی سرشت میں تھیں کیونکہ انجیل ہمیں خبر دیتی ہے کہ ان کی عقل باریک نہ تھی۔ ان کے حالاتِ ناقصہ کی خود حضرت مسیح گواہی دیتے ہیں کہ وہ فہم اور درایت اور عملی قوت میں بھی کمزور تھے۔ بہرحال یہ

سچ ہے کہ پاکوں کے دل میں شیطانی خیال مستحکم نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کوئی تیرتا ہوا سرسری وسوسہ ان کے دل کے نزدیک آبھی جائے تو جلد تر وہ شیطانی خیال دور اور دفع کیا جاتا ہے اور ان کے پاک دامن پر کوئی داغ نہیں لگتا۔ قرآن شریف میں اس قسم کے وسوسہ کو جو ایک کم رنگ اور ناپختہ خیال سے مشابہ ہوتا ہے طائف کے نام سے موسوم کیا ہے اور لغتِ عرب میں اس کا نام طائف اور طوف اور طیف اور طَیِّف بھی ہے۔ اور اس وسوسہ کا دل سے نہایت ہی کم تعلق ہوتا ہے گویا نہیں ہوتا۔ یا یوں کہو کہ جیسا کہ دور سے کسی درخت کا سایہ بہت ہی خفیف سا پڑتا ہے ایسا ہی یہ وسوسہ ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ شیطان لعین نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دل میں اسی قسم کے خفیف وسوسہ کے ڈالنے کا ارادہ کیا ہو اور انہوں نے قوتِ نبوّت سے اس وسوسہ کو دفع کر دیا ہو۔ اور ہمیں یہ کہنا اس مجبوری سے پڑا ہے کہ یہ قصہ صرف انجیلوں میں ہی نہیں ہے بلکہ ہماری احادیث صحیحہ میں بھی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے ... طاؤس نے ابی ہریرہ سے کہا شیطان عیسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ کیا تو گمان نہیں کرتا کہ تو سچا ہے اُس نے کہا کیوں نہیں شیطان نے کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو اس پہاڑ پر چڑھ جا اور پھر اس پر سے اپنے تئیں نیچے گرا دے۔ حضرت عیسیٰ نے کہا کہ تجھ پر واویلا ہو کیا تو نہیں جانتا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنی موت کے ساتھ میرا امتحان نہ کر کہ مَیں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ شیطان ایسی طرز سے آیا ہوگا جیسا کہ جبرائیل پیغمبروں کے پاس آتا ہے کیونکہ جبرائیل ایسا تو نہیں آتا جیسا کہ انسان کسی گاڑی میں بیٹھ کر یا کسی کرایہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر اور پگڑی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر آتا ہے بلکہ اس کا آنا عالمِ ثانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ پھر شیطان جو کمتر اور ذلیل تر ہوتا ہے کیونکر انسانی طور پر کھلے کھلے آسکتا ہے۔ اس تحقیق سے بہرحال اس بات کو ماننا پڑتا ہے جو ڈریپر نے بیان کی ہے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قوت نبوت اور نورِ حقیت کے ساتھ شیطانی القا کو ہرگز ہرگز نزدیک آنے نہیں دیا اور اس کے ذب اور دفع میں فوراً مشغول ہو گئے۔ اور جس طرح نور کے مقابل پر ظلمت ٹھیر نہیں سکتی اسی طرح شیطان ان کے مقابل پر ٹھیر نہیں سکا اور بھاگ گیا۔ یہی اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ کے صحیح معنے ہیں کیونکہ شیطان کا سلطان یعنی تسلّط درحقیقت اُن پر ہے جو شیطانی وسوسہ اور الہام کو قبول کر لیتے ہیں لیکن جو لوگ دُور سے نُور کے تیر سے شیطان کو مجروح کرتے ہیں اور اُس کے مُنہ پر زجر اور توبیخ کا جُوتہ مارتے ہیں اور اپنے مُنہ سے وہ کچھ بکے جائے اُس کی پیروی نہیں کرتے وہ شیطانی تسلّط سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر چونکہ اُن کو خدا تعالیٰ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] دکھانا چاہتا ہے اور شیطان ملکوت الارض میں سے ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ مخلوقات کے

---

[1] الاعراف آیت ۱۸۶

مشاہدہ کا دائرہ پورا کرنے کے لئے اس عجیب الخلقت وجود کا چہرہ دیکھ لیں اور کلام سُن لیں جس کا نام شیطان ہے
اِس سے اُن کے دامن تنزہ اور عصمت کو کوئی داغ نہیں لگتا۔ (ضرورت الامام ص۱۱-۱۲ طبع اوّل)

وہ لوگ جو اپنے صدق اور وفا اور عشق الٰہی میں کمال کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں اُن پر شیطان تسلّط نہیں پا سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔

(حقیقۃ الوحی ص۱ طبع اوّل)

جس میں شیطان کا حصّہ نہیں رہا اور وہ سفلی زندگی سے ایسا دور ہوا کہ گویا مر گیا اور راست باز اور وفادار بندہ بن گیا اور خدا کی طرف آ گیا اُس پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ جو شیطان کے ہیں اور شیطان کی عادتیں اپنے اندر رکھتے ہیں انہیں کی طرف شیطان دوڑتا ہے کیونکہ وہ شیطان کے شکار ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۳۸-۱۳۹ طبع اوّل)

روح القدس کے فرزند تمام وہ سعادتمند اور راستباز ہیں جن کی نسبت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وارد ہے۔ قرآن کریم سے دو قسم کی مخلوق ثابت ہوتی ہے اوّل وہ جو روح القدس کے فرزند ہیں دوسرے وہ جو شیطان کے فرزند ہیں پس اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ ص۳ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۳ء)

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝

ایک روز یہ ذکر آ گیا کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں اور بہشت کے آٹھ۔ اس کا کیا سِر ہے۔ تو ایک دفعہ ہی میرے دل میں ڈالا گیا کہ اصول جرائم بھی سات ہی ہیں اور نیکیوں کے اصول بھی سات۔ بہشت کا جو آٹھواں دروازہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا دروازہ ہے۔

دوزخ کے سات دروازوں کے جو اصول جرائم سات ہیں ان میں سے ایک بدظنّی ہے۔ بدظنّی کے ذریعہ بھی انسان ہلاک ہوتا ہے اور تمام باطل پرست بدظنّی سے گمراہ ہوئے ہیں۔

دوسرا اصول تکبّر ہے تکبّر کرنے والا اہل حق سے الگ رہتا ہے اور اسے سعادت مندوں کی طرح اقرار کی توفیق نہیں ملتی۔

تیسرا اصول جہالت ہے یہ بھی ہلاک کرتی ہے۔

چوتھا اصول اتباع ہوٰی ہے۔

پانچواں کورانہ تقلید ہے۔

غرض اس طرح پر جرائم کے سات اصول ہیں اور یہ سب کے سب قرآن شریف سے مستنبط ہوتے ہیں خدا تعالیٰ نے ان دروازوں کا علم مجھے دیا ہے۔ جو گناہ کوئی بتائے وہ ان کے نیچے آجاتا ہے۔ کورانہ تقلید اور اتباع ہوٰی کے ذیل میں بہت سے گناہ آتے ہیں۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ۝

یہ ایک پیشگوئی ہے کہ آئندہ زمانہ میں آپس میں رنجشیں ہوں گی لیکن غلّ ان کے سینوں میں سے ہم کھینچ لیں گے۔ وہ بھائی ہوں گے تختوں پر بیٹھنے والے۔
(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

قرآن شریف صحابہ کی تعریف سے بھرا پڑا ہے اور اُن کی ایسی تکمیل ہوئی کہ دوسری کوئی قوم اس کی نظیر نہیں رکھتی۔ پھر اُن کے لئے اللہ تعالیٰ نے جزا بھی بڑی دی یہاں تک کہ اگر باہم کوئی رنجش بھی ہو گئی تو اس کے لئے فرمایا وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ الآیۃ۔
(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

یہ تو شیعوں کا مذہب ہے کہ صحابہ کے درمیان آپس میں ایسی سخت دشمنی تھی۔ یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اسکی تردید میں فرماتا ہے کہ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ برادریوں کے درمیان آپس میں دشمنیاں ہوا کرتی ہیں مگر شادی و مرگ کے وقت وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اخیار میں خونی دشمنی کبھی نہیں ہوتی۔
(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۝

جو لوگ بہشت میں داخل کئے جائیں گے پھر اُس سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور قرآن شریف میں اگرچہ حضرت مسیح کے بہشت میں داخل ہونے کا بہ تصریح کہیں ذکر نہیں لیکن ان کے وفات پا جانے کا تین جگہ ذکر ہے اور مقدس بندوں کے لئے وفات پانا اور بہشت میں داخل ہونا ایک ہی حکم میں ہے کیونکہ برطبق آیت قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ[1] وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ[2] وہ بلا توقف بہشت میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اب مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں گروہ پر واجب ہے کہ اس امر کو غور سے جانچیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مسیح جیسا مقرب بندہ بہشت میں داخل کر کے پھر اس سے باہر

---

[1] یٰسٓ آیت ۲۷؎ [2] الفجر آیت ۳۱؎

نکال دیا جائے ؟ کیا اس میں خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا تخلف نہیں جو ان کی تمام پاک کتابوں میں بتواتر و تصریح موجود ہے ؟ کہ بہشت میں داخل ہونے والے پھر اُس سے نکالے نہیں جائیں گے۔ کیا ایسے بزرگ اور حتمی وعدہ کا ٹوٹ جانا خدائے تعالیٰ کے تمام وعدوں پر ایک سخت زلزلہ نہیں لاتا ؟ پس یقیناً سمجھو کہ ایسا اعتقاد رکھنے میں نہ صرف مسیح پر ناجایز مصیبت وارد کروگے بلکہ ان لغو باتوں سے خدائے تعالیٰ کی کسرِ شان اور کمال درجہ کی بے ادبی بھی ہوگی اس امر کو ایک بڑے غور اور دیدہ تعمق سے دیکھنا چاہیئے کہ ایک ادنیٰ اعتقاد سے جس سے نجات پانے کیلئے استعارہ کی راہ موجود ہے۔ بڑی بڑی دینی صداقتیں آپ کے ہاتھ سے فوت ہوتی ہیں اور درحقیقت یہ ایک ایسا فاسد اعتقاد ہے جس میں ہزاروں خرابیاں سخت اُلجھن کے ساتھ گرہ در گرہ لگی ہوئی ہیں اور مخالفوں کو ہنسی اور ٹھٹھے کے لئے موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ (توضیح مرام ص۹ طبع اوّل)

ہمارے عقیدہ کے موافق خدائے تعالیٰ کا بہشتیوں کے لئے یہ وعدہ ہے کہ وہ کبھی اس سے نکالے نہیں جائیں گے پھر تعجب کہ ہمارے علماء کیوں حضرت مسیح کو اس فردوس بریں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ ہی یہ قصے سناتے ہیں کہ حضرت ادریس جب فرشتہ ملک الموت سے اجازت لے کر بہشت میں داخل ہوئے تو ملک الموت نے چاہا کہ پھر باہر آویں لیکن حضرت ادریس نے باہر آنے سے انکار کیا اور یہ آیت سُنا دی وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ اب مَیں پوچھتا ہوں کہ کیا حضرت مسیح اس آیت سے فائدہ حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں کیا یہ آیت اُن کے حق میں منسوخ کا حکم رکھتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس لئے اس تنزل کی حالت میں بھیجے جائیں گے کہ بعض لوگوں نے انہیں ناحق خدا بنایا تھا تو یہ ان کا قصور نہیں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى[1] ماسوائے اس کے یہ بات بھی نہایت غور کے قابل ہے کہ یہ خیال کہ مسیح مع مسیح بن مریم ہی بہشت سے نکل کر دنیا میں آجائیں گے تصریحات قرآنیہ سے بکلّی مخالف ہے۔ قرآن شریف تین جگہ حضرت مسیح کا فوت ہوجانا کُھلے کُھلے طور پر بیان کرتا ہے اور حضرت مسیح کی طرف سے یہ عذر پیش کرتا ہے کہ عیسائیوں نے جو انہیں اپنے زعم میں خدا بنادیا تو اس سے مسیح پر کوئی الزام نہیں کیونکہ وہ اس ضلالت کے زمانہ سے پہلے فوت ہوچکا تھا۔

(ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۸۸-۹۰ طبع اوّل)

بہشت میں داخل ہونے والے ہر یک رنج اور تکلیف سے رہائی پاگئے اور وہ کبھی اس سے نکالے نہیں جائیں گے۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۳۵۳ طبع اوّل)

اس جگہ بظاہر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ جبکہ ہر ایک مومن طیّب اور طاہر جن کی گردن پر کوئی بوجھ گناہ

---

[1] الانعام آیت ۱۶۵

اور معاصی کا نہیں بلا توقف بہشت میں داخل ہوجاتے ہیں تو اِس صورت میں حشر اجساد اور اُس کے تمام لوازم متعلقہ سے انکار لازم آتا ہے کیونکہ جب کہ بہشت میں داخل ہوچکے تو پھر بموجب آیت وَمَاھُمْ مِنْھَا بِمُخْرَجِیْنَ اُن کا بہشت سے نکلنا ممتنع ہے پس اس سے تمام کارخانہ حشر اجساد و واقعات معاد کا باطل ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا عقیدہ جو مومنین مطہّرین بلا توقف بہشت میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ میری طرف سے نہیں بلکہ یہی عقیدہ ہے جس کی قرآن شریف نے تعلیم دی ہے اور دوسری تعلیم جو قرآن شریف میں ہے جو حشر اجساد ہوگا اور مُردے زندہ ہوں گے وہ بھی حق ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ بہشت میں داخل ہونا صرف اجمالی رنگ میں ہے اور اس صورت میں جو مومنوں کو مرنے کے بعد بلا توقف اجسام دئے جاتے ہیں وہ اجسام ابھی ناقص ہیں مگر حشر اجساد کا دن تجلّی اعظم کا دن ہے اس دن کامل اجسام ملیں گے اور بہشتیوں کا تعلق کسی حالت میں بہشت سے الگ نہیں ہوگا۔ من وجہٖ وہ بہشت میں ہوں گے اور من وجہٖ خدا تعالیٰ کے سامنے آئیں گے کیا وہ شہداء جو سبز چڑیوں کی طرح بہشت میں پھل کھاتے ہیں کیا وہ چڑیاں بہشت سے باہر نکل کر خدا کے سامنے پیش نہیں ہوں گی۔ فتدبّر

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۳ بحاشیہ طبع اوّل)

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۝

ہم نے تجھے اے رسول سات آیتیں سورہ فاتحہ کی عطا کی ہیں جو مجمل طور پر تمام مقاصد قرآنیہ پر مشتمل ہیں اور اُن کے مقابلہ پر قرآنِ عظیم بھی عطا فرمایا ہے جو مفصل طور پر مقاصدِ دینیہ کو ظاہر کرتا ہے اور اسی جہت سے اس سورہ کا نام امّ الکتاب اور سورۃ الجامع ہے۔ امّ الکتاب اس جہت سے کہ جمیع مقاصد قرآنیہ اس سے مستخرج ہوتے ہیں اور سورۃ الجامع اس جہت سے کہ علومِ قرآنیہ کے جمیع انواع پر بصورت اجمالی مشتمل ہے۔ اِسی جہت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ جس نے سورہ فاتحہ کو پڑھا گویا اُس نے سارے قرآن کو پڑھ لیا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۸۸ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ۝

رسول وہی کام کرتا ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے جیسے خدا فرماتا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ جس کا حکم نہ دیا جائے اس کے برخلاف کچھ کہنا یا کرنا گستاخی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۴)

جب کسی امر کے متعلق وحی الٰہی آجاتی ہے تو پھر مامور اس کے پہنچانے میں کسی کی پروا نہیں کرتے اور اس کا چھپانا اسی طرح شرک سمجھتے ہیں جس طرح وحی الٰہی سے اطلاع پانے کے بغیر کسی امر کی اشاعت شرک سمجھتے

ہیں۔ اگر وہ اس بات کو جس کی اطلاع وحی الٰہی کے ذریعہ سے نہیں ملی۔ بیان کرتا ہے تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُسے وہ سُوجھتا ہے جو خدا کو بھی نہیں سُوجھتا اور اس گستاخی سے وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

۹۶ إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ

وہ جو تجھ سے اور تیرے الہام سے ہنسی کرتے ہیں ہم ان کے لئے کافی ہیں یعنی تجھے صبر چاہئے۔
(تریاق القلوب صفحہ ۶۲ طبع اوّل)

۱۰۰ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○

مفسّر کہتے ہیں کہ یقین سے مراد موت ہے مگر موت روحانی مراد ہے اور یہ ظاہری بات ہے کہ اس کا مقصود بالذات کیا ہو؟ جس کی تلاش کرنے کیلئے یہاں ایما اور اشارہ ہے مگر مَیں کہتا ہوں کہ وہ روحانی موت ہو یا تمہاری زندگی خدا ہی کی راہ میں وقف ہو۔ مومن کو لازم ہے کہ اس وقت تک عبادت سے نہ تھکے اور سُست نہ ہو جب تک یہ جھوٹی زندگی بھسم نہ ہو جاوے اور اسکی جگہ نئی زندگی جو ابدی اور راحت بخش زندگی ہے اُس کا سلسلہ شروع نہ ہو جاوے اور جب تک اسی عارضی حیات دنیا کی سوزش اور جلن دور ہو کر ایمان میں ایک لذّت اور روح میں ایک سکینت اور استراحت پیدا نہ ہو یقیناً سمجھو کہ جب تک انسان اس حالت تک نہ پہنچے ایمان کامل اور ٹھیک نہیں ہوتا اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ تو عبادت کرتا رہ جب تک کہ تجھے یقینِ کامل کا مرتبہ حاصل نہ ہو اور تمام حجاب اور ظلماتی پردے دور ہو کر یہ سمجھ میں آجاوے کہ اب مَیں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھا بلکہ اب تو نیا ملک نئی زمین، نیا آسمان ہے اور مَیں بھی کوئی نئی مخلوق ہوں یہ حیات ثانی وہی ہے جس کو صوفی بقا کے نام سے موسوم کرتے ہیں جب انسان اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رُوح کا نفخ اس میں ہوتا ہے۔ ملائکہ کا اُس پر نزول ہوتا ہے یہی وہ راز تھا جس پر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت فرمایا کہ اگر کوئی چاہے کہ مُردہ میّت کو زمین پر چلتا ہوا دیکھے تو وہ ابوبکر کو دیکھے۔ اور ابوبکر کا درجہ اس کے ظاہری اعمال سے ہی نہیں بلکہ اس بات سے ہے جو اس کے دل میں ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

صوفیوں نے لکھا ہے کہ ہر ایک انسان کے لئے باب الموت کا طے کرنا ضروری ہے اس پر ایک قصّہ بھی ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک طوطا تھا جب وہ شخص سفر کو چلا تو اس نے طوطہ سے پوچھا کہ تو بھی کچھ کہہ۔ طوطہ نے کہا کہ اگر تو فلاں مقام پر گذرے تو ایک بڑا درخت ملے گا اس پر بہت سے طوطے ہوں گے ان کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ کھلی ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کرتے ہو اور ایک مَیں بے نصیب ہوں کہ قید میں ہوں۔ وہ شخص جب اس درخت کے پاس پہنچا تو اس نے طوطوں کو وہ پیغام پہنچایا۔ ان میں سے ایک طوطہ درخت سے گرا اور پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔ اس کو یہ واقعہ دیکھ کر کمال افسوس ہوا کہ اس کے ذریعہ سے ایک جان ہلاک ہوئی۔ مگر سوائے صبر کے کیا چارہ تھا جب سفر سے وہ واپس آیا تو اس نے اپنے طوطہ کو سارا واقعہ سُنایا اور اظہارِ غم کیا۔ یہ سنتے ہی وہ

طوطہ جو پنجرہ میں تھا پھڑکا اور پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔ یہ واقعہ دیکھ کر اس شخص کو اور بھی افسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ سے دو خون ہوئے۔ آخر اس نے طوطہ کو پنجرہ سے نکال کر باہر پھینک دیا تو وہ طوطہ جو پنجرہ سے مُردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا اُڑ کر دیوار پر جا بیٹھا اور کہنے لگا کہ دراصل نہ وہ طوطہ مرا تھا اور نہ مَیں۔ میں نے تو اس سے راہ پوچھی تھی کہ اس قید سے آزادی کیسے حاصل ہو سو اس نے مجھے بتایا کہ آزادی تو مر کر حاصل ہوتی ہے پس میں نے بھی موت اختیار کی تو آزاد ہو گیا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۴-۲۳۵)

پس یہ سچی بات ہے کہ نفسِ امارہ کی تاروں میں جو یہ جکڑا ہوا ہے اس سے رہائی بغیر موت کے ممکن ہی نہیں۔ اسی موت کی طرف اشارہ کر کے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ اس جگہ یقین سے مراد موت بھی ہے یعنی انسان کی اپنی ہوا و ہوس پر پوری فنا طاری ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت رہ جاوے اور وہ یہاں تک ترقی کرے کہ کوئی جنبش اور حرکت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نہ ہو۔

سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ موت انسان پر وارد ہو جاتی ہے تو سب عبادتیں ساقط ہو جاتی ہیں اور پھر خود ہی سوال کرتے ہیں کہ کیا انسان اباحتی ہو جاتا ہے اور سب کچھ اس کے لئے جائز ہو جاتا ہے؟ پھر آپ ہی جواب دیا ہے کہ یہ بات نہیں کہ وہ اباحتی ہو جاتا ہے بلکہ بات اصل یہ ہے کہ عبادت کے اثقال اس سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر تکلف اور تصنع سے کوئی عبادت وہ نہیں کرتا بلکہ عبادت ایک شیریں اور لذیذ غذا کی طرح ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور مخالفت اس سے ہو سکتی ہی نہیں اور خدا تعالیٰ کا ذکر اس کے لئے لذت بخش اور آرام دہ ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ[1]۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ نواہی کی اجازت ہو جاتی ہے نہیں بلکہ وہ خود ہی نہیں کر سکتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی خصی ہو اور اس کو کہا جاوے کہ تو جو مرضی ہے کر۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس سے فسق و فجور ادا لینا کمال درجہ کی بیحیائی اور حماقت ہے یہ تو اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جہاں کشفِ حقائق ہوتا ہے صوفی کہتے ہیں اس کے کمال پر الہام ہوتا ہے اسکی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہو جاتی ہے اسوقت اسے یہ حکم ملتا ہے

پس اثقالِ عبادت اس سے دور ہو کر عبادت اس کے لئے غذا شیریں کا کام دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ[2] فرمایا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۳-۴)

اس کی راہ پر چلا جاوے یہاں تک کہ مر جاوے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کے یہی معنے ہیں۔ وہ موت جب آتی ہے تو ساتھ ہی یقین بھی آجاتا ہے۔ موت اور یقین ایک ہی بات ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

اگر یقین کی لذت پیدا ہو جائے تو شاید انسان دنیا طلبی کے ارادوں کو خود ترک کر دے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں کہ اس بات کو آزما لیا جائے کہ درحقیقت خدا موجود ہے اور درحقیقت وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور وہ کریم و رحیم ہے۔ ان لوگوں کو ضائع نہیں کرتا جو اس کے آستانہ پر گرتے ہیں۔ (مکتوبات جلد ۵ نمبر ۱ صفحہ ۳۵ (مکتوب نمبر ۲۴ بنام حضرت سیٹھ عبدالرحمان صاحب مدراسی))

---

[1] حٰم السجدۃ آیت ۴۱ ۔ [2] البقرۃ آیت ۲۶ ۔